



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

CALL NO. 297.05
Accession No. 16815
56144

297.05
16815

56144

نگین -
نہرو شاہ

Call No. _____

Acc. No. _____

--	--	--	--

ہندوستانی مسلمان مذہب

گلگن

Rs. 15/-



علم الانسان النعمان

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
حَامِعَةُ طِبِّهِ اِسْلَامِيَّةً
نئی دہلی

تعداد 297.05
ستارہ 16845
عدد داخلہ 56144

سینکارا

آپ کے جسم کو بہت کچھ دیتا ہے

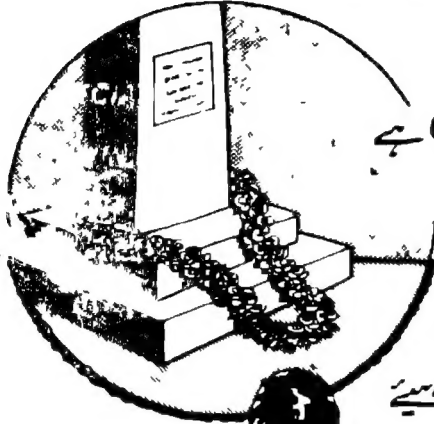
سینکارا میں ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزاء کے ساتھ ہی چودہ جڑی بوٹیاں خاص کو شامل ہیں، جن سے ہضم کی طاقت بہتر کام کرتی ہے اور جن کی مدد سے آپ کا جسم سینکارا میں شامل وٹامنوں وغیرہ کو بہت تیزی سے جذب کر لیتا ہے اور آپ کی غذا صحیح طور پر ادائیگری سے جزو بدن ہو کر آپ کو بہت جلد قوت حاصل ہوتی ہے

وٹامنوں اور قدرتی اجزاء سے بھرپور ہر موسم میں خاندان بھر کے لیے بے مثال ٹانک

سینکارا



آپ اسی وقت عظیم
ہو سکتے ہیں جبکہ آپ ہی قوم عظیم ہو
— اور قوم کی عظمت اسکے نوجوانوں کی
مساعی اور کامرانیوں پر منحصر ہے



اپنے دیش کو
آزاد کرانے کے لئے ہمارا بہت خون بہا ہے



آج کے نوجوان کو
ملک کو عظیم بنانے کے لئے پوری جدوجہد کرنی چاہیئے
اس عظیم قوم کی تعمیر میں نوجوان
نسل کو اہم ترین دست درازت
اور اہمیت ہے
ہمارا اسٹر کے نوجوان قومی تعمیر نو کے
فوری کام میں ہمت، پیش پیش
رہتے

آئیے ہم ہر میدان
میں پیداوار بڑھانے
کا عہد کریں تاکہ
سماجی انصاف اور
ترقی کی سمت
قدم تیز سے
تیز تر ہو

MAKTABA JAMIA LTD.

Book Sellers & Publishers,

Princess Building, 4, J. Hospital,

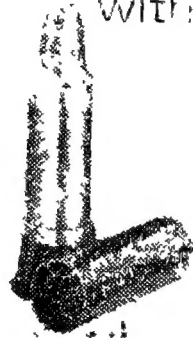
Dr. Mohd. Iqbal Chowk,

BOMBAY-400 003

ڈاکٹر محمد ریاض، جنرل آف ایڈمیشن اینڈ بکس، دہلی، ہندوستان

شعبہ کائنات، کائنات، کائنات

the name of love keeps burning
with KISS OF FIRE



Let your lips
reflect love with
KISS OF FIRE lipsticks.
Shades that are
rich, clear and mellow.
Pick the one to suit
the time of the day.
KISS OF FIRE
lipsticks

From the makers of **AFGHAN SNOW** Beauty Aids

گلستانِ پامندستانِ مسلمان

With best compliments from :



S I M P L E X

WOOLLEN MILLS

BOMBAY-400 068

**WOOLLEN BLANKETS, UNISEX TWEEDS, BLAZERS
MUFFLERS, VELOURS, HOSPITAL BLANKETS,
INDUSTRIAL CLOTH AND SHAWLS**



SADHANA RAYON HOUSE

DR. D. N. ROAD, FORT,

BOMBAY-400 001.

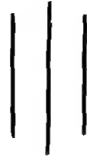
Phone Office
266041-2-3

Mills
662311-12

Telex
011-2925 (Seth)

Gram
"SHODDY MILL"

*With Best Compliments
from*



AINAMID ENGINEERING & METAL WORKS PVT. LTD.



Manufacturers & Fabricators of Stainless
Steel, Mild Steel, Chemical Pharmaceutical
Industrial Vessels, Aluminium and CRCA
Drums, Tin Containers, Ghamelas & other
Hallow Ware



Office : 110/5, TANK STREET, BOMBAY-8.



Factory : PLOT No. B-44, WAGLE IND. ESTATE, THANA.

Phone : 5 9 2 2 2 8 - 5 9 4 8 1 8

CAR & LORRY DRIVING & MECH. SCHOOL



- HEAD OFFICE :

Phone : 458719

BRANCHES :

1. **OPP. J. J. HOSPITAL GATE NO. 12 SIR J. J. ROAD,
BOMBAY-400 008.** **PHONE : 374222**
2. **(IRLA) VILE PARLE, S. V ROAD,
BOMBAY-400 056.** **PHONE : 573881**
3. **BEHIND KALPANA TALKIES, OLD AGRA ROAD, KURLA,
BOMBAY-400 070.** **PHONE : 551141**
4. **GOWALIA TANK, TANKERVILLE ESTATE,
BOMBAY-400 036.** **PHONE : 384521**

BUY TICKETS & TRAVEL WITH DIGNITY

When you are in possession of proper tickets, you travel with dignity and confidence. You enjoy your journey as your mind is at rest.

Without tickets, you are always afraid ; You are unable to look at any one with courage.

If you are caught, you are not only fined heavily but also become an object of ridicule and fun.

Why cheat yourself and the Nation, when you can travel and honourable with a proper ticket.

WESTERN RAILWAY

REMEMBER EVER

SUPER FURNISHERS—the professionals—with a backing of two decades of practical experience—have to their credit the furnishing and interior decoration of a number of top-class offices—industrial concerns—government departments—shops—cinema houses etc. and above all the most beautiful homes.

we have

well equipped workshop with expert and experienced technicians having SPECIALIZED KNOWLEDGE, UNDER LATEST MANUFACTURING TECHNIQS, FOR IDEAL, ARCHITECTURAL DESIGNS AND LAY-OUTS, COMPARABLE TO THAT OF SCIENTIFIC WESTERN TYPE DESIGNS. Our accent is on COMFORT and our furniture angles are designed to soothe and support the human body and to relax tired limbs.

contact

SUPER FURNISHERS

**215-E, MAULANA AZAD ROAD,
NEAR NAGPADA, MADANPURA,
BOMBAY-400 008.**

Gram 'SUPERSEATS'

Phones { Office : 37 51 48
Resi. : 37 13 03

With best compliments from :



INDIANA POULTRY

(COLD STORAGE)

BROILERS, INDIAN CHICKEN, CHICKEN
LEGS, FROG LEGS, FISH, PRAWNS,
EGGS, ETC.

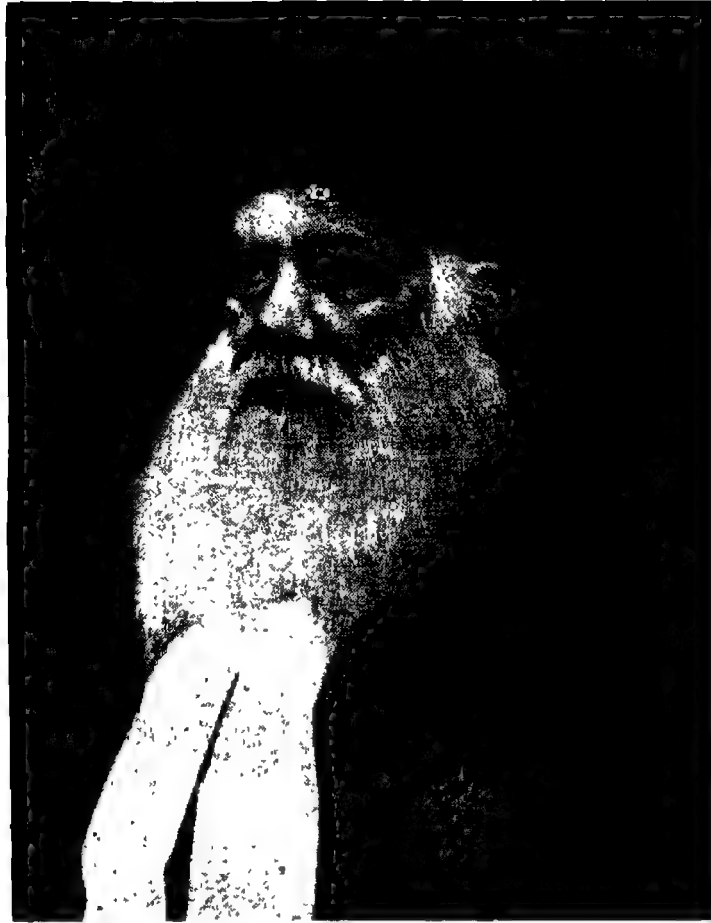
DAILY FRESH PRODUCTS

FREE HOME DELIVERY

SHOP NO. 476-79, INSIDE M. J. PHULE MARKET,
BOMBAY-400 001.

Gram : 'POULTRY'

Phones { Shop : 26 49 77
Call : 26 95 94



Sir Saiyyad Ahmed Khan



Maulana Aazad



Maulana Haali

گلن کاهندستانی مسلمان نمبر



Shaikh Abdullah

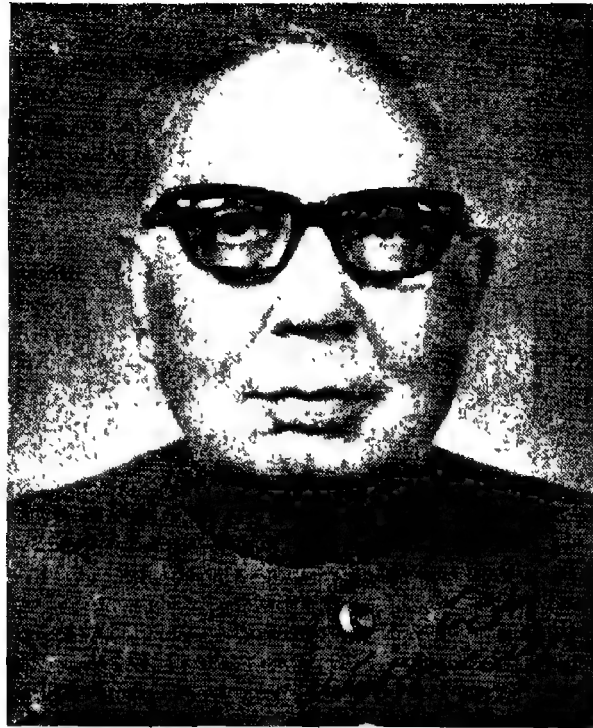


Shamim Ahmed Shamim



Dr. Ishaq Jamkhanawala

ڊاڪٽر ايشاق ڄامڪھانوالا



Hafiz Yusuf Dehlvi



Shams Kanwal

Nashad Dehlvi

Sarwar Taunsvi



K. Ahmed Abbas



Bal Thakaray



Sultan Dosai



Om Prakash Nami



Salim Javed



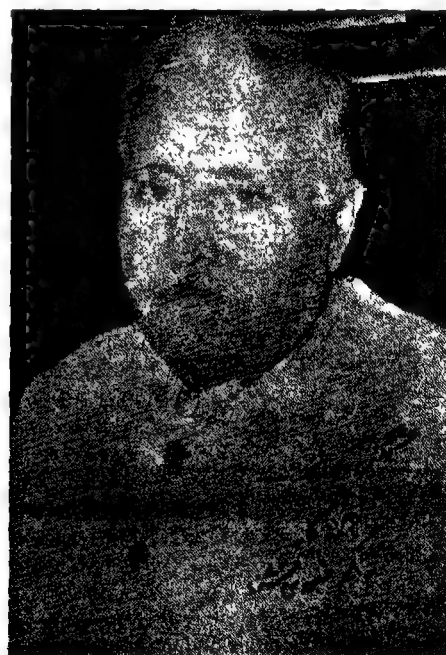
Shamim Ahmed Shamim

Krishna Chandra

Salma Siddeeque



Hameed Dalvai



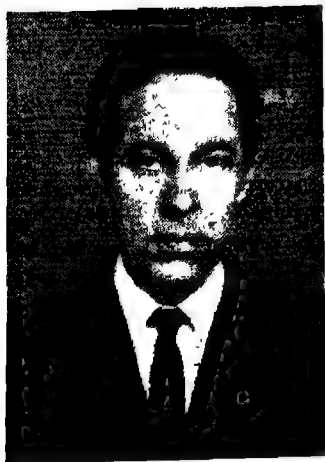
Diwan Anand Kumar



C. L. Kavish



Husain Akrami

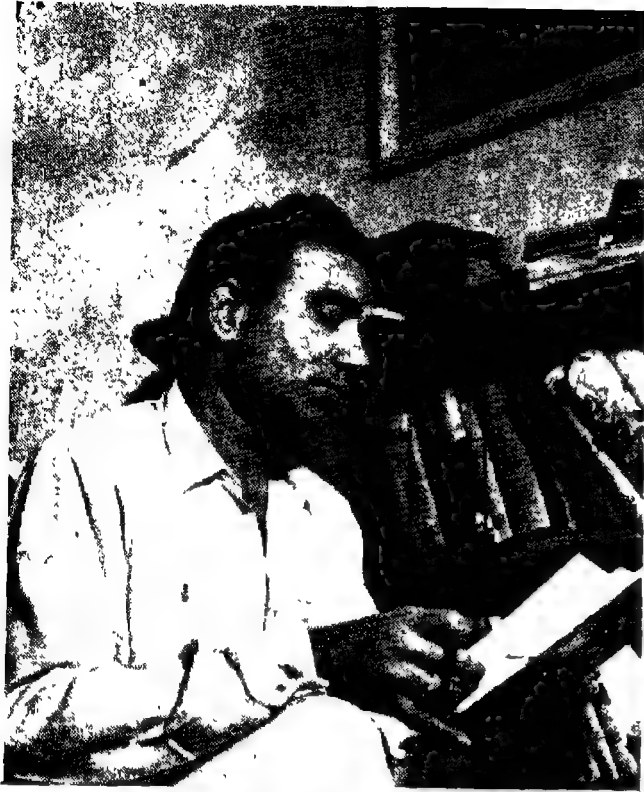


H H Khan



Fareed Phooliavi

گورکھ پستالی سکرانمبر



Niyay Sharma



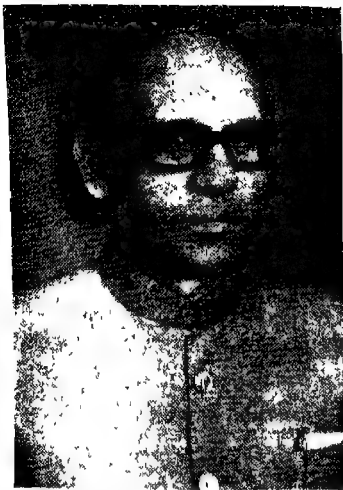
Sarwer Taunsvi



Khalid Irfan



Salma Siddeeqee



Shams Kanwal



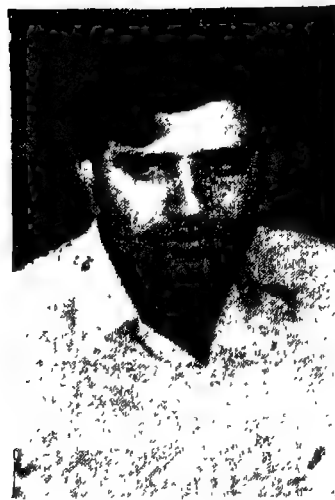
Abdul Ghaffar



Sadiq Ali



Baigum Shehnaz Kanwal



Anwer Qamar

شہر کا مہندس آلی مسکن نمبر

ہندوستانی مسلمان نمبر

مبئی



اڈی ٹی
شمس کنول
شہزاد کنول
شہزاد کنول

1975
اشاعت کا تیرھواں سال
فروری، مارچ، اپریل
دوسرا، تیسرا، چوتھا شمارہ

پبلشنگ ہاؤس، 10/11، لکھنؤ، دارالکتاب، دارالکتاب

قیمت = 15 روپے



”

“

حق دو شخصوں کا محتاج ہے
ایک وہ جو اُس کا اظہار کرے
دوسرا وہ جو اُسے مان لے !
- خلیل جبران -



باراں دیدہ دور اندیش بزرگ

کنارا سٹڈی کیٹ کے پیلائی گئے ہوئے
روف ٹائلز [کوئے لو] یعنی کھیتل

پیرا اعتماد رکھیے، میں
کنارا سٹڈی کیٹ
ٹائلز، ٹمبلر، ڈرائے فٹس ایجنٹ

4 - مستان ٹینک کراس لائن، بمبئی 400008

گرم: پیغام

فون: 378172

323635

پوسٹ بک نمبر 4504

پاسپورٹ
ویزا

کی معلومات کے لئے

اور غیر مالک میں جالے کے لئے

ٹکنوں کی بکنگ کے سلسلے میں

ہمارا تعاون حاصل کیجئے

گلوبل ٹریولس

نمبر 4 مستان تالاب کراس لائن ٹانگیڑہ

بمبئی نمبر 400008

ہندوستانی مسلمان نمبر

یہاں نیرنگی فکر و نظر ہے



شمس کنول
اڈیٹر

29

33

شمس نے فکر کیجئے
نور محمد

مَقَالَات

آصف فیضی	39
عار عثمانی	47
شیخ محمد عبداللہ	56
مولانا محمد سلم	63
شمیم احمد شمیم	66
غلام محمد بستان والا	69
آل احمد سرور	73
ڈاکٹر حفظ انصاری	80
گوپال متل	89
خواجہ محمد ثانی نظامی	93
خواجہ احمد عباس	96
انور علی دہلوی	99
سید امیر شہزاد نظامی	101
شہر یوسف طیب جی	105
سید احمد اکبر آبادی	108
نشرت خانقاہی	110
سی۔ ایل۔ کاوش	114
سید انیس الرحمان	120

اسلامی قانون سے متعلق نئے رجحانات
اسلام پہلے، بعد میں سب کچھ
صرف ایک ہی راستہ
کہ آجائے کوئی رجحان
تقسیم ملک کے بعد اثرات
ہندوستانی مسلمانوں کا تاریخی کردار
ہندوستانی مسلمان
کمیونزم اور ہندوستانی مسلمان
کمیونٹ پارٹی اور ہندوستانی مسلمان
مسلمان اور وطن دوستی
مولا بخش بھی ہندوستانی مسلمان
آئیے اپنی قسمت بدل ڈالیں
ہندوستانی مسلمان اور مسائل
لوڈیئے عہد شکن
فرقہ وارانہ فسادات
مسلمان اور مسرف آخر
سیاست اور اقلیت
اقلیتوں کا مسئلہ

نقشِ صحری	124
ڈاکٹر ذبیحہ تنائی	129
حسین شاہین	133
ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا	138
ایم۔ آر۔ بیگ	141
باجرہ بیگم	143
احقر علی انجینئر	145
سید شہاب الدین دستوی	150
اے۔ بی۔ شاہ	153
پروفیسر ڈبلیو اسمتھ	156
سر قورٹوسوی	159
ڈاکٹر ظانصاری	164
ڈاکٹر شانتی رجن بھٹاچاریہ	168
بنت کمار چٹرجی	181
ضیاء ہانی	186
جلید احمد	190
نقشِ صحرائی	192
مولانا حامد الانصاری غازی	198
کوشن چندر	202
ڈاکٹر انیشور ٹوپا (جی۔ ایل۔ غفار)	204
جی ایم سید (جیوت چاؤلا)	212

ملاحزہ

بال ٹھاکر سے	225
شیم احمد شمیم	228
حمید دولانی	232
حافظ یوسف دہلوی	236
نور ہند سنگھ بیدی سحر	239
دیوان آسنہ کمار	241
دییشنکر	243

مسلمان اور حساس کم تر	
مسلم خواتین	
ہندوستانی مسلمانوں کے اہم مسائل	
کہاں میں کہاں ہیں	
پہلے مسلمان یا ہندوستانی	
عورت کا رتبہ	
فرقہ پرستی	
ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل	
مسلمان اور تعلیم	
ہندوستانی مسلمان	
زبانِ اردو	
اسلام اور مسلمان	
بنگالی مسلمانوں کے مسائل	
ہندوستانی مسلمان کی ٹریجڈی	
احتملِ ام باہمی	
مسلمانو! اچھے انسان بنو	
تمدیب اور مذہب	
ہم سب ہندوستانی ہیں	
قومی مزاج کی تشکیل	
ہندوستانی مسلم حکمرانوں کے سیاسی اصول	
قومیت، دینی حکومت اور جہاد	

پہلے ہندوستانی بعد میں مسلمان	
نئی سہ میدوں کا فروغ ہے	
روح کا ختم	
ترقی قلتِ خرچ سے	
قومی یک جہتی	
سورمئی	
مسلمان اور سرکاری ملازمتیں	

ناش و دہلوی	246
سلیم خاں	248

نئی نسل کے قلم کار

مجید مرزا تاباں	253
طار الدین جینا بڑے	256
انور قمر	258
عبدل غفار	261
صادق علی	264
جمال خیر گل	268
خالد عرفان	273

اپنی کتاب

شمس کنول	285
----------	-----

نظم حصہ

مولانا الطاف حسین حالی	307
حالی	310
علامہ اقبال	312
اکبر الہ آبادی	314
مولانا محمد علی جوہر	316
فضالہ آبادی	317
طاہر مراد آبادی	318
جوش ملیح آبادی	319
کنہد ہند رنگہ بیدی سحر	320
نیاز حیدر	323
نشرت خانقاری	324
ثاقب رملامی	325

ناؤس زبانیں
یوگ ایک عبارت

ہندستانی معیشت
علاقائی زبان اور سلمان
قول و فعل کی بد اعمالیاں
اس زہر بھری دنیا میں
مسلمانوں کے معاشی مسائل
مسلم نوجوانوں کا ایسہ
گہری اور مضبوط بنیادیں

کوئی شے مستقل نہیں

مدد جدر اسلام
نظم
ساقی نامہ
نظم
نظم
نظم
صدائے خاقون
پیران سالوس
پاکستانی عوام سے خطاب
مولوی
اشعار سفر میں
خطاب

مَعاشرتی مَضامین

جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ	329	کے۔ ایم۔ یوسف
مسلمانان ہند کا قریبوں کا جائزہ	334	عزیز الرحمن جاسمی
تاریخ ہندستان	341	مگن
مسلم نیو ہار	344	کرار جیسی
ہندستانی مسلمان اور سنی	349	اے۔ حلیم
مسلمان اور حراج	358	نخاجہ عبدل غفور
ہندستان میں خبر رسائی	359	نونا امداد صابری
دنیا کے مسلم ممالک	369	مگن
اردو کے آٹھ سو برس	372	مگن
مسلم قیادت	380	مگن

سوانحی خاکے

80 مسلم بزرگوں کے سوانحی خاکے	387	مگن
-------------------------------	-----	-----

نشانِ راہ

90 استفسارات و جوابات	437	جیوتی
-----------------------	-----	-------

تحریکیں و جماعتیں

مسلم سیاسی تحریکیں و مذہبی جماعتیں	471	مگن
------------------------------------	-----	-----

دانش گدے

مدد سے لائبریریاں و اخبارات	485	مگن
-----------------------------	-----	-----

تجدیدیں و تقدیریں

کلاسیکی تحریروں و تقریروں کے اقتباسات	525	مگن
---------------------------------------	-----	-----

سورج بھی تماشائی

تیسرہ فلم گرم ہوا	555	فلک پیا
-------------------	-----	---------

مگن نما

مگن کا بارہ سالہ جائزہ	563	عبدل غفار
------------------------	-----	-----------

مقام اشاعت : 5 واٹ فلور، سوہ پبلشرز

132- کالمیہ کراٹر پبلشرز، ممبئی

مالک، پرنٹر و پبلیشرز: شمس کنول

ایک پرچا : 150 بارہ پرچے : 18-00

ہندستان کے مسلمانانہ نمبر : 15-00

مطبوعہ : آج لٹریچر ہاؤس، ممبئی

ہندستان کی مٹھائیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں

(اور)

عثمان سلیمان مٹھا والا

مٹھائیاں سارے ہندوستان میں پسند کی جاتی ہیں

مذہبی تقریبات، تہواروں، دعوتوں پارٹیوں اور

نہایت قابل اعتماد مٹھائیوں کے لئے یہ پتہ

67۔ کینڈل روڈ، درگاہ کے سامنے، ممبئی۔ 400016

مری جاگ

سترا والا

برقہ کے ایگزٹ ڈیشنگ، اسٹیل اور لوہے کا سامان بنانے والے

اور ہر اقسام کی دھات کی چادروں کا کام کرنے والے۔

— آفس و فیکٹری —

20۔ ڈاکٹریوزیز روڈ، مہالکشی، ممبئی 400011

TINSMITH : نام

فون: 377444

دواخانہ ایک
دوائیں بے شمار

حم دم دواخانہ

مقامی مریضوں کے لئے
طبی مشورہ مفت

ہندستان کے مستند دواخانوں کے قابل اعتماد یونانی دواؤں کے مرکز

159۔ ہارون منزل، بھنڈی بازار تاکہ، سکسٹی۔ 400003

نیک خواہشات

گگن کے ایک ہی خواہ کی جانب

سے

ہنگ کانٹسٹانی مسلمان نمبر

کس مینہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خالص کا!

حسن اور دولت دونوں دل کش چیزیں ہیں اور انسان کو حوصلہ بخشتی ہیں مگر وہ احساسِ نگر سخت لگن، سوکھا، ہڑا، پال دیر نہ تھا جہاں میں نے بار بار بس پہلے لگن کی بنیاد رکھی تھی اور بنیاد رکھنے میں متحد، یکم اور یکسر جیسے دوستوں نے میرا ہاتھ پکڑا تھا، ہمت تھی، نظر کے سلسلے میں نہیں تھا، ایک آدھش تھا، حبیب میں دولت نہیں تھی، دل میں ایک لگن تھی جہاں پہل اور کج کے درمیان کا فاصلہ ناپنے بیٹھتا ہوں تو مجھے خد تعجب ہوتا ہے۔
مگر کو بھی خد تعجب نہیں شوق نے کیسے طے کیے غم کے ہزار مرحلے، بحر کی ایک رات میں

در اصل محض دولت کا فی نہیں بل کہ شوق ہو، چکا ہو، لگن ہو اور ڈرپ ہو یعنی وسائل سے زیادہ دلوں تب کوئی کام اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔
یہ احساسِ نگر سے کلیاں میں منتقل ہونا، لگن کی کامیابی کا پہلا قدم تھا مگر میں غریب وطن کلیاں کے گرد و غبار میں دب کر رہ جاتا اگر غلامِ مسطفا ناکی رہ کر بکٹِ عظیم آدین رو ہے اور شیخِ اقبال ہے مینر بان مفت اور شریف نفس دوستوں نے میرے شن سے اتفاق کرتے ہوئے میری زندگی کو سہولت نہ بخشی ہوئی۔
سبکی میں میری زندگی کا ثبوت تھی۔

اٹھا سکے نہیں سہ آساں سے غضب ہے بارہنیت پاساں کا
کہنے کو تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ لگن، کامیابی، ہندوستانی مسلمان بھروسے ہوئے پچھلے بار بار بس کی جدوجہد کا دکاوش کا پوٹ ہے، مگر نہیں، حقیقت یہ ہے کہ لگن، اور لگن کا یہ کام نہ نیلے نہ سڑا، اب ہم انصاری بی کام، خان فضل کریم مرزا، رامانند ساگر، ڈاکٹر مسعود آہ، شاہد علی خاں، حمید چٹھان، ریاض خان، فضل احمد، انور اشفاق، حسین اکری، پرتیش بھلا، ایچ ایچ خان، لاج پتہ لے، شبیر احمد راہی، ایس ایم ساگر، روشن لال، ڈوہیلر، بونس کا سکر، فرید بھو لیا دی، خالد عرفان اور اورنگزادہ کا جی جہانہ والا کی اس اعانت، حمایت، قوت اور توانائی کا خوش گوار نتیجہ ہے جو مجھ کو مسلسل حاصل رہی ہے۔
اردو رسالوں کو جو لوگ پامال کر رہے ہیں ان میں رسائلِ فروش (نوبل ایجنٹ) پیش پیش ہیں، اردو دنیا کے نواسے فی صدی ایجنٹ اخبارات ناہیندہ، خیانتی، بددیانت اور بدحوالہ میں گلاس ایک فی صدی میں تین نام وہ ہیں جو ابتداء ہی سے مجھے اپنا معترف بنائے ہوئے ہیں یہی تھیں حسین خاں (کلکتا) کلیم بک ڈپو (جھکاباد) اور محض ایک لکھنؤ (کلیکتا) جن کی دیانت داری اور معاملے کی سچائی کی میں قسم کھا سکتا ہوں ابتداء ہی سے ان تینوں خوش دہندہ ایجنٹوں کا لگن، کوئی تعادل حاصل نہ ہوا اور اسی طرح لگن کے مستقل مشہرین میں طیب بھائی (حامی اینڈ کو) اور برادران عیسا خان اور موسا خان (بھارت ٹوٹرا سکول) کے نام سر فرست ہیں ان دونوں اداروں کی لگن کو نوازی ناقابلِ فراموش رہے گی۔
نہ پوچھ میں کھنیا کر میری دنیا میں خدا قاتاب بھی فتنہ ہے آفتاب نہیں

ذہنی دیانت داری اور اپنے نصیب بھی پر ایمان ہی ایک ظلم کا رگوان وقت اور زمانہ ساز ہونے سے بچاتا ہے۔ قدرت کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابتداء سے آج تک میرا نظر کبھی نہیں بدلا اور میرا ایمان کبھی ستر لول نہیں ہوا۔ دولت کا لالچ یا جان کا ڈر انسان کو مصیبت شناس اور بزدل بنا دیتا ہے مگر میں نے آنکھ کھلی نہیں کھلی، اپنے ظلم کے مدد کو نہیں مولا اور غراپتی دنیا نہیں بنائی۔ یہ جانتے کے باوجود کہ جس فرستے سے میں مخاطب

ہوں اس کا مزاج ہی کچھ اسی ہے میں نے کلمہ باطل کی تائید کبھی نہیں کی بل کہ میری ہر قدم پاؤں پر ٹھیکوں، سوختوں اور عالمی بھائی چاہے کی حمایت کرتا آیا ہوں۔ چل کر بڑوں کا دین کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا رہا ہے اور میں آج کے انسان کے دودھ دیکھ کر کی پوری ترجیحی کرتا رہا ہوں اس لئے مجھے اعتراف ہے کہ میری تنقید کے نشتر نے گہرے زخم ڈالے ہیں، مگر علاج دوائے تلخ تو برکت ہے جوئے ریش کی پسند کو ملحوظ نہیں رکھتا۔

انہیں پھر دل چاہے اگر آسکو تو آؤ مہرے گھر کے رستے میں کوئی کمکشانی نہیں ہے

تقدیر و احتساب کا فرض انجام دینا میری عادت ہے اور اس عادت کی بنا پر میں نے بہتوں کو پلایا ہے اور بہتوں کو کھو رہا ہے۔ جوئی کے معتد فیصلی محل نے ایک بار کہا تھا، میں جب بھی ایک پورٹریٹ تیار کرتا ہوں ایک دوست سے محرم ہو جاتا ہوں، مگر میں نے کبھی کسی کی خوش نوکی پانٹا رنگی کی کبھی پردائیں نہ کیں۔ یہاں تک کہ میں نے محبت کش، بھی ثابت ہوا اور میرے کئی محسنوں نے مجھ سے جواب بھی طلب کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کو انسان پر آقا نہ صرف کہنے میں جولوٹ آتا ہے وہ اور کسی بات میں نہیں آتا، انسان چاہتا ہے کہ سامنے کا انسان اتنا مجبور ہو جائے کہ وہ اپنا تمام من مہل اس کی نذر کر دے لیکن ہزار ہزار نفرات بندہ کہہ جاتے ہیں کہ وہ پہلے سے منہ بھی نہیں کھولے گا۔ غرض کہ ممکن، کتنے جوئے اسے آگتا دلوں کی پھاؤں لگی تو اسے پتے پتے ہنسنے شروع سے بھی واسطہ پڑے گا۔

مجھے اس حقیقت کا احساس بھی ہے مادہ اخلاقیات بھی کہ میرے ذرائع اور وسائل بہت تنگ اور محدود ہیں مگر یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بات یہ ہے کہ میں کسی کی انگلی پر کڑکھیں نہیں چلا، میں نے اپنی راہ الگ نکالی ہے اس لئے میں کسی دوسرے طبقے میں داخل ہی نہیں ہو سکتا دراصل منفرد راہ پر چلنے والے کو گردہ بندی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ جس طرح میں اپنا نام نہاد آپ ہوں، اسی طرح ممکن، کو بھی میں نے نہ کسی انسان کے پیچھے چلایا اور نہ کسی قصص کے پیچھے بل کہ اور کچھ بھی بنا کر پیش کیا ہے

دیکھنا آپ کھڑے ہوئے ہم اپنے بل پر غیر سے چارہ نوازی کا آفاقی گلیا!

یہ تو ظاہر ہے کہ اس وادی کے رہنوردوں کے حصے میں پھر زیادہ بھول کم آتے ہیں شاید اسی لئے جس کا بھ کو قلع ہے) میرے اکثر دوستوں اور بزرگ رشتے داروں نے میری فکر و نظر کی اس روش کو دنیا دہی کے اعتبار سے خسارے کا سودا قرار دیتے ہوئے مجھ کو مصلحت پسند بننے اور دولت پسند بن جانے کا شور و دیا ہے اور مجھے خشی ہے کہ میں نے ان کے کسی ایسے شور سے براہِ یک عمل نہیں کیا۔

پچھلے بار برس سے مگن، تلے میں جی سب کچھ کتا آ رہا تھا۔ سوچا کہ ایک منجم شافیت خاص کی صورت میں مختلف نظریات و خیالات کے مضامین پیش کئے جائیں تاکہ تنوع میں نئی بات دریافت ہو سکے، یہ تو یہ ہے کہ بزرگ کا اعلان کرتے وقت مجھاس کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کتنے بڑے کام کو بات میں لے رہا ہوں۔ لیکن کی قائم کر رہا دیت، معیار اور مگن، کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے بلند پایہ مصوٰف اور مستند مصلوں سے ان کے نظریات کے مین مطابق ان کے مضامین کے لئے گزارش کی۔ اور اب مجھے یہ کہتے ہوئے نصیحتیں اپنے آپ پر اور اپنے مشن پر فخر محسوس ہو رہا ہے کہ مگن، ان بزرگ قلم کاروں کی نظیر التفات کا ریح بنا کہ مجھ کی ذات کو نور ہدایت کہا جاسکتا ہے، سبھی مضمون نگار حضرات کا تعاون مجھ کو میری توقع سے زیادہ حاصل ہوا۔ موضوع کی نزاکت کے اعتبار سے اس نمبر میں لکھنے والوں کا ایک جا ہوتا ہے ضد بین ہے۔ چنانچہ ہر کتاب فکر کے نمائندوں کو اس طرح پہلے شاید ہی کسی اور درجہ سے لے آکھایا ہو۔

پہلوں نے کہا تھا: کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کی عورتیں روشن خیال نہ بن جائیں، یہ زیر نظر نمبر میں خواتین قلم کاروں نے بھی خاص حصہ لیا ہے اور خشی اس بات کی ہے کہ انہوں نے جن کے پیچھے سے باتیں نہیں کہیں بل کہ مردانے میں آکر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے آجکل کو پرچم بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس نئی تعاون پر میں مضمون نگار حضرات کا دلی طور پر شکر گزار ہوں۔

مرسید نے علی گڑھ کالج کے چندے کے سلسلے میں ایک بار اپنے ”تہذیب ال اخلاق“ میں لکھا تھا:-

توی پھلائی کے چاہنے والوں نے بھنا چیر ماس قدر بھروسا کیا کہ لاکھوں روپے چند بچے دے دیا
 نہ کبھی کسی نے پوچھا اور نہ جانا کہ روپیہ جو دیتے ہیں کہاں جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ اپنی تمام زندگی میں
 کسی امر میں اس قدر فخر نہیں کر سکتا جس قدر کہ اس اعتماد اور طمانیت پر فخر کرتا ہوں جو میری قوم اور
 غیر قوم کے بزرگوں نے بھریا۔“

یہاں بات لاکھوں کی تو نہیں مگر ہزاروں کی ضرور ہے، اور مجھے بھی فخر بھی ہے اور خوشی بھی کہ اس نمبر کے اکثر مشہرین نے یہ جانتے
 ہوئے کہ میں ایک اردو رسالے کا اڈیٹر و مالک ہوں (اپنا بل پیشگی ادا کر دیا۔ یہ اقدام جو مشہورین حضرات نے مجھ پر کیا اس کے لئے مجھے
 بڑی خفی محسوس ہو رہا ہے۔

دہلی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ دوسرے شہروں کی وہ نمائی کی ہے چنانچہ دہلی سے جناب سردار تونسوی، جناب حافظ
 یوسف دہلوی، جناب ناخدا دہلوی، جناب دیوان آمنت کار، جناب شمیم احمد شمیم، جناب افسر عثمید، اور بیٹی سے جناب
 سی ایل کاوش، پی این ریگن، محمد اشفاق بٹ اور جناب آئی این کمار کا تعاون اگر مجھے حاصل نہ ہوتا تو اس نمبر کی اشاعت ممکن
 دھبی۔ خیالات کو شکل و صورت بخشنے کا ہم رول ان خوش نویسوں نے انجام دیا جن کا تعاون جناب غلامش جعفری کی عنایت و توسط سے مجھ کو
 حاصل ہوا۔ جب کہ جناب سردار عرفان نے صفحات (ضمنی سرورق) کو سجایا اور پھر اس طرح نمبر کو اکب و تاب ملی۔ میں تمام خوش نویس
 حضرات کا اور خصوصی طور پر سردار عرفان صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس سلسلے میں اپنے ان تین ساتھیوں کا ذکر بھی میں ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے لیکن، کو اپنا پرچا بکھلا ہے اور اس نمبر کی تیاری
 میں بڑی مہارت بٹایا ہے یعنی صادق علی، عبدل غفار اور انور قمر نے وقت کی قید کو توڑ کر دن رات میرے ساتھ کام کیا ہے اور اس نمبر کے
 سلسلے میں وہ ابتداء سے اختتام تک میرا ہاتھ نہ رہے ہیں۔ یہ تینوں خوش نفس خوش فکر نوجوان قلم کار ہیں اور راہ زندگی کے نئے مسافر
 ہیں اس لئے شکریے سے زیادہ شاباشی کے مستحق ہیں۔

غالب نے قباب رام پور کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا: ”گو زمانہ اور آسمان مل کر کیا ہی مخالف ہو مگر میں حضور عالی کی دوستی کی بدولت
 زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے قانع“۔ غالب اپنے ایک چاہنے والے کے بل بوتے پر بے فکر تھے اور قانع بھی
 میرے چاہنے والوں اور قدردانوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے اس لئے میں اپنے اور لیکن کے سلسلے میں اور بھی زیادہ مطمئن ہوں
 مگر جہاں تک لیکن کے مشن کا تعلق ہے تو کعبہ مقصود ابھی دور ہے اس لئے ۵

خاطر تو تم نے آج بہت کی مگر حضور
 کل پھر بھی منگاہ یہی گفت گو رہے

لیکن ”زندہ محبت باقی
 ادب، احترام اور پیار کے ساتھ۔“

نیاز کار
 شمس کنولہ

اور بھی زیادہ دلکاش قومی بچتوں پر سود کی شرحوں میں مزید اضافہ

سالانہ ٹیکس سے مستثنیٰ 5%
ٹیکس سے مستثنیٰ 6%
10.25%

8%
8.5%
9%
10%
9.25%
6.25%
7%

ڈاک گھریلو سٹیونگ بینک
نیشنل سٹیونگ سٹریٹجکٹ (دوسرا اہر تیسرا اجراء)
نیشنل سٹیونگ سٹریٹجکٹ (چوتھا اور پانچواں اجراء)
ڈاک گھریلو بچت کے لئے:

- 1- سالہ
- 2- سار
- 3- سار
- 5- سالہ
- 5- سالہ ڈاک گھریلو سٹیونگ کے لئے
- 10- سالہ ڈاک گھریلو سٹیونگ کے لئے
- 15- سالہ بینک پرائیویٹ فنڈ کے لئے

* دوہرا نامہ — ٹیکس میں رعایت کے مستحق اور سود بھی ٹیکس سے مستثنیٰ۔
23 جولائی 1974ء سے پہلے جاری کئے گئے نیشنل سٹیونگ سٹریٹجکٹوں اور میعاد پوریاپارٹ
کھانوں میں جمع شدہ رقم پر بھی 23 جولائی 1974ء سے شروع ہونے والی
مدت کے لئے بڑھی ہوئی شرح پر سود ملے گا۔
دوسری اسکیموں پر ملنے والے سود کی رقم 3,000 روپے سالانہ تک، دیگر مخصوص اسکیموں کے تحت
ملنے والے سود کے ساتھ ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔
آج ہی بچت کریں۔ زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔

قومی بچت —
پوسٹ بکس 96، ناگپور

DAVP

ایک صاحب اپنے کمرے کی کھڑکیوں پرچی ہوئی برف کھڑچ رہے تھے
مگر کھڑکیوں کے شیشے صاف نہیں ہو پاتے تھے
ایک راہ گیر نے سمجھایا:
”کمرے کے اندر جاؤ،
کمرہ گرم کرو
باہر کی برف خود بخود صاف ہو جائے گی“

جن کو سب سے اچھا ہونا چاہیے تھا،
وہ سب سے بُرے ہیں
دوسرے بگڑتے ہیں تو سنو رتے بھی ہیں
مگر مسلمان بگڑا کر
سنو رنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

اس ساری خسروابی کا سبب صرف یہ ہے
کہ مسلمانوں نے ہمیشہ بندوں کے حق پر
حق اللہ کو ترجیح دی ہے
جب کہ نماز روزہ محسوسات میں سے ہیں،
عبادت نیکی نہیں ہے
رات دن محنت کر کے اپنی روزی آپ کسانا
شاہ درغایا، امیر و غریب، آقا و غلام کے امتیاز کو مٹا دینا
نیکی ہے
اور خدمتِ خلق، حسنِ سلوک اور انسان دوستی
عبادت ہے
امیر و غریب کا امتیاز قائم رکھ کے۔
نیکیاں مشتبہ اور گناہ یقینی ہو جاتے ہیں
مسلمان اپنے آپ پر احسان کریں
اگر وہ مسجد میں چسپوارہ جلانے سے پہلے
اپنے دل روشن کر لیں!



کونل کھلے دھرتی ہنسی گونج اٹھے نرسال

ہنگی اجالا دیکھ کے جاگے جاگے لال:

نیا ہوتا

ہلکے کا مندرستانی مسلمان نمبر

بھارت کے آئین کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم چوکس رہنے کا عہد کریں

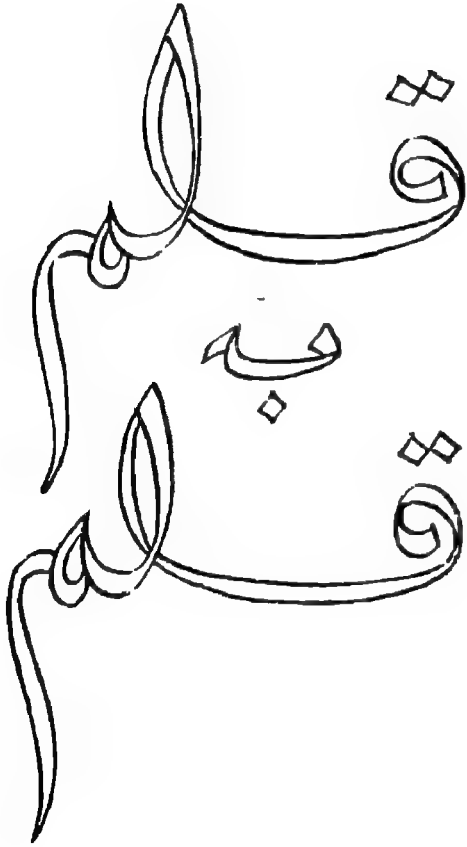
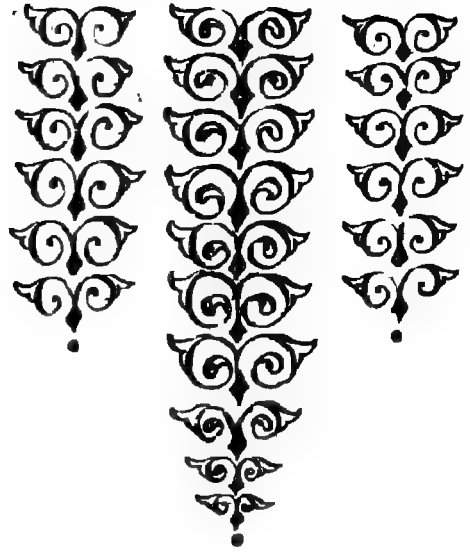
اپنے آئین کے ذریعہ ہم نے زندگی کا ایک خاص راستہ چنا ہے۔ یہ ہے پارلیمانی جمہوریت کا راستہ جس پر چل کر ہم اپنے دیش میں سب کے لئے سیاسی، معاشی اور سماجی انصاف کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہی کچھ لوگ جنہیں یہ طرز زندگی پسند نہیں، اس پر وار کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں چاہتے کہ اس راستے پر چل کر ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ بلکہ وہ تو اس طرز زندگی کو سرے سے ختم ہی کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا راستہ کچھ اور ہی ہے۔

انتشار، بربادی، اور دوسروں پر کچھ اچھلنے اور دیش میں فاشنزم لانے کا راستہ۔

آئیے ہم ایسے لوگوں سے خبردار رہیں

آزادی اور جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر دم پر کس رہنا لازمی ہے

دیکھئے! آئین پر آنچ نہ آئے



تم بھی ٹک دیکھو تو صاحبِ نظران ہے کہ نہیں !

زاتی رابطہ والی بینکنگ

عملی کوآپریٹو بینکنگ

بینکنگ سے متعلق عوام کی جملہ ضروریات کو پورا کرتا ہے

مندرجہ ذیل مفادات کی ہر ممکن مدد

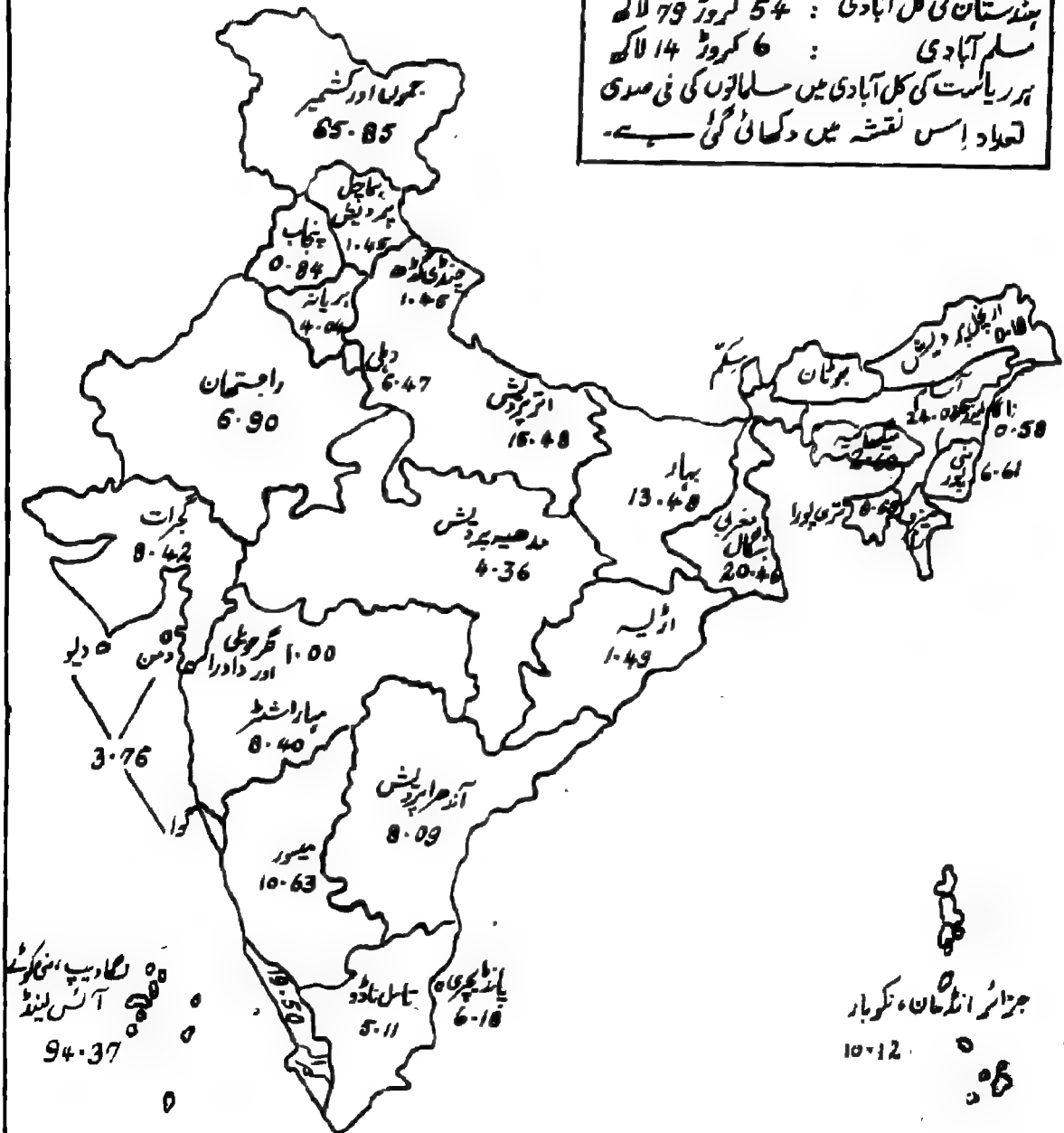
- (1) اسماء اسکیل انڈسٹریز (چھوٹے پیمانے کی صنعتیں)
- (2) پروفیشنل (پیشہ ور اور مستقل کاریگر)
- (3) ریڈیلرز (چھوٹے دوکان دار)
- (4) ہاؤسنگ پروجیکٹس (مکانوں کی تعمیر کے منصوبے)

(شہر کے گنجان علاقے میں)۔

53۔ حاجی محل، محمد علی روڈ، بمبئی۔ 400003

ہندوستانی مسلمان

ہندوستان کی کل آبادی : 54 کروڑ 79 لاکھ
مسلم آبادی : 6 کروڑ 14 لاکھ
ہر ریاست کی کل آبادی میں مسلمانوں کی فی صدی
تعداد اس نقشہ میں دکھائی گئی ہے۔



اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

(اور)

آپ کا یہ شوق راجد ہائی کی مقبول ترین عوامی لائبریری

دیال سنگھ پبلک لائبریری میں

بطریق احسن پورا ہو سکتا ہے۔ جہاں اردو۔ ہندی۔ پنجابی اور انگریزی کی
بزار ہا کتابیں ہر موضوع پر آپ کے ذوق مطالعہ کی سیر کی لئے موجود
ہیں اور بغیر کسی نقد معاوضہ کے آپ صبح دس بجے سے شام کے پانچ
بجے تک اپنی پسند کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اردو۔ ہندی اور انگریزی
کے مشہور روزنامے۔ ہفت روزے اور ماہنامے بھی لائبریری میں
منگائے جاتے ہیں۔

دیال سنگھ پبلک لائبریری
ٹرسٹ سوسائٹی

داؤد ابونیر۔ نئی دہلی

انوار اور کسری تعطیلات کے روز
لائبریری بند رہتی ہے

اسلامی قانون متعلق نئے رجحانات

کا کہنا ہے۔ ”شادی کے دو اہم کام ہوتے ہیں یہ معاشرے کا بنایا ہوا وہ قانون ہے جس کے ذریعہ دو مختلف جنسوں کے درمیان رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اور پھر اسی کے ذریعہ قوم اور کچن کے رشتوں کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔“

کیونکہ فرقہ کے مطابق ”شادی کا بنیادی مقصد افزائش نسل اور تسلیم و توثیق ہے اور ثانوی مقصد امداد باہمی اور جنسی خواہش کا تدارک ہے، شادی ایک دوزخا معاہدہ ہے، جس کے ذریعہ ایک مرد اور ایک عورت مستقل طور پر آپس میں کچھ لیتے ہیں اور کچھ دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے جسم پر کچھ غیر معمولی حقوق رکھتے ہیں اور پھر اس تہذیبی طور پر نسل بڑھتی ہے۔“

لیکن آج کے دور میں ایک تیسرا نکتہ بھی پیدا کیا گیا ہے اور وہ عامی اہمیت کا حامل بھی ہے، بہت ہی ذہین

(J. H. J. 1957) جو اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ شادی میں سب سے زیادہ دھیان میں رکھنے والی بات آپس میں میل جول ہوتی ہے جس سے ایک دوسرے کا ساتھ ایک لمبے عرصے تک بنا بنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ آج جب کوئی بیس سال لڑکا لڑکی جوڑا ازدواجی زندگی کے بارے میں غور کرتا ہے تو بچہ کی کافی طبی ترقی کی وجہ سے اسے کافی لمبے عرصے تک ساتھ بنا بنانا پڑتا ہے جس سے دونوں ہی غیر معمولی بوجھ سے دب جاتے ہیں اور بے پناہ ممکنات کا شکار بنتے ہیں۔ اس بات کو یوں مختصر کیا جاسکتا ہے کہ شادی ہے۔ عام طور پر دو خاندانوں یا دو

جب بھی میں نے شادی کو ایک ادارہ یا تنظیم سمجھا ہے تو ایک فرانسیسی اور ب کی کہی ہوئی یہ بات مجھ کو یاد آگئی ہے۔ ”شادی کے رسم و رواج پوری دنیا میں مختلف ہیں مگر اس کے بعد کے تمام اعمال بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔“

اسلام میں شادی کے موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے میں عام انسانی شادی پر ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ با قبل از تاریخ شادی سے متعلق ہمیں ذرا بھی علم نہیں ہے۔ لیکن تمام محققین کا یہ خیال ہے کہ شادی کے نام پر انسان کو چند محدود فرائض میں بانڈھ دیا جاتا تھا اور پھر جلد ہی ایک عورت سے مستقل تعلق رکھنے کا رجحان عام ہو گیا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ یہ آتی ہے کہ دیکھ جائے اور وہی بہ نسبت انسانی بچہ بلوغت حاصل کرنے میں سب سے زیادہ وقت لیتا ہے۔ اور اگر اس کے والدین اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنا چاہیں تو یہ کافی احتیاط طلب بات ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں عام طور پر 18 سال کی عمر میں بلوغت آجاتی ہے جبکہ انگلینڈ میں 12 سال میں۔ ابتدائی اسلام میں جب معاشرہ کافی ترقی یافتہ تھا، بلوغی عرصہ بھی مختصر تھا۔ 15 سال درج ہو جاتا تھا۔ بلوغی عرصہ 12 سال کو بھی موزوں سمجھا گیا ہے۔

میرے خیال میں شادی کے دو اہم مقصد ہوتے ہیں اول بچوں کی پرورش اور نشوونما۔ دوم ایک گھر کی بنیاد ڈالنا۔ (J. H. J. 1957)

فرتوں میں رشتہ داری کا سبب بنتی ہے۔ ۲۔ (یہی خاص گندلسبر کے لئے مالی طور پر مددگار ہوتی ہے۔ ۳۔ دو فرد کی ذہنی طور پر ترقی کا باعث بنتی ہے۔ ۴۔ مذہبی طور پر روحانی اور ذہنی نشوونما کا بھی موجب بنتی ہے۔

قیلے کے اندر ہی شادی کرنے کا رجحان بھی عام ہو سکتا ہے جیسا کہ قدیم ہندو تہذیب میں گوت وواہ کا رواج تھا۔ عرب اہل میں یا افریقہ کے ایک قبیلے سائی میں یا برائی، پیر وادہ قدیم مصر میں جہاں بادشا صرف اپنی بہن سے ہی شادی کر سکتا تھا، عربوں میں باپ کے بھائی کی لڑکی نہ تلم، کے ساتھ شادی کرنا بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ عربوں میں یہ رشتہ عام تھا لیکن اب شریک حیات کافی تیزی سے بگڑ رہی ہے

قدیم ہندو تہذیب میں اس رواج پر بہت سختی سے عمل ہوتا تھا کہ صرف ایک خاص طبقے میں شادی ہو، مذہبی بنیاد کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ خاص طور پر فرقہ کو۔

جبکہ دوسری جانب کچھ فرقے (ازدواج خارجی پر عمل کرتے تھے یعنی اپنے حلقے سے باہر ہی شادی کرتے تھے۔ یہ شاید ماہرینِ علم اور انسانی (Orthodox) کے ساتھ ساتھ وکیلوں کے لئے بھی کافی دل چسپی کا سبب بن سکتی ہیں جنہاں پر شادی کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ۱۔ ایک زوجگی (ایک مرد ایک عورت) ۲۔ چند زوجگی (ایک مرد کئی عورتیں) ۳۔ چند شوہری (ایک عورت کئی مرد) ۴۔ گروپ شادی جس میں مردوں کا ایک گروپ عورتوں کے ایک گروپ سے شادی کرتا ہے۔ جہاں تک قسم چارم کا تعلق ہے تو اس کی مثال اتنی کم ہے کہ اس پر بحث نہ کرنا ہی فائدہ مند ہوگا۔ اور قسم سوم کا وجود صرف بت کے چند فرتوں اور توڑوں میں ملتا ہے۔ چند شوہری شادی کا مکمل طور پر ضائع ہو چکا ہے۔ اور پھر نہ کہ ہماری بحث سے مکمل مختلف ہے۔ اب صرف یک زوجگی اور چند زوجگی کے کئے رہ جاتے ہیں جن پر اب ہم اپنا پورا دھیان دیں گے۔

یلت فرو جگتے۔ ۱۔ ہندوستان میں اب ہندو، عیسائی، سکھ، پارسی اور یہودی یک زوجیت پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان بھی چند معروف حدود میں چند زوجگی پر عمل پیرا ہیں۔ پہلے ہندوؤں میں چند زوجگی کی اجازت تھی۔ لیکن حالیہ میں قانون کو بدل دیا گیا۔ اور اب قانون ان کو ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا

قدیم ہندو نامے (The old testament) کی رو سے یہودیوں کو چند زوجگی کی مکمل اجازت تھی۔ لیکن گذشتہ تیس سو سالوں سے ان کا نقطہ بدلا ہوا ہے۔ اگر ہم تاریخی حقائق کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جدید دنیا میں یک زوجگی حاصل عیسائی کیساؤں کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اور کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ہی یک زوجگی کو خلاف قانون عمل سمجھتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ فقہ طور پر کیتھولک فرقے کی تعلیم کا ذکر کر دیا جائے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ کس طرح عام قانون اس سے متاثر ہوا ہے۔

عیسائیت میں شادی ایک تسلیم شدہ تعلیم ہے۔ *Canon Law* عنوان کے تحت انجیل مقدس (1-28) میں کہا گیا ہے: "کسی بھی قانون کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو اس کے فطری اور اصل حقوق سے سیدخل کر دے۔ اور خدا کے بنائے ہوئے قانون میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا حق رکھتا ہے۔"

کنوار پی اور باعزت ہونا بہت اچھی صفت سمجھی جاتی ہے اور عیسائیت کے تحت روح کی توانائی کیلئے بھی اس کے علاوہ کسی دیگر کی تعلیم خاص طور پر دی گئی ہے۔ "ہر مرد اپنی ہی عورت رکھے، اور ہر عورت کا رہنما شوہر ہو۔" عیسائیت میں شادی جو خاص طور پر شوہر اور بیوی کی محبت کا مظہر و عہدہ ہوتا ہے وہ یک بنیادی خصوصیت رکھتی ہے یعنی وہ دو جہان ایک قالب ہوتے ہیں۔ عیسائی شادی کی رسم کے میں نہایت اہمیت ہے یہیں شوہر کہتا ہے۔ "میں (مارٹن) تمہیں (میری بیوی کی حیثیت سے قبول کرتا ہوں) آج آج کے عہد اچھے اور برے میں" امیری اور فوری میں بیماری و صحت کی حالت میں، محبت اور پردوش کیلئے، موت آنے تک، خدا کے حکم کے مطابق، میں اس کو حاضر و ناظر جان کر سہائی کے ساتھ عہدہ کرتا ہوں۔" بیوی بھی یہی عہدہ کرتی ہے اور ان الفاظ کا اضافہ بھی کرتی ہے۔ "..... محبت اور حکم ماننے کیلئے، موت آنے تک....." والاخر۔ "اس انگوٹھی کے ذریعہ میں تم سے شادی کرتا ہوں" میں اپنے جسم سے تمہاری عبادت کر دوں گا، اور دنیا کے سارے مال و متاع....."

آپ یقیناً میری اس بات سے یہی طرح متفق ہوں گے کہ ایک ہر جوش اور جذبات انگیز بنیاد ہے اور پھر آمیز عہدہ ہے

انگلش عدالتی قانون اس کی مکمل طور پر عکاسی کرتا ہے شٹن وٹ کاؤنٹ ریڈنگ (Viscount Reading) کا کہنا ہے، "انگلش قانون کے مطابق اور جیسا کہ عام ایسائی حکومتوں میں مانا جاتا ہے۔"

Hyde v/s Judge Ordinary (Lord Penzance) نے Hyde and Woodmansee میں شادی کی جو تعریف کی ہے وہ ہے "ایک عورت اور ایک مرد کی زندگی بھر کا رضامندانہ اعتقاد، جو دوسروں سے بالکل غیر متعلق ہو"۔ اصل شادی کا مقصد یہی ایک زندگی اور ۲۰ پائے دہری ہے۔ دونوں ہی منفی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ (مثلاً) اسلامی اثرات کے تحت Code (مصلحت side) کے مطابق تیسرے صدی میں اور سوہویں اور تیسرے صدی عیسوی میں بھی اسپین کے عیسائیوں میں ہمیشہ رکھنے کا رواج تھا، لیکن اس استثناء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسائیت میں نہ چند زوجگی اور نہ چند شوہریت ہی کی کبھی تائید کی گئی چند زوجگی اور آشنائی دونوں ہی عربوں، یہودیوں اور غیر خدا پرست میں کالی دونوں سے رائج تھی۔ کیتھولک چرچ کے مطابق شادی کے تین فائدے ہیں۔ ۱۔ علم و نشوونما کی بہتری کیلئے ۲۔ فرماں برداری و اعتماد (شاہی میں کئے ہوئے وعدے کا پابند رہنا)۔ ۳۔ حلف برداری۔ (چرچ میں خدا کے سامنے حلف لینا)۔

یہ تشریح ضروری ہے کہ حلف برداری ایک عہد نامے کی صورت میں ہوتی ہے، مذہب کے دائرے میں انسانی عہد نامے کی طرح ہوتی ہے خدا کے سامنے ایک خفیہ اندرونی اور روحانی مضبوطی کا باعث بنتی ہے۔

یہ تو کئی کیسائی شادی، لیکن ہمیں جربرار کے سامنے کی گئی شادی کا بھی مطالعہ کرنا ہے۔ سول میرج (Civil Marriage) حاصل ازدواجی زندگی کیلئے ایک عہد نامہ (Marimonial Bond) ہوتا ہے۔ جو ایک سرکاری عہدیدار کے سامنے کیا جاتا ہے۔ اس میں مذہب کا عمل دخل بالکل نہیں ہوتا۔ اور نہ حلف برداری کا ہی کوئی کردار ہوتا۔ اس کا تمنا پہلو ہوتا ہے طلاق کا ممکن ہونا جس کی تائید چرچ کسی بھی صورت میں نہیں کرتا۔ عہد نامے جو شخص مذہب سے بے جبرہ ہیں سول میرج

کر سکتے ہیں۔ وہی قاعدہ اب ہندستان میں سپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء کے تحت عمل درآمد ہے۔

اس ایکٹ میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ مذہبی طریقے سے کی گئی شادی کو بھی جربرار کیا جاسکتا ہے۔ ملک میں موجود مذہبی رسومات سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس قسم کا (اختیاری) قانون فریقین کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ کسی ترقی پذیر معاشرے میں چند زوجگی کو یک زوجگی میں بدلایا جاسکتا ہے شٹن ہندو مذہب کے طریقہ کی شادی اور مسلم نکاح کو قانونی طور پر یک زوجگی میں بدلایا جاسکتا ہے۔ میں نے عیسائی قانون کے تحت شادی کے موضوع پر تفصیل اسلئے پیش کی کہ یورپ میں اور خاص طور پر انگلش قانون میں مذہب کو کافی عمل دخل ہے۔ نہ صرف قبولیت میں بل کہ طلاق دینے کی صورت میں بھی۔ چنانچہ اب یہ بات واضح طور پر سمجھی جاسکتی ہے کہ شادی کے ان بنیادی اصولوں سے جدید دنیا کس طرح فیضیاب ہوئی ہے۔ اور خاص طور پر یونیٹا اور ترکی میں شادی کی جو صورت عمل میں آئی ہے وہ ابتدائی اسلام سے قطعی مختلف ہے اور آج کی جدید دنیا کے طریقے سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔

اسلام میں شادی

اس عنوان کے تحت ہم اسلامی طریقہ شادی 'نکاح' سے متعارف ہوں گے۔ اسلام نے شادی کو سب سے پسندیدہ عمل قرار دیا، ایک ابتدائی معری تفسیر کے مطابق "روایت ہے کہ پیغمبر نے کہا ہے کہ جو میری سنت پر عمل کرنا چاہتے ہوں وہ شادی کریں" قرآن اور حدیث کے ذریعے کہا گیا ہے، "شادی ایک پسندیدہ عمل ہے پیغمبر کا یہ جملہ "لا رھباً فیہ فی الاسلام"۔

(اسلام میں رہبانیت نہیں ہے)۔ علی الاعلان شادی کرنے پر زور دیتا ہے۔ ایک جدید معری مصنف (مفسر) بدان نے شاہ ولی اللہ کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ عیسائیت مجرور زندگی کو پاک عمل قرار دیتی ہے جس سے مذہب کی علاقہ دہوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ ان تمام پیغمبروں کی تعلیم یہ ہے کہ شادی بیک

حضرت شیخ محمد جبریل نے تجویز رکھی کہ جو شخص پہلی بیوی رکھتا

ہے دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ عدالت مطمئن نہ ہو جائے کہ وہ نام شافعی کی تعمین کی ہوتی دو شرطوں کو مکمل طور پر پورا کرے گا۔

۱۔ حقوق کی برابر تقسیم۔ ۲۔ مالی طور پر خد کفیل ہونا۔
 سرکاری کابینہ نے ان اصلاحات کو منظور کر لیا تھا لیکن شام نے اسے ویٹو کر دیا۔ سر میں کیا صورت حال ہے؟ تو معلوم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جب بھی ایسا مبارک موقع آئے گا تسلیم پانہ طبقہ ایسی تبدیلی کو خوش آمدید کہے گا۔

شام میں یہ قاعدہ ہے کہ جب تک عدالت اس بات سے مطمئن نہیں ہو جاتی کہ مرد قرآنی سادات پر عمل کرے گا تب تک اسے دوسری شادی کی اجازت نہیں ملتی۔ یعنی یونیشیا کے قانون کی رو سے چند زوجگی ممنوع ہے۔

مراکش کا مسئلہ Code of Personal Status یونیشین قانون کی بہ نسبت کم سخت ہے۔ اس کیلئے دو شرطیں ہیں۔
 اول۔ پہلی بیوی کی درخواست پر شوہر کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

دوم۔ اگر ایسی شادی عملی جائے تو اس سے پہلی بیوی یہ مسئلہ عدالت کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ اور پھر عدالت شوہر کے اس عمل سے بیوی کو پہنچنے والی تکلیف پر غور کرتی ہے۔
 اسلامی سسٹم میں چند زوجگی کے قانون کو ہمیشہ ہی سے ایک

کم زوری خیال کیا جاتا رہا ہے اور اسی نے میں مختصر طور پر آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک بھرت کی تکلیف کو کم کرنے کیلئے ایک ایشیائی ملک کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں سنگا پور میں گئیں اصلاحات ان کے لئے روشنی کا دینا ثابت ہوں گی، جو ہمارے ملک میں اس قسم کی اصلاحات کرنے کے خواہش مند ہیں چند زوجگی کے جنرل قانون کا بہترین علاج وہ ہے جو سنگا پور کی ایک سوشل ورکر مسز ایم سلج نے کیا۔

قرآن کی آیت (35 سورہ 3) (اور شیخ محمد جبریل دمر، کے متون کی مدد سے انہوں نے (مسر سراج نے) اس بات کو یوں سمجھا کہ قانون چند زوجگی کیلئے دو شرطیں پیش کرتا ہے

کی مدد سے مطابقت رکھتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ چند زوجگی جیسے عام رواج کی شمار عدالتوں کے دیکھ کو کم کرنے کے لئے دوسرے ممالک نے کیا کیا؟ پاکستان میں سن 1961 کے آکٹوبر آرڈیننس کے تحت چند صحت بخش عمل بنائے گئے ہیں۔

کوئی کونسل Arrendation Council سے اجازت لئے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ آرڈیننس کونسل میں تین ممبر ہوتے ہیں، ایک چیئرمین جسے حکومت متعین کرتی ہے اور دو اشخاص دونوں فریقین کی جانب سے۔ عرضی کا طریقہ کار تقریری ہوتا ہے۔ Arrendation Council کونسل کا فیصلہ مدلل ہوتا ہے کونسل تقریری فیصلہ بھی دے سکتی ہے۔ آرڈیننس نے اس سلسلے بات کی دھمکت نہیں کی کہ کیسے اور کن وجوہات کی بنا پر اس کی اجازت دی جاتی ہے؟ میرے خیال میں اس کیلئے شرعی مثالوں کی پیروی کی جاتی ہوگی!

یہ کوئی خاص اطمینان بخش قدم نہیں ہے نہ اس نے ہندوستانی قانون پر کوئی خاص اثر ہی ڈالا ہے۔ لیکن یہ کتنا مشکل ہے کہ اس قانون پر وہاں کس حد تک عمل ہوتا ہے۔ پھر بھی ہندوستان کیلئے ایک نئی راہ ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ مسلم فرد اس جانب متوجہ ہوگا اور اس سلسلے میں ہندوستان میں جلد ہی کچھ اصلاحات کا نفاذ ہوگا۔

شرق وسطیٰ میں صورت حال پھر بھی بہتر ہے۔ کم از کم کچھ ملکوں میں۔ ہم اس قانون کو اس کی تکمیل کے دو شعبوں پر مانتے ہیں۔ اول ترکی اور یونیشیا میں جہاں مکمل ایک زوجگی رائج ہے۔ ترکی میں کمال انقلاب کے بعد سولہ کوڑ کے نفاذ نے ہندو زوجگی کی مکمل طور پر ممانعت کر دی۔ لیکن جیسا کہ قانون سکولر ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح ایک مسلم ملک میں ایک مذہبی قانون کی بجائے اس کا اپنا قانون رائج ہے۔ اگرچہ یونیشیا میں

اسلامی قانون غالب ہے۔ پھر بھی نو Tunisian Law 1957 Personal Status کے ذریعہ چند زوجگی کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

(الف) ایک سابر تائڈ (ب) خرچ کرنے کی طاقت (مالی حالت)۔
انہوں نے پھر یوگوسلاویہ، یوگوسلاویہ، ہونڈو، پاکستان، شام،
یونینیا، عراق کی چند دہائیوں پر کنٹرول رکھنے کی کوششوں
کا ذکر کیا۔ سنگاپور میں سن 1957ء کے بعد ہندو مت پر پابندی لگانے
کی سنجیدگی سے کوششیں کی گئیں۔ بسم آروٹی جس 1957ء نے
ایک چیف قاضی کی ضرورت کا اظہار کیا۔ جو اس بات سے مطمئن ہو کر کہ
حال واقعی ایسی ہے کہ دوسری شادی کرنی چاہیے۔ جیسا کہ ٹریبونل
کو حق ہے کہ وہ ہر پہلو پر غور کرے، اسی نے دوسری شادی
کا حجاج کم ہو گیا۔ ہم آگے دیکھیں گے کہ طایا میں 1967ء کے قانون بن
جانے سے کس طرح طلاقوں کی واردات میں کمی واقع ہوئی ہے !
شوہر کے ذریعہ طلاق

ہندو مت کی حالتوں کا ایک قبیح عمل ہے مگر اسلامی قانون میں
ایک کم زور ترین چیز نہیں ہے۔ بلکہ ایک سوت اور ایک ناخوش
مطلقہ میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو جانے تو مجھے شک ہے کہ شاید
یہ کبھی وہ ایک بات پر تفرق ہو سکیں ایک وکیل اور قانون کے
ایک طالب علم ہونے کے ناتھے مجھے کہنے میں کسی قسم کی جھجک
نہیں ہے کہ ہندوستان کے عدالتوں میں یہ دونوں سب سے
بڑی برائیاں ہیں اور اس سے بھی بڑی بڑے جینڈر ہے کہ ہم
دوسرے ملک شٹن یونینیا، عراق اور سنگاپور سے کچھ سیکھنا
ہی نہیں چاہتے! اکثر اس بات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ شوہر کو طلاق
دینے کا یہ خود حق قانون کا ناقص ترین حصہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو مت میں
ہر کو طلاق دینے کا اسلامی قانون مسلمان عورت کی تکلیف کی
اصل اور بڑی وجہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلم دنیا میں ایسے بھی حصے
موجود ہیں جہاں طلاق ہی واردات بہت ہی کم ہے۔ لیکن باقی دنیا
بکریات ملک ہے۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے تو یقیناً مسلمان
عورت پریشہ طلاق کے ٹکے سے مانتے ہیں۔ رہتی ہے۔ جو ہی نے انسانی
پرستی حق کو مقرر کیا ہے۔ لیکن یہ تو قانونی اثرات کے مقابلے
میں کہ بھی اثر نہیں رہتا ہے۔

سنگاپور کے مسلم آروٹی جس 1957ء نے مسلم شادی کے رجسٹر کی نگرانی
میں ایک شریعت کورٹ کی تشکیل کی ہے۔ یہ شریعت کورٹ خلیفہ
کے متفقہ قانون سے عدالت کی رہنمائی کرتی ہے اور عدالت کے دو
خاص کام ہیں، دونوں فریقین کے درمیان صلح کرانے کی کوشش
کرنا یا طلاق کی اجازت دے دینا!

صلح وہ بڑا ذریعہ ہے جس سے سنگاپور کی عدالت
اور اس کے افسران طلاق کی واردات کو کم کرنے کا موجب بن گئیں۔
عدالت ملی طور سے قرآن کی چوتھی سورت کی 50 ویں آیت پڑھ کر کہتی ہے:
”اور اگر تم کو معلوم ہو کہ کیاں بیوی میں ان فحشہ ہے تو ایک
نصف مرو کے خان دان میں سے“ اور ایک نصف مرو کے خان
دان میں سے مقرر کرو، اور اگر وہ صلح کر ادیتی چاہیں گے، تو خدا ان
میں صلحت پیدا کر دے گا۔۔۔۔۔“

عدالت میں ایک قاضی النفاۃ اور دو ممبران ہوتے ہیں جس
میں ایک عدوت ہوتی ہے۔ اس صلح کے کام کے علاوہ وہ رضاندی
سے عمل میں آتی ہوتی طلاق کو بھی رجسٹر کرتی ہے۔ پہلے تو طلاق کو
دکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر کوشش ناکام ہو جاتی ہے
تو اسے صرف طلاق دینے کی اجازت دینے کا اختیار ہوتا ہے سنگاپور
میں طلاق کی گھنٹی ہوتی شریعت سے ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے
ہیں کہ اس تنظیم کے اس کام کا کتنا اثر ہوتا ہے اور ہوا ہے۔

سن 1957: 7-8 فی صدی - سن 1963: 7-21 فی صدی

سن 1961: 8-21 - سن 1964: 5-17

یہ قابل ذکر ترقی ایک ایسے ایشیائی ملک کا کارنامہ ہے جو نہ ہم
نیاہ تعلیم یافتہ ہے اور نہ زیادہ ترقی یافتہ ہی! اور امید کی جاتی ہے
کہ ہندوستان سمیت دوسرے ملک بھی اس اچھے کام کی تقلید
کریں گے۔

خاتمہ۔ اتنے ٹھوڑے سے وقت میں ان دوسرے سوالات
تک جانا ناممکن ہی ہے جو مضمون کی ضرورت میں میرے ذہن میں
تھے۔ لیکن میں ان خاص خاص نکاتوں کی جانب اشارہ کرتا چلوں
جن کی اصلاحات کرنا آج کے ہندوستان میں بہت ہی ضروری ہے۔

اول: connection Tribunal (میں ساری تنظیم)

نہم کی تنظیم ہمارے ملک میں متعارف کروائی جائے، جیسا کہ قرآن میں بھی موجود ہے۔

دوم۔ اس کا خاص کام امن سازی ہو، لیکن مرد کو دینے کے طلاق دینے کے اختیارات کو بھی کم کیا جائے اور یہ کام امن سازی و عدالت کے ذریعے کیا جائے اور اس کی منظوری کے بغیر کسی بھی حلاق کو منظور نہ کیا جائے۔

سوم۔ میں عورت کو بغیر اس کی غلطی کے طلاق دیا جائے تو اس کے لئے ان نفعہ قسم کا بندوبست کیا جائے!

چہارم۔ سب سے اہم یہ کہ ایسے مطلقہ جوڑے کے بچوں کے لئے مناسب سرپرستی اور سہولگی کا انتظام کرنا چاہیے۔ طلاق پیچھے ب سے اہم واقعے کا سب سے زیادہ متاثرہ بچے ہی ہوتے ہیں۔ مناسب

کیسوں میں ماں کی مسجد تھی کے حق کو تسلیم کرنا چاہیے۔
ونہم۔ میں مسلمانوں کیلئے ایسا ہی یک نہ بھی تجویز نہیں کروں گا۔

لیکن میں چند رو بھی کو ایک دائرہ رکھنے سے زیادہ برا سمجھتا ہوں کیوں کہ ایک دائرہ بھاگ سکتی ہے، لیکن ایک پھر کی نہیں! یہ کبھی زخم ہونے والی غمیرت ہے، لیکن میں نے صرف ان ہی اطلاعات کو مد نظر رکھا ہے جن کو مناسب قانون کی مد سے متعارف

کیا جاسکتا ہے اور جو اسلامی قانون کی روح میں بھی جیسی ہیں۔ ان اصلاحات کیلئے زمین صرف اسی صورت میں ہم مار کی جا سکتی ہے جب عوام کی مناسب نمائندگی کی جائے اور عوام کو تسلیم سے سہولتوں کی جائے۔ مدد لاکھ ہاتھ ہوتے ہیں مام سول کوڈ کی بات کرنا انتہائی کی جنت میں رہنے کے برابر ہے۔

مسلمان عورتوں کی تعلیم مسلم فوٹے کے ترقی کے لئے واحد ضما

مردوں نے عورتوں کو نفسی اسلئے تعلیم سے محروم رکھا کہ وہ اپنے حقوق سے واقف ہو جائیں گی اور پھر معاشرے میں اپنے صحیح مقام کیلئے لڑیں گی۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حدیث کی تعلیم کے باوجود مسلم عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھا گیا۔ مسعود مسلم عورتوں نے انصاف اپنی لاعلمی کی بنا پر یہ صورت قبول کی ملاؤں نے صرف اپنے مفاد کیلئے ان کو اندھیرے میں رکھا۔ اور یہ صورت تب تک قائم رہے گی جب تک مسلمان خود میں تسلیم سے محروم رہیں گی۔ اسلئے مسلمان عورتوں کو اپنے حقوق کے حصول کیلئے تعلیم حاصل کرنا ہی چاہیے۔ میں تمنا کرتا ہوں کہ وہ اس سے ہمارے احوال میں بچوں کی تعلیم کے فروغ میں مدد ملے گی۔ ہم مسلمان عورتوں کیلئے بہت سی ضروری ہے کہ تعلیم حاصل کریں اور مردوں کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری پوری مدد کریں۔ صرف ایک قدم سے مسلم فرقہ کی ترقی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

میں اس بات کو بھی خاص طور پر اہمیت دیتی ہوں کہ ہم مسلم عورتوں کو مسلم پرنسپل لار کی تفصیلات سے ہماری طرح واقفیت ہو، اس ہمارا کیس فیصلہ ہو گا اور اس میں بھیگی سہولتوں کے حاصل کرنے میں مدد بھی ملے گی۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ پرنسپل گورنمنٹ نے انڈین پینل کوڈ کو اسلئے اختیار کیا تھا کہ اسکے ذریعہ شریعت کے قوانین میں ترمیم کی جاسکے۔ مگر انڈین پینل کوڈ کے ذریعہ پرنسپل سکول نے انھوں کی تہذیب کے عرب رجحان کو ختم کر دیا اور اس ہم میں شریک لوگوں کیلئے مضامین کی اس تبدیلی کے خلاف ایک مسلمان نے بھی لب کشائی کی کیونکہ اس کے بعد ہمیں اس کی بھی تبدیلی کی مخالفت ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور اس سے نہ صرف مسلم قوم کی پسماندگی کو برضا و انشا ہے بلکہ مسلمان عورتوں کے ساتھ بے انصافی بھی ہوتی ہے۔

مسلمان عورتیں زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ ہیں اور معاشی طور پر مجبور و منحصر اسلئے وہ ہمیشہ اپنے سر پر طلاق کی ٹنگتی ہوئی تلوار سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ اس خوف کے جذبے کے معقولہ کرنے کیلئے یہی ماننے ہے کہ ایران، الجزائر، یوگوشیا اور مصر کی طرح ہندستان میں بھی Courts of Reconciliation (محاکمات صلح و ملاپ) قائم کیجئے۔ سماجی تبدیلی کو مد نظر رکھتے ہوئے قانون میں بھی تبدیلی کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسلم پرنسپل لار میں بھی بنیادی طور پر تبدیلی (ازم) ہے۔ اور یہ کام بغیر کسی تاخیر کے اٹھایا جانا چاہیے۔ اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو مجبور لینا چاہیے کہ وہ اپنے اقدام سے محض اپنی قوم کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں بلکہ ملک کی ترقی میں بھی مانع آ رہے ہیں۔ (سلسلہ فیضی)

اسلام پہلے بعد میں سب کچھ

’تجلی‘ کے مطالعے آپ نے: اندازہ تو کر لی لیا ہوگا کہ لہجہ میں مفکر ہے نہ دانشور نہ سیاست داں بلکہ نقطہ ایک مولوی ہے جو عوام انسان کو ان کی ضرورت کے مطابق شرعی احکام بتانے کی کوشش کرتا ہے اور دینی و ملی مفاد کے پیش نظر نقد و تبصرہ کی کچھ ٹوٹی پھوٹی ضمانت انجام دے لیتا ہے یا معمولی حیثیت کے آدمی سے آپ کا یہ توقع کرنا حیرت ناک ہی ہے کہ وہ کسی ایسے پیچیدہ مادہ ذیل در ذیل مسئلہ پر داد و تحقیق دے سکے گا جس پر داد و تحقیق دینے کے لئے ایک مفکر کی گہری بصیرت، ایک مجتہد کی شرف نگاہی اور ایک اہل اجتہاد کی سوجھ بوجھ درکار ہے۔ آپ نے چند سطروں میں ایک ایسا سوال سیٹ لیا ہے جو دشوار ترین ہونے کے علاوہ اتنے مفصل جواب کا طالب ہے کہ پوری کتاب کی ثوابت آجائے۔ ’اچیز۔ بلا تفسیر۔ نہ تو اتنا زیرک اور باخبر فطریہ کہ حق جواب ادا کر سکے۔ نہ آپ ہی پر پسند کریں گے کہ جواب کے عنوان سے ایک بلند آہنگ روڈ نہ کر دیا جائے۔ بس یہ آپ کے امر کا کرشمہ ہے کہ اپنی نااہلی کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنے پر خود کو مجبور پارا ہوں۔ ورنہ مزید بات تو یقیناً یہ ہوتی کہ اس قدر وسیع الذیل اور دقیق سوال کا جواب آپ مثلاً امیر اہل علم و علم سے لیتے۔

بہرحال سادہ تمہید کے بعد میں اپنی بساط کے مطابق جواب کی کوشش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے یہ تاویز ضروری ہے کہ دنیا اور اس کی زندگی اور انسان کے نوع، نوع مسائل کے مطالعہ میں میرا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے۔ یہ اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ بنیادی نقطہ نظر کا متین جب تک ہو جائے کسی بھی مسئلے کے بارے میں کوئی مضبوط اور منظم فکر

سنانے نہیں آسکتا۔ کسی مفید اور کارآمد نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے ماننے کی بات۔ ہے کہ مختلف امور و مسائل میں ضرورت و اہمیت کی وجہ بندی اور ترتیب کا انحصار ہر شخص کے بنیادی نقطہ نظر پر منحصر اور انداز مطالعہ پر ہوا کرتا ہے۔ ایک ہی چیز زید کے نزدیک دو کوری کی ہو سکتی ہے مگر کبر اسی کو لعل و گہر جیسی بیش و بہا تصور کر سکتا ہے۔ شلادھت کی حق و عصمت کا مسئلہ لے لیجئے۔ کچھ لوگوں کیلئے یہ جان ہے (یادہ عزیز ہے) کچھ کے نزدیک اس کی کوئی غیر معمولی قیمت نہیں۔ وہ انتہائیں میں جن پر ایک ہی آدم کے دو بیٹے بنیادی نقطہ نظر کے فرق کی بنا پر پہنچتے ہیں اور ان دو انتہاؤں کے امین بہت سے اسٹیج ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے عموماً مسائل حیات کے مطالعہ میں طرز فکر کے تضادات نے مغفرت و غفرت میں بھی تضاد و رنگارنگی پیدا کر دی۔ اسی لئے یہ بات باطل ممکن ہے کہ اگر دس مختلف حضرات آپ کے سوال کا جواب غایت فرمائیں تو ہر جواب دہ کو سے نکال یا جزاً مختلف ہو۔

میرے نزدیک یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ اسلامی تعبیر کے مطابق یوں کہہ لیجئے کہ یہ دنیا ایک ایسا میدان ہے جہاں انسان کو کاشت و تلاؤں کا کرنی ہے لیکن اپنی کھیتی وہ یہاں نہیں کاٹ سکیں گے۔ بلکہ مرنے کے بعد جس جے کر ان اور غیر فانی دنیا سے سابقہ پیش آنا ہے وہاں کاٹیں گے۔ یہ دنیا جسے جنت بنانے کے خواب دیکھنے والے طرف کے مطابق انسان ماضی بعید سے دیکھتا چلا آ رہا ہے اور آج کے دور سائنس میں تو یہ خواب و غموض اور نعروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کبھی کسی بھی دور میں گمان و آفات و حلاوت اور آلام و افکار اور فتنہ و شرے خالی نہیں رہی اور

نہ کہہ سکتی ہے۔ انفرادی طور پر اور اجتماعی سطح پر بھی طرح طرح کے مذہبی مسائل اور پریشان کن قضیے بفرق مراتب پیش رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ لہذا ان کی کئی تمام تر اہمیت اس بات کی نہ ہونی چاہیے کہ کسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر زیادہ سے زیادہ پیش و راحت حاصل کرنے کی دمن میں لگ جانے اور سارا زور اس پر مرکوز کر دے کہ دنیاوی فہم و اندوہ کا سایہ تنگ اس پر پڑنے نہ پائے۔ ہر لذت لازماً اسے حاصل ہوا اور ہر اعتبار سے اس کی زندگی بہت کامنڈ بن جاتی ہے۔ اس کے بکھڑے اصل اور اساسی اہمیت اس بات کی ہونی چاہیے کہ سوچا پاس سال کی مختصر سی زندگی کے بعد یہاں بھولی تر اور لامحدود زندگی سے واسطہ پیش آنا ہے اس کیلئے آرام و راحت کا کتنا اور کیسا سامان جمع کیا جاسکتا ہے۔

ہر مسلمان زوجات و اولاد کے عقیدہ رکھتے ہیں لیکن دوسرے بھی تقریباً تمام مناسبات میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا جاتا ہے مگر بعض روایتی اور مذہبی حیثیت سے اس عقیدے کا پایا جانا تبخیر نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس پر اتنا ہی کالہ یقین اور غیر متزلزل وثوق نہ ہو، جتنا اپنے وجد پر آگ اور پانی کی خامیوں پر رنج و مسرت کے احساسات پر اور دہر و تریاق کے لطف پر آم سب کو ہے۔ یہ یقین و اذعان لازماً مصحفی رکھتا ہے کہ ہم دنیا کے صرف اس پیش و آرام کے طالب ہوں جس کی طلب اور حصول ہماری اخروی زندگی کیلئے نقصان نہ ہو اور اس پیش و آرام کے زہر قاتل سمجھیں جس کے نتیجے میں ہماری اخروی شمع و ممانیت صلیبے میں بجھ جائے۔

ایک سادہ سی مثال :-

اسلام نے غیروہی ہے کہ ضروریات زندگی کو اس قیمت سے بیگ رکھنا کہ گراں فروخت کی جائیں حرام ہے۔ جرم اسلامی شریعت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس فعل پر وہ آقا اور الگ الملک ناراض ہو جائے گا جس کے قبضہ و اختیار میں سارا عالم ہے۔ اور جس کی چشم غایت پر ہماری اخروی ممانیت کا حملہ ہے۔ اب غم کر لیجئے کہ اگر اس خبر کی صداقت پر ہمیں مکمل وثوق ہو تو کیسے ممکن ہے کہ ہم اس حرام کا ارتکاب کریں اور غلو قہ خدا کی زندگی امیر بن کریں۔

مجھے دیکھ کر شہر آشوب بھی اور تمام جہاد و انشود بھی لہذا خداوند مقررین بھی میرے اس روز فکر کو "مولویاد" قرار دیکر بلا تحفہ خندہ

استہزاء فرمائیں گے۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں بھولتا ہوں مسائل کو کسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں اور یقیناً کال رکھتا ہوں کہ یہ وہ واحد قطعی نقطہ نظر ہے جو انسانی کے ایمان اس و عدل کی فضا اور پیمانی کا اصول پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں نہ صرف مرنے کے بعد دہائی زندگی کی فہم مضمر ہے بلکہ حیات دنیاوی کیلئے بھی اس کی افادیت شہ سے بالاتر ہے اس سے مفاد کوئی بھی نقطہ اور انداز فکر انسانیت کی کوئی حقیقی نہایت انکام نہیں دے سکتا اور وقتی طور پر اس سے کچھ مسائل سلجھ جائیں تو کہیں زیادہ مسائل الجھتے چلے جائیں گے۔ ان ان کے ایمان و عدل کا قیام خیر کا فروغ اور امت جمیعہ کا شعور نا پاکیزہ جہات کا پھیلاؤ اور امن کی پائیدار تعمیر کا اہم ترین کام صحیح طور پر انجام پائی نہیں سکتا۔ اگر انسانی اہمال و افعال کا فکر کے خیال کو کو جو کچھ ہے۔ یہی دنیا ہے یہاں سے جا کر دیکھیں اور زندہ ہونا ہے نہ صواب و ناپ ہے۔ دالام پائے نہ سزا جگہ تھی ہے۔

ام ہندوستانی مسلمان میں بے شمار مسائل سے دوچار ہیں ان میں سے کسی کی بھی اہمیت ہے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے ادب و عقل و فہم پر ہر مسئلے کو اس کے اپنے دائرے میں رکھتے ہوئے حل کرنے کی جدوجہد برقرار رکھیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر ضروری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ان کے بنیادی نقطہ نظر کا فساد اور بکلی اور قسم زدہ ہو۔ جڑیں پایا جائے گا ہر بہت گناہ نالہ دہی کا رنگ و بھر کی ستیت نالہ نہ ہو سکے گی۔

یہ ایسا ہی ہے جسے مجر کی خرابی سے ایک شخص کو مجبور و زندہ نہیں بنا کر بھی بڑا ہو جائے۔ اصحاب بھی کڑو پڑ جائیں۔ دل و دماغ بھی صحیح طور پر کام کرنا چھوڑیں۔ منصف کے باوجود کوئی حق کام نہ ہو سکے۔ ان میں سے ہر خرابی بلاشبہ اس کی مستحق ہے کہ وہ ان میں اس کا لحاظ رکھا جائے لیکن اہم تر بات یہ ہے کہ توہ اسلام مجر کی ہستی پر مبنی کی جاتے۔ اور کسی بھی وقت اس خطا بھی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ مجر کی اصلاح کے بغیر مذکورہ عوارض میں سے کوئی بھی ممانہ دہ کیا جاسکتا ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے۔ اور انوکھ دیکھیں معمول بن گیا ہے کہ جسم کے کسی بھی حصے میں اٹھنے والے درد کا وقتی علاج اسپرین اور مائٹوین ہے۔ وہ ان سے کر لیا جاتا ہے اور مگر نہیں کی جاتی کہ وہ کی اصل جگہ کیا ہے۔ اور ان کو خرابی سے روکی جاتی ہے۔

ہنگامہ بڑھتا جائے اور مجموعی صحت کو کھلی ہوتی ملی جائے۔ اسی طرح اگر مسلمان
کے کسی بھی مسئلے کو اس کی بنیادی اور منہوی وجہ سے الگ کر کے مستقل
بالذات مسئلہ کی حیثیت دی جائے اور کسی نہ کسی طرح اس میں کچھ سمجھاؤ
پیدا کر دیا جائے تو یہ ایک ناپائیدار اور سطحی طریقہ کار ہوگا جس کے اثرات نہ
دیر پا ہو سکتے ہیں نہ گہرے۔ یہ میں بھی مانتا ہوں کہ درد کا خوری لالہ اور۔
تسکین کا ماحول حاصل بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ جو درد مریض
کو نر پارا ہو اس کے اصل سبب کو ختم کرنے کی تدابیر کے ساتھ ساتھ۔
بلکہ بعض حالتوں میں ان تدابیر سے بھی قبل تسکین بخش دواؤں کی ضرورت ہے
تاکر ب شدید یہ نجات ملے اور جسم کی قوت کا صحت کیسوی کے ساتھ اس
مرض سے لڑ سکے۔ اسی لئے میں اسے غلط نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کے مختلف
ارباب بصیرت اور فعال حضرات اپنے اپنے حلقوں اور مہالوں میں اپنے اپنے
وسائل و امکانات کے مطابق ہمیشہ آمد مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں
حتیٰ کہ اس افراد اگر درد گارے محروم ہیں اور صحت سے جہان نہیں ہڑاتے
تو ان کیلئے درد گار کا بندوبست کرنا بھی فی نفسہ ایک استحسن کام ہے جو خود
دائرے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن بڑا اور اساسی سوال۔ جو
ہم شمار مسائل کا مصدر و منبع ہے۔ یہ ہے کہ کیا حیات و کائنات کے باطن میں
ہم مسلمانوں کا نقطہ نظر اور سوچے کا ڈھنگ وہی ہے جو اسے ہٹا چاہیے۔
یا ذاتی دعوت اسلام کے باوجود ہم ٹھیک اسی انداز سے سوچنے لگے ہیں جس
سے وہ تمام لوگ سوچتے ہیں جنہیں موت کے بعد والی زندگی اور شہر و
نشر اور صاب کتاب پر مطلق ایمان نہیں یا وہ ہم یقینی کی کیفیت
میں مبتلا ہیں۔ یا کوئی قابل اطمینان علم ہی انہیں اس بات میں حاصل نہیں ہے
کہ حکومت کچھ بنیادی پالیسیاں وضع کرتی ہے اور ہر تمام شعبوں کو ایسی
ہدایات دیتی ہے جن کی تعمیل اس پالیسی کے رویہ کار آنے میں معاون ثابت ہو
اور جن سے اگر اس پالیسی کو ناکام بنا دے۔ اب اگر کوئی پالیسی ہی ستر سے
خطا اور مفسر ہے تو تمام شعبوں کے کارپرداز خواہ کتنی ہی تندرہ ہی اور یا تندی کے
ساتھ حیات کی تعمیل کریں تا جہ نقصان وہی نکلیں گے اور پالیسی اگر بچاتے
خود بھی وہ مفید ہے لیکن اسے کامیاب بنانے والی ہدایات پر عمل نہیں کیا جاتا
تب بھی کوئی مفید خرما مل نہیں ہو سکے گا۔ ضرورت ہے کہ پالیسی ہی اپنی جگہ
مفید و مانت ہو اور اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے والی سرگرمیاں بھی ہوتی
وہی کے ساتھ جاری رکھی جائیں۔

میں جس بنیادی نقطہ نظر کی بات کرتا چلا آ رہا ہوں اسے مثالاً ایک پالیسی تصور
فراہم کیجئے۔ گویا کردار و عمل کی تمام جزئیات سے ہٹ کر مسلمان کو دلایہ طے کرنا ہے
کہ وہ کارہائیات میں جو کچھ کام کرے گا وہ لازماً ایسا ہوگا جس کے نتیجے میں آرت کا
زبان نہ ہو۔ جو اس قسم کے اصول و انکار سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس میں سبب و اسباب
سے گرا ہوا ثابت نہ کیا جاسکے اور جس میں دنیاوی منافع کو اندری نقصانات
پر فوقیت نہ دی گئی ہو۔ یہ طے کرنے کے بعد اسے تعمیری منصوبہ بنانے ہیں۔
مسائل کامل و صوبہ خطاب اور اپنی راہ کے ہر ہمار کو عزم و ہمت اور فہم و فراست
کے پیشوں سے کاٹنا ہے۔ اگر وہ اپنا بنیادی نقطہ نظر قریب ٹھیک کر لیتا ہے لیکن
جدوجہد عمل کی راہ میں مردانہ وار آگے نہیں بڑھتا اور میسر وسائل کا دانشمندانہ
استعمال کر کے نئے راستے نہیں بناتا تو بعض بنیادی نقطہ نظر سے کچھ نہیں کر سکتا
زندگی کا میدان محنت کا پسینہ ہانڈا کا درد اور فراست کی طراری چاہتا ہے۔ بعض فکر
محض خیالات، محض خواہشیں اور تمنائیں لا حاصل ہوا کرتی ہیں۔ جب تک جاؤ
عمل پر پیش قدمی نہ کی جائے۔ اسی طرح اگر جدوجہد کا بازار تو گرم ہو لیکن بنیادی نقطہ
نظروں نہ ہو تو ہر قدم منزل سے دوری ملے جائے گا۔ ضمنی کاموں کے کچھ
مراحل آتے بھی تو وہ قریب نظر ہوں گے اور عقیدہ ٹکرائی نامی ہو تک ہی کر رہا رہی
کا خون چستی رہے گی۔

میرے نزدیک مسلمانوں کے زوال اور بے حالی کا قوی ترین اور متفق
سبب پہلے ہی رہا ہے۔ اب بھی یہی ہے اور قیامت تک یہی رہے گا کہ مرنے
کے بعد والی زندگی اور اس کے لوازمات کے بارے میں ان کا عقیدہ ابتدا و ابتدا
ماخوذ آئے ہو یا پھر اس غبار کی کثافت پر مبنی گئی اور شدہ شدہ اس کی حیثیت
ایک روایت اور رسم کی ہو گئی۔ اس میں وہ صلابت اور گیرائی اور تاثیر باطل
نہیں رہی جو عقیدے کی شان ہے۔ عقیدہ صرف رائے یا غرضیات نظر
کو نہیں کہتے وہ ایک ایسا جو ہر سال ہے جو رگ رگ میں لہو کے ساتھ
دور تا ہے اور آدمی کی پوری نفسیات اس سے لپٹی رہتی ہے۔ کوئی بھی آنکھ
دلا تا یہ سچ اسلام کا گہرا مطالعہ کرے آج کے مسلمانوں کی ملامت۔
وہ نیست اور کردار پر ناخداہ نظر ڈالے وہ بلاشبہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ
اوپر سے نیچے تک ایک مانی سے لے کر مولوی اور صوفی کے دو ٹکڑے
تک بازار اکھیت مسجد خالقہ اور درگاہ ہر جگہ دنیا ہی نفیت
خود غرضی جہالت مرکبہ کبر و نخوت حرص و حسد ادبے علی و بدلی کی فصل
بہار ابلہا رہی ہے۔

مسلمانوں کی اکثر و بیشتر سرگرمیاں اور معمولات و مشاغل ایسے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں جو فکر آخرت سے بے نیاز اور محنت مند افکار سے محروم قوتوں کا رنگ ہے۔

مسلمانوں کے مخصوص مسائل تو جو ہیں سو ہیں، بے شمار مسائل ہمارے ملک میں مشتمل ہیں۔ مثلاً آج کا سب سے اچھا ہوا مسلمان روزہ افزوں گرائی اور استیاضہ و ریکہ قلعہ ہے۔ اس میں مسلم مکہ ہندو عیسائی کسی کی تخصیص نہیں۔ بے شمار انسان اکھڑے اکھڑے مائیں رہے ہیں۔ زندگیاں اجیرن ہو کر رہ گئی ہیں۔ حال ارباب اور مستقبل تاریک تر ہے۔ اس صورت حال کے سیاسی و اقتصادی وجوہ اور مادی و فنی اسباب خواہ کچھ بھی تشخیص کیے جائیں مگر بنیادی ترین اور قوی سبب دولت ہستی کا وہ جنون ہے جو انسانوں کے سرور، پر سوار ہو گیا ہے۔ یہ جنون اپنی عین فطرت میں یہ تھافے سموئے ہوئے ہے کہ آدمی خود فرض ہو، سنگدل ہو، اخلاق دھوڑ، رجم و راحت اور ایشیا و خدمت سے اے کوئی واسطہ نہ ہو۔ ذاتی نفع اور لذت اور تفتیش کی قربان گاہ پر وہ انسانیت، عدل، قناعت اور قربانی کے تمام میلانات کو ذبح کرنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ بحث غیر ضروری ہوگی کہ اس جنون کو اپنے موجودہ مرحلے تک لانے میں کن کن عوامل نے کتنا کتنا کام کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور عرض کیا جائے گا کہ اس جنون کی گرفت صرف غیر مسلموں ہی پر نہیں مسلمانوں پر بھی مضبوط رہتی جا رہی ہے۔ اور مسلمان بھی اسی کے زیر اثر ان تمام مایہوں پر دوڑ لگا رہے ہیں جو آخرت فراموش اور دنیا پرست قوتوں کی راہیں ہیں۔

دیکھئے، وہ بڑے کی ایک شان دار مکان پر مسلمان تاجر بیٹھا ہے اس کے منہ پر دارمی بھی ہے اور سناڑوں کے وقت وہ مسجد بھی جاتا ہے بارہا اے تسبیح پڑھتے بھی دیکھا گیا ہے گویا وہ عالم فاسق و فاجر مسلمانوں سے متضاد ایک صالح مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں بظاہر بھی حسن ظن رکھی جاسکتا ہے کہ اے اسلام کے دینے ہوئے عقائد و شعور سے گہری وابستگی ہوگی۔ وہ زندگی کے تمام ہی شعبوں میں یہ لحاظ ضرور رکھتا ہے کہ کون سے کام آخرت کیلئے مفید ہیں اور کون سے نقصان دہ۔ مگر جب آپ بہت قریب سے مطالعہ کریں گے اور آپ کی نگاہ نقد اس کے دل و دماغ کے نبساں خاں لڑا تک پہنچے گی تو متکشف ہوگا

کہ اس کا حال بھی دوسروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ پچھلے سال اس نے ۲۰ ہزار میٹر کپڑا اور سٹا دو روپے میٹر کے حساب سے خریدا تھا، آج اس کے دام آٹھ روپے میٹر تک جا پہنچے ہیں۔ یہ قیمت رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ اور اس نے ابھی خاصی دولت کمائی ہے۔ اب اس کے پاس اس میں سے پانچ ہزار میٹر موجود ہے۔ اور وہ دیکھ رہا ہے کہ گرانی ابھی ادا ہو جانے والی ہے۔ لہذا اب وہ آٹھ روپے میٹر بیچنے میں بھی تامل کر رہا ہے۔ بہترین تھان چھپا اور سنگڑا کر رکھ دیتے ہیں اور تہہ بدل سے نظر ہے کہ کب دام اور بڑھتے ہیں اور کب وہ اپنے دو روپے میٹر خریدے ہوئے کپڑے کو ہندہ سولہ روپے میٹر فروخت کر کے اپنی جیب میں غیر معمولی اضافہ کرنا ہی اس کی خدا ترسی کی یہ حالت ہے کہ ایک جانا پہچانا غریب آدمی اپنی بچی کے جہیز میں ضروری دو جوڑے دینے کے لئے اس کی دکان پر یہ تفتے کر آتا ہے کہ یہ نازی مسلمان ہے، میری غربت کو بھی غیب جانتا ہے، مجھے حمایت سے کپڑا دیدے گا۔ لیکن اس کی تمام امیدوں پر پانی بھر جاتا ہے جب وہ اس سے یہ جواب سنتا ہے کہ بھادو آج کل میں اور بڑھنے والا ہے لہذا ابھی رعایت سمجھو کہ تمہیں آٹھ روپے میٹر دے سکتا ہوں۔ دیکھا آپ نے، دو روپے میٹر خریدا ہوا کپڑا، آٹھ روپے دے کر بھی احسان بھارا رہا ہے۔ حالانکہ اگر اسے اسلام کی اس یقین دہانی پر اطمینان قلب ہوگا کہ ہر بھلائی کا اجر کم سے کم دس گنا فائدہ ہے تو یقیناً وہ چنگھے ہوئے دل کے ساتھ یوں سوچتا کہ یہ غریب نہ جانے کتنے وقت کے خاتمہ کر کے کچھ پیسے جوڑ لایا ہے۔ میں اگر اسے خرید کر خرید پر دیدوں تو اس کا بھلا ہو جائے گا اور مجھے کوئی نقصان بھی نہ ہوگا۔

یہی نہیں، اس ایک تاجر کے پڑوس میں کئی افراد مشتمل ایک گھر ہے جس کے کچن مشکل دو وقت روٹی کھا سکتے ہیں، ابا تو فاقہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا گھر ہے جس میں ایک غیرت دار اور شریف مگر محض رستے کی جوان بچی محض اس لئے بن بنایا بیٹی ہے کہ شاہی کے انگویر اخراجات کیلئے وہاں کچھ نہیں۔ تیسرا گھر ہے جس کا ایک ہونہار بچہ محض اس لئے تعلیم سے محروم رہا، بارہا ہے کہ اس کے غریب باپ یا بیوہ اس کے پاس تعلیمی اخراجات کا بندہ دہت نہیں ہے۔

آپ اکثر و بیشتر یہ دیکھیں گے کہ اس نازی تاجر کی فدا بھی توبہ پڑوس کے ان مسائل کی طرف نہیں۔ اسے سرے سے یہ اسکا

یہ خبریں کہ ایک سلطان کی طبیعت سے ان مسائل کے رخ پر بھی اس کی کچھ
وجہ داروں میں، فراغی ہیں۔ اسے خدائے اتنا پیسہ دیا ہے کہ اگر وہ چرکا
تھپنے کو بھی آرام و راحت کو تاثر کرے بغیر اور ملائی اٹھائے
ان تھکن گھروں کی کافی امداد کر سکتا ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ اسے
توفیں، ٹکڑے کر خود اس کی نگہ میں زیادہ سے زیادہ پیسہ کیوں کر
آئے اور کاد بار اور زیادہ کیسے چکے۔

ان کا خیال ٹھیک ہے۔ قہار کی صحت اور کردار و صل کی بندی سے انھیں محبت ہے۔ بے شک وہ بھی ہی چاہیے۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ غالباً کھف اپنی اولاد کو ان ہی اسکوں اور کالجوں میں داخل کرتے ہیں جہاں رہے ہیں۔ انھیں تہاں داخل کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں ہو سکتا کہ اولاد میں ان ناچون میں داخل بنائیں جن کا کوئی جوڑ مولانا صاحب کے معیار بندہ نہیں ہے۔ پھر کوئی صاحبزادے اگر پڑھ کھڑے کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتے ہیں تو مولانا سب سے سادہ گھر اس پر فخر کرتا ہے خوشی مناتا ہے۔ حالانکہ انھیں ~~معلوم~~ معلوم ہے کہ بڑے عہدے والوں پر ان کی کل حوام کے کہنے اور دوازے چوٹ کھلے ہوتے ہیں۔

اسے اپنا تابع اور محکوم بنانے پر مصر ہے۔ اس کی ہمدردیہاد کوشش کا شرف
کی سمت سفر ٹھیک وہی ہے جو کسی دنیا پرست کی ہونی چاہیے۔
قدیم تعلیم کا حامل طبقہ بھی اپنے افکار و معتقدات کا کوئی خوش
آئینہ امدل کش منظر پیش نہیں کرتا۔ غلو، تشدد، خشک نظری اور خود
پرستی کے اوصاف قبیح اس کا طرہ امتیاز بن گئے ہیں۔ اسی اسی طبقے
میں بہت سے کوتاہ فکرانہ کج فہم حضرات نے تصوف و طریقت کے نام
پر ایک نیا اسلام کھڑا کر دیا ہے جس نے تو مسلم کا ذہنی قبلی بلی کر
دیکھ دیا۔ دیکھا ہوں کی چہل پہل معذرات کے چلے، غنہ گنہ دین کے حرس
بے شمار، اہل عقیدوں کی ریل ریل اور توہمات و شرکیات کی بھیڑ بھاڑ
سب اسی نئے خانہ ناد اسلام کی دین ہیں اور ان میں دل چاہنے والا
ذہن اسلام کی اساسی افکار و فہم اصل قصہ سے بھٹ گیا ہے۔
دین داروں کا وہ طبقہ اندہ محضات و خرافات سے بھرا ہے وہ کچھ
آدم کی اخلاقی کمزوریوں کا ہدف ہے۔ منافست، حرص و حسد، خود
فرضی، امانیت اور جہل مرکب ہے۔ یہاں اوصاف میں بڑی انفرادیت
ہر طرف پائے جا رہے ہیں۔ اور ان کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے
کہ ہندوئی، مسلمان، مشرک، منال کی گروہ کشائی کیلئے کسی ایک قیادت
کے زیر سایہ جمع ہوں۔ اور اپنی گھری ہوئی طاقت کو جمع کر کے دشمنوں
کے پہاڑ کاٹ سکیں۔

ہندوستان سے باہر کی دنیا نے اسلام پر ایک طائرانہ نظر
ڈالتے تو وہاں بھی کسی امید افزا حالت کا دیدار آجکے مسر نہیں آئے گا۔
ہم ہندوستانی مسلمان تو ہمیشہ حیثیت سے غریب ٹھہرے لیکن دنیا نے
اسلام کو تو اللہ نے نیل کے ذبیحہ دولت مند بنا دیا ہے۔ اس کے اچھے
وی بدترین نفاق اور فکری دورنگی اور گنگی دنیا طلبی وہاں بھی پناہ تک پہنچ
ہو کے ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں قوم ساز و منتخب قوم جو خدا کی مرضیات
کا مظہر بنا کر بھیجی گئی تھی اور عزت و عظمت اس کا طبعی حق تھا آج ایک
ایسی قوم ہے جس نے اپنا امتیاز کھو دیا ہے جو بے شمار خاتمہ و احل میں
اغیار کی قلعہ انداز ہے، جس کے اندر کا جو حق و حقیقت مجبوری ان
ایوانوں سے شائبہ ہے جن کے بتانے والے آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔
اور دنیاوی کو سب کچھ تصور کرنے میں۔ خدا کی باز پرس، گناہ، تو ارب
اور حیات بعد الموت کا مفہوم، ان کو ان کے پاس پہنچے ہی نہیں پہنچے تو

برائے نام فقط دیکھ دو دینی، غیر مؤثر اور محفل۔

ابھی حال ہی میں عرب ممالک کے مابین ایک سیاسی فوج
کا جو اتحاد دکھایا ہوا۔ اور اس کے نتیجے میں دوسری فوجوں کو یہ محسوس
کرنے کا موقع ملا کہ یہ ملت بیمار ابھی نرے ملک نہیں بن چکی ہے اور
اس کی خاکستر میں ابھی چنگاریاں باقی ہیں۔ تو ہمارے ملک کے ساتھ
روح انیکٹ ل مسلمانوں نے بڑے زور و شور سے اس قسم کی باتیں
شروع کر دیں کہ سوا ہاشمیر ہاگ اٹھا ہے، غفلت کا نٹ ٹوٹ گیا
ہے، غفلت کے پرچم کھل گئے ہیں۔ امریکہ جیسی قوتیں خوف زدہ
ہو گئی ہیں، وغیرہ ک۔

گو میں عرض کروں گا کہ محض سیاسی سطح پر معمولی سی خوش
آئند تھیلین اگرچہ قدر و قیمت کی حامل ضرور ہیں۔ مگر اس قدر بڑیا
کرات کے سہارے، بڑے سائز کے خواب، دیکھتے چاہئیں۔ انہیں
کمال بیداری کا پیش قیمر سمجھ لینا جائزہ آمیز حسن ظن ہے کیوں کہ
ان کی حیثیت محض ایسی کر دوں کی ہے جو سوتے میں لی جاتی ہیں۔

مسلم قوم کو اس کی عظمت رفتہ کی طرف لہجائے اولیٰ اور اس کا وہا
منوانے والی عید ای اگر فی الحقیقت کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ہو سکتی ہے
جس کو قلب و روح کی بیداری کہتے ہیں اس بیداری کا آغاز اس دن
ہوگا جب حقوق خدا کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہٹانے والے اور حاشائے
کو جس رنگ میں چاہے رنگ دینے کا اختیار رکھنے والے مسلمان
سرب راہ اور قائدین اس نفاق کو تیغ کرنے کا جتہ فراہم کریں گے۔
مجموعہ اس عمل کی دورنگی سے عبارت ہے، اور جس کا ہر دوغہ کے ہر
زمرے زیادہ ہلک ہے جس نے اسلام اور غیر اسلام کے امتیازی
خطوط کو کہیں دھندلا اور کہیں بالکل مٹا کر دیا ہے۔

یہاں کسی بحث کی حاجت نہیں کہ طائرانہ اور دیگر مصطلحات
انتہائی ضروری ہونے کے باوجود دوسروں کیلئے وہ وسیع و عمیق اثرات
اپنے اندر نہیں رکھتیں جو اسلام کی عالم اخلاقی تعلیمات میں پوشیدہ
ہیں، یا اس معاشرت، معاشرت ہر دائرہ زندگی میں اخلاق کا جو
سیارہ اور دار کا سا پنجرہ اور انداز فکر کا جو رخ اسلام نے چاہا ہے وہ
بالیقین ایسا ہے کہ جب جس درجے میں اس کی نمود ہوگی اسی درجے
میں دوسری قوم اس سے متاثر ہوئی ہوگی جتنی جانی گئی۔ ہمارے سب

سب سے بڑی ضرورت ہے کہ حیات و کائنات کے رخ پر مسلمانوں کا
طرز فکر درست ہو۔ وہ دوسروں کے محبوب اور سلوک کیون پر نام تر
توجہ نہ منظر کرنے کے عوض اپنی خامیوں اور منافقتوں پر انکشاف
نہیں کرتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے نام کا چھوڑ کر
اسی ایک نام میں نرزا لگ جانا چاہیے۔ دوسرے نام مثلاً جان دال ،
تہذیب ، زبان ، معاشرتی اقدار اور مالی و معاشی حقوق کے تحفظ کی کوشش
بہر حال ضروری ہیں اور ان سے ذرا بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے
لیکن جس طرح سائنس لینے کا شغل ایک مستقل اور مسلسل شغل ہوتے
ہوئے بھی نہیں دوسری ضروریات سے نہیں روکتا اسی طرح طرز
فکر میں تغیر کی کوشش 'نفاق' سے گریز کا مزمع اور اسلامی اخلاق
سے پوری طرح وابستہ رہنے کا مزمع کوئی ایسا کام نہیں جو یہ تقاضا
کے کہ پہلے کچھ کر دیکھ کر کسی اور کام کو ہاتھ لگنا۔

آپسے سوال کیا ہے کہ کھانوں و خوراک کے تحفظ کی خاطر
ہندوستانی مسلمانوں کو کون سا سماجی و سیاسی نظریہ اپنا کر کس راہ
پر چلنا چاہیے۔

میرا جواب یہ ہے کہ جہاں تک سماج کا تعلق ہے ہمارے
حک میں کوئی بھی ایسا سماجی نظریہ سرے سے پایا ہی نہیں جاتا
جسے سنیہ مفہوم میں منظر کا کام دیکھا سکے۔ اس لیے یہی قسم کی دعاات
ہے اس میں نہ کا وہ خاندان اچھے ہونے اور اہم و خجالت پر مبنی ایک سماج
جیتنا موجود ہے مگر ایسی کوئی چیز موجود نہیں جسے غفل و علم کی کسوٹی
پر ہر گز اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ ہمیں ہمارا گوہر مفقود دل گیا ہے۔
سنی کہ میرے نزدیک یہاں اسلام کا سماجی نظریہ کی کردار و عمل کے رخ
پر اپنے بہت سے امتیازی خط و خال نسخہ کر چکے ہیں اور مزید نسخہ
کرتے ہی رہے۔ سو غور کی ضروریات زندگی کی ذخیرہ و انفعالی رشوت
مستافی خادایوں میں دھوم دھماکا لڑائی والوں سے جہیز کا مطالبہ ہمسایوں
کے ہوسے پھلے سے بے نیازی ، ضروری تعلیم و تربیت سے لاپرواہی
بد معاشرت ، بد عہدگی ، بد مزاجی ، سائنس و معاشی کی حرص اور پیسہ کمانے کی
دھن ، بے اظہار وادعا صاف اسلامی نظریہ معاشرت سے کچھ بھی نہیں کہتے ہیں
پھر ہمسایہ بھرم ان شایانہ سرگرمیوں نے کھو دیا۔

جنہیں طریقت کے نام پر اختیار کر لیا گیا ہے جو قوم کثیر اور اقلیت میں تقسیم
ہو گئی ہے۔ جنہیں ہم میں مردہ لوگوں کے زندہ جاوید اور غوث و دستگیر
ہونے کا عقیدہ پایا جاتا ہو جو قبروں پر دھوکا اور ہارونیم کے ساتھ
قوالیاں اڑاتے ہیں کی دھماکوں میں مزااات کے اور گرد آدم کے بیٹے
روک و سجو تک سے گریز نہ کریں اور جس میں صدیوں قبل کے ذوات
یا سنگین سے اولاد اور نوکری اور محبت لگی جاتی ہو اسے بھلا اسلامی کلمہ
اور نظریہ معاشرت سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ دارلحیالیہ اس کی ایک خاص
وضع یا باہمی فتنے میں استعمال ہونے والے برتنوں کی خصوصیات اقام
نہ ابھی نظریاتی اہمیت نہیں رکھتے۔ اگر وہ بن و قلب میں اسلام کے فہمی
فکر و نظریہ کی نقش کاری نہ ہو۔

یہ شک اسلامی تہذیب و معاشرت کی بہت سی قدیم اور اصول
و شمار ابھی ہمارے اہل ذمہ ہیں۔ متاثرہ ہم ان پر غور بھی کر سکتے ہیں
لیکن کوئی بھی مشین کار آمدی وقت ہو سکتی ہے جب اس میں تمام پرزے
نہ اپنی جگہ نہ ہوں۔ اگر ہزاروں پرزوں والی مشین ہے تو اس سے کام
نہیں چلے گا تو نو سو پرزے تو ٹھیک طرح سے جوڑ دیئے گئے ہوں
مگر سو پرزوں کی جگہیں یا تو خالی ہوں۔ یا اس میں اور احداث ہر کے غیر پرزوں
پر نہ جوڑ دیئے گئے ہوں۔ مگر سو پرزوں کی جگہیں یا تو خالی ہوں یا انہیں
دورانہ کر کے غیر پرزوں پر نہ جوڑ دیئے گئے ہوں۔

اسی طرح اسلام کا سماجی نظریہ کتابوں میں اگرچہ مکمل طور پر موجود ہے
اور فقہانہ نظر کے تحت سے سخت مراحل سے کامیاب گذرنے کی پوری
صلاحیت رکھتا ہے مگر اینٹ اور پتھر کی دنیا میں وہ اپنے داہمی اثرات
بیدار کرنے کا اہل نہیں ہا کیوں کہ وہ صرف کتابوں میں ہے مسلمانوں
کے کلمہ اور میں نہیں ہے وہ ایک ایسا نسخہ کیما ہے جس کی کوئی فہم
تربیت کی جاتی ہیں لیکن آڑ لایا نہیں جاتا یا آڑ لایا جاتا ہے تو ناقص انداز میں۔
اسی کا نام ہے نفاق۔ دورنگی۔ میں شخص خوش تعلیم کی طور پر
نہیں بلکہ پوری طرح سورج بھجھ کر غرض کرنا ہوں کہ مسلمانوں کو کسی
نئے سماجی نظریہ کی جستجو ہرگز نہ کرنی چاہیے بلکہ ان خامیوں اور
نارسائیوں کے مادے کی فکر کرنی چاہیے جو اسلامی نظریہ معاشرت کو
اختیار کرنے میں پائی جا رہی ہیں۔ اس نظریہ کی نمود بہت اور ضروریات
کے اعتبار سے تو مختلف کھوں اور مختلف زبانوں میں رکنا نہیں ہو سکتی۔

ہر ملک اور زمانہ اپنا مخصوص مزاج و طرزِ عمل اور مخصوص تقاضے اور مخصوص
تلاشیں اور پیمائشیں رکھتا ہے۔ روایات رکھتا ہے۔ ان کا لحاظ رکھنا ہی ہوگا
لیکن یہ لحاظ غیر جمود نہیں اس کی حد بندی اسلامی ضوابط سے کرنی ہوگی
اسلام کے بنیادی ضوابط اور خطوط اور اصول و احکام میں تبدیلی کا نہ تو مسلمانوں
کو حق ہے نہ تبدیل شدہ چیزوں کو اسلامی نظریہ معاشرت کا حصہ بنا سکتا ہے
بسیاسی نظریہ تو اس موضوع پر ہم جیسا غیر سیاسی طالب مسلم
کیا۔ و تحقیق دے کے گا۔ یہ بڑا نفسہ و ذلف مسئلہ ہے اور ملک کے موجدہ احوال
میں ہر فیصلہ کو متعلق بہت ہی مشکل ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ
مسلمان جو بھی نظریہ سیاسی اختیار کریں اس میں ہر کیف یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے
کہ اسلام کے رہنما خطوط اور عقائد و نظریات سے انحراف نہ ہو۔ اسلام کو سیاست
کے تابع نہیں بلکہ سیاست کو اسلام کے تابع رکھنا لازمی ہے۔ کسی بھی
اسلامی تعلیم کا عنوان کر کے پورا ایک ملک بھی نسخ کر لیا جائے تو میرے نزدیک
خدا کے لئے کافرا ہے۔ اسلام پہلے ادب کچھ بعد میں۔

آزمیں اپنے یہ قید بھی لگائی ہے کہ مسلمانوں کیلئے جو راہ
منتخب کی جائے وہ لازماً ایسی بھی ہونی چاہیے کہ اکثریتی فرقہ کو اس سے
اختلاف نہ ہو۔

یہ شرط بڑی سخت ہے اور ناممکن العمل بھی آپ مثلاً اردو
سے سنے پر نظر ڈالیں۔ اردو کو مناسب قانونی تحفظ ملنا چاہیے اور اس
کی کھلا مخالفت کیا جانا چاہیے۔ یہ ایک ایسا مطالبہ ہے جسے دنیا کا کوئی معقول
آدمی مستعمل نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی فرقہ پرستانہ مطالبہ بھی نہیں ہے
کر فیصلہ اس کی مخالفت پر مقدمہ جمود ہوں۔ یہ ایک حق بجانب منصفانہ
اور معقول ترین مطالبہ ہے۔ جسے صرف مسلمان ہی نہیں بہتیرے غیر مسلم
بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا اکثریتی فرقہ کی ایک بڑی تعداد کو
اس سے سخت اختلاف نہیں ہے۔ اور اس اختلاف کی وسعت و شدت کا
کیا یہ عالم نہیں ہے کہ برسرِ امتداد طبقے کے متحد افراد مطالبے کی مقبولیت
تسلیم کرنے کے باوجود اسے ماننے کی طرح ماننے پر آمادہ نہیں۔ اور غیر
مؤثر و غیر نتیجہ خیز معاملات سے زیادہ وہ اس کی جھولی میں کچھ بھی نہیں ڈال سکے۔
اس مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ اکثریت میں
ضمیمہ ہونے سے انکار کرتے ہوئے کوئی بھی معقول سے معقول تر راہ اختیار
کر لیں۔ اکثریتی فرقے کے کچھ طبقات اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔

مخالفت سے بچنے کا کوئی طریقہ سوائے اس کے نہیں کہ مسلمان اپنی انفرادیت
سے دستبرداری دیں۔ اور اپنے ان حقوق سے بے تعلقی ہو جائیں جس کا متعلق
ان کی ذاتیت سے ہے۔ چنانچہ بعض نامور مسلمانوں نے اس ذہنیت کا
مظاہرہ کیا۔ وہ براہِ برہے پوشش کرتے رہے ہیں اور آج بھی کراہے
ہیں کہ مسلمانوں کے جن اختیارات سے غیر مسلموں کو فائدہ ہے انہیں ختم
ہی کر دیا جائے۔ انفرادیت پر مطلق زور نہ دیا جائے۔ مذہب کو پس منظر اور
مسجد میں قید کر کے رکھا جائے اور اجتماعی و سیاسی سطحوں پر اسلامی
اصول و اقدار کے انطباق کی روش ترک کر دی جائے۔ یہاں تک کہ پرنسپل
بھی ملک بھر کا یکساں ہو اور فقہ کا تمام دفتر بحرِ ہند میں ڈبو دیا جائے۔

فرمایئے کیا یہ طرزِ فکر قابلِ قبول ہے۔

پھر تاریخِ عالم کا مطالعہ کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی کوئی قوم
سے قوم تحریک اچھے سے اچھا سیاسی نظریہ بہتر سے بہتر سماجی مشن
مخالفتوں اور مزاحمتوں سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہی نہیں
ہے کہ کوئی موثر تحریک یا پروگرام یا دعوت برپا ہو اور اس کی مخالفت
نہ کی جائے۔ وہ اور دو چار کی بھی شدہ مدے مخالفت نہ کرتی ہے۔ جب
اس سے کسی گروہ اور طبقے کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ مفادات کا
ٹکڑاؤ ایک ناگزیر مالی اور دائمی حقیقت ہے اس سے کسی طرح کسی
زمانے اور کسی ملک میں بھی مفر نہیں۔

ہندو یا غائب کبھی نہیں دیکھا جائے کہ ہندوئی یا مسلمان یعنی
اسلامیت کو قائم رکھتے ہوئے کوئی بھی سیاسی راہ ایسی لے گا کہ کسی گروہ
جسے اکثریتی فرقے کے کچھ طبقوں کی مخالفت سے سالہ و میش نہ آئے۔
مخالفتیں ہوں گی، قربانیاں دینی پڑیں گی، نقصانات و واسطی
آئے گا۔

تراش کر کہہ سگ و آہن نکالتی ہوگی راہ و منزل

بغیر شعلوں کا کھیل کھیلے زیادہ دیر کبھی زمانہ

دیے تلمیذ کی رائے یہ ہے کہ جب تک کسی داخلہ و متبعین سیاسی راہ و منزل
ہو مسلمانوں کے فعال طبقے کو کم سے کم معاشرتی اصلاح میں تو سرگرمی دکھانی
دی جائے۔ مثلاً شاہی یاہ اور دیگر تقریبات کی اصلاح، جماعت اور توکم پرستی
کی بے نیکی، دولت پرستی کے جنون کی ہمت شکنی، وقت کی تبدیلی
کی طرف مسلمانوں کا ذہن منبذ کرنا، اولاد کی تربیت پر خصوصی توجہ دینا،

کے نزدیک ذاتی و شخصی مفادات سے فائق و برتر ہوں۔
 زہد جب اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی میں! اور کسی ذاتی
 تقرب میں بہت سی دولت صرف کرتا اور دھوم دھماکا اٹھاتا ہے
 مظاہرہ کرتا ہے تو یقیناً وہ خودی و ملی مصالح کی بڑا پسندیدہ ہے

بہر گریہ! یا کسی سنجیدہ کسی پیش قدمی کا مظہر نہیں لیکن مجھے
 یقین ہے کہ یا کسی اتنوں پر وہی لوگ زیادہ متبرکات کر سکتے ہیں پھر
 ہوں حقیقت پسند ہوں۔ سچے اور تیز سے مرمت ہوں۔ ایشاد قرطانی
 کی معنوی قدر و قیمت کا احساس رکھتے ہوں اور خودی و ملی مفادات ان

مذہبی لوگوں کی بیوقوفی !

”مذہبی لوگوں کے بارے میں میرا تجسس یہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب
 میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔
 یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے تھے۔

”میں جتنی مشاواں کرتا اور مذاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ دیتا ہوں۔
 وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالو میں وصول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا
 کفارہ نفسوں میں قبول کر لیتا ہے۔ مذہب بڑی سخت اور بڑی قابل قدر آرائش ہے۔ بالخصوص۔
 مسلمانوں کا مذہب جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیش نظر ہیں۔ وہ اس وجہ سے بیوقوف ہوتے ہیں
 کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اور گرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے،
 تو وہ خدا کو کیوں کر دھوکا دیں گے، جس کی صفات کا ان کو عیلم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں
 معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات ان مسندوں کو ہمیشہ کیلئے منتقل کر دیئے ہیں جن کا وہ حق
 دار تھے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ٹھکے
 بغیر عدالتِ مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔ ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا
 کو یہ سہی ان فرشتوں ہی کو دھوکا دیکر کار براری کر لیں جو ان کا اعمال نامہ مرتب کرنے کے لئے کاغذوں پر بٹھا دیتے
 گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آخرت میں پورا ہی کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے۔“

رشید احمد صدیقی

شیخ محمد عبداللہ

صرف ایک ہی راستہ۔ سیکولرزم اور غیر فرقہ واریت

مس: یہ بات آج تک مشہور ہے کہ آپ کشمیر کو ایک عہدِ مختار ملک بنانے کا منصوبہ بنا چکے تھے یا پاکستان سے الکان کرنے والے تھے گردِ ماسل وہ حقائق کیا تھے جن کا بنا پر آپ ۱۵ برس تک نظر بند رہے؟

ج: یہ الزام کچھ پر و رگست ۱۹۵۲ء کو عائد کیا گیا۔ اور اس کا مقصد میری ناجائز گرفتاری اور ذاتِ عظمیٰ سے میری غیر آئینی برطرفی کے لئے جوازِ ہم کر کے ملک کی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ الزام لگانے والوں میں اکثریت اُن لوگوں کی تھی کہ جو "رگست تک مجھے سب سے بڑا عیب وطن، قومی ہیرو اور اللہ سیکرٹریز کا حرفِ آخر قرار دیتے رہے تھے۔ لیکن "اور و رگست" کی بات کو یہ سب کچھ بدل گیا۔ اللہ میں خدا کی پکائی، فخر پرست امریکی ایجنٹ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ قرار پایا۔ یہ سوال کچھ سے پوچھنے کی بجائے اُن لوگوں سے پوچھنا چاہئے کہ جنہوں نے یہ سیاسی ڈراما اسٹیج کر کے کشمیری عوام کے اعتماد اور اُن کے عقائد کو بُری طرح جھوٹ کر دیا "افراد کی تاریخ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے مجھے اس بات کا فخر نہیں کہ میری ذات کے ساتھ کیا ہوا ایسی مصیبت کا انھیں فخر ہے کہ چندستانی حکومت نے اس غیر مجرمانہ اور غیر آئینی کمزور ڈالے سے نہ صرف کشمیری عوام کا اعتماد کھو دیا بلکہ ملکی دنیا میں اپنی اخلاقی حیثیت کو مشکوک بنادیا۔

جہاں تک اس اہرام کی سمت کا تعلق ہے میں اپنی مخالفت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اگست ۱۹۷۹ء کو جب ملک آزاد ہوا تو ملک کی تقسیم کے اصول پر ایک اور جغرافیائی فزیشن کے اعتبار سے کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننا چاہئے تھا۔ اب پاکستان نے اسی بنیاد پر ریاست جوں کشمیر پر اپنا حق جتنا مانگی ضرور کر دیا تھا۔ لیکن جس نے اب میرے ساتھیوں نے مذہبی بنیادوں پر کی گئی اس تقسیم کے قطع کو ماننے

سے انکار کر دیا۔ اور جب پاکستان نے ہندو بایزوں کو اپنا شریع بنانا چاہا تو یہی قیادت
میں سیاست کے لوگ اس جارحیت کے خلاف ڈٹ گئے۔ یہ وہ نازک لمحہ تھا کہ کشمیر کا
ہمارا جو پاکستان کی علامت اعداد کی تاب نہ لا کر فرار ہو چکا تھا۔ اب پاکستان سے آئے جیسے
نیائی علامت کدھری لڑنے کے مدافعت پر دست تک پہنچے تھے، اس وقت ہم پاکستان
کا حصہ بننا چاہتے تو ہم دنیا کی کوئی طاقت ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی تھی لیکن
دنیا جانتی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اس نازک ترین مرحلے پر ہم نے بے شرم سامانی
کی حالت میں بھی پاکستانی جارحیت کا مقابلہ کیا۔ خود کشیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کی
جائے ہندوستان میں لے آئے، پاکستان کی محبوبائے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ
کر لیا۔ ماری ضل نہیں تھا۔ یہ ہمارے سیاسی عزائمات اقتصادی پروگرام اور سیکور
آڈیشن سمیت ہر شعبہ میں مقبول رہا۔ آج بھی وہ نظریات پر پوری
روح قائم ہیں۔ وہ کشمیر کو ہندوستان سے الگ کرنا، اس مسئلے میں چین نے ۱۹۵۰ء
میں ریاستی اتحاد اسلام کو محسوس اپنے نقشہ پر ہمیں خود مختار کشمیر کے متعلق
اپنے نظریات واضح طور پر بیان کئے ہیں۔ ادیتی آنکس میراں دیوانا نہیں چاہتا۔

میرے نون گنیز کو خود مختار بنانے یا اسے پاکستان کا حصہ بنانے کا اقدام راسل
اس گہری ساریش کا حصہ تھا کہ جو میرے آخر وار منصوبے کے بعد حکومت ہند
کے بڑے بڑے ایوانوں میں منظم ہوئی اور جس کی سربراہی براہ راست ہندوستان کے
مہذب ذہین سردار جینل کر رہے تھے۔ مگر سیکرٹریز اور نئی ہند کی کامیابہ اور
کے باوجود بنیادی طور پر قریب اور جمعیت ہند تھے اور ان کی آنکھوں میں میرا وجود
خدا کی طرح کھٹکے گا۔ یہ ہماری ترقی پسند ناپائیداریوں سے بھر پور تھی۔ ہماری
ذہنی اصلاحات، موڈل ٹیوٹریل کے خاتمے اور اسی نوعیت کے دوسرے انقلابی
اتہادات سے خفا تھے اور اسے شرم سے اس تک میں گئے تھے کہ کبھی طور پر جارج ایل ٹرو

اور میرے مدد میں بدلتی پیدا کر لی جائے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔ اور میرے ہی چند ساتھیوں کی کچھ کڑھائیوں کا نادمہ وطن کمرانوں نے ۱۹۵۲ء کو ہم پر شب خون مار دیا اور ہندوستانی مدیلیہ اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ہم پر طوع طرح کے الزامات عائد کر دیئے۔ میں سو لاکھ سال تک ان ناکردہ گناہوں کی پاداش میں نظر بند رہا۔ اور بالآخر جھوٹ 'انفرار اور افراط' کے بادل چھٹ گئے اور کڑوں روپیہ خرچ کرنے کے باوجود میرے خلاف ایک بھی الزام ثابت نہ ہو سکا اور مجھے باحزت اور بزرگی کر دیا گیا۔

حصہ : اگرچہ آپ کشمیر کا الحاق پاکستان سے نہیں چاہتے اور ہندوستان سے بھی ملازم نہیں تو پھر بار بار آپ یہ کیوں فرماتے ہیں: کشمیری قوم کو اپنی تقدیر بنانے کا حق حاصل ہونا چاہیے یا عدل اصل آپ حکومت ہند سے کیا چاہتے ہیں؟

ج : معلوم ہوتا ہے کہ آپ کشمیر کی تحریک آزادی کی تاریخ سے بھی طوع واقف نہیں ہیں مدنیہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوا نہ تھا، پر حال میں میں قصور آپ کا نہیں، اُن حالات کا ہے کہ جس کی بنا پر ہندوستانی حاکم کی اکثریت کو ہماری تحریک کے بنیادی اصولوں ہماری جدوجہد کے منہائے مقصد اور ہمارے موجودہ سیاسی نصب العین کو کہنے میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میں مختصر الفاظ میں یہ کہتا ہوں کہ اس سوال کا جواب ہے کہ اس بات کی وضاحت کر دوں گا۔

کشمیر کی تحریک آزادی میں ۱۲ جولائی ۱۹۳۰ء کا دن غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، اس تاریخ سے ہماری جدوجہد کا تاحہ آغاز ہوتا ہے اور جب سے اب تک ہم چند بنیادی اصولوں اور آدھوں کی خاطر لڑتے آئے ہیں۔ ملک کی تقسیم کا سال ۱۹۴۷ء میں تھا۔ یہ کہیں اس سے پہلے بھی ہمارے سیکرٹوں اور جوانوں نے اپنا بوجھ کیا کہ کشمیر کی سرزمین کو لالہ زار بنادیا تھا۔ اور ہزاروں لوگوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال جیلوں میں گزار دیئے تھے، ہر قسم کی تعزیریں برداشت کی تھیں، اور اپنے مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے تھے، جب سامان ملک انگیزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے لڑ رہا تھا تو ہم دنگو مطلق انصافیت کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ اور ہم نے نیا کشمیر کا شکل میں اپنے لئے ایک اقتصادی اور معاشی پروگرام ترتیب دیا تھا

ہم صلیوں کی غلامی اور استعمار سے آزاد ہو کر دنیا کے نقشے میں ایک باحزت مقام حاصل کرنا چاہتے تھے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلق انصافیت کے خلاف ہماری اس جدوجہد میں ہمیں ہندوستان کے مرکزہ رہنماؤں جیسا کہ گاندھی، جواہر لال نہرو اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں نے ہماری بھرپور مدد اور اخلاقی حمایت کی، جیسا کہ اصطلاح یہ تھا کہ کشمیر کے چالیس لاکھ کو اپنی قسمت بنانے، اپنی تقدیر بنوانے اور اپنے خوابوں اور خاکوں میں رنگ بھرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اور کسی راجے، ہمارے بادشاہ یا ذیر کو ہماری جانب سے کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لئے کشمیری قوم نے قربانیاں دیں اور اسی کے حصول کے لئے ہماری جدوجہد آج بھی جاری ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو ہم اور میرے ساتھی ہمارے ملک کے خوف کو کٹ کر کشمیر کی تحریک چلانے کی پاداش جیلوں میں نظر بند تھے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب ہمیں رہا کیا گیا تو ہم نے اپنی تقریر میں یہ بات واضح کر دی کہ کشمیر کی قوم کے لئے ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے سے زیادہ اس بات کی اہمیت ہے کہ مطلق انصافیت جاگیر داری اور مدنی حکمرانی کے خلاف ان کی جدوجہد کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس وقت ہم پر دونوں جانب سے یہ زور دیا جا رہا تھا کہ ہم ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ لیکن ہم نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم حالات کے دباؤ یا مجبوریوں کی بجائے اپنے اصولوں اور آدھوں کی روشنی میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے اور یہ فیصلہ کرنے کا حق صرف اس ریاست کے حاکم کے ہے۔ ہمارے ملک میں خوش قسمتی سے ہندوستان نے پہلے اس موقف کو تسلیم کر لیا۔ اور پاکستان کے حکمرانوں نے پہلی جمہوریہ میں بے سرو سامانی سے نالہ اٹھا کر ہم پر حملہ کیا، اس صحت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے ہندوستان سے مدد مانگی۔ اور ہندوستان نے پہلے بنیادی موقف کی صحت اور مقبولیت کو تسلیم کر کے ہماری مدد کی، ہندوستان سے چاہئے کہ مطلق کی جگہ ہمیں تیار ہے۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں ہندوستان نے بھی پاکستان کی طرح پہلے اس موقف کو نظر انداز کر کے طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان اور کشمیر کے تعلقات کی نوعیت کو بدلتے کی کوشش کی اور ہم نے اس کی مخالفت کی۔ ہم نہ ہندوستان سے ناراض ہیں اور نہ پاکستان

کے ساتھ کشمیر کا احاطہ چاہتے ہیں لیکن ہم یہ فرود چاہتے ہیں کہ کشمیری عوام کو اپنے اصولوں اور آدھوں کی روشنی میں اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے۔ اور وہ خود بروستی، طاقت اور ایک میل کے ذریعے انھیں کسی فیصلے یا سمجھوتے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں صدیوں سے عزت و آبرو کی زندگی گزارنے کے حقوق ہیں۔ محرم کیا گیا ہے۔ اور جب تک یہ حقوق بحال نہیں کئے جائیں گے، ہمدی جید جاری رہے گی۔ میں ہندوستانی حکومت سے واضح برہم چاہتا ہوں کہ وہ کشمیری عوام سے کئے گئے دھمے پورے کر لیں اور میں کشمیری عوام کی جانب سے یہ یقین دہانی کراتا چاہتا ہوں کہ وہ بھی اپنے دھمے اور معاہدے نبھانے کے لئے تیار ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کشمیری اپنی مرضی اور خواہش سے ہندوستان کا حصہ بنائے۔ فوجی طاقت اور سنگینوں کے بل بوتے پر نہیں۔

سہ: کیا آپ ایک ساں سول کوڈ کے حق میں ہیں؟ اور مسلم پرسنل کو قابلِ رسم خیال فرماتے ہیں؟ اس سلسلے میں یہ بھی عرض ہے کہ ہندوستان میں مسلمان چور کے نہ ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور ہندوئی کو سنگسار کیا جاتا ہے لیکن مسلم علماء ایسا اسلامی قانون رائج کرانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

ج: جی نہیں، میں ہندوستان کے لئے یکساں سول کوڈ کے حق میں نہیں ہوں۔ ہندوستان اپنی روایات اور اپنی تاریخ کے اعتبار سے مختلف مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ اور پہلی آج بھی مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ مذہب کو ہماری زندگی میں جو اہمیت اور ادبیت حاصل ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ یہ ایک مذہب ہی نہیں، ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے اور اس کا اپنا ایک اخلاقی اور معاشرتی نظام ہے۔ اس لئے میں ہندوستان میں رہنے والے تمام لوگوں کے لئے یکساں سول کوڈ نافذ کئے جانے کے حق میں نہیں ہوں۔ جہاں تک مسلمان چور کے ہاتھ کاٹے جانے اور ہندوئی کے سنگسار کئے جانے کا تعلق ہے ان قوانین کا اخلاق ان ممالک پر ہی ہو سکتا ہے کہ جہاں اسلامی طرزِ حکومت مروج ہو۔ اور ہندوستان کے مسلمان علماء

ہندوستان میں ان قوانین کے رائج کرنے پر زور نہیں دیتے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ جہاں تک مسلم پرسنل و میں ہندوئی کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا فیصلہ خود مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ اس میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت کے مسئلوں میں جانور شکوک و شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے

سہ: آپ کے خیال میں مسلمانوں کے معاملات کو مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہئے مگر ہندوستان کے سارے فرقوں میں مسلم فرقہ سب سے زیادہ جاہل ہے اور مسلمانوں میں تو ایک فی صدی بھی پڑھی لکھی نہیں ہیں تو پھر ان حالات میں کیا ایسا اپنے معاملات آپ نے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

ج: میں آپ کے اس بیان سے متفق نہیں ہوں کہ ہندوستان کے سارے فرقوں میں مسلم فرقہ سب سے زیادہ جاہل ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہندوستان کی سیاسی سماجی اور مذہبی تاریخ سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ جہاں اور وطنی مرت مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ہندوستانی عوام کی اکثریت اس کا شکار ہے۔ اگر آپ کی بات کو بھی صحیح مان لیا جائے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کو اپنے معاملات اپنے آپ لے نہیں کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کی جہالت اور ان کی ناخواندگی کو مدد کرنے کے لئے بھی خود مسلمانوں کو منظم ہونا پڑیگا تاکہ دوسرے فرقوں کے لوگوں کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔ میرا ایمان ہے کہ اگر مسلمان اپنی وقف جائیدادوں کا مناسب اور مقبول انتظام کر سکیں تو تو ہندوستان کے مسلمان سماجی، تعلیمی اور اقتصادی میدان میں بہت آگے بڑھ سکتے ہیں، میں آپ کی طرح مسلمانوں کے مستقبل سے یاموس نہیں ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ ہندوستانی مسلمان رفتہ رفتہ اپنے خول توڑ کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

سہ: مسلمانوں کو متحد ہونے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہئے مگر ظاہر ہے وہ مسلم لیگ کا پلیٹ فارم نہیں ہو سکتا اس لئے آپ کے خیال میں وہ کون سی جماعت ہوگی کہ جس میں شامل ہو کر مسلمان قومی دھارے میں بھی شامل ہو سکیں؟

ج: میں مسلمانوں کے سیاسی طور پر متحد اور متحد ہونے سے زیادہ اس بات کا اہمیت سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی تعلیمی پس ماندگی، اقتصادی بد حالی اور بد ہمتی کو

دور کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کریں جب تک مسلمان سیاسی جھڑپ پر اٹھ کر اور اقتصادی اعتبار سے کمزور ہو گا وہ کوئی موثر سیاسی طاقت نہیں بن سکے گا۔ لیکن اگر مسلمانوں کی ذہنی سطح اوروں کی معاشی حالت بہتر ہو جائے تو وہ کسی بھی سیاسی جماعت کے لئے بہت بڑا قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک اولین اہمیت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی پیمانہ نگ دہ کرنے اوروں کے لئے مددگار کے مواقع فراہم کرنے کے لئے کچھ جامع منصوبے ہاتھ بندھے جانے چاہئیں اور سیاسی رنگ نظری سے بلند ہو کر ان منصوبوں پر دیانت داری سے عمل کیا جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں باغیہات اور پڑوسے کچھ مسلمانیت اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں اور انہیں اس میں تاخیر نہیں کرنا چاہئے۔ جیسا کہ سیاسی سرگرمیوں کا تعلق ہے، میری ناچیز رائے میں مسلمانوں کو فرقہ وارانہ سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے کی بجائے ان کے خلاف متحد اور منظم ہو کر جدوجہد کرنا چاہئے۔ کیونکہ میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتی ہیں کہ جتنا مسلم فرقہ پرست جماعتیں۔

مس: نہ اردو کی کتابوں اور جریڈوں کا تعداد اضافت زیادہ ہے نہ اردو آج کار بار میں کام آتی ہے اور نہ سرکاری ملازمت کے لئے اردو زبان کا جاننا ضروری ہے۔ ایسی حالت میں کیا صرف قوالیاں اور مشاعرے کر کے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کا مستقبل محفوظ ہو گیا؟

ج: اردو کے مستقبل کے متعلق آپ نے جس مایوسی کا اظہار کیا ہے اس سے میری مایوسی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ سیاست کی زبان گاہ پر چڑھ کر ذہنی خوبصورت زبان کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اردو بے بسی کے ساتھ ناشاد کیٹھے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے، اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی سب سے جان دار اور شاندار علامت ہے اور یہ اس ملک کی بہت بڑی برکتی ہے، کہ ہم زبانوں کے معاملے میں بھی تعصب اور رنگ نظری سے بلند نہیں ہو سکتے۔

سناؤ گے زبان مرے اظہار کا سب سے موثر ذریعہ ہے، اور بس، میں اردو کی وجہ سے کس پرسی کے لئے صرف اردو کے دشمنوں کو ہی نہیں اس کے حامیوں کو بھی دھمکی دیتا ہوں کہ جنہوں نے اسے مذہب کا درجہ دے کر اس کے خلاف تعصب اور عصبانیت کی نفی قائم کرنے میں

مدد دی۔ ہر حال میں اُمید رکھتا ہوں کہ ہندوستانی حکومت کے ارباب حل و عقد اور اس ملک کے دانشور اس زبان کو مرنے نہیں دیں گے۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑا ہندوستانی سرمایہ ہو گا

مس: آپ متعدد بار فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ہندو اور مذہب کا دور فرما چکے ہیں۔ آپ نے فساد زدہ انسانوں کو ڈھارس بنوائی ہے۔ تسلی دی ہے مگر یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے آگ لگنے کے بعد نائبربر کی گڈ انجن کا موتیہ پر بیخ جانا، سوال یہ ہے کہ آپ آگسے دن ہونے والے ان فسادات کے اسباب پر غور فرما کر مستقبل سدباب کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

ج: فرقہ وارانہ فسادات اتفاقیہ طور پر رونما نہیں ہوتے، اوروں کے کچھ نفرت اور تعصب کی ایک پوری تاریخ ہے جس ملک میں صدیوں سے غم غم کو ذاتی اغراض، غیر معاہدہ اور ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہو۔ وہاں فرقہ وارانہ فسادات کا رونا ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں آگے دن جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں ان کی تہذیبیں باہمی نفرت، تشکیک، بے اعتمادی اور بدظنی کا وہ جذبہ کار فرما ہے جسے گزشتہ پچاس سالہ برسوں سے منظم طریقے پر ابھارا جاتا رہا۔ اور جس کا منطقی نتیجہ ملک کی تقسیم کا مدت میں برآمد ہوا۔ بر لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو مختلف متضاد اور متضاد قومیں تصور کرتے ہیں وہ بالواسطہ نہیں بلکہ براہ راست فرقہ وارانہ فسادات کے لئے زمین ہمارا کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جس دلیل سے ان کے دلوں کی تکذیب ہونا چاہئے تھی وہ اسی کو اپنے موقف کی صحت کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ فسادات کا ہونا کیوں ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بدظنی کا بیج بونے والے نہ ہندوؤں کے دوست ہیں اور نہ مسلمانوں کے، لیکن فسادات کی آگ میں جھلنے والے اکثر مظلوم، نفرت اور عداوت کے (اللہ ہی اعلم) کو اپنا مسیحا بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ہماری سیکورٹی قیادت کی ناکامی ہی نہیں۔ ہمارے قومی شہد کا بھی المیہ۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا سدباب صرف اسی صحت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ سیاسی سطح پر فرقہ وارانہ طبیعت چھوٹے، والی جماعتوں کا متحدہ گروہ پر

مقابلہ کیا جائے۔ اور سرکاری سطح پر ہر فرقہ دارانہ منافرت پھیلانے والوں۔ فسادات کو بھڑکانے والوں۔ اور اس میں حصہ لینے والوں کو جبراً سزائیں دی جائیں۔ لیکن تجربہ اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ حکومت نہ صرف فرقہ دارانہ جماعتوں سے سیاسی سمجھوتے کرتی ہے۔ بلکہ ان کو قرار دیتے ہیں کہ یہ غلط کرتی ہے۔ اور جہاں تک فسادوں کو مزید دینے کا تعلق ہے۔ یہ بات قابل غور ہے، کہ آج تک فرقہ دارانہ فسادات میں لوٹ کسی شخص کو پھانسی تو کی عرقہ کی سزا بھی نہیں لی ہے۔ میں ایک فرد کی حیثیت سے فرقہ دارانہ فسادات کے سدباب کے سلسلے میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور میں نہیں جانتا کہ اس سلسلے میں آپ مجھے کیا توقع رکھتے ہیں

سے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ہزار سالہ ماضی کو ملحوظ فرماتے ہوئے اور حال کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ مسلمانوں کو ان کے مستقبل کے سلسلے میں کیا نصیحت فرمائیں گے؟

ج۔ ہندوستانی مسلمانوں کا ہزار سالہ ماضی، اسلام کی اس عظیم تاریخ اور ان عظیم روایات کا ایک حصہ ہے کہ جس نے اسلام کو دنیا کا سب سے ترقی پسند مذہب اور مسلمانوں کو دنیا کی سب سے متقدم اور مذہب قوم بنا دیا تھا۔ یہ تاریخ ہمارے لئے ایک وقت بھر تاد جبرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب تک اسلام ایک بھرپور نظام حیات، ایک مکمل فلسفہ زندگی اور ایک مربوط اخلاقی شاخ کی حیثیت سے قائم رہا، مسلمانوں کو دنیا بھر میں سرزندگی اور فتح و کامرانی حاصل رہی۔ اور جو اس اسلام عمل سے زیادہ عقیدے، اور اعتقاد سے زیادہ رسوم اور رواج کا پابند بن گیا۔ مسلمانوں کی اخلاقی طاقت اور سیاسی قوت دونوں ہی زور و بردار نظر آنے لگیں۔ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اس بات کی گواہی ہے کہ اگر ہم مسلمان یہاں سب سے پہلے حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے۔ لیکن مسلمانوں کو ان کی آمد سے پہلے، اسلام کا پیغام یہاں پہنچ چکا تھا۔ اور عام لوگ اسلام کی تعلیمات اور اسلامی نظام کی خصوصیات سے متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ تھے۔ اور مسلمان تاجروں نے مقامی لوگوں پر اپنے بتاؤ۔ امن اخلاق اور اچھا داری کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ بعد میں سیاسی متوجہات اور اقتدار کی جنگ نے اسلام اور مسلمانوں کو اس درجہ غلط فہمی کا شکار کیا کہ مسلمان پادشاہ

کو کسی اعتبار سے اسلام کا نمائندہ کہا غلط ہو گا۔ یہ اسلامی تاریخ کا وہ دور تھا۔ کہ جب مسلمانوں کے لئے سیاسی اقتدار اخلاق سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن جہاں تک مسلمان صوفیوں، بزرگوں اور عالموں کا تعلق تھا، وہ اقتدار سے بے نیاز اپنے بے لوث اور اپنے بلند کردار سے ہندوستانی کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچاتے رہے۔ میرے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کے لئے پادشاہوں کے مقابلے میں ان ہی نقیروں کا درجہ قابل قدر اور باعث افتخار ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے تاریخی سرمایے یا سیاسی ماضی سے لاتعلقی رہ گئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی ہے، اور ان میں اچھے اور برے دونوں قسم کے مسلمان شامل ہیں۔ لیکن اس کے بھی زچہ اہم حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اشتراک سے ایک ایسی ملی جلی تہذیب اور ایک ایسا متنوع کلچر وجود میں آیا کہ جو ہندوستان کی تہذیب، تاریخ اور تمدن کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اس مشترکہ تہذیب اور تاریخ کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا اور جن لوگوں نے اس وقت حقیقت سے انکار کیا ہے۔ اپنے لئے الگ ملک اور الگ سلطنت کا مطالبہ کیا۔ ان کے حشر سے ہندوستانی مسلمانوں کو سبق ہی نہیں جبرت حاصل کرنا چاہیے۔ تاریخ کی بنیاد پر انکار کرنے، مذہب کی بنیاد پر الگ سلطنت کا مطالبہ کرنے والوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور سیاسی طاقت کا شیرازہ بکیر دیا۔ بلکہ پورے برصغیر میں باہمی منافرت، بے ہمتاوی اور دشمنی کی وہ آگ بھڑکادی۔ کہ جو آج بھی بجھنے نہیں پاتی۔ میں نہیں کہتا کہ آگ قسیت اور الگ سلطنت کا مطالبہ صرف کچھ مسلمان رہنماؤں نے ہی کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں میں بھی ایسے بے شمار لوگ موجود تھے، کہ جو مسلمانوں کے اس مطالبے کو اپنے عمل اور اپنے کردار سے تقویت پہنچاتے رہے۔ لیکن اس وقت برصغیر کی تقسیم کی ذمہ داری نہیں بانٹ رہا ہوں۔ اس تاریخی پس منظر کی صورت میں اشارہ کر رہا ہوں۔ کہ جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو بصیرت حاصل کرنا چاہیئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد مسلمانوں میں مایوسی اور محرومی کا جو احساس پیدا ہوا ہے۔ اس نے ان کے اندر احساس کمتری کا

ایک قسم کے **Persecution Complex** کو جنم دیا ہے۔ یہ تقریباً وہی حالت ہے کہ جس سے مسلمان مسیحیوں کی جنگ لڑنے کے بعد گندہ تھے۔ انگریز انجمن اپنا دشمن اور ہندو اپنا رقیب سمجھتے تھے۔ اور مسلمان سیاسی زہوں حالی، اقتصاد کی بحالی اور شکست خوردگی کا شکار تھے۔ وہ ماری دنیا سے بیزار اپنے ہی خول میں بند ہو گئے تھے، انگریزوں سے ناراضگی کی بناء پر ہاتھوں نے انگریزوں کی تہذیب اور جنم سے بھی کٹ کر کشمکش اختیار کر لی، یا دوسری اور شکست خوردگی کے اس خول میں محصور تھے احمد خان نے مستقبل کے امکانات کا جائزہ لے کر مسلمانوں کو عمل بدھ اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اور تنگ نظر قباؤں کی سخت مخالفت کے باوجود مسیحی مسلمانوں کو اپنے وجود کی تاریکیوں سے باہر لاکر حقائق کی روشنی کا سامنا کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ آج ایک بار پھر اسی دوسری، شکست خوردگی، اس کا سنگ اور بے یقینت کا شکار ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس کے نام پر سیاسی سودے بازی کی تھی، اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے، وہ قیادت سے بھی محروم ہے اور اپنے مستقبل پر اعتماد کی سعادت سے بھی محروم ہے۔ یہ کہ وہ ہر ہونہو ہمارے ہر گھر کو اپنی منزل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بے بس سوداگر نے مسلمانوں کے اس احساس محرومی سے فائدہ اٹھا کر لے لے تجارت بنانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یا دوسری اور پریشانی کو کوئی دھڑ نہیں۔ اور اگر مسلمان اپنے غمی کا اس قسم کا تجزیہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کریں تو تاریکی اور ناامیدی کے بادل چٹ جائیں گے اور ان میں ملک بھی پھر نئے تمام حاصل ہو جائے گا، اس لحاظ سے میری یہ گزارش ہے کہ سچے پہلے مسلمان اس حقیقت کو سمجھیں کہ چھپ چھپ چھپیں یہ ہیں برسوں میں دنیا کو بیت بدل گیا ہے۔ ہندوستان بھی بہت کچھ بدل گیا ہے، یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ بہت سے مسلمان آج بھی 1947ء کے قبل کے ہندوستان میں رہ رہے ہیں۔ وہ اسی طرح سوچتے ہیں، اسی انداز میں بات کہتے ہیں اور اپنی تعلقات وہی زبان استعمال کرتے ہیں، ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ انگریز چھپ چھپ ہے۔ اور ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت ہے، یہ ایک وہ کٹھن حقیقت ہے کہ اسے دیکھا جود ہر لے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی

حقیقت سے یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ آج ہمارا مسئلہ انگریز سے نہیں، اور انگریز کے ذریعہ نہیں، بلکہ براہ راست اپنے ہندو بھائیوں سے ہے۔ ہم ان سے کیا چاہتے ہیں ان سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ جب ہم ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے جذبات کو سمجھیں، ہمارے مسائل اور مشکلات کا اٹھانہ کریں تو ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے ہندو بھائی بھی ہم سے یہی توقع رکھتے ہیں۔ اس بنیاد پر مفاہمت کے جدید بات بھی ذہن نشین کیجئے، کہ اس ملک میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ جنہیں ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ایک آگ نہیں سمجھتا۔ اور یہ کسی بھی بھائی مسلمانوں کی حوصلہ شکنی اور دل آزادی کرنے پر تیار رہتے ہیں خوش قسمتی سے ان کی کمی کر دے کے اس کٹھن ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ اپنے عمل اپنے کردار اور اپنے گفتار سے وہ اس شرانگیز اقلیت کو تقویت تو نہیں پہنچاتے، یہ مسلمانوں کے لیے مفاہمت میں ہے کہ وہ اس خاموش اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ کہ جس نے ہندوستان کو ایک سیکولر ری پبلک بنانے کا فیصلہ کر کے مسلمانوں کو آئینی طور پر وہی حقوق اور وہی درجہ عطا کیے۔ کہ جو اس ملک کی اکثریت کو حاصل ہے۔ ہم جانتا ہوں کہ فرقہ پرست ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کو قدم قدم پر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن میں مسلمانوں سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ فرقہ پرستی کا زہر کبھی بھی فرقہ پرستوں کے قریب سے ختم نہیں ہوتا، مسلمانوں کو رد عمل کے طور پر نہیں، بلکہ مثبت طور پر سیکولر ازم اور غیر فرقہ واریت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ مشکل درست ہے۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے یہ ایک راستہ ہے۔ انہیں اکثریت سے ناراض ہو کر اپنے ہی خول میں بند نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ تعلیم، اقتصادی اور سماجی طور پر اپنے آپ کو بچھڑ کر اس ملک کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے۔ اور اس مقصد کیلئے انہیں وہ تمام ذرائع بروئے کار لانا ہوں گے جو ان کے پاس ہیں یا جو پیدا کرنا ضروری ہیں۔ میں اس سلسلے میں تعلیم کو سب سے مقدم سمجھتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ مسلمانوں کے پاس وقفہ کی جو جاری املاک موجود ہیں جن میں صرف مسلمانوں کی تعلیم پر صرف کیا جائے۔ تاکہ ہندوستانی مسلمان ذہنی طور پر آسودہ اور خوش حال بن جائیں۔

میں فرقہ واریت اور سیکولرزم کے خلاف جو فیصلہ کن جنگ لڑی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمان اس جنگ میں سیکولر قوتوں کا ساتھ دیں تاکہ فرقہ واریت کو ہمیشہ کے لئے شکست فاش ہو جائے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ چند سال مسلمانوں کے تعاون اور مشترک کے بغیر ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ خود فرقہ واریت کے زہر سے دھو رہ کر اس جدوجہد میں اپنا بھرپور حصہ ادا کریں۔

شیخ محمد مدظلہ

جہاں تک مسلمانوں کی سیاست کا تعلق ہے۔ اس کا بارے میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ لیکن اس بات کے دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کہ فرقہ پرست سیاست مسلمانوں کے لئے زہرِ ملامل سے کم نہیں۔ اور مسلمانوں کو فرقہ پرست لیڈروں اور جماعتوں سے دھو رہنا چاہیے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ فرقہ پرست لیڈر عدولتہ مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اسلام کا تاریخ میں مسلمانوں کے بدترین دشمنوں نے بھی کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ہندوستان

ہم بھوکے مرتے ہیں

سید احمد خاں کے نانا خاجہ فرید الدین احمد منغل بادشاہ اکبر شاہ کے وزیر تھے حکومت مغلی کا شہنشاہ تھی، بادشاہ مقرر دھن تھا، اپنے خان دان کے اختراجات کا بھی کفیل نہ ہو پاتا تھا قلعے کے شاہ زادوں کو جب خرچ نہ ملتا تو وہ قلعے کی چھت پر چڑھ کر چلنے لگتے تھے ہم بھوکے مرتے ہیں، ہم بھوکے مرتے ہیں! ملازمین کی بھی کئی کئی مہینے کی تنخواہیں چسٹھی ہوئی تھیں۔ خاجہ فرید نے شاہ زادوں، بیگمیں اور شاہی محلے کی تنخواہوں میں سے دس روپے فی سیکڑہ کم کر دیا۔ دیوان عام کی چھت گیری موٹے تانبے کی بنی ہوئی تھی جس پر سونے کا طبع چسٹھا ہوا تھا۔ یہ چھت گیری مراہٹا حملہ آوروں نے اکھاڑ ڈالی تھی مگر اپنے ساتھ لے جاسکے تھے۔ ان کا سونا الگ آ کر والیا گیا اور تانبے کو شاہی تنگ سال میں بیچ دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی قرض کا کئی لاکھ روپے ادا ہو گیا۔ مگر خاجہ فرید کو اپنی پوشش مندی کا اچھا مسئلہ ملا۔ شاہ زادے اور بیگمیں اپنی تنخواہوں میں کمی کی بنا پر ان سے ناراض ہو گئے اور آخر وہ مستعفی ہو گئے۔

کہ آجائے کوئی رہوار وحشت پر سوار اب بھی

کو دیکھنا ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ایک عملی منصوبہ بھی اس اجتماع میں پیش فرمایا تھا جو کچھ اس طرح کا تھا کہ مسلمانان ہند کو چار دائروں میں بیک وقت کام کرنا چاہئے۔

۱۔ اپنی پسماندگی دور کرنے کی کوشش

۲۔ خدمت خلق کے ذریعہ ہندو ماس کمیونٹ کا بروگرم

۳۔ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ اسلام کا قیام

۴۔ سیاست میں حریفانہ مقام سے ہٹ کر ملک سماج کو فائدہ پہنچانے

کے لئے احمد کی بنیاد پر اپنے دور کا استعمال اور معاہداتی سیاست کو اپنانا۔

ڈاکٹر صاحب کے الفاظ چاہے کچھ مختلف رہے ہوں مگر ان کا مفہوم تو یہی

ہی تھا جو میں نے اوپر مختصر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہم میں موجود نہیں

ہیں اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو پُر نور کرے اور ان کو کرڈل کر ڈٹ جنت

نصیب فرمائے۔ میرا اندازہ ہے کہ ملا کے بعد سے جب ۱۰۰ راج دہڑپتے

نہتے تھے اللہ زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور مختلف ادوار کے آثار و حقائق

کے مشاہد اور اپنے ذاتی مطالعے کی بنا پر اللہ نے ان کو جو بصیرت عطا

کی تھی وہ ہمارے دہریہ شاذ و نادر ہی کہیں پائی جاتی ہے۔

اپنے اس نقشے کی وضاحت میں انھوں نے لکھا تھا کہ اگر ایک طرف

مسلمان اپنے آپ کو تعمیری اخلاقی اور اقتصادی طور پر اوجھڑانے کی کوشش

جو جدید کریں دوسری طرف اپنی افرادی قوت کو دہلی کے کروڑوں اندر

کے پاس کوئی اجتماعی کام نہیں ہے) بے لوث اللہ بے غرض خدمت خلق کا

کام میں لگا کر محلے محلے اور سبھی سبھی ایک اخلاقی ماحول بنادیں۔ سر لنہا

اب سے تقریباً ۱۴ سال پہلے کی بات ہے انہیں گواہ میں کچھ موقوف مسلمان اکابر اور اہل فکر کا ایک اجتماع ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب نے مسلمانان ہند کے لئے ایک لائحہ عمل تجویز کیا تھا۔

یہ لائحہ عمل ایک معنوں کی شکل میں تھا اور شاید پرانے کاغذات میں اس کی

نقل بھی دستیاب ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ مسلمانان ہند کو ہشت

ایک ہاری ہوئی بازی ہونا ہے اور ایک ہاری ہوئی بازی کو جیتنے کے لئے

جنسی محنت جیسا مہر جس طرح کی تندی اور لگن اور جس قسم کی بصیرت جو

اتحاد و فکر اور جیسا استقلال فریضہ ہے ان سب صفات سے اپنے آپ کو

منتفع کرنے کی فرست ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا تجزیہ تھا کہ مسلمانوں

پر یوں تو ۱۰۰۰ آدمی جنگ جلاسی کے بعد ہی دہشتہ ۱۹۰۰ کے وقت سے

تقریباً اس شکست کے آثار پیدا ہو گئے تھے مگر اس کی ٹیکس ۱۹۰۰ میں

ہوئی جب کچھ پست و صلا افراد کی وجہ سے مسلمانوں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ

اپنی آدمی آبادی اور اپنی تہذیب کے ممتاز ترین مراکز سے دستبردار ہو کر اور

انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر شمال اور مشرق کے کچھ بکھرے ہوئے علاقوں کو

اپنی پناہ گاہ بنالیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اگر واقعی اپنے اندر یقین ہے تو

انہیں تہ بنیادی تصورات کو ہر وقت اپنے دلوں و دماغ میں مستحضر رکھنا اور

اپنے عمل سے اس کی گواہی دینا ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استعداد

کو اس حد تک بے محاشیں کہ ان کا وجود پورے ملک اور سماج کے لئے ناگزیر

ہو جائے اور ہر سہ یہ کہ وہ اپنی اخلاقیت کو قائم کریں اور پورا ملک محسوس

کرنے کے لئے محبت و شفقت و رحمت، انسانیت اور شرافت کے کسی بھی پیکر

دعوتِ تبلیغ کے لیے خود راہِ باطنی میں بیوجیا مسائل کا سفر کے سلسلے میں
شکرات کی تھی اس لیے اس کی رست میں اسلام کا اس طرح قمارت
کرائیں کہ وہ ایک رست کی بنیاد اور ایک فرستے کا خادم بنے کی بجائے
انسانیت کی رہائش کی آیت سے ملنے آئے اور چوتھی جانب دو ملکی
سیاست میں اس کے لیے کوئی دور عمری یا وزارت یا سیاسی پھردوں
سے دور رہیں اگر کچھ اور دور کا رست کی بنا پر ریاست اور سماج کو اختلاف
ٹوڑے بلکہ اند ایک فوری ریاست کی شکل دیے کی راہ نکلے اور ان کے
دولت کی تائید کے لیے اس کے ساتھ ساتھ جو چرنا نکالتے کی تائید کے
لیئے آئے ہوں اس لیے اس کے خلاف اس کے منصوبے پر ملدہ ملدہ ہو سکے اور
سینکڑوں کامیاب اور ناکام جہاں نیز نواہر اور ایامِ جمالیاتیں جس دائرے
میں کام کر رہے ہیں ان کو دورِ جاہلادیں تو مجاہدین کے دس سال میں اس
ملک کا نقشہ بدل جائے۔

نہیں ہے کہ اس مندرجہ بالا تجربے سے بعض لوگوں کو اتفاق نہ ہو لیکن اس بارے میں شاید کم ہیں لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ مسلمانوں نے ۱۷۵۷ء کے بعد جو بھی مساعی کیں ان میں ایک دو جوتے کے سمنا فائدہ نہ رہا بہت کم اور دفاعی رول زیادہ تھا۔ ۱۷۵۷ء کے بعد تو ہماری تمام ترکشوں کا محمد نواح اور تحفظ ہی رہا ہے اور اسی ایک نغمہ کے گرد ہم سب گھومتے رہے ہیں حالانکہ یہ بات دھکی چھپی نہیں ہے کہ دنیا میں جو گروہ بھی تحفظات کا خواہشمند ہوتا ہے وہ خود بخود اپنے آپ کو دوسرے درجے کی شہریت کے مقام پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے لیکن جو گروہ اقوام کی پوزیشن اختیار کریں اور ملک کی مختلف قوتوں اور عناصر کو سمجھ کر ان کو کھسی کسی حیثیت سے اپنی تحریک کا ہمنوا اور ساتھی بنائیں اور اپنا تحفظ بھی یقینی بنایا ہے اور ملک کا رخ بھی آہستہ آہستہ موڑ سکتا ہے۔

اس ابتدائی مقام پر آنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں ایک یہی کہ دوسرے معنی
و بجائی بات تو یہ ہے کہ ہم ملک اور سماج کے ایک ایک مسئلے سے اپنے آپ کو
مشتغی کریں اور اسلام کے اس دعوے کا ثبوت پیش کریں کہ وہ انسانی مسائل کا
سب سے بہتر حل پیش کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی افادیت اور حسن کا یہ معنی
انہما ہر اسی ذلت ہو سکتا ہے جو وہ ریاست سے لے کر سماج اور فرد و سب کی
زندگی پر حاوی ہو مگر ایک ایسی ریاست میں جس میں ہم آباد ہیں اگر ایسی ہمہ جہتی
نقشر پر علاوہ آمد ممکن نہ ہو تو بھی اتنا تو بہر حال ممکن ہے کہ ہم شریک مملکت کی
حقیقت سے اپنا نقطہ خیال نہ ہرٹ پیش کرتے رہیں بلکہ اس کے لئے ہم
کو ہموا بنانے کی بھی کوشش کریں۔

جس اکثریت کے افراد نے دیوں پر انھیں دستک دینی ہے اُس کے ذہن میں یہ بات ٹھکانا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو اقتدار کی ہوس نہیں اور وہ اکثریت سے کوئی چیز چھیننا نہیں چاہتے بلکہ اس ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ میں موجودہ سیاست کو خارج از بحث نہیں قرار دے سکتا۔ اس ملک میں ہیں ان مصلوں میں شریک ملک قرار دیا گیا ہے کہ ریاست کو چلانے والے ہاتھوں کے انتخاب میں ہم بھی اپنا وزن ڈال سکتے ہیں لیکن اس معاملے میں بڑی سوچی سمیٹ لانی ہے کہ مسلمانوں کو دونوں کے استعمال اور غلطی آپ کو امیدوار بنانے کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اپنے آپ کو امیدوار بنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم حریفانہ کشش کے اکٹھا رہے میں فرق بن جاتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے امیدواروں کو کامیاب کرنے کے لئے ہمیں یا تو کسی موثر پارٹی کا دامن تھامنا پڑتا ہے یا خود اپنی پارٹی تشکیل دینا ہوتی ہے۔ اگر یہی کوشش کا ساتھ دیا جائے تو اس کا آپس کی آپ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اس کی پالیسیوں کا خواہی نہ خواہی ساتھ دیں اور خود اپنے من کو اگے نہ بڑھا سکیں۔ یہی دوسری صحت تو اس طرح اگر کسی ایوان میں دس یا پانچ افراد ابھی جائیں تو ان کی معذی کا تو فرد رسامانی فراہم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مسئلے پر وہ ملت کی راہ دہی حاصل کر لیتے ہیں مگر اجتماعی طور پر اکثریت کے ذہن کو موڑنا ناممکن نہیں ہوتا بلکہ شاید کچھ اور فصد ہی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہاں اس کی جگہ اگر یہ صحت اختیار کی جائے کہ مسلمان اپنے دونوں کا اجتماعی طور پر استعمال کریں اور اپنی شرائط کھلے طور پر اکثریتی پارٹیوں کے سامنے پیش کریں اور پھر کھلے بندوں کسی پارٹی سے معاہدہ کر کے اس کا ساتھ

دیں تو اس طرح اکثریت کے ہاتھوں سے مسلط عمل کرنے میں انھیں ہمسائی ہو سکتی ہے۔ اب اس کا افسار خود مسلمانوں پر ہے کہ ان کی شرائط کیا ہوں اس میں ان کے دائرہ شکر نہ رہے اپنی ہر رنگ خود ہو تو اس سے تاریخ ایک طرح کے نکلیں گے اور ان کا اثرات ایک خالص قسم کا ہو گا اور اگر یہ دائرہ دوسرے ان دونوں کے درمیان اور عورتوں کے بھی وسیع ہو تو ہمسائیوں اور ان کا تعارف دوسری طرز کا ہو گا۔

آج کے بھٹان کے سپہ سالار نے دل ایک دوسرے سے بڑا رکھا ہے کچھ ہے ہیں اور ان کی آپس کی نزاعوں سے یہی صورت پیدا ہو رہی ہے اور ہر کی سطح پر نیک لوگ آتے ہوئے گھبراتے ہیں لیکن کسی گروہ کو اگر کوئی اور افراد کی ضرورت تائید حاصل ہو جائے تو نصفیات بھی چنداں نہیں رہیں۔ افراد کے انتخاب پھر وزن ڈال جائے اور اپنی مرضی سے نیک من افراد کو مجالس قانون ساز میں مائتدگی کرائی جاسکے۔

یہ مسلمانوں کے کام کا صرف ایک چوہ ہے باقی تین امور ان کے لئے اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۱، خدمت خلق کا پروگرام ۲، اپنے صاف رہنے کی اصلاح ۳، اور اسلام کا تعارف و تبلیغ۔ یہ تینوں امور اس لائن ہیں کہ ان پر مسلمانوں ہند کے دانشور اور درمند اصحاب اپنا نقشہ کار بنا سکتے ہیں نیز جو کام ان میدانوں میں ہوتے ہیں ان کے تجربات کو سامنے رکھنا ان کو اور تقویت بخشی جاسکتی ہے۔

مسلمان اگر حریفانہ کشش سے دست کش ہو جائیں تو قیامت اسلام کی موت دیکھنے کیلئے بھی رہیں کھلی گئی ہیں اور ملک پر وہ اپنا گہرا نشان بھی ثبت کر سکتے ہیں۔

موازنہ پارسی اور مسلمان

دوسری تاریخ کو الہ آباد میں قیام کیا، تیسری اپریل کو ہم بٹانہ جیل پور پہنچے یہاں بیلوں کی دستگیریں کر لیں اور تین دن در تین رات برابر چلے اور جاگ پور پہنچے۔ آگ پور سے دہلی پر سوار ہوئے اور آٹھویں تاریخ قریب دہلی پہنچے۔ الہ آباد سے بمبئی تک ایک گاڑی میں چوکیات کیے رہیں۔ کیا گورنمنٹ کے اہل کاروں سے ہر ایک جگہ اردو میں گفتگو کی۔ سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے تھے۔ یہیں میں پانچ جی ہوٹل میں دو کمرے لئے۔ ہم وہاں نہایت دھوئے کپڑے بدلے۔ ہمیں میں مجھ کو پارسی بہت پسند آئے انھوں نے نہایت عمدہ مہماندہ سے قومی راق مشروع کی ہے مگر انوس ہے کہ مسلمان ہر جگہ سے چھپے ہیں۔

(د سترید احمد خاں یو پی کے سفر پر جلتے ہوئے)

تقسیم ملک کے مابعد اثرات

کاشکار ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ہندوستانی مسلمان کی اس گہری جذباتی عقیدت کی ایک اور معقول وجہ بھی ہے۔ اور وہ ہے ان دونوں کا خونی رشتہ، برصغیر کی تقسیم نے مرنے والے ایک ملک ہی کے دو ٹکڑے بننے کے گہروں اور خاندانوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکیاں اٹھل پھلنے لگیں۔ ملکوں کے درمیان باہمی نفرت، عداوت اور شک و شبہ کی آبی ادابی اونچی دیواریں حائل کر دیں کہ آج، سال بعد بھی ال بیٹے سے بھائی بہن سے، بیوی شوہر سے اور بیٹا باپ سے ملنے کی حسرت میں تپ رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پاکستانی مسلمانوں کے آدھے سے زیادہ عزیز اور رشتے دار ہندوستان میں ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے بیشتر عزیز و اقارب پاکستان میں ہیں۔ اس حوالہ سے پاکستان نے دونوں کو ایک ناقابل بیان مصیبت ہی میں نہیں ملک کی اکثریت کی فکرمندی میں ایک ناپسندیدہ دماغی کیفیت میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ جنہیں اس جذباتی کرب اور نفسیاتی کشمکش سے کبھی دو چار ہونا نہیں پڑا ہے۔ اور مغربی پاکستان کی ساری ہندو آبادی چونکہ مکمل طور پر اکھڑ کر ہندوستان میں آباد ہو گئی ہے اس لئے اس ذہنی عذاب سے نجات مل گئی اور اسے زیادہ سے زیادہ اپنے مکان باغ باغیچے یا دوسری جائیداد کا ہی ماتم کرنا پڑا اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں تقسیم ہندوؤں کو تقریباً ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا کہ جس سے ہندوستانی مسلمان عرصہ

ہندوستانی مسلمان کی جان عذاب میں ہے اور وہ ایک شدید قسم کے ذہنی کوئٹہ میں مبتلا ہے، تاریخ نے اس کے ساتھ ایک ایسا بے رحم مذاق کیا ہے کہ وہ بغیر کسی گواہ کا ارتکاب کئے شدید قسم کے احساس گناہ کا شکار ہے، اس کا دل اور دماغ ایک ایسی نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ ہے کہ جس نے اس کی شخصیت کو

(SCHIQOPRENICK) بنادیا ہے۔ اور وہ بیک وقت دو ملکوں کا شہری روحانیت قوتوں کا وفا دار، دو متضاد فلسفوں کا پرستار اور دو قوموں میں بٹی ہوئی ایک روح ہے مسلمان ہونے کے باوجود اسے صرف برصغیر ہی میں نہیں تمام دنیا میں مسلمانوں کے مفادات اور مستقبل سے گہری کچپی ہے اور پاکستان چل کر ایک مسلمان ملک ہی نہیں بلکہ اسلام کے نام پر قائم کی جانے والی دنیا کی پہلی ملکیت ہے اس لئے پاکستان کے ساتھ اس کی گہری جذباتی وابستگی اور روحانی عقیدت ناگزیر بھی ہے اور ناقابل فہم بھی جو مسلمان ترکی میں خلافت کی بحالی کے لئے جان دینے پر آمادہ ہوا کے لئے پاکستان کی بقا اور اس کی سلامتی سے گہری کچپی کا اظہار کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ اور تعلقات کی روشنی میں ہندوستانی مسلمان کے لئے پاکستان کے متعلق کسی قسم کی ہمدردی یا کچپی کا اظہار کرنا جو کہ حسب الوطنی کے تقاضوں کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس لئے ہندوستانی مسلمان عام طور پر اس جذبے کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں ایک شدید قسم کے احساس گنا

۲۷ سال سے دوچار ہے یہی وجہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں نے ان پر ہمیشہ ہندوستان کی وفاداری اور ہندوستان سے گہری جڑ بانی و بستگی کی تمہت لگائی۔ اور یہ وفاداری اور یہ وابستگی میری نگاہوں میں اتنی ہی ناگزیر اور قابل فہم تھی کہ جتنی ہندوستانی مسلمانوں کی پاکستان سے رنجی، بے شک و دیش بننے کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے لئے نفعیاتی مسئلہ نہ ہو جائیگا لیکن بھگت دیش کے اندرونی منافات کا اگر علم رکھتے والوں کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ بھگت دیش کے ہندوؤں پر جب بھی جی کوئی افتاد پڑتا ہے ان کی نگاہیں ہندوستانی طرف اٹھتی ہیں اور ان کی وفاداریاں اور ہمدردیاں اسی طرح ہی ہوئی ہیں کہ جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان گزشتہ ۴۷ برسوں کے تعلقات کی تاریخ نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس تکلیف دہ صورتحال کو اور زیادہ ناقابل برداشت بنا دیا ہے۔ اور مسلمان کو اپنے ملک سے وفاداری کا اعتبار دلانے کے لئے پاکستان سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار اور اعلان کرنا اگر ضروری نہیں تو عین مناسب سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بے شمار ایسے ہندو موجود ہیں کہ جو پاکستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی کوششوں میں تو پیش پیش ہیں لیکن پانچ چھ کروڑ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان نیک جو کھل کر یہ بات کر سکے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ ذہنیت اور فسادات کو ختم کرنے کے لئے پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات استوار ہونا بہت ضروری ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان پاکستان کا نام لیتے ہیں، ایک احساس گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ یا تو پاکستان کو گالی دے کر اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے، یا پاکستان کی ہر بات کی غلط تاویل کر کے اپنی وفاداری کو خنکوک بنا دیتا ہے اور جو لوگ یہ دونوں باتیں نہیں کر سکتے وہ رات کی تاریکیوں میں مسجدوں کی چار دیواریوں اور باہمی سرگوشیوں میں پاکستان کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں بالفاظ دیگر یہ کہ پاکستان کے تیس مسلمانوں کا رویہ اور رجحان ہر حال نازل نہیں اور نہ موجودہ حالات میں ایسا ہونا ممکن دکھائی دیتا ہے۔

میں اس کی ذمہ داری نہ ہندوؤں پر عاید کرتا ہوں اور نہ مسلمانوں پر۔ یہ صورت حال تقیہ ملک کے اس غیر نظری آپریشن کا منطقی نتیجہ ہے کہ جس نے ایک مال کے دو ٹکڑے کر کے یہ قانون نافذ کر دیا کہ ایک ہی جسم کے ان دو ٹکڑوں میں کوئی ربط کوئی رشتہ کوئی تعلق باقی نہ رہے جس طرح تقسیم کا عمل ایک غیر انسانی، غیر نظری اور وحشیانہ فعل تھا اسی طرح یہ قانون بھی ناقابل عمل اور ناقابل قبول ہے پاکستان کے ہندو (ان کی تعداد اگرچہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے) اور ہندوستان کے مسلمان دونوں ہی قوم پرستی، صاب الوطنی اور وفاداری کے تمام مسئلہ تو ان میں تو گہرے ہندوستان اور پاکستان کے مفادات مستقبل اور سلامتی سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے رہیں گے اور میرا دعویٰ ہے کہ بھگت دیش کے ہندو بھی ہمیشہ ہندوستان کے ساتھ ایک گہری وابستگی محسوس کرتے رہیں گے میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک سے وفاداری اور اپنے پڑوسی ملک کی سلامتی سے گہری دلچسپی میں کوئی ایسا تضاد نہیں کہ اسے گناہ تصور کر کے اس کا انکار کرنے والوں کو قابل گردن زدنی سمجھا جائے۔ جب ہم نے ملک کی تقسیم کے گناہ ظلم کو ایک تاریخی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہے تو ہمیں اس سے پیدا شدہ نفسیات اور نتائج کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کرنا چاہیئے مسلمانوں کو ذہنی کرب روحانی عذاب اور نفسیاتی کشمکش سے آزاد کر کے ان میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنا ضروری ہے اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ انہیں گناہ اور جرم کے احساس سے نجات دلائی جائے اس مقصد کے لئے پاکستان کے ساتھ ہمارے ملک کے تعلقات بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے حکمرانوں کو باہمی تناؤ کشمکش اور تصادم کی موجودہ نفسیاتی راس آتی ہو۔ لیکن ہمیں اپنے طور پر موجودہ ناگوار ماحول کو خوشگوار بنانے میں سہل کرنا چاہیئے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ بے چینی ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور ان کے حالیہ مصائب اور مسائل کو اپنے ناجائز مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے بہت سے بازاری ڈاکٹروں، بناپتی سبھاؤں اور سیاسی سوداگروں نے اپنی اپنی دکانیں بجا رکھی ہیں

بر لیڈر اور ہر سیاسی جماعت ان کی بے چارگی اور بیماری کا قائلہ اٹھا کر نئے نئے سچے بخویر کرتی ہے اور نیم حکیموں کی اس سچائی نے مسلمانان ہند کی جان خطرے میں ڈال دی ہے ان بازاری ڈاکٹروں میں سب سے خطرناک قبیلہ ان ڈاکٹر دل کا ہے کہ جو مسلمانوں کے زخم سچ کر اپنے لئے سیاسی اقتدار کی منہ سجالتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کو ہمیشہ جذباتی طور پر آلودہ، سیاسی سطح پر ملک کی اکثریت سے بالکل الگ ٹھگ اور ذہنی اعتبار سے بالکل براگندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کو اپنے شاندار مہی کی یاد دلانا کران کے مستقبل کو تباہ کرنے اور اپنے ہتھیار کو سوار کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں ان کا مفاد اسی میں ہے کہ مسلمان اس موجودہ ذہنی کشمکش سے کبھی آزاد نہ ہوں تاکہ ان کی قیادت اور سیاست کو کبھی کوئی گزند نہ پہنچے اور وہ اطمینان سے زعموں کی تجارت کرتے رہیں یہ لوگ مسلمانوں میں فرقہ وارانہ رجحانات کو ہوا دیتے ہیں انھیں ملک کی اکثریت کے تیس بدطن کرتے ہیں اور اپنے اعمال اور کردار سے ملک کی اکثریت کو مسلمانوں سے بیزار اور بدطن ہونے کے سوانح فراہم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو قوی یک جہتی کی تعلیم دینے کی بجائے انھیں علیحدگی پسندی کی ترغیب دیتے رہتے ہیں اور ہر رانی کو پھاڑ بنا کر ان کے معمولی مسائل کو بھی خطرناک اور لاعلاج بیماری کا رنگ دیتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو فرقہ پرست ہندوؤں سے زیادہ ان ہی سہاؤں سے زیادہ خطرہ ہے اور ان سے خرد دار رہنے کی اہمیت کو، ضرورت کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

پاکستان کی حکومت اور پاکستانی لیڈروں کو بھی مسلمانان ہند کی مجبوریوں اور صیبتوں پر ٹھوسے بہانا زیب نہیں دیتا کیوں کہ ایک توان کی ہمدردی اور ان کی غم خواری مشکوک ہے اور وہ واضح طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان سے اپنا سیاسی مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، دوئم ان کی غم خواری سے ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلے تو کیا حل ہوں گے ان کی نوعیت زیادہ پیچیدہ اور ان کا حل دشوار تر ہو جاتا ہے یہ پاکستان کے ارباب سیاست اور اہل اقتدار ہم پر بڑا کرم کریں گے کہ اگر

وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر ہمارے اندر نی معاملات میں دخل نہ دیا کریں لیکن مجھے ذاتی طور پر اس بات کی توقع نہیں کہ وہ اس کرم فرمائی پر آمادہ ہوں گے۔ کیوں پاکستانی حکمرانوں کو ہمیشہ اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو ذہنی آسودگی اور جذباتی اطمینان حاصل ہوا تو پاکستان کی نظریاتی اساس ختم ہو جائے گی اور پاکستان کے عوام ان سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دونوں ملکوں کے درمیان نفرت، بدظنی اور بے اعتمادی کی موجودہ دیواریں کب تک حائل رہیں گی؟ ہندوستان اور پاکستانی عوام کے درمیان آمد و رفت، اقامت و تفریح اور میل ملاپ کے عمل میں قدم قدم پر روٹے ٹکڑے اٹکانے کی موجودہ کوششوں کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔

ہندوستانی مسلمان کا مستقبل کیا ہے؟ اسے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا قطعیت کے ساتھ کوئی جواب دینا ممکن نہیں۔ لیکن ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی مسلمان کا مستقبل خود ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہے اگر سارا ملک تعلیمی مساوات، ذہنی پستی، اقتصادی بد حالی اور سیاسی انفرافری کے اس اندھیرے سے باہر نکل کر آگے بڑھنے میں کامیاب ہوا تو ہندوستان کا مسلمان بھی خوش حال اور آسودہ ہو گا۔ کیوں کہ نئے ہندوستان میں مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ نفرت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی اس کے برعکس اگر ہندوستان کی سیاسی قیادت اقتصادی محاذ پر ناکام ہو کر اس ملک سے بھوک، غربت، افلاس اور لاچارگی مٹانے میں کامیاب نہیں ہوتی تو بچپن کر ڈر ہندوؤں کے ساتھ چھ سات کر ڈر مسلمان بھی ڈوب جائیں گے اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل گہرے طور پر اس ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے انھیں کیا کرنا چاہیئے یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن انھیں کیا کرنا چاہیئے یہ میں کہہ سکتا ہوں انھیں کسی قیمت پر بھی کسی مسلم فرقہ پرست جماعت کا آلہ کار نہیں بننا چاہیئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے فرقہ پرست سیاست خودکشی کے مترادف ہے اور اسلام میں خودکشی گناہ عظیم ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا تاریخی کردار

سراج الدولہ، حیدر علی اور سلطان ٹیپو سید سپر ہو گئے۔ حیدر علی کی قرب کاری نے تو انگریزوں کو اس قدر دکھایا تھا کہ وہ ہندستان چھوڑ دینے کے بارے میں سوچنے لگے تھے لیکن یکایک فرانس انگلستان میں مسلح ہو گئی۔ اور اس مسلح کے نتیجے میں ہندستان کی فرانسیسی فوج سلطان یسور کی امداد سے کنارہ کش ہو گئی، اچانک حیدر علی کا بھی انتقال ہو گیا اور انگریزوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ سلطان ٹیپو نے اپنے خون سے داستان بریت کو رنگین بنا دیا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریزی حکومت کے قدم مضبوطی سے بٹھنے لگے۔ یہ حکومت اپنے ساتھ جدید مغربی تہذیب کا بیج بھی لائی۔ نئے زمانے کا جواب ہونی و شمالی ہند کے مسلمانوں نے خلع انداز میں دیا۔ جنوبی ہند کے اونچے اور متوسط طبقوں کے مسلمان زیادہ تر تجارت پیشہ تھے عرب نے باہر ملابار اور ان علاقوں میں بس گئے تھے۔ یہاں انھوں نے اسلام کی روشنی پھیلانی تھی اور ہندوستانی سماج کا ایک جز بن چکے تھے۔ ان باہروں کا رویہ ”مقامی معاشرت“ کا تھا۔ اپنی گہری مذہبیت کی وجہ سے مذہبی عقائد اور روایات پر وہ مضبوطی سے قائم رہے لیکن انگریزی تعلیم اور مذہبی علوم کو بھی حاصل کرنے پر تیار ہو گئے۔

جنوبی ہند کے برعکس شمالی ہند کے مسلمان عموماً جاگیردار تھے یا سرکاری ملازم کی حیثیت سے شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ انگریزوں کی پالیسی ان کیلئے خصوصی طور پر تسم قائل تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعتبار کردہ رویتے کی وجہ سے مسلمان جاگیرداروں کے ہند

تہوں کی زندگی میں مشکلات و تنواریاں، اب نشاط انگیز، کا اثر رکھتی ہیں۔ اور ان کی تعداد و صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہیں۔ لہذا اگر عصر حاضر کا ہندوستانی مسلمان مشکلات میں گھرا ہوا ہے تو یہ کیفیت بالکل ایسی و نا ایسی کی بجائے نوید بخا افرائے ہوئے ہے۔ تاریخ کی ہر گز دہشت نے ان قوموں کو نئی و پیچیدہ صورت حال سے دوچار کیا ہے۔ اور انھیں نازک و دشوار پوزیشن میں لائے رکھا کیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان بھی تاریخ کے اس تسیب و فراز سے گزرا ہے۔ زمانے کے تقاضوں سے وہ بھی یہ حسرتاں نہایت اظہار سے محسوس اور نئے جوش و نئی امنگوں سے نمودار اس سے ہر تہ ذلت کا جواب اپنے انداز میں دیا ہے۔ ہر دور کے ریتے حالات نے اس ہندوستانی مسلمان میں ایمان کی چنگاری کو متحرک کیا ہے اور اسے صاحب فکر و عمل بنانے میں کامیاب کیا ہے۔

ایسی چنگاری بھی دیاب اپنے ناکستریں تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کا یہ واضح کردار ان پر وقتاً فوقتاً لگائے جانے والے طبعی پسندی کے ہر الزام کو مسترد کر دیتا ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کر دیتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ہر زمانے کو اہتول۔ نیز نگیاں عطا کی ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کی نوعیت اور ان کے موقف کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پیچھے مگر نہ لگی کے ہر موڑ پر ان کی ادا کیا رہی اس کا ایک تجزیہ کیا جائے۔

ٹھیکے دار موردی زمین دار بن گئے اور مسلمان امراء کا یہ طبقہ ختم کرنے لگا۔ سرکاری ملازمتوں سے بھی مسلمان دھڑے دھڑے ہٹائے جانے لگے۔ مسلمان علماء بھی انگریزوں کی پالیسیوں کا شکار ہونے لگے۔ انگریزوں نے شرعی عدالتوں کو ختم کر کے سول عدالتیں قائم کر دیں۔ ان عدالتوں میں قاضی و مفتیوں کی حیثیت سے مسلمان علماء کی بجائے انگریز افسر ہوا کرتے تھے۔

1

کی طرف منتقل کیا جائے۔ ۱۶۲ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا
دارالعلوم ندوۃ العلماء نے دین اسلام کو جدید دنیا کے سامنے خوشتر انداز
میں پیش کرنے کے سلیج کو کامیابی کے ساتھ نبھایا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد مسلم مسلمان معنوں میں جو دی گئے
 پر عمل ہوا کہ اب اس کی دو میں صرف آزاد ہندستان کا مسلمان تھا۔ گوکہ
 یہ زبردستی کچھ مسلمانوں کو ایک بار پھر بدلتے زمانے کے چیلنج کا سامنا ہوا۔
 موجودہ بحران کو، ۱۹۵۵ء کے آئینے میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اور پی ہادی
 کا پیش کردہ تجزیہ آج بھی ایک اہم دست اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن
 موجودہ بحران، ۱۹۵۵ء کے بحران سے کہیں زیادہ سخت ثابت ہوا ہے۔
 آزادی کے بعد فسادات باق عروج پر پہنچ گئے، سارے ملک میں۔
 جاگیرداروں اور زمین داروں کا خاتمہ ہوا۔ اور ۱۹۵۷ء کے بعد مسلمانوں
 کا جو بھی بچا کچھ جاگیردار طبقہ تھا، اس کی طور پر ختم ہو گیا۔ ان طبقوں کی
 معاشی حالت بھی تباہ ہو گئی۔ جو جاگیرداروں اور زمین داروں کے تھا
 والہ تھی۔ ترک وطن یا ترک وطن کا ارادہ رکھنے والوں کی جائیداد
 کے بارے میں جو سخت قوانین نافذ ہوئے۔ انھوں نے کاروباری طبقوں
 کو انتہائی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ کیوں کہ اب کا وہ بار کیلئے قرض
 یا فراہمی سرمایہ کے امکانات ختم ہو گئے۔ یہ قوانین بعد میں ختم کر دیے گئے
 لیکن نئی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے کاروباری طبقہ کا افسار حکومت
 پر پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا۔ اور اس صورت حال نے نئی مشکلات
 کھڑی کر دیں۔ سرکاری عہدوں و ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد روز
 بروز گرتی رہی اور معاشی بد حالی زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہونے لگی۔
 جوں جوں وقت گزرتا گیا مسلمانوں کے مسائل کی فہرست میں اضافہ
 ہی ہوتا رہا ہے۔ فسادات، معاشی تنہائی، تعلیمی پیمانی، ہندو مت
 یونہی ہوئی مستقبل شرمیلی قوانین کی حفاظت اور ان کی سختی دیگر کتنے
 ہی مسائل سر فہرست ملیں گے

آج ہندوستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ کی بنیادی
 نوعیت یہی ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت اور زمانے
 کے تقاضوں کو کس طرح ہم آہنگ کریں۔ اس ضمن میں خصوصی طور پر
 دو مسائل پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جانے کے منجملہ دیگر ہندوستانی
 مسلمانوں کے موقف اور ان کی جدوجہد کے رخ کی نشاندہی کرتے ہیں۔
 ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی و تہذیبی مستقبل اور ان کے ساتھ
 عمومی وابستگی رکھتا ہے۔ لہذا ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے حل کا
 ایک بڑا اجزا اس میں ہے کہ اردو پر اقتصادی و معاشی دروازہ کھول دینے
 کے لئے

ہائیں۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے ہندوستان کے موجودہ سانی
 مسئلہ کو سمجھنا ہوگا۔

دستور ہند نے اردو کو کبھی ایک ملکی زبان تسلیم کیا ہے لیکن
 آزادی کے بعد مختلف ریاستوں، مخصوص گھوڑے اردو یوپی میں
 اردو کو ابتدائی و ثانوی درجہ تعلیم کے کمال کراسے موت کی نیند سلانے
 کی کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ کوئی ماتھے مسہانے تو واضح الفاظ میں کہہ دیا
 ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاست یوپی کے ترقیاتی منصوبے
 کی پہلی آئینہ اردو کی تباہی تھی۔

۱۹۵۶ء میں سانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم عمل میں آئی۔
 اس تنظیم نو میں اردو کی قسمت میں کوئی علاقہ نہ دیا گیا۔ ہر ریاست
 میں غریب الوطن ہو کر رہ گئی۔ سانی تنظیم نے اردو کی کس فہرست
 میں اضافہ ضرور کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی مختلف ریاستوں میں سانی اقلیتوں
 کے مسئلہ کو بھی شدت کے ساتھ ابھارا۔ اور اردو کو کبھی ان سانی اقلیتوں
 کی صف میں لاکھڑا کر دیا۔ اب ہندوستان میں اردو کی قسمت ان سانی
 اقلیتوں کی قسمت سے وابستہ ہو گئی ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی میں
 اردو طبقہ ۱۵ فی صد ہے۔ اس میں غلطیوں کا کیا ہے؟ دیگر
 ملک پر بھی ایک نظر دوڑائیں انہیں زبان کے مسئلے سے اپلا پڑا ہے
 سوئٹزرلینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن تین سرکاری زبانیں رکھتا ہے۔
 جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانیں سرکاری زبانیں ہیں جبکہ آبادی میں ان
 کا تناسب حسب ذیل ہے۔

جرمنی ۱ - ۲۲ فی صد

فرانچ ۳ - ۵ فی صد

اطالوی ۵ - ۹ فی صد

کناڈا میں انگریزی اور فرانچ دو سرکاری زبانیں ہیں۔ بلجیم میں
 فلیمش اور فرانچ کو سرکاری زبانوں کا درجہ دیا گیا ہے۔ سوئٹزرلینڈ
 میں تقریباً دو سو زبانیں ہیں جن میں تقریباً ۱۴ زبانیں اہم ہیں اور
 قوانین گزٹ وغیرہ ان سب سول زبانوں میں شائع ہوتے ہیں
 دستور ہند میں - مذہب "کا تصور اور مشترکہ سول کوڈ کی ہدایت
 ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی انفرادیت کیلئے سخت تشویش کا باعث ہیں

شہر کی قرابت کی منسوخی اور شہر کے سول کوٹ کے لحاظ کا تصور آزادی کے بعد کی پیدوار ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنچا یا گیا ہے آئین کی ذمہ داری ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو، جس کے ایک سیکولر لک "میں عدالتوں نے یہ تان پھینچا" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے ضروری اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کر رہ مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد و رواج و رسومات کی آلودگی سے پاک کرے۔

اسی دوران میں۔ یہ سہریج بہادر سپرد خود کنگھے الکاہد بھی گئی۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بسترِ علالت بلکہ بسترِ مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے یہ سہ کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا وہی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ یہ تحریک کے ایڈیٹر گویانی نعل جو اردو کے بڑے حامی ہیں۔ بتاتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام دلشان بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے کچھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے، پاکستان چلے جاؤ۔ یہاں کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پسندوں کی اور وہاں کہاں کہاں ہے وہاں اسکے لئے کام کیوں نہ ہو۔ اور اس سے نہ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اور تم نہیں جانتے کہ ہمارے گھر میں چرس یا ایون رکھ کر تیس گز تار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالو اردو کا سچ بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دُعا ہے۔

بابائے قوم علامہ اقبال کی ایک تقریر سے

اقتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

24 فروری 1969ء

ہندوستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ تاریخی گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کاپانی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے معراجِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری سیکولر اور روادار ملک کے شایانِ شان ہو گا اور ایک سنگتے ہوئے مسئلہ کا معقول و بامدار اور نیشنل حتیٰ ہوموگنیٹس اس کی کوئی راہِ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں چاہتے ہیں وہ تاریخ کے دھڑکے کی خلاف ورسی کر رہے ہیں۔

سفینہ بزرگ گل بنائے گا قافلہ مورتا توں کا
ہزارہ موحوں کی بے کشاکش نگہ ہے پار ہوگا

ہندوستانی مسلمانے

مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا روایتی مذہب یا کلیسا، یا علما یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہندو جب شریعت بنا تو یہاں اس لئے تدریجی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا دیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سکھڑیا اور دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپرین گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجملہ تعبیرات پر اصرار کیا جو اوقات کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آئیں مسلماتیں کوڑھی تھیں اور اس لئے انسان کی مادی ترقی تخریج نظریات، تخریج کائنات، مشینی نظام کی سہولت، اداسی و نجات کے منصوبوں میں خارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب سے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجود فکر کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتے ہے بلکہ ہر حرکت کچھ غریبے بعد اپنی حد سے بڑھ کر رحمت ہوجاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی رحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے جینے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح جو کمزور کم کو پیدا نہیں کرتی بلکہ سلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی انیون بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعضا

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے کیونکہ مادی وسائل میں ترقی و علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی اہمیت کی پوری زندگی کو متاثر کرتے ہوئے کھلیا جاتا ہے کہ ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ ایسی بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا انشور اور مفکر ایک مذہب ہی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ لڑاؤں کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہب ہی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنس دان سائنس اور روحانیت کا ملاپ کر دانا چاہتے ہیں۔ میں ایسا نہ کہی سے یہ محسوس کرنا ہوتا کہ موجودہ فکر و ذہن اگر سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے ہر سال پیشتر تھا اور مذہب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقاء۔ قوموں کی تاریخ، انکار اور تدارک کی تاریخ کا جو ٹھٹھا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور نیچے اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے، اس لئے مجھے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں

یہاں تاریک ہاں دھندلا

اسی دوران میں، میں سرینج بہادر پیر کو دیکھنے لگا۔ وہ ہماری انجمن کے مدرسے اور اس زمانے میں بستر علات بلکہ بستر مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرت زبان کام دیتی تھی اس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام بھٹا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا تو ہی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ "تحریک کے ایڈیٹر گویا جیل جوار دو کے بڑے حالی ہیں۔" لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام دلشان بھی نہ رہے گا۔ میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے۔ پاکستان چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پیدا ہوئی اور وہاں کی وہ زبان ہے۔ وہاں اس کے لئے کام کیوں نہ کرے۔ اور برائوں نے مجھ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جانتے تو ہمارے گھر میں ہیں یا انیوں رکھ کر تیس گرتار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی اردو کا سچ بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے؟

بابائے مولو عبدالحق کی ایک تقریر ہے

اقتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

24 فروری 1969ء

شرعی قوانین کی منسوخی اور مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی چیز ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنچایا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ ۲۵، مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غریبیک ایک سیکولر ملک، "میں عدالتوں نے یہ "شان پیغمبرانہ" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے فروعی اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد و رواج و رسومات کی آلودگی سے پاک کرے۔

ہندوستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے معر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری سیکولر راہروا دار ملک کے شایان شان ہوگا۔ اور ایک سگتے ہوئے مسئلہ کا معقول بانٹار اور پیش رفتی ہوگا۔ جنہیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو ملنے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں چاہتے ہیں وہ تاریخ کے صفا کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

مصر مرنے پہ بھوس کی امید۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں، کلی مسائل کا، ہم سب ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک و گمانی لہجہ متمادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی نفا کا نتیجہ تھا کہ کتنوں کو "انڈیا ونس فریم" کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند-پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے صوفی سیٹ میں چھپا ٹر انسیمیٹر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود واضح ہے

سفینہ برگ گل بنائے گا قافلہ مویرا نقاں کا
ہزار موجوں کی ہر کشاکش نگہ سے چلے پاد پھکا

ہندستانی مسلمانے

مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا روحانی مذہب یا کلیسا، یا علما یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہندوین جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سکھایا اور دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپرین گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان سمجھ تعبیرات پر اصرار کیا جو وقت کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھیں تھیں اور اس لئے انسان کی مادی ترقی تخریر و تفسیر کا ناسات، مبینی نظام کی مہولت، اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں حارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور نعمتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجود بلکہ کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ نعمتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ عرصے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت ہو جاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی رحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے مہینے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح جو کم کم کن کو میلار نہیں کر لے بلکہ سلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی انیون بن جاتی ہے جو بالآخر اعضا

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکرین کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کا انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کا صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یاد دہانا چاہتے ہیں یا دانشور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ ٹوڈن کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنس دان سائنس اور روحانیت کا ملاپ کر دانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداروں سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر و ذہن گر سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور وہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقاء۔ قوموں کی تاریخ، انکار اور تقدار کی تاریخ کا جو ٹھکانہ بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ ملنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں

میاں تارک ہاں دھندلا

اسی دوران میں، میں سیرج بہادر پیردو کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بسترِ علالت بلکہ بسترِ مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا بھی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ "تحریک کے ایڈیٹر گوپالی بھل جو اردو کے بڑے حامی ہیں لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام دلشان بھی باقی نہ رہے گا۔ میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم میاں کام نہیں کر سکتے، پاکستان چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پیدا ہو اور وہاں کچھ زبان ہے۔ وہاں اس کے لئے کام کیوں نہ کرے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو ہمارے گھر میں چرس یا اینون رکھ کر تیس گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی اردو کا کچ بنایا اگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے؟

بابائے مولو عبد حق کی ایک تقریر ہے

اقتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

24 فروری 1969ء

شرعی قوانین کی منسوخی اور مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی چیز ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنچا دیا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غریب لک "سیکولر ملک" میں عدالتوں نے یہ شان پیغمبرانہ اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے مضموری اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد و رواج و رسومات کی آلودگی سے پاک کرے۔

ہندوستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری سیکولر راہروں و اداروں کے شایان شان ہوگا۔ اور ایک سنگتے ہوئے مسئلہ کا معقول پائدار اور پیش نظر حل ہوگا۔ جنھیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں چاہتے ہیں وہ تاریخ کے صدار کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

ختم کرنے، بھوس کی امید۔ ناامیدی اس کی دکھا چاہیئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں بلکہ مسائل کا اجماع ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک و گمانی اور معاشرہ کی مخالفت ہے۔ اور کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کنسوں کو انڈیا وٹس فریم کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے موفد سیرٹ میں چھپاڑا ضمیر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود واضح ہے

سفینہ بزرگ گل بنائے گا قافلہ عبورِ آقاں کا
ہزار موجوں کی ہولناکیں گمت ہائے پار ہوگا

ہندوستانی مسلمانے

مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا روحانی مذہب یا کلیسا، یا علما یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہندو جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدردانی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سیکڑیا اور دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپرین گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان عجیب تعبیرات پر پھر اکیا جو قدرت کے بلی جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھیں انہیں انسان کی مادی ترقی تسخیر نظرت، تسخیر کائنات، مبینی نظام کی مہولت اور ناجی نجات کے منصوبوں میں خارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجود بلکہ پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ غریبے بعد اپنی مدت سے بڑھ کر رحمت ہر جاتی ہے، اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی رحمتیں بھی ہوتی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے مینے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا سلسلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ نہ کو بیدار نہیں کرتی، بلکہ سُلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی انمول بن جاتی ہے جو بالآخر اعضا

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے۔ کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کا انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کا میلان کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا انتہا اور مفکر ایک مذہبی بنیاد پر رعبانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ تو این کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ مائینڈ ان سائنس اور روحانیت کا ملاپ کر دانا چاہتے ہیں۔ میں ایسا انداز سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر ذہنی گرسائش کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور مذہب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا۔ قوموں کی تاریخ، انکسار اور تقدار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراض ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ ملنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں

ہندوستانی مسلمانے

یہاں تاریک ہاں دھندلا

اسی دوران میں، میں سیرتج بہادر پیر و نودیکھے الہ آباد بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بستر عیال بکھ بستر مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا واقعی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ یہ تحریک کے ایڈیٹر گوپال چند جوارو کے بڑے حامی ہیں۔ بولتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام دلنشان بھی باقی نہ رہے گا۔ میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے، پاکستان چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پیدا ہوئی اور جہاں اس کا دلہا ہے۔ وہاں اس کے لئے کام کیوں نہ کر دوں۔ میرا انھوں نے یہاں یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے گھر میں چوس یا امیون رکھ کر تیس گز فاصلہ کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی اور دو کالج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے؟

بابائے مولو عبدالحق کی ایک تقریر ہے

انتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

24 فروری 1969ء

مشرقی قزاقستان کی نسوخی اور شتر کر سول کوڑکے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی پہلی بات ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مضمون پہنچا دیا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ (۱) ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غریب ایک سیکولر ملک، میں عدالتوں نے یہ نشان پھیرا ہے۔ اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے فردی اور غیر فردی غام کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر فردی عقائد و رواج و رسومات کی آلودگی سے پاک کرے۔

ہندوستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب دیا ہے۔ انمازیں دیا ہے۔ کراچی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے معر حاضری کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری سیکولر اور ادارہ ملک کے شایان شان ہوگا۔ اور ایک سنگت ہوئے مسئلہ کا معقول بائدار اور پیشکش حق ہوگا۔ جنہیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں دیتے ہیں وہ تاریخ کے ہمارے کبھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

ضمیر مرنے، ہوجس کی امید۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں بلکہ مسائل کا اجماع ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک و گمانی اھم و اتادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کنٹون کو انڈیا وائس فریم کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے موفد سیٹ میں چھاپاٹر انسپٹر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود راج

سفینہ برگ گل بنائے گا قافلہ مور ناتواں کا

برادر مومن کی ہر کوشش، گمراہی سے پار ہوگا

ہندستانی مسلمان

مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا روایتی مذہب یا کلیسا، یا علما و یا برہمن اس ترقی کے مخالفت رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ برہمن جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سکھ یا اور دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپرین گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجید تعبیرات پر اصرار کیا جو دقت کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھیں تھیں اس لئے انسان کی مادی ترقی تسخیر نظریات، تسخیر کائنات، مبینی نظام کی مہولت، اداسماجی علاج کے منصوبوں میں خارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور نعمتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجود بلکہ کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ نعمتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ عرصے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت پہنچاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی زحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے جینے کے کام کو مشینوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے زحمت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور نہ صرف تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سُلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی انیورن بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعضا

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی اگساں کی پوری زندگی کو متاثر کر دینے کا صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا انتشار اور مفکر ایک مذہبی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مودعہ ٹو این بی کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنس دان سائنس اور روحانیت کا ملاپ کر دانا چاہتے ہیں۔ میں ایسا انداز سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ مکر و ذہم گرو سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور وہ اب مذہب سے تعلق کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سادے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا۔ قوموں کی تاریخ، انکار اور ارتقا کی تاریخ کا جو ٹھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراض ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ ملنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں

میاں تارکٹ ہاں دھندلا

اسی دوران میں، میں سرسبز بھارہ پر نور دیکھنے لگا۔ وہ بھی گیا۔ وہ ہماری آنکھ کے مدرتے اور اس زمانے میں بستر علات بکھر بستر مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرت زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام بیٹا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا تو ہی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ یہ تحریک کے ایڈیٹر گویاں بٹل جو اردو کے بڑے حامی ہیں کہتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام دلشان بھی باقی نہ رہے گا۔ میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم میاں کام نہیں کر سکتے، پاکستان چلے جاؤ۔ میں سے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پیدا ہوئی اور وہاں کہ وہ زبان ہے۔ وہاں اسکے لئے کام کیوں نہ کر دو۔ انہوں نے کہا کہ میاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جانتے کہ تو تمہارے گھر میں چوں یا ایوں رکھ کر تیں مگر خوار کر دیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی اردو کا کج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے؟

بابائے مولو عبدالحق کی ایک تقریر ہے

اقتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

24 فروری 1969ء

شرعی قوانین کی منسوخی اور شستر کرسول کو بڑے فضا کا تصور آزادی کے بعد کی پہل ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنچا دیا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ (۲۵) مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ فریڈک ایک سیکولر ملک، "میں عدالتوں نے یہ نشان پھیرا ہے" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے مروجہ اور غیر مروجہ خاص کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر مروجہ عقائد و رواج و رسومات کی آلودگی سے پاک کرے۔

ہندوستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی اعزاز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے معاصر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری سیکولر اور ادارہ ملک کے شایان شان ہوگا۔ اور ایک نئے مسئلہ کا معقول ہائمد اور پیش حل ہوگا۔ جنھیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں جانتے ہیں وہ تاریخ کے صدار کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

خضر مرنے پر جس کی امید نا ابدی اس کی دیکھا جائیے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں بلکہ مسائل کا اجماع ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک بدگمانی اور اعتمادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کنوں کو انڈیا ولس فریم کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی فرزند پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے موقع سمیٹ میں چھاپڑا نسیم بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود راج

سفید برگ گل بنائے گا قافلہ مودہ نازاں کا
بزم مہجوں کی بکشا کس گمے دیارے پلڑیوں کا

ہندوستانی مسلمانے

مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا روحانی مذہب یا کلیسا، یا علما یا برہمن اس ترقی کے مخالفت رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہندو جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سکھڑیا اور دوسری طون یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپرین گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجھد تعبیرات پر ابھرا کر کیا جدوت کے بل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھڑی تھیں اور اس لئے انسان کی مادی ترقی تفسیر نظریات، تفسیر کائنات، تفسیر نظام کی سہولت، اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں خارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس بُرائے نسخے سے نہیں ہو سکتا جن کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور نعمتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانونِ قدس کے مطابق موجود بلکہ پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ غریبے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت ہو جاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی رحمتیں بھی ملی ہیں مشین ہنر و سائنس آدمیوں کے مہینے کے کام کو مشینوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے رحمت کا سلسلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سُلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی انیون بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعضا

میں سے اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکرین کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے۔ کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کے احسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے لگا ہوا ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا دستور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد پر ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ موجد نوانین کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنس دان سائنس اور روحانیت کا ملاپ کر دانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداروں سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر و ذہن گورسائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیش تھا اور وہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقاء۔ قوموں کی تاریخ، فنکار اور فنکار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے افسران ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ ملنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں

ہمارے ہندوستانی مسلمان بہتر

کو بے معنی بیجا نیت کا عادی بنا دیتی ہے اس کا علاج ذرعت کو کم کرنے یا تفریق کو کم کرنے میں نہیں بلکہ ایسی بے معنویت کی حامل تقریحات کو عام کرنے میں ہے جو اقدار کے احساسات کو باقی رکھے اور اعضا کو براہین کی طرف نہ لے جائیں۔

مذہب کے بھی بڑے پہلو کے جاسکتے ہیں۔ ایک عقائد و سرائے عبادات، تیسرا معاملات، ظاہر ہے کہ عقائد کے سلسلے میں بنیادی عقیدہ توحید رسالت کا ہے۔ ایمان کے لئے اقرار یا انسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی بھی شرط ہے لیکن چونکہ دل کا حال ہم نہیں جانتے اس لئے سوائے اس کے کہ ہم اقرار باللسان کو مان لیں ہمارے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے یعنی جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے وہ مسلمان ہے اور ہمیں اس قول پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے رہا عبادت کا معاملہ تو سر عبادات دو قسم کی ہیں ایک انفرادی عبادات اور ایک اجتماعی جس طرح عید کے معاملے میں صدیوں سے مسلمانوں نے تکفیر کے ذریعہ ایک دوسرے کو گالے کی کوشش کی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے فرقوں کا آغاز ہوا پسندیدہ طرح عبادات کے مسائل میں انفرادی تفریط ہوئی ہے اور امام کی قیادت پر ملو یا لاؤڈ اسپیکر کے بغیر نازم پامصر ادا آمین بالچکر مخالفت اور موافقت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عقیدے کے معاملے میں بنیادی شرط کو کاٹی نہیں سمجھا گیا اسی طرح عبادات کے سلسلے میں دین کی روح کے بجائے معنی کے فوے کو زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ رویت ہلال کا سلسلہ اس کا مزید ثبوت ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عقیدے کے معاملے میں اگرچہ دینی زندگی کی سہولت پر اہل ادلی نظر تھی مگر بعد کے شارحین نے ایک فانی بال طبقے کے لئے عقائد و عبادات کے ایسے قوانین بنائے کہ دینی زندگی کی مصروفیات میں غلطی نہ ہو، بچپن میں بے پڑھا تھا کہ حضرت معاذ بن جبل صبح کی نماز میں ٹہری کبھی صبح میں پڑھتے تھے ایک صحابی نے جھیلنے کا نام پڑھا تھا نیت تو رکھ چکے تھے بن سے پچھا کیا معاذ رسول اللہ تک پہنچا، آپ نے حضرت معاذ کو طویل صورتیں پڑھنے سے روکا۔

میرے نزدیک اسلام کی حیات بخش اور حیات آفریں طاقت کو ان مبصرین اور شارحین نے بہت نقصان پہنچایا کیونکہ ان کی نظر

مذہب کے تیسرے پہلو یعنی معاملات پر اتنی گہری دیکھی۔

حالات کا قلعن صرف ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان سے رشتے تک نہیں ہے بلکہ اس میں غیر مسلموں سے رشتہ بھی آجاتا ہے۔ معاملات کے سلسلے میں اسلام کے اصول عمل اور مسادات پر مبنی ہیں مگر عملی زندگی میں پہلے با دشامت نے پھر فتوحات نے پھر رسم و رواج نے اس حسن و ملک پر ایسی گروچڑھا دی کہ معاملات کے ددورس اثرات کو نظر انداز کر کے صرف عقائد و عبادات کی صحت اور نیک خاص نمیا کے مطابق صحت پر بند دیا گیا معاملات میں معاشرت و معیشت کا پورا نظام سیاہی سیاہی زندگی کے بھی عنوان آجاتے ہیں۔ سماجی تبدیلیوں کے ساتھ اس تصور میں تبدیلی ضروری تھی مگر مجموعی طور پر اس تبدیلی کی مخالفت کی گئی اور چون لوگوں نے اس تبدیلی پر زور دیا انھیں کا زور دینا نہ کہا گیا۔ یہاں اس حقیقت پر

زور دینا مقصود ہے کہ سامتی یا جاگیر دارانہ نظام کے تقاضے اور سختی اور صحتی نظام کے اور سٹالسٹ نظام کے اور میں لیکن تاریخ عالم کا یہ ایک تجربہ ہے کہ جس طرح مغرب میں کلیسا کے عام طور پر دوسرے اقتدار طبقے کا ساتھ دیا اسی طرح اسلام کی تاریخ میں بھی چند نفوس قدسہ اور آزاد رالیوں کو چھوڑ کر عام طور پر ایسے علماء برسر اقتدار طبقے کو چھوڑ بیسرا گئے جو بھائے بنیادی مسائل پر غور کرنے کے اور سماجی تبدیلیوں کا ساتھ دینے کے عام مسلمانوں پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے فقہ کے خاص اصولوں کی پابندی پر زور دیتے رہے۔ اور بنیادی معاملات میں نیادت کو بادشاہوں یا فاتحوں یا فوجیوں پر چھوڑ کر مطمئن ہو گئے۔

دین کی سلامتی کے لئے اس کے دینی پہلو پر جو توجہ ضروری تھی وہ نہ ہو سکی۔ مثلاً جمہوریت کا موجودہ تصور اسلام میں نہیں ہے مگر جمہوریت کی روح موجود ہے۔ جب انقلاب فرانس کے بعد مسادات اخوت حریت کا فقرہ بلند ہوا اور اس سے پوری دنیا متاثر ہوئی تو اس کی کچھ قواعد اسلامی دنیا تک بہت دیر میں پہنچی دوسرے قدیم نظام تعلیم نے چونکہ وہ کمزور غائب میں اٹھے رہے کا عادی بنا دیا تھا۔ اور علوم دینیہ کی تحصیل ایک ایسا طبقہ کرنا تھا جو دینی علوم کے بڑھتے ہوئے سرمائے سے کا حق و اوقاف دقت اس لئے جس طرح بہرین اپنی ذات کے اقدار کو باقی رکھنے کے لئے سنسکرت کی تعلیم کو عام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح علماء بھی علوم دینیہ کی تعلیم صرف ایک خاص طبقے کے لئے

کربانی رکھنے کے لئے چاہتے تھے اس کا کام بڑا اور دینی علوم سے مربوط بڑا انھیں گراما دھنا اپنے استاد کے نام اور رنگ زیب کا خط اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ شاہ ولی اللہ نے میں اپنے رسالے الانشا فی بیان مہمب الاختلافات میں اچھے علم و فضل کے متعلق ایک لطیف بات کہی ہے۔

خلفائے راشدین کا ہمارا ایک دور ختم ہو گیا تو زمانہ خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو نہ اس امانت کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے ورنہ ان میں فتویٰ اور احکام شریعت سے گہرا نکتا و تھا اسلئے وہ مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے اور فقہائے شرعی جاری کرنے کے لئے مجبور ہوئے کہ فقہاء سے مدد لیں اور انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھیں۔ جاہ پسند لوگوں نے جب دیکھا کہ ان فقہاء کی بڑی عزت ہے اور وہ اپنے اغراض و استغنائے گہرا ہر جاہ باب حکومت کے مطالبہ خاطر چنے ہوئے ہیں۔ تو ان کے دلوں میں علم دین حاصل کرنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا۔ بلکہ اسے مانا دین لاکر عزت و شرف کا سوا کریں۔ قبل و قال اور اعتراض جواب کا بانا و گم ہو چکا تھا۔ اور بحث و مناظرہ کی راہیں ہمارے دین و نفا کے لئے یہ چیزیں دلچسپی کا مرکز بن گئیں اور ایک صفت تک پہنچ رہیں۔ یہاں تک کہ ایسے خلفاء اور سلطان پیدا ہوئے جو فقہی مناظروں کے دلدادہ تھے جنہیں اس وضاحت کے سننے کا بڑا شوق تھا کہ فلاں مسئلہ میں اولیٰ مسلک مسلک حنفی ہے یا مسلک شافعی نتیجہ یہ ہو کہ تمام ارباب فن کلام ائمہ دیگر کلام کے میدان تحقیق و جستجو سے نکل کر اختلافی مسائل فقہ کے سر کے میں اُتر آئے۔ سیستم یہ کہ ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے اسرار و راز کا استنباط کر رہے ہیں اس خیال کے تحت انھوں نے تصنیفات کا ڈھیر لگا دیا۔ اور بحث و جدل کے

میں بہت سی کتابیں لکھیں۔

اسلئے دیکھا کہ ڈولے افسوس کر وہ اب تک کسی رفتی پر چلے جا رہے ہیں معلوم نہیں کب تک مجلس اور مشعل میں کیا ہونے والا ہے۔ (کتب اس از علی گڑھ تحریک)

میں دراصل اسی پر زور دینا چاہ رہا ہوں کہ یورپ نے ازمنہ و سنی کی جن ذہنی پابندیوں اور فکر پر احتساب سے نشا طنائیم کے دور میں آنادی حاصل کر لی۔ اسلامی دنیا نے یہ کوشش شاہ ولی اللہ سرسید اور جمال الدین افغانی کے ذریعہ اپنے اپنے دائرے میں کی مگر عجری طور پر جو احتساب یہ پابندی ابھی تک موجود ہے۔ میرے نزدیک یورپ میں دور جدید صنعتی انقلاب، انقلاب برائیس، مابکسی تعلیم و کسب و کمال اور بیسویں صدی کی ساری ذہنی و فکری ترقی اس دور کی ذہنی آنادی کی زینت منبت ہے جس نے ایک طور پر حریت فکر پر پابندی کو ختم کیا۔ دوسری طرف سماجی و سیاسی زندگی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی فلاح کو قید بنایا اور تعلیم و کمال کی جو لوگوں میں خدمت خلق و محبت اور سماجی انصاف کو عام کیے۔

اسلامی دنیا میں نشا طنائیم پورے طور پر کہیں نہیں آیا جہاں آیا وہاں چند ہی معاملات میں نشا طنائیم کے ثمرات ظہور میں آئے۔ دوسرے اسلامی دنیا نے صنعت و صنعت کی طریت توجہ دہی نہ دینی علوم میں دل کھول کر جھڑپا اسنے انجیلری، ڈاکٹری، جراحی کا دوا میں غیر مشہور کی اجارہ داری قبول کر لی۔ اپنے انجیلری و فکٹر جراح اہل حرفہ پیدا نہیں کئے۔ ان کے مقابلے میں دبا دلاور فوج کو اہمیت دی۔ زمیندار کو زمین دے کر وہ بے فکر ہو گئے۔

اسی زمین کے مناسب استعمال اور پیداوار کے بڑھانے اور کافوں کے استعمال پر پوری طرح توجہ نہیں کی آخر یہ کیا بات ہے کہ اسے سے صرف ہل اور تلوار میں چٹائی گئیں۔ اور سہلے چاندی اور ہیرے نکال کر صرف دولت پیدا کی گئی۔ زیر زمین معدنیات کو اپنے پاس کے نظر کم گئی۔ علمائے تونے کی ماسکتی بھی کہ وہ اسلام کی دعوت کو داس کی حیات بخش فوٹ کو عام کر کے عالم اسلامی دنیا میں زندگی کی رو دوٹھا دینگے۔ مگر وہ عمرنا اس جاگیر و اطلہ نظام اور اس شہنشاہیت کی پشت پناہی میں لگے رہے۔ جو رتہ رتہ یہ وقت کی راگنی ہوئی جا رہی ہے۔

میرے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد قدیم ہندوستان کے ذات پات میں جھڑپ ہوئے اور تنگ چھادوں میں پناہ گزیں ، لوگوں کے لئے ایک تازہ ہوا کاجھونکا تھی جو نظام مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے اُس میں نسبتاً علم کو عام کرنے اور سماج کی بہتر تنظیم کی حکمت تھی مگر جب یہ صلاحیت جاتی رہی تو قدیم ہندوستان اور ازمنہ سنی کے ہندوستان دونوں کو مغرب کے زیادہ فعال زیادہ ہمہ گیر زیادہ حیات آفریں زیادہ سماجی خیر اور دینی نفع رکھنے والے نظریات نے جن کے پیچھے روشن خیال کے دور کی روشنی کی کرن تھی اس پس ماندہ جائیداد تنگ نظر اختلافات رنجشوں خود غرضیوں اور فروعات میں گھرے ہوئے نظام کو شکست دیدی یہ بات کسی غلامانہ ذہن یا مغربے شاعر ہو کر نہیں کی جا رہی ہے یہ اس وجہ سے کی جا رہی ہے کہ میرے نزدیک انسانی تہذیب ایک اکائی ہے ۔ اس زمانے میں اس کی قیادت ایشیا اور افریقہ نے کی پھر یہ قیادت عربوں کے ذریعہ سے یورپ کو مل اور آج تک یورپ اور امریکہ نے اس کا روال کی قیادت کی ہے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کونکر کے دائرے میں بھی مغربی خلق کا کارنامہ کیفیت و کثرت کے لحاظ سے کم نہیں ہے ۔ علوم کے لحاظ سے اس کا سرمایہ تمام تہذیبوں کے سرمایہ پر فوقیت رکھتا ہے ۔ فطرت کی فحش اور مادی دسائی کی آزادانی کے لحاظ سے اس کا جواب نہیں ہے ۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس نے صدیوں کا کام برسوں میں کیا ہے ۔

اگر صرف اسلامی علوم کو لیا جائے تو یورپ اور امریکہ نے اسلام پر جو تحقیق کی ہے وہ باوجود بعض فطری عجوبوں کے مجموعی طور پر اسلامی مورخوں اور محققوں سے ذہن سکی میرے نزدیک ان سب تہذیبوں کا راز حریت تھی ہے اور جب تک اسلامی دنیا حریت فکر کو نہ اپنائے گی دنیا اور دین دونوں کے دائرے میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکے گی ۔

اس لئے میں سرسید کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ۔ سرسید کی دوسری خدمات بڑی عظیم الشان ہیں ۔ مگر میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس عقلیت کو جو روشن خیالی کے دور نے مغرب کو عطا کی تھی اپنا رہسوتا یا

کھنڈ کیا تھا ۔

علم کی جستجو اور عقل و علم دونوں کو فطرت میں سمودیا ۔ فطرت علم کا سرچشمہ اور عقل کی لسوٹی ، فطرت سمجھا رہا ہے اور فطرت ہریان ہے ۔ اگر آدمی فطرت کی بات پر کان دھرنے تو کبھی نہیں بہک سکتا ۔

سرسید کی تحریک نے رفتہ رفتہ اپنے اثرات دکھائے مگر سرسید کی عظیم الشان ذہنی مبادی کی ہم کا بنیادی کام مسلمانوں کی ذہنی تربیت تھی ۔ جس کے لئے دو اپنی مذہب پر انھیں کاوی ضرب لگانی پڑی ۔ لیکن وہ ایم ، اے ، اے کا لہجہ کی زینت بن کر رہ گئی ۔

ہندوستانی ذہنی مسلمانوں کے ذہن پر بیسویں صدی میں سب سے گہرے اثرات امیر علی ، ابوالکلام آزاد ، نیا ز فچوری اور اقبال کے پڑے ہیں ۔ ان چاروں نے سرسید سے نفیس حاصل کیا ۔ مگر اقبال کا علی گڑھ سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ وہ ایم ، اے ، اے کا لہجہ جس کی تعریف ہمارے رشید صاحب کرتے نہیں ٹھکتے ۔ مسلمانوں کی قیادت اس لئے نہ کر سکا کہ سرسید نے پہلے اس کی خاطر تہذیب الاخلاق میں اخلاقی مسائل پر مضامین قلم بند کئے کا دعوہ کیا اور پھر کالج کی مذہبی تعلیم اس طبقہ کے حوالے کر دی جس کی مخالفت وہ نہ بد مذہب سے اپنی تحریک میں کر چکے تھے ۔ ظاہر ہے کہ مغربی علوم کی تعلیم اور انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے ۔ مگر سرسید کا بنیادی کام پورنہ ہوس کا بیڑا کا کام ہندوستانی مسلمانوں کا ازمنہ سنی کے ذہن سے نکال کر روشن خیالی کے دور میں لانے کا تھا ۔

اگر سرسید کے مذہبی خیالات کالج میں پڑھائے جاتے اگر ان کی تفسیر بھی دوسری تفسیروں کے ساتھ درس کا جز ہوتی ہے ۔ اگر ان کے ابتدائی خاکے کے مطابق انگریزی کے مدرسے کے علاوہ اردو کا مدرسہ اور عربی فارسی کا مدرسہ بھی ہوتا ۔ اور اگر انگریزی کے مدرسہ کے صرف ایک مقصد کی فکر نہ ہوتی بلکہ دوسرے پر بھی توجہ ہوتی تو وہ ذہنی انقلاب عمل میں آسکتا تھا جو سرسید کا حقیقی مقصد تھا لیکن مشکل یہ ہوئی کہ قدامت پرست مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے ادبی فرائد پر ہی توجہ کی اور صرف لازمتوں کے حصول کا ہی ذریعہ سمجھا اگر وہ اور انگریزی ادب کے سانسے انکار و افتدرا کا خیر سمجھ کر توفیقاً یہ آتش فزود اسی طرح گلزار بن جاتی جیسا کہ سرسید

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے بن گئی تھی۔

بات یہ ہے کہ سائنس اور علوم جدید یا مشینی اور صنعتی کمالات سے واقف ہونا کافی نہیں ہے ان کی روح تک پہنچنا ضروری ہے ہندوستان میں عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں میں خصوصاً ایک دو شاخیں ہیں۔ یہ معلومات و مسائل ہنر حاصل کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ اسکے بغیر چارہ نہیں مگر ان کے پیچھے جو ذہن ہے اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

سر سید کو کالج کی خاطر اپنے ذہن خیالات کی اشاعت ترک کرنا پڑی کالج کے قیام کے زمانے میں انھیں انگریز پرنسپلوں کو امدان کی سیاست کو بھی قبول کرنا پڑا۔ اس وقت کی یہ مجبوریاں کچھ میں آتی ہیں مگر یہ عیبت کی بات ہے کہ آج بھی ہندوستانی مسلمان مذہب کے معاملے میں سر سید کا پوری طرح منہوا نہیں آج بھی اجتہاد جس کی ضرورت پر سر سید نے اتنا زور دیا تھا اور جس کو اقبال نے بھی اپنے نکتہ میں مرکزی حیثیت دی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک خطرہ بن کر نظر آتا ہے۔ مغرب جو صلیب جھنڈوں کے اشعار کی وجہ سے اسلام کے ساتھ انصاف نہ کر سکا تھا آج مشینوں کے اثر سے اسلام کے آفاقی پیغام کی اہمیت کو محسوس کرنے لگا ہے۔ شناخت، منسکری، وراثت بننا ڈیڑھ سو اور کینیٹ دیں اسلئے کہ خیالات اس سلسلے میں قابل غور ہیں۔

ہندو ذہن و عقائد شروع ہی سے لچکنا دیں۔ اس لئے یہ بات کچھ میں نہیں آتی کہ ہندوستانی مسلمان کیوں خوفزدہ اور اپنے مصارعین بندھے نئے انکاس سے خطرہ سارے مذاہب کو ہے صرت اسلام کو ہی نہیں۔ اپنے اپنے چند سادہ عقائد اور عملی تعلیم کی وجہ سے ان نئے لوگوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے ہندوستانی مسلمان اس جدید دور میں اپنا خاص اہم ردول ادا کر سکتا ہے۔ اور معاملات میں چند اخلاق اور سماجی قدروں کو اپنا کر محنت اور خدمت خلق پر زور دے کر اپنے غلط اثر کو وسیع کر سکتا ہے مگر اول تو وہ علماء کی قیادت کے زیر اثر ہے دوسرے اس وقت کی ذہن سے چپکے رہنے کی وجہ سے تیسرے جاگیردار اور مزارع پر عمل کرنے کی وجہ سے ہر اس اصلاحی کوشش کی مخالفت کرتا ہے۔ جو خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ وقت اور حالات کا تقاضا ہے

اس سلسلے میں چند مثالیں دینا چاہتا ہوں

۱۔ عرب اسرائیل کی کشمکش میں اسرائیل کی فترت صرف امریکہ کی مدد کا نتیجہ نہیں بلکہ دراصل جدید ذہن اور ازمہ وسطی کے ذہن کی ردائی ہے اور عربوں کی شکست مجموعی طور پر ازمہ وسطی کے ذہن کی شکست ہے۔ ۲۔ ہندوستان میں سوشل ریفارمر کا جو سلسلہ رائج ہے۔ اس کے لئے شائع ہوا اس کا قدرتی نتیجہ ہندو کڈیل تھا۔ ہندوؤں نے مجلس جماعت مسلمانوں سے بہت پیچھے تھے۔ اتنا انقلابی تبدیلی کو قبول کیا۔ مسلمانوں کو ازدواج کے متعلق علماء کے اثر سے ہندوستانی مسلمان ایک ہر اس تحریک کی مخالفت کرتا ہے جو تعداد ازدواج پر پختہ دہی سے بھی پابندی لگانا چاہے۔ اس سلسلے میں ایک ذاتی گفتگو کا حوالہ دینا شاید عیبت ہو گا۔ جس زمانے میں مولانا حفظ الرحمن مرحوم تندرہ تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ریگنڈ کوئٹل کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے یہاں آتے تھے تو اکثر مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا تھا جب اخباروں میں یہ اطلاع آئی کہ پاکستان میں تعداد ازدواج پر پابندی لگائی گئی ہے۔ مولانا میری شادی کرنے کے لئے ایک ٹریبونل سے اجازت لینے پڑے گی جس میں ایک ماہر قانون ادب ایک عالم ہو گا۔ تو میں نے مولانا سے کہا کہ آپ ہندوؤں میں شہم کا قانون کب لیں گے تو پھر ہندو نے کہا آپ اس قانون کی ترقی ہوں مگر ہندوؤں کا سیکرٹ حکومت کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے ہیں بعض دوسرے اسلامی مالک کا حوالہ دیا جہاں اس زیادہ رد عمل تو نہیں بتائے گئے ہیں مگر مولانا نے میری بات سننے سے ہٹا کر دیا۔ اور کہا کہ مسلم حکومتوں کو یہ حق ہے مگر غیر مسلم حکومتوں کو نہیں۔ میرے نزدیک اگر ایک سیکرٹ حکومت مسلمان۔ دانشوروں، مسلم قانون دانوں، وکیلوں، علماء، سنجیدہ اندو مدار اشخاص کے مشورے سے ایسا قانون بنائے تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ قانون کے سلسلے میں ایک نکتہ اور اہمیت رکھتا ہے آج بھی ہندوستان کے بہت سے مسلمان شرع محمدی کی جگہ رواجی قانون پر چلتے ہیں۔ تعلقہ داروں اور زمینداروں میں یہ میلان عام رہا ہے ظاہر ہے رواجی قانون شرع محمدی کے خلاف پڑتا ہے اور دولت کو چند مخصوص اہل حق میں رکھنا چاہتا ہے۔ بڑے لوگ کو زیادہ حق دیتا ہے۔ اور لوگوں کو عام طور پر جاہل حق سے بھی محروم رکھتا ہے جاہلی عدالتیں اس رواجی قانون پر چلنے کی اجازت دیتی ہیں اور علماء

اس سلسلے میں کوئی احتجاج نہیں کرتے اسی طرٹ سے اس سلسلہ کا مزاج کے سلسلے میں یا طلاق کے سلسلے میں بھی عام مسلمان کو اگر اجازت ہو کہ وہ یا تو شرع محمدی کی پابندی کرے یا ملک کے قانون کی تو ایسی صورت میں بیچ کی ایک راہ ہو سکتی ہے۔

اسی طرٹ خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ ہے۔ ماہرین اقتصادیات اس بات پر متفق ہیں کہ اگر آبادی کی تعداد بڑھتی بڑھتی رہے تو فدا کا دوسرا یہ جو زمین میں چلی ہوتا ہے ناکافی ہو جائے گا۔

دوسرے سادہ سنہری ہوا اور کھلے ہوئے گھروں میں رہنے کا تصور خواب ہو جائے گا۔ اب بھی بڑے شہروں کے گھروں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں گے جنہوں نے آسان نہیں دیکھا۔ دریا اور سمندر سے ناواقف ہیں۔ پڑھا لکھا طبقہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھتا ہے لیکن سچے طبقے میں چونکہ مالی پریشانی زیادہ ہے۔ اور زندگی کی غتیلوں کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے تعلیم کی کمی اور سنجیدہ مشاغل سے محرومی ہوتی ہے۔ اس لئے تفریح صرف جنسی عمل میں ممکن ہے جس کا نتیجہ بچوں کی کثرت ہے۔ اور بقرل اکبر۔

عاشقی قید بشریت میں جو آجاتی ہے۔

جلوہ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

علماء سے توقع یہ تھی کہ وہ درانت، طلاق، تعداد اولاد خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق قرآن کی روح سے استفادہ کر کے جدید حالات اور جدید مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں گے مگر ان معاملات میں علماء کوئی اقدام کرنے کو تیار نہیں نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان طبقہ جہاں مسائل سے دوچار ہے وہی احکام سے غفلت کرتا ہو نہ رشتہ مندرجہ کے بیگانگی کی شکل اختیار کرنا جاتا ہے۔ اور بعض خالی خولی اسلام کا نام لیکر اپنی زندگی غیر مذہبی بنانے کا میلان کرتا جا رہا ہے۔ مگر ان کا حل کوئی نہیں نکالتا پاکستان میں جب جنرل ایوب خان نے اس سلسلے میں اقدامات کیے تو ملانے سختی سے ان کی مخالفت کی اور عوام کے طبقہ نے نئی نسل نے ان کا ساتھ دیا۔

چند بدش خیال علما کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ہندوستان کے علماء تقلیدی رہے ہیں انہوں نے اجتہاد کے مسئلہ پر بالکل غور نہیں کیا۔ شبلی جب علی گڑھ صدام اوے اور کالج سے واپس ہوئے تو انہوں

نے ندوۃ العلماء میں حریت پسند اور حالات زمانہ سے باخبر علماء پیدا کرنے کی سعی کی مگر جیسا کہ خبر نے لکھا ہے۔ علماء سے شبلی بڑی طرح بے اور ان کا یہ خواب کہ روشن خیال علماء پیدا کریں گے بارہ بارہ ہو گیا دیوبند کے علماء نے چونکہ مذہبی نقطہ نظر سے انگریزوں کی خلاف ورزی احتجاج و سرسید نے جمعی طور پر انگریزوں سے تعاون پر زور دیا اسلئے بہت گلدیوبند کے علماء کو ترقی پسند اور سرسید کی تائید ہند کا مخالفت کھینے لگے۔ حالانکہ دیوبند کے علماء کا یہ سیاسی ریل سیاسی خود پر مبنی نہیں تھا۔ ایک خاص مذہبی فکر

کا نتیجہ تھا جس میں انگریز اور اس کی ہر چیز سے تعاون مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اسلئے میرے نزدیک ہندوستان کی سیاست میں جمعۃ کی قوم پرستی اور سیاست پر اسکی قابل تعریف ہے مگر اہم اس لئے نہیں کہ موجودہ سیاست کے بیچ دم کو کچھ بغیر اور موجودہ ذہن کے طریقہ فکر اور اس کی زبان کو استعمال کئے بغیر اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو عالمی مسائل پیدا کئے ہیں ان سے پوری طرح آشتنا ہوئے بغیر سیاسی ریل مسنی خیز اور دوسرے نہیں ہو سکتا میرے نزدیک تہذیبی تصور میں انقلاب کے بغیر ریاست میں کوئی بھی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ سرسید کے تہذیبی تصور میں دینی پہلو کا پورا احساس موجود ہے جو دین میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی معاملات اور اس تہذیبی تصور سے زندگی کے تمام شعبے یہاں تک کہ سیاست میں بھی انقلابی تبدیلیاں ممکن ہیں اس لئے سرسید کے بنیادی تصورات اور ان کے علمی و فکری گام میں جو وقتی ضروریات کے مطابق فرق تھا۔ یہ بنیادی تصورات آج بھی ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ البتہ ان کے وقتی پروگرام کو: گلاسٹر طاق نسیاں بنانا پڑے گا۔ کہا جاسکتا ہے کہ سرسید روشن خیالی کے قد کے تصورات اور انیسویں صدی کی سائنس سے مرعوب تھے ان کی یہ ذہنی مرعوبیت ہمارے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ یہاں میر نزدیک ایک منطقی غلطی ہے۔ عالمی سرمایہ انداز بھی صورت ہوا نہیں ہے دراصل انداز و علوم میں اس قسم کی دیاریں ازمنہ قدیم کے ذہن کی نشان دہی کرتی ہیں۔ جو پھیلاؤ کے بجائے سکڑنے پر، نشر و اشاعت کے بجائے حفاظت و جذبہ جذبہ کے بجائے ہر ہر رونی اثر کو کاٹ کر پھینک دینے پر زور دیتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوستانی مسلمان کی موجودہ ذہنیت کی ذمہ داری بڑی حد تک اس کے ہونے

ذہن نقاب و حجاب کی عادی طبیعت اور علیحدگی پسندی پر ہے جو ہر میل میں مصیبت دیکھتی ہے۔ ہر نئی تحریک کو خطرہ سمجھتی ہے۔ جیسے زندگی بھاؤ کا ایک ہجوم نظر آتی ہے۔ جو ہمارے مسلمانوں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک سرسید، بنیادی افکار کی روشنی اور الکلام آزاد نیاز فتح پوری اور اقبال کے جہاد و دلپس کی معنویت دانستے ہوگی۔ اقبال صرف شاعر تھے انھوں نے تقدیرِ اہم اور عالمِ اسلام کے مسائل پر جس طرح غور کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جدید دور کے امکانات سے واقف تھے۔ اور وہ روایت کا اس طرح استقبال کرنا چاہتے تھے کہ وہ اجتہاد کے لئے دروازے کھول سکے سرسید کی تفسیر اور اقبال کی ابیات کی تشکیل جدید۔ نیاز کی من و مروت اور ابو الکلام کی سوسہ ناخت کی تفسیر کو درسیات کی بنیاد بنانا چاہیے۔ کینٹ ویل آسمان نے آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے دل کی طرف اپنی کتاب ISLAM IN MODERN HISTORY میں جو اشارہ کیا ہے وہ نہایت معنی خیز ہے۔ اسلام ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت نہ ہوتے ہوئے ہندوستان میں ایک اہم اخلاقی امر کی رول ادا کر سکتا ہے۔ تو اس سے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا

کو فائدہ پہنچے گا۔ دیکھنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس فریضے کی طرف کیا متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے لئے صرف اسلامی خال اور ذاتی تعلیم کو مسلمانوں میں عام کر ہی نہیں ہوگا بلکہ مسلمانوں کو سماجی خیر اور نفاذ عام کے لئے ایسے کام بھی شروع کرنے ہوں گے جو صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہ ہوں۔ عیسائیوں اور پارسیوں کے خیراتی ہسپتال اور اعلیٰ تعلیم کے ہندوؤں کے اسکولوں کے داروں۔ یہ نمونے ہندو مسلمانوں کو نہیں بہت سے ایسے ادارے کھولنے پڑیں گے جو سب کے لئے ہوں۔

ہندوستان میں اسلام کیلئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان کے تمام مسائل سے گہرا تعلق رکھے سبھی ہندوستانوں کے دکھ سکھ میں حصّے۔ وہ صرف حقوق کا مطالبہ نہ کرے بلکہ اپنی ذمہ داری بھی ادا کرے۔ وہ نہ اسلام کے شاندار سرمائے کے کسی تیل قد چھوڑنے پر آمادہ ہو نہ ہندوستان کے شاندار ماضی کے قابلِ قدر حصّے سے علیحدگی پر غور کرے۔

کبھی کبھی دوسروں کے دستانے پر چل کر بھی اپنا راستہ ملتا ہے۔ کچھ کو ایک راستہ ترکستان ہو کر بھی جاتا ہے۔

سرسید کا کالج جب چل نکا تو سب لفظوں نے آپس میں ساروش کر کے کالج کو ناکام بیٹانا چاہا وہ طلباء کے اُن سر پرستوں کو جو علی گڑھ سے باہر رہنے تھے کبھی یہ جھوٹی خبر بھیج کر پریشان کرتے کہ علی گڑھ میں خوب بارش ہوئی ہے جس سے پریشانی تھی گر گئی ہے۔ اور کئی طالب علم مر گئے ہیں۔ کبھی یہ اقوال اڑاتے کہ کالج کیسے کی طرف سے ناز کے دکان میں باتیں کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور پانچ وقت کی ناز کی جگہ تین دفت کی ناز کر دی گئی ہے اور اذان نہیں دی جا رہی بلکہ گھنٹہ بجا کر ناز کے لئے بلایا جاتا ہے۔ اور لڑکے چمکے پہنے ناز پہنچتے ہیں۔ اور کبھی بڑے بیکندے سے سرسید کو دکھ ضرور ہوتا مگر وہ بہت حد ہنسے۔ یہ اقوال بھی اُڑائی کہ سرسید نے کالج اپنے رشتے داروں کو نہ کر کے لئے کھولا ہے اور وہ خود کالج سے ایک بھاری تحلوہ وصول کرنے ہی قابلِ حسنِ الٰہی ملک جس نے انہیں مسیحاں کہاں سرسید کا بیکر تھا۔ علی کے مولیٰ نے حسنِ الٰہی کے کہا کہ اس کے لئے کچھ سننے کے لئے جانا سید سے جہنم میں جانا ہے۔ بیکر سینے والوں نے کہا کہ جہنم میں جانا ہے تو جہنم میں جانا ہے

کمیونزم اور ہست دستانی مسلمان

و مختلف کوششیں جاری ہیں انہی کوششوں کا نام کمیونسٹ تحریک ہے۔ البتہ طبقاتی انقلاب کے بعد اور کمیونزم سے پہلے کام حد جو کمیونزم یا اشتراکیت قرار پایا تھا، روس اور چین۔ دنیا کے دہڑے ملکوں کا دعویٰ ہے کہ وہ سوشلزم کے اس مرحلے میں داخل ہو کر کامیابی سے گزر رہے ہیں۔ یہی کمیونسٹ تحریک ہے۔ اس سلاطیت کے مطابق کام کیا جا رہا ہے اور کام کے مطابق اجرت دی جا رہی ہے۔ تعلیم روزگار اور طبی سہولت فراہم کرنا اسٹیٹ کا فرض ہے اور زبان نسل، عقیدے کی تفریق کے بغیر یہ سہولتیں ہر ایک شہری کو دیے جائیں۔

کمیونسٹ تحریک نے جہاں جہاں انتظام حکومت سنبھالا، وہاں یہ سہولتیں صرف دکھانے کی نہیں بلکہ دراصل شہریوں کی زندگی اور حقوق کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہیں۔ اگر آدمی پیکین سے براہ دلی مشرقی برلن تک چلا جائے تو اسے عام محنت کش کی زندگی میں تبدیلی اطمینان اور قوت کا احساس قدم قدم پر ہوگا۔ اور ہر ایک پنج سالہ پلان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی روزمرہ زندگی کا معیار، ڈیل ڈول، چروں کا رنگ، تعلقات کا بہانہ اور مطالبے کا پیمانہ پچھلے پانچ سال کے مقابلے میں بہتر نظر آئے گا۔ مغرب کے غیر کمیونسٹ ملکوں خصوصاً سویڈن اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بعض پیشہ وروں کا معیار زندگی (قوت خرید وغیرہ) یقیناً چین کی نہیں، روس سے بھی بدرجہا بلند ہے اور اسے بلند تر بنانے کے لئے حکومتیں بھی کوشاں رہتی ہیں۔ انجینڈری کو کلمہ کا نول میں کام کرنے والا، ایک نیم خورہ دستری یا بینک کا کلرک روس کے اوسط ملازم اور انجینئر سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے اور زیادہ قوت خرید رکھتا ہے تاہم

اس کا کم کہ وہاں اور مل ۶۱ دلی کی یکساں نش کے لئے ضروری ہے۔ البتہ باوجود اشتراکیت اور بعد از اشتراکیت کے اظہار کے۔ بے تصدیق اور تنبیہ کے تصور کیا اختلاف کا حل وضع کرنے کے لئے ایک دو نہیں ہے۔ البتہ حیران کن بات یہ ہے کہ مشرقی برعظیم (ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا) کے علاوہ مشرق و مغرب کے ڈیڑے اسیں نے ملائیے ہوئے مکر اپنے سیاسی اور سماجی اقتدار کی بوجہ میں، طلوع اسلام کے اول ڈیڑے اسیں میں پھولی تھیں، آج بھی وہاں سے آگے نہیں بڑھا ہے بلکہ کچھ پورے قومی اعتبار سے کچھ سٹراپٹ ہی ہے۔ آج ۱۳۵۲ ہجری بعد جو لوگ قوموں کے عروج و زوال کی داستان ٹھنڈے دل سے سننے یا سمجھنے انہی اس امر کی باسیابی کے منظر کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے اسلام کی قیامات پر عمل کرنا چھوڑ دیا، بالفاظ دیگر ان کے اعمال خراب ہو گئے، مسلمان درگزر و سلامتی در کتاب رہ گئی۔ اور اب ہر ضرورت ہے اس کی سادگی، پائی اور نظریاتی شدت۔ حدت اور باگز کی طرف اسے پائوں واپس جانے کی۔ وہ غالباً یہ حقیقت بھول جانے پر آمی ہیں کہ اسلام سے پہلے کے مذاہب میں تو اور بھی کثرت سے تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ عیسائی "پھیل گئی ہیں، وہاں تو اعمال خراب" ہونے کا سلسلہ قبل اسلام سے چل رہا ہے پھر کیا سبب کہ ان کے "حوال" اتنے خراب نہیں ہوئے۔ یہ نکتہ فی الحال اسی سوا یہ علامت پر چھوڑ کر ہم کمیونزم سے رجوع کرتے ہیں۔

کمیونزم کے ماباط نظریے کو کتنا سہ ماہ سال ہوتے ہیں۔ اور علو پر وہ آج بھی ایک امداد ہے جس کی طرف بڑھتے

ذوقوں کے ساتھ آنے والے معاشی سکٹوں نے اور کھانسی کے بعد دیکھے گئے کئی علاقوں میں غریب جنگوں کا ایندھن فراہم کرنے کی تدبیروں نے غیر کمیونسٹ نظام کے اس ناسور پر سے ٹپکھول دی ہے۔ اب یہ کھلی رہے گی۔

غرض اس تہید کی یہ کہ ہیں اپنے موضوع کے سلسلے میں کمیونزم کی خوبیاں اور خامیاں گنوانے کے لئے فلسفہ کی موٹنگائیوں میں پڑنے، ازم، کوکریڈنے اور پارتیزاک یا سولر کے تئیں کے مابین کو عینک بنانے کی نگاہ اتنی ضرورت نہیں جتنی اس بات کی کہ اپنے یہاں کے خاص تاریخی حالات سماجی بناوٹ اور تقاضوں کو نظر میں رکھ کر یہ جانیں کہ کمیونسٹوں نے (چاہے وہ نرم جمل، گرم یا مستدل) اپنے عملداری میں یا اقتدار میں عموماً مذہب اور اہل مذہب کے اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے اور اسے کیا نتائج ملنے آئے ہیں۔

گفتگو ہندوستانی مسلمان کے اُن حالات پر مبنی چاہئے جو سیکولر پارلیمنٹری، ڈیموکریسی میں اُسے درپیش ہیں۔ سیکولرزم کسی بھی مذہبی یا سانی یا نسلی اقلیت کے لئے ایک مضبوط سیکنے کا اہم عنصر ہے کہ وہ بھی تیر سکے۔ پارلیمنٹری جمہوریت حقوق کی ناسندگی کا اولین یا آخری ڈھانچہ نہیں ہے، جب تمام جدید پارلیمنٹوں کی مادرِ بزرگوار انگلینڈ کی پارلیمنٹ پیدا نہ ہوئی تھی، اس وقت بھی مختلف مفادوں، نسلوں اور حلقوں کی ناسندگی کے کچھ طور طریقے رائج تھے اور اب اسکے جواب میں کمیونسٹوں کا نظام حکومت ہے جہاں پارلیمنٹ کی نسبت پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) زیادہ طاقتور اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ مختلف ناسندگیوں کا توازن بھی وہی طے کرتی ہے۔

ہندوستانی مسلمان عملی طور سے ہندوستانی ہے، رسم و رواج، آداب معاشرت، معیشت، زبان نسل اور عقیدے میں بھی وہ بڑی حد تک (جائے انجائے) ہندوستان کی دوسری تہذیبوں، رنگینیوں اور حد بندیوں میں مشرک ہو چکا ہے۔ کھل مل جانے کا یہ عمل ملک کے کسی حصے میں گہرا ہے، کہیں اُٹھلا۔ کہیں رنگ پکٹا ہے، کہیں کچھ۔ تاہم عمل جاری ہے۔ اس کے حق میں یا اس کے خلاف کوئی فلسفہ

زندگی کا وہ بنیادی اطمینان، بنیادی ضروریات کی وہ ضمانت جس کے بغیر ذہن انسان اپنی پوری کا درگاہی نہیں دکھا سکتا، جس طرح پیچ در پیچ رسد کشی سے پاک کمیونسٹوں کی عملداری (RE & TIME) میں عام آدمی کو میسر ہے۔ افزائش، کھجنا، تان، شدید مقلبے، اور بے یقینی پر مبنی گنے والے غیر کمیونسٹ نظام میں نہ میسر ہے نہ ہو سکتا ہے۔ کوئی غیر کمیونسٹ ملک جتنا زیادہ صنعتی یا ترقی یافتہ یا دولت مند ہے وہاں صنعتی مہارت ذاتی ترقی کی روٹ اور دولت بنانے کی پونہ کے پیچیدہ عمل میں رک دینے اور رک اٹھانے کا فضلہ اتنا ہی زیادہ تباہ دیا ہے اور عام زندگی میں اس تباہی کا اثر انفرادی طور پر اعصابی بوجھ اور اعصابی ٹھکن میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ نکتہ قابل غور بھی ہے اور تفصیل طلب بھی، تاہم پڑھنے والوں کی ذہانت اور شعور پر بھروسہ کر کے صرف اتنا جتنا کافی ہو گا کہ اعصابی، بوجھ اور اعصابی ٹھکن دونوں کے نتیجے، علامتیں اور آثار انسانی مسائل، اخبارات، بلوغتیں، نااماری سے برزنا، ناولوں اور ڈرامے، سنگے (اخلاق سوز) ڈراموں میں سنسنی خیز اور دہشت انگیز کارروائیوں میں انتقامی فاسفوں اور فیشنوں میں ابھر کر آ رہے ہیں جنہیں اسلام سمیت کوئی بھی مذہب اپنانے کو تیار نہ ہو گا۔

کمیونسٹ نظریے اور عمل دونوں کے نزدیک یہ جرم ہے کہ روپے کو مال میں اور مال کو پھر زیادہ روپے میں تبدیل کر کے (جلب منفعت) زیادہ مفاد حاصل کیا جائے جبکہ غیر کمیونسٹ سوسائٹی، خوش حالی کی کئی اسی عمل کو قرار دیتی ہے۔ آمد ہزمنندی، سائنسی قابلیت، تکنیکی ترقی اور حوصلہ آزمائی سب اسی سمت کو خود بخود درواں رہتی ہیں کہ آسائشوں کا بنیادی ذریعہ روپیہ (نر) زیادہ سے زیادہ آئے اور وہ کسی درمیانی ذریعے (تجارت، صنعت، بینکنگ، پبلٹی، اسمگلنگ، جنگ وغیرہ) پر قدم رکھ کر مزید دولت سازی کے میدان میں کود جائیں۔

اس عمل میں بعض افراد، خاندانوں اور گروہوں کی دولت بڑھتی ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ اپنا دھل بھی پیدا کر لیتی جاتی ہے یعنی زیادہ سے زیادہ پیداوار کو اپنی (منافع بخش) قیمتوں کی سطح پر دس کے رکھنے کے لئے تیار مال کی برادری یا قوت پیداوار پر دھوکہ۔ جو بالآخر عام نوع انسان کے لئے ادعا اور بڑھتی کامیابی ہے۔

کوئی فخر پوری طرح کارگریوں نہیں ہو سکتا کہ خود ہندوستانی سماج میں
 وسعت اور گہرائی دونوں اعتبار سے حد بندیاں یا دیواریں مندریں
 کھڑی ہیں، جو ناہمواری چار سو برس کی مرکزی سلطنتوں کی نگار
 کوششوں سے نہ ٹوٹی، وہ سیاسی پارٹیوں کے وقتی معاملات کے
 غمروں سے اور پھاؤؤں یا دھکیلوں سے نہیں ٹوٹنے والی سماج کی یہ
 خاردار ناہمواری ہماری اور ہمارے بچوں کی زندگی ہیں، یوں ہی
 برقرار رہے گی کہ ہمارے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام پہلے صدیوں کا
 گہرا سرچاٹلے اور بوسیدہ کا سٹیوم کی پرٹی فعل میں دبائے ہوئے
 دغنا رہا ہے۔ یہاں پیانہ اور لہسن تک سے پرہیز کرنے والے جینی یورپ
 چڑھے، فرٹی لاؤر اور اٹلین بند پھیلیاں اکپورٹ کرتے اور اس کے
 منافق سے مندر کھڑے کرتے ہیں اور ہریانہ کا بڑی خدا جٹ ملک
 کی سرحدوں سے باہر تک لڑنے دینے بھیجا جاتا ہے۔ صبح سویرے گیتا
 کا پاٹھ کرنے والا اور جو ٹیوٹو ٹکر کھلانے والا شانتی پوروک، دھاکہ
 ماراڑی یا سندھی ملات گئے مندروں کی مورتیاں اٹھو کر باہر بھیج
 دیتے ہیں اور ان کی آدنی سے سندھی زبان کے رسم خط کو نگاری میں
 تبدیل کرنے کے ٹرسٹ قائم کرتا ہے، نئے شاندار ہوٹل کھول کر
 کیرے ٹولنس کا اہتمام کرتا ہے اور غدریشیوں کے چون چھوٹا ہے
 جھٹا ختم میں گجرات کا سرمایہ اور بنگال میں ماراڑ کا سرمایہ دار چلتا
 پھوٹتا ہے۔ یا گرم راجستان کے بے کھیت مزدور کشمیر میں سردی لٹوٹ
 اور ڈیم بنانے جاتے ہیں۔ منافق خدی سگھاس متے جوئے جال میں
 چھوٹی بڑی پھیلیاں سب ایک وضع کی نہیں اور کئی دھاریاں ہیں
 "ٹائٹ آف انڈیا، یا انڈین اکپریس کے کروڑ پتی اجاری اداروں
 سے درجنوں پے شائع ہونے لگے ہیں، ادھر ایک ہی اخبار روالہ
 یا کتاب شائع نہ ہو سکا تو اس کی وجہ گھنٹی یہ نہیں کہ اس زبان سے شرح
 خانہ کم رہے گی بلکہ وہ ہندی تنگ نظری بھی ہے جسے پورندرا
 (صنعتی سرمایہ دار) کی قوم پرستی میں شامل ایک طرح کی مذہبی مصیبت
 نے پاف دیا اور صحن پرستی نے پیمان چڑھایا ہے۔ کیونکہ کیونکہ
 غیر مذہبی ہونے کے نکتے بالکل دوسری انتہا پر کھڑی ہے اور جہاں وہ واقعہ
 ہم ان ناہمواریوں پر براہ راست ضرب پڑے گی۔

حالات کا پیمانہ ہم اسے منسے کھلا ہوا ہے تجزیہ اور تجزیہ

کے دیکھ سکتے ہیں کہ سیکور اور پارلمنٹری طرز کی جمہوریت عام سطح پر
 ایک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک کی ترقی پسند پالیسی سے بھی اس کے
 پاس ہمارے درد کا دریا نہیں۔ یقیناً اس طرز حکومت کی تیسریں اُن
 پرانے آزادی پسند رہنماؤں اور نوجوان اشتراکیوں کا ہلو پسند ایک
 ہلو ہے جو واقعی بیکور تھے، جی جی سے ملک کے ہر طبقے کا اخبار اور
 شہار چاہتے تھے مگر جیسا کہ پوری انسان تاریخ کی لوح پر صلی حروف
 میں لکھا ہوا ہے۔ حالات اور ادا دے ہی حالات اور ادا دوں کی
 راہ کاٹ دیتا ہے۔ ہماری قومی تاریخ ہی میں وہ قوتیں بھی پس منظر
 میں بھی منظر عام پر تنظیمی صورت اختیار کرتی رہی ہیں جو SYNTHESIS
 کی ملی تہذیب کو حقارت کی لہر سے دیکھتی ہیں جنہیں "مذہب" لفظ کے
 مقابلے میں۔ "تسم" پسند ہے جن کی نمائند اور ادا دوں میں کسی
 ایسے منظر کی گنجائش نہیں جو "لہ" یا میلا ہو چکا ہو۔

سب سے مقدم بات ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنے انفرادی
 اور اجتماعی وجود کی حفاظت کی خاطر (کیونکہ ہمیں بلکہ) یہ ہے کہ ہر
 ایک مسلمان میں ان قوتوں سے اپنا رشتہ بنائے کہیں جو ملک کو تاری
 اور اخلاقی اعتبار سے اسی کے نہیں تقبل کے ہندوستان کی طرف بیکور
 ریاست کے صحیح زبان کی جانب، کھلی اور ملی ملی ہمارا معاشی اور تہذیبی
 زندگی کی سمت لے جانے والی ہیں۔ کام صرف دوٹ دینے سے نہیں
 چلتا۔ ذہنوں کی دھلائی بھی لازم ہے۔ دھلائی میں رکاوٹ پڑ گئی ہے
 بلکہ قوم معاشی اور انتظامی ڈھانچے میں بے فاسدگی اور بددیانتی سے اونکے
 اس کارن کہ ہندوستانی مسلمان آٹھ سو برس کی اپنی کائی سے اپنے جوتن
 ذہنوں اور نائنوں سے محروم ہو گئے۔ ملک کی تقسیم ہندوستانی مسلمانوں
 کے زیادہ تر لائق اور ذی نعم فرزند اٹھا کر لے گئی اور ریگستانوں میں بھگتنے
 کے لئے اُنہیں چھوڑ آئی۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پورے ملک میں کیس مشترک ہیں،
 کہیں علاقائی، اور کہیں ہنگامی۔ بنگال اور آسام میں جہاں ان کی آبادی
 ۲۵ فیصد سے زیادہ ہے اور کھیتوں میں بکھری ہوئی جو سائل درپیش
 ہوں گے عموماً وہی ہوں گے جو غیر مسلم کاشتکار، چھوٹے دھکا خاں، یا
 کاشتکار کو درپیش ہیں۔ وہاں ہندوستانی مسلمان ایک موثر اقلیت
 ہے۔ کیونکہ اسے موثر اقلیت بنانے والا معبود بالکل مختلف

ہے۔ جسائی آبادی اور سبھی (ترقی یافتہ) ادا سے۔ موثر اقلیت ہونے کے باوجود دونوں مقامات پر مسلمانوں کے مسائل قطعاً یکساں نہیں ہوں گے۔ کہوں کہ ان کی طبقاتی بناوٹ (اجزائے ترکیبی) یکساں نہیں۔ یوپی، دہلی اور بہار میں کبھی وہ ایک ترقی یافتہ متحمل اقلیت تھے۔ اب ان کے "اشراف"، بہت حالت میں اور ان کے "اجلائی" اچھوٹی ذات (وٹے خٹا بھٹی) اٹھان کے کسی نہ کسی مرتلے پر پہنچ چکے ہیں۔ بٹمان سے لے کر ہندوستانی مسلم سماج میں بعض اندرونی تباہیوں کو لہا دی ہے۔ کاریگر طبقے نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی طرف قدم بڑھایا ہے، جامہا یا باوقار اور زمینوں، جاگیروں اور اوقات سے وابستہ درمیانی طبقہ روٹی کو محتاج ہے۔ روزگار پریشہ کچھ اپنی بے حساسی اور ادا سی اور کچھ سخت مقابلے کے تقاضوں کے باعث رفتہ رفتہ چھینا جا رہا ہے۔ کاریگر، دستکار اور آبائی پیشوں میں مشغول محنت کش طبقہ درمیانی ڈھائی سو برسوں کا وسیعہ غیظا لباس اتار کر نئے حصے، ہنر، محنت، اور تنظیمی صلاحیت کے ساتھ اٹھ رہا ہے۔ اگرچہ اُسے اپنا نام شدہ رتبہ حاصل کرنے میں دو یا تین سو برسوں کے گزرنے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تاہم ہندوستانی مسلمانوں کی وہ آبادی جو ہر ایک خرابی میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ حاصل کرتی جا رہی ہے، یہی لوگ ہیں۔ اور پیشوں کے اختلاف کے باوجود ان کے مسائل ہندوستان گیر اور مشترک ہیں۔

ان کا اصل مسئلہ نہ مسلم پرنٹ لاء، درجہ و فوات کی اونچ نیچ سے وابستہ ہے، نہ مسلم یونیورسٹی کورٹ میں کسی غیر مسلم کاریگریا حریف پیشہ کا ہے، یہ کہ مال اور بازار کے درمیان ڈھانچا ہوا زر دار طبقہ فیصلہ کن طاقت سے محروم کیا جائے۔ یوں ملزم کی دھوبی دار درمیانی بورڈر دا طبقہ کی موجودہ علمداری کی خاص بیاض میں دو نئے درجے تھے، بڑے بینکوں کا قومیانا اور کوہ پرے ٹیڈ (اعلا باہمی) کی طاقت، سوسائٹیوں کو بڑھا دیا۔ تاہم اس نے دونوں نئے ازمائے حاصل نہیں معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ فیصلہ کن انقلابی قدم اٹھانے والی حکومت، جسے محنت کشوں کی "ایڈ حاصل ہو، وہی اس سے آگے جاسکتی ہے کیونکہ کے نظر سے کی عمل میں جہاں تک رسائی ہوئی ہے اس نے اتنا کر کے دکھائی ہی دیا ہے۔

ہنگر کا ہندوستانی مسلمان

ہندوستانی مسلمان ان معزوں میں نملی گرہ یا سانی۔ مذہبی اقلیت نہیں ہیں۔ جس میں یورپ کے یودی، مصر کے قبطی، عراق کے کور، روسی فیڈریشن کے تاتاری یا امریکہ کے ریڈ انڈین، ان میں سے اکثر کے پاس ناموں اور چند رسموں کے علاوہ جلا کا نہ شناخت کا کوئی میل باقی نہیں ہے پھر بھی ایک ناخوار ذہنیت کئی دھروں سے جی میں سب سے بڑی وجہ تہمید ملک کی مانگ اور اس کے نتائج ہیں مسلمانوں کو الگ شناخت کرنے، انہیں اشتعال انگیز مشورے یا ہڈیاں دینے اور ان سے سوتیلوں کا سا سلوک رفتار رکھنے پر آمرا کر رہے تو اس میں ہمارے ملک کی تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور اس کی غرض مندانہ تعلیم کی پچ بھی خرد رنگی ہو چکی ہے۔ کس ملک کی تاریخ میں حملہ آوروں اور فاقوں کے فرزند مفتوحوں میں گھل مل نہیں گئے، ہمزگ نہیں ہو گئے؟ یا مفتوحہ علاقوں کی تہذیب کے سرپرست یا طبردار نہیں بن گئے؟ یودیوں کی نوبت تو بعد کو آئی۔ چنگیز و ہلاکو کی دسل بعد ہی یہ منظر سامنے آ چکا تھا۔ اور پھر ہندوستانی مسلمان بغیر انہی مقامی باشندوں کی مثل اور معاشرت کا وارث نہ بن سکتے تھے۔ ایک خاندان دوسرے ہندوستانی مذاہب میں پھیلے ناموں کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ دادی کثیر کے اکثر مسلمان نسلاً گھیری ہیں۔ پنڈت، یا کھتری، گجرات کے بوہرے، عجمے، کاٹھیاواڑ کے میمن، ہلائی اور کچھی، میوات کے میو، ہریانہ اور پنجاب کے راجپوت و جوت یوپی کے گنہ اور گاڈھے، ودھیا پرکاش کے امام شاہی (امام شیعہ) وغیرہ آج تک پھیلی برادریوں کی کچھ نہ کچھ وراثت سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو عقائد کے علاوہ رسوم میں زندہ ہے۔ پھر ان کو اقلیت کا احساس دلانے، شکست خوردہ یا مظلوم اقلیت کی حیثیت اور کلاہ باقی رکھنے والے اسباب سوائے اس نودہ لیٹے مرایہ دارانہ نظام کے کیا ہیں جو اپنی پیش رو جاگیر داری کی گندگی تو سمیٹ لایا، اس کی مالی طرفی سے محروم رہا جو مذاہب کے پردے میں پوشیدہ لوہار دانت اخلاق، بلای رواداری اور غیر عقائد کا احترام کو نہ اپنا سکا، اس کی کلمی اور گلدگی پسندی کو ایک سارا مدھیہ کار کے طور پر لے بیٹھا۔ آج بھی اسی سے کام لے رہا ہے۔

کوئی سیٹ محض یکو روڈ یا کریک ہو کر صدیوں کے اس جالے کو نہیں آتا رہ سکتی۔ البتہ وہ خود مذاہب اور اہل مذہب کی تنگ نظر کا

تعب اور دھاندلی میں یوں غیر جانبدار ہو سکتے ہیں کہ غیر جانبداری بھی
 مجرمانہ غفلت بن جائے۔ یہ تیز زبانی اٹراپانک کے تمام سیاسی معاشی
 نظاموں میں صرف کیئر سٹول کو مقدر ہوا ہے جو سماج کے ارتقائیں
 پوشیدہ ترقی اور رجعت کی دھارا کو چلانے پر تامل نہیں۔ ترکی کے
 مادی نظریے کو روحانی ترقی سے متصادم نہیں پاتے اور سماجی تاریخ
 کے معاشی مطالعے نے یہ حقیقت ان کا جزو ایمان بنا دی ہے کہ ترقی
 کا ہر ایک عنصر ہر ایک منظر پر چاہے وہ کتنے ہی پردوں میں بہا ادا
 ایک تدبیر بالآخر ان کی پشت پناہ بننے والی ہے۔

ذہنی نعروں، نسلی بادریوں اور گردہ بندوں سے ہٹ کر اقلیت
 اور اکثریت کے مسئلے کا فیصلہ کرنا ہے ان کے نزدیک اقلیت ایک ہے
 دوسروں کی محنت سے منافع بٹورنے والوں کی۔ اور اکثریت
 دوسری۔ باہمی محنت سے قدریں (VALUES) تیار کرنے والوں
 کی رہی۔ گردہ بندوں اور تہذیبی دہشتوں کی شناخت (IDENTITY) تو
 پچھلے پچاس سال کا بڑا و معتبر گواہ ہے کہ یہ شناخت نہ صرف یہ کہ بھینی
 یا شانی نہیں گئی بلکہ اس کا احترام کیا گیا۔ جن گردہ بندوں کی عددی اقلیت
 مرد زمانہ سے پامال اور کسی قابل ذکر شناخت سے محروم ہو چکی تھی انہیں
 وہ تاریخ کے انبار میں سے تلاش کر کے دی گئی۔ جن کے پاس نہ کم خط
 تھا نہ ادب، نہ اشاعتی ادارے انہیں استناد کی تلاش میں یہ سب
 کچھ ملا۔ اولاً بتا لاکھ وہ اسے فکر کے ساتھ جتانے لگے ہیں۔ دوسری مشرق
 کے بودیات، اولی گزادہ کرغز کس حال میں تھے، ہندوستانی مسلمان تو
 گمان بھی نہیں کر سکتا اس گراوٹ کا۔ اور اب؟ بنگ کچھ اور ہے۔

لکھ کی عام مردم شماری میں بعض حقائق ابھرنے کے بجائے چھپ
 جاتے ہیں، مثلاً یہ تو سب کو معلوم ہے کہ مسلمان ایک روٹنگی MONOGAMY
 کو نہیں ملتے۔ مردم شماری کا کوئی خانہ یہ نہیں بتاتا کہ فی ہزار کتنے مسلمان
 ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں، مسلمان کی شرح پیدائش
 (BIRTH RATE) کے مقابلے میں شرح اموات (DEATH RATE) کتنی
 زیادہ اندکیوں ہے؟ (دشہ) اسی طرح ہندوستانی مسلمان کو آل انڈیا
 پیمائے پر کسی پارٹی پروگرام یا تبادلہ خیالی سے پہلے اعداد و شمار کی دشمنی
 میں یہ جاننا چاہیے تھا کہ ہندوستان کے آرٹس اور کرافٹس دستکار کی

اور بھولے پیلنے کی حرفوں میں ان کا تناسب آبادی کیا ہے۔ مثلاً
 پاد لوم کی صنعت، لکڑی کے کام، فرنیچر اینڈ لوم، پریشنگ، زری گھانا،
 نرل اور میدر کی لٹاخی، مثال، پیراشی، مراد آبادی برتن مے پوری
 نقشیں کام۔ غیر مراد آبادی صنعت (چوڑی کی صنعت) جسے کشیدہ کاری
 جھن، رشیم، خلاد، جرم، دھات اور عمالت، گن کاری، منبت کاری
 اور بچی کاری میں ان کا کس قدر دخل ہے اور کیوں امتیاز حاصل ہے؟
 اور اس امتیاز کے باوجود وہ مادی خوش حالی، سماجی صلاح اور ذہنی
 بیداری میں کیوں پچھڑے رہے ہیں؟

کی صرف نام کا ملنا ہونا، پنج وقتہ نماز پڑھنا، مسلمانوں
 کے درمیانی طبقے کی تہذیبی ولادت سے لو لگانا، اجملا غریب ہونا یا مائی
 تعلیم سے منہ موڑنا اس کا مذہب ہے؟ یا یہ سماجی دھاپہ جس میں
 چھوٹا کاری گرا پنے ایک ہزار ہی سے کسی ایک آدھ کو ادھر بھیجتا ہے
 ادباً ۹۹۹ کو پست سے پت تر حالات میں رکھنے اور آخر کار پروٹاڈ
 میں جسنی اس بے زر بے ادوار طبقے میں جوڑے صنعتی کاروبار کے
 ہاتھ مرن اپنی محنت بیچ سکے دھکیل دیتا ہے؟ (یوں ہے تو کمبوزم
 کے سوا کسی کے پاس اس کا توڑ نہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی بھی تفصیلی مردم شماری یہ بتانے
 کو کافی ہوگی کہ وہ لبعاً عاداتاً، ولادت پھولنے بڑے شہروں اور
 مرکروں سے متعلق رہے۔ ہیں، اور دہلی میں ان چند صدیوں میں باہر سے
 آئے ہوئے اور مقامی لیبی ہنرمندوں کی پائیدگاہ، ان کے ترحان
 ہیں۔ انہی کی تعداد اور تناسب زیادہ سے بھر قدیم سے ان میں
 ارتکاز دولت (ACCUMULATION OF WEALTH) نہیں ہوا
 ہے۔ مذہبی عقائد کو کسی حد تک اور سماجی رشتوں اور مادوں کو بڑی
 حد تک اس کی ذمہ داری جاتی ہے۔ ارتکاز دولت نہ ہونے سے اس
 میں ایک طرف تو سماجی ذہن پرورش نہیں پاسکا، دوسری طرف کسی بڑی
 صنعت کاری کا بار نہیں اٹھ سکا۔

تیز رفتار سائنسی انکشافات کے ساتھ ساتھ میننگ اور
 انڈسٹری کی جدید تنظیم کی لہریلی اس میں وہ توازن کھو بیٹھے، اند
 یوں قوی دھارے سے کٹ جلنے کا ایک بڑا سبب پیدا ہوا
 حرفت پلٹنے کے کتر تعداد بیٹھے بیٹھے کھانے اور حکومت جتانے

والوں کی بھی ایسی زمیندار، وثیقہ دار، پیش دار، شہری جائیدادوں کے مالک، اذفاف سے بالکاد قتل رکھنے والے۔ اور ان کے ساتھ نہیں پلٹنے والے ہنرمند موسیقار، سازندے، معتمد شاعر، پیش نماز، مرثیہ خواں، مولوی، واعظ، انجمن ساز و غیرہ۔

تعداد اور سماجی اہمیت کے لحاظ سے ان کے بعد سرکاری ملازمت پیشہ (فوجیوں سمیت) مسلمانوں کی باری آتی ہے جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران (جب انگریزوں نے ان پر بدست شفقت پھیرنا شروع کیا) پورے مسلم انڈیا کا ایک فیصد سے زیادہ نہیں رہے۔ ان کی تعداد اور نسبت آبادی سرکاری ملازمتوں کے دس گنا ہو جانے کے باوجود اس سے آگے نہیں بڑھی۔

مرکزی شہروں کی بڑی تجارت، خصوصاً اسپورٹ اسپورٹ میں ہندوستانی مسلمان جب تک حادی، جب تک مالی ولایت سے آتا تھا۔ یہ قانون تجارت ہے کہ قوی آزادی کی اونچی لہر اٹھے پہلے کی سودیشی صنعت کاری کا لہ ہوا کر رہی ہے اور جوں ہی یہ راہ تیار ہوئی اسپورٹ کی اہمیت اسپورٹ کے سامنے گری۔ بڑی صنعتیں تو ان کے ہاتھ میں تھیں نہیں، اسپورٹ کیا کرتے بیکنگ اینجینئروں کے فتنے پر در نظام نے جو کنبہ پروری شروع کی۔ اور دوسری طرف اونچے با اختیار عہدہ دار مسلمان بھی جو پرمٹ اور لائسنس کی تقسیم میں کام آتے، سرحد پار کرتے گئے۔ دس بادمال کے اندر مسلمانوں کا بڑا تاجر طبقہ بنائے کے طرح بیٹھ گیا۔ سندھ اور پنجاب کے آئے ہوئے آزمودہ کارا در چابک دست یو پیازین نے ان کی آڑھیں یا تو چھیں لیں یا بانٹ لیں یا اندک لگی میں حنا دیں۔

کسی بڑے شہر کے SLUMS پر: مصافحات کی گندی بقیوں میں گھوم پھر کر دیکھا جاسکتا ہے کہ بیشتر مسلمان وہی ہیں جو زمین جاؤ، اڑھت، پیش، وظیفہ یا بطریقی مکان کھوکھو اس حال کو پہنچے ہیں۔ اہد اب ان میں کوئی نوآبادی، یا کوآپسے ٹیوٹورز کی جدید بنی بنانے کا نہ حوصلہ، نہ نکت۔

آبادی کے ایک ایک پرت کے تقاضوں کا لگ الگ الگ ایک ساتھ لا کر دیکھئے تو معلوم ہوا کہ وہ مانی طبقے کی روز بروز کمزوری

منگل سہ ماہی سنائی مسلمان معاشرہ

اور اسی کے اباب کمان کمان ہیں۔ مسلم آبادی کے وہ کون سے سیکشن ہیں جو بیزاری یا FRUSTRATION کے شکار ہوئے ہیں اور یہ بیزاری بات بات بن بات بھٹا ہٹ اور اشتعال کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نادان دوستوں کے ایجنٹیشن یا بھلا دوسے میں آجاتی ہے۔ آج کی بیکوڑ جمہوری حکومت پالیسی ان کے حق میں بنا سکتی ہے لیکن زنجیر کی آخری کڑی تک پہنچتے پہنچتے وہ صلابت ہو جاتی ہے کیوں کہ اس پالیسی پر عملدرآمد کرنے والوں کی تعلیم، بندشیں اور ذہنی حدیں پالیسی سازوں سے مختلف ہیں۔

پھر پالیسی سازوں کی اپنی تعلیم اور مجاہدیں ہیں، انہیں پارٹی کی خشین چلانے، اسے حریف پارٹیوں کے مقابل الیکشن میں آمانے، اور الیکشن کے تقاضوں کی ٹیکنیک کی خاطر نا انصافیاں ٹال جانی پڑتی ہیں جانے اور برادری وار گٹھ بندوں کو تھپکے کا ناگوار مزید انجام دینا پڑتا ہے۔ جمہوریت پسند پارلیمنٹری نظام کی باگ ڈور کتنے ہی نیک نیت، (خدا ترس) لوگوں کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو ان سے ہندوستانی مسلمانوں کا بھلا نہیں ہونے والا۔ بھلا ہو گا اس نظام کے ہاتھوں جو نیچے کے دیے کچلے اور محروم کئے ہوئے طبقوں کے بل بوتے پر کھڑا ہو۔ کیڑا اور بنگال میں کمیونسٹوں کو محدود اختیارات والی کم عمر، نا آزمودہ کار حکومت ملی تھی، اس تھوڑی سی مدت میں جو کچھ انہوں نے کر دکھایا وہاں کے مسلمانوں کے دل جانتے یا پھر خافین کے ایجنٹیشن میں اس کا سراغ لگتا ہے۔ جیسے جیسے ترکیبوں اور تدبیروں سے دونوں کی اکثریت پر نظر رکھنے والی جمہوریت کتنی بھی سیکور کیوں نہ ہو جائے اسے خود اپنے وجود کی خاطر اصولوں سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ البتہ وہ ڈکٹیٹر شپ جیسے محنت کشوں کی مکمل جمہوری تائید حاصل ہو کر نیٹوں کے نظام فکر و عمل سے مطابقت رکھتی ہے اور وہی اس عدم توازن کو دھت لکھنے یا اگلنے سے بے نیاز ہو کر توازن میں بدل سکتی ہے۔

کیونکہ ملاحظہ کتاب کے درجوں سے اچک کر جب ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کی شکل میں نمودار ہوا تو اس سے مشرق کی تمام آبادی مسلم ریاستوں، ایران، ترکی، افغانستان کو ہی سب سے زیادہ

نشانے میں بخیر یا اجتناد کی صلاحیت عام نہیں لگتی۔ اور پہلے
 تین صدیاں ایک ہی ڈھنگ سے پرچار کی حالت میں گزر گئیں۔ خود
 کیا جائے تو جمال الدین افغانی، مفتی محمد حیدر اور سر سید احمد خان
 کی تحریکیں اس لحاظ سے عالم اسلام میں جدت اور بیداری کی ہر
 دوڑا گئیں۔ البتہ مسلمانوں نے پچھلے چھ سو سال سے دنیا کی
 تہذیب میں علوم میں، ذہنی یا سماجی ارتقا میں کوئی قابلِ تہذیب اضافہ
 نہیں کیا۔ اسی لئے ہم نے غور کی آٹھ صدیوں کا ذکر کیا ہے (ظاہر)
 علامہ کارل مارکس نے کیونٹ پارٹی کا مینی فیسٹو اعلان نامہ یا
 منشور ۱۸۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ جب تک مارکس کی گہری نظر
 فلسفے پر تھی، معاشیات پر نہیں تھی۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ معاشیات
 اور سیاسیات پر یکساں دیکھ اور تفصیلی مطالعے کی نوبت بعد کو
 آئی جس کا حاصل اُس کی اہم فریڈرک اینگلس کی مشترکہ محنت کا
 نتیجہ داس کپٹل DAS CAPITAL (دس کپ سرمایہ) کی صورت
 میں ۲۰ سال بعد مکمل ہوا۔ تب تک کیونٹزم ایک لفظ، ایک اصطلاح
 اور ایک آئندہ تھا۔ باقاعدہ سائنسی نظریہ نہ تھا۔

علامہ ڈیوڈ ہاروی نے اگر ایک ہی کتاب، اسلے، یا اخبار کا
 مطالعہ نہ کیا ہوتا تو صرف کھلی آنکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ
 کر سکتا تھا۔ ملک صاف کرنے والے یونینوں کی ملازمین کی کلاں پر
 ۱۹۵۶ء میں گھڑی تک نظر نہ آتی تھی آج اپنے گھروں میں بڑے
 سائز کے ٹیلی ویژن سیٹ لگاتے ہیں اور عالمی خبریں پر تبصرے
 لکھتے اور تبادلاً خیال کرتے ہیں۔ حال کے ہی اعداد و شمار نے
 ڈیوڈ ہاروی، اعداد و شمار اور کتابوں کی نوعیت اور مقدار کا رتہ
 رتی حساب لگا کر اوپر کے بیان کی تصدیق کر دی ہے (ظاہر)
 علامہ ادھر چند برسوں سے یہ ہوا چلی ہے کہ کیونٹزم کی ساری
 برکتوں کا فقدان، مظالم کو قرار دیا جاتا ہے جو گھر کے بھید کی
 کے ان قابل ذکر مصنفوں نے اپنے نادلوں میں بیان کئے ہیں اور
 جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دانشوروں پر اہل قلم اہل علم پر اپنے
 طوطے سے سوچنے یا کہنے والوں پر یا دشمن کی سازش کے شکار ہو
 جلسے والوں پر مختلف جیلوں محالوں سے پُر اسی زندگی کے تمام
 مدد دانے بند نہ لگائے رہے اور ہزاروں ہزاروں نام نہاد

ادبیت تک قید و بند کی حالت میں گل سرگشیں۔ اگر ذہب و ادب کی
 خاطر کچھ مبالغہ بھی ضروری ہو تب بھی ان افسانوں کی چلن سے یہاں تک
 حقیقت کا روپ دکھائی دے جاتا ہے۔ لیکن کسی بنیادی کھڑ
 بکھڑ کے وعدے میں، طبقاتی انقلاب کے لئے میں ایسے گئے چنے
 افراد کا رجحان ایک سماج میں غلام اقلیت ہوتے ہیں (پچھلے جانا)
 طبع قدرتی اسباب کے باوجود ایک حد تک قدرتی ہے وہ شخص جو
 مسلمانوں کی عالمی تاریخ سے باخبر ہو اسے تو حق نہیں اٹھتا ان
 واقعات پر اٹھ اٹھانے کا۔ (ظاہر)

۵۔ جسے مذہب، جو وہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کے درمیان ہونے
 والے فرقہ فسادات کی روداد اٹھا کر دیکھ کر قتل اور زخمی
 ہونے والوں سے قطع نظر وہ غیبیاتی ڈھنگ اہم ہے جو بالآخر
 اقلیت کو اپنے معاشی اور سماجی وجود میں محسوس ہونا ہوگا جس کے
 کار کا حصہ ہے۔ مابوکی عام اور ملی جمل کر رہنے کی انگ ڈھکی
 ہے۔ یہ فسادات، جمہوریت POGRAMS کسی فرقے کو گھیر کر
 ماننے کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ صرف کشت و خون پر تمام نہیں ہو
 جاتے، بلکہ اکثریت میں ناگوار، اقلیت میں بیزاری اور کسی
 حد تک بے روزگاری اور SYNICISM کو بڑھا دیتے ہیں
 جو ہمارے سماج کی تعمیر میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر رہتے ہیں (ظاہر)
 ۶۔ ڈھائی سو برس سے مزید کہ انھارویں صدی بے معنی اور بے
 سمت خانہ جنگیوں میں بسر ہوئی۔ ساجم علاقے اور ان میں بہت سی ہولی
 خونی تاریخ ہو گئیں۔ کاروں گہرے غامناں ہوئے، سرخیں غیر محفوظ
 اور تجارت کے فروغ کے لئے محدود ہوتی چلی گئیں ۱۹ویں صدی
 شروع ہوتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی صنعتی اور تجارتی لوٹ کو
 سیاسی اقتدار کی پشت پناہی نصیب ہو گئی اور ملک معشر کی حکومت
 ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ملک براہ کچھ مال کی کھیتی اور تیار

مال کی منڈی بنارہا (ظاہر)
 شرح پیدا نش اور شرح اموات دونوں میں بے حد اضافے کے
 ساتھ ساتھ مسلمانوں کی یکے بعد دیگرے جسمانی اور ذہنی ملامت
 مگر جان سے ہٹا کر یہ ملک باوریں کے قانون کے تابع مطابقت ہے
 (ظاہر)

دُشْمَنِ دُنْیَا

مسلمان نے عقیقہ کو دنیا پر اس طرح مسلط کر رکھا ہے کہ اس دنیا کو مقابل امتنا ہی تصور نہیں کرتے۔ مسلمان رہتے دنیا میں ہیں اور ان سے بیزار رکھتے ہیں، ان کے گوشت و پوست کی منسوخیات مادی ہیں، خود انشراح اور تقویت کا انحصار جسم کی صحت پر ہے دنیا مزید آخرت ہے اسی لئے دنیا میں صحت اور دیانت کی زندگی بسر کرنا چاہیے۔ معاش اور معاد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر ہمارے علمائے دین اور مفتیان شرع متین کائنات کے قوانین پر تو غور نہیں کرتے جن سے ان کی دنیا درست ہو اور تجسٹا حق میں بھی صلاح حاصل ہو۔

یہ زمانہ خارجی حقائق کی مکرانی اور عمل تجربے اور مشاہدات کائنات کا ہے، صنعت و حرفت کا ہے۔ محنت و اجتہاد اور ایجاد کا ہے، از کار رفتہ الہیات رد کردہ منطقی اور منسودہ فلسفہ کا ہے جب تک مسلمان جدید تعلیم حاصل نہ کریں گے، اور اپنے بہت سے فضول اعمال اور حیالات کو ترک کر کے اپنا وقت قرآنی اور روپیہ جدید تعلیم کے حصول میں صرف نہ کریں گے اس وقت تک ان کا فہم اور پستی سے نکلنا دشوار ہے، مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کا مسئلہ تعلیمی مسئلہ ہے، اگر ان کی تعلیم صحیح اصولوں پر سمجھا تو ہائی خود بخود حل ہو جائیں گے۔

(بابائے اردو)

کیونسٹ پارٹی اور ہندوستانی مسلمان

ہاں کی ہے۔ یہ واحد پارٹی ہے جس نے یوپی میں اردو کو ثانوی سرکار میں زبان بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ کچھ اور باتیں بھی ہیں جن کی بنا پر کمینٹیوں اور سیاریوں کے درمیان خط امتیاز کچھ زیادہ واضح نہیں رہتا۔ مسلم فرقہ مسلم پرسنل لا میں مخالفت کے سوال پر خاصا براہ فرقتہ ہے۔ جہاں بھی سیاری پارٹیوں نے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کو قابل جواز ٹھہرایا ہے وہاں گرد گولہ لگنے اس قسم کی مداخلت کی مخالفت کی تھی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جن سنگھ کا نعرہ ہے۔ ہندی ہندو ہندوستان۔ لیکن مرحوم گولڈا لکرنے پنجاب کے ہندوؤں کو پیشہ بھی دیا تھا کہ وہ پنجابی زبان کو اپنی زبان تسلیم کریں۔ اردو کے معاملے میں تو کمینٹیوں اور سیاریوں کے درمیان خط امتیاز خاص طور پر بفرود صبح ہے۔ جن سنگھ ٹلے کہتے ہیں کہ اگر اردو والے اپنی زبان کے رسم الخط کو چھوڑ کر دیوناگری لپی اختیار کریں تو انھیں اردو کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے گی۔ بعینہ ہی مشورہ کچھ ترقی پسند ادیب بھی دے رہے ہیں جن کی کیونسٹ پارٹی سے (دشمنی دھکی چھپی نہیں۔ ایک وقت اس معاملے میں مجھے کا ترقی پسند گروپ متفق اترے تھا لیکن جب اردو والوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا ہوا تو اس گروپ کے بہت سے ممبر مت ہار بیٹھے۔ بہر حال جو بھی کو معلوم ہے کہ کھنڈ میں ان لوگوں نے ہندی کے ادیبوں کے ساتھ جس معاہدے پر دستخط کئے تھے ان میں انھوں نے اردو کو ایک ضمنی اور ذیلی زبان مان لیا تھا۔ اس معاہدے کے خلاف مخالفانہ مظاہرے بھی ہوئے۔ خواجہ احمد عباس کا کہنا تھا کہ مظاہرین مسلم لیگی تھے لیکن یہ انھوں نے نہیں بنایا کہ مظاہرین کے سیاسی عقائد کا فیصلہ انھوں نے کرکٹ کی بنا پر کیا کہ نہ مسلم لیگ تو ان دنوں یوپی میں تھی ہی نہیں۔ اگر کیونسٹ کے کچھ اذیلی اداروں کی کارگزاری پر نظر ڈالی جائے تو بھی یہی مسلم ہو گا کہ ان کے

بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وہ سیاسی پارٹیاں جن کا رجحان عیسیت کی طرف ہے، اقلیتوں سے متنازعہ خصوصی کشتی ہیں اور سیاری پارٹیاں ان کی ہمدردانہ کے حقوق کی حمایت ہیں، البتہ انہیں کہ اس نظر سے کہ تاہم میں کچھ ثبوت پیش نہ کئے جا سکیں۔ تقسیم ملک کے بعد جو ہنگامہ غارت گری برپا ہوا اس میں پیش پیش یمنی گروپ ہی تھے۔ اگرچہ یہ جی جمع ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے نوآبادی کے فسادات کے جواب میں راجپی میں مسلمانوں کے قتل عام کی جو اسکیم بنی اس میں کچھ سیاری رہنما بھی شریک تھے۔ اب بھی اقلیتوں کو معمولی سے معمولی رعایت دینے کا بھی سوال اٹھے تو بعض یمنی گروپ اس پر بوکھلا رہ گئے ہیں۔ مثلاً یوپی میں انتخابات سے قبل اردو والوں کو جو معمولی سی رعایات دی گئیں وہ اگرچہ اردو والوں کے کم سے کم مطالبات سے بھی کم تھیں لیکن جن سنگھ نے ان رعایات کی بھی مخالفت کی۔ اور برسر اقتدار پارٹی پر مسلم فرقہ پرستی کو فروغ دینے کا الزام لگایا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب دلی میں جن سنگھ کی حکومت تھی تو اپنے زمانہ اقتدار میں اس پارٹی نے اگرچہ مسلمانوں اور اردو زبان بولنے والوں کو کوئی حق سہولت نہیں دی لیکن ایسی کسی سہولت کو دیا بھی نہیں یا جو ان کی پیش رو کا نگریسی حکومت دے چکی تھی۔ اسی طرح کانگریس نے بھی یہاں دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد مسلمانوں یا اردو والوں کو تاحال کوئی نئی سہولت ہم نہیں پہنچائی۔ دیے بھی جہاں تک اقلیتی مسائل کا تعلق ہے مرحوم ڈاکٹر رام مندر لویا دوسرے سنگھ گوند داس اور مرحوم ڈاکٹر سمجھو ناخند و کانگریس اور شری ایل بیاری باجپئی (جن سنگھ) کے موقع میں سرور فرقی نہیں۔ بھر سوتن پارٹی بھی ہے جسے بحیثیت کا الزام قبول کرنے سے خود بھی انکار نہیں۔ اس پارٹی نے اس وقت تک اقلیتی حقوق کی حمایت

موقف میں اودھان لوگوں کے موقف میں جنہیں فرق پرست کہا جاتا ہے جو فرقہ
وہ بندی ہیں بلکہ غمی ہے۔ مثال کے طور پر سیکولر ڈیموکریسی کے محاذ کو
یہ کہیں۔ اس محاذ پر کام کرنے والے جن کی کیونسٹ پارٹی سے وابستگی شک
سے بلا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو جو مشورہ دیتے ہیں ان کا موازنہ
اُن مشعوذوں سے کیا جائے جو انہیں ہندو فرقہ پرست جیتے جیتے ہیں تو معرفت
اتفاق نظر آئے گا کہ جہاں ہندو فرقہ پرست مسلمانوں کو ہندو بنا چاہتے
ہیں وہاں سیکولر ڈیموکریسی کے حامی انہیں ہندیا نے پرکھ کر لیں گے۔ اس
فرق کو غمی قرار دینے سے جو حضرات اختلاف کریں اُن کی خدمت میں گزارش
ہے کہ ہندیا نے کا مطلب بالافعل یہ ہو گا کہ مسلم اقلیت اکثریتی فرقے کے
کتاب و رسوم کو اپنا لے۔ یہ کوئی دہم یا گمان نہیں۔ آخر برسرِ اقتدار پارٹی
بھی تو سیکولر نظام کی حامی ہے لیکن سرکاری تقاریر بالخصوص انقشائی
تعاریف کو دیکھنے کا جن لوگوں کو موقع ملا ہے اُن سے یہ بات غمی نہیں ہوگی
کہ ان تقریروں پر ہندو رسم و رواج کی کج فہمی اور واضح چھاپ پڑتی ہے تو پھر
کیسے ایسا تو نہیں کہ

ہیں سنا ہے کچھ نظر آئے ہیں کچھ

در اصل بات یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں برسرِ اقتدار آنے کے لئے مختلف
حرے استعمال کرتی ہیں۔ جب یہ محروم اقتدار ہوتی ہیں تو ان کے پیش نظر
دو مقاصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ جس طبقے یا فرقے کی انہیں ٹھوس تائید حاصل
ہے اُسے مطمئن رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ جن طبقوں یا فرقوں میں انہیں کچھ
خاص تائید حاصل نہیں انہیں فریب توقعات میں مبتلا کر کے اگر ان کی تائید
نہ بھی حاصل کی جاسکے تو کم از کم ان کی مخالفت میں کمی لائی جائے۔

فریب توقعات میں مبتلا کرنے کے لئے ان فرقوں یا طبقوں سے جو دوسرے
کئے جاتے ہیں اقتدار میں آنے کے بعد انہیں یا تو بھلا دیا جاتا ہے یا
وہ فوجی نمائندگی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کسی پارٹی کے حقیقی محرک کا فیصلہ اُسی وقت
ہوتا ہے جب وہ برسرِ اقتدار آ جاتے۔ ہندوستان کی کیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار
نہیں اور اس سے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اپنے طور پر برسرِ اقتدار نہیں آ سکتی۔
اسے احساس ہے کہ اقتدار تک رسائی اسے حکمران پارٹی میں نفوذ کے
بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ نفوذ کی حکمت عملی کو کامیاب بنانے کے لئے یہ
ضروری ہے کہ جو بات نام کا نگاہی دیکھے بے یں کہتے ہیں اسے کانگریس
میں نفوذ حاصل کرنے والے کیونسٹ زوردار لکھے میں کہیں —

سیکولر ازم کی حمایت اور اقلیتی مفادات کے تحفظ کی بلند ہنگامی باتیں
اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہیں لیکن زیرک سیاستوں کی طرح کیونسٹ یہ بھی سمجھتے
ہیں کہ اقلیتوں کی تائید پارٹس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور برسرِ اقتدار
آنے کے لئے اکثریتی طبقے کی حمایت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ اُن کے رویے
میں دو رخا ہیں جس سے پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اصل سوالیہ یہ ہے کہ اگر یہ پارٹی برسرِ اقتدار آ جائے تو مسلم
اقلیت کے ساتھ اس کا کیا برتاؤ ہو گا۔ جیسا کہ سطور بالا میں کہا جا چکا ہے
اُس وقت تک اقلیتوں کے بارے میں ہندوستان کے کیونسٹوں کی پالیسی
گو گو کی پالیسی ہے لیکن ہندوستان کی کیونسٹ پارٹی کوئی ایسی پارٹی نہیں
جس کی حیثیت صرف ملکی ہو۔ یہ ایک بین الاقوامی کیونسٹ پارٹی کی شاخ
ہے۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسلم اقلیت کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہو گا
اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے جن ملکوں میں
کیونسٹ پارٹیاں برسرِ اقتدار آئی ہیں وہاں کی مسلم مسلم اقلیتوں کے ساتھ
ان کا برتاؤ کیا ہے؟ وہاں انہوں نے مسلم اقلیتوں کو اکثریتی طبقے کا ہمتیہ
سمجھا ہے یا اس کے مقابلے میں حق اور فرقہ پرستوں کو اہم ترین کیونسٹ
ملک ہے اس لئے سب سے پہلے ہم اسی ملک کی اقلیتی پالیسی پر نظر
ڈالیں گے۔

آزاد کے زمانے میں روسی مسلم خطوں کے مقابلے میں اپنی برتری کا اعلان
”بڑے بھائی“ کی اصطلاح میں کیا کرتے تھے۔ ترکستان میں روس کے
آخری گورنر جنرل کرپائیچ نے ایک مقالے میں وہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
”تھا“ روس میں جو متحد قومی آباد ہیں وہ ایک ہی ماں یعنی عظیم روس
اور ایک ہی باپ یعنی عظیم شہنشاہ کی اولاد ہیں لیکن اس بڑے خاندان میں
روسی باقیوں کے بڑے بھائی ہیں۔“

مسلم خطوں کے باشندوں کو روسی اب بھی یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں
کے تمام دعوؤں کے باوجود علاء انہیں خود سے کمتر ہی سمجھتے ہیں اور ان خطوں کے
کیونسٹ اس معاملے میں روسیوں کی ہمواری پر مجبور ہیں جو روسیوں کا ذکر
بھائی کی حیثیت سے نہیں ”بڑے بھائی“ کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ مثال
کے طور پر ہندوستان کے دوسرے پرانے والے ایک روسی وفد کا لیسنڈ
ماہام یا گار نامہ کی ڈیوٹے بھی اسٹانی دود گزرجانے کے بہت دن
بھر یعنی ۱۹۱۵ء میں ایک قوم کے ”بڑے بھائی“ کے تئیں احترام و محبت کا

مخلصانہ فلاحی کا جہد یا تھا۔ ریرادوا ادسکوٹا۔ ۲ نومبر ۱۹۵۹ء) یاد رہے کہ اپنے نوآبادیاتی وعدہ میں اپنے آپ کو انڈو نیشیا دلوں کا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور جب جاپان سامراجیت کی روپر گامزن ہوا تو اس نے بھی اپنے لئے ایشیائی قوموں کے بڑے بھائی کا لقب ہی اختیار کیا تھا۔

روسیوں نے ایسے جہد انتظامات کر رکھے ہیں کہ ان کے بڑے بھائی کا منصب برقرار رہے۔ فوج میں مقامی باشندوں کی بھرتی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔

داخلی اور خارجی دغا کے لئے جو فوجیں ہیں وہ زیادہ تر روسیوں اور غیر ایشیائی نوآبادکاروں پر مشتمل ہیں۔ نوآبادکار یا تو روسی ہیں یا یوکرینی۔ غیر ایشیائی نوآبادکاروں کی تعداد ۲۰۰۰۰۰ تھی لیکن ۱۹۵۹ء میں یہ ۷۰۰۰۰ تک پہنچ گئی ۱۹۶۲ء میں جو تعداد و شمار شائع کئے گئے تھے ان کے مطابق وسطی ایشیا کے پانچ ری پبلکوں کی آبادی میں چھٹی ۱۹۵۹ء اور چوتھی ۱۹۶۲ء کے درمیان ۲۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس عرصے میں روس کی پوری آبادی میں کل ۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ وسطی ایشیا کی ری پبلکوں کی آبادی میں غیر معمولی اضافے کا سبب یہی تھا کہ وہاں غیر ایشیائی نوآبادکاروں کی پلغار بڑھ گئی۔

رہن سہن اور معاش کے معاملے میں بھی مقامی مسلمان باشندوں کا معیار روسی نوآبادکاروں کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے علماء کا ایک وفد روس گیا تھا۔ اس وفد کے ایک رکن مولانا رفیع حسن کا بیان ہے کہ تاشقند کے تمام نئے اور اچھے علاقوں پر روسی قابض ہیں اور مسلمان عموماً گندی پستیوں اور مٹی کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔

ان خطوں میں ترقی ہوئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ترقی کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس ترقی سے فائدہ کسے پہنچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی ترقی کو لیجئے۔ یہ ترقی فربہ ہوئی ہے لیکن اس سے فیضیاب ہونے والوں میں مقامی باشندوں سے زیادہ بیرونی لوگ ہیں۔ ۶۱-۱۹۶۰ء کے تعلیمی سال میں تازقستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب یہ تھا: ۳۲.۳۹٪ تازق طلباء، ۳۱.۲۵٪ تازق طلباء، یہ بات قدرتی بھی ہے کیونکہ دیہی تعلیم وہاں روسی ہے۔

انتظامی مہم میں بھی مقامی باشندوں کا تناسب اہم مساوات کی غماز کی کرتا ہے ۱۹۴۸ء میں صدر لہ گوشت کے صوبہ دار میں تازقوں کے پاس انتظامی مہم سے صرف ۳۰ فیصد تھے بعد کچھ عرصے کی محنت اور ہلکی محنتوں میں بالترتیب ۶۱٪ اور پھر بعد نسبتاً اتنا اضافہ ہوا کہ اب کچھ مقررہ تصویب پر بھی نہیں کرتے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۵۹ء کے

تازقستان کا ریرادوا کی اطلاع کے مطابق اس سال تازقستانی صنعتوں میں جو ماہرین ملازم تھے ان میں تازق صرف ایک تھا اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء کے ریرادوا ادسکوٹا کے مطابق ازبکستان کی ہلکی صنعتوں میں جو کارکن تھے ان میں ازبکوں کی تعداد صرف ۱۲ تھی۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جب انقلاب کے بعد مسلم خطوں کو ازبکوں نے زیر کرنے کا سلسلہ درپیش تھا تو اس معاملے میں روسی کونٹوں کے مرکز میں روس کے ان طبقوں کے افراد تھے جو اندرون قفقہ کیوزم کے جانی دشمن تھے۔

یہ بات یمن کے معاون خصوصی سانار دیکھی تسلیم ہے جسے ۱۹۱۹ء میں تاشقند کی حکومت کو زیر کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ اپنی کتاب *Kolonial naya Revolyutsiya* میں جو ماسکو سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی وہ رقمطراز ہے:

”اس وقت جب ترکستان کی سوریہ مسلمانوں کو ایک مختار قوم سمجھ کر ان کی مخالفت کر رہی تھی تو اسے یورپی قوموں میں ایسے اتحادی میسر آئے جو کبھی کے باس میں یہ قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ کیوزم کا ساتھ دیں گے۔ یہ لوگ زمینیا کے بورژوا طبقے کے لوگ، دولت مند روسی کسان، زار شاہی کے افسر تھے کہ روسی پادری تک۔ لوٹ کھسوٹ کرنے والے سامان کے یہ لوگ قدرتی طور پر کیوزم کے سرخ جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ سابق زار روسی نوآبادکاروں کے جھنڈے سے متحد تھے۔ بیماری کیوزم دراصل ان کے لئے روسی سرخ محافظوں، آبادکاروں اور افسروں کی طرف سے مقامی باشندوں کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھنے کے مترادف تھا۔“

منہجی اور ثقافتی احمد کے بارے میں بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ کونٹسٹ مسلم دنیا کو ظلمت کشی سے ہٹا کر ترقی پسندی اور روشن خیالی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے۔ کونٹسٹ ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو مکمل طور پر فنا کر کے انھیں اکثریتی معاشرے میں مدغم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں کوئی مسلمان بھی قابل اعتبار ٹھہرتا ہے اگر وہ خدا پر ایمان سے مکمل طور پر دستبردار ہو جائے۔ اپنے تہذیبی ورثے سے مکمل بے تعلقی اختیار کر کے اور اپنے اسلامی نام سے بھی دستبردار ہو جائے۔ مثال کے طور پر یوڈیت جریدے ”سائنس اور مذہب“ کے ۱۹۶۴ء کے دسویں شمارے میں جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ ”بہت سے مولوی تو یہاں تک کہتے گئے ہیں کہ اسلام کے جو چالیس احکام ہیں، اب اب ان کے لیے سو فیصد حکم کبھی اضافہ ہونا چاہئے۔ مولویوں کے

مدیہ میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ سچا حوالہ کا نتیجہ ہے۔ معنون نگار کے خیال میں سماجی ترقی اور قومی معاہدے کے واسطے جس مسلمان مولوی جو نئی باتیں کہتے ہیں وہ اسلام کا جز نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کا ضد ہیں۔ مسلمان جو کچھ بھی کہتے ہیں اس لیے میں کہتے ہوں جس سے یہ ثابت ہونا ہے کہ ہر چیز کا فیصلہ خدا ہی کرتا ہے اس طرح وہ مارکسزم / لیننزم سے تمام کے ذہن کو گمراہ کر رہے ہیں۔ وہ لوگوں کے ذہنوں میں مادی رائی طاقتوں پر بھروسہ کرنے کا رجحان پیدا کرتے ہیں اور اس طرح سماجی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ معنون نگار کو یہ بھی شکایت ہے کہ مسلمان مولوی مسلمانوں کو بار بار یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ اُن کے ہر فرد کو اپنے بچوں کے نام اسلامی رکھنا چاہیئے۔ دوسرے کمیونسٹ ملکوں کا مذہبی کمیونیت دوس سے مختلف نہیں ستمبر ۱۹۷۲ء میں یسایا کے مفتوح اعظم شیخ طاہر احمد الزواہلی نے حکومت بلغاریہ کے واسطے میں بیان دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف حملہ واز کا رکھنا یاں کہہ سکتا ہے۔ تھوڑوں کی عدم ادائیگی کی دھمکی دیکر وہ یسایا کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے اسلامی نام بدلیں اور بلغاریہ قوم میں جذبہ ہونے کے لئے

اسلام کو زیر باد کہہ دیں۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں مفتوح موصوف نے یسایا کے اخبار "الفجر المجید" میں ایک معنون نکھامیں میں بتایا کہ جو مسلمانوں نے اپنے نام تبدیل نہیں کئے انھیں بلغاریہ کی کمیونسٹ حکومت نے سخت سزائیں دیں جن میں موت کی سزا تک شامل تھی۔ ۲۴ مئی ۱۹۷۳ء کو "بنانی اخبارات" میں خود بلغاریہ کی مسلمانوں کا یہ بیان شائع ہوا کہ انھیں اپنے مذہب کو خیر باد کہنے اور نام بدلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ پانچ سو مسلمانوں نے ان احکام کے خلاف احتجاج کیا تھا، "اسٹیٹ سنڈے" اور "سے جیلوں میں بند ہیں یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی اگر ہر فرد کو آزادی تو اس کا مذہب مسلم اقلیت کے تئیں باقی ملکوں کی کمیونسٹ حکومتوں سے مختلف ہو گا۔ دراصل کوئی بھی سیاسی پارٹی جس کی بنیاد کسی ادنیائی نظریے پر ہو اقلیتوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی ہندوستان جیسے ملک میں تو جو مختلف ہندوستانی اور مذہبی اگلیوں کا ملک ہے اس قسم کی پارٹی کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے غیر معمولی تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ اور اگر اس کی نوبت آئے تو جو اگر سانا زاد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے اس کی تمدنی حلیہ ہی جھٹلیں اور وہ اگر لڑے نہیں گئے جنھیں ان دونوں پر پابندی ناستوں کا لقب دے سکتا ہے۔

شخصی حکومت اور جمہوریت

شخصی سلطنتیں سازشیں کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جتنی جہاں خوب چھلنی چھوڑتی ہے۔ قصر حکومت کے رستے ایسے پتہ درپتے اور اس میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ ان میں داخل ہو کر نکل آنا بڑے شاطر کا کام ہے۔ ریاستوں میں دو گونہ مصیبت ہو سکتی ہے، ایک اندرونی، ایک بیرونی، خود مختار ریاستوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی گنجائش ہوتی ہے، ہر شخص کی خواہ وہ کوئی بیویہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سرکار کو خوش کر لیا جائے۔ جس سے پیا خوشی اسی گراج۔ اس میں رفاقت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں، ریشہ دواٹیوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس کشمکش میں کذب و استرا بہتانت، خیر غرض کوئی ایسی کینہ حرکت نہیں ہونی جو حریف ایک دوسرے کے کام میں نہ لائے ہوں۔ اب جمہوریت کا زمانہ ہے، کامیابی و ناکامی کا مدار تعدد پر ہے جس قدر زیادہ ہاتھ اٹھ گئے وہی جیت گی جہاں جہاں نہیں ہوتا، اخلاقی جرات نہیں ہوتی جہاں ذاتی پارٹی کا مفاد مدنظر ہوتا ہے جہاں شہرت یا ہرلعزیزی کی چاہت ہوتی ہے جہاں جذبات سے زیادہ اور عقل و دانش سے زیادہ بحث ہوتی ہے جہاں خود اعتمادی اور قوت ایمانی کا فقدان ہوتا ہے وہاں تعدد ہی غالب ہوتی ہے!

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق

مسلمان اور وطن دوستی

رکھتے۔ ایک روز بازار میں جا رہے تھے کہ اپنے اسی خاص دوست کو پٹے دیکھا جس کو سلام کا جواب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آؤ دیکھا تاؤ۔ فوراً خود بھی میدان جنگ میں کود گئے۔ دوسری پارٹی مضبوط تھی۔ اس نے دوست کے ساتھ میاں جی کو بھی مارا کہ آدھ موا کر دیا۔ چار پائی پر ڈال کر گھر لایا گیا۔ بچوں نے کہا کہ آبا آپ کو کیا بڑی تھی کہ خواجواہ پر لے جھگڑے میں ٹانگ اڑائی راہی وحم کٹی ہوئی بولے اس دوست کو سلام کا جواب دیا کرتا تھا۔ سلام کا مطلب ہوتا ہے تم سلامت رہو۔ بس جس کی سلامتی زبان سے مانگے اس کی سلامتی ہاتھ پیر سے بھی چاہئے۔ میں ایک کے سوا کسی کو سلام کا جواب اسی لئے نہیں دیتا تھا کہ کس کس کے لئے لپٹتا پھروں گا؟ ایک کی سلامتی چاہی تھی سوا اسی لئے یہ حال بنا دیا!

ایمان داری کی بات یہ ہے کہ عبادت کی طرح یہی اور اصلی دوستی بھی مسلمان صرف ایک ذات سے رکھ سکتا ہے۔ اور اس ایک دوستی میں ایسی ایسی شقیں ہیں۔ ایسی ایسی افتادیں ہیں کہ کیا عرض کیا جائے بس اللہ دے اور بندہ ملے۔ اس مشرق کے غمزدے کسی اور طرف کا ہوش ہی نہیں آنے دیتے۔ چنانچہ دنیا کی جتنی بھی پسندیدہ اور محبوب چیزیں ہیں۔ ان کو احساس کمتری شدت کے ساتھ بولنے لگتا ہے۔ غلام اور انصاف کے کچھ دعوے دار یہ کہتے تھے جلتے ہیں کہ خاں کوڑا تیا کیوں چاہا اور خاں کو اتا کیوں نہ چاہا۔

وطن بھی دینا ہے ان محبوبان میں سے ایک محبوب ہے حمی کو بیض فداں مندوں نے خواہ مخواہ سدا سے مقابلے پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اور کہتے

ایک نو مسلم بھائی کا لطیفہ سنا تھا کہ ہونے کو وہ مسلمان ہو گئے روزہ نماز انھوں نے سب کچھ کیا مگر یہ عادت نہیں چھوڑی کہ گاؤں سے باہر نکلتے تو بیل کے نیچے استھاپت مورتی کو ڈنڈوت ضرور کر لیتے۔ ایک روز عاقوں کے مسلمانوں نے ان کو یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ اور خوب خیر لی۔ مگر یہ صاحب نہایت معصومیت سے بولے کہ: خطامات! میں تو یہاں ڈنڈوت اس لئے کیا کرتا تھا کہ کیا خبر کبھی ان سے بھی کوئی کام بڑ جائے!!

مترم شمس کنول صاحب کی فرمائش ہے کہ مضمون لکھو بعنوان ہو مسلمان اور وطن پرستی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ مضمون ضرور لکھوں گا۔ مگر عنوان ہوگا "مسلمان اور وطن پرستی"

مسلمان تو خیر لوہیں بھی خدا کے سوا کسی کی پرستش کے قائل نہیں۔ لیکن جو لوگ قائل ہیں۔ وہی پرستار ہونے کا حق کو لینا اور کہہ رہے ہیں؟ ہاں اگر پرستش ہے مراد محض شاعری ہے اور کام پڑنے والی پرستش ہے تو پھر بلاشبہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سارے ہندوستانی وطن پرست ہیں۔ اور جو ہماری اس وطن پرستی پر شبہ کر رہے ہیں اس کو دراصل سمجھ کسی سے کوئی کام پڑا ہی نہیں ورنہ اس کو بھی ہماری طرح مجبوراً وطن پرست بننا پڑتا!

دوستی کا معاملہ البتہ جدل ہے۔ مگر دوستی کیا ہوتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے بھی ایک لطیفہ سنتے چلے۔ کہتے ہیں ایک میاں جی اپنے ایک خاص دوست کے سوا کبھی کسی کو سلام کا جواب نہیں دیا کرتے تھے لوگ ان کو بد دماغ کہتے۔ مگر میاں جی کسی کی پرواہ نہ کرتے اور اپنے کام سے

ہیں جو مشقتیں ہماری خاطر برداشت کی ہیں۔ ان کے سامنے کسی عارضی تکلیف کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اللہ اس تکلیف کو برداشت کرنا اور اور وطن کی خدمت بے قیور انجام دیتے رہنا۔ گو یا خدا کے حکم کی تعمیل ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن کے سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ حضور کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو مدینے کی طرف ہجرت کرتے وقت زبان مبارک پر آئے تھے۔

ارثا دو ہوا تھا کہ

”مکہ! تو مجھے ساری دین سے زیادہ عزیز ہے لیکن
تیرے عزیز محمد کو رہنے نہیں دیتے۔“

ایک اور حدیث شریف بھی بیان کی جاتی ہے جس میں حبیبِ وطن کو جزو ایمان بنایا گیا ہے۔ مگر اس روایت کی صحت پر اختلاف ہے اس لئے میں اس کا حوالہ نہیں دیتا۔ تاہم ہجرت کے وقت جو ارشاد ہوا تھا اس پر تو کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے اگر کوئی وطن دوستی کو مذہب اسلام کے منافی سمجھتا ہے تو اس کی عقل اور سمجھ پر قائم ہی کرنا چاہئے۔ مگر ہم وطن کو بُت بنانا نہیں چاہتے اور اسلام اخوت کو بھی بت بنانے کے خلاف ہیں اخوت اسلامی اور اخوت انسانی کے جو ش میں اگر ہم گھر گھر سچی اور کرنا بھولیں گے تو یہ اخوت اسلامی اور اخوت انسانی بھی ایک بُت کا ادب و حار لے گی۔ اور اس کو اسلامی تعلیمات اور انسان کے فطری تقاضوں سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

۱۹۴۷ء میں ہندو پاک جنگ ہوئی تو ایک مسلمان فوجی افسر ہندوستان کا وطن سے لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں کام آئے ان کی بیوی کو شوہر کی موت کے صدمے سے زیادہ صدمہ اس کا تھا کہ اپنے والدِ دوزخ میں جلے گا۔ کیوں کہ ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مسلمان کے ہاتھ سے مرنے والا جہنمی ہوتا ہے۔ میں نے ان خاتو سے پوچھا کہ بہن! ذرا یہ تو بتاؤ کہ اللہ میاں کے گئے کون کون سے ہیں؟ اور سوتیلے کون کون سے ہیں؟

میرے اس عجیب سوال پر وہ کچھ حیران ہی ہوئیں اور تھوڑی دیر کے لئے رونا بھول کر کہنے لگیں کہ اللہ میاں کے لئے گئے اور سوتیلے

ہیں کہ اس کو اسی طرح چاہو جس طرح خدا کو چاہتے ہو۔ یا پھر خدا سے بھی اسی طرح کا تعلق رکھو جس طرح کا تعلق وطن سے رکھتے ہو۔ دوسرے الفاظ میں وہ خدا کے ساتھ بھی اسی طرح کا مسخرہ بن کر آنا چاہتے ہیں جس طرح کا مسخرہ بن وطن سے ذرا رکھا گیا ہے۔

کسی کو برا لگے یا بھلا۔ ہم مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ہیں ہم دُشمن کی چوٹ یہ بات کہتے ہیں کہ ہماری عبادت اور پرستش کا سنوارا صرف وہی ہے لا شریک الاہ ہے۔ اور حقیقی محبت بھی صرف اسی ایک ذات سے کی جاسکتی ہے۔

مگر اس ایک ذات کی پرستش صرف اس سے محبت کہنے کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم باقی سب کا حق ادا کرنا بھول جائیں۔ بچے کو ملے سے ادا مال کو پیچھے سے چھوٹ جاتی ہے۔ جو باہمی تعلق ہوتا ہے۔ اور جس طرح وہ ایک دوسرے کے لئے دکھ اٹھاتے ہیں۔ اور خدمت کرتے ہیں۔ وہ خدا کی عبادت اور خدا کی محبت کی راہ میں رو کاوٹ کبھی نہیں بنتی۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں سمجھتا۔ ماں باپ سے محبت اور خدمت اور ان کے حقوق کا ادا کرنا چونکہ خدا کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو بھی عینِ عبادت ہی سمجھنا چاہئے قرآن کہتا ہے کہ مسلمان اولاد کو اپنے پورے مال باپ کی کسی بات پر اُت بھی نہیں کہنا چاہئے۔ اور اس کی وجہ بھی بتا دی ہے کہ تمہاری ماں تمہیں پیٹ میں رکھتی ہے اور دکھ پر دکھ اٹھاتی ہے۔ اسی اصول کی بنا پر ہم اپنی ماور وطن سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اور اس کی خدمت کو اپنا فرض اور اطاعت خدا دندی جانتے ہیں۔ کیونکہ اس مال نے بھی برسوں ہمارا بوجھ اپنی چھاتی پر اٹھایا ہے۔ اسی کی گود میں کھیل کود اور پڑھ لکھ کر ہم پر جان چڑھتے ہیں۔ اس کے پالنے پر ہی ہمیں یاس بھائی ہے۔ اس کی رودی سے ہم نے بھوک میں پیٹ بھر لیا۔ اس کے درد و دیوانے ہم کو سایہ اور حفاظت بخشنے ہیں اور اسی کے جسے مالے ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ اور جس طرح ہم نے ماں باپ کی باتوں سے یعنی اوقات ہم کو تکلیف پہنچتی ہے مگر اُنہ کے لئے خیال نہیں ہوتا۔ قرآن کے مطابق۔

اسی طرح میں بڑھی دھرتی۔ اس پر اپنے وطن اس جہم بھومی سے بھی اگر کسی کو کوئی عارضی تکلیف پہنچتی ہے تو میں قرآنی اصول سے اُنہ کو غلط جانتا ہوں۔ کیوں کہ جو سکھ اس مال نے پھیلانے

سو تلے لکھا سوال؟ پھر ذرا سوچ کر بولیں کہ جو ان کو مانتا ہے اور اطاعت
گزار ہے وہ مسلمان ہے اور سوتیلے ہیں!

میں نے کہا اچھا اب یہ بتائیے کہ ہندوستان میں جو یہ چھرتا
کر دے مسلمان کہتے ہیں۔ یہ اللہ کو اسی طرح مانتے ہیں یا نہیں جس طرح
پاکستانی مسلمان مانتے ہیں اور یہ اسی طرح اللہ کے اطاعت گزار ہیں یا
نہیں جس طرح پاکستانی مسلمان اطاعت گزار ہیں؟ ان ہندوستانی
مسلمانوں کو آپ اللہ میاں کا سا سمجھتی ہیں یا سوتیلے؟

بولیں۔ ہم لوگ سچے اور سچے مسلمان ہیں اور گمان ہی ہے کہ
اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا سمجھتا ہے۔ میں نے پھر پوچھا کہ جنگ سے پہلے کیا
برادران وطن کا جام خیال یہ نہیں تھا کہ ہندوستانی مسلمان دغا دہ
نہیں ہے؟ اب کبھی وقت پڑا تو یہ دھوکا دے گا غاری کرے گا۔ اس کی
ساری ہمدردیاں پاکستان اور اسلامی ممالک کے ساتھ ہیں۔ اور کیا یہ بات
صحیح نہیں ہے کہ اگر برادران وطن کی یہ بدگمانی ایک فیصدی بھی درست
نکلے تو پھر ان کروڑوں مسلمانوں کا اس ملک میں عزت و اکبر کے ساتھ
زندہ رہنا مشکل کیا ممکن ہو کر رہ جاتا۔ اور ایسی تباہی محیٰ کہ بابر دشا بد
پھر تائیے کہ آپ کے شوہر اہل ان کے ساتھیوں نے برادران وطن کے
شاد بشت نہ لڑ کر جاں دی۔ اور یہ سمجھ کر جان دی کہ اگر اس وقت ہماری
طرف سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو اس کا خیزا زہ کروڑوں آدمیوں کو
بھگتنا پڑے گا۔ تو کیا انھوں نے کروڑوں مسلمانوں کی جان اور عزت اور
اکبر و ہنر بچائی۔ اور کروڑوں سچے مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و حریت

پر اپنی زندگی قربان کر دینے والے کو آپ کے خیال میں کیا اللہ کا وزن میں
ڈالے گا؟

نوجوان امر کی یوہ کی سمجھ میں میری بات آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ لیکن ہندوستان
میں رہنے والے ہر سمجھ دار مسلمان کو یہ بات ضرور ذہن نشین کر لینی
چاہئے کہ ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اپنی اور بھائی ہندو
کی جان بچانے کے ہمارے کچھ آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر میمنٹ
چڑھ جائیں بلکہ اگر واقعی ہم سچے مسلمان ہیں تو ہم میں اتنی جرأت اور
ہمت ہوتی چاہئے کہ اگر کسی اسلامی ملک سے کوئی امر کہہ دیا ہو اور
ہم ناحق پر ہوں تو پوسے زور اور قوت کے ساتھ برادران وطن اور حکومت
سے کہہ سکیں کہ بے انصافی سے جو اہل اگر اس کے برعکس غلطی اسلامی
ملک کی ہو تو کسی پس و پیش کے بغیر حکم کھلا مقابلے پر آئیں اور برادران
وطن سے پہلے اپنا خون ملک کے دفاع میں بہائیں اس وقت ہماری
کوئی ہمدردی حملہ آور مسلمان کے ساتھ نہیں ہونی چاہئے۔ حدیث خریف
میں ایک روایت ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کا ساتھ دو چاہئے وہ ظالم
جو چاہے مظالم سننے والوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے بے اختیار
پوچھا کہ مظالم کا ساتھ دینا سمجھ میں آتا ہے لیکن ظالم کا ساتھ کیوں دیا
جائے؟ ارشاد ہوا کہ ظالم کا ساتھ دینا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو اور
اس کو ظلم سے روک دو۔

اس واضح تعلیم کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان وطن دوستی میں
کسی سے پیچھے رہ سکتا ہے۔

اپنے ہم بیٹریوں کے سامنے چھوڑ دیا

جب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ملک کی تقسیم کو قبول کر لیا تو مولانا آزاد نے بحالت عیواری خان عبدالغفار خان کو مشورہ دیا
کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ راج گوپال آچاریہ اور سردار پٹیل جو برسرِ جد میں رری فریڈم کے حق میں تھے اس
پر بادشاہ خان نے کہا: تو بہ! تو بہ!! ہم بختیوز نے آپ کا ساتھ دیا، حصول آزادی کے لئے کتنی ہی قربانیاں دیں اور
اب آپ نے ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم کو بیٹریوں کے سامنے ڈال دیا۔ مجھے یہ سمجھ کر دکھ ہوتا ہے کہ آپ نے ہماری دوستی
کا کیا صلہ دیا، اور کیا قدر کی۔ اگر ہم کانگریس چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے تو انگریز حکومت ہمارے سارے مطالبات
پورے کر دیتی مگر ہم نے اقتدار کی خاطر اپنے نظریات کو کہیں قربان نہیں کیا:

مولائش کسان بھی ایک ہندوستانی مسلمان

آغاخان صاحب بھی ایک ہندوستانی مسلمان تھے جو آخر وقت تک برطانوی سامراج کے وفادار رہے جو اپنا وقت زیادہ تر ہندوستان کے باہر یورپ اور امریکہ کی سیر کا چلن کر رہے تھے اور جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ شراب جب ان کے مارک ہونٹوں کو چھوئی ہے تو بھڑھو ہوتا ہے اور وہ پانی میں جاتی ہے۔

محمد علی کریم چچا گلا صاحب بھی ہندوستانی مسلمان ہیں جو اسلامی شریعت کے قانون میں تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ وہ کھٹا بھی ہندوستانی مسلمان ہیں جو کہتے ہیں کہ دوسرے اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں اور اصلاحات ہو جائیں لیکن ہندوستانی مسلمان شریعت کے قانون کی پتھر کی کیر میں کوئی تبدیلی برداشت نہیں کریں گے۔

راجہ صاحب محمود آباد بھی ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو کہتے تھے کیوں کہ ہندوستان میں ان کی آبائی جاگیر تھی اور دل سے پاکستانی ہوتے ہوئے بھی وہ پاکستان ہجرت کر کے نہیں گئے کیونکہ وہاں جلنے سے ان کی جاگیر ضبط ہو جاتی۔ اور اس لئے مدت تک وہ عراق میں مقیم رہے۔

نانی حلو کا کھدر کا کفن

یہ سب ہندوستانی مسلمان تھے۔ ہمارے محلے کی ٹوڑھی نانی حلو بھی ہندوستانی مسلمان تھیں

کس ہندوستانی مسلمان کی بات ہو رہی ہے۔

خالدا اعظمی محلی بڑا بھی ایک ہندوستانی تھے (زندگی کے آخری پندرہ برس کے لئے وہ پاکستانی ہوئے تھے) وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، کروڑوں مسلمان ان کو اپنا قائد اپنا لیڈر مانتے تھے لیکن اسلام کا بظاہر پریشانیوں میں سے کوئی ان میں نمودار نہیں تھی۔ ذرا ان کو کوئی نماز پڑھتے دیکھ لکھتا تھا وہ روزہ ہی رکھتے تھے۔ کیا ایسے مسلمان کو درک ہے جو دھڑی ملیں، انہیں بھی ایک ہندوستانی مسلمان تھے۔ انہوں نے جو دستور ساز اسمبلی (CONSTITUENT ASSEMBLY) میں ہندوستان کا وفادار شہر پارہنے کی قسم سب کے سامنے کھائی تھی۔ ایک برس کے اندر اندر وہ اپنے خاغان کے لوگوں کو لے کر پاکستان چلے گئے اور وہاں پاکستان کے وفادار رہنے کی قسم کھائی۔ دھیرے دھیرے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل ان کو تار یک دکھائی دیتا ہے اس لئے وہ ہندوستان میں نہیں رہ سکتے (وہ ذرا بوجھنا صاحب نہ

یہاں سے گئے۔ لکھتے تھے: ایک ملک کے صاحب لوگوں کی طرح صرف ہونے لگے تھے) جو خلیفہ الزماں صاحب کے علاوہ موتی لال نرود، سر تیج بہادر چوہدری، آئندہ لائیں ملا اور گھوٹی سہائے فراق کی زبان تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ایک ہندوستانی مسلمان تھے حالانکہ ان کی پیدائش کا معطر میں ہوئی تھی جو دینیات، عربی فارسی، اسلامی فلسفہ اور قرآنیات کے عالم فاضل تھے۔ وہ آخر تک قوم پرست بے ادراک کے اسلام نے کبھی ان کو قوم پرست ہونے سے نہیں روکا۔

گلن کا ہندوستانی مسلمان

جواپنے پیٹھے سے منجھکتیں۔ یہ اس حد تک کہ انہی نے جلا ہی نہ کیا۔
قیس جو پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھیں، جو مہمان کا گناہ بھی کہ ایک تقریر نہ
کراتی ستا کر ہوئی تھیں، کہ ان کا اور رسول کے بعد مہمان کا گناہ ہی کا نام ہی
لتی تھیں۔ اور جنہوں نے ستر برس کی عمر میں اپنے کو گھگھے پر اپنے کو گن
کے لئے کہہ دیا ہے انہوں سے بڑھا تھا کیوں کہ انہیں سر نہ کے نہ
بھی اگر میزی لٹکے کے کفن میں دفن کیا جانا منظور نہ تھا۔

اک سواری میں نہیں ڈھلے

مزدور ہندوستانی ہیں جو کم بگار اور اونچی قیمتوں کی چکی میں
پستے رہتے ہیں، منگالائے الاؤنس کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، مزدور
ہندوستانی مسلمان بھی ہیں جو اسی طرح کم بگار اور اونچی قیمتوں کی چکی میں
پستے رہتے ہیں اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔
زمیندار ہندوستانی ہیں جن کے پاس زرعی انقلاب کے بجائے
بڑے بڑے فارم ہیں۔ زمیندار ہندوستانی مسلمان ہیں جو اس کے پاس
آج بھی زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھتے ہیں۔
اسے ہندوستانی سمگلرز بھی ہیں جو لاکھوں روپیہ کا لادیں

کہتے ہیں۔ ان میں اگر کراچی، یسکاتر، تھمال جیسے ہندوؤں کی
توجہ ملی مستان جیسے مسلمان بھی ہیں۔ عیسائی بھی ہیں پوری بھی ہیں۔
کوڑوں ایسے ہندوستانی بھی ہیں جو دروہے روز بھی نہیں
کے سکتے جو ادھا پیٹ کھا کر کسی گندی جھونپڑی میں سو جاتے ہیں
ادراں میں کافی تعداد ہندوستانی مسلمانوں کی بھی ہے۔

کر وڑ پتی حاجی ستان کی (جولا کھوں روپے خیرات میں خرچ کر دیتا تھا) یادِ صبر پر کش کے مولانا بخش گسان کی جو اپنے گاؤں میں آج بھی کھڑی کاہل چلاتا ہے اور مٹی کے جھونپڑے میں رہتا ہے۔

یہ مولانا بخش کسان بنگال میں رہتے تھے تو بنگالہ زبان بولتے تھے
کیونکہ وہیں رہتے تو لیا م بولتے تھے... اور لیا م یہ تو ان کا بڑا تھکے
جو مرگ گیا کاروی تک جاتی ہے ان پر ہندوستان کا آخری
ملاؤں۔ محمد پورم ہے یہ مسلمانوں کی چھوٹی سی بستی ہے جو صرف لیا م
بول سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کی چھوٹی سی ٹوٹی مسجد میں اذان اور نماز
عربی میں پڑھی جاتی ہے۔

ایسے لاکھوں مولا بخش کسان ہندوستان میں موجود ہیں۔

اُن کو اُن کے بال بچوں کو پیٹ بھر کے رول ملے۔

ان کو۔ ان کے ہاتھ پیر (نہ)۔ تنہا چلنے کے لئے پڑا۔
 ان کو۔ ان کے بال بچوں کو۔ سر بھینپنے کے لئے مکان ملے
 ان کے بچوں، لئے پٹھن کے لئے سکول ہوں۔ کتابیں ہوں،
 لائبریریاں ہوں، ان کے کھیلنے کے لئے میدان ہوں۔
 ان کے نہیں تو ان کے بچوں کو برقی۔ کھسار۔ مونتے ملیں
 جمہوریت کی شہری کی حیثیت سے اُن کا حق ہے۔
 اُن کے کھیتوں میں نہروں کا پانی آئے۔
 اُن کے گاؤں میں ٹوب دیں لگیں۔
 اُن کے علاقے میں بھی سکس ہوں۔ کہنے جلنے کا انتظام ہو۔
 اُن کے گاؤں میں بھی کبھی کبھی سینما باہر کی دنیا کی رنگیں بھلک
 دکھانے آجایا کرے۔

اُن کے گاؤں کا بنیا (جو مسلمان بنایا بھی ہو سکتا ہے) قیمتیں
 بڑھا کر ان کو لوٹے کھسٹے نہیں۔
 جو اناج وہ پیدا کرتے ہیں اُس کی منڈیوں میں مناسب قیمتیں

مولانا بخش، رام دین، گورنمنٹ سنگھ

یہ مولانا بخش کسان مولانا بخش مل مزدور بھی ہو سکتا ہے۔
 وہ کبھی میں بھی کام کر سکتا ہے، گلگتہ میں بھی، مدراس میں بھی،
 بنگلور میں بھی، وہ دلی کے پٹن کے کارخانوں میں "کرخندار" بھی ہو سکتا
 وہ کثیر میں ایک کشتی چلانے والا بھی ہو سکتا ہے، بوجھ سر پر اٹھانے
 چلنے والا نقلی بھی ہو سکتا ہے۔

وہ جو بھی ہے جہاں بھی ہے اس کی بنیادی ضروریات، اس کی
 زندگی کے بنیادی مسئلے اور بھینس زیادہ تر اقتصادی ہیں، سیاسی ہیں
 سماجی ہیں اور اس لئے یہ سب وہی ضروریات، وہی مسئلے وہی بھینس
 ہیں جو اس کے سب ساتھیوں کو ہیں۔ چاہے ان کا نام رام لال ہو،
 کتن سنگھ ہو، جان ڈی سوزا ہو، یا بوڈرا برہم ہو۔

ہندوستانی مسلمان مولانا بخش کی مشکلوں کا ایک ہی علاج ہے
 سماجی اور اقتصادی انصاف جسے سوشلزم کہتے ہیں اس کو اور
 سب ہندوستانیوں کو ساتھ مل کر اپنی مشکلوں کا حل اور علاج کھوجنا
 ہے۔ مولانا بخش، رام دین، اور گورنمنٹ سنگھ کو ساتھ مل کر یہ کام کرنا ہے

حکومت ہندوستانی مسئلے

ان سب کی۔ نزل ایک ہی ہے۔ اس لئے راستہ بھی ایک ہی ہے۔
 صرف ایک مولانا بخش کا (اور سارے مسلمانوں کا) ذاتی مسئلہ ہے
 اپنے خدا کی عبادت۔ اگر اس کو کوئی امیر اور رسول کا نام لینے سے
 روکتا ہے، نماز پڑھنے کو منع کرتا ہے، رمضان کے مہینے میں زبردستی
 کھانا کھانا ہے رکوع دینے سے روکتا ہے تب بے شک "اسلام"
 خطرے میں ہے، کافر لگانا چاہیے تب بے شک ڈیڑھ اینٹ
 کی علیحدہ مسجد بنانا ضروری ہو جاتا ہے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے۔
 لیکن فی الحال اس کا کوئی ڈنہ نہیں ہے ڈیڑھ اینٹ کی نہیں
 لاکھوں کروڑوں اینٹوں کی خوبصورت اور شاندار اور اکثر دران
 مسجدیں اس ملک میں کھڑی نمازیوں کا انتظار کر رہی ہیں۔

مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان میں کتنے عرصے حکومت کی؟

محمد غزنوی نے ۳۳ سال *	غوری نے ۳۰ سال
تکلیب الدین ایک نے ۴ سال *	غیس الدین نے ۲۵ سال
رضیہ سلطانہ نے ۴ سال *	ناصر الدین نے ۲۰ سال
بلبن نے ۲۰ سال *	کیقباد نے ۴ سال
جلال الدین خلجی نے ۶ سال *	علاء الدین خلجی نے ۲۰ سال
غیاث الدین خلجی نے ۵ سال *	محمود خلجی نے ۲۶ سال
ہملو دوی نے ۲۸ سال *	سکنہ دوی نے ۲۸ سال
ابراہیم دوی نے ۹ سال *	بابر نے ۴ سال
ہمایوں نے ۱۱ سال *	شیخشاہ موری نے ۵ سال
اسلام شاہ موری نے ۹ سال *	جلال الدین محمد گورن نے ۴۹ سال
جہانگیر نے ۲۲ سال *	شاہ جہاں نے ۳۰ سال
اورنگ زیب نے ۴۹ سال *	مبادشاہ نے ۵ سال
جہان شاہ نے ۱ سال *	فرخ سیر نے ۶ سال
محمد شاہ نے ۲۹ سال *	احمد شاہ نے ۶ سال
عالم گیر شاہ نے ۷ سال *	شاہ عالم نے ۲۷ سال
اکبر شاہ نے ۳۱ سال *	مبادشاہ ظفر نے ۲۰ سال

آئیے اپنی قسمت ہم خود بدل ڈالیں

جب سے بھارت دو بنگلہ، بھوٹا، ایک بھگت سنگھم پاکستان اور دوسرے کا بھارت رکھا گیا۔ یہ برا اتفاق ہوا کہ ان دونوں ہی بھگت سنگھم مسلمان کا بیٹا تھا۔ ۲۷ برس میں یہاں اور وہاں مسلمانوں کی جس درد بھری کہانی نے سیم لیا اس کی مثال سننا اکاشا پر ہی کوئی دوسرا فرقہ پرستانہ کر سکتا۔ غریب، مجبور ایسے کس اور غلامی ہندوستانی مسلمانوں کے کتنے کے کتنے بٹ گئے۔ بٹاؤں سے چھٹ گیا، بھائی بہن کی صورت کو ترس گیا۔ دلش کے اس بڑا دے پر کتنی تباہی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس کی تو گنتی ہی مشکل ہے اور نہ بتایا جاسکتا ہے کہ اس رات بھیرور دھڑکھٹ میں کتنی دولت برباد ہوئی۔ رونے کی بات صرف یہی نہیں ہے بلکہ بھلائے جانے والے اتنا چار تو وہ ہیں جو پاکستانی علاقوں (پنجاب، سرحد، بلوچستان اور خصوصی طور پر سندھ) میں پہلے سے بسے ہوئے مسلمانوں سے جاتے سے گئے ہوئے (مہاجر) مسلمانوں پر گئے۔ مرحوم صدر ایوب خان کی پاکستانی بیٹے کوبرا ایوب نے تو مہاجرین کی بستیوں میں آگ لگوائی۔ لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کر کے ایوب خان کا پوتہ ننگیز خان بن گیا۔ آج بھی پاکستانی مسلمان بھارت سے ہونے والے مسلمانوں سے گھن کر رہے ہیں جنہوں نے پاکستان بنانے میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا تھا۔ یہ مہاجرین ٹھیک طور سے آج تک آباد نہیں ہو سکے جن انڈو زبان کے نام پر پاکستان بنا اسی دشمنی پر بھارتی مسلمانوں پر سجدہ کے اکثر مشہور ہیں لاٹھی چارج کیا گیا۔ اور گولی چلائی گئی۔ اور ان کے وجود کو کھٹا گیا۔ اور ان کی آواز کو بایا گیا۔ یہ تو سچی بھائی پاکستانی مسلمانوں کی۔

آزادی کے ۲۷ برس بعد بھی دلش و دلش و اسیلوں نے آزادی کی سانس نہیں لی۔ آج دلش میں کوئی بھی انسان اپنے تمام پرکھ اور چین کی ہنگامہ نہیں بنا رہا۔ سوال یہ پیدا ہے کہ کیا ہماری سرکار خدا کے سسٹم میں اپنا فرض پورا نہیں کر رہی؟ خدا کے وقت جو عدلے کئے جاتے ہیں کیا ان کا پلن کیا جاتا ہے؟ کانگریس سرکار نے 'غریبی بناؤ' کا وہی کس حد تک پورا کیا؟ البتہ ہماری راشٹریہ سرکار نے اس سلسلے میں کچھ قدم ضرور اٹھائے۔ بینکوں اور پبلک انڈسٹریز کو نیشنل کر دیا۔ راجے لوہوں کے پریوی پر سسٹم کو دینے گئے ہیں اور بھوی دھرمانے کے سسٹم میں بھی اپنی تھک کھاتیاں کھ کھیا ہے۔

لیکن کیا ان سب باتوں کے بعد بھی دلش سے غریبی بٹ گئی؟ بڑی پیپل پوچھتی ہیں کہ خدا نے میں جاتا تھا ان مسلمانوں کے بعد کیا اس کا ایک پیپ بھی غریب کی جیب میں آتا ہے اور کیا دلش کی غریب بھنا اب آرام اور سکھ کی سانس لینے لگی ہے؟

دلش کی اس دشا کو دیکھتے ہوئے کیا مسلمان یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بھارت میں کینل ان ہی کی ذات دکھی ہے؟ ہندو، سکھ، عیسائی و غیرہ ذاتیں مزے میں ہیں، درہن مسلمان ہی دکھ دھکا بیٹا رہا ہے؟ جب کانگریس سرکار کسی کو بھی سکھ نہیں کر پاتی تو پھر مسلمان ہی بچے دکھوں کی دہائی کیوں دیں۔ کانگریس سرکار کسی کی سکھ نہیں۔ اگر کچھ کرے گی تو سب کھلے، وہ نہ پھر سب کچھ اپنے ہی لئے۔

اگر مسلمان اپنا بھو شعیہ سہلنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہی رخ سے اپنے پتے پرے اٹھ آتے کہ ان کا تڑخ خود لینا چاہئے۔

اب بھارت کے مسلمان کی گنجائی ہوتی حالت کا اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دیش کی ۶۶ کروڑ لاکھ آبادی میں کیوں لکڑ ہونے کے باوجود ابھی تک سب لگ بھگ زندگی گزار رہا ہے۔ اس میں اس کا دوش نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے کچھ ایسے جنوی لیڈر ہیں جو لیڈری کے جوہر کے ہیں اور وہ لیڈری کی کون بھوک کی خاطر نہ صرف اپنے فرقہ کے دشمن بنے ہوئے ہیں بلکہ وہ سارے راشٹر اہلہ دیش سے دشمنی کر رہے ہیں۔ ان کو اس سے مطلب نہیں کہ مردہ جنت میں جائے یا جہنم میں، ان کو اپنے علم سے لاش سے کام ہے، وہ جیڑیں جو مسلمانوں کو بھارتیہ کرن یعنی قومی دھارے میں شامل ہونے نہیں دیتے۔ ان ہی غدار پرست خود غرض اور جنوں کی صورت میں مسلمانوں کی لڑیاں کوچ کوچ کر کھانیوالے ان پیشہ ور لیڈروں نے پہلے ہی دلی سے نفرت اور دشمنی کے جذبات کو بڑھاوا دیا ہے۔ نتیجے میں یہ ۱۹۶۴ء بھی بھارتیہ مسلمانوں کیلئے ۱۹۴۰ء بنا ہوا ہے۔ ۲۶ برس گئے مگر اس کے بعد بھی وہ فرقہ وارانہ فسادات کی جوش سے نہیں کچے پارہے ہیں۔ اہلہ کوچ بھی ریلوے پلیٹ نام پر ایک مسافر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ چون کہ ان کے دیش و دوزی لیڈروں نے ان کو وطنیت اور قومیت کے متبع جذبات سے لائق کر رکھا ہے اس لئے وہ ۶۶ کروڑ انسانوں کے اس ملک میں سب سے کٹی دیتی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اہلہ اپنے لئے وہ مقام بنائے پانے میں ناکام ہیں جس پر کہ ان کا ادھیسکار ہے۔ تجارت، زوہا طاعت، ہر بازار اہلہ ہر دفتر میں وہ اپنے لئے تنگی محسوس کرتے ہیں۔

اب بھارت کے مسلمانوں کیلئے کتنی ایک ہی راستہ ہے کہ وہ پائے انگ نیست، ملک عداوت کی نیست کے متوے پر عمل کریں یعنی اپنا حق وہ آپ بنائیں۔ وہ ایسے سارے دھاروں کو اپنے من سے نکال پھینکیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ بھارت میں ان کیلئے جگہ نہیں، بھارت کے مسلمان کا یہ دشواری بڑھ چکا ہے کہ وہ ۶۶ کروڑ کی بھارتی قوم کا ایک فرد ہے۔ جس میں ماری قوم ایک شریہ ہے اہلہ اس شریہ کا ایک حصہ ہے مسلمان پہلے اپنے آپ کو بھارتی سمجھے، بعد میں کچھ اہلہ۔ وہ اپنے ان دھوئی لیڈروں سے کچھ جو اقلیت و اکثریت کا ٹھکانہ رکھا کر ہندو مسلمان کو ایک ایک ناخوں میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مسلمانوں کے جو لیڈر دین اہلہ قوم کے کہ انوں میں دھڑ کو بچھ میں

میں لاکھ بھید بھاد پیدا کرتے ہیں، مسلمان دن کا ساجی بائیکاٹ کریں اور ہو سکے تو ان کو اپنی برادری سے نکال باہر کریں۔ ان کیلئے مسلم سماج میں کوئی جگہ نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دنوں کو اگر یاد کرنا نہیں چاہتے تو یہی شہر آزادی کے جد کے دن ۲۶ برس کا جاترہ وہ فرد ہیں کہ انھوں نے اپنے پڑوسی ہندوؤں سے انگ ریکر کیا کھو یا اور کیا پایا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے بہت کچھ کھو یا ہے۔ دنیا کا جاہ و ثروت سے ہٹ کر انھوں نے ہندوؤں کی نظر میں اپنا اہلہ کھو یا ہے۔ بہر حال اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا، جب آئنگے کھلے مسلمان تب ہی سورا بجھے۔ قومی دھارے میں اپنے آپ کو شامل کر لئے ان کو پانا سمجھے جو اس کے کام آئیں خواہ وہ اس کے ہم مذہب نہ ہوں، ان عہدوں کی خاطر انہوں سے نہ بگاڑے جو اس کے کام آئیں آسکتے خواہ وہ غیر اس کے ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ عمل ہی سے اپنے غیر بھاتے ہیں اور میرا اپنے۔ یہ بات مشکل نہیں ہے، مسلمان اپنا کھو یا ہوا اختلاف اس طرح واپس لاسکتا ہے کہ شکوے شکایات اور مطالبات کئے بغیر قومی دھارے میں شامل ہو جائے۔ سب سے اس کی ساجی زندگی پر اس کے اپنے فرقے کی بھائی بنے بلکہ اس کی ساجی زندگی ہندوستانی تہذیب کی غائیہ ہو۔ اگر مسلمان نے دلی سے ہندوستانی بننا چاہا تو بھارت کی قومی زندگی میں باریک کارو چھ حاصل کرنے سے پھر اسے کوئی نہیں روک سکے گا اور پھر وہ بھارت کا شان دار اور باعزت لاکھ بن جائے گا۔

مسلمان بی جان، ال کو دوسرے اس لئے نقصان پہنچاتے ہیں کہ وہ اس کو قومی سرمایہ سمجھتے لیکن جس دن مسلمان نے اپنے آپ کو اپنی ہر شے کو قومی تصور کر دیا اسی دن سے خود بخود مسلمان کی جان وال کی حفاظت کیلئے بہتر سے بہتر انتظامات ہونے لگیں گے۔ اور مسلمان کے اقتصادی حالات بھی سدھرنے لگیں گے۔

اگر مسلمان یہ یاد رکھیں کہ وہ اپنی نفرت سے دوسروں کی نفرت حاصل نہیں کر سکتے، وہ دوسروں سے جب تک لگ کر رہیں گے تب تک دوسرے بھی ان سے آکر نہیں ملیں گے۔

مسلمان یہ کہنا چاہئے کہ ملک کو خوشحال اور ترقی یافتہ بنانے میں دوسروں کا برابر برابر ساتھ دین تاکہ نتیجے میں ملک کی خوشحالی اور ترقی میں وہ بھی برابر کے حصہ دار بن سکیں۔

ہندوستانی مسلمان اور ان کے مسائل

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی جتنی تنازعہ فیہ ہے۔ ان کے مسائل بھی اتنے ہی متنازعہ فیہ ہیں۔ مسلمان ہر اس بات کی شکایت کرتے آ رہے ہیں کہ ان کے مسائل پر توجہ نہیں کی جا رہی ہے اور آزادی کے 72 سال بعد بھی حکومت انہیں حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور حکومت بھی تسلیم کرتی ہے کہ مسلمانوں کے کچھ مسائل ہیں انہیں حل ہونا چاہیے۔ حکومت اس کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکا۔ اس کے حل میں ہونا چاہیے کہ کچھ مسائل ہیں۔ لیکن جب تک ان مسائل کی نوعیت اور اہمیت کو جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ان کا حل ہونا بھی دشوار ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا تعلق مین مسائل سے جڑا جا رہا ہے۔ تاریکی میں یا فطری۔ یا حالات و سیاست کی پیداوار۔ ان مسائل کو ختم دیا گیا تھا۔ خود پیدا ہوئے تھے۔ کیا آزادی سے پہلے بھی ان کا وجود تھا۔ ان کا تعلق جذبات سے ہے یا ضرورت زندگی سے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان سوالات پر کبھی تنقید کی گئی۔ ساتھ غور نہیں کیا گیا اور مسلمانوں کے مسائل کی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمانوں کے لیڈروں نے ان مسائل کی حقیقت کو نہ مسلمانوں سے نہ صرف چھپایا بلکہ وقت ضرورت انہیں اچھا لگھا کر چھپا دیا اور ناقابل حل بنایا۔ ان مسائل کو حکمران پارٹی نے اپنے سیاسی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بنایا۔ مسلمان لیڈروں اور حکمران پارٹی نے مسلمانوں کو اور ان کے مسائل کو سیاسی شطرنج کا ہتھیار بنایا۔ جب بھی آپکشی آئے مسلم لیڈر ان مسائل کو چھپا کر کوئی کنوینشن یا کانفرنس کر کے ان کا رعبیت یا کوئی ذات حسیہ کر لیتے ہیں۔ یہ حکمران پارٹی ان کی حمایت و ہمدردی میں دو الفاظ کہہ کر کے جاننا کہ وہ مطالبہ و مطالبہ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

مسلمانوں کی قسم ہے کہ ان میں توجہ تک ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو سرسید کی طرح قوم کی صحیح رہنمائی کرتا۔ آئیو لے دہ کی ضروریات و اہمیت کو ان کے اہل سہ انہیں تیار کرتا۔ قوم کو اہمیت اور تباہی و خوش و خرابی سے بچانے کا جو ہم پرستی سے نجات دلائی ادا اہمیت کو چھٹ کر جرات و بہت سے مستقبل کی طرف بڑھنا سکھاتا۔ اور بحوث و تہ کے رجالات کو دھکے دیتا تھا۔ کیا ہوتا ہے جا رہا ہے اور قوم کو کیا کرنا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ لیڈر جس کو کہتے ہیں وہ صرف و بہرہ رہنمائی نہیں دیتا۔ بلکہ حکومت اور قوم کے درمیان رابطہ بھی ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں ایک لیڈر بھی ایسا نہیں ہوا ہے جو سرکار اور قوم کے درمیان دشتہ یا رابطہ بنے۔ مسلم لیڈروں کی ساری توجہ کسی پر جا کر ادب دنانے پر اور دولت حاصل کرنے پر رہی۔ وہ مسلمانوں کو تباہی و تباہی کے کو کیا کچھ ہو رہا ہے۔

اردو کا مسئلہ

مثال کے طور پر اردو کا مسئلہ لیجئے۔ مسلمانوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اردو کو دہری درجے جو دوسری طاقتوں زبانوں کو دیا گیا ہے۔ اس زبان میں اعلیٰ تعلیم ہو۔ اردو میں تعلیم حاصل کر کے نوجوانوں کو ہندوستان میں ہر جگہ کے حقوق ملیں۔ دھرم و فہم۔ یہ مطالبات بالکل حق و جائز ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا حل ہندوستانی کیوں نہیں ہو رہا ہے صرف زبانی تیج خرچ پر مائل ہو کیوں نالا جا رہا ہے اور ایسی نہیں دہریوں ہر جگہ پر مل کی توجہ کچھ نہیں آتی۔ مسلمانوں کو کیوں ٹھکرا جا رہا ہے مسلم ہندوستان نے مسلمانوں کو اس بات کی تہ میں جانے کی کوشش کی ہے کہ حکومت میں تسلیم کر لے کہ وہ کو اردو کو اس کا

جائز حق و مقام ملنا چاہیے۔ تو پھر دینی کیوں نہیں۔ آخر وہ کون سی کاوشیں ہیں جن کو وہ گزرا حکومت کیلئے مشکل ہے۔ کیا حکومت اردو کا مسئلہ حل کرنے میں نیک نیت نہیں ہے۔ اگر نیک نیت ہے تو کیا دوسری طاقتیں ایسی ہیں جو اثر انداز ہو رہی ہیں اور اس مسئلے کو اٹھا رہی ہیں اور حکومت ان سے خوفزدہ ہے اگر ایسی بات نہیں تو کیا حکومت نے اردو کے متعلق سے کوئی صاف اور واضح پالیسی اختیار کر رکھی ہے جس کے اظہار سے وہ پرسہ سرگشتہ ہے۔ اور وقتاً فوقتاً دل بہلانی کی بات کر کے خاموش رہ جاتی ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں باتیں ہیں۔ وہ فرقہ پرستوں سے ڈرتی ہے کیوں کہ انھوں نے اردو کا کوئی فرقہ دارانہ رنگ دیا ہے۔ اور مسئلہ کار کے ساکھیاں کو منطوق کر رکھا ہے۔ یہ طاقتیں حکومت کو جرات مندانہ قدم اٹھانے سے روکتی ہیں دوسری طرف حکومت کی بعض کاروائیاں دیکھ کر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کیلئے کچھ کرنے کے لئے وہ میں شہرت ہی سے نہیں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیا ہمارے مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین جنھوں نے ۲۰۰۰ کے بعد دستخط کے ساتھ ڈاکٹر اجتہاد پشاور کو جو میورٹم اردو کو اس کا جائز حق دینے کے بارے میں پیش کیا تھا اس پر مشورہ صدر پنشنے کے بعد کچھ کاروائی کرتے۔ اردو کے سب سے بڑے علمی اور اس کا ان کے سب سے بڑے مجاہد پورے کے باوجود وہ خاموش رہ جاتے ظاہر ہے کہ صدر پنشنے کے بعد انھیں سرکاری پالیسی کا علم ہوا ہو گا۔ اور وہ خاموش ہو گئے ہوں گے۔ پنڈت نہرو کو سب اردو کا کافی سمجھتے ہیں لیکن انہی کے دھ میں جاوٹھانے حیدر آباد کا جو اردو کا عظیم مرکز تھا ختم کیا گیا۔ اردو زبان بھی پلان سکے۔ (خدا کا مدھی نے ہر ایک شخص سے پہلے اردو سے ہندی ظاہر کی۔ اور یقین دہایا کہ وہ اس کے لئے کچھ کریں گی مگر کامیابی کے بعد اچانک بن گئیں۔ اردو کیساتھ افسات کرنے کے بارے میں مرکز نے کئی سرکل پر مبنی حکومتوں کو رواد کئے مگر اس کو ہر جگہ ردی کی نذر کیا گیا۔ آج بہار میں یوپی میں انہی صراستیں اردو خود ہی میں اردو کیلئے کوئی مقام نہیں۔

بہار حکومت کا آئیہ حکم ہے کہ سرکاری کاغذات پر سوائے ہندی کے کسی دوسری زبان میں نوٹ نہ لکھے جائیں۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ جو گن نے کہا ہے کہ وہ اردو کی ترقی کیلئے تو سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن اسے دوسری سرکاری زبان نہیں بنا سکے۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ سیٹھی نے بھی اردو کے سلسلے میں معذرت کر دی ہے۔ ان اشاروں کے علاوہ اردو بھی بہت سے اشارے ایسے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ایک طے شدہ

ہنگامہ کشستانی میں ہے۔

ایسی پٹریں میرا ہے۔ وہ یوں کہ دستور میں اردو کو کوئی زبانوں میں سے ایک کا درجہ دیا گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے خاتمہ کا بھی بندوبست کیا گیا جن صوبوں میں اردو کے ناگھوں بڑھنے بولنے اور کھنے والے تھے۔ وہ اردو کو غائب کر دیا گیا۔ اردو ہندی زبان کو، اگر چہ پہلے ایسی تحریکوں و ترغیب دی گئی تو اردو بولنے والے ہندی کی طرف پٹ پڑے۔ مسلمانوں سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ابتدائی سے اردو کو مسلمانوں کے زبان چنا شروع نہ کیا۔ اور ان ناگھوں اردو بولنے والے غیر مسلموں کو ساتھ لے کر متحدہ مجاہد بنا کر لڑنے کی کوشش کبھی نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو مسلمانوں کی چھاپ پڑ گئی۔ اردو ہی اس کیلئے آواز اٹھا بولے بھی چونکہ مسلمان تھے اس لئے اردو پر فرقہ دارانہ رنگ چڑھ گیا مسلمانوں کی جذباتیت اور فطرتی طبیعت اور غیر مقامیانے اکثریت کے دامن میں بدگمانی پیدا کر دی۔ دوسری غلطی مسلمانوں سے یہ ہوئی کہ انھوں نے انہی کے صحیح حالات کا اندازہ نہیں کیا۔ وہ علماء کی ادلیڈوں کی باتوں میں آگئے اور اردو کو غلط انداز میں کاٹل کر بیٹھے نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اردو کو قاتل کا ٹیٹ سیاست کا اداسی لٹڑوں نے کسی کا زیر بنایا پنا چھب بھی اردو کا سر مل آئی وہ علماء کہتے ہیں کہ اگر اردو باقی نہیں رہی تو غیر بھی باقی نہیں رہے گی کیوں سال کا دینی سڑے چونکہ اردو جس سے اردو کا حفظ گویا دین کا حفظ ہو گا حالانکہ غلوں کے دور میں وہ اس کا سرمایہ خرابی زبان میں تھا۔ اور تمام بول چال کی زبان فارسی ہی تھی۔ لیکن غلیہ سلطنت کے زوال کے بعد وہ دوسری فارسی کی جگہ لے لی تو اس سرمایے کو خود علماء نے وقت کے تقاضوں کے تحت استعمال کیا۔ سوال یہ ہے کہ جب دین کی غریب باتیں عربی سے فارسی زبان سے اردو میں منتقل ہوئیں اور معاہدہ مت اثر نہ ہوئے تو ان کی زبانوں میں اس کی منتقلی مذہب کیلئے تباہ کنی کس طرح ہوگی۔ مذہب کی تعلیمیں و تحریکوں میں کی کیسے آہل تھے گی۔ علاقائی زبانوں کے مذہب کو خطرہ کیوں ہے۔ جب کہ لا میں ہندوؤں مسلمانوں اور عیسائیوں کی واحد زبان لیٹام ہے۔ ان کے مذہبی ذخائر لیٹام میں ہیں۔ پھر بھی ان کا مذہب اردو ان کے عقائد کا اثر نہیں ہوتے۔ کیوں کہ مسلمان دینی معاملات میں کسی اردو بولنے والے سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ کل ناڈا مسلمان جس کی گھر کی بازار کی زمین دین کی۔ اب کتاب کی اردو عطا و بیان کی زبان میں ہے۔ اردو بھی اردو بولنے والے مسلمانوں سے کسی طرح کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ مگر ان کا مسلمان بھی گجراتی زبان بول کر مسلمان رہ سکتا ہے اور اپنی اپنی زبان میں دینی

سوائے کو محفوظ کر سکتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ سارے دیش کے مسلمان اس سلسلے میں جذباتی بن جائیں۔ علماء و لیڈران کا یہ فرض تھا کہ وہ علاقائی زبان کی کہیت اور ضرورت بتاتے اور مسلمانوں کو ابھی سے ایک شاندار اور خوشحال مستقبل کیلئے تیار کرتے۔ عام مسلمانوں کو یہ بتانا بھی ان کا فرض تھا کہ جس زبان کو سرکاری حیثیت حاصل نہیں جس زبان کے مستقبل کو اندھیروں میں ڈال دیا گیا ہے جس زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے کیلئے ملازمتوں میں برابر کے مواقع حاصل نہیں جس زبان کو سرکاری تسلیم نہیں کرتی ہے اس کیلئے سرگھانا بیکاس ہے چونکہ ریاستوں میں "فرز ند وطن" کی تحریک زور پکڑ گئی ہے۔ ملازمتوں کیلئے علاقائی زبان جاننے کی ضرورت لگتی ہے۔ سرکار کا پارلیمانی زبان میں ہونا بے جا چلے ہے۔ مسلمانوں کا اردو کو کیسے سے لگائے بیٹھ رہنا ادنیٰ ہے۔ جب کیرنا، بہار، اتر پردیش، اڑیسہ، مدراس، بنگال، پنجاب، راجستھان وغیرہ میں اردو کا کوئی سوال ہی نہیں وہاں کے مسلمان اپنا کام کئے جا رہے ہیں تو پھر اسکو تک گرسٹل بنانا کہہ سناں کی عقل مندی ہے۔ اگر مسلمانوں نے علاقائی زبانوں کو سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اپنے بچوں کو ابھی سے اس کیلئے تیار نہ کیا تو وہ آگے چل کر ہر میدان میں پیچھے رہ جائیں گے اور ان کی پس ماندگی آئندہ زمانہ میں اور بڑھ جائے گی۔ محرومیت کا احساس ان میں باوجودی اور گھٹتی پیدا کر دے گا۔ مگر کسی اللہ کے بندے نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اردو کے سوال کو انکیشن کے زمانہ میں ابھارتے ہیں اور دوش پیٹنے کے بعد انجان بن جاتے ہیں۔ اور مسلمان ہیں کہ اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی عقیدت اور غلط جو ش و جذبات کی ٹٹی کھول نہیں چلہتے۔

ملازمتیں اور نمائندگی

مسلمان ہمیشہ تعلیم اور لیڈرانوں کی مدد میں غافل اور بداندیش رہے ہیں اگرچہ پچاس سال پہلے برادرہ سیلمی میدان میں پچھڑے حسین مسلم میں کی کی وجہ ان میں جہالت ہے۔ اور جہالت غربت کو سبب دیر ہی ہے۔ دس سال سے برابر مسلمانوں میں حصول علم کی تحریک چلائی جاتی رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو غلط طریقوں سے تیار کیا جا رہا ہے۔ اگر دیکھیں تو تعلیم کی طرف تو بہت نہیں دی تو بے سوت مارے جائیں گے۔ اس تحریک کے نتیجے میں کچھ پیش رفت ضرور ہوئی ہے لیکن وہ ذوق و شوق ابھی پیدا نہیں ہوا جسکے نتیجے میں مسلمان آگے بڑھ سکیں۔ چنانچہ آئی اے ایس آئی پی ایس اور دیگر بڑے بڑے امتحانات میں مسلمان شریک ابھی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو ذلت، ذلیلیت اور دوسری صلاحیتوں کی کمی کی وجہ سے نامزد ہوجاتے ہیں۔ مسلمان چھائے اپنی تعلیمی

ھلکے کا عقد ستانی مسلمان نمبر

قابلیت کو بڑھانے اور دوسروں سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرکاری ملازمتیں حاصل کرتے ہیں اور ملازمتوں میں کوٹا ملاٹ کرانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ بیچ ذات، ذلت کی صف میں اپنے آپ کو لانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ اس زمانہ میں بچہ تعلیم عام ہو چکا ہے۔ اور ہر جگہ "میرٹ" پر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا تعلیمی معیار کو بڑھانے کی کوشش نہ کرنا انکو ناک اپات ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم تعلیمی ادارہ کچھ کریں: بچوں کی تعلیم کا ٹھیک بندوبست کریں، ہر بچے پر انفرادی توجہ کریں، فنت اور فن انھیں پڑھانیں، کوچنگ کلاس کھول کر ان کی کتابیاں دہر کریں اور بڑے امتحانات کیلئے خصوصی طور پر تیار کر کے اچھے نمبروں سے انھیں پاس کرانے کی کوشش کریں مسلمان بچوں کا ہر ادل میں پاس دکر ماننے سے دروازے سے ملازمتوں میں آنا اس سے کہیں زیادہ بہتر اور قابل فخر بات ہے کہ وہ عات کے کچھ دروازے سے داخل ہوں۔ جس طرح ادارہ ماپ کے بچے سخت مشقت سے جی جاتے ہیں اور زندگی میں جدوجہد کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اسی طرح وہ قوم جو عات اور کڑے زینہ سے اور پر جڑتی ہے اور کبھی اپنا تھاؤں پر قرار نہیں رکھ سکتی۔ پیسہ ہے کہ مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے ملازمتیں عطا ملنا چاہیے۔ لیکن ہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ پرائیویٹ جگہ ملازمتیں قابلیت کی بنیاد پر ملتی ہیں۔ اقلیت یا اکثریت کی بنیاد پر نہیں۔ ہاں قابلیت اور صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات کا ذکر دل چاہی سے خالی نہیں ہوگا کہ ایک یونیورسٹی کی دیگریاں جہدستان کے اکثر علاقوں میں اسلئے خالی چول نہیں ہیں کیونکہ ان کے باہر میں شہر اور مسلمانوں کو ازراہ ہمدردی حمایت کر دی جاتی ہیں۔

سرکاری اداروں اور قانون ساز اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا محالہ میرے خیال میں بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ کیوں کہ اگر وہ کہا جائے کہ کوئی اداروں اور۔ ایوانوں میں مسلمانوں کی موجودگی ضروری ہے اور اس طرح مسلم عادات اور حقوق کا تحفظ ممکن ہے تو یہ بالکل غلط اور بے ہودہ بات ہے۔ مسلمانوں کے بڑے شمار میربادی منٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں ہیں۔ مگر یہ مسلمان قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ ان نمبروں نے ان کا کوئی ایک مسئلہ بھی حل کیا ہے۔ کیا ان کی موجودگی سے مسلم عادات کا تحفظ ہوا ہے کوئی مہم کی جی مہم کی چیز بھی ان لوگوں سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے ان۔ سرکاروں کو نہ سیاست کرتے ہیں اور نہ ان کو بے جا طریقہ پر آجیہ۔ وہ ان کے دلوں کو سنبھال رہے ہیں اور انھیں پاراگم تہ ہیں۔ حکومت مسلمانوں کے بہروں کو غلطہ میں کب لاتی ہے۔ اور کسی

بلدے میں ان سے مشورہ کب کرتی ہے۔ کئی قوانین ایسے پاس ہوتے ہیں۔ جن کا متعلق مسلمانوں سے تھا اہان میں یہ شہرہ نقص تھے۔ مگر مسلمان میرا بی بی کم علی کی وجہ سے خاموش رہ گئے۔ مسلمانوں کے ہندو ممبروں نے آج تک سوائے ضرورت کی کسی معاملہ کرنے کے۔ اپنے عزیزوں کو کوڑا، ہارٹ، لائنس والا کرانے، رشوت سے کر بند لیا کرانے۔ سوتڑی بہت جائیداد پیدا کر لینے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا۔ اپنے اعلیٰ اخلاق اور صفات کو دیکھ کر مسلمانوں نے انہیں قوم قزوقش اسی ہے فیر لیڈر کا خطاب دیا ہے جس کے وہ مسیح طہ پرستی ہیں۔ میرا کہنا ہے کہ نارائن سوائی جتنا کام مسلمانوں کا کر سکتے ہیں حسین نہیں کر سکتا۔ نارائن سوائی کی بات سچی ہے، محمد حسین کی بات کوئی نہیں مانتا۔ اگر اسی بھیر محمد حسین سرکار کے اعلیٰ عہدہ دار عبداللطیف سے کچھ کرنا چاہے تو عبد اللطیف نہیں کرے گا۔ لیکن نارائن سوائی سب کچھ کر سکتا ہے اور کبھی سکتا ہے۔ اس حالت میں مسلمان رضا کارانہ طور پر فیر مسللوں کو رہنا ناپسند نہاتیں۔ اور اس سے کام لیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور فرقہ واریت کی بنیاد ہی مٹ سکتی ہے۔

مسلم پرسنل لاؤ

مسلم پرسنل لاؤ کے تحفظ کی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرنے کی اور اسے جوں کا توں برقرار رکھنے کی تحقیق قائم کر رہے ہیں وہ اصل مسلم پرسنل لاؤ نہیں ہے۔ بلکہ وسط و کاٹھن لاؤ ایکٹ ہے جس میں خود علماء کے بیان کے مطابق کئی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں۔ اس ایکٹ میں کئی باتوں کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر جوں کا توں رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے بعض حقوق میں طلاق اور نکاح کی جو دو انتہیں چلی آرہی ہیں ان کو بھی پرسنل لاؤ میں جگہ دی گئی ہے۔ حالانکہ ایسی باتوں کو تسلیم کرنا پرسنل لاؤ کا اثر و ثروت کا مذاق اڑاتا ہے۔ قرآن کے حکم کے مطابق مسلمان "ول" نہیں کر سکتا کیوں کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنے کا کسی کو حق نہیں مگر مسلمان ول کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ترک میں سب کا حق مقرر کیا ہے لیکن اس حکم کو پس پشت ڈال کر ترکہ آپس میں تقسیم کر لیا جائے گا جہاں تک طلاق کا مسئلہ ہے۔ خود علماء میں بعض بنیادی باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی کہ ایک شخص میں دو یا کئی عورتیں ایک ہی طلاق کے برابر ہوں گی۔ یا بیویوں کو طلاق دینا جائز ہے اور طلاق کے بغیر زوجیت ممکن نہیں۔ پرسنل لاؤ میں یہ بیان کیا گیا کہ ایک مرد اس وقت تک کہ مرے یا میرا بچہ نکاح نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ

تمام بیویوں کے ساتھ انصاف کرنے اور ان کا حق ادا کرنے کی شرط پوری نہیں کرتا۔ شریعت کہتی ہے کہ مرد کیلئے ایک ہی عورت کافی ہے۔ دوسری اور تیسری کے لئے ضرورت ثابت کرنا چاہیے اور شریعت نے جو اختیارات دیئے ہیں ان کا ناجائز تاہم داخلہ۔ جب یہ بات طے ہے کہ موجودہ محمدن لاؤ میں غلطیاں ہیں۔ تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں درست کریں۔ شریعت کے مطابق بنائیں۔ اور مردوں کو جو حقوق ملنے چاہئیں۔ وہ دلائل۔ مردوں کے اختیارات جس کے متعلق وہ خود جانتے ہیں کہ ان کا غلط اور بے رحمان استعمال ہو رہا ہے مگر کریں اور ایک ایسا وقت بھی آئے گا جبکہ خود میں خود آگے بڑھ کر اپنا حق حاصل کر لیں گی۔ اور مردوں کو ہندو دیکھتے رہ جانا پڑے گا۔ اگر دنیا کے مختلف اسلامی ممالک میں علماء کرام نے قوانین میں صحیح ترمیم کر کے انہیں مام نام نہایا ہے۔ تو ہندوستان کے علماء کا کام کیا اور انہیں کر سکتے۔ اور ایک خالص سماجی مسئلے کو کیا اور خود باقی بنانے کی کوشش کیوں کر ہے۔

ایک گناہ شن

ذکرہ بالا مسائل پر چونکہ کل ہر مسئلہ ہر فرقہ میں

ہر کوشش میں زیر بحث آتے ہیں۔ میں نے اپنے خیال کے مطابق روشنی ڈالی ہے اور ان مسائل کو جس نظر سے دیکھا ہے بالکل ویسا ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے سمجھنے میں غلطی کی ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ میں نے حالات اور ماحول کا صحیح جائزہ لیکر ٹھیک سمجھا ہو۔ فیصلہ مارتیں ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک آخری گزارش اس سلسلہ میں ہے کہ مسلمان جیٹنگ فرقہ پرستوں کے چنگل سے نہیں نکلیں گے۔ ان کی اشتعال انگیز باتوں کو سننا ترک نہ کریں گے اور کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ ڈالیں گے۔ قدامت پسندی کے غول سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ نئے زمانے کی نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں کو سمجھنے اور انہیں ادا کرنے کی عادت نہیں ڈالیں گے اس وقت تک کہ وہ مشکلات و مصائب میں مبتلا رہیں گے اور وقت کا سارا انہیں پیچھے کی طرف دھکیلتا رہے گا۔ اگر وہ وسیع النظری سے کام لیں اور دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنائیں تو کوئی مسئلہ ایسا نہیں رہے گا جو حل نہ ہو۔

توڑیہ عہد شکن، سلسلہ بند بھی توڑ

کو کہتے ہیں۔ ہر مذہب کی بڑا ایک ہی سہے اور کوئی ایک دوسرے کا دشمن نہیں۔ میری رائے ہے کہ ہم اپنے بچوں کو نماز یا پوجا سکھانے سے پہلے انسانیت کی یہ باتیں سکھائیں، دراصل انسانیت کی یہی تعلیم عبادت سہے اور یہی پوجا۔ اپنے بچوں کو عام اسکولوں میں داخل کر لائیں۔ مسلمان بچوں کا مسلم اسکولوں یا اردو اسکولوں میں تعلیم پانا ان بچوں کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اردو اسکول فرقہ پرستی کے جذبے کو فروغ دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان اور ہندو عورتوں کی تنظیموں کا علاحدہ علاحدہ قائم ہونا بھی غلط بات ہے اس سے آپس میں اتحاد پیدا نہیں ہوتا۔ بل کہ دوری بڑھتی ہے اور ہمارے بچے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی اچھائیوں کو سمجھ نہیں پاتے۔

ہمارا یہ تو تو کرنا غلط ہو گا کہ ہمارے ایسے مسائل گورنمنٹ ہی حل کر سکتی ہے گورنمنٹ قومی یک جہتی کا پلان بنا سکتی ہے مگر اس کے پلان کو عملی جامہ ہم ہی پہنا سکتے ہیں۔ فیملی پلاننگ کی مثالی لیجئے۔ اس سلسلے میں تو یہ بات خشتی کی ہے کہ نوجوان طبقہ خانہ دانی منصوبہ بندی کے حق میں ہے مگر بزرگ اب بھی اس کے خلاف ہیں۔ اور بعض اوقات وہ اس حد تک نفرت پزیر آتے ہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں کو خانہ دانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اولاد خدا کا تحفہ ہوتی ہے اور پیدا کرنے والے نے روزی دینے کا بھی وعدہ کیا ہے اور جو دولت مند ہیں ان کا دعوا ہے کہ وہ ایک ایک ایک درجن بچوں

مذہب اور اس کی قدریں ذاتیات سے تعلق رکھتی ہیں اگر کوئی نماز ادا کرتا ہے قرآن پاک پڑھتا ہے یا مندر میں جا کر کوئی پوجا کرتا ہے، اپنے گھر پر گیتا کا پاٹ کرتا ہے یا کوئی چرچ جا کر سر دس میں شکر کرتا ہے اور مقدس انجیل کی تلاوت کرتا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اس سے کسی کو کیا سروکار؟ علاوہ اقبال کے بقول مذہب پر نہیں سکھاتا۔ مگر پھر کیوں ہم فرقہ وارانہ منافرت کا شکار ہیں۔ دراصل شریک مذہبیتیں اور خالی ذہن اپنے فائدے کی خاطر ذاتی معاملے کو دعویٰ سلسلہ بنا دیتے ہیں۔ مفاد پسند پارٹیوں کی ایسی تحریکیں کاروائیوں کو روکتا ہے عورتوں کے لئے فحش ضرور ہے مگر آپس کی بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ نفرت کو ہم اگر چاہیں تو کم ضرور کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ابتداء ہم کو اپنے بچوں سے کرنا چاہیے۔ بچوں کے ذہن کو کافر ہندو اور ملچہ مسلمان، جیسی تباہ کن باتوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا جائے بل کہ ابتداء ہی سے ان کے ذہن میں یہ نقش کو دیا جائے کہ جو بھی دہاؤ اور تعصب پیدا کرتا ہے وہ مذہب نہیں ہے۔ مذہب تو میل محبت، بھائی چارے اور انسانیت کا سبق دیتا ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو بتانا چاہیے کہ جب کوئی پیدا ہوتا ہے تو وہ نہ مسلمان ہوتا ہے نہ ہندو، نہ عیسائی اور نہ سکھ یا پارسی۔ یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں پہلے تو وہ انسان ہوتا ہے اور جب تم مذہب کہتے ہو وہ مسجد، مندر، یا گرجے کا نام نہیں مذہب تو پیار، رواداری، دگر داری کسی غرض کے بغیر کسی کے کام آئے

کو پالنے کی سکت رکھتے ہیں، پھر فیملی پلاننگ کی کیا ضرورت ہے؟ بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم ہر قدم پر اپنے ہی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں، قومی مفاد کو نہیں، جبکہ قومی مفاد دراصل ہر فرد کا مفاد بن جاتا ہے۔ ایک بار میں نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون سے فیملی پلاننگ کے متعلق اس کی رائے معلوم کی اس نے بتایا کہ وہ اور اس کے شوہر تو فیملی پلاننگ کے حق میں ہیں مگر ان کے بزرگ (اس خاتون کے بوڑھے ساس اور سسر) سختی سے فیملی پلاننگ کے مخالف ہیں۔ ان بزرگوں کا کہنا تھا کہ ان کے مذہب نے یہ پیشین گوئی کر رکھی ہے کہ جلد ہی آخری امام کا ظہور ہونے والا ہے اور نہیں معلوم کہ وہ کس گھر میں پیدا ہوگا۔ اس لئے اولاد کے پیدا ہونے کو روکنا مذہب کے خلاف ہوگا۔ اس بات کا میں نے یں جواب دیا کہ جب یہ پیشین گوئی ہے تو حالات کچھ بھی ہوں وہ امام پیدا ہو کر رہیں گے کسی کے فیملی پلاننگ پر عمل کرنے یا نہ کرنا سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں میں وہ بات یاد دلاؤں جو پاکستان (جسے ایک اسلامی ملک کہا جاتا ہے) کے مرحوم صدیق ابوبخار نے اپنے دور حکومت میں کہی تھی، اگر خان دانی منسوب بربندی پر عمل نہ کیا گیا تو وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب زندہ رہنے کے لئے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو مار کر کھا جائے گا۔ اب یہ بات صرف پاکستان ہی پر صادق نہیں آئے گی بلکہ ہمارے ملک میں بھی یہ بات پیش آ سکتی ہے۔ بیانیہ زندہ رہنے کے لئے بڑی پھلی چھوٹی پھلی کو نکل جاتی ہے۔

چودا سو برس پہلے جب اسلام کی ابتدا ہوئی تھی تب عورت کو کچھ حقوق دیئے گئے تھے جیسے تعلیم حاصل کرنے کا حق، شادی اور طلاق کا حق، اور وراثت کا حق۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری حالت کو سدھرتے دھنا چاہئے تھا مگر ہوا یہ ہے کہ اگلے ہمارے حالات بگڑے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے فرمایا تھا کہ مرد اور عورت دونوں کا فرض ہے کہ وہ تعلیم حاصل کریں مگر ہوا یہ کہ لڑکیوں پر تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ ان کو روزگار حاصل کرنا نہیں ہے۔ ان کا مقام گھر کا بادی چر خا ہے اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال ان کا کام ہے یہ بھی کہا جاتا ہے

ہاگن کھند ستانی مسلمان نمبر

کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے تعلیم یافتہ شوہروں کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں اگرچہ لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے مگر وہ بھی تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ ان کی مائیں جاہل ہیں یعنی یہ ایک تاریک چکر چلے کہ ایک جاہل دوسرے کو جاہل بنے رہنے میں مدد دیتا ہے۔ باپ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچے کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے سکے اور یہ فرض اس مال کا ہوتا ہے جو جاہل ہوتی ہے جو اپنے بچے کے لئے تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو کبھی نہیں سکتی، دراصل ایک تعلیم یافتہ ماں ہی اپنے بچے کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہے گی۔

اگر لڑکی زمین اور ہوشیار ہے تو اکثر والدین اس کو پڑھانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر فائنل درنا کو لڑکی یا زیادہ سے زیادہ میٹرک تک۔ اور میٹرک کے فوراً بعد شادی کی بات طے کر دی جاتی ہے۔ ایک خاتون جن کی بیٹی ایس ایس سی میں زیر تعلیم تھی، بیٹی کی اچھی پڑھائی اور اس کے ذہن ہونے کا ذکر مجھ سے کرنے لگیں اور پھر یہ بھی کہنے لگیں کہ ان کے شوہر اس کی منگنی کر چکے ہیں۔ میٹرک کے بعد شادی کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ جب لڑکی پڑھائی میں اچھی ہے تو اسے آگے کیوں نہیں پڑھاتیں؟ بولیں کہ چاہتی تو ہیں مگر میں نے کہا کہ تعلیم حاصل کر کے میرے شوہر طے کر چکے ہیں کہ میٹرک کے بعد بیٹی کی شادی کر دی جائے۔ میں نے دریافت کیا کہ ایک جائز اور درست بات کے لئے بھی آپ شوہر کے سامنے اپنی آواز نہیں اٹھا سکتیں؟ بہر حال میں عورت ہوں! یہ ان خاتون کا جواب تھا۔ عورت اس پوزیشن میں کیوں نہیں ہے کہ وہ ایک شخص سے مل جائے اور اس کے لئے بھی اپنے شوہر کے سامنے اپنی آواز اٹھا سکے؟ اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ بات کتنی ہی درست کیوں نہ ہو اگر وہ شوہر کی مرضی کے خلاف اس پر زور دے گی تو وہ گھر سے بے گھر کر دی جائے گی۔ بد نصیبی یہ ہے کہ ایسا کوئی قانون ہمارے ملک میں نہیں ہے کہ جو مرد کر دے کہ وہ بیوی کو نہ ٹھکرائے اور

دوسری شادی نہ کرے۔ یہی نہیں بل کہ ہمارے ملک میں اپنے شوہر کے ہاتھوں بیوی کا پٹنا، زہد کو بُب ہونا اور فاقے کرنے پر مجبور ہونا عام بات ہے۔ اکثر شوہر اپنی بیویوں، غیر ذمے داریوں اور فرض ناشایستوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر اپنی بیویوں کو بدنام کرنے اور جھوٹے الزام لگا کر زہد کرانے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس سلسلے میں یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ بیوی شوہر کی زیادتی برداشت کرتی ہے مگر نہ احتجاج کرتی ہے اور نہ کسی کے سامنے فریاد۔ اس دُرسے کہ اگر اس کے شوہر نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو کس طرح زندہ رکھے گی۔ چونکہ وہ غیر تعلیم یافتہ ہوتی ہے اس لئے اس کو اپنے میٹ کی خاطر بڑے ادنام کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ مسلمان عورت کو تو عموماً بے حسنی اور بے نیکی الزام دے کر طلاق دے دی جاتی ہے۔ میں ایک ایسی جوان لڑکی کو جانتی ہوں جس کو شادی کے پندرہ ہی دن بعد طلاق دے دی گئی۔ وجہ صرف یہ بتائی گئی کہ اس کا سر بہت بڑے سائز کا ہے۔ طلاق کے بعد اس لڑکی پر کئی اور جھوٹے الزام لگائے گئے اور اس کو اس حد تک بدنام کیا گیا کہ اس کی دوسری شادی کا ہونا نامکن ہو گیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نہ دوسری شادی کر سکتی ہے اور نہ اپنے گزارے کے لئے محنت مزدوری ہی۔

فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان

تعلق رکھتے تھے اور ایک دن ان کے یہاں پہنچے اور بولے :
 "مکرمی صاحب! آپ نے میرے اوپر بڑی بڑی عنایتیں کی ہیں
 لیکن اب ایک آخری عنایت ادا کر دیجئے اور وہ یہ کہ مجھ کو یہ
 مشورہ دیجئے کہ میں یہاں ہندوستان میں رہوں یا پاکستان چلا جاؤں؟
 مکرمی نے یہ سن کر قہر لگایا اور بولے : "مارے تم بھی ڈر گئے! اللہ
 اس کے بعد کہنا : جو کچھ ہو رہا ہے محض سیاست کا ایک کھیل ہے
 درہ ہندو مذہب بھی دوسرے مذہب کے ساتھ رواداری کا
 معاملہ کرنا سکھاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس ملک پر آٹھ سو
 برس تک حکومت کر سکے۔ تم نہیں رہو اور دل مضبوط کر کے رہو مجھ کو
 یقین ہے کہ مسلمان اس ملک میں عزت و اکبر و ادراپے کلمہ اور مذہب
 کے ساتھ رہیں گے۔" ہر شخص جانتا ہے یہ شاہ پارٹھا دکر کی ہندو
 مہا سمجھا کے صدارت اس کے بڑے پُر عرش لیڈ تھے لیکن شاید
 آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو کہ یہی وہ کرمی تھے جنھوں نے کلکتہ
 یونیورسٹی بھی ڈائریکشن چانسلری کے زمانہ میں بڑے ارمان سے
 یونیورسٹی میں ایک مستقل مشعب اسلام و تاریخ و ثقافت
 (DEPARTMENT OF ISLAMIC HISTORY &
 CULTURE) کا کھولا تھا اور ڈاکٹر محمد زبیر صاحب مدلی کو کھنڈ
 سے بلا کر اس شعبہ کا اور علی کا پروفیسر اور صدر بنایا تھا اور آج
 بھی یہ شعبہ کلکتہ یونیورسٹی کا نہایت وسیع اور ترقی یافتہ شعبہ ہے
 مہنا بھارتی فرقہ وارانہ فسادات کا مذہب یا فرقے سے ہرگز کوئی تعلق

اگر ہم دنیا کے حالات کا جائزہ ذرا وسعت نظر اور ذہن نگاہ
 سے لیں تو معلوم ہو گا کہ آج ہر جگہ دو ہی طاقتیں ہیں جو ایک دوسرے
 کے ساتھ ہمدرد آ رہی ہیں۔ ایک رحمت پسند طاقت اور دوسری
 ترقی پسند۔ ان کے روپ اور شکلیں سو درجہ سے نازع و نزاع اور رنگ
 و رنگ ہیں لیکن بنیادی طور پر یہی دو طاقتیں جو جنگ عظیم اول کے
 بعد نئے مسلح باہوگر مہر کر آ رہی ہیں اگر اسلام ایک خیال اور اثر طاقت
 و قوت کی حیثیت سے کہیں موجود ہوتا تو ثالث بالآخر بن کر اس قضیہ
 نامرضیہ کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے الیاد ہو سکا۔ دائرہ
 غالب علی اہم ہندوستان جو اس قدر وسیع و عریض ملک ہے
 اور جہاں دنیا کے ہر مذہب و وقت اور پہلے کے لوگ رہتے ہیں
 وہ کس طرح ایک تنگ روہکتا چنا چوہہ بھی ان دونوں طاقتوں
 کا رزم گاہ بنا ہوا ہے اور نظریہ حالات موجودہ یہ جنگ ابھی
 جلد اور بیکری انقلاب عظیم کے ختم ہونے والی نہیں ہے۔ ہیں چاہئے
 کہ فرقہ وارانہ فسادات کو بھی اسی پس منظر میں دیکھیں اور اسی
 کی روشنی میں اپنے واسطے کوئی راہ عمل متین کریں۔ یہ جو کچھ ہے محض
 ایک سیاست کا کھیل ہے اور سیاست بھی وہ جس میں مکی اور غیر مکی
 سیاستوں کے دوچارے اکرل گئے ہیں۔ ہندو کی بات ہے کہ کلکتہ
 میں بڑے بڑے ہندو مسلم قاد ہوں۔ میں اس زمانہ میں وہیں تھا
 اس تباہی و شدت اور پھیلاؤ سے پریشان ہو کر میرے ایک نہایت
 عزیز اور نامور مسلمان دوست جو شاہ پارٹھا دکر کی سے خصوصی

جنگ کا مذہب مسلمان نہ ہو

نہیں ہے یعنی عمومی حیثیت سے در ذہر بہت ملکی ہے کہ اکثریتی فرقہ کے جاہل اور نہایت غالی قسم کے بعض افراد مسلمانوں کو پیچ بکھ کر بھارت کی سبز زمیں کو ان کے دھوم سے پاک کرنے کو اپنا فریضہ ہی سمجھتے ہوں لیکن اس قسم کی عصیت اور فریبی غلط اندیشی ہندوؤں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مذہب میں اس قسم کے افراد کم و بیش ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کو ہی ملاحظہ فرمائیے وہ صرف ایک سیاسی تحریک تھی مذہب سے اسکا کوئی تعلق دور کا بھی نہیں تھا۔ لیکن کتنے بھوے بھالے اور جذباتی مسلمان تھے جو اس چکر میں آ گئے اور اس تحریک کی تائید کو ایک مقدس مذہبی حکم سمجھنے لگے۔ بہر حال اس قسم کے مذہبی دلوں نے (FANA TIES) فرہذب و ملت میں ہمیشہ ہوتے آئے ہیں۔ اس لئے اگر ہمارے ملک کی اکثریت میں بھی ایسے افراد موجود ہیں تو یہ نہ کوئی عجوبہ بات ہے اور نہ انہونی؛ لیکن آج کی دنیا میں اس قسم کے لوگوں کا کوئی مقام اور مستقبل میں انکے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اصل محرکات پھر فسادات سیاسی ہیں اور سیاست نے بسا اوقات مذہب کو اپنے لئے آلہ کار کی طرح استعمال کیا ہے میں اسی سلسلے میں اس ملاقات کا ذکر کروں گا جو چوبیس برس پہلے سورگ پور شوق لال ٹنڈن سے ہوئی تھی۔ فسادات کے موضوع پر بہت دیر تک گفتگو ہونے کے بعد میں نے ان سے دریافت کیا تھا: "لیکن یہ بھی بتائیے کہ مسلمان کیا کریں؟" ٹنڈن جی نے فرمایا تھا:-

اس وقت مسلمانوں کے لئے (اور خود ہمارے لئے بھی) سب سے زیادہ توجہ کی جو بات ہے وہ فسادات ہیں جو ایک لادے کی طرح پھٹ پڑے ہیں اور جن سے مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصانات ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ حکومت کو بڑی قوت اور استعدادی کے ساتھ ان فسادات کو ختم کرنے اور فسادات کے اسباب و وجوہ پر کڑی نظر رکھنا چاہئے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہل مشورہ یہ ہے کہ مسلمان مبر و ضبط اور تحمل و برداشت سے کام لیں اور کم از کم دس برس کے لئے یہ

ہمد کر لیں کہ ہندو لیڈر یا ہندو اخبارات ان کو خواہ کتنا ہی برا بھلا کہیں، کیسی ہی جلی کٹی سنائیں، طعنہ دیں اور زبان کی مخالفت کریں اور ان کے خلاف دوسری استعمال انگیز باتیں کہیں بہر حال مسلمان خاموش رہیں۔ سنی ان سنی کر دیں اور ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیں کیوں کہ اگر انھوں نے جواب دیا تو جواب در جواب کا پیکر چل پڑے گا اور اس کے باعث دعویٰ فرقوں میں جو علیحہ حاصل ہے وہ کم ہونے کے بجائے وسیع سے وسیع تر ہوتی رہے گی اور فرقہ پرستی کو پھیلنے پھولنے کا موقع ملے گا اور جو کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس بنا پر ان کی فرقہ پرستی تو ہندوؤں کو اب کچھ زیادہ نقصان پہنچانے کے لئے ہے۔ البتہ ہندو جو بڑی بھاری اکثریت میں ہیں ان کی فرقہ پرستی مسلمانوں کو پسینے نہیں مے گی۔

بہر حال جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اب تعمیر کے جد و جد کے لئے کربستہ ہو کر عزم و ہمت کے ساتھ میدان عمل میں گامزن ہوں۔ اور اس کے لئے سب سے مقدم اور ضروری یہ ہے کہ وہ احساس گتیری کا لبادہ اتار پھینکیں خود اعتمادی پیدا کریں۔ فسادات کی شدت اور ان کے تسلسل سے بد دل اور ہراساں نہ ہوں۔ انھیں سمجھنا چاہئے کہ اگرچہ وہی تنہا اس ملک میں پریشانی نہیں ہیں بلکہ افریقہ اور ایشیا کے نوآبادیوں میں ملک و عنیت کو تو مایانے کا جو تجربہ کیں بڑے تعداد شد سے مل رہی ہیں انھوں نے کہ رڑوں ان لوں کو ختم نڈن سے خان ومان بنا کر رکھ دیا ہے اد یہ آگ بوز بروز پھیل رہی ہے۔ جو لوگ آج اظام و چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل ہوا کا رخ کیا ہو گا اور وہ کہاں اور کس حال میں ہولے گے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان ہر اعتبار سے یعنی جملے پیدا نش اور حکومت دونوں کے لحاظ سے ان کا وطن ہے اور اس بنا پر جس یقین اور بصورتہ کے ساتھ وہ اس ملک میں اپنے حقوق کے لئے جد و جد کر سکتے ہیں کسی دوسری جگہ نہیں کر سکتے۔ ہا اطمینان اور یقین نفس! تو

خون دل و جھجک سے ملو اور جان

مسلمان اور حرفِ آخر

کیلئے چلے میں، ملکہ کا وقت تنگ بعد ہے، نماز کے بعد مغرب کے لئے جانے
غیر کریں گے۔ خدا بڑا کاسا ہے اور حکیم مطلق ہے، شفا دے گا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے خون کی مدت بڑھ رہی ہے اور اوقات
میری کہنیوں سے چل کر ٹیڑھ کی ہڈی تک آ رہا ہے۔ میں نے کہا۔

”آپ جاسکتے ہیں لیکن یہ بتاتے جائیے، کیا اللہ جان ایک وقت

کی نماز کے برابر بھی نہیں ہے؟“ آپ پر ادا آپ کے تبلیغی مشن پر۔

”دانشہ میں نے صرف اس لئے وہ ہر ایسے کراس سے اس

قوم کے اخلاقی اور ذہنی زوال کا ٹھیکہ تریخ رخ سامنے آ رہا ہے۔ اور حقیقت

ہماری طرح کھل جاتی ہے، راکٹانہ نمازی جو آدمی کو بہتر بنانے کا وسیلہ تھے

مفسدہ بالذات ہو گئے ہیں مسلمان موم و صلوات اللہ علیہ و آلہ و سلم جیسے فرائض

کو نیکی مان کر چلتا ہے۔ یہ نہیں اتنا کہ ان فرائض کو کما ہندی سے دہی نہ

نیک کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے، ماحصل یہی وہ ہیں، یہ نہیں۔ یہاں

گویا مذہب کی وہ اپرٹ رہی ختم ہو جاتی ہے جو نماز روزے کے سلسلے سے

آدمی کو سچ پن کا آدمی بنانے، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے،

اور دوسروں کے کام آنے والا آدمی بنانے کیلئے پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح

مذہب کے پردے میں نیکی کا ذہنی مفروضہ ترویجی رہ جاتا ہے اس کا کلی

روح باقی نہیں رہتا۔ آج اخلاقیات کی تاریخ میں مسلمان کی منہ بے

مذہب نہیں رہی ہے۔

یہاں ایک گستاخانہ جملہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جی بھی نہیں چاہتا

بلکہ یہ جملہ لکھنا میری مجبوری ہے۔ کیوں کہ اگر میں اس کو نہیں لکھوں گا

تو اپنی بات آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔

بہ خدا سال بچے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایک شام مصر کی نماز

کے وقت میں اپنے گاؤں کے مکان کے مردانے میں کچھ الجھا الجھا سا بیٹھا تھا

کہ میں نے دیکھا کہ ایک تبلیغی جماعت میری طرف بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اس

وقت میری ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ میں اس اچانک چلے کیلئے تیار نہ تھا مگر

مجھ میں نے اپنے حواس جمع کئے اور خدا مرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ جبک سلیک کے

ادھوں ہی انھوں نے میرے لئے مسجد میں چلنے کا حکم صادر کیا تو نہ سنبھل کر

اور انتہائی نرم لہجہ میں، میں نے ان سے پوچھا۔

”کیا آپ لوگوں کے پاس کچھ ویسے ہیں۔؟“

میرے اس عجیب سے سوال اور چمکا دینے والے سوال پر جماعت کے افراد نے

پہا تو جہت کے اتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر چند لمحے چپ رہ کر

امیر جماعت نے مجھ سے کہا۔

”حضرت! آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اس لئے۔“ میں نے ان سے کہا۔ ”میرے پردوں میں ایک

غریب بیٹھ جاتی ہے جو میں دن سے نوزیہ میں بیٹھا ہے اور آج دہرے اس کی

مات بہت خواب سہرے غریب اتنی ہے کہ وہ اطلاع کیلئے اس کے پاس نہیں نہیں۔

لاحظ اتنی ہے کہ وہ اگر تکبیر پہچانے کیلئے اس کے پاس کوئی آدمی نہیں چلے

کچھ مجھ سے دیا ہوں کچھ آپ دیں اور اسے ڈاکٹر تک لے چلیں، ہو سکتا

ہے کہ آپ حضرات کی مدد سے اس کی جان بچ جائے۔“

میں نے دکھ کے ساتھ دیکھا کہ امیر جماعت کے چہرے پر

بدولی بلکہ کراہت کی ایک لہر آئی اور اس نے ایک ایسے پتھر لے لہجہ میں

جس میں شہدے کی لاکوئی شاہجہک نہ تھا، لکھ سے کہا۔ ”چلے نماز

پیغمبر اسلام حضرت محمد صاحب نے اپنے آپ کو خاتم الانبیاء اور نبی خاتم النبیین کہہ دیا۔ آخری مذہب کہہ کر جہاں اسلام کو اور ساتھ ہی اپنی نبوت کو تاریخی نقطہ نظر سے ہمیشگی بخش دی وہیں قانون اور تقاریر اس میں کچھ ایسی چیزیں لگائیں بھی پیدا کر دیں جن کا حق و حق گزرنے کے ساتھ ساتھ مشکل ہوتا جا رہا ہو۔ حرف آخر کا مطلب ہوتا ہے اور تقاریر پھیلاؤ بڑھوتری تفسیر اور تبدل کی قیاد پر عمل مستطاب لگنا۔ عمل اسٹاپ نہ لگ گیا لیکن عمل اسٹاپ کے گنگے سے مذہب کے ڈھانچہ میں اور اس کی وجہ سے مسلمان کے ذہن میں جس طرح کی مہمہ مہمہ کے طرح کا تصور پیدا ہوا۔ اس نے آگے بڑھنے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کرنے اور تاریخ کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی ساری مساعرت۔ مسلمان سے ہمیں لی کسی آئین یا نظام حیات میں اس کی طرف سے کوئی ایک موجود نہ ہو تو ظاہر ہے کہ آئین ایک دن اس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ یا تو آثار تدبیر کا کوئی نقش بن جائے یا میریم میں رکھی ہوئی کوئی کرم خود وہ کتاب۔

ماہول ماسکر آئین نے اسلام کا ستمی تصور کرتے ہوئے ایک بار یہ لکھا تھا کہ اسلام دراصل تہائی عہد سے جاگیر واری عہد کی طرف اٹھا ہوا ایک قدم تھا۔ اس احوال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام میں طعن و عرفہ و عہد میں آیا ان دنوں عرب کے چاروں طرف ہنسائیت کا جاگیر واری اٹھا تھا اپنی تمام تر سخت گیریوں اور اندونی اتفاقات کے ساتھ موجود تھا۔ اس ماحول میں اسلام کا بظاہر جمہوری ڈھانچہ (اگرچہ اس کی بنیاد بھی جاگیر واری پر تھی) یعنی طور پر لوگوں کیلئے کشش کا سبب بنا ہوگا۔ لیکن چون کہ نفس یا انسانی زندگی کا ارتقائی اسامیہ شہنشاہیت اور جاگیر واری نظام عہد کے فروغ اور اس کے استقامت کیلئے ہدی طرح سازگار تھا۔ اس لئے بعد کی تاریخ میں بتاتی ہے کہ جہاں جہاں بھی اسلام پہنچا تاریخ کے انھیں سولوں میں جذب ہوتا گیا۔ گویا اسلام بھی اپنے معاصر مذہبوں کی طرح جاگیر واری عہد کے فروغ و فعال کی تاریخ ہے لیکن دیگر مذاہب میں اور ان کے ماننے والوں میں چونکہ مذہب اور نبوت کے آخر انزاں ہونے کے تصور سے عقیدہ پیدا ہوتا ہے وہ نہیں تھی۔ اس لئے دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے کسی نہ کسی حد تک کو بڑی حد تک اپنے آپ کو ملتے ہوئے وقت کے مطابق ڈھال لیا۔ لیکن مسلمان چون کہ آسمانی سے اترے ہوئے آخری نظام زندگی پر مائل آخری نبی۔ اس کی

حکومت اسلامیہ

بھی لکھا ہے ناقابل ترمیم ہونے پر ایمان لے آیا تھا۔ اس لئے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔ اس طرز فکر نے جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا کیں وہیں علمائے دین کو مولوں اور قانون کو سب سے اعلیٰ درجہ دیا۔ اس طرز فکر منطقی نتیجہ ہونا بھی چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے مستقل ڈھانچہ میں وقت کی ضرورت کے مطابق کسی ترمیم یا تبدیلی کی گنجائش تو کتنی ہی نہیں، ایسے میں علمائے دین کی بنیادی اور انھوں نے جو کچھ بھی جمع یا خطا اچھایا ہوا فردی یا غیر ضروری کہا اسے بھی اسی طرح حرف آخر مان لیا گیا۔ اگر اسلام کے نظام حیات میں تھوڑی سی ہلک کی گنجائش بھی رکھی گئی ہوتی تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ پرانے اور قیادوی خیالات کے ذہن آپ ہی آپ رہتے رہتے اور دنیا کی ارتقائی رفتار کا ساتھ دینے والے ذہن رہنمائی کا فرض انجام دیتے۔ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ دنیا اپنے نظری ہواؤ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی اور مسلم قوم کی رہنمائی وہ لوگ کرتے رہے جن کا فیصلہ ہی یہ تھا کہ اپنے آپ کو چھوٹے سال پہلے کے احوال سے آگے مت نکالو کہ یہ اسلام کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ ہمارے مرحل کا فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا۔ جو ان قدیم دستاویزات کو اپنی فیملوں میں جانے میں ثواب و عذاب کے وہ نکات سمجھا رہے تھے۔ جن میں زمانے کا ساتھ دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج ہمارے اور عہد حاضر کے درمیان مسدود کا فاصلہ ہے اور یہ مسدود کا فاصلہ اگر کسی نہ کسی طرح گوارا کر لیا جائے تو اس طرز فکر نے ایک مام مسلمان کی زندگی اور عملی زندگی میں جو خوفناک تغیر پیدا کر دیا اور اس تغیر نے مسئلہ میں جڑت اور پے پیچیدگی پیدا کی ہے۔ اس کا حل کیا ہو۔ زمانے کے تقاضے دیکھو و دے کر ہمیں مجبوراً کہہ دینا کہ ہوا اور دین آؤ کا حفظ کرنے والی سولیت کا بوجھ ہمیں کچھ دبا ہے کہ دیکھو جس نے دین و جنہم کا دھانڈا نہ بھانڈا ہے۔ یہاں اس کشش نے ایک ایسے نظام کی صورت اختیار کر لی ہے کہ آج کا مسلمان ایک عجیب طرح کی دوغلی زندگی جیتنے پر مجبور ہے۔ مذہب کی ساری روایت و عمل سے چل کر تاہیں رسول ایک نبی ہے اور اس سے آگے آیت ہے۔ قصداً اور دواعی تقسیم حکمت، نوبت طلاق، ارث، تولد اور اسی طرح کے اور کئے مسائل میں محظوظ ہے اسلام کے بنیادی احکام میں تنبیہات اور مذہب میں رکھے اور اگر ضرورت پڑے تو انھیں سوامی کی بہتر تفسیر تو کہنے سے تیار نہ کرنے کی اجازت بھی ہونی چاہیے۔ لیکن ہمیں مذہب کبھی ترمیم و اصلاح کی بات آتی ہے تاہیں رسول اور احکام الہی کے حرف

آخر کے ساتھ بندھے ہوئے مسلمان کا ذہن پیچ اٹھتا ہے کہ یہ پاپ ہے،
مگر غلط فہمی ہے اسلامی معاشرہ میں کسی قسم کی مداخلت برداشت
نہیں کی جائے گی۔

سکور: اسلامی معاشرہ میں یہ انتہا پسندی پیدا ہونے کا سبب
کیا ہے، غرض یہ کہ تیرہ سو سال پہلے سے ہم یہ ایمان لے کر چلے ہیں۔ اور
ایمان ہماری رگ ریشے میں سرایت کر گیا ہے کہ ہمارا دینی نظام مکمل اور
اقبال کریم ہے۔ یہاں ایک زبردست ٹریجڈی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ
ہم جن نظام زندگی کو ایمان کا درجہ دیتے ہیں، عمل کی دنیا میں اس
خواب کو شرمندہ خمیر کرنے کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی خوشنہیں کرتے۔
لہذا ذہنی اور ملی زندگی کے درمیان اتنا ہولناک خلا پیدا ہو گیا ہے کہ جب
تک اس ذہن میں تبدیلی واقع نہیں ہوگی اس خلیج کو پاٹنے کی
کوئی صورت نہیں نکلیے گی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اسلامی قوانین سب کے سب ہل دینے
کے قابل ہیں یا ان کو بدل دینا چاہیے۔ لیکن وہ تمام مغروٹے زندگی کا وہ
تمام انصاف جس کے بہت سے فردی اور فاضل گوشتے مسلمان کی ارتقائی
زندگی کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہیں ان کو توڑا جائے اتنا ہی ضروری ہے
جتنا کسی مرتے ہوئے بیمار کیلئے آکسیجن پلاٹ۔

اپنے معاشرے کی ہر چیز کو "حرف آخر" سمجھنے کی برائی نے مجھ
کی جو کیفیت پیدا کی ہے اس کا سب سے بڑا اور ناقابل تلافی نقصان مسلمان قوم
کو یہ پہنچا ہے کہ جاگیردارانہ تہذیب کے بد میں سختی تہذیب نے دنیا کو اپنی طرف
متوجہ کیا ہے، مسلمان نے اس سے اپنا تعلق قائم نہیں کیا۔ اور اس طرح اس
کے مروج کی داستان شہنشاہیت کے عہد سے آگے نہیں بڑھی۔

آج کے ٹیکنیکل دور میں مسلمان سے زیادہ نان ٹیکنیکل قوم کوئی دوسری
نہیں ہے۔ بیات میں صرف ہندوستانی مسلمان کے بر میں نہیں کہہ سکتے۔
عالم اسلام کے بارے میں میرا تجزیہ یہی ہے۔ عرب کے دورانی پہلے اسلام
کے جنگ باندوں نے حکمت کھاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ
یہودیوں کے مقابل میں خدا کو کم سمجھتے یا ان کے پاس چھایا ہوا کی کمی تھی۔
یا خدا پر اتنا یقین نہیں رکھتے تھا یہودی کہتے ہیں کہ اس کا وہ یہ ہوتا
ہے کہ سائنس کے اس عہد میں ان کا مزاج انتہائی غیر سائنسی یا فطری
محسوس نہ ٹیکنیکل ہے۔ مدت کی ان کے پاس مرادانی ہے لیکن بہر حال

ہم گن سائنس دان مسلمان نہیں

ٹھکانہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے ان کا کوئی واسطہ نہیں بچھا جنگ میں
لوگوں نے دیکھا ہے کہ سویت روس کے وہ جنگی ٹینک جو یہودیوں کی گولہ باری
سے ناکارہ ہو جاتے تھے، یہودی انھیں اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے اور اگلے
چوبیس گھنٹوں میں اپنے ملک کے جنگی صنعت کے مراکز میں ان کی محبت
کر کے انھیں ان ہی کے بالکون یعنی عربوں کے خلاف استعمال کرنے لگتے۔
جہاں ایک طرف ٹیکنیکل مہارت کا یہ عالم ہوا اور دوسری طرف اللہ کا
نام دیاں باوریت کا فیصلہ جنگ لڑنے سے پہلے ہی اڑھتا ہے

یہ صرف ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ غرض یہ ثابت کرنے کے لئے
کہ جاگیرداری عہد کی آخری حد پر اپنی زندگی کے شب و روز ختم کر دینے والے
مسلمان کا ذہن کتنا غیر منطقی، غیر سائنسی اور غیر ٹیکنیکل ہے۔ وہ اس کچھ کہہنا
ہی نہیں جانتا کہ آج جو قوم ٹیکنیکل طریقوں سے جینا نہیں جانتی وہ دواں
جی ہی نہیں سکتی۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی عورتیں تو کیا عام طور پر
مرد بھی اپنے اپنے گھروں میں بجلی کا سوچ آگے کرتے ہوئے اس لئے ڈرتے
ہیں کہ کبیں انھیں بجلی نہ پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ اس حد تک قدیم ذہن وقت
کے جدید ترین تقاضوں کا ساتھ کہاں تک دے گا اور کیسے دے گا۔

مسلمان کا مسئلہ اصل سیاست کا مسئلہ نہیں ہے یہ مسئلہ
انسان کی ارتقائی زندگی کے منطقی کا۔ جو لوگ سیاست کے وسیلے سے ہندوستانی
مسلمان کے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل غلطی پر ہیں اور وہ مسلمانوں
کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان کے مسائل کو بڑھانے
یا اور پیچیدہ کر دینا چاہتے ہیں۔

تقسیم کے فوری بعد بات چٹ ہو گئی تھی کہ سیاست کی بنیاد پر مسلمان
بازی ہار گیا ہے۔ اور صرف بازاری ہار گیا ہے بلکہ کئی طرح کے معاشرتی، ذہنی
سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل کا شکار ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان
مسائل کا حل انھیں بنیادوں کی تہ میں تلاش کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن مسلم
تائمر نے نہ مسلمان کے معاشی مسائل کی طرف توجہ دی۔ نہ تعلیمی تہذیبی اور
نسلی مسائل کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے ہر مسئلہ کا علاج سیاسی دواؤں سے
میں دیکھا۔ نتیجہ میں کا یہ ہوا کہ مسائل بڑھتے گئے اور مسلم قوم دوسری قوموں
سے الگ تھلک ہو کر زوال کے آخری کنارے پر آ گئی۔ آج حالت یہ ہے
کہ مسلم قوم نے سیاست اور مذہب کو ٹاکر ایک ایسی "کاک ٹیل" تیار
کے ہے کہ جس کے نشے نے اسے بھارت اور بھارت کے دورانی سے غرق

کہوا ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ملک کے موجودہ جمہوری سینٹ اپ میں مسلمانوں کی جہاں گاندہ مذہبی سیاست کی کیا اہمیت ہے؟ اب وہ اپنے ان خصوصیات پر مبنی سیاست سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا اب اس کی کوئی قوت باقی ہے کہ اس ملک پر کوئی اور پاکستان نہیں لگا۔ یا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ہندو مسلمان کی اس مذہب آمیز سیاست کے بل بوتے پر اس ملک میں کوئی اسلامی طرز کا نظام قائم ہونا ممکن ہے؟ اگر نہیں تو اس سیاسی غلط کاری کا فائدہ کیا ہے؟ اگر یہ پوچھا جائے کہ آخر ہم چاہتے کیا ہیں؟ تو اس کا ایک اندازہ محابہ ہوگا کہ ہم بدیہیت ایک مسلمان قوم کے ملتیں خوشحال و عزت مند بننا چاہتے ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان ہمیزوں کو حاصل کرنے کیلئے مذہب کام آسکتا ہے یا سیاسی حربے؟ یا پھر وہ ذہنی جو عقلیت پسند اور پیدا تو ہیں اپنے کو غلطی تہذیبی اور تمدنی بندیلوں پر پہنچانے کیلئے استعمال کرتی ہیں۔

اپنی ساری اجتماعی قوت پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں چند سیٹیں حاصل کرنے کیلئے دگادنا زیادہ ضروری ہے یا بات فروری ہے کہ ہم اپنی قوم میں بہتر سائنس دان، بہتر کاریگر، بہتر انجینئر، بہتر ڈاکٹر اور بہتر صنعت کار پیدا کریں۔ اور وہ پختہ پیشہ اختیار کریں کہ ہمیں بھیک کی طرح یا سہرا مات اٹھنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

مذہب کی بندستانی مسلمانوں کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے

دیتی ہیں، یہ پانچویں لگا کی جائے کہ وہ اپنا انصاف ہم پر دل دے۔ اپنے یہاں تکنیکی اور معیشتی شعبے قائم کریں۔ جب صنعتی یا تکنیکی انداز پر ذہن کی بربادش ہوتی ہے تو دھرم و دھرم سے سوچنے سمجھنے کے سادہ طریقے بجاتے ہیں۔ فرار کی کیفیت نازل ہونے لگتی ہے تو قوم کا رجحان تعمیری دھرم کی طرف لگ جاتا ہے۔ اگر اس پہنچ پر کام نہیں کیا جاتا تو ظاہر ہے کہ سیاست کے ذریعہ مسلمان کے مسائل حل نہیں ہوں گے اور اپنی قوم مسلم ملتوں کے بنائے ہوئے حریف آخر کے ماترے میں کھوکھلے کی طرح گھومتی رہے گی۔

یہ میں دیکھتا ہوں کہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک واضح اور صحیح ذہنی تبدیلی کے بغیر سیاست کے راستے سے ان مسائل کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ اور جہاں تک ذہنی تبدیلی کا سوال ہے وہ آپ ہی آپ آسمان سے نازل نہیں ہوگی۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمیں ذہنی طور پر اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس ذہنی تبدیلی کو لانے کیلئے ہمیں سب سے پہلے اور سب سے بڑے کس عاز پر جھگ کرنی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ آج پوری قوم کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ اپنی جداگانہ سیاست سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو کر اپنی ساری صلاحیتیں زیادہ مفید و زیادہ تعمیری کاموں کی طرف لگائیں۔ سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت تو یہ ہے کہ تمام مذہبی اور مذہبی دوس گاہوں پر جو ہر سال ملاؤں کی ایک تکنیکی کمیٹیاں کر کے بازار میں بھیج

مذہبات بڑھانہ دارگی

ایک مولوی نے ایک شخص کو کل علامہ اقبال کے پاس اکثر و بیشتر آتے اور اپنی وراثت کے جھگڑوں سے متعلق ان سے مشورہ لیتے۔ مگر ہر بار کچھ وعظ بھی فرما جاتے۔ اقبال سے یہ بھی کہتے کہ آپ عالم دین ہیں اور مشرعیات حق کے حامی ہیں۔ مگر آپ دارمعی نہیں رکھتے جو ایک اسلامی شعار ہے۔ ایک روز ان کی تلقین کا ایسا اثر ہوا کہ اقبال نے ان سے کہا کہ ہم آپ ایک معاہدہ کریں۔ مسلمان کے چہرے پر دارمعی نہ ہونا بھی ایک شرعاً نقص اور کوتاہی ہے اور اپنی بہن کو وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک شدید قسم کی معصیت اور مشرعیات کی خلاف ورزی ہے۔ لہذا بات بڑھانے میں دارمعی بڑھاتے لیتا ہوں بشرطے کہ آپ اپنی بہن کو وراثت سے محروم نہ کریں۔ مگر مولوی صاحب بات آگے بڑھانہ اقبال کے چہرے پر دارمعی بڑھی۔

سیا اور اقلیت

چلا گیا۔ دکان دار آیا۔ نوکر نے کپڑا بچنے کی اطلاع دی، مالک فوراً گاہک کے پیچھے دوڑا۔ میلوں پہنچا کرنے کے بعد گاہک تک پہنچا اور اسے بتایا کہ اس کپڑے میں کھردرچ ہے، لازم نے بھول سے آپکو یہ کپڑا بیچ ڈالا۔ دام واپس لے لو اور کپڑا دیدو۔ گاہک نے کپڑا واپس نہ لیا اور کہا کہ رکان داری کی کھردرچ بھی قبول ہے۔ مگر آج کے سیاست دانوں نے ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی بساط نہیں بچائی۔ بلکہ ان کی بساط سیاست ہے۔ اپنی مطلب برادری کے لئے اور ہر وہ اقلیت ان کی بساط کا مہرہ ہے۔ جو اکثریت سے مخالف رہتی ہے۔ اور جس کو کسی بھی بات پر اکثریت کے خلاف صف آرا کیا جاسکتا ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کی سیاست اپنے جلو میں اکثریت بیکر چیتی تھی۔ مگر اکبر کے زمانے میں تو اقلیت کو ساتھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سہ کار کا کہنا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی ہے۔ لیکن اکثر نے مراہٹوں اور راج پوتوں میں کبھی دوستی نہیں دی۔ اور یہی اس کی سیاست تھی۔ وہ اکثریت کے چنیدہ اشخاص کو اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا جو ظاہر ہے اقلیت بن جاتے تھے۔ مہارانا پر تاج کا بھائی راجہ مان سنگھ چنیدہ اقلیت کا سردار تھا۔ اس نے اکبر کی دہلیز پر اپنا ماتھا ٹیکا، مذہب کی کمرچک گئی۔ اور اکثریت کی بیٹی جہیز میں ہندو دھرم کی آن لے کر اکبری خواب گاہ کی زینت بن گئی۔ اکثریت نے اس سے بڑھتے کو دھرم اور کر تو یہ کا نام دیدیا۔ ہندوؤں نے کہا کہ راجا دشنو کا آتش ہوتا ہے، دھرم نشٹ ہندوؤں نے مسلمان بادشاہ میں

اس زمانے کی دو بڑی طاقتیں۔ آمارت اور سیاست ! اس دور کی دو بڑی لغتیں۔ آمارت اور سیاست ! یعنی دھنواں اور سیاست داں۔ ایک کے پیچھے بھاڑتے ہیں۔ دوسرے کے پیچھے ہٹتے ہیں۔ جن کے پاس یہ دونوں طاقتیں ایک ساتھ جاتی ہیں ان کے۔ سنے سورج کا قلم وقت کے رخ کو بدل دیتا ہے۔ منصف کی ترازو ان کے اشارے پر قانونی ہوتی ہے اور مذہب کی کمرچک جاتی ہے۔ حکمران عموماً دولت مند بھی ہوتے ہیں۔ اور سیاست داں بھی کورے امیر ایکسپلائٹر، بورژوا، انظام اور ڈکوبلائٹرز۔ کورے سیاست دانوں کو حکومت کے بھوکے سنگدل چال باز اور عوام کا قاتل کہا جاتا ہے۔ مگر یہاں دولت اور سیاست دونوں انسانیت کیلئے زہر ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ اپنے غلوں سے اس زہر کو ثریا کی یں بدل دیتے ہیں۔ جیسے چانڑ کیہ یا جیسے بھاما شاہ۔ ایک جنگل میں رہتا، بچوں کو ڈھکاتا اور اپنا پیٹ پالتا۔ دوسرے نے اپنی دولت دیکر ایک ٹوٹے ہوئے بہاد کو اکبر کے خلاف کھڑا کر دیا تھا۔

آج دولت مند روپہ اچھالتے ہیں ایمان داری کی حدود کو پھلانگتے ہیں۔ سود بیاج کا جال پھیلاتے ہیں اور دنیا کے سہرائے پر قبضہ کرنے کو بزنس کہتے ہیں۔ ویسے کاروبار کے اصول سے گاہک کو بٹا مقصد نہیں ہوتا۔ مقصد ہوتا ہے واپسی دام لے کر اچھا مال دیکر گاہک کے کام آنا۔ عرب کی تاریخ میں ایسے واقعات ملے ہیں کہ دکان دار کی عدم موجودگی میں نوکر نے کپڑا بچا۔ گاہک نے کر

گگن کا ہنستستانی مسلمان شہر

وہ انش دیکھ لیا تھا اور اکبر نے اپنی اسلامی کلتی کو کھڑکی دلو گڑھی
میں چھپا کر مہابی کی پدوی پالی تھی۔ مگر اکبر کی اولاد ہندو دھرم
کی مینی کی کوکھ سے ہم پاکراہ شہراب پی کر بھی مسلمان بنی رہی۔ پھر
بھی اکبری رواداری کی لہر شاہ جہانی دور تک رواں دواں رہی۔
اور اخیر میں اورنگ زیبی چٹان سے ٹکرا کر مٹ گئی اور مہابی کی
پدوی پانے والا خان دان اپنے اختتام پر پہنچ کر رحمت اللہ علیہ
سج گیا۔

اھنگ زیب کی پشانی پر جہاں اسلامی پاکیزگی کی خواب
نظر آتی ہے وہاں اپنے بھائیوں کے خون کا تشقہ بھی چلتا ہوا دکھائی
پڑتا ہے۔ دراصل یہ سیاست تھی اور اس کا اسلامی جہوریت اُتوت
فسادات اور شریعت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

سیاست کی آنکھ غرض نہاد خود غرض ہوتی ہے اور اس
کی مطلب براری کے راستے میں جو آتا ہے وہ اس پر ناتجربہ حکمر
آگے بڑھ جاتی ہے۔ سیاست باپ بیٹے میں بھائی بہن میں
اور دوست دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔ سیاست کی تلوار
اپنوں ہی کا لہو چاٹ کر زیادہ چمکتی ہے۔ اھنگ زیب نے
توپانے تحت مگر کو بھی نہیں بخشا۔ اکثریت مرعوب ہو گئی۔

اقلیت مذہب کے نام پر بہک گئی۔ اور اپنے بادشاہ سے یہ بھی
ذکرہ سکی کہ بادشاہت کو اسلام سے کیا تعلق۔ پس یہیت نے
آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اور ذہن پر مہر لگا دی تھی ہر
کا واقعہ نہ ہی نہیں قطعی طور پر سیاسی تھا۔ سیاست کی تلوار نے
اللہ کے گھر میں اللہ والوں کے سامنے شرع کا نام لے کر اس
بجذبہ اللہ کی گردنی اڑا دی جس نے کہا تھا ہے

بالائے خوشے کردہ چنیں پست مرا

چشمے بد و جام بردہ از دست مرا

اور دلیل من ست و من در طلبش

وز دینجے بر ہنہ کرد دست مرا

اور اس کے بعد خلیہ سیاست دم توڑنے لگی۔ لیکن لہا لہو بھی
ہوئی تھی۔ شاہ جہاںس ہمارے چیل رہے تھے۔ اور انگریز خاموش
شاہنشاہ کی طرح آنکھ کھٹا ہو گیا۔ اور مادی بیچ سکھانے لگا

ہنگر بہانہ ستانی نسلان نمبر

مرا بیٹے پے در پے مغلوں کو شہ دینے لگے۔ اور مہا چانوں کے
نیل بڑھنے لگے۔ ٹھگ پنڈاری پیادوں کا کام کرنے لگے۔
بازی زبج ہونے لگی۔ شاہی بساط پلٹنے لگی۔ شاہی مہرے دبتے
دبتے قلعہ سے باہر گرنے لگے اور آخر قلعہ میں انگریز داخل ہو گیا
اور اعلیٰ جی نے اعلان کیا: 'قوم خدا کی۔ ملک بادشاہ کا۔ حکم
کمپنی بہادر کا!'

انگریز نے ہندستان کے مزاج کو سمجھا۔ ہندوستانیوں
کی کمزوری کو پرکھا۔ اکثریت اور اقلیت کو جانچا۔ پتے ہوئے
مہروں کو کھڑا کیا۔ مسلمانوں کی حکومت میں جو لوگ ناں جوں کو
فناج تھے ان کے دسترخوان پر شاہی ٹکڑے بٹنے لگے۔

1857 میں اکثریت و اقلیت اپنے تفرقے مار کر ایک ہوئی۔
میرٹھ سے دباؤ پڑا۔ اور آزادی پسند انسانوں نے قلعہ پر آکر
مہابی کے خان دان کو پکارا۔ تو سفرہ انقلاب سن کر انگریز تو
سہم گیا۔ مگر قلعہ معلیٰ کے دروازے بند ہو گئے۔ اور نتیجہ ہوا

کہ تحریک آزادی غد کے نام سے بدنام ہو گئی۔ بادشاہ ملک بدر
ہو گیا۔ اور شہزادے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ انگریز
نے اس ملک پر حکومت کرنے کیلئے ایک نئی ترکیب پر عمل کیا۔

اس ترکیب کا نام انگریز کے ہاں ہوا ہنر۔ مگر ہر دیال نے اس
کا نام Divide and Rule رکھا تھا۔ انگریز نے ہندو مسلمان
ہی کو Divide نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں اور مسلمانوں کے بیچ میں بھی
کئی دیواریں کھڑی کر دیں۔ غدر کے بعد انگریز نے جو پہلا کام کیا
وہ یہ تھا کہ اپنے تشدد سے عوام پر اپنی یہیت ماری کر دی۔

مگر تشدد بھی مسلمانوں کیلئے الگ نوعیت کا تھا اور دوسرے فرقے
داؤں کیلئے الگ۔ 'ما نماز آف انڈیا کے ایک ایڈیٹر مسٹر ڈی لین
کی تحریر کا ایک اقتباس جو مسٹر نسل کی ڈائری کے صفحہ 4 پر
موجود ہے کافی لہنا دینے والا ہے۔

'زندہ مسلمانوں کو سڑکی کھال میں سینا یا پھانسی
دینے سے پہلے ان کے جسم پر سڑکی چربی لٹایا زندہ آگ میں جلانا
اور ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بد عمل کریں،
یقیناً سیاست کے نام پر ایک بدناما دھماکا ہے۔'

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے مسلم علماء سے فتوے لئے اور جن علماء نے فتوے دیئے وہ انگریزوں کے دستِ اہ گماشتے بن گئے۔ ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء کو بھگل پور کے اسسٹنٹ کمشنر سید امیر حسین شاہ کے استفتا پر کہ ہندوستان میں جہاد جاری ہے یا نہیں جو فتویٰ علماء کرام نے جاری کیا وہ یہ تھا۔

۱۔ مسلمان رعایا کے پاس اپنے حاکموں سے لڑنے کیلئے تو طاقات ہے اور نہ ہتھیار ہی ہیں۔ اگر لڑائی شروع کر دی گئی تو شکست ناگزیر ہے جس سے اسلام کی عزت کو نقصان پہنچے گا۔ لہذا جہاد واجب نہیں۔ ضروری ہے کہ اگر جہاد کیا جائے تو اس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو۔ اگر اس قسم کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے!

نکلنے کی محنت سوسائٹی کی جانب سے ایک فتویٰ جاری ہوا تھا جس میں جہاد کو بنیاد سے تعبیر کیا گیا تھا۔ جبکہ مجاہدین ہندوستان کو دارالحرب کہتے تھے اور ان ہی دنوں سرحد میں مجاہدین کی تحریک زوروں پر تھی۔ دو بندگان علماء مجاہدین کے ساتھ تھے۔ انگریز ٹھانڈوں کے خلاف جنگ جاری کئے ہوئے تھا اور تب ہی کئے کے مفتیوں نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالاسلام ہے۔

اور حد تو یہ ہے کہ اطمینان اللہ و اطمینان رسول میں الامریکم کے مصداق انگریزوں کو بٹھرایا گیا اور انگریزوں کو یہ مرتبہ دینے والے اردو زبان کے مشہور انشاپر از ڈپٹی نذیر احمد بھی تھے، جو شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ ادیب بھی اور مصنف بھی۔ انھوں نے قرآن پاک کے ترجمے میں بھی انگریزوں کو پہلی دفعہ اولاً قرار دیا۔ انھوں نے اپنے ترجمے کی ایک کاپی سرورہم مود کو انگلستان بھی بھجوائی اور سرورہم ہما کی سفارش پر ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اسی ترجمے کی بنا پر ڈپٹی نذیر احمد کو ایڈیٹر لونیو رسٹی سے ایل ایل ڈی کی ڈگری بھی دی گئی۔ لے

شمس العلماء، خان صاحب، خان بہادر، رائے بہادر

لے۔ دیکھئے داستان تاریخ اردو، مصنف، حامد حسن قادری۔ صفحہ ۳۹۸

وغیرہ جیسے خطابات انگریزوں کے دیئے ہوئے ضرور تھے مگر ان کی ایجاد دین میں ان غمیدہ لوگوں کا دخل تھا کہ انگریز پرستی جن کا شیوہ تھا۔ اور وہ لوگ اقلیت میں تھے۔ انگریز بھی اپنی بات پر اقلیت کے مہرے بھا کر بٹھ گیا۔ اور ان مہروں کو بڑھانا گیا۔ انگریز پرست ہی زمین دار بنے، جاگیر دار اور قلعہ دار بنے اور اکثریت کے ان دام اکھلائے جانے لگے اور جنھوں نے پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں حصہ لیا تھا۔ وہ اکثریت اب اس غمیدہ اقلیت کے دورِ اقتدار میں ذلیل زندگی گزارنے لگی۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے والے پورے ساڑھے سو گئے اور غدار رئیس بن گئے۔ رئیسوں کے ہاں مصاحف اور بھانڈ پلٹے گئے۔ سائیس کی خدمت کرنے لگے اور رئیسوں کے بچے انگریزوں کے ہاں تربیت پانے لگے۔ عیسائی انگریز اپنی سلا کیلئے نئے مہرے تیار کرنے لگا۔ دراصل وہ ایسی کھپ تیار کرنا چاہتا تھا جس کا ذہن اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور جو اس کی حکومت کو مستحکم اور مستقل بنا دے۔

ہر موبے میں انگریز کی پالیسی کا انداز بدلا ہوا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں مکھنود میں شیعہ سنی فساد ہوا۔ ۱۹۰۵ء تک مکھنود کے ہندو مسلمان شیعہ سنی مل کر عمر منایا کرتے تھے۔ اس وقت کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے شیعوں سے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ محرم کی مجلسوں اور تہذیبوں کے جلسوں میں شیعہ بھاریے تو ننگے سر اور ننگے پاؤں ماتم کرتے ہیں اور سنی بھاریے باندھے یا ڈپٹی پہنے اور پان چاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شیعوں نے اس انگریزی مشورے کے نتیجے میں اعلان کیا کہ ہماری مجلسوں میں ہم بھی آئیں گے۔ سر آئے گا اور پان نہیں کھائے گا۔ اس وقت کی مشرقی تہذیب میں ننگے سر باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا شیعوں اور ہندوؤں نے احتجاج کیا کہ ننگے سر رہنا ہمارا رواج اور تہذیب کے خلاف ہے۔ شیعہ نہیں مانے، ہندو تو عمر میں شریک ہونے سے گریز کرنے لگے مگر شیعوں کا ایک وفد انگریز ڈپٹی کمشنر سے ملا۔ ڈپٹی کمشنر نے ہمدردی کا تو اظہار کیا مگر جواب میں یہ بھی کہا کہ یہ شیعوں کا مذہبی معاملہ ہے اور انگریز سرکار کسی کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دے سکتی، بہتر

ہے کہ سستی لوگ اپنی کربلا لگ بنا لیں۔ آخر یہ بات اتنی بڑھی کہ مدح صحابہ جو سب ملکر کرتے تھے اس پر پابندی کا سوال پیدا ہو گیا۔ اور تبراً شروع ہو گیا۔ اور یہ بات اپنے نقطہ خروج پر اس طرح پہنچی کہ ۱۹۵۱ء میں شیعہ سستی فساد ہو گیا اور مدح صحابہ کا فوٹا روک دی گئی۔

ادھر انگریز نے ایران کے حصے تجربے کر دیئے۔ ہندستان کے سستی مسلمان ایران کے معاملے میں اس لئے نہیں بولے کہ ایران ایک شیعہ حکومت تھی اور ہندستان کا سستی ہندستان کے شیعوں سے مدح صحابہ کے معاملہ میں اراضی تھا۔ مگر شیعہ بھی ایران کے معاملہ میں نہیں بولے کہ انھیں انگریز نے مدح صحابہ پر پابندی لگا کر خوش کر دیا تھا۔ اصل اس طرح انگریز نے مسلمانوں میں ایک ایسی اقلیت پیدا کر لی کہ جسے وہ دقت آنے پر استعمال کر سکے اور آخر انگریز اقلیت کے اس مہرے کو ۱۹۳۷ء میں پہلی کانگریس وزارت بننے کے بعد اپنے کام میں لایا۔ کانگریس نے جب یوپی میں اپنی وزارت بنائی اور سستیوں کو مدح صحابہ کی اجازت ملی تو کھنڈہ میں پھر شیعہ سستی فساد پھوٹ پڑا۔ اسی زمانہ میں مولانا مظہر الدین مظہر (جو خود شیعہ تھے اور مجلس احرار کے اہم رہنما تھے) نے ’سلاویاست‘ کے نام سے ایک کتاب لکھی جہاں جس میں ۱۹۵۱ء کے لکھنؤ کے واقعات اس وقت کے اخباری تراشوں کے حوالوں سے انگریز کی پوری کارستانی بے نقاب کی گئی تھی۔

وہ تھی یوپی کی سیاست جو انگریزوں نے شیعہ سستی مہجوں کی مدد سے کھلی۔ پنجاب کی سیاست میں انگریز نے قادیانیوں کو اپنے ساتھ لایا۔ میرزا غلام احمد جو احمدی فرقے کے بانی تھے وہ ایک درخواست میں کہتے ہیں:-

”ہمارا جاننا شاہ خاندان سرکار دولت دار کا خود کا شرف

ہو رہا ہے۔ ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون

بھانے ادا جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا“

پنجاب میں انگریزی سیاست نے جو اکھاڑ پھار کی اس کی ایک فہرست ایک بار ’چٹان‘ کے ایڈیٹر آغا شورش کا تیسری نے تیار کی تھی جتنی دن بڑے بڑے زمین دار التزاماً پیدا کئے گئے۔

(۲) بیروں کی روایتی گدیوں نہ صرف بحال رکھی گئیں بلکہ مزید پیدا کی گئیں۔

گنگا کا ہندو متی مسلمان سمجھ

۳۰: سرحدی علاقوں میں جن مسلمانوں کے پاس کئی کئی ایکڑ زمین تھی ان کو سہارا نواب کے لقب سے نوازا گیا۔

۳۱: مسجد کے ملاکوں زمین داروں، متعلقہ داروں اور نوابوں کے اشاروں پر چلنے پر مجبور کیا گیا۔ اسلام کی تالیس سرائے داروں کی مرضی کے مطابق ہونے لگیں جس نے انکار کیا اس کو فوج نے خدا کے حکم سے نکال باہر کیا

نواب جادوہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ روزہ بھی رکھتے تھے اور سگریٹ بھی نوش فرماتے تھے۔ ان کے پاس علماء کے دیئے ہوئے نوتے موجود تھے کہ سگریٹ پینے سے روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ مکروہ ہوتا ہے۔ جواز یہ دیا گیا کہ دھواں پیٹ میں نہیں پھسپھڑوں میں جاتا ہے۔

اگر دھوئیں سے روزہ ٹوٹتا تو عورتیں جو چوٹھا جلاتی ہیں اور چوٹے کے دھوئیں میں سانس لیتی ہیں ان کا بھی روزہ ٹوٹتا۔ مگر دھواں ان کے بھی پھسپھڑوں ہی تک جاتا ہے۔ چنانچہ جب نیک بیبیوں کا روزہ نہیں ٹوٹتا تو نواب صاحب کا روزہ کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔

کچھ علماء بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ انھوں نے امارت کا بھانڈا بننا منظور کیا اور سرے کفن باندھ کر انگریز کی قبر کو دھونے کیلئے تیار ہو گئے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں پنجاب نے دل کھول کر فوجی بھرتی دی۔

پنجاب کی فوجی خدمات پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کہا کرتے تھے: ”پنجاب کی ایٹم تو انگریز بابا کیلئے بچے جتنی ہیں! سستی پیدا ہوا اور فوج میں چلا گیا۔ چنانچہ ہندوستانوں نے کٹ مکر انگریزوں کو جتا دیا۔

سرحد کے علاقہ میں انگریز کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تحریک ہند قادیانیوں کی پناہ میں آئے ہوئے تھے۔ وہ

انگریزوں کو سرحدی علاقوں میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے

بلکہ وہ پنجاب تک افراتفری پھیلاتے تھے۔ انگریز نے سرحدی

شورش سے پنجاب کو بچانا چاہا۔ چنانچہ اس نے ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے

ایک الگ صوبہ قرار دیکر شمال مغربی سرحدی صوبہ تشکیل دیدیا۔

وہاں انگریزوں کی اپنی مخصوص فاروٹ پالیسی تھی۔ پولیٹیکل ایجنٹ

کو لاکھوں روپے خرچ کرنے کے اختیارات ملے ہوئے تھے اور صاحب

دینے سے وہ متبراً سمجھا جاتا تھا۔ وہ قبائلی علاقے کے چند شہر پشت

بکاؤ تھا لوں کو پیسہ دے کر سرحد کے ہندوؤں کو اغوا کر دیتا،

پولیشکل رجنٹ اس کی تحقیق کرتا۔ فوج ارج کرتی اور پھر انگریز اپنی رعایا کے تحفظ کا نام لیکر قبائی علاقے میں آگے بڑھتا۔

پنجاب میں مسلمان اور ہندو آبادی کے اعتبار سے تقریباً سالیانہ تھے۔ سرحد میں ہندو صرف ۲ فیصدی تھے۔ قبائی علاقہ میں بھی ہندو اور سکھ موجود تھے۔ اور شیر و شکر کی طرح تھے۔ وہاں کسی بھی ہندو یا سکھ کو اپنی جان و مال کا خطرہ نہ تھا۔ گراٹلی بات یہ تھی کہ انگریزی علاقہ میں ہندو کو خطرہ تھا۔ مطلب یہ کہ انگریز کی سیاست باقاعدہ اقلیت کے مہرے کو استعمال کرتی تھی۔ انگریز نے براہمن اور غیر براہمن کا فرق پیدا کر دیا تھا اور یہ فرق آج تک موجود ہے۔

۱۹۱۹ء میں واقعہ جلیان والا باغ کے بعد گاندھی جی بسا اویاس پر نمودار ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ سیاست و اقلیت کا استعمال کس ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ اس نے انھوں نے کوشش کی کہ اب اقلیت ہی کوئی نہ رہے۔ جسے اپوزیشن کہتے ہیں۔ دراصل وہ اقلیت ہی ہوتی ہے۔ اس نے گاندھی جی اپوزیشن کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اقلیت کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ چورچوڑی کے واقعہ پر انھوں نے اپنی ساری تحریک اس لئے واپس لے لی تھی کہ چند لوگ گاندھی جی کے نظریے کے خلاف ہو گئے تھے۔ عید ملی جناح کو انھوں نے کس کس طریقے سے راضی کرنے کی کوشش کی۔ حدیہ کہ ان کے قدموں میں ساگر ہندستان کی حکومت رکھ دی اور ان کو تادم اعظم بھی بنا دیا۔ اور جناح کے نہ ملنے پر بھی وہ ملک کی تقسیم پر راضی نہ ہوئے۔ اور حصول آزادی کے بعد کانگریس کو توڑنے تک کا شورہ دیا۔ دراصل وہ جانتے تھے کہ۔ اقلیت، جمہوریت کو چلنے نہیں دیتی۔

گاندھی جی کا اچھوت سدا بھائی اقلیت کو اکثریت میں سمونے ہی کا ایک طریقہ تھا۔

پاکستان میں جو حکومت بنی وہ مذہب کے نام پر بنی اور ہندستان میں سیکولر حکومت کی قیاد رکھی گئی۔ مگر

सत्यमेव जयते

حکومت کو ایک مذہبی رنگ بھی دیدیا گیا۔ مسلمان اور ہرے سپہا جو اٹھا۔ بل نہیں سکتا تھا۔ مگر اس کے اندر دھڑکڑا چکا ہونے لگی اور افسردہ ویم کی وہ حالت آج بھی ہے۔ مسلمان جو تیشہ لٹ

تھے ان میں کچھ کانگریس میں شامل ہو گئے اور کچھ نے کناہ کشی اختیار کر لی۔ جو یک کے ساتھ تھے ان میں زیادہ تر پاکستان چلے گئے۔ باقی مسلم مذہبی و فرقہ پرست جماعتوں، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، تعمیر ملت اور نئی مسلم لیگ) میں گھل مل گئے۔

اکثریت کے وہ لوگ جو کانگریس کے ساتھ نہیں تھے۔ بلکہ انگریز پرست تھے۔ آزادی کے بعد کانگریس میں گھسنے لگے۔ رائے بہادر مہر چند کھنہ جو مرکز میں کانگریس کے ذریعہ چکے ہیں۔ وہ کبھی انگریزوں کے بہت بڑے پیٹھو تھے اور سرحد میں صاحبزادہ محمد انصوم کی وزارت کا ایک مہرہ تھے۔ آزادی کے بعد آزاد دی سے زرا پہلے وہ کانگریسی بن گئے۔ جن کو کانگریس میں جگہ نہیں ملی۔ وہ ادھر ادھر کی پارٹیوں میں شامل ہو گئے۔

ہندستان کا طرز حکومت جمہوری ہے جس طرف کثرت رائے ہوگی، وہ پارٹی حکومت کی باگ ڈور نبھالے گی۔ اپوزیشن پارٹی اقلیت میں رہے گی۔ لیکن ہندستان میں چھ کروڑ وچوڑ مسلموں کے ہوتے ہیں۔ کانگریس پارٹی کیلئے یہ مسلم اقلیت ایک زبردست مہرہ ہے۔ کانگریس کا غیر مذہبی ہونا بھی کانگریس کیلئے ایک زبردست جدیت ہے اور کانگریس نے دشنام کا فقرہ بھی بلند کر رکھا ہے۔ اور کانگریس اپنے آپ کو دھرم کی پیشکش۔

सत्यमेव जयते

اس بات کا دعویٰ کرتی ہے اور چنانچہ ہندو نہا بھاشا شومینا اور جیٹکے جیسے ہندو مذہبی جماعتیں اس حکومت کو مذہرب کہتی ہیں۔ پاکستان، ہندستان کی حکومت کو صندوق کتاب ہے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندستان میں ہندو اکثریت میں ہے۔ لیکن

واقعہ ہندو اکثریتی فرقہ نہیں، اقلیتی فرقہ ہے۔ اس لئے کہ بدھ مت، جین مت، سکھ مت اور ولت جاتیوں (اچھوت) کو ہندو نہیں کہا جاسکتا۔ ہندوؤں کے جو پہلے چار درجہ (چار ذاتیں) برہمن، کشتری، ویش اور شودھ تھے۔ ان میں سے شودھ الگ ہو گئے۔ اب جو تین جاتیں ہیں اگر کبھی ان کی مردم شماری کی گئی تو مسلمان نہیں ہندو اقلیت میں ہوں گے۔

کانگریسی سیاست نے بھی اقلیت پیدا کرنے کے فارمولے

کو اپنے ہات سے جانے نہیں دیا۔ ہندوستان میں نسائی تنازعوں نے بھی اقلیتیں پیدا کیں۔ ہندو زبانوں کا مطلب ہے ہندوہ اقلیتیں۔ عام چناؤ کے وقت کانگریس کے مقابل میں کھڑے ہوئے والے زبان کو بھی ووٹ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بناتے ہیں۔ تجربہ ہوتا ہے۔ کراپولیشن کے ووٹ بٹ جاتے ہیں۔ اور کانگریس ہر ایک کے مقابلے میں جیت جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد سے آج تک کوئی بھی دوسری پارٹی مرکز میں حکم راں پارٹی نہیں بن سکی۔ اور حالات بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں بھی کسی دوسری پارٹی کے حکم راں بننے کا امکان نہیں۔

خاں پر مسلمان اقلیت ہی کانگریس کی جیت ہے اور اسی نے کانگریس مسلمانوں کو ہر طرح کی سہولت دیتی ہے۔ اردو زبان جو مسلمانوں کی نہیں ہے سرکاری پروپیگنڈے نے اردو کے سلسلے میں مسلمانوں کو جذباتی بنادیا ہے اور ہندوؤں کو متعصب۔ جمہوریت کا اصل ہے کہ سب برابر ہیں۔ اسی نے جمہوری ملک کے قانون کا اطلاق بھی سب پر یکساں ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے جب ووٹ برابر ہے تو قانون برابر کیوں نہ ہوگا۔ گراں جمہوری اور سیکولر ملک میں ہندو 'بھ' جین' جیانی' سکھ' دیویاں نہیں رکھ سکتا۔ (حالاں کہ ہندو دھرم میں شادی کے سلسلے میں ہندو مرد پر کوئی پابندی نہیں ہے) مگر مسلمان ایک وقت چار بیویوں کا شوہر ہو سکتا ہے۔ ایسے ہندو بھی وجود ہیں جو شخص دوسری بیوی رکھنے کی خاطر مسلمان ہو گئے اور دوسری بیوی بھی ہندو پہلی نے طلاق نہ لی۔ دوسری مسلمان نام رکھ کر کہنے کو مسلمان ہو گئی مگر یہی رام داس سے جدا لہ ہو گئے اور یہی نمبر دو سیٹا سے فاطمہ بن گئیں۔ اور قانون ان کی طرف یوں دیکھا جاتا ہے جیسے جی قیدیوں کو دبا کر دینے کے بعد سورن سنگھ بھیڑ کی طرف دیکھا کریں۔ مسلمانوں کو یہ ساری رعایتیں ان کے ووٹ کی طاقت کی وجہ سے حاصل ہیں۔

ہوں کہ ہندوستان میں جمہوری نظام ہے۔ جمہوری طرز حکومت نرفا کی نیک نیتی پر مبنی ہوتی ہے۔ جمہوری نظام شریف لوگوں کی جانب سے شریف لوگوں کیلئے جب کی بہتری کی خاطر ہوتا ہے۔ نیک سیاست دونوں کا سوجا ہوا طرز عمل ہے۔ مگر جب نیک سیاست دائرہ مملکت کی نظر پڑتی ہے تو نیکی کا جاندار گھٹنے لگتا ہے۔

گلن نہا ہنسٹانی نندن ہر

امیر لوٹ پھرتا ہے اور ووٹ خریدتا ہے۔ ایمان داری کی بات ہے کہ غریب کا ایمان بھی بازار میں بیلا ہو جاتا ہے اور بھوک کی منی کے نیچے دیانت داری دفن ہو جاتی ہے۔ اسی نے رسول اللہ نے فرمایا تھا، 'یا خدا مسلمان کو فاقے سے بچاؤ! فاقہ انسان کو کفر کے قریب لے جاتا ہے! ' برادر دشا نے ایک جگہ کہا ہے 'The only way to save a man from poverty is to give him a job' (مغلی گناہ ہے)۔ اب گناہ گار کا ایمان کیا اور عزت کیا۔ عزت کو داغ لگنے کیلئے سفید کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے اور غریب کے تن پر کپڑا ہی نہیں ہوتا۔ کانگریس کا طرز حکومت تو ٹھیک ہے جمہوری ہے سیکولر ہے مگر جب سیاستداں کے پیچھے امیر آکر کھڑا ہو جاتا ہے تو سیاسی ایمان دنگ گانے لگتا ہے جمہوریت کا طرز نظام جو ہمارے دلش میں ہے وہ ہے تو بہت اچھا مگر وہ بہت قیمتی ہے۔ چناؤ میں حصہ لینے والا اگر خود کر دیتی ہو یا اس کی بیٹی پر کوئی کر دیتی ہو تب ہی وہ انتخاب لڑنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ سچے نیکو بھی چناؤ کا خرچ برداشت کرنے کے لئے فانی نفس سر کی ضرورت پیش آتی ہے اور فانی نفس سر سود کے ساتھ اصل بھی وصول کرتا ہے اسلئے اب ہر سیاسی پارٹی میں امیر گھسے ہوئے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی سیاست نیاؤں کو ان کے ساتھ جھوٹ کر پڑتا ہے دیر پزیر لکیشن کا خرچ کون اٹھائے گا اس وقت اور سیاست ساز باز کرتے ہوئے ہے۔ اور ساز بازار اصولی طور پر جیتنے کے معانی ہے اس میں ہندو مسلم کا سوال نہیں سوال ہے صرف امیر و غریب کا تہذیب زبان صوابی تعزات وغیرہ۔ سب سیاستداں کو گولی پر جانے اور امیر کو کھانا اور زیادہ امیر بننے کے شرفاء گز رہیں اگر سیاستداں سو غلام کا نوکالہ ہے تو امیر کا لڑی کا ایک نیا پوپار کھول دیتا ہے۔ اور اس پر ہر امیر ہم سب شامل ہیں جنتا بھی اور میا بھی سدا ان کو اس تمام پر جو بقرانہ کہے ہوئے ہے وہ ہے اقلیت ذکر اکثریت۔

پاکستان میں کوئی اقلیت نہیں ہے اسلئے قیام پاکستان سے آج تک ان تقریباً پڑھ دھن پرانے مسٹر میل پکے میں اور آج تک کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہو پائی۔ مگر اب ضرورت نے وہاں بھی ایک اقلیت (احمدی) ایجاد کر دی ہے۔ اور اب یہ اقلیت پاکستانی بساط سیاست کا ایک ایسا اہم ٹھہر ہو گا جس کی مد سے بڑے بڑے فیصلوں کو مات دی جا سکے گی اور وہاں بھی سدا قائم رہنے والی ایک حکومت بن جائے گا۔ مگر جمہوریت کی تشبیہ ہو گی۔

کے بنا، یہ یورپ کے ازمیر، قسطنطنیہ کی جائے تاکہ جھوٹی جھوٹی افیتین کو بھی اپنی ایک متحدہ ریاست قائم کرنے کا سونے مل جائے۔ اسی بنا پر پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ کی جمہوریتیں قائم ہوئیں اور بلقان کو نصف درجن حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن جمہوریتیں بھی کسی حد تک ختم پر مشتمل نہ رہ سکیں، بلکہ ان دونوں میں کافی جرمن افیتین چھوڑ گئیں جن کی تعداد پچیس فیصد کی سم۔ نئی غرض کہ اس مسئلہ کا حل تلاش کا ماب نہ ہوا۔

یہ روپ میں ایسی ملکوں نے مسئلہ انیت سے تنگ کر اس سے چھٹکارا۔
 یا نہ کے لئے یہ دستور کا کہ ملک کو خلیفہ ملکوں میں بانٹ دیا جائے، لیکن
 یہ بھی ممکن نہ ایک کھل اور بھانسنے یا امت بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس پر
 یہ قسم کے جتن بھی کئے گئے ان میں مذہبی، لسانی اور نسلی اقلیت
 یہ بھی نہیں اسی کے سارے جھڑے بھی رہ گئے کیونکہ ہر ملک کے کو اپنی اندر
 یہ کہ نہ کچھ اقلیتوں کو جگہ دینی ہی پڑی۔ لیکن آخر یہ ٹکڑے بازی کس حد تک
 دنیا کو کھینچے گی کیونکہ اس قسم کے ٹکڑوں کی کچھ اقتصادی حدود بھی ہیں۔ گذشتہ
 جنگ عظیم کے بعد یہ رائے ہوئی کہ حق خود ارادیت **Self Determination**

کی حالت کو بھی دھکا لگانے سے وہ باز نہ آئیں اور کھلم کھلا انھوں نے دشمنوں سے ساز باز کی۔

چنانچہ موجودہ جہد میں ایک ریاست کو نہ صرف اپنے بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے بلکہ اسے اندرونی دشمنوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کا تمام تر سبب ہی اقلیتوں کا مسئلہ تھا اور گزشتہ عالم گیر جنگ بھی پلانڈ کی سوڈن جرمن کی اقلیت ہی کے سواں چھوڑی تھی سوڈن جرمنوں نے مادر وطن سے غداری کر کے کھلم کھلا ہٹلر کا ساتھ دیا اور ہٹلر نے اپنی جرمن اقلیت کی محافظت کا بہانہ کر کے تمام اٹھائی۔

بہر حال فرقہ وارانہ سوال یا اقلیت کا مسئلہ موجودہ جہد کا سب سے پیچیدہ اور اہم مسئلہ بن گیا ہے چنانچہ دنیا کی حکومت نے جبریں اور اقوامی کانفرنسوں اور پھر انجنوں نے اس مسئلہ کے حل پر کافی توجہ دی ہے۔ اس سے قبل بھی انیسویں صدی کے بعض صلحنامہ میں جو یورپین اقوام کے درمیان ہوئے اس مسئلہ کا ذکر موجود ہے اور اس کے حل کی کوششیں کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے پیرس کے صلحنامہ میں (TREATY OF PARIS) واپس پڑا تھا اور پھر میں ہوا تھا اقلیتوں کی محافظت۔ یعنی ایک دفعہ رکھی گئی اور یہ صاف طور پر اعلان کر دیا گیا کہ کسی ملک کے باشندوں کے کسی طبقہ سے صرف اس بنا پر کہ وہ نسلی، لسانی یا مذہبی لحاظ سے مختلف ہے کوئی برابرتاؤ نہ کیا جاسکے اور نہ اسے حقیر سمجھا جائے گا۔ غرض کہ اس صلحنامہ میں اقلیتوں کے مساوات کے درجہ کو تسلیم کیا گیا۔ اور مختلف ملکوں میں حکومتیں اقلیتوں کا خاص خیال رکھنے لگیں۔ اسی طرح جہد نامہ بریں (۱۹۱۸ء) میں بھی یہ اعلان کیا گیا کہ جرمن میں جو مختلف ریاستیں ہیں وہ اپنی اپنی اقلیتوں سے مذہبی رواداری کا برتاؤ کریں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے آخر سیاسی دست دیزل میں افراد کی شخصی آزادی کو مانا گیا۔

لیکن پھر میں صدیوں اور بعد میں پہلی جنگ عظیم کے بعد پھر ایک مسئلہ اقلیت کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی اس نے پہلے کسی ملک کے اولیاء کا یہ حق تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جس طرح چاہیں وہیں خود زبان چاہیں استعمال کریں اور اس دین کی پیروی ان کی مرضی ہو کریں لیکن اقلیتوں کو حلقہ حیاتیت سے تسلیم نہ کیا گیا۔ بعد میں ایک جھگڑائی قوم کا درجہ دیا گیا۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد انھیں جماعتی شکل میں مانا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا حق خود ارادیت بھی تسلیم کر دیا گیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب پیرس میں صلح کانفرنس

صدد سن دہر کے کی صداقت میں پہنچی تو اس نے اندر تو پر ایک ایسے مستحکم نئے نظام کی داغ بیل ڈالنا چاہی جس سے آئندہ اس قسم کے جھگڑوں کا امکان نہ ہو اور مستقبل میں انہیں ہونا ک جنگوں کا سد باب ہو سکے۔ یہی غدار ہے یہ کانفرنس بھی کوئی ایسی جادو کی کڑی نہیں گھا سکتی تھی کہ یورپ کے سارے ملکوں میں صرف ایک ہی قوم کی ریاستیں بن جائیں اور اقلیتوں کا جھگڑا ہمیشہ ہٹلر کے لئے ختم ہو جائے کیونکہ موجودہ دور میں عرب کی قدیم قبیلہ لیبیوں یا یونان کے آزاد شہروں کا تصور ناممکن ہے جہاں صرف ایک ہی قبیلہ یا نسل کے لوگ رہا کرتے تھے۔ کانفرنس بڑے طور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ جو بھی ریاست بنے گی وہ لازمی طور پر ایک سے زیادہ فرقوں پر مشتمل ہوگی لیکن اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کہ اقلیتیں بھی اپنے ملک کی اسی طرح ہی خواہ فرماں بردار اور جاں نثار ہوں اس طرح اکثریت ہمارا کرتی ہے۔ یہ ضروری قرار پایا کہ اقلیتوں کو بھی اکثریت کے مساوی حقوق دئے جائیں۔ یہ ساری باتیں اس لئے کی گئیں کہ اقلیتیں بھی اپنے وطن کو چھوڑیں اور بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے تمام فرقوں سے مل کر ریاست کو چلائیں۔ اور وطن کی ترقی کے لئے کوشاں ہوں۔

یہاں لفظ مساوات سے غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ امتیاز کو مساوات دینے کا مطلب یورپ میں سب سے پہلے یہ ہے کہ جس طرح اندلوگوں کو حق رائے دہندگی ہے انھیں بھی یہ حق دیا جائے اور انھیں محض نہ سمجھا جائے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ شہر میں انھیں تمام شہری حقوق دیے ہی حاصل ہوں جیسے اکثریت کو ہیں۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اقلیت کے ایک فرد کے لئے حکومت کے کاموں میں ایک فرد کی آسانی سے یکساں ہوجائے۔ کی صورت کا مدللہ بھی کھلے ہو اور اس کی اہلیت میں اس کا مذہب یا نسل حائل نہ ہو۔

جمعیتہ الاقوام اور اقلیتیں

جمعیتہ الاقوام اپنے مقاصد میں کتنی ہی کامیاب نہ رہی ہو لیکن یہ کام ہے کہ دنیا میں پہلی بار باہمی جھگڑوں کو جنگ کے درجہ نہیں بلکہ صلح و مفاہمت اور گفت و شنید سے طے کرنے کے لئے اقوام عالم کی انہیں عالم جہد میں آئی۔ بہر حال عالمی جنگ کے بعد جمعیتہ الاقوام کا قدر عمل میں آنا تھا کہ یورپ کی تمام اقلیتوں نے اپنی اکثریت کی شکایتیں اس کے سامنے پیش کرنا شروع کیں یہ شکایتیں ۱۹۱۸ء میں ہٹلر کے خلاف تھیں۔

چنانچہ جمیتہ اقوام نے ان تمام ممالک کی حکومتوں سے مشورہ کیا اور اقلیتوں کے حقوق کے متعلق ایک دستاویز مرتب کی جس پر مندرجہ بالا ۱۷ حکومتوں نے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ یہ حقوق جن امور سے متعلق ہیں وہ تین عنوانوں کے تحت آتے ہیں۔

۱۔ زبان ۔ ۲۔ نسل ۔ ۳۔ مذہب۔ جنی جمیتہ اقوام نے جو بھی تعلقات مقرر کئے وہ ان میں ہی امور سے متعلق ہیں۔ یہاں پھر ہمیں ہندوستان کے مسئلہ اقلیت اور یورپ کے مسئلہ اقلیت میں فرق نظر آتا ہے اسلئے یہ کہ اقلیتوں کے تمام مطالبات عرب زبان و معاشرت مذہب اور نسل ہی تک محدود ہیں اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمارا انتخاب جہاں جہاں ہو گا یا اسیلی یا مجلس آئین ساز میں ہمارے لئے اتنی نشستیں مقرر کر دی جائیں یا پھر برسرکاری ملازمتوں میں تناسب مقرر کیا جائے۔ ہر حال جمیتہ اقوام نے ان تین قسم کے مطالبات (زبان مذہب، نسل) کے مسئلے میں قوانین بنائے۔ اور پھر جمیتہ کی رہنمائی میں مختلف قوموں نے اپنی اقلیتوں کی زبان نسل مذہب وغیرہ کے تحفظ کے مسئلے میں اپنے دستور میں حسب ذیل دفعات شامل کیں۔ مندرجہ بالا تین مطالبات کے علاوہ اقلیتوں کو شہری حقوق میں بھی مساوات دی گئی اور انہوں نے بنیادی حقوق یکساں مل گئے چنانچہ ہم یہاں چاروں قسم کے حقوق ۱۔ شہری ۲۔ نسلی ۳۔ نسلی ۴۔ مذہبی حقوق کے متعلق دیکھیں ممالک کے دستور سے دفعات نقل کریں گے۔ ان دفعات پر یورپ کے تمام ممالک متفق ہیں۔

شہری حقوق :- ۱۔ کسی ریاست کے آگے ہر شخص خواہ وہ کسی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو سادگی ہے اور انہوں کے لئے ایک ہی قانون ہے۔

۲۔ کسی شخص کو بھی بغیر مقدمہ چلائے قید نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ تمام لوگوں کو پریس پبلشٹ فام اور اجتماع کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ انہیں بنا سکتے ہیں اور اجتماعی طور پر دفتروں کے احاطہ میں رکھ کر کام کر سکتے ہیں

۴۔ کسی ملازمتوں کا دو روزہ ہر ایٹیشن کے لئے بلا تفریق مذہب نسل کھلا ہوگا

۵۔ حق رائے دہندگی ہر شخص کو مساوی طور پر حاصل ہوگا اور وہ ریاست کے بڑے بڑے ہندسے تک پہنچ سکتا ہے۔

۶۔ ریاست کا کوئی مذہب نہ ہوگا۔

مذہبی حقوق :- ہر فرد بشر کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ نجی طور پر یا برسرعام اپنے مذہبی رواسم اور کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے اسی عام میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

۷۔ قانون کے آگے تمام مذاہب برابر ہوں گے خواہ وہ اکثریت کا ہو یا اقلیت

ہاگن سمندستان فیلسفہ

۲۔ کسی خاص مذہب کے لوگ اگر چاہیں تو اپنی مذہبی جائیدادوں اور ادوات کا انتظام خود کر سکتے ہیں۔ ریاست بھی سب امور اور مختلف مذہب کے لئے اپنے بٹ میں ایک سر رکھے گی جو ہر مذہب کے پیروں کی تعداد کے تناسب سے ہوگی۔

۳۔ کسی کو اپنے مذہب کے عقائد کے اظہار پر مجبور نہ کیا جائے اگر وہ اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتا۔

۵۔ مسلم پرنسپل لا، وراثت، طلاق، طلاق وغیرہ کے مقدمات کا فیصلہ کسی مذہب کی مخصوص شریعت کے مطابق ہی کیا جائے گا۔ کسی مخصوص مذہب کے لوگ اگر چاہیں تو اس کام کے لئے اپنی علیحدہ عدالت بھی قائم کر سکتے ہیں۔

نسائی اور معاشرتی حقوق :- ہر شخص جو زبان چاہے استعمال کرے اور

اگر ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہوئی تو وہ اپنے مرنے سے اپنے بچوں کے لئے مذہب سکول بھی قائم کر سکتے ہیں (بعض حکومتیں خود اس خرچ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتی ہیں جیسے ترکی) ۲۔ لیکن ریاست کی ایک واحد زبان ہوگی جسے تمام اقلیتوں کو ریاست کے تعلقات کے موافق براستعمال کرنا ہوگا۔

نسلی حقوق :- ۱۔ کسی خاص نسل کے لوگ محض اس لئے کم تر نہ سمجھے جائیں

۲۔ ہر نسل کو اپنی نسلی خصوصیات اور اپنے قومی تعلق کو محفوظ رکھنے اور اسے بڑھانے اور ترقی دینے کا حق حاصل ہوگا۔

غرضکہ یورپ میں مسئلہ اقلیت کی یہ نوعیت ہے اور اس طرح اسے حل کرنے

کی کوشش کی گئی ہے مگر پھر بھی بیس کا یہ سب سے بڑا الجھا ہوا مسئلہ ہی دیکھا

چنانچہ گذشتہ عالمی جنگ اسی اقلیت کے تحفظ کے بہانے شروع ہوئی اور اب

عام طور پر دنیا میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ اقلیت کا مسئلہ جس حد تک موجود ہے

اسے اسی حد تک پہنچا دیا جائے اور آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

چنانچہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ اکثریت کا موجودہ برابری اور اسی

بنیاد پر کہ وہاں کی اقلیت کی آبادی نہ زیادہ بڑھنے پائے اور اسی لئے یہ

تمام خودمختاری نکلیں ہیں کہیں آگے چل کر کہیں یہ بھی اقلیت کا مسئلہ نہ بن جائے

اسی طرح ہٹلر نے ایک ایسے درجن کی شہنشاہیت کا خواب دیکھا اور دوسری

نسلی اقلیتوں کو مغرب دہستی سے بچانے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ

اس طرح حل ہونے کا نہیں ہے اور نہ ملک کی تقسیم سے حل ہوا ہے۔ ملک کی

تقسیم کا نتیجہ یورپ میں بھی آزمایا جا چکا ہے اور ناکام ہوا ہے۔ بلقان کے ٹکڑے

ٹکڑے کئے گئے لیکن پھر بھی ہر ٹکڑے میں اقلیت کا مسئلہ موجود ہے۔

غرضکہ یورپ میں اب تک اقلیتوں کا مسئلہ حل نہ ہو سکا حالانکہ یورپ انتہائی

ملکوم علاقوں اور قوموں کو آزادی نصیب ہوئی۔ ہیل انقلابی حکومت کی طرف سے سینوں اور اسٹامین نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا۔

موس میں کبھی کسی مذہبی بنیاد پر کسی قومیت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ احمدیہ کسی علاقے کو روس سے علم کی کا اعتبار، ان معنوں میں حاصل ہوا جو ان معنوں میں پاکستان بنا۔ لہذا اس چیز پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

”مس کے مسلمانوں! کریمیا اور دوسکے تاناریو! ترکستان اور سائبیریا کے گورنر اور سائے قوم والو! مائے ناس کے ترک اور تاناریو تمہارے عقائد اور تمہاری قوم تمہاری تومی تمدن اور معاشرت اب آزاد ہیں اور کوئی ان کو نہیں لگا سکتا۔ تیس اب معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے ارد دیگر اقوام کے حقوق اب انقلاب کی طاقت میں ہیں۔ اٹھو اور اس انقلاب کی مدد کرو۔“

تاریخ شاہد ہے کہ سیاسی اور اسلامی نے یہ وعدہ ایفا کیا جس کے بعد دیکھے مختلف
 علاقوں کو حق خود ارادیت دیا گیا اور متحدہ مرکزی سمیت کی نگرانی میں مقامی جمہوریہ
 قائم کی گئیں مگر یہ خود ارادیت پاکستان کے مفروضہ تہتمی حرف تہذیبی مذہبی اور علاقائی مسئلہ
 میں ان علاقوں اور ریاستوں کو آزادی دینی گئی تھی۔ سیاسی اور اقتصادی اور میں متحدہ مرکزی
 حکومت کو پسے اختیار حاصل تھے اور اب بھی ہیں جب کبھی رجعت پسندوں نے اپنے
 بچے علاقوں میں ڈیڑھ انٹ کی مسہرنگ کھڑی کرنی چاہی تو ان کو سختی سے دبا دیا گیا کہ کسی
 ریاست کو یا اختیار نہ دیکھا کہ وہ اپنی بنیاد مذہب پر رکھے بلکہ اپنی کتاب میں اسلامی
 یا اسلامی جذبے کی شہید مخالفت کی ہے اور پانی اسلام ازم کی توہین ان الفاظ
 میں کی ہے۔ ”پان اسلام ازم۔ یہ حرکت اور تاریکی اور بچے طبقوں علاقوں یعنی
 خانوں تاجروں اور ملاؤں کو وہ سیاسی تحریک تھی جو سب مسلمانوں کو ایک
 مشترک زیادت میں متحد کرنا چاہتی تھی۔

• ایک قوم ایک ایسا گروہ ہے جو مشترکہ تاریخی مہدایات رکھتا ہو۔ اور
 جس کی زبان، وطن، اقتصادی اور نفسیاتی ماحول میں مناسبت اور اشتراک
 ایک مشترکہ تمدن کی شکل میں ظاہر ہو۔ (مذہب کا کوئی ذکر نہیں) ان اصولوں
 کے پس منظر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندو کی مسطرت مختلف علاقوں میں پھیل چوئی
 تھی۔ ہندوؤں کے عہد حکومت میں ہر علاقہ اور قوم پر ہندو زبان، ہندو تمدن کو پیروتا
 عالم کیا گیا تھا۔ جب آریہ کی حکومت ختم ہوئی اور انقلابِ ہندس نے دنیا کی تاریخ
 میں پہلی دفعہ ہندوؤں اور کسانوں کی حکومت قائم کی تو ہندوؤں کے بعد آریہ کے

123

مسلمان اور احساسِ کثرت

کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان اعلانات کے باوجود دوسرے ادھر اور ادھر سے ادھر انسانوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا اور قیل و غارٹ گری گئے اسے اس قدر التاک بنا دیا تھا کہ احساسِ انسان دو آنسو بھی نہ بہا سکے تھے۔

ہندوستان مسلمانوں کے توجہ قدم اکھڑے گئے تھے۔ ان کے سارے خواب بکھ جڑ چکے تھے اور آزادی کے بچس سال بعد بھی وہ اس سرزمین پر سنبھل سنبھل کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی بات پر اعتماد انداز میں نہیں کہہ پاتے:

گذشتہ ۲۵ برس میں مسلمانوں کے مسائل پر جتنی باتیں کہی گئی ہیں اور جتنا لکھا گیا ہے۔ اختصاراً دنیا کے کسی اور نسل پر نہ کہا گیا ہوگا اور نہ لکھا گیا ہوگا۔ لیکن مسلمان اپنے مسائل دوسروں کو سمجھانا تو دنیا کی خود ہی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ کیا مسلمانوں کے مسائل بس عارضی ہیں مناسب نامزدگی، مسلم یونیورسٹی اُردو (جو صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے) انسدادات سے نجات تک محدود ہیں؟

یہ کہنا بڑی سطحی بات ہوگی اور بد قسمتی سے ہم گزشتہ بیس بائیس سال سے اسی طرح کی سطحی باتیں کہتے آ رہے ہیں اور اصل مسئلے کو نظر انداز کرتے رہے ہیں مسلمان زمیندارانہ عدلی روایات کو بہت عرصے تک

سننے سے دکانے لیے اور اب تک وہ تاریخی طور پر خود کو ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کا وارث سمجھتے ہیں اسی لیے جب پچیس سال پہلے ذیلی براعظم کی نئی تاریخ کی ابتدا ہوئی تو ڈھسے سے مسلمانوں نے خود کو نہ صرف سامانی کے حکمرانوں سے کٹا ہوا پادریوں سے بلکہ انھوں نے فریضی رشتہ جوڑ دکھا تھا۔ بلکہ ہندوؤں کے مقابلے میں خود کو گنہگار سمجھ کر

● میں نے اپنے ایک ہندو سنی دوست سے کہا بدین زیادہ وطن پرست زیادہ دیر اور انسانیت پر زیادہ یقین رکھتا ہوں کیوں کہ تقسیم ملک کے بعد بدترین حالات میں بھی میں مایوس ہو کر وطن سے فرار نہیں ہوا!

● میں نے اپنے ایک مسلمان دوست سے کہا: ”مجھے اپنا شجرہ نسب نہیں معلوم، میرے پردادا سے پہلے ان کے اجداد ہندو تھے۔ یا آتش پرست میں یقین سے نہیں کہہ سکتا اور نہ میں نے کبھی اپنا فریضی شجرہ بنا کر پناہ دہشتہ کسی امام یا کسی خلیفہ سے جوڑنے کی کوشش کی ہے!“

ظاہر ہے ان دونوں نے مجھے ایک لمحے کے لئے حیرت سے دکھا ہمارے ملک میں آج کتنے مسلمان ہیں جو اس طرح کی بات کر سکتے ہیں؟ یہ کوئی بڑائی کی بات نہیں ہے۔ سچ بولنے کی جرأت، اگر ایک کوشش ہے۔ اور اگر ہم سچ بولنے پر آمیز آئیں تو خچ گولیاں تو بہت ٹنگا چڑی گی لیکن ایک ایسے موذی مرض سے نجات حاصل کر لیں گے جو آزادی کے بعد سے ہمارے سیاسی، سماجی حتیٰ کہ مذہبی جسم میں بھی ناسور کی طرح رکنے لگا ہے۔ یہ مودی مرض ہے۔

احساس سے کثرت

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو تاحظ اعظم محمد علی جناح کراچی میں اعلان کر رہے تھے کہ پاکستان ان سب کا وطن ہے جو یہاں رہتے ہیں اور ۱۵ اگست کو لال قلعے پر ترنگا لہراتے ہوئے قائد ہندوستان جواہر لال نہرو نے اعلان کیا تھا: ہندوستان ان سب کا وطن ہے جو یہاں رہتے ہیں چاہے ان کا مذہب، ذات، رنگ، نسل، زبان، بھگن کا مذہب، ستانی، سدر، نہر۔

مشن (مفسد) میں جتنے مصلحین اور جتنے صاف گو اور جتنے انسانیت پسند ہوتے ہیں اتنے ہی یہ ریاکار انسانیت دوستی سے دور اور محنت کشوں سے بیزار ہوتے ہیں اس طبقے کے جو لوگ سیاسی یا سماجی زندگی میں ہیں وہ لہذا ہر شے عزت دار ہوتے ہیں۔ اخبارات میں ان کے نام اور سرگرمیوں کی خبریں شائع ہوتی ہیں لیکن عوام سے ان کا کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں ہوتا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ عزت دار کتنے پانی میں ہوتے ہیں!! ظاہر ہے یہ طبقہ مسلمانوں کی رہبری کر سکتا ہے۔ ان کے مسائل سے کو کوئی سروکار رکھتا ہے۔ ہاں وقت ضرورت یہ طبقہ مسلمانوں کے نام پر چند زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنا ہے لیکن اس طبقے میں بھی کچھ دوسرے اور غلیص ہیں جو کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں، ویسے ان کا دائرہ عمل بھی محدود ہوتا ہے کیونکہ آبادی کے اس طبقے میں کوئی کتنوں کا مددگار نہایت ہو سکتا ہے۔

پھر یہ طبقہ بھی اپنے سے بڑے صنعتی کاروباری یا تجارتی اداروں کے مقابلے میں احساس کتری کا شکار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، ہر لانا، لانا، وقت مال، ہندو مالٹہ ہندو را اور دوسرے پچاس ساٹھ صنعتی اداروں کے مقابلے میں اس کے ادارے بڑے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا ہم طبقہ علماء کا ہے جسے قومی میدان میں سچا، میرا، بے خوف رہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن عام مسلمانوں کو سب سے زیادہ اس طبقے نے مایوس کیا ہے۔ علماء گفتارِ ملک کے سلسلے میں اپنی ساکھ ہی نہیں جاتے ہوئے ہیں اپنا مرنے والا بھی حاصل کرتے ہیں۔ بیش و فراز کی طرح ان کے بھی۔ ریش ہیں۔ جو جتنا گرم گفتار ہوتا ہے لوگوں پر اتنا ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اسی کے لحاظ سے اپنی فیس وصول کرتا ہے۔

سب سے بڑی قباحت فرقہ بندی ہے۔ جو علماء کو ایک دوسرے کے مسلک کے خلاف بولنے پر اکساتی ہے علماء بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو قدم بہتر فرقوں میں بٹی ہوئی ہو اسے ایک لڑائی میں کیسے پروا جاسکتا ہے لیکن ہم نے بھی یہ نہیں سوچا کہ اسلام کے بنیادی عقائد کو تسلیم کرنا کے تمام فرقہ بندیوں کو ختم کر دیں۔ اور صرف مسلمان باقی رہ جائیں۔ یہ دہائی خان جو کھانا کھاتا ہے۔ کیونکہ کسی خاص مسلک کے ماننے والے کو یقیناً رسومات کی ادائیگی سے روکنے کی کوشش کرنا سادہ و سہل نہیں ہے۔

دینے کے برابر ہے، کوڑے۔ عرس، فاتحہ، قبر پرستی، شہنشاہی، غوریز، گنڈہ، تہذیب داری وغیرہ آج مسلمانوں کی اکثریت کے لئے اسلام کا جوہر بن گئی ہیں۔ اتھ بڑی تعداد میں لوگ ان رسومات کو انجام دیتے ہیں کہ انہیں اس سے دو کنا نامکن نہ نظر آتا ہے۔ پھر ان رسومات کو بہت عظیم الشان کی حمایت بھی حاصل ہوتی ہے اس سلسلے میں صرف جماعت اسلامی کی جرأت مندانہ کوششوں کی داد دی جاسکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس معاملے میں عقل سلیم رکھنے والے تمام مسلمانوں کو تعاون بھی کرنا چاہیے۔ (جماعت اسلامی کی سیاست اور دیگر نظریات کے باوجود)

اس سلسلے میں بھی یہ عرض کرنا باقی ہے کہ ہر مسلک کا عالم احساس برتری کا شکار ہوتا ہے جو دراصل احساس کتری کا دھڑکا نام ہے۔ کیونکہ وہ خود کو نفع مند اور دوسروں کو کمتر سمجھتا ہے، حدیث ہے کہ ایک دوسرے کو سرعام بدعتی گرداننے سے بھی گریز نہیں کرتا! علماء کی ذمہ داری یہ ہے کہ یا درودہ کر کیا عام مسلمان خود مذہب اسلام کی صحیح اقدار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر سکتا؟ یہاں سوال پھر اس کی کیا گنجائش ہے چارگاہ اور کیم علی کا آجاتا ہے۔ اور یہی جڑ ہے۔ عام مسلمان کی کردی یا اس کے احساس کتری کی!

ہمارے علماء شاید جانتے بھی نہیں ہیں کہ دینی اور دنیاوی دونوں معاملات میں عام مسلمان بڑی حد تک لاعلم ہے تاکہ ہر کھوٹے، بڑے معاملے میں ان کی ہر نقد و رائے کا محتاج رہے۔ اور وہ جو فترے صادر کرتے رہیں ان کو بلا جوں و چرا تسلیم کرتا رہے۔

اس لئے آج کے مسلمانوں کا استحصال جس آسانی سے ہمارے علماء کر سکتے ہیں اس آسانی سے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بعض نے تو مذہب اور سیاست کے رشتے کو اٹوٹ بنا کر خوب خوب فائدہ بھی اٹھایا ہے ہمارے علماء کے ساتھ ایک شکل یہ بھی ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ آج کی خاصی پیچیدہ سیاسی سماجی اور معاشی صورتحال کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے، اس لئے ان کی نصیحت کا سارا زور اس بات پر صرف ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں نے دین کو نظر انداز کر دیا ہے اور وہ دنیا کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔

ان کے نزدیک دین صرف پانچ وقت اللہ کو یاد کر لینا ہے۔ ان

کے نزدیک دین صرف پانچ وقت اللہ کو یاد کر لینا ہے؟ یقیناً یہ فرق ہے لیکن کیا اس سے دنیاوی مساکی خود بخود دخل ہو جائیں گے؟

● ایک بڑے شہر میں مغرب کے وقت ایک نوجوان گزبھوٹ افغان دسے رہا تھا۔ اکون ہے جو اسکو دھانہیں دینگا۔ اور اس کے جذبہ دین کی تعریف نہ کرے گا۔) اذان ختم ہوئی تو میرے بزرگ دوست نے انکشاف کیا کہ یہ نوجوان پانچوں وقت اسی طرح اذان دیکر اللہ کے بندوں کو نماز کے لئے بلاتا ہے۔ لیکن اس نوجوان گزبھوٹ نے اس عرصہ میں کبھی ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ بے روزگار گزبھوٹوں کے لئے سرکار کی بہت سی اسکیمیں ہیں اس کے اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی اور جب بھی موقع ملتا ہے وہ آکر یہ شکایت کرتا ہے کہ مجھے ملازمت نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا کیا ملازمت تمہارے گھر کے دروازے پر آکر پیشکش کر چکی کہ یہاں آجاؤ یہ جگہ خالی؟

یہ سچا واقعہ ہے اور کہتے ہی نوجوان ایسے ہوں گے جو یہ سوچتے ہوں گے کہ گھر بیٹھے آسان سے ملازمت ان کے پاس آجائے! میرے دوست ذرا تیز قسم کے آدمی تھے، اس لئے انھوں نے خامی کھنی تھی کہ یہ عمر بھر اذیتیں دیتا رہے گا۔ اور دوسرے فرقے کے لوگ ملازمتیں حاصل کرتے رہیں گے۔!

عام مسلمانوں کو تو چھوڑیے چھوٹے مسلمان بھی اپنے ہندو واقف کاروں بلکہ دوستوں تک سے - دل کی بات کہنے سے بچکھاتے ہیں اور اکثر کہہ نہیں پاتے موضوع اگر فرقہ دارانہ فساد یا پاکستان کی سیاست ہے تو وہ اس احتیاط سے بات کر دیتے جیسے ان کے ایک ایک لفظ کو توجہ دلانے والا ہر اہل اپنی کمی ہوتی ہر بات کا ان سے جواب طلب کیا جانے والا ہو۔!

ہم دراصل ہندوؤں کی زیادہ قربت سے لڑتے ہیں ہم انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لازمی طور پر وہ بھی ہم پر پوری طرح بھروسہ نہیں کرتے۔ لیکن جہاں کہیں ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ کر لیا جاتا ہے گھریلو تعلقات قائم ہو جاتے ہیں ایک دوسرے کے لئے ہر مصیبت برداشت کرنے پر قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے ہم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حکومت پاکستان کی توجہ

بہی بی بی میں نہیں دوسرے شہروں میں بھی عام طور پر مسلمان ایسے علاقوں میں رہائش اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ کوئی ہندو بھی شاید خالص مسلم علاقے میں رہائش اختیار کرنا مناسب نہ سمجھتا ہو لیکن ملی جلی آبادی والے علاقوں میں ہم کیوں نہیں رہ سکتے۔؟ فسادات کا کیا ہم اتنا گہرا اثر لیں کہ علیحدہ علیحدہ بستیاں بسنے کو ٹھیک سمجھیں۔ دراصل یہاں بھی ہم ہندو اکثریت کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ حکمران طبقے میں ان کی اکثریت رہے گی۔

ہم مسلمان دراصل ایک عام قلعہ نہیں کاٹسکار ہیں۔ کہ ہندو کو ہم حکمران طبقے کا فرد سمجھنے لگے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہندو خود ہماری طرح عام شہری ہے اور جو لوگ ہندوؤں کو جانتے ہیں۔ ان سے قرب حاصل ہے۔ ان کا اعتماد حاصل ہے۔ وہ اس بات کی نگاہی دیں گے کہ ہندوؤں کو حکومت سے ہم سے زیادہ شکایتیں ہیں۔ آزادی نے انہیں نڈر بنایا دیر بنادیا اور وہ سرعام ہر بات کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں ہندوؤں کے ہم سلیم تو دور کی بات اپنی عقل میں بھی چاروں طرف دیکھ کر اپنی بات کہتے تھے۔ اب خیر سے آزادی کے تقریباً ۲۰-۲۲ سال بعد ہمیں اپنی زبان واپس لی گئی ہے یعنی بولنے اور لکھنے میں اب ہم پہلے کی طرح بچکھاتے محسوس نہیں کرتے۔ آزادی کے بعد سے پاکستان ہماری سب سے بڑی گزروہی رہا ہے۔ لیکن ہم نے کبھی اسکا اعتراف نہیں کیا۔ آزادی کے بعد کے کچھ برسوں میں تو ظاہر ہے۔ پاکستان کا نام بھی ہم دہی زبان سے لیتے تھے لیکن اب بھی ہم کھل کر یہ کہنے کو جرأت نہیں کر پاتے کہ پاکستان سے ہماری خصوصی دلچسپی اس لئے نہیں ہے کہ وہ مسلم ملک ہے اور اس کی تشکیل میں ہمارا بھی بھڑا بہت ہاتھ رہا ہوگا۔ بلکہ اس لئے ہے کہ وہاں ہمارے بیشتر خاندانوں کے کچھ لوگ چلے گئے تھے۔ اور ہماری دلچسپی پاکستان سے شیعان و گروں سے ہے۔ وہ جو ہمارے بھائی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہو سکتی ہیں۔ اور دوسرے قریبی عزیز ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم میں سے بیشتر نے لاہور دیکھا ہے، نہ راولپنڈی، نہ کراچی، نہ ہم وطن کی آب و ہوا اور وہاں کے باشندوں سے واقف ہیں اور نہ ہی ہمارا واسطہ وہاں کی کسی حکومت حکومت کے سربراہ یا کسی ایڈمنسٹریٹو ہائر عہدیدار کا رقبہ کی دہانے کے صوبہ پاکستان سے دوگنی

اور اچھے تعلقات کی جتنی شدید خواہش ہیں۔۔۔ اتنی پاکستانی حکومتوں سمیت کسی کو نہیں ہے، ہم، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان میں اس لئے پاکستان کو آزادی کا خیال ہی ہم پر چھپا کر دیا جاتا ہے (بلادیہ کے پاکستانیوں کو ان کو ان کے خاص فوائد میں ہیں لیکن ان کی اکثریت جاہل ہے۔ اس لئے انہیں معاف کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ شاید کسی دن یہ ہو جائیں کہ جس میں سے وہ پیدا ہوئے ہیں۔ وہی ان کی آخری پناہ گاہ ہوگی

● ہندوستانی مسلمانوں کی صبح رہبری دانشور ہی کر سکتے تھے اور وہی کر سکتے ہیں۔۔۔ "ملازم" اور اس میں کتری کے تاریک غار سے ہوا لوگ نکال سکتے تھے۔ لیکن جذباتی مسلمان جو صرف غروں سے بہک جاتا ہے۔ کسی دانشور کی بات کو منسلک ہی سے تسلیم کر سکتا ہے اور ہمارے دانشور سیاسی دلال اور گندگی سے دور رہ کر خاموش تماشائی بن کر رہ گئے۔ شاید کسی دن یہ المیہ مت ہوگا اور مسلمان اس کا

کتر کر کے یاد دے کر آتا دیکھئے گا، اور اس کی سیاسی۔ سماجی۔ ثقافتی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔۔۔۔۔!

لیکن اس کے لئے اہم شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے مسائل کو ایک تھک کر کے پیش کرنا ترک کر دے، اس طرح ہوتا یہ رہا ہے کہ اکثریت مسلمانوں کے مسائل کو قومی مسائل نہیں سمجھتے بلکہ کچھ مسائل سمجھتے ہیں۔ اردو جیسے لسانی مسئلہ کو بھی فرقہ دارانہ سمجھنے لگتی ہے۔

فرقہ پرست ہندو لیڈر یہ الزام لگا کر اور غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ مسلمان خصوصی مراعات چاہتے ہیں۔ ہمیں مسلمانوں کے مسائل کو مفاد خواہی کے انداز میں پیش کرنے کا طریقہ ختم کر کے انہیں ہندوستان کے شہریوں کے قومی مسائل کی حیثیت سے پیش کرنا ہوگا۔۔۔ "م" مسلمانوں کے مسائل سے الفاظ ترک کر کے جس دن انہیں قومی مسائل بنا کر پیش کریں گے ہم خود میں بھی تبدیلی عکس کریں گے اور حکومت اور اکثریت کے رویے میں بھی!

چالاک، عیار اور دنیا دار علماء

نادۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن خیال علماء کی جو حالت منکشف ہوئی کیرا۔ شبیں ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حسن ظن تھا اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوس اور طبقہ علماء کی طرف سے سخت دہشت پیدا ہوگئی۔ مخالفین ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اور کہہ رہے تھے ان کی اہمیت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں۔ لیکن جو لوگ ندوہ سے کئے لئے سرگرم تھے ان کی بھی عجیب حالت نظر آنے لگی۔ بڑوں کو پانچ چھ پہینے تک ان سرگرمیوں کو قریب سے دیکھتا رہا۔ اس لئے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔

میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیا داروں کی سی کارروائیاں کی جا رہی ہیں، اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لئے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامی کرنے کے لئے ہر طرح کی غیاریاں کی جاتی تھیں اور عوام پر اپنا اثر قائم کرنے کے لئے مصنوعی حالتیں اختیار کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک دامعظ نے ندوہ کے ایک سرگرم تاجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلس و غلامیوں کو ان کو اظہار جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکہ آخر میں نالودیکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہوگئی۔ اس کے بعد اعلان ہوئے جو ہی فتویٰ کی ایک حکایت شروع کی دوسرے اصحاب نے سنا کھڑے ہو کر حال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اس سے مجلس میں بڑی وقت طاری ہوگئی اور اس قدر آدھ بکا ہوگا کہ اس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اسی طرح کی بیسیوں باتیں رفتیں دیکھتا تھا اور میرے دل میں روز بروز اس طبیعت کی طرف سے دہشت بڑھتی جاتی تھی۔

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۱۹

مولانا ابوالکلام آزاد

مسلم خواتین مستقبل کا انحصار

کی تعلیم بعض وجوہات کی بنا پر زیادہ ضروری ہے جب تک ان میں پڑھی لکھی باشعور باسیلہ نہ ہوں۔ ان کی آغوش میں بچوں کی بدورش اچھی طرح سے نہیں ہو سکتی۔ بچوں کیلئے آغوش مادر ہی پہلی درس گاہ ہے۔ اگر پہلی اینٹ صحیح نہیں رکھی گئی تو عمارت کی کی لارنی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمارے مستقبل کی درخشندگی کا انحصار بہت کچھ عورت کی تعلیم و تربیت پر ہے۔ عورت وہی ہے! باصلاحیت اور مائبہ انسان بنے ہوئی ہے۔ عورت ہے کہ ان خوبیوں کو بروئے کار لانے کا اسے موقع دیا جائے پھر دیکھئے کہ یہ چنگاری کس طرح شعلہ فتنی ہے اور اپنی آئینہ کی عبادت مند کو کس طرح روشن کرتی ہے۔

جب ہم ہندوستان کی تاریخ کے صفحات اٹھتے ہیں تو ان اداق مسلم خواتین کے نزدیک کڑا ہے کبھی بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں مسلم خواتین عالم و فاضل رہی ہیں مسلم خواتین نے اپنے تہذیب و سیاست مافی اہد ذہانت سے ان شکل مسائل کو حل کئے جہاں بڑے بڑے دانشوروں کے بھیر چلتے تھے مسلم خواتین کے سر پر حکومت کا آج رہا۔ ایدیدان جنگ میں فوج کی قیادت کی۔ رضیہ سلطانہ نورجہاں چاند بی بی، گبدن جہاں آرا، زینت محل وغیرہ نام غالباً ہر کسی کے حافظ میں محفوظ ہو چکے۔ جنگ آزادی میں مسلم قائد اور رہنماؤں کی اچھی خامی تھی اور نظر آنے لگی۔ غور کیجئے تو یہی مشوق اس پر وہ نہنگاری میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ کیوں کہ جب تک گھر میں عورتوں کا تعاون حاصل نہ ہوں انسان سکون

قبل از اسلام عورت کی حالت یہ حد و ذاک اور دلہند تھی۔ نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی عورت کسمپرسی کے عالم میں پڑی تھی۔ دل بہلانے کا وسیلہ بازار میں خرید و فروخت کی جنس لگن ہوں کی ماں برائی کی بیوی بننے میں راسخ نہ تھیں۔ شے مرد کی معیبت کا سبب وغیرہ عورتوں کے خطاب و وقاب تھے۔ اسلام کی دنیا پائشی نے عورتوں کو بھی مستغنی کیا اسے ذات و خواری سے نکال کر ہندی و رفعت عطا کی۔ تہذیب و تمدن کی تشکیل میں اسے حصہ دار و کمال کا سبب بنی۔ گویا عورت کے حقوق کا تعین و تحفظ اسلام میں بخوبی کیا گیا ہے اسے جو حقوق دئے گئے ہیں وہ عین فطرت کے مطابق ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس پس ماندہ منصف کو وہ ہندی و رفعت، عظمت و شکوہ، جلال و مرتبت عطا کی گئی کہ وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آنے لگی۔ بلکہ اس کے قدموں کے تلے جنت کا خرہ ناکر مردوں کیلئے اسے قابل رشک بنا دیا گیا۔

مگر آج جب ہم یہاں مسلم خواتین کی حالت پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بڑی ایسی ہوتی ہے۔ گتا ہے جو حقوق ہم کو ملے ہیں ان کی صحیح قدر قیمت نہیں جانی اور انہیں محفوظ رکھنے کے جتن کئے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کا تناسب کم ہے۔ اللہ حمد بھی اسی بیماری کا شکار ہے۔ اسلام نے علم کے حصول کیلئے ہمیں تک جاننے کی ہدایت کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ صرف دینی علم ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے حصول کی تبلیغ بھی ہمارے مذہب میں کی گئی ہے۔ عورت کو اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ عورت

فہم کا منصب شافی سلمان شہید

اطمینان حاصل نہیں کر سکتا مگر جنہم کا مذہب بن جاتا ہے۔ وہ ذہنی طور سے پر آگندہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے پر آگندہ دل دماغ نہ خود کو سمجھا سکتا اور نہ دوسری کی کشتی کا پتہ دے سکتا۔

آج کے دور پر نظر ڈالنے آپکو زندگی کے ہر شعبے میں دوسری خواتین کے دوش بدوش مسلم خواتین بھی نظر آئیں گی۔ ڈاکٹر، انجینئر، منسٹر، پکوری، سائنسدان، معتمد، مدیر، مشاعرہ اور کچھ شعور و شعوریت، بحیثیت آئیئر آپ انہیں پائیں گے۔ فائین آرٹس اور کمپس کے میدان میں بھی مسلم خواتین کے نام نظر آتے ہیں لیکن اس بات کا اعتراف کرنے میں قطعی جھجک نہیں ہے کہ یہ تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم عمل جہد و جہد اور تیز رفتاری سے کام لیں اور زمانہ جو کہ قیامت کی چال پل رہا ہے اس کے ساتھ ڈر سکیں۔ اسی تیز رفتاری، تندہی، مسلسل جہد و جہد سے ہمارے مستقبل کی اتنا بڑی وابستہ ہے۔

آزادی کے بعد مسلم خواتین کو جتنی تیزی سے ابھرنے پائے گئے تھا وہ نہ ابھر سکیں۔ سچ پوچھ تو اس کی راہ میں کمی دلواریں حاصل رہی ہیں سب سے پہلی کاوش مرد پر دھبہ۔ ہمارے مذہب نے پردے کا حکم ضرور دیا ہے مگر ہندوستانی خواتین نے جو پردہ اختیار کیا ہے اس میں اسلامی اثرات سے زیادہ مغربی اثرات پائے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ ہم نے ان اثرات کو اپنے مزاج کا جزو بنالیا۔ لیکن جن کے یہاں سے یہ اثرات ہمارے یہاں دے آئے انھوں نے غور و خوض کے بعد پردہ ترک کر دیا۔ یہ ہماری بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ جن کی تعلیم نے ان کی انھوں نے خود کو ان ذہنیوں سے آزاد کر لیا۔ اور ہم گرفتار نفس ہی رہے۔ اس مرد پر دے کی وجہ سے مسلم خاتون آگے آنے سے جھجکتی رہی۔ یہی پردہ اس کی ترقی میں سد راہ رہا۔ پس پردہ ہونے کی وجہ سے اس میں جہت و ہمت پیدا نہ ہو سکی۔ شاید بے کافقدان رہا۔ تجربے سے محروم رہی اور اخلاقی و اصلاحی رجحانات سے بے بہرہ! نتیجہ وہی ہوا جو لادنی تھا اور جو ہمارے سامنے ہے۔

جہاں تک مغربی تعلیم کا سوال ہے وہ اس میں کمی صدی بچے رہی۔ اس کی وجہ ہماری تعلیم پرستی ہے مگر تادی سے پہلے انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہمارے بعض چھٹن کا فائدہ ستانی سلطان شہزاد

رہنماؤں نے مغربی تعلیم سے خود کو مزین کرنے کی تبلیغ کی۔ تاکہ دنیا پر سوار ہو سکے اور دنیا کے ستارے سے آخرت بھی مسخ نہ جلائے۔ مگر فاضلین نے اسے مغرب پرستی اور غلامانہ ذہنیت سے تعبیر کیا۔

اور یہ اثرات کافی دیر پا اور دور رس ہوئے۔ جب مردوں کا مفہوبی تعلیم حاصل کرنا پڑی تو بھروسہ دیکھا جاتا تھا۔ تو عورتوں کیلئے مغربی تعلیم کا حصول بے شمار دشوار تھا اس لئے وہ پیچھے رہی۔ میکینیکل تعلیم کا بھی یہی حال ہے۔

پہلے خیال میں فائن آرٹس کا شعبہ ہی ایسا شعبہ ہے جس میں مسلم خواتین کی تعداد اچھی خاصی رہی ہے۔ موسیقی، رقص اور کاری میں ان کے جوہر کچلے اس سلسلہ میں ان کا نام بہار دانگ عالم مشہور ہوا اور آج جی ان کے فن کا لوہا مانا جاتا ہے۔

ہیں غور کرنا ہے کہ ہماری خواتین کیلئے کون سا لائحہ عمل پیش کیا جائے جس پر عمل کرنا ان کا مستقبل محفوظ ہو سکے، بلکہ اتنا بڑا اور خوشندہ بھی بن جائے۔ سب سے ضروری چیز تعلیم ہے تعلیم کے حصول کے وقت اس نہ صرف اپنے ذہن کے دروازوں کو کھولنے کی ضرورت ہے بلکہ دل کے دروازے بھی کھلے رکھنا ضروری ہے۔ تعلیم کا مقصد سرور و شان دہی کیلئے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد صحیح معنوں میں انسانیت کی جلا اور اخلاقی اقدار سے آگاہی حاصل کرنا ہے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں خلوص و محنت ہی برتاؤ ہے۔ عورت کے فرائض بلند و عظیم ہیں لیکن بڑے پیچیدہ بھی۔ وہ کہیں بیٹی ہے تو کہیں ماں، کہیں بیوی ہے تو کہیں بہن۔ اور ان تمام حیثیتوں سے اس کے فرائض مختلف اور مشکل ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ لیکن جب ہم عورت کے جذبات اور احساسات پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ذکی الحس ہے، محبت و راحت کا پیکر ہے۔ اور شفقت و مروت اس کی فطرت ثانیہ۔ ان خوبیوں کی بدولت وہ اپنے فرائض کو ادا کر سکتی ہے۔ اگر وہ خود کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے اور دیانت کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں نہجک ہو جائے تو ہماری ملت کی فلاح و بہبودی، مروجہ کمال یعنی ہے تعلیم کی اہمیت کا ہمیں احساس نہیں جس کی وجہ جہالت

کبھی جاسکتی ہے۔ یہ جہالت کیسے دور ہو؟ اس کے لئے ضرورت ہے اس بات کی کہ ایسی خواتین جنہوں نے تعلیم حاصل کی ہے جو دلور اور دردمند ہیں جو حقیقت میں حقیقت شناس بن چکی ہیں وہ آگے آئیں پس ماندہ طبقوں میں تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا کریں۔ انھیں اپنی حالت زار سے آگاہ کریں۔ ان کی صلاحیت کو بروئے کار لانے پر اکسائیں۔ ان کے جوہر کو تاباک بنائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس طبقہ میں احساس کتری زیادہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے بھی ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں تعلیم یافتہ بہنوں کو بڑی کٹاؤ دہلی اور دوست قلبی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اچھے گھر کے کام کیلئے پہلا قدم بڑھاتے ہیں تو تریف و تحسین تو کم ہوتی ہے۔ سختہ جینی اور گرفت زیادہ۔ لیکن قوم کے عروج کی خاطر ہمیں اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ جب پس ماندہ طبقہ کی کچھ خواتین بڑھ کھ جائیں تو اپنے طبقے سے نفرت نہ کریں۔ اور ان سے دوری بھی اختیار نہ کریں۔ بلکہ ان ہی میں شیر و شکر ہو کر ان کا دکھ درد محسوس کریں انھیں پیار و محبت سے اصلاح کی طرف متوجہ کریں یہ کام دشوار ضرور ہے مگر غلطیوں اور محبت یقین اور اعتماد کے آگے بڑی بڑی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں پس ماندہ طبقے کی حالت پچھلے افسوس ناک ہے۔ جس محلے میں یہ پس ماندہ طبقہ رہتا ہے اس کی حالت خستہ۔ پانی کے نکاس کیلئے ڈریسٹج صوفہ منصوبہ کی بجائے جھوٹی ٹھوٹی گندہی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ بچے اسکول جانا تربیت پانے کی بجائے آپس میں گالی گلوچ کر رہے ہیں۔ آپس میں پیار و محبت کے بجائے پتنگ اور کپڑا بازی پر تھکے ہوئے ہیں۔ پان کھاتے ہیں اور دونوں لبوں کے گوشوں سے پان کی لالی بھاٹکتی ہوئی فریاد کرتی ہے! اے ہت ہمارے پس ماندہ طبقے کا محلہ۔ اگر ہم میں اپنی حالت زار کا احساس بیدار ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے یہاں کے کارپوریشن میونسپل اور اسی قسم کے ادارے ان کی طرف توجہ نہ دیں۔

اس سے پہلے لکھا جا چکا کہ مرد پر پردہ ہماری ترقی کی راہ میں روکاؤٹ ہے۔ خوش قسمتی سے ایسے خاندان کی لڑکیاں (جو پردے کے پابند ہیں) کا لٹریچر یا تو یہی جانی

ہوگا کہ انہیں ستانی نہیں

میں تو عجیب مذہب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ پہلے محلے سے تو نقاب ڈالے نکلتی ہیں لیکن جہاں محلے کی سرحد ختم ہوئی رنج و شوق کو نقاب سے آزاد کر دیتی ہیں۔ اس سے ان کی شخصیت اور سیرت پر برا اثر پڑتا ہے۔ ریا کاری پیدا ہوتی ہے اور جھوٹ بولنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ چھپ چھپ کر کام کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے جس کی وجہ سے غلط راہ اختیار کرنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن آپ کی فضا دیدیکھے غلطیوں کے امکانات کم سے کم ہوتے جاتے ہیں گے۔ اسی پردے کی وجہ سے وہ دوسرے معاشرتی اور سماجی کاموں میں حصہ نہیں لے پائیں جہاں آگے بڑھنے کے مواقع ہیں۔ وہاں کبھی پردہ، پردہ بن جاتا ہے۔ اس لئے یہ خیال ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح اس مرد پر پردے دست بردار ہو جائیں۔ اگر ہماری بچیوں کو صحیح تعلیم دی گئی ہے اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ذہن نشین کرادی گئی ہے 'جاکے زیور سے مزین کر دیا گیا ہے تو بے پردہ ہو کر بھی شریف، با وضاحت اور رکھ رکھاؤ والی ہی ہوں گی۔ لیکن وہ ان اوصاف ہی سے محروم ہیں تو لاکھ پردے میں رکھیں بولائیاں غالب آہی جائیں گی۔

مسلم خواتین کیلئے میکنیکل تعلیم کیلئے مزید سہولتیں فراہم کی جائیں۔ ڈاکٹری، انجینئرنگ، سماجی بھلائی وغیرہ کے شعبے میں ان کی تعداد کافی ہونی چاہیے۔ تاکہ باہر اس شہرہ صحرے کے۔ اگر اس قسم کی تعلیم دی گئی تو فلاحیت کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی آج کا دور اقتصادی لحاظ سے پچھلاؤ کا ہے۔ وہ دور نہیں کہ صرف مرنے والے پر کفالت کا بوجھ ڈالا دیا جائے۔ جاری سماجی ضروریات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ خیر احادی میں توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں تعلیم کے بعد فلاحیت کی جائے تو مفاد پر نہیں۔ بلکہ اس سے زندگی میں خوش گواری ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس دور ہری ذمہ داری کو نبھانے کیلئے عورت کو دوسرے ممبر اور محنت کی ضرورت ہوگی۔

اب آئیے فائن آرٹس کی طرف۔ انسان کا سب کچھ اس کا جسم ہی نہیں۔ بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ جسمانی اور مادی ضروریات کے علاوہ بھی وہ کچھ چاہتا ہے۔ آپ اسے ذہنی تسکین کہہ لیجئے۔

ہی ہاں روحانی بھی۔ اس تسکین کو وہ فائن آرٹس کے توسط سے حاصل کرتا ہے۔ آج اس مشین اور سامان سے وہ میں بھی انسان اس تسکین کا خواباں نہیں بلکہ اس کی جستجو میں سرگرم بھی ہے۔ میرا خیال ہے مسلم طبقے میں اس شعبے میں صرف شادی کو چھوڑ کر وہ آرٹس کو تسلیم نہیں کیا ہوگا۔ آج بھی صرف ادنیٰ طبقہ ہی اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ غرض کہ چکی ہوں کہ فائن آرٹس کے شعبہ میں مسلم خواتین کا تناسب زیادہ ہی ہے اس لئے زندگی کے اس شعبہ کی طرف سے تو اطمینان ہی ہے لیکن اس طبقے کی مسلم خواتین پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں لیکن اپنے دل میں ان خواتین کا خیال رکھیں جو آواز ہوا میں سانس لینے کو ترس رہے ہیں۔ فن کار خواتین ایسی خواتین کی مالی امداد کر سکتی ہیں کیوں کہ فائن آرٹس میں جنہوں نے کمال حاصل کیا ہو۔ دولت ان کے مدد کی پاس بانی کرتی ہے۔ اگر وہ اپنے فنوں اور اخراجات کو ہر طرف کر کے مسلم بچیوں کی تعلیم و تربیت کیلئے وقف کر دیں تو یہ بھی ان کی تسکین کا سبب بن سکتا ہے۔

انٹرکینول میریج کے سلسلے میں میں یہی کہوں گی کہ یہ صرف ان لوگوں کا حق ہے جو اعلیٰ سوسائٹی کے افراد ہیں ایسی سوسائٹی میں اس قسم کی شادیوں میں مصوب نہیں سمجھی جاتی ہیں اور نہ ان سے بڑے تانے بچے برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن متوسط طبقے میں ایسی شادیوں کے تانے بچے خطرناک ہوتے ہیں۔ غیر مذہب کی لڑکی یا لڑکے کو خاندان والے قبول نہیں کرتے۔ اگر شادی ہو بھی جائے تو ان کے بچوں کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ بھولسی شادیوں پر کیونل فساد بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ مسلم خواتین اس سلسلہ میں محتاط رہیں تاکہ ان کے مستقبل کی ترقی پر بے اثرات نہ پڑیں۔

ایسی خواتین جو مالی فکروں سے آزاد ہیں میرا مطلب جو ملازمت کے بنجال میں گرفتار نہیں وہ وقت نکال کر سماجی اصلاح و بہبودی کے کام کر سکتی ہیں۔ غیر مسلم خواتین کے کئی امدارے ایسے ہیں جہاں غریب عورتیں دستکاری صنعت اور چھوٹی موٹی کمپنیاں بڑیں بناتی ہیں۔ انہیں فروخت کیا جاتا ہے اور اس طرح ان کی بڑھتی

تھکن کا مندرستائی مسلمان نہیں

ہمارے یہاں ایسے اداروں کی سخت ضرورت ہے۔ جو عورتیں اس قسم کی سوشل سروس کیلئے نہیں انہیں میں بتا دوں کہ ہمارے یہاں سمائے کی فراہمی مشکل مرحلہ نہیں۔ روحانی فیدی و کاہ اہل نصاب پر واجب ہے۔ لوگوں کو ایسے اداروں کی طرف توجہ دلائی جائے اور اہل نصاب افراد فریادیں دس پانچ پانچ روپے دینے کے بجائے ایسے اداروں کو دیں گے تو زیادہ غصیدہ نتائج برآمد ہوں گے اور بہترین صرف ہوگا۔ اسی طرح اذکار سے بھی دقتا فوقتاً مسدود دی جاسکتی ہے۔

مسلم خواتین میں جو خرافات ہیں بند ہونے چاہیے۔ جو فضول خرچیاں ہیں اس کی مذمت کر کے انہیں روکا جائے تاکہ رقم کسی مجمع اور غصیدہ صرف میں لائی جائے۔ مختلف خواتین مل کر انہیں بنائیں جہاں گھر بلوغت کی تربیت دی جاسکے اور جہاں غریبوں کی امداد کے مواقع فراہم ہو سکیں۔

اگر ہم میں دل سوزی ہے ملت کا درد ہے۔ ہم محنت اور خلوص سے کام کرنے کی طرف راغب ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا مستقبل تابندہ بلکہ تابزور تر ہو سکے۔

قیسہ زار

شکوہ زار کے بعد

لالہ زار

اردو کے جانے پہچانے اور نئے مزاج نگار

خواجہ عبدالغفور

کا ایک دل خوش کن کتاب

قیمت - 5 روپے

مطالعہ آفرین 200

ہندوستانی مسلمانوں کے چند اہم مسائل

کے مسائل نہ صرف ان کے امدان کے مالک کے لئے بلکہ عالم اسلام اور دنیا کے لئے بھی کس قدر اہمیت رکھتے ہیں؟ تاریخی نقطہ نظر سے ہندوستان میں مسلمان جن مسائل سے ۱۹۴۷ء کے بعد دوچار رہے ہیں وہ دیگر مالک کے مسلمانوں کے مسائل سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نہ ہندوستان بلکہ دنیا کے اکثر مالک میں مسلمان یا تو حاکم رہے ہیں یا محکوم۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کو یہ آئینی موقوفہ کے تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہونے کے باوجود وہ اپنے ہم وطن ہند اکثریت کے ساتھ ملکر ملک کا سیاسی اقتدار سنبھالیں۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی بھاری اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے اور ہندوستان کی حکومت لادینی یا سکولر بھی جاتی ہے جس کا بنا پر اکثر مسلمان یہ اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر حکومت مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی معاملات میں دخل دینا شروع کر دے تو مسلمان اقلیت کی اپنی مذہبی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ لہذا مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ حکومت ہند مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں دخل دے۔ لیکن مسلمانوں کے اس نظریہ کو حکومت کے تسلیم کرنے کے بعد لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کے دیگر فرقوں کے ساتھ آئینی لحاظ سے سماجی طور پر برقی کا منہ کھولنے کی طرف گامزن ہونے کیلئے خود کون سا مناسب و معقول طریقہ کار اختیار کر لیا جاسکتا ہے؟

جن لوگوں نے دنیا کے مسلم مالک کا وعدہ کیا ہے یا دیگر مسلم مالک کے مسلمانوں سے حج بیت اللہ کے دوران ملاقات کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اکثر دینی امور اور دیگر مذہبی طور پر حق کے بارے میں ہندوستانی مسلمان دیگر مالک کے مسلمانوں سے مختلف ہوتے ہیں جن کی بعض سبب مالک کے مسلمان اور خصوصاً سعودی عرب میں جہاں آج سے تیرہ سو سال پہلے آفتاب رسالت (صلعم) اسلام کا پیغام نوید دعا لگے سرحد کی ایک طلوع ہوا تھا، ہندوستانی مسلمانوں کو اکثر اسلامی عقائد امدان پر عمل کے اعتبار سے خود کو مقابلہ میں مختلف اور زیادہ کفر اور دنیا فوسی سمجھتے ہیں۔

برصغیر ہند میں بنگلہ دیش کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد موجودہ خطہ پاکستان سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کی آبادی کا شمار کیا جائے تو انڈیشیا جس کی آبادی دس کروڑ سے کچھ زیادہ ہے، اس کا نمبر پہلا، بنگلہ دیش کا دسرا اور ہندوستان کا تیسرا آتا ہے۔ گویا برصغیر کا کل آبادی، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کو ملا کر تقریباً بیس کروڑ ہوتی ہے، جو دنیا کے مسلمانوں کی ایک تہائی آبادی سے زیادہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کی مسلمان ہند سے مراد موجودہ پنجاب، مالک یعنی ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمانوں سے لی جاتی تھی جن کا کل تعداد تقسیم ہند کے وقت دس کروڑ تھا لیکن آئندہ کے بعد ہندوستان میں تقریباً ۶ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ برصغیر ہند کی مسلمان آبادی کے علاوہ متحدہ کینجے کے بعد اس کا نمبر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس خطہ کے مسلمانوں

کون سیسا مسلمان ہے اور کون کافر؟ اور اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنا چاہے تو کون سا اندکس فرقہ کا اسلام قبول کرے؟

مسلم سماج میں عورت کا مقام

اسلام نے جہاں ہی نوع انسان کو دعائیت اور عالمگیر برادری کی تعلیم دی، وہاں مسلم معاشرہ میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ ایک باعزت مقام و مرتبہ بھی دیا۔ لیکن حقیقت یہ، اور علیٰ طریقہ عورت کا جو مقام مسلم سماج میں ہے اس کو اسلامی تقاضات کے عین مطابق نہیں کہا جاسکتا۔ بیشتر غیر مسلم اقوام اور خود مسلمان عورتوں کا تعلیم یا عدہ طبعیہ گھٹتا ہے کہ مسلمان عورتوں کو مسلم سماج میں مردوں کے غایب میں کم درجہ ملتا ہے۔ اگرچہ اسلامی تعلیمات کے مطابق عورتوں اور مردوں کے حقوق سماجی، انسانی اور اخلاقی طور پر برابر ہیں، لیکن عملاً ان حقوق کے حائل میں مردوں کو زیادہ برابر "Male dominant" اور عورتوں کو "less equal" پایا جاتا ہے۔

عجب کی بات ہے کہ بعض علماء کو ان کے نزدیک مسلمان عورتوں کا سماج میں آنانیک امت میں فتنہ و فساد کا موجب اور مذہباً ممنوع سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اساساً تعلیمات کے مطابق عورتوں کا سماج میں آزاد و نامزدوں کی برابری طور پر شرکت کرنا ممنوع نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے کائنات کی صورت میں علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو جہنم میں لے کر آنا مقایہ تاکید فرمائی تھی کہ ان کو مابعد میں آنے سے منع رکھیں۔ کس قدر انہوں کی بات ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان بعض روایات اور رسم و رواج کو اصل، اسلامی تعلیمات پر ترجیح دے کر اپنی عورتوں کو ان کے جائز مذہبی حقوق سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ہمارے شہروں میں شافعی فقہ کی کوئی ایسی مسجد ہوتی ہے جہاں عورتوں کے لئے شرعی طور پر نماز باجماعت کا اہتمام ہوتا ہو حالانکہ آج کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ایک مسجد ضرور ایسی ہونی چاہیے۔

حال ہی میں مجھے کبھی شہر میں وہ ایسے طبقوں میں شرکت کرنے کا

مسلمانوں کے لئے یہ سمجھ لینا اشد فحش ہے کہ ان کے مذہبی معاملات میں حکومت کے دخل نہ دینے کے صرف اسی وقت کوئی ایسے معنی ہو سکتے ہیں۔ یہ کہ مسلمان اس بارے میں خود اپنی ذمہ داری کو نبھیں۔ یا براہ الفاظ دیگر خود مسلمان اپنے مذہبی اور سماجی مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ سماجی ترقی کی راہ میں ملک کے کسی دوسرے فرقہ سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں باعزت شہر کی حقیقت سے رہنے کے لئے اپنے مذہب سے دست بردار ہونا چاہیے۔ بلکہ ان کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اپنے مذہبی عقائد اور اعمال کا از سر نو جائزہ لیں اور صحیح اسلامی تعلیمات کی اس پرکھ کی حقیقت کو بروہ روایات اور دیگر رسم و رواج کے خلاف اس سے انکسار کی کوشش کریں تاکہ مسلمان دنیا و دنیاویوں میں سرخروئی حاصل کر سکیں۔

ہم کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ ہر قوم اور مذہب کے ہر فرد اپنے مذہب کی تعلیمات کا حامل ہے کہ یا اپنے باپ سے یا بلند آنگ دعوے کر کے نہیں بلکہ اپنے والدین کے اعمال اور احسان سے پیچھے جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے بھی یہ جاننا اشد فحش ہوگا کہ اپنے اعمال سے انہوں نے دنیا کے غیر مسلم عوام اور خواص کے ساتھ اسلام کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ کیسا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مسند ہر بنی ٹیڈ ڈاکٹر امیڈ کر اپنے فرقے کے افراد کو اعلاذات کے ہندوں کے عہدیوں پر لے کر تھبہ اندظم سے نجات دلانے کے لئے اپنی زندگی کے ابتدائی حصہ میں اسلامی تعلیمات وادات و اخوت سے متاثر ہو کر مذہب اسلام کی طرف راغب تھے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں موجود باہم اختلافات اور علماء کرام کی کفر بازیوں کو دیکھا تو کبھی گئے چنانچہ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ڈاکٹر امیڈ کر نے اپنے لاکھوں پیروں کی سمیت بدھمت کو اختیار کر لیا تھا۔ کیا بدھمت نے ڈاکٹر امیڈ کر سے اسلام قبول نہ کرنے کے باپے میں کوالی بوجھا تو انہوں نے جواب دیا کہ مسلمان فرقوں کے علماء کی کفر بازیوں کو دیکھنے کے بعد وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ خود مسلمانوں میں

حکامہ مسلمانوں کی مسلمان

اتفاق ہوا تھا جو مسلمانوں کے تعلیمی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی مسائل پر غور و خوض کے لئے منعقد کئے گئے تھے۔ یہ جلسے خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں مسلمان علماء و محدثوں کے چند ناگفتہ بہ اہم مطالب و مسائل پر بحث کی گئی تھی۔

ایک جلسہ جو خالص مذہبی قسم کا تھا چند پرچوش مسلم خواتین نے جتنی سیدالائیں گٹا نے کے لئے منعقد کیا تھا۔ حاضرین جلسہ میں مسلمان مرد و عورتیں دونوں شامل تھے۔ جلسہ کی صدارت ایک مسلمان خاتون نے کی تھی۔ اور تعاریف کے لئے چند فاضل مقررین بھی مدعو تھے۔ جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن مجید اور حمد و نعت سے ہوا جس کے بعد ایک عالم و فاضل مقرر نے اپنے تقریر کے بعد ان فرمایا کہ مسلمان عورتیں آئندہ اگر کھانا مذہبی جلسہ منعقد کرنا چاہیں تو ان کے لئے مجاہدے کو شرعی پابندیوں کو ملحوظ رکھیں۔ خواتین کے لئے دوسرا اہم بات ملحوظ رکھنے کی یہ ہوگی کہ مردوں اور عورتوں کو مل جل کر اور مدد سے تقریریں کرانے کی بجائے اپنی چاہیئے کہ ان جلسوں میں شرکت صرف عورتوں کی ہو جس میں عورتیں ہی تقریر کریں۔ فاضل مقرر اپنی تقریر کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ انکی صاف گوئی سے تاثر ہو کر اگر تنظیمیں جلسہ آئندہ جلسوں میں تقریر کے لئے انکو مدعو نہ کریں تو انہیں اس بات کا کوئی دکھ نہ ہوگا۔

اپنے جلسہ صدارت میں محترم صدر صاحب نے مولانا موصوف کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ غیر مسلم اقوام کے اکثر لوگوں کو مسلمان عورتوں کے بارے میں عام اور خاص مسلمان مردوں کے خیالات و اعمال سے یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ اسلام میں عورتوں کا مذہب مردوں کے مقابل میں کمتر ہوتا ہے عام طور پر مسلمانوں کے اقوال و اعمال سے غیر مسلم اقوام میں یہ غلط فہمی بھی رہتی ہے۔ مذہب اسلام کی تعلیمات کے مطابق وحدت کو زندگی کے ہر شعبہ میں کمتر درجہ دیا جاتا ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مرد یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں نوعہ بالندہ وحدت کی کوئی روح تک نہیں ہوتی۔

صدر محترم نے مزید فرمایا کہ عام طور پر مسلمانوں کے شراب کے ناجائز اور حرام دھندوں سے مسلمانوں کو منسوب کیا جاتا ہے حتیٰ کہ بہت سے عالمی سنگ ایسٹنگ کے ناجائز دھندوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ خود بھی ہر شریعہ سنگ ایسٹنگ کے مال کا خرید و فروخت کا ایک شمار کرنا۔ ماحیوں کے مافوق خانہ سے بالکل متصل پایا جاتا ہے۔ فرض ہے کہ مسلمان اپنے عمدہ عمل سے

گلن کاہنڈستانی مسلمان نمبر

مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

دوسرا جلسہ جس میں مجھے شرکت کرنیکا اتفاق ہوا تھا۔ اس میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے کئی مسلمان نمائندے بھی شامل تھے۔ جلسہ کی ایک خصوصیت تھی کہ اس میں مسلمانوں کی اقتصادی پست حالی اور چند سماجی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک فاضل مقرر نے کہا کہ ملک کی آزادی کا ۲۷ سالہ بعد بھی مسلمان تعلیمی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے میدان میں بہت پیچھے پائے جاتے ہیں۔ اپنی خستہ حالی کے اسباب پر مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے۔ بالخصوص مسلمانوں کو اس اہم مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے کہ صنعت و زرعی کے دھندوں میں مسلمان عورتیں ملک کے مسلمان آبادی کے نامناسب سے بہت زیادہ جو پائی جاتی ہیں اس کی کیا وجوہ ہیں؟

آج کے تقریباً ۱۰ سال پہلے میرے ایک سردار محمد دست جو قسیم ہند کے بعد صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے، انہوں نے بھی لاہور، راولپنڈی اور دیگر مسلم اکثریت کے شہروں کا حوالہ دیتے ہوئے مجھے سبکیا کہ یہاں تو لوگ چھاپتا کہ انہوں کی اکثریت مسلمان عورتوں پر کیسی قہر مسل ہے؟ اگرچہ میرے سردار کو چند اقتصادی وجوہ تباہ کاریاں دیکھ سہی یہ اقوام کے چند اعداد و شمار کا حال اس وقت دیکھ کر حوش کر دیتا تھا۔ ان کا یہ سوال ایک سترہ زمین میں کھٹکتا رہا ہے۔ سوال کا موضوع باوجود اپنی اہمیت کے بہت کم ہی عام طور پر مسلمانوں کی بحث میں آتا ہے یا تمام مسلمان اس موضوع پر سوچنا یا بحث کرنا ہی نہیں بلکہ باعث تنگ و غار سمجھتے ہیں یا کبھی اس موضوع پر بحث ہوتی ہے تو بلا جھجکا و زعامت خالق کا دعویٰ میں بحث نہیں کی جاتی۔ عموماً مسلمان اس موضوع سے یا تو بے پروائی کرتے ہیں یا اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جس سے سوال بڑھتی بلکہ مدھنک ہو جاتا ہے۔ چند اہل احباب میں سے ہیں اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا، ان کا کہنا ہے کہ تمام طوائف پیشہ و صنعت و زراعت میں نہیں ہوتیں۔ ناچ گانا ان عورتوں کا پیشہ ضرور ہوتا تھا لیکن ناچ گانوں کو ان طوائفوں نے علم با نادی سطح سے اٹھا کر ایک ناٹن کرٹ یا منظر لطیف کے درجہ کو پہنچا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا بہت سی عورتیں طوائفیں بادشاہوں، اربابوں، اور رئیسوں کے ایک خاص طبقہ کی عیش و سرور اور تفریح کیلئے وجود میں آئی تھیں لیکن یہ طوائفیں بازاری پیشہ و عورتوں سے نفرت ہوا کرتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اگر مسلم امراء اپنی اولاد کو اسباب شامی کی تربیت کے لئے طوائفوں کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن یہ باتیں مسلمانوں کے شامی حکومت کے بعد کی تھیں حکومت احمدیہ اور ہندوستانی مسلمانوں سے چھوٹ جانیکے بعد تیرا ہی طوائفیں تانا، ہی عورتوں کے کچھ زیادہ مختلف درجہ ہیں

جہاں جندہ دوسرے سرمایہ داروں کی جہاں اپنی ذات کی جہاں ہوتا
ہیں وہاں ان کی داشتائیں وہاں ان کی جہاں ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان
کہتے ہیں۔ اکثر ان طوائفوں کے نام تھامہ، سلمان، شوہر، بھی ہوتے
ہیں اور ان کے اپنے خاندان بھی۔ مگر ان طوائفوں کو اپنے بھائی بھائیوں
سے اپنی عصمت فروشی کے عوض مہمانانہ وظائف ملتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔

بھٹی کی فلمی دنیا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں آئے
دن سہندھو نے والی مجرمانہ اور تواریفوں کی محفلوں میں مسلمان عورتوں
کی شرکت پر نظر کرنے سے اس مسئلہ کی نوعیت اور حقیقت اچھی
طرح واضح ہو جاتی ہے۔ یہاں پر یہ تباہی ناپائیدار زندگی نہ ہوگا کہیں نہ اپنے
چند دوستوں کو اس صورت حال پر شرم محسوس کرنے یا اظہارِ رجحان
نہ کرنے کی بجائے ایک طرح کی خوشی یا فخر کا اظہار کرتے ہوئے دکھایا
ہے۔ کیوں کہ ان کی خیالی میں مسلمان پیشہ و عورتیں بازارِ حسن میں غیر مسلم
پیشہ و عورتوں کے مقابل میں زیادہ "دلکش اور نفیس" ثابت ہوتی
ہیں جس کا سبب عوام میں مسلم عورتوں کی مانگ اور "مقبولیت"
مقابلہ ہے۔ دوسرے فرقوں کی عورتوں کے زیادہ ہوتے ہیں۔

یہ بات تمام مسلمانوں کے لئے باعث فکر و تأمل ہونی چاہیے
کہ جہاں مذہب اسلام عصمت و عفت، شرم و حیا اور ایک پاکیزہ زندگی
کے بارے میں اپنے پیروں کو اس قدر مطلق و ارفع تعلیم دیتا ہے وہاں
مسلمان مردوں کی غفلت اور غلط کاریوں کی وجہ ان کی بے نصیب عورتوں
کی ایک بھاری تعداد اس طرح غیر اسلامی، ناپاک اور مذہبوں کی طرح
پرنسنگ لبرل کر رہی ہے۔ اور ہم مسلمان ان عورتوں کی بھٹی اور اصلاح
کے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم معاشرہ کا یہ نامور ان کے
شاہجہاد کے قدیم و فرسودہ (Fossilized) مانگیر دارانہ نظام کی پیداوار
ہے جس کو وضع و ہستی سے شاناً مسلمان کی پناہ میں اور زمین کھینچا چلے گئے ہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کے تمام سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر غور
کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی ان ٹھیکسی ہوئی اور مجبور عورتوں
کا آباد کاری کی طرف توجہ دیں۔ ہم کو ایک حقیقت پسندانہ تدبیر اختیار
کرنے ہوتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ ان عورتوں کی خستہ حالی اور اخلاقی تباہی
دگرہ میں ہم مردوں کی کتنی ذمہ داری ہے؟ ایسا عورتوں کے غم و غور

دیکھنا کہ ہندوستانی مسلمان نہ۔

آباد کاری اور مناسب و معقول تعلیم و تربیت کے لئے مسلمانوں کو چاہیے
کہ جہاں درس گاہیں اور Reacus Homes ایسے بہادر اور فاضل
آمرانہ ٹریننگ دینے کے مرکز ہیں جہاں ایسی عورتوں کو مسلم سماج کی تعمیر و ترقی میں
Tag Centre قائم کریں جہاں ایسی عورتوں کو مسلم سماج کی تعمیر و ترقی میں
کارکنوں کو ان کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

یاد رہے کہ ہندو سماج میں دیور سماج عورتوں کو مذہب کے نام پر چند
خود غرضانہ نصیحتیں دے دیتے ہیں مددیں سے اپنی عیش و عشرت کا
اڈکار بنارکھتا لیکن ہندو سماج کے کچھ بہادر مغز قائمینہ کی سماج
سداکار مضبوطوں کے تحت مسلسل جدوجہد کے بعد حکومت کی مدد سے
ہندو سوسائٹی کو اس نصیحت سے پاک کر دیا۔ اور دیور سماج عورتوں
کو عزت و احترام کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق دیا۔ اسی طرح مسلمان
کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ مسلسل جدوجہد کے اپنی سوسائٹی کو
اس شرے نگلے جاگیر دارانہ نظام کا تمام فضول سے پاک کریں اور
کوہر شعبہ میں ان کا وہ جائزہ و باعزت مقام ملنا چاہیے جس کی
اسلام ہم کو تعلیم دیتا ہے۔

خدمتِ خلق اور مسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک نہایت ہی اہم کام جو کرنا ہوگا
وہ ہے اپنے نیک کردار اور خدمتِ خلق سے اپنی ہمسایہ اقوام کا دل
جیتنا۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کا مشن تمام بنی نوع انسان
کی فلاح و بہبود ہے۔ عالمگیر انسانی برادری اور اخوت و مسادات،
جس کا اسلام تعلیم دیتا ہے، اس پیغام کو تمام انسانوں تک اسی
وقت پہنچایا جاسکتا ہے جب کہ مسلمان اپنا دنیا میں انک تھلک
رہنے کی بجائے بلا تفریق مذہب و ملت خلقِ خدا کی خدمت کرنے
کا بھی سعی کریں۔ دیگر فرقوں سے اقتصادی تعلیمی اور سماجی ترقی میں پیچھے
رہنے کے سبب، ان شعبہ جات زندگی میں خود کی ترقی کیلئے مسلمان
ہر ممکن جدوجہد میں بلاشبہ حق بجانب ہوں گے۔ لیکن مسلمان عجب
تک اپنا دائرہ عمل وسیع کر کے اپنے آپ کو خدمتِ خلق کے لئے بھی
وقف نہ کر لیں گے ان کا عالمگیر اسلامی مشن اور حصہ جانے لگا۔ اس
سلسلہ میں عیسائی شہزادوں کی خدمت مسلمانوں کے لئے مشعل ہوا

شابت ہو سکتی ہیں۔

گذشتہ چند برسوں میں مکھڑ کی افلاس زدہ اور گندھی لبتیوں میں لگاردوں، غریبوں، محتاجوں اور بیابانوں کی جاتفریق مذہب و ملت جس طرح بے لوث خدمت کر کے کیتھولک عیسائی خیری سہل ٹریسا (MOTHER TERESA) نے اپنے مذہب عیسائیت کے لئے ایک عزت و محبت کا مقام کر ڈالا ہندو اور دیگر غیر عیسائی قوموں کے دلوں میں پیدا کر لیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے خدمت خلق کا ایک عمدہ نمونہ اور سبق ہونا چاہیے۔ مدرٹریسا سے ان کی جیہ خیال مختصر بعد بخدمت خلق صرف حضرت یسوع مسیح کی محبت کی خاطر کر رہی ہیں۔ کاش مسلمان بھی اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت کی خاطر جو رحمت اللعالمین کے لقب سے موسوم ہیں خود کو کس طرح اپنے آپ خدمت خلق کے لئے وقف کریں؟

مسلمانوں کے لئے فرضی ہے کہ ان کی درسگاہیں اور شفاخانے مسلمانوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ تمام خلق خدا کی بھی جاتفریق مذہب و ملت خدمت کریں تاکہ اسلام کی عالمگیریت خاصہ عام پر آشکارا ہو سکے۔ جنوبی ہند کی ریاست تامل ناڈو کے ایک تاریخی شہر تریچنا پالی میں مجھے چند سال پہلے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس شہر میں عیسائی خیریوں کا ایک بڑا ہسپتال ہے۔ جہاں عیسائی اور دیگر عیسائی مریضوں کا علاج ہوتا ہے یہاں کبارہ زخمی مریضوں کا ہر صبح ایک باڈی اپنے چرچ کے فرائض و عبادت سے غافل ہو کر ہسپتال کے مریضوں سے خود ملتا اور انچی دواؤں اور تسلی کی باتوں سے مریضوں کا دلہل کرنا تھا۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ کاش مسلمانوں کے مذہب پر رہنا اور مساجد کے پیش امام بھی مصیبت زدہ خلق خدا کی خدمت کی خدمت کی طرف اسی جذبہ ایثار سے دھیان دے سکتے؟

مجھے یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کرتا تھا کیوں کہ ہر مسجد میں اسی شہر کی جامعہ مسجد کے امام صاحب کے پر جوش اور دہلور انگیز و خطا اور خطبہ بھی سناتا تھا۔ ہر جمعہ فاضل خطیب صاحب توار پختہ بیچنے لے فلسفہ شہادت و جہاد پر حوالہ دھا تقریر کرتے اور مسلمانوں کے دیگر فرقوں بعد ان کے قادیان پر کفر کے فتوے صادر فرما کر سامین کو ہن۔ دھشتان اسلام کے خلاف "جہاد" کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

امام صاحب بصورت کا وقت نماز پڑھنے کے علاوہ عام مسلمانوں

نگاہیں کھینٹتے تھے

کو کعبوت پرست سے نجات دلانے اور ان کی تقویٰ میں دیرہ فرخت کرنے میں محنت کرتا تھا۔ ہم دہلی میں اس وقت تک حال ہمارے اماموں کا ہندوستان کے تقریباً چھوٹے بڑے شہر کا کچا جاسکتا ہے۔ آج کے کئی سال پہلے علامہ اقبال نے ہمارے اماموں کے بارے میں لکھا تھا کہ

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ پیار سے دور کھت کے نام؟

ہماری مساجد کے اکثر و بیشتر امام آج بھی صرف "دور کھت کے نام" ہی بنے ہوئے ہیں۔ انھیں قوم اور قوم کے سماجی اور مذہبی مسائل سے مدد کو بھی واسطہ نہیں رہتا۔

قارئین کرام کو معلوم ہو گا کہ اسلام کے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فارغ اسلام میں پہلی مرتبہ اماموں کی تنخواہیں مقرر کی تھیں تاکہ امام دنیاوی ضروریات سے آزاد ہو کر دین و ملت کی خاطر خدہ خدمت کر سکیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ آج کل ملک کے بیشتر حصوں میں مساجد کے اماموں کی مالی حالت نہایت خستہ پائی جاتی ہے۔ اماموں کی تنخواہیں بالکل معمولی ہوتی ہیں کہیں کہیں تو اماموں کا گذر اوقات صرف خیرات پر ہوتا ہے جس کو قوم کی بد بختی کہتے ہیں۔ اماموں کی تعلیم و تربیت بھی ناکارہ اور ناقص قسم کی ہوتی ہے۔ پہلے مساجد کے اماموں کے بارے میں یہ صحت حال مسلمانوں کے لئے سخت نقصانہ ثابت ہو رہی ہے۔ لہذا فرض ہے کہ ہمارے اماموں کی باقاعدہ تعلیم و تربیت ہو تاکہ ہماری مساجد نہ صرف ہماری عبادت گاہیں ہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے عمدہ درس گاہیں اور سماجی خدمات کے مفید مراکز کا بھی کام دیں جیسا کہ اسلام میں مساجد کا صحیح مقام ہے اور ہونا چاہئے۔

ہمارے اماموں کی باقاعدہ تعلیم و تربیت کے لئے ٹریننگ اسکول کھولے جانے چاہئیں۔ جہاں ان کو قرآن، حدیث اور اسلامی فقہ کے ساتھ ساتھ ملک و ملت کے سماجی اور اقتصادی مسائل سے بھی روشناس کر دیا جائے تاکہ ہمارے امام صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ قوم و ملت کی تعلیمی سماجی خدمات بھی اچھی طرح انجام دے سکیں۔ تربیت یافتہ اماموں کی تنخواہیں مقرر ہونی چاہئیں تاکہ وہ دنیاوی ضروریات سے سختی اختیار اور مناسب حذیب انکسور رہیں۔



کہاں ہیں کہاں ہیں سمساجی کارکن

دہاں کے لوگوں کو صاف ستھرے طریقے سے رہنے کے آداب سکھانے اور حفظانِ صحت کے اصول بتانے۔ ایسا تھ سینٹر شفا خانے، انکولی کالج اور ویل نیئر سینٹر کھولے، مگر انفرس ہمارے مولوی صاحبان فرما ستم کے تیغے دوڑنے دوڑتے سینٹھوں کے محلات میں داخل ہوئے اور جہری پرودوں کے تیغے، نرم گدوں اور ریشمی ٹیکوں پر اسے علم کا بوجھ اُتار کر خرگوش کی نیند سدر گئے۔ اور جب جاگے تو مریدین و معتقدین کی درخواست پر دُنیا کو بھلا کر علم و عرفان کے دُغظ دینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمل کی دنیا میں خود پر و مرید دونوں نعر فرہے۔

مستتر طور پر یہ انکشافات بھی ضروری ہے کہ مرید اپنے پیر کو اس وجہ سے خوش رکھنا چاہتا ہے کہ اول اس کو دُنیا میں عیش و آرام ملے اور دوم جب مرے تو جنت میں محل ملے جب کہ اپنے مرید کو خوش و رضا مند رکھنے سے پیر کا منشا یہ ہے کہ اُسے دُنیا ہی میں وہ ساری سہولتیں میسر آجائیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں فرما کر دیئے کا وعدہ فرمایا ہے، پیر کو جنت کی فکر بالکل نہیں ہوتی ابتدا ہی سے اپنے آپ کو وہ جنت کا مستحق سمجھتے ہوئے ہوتا ہے۔

اب رہا سوال آج کے پڑھے لکھے مسلم نوجوانوں کا، تو یہ ہمارے مولویوں سے بھی ایک تدم آگے ہیں۔ انھیں یہ گمان ہے کہ یہ جدید (مادرن) ہیں، یہ احساس برتری کا بڑی طرح شکار ہیں۔ اور عام غریب مسلمانوں سے یہ اپنے آپ کو اکثر الگ اور دوردور رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے غریب و کم نصیب مسلمان بھائیوں کا مذاق اڑانے کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا۔

چند دن قبل کچھ دوستوں کے ہمراہ بمبئی سے تھوڑی دور ساحلی علاقے علی بارغ (ضلع تلالہ) ہمارا سفر اچانے کا اتفاق ہوا مقصد زیادہ تر تفریح ہی تھا مگر اس میں علی بارغ کے لوگوں کا اصرار اور اُن کا خلوص بھی شامل تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ میں وہاں پہنچ کر اُن لوگوں کو ایسا دُعا دیا جی کے متعلق کچھ باتیں بتاؤں علی بارغ ویسے تو ایک چھوٹی سی بستی ہے مگر ان کا ساحل پرکشش ہے اور وہاں کے لوگ خلیق اور زیادہ لوح ہیں وہاں کے مسلمانوں کے جو بھی چھوٹے بڑے ادارے ہیں انھیں میں نے دیکھا اور مختلف مسلم جماعتوں اور بااثر مسلمانوں سے بھی ملا۔

جوں ہی میں بستی میں داخل ہوا تو مجھے ایک گندے علاقے میں لے جایا گیا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہی علاقہ ہے جس میں اس بستی کے مسلمان آباد ہیں۔ یہ جان کر مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا، مسلم بستیوں کا ہر طرف یہی حال ہے۔ تعجب نہ ہونے کے باوجود میرا دل ضرور دکھا صفائی اور پاکیزگی کا سبق اسلام نے ساری دُنیا کو دیا مگر اُسی کے پے روکا رگندے رہتے ہیں اور گندگی میں رہنے والے واقعہ ہوتے ہیں۔ اس کی سبب بڑی وجہ جہالت ہے اور اس جہالت ہی کی وجہ سے غریب اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

ہماری قوم کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں صحیح قسم کے سماجی کارکن وہ کارکن جن میں کام کرنے کی صلاحیت ہو، ایک توب ہو ایک لگن ہو اور درود و بہت ہی مشکل سے ملتے ہیں۔

در اصل ہمارے علماء کو چاہیے تھا کہ وہ اس کام کو کرتے، پادری اپنے دین کا پیغام لیکر جہاں جہاں گئے اور جس بستی میں تبلیغ کی پہل

رہے وہ لوگ جن کو ہم سیاست دان کہتے ہیں۔ دراصل مسلم فرسے کا وہ گنگا گندرا طبقہ جو قطع طور پر ناکارہ ثابت ہو چکا تھا اب لیڈر پیدا کر رہا ہے، تعلیم، ایانج، بے ہنرے، احمد شناس اور (چھتے ہوئے) نمبری لوگ سیاست کے میدان میں آکر لیڈر بن جاتے ہیں، وہ لیڈی خلقِ خدمت کے لئے نہیں بلکہ وہ پیسے کے علمبردار پر انجام دیتے ہیں، وہ مسلم فرسے کی جہالت، بے بسی اور مغلی کا استحصال بڑی خوبی سے کرتے ہیں تھوڑے دفعے کے بعد چر رہے پرکھڑے ہو کر مسلمانوں کی زبوں حالی پر دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں اور اپنے ان آئندوں کے سیلاب میں بھولے جالے اور بے دست و پا مسلمانوں کو لے ڈوبتے ہیں اور وہ بے چارے اپنے اس ڈوبنے ہی کو اپنا بڑا بار ہونا سمجھتے ہیں۔

مسلم فرد الگ الگ گروہ میں بنایا ہوا ہے۔ اور ایک گروہ دوسرے کا سخت دشمن ہے۔ ایک مسلمان جب کوئی قدم اٹھاتا ہے تو دوسرا مسلمان اُس کے اقدام کو غلط قرار دے کر اُس کی زبردست مخالفت کرتا ہے جب کہ مخالفت اصولی بالکل نہیں ہوتی بلکہ محض حسد کی بنا پر مخالفت کی جاتی ہے اختلافات فروغی ہوتے ہیں، ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ حلال ہے دوسرا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ حرام ہے حالانکہ اُس بات کے حلال یا حرام ثابت ہونے سے مسلم فرتے پر کسی اچھا اثر نہیں پڑتا تو شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ سماجی کارکن مسلمانوں کے ان چھوٹے چھوٹے گروہوں کو ختم کر کے مفادِ مشترک کی خاطر آپس میں ایک کر دیں۔ سیاسی طور پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آئیں یا نہ آئیں مگر اُن کو ایما دیباہی کی تخیلی سیجھا کر تعمیری کاموں کی جانب رجوع کیا جاسکتا ہے۔

دست کار یوں اور حکومت کی پیش کی ہوئی اعداد و اہم کی ایکسپریس کی طرف
مسئلہ نوں کو ترجمہ دلائل اور اُن میں تنظیم پیدا کریں تاکہ وہ اس مذہب کی
خود کفیل بن جائیں کہ اپنے کہیں بھٹکے سے اپنے روزگار کا کام نہ لے کر اُن
میں اس کی وجہ سے۔
مگر یہ سب باتیں اُسی وقت ممکن ہو سکتی ہیں جب مسلم سماج
یہ ایسے غلطیوں کا رکن پیدا ہو جو سماج سیر کو اپنا دشمن بنالیں

قہر کی بد ذوقی

علامہ اقبالؒ کی شکایت تھی: میری قوم کو ابھی کتابیں خریدنے کا شوق نہیں ہے! یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب اُنھوں نے خُدا اپنے مرنے سے شائع کر دالی تھی۔ اُس کے پانچ سو نئے بھی دو تین برس تک فروخت ہو سکے تھے۔ بہت سے نئے دوستوں کو خُدا نئے کے طور پر دینے یا دوستوں نے نئے کے طور پر مانگ لئے۔ حالانکہ اُس نئے کی قیمت صرف ایک روپائی تھی۔ انہوں نے ایک خانقاہ کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؒ ایک دن کہنے لگے، اُن کی ریاست کا نیچر جو میرا دوست ہے، مجھے سے اسرارِ خودی کا ایک نسخہ بطور تحفہ لے گیا تھا۔ جندوں بد چہر آیا اور دو تین نئے چہرے مانگے۔ لگا۔ کیرنگہ نواب صاحب کے گھر میں بھگڑا پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک نسخہ کس کے لئے ہے۔ بھگڑا مفت لینے پر پیدا ہوا، یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ دو چار روپے کے دو چار نئے خرید لئے جائیں۔

ایک روز تحریکِ خلافت کے قائد مولانا محمد علی علامہ اقبالؒ کے مکان پر پہنچے اور فرماتے لگے: ظالم! تم نے لوگوں کو گرم کر دیا اُن کی زندگی میں بیجان، تو پیدا ہو گیا ہے اور خُدا یہاں سے اُٹھ کر کسی علی ستیا میں حق نہیں لیتے! اقبالؒ نے جواب دیا: تم بھی عجیب بے سمجھ انسان ہو، تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں قوم کا قوال ہوں، اگر قوال کو خُدا بد اور حال آجنا بعد وہ بھی بھٹکے میں تہہ بالا ہونے لگے تو قوال ہی ختم ہو جائے گا۔

پہلے مسلمان یا ہندوستانی

کو اپنے لئے اسلامی طرز زندگی کا ایک قطعی نیا انداز ڈھالنا ہے۔ آج جو اسلامی طریق زندگی ہے وہ اسلامی دور حکومت کے عروج کی یادگار ہے اور دراصل یہ زندگی ان ملکوں سے ورثے میں ملی ہے جہاں مسلمان کبھی غیر معمولی اکثریت میں تھے۔ اور جہاں ان کے لئے اقلیت ہونے یا غیر مسلم ریاست کی رعایا بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جو طریق زندگی صورت پذیر ہوا وہ قدرتا اور منطقی طور سے مسلمانوں کا تھا۔ مسلمانوں کے واسطے تھا اور سراسر مسلمان ہی اس کے عمل درآمد کا ذریعہ اور وسیلہ تھے۔ وہ ایک ذیلی ریاست معزز اور مخصوص ذریعے کا طریق کار تھا جس کا محور، مرکز صرف امت مسلمہ تھی۔

حضرت عیسائے جس سرزمین پر جنم لیا وہ رومیوں کی نوآبادی تھی اور یہودیوں کو اس کا احساس تھا ایسے ہی ماحول میں جو سوال پیدا ہو سکتا ہے اس کا جواب پہلے ہی یوں دیدیا گیا: قیصر کو قیصر کا واجب و داد خدا کو خدا کا حقتہ! یہ جواب ریاست اور مذہب کو واضح طور پر ایک دوسرے سے علاحدہ کر دیتا ہے۔ مگر عربوں کے سامنے ایسا سوال آیا ہی نہیں۔ اس لئے اسلامی ہدایات میں ایسی ہدایت نہیں ملے گی کہ مسلم اقلیتیں کس طرح بسر کریں۔ اسلامی تاریخ میں ہندوستان پہلا ملک ہے کہ جہاں کچھ روٹے سے زیادہ مسلمان اقلیت رہتی ہے۔ غیر محفوظ اور مضطرب اقلیت۔ یہ درست ہے کہ چند دوسری باتیں بھی مسلمانوں کو بے چین بنانے کی نئے دائر ہیں مگر اس سارے خلیان اور اضطراب کا سبب کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندوستان

آج کے ہندوستانی مسلمانوں کو دو مشکلات درپیش ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مسیح شدہ اسلام کو اپنی آنکھیں بند نہ کئے ہوئے مانے جا رہے ہیں۔ جہاں ہری پڑا اندھ بڑا گندہ ماحول کے رد عمل میں جنم لیتا ہے اسے اپنے ہی ماحول کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوتا ہے وہاں وہ دوسرے ماحول یا دوسری سرزمین کے حالات سے کبھی مطابقت حاصل نہیں کر پاتا۔ سماج کے اس قدرتی قانون سے اسلام بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ جیسے ہندومت، ایک بادشاہت آمیز دھرم ہے اسی طرح اسلام سیاست آمیز مذہب ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی جمہوریت آمیز مذہب نہیں ہے۔ مسلم معاشرے کی بہت سی خامیوں میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے معاشرتی اصول انہی ملکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں پائے جاتے ہیں اس کے اصول غیر مسلم اکثریت کے معاشرے سے میل نہیں کھاتے۔ دراصل اسلام ایک طرفہ تاشا ہے وہ غیر مسلموں سے یک جہتی قائم کرنے میں مانع آتا ہے اگر مسلمان کا کسی سے اتحاد ممکن ہو سکتا ہے تو اسلام ہی کی شرائط پر یعنی اسلام بڑا اصولوں مذہب ثابت ہوتا ہے اسلامی ملک کے لئے اس میں شک نہیں کہ اسلام نے عرب میں بڑا کام انجام دیا اور جب یورپ میں فاتح بن کر پہنچا تو وہاں بھی اپنا اثر چھوڑا مگر وہ جمہوری ہندوستان میں بھی کچھ کر سکے یہ ممکن نہیں۔ جو سوشل کڈ اور قانون دین صدی کے عرب کے لئے بنائے گئے تھے وہ آج ما نہیں دے سکتے۔

چنانچہ ہندوستان بالاحقیقت کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں

گنگا کا ہندوستان کا مسلمان

مسلمان اسی تک وہ طریق زندگی تشکیل نہیں کر پائے جو اعلیٰ تعلیمی پوزیشن میں مناسب و موزوں ہو؟

اسی سوال سے پھر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔

کیا یہ بات خود مسلمانوں کے مفاد میں نہیں ہے کہ وہ عرب و ایرانی اندازِ نظر کو اور اُس طریق زندگی کو جو خالص مسلم عالم کے مسلمانوں کے لئے موزوں تھا اب خیر یاد کہہ دیں۔ اور کیا یہ بات اسلامی نقطہ نظر کے خلاف ثابت ہوگی؟

انڈونیشیا کی مثال نیچے دیے دیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت ہے۔ لیکن راماٹن اور مہا بھارت کی اساطیری روایات ان کے مسلمانوں کے لئے تحریک حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ ان مسلمانوں کے قصے، تھیے، ڈرامے و سرے خون کی اساس راماٹن اور مہا بھارت ہی میں ہیں اور وہ ان کے مسلمانوں کے نام پر تھے جس دھرم سیتا کو ایک مسلمان وزیر کا نام) اور گودیہ دھرم ایک مسلمان فوجی (نصر کا نام)۔ کیا آپ دیکھ کے دوسرے مسلمانوں کے مقالے میں انڈونیشیہ کے مسلمانوں کو کم تر کہیں گے؟ اور کیا ایسی کوئی بات ہندوستان میں مسلمانوں کو کم تر بنا دے گی؟ ہندوستانی مسلمان اس حقیقت کو تو قطعی طور پر فراموش کئے ہوئے ہیں کہ ان کی بھاری اکثریت آریسل سے تعلق رکھتی ہے یا پھر غیر سانی اصل سے یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک بڑے ہوا کو ہجراؤں نے اپنے یہاں سے عرب اثرات کو ختم کر دیا ہے اور ان پر اس کا کوئی بُرا اثر نہیں ہوا اور نہ ان کے مسلمان ہونے میں فرق آیا۔ تو پھر کیا ہندوستان مسلمانوں کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ عرب و ایرانی عناصر کو اب اپنے اوپر غریب نہ لادے پھریں؟

شمالی ہندوستان کے اکثر علاقوں کا مسلم کلچر مشرق وسطیٰ کی روایت کے ذریعہ اثر ہے۔ بلکہ، مغربی ہند اور جنوبی ہند کا مسلم کلچر آریا کی روایات کا حامل ہے۔ چنانچہ شمالی ہند کا مسلمان ایک نظر میں پہچان لیا جاتا ہے اور اس کی زبان سے دو چار لفظ سننے کے بعد اس کو پہچان لینا بالکل بھی مشکل نہیں مگر وہ یقیناً ایک دانش مند شخص ہوگا جو اسی طرح ایک بنگالی ہندو اور بنگالی مسلمان میں تیز کرے یہی بات مغربی ہند اور جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے مسلمان اور ہند کی ہے۔ بنگال، مغربی ہند اور جنوبی ہند میں شاید ہی کوئی غالب

کی عزتوں کی داد دے سکے اور شمالی ہند میں سیکور سے محفوظ ہونے والے خشک جی سے ملیں گے۔ خاصی کی اتنی ساری تکلیفوں اور آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بھی اس آریائی مسلم کلچر کی بدولت ڈھاکہ کے بنگالی مسلمانوں اور بنگال کے بنگالی ہندوؤں کے مابین خاصی خاصی ہندوئی قربت پائی جاتی ہے۔ ایک ہی مذہب کا لیے رو ہونے کے باوجود وہاں مسلمان لاہور کے مسلمان سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت تک اپنے آپ کو محفوظ و مطمئن محسوس نہیں کر پائیں گے جب تک کہ وہ یہ محسوس نہ کرنے لگیں کہ وہ ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اب یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ کون سا کلچر انہیں یہاں سے تعلق کر سکے گا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں جو مین مسلم فرقے خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں وہ خوجہ، بوہری اور سیمین ہیں اور جس کلچر سے یہ تینوں فرقے تعلق رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو عموماً اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو خصوصاً واضح طور پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اب بہت دنوں تک ذہنی طور پر منحل جہد میں نہیں رہ پائیں گے۔ انہیں اپنے آپ کو آریا نہ سمجھنے اور جب تک وہ ایسا نہیں کر لیتے وہ اس سرزمین سے نہ وابستہ ہو سکتے ہیں اور نہ اس سرزمین پر ان کا کوئی حق ہے۔

غالب شناسی

غالب کے تمام اوصاف کی کلام کا نفیس انتخاب

۴۶۸ صفحات میں فوٹو آفیسٹ سے چھپا ہوا غالب کا اردو فارسی کلام جو ڈاکٹر انصاری صاحب کے شائع کیا ہے۔ مکتبہ جامعہ لنیڈ، یا علوی بک ڈپو محمد علی روڈ، ممبئی ۲۰ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

عورت کا رتبہ

پورا پورا اختیار رکھتے تھے۔ جنگل میں مرد کا بول بالا تھا اور گھر میں عورت کا۔ چنانچہ ساری ملکیت مشترکہ تھی اور عورت مرد کی محتاج نہیں تھی۔ اس وقت کے سماج میں سگی ماں کا توپا ہوتا تھا مگر باپ کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مرد کی بہ نسبت عورت کی قدر اور عزت زیادہ تھی۔

در اصل ان تمام قوموں میں جنہوں نے کھیتی باڑی نہیں کی اور چرواہے نہیں بنے اور بھالے اور تبر و کمان پر چرن کی زندگی کا مدار مدار رہا وہاں خانہ دان میں ہمیشہ عورت کا پلہ بھاری رہا۔

کروٹی ٹیگ میں جب ہزاروں برس تک آیا لوگ گھومتے رہے اور کہتے ہی گھولے سے گزرتے۔ مگر انہوں نے کسی اس صہرت میں نہ ذاتی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا تھا نہ غلام رکھنے کا اور نہ کسی سماج ہی کی بنیاد پر کھیتی باڑی جو کچھ پیدا کیا جاتا یا جو شکار کیا جاتا وہ اجتماعی محنت کا نتیجہ ہوتا اور ظاہر ہے کہ اس کا استعمال بھی اجتماعی طور پر کیا جاتا۔ اس لئے عورت بھی مردوں کے لئے ساجھے کی تھے بن گئی اور عورتوں کے لئے مرد ساجھے کی چیز سمجھا جانے لگا۔ لیکن دور وحشت میں مجموعی طور پر مرد اور عورت کا رتبہ برابر ہی رہا۔

مگر ان کی زندگی کا میار بدلا۔ ان دنوں دودھ دینے والے جانور پالنے لگا۔ اون، کھان، گوشت اور اون کے بنے ہوئے کپڑے اس کی ملکیت بننے لگے۔ بات جب آگے بڑھی تو کرگھے اور دھات کی دست کاری نے پیداوار کو بڑھانے کا رجحان پیدا کیا۔ محنت کشوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جنگ میں کپڑے ہوئے ان لوگوں کو غلام

ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو سماج میں عورت کا درجہ مرد سے نیچا ہونے کو سچی خیال کرتے ہیں بلکہ اس کو فطری بات مانتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ عورت کی ذات مرد کے مقابلے میں مذکر طور پر کم زور ہے اور عورت نہ صرف جسمانی اعتبار سے بلکہ ذہنی طور پر بھی مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ناقص عقل ہوتی ہے اور دراصل اس دنیا میں عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور پھر ماں بننے کی مجبوری تو اسے اور بھی زیادہ مرد کا دست نگر بنا دیتی ہے چنانچہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد کی حفاظت میں اور مرد کے زیر سایہ رہے۔

مگر کیونز میں یقین رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہمیشہ مرد عورت پر حاوی رہا اور نہ سدا عورت مرد پر غالب رہی۔ انسانی سماج چونکہ بدلتا رہا ہے اور جہاں آقا اور غلام، راجا اور پرچا، زمین دار اور کسان، کارخانے دار اور مزدور کے رشتے بھی بدلتے ہوئے سماج کے ساتھ بدلتے رہے ہیں وہاں مرد اور عورت کے تعلق کی نوعیت بھی بدلتی رہی ہے۔ تاریخی حیثیت سے انسانی ترقی کے زمانہ قدیم کو تین دوروں میں بانٹا گیا ہے یعنی عہد وحشت، عہد بربریت اور عہد تمدن۔ زمانہ قدیم میں عورت کا کیا مرتبہ تھا یہ جاننے کے لئے ہم گیس کی کہی ہوئی یہ بات سنئے، محنت کی تقسیم صرف مردوں اور عورتوں کے درمیان تھی۔ مرد لوڑائی پر جاتے، شکار کرتے، غذا کے لئے کچال لاتے اور اوزار بناتے۔ عورتیں گھر بنھالیں، کھانا پکاتیں کپڑے تیار کرتیں، یعنی مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے شعبوں کا

بنا کر ان سے محنت کا کام لیا جانے لگا یعنی محنت کی یہ حاجی تقسیم تھی اس تقسیم سے سماج دو طبقوں میں بٹ گیا، ایک جانب آقا تھے دوسری جانب غلام یعنی استحصال کرنے والے اور استحصال ہونے والے۔ محنت کی اس پہلی غلط تقسیم سے سماج میں انقلاب آگیا۔ روزی۔ روزی کا در لیو، پیداوار اور ملکیت پر رفتہ رفتہ مرد کا قبضہ ہو گیا عورت کو صوت استعمال کا حق تھا یعنی عورت کی پوزیشن نہایت بن کر رہ گئی۔ کام کی تقسیم سے عورت جو کبھی گھر کی ملکہ تھی جب مرد کے کام کے مقابلے میں عورت کے کام کی کوئی اہمیت نہ رہی تو اس کے وجود نے بھی اپنی اہمیت کھوری۔

استعدادی تبدیلی سے سماج بدلا اور سماج کی تبدیلی سے خانہ دہشتے بدل گئے۔ گھر کے اندر بھی مرد مطلق غمان بن گیا۔ اداری حق کا خاتمہ ہو گیا اور پدری حق کا رواج شرمع ہو گیا۔ مگر وہ دار شادی کا عہد ختم ہو گیا۔ ایک مرد اور ایک عورت جوڑا بن کر رہنے لگے۔ بیٹی پر پاپ کا اختیار بھی بڑھ گیا وہ جس سے چاہے اپنا کر یا ہ دے اور بیٹی دینے کے عوض وہ چاہے تو دولت بھی لے سکتا تھا۔ آلف لیلا کی داستان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غلیظ کو روز ایک نئی دہ شیزہ سے شادی کرنے اور کسی جرم کے ارتکاب کے بغیر اسے قتل کر دینے کا اختیار تھا یعنی مرد کو اپنی بیوی کی زندگی پر پورا اختیار تھا۔ بالکل ابتدا میں شوہر کی موت پر عورت سستی نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ وہ کئی بھائیوں کی بیوی ہوتی تھی مگر جب وہ صرف ایک ہی مرد کی ملکیت قرار دی گئی تب اسے سستی ہونا پڑا۔

بربریت کے مددہ دور آیا کہ جب وہ طبقہ پیدا ہوا جو پیداوار میں تو ہاتھ نہیں بناتا تھا مگر اس نے بحیثیت مجموعی پیداوار کے سادے انتظام کو اپنے قبضے میں لے لیا اور پیدا کرنے والوں پر حکمرانی بھی کرنے لگا یعنی جاگیر دارانہ دور آگیا۔ محنت کا جو لاکھوں اور کروڑوں غلاموں کے کاغذوں پر کہہ دیا گیا اور دوسروں کو لوٹ کر مسخنتی جنم پانے لگیں، غلام، شورور، پنج یا انجھت کے غلام سے حکم دلاں جب بہت زیادہ طاقت ور بن جاتا تو پھر اپنے ہی جیسے حکمران سے جنگ کرتا اور اگر فتح ہوتی تو شاہنشاہ، سرٹ یا زار بن جاتا۔ اسی جاگیر دارانہ عہد میں حکوم و فنون بھی پیدا

ہوئے اور مختلف مذاہب نے بھی جنم لیا۔ حیسانیت اور اسلام اسی دور کی دین ہیں۔ اس نظام میں اگرچہ عورت اطلس، زربفت اور کم خوابیں لبوس، نیلم، کچھ راج، لعل اور سرورل سبھی ہوئی سیش نعل کی ملکہ نظر آتی ہے اور شاعر قاصد، مغینہ، ساقی غزنے کی ہر طرح مرد کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے مگر وہ ایک کلونایا ایک سچی ہوئی گڑباز سے زیادہ کبھی کبھی نہ رہی، عہد و حشر میں وہ مادی تسلط کی معتداری رہی، بربریت میں اگرچہ اس کے کچھ اعتدال چھن گئے مگر اس کے کچھ حقوق دوبار بھی رہے۔ لیکن جاگیر دارانہ نظام نے تو عورت کو لونڈی بنا دیا۔ جاگیر دارانہ نظام میں مرد کے ہاتھوں عورت جتنی ذلیل ہوئی اتنی ذلت اس کی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ کسی ملک میں بچپن ہی سے اس کے پاؤں میں لوہے کے جوتے ڈال دیئے گئے کہ وہ چل سکے، کہیں اس کی ناک میں نیکیل اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں کسی نے گلے میں طوق ڈالا کہیں پیدا ہوتے ہی اس کا گلہنٹا دیا گیا اور کہیں اس کو شوہر کے مرے پر زندہ جلنے پر مجبور کیا گیا۔ اس عہد کے ہر قانون بننے والے نے اس بات پر زور دیا کہ عورت کو اپنے شوہر کی پوجا کرنا لازمی ہے چاہے وہ عرابی ہو، جواری ہو یا بیکھنوا اور بھینا ہو۔ اس لئے کہ پتی سوانی ہوتا ہے اور بخاؤی خدا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ ذلت یہ عورت کی بنتے لگی۔ سستی کی رسم صرف ہندوؤں یا آریوں ہی میں نہیں تھی بلکہ مصر میں بھی جب فرعون مرتا تھا تو اس کی ساری بیویاں اس کے ساتھ زندہ دفن کر دی جاتی تھیں۔ مسلمان بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور عہدہ داروں کے آج کے مسلم گھرانوں میں بھی لڑکی کی پیدائش پر اتنی خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا جتنا کہ لڑکے کے پیدا ہونے پر خوشی منائی جاتی ہے۔

خدا بخش اپنی کتاب 'INDIAN & ISLAMIC STUDIES' میں لکھتے ہیں:

عورت کو بچہ گرنے کا ذیل کام سب سے پہلے ان کو اسلامی ملاؤں کا ہے۔ انھوں نے یہ مکر وہ کام اس لئے نہیں کیا کہ نسوانی کشش سے متاثر نہیں ہوتے تھے ان کے تو اپنے اچھے خاصے حرم تھے، بلکہ اپنی جنس کے

باہر وہ عورت کی گزری اور دیا رکابے ثباتی کو مختار

سے دیکھنے کا ڈھونگ دچلتے تھے!

اگرچہ پہلے بھی عورت طوائف کے روپ میں موجود تھی مگر
ری، داسی یا بیچ ذات کی عورت محمودی سے کسی بھی تھی مگر
اگیر دارانہ نظام نے باقاعدہ طوائف کا ادارہ قائم کیا، حسن بازار
ہوئے اور مینارہ باز ہنسنے لگے اور یہی براہی اس
یشے نے ایک ذات کو جنم دیا یعنی طوائف کی جٹی طوائف بننے پر
لیور ہو گئی۔

اسی بات واضح ہو گئی کہ عورت موکل حکوم تو رہی مگر
اس لئے نہیں کہ وہ مرد کے مقابلے میں قدرتی طور پر (جسمانی یا دینی
حیثیت سے) کم زور ہے اگر ایسا ہوتا تو اس کو کبھی بھی سماج میں
مرد کے برابر یا مرد سے بزرگ و بڑا ملک عورت کا مرد سے بچھڑا ہوا
ہونے کا سبب یہ بھی نہیں ہے کہ مرد اس کو ذلیل کرنا چاہتا ہے
یا تکلیف دینے میں اسے مزا آتا ہے یا مرد عورت سے نفرت کرتا
ہے۔ عورت کے بچھڑنے پن کی وجہ یہ ہے کہ وہ جسمانی یا روحانی
طور پر ناپاک یا گناہگار قرار دی گئی ہے مگر عورت پر مرد کے حاوی
ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ پیداوار کے ذرائع، اعضاء، آلات
اور دیگر سامان پر مرد کا قبضہ تھا انسان سے جو دولت، ثقی تھی وہ مرد
ہی کی ملکیت مانی جاتی تھی عورت کی نہیں، یعنی عورت دن رات
محبت کرنے کے باوجود پیداوار کے ذرائع کی مالک نہیں ہوتی تھی
اور جب سراپہ داری نظام آیا تو اس نے غلام اندیم غلام کو بچھڑے
ہوؤں کو اور حقوق سے محروم بیچ ذات کے کہے جانے والے لوگوں
کو بھی صنعتی نظام کے ترقی یافتہ دور میں کھینچ لیا مگر عورت کو مزدور

یا دینے کے باوجود مزدور کے حقوق سے محروم ہی رکھا۔

اب سوال یہ ہے کہ عورت کو اس معیشت سے نجات کیسے
ملے؟ ان کو اس کا حق کیوں نہ ملے؟ اور وہ سماج میں برابر کی
درجہ کیسے پائے؟

عورت کے سماجی بچھڑے پن کو دور کرنے کا کیونسی نظریہ یہ
ہے کہ آج کی ہندوستانی عورت کو اس حقیقت سے روشناس کرایا
جائے کہ جو مقام یا رتبہ یا درجہ اسے ملا ہوا ہے۔ وہ باعزت مرتبہ نہیں
ہے احساس کی بار حق تلفی ہو رہی ہے اور گھراؤ باہر دونوں جگہ
اس کی حالت بہت گری ہوئی ہے۔ آج کی ہندوستانی عورت کو
بتایا جائے کہ جب تک سراپہ ملانہ یا بوشدنائی نظام ختم نہیں
ہوگا، نجی ملکیت کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں پیداوار
کے ذرائع، کارخانے، زمین، مکان، مشین، بجلی پیدا کرنے والے
پلاٹ، تیل، کوئلہ اور دھاتوں کے ذخیرے، نقد دولت اور وہ سب
چیزیں جو پیداوار کا اندلیہ ہیں ہندو سراپہ پستوں کے قبضے سے نکل کر
یا ان سراپہ فاضل کی حکومت سے چھین کر عام کی ملکیت نہیں بن
جائیں اور سراپہ داری نظام ایک سوشلسٹ نظام میں نہیں بدل
جائے تب تک محنت کش مزدور ہواکان، سلاک ہو یا انجلی تیل
مزدور عورت اس کی حالت نہیں سنبھال سکتی۔ ہندوستانی عورت
اور خصوصاً طور پر ہندوستانی کی مسلمان عورت کو باعزت رتبہ نہ پاؤں درجن
شادیاں اور نفعت و دین راج کرنا اسراپہ دار مرد سے سکتا ہے اور نہ
اس سڑو دان کے دسترخوان کے گوشے پر بیٹھنے والا ملا ہی اس کے انسانی
حقوق اس کو بخش سکتا ہے۔ مسلمان عورت کو باعزت تمام سوشلسٹ نظام
ہی میں ملے اور سوشلسٹ انقلاب کسان، مزدور، غریب اور متوسط
طبقہ ہی کے ذریعہ آسکتا ہے

سوشلسٹ ملکوں میں مال کا رتبہ۔ مسکو، لیا کا سوشلسٹ حکومت رچی سے ۴۵ دن پہلے اور

۴۵ دن بعد۔ چین کی چینی کمیونسٹ اتحاد نہیں کئی۔ مالدیوؤں کو رات کا کام یا اور نام کرنا نہیں ہے جس مال کے بچے

ہوتے ہیں اس کو سالانہ ۲۳۰۰ اگرک ذلیقہ ملتا ہے جب تک اس کا بڑا بچہ ۱۲ برس کا نہ ہو جائے۔ اگر بڑا وال بچے ہوں تو حکومت

ایک ایک کرک دو لاکھ پچو کو دیتی ہے۔ بنار، لیس بھی تنہا سمیت رچی کی چھٹی ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ تک ملتی ہے۔ سوچنے کی پیدائش

ہند میں مال کو پہلے بچے کو ۲۰۰۰ دوسرے پر ۲۰۰۰ اور تیسرے پر ۵۰۰ لیا اور چھٹے ملتا ہے۔

فرقہ پرستی - تحقیقی جائزہ

ہندوستان کے خوب صورت سیکولر جسم پر فرقہ پرستی ایک گوندہ کا سادہ جھنڈا ہے۔ یہ ایک چمپہ سیاسی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس مضمون میں ان تمام جواہرات کا بیان تو مشکل ہے بھرپور فرقہ پرستی کے فروغ کی چند جواہرات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا اور اس سلسلے میں تو دورائے ہوئی نہیں سکتیں کہ سیکولر کی منزل کے راستے میں جسے بڑا روڈ مارٹ اور صرف فرقہ پرستی ہے۔

1857ء کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد برٹش حکمرانوں نے "نظم کو رو بہ حکومت کرو" کی پالیسی اپنائی۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے نتیجے کو ابھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے انھوں نے دونوں کے بیچ بھوٹ ڈالنے کی سوچی کہ ان کی مخالفت طاقت کو درد ہو جائے اور وہی نفاذ ساریج آج ایک تناؤ درخت بن چکا ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیں۔ آئیے ہم تاریخ سے اسکا پسلسرا ڈھونڈیں۔

1857ء کی جدوجہد آزادی ہماری سیاسی آزادی کا ایک اہم اور پہلا سنگ میل ہے۔ اس کے بعد کی تمام تحریکیں اس سے متاثر تھیں یقیناً 1857ء کی جنگ آزادی ناکام ثابت ہوئی لیکن اس نے اسٹیج کو بردیا تھا جس کا پہل 1947ء میں آزادی کی صورت میں ملا اور اسی متحدہ جدوجہد نے جمہوریت کی سمت رہ سائی۔ اسی سے ملک کی مختلف قوموں کو ان کے فرائض کا علم ہوا۔ اور وہ اپنے حقوق سے واقف ہوئیں۔ اختیارات کی کسی پرتھوہ کرنے کے لئے

1857ء کی جدوجہد آزادی ہماری سیاسی آزادی کا ایک اہم اور پہلا سنگ میل ہے۔ اس کے بعد کی تمام تحریکیں اس سے متاثر تھیں یقیناً 1857ء کی جنگ آزادی ناکام ثابت ہوئی لیکن اس نے اسٹیج کو بردیا تھا جس کا پہل 1947ء میں آزادی کی صورت میں ملا اور اسی متحدہ جدوجہد نے جمہوریت کی سمت رہ سائی۔ اسی سے ملک کی مختلف قوموں کو ان کے فرائض کا علم ہوا۔ اور وہ اپنے حقوق سے واقف ہوئیں۔ اختیارات کی کسی پرتھوہ کرنے کے لئے

ہمیں کاہنہستانی مسلمان نمبر

ہندوستان کے خوب صورت سیکولر جسم پر فرقہ پرستی ایک گوندہ کا سادہ جھنڈا ہے۔ یہ ایک چمپہ سیاسی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس مضمون میں ان تمام جواہرات کا بیان تو مشکل ہے بھرپور فرقہ پرستی کے فروغ کی چند جواہرات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا اور اس سلسلے میں تو دورائے ہوئی نہیں سکتیں کہ سیکولر کی منزل کے راستے میں جسے بڑا روڈ مارٹ اور صرف فرقہ پرستی ہے۔

1857ء کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد برٹش حکمرانوں نے "نظم کو رو بہ حکومت کرو" کی پالیسی اپنائی۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے نتیجے کو ابھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے انھوں نے دونوں کے بیچ بھوٹ ڈالنے کی سوچی کہ ان کی مخالفت طاقت کو درد ہو جائے اور وہی نفاذ ساریج آج ایک تناؤ درخت بن چکا ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیں۔ آئیے ہم تاریخ سے اسکا پسلسرا ڈھونڈیں۔

ہندو زمین داروں کے خلاف برقی تھی۔ کیوں کہ اسے تو زمین سے مطلب تھا۔ لیکن فرقہ پرست زمین کے سرخوں نے صرف ہندوؤں کے خلاف اس کے اقدام کا ذکر کیا۔ اسی طرح رانا پرتاپ اور شیواجی کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ حالانکہ دونوں ہی نے صرف اپنے علاقے کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی فوج میں بہت سے مسلمان بھی شامل تھے جو اپنے ہندو ساتھیوں کے ساتھ ساتھ جنگ میں شامل تھے بغل اور افغان مغربی طور پر ایک ہی تھے۔ لیکن بابر کے خلاف جنگ میں کئی افغان افسرانہ سادہ لڑکے کے ساتھ تھے اسی طرح رانا پرتاپ کی فوج میں اکبر سے قبل کے وقت بھی افغانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اسی طرح اکبر کی فوج میں بہادر شاہ چوتھوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور وہ کئی ہندو راجاؤں سے لڑے بھی۔ ان خالوں سے عاف ظاہر ہے کہ وہاں مذہب سے زیادہ سیاست کو اہمیت دی جاتی تھی۔

اگر ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ مسلم اور ہندو حکمرانوں کے مفاد ایک ہی تھے۔ انھوں نے ذات مفاد ہی کے حصول کے لئے کئی بار آپس میں سیاسی بھجوتے بھی کئے، جنگیں بھی کیں اور اپنے ہی مفاد کے لئے دونوں مذہبوں کے ماننے والوں کے بیچ تبلیغ بھی پیدا کرتے رہے۔

برٹش سے پہلے فرقہ پرستی کا نام وراثت ان تک نہ تھا۔ معاشی طور پر ہر فرقہ خوش حال تھا اور تلوار کا راج تھا۔ اس لئے مذہب کا حال نہ مل گیا لیکن جب وہ لوگوں کے ذریعے حکمران چنے کا وقت آیا تو مذہب نے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ ایک پس ماندہ ملک میں بڑے لوگوں کے لئے مذہب زبان اور فرقہ ایکشن کے وقت بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں! 30 اپریل 1888ء کو آلہ اباد میں انڈین نیشنل کانگریس کے جلسے میں مسٹر اے۔ او۔ ہیرنم نے کہا تھا کہ ہم ہندوستانی معاشرے کو ذہنی اخلاقی اور سماجی طور پر سب سے زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں نے آنے والے دہائیوں کا اندازہ کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں ہندو مذہب و عقائد کا بھی تجربہ ہو چکا تھا اور وہ دوبارہ کوئی متوجہ نہیں دینا چاہتے تھے اس لئے نفرت کا بیج بویا گیا۔

اس وقت مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ پہلا گروہ ہم

کے میدان میں شہسوار کی حکمت کے انتظامیہ میں داخل ہونا چاہتا تھا جبکہ دوسرا گروہ 1857ء سے قبل کی صورت کو پس لانا چاہتا تھا۔ ذکر اول گروہ کی رہنمائی سرسید احمد خاں کر رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے متعلق بہت فکر مند تھے انہوں نے اسی لئے انگریز سرکار کے عدسے مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی جانب سے سرکار کی بدگمانی کو دور کرنے کے لئے 1860ء میں ایک کتاب "ہندوستان کے دفاتر مسلم" نامی قلم بند کی جس میں انھوں نے بیان کیا کہ بنیادی طور پر مسلمان انگریزوں کے دفاتر ہیں اور ان کے خلاف سرکار کو جو بدگمانیاں ہیں وہ سرکار ختم کر دے اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلمانوں کو ہندوستان کی جدید تعمیر میں انگریز سرکار کا ہاتھ بٹانے کے لئے کہا۔ پھر محطون اینگلو اور ٹیل کا ریج علی گڑھ کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک انگریز سرکار کی حمایت میں تھی۔

دوسری تحریک اس کے بالکل مخالف تھی، مخالف برطانوی حکومت اور قوم پرست۔ یہ تحریک علما نے اٹھائی تھی۔ اور اس کی محرک تھی علما کی معاشی بد حالی۔ برٹش سرکار نے ہندوستان میں شہین دلائیوں اور کارخانہ قائم کئے جس سے مسلم دست کار بے کار ہو گئے۔ مسلمانوں کی دیہاتی آبادی کا بیشتر حصہ دست کاروں، کسانوں، چھوٹے چھوٹے دکانداروں، جولاہوں اور چھوٹی چھوٹی جائیداد کے مالکوں پر مشتمل تھا۔ یہ سب ہی معاشی طور پر بہت پریشان ہو گئے مسلمانوں سے حکومت تو جیسے ہی لگی تھی۔ اس معاشی بد حالی نے جلتے پرتیل کا کام کیا۔ اور وہابی تحریک نے جنم لیا۔ یہ تحریک مکمل طور پر خطرناک مخالف برطانوی تحریک تھی۔ پروفیسر ڈبلیو۔ سی۔ سمٹھ کے کہنے کے مطابق وہابی تحریک ہندوستانی مسلمانوں کی پہلی منظم تحریک تھی۔ حالانکہ اس تحریک نے مذہبی رنگ میں جنم لیا تھا۔ لیکن اسے سیاسی اور معاشی طور پر پوری پوری تائید حاصل تھی۔ بنگال کے ہائین مسلمان کسانوں میں یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی علما نے عوام کو انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے پر اکسایا اور ہندوستان کو دار عرب قرار دیا۔ اس مذہبی فتوے سے مسلمان انگریز سرکار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پھر 1857ء میں انھوں نے

ہندوؤں کے دوش بدوش انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔
 WAMIS KOHM نے لکھا: 1857ء کی بغاوت سے معلوم ہو گیا
 کہ ہندو اور مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف بڑے پیمانے پر
 اتحاد ہو سکتا ہے۔ رشید احمد نکو ہی نے فتوح دیا کہ مسلمانوں کی انگریزوں
 کے خلاف کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیے۔ دہلیوں نے حضرت اٹلاز
 نامی کتاب میں ۵۵ سے زائد خط لکھا اور کیا ہوا انوشاخ کر گیا
 یہ تو ابھی کانگریس میں شامل ہونے کے لئے تھا۔ یہ محدود نظریے
 کے مالک، اور اخلاق، سہاج اور دنیاوی زندگی کو بھی کچھ پانے
 سے ناچنے والے علما، پیش سرکار کی مخالفت میں زمین دار کسٹم
 کے خلاف ہونے لگے تھے۔

علی گڑھ تحریک ابھری اور انگریزوں نے اس میں شامل علاحدگی
 پسند لوگوں کو اکٹھا شروع کیا۔ سر جان سربے نے برٹش پالیسی اس
 طرح بیان کی۔ "ان کا بڑا عار سیاسی نقطہ نظر سے ہونا بڑھاوا تھا۔
 اس سے ہماری پوزیشن اور مبسوط ہو گئی۔ مسلمانوں ۱۸۷۱ء کا حق ہمارے
 لئے زحمت کی بجائے رحمت ثابت ہوا۔ حالانکہ یہ غلطی ہی تو اذیت
 تھی، لیکن تمام دوسروں، بھاری تھے۔"

اس برٹش پالیسی کے اجاڑے آہستے آہستے ہندو اور مسلمانوں
 میں نفرت بڑھنے لگی اور ہمیں سے فرقہ پرستی کا جنم لیا گیا۔ اس بار
 ہماری سیاست فرقہ پرستی سے آہستے آہستے گر نکلا اور ہر اکودھن بد
 سیاسی فرقہ پرستی نے جس کا نام و نشان تک نہ تھا بڑھ کر پکڑ لی۔ یہ زیر پرست
 گہرائی تک پہنچ گیا اور پوری سیاست زہر آلود ہو گئی۔ برٹش
 پالیسی کے بہترین حصے، پھوٹے ڈالو حکومت کو ملے ایک بے
 عرصے تک انگریزوں کو سود و سود منافع بخشا۔

اس کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے میں تقسیم بنگال (1905ء)
 نے بھی ایک اہم رول ادا کیا۔ غرض انگریزوں نے ہندو مسلم منازت کی
 آگ کو ہوا دینے کی ہر ہر کوشش کی۔ ایسے احوال سے پورا پورا فائدہ
 اٹھاتے ہوئے انگریزوں کے حامی زمین دار اور آغا خان وغیرہ نے
 مسلم لیگ کو بے پروا کر دیا۔ انگریزوں کی ایما پر کیا گیا تھا۔ میوٹرٹم
 کا ڈرافٹ یورپ کے گورنمنٹ تیار کیا تھا، مسلم لیگ کی بنیاد کی وجہ
 یہ بیان کی گئی کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ ٹیڈ کرٹ

سے آرٹوٹپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر
 میدان کرنے کا غلط طریقہ اختیار کیا گیا۔ ہندوؤں کی جبریتاً
 کے کئی مالی بعد مسلمان بیدار ہوئے اور جب ان کی آنکھ کھلی
 تو معلوم ہوا کہ ہندو تجارت، صنعت و حرفت اور فنانس پر
 چھانٹے ہوئے ہیں ایسے سوتے پر انھیں چاہیے تھا کہ وہ خود کو
 اس کا اہل بناتے۔ لیکن انھوں نے ہندوؤں کو اپنا مخالف سمجھ لیا
 اور اس موقع کا مسلم لیگ نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دہلی ہندوؤں
 کو اپنا مخالف سمجھنے کی ذہنیت بھی مسلم لیگ ہی کی پیدا کردہ تھی۔
 مشرقی بنگال، سندھ اور پنجاب میں کسانوں کی بڑی تعداد مسلمان تھی
 اور ان کے زمین دار ہندو تھے۔ اس عجیب و غریب صورت نے
 حالات کو اور پیچیدہ بنا دیا اور فرقہ پرستی کو خوب خوب چھادی۔ اسی
 صورت کی پیدا کردہ تھی 1931ء کی موپلا بغاوت، موپلا بغاوت،
 نامی کتاب کے صفحے 26 پر کرشنن نے لکھا ہے کہ موپلاؤں کی
 بغاوت ہندو زمین داروں اور سودوروں اور انگریزوں کے خلاف تھی۔
 مسلم لیگ کی ہمیشہ ہی انگ رہی ہے کہ اسمبلی میں ان کو سیٹ
 ملے اور مسلمانوں کے لئے نوکری میں مکہ محفوظ ہو آزاد کی کی جبریت
 میں، انگریزوں کے خلاف اس نے کبھی حسرتیں لیا۔ یہاں تک
 کہ کبھی آزاد کی کانفرنس تک نہیں لگایا۔ وہ جدوجہد کے میدان سے
 دور رہا۔ دور ۱۹۰۶ء کی دوری شکل بھی ہندو جمہوریت اور
 سندھ کے چھوٹے موپلاؤں کے ہندو اقلیت کے لئے یہی
 کام کر رہی تھی۔ ان کی خالصتاً مذہب کے فرقہ پرست ہمیشہ ایک ہی
 زبان بولتے ہیں۔ ان کا مطلب بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ نوٹ کرنے
 کے قابل بات ہے کہ فرقہ پرست پارٹیوں نے تحریک آزادی میں
 کبھی بھی حصہ نہیں لیا۔ خلافت اور علم تعاون کے عروج کے زمانے
 میں یہ دونوں ہی پارٹیاں تماشائی بنی رہیں۔ لیکن 1922ء میں
 جو ری چوراکے واقعے کے بعد گاندھی جی نے فوراً ہی تحریک
 واپس لے لی اور اس طرح سیاست میں تھوڑی دیر کے لئے خلا
 پیدا ہو گیا۔ اس تہ سے کہ فرقہ پرستوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔
 انھوں نے محاذ بنگال لیا اور پھر 1925ء ۱۹۳۵ء کے درمیان
 ہی بڑے بڑے قراردادوں کو رد کیا۔ لیکن پھر فرسٹ پی فیسٹ

ختم ہو گئے۔ اور ۱۹۳۵ء کے بعد ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر پہنچ گیا اور ہندو مسلمان متحدہ طور پر اپنے کنہیوں سے انگریزوں کا جوا چھینک دینے کی کوشش کرنے لگے۔

۱۹۳۸ء تک مسلم لیگ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی اس کے پاس معاشی مسائل کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ وہ صرف نوکری میں محفوظ جگہ اور اسمبلی میں سیدٹ کی باتیں کرتی۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مسلمانوں کی دوسری جماعتیں مثلاً جمعیتہ العلماء اصرار پارٹی، اور آل انڈیا مومن کانفرنس مسلمانوں کے جذبات و حساسات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں مسلم لیگ محکمہ پر ختم ہو گئی تھی۔ شکست اس بری طرح تھی کہ وہ مسلمانوں کے ۵ فی صدی ووٹ بھی حاصل نہ کر سکی تھی۔ کانگریس کو اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ ایسے موقع پر مسلم لیگ نے نعرہ بلند کیا کہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے جس سے کانگریس مسلم لیگ اتحاد بھی متاثر ہوا۔ رفیع احمد دہلوی نے یوپی کی کانگریس غلطی کی جانب سے زمین داری کے خلعے کا بل پیش کیا۔ مسلم لیگ کے داروں نے اسے یہ کہنے والے طوفان کا ٹھکانہ بنا لیا۔ وہ اس طوفان سے پناہ لینے کے لئے جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ مسلم لیگ کے پاس کوئی معاشی پروگرام تھا ہی نہیں۔ زمین داروں کی شمولیت سے مسلم لیگ پوری طرف ان کے رحم و کرم پر ہو گئی۔ مسلمانوں میں ان کی شکلات کار و بار دیا گیا اور مسلم اقلیت علاقے کے مسلمانوں کو ان کے ہندوؤں کے مقابلے میں خوف میں مبتلا کیا گیا۔ جب کہ مسلم اکثریت علاقے کے مسلمان مسلم لیگ سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے، پنجاب میں سکھ ریٹیا خاں کی یونینسٹ، بنگال میں فضل حق کی پر جا کر خشک پارٹی اور سرحدی علاقے میں بادشاہ خان کے اثرات نے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے دور رکھا۔ ان پارٹیوں نے مسلم لیگ کے تقسیم کے پروگرام کو منظور نہیں کیا تھا اور ان کی حمایت ہی کی۔ یہاں تک کہ تقسیم کے بعد بھی مشرقی بنگال میں فضل حق کی پر جا کر خشک پارٹی نے بنگال کو متحدہ ہونا چاہنے کی تحریک چلائی اور اس سلسلے میں کانگریس سے مدد مانگی لیکن سنا پور شاہ دکر جی کے احتجاج سے ڈر کر کانگریس نے تقسیم بنگال کو قبول کر لیا۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوجانے پر ارد گرد برٹش انڈیا کی جنگ میں شمولیت کے خلاف کانگریس نے غلطی سے احتجاج کیا۔ اس احتجاج سے دیا۔ جناح نے اس دن کو یوم نجات قرار دیا جنگ میں شمولیت کی وجہ سے پوری قوم نگین تھی۔ اور مسلم لیگ خوشی منا رہا تھی۔ جناح نے ۱۹۳۹ء میں دو قومی نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ چیز نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ۱۹۳۳ء کے انجیر سیشن میں ہندو رہا بھلے بھی ہندوؤں کو ایک مختلف تہذیب اور کلچر رکھنے والی قوم بیان کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ ہندوستان کو صرف مادری وطن ہی نہیں پاک وطن بھی سمجھتے ہیں اور وہی ہندوستانی قوم کہلانے کے لائق ہیں۔ ۱۹۳۳ء ہی میں اس وقت اس کے ہندو رہا بھلے کے ہندو بھائی برہمن ہندو مسلم اتحاد کی بجو کر بھی اور سواراج حاصل کرنے کی طرف اس کا ایک اور یقینی مشرط ہونے کا مذاق اڑایا تھا رہا بھلے کے مطابق مسلمان اور کرکھیں کو ایک الگ رہا بھلے دیا جاسکتا تھا اور ان طرح ان کو تہذیبوں کے حقوق بھی دینے جاسکتے تھے لیکن انھیں ایک قوم نہیں مانا جاسکتا تھا۔ یو و اے میں بھائی برہمن نے لکھا کہ مسٹر جناح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے خاندانی حق صرف مسلم لیگ ہی کو ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر جناح کہتے ہیں کہ ملک میں دو قوم ہیں۔ اگر مسٹر جناح کا کہنا سچی ہے اور میرا خیال ہے کہ سچی ہے تو کانگریس کا ایک قوم کا نظریہ شکست پا جاتا ہے اب صرف دو راستے رہ جاتے ہیں۔ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یا ہندوستان ہی میں مسلمانوں کو ایک الگ حکومت بنانے کی اجازت دی جائے۔ ۱۹۳۷ء میں ہندو رہا بھلے کے احمد آباد کے سیشن میں تہری وی۔ ڈی سادو نے مسٹر جناح کی طرز و دو قومی نظریہ پیش کیا۔ مسٹر جناح کے دو قومی نظریے نے ملک میں ایک سیاسی طوفان برپا کر دیا تھا۔ لیکن اس کا مقابلہ ہندو اور مسلمان قوم پرستوں نے مل کر کیا۔ آزاد مسلم کانفرنس مسلمانوں کی اکثریت کی ترجمان تھی۔ اس میں قوم پرست ذہن کا تقسیم یافتہ طبقہ شریک نہ تھا۔ جی ایم سید احمد شہید بخش اس کے روح رواں تھے۔ اس میں مجلس ہزار آل انڈیا مومن کانفرنس، آل انڈیا انصار ایسوسی ایشن، جمعیتہ علماء اور کانگریس میں شریک تھیں۔ کانفرنس میں ۵۵۰ سے ۱۰۰۰

لوگوں نے شرکت کی اور اس کانفرنس نے دو قوی نظریے کی مکمل طور پر فرست کی۔

یہاں ہم مضر جملہ کے پیش کئے ہوئے بحثوں پر گفتگو نہیں کریں گے لیکن اس بات کی خوبی کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اس تقریر میں انھوں نے بڑی خوبصورتی سے زمین داروں کی غرض کو چھپایا تھا اور صرف عام مسلمانوں ہی کی تکالیف کا ذکر کیا۔ جو زیادہ تر غریب تھیں مسلم تاجر اور ہندو تاجر کے مقابلے اور ٹکڑاؤ کو بھی خوب سمجھتی ہے۔ چھپائے گئے دور نہ مسلم تاجر کسی طرح بھی ہندو تاجروں کے مقابلے میں نہیں ٹھک سکتے اور اسی لئے ان کے لئے ایک نئی اور علاحدہ آرگنٹ کا بندوبست کیا۔ اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ ۱۹۳۵ء کے دستور کی رو سے مسلمانوں کا صرف

۱۵ فی صدی ہی ووٹ دینے کے قابل تھا جو اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو معاشی طور پر بخش حال تھا اور باقی ۹۵ فی صدی کو پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ہماری تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ ووٹر مسلمانوں میں سے صرف ۵۵ لاکھ مسلمانوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا اور کھٹ تقسیم ہو گیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرقہ پرستی کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تاریخی، انبیائی، مذہبی اور معاشی تمام اصولوں نے اس ایک فرقہ پرستی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اب صرف معاشی انصاف اور سوسائٹی کے تمام فرقوں کو ترقی کے لئے برابر کے مواقع فراہم کرنے والا سوشلسٹ سماج ہی اس عظیم ٹریجڈی کے بچنے ہوئے رستوں کو بھر سکتا ہے!



گائے کی قربانی

یہ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان میں اس قسم کی دوستی دہرائی اور محبت روز بروز بڑھتی جاوے اور سوشل حالت میں ایسی ترقی ہو کہ مسلمان بجز مسجدوں کے اور ہندو بجز مندر کے پچانے نہ جائیں جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و ارتباط ہندو مسلمانوں میں ترقی پکڑ جائے ہم کو نہایت خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ ریلوے میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے یعنی بٹر عید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی بل کہ ہندوؤں کی خاطر سے بکرے اور بھیڑوں کی قربانی کی اور ہندوؤں نے محرم کے زمانے میں سیلیں لگانے کا اور مسلمانوں کے ساتھ فم میں شریک ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ہماری بھی عزت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

سر سید احمد خاں۔ علی گڑھ گزٹ، ۹۷-۱۸۸۸

ہندوستانی مسلمانوں کے بعض تعلیمی مسائل

طرف مڑ جاتی ہیں۔ گویا اس علاقے میں تعلیم کے معاملے کے ساتھ ہی اردو زبان کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

ان دو طبقوں یعنی اردو دواں اور قسطنیہ غیر اردو دواں کے علاوہ ایک تیسرے طبقہ ان مسلمانوں کا بھی ہے جسے ہم ذوالسانی گروپ کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سبئی شہر کو چھوڑ کر ہمارا شہر کے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو وہ پڑھے لکھے عموماً یا بالکل ان پڑھے مراٹھی اتنی ہی سہولت سے بولتے ہیں جتنی کہ اردو۔ البتہ ان پڑھے ہندو کی وجہ سے اردو ہو یا مراٹھی، ان کی زبان قرار دینے کے اعتبار سے نام درست ہوتی ہے مسلمانوں کے ایسے طبقے کے لئے یہ بات بالکل ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے کہ ان کے بچوں کی تعلیم اردو میں ہو یا مراٹھی میں۔ ہاں جذباتی طور پر وہ اردو میں تعلیم دلانا زیادہ پسند کریں گے مگر مجبوری کے تحت مراٹھی اسکول جانا پڑتا تو وہاں بھی بچے کو کوئی دقت نہیں ہوتی اس طرح یہ طبقہ گھروں میں اردو بولتا ہے اور تعلیم مراٹھی میں حاصل کرتا ہے اور کبھی تو کلاسیکی زبان کے تحت سنسکرت یا آودھ گدھی سیکھتا ہے۔

جن علاقوں میں مسلمان مقامی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں سیکو (تعلیم کی خاطر انھیں اپنے اسکول کھولنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے وہ دوسروں کے شانہ بشانہ میٹھ کر پڑھتے ہیں مسئلہ ان لوگوں کا پیدا ہوتا ہے جو اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر یا اسے ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کا خاطر اپنے

ہندوستانی مسلمانوں کے خالص تعلیمی مسائل عام ہندوستانیوں کے مسائل سے کچھ جدا کا نہ حیثیت نہیں رکھتے۔ البتہ ان کے بعض مسئلے خصوصی نوعیت کے ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کے لئے بے چینی کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان میں پہلا مذہبی تعلیم کا اردو و مراٹھی کے تعلیم کا مسئلہ اردو کی تعلیم بھی سارے ملک کے مسلمانوں کا مسئلہ نہیں کیونکہ کئی علاقے ایسے ہیں جن میں مسلمان نہ تو اردو بولتے ہیں نہ پڑھتے ہیں کیرل، تامل ناڈو، گجرات، کاٹھیاواڑ، بنگال اور آسام کے علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت وہاں کی مقامی زبان بولتی ہے اور اسی میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ اس لحاظ سے انھیں اردو سے کوئی تعلق ہونا نہیں چاہیے مگر دیکھا جاتا ہے کہ اکثر وہ بھی اردو کے حق میں آواز بلند کر کے اپنی جذباتی ہم آہنگی کا اظہار اتنی شدت کے ساتھ کرتے ہیں کہ جیسے ان کی زبان اردو ہی ہو (مثلاً ایک جلسے میں مسلم لیگ کے ایک بہت بڑے لیڈر اپنی تقریر میں کانگریسی حکومت پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ اردو کو ختم کر کے مسلمانوں کو غیر اسلامی (UN-ISLAMIC) کر رہی تھی، لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ خود لیڈر صاحب اردو سے قسطنیہ نا بلند اور تقریر بالانگریزی میں کر رہے تھے) شمالی ہندوستان میں کم و بیش اختلاف کے ساتھ عام لوگوں کی زبان ایک ہی طرز کی ہوتی ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اور جس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ زبان ہندی ہے یا اردو شہروں میں البتہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبانیں اردو یا ہندی کی

گلن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

اسکول کھولنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کی کبھی انھیں اجازت ملتی ہے کبھی نہیں ملتی ہے اور ملتی بھی ہے تو کئی طرح کی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ ملک میں جب کبھی اردو کو اسلا جائز حق دلائے کی تحریک اٹھتی ہے تو ذمہ من شمالی ہندوستان بلکہ جنوبی ہندوستان کے غیر اردو وال مسلمان بھی ایسے مطالبے کی دل نائید کرتے ہیں۔ کیوں کہ بجا طور پر وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی ہندوستانی زبان میں اسلام کا سب سے زیادہ مذہبی لٹریچر کتاب کو وہ اردو ہے۔ اردو زبان کے بعد ایک شخص بڑی حد تک دینی معلومات کی فاعل عربی اور فارسی سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے رسم الخط کے ذریعے وہ قرآن مجید اور اس کے تفسیریں پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے اس خیال کے تحت شہر والے باکفعمال اور دوسرے علاقوں کے ذہنی مسلمان اردو کے اسکول قائم کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

مسلمانوں میں اردو کی مقبولیت کا ایک دوسرا سبب اسکی شہسختی اور لطافت ہے۔ عربی اور فارسی سے بیکار ہو کر ہندوستانی مسلمان اردو ہی کو اپنی تہذیب، شہسختی اور ثقافت کی علامت تصور کرتے رہے ہیں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ یہ علامت ان میں پائی جائے۔ اگر اس شوق میں اکثر یہ بات ذرا غمان ہو جاتی ہے کہ کوئی زبان صرف زبان کا حقیقت سے ایک ایک قصہ ہے اور اسے مزید ترقی دینا اسے اور سرکاری زبان کی ترقی استھان کے جانے کا اکر دور کہنا بڑی دیر کی بات ہو جاتی ہے۔ ان دونوں باتوں کے دائرہ طلب میں بڑا فرق پڑتا ہے۔ ایسا بار بار میں آغا خان نے پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ عربی کو ہی زبان بنائے جسے خصوصاً ماقبہ پاکستان کا دھندل میں آجائے دیکھتے ہوئے یہ مشورہ مقبول تھا۔ ایک طرف باسٹنڈنگ پاکستان اپنا آئیڈیولوجی سے قریب ہو جاتا ہے دوسری طرف وہ سیاسی حقیقت سے عرب قوموں میں شمار کے ہونے کے وجہ سے ایک بڑی عرب برادری کے رکن بن جاتا ہے۔ مگر اس مشورے کی تائیدیں کوئی آدمی نہیں اٹھا سکتا۔ یہی سبب رہا ہے۔

ہاں یہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے

اردو میں اور اردو کے ذریعے تعلیم دلانے کا انتظام کرنے سے پہلے ذہن صاف ہو جانا چاہیے کہ مقصد کیا ہے؟ اس معاملے میں اب تک جذبات سے زیادہ کام لیا جاتا رہا ہے اس لئے کئی ضروری اور اہم پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ جن علاقوں میں اردو پڑھنے والوں کی معقول تعداد جتنی ہے وہاں اردو کے ذریعے تعلیم دلانے کا مطالبہ اور ان کے لئے کوشش کرنا درست ہے جہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد قلیل ہو وہاں صرف ایک نمونہ کی حیثیت سے پڑھنے کا موقع اور سہولت فراہم کرنا کافی ہے اور اس کا سلسلہ ابتدائی جماعت سے لے کر اعلیٰ سطح تک ہونا چاہیے۔ غیر اردو علاقوں میں جہاں لوگ عموماً مسلمان خصوصاً اردو ایک جدید ہندوستانی زبان کے طور پر یا نہ ہی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پڑھنا چاہتے ہوں۔ اردو ملک کے مختلف حصوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کافی ہے ان کے لئے۔ خط و کتابت کے ذریعے اردو کے کورس ہونے چاہئیں اور خصوصاً جس ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو میں سرٹیفکیٹ اور ڈیپلومہ دینا ایسے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مسلمانوں کا دوسرا اہم مسئلہ ان کا مذہبی تعلیم کا ہے۔ ایک نمونہ تھا جبکہ بچوں کو قرآن مجید، دینیات کی کچھ کتابیں اور تھوڑی بہت فارسی پڑھانے کے بعد سکول تعلیم کے لئے اسکولوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اب حال یہ ہے کہ بچوں کو کچھ فارسی یا کچھ عربی سے غریبی یا کمزور کارڈ میں اور اس کے بعد اسکولوں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں مسجدوں یا مکتبوں میں اسکول کے اوقات کے علاوہ ناظرہ قرآن مجید پڑھانے کا انتظام ہوتا ہے جن میں بچے سال دو سال گزارتے ہیں یا پھر یہ کام مکان ہی پر کر لیا جاتا ہے یہ صورت حال غیر قابل بخشش ہے۔ اس لئے مسلمان بچوں پر خصوصاً کہتے ہیں کہ اگر ان کے اپنے اسکول ہوں تو سکول تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے لئے تھوڑا سا وقت نکالا جاسکتا ہے جن میں روزہ نماز، سیرۃ یا تاریخ اسلام، بزرگوں کے حالات وغیرہ جیسے مضامین پڑھائے جاسکتے ہیں۔ مسلم اسکولوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں نادان مسلمان، غلبہ کی فیس کی

مذہبی تعلیم کے بارے میں ہمارے ملک کی سرکاری پالیسی بدلتی رہی ہے کبھی ایسا محسوس ہوتا رہا کہ یہ بات پسند کی جا رہی ہے کہ بچوں کو اسکولوں میں مذہبی تعلیم دی جائے اور کبھی اسی مذہبی تعلیم کے نام پر سرکاری طبقے ناک جھوڑ چڑھاتے ہیں کبھی اس کی اجازت مٹی بھی تو اسکول کے اوقات کے پیشتر یا بعد ۱۹۵۵ء میں بھی میں بہت بڑے پیمانے پر کلہا پتہ دینی تعلیمی کونشن منعقد ہوا۔ اس کی کامیابی کی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں کی تاریخ میں خاندان بار مختلف مکاتب خیال کے مسلمان یکساں ہوئے تاکہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ اسکولوں میں دینی تعلیم کا انتظام کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی پشت پر مولانا ابوالکلام آزاد کا اشارہ تھا کہ اگر اس قسم کا مطالبہ کیا گیا تو حکومت اس پر ہمدردانہ طور سے غور کرے گی۔ مگر کونشن کا بیڑا میں یہ بات صاف ہو گئی کہ الگ کرنا نہ صرف سیکولر حکومت کے پیرسٹ کی نفی ہو گی بلکہ یہ ایک خطرناک اقدام ہو گا جس سے فائدہ کم نقصان زیادہ ہونے کا خطر ہے۔ البتہ کونشن نے یہ مشورہ ضرور دیا کہ مسلمان اپنے قائم کئے ہوئے اسکولوں میں یا اسکول کے اوقات سے باہر مسجدوں یا دوسرے مقامات پر دینی تعلیم کے مراکز کھولیں، اجتناب نظام تعلیم ہو۔ اس انداز کے لئے ترمیمی کیسپ اور مراکز کی نگہداشت کا انتظام کریں۔ چنانچہ دہلی میں تعلیمی بورڈ قائم ہوا۔ کچھ کام ہوا بھی مگر رفتہ رفتہ یہ تحریک ٹھنڈی پڑتی گئی۔

چونکہ دینی تعلیم کے مسئلے کی اہمیت اب بھی اپنی جگہ قائم ہے اس لئے مسلمانوں کو حالات اور خصوصیات سمجھتے ہوئے حالات اس پر مسلسل غور کرتے رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں چار باتیں غور طلب ہیں: (۱) کیا پڑھایا جائے (۲) کہاں پڑھایا جائے (۳) کب پڑھایا جائے (۴) کون پڑھائے۔؟

یہ چاروں سوال اپنی جگہ بحث کے موضوعات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر مجلس مذکرہ منعقد ہونی چاہیے۔ تب ہم اپنی راہ متعین کر سکتے ہیں کا میاب ہو سکیں گے۔ اردو کی تعلیم ہو یا دینی تعلیم کا مسئلہ ان

کی اہمیت کے باوجود جو چیز کہ ہمارے اعزاء فکر کو الجھن میں ڈالتی رہی وہ دستور ہند کی بعض چھب دگیاں تھیں۔ وفات ۲۹، اور ۳۱ کی رو سے مذہبی لسانی اور ثقافتی اقلیتوں کو بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب، زبان یا ثقافت کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لئے اقدامے (جن میں تعلیمی اقدامے شامل ہیں) قائم کریں، اور حکومتوں کو بھی اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جو اقدامے اس طرح کے قائم ہوں ان کو نہ کڑی گرانٹ دینے میں کوئی امتیازی سلوک نہ کریں بشرطیکہ وہ ادریشیتوں سے اس کے حقدار ٹھہریں۔ اس صریح دستوری حق کو ریاستی حکومتیں اور بسا اوقات مرکزی حکومت دوسری دفعہ کا سہارا لے کر منسوخ کرتی رہیں۔ اور ایسے احکامات نافذ کرتی، ہیں جس سے ان اقداموں کا اقلیتی کو دیا یا تو محدود ہوتا رہا یا پھر وہ حق ہی سلب ہو گیا۔ اس غیر یقینی صورت کے تحت، اقلیت اپنے اقداموں کو غیر محفوظ سمجھتی رہی اور ایک طرح کی الجھن میں بھی گرفتار رہی۔ گذشتہ اپریل میں خوش قسمتی سے سپریم کورٹ کے ایک تاریخی فیصلے نے الجھن دور کر دی۔ ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے

عدالت نے دفعات ۱۹ اور ۲۰ کی جو موادیت کی ہے اسے اب شک
شعبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ غرضیکہ اور سانی اقلیتیں اب آزادی کے ساتھ اپنے
تعلیمی انارے قائم کر سکتے ہیں اور ان میں اپنا اقلیتی کو یا برقرار رکھ سکتی
ہیں۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اقلیتوں کے چارہ کار درجہ رکھتا ہے بلکہ انوں کو
چاہیے کہ وہ اسکا بغیر طالعہ کریں اور اس کی اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ تلوار
رکھنے کی اجازت کا اصل کر لینا بڑی بات نہیں ہے لیکن تلوار کو مطرح سنبھال کر رکھنا
گزرتنگ کو بھی نہ ہونے پاتا اور اسکی دفعہ سے بلکہ وجہ عقوبت اب بھی نہ ہونے پاتے۔ بہت
اہم بات یہ عدالت کے فیصلے کی بنیاد یہ ہے کہ مگر ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق
اکثریت کے حقوق کے مساوی ہونے چاہئیں۔ تاہم ایک شمیری اور مہرے کے مقابلہ
میں نابرابری محسوس کرے۔ اس اختلاف کو حل بھی ایسی سمیت دی چاہیے کہ شمیری
اور شمیری میں فرق نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد اس آئینہ طبقے کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے
اس قسمی حق کا استعمال کر نہیں کسی حد تک اور انہی اور انہی کی کثرت و تناسل
وہ چاہے تو اس حق کے تحت پیش کیا کو تعقی طور پر دوسرے شریوں سے جدا کر کے بنا جو بڑ
اگے ہندو مت کا بھرتہ ہے یا نہ سمیت اور ہوش ہندی سے سماحق استعمال کر کے
دوسرے شریوں کے خلاف بدوش کوڑا ہو کر مساوی درجہ میں مل سکتا ہے۔ ۵۵

مسلمان اور تعلیم

مسلمانوں کی معاشی و سماجی بحالی کا سب سے بڑا سبب تعلیمی پس ماندگی ہے۔
 ہمارے سابق چیت جس میں مسلمانوں کے مطابق مسلم فردوں میں صرف
 ۱۰ فیصد ہی اور مسلم خواتین میں ۶۰ فی صدی سے بھی کم تعلیم یافتہ ہیں۔ اس طرح اسی
 پورے نرے میں جیسے فی صدی سے بھی کم لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ ۱۹۱۱ء کے
 مردم شماری کے مطابق ملک میں ۲۹ فی صدی سے کچھ زیادہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔
 مرد ۵۹.۵ فی صدی اور عورتیں ۱۸.۶ فی صدی۔ اس طرح صاف ظاہر ہے کہ
 مسلمان تعلیمی لحاظ سے بہت پس ماندہ ہیں۔

پھر بھی صورت حال کچھ اتنی بھی زیادہ خراب نہیں ہے۔ آزادی کے بعد کئی سال
 نے اُسے اندازاً نصف چار سو لاکھ سے ایک ارب چار سو لاکھ کے مطابق بڑے ملک کے
 کاجوں اور اسکولوں کے تقریباً ۷۰ لاکھ طلباء میں سے دو لاکھ پچاس ہزار کے
 قریب مسلم طلباء ہیں یعنی تقریباً ۹۰ فی صدی تعلیم یافتہ سالوں میں صورت کچھ نہ کچھ
 بہتری ہوگی۔ اب فکر کی بات صرف یہ ہے کہ کل ہند آبادی میں مسلمانوں کا جو
 تناسب ہے وہ تناسب کئی طلباء اور مسلم طلباء کے تناسب سے کہیں زیادہ
 ہے۔ اُمید ہے کہ بہ فرق آئندہ چند سالوں میں اور بھی کم ہو جائے گا۔ پھر
 خاصیت کے لحاظ سے مسلمان ٹیکنیکل اور پروفیشنل لائسنس کم ہی اختیار کرتے
 ہیں۔ اس کے بجائے مسلم طلباء آرٹس اور سائنس کاجوں میں داخلہ لیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اسکول ہی کی سطح پر ان کا وہی سائنس اور حساب جیسے
 مضامین سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اسے صرف باقیات نا اہل لائسنس اور خلاف مدراء لائسنس
 کا کھانا ملتا ہے۔ بے شک سائنس اور حساب مشکل مضامین ہیں۔ اور جب تک
 اسکول کے کمرتا و خزانہ اور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اُنہیں تعلیم کو ذہن میں
 رکھتے ہوئے خاص توجہ نہیں دیں گے تب تک تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ فرتے

مسلمان کی تعلیمی ترقی کا دوسرا سب سے بڑا سبب اس کی وہ ذہنی
 ہے جو اسے ملائی زبانوں سے ٹھنڈی کہتی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو ہی

اس کی مادی زبان ہے، خواہ وہ ملک کے کسی بھی حصے میں رہتا ہو! اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان اچھا مسلم اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک وہ لہجہ نہ بڑھوے۔ حالانکہ صرف امدی کے فیصلے اسلام کو سمجھنا امداس پر عمل کرنا فرضی نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں مسلمان دوسری زبانیں بولتا ہے امدان پر فخر کرتا ہے۔ ہندستان میں بھی بہت پروٹیسٹس کے باوجود ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں امدے سے بھی کم مسلمانوں نے امدو کو اپنی مادی زبان بتایا ہے۔ یوپی کے علاوہ بہار، جیہا، بام، اندھرا، جیسے علاقوں کے مسلمان جہاں یا تو شمالی ہند سے بڑی تعداد میں آکر بس گئے ہیں یا پھر وہاں حکمران ہے، اپنی مادی زبان لڑو دگھڑنے میں امد ہندوستان کے بغیر حصے کے مسلمان اسی علاقے کی علاقائی زبان کو مادی زبان کہتے ہیں۔ مگر یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق امد بولنے والوں کی تعداد ۶ کروڑ ۹ لاکھ کس طرح ہے، جب کہ اسی رپورٹ کے بموجب مسلمانوں کی تعداد ۶ کروڑ ۱۵ لاکھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو امدے سے زیادہ مسلمان کافر ہیں، یا پھر اسلام سے برگشتہ ہو گئے ہیں۔ لیکن اس بات سے وہ بھی انکار کرتے ہیں جو اسلام امدو کو ایک ہی دھڑے میں پر مکتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے ہیں اپنے ذہن میں ایک بات کو یاد رکھیں کہ اس بات میں سیاسی قائد امدو کیا کہتے ہیں؟ ہندوستان میں مسلمان حاصل شدہ تعلیمی سہولیات کا اسی وقت پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ علاقائی زبانوں کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرے۔ جیسا کہ جیسے ہی کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے امدے سے زیادہ مسلمانوں کی مادی زبان علاقائی زبانیں ہیں۔ اس تعلیمی اصول کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں کے ایک حصے ہونے کے ناطے مسلمان بچوں کو یوپی امدیہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ امدو کو ذریعہ تعلیم بنانا ایک غلط بات ہے۔ ان ریاستوں میں بھی اگر تعلیم کو مذہب اور مذہب سے منسلک کر کے دیکھا جائے تو مانتا ظاہر ہوگا کہ امدو کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرنے سے مسلمانوں کو صرف نفعان ہی ہوگا، نہ صرف نوکریاں حاصل کرنے میں بلکہ تعلیمی ترقی میں۔ یہ سرکار کی پالیسی یا اکثریت کی مسلم دشمنی کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک عام سوچہ بوجھ کی بات ہے کہ جس علاقے میں جو زبان اکثریت سے بولی جاتی ہے وہاں کے لوگوں کی زندگی اس زبان کا ایک اہم مقام بن جاتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر اس جگہ صادق آتی ہے

جہاں جمہوری صورت ہو۔ یہ نہ صرف خلافت، قانون، بلکہ خلافتِ شیعہ کی بات ہی ہوگی کہ ایک اقلیتی زبان جو یوپی امدیہ میں بھی ۱۵ ویں صدی سے بھی کم تعداد کے لوگوں کے ذریعے بولی جاتی ہے، امداس سے بھی کم تعداد کے لوگوں کے ذریعے دوسری ریاستوں میں، تو صرف تاریخی اہمیت ہی کی وجہ سے امدے خاص اہمیت دی جائے۔ اگر سرکار یا چند سیاسی پارٹیاں اپنی غرض کی وجہ سے یہ مانگ کرتی ہیں، تو وہ کیا کریں، سماج ایسی ناجائز و غیر جمہوری مانگ کو قبول نہیں کر سکتا! اگر اب اصل و مفیدہ فرقیات پسندانہ اقدام اٹھاتے ہیں تو اس سے اقلیت امد اکثریت کے بیچ صرف ایک خلیج ہی پیدا ہوگی۔ اور یقیناً یہ بات اقلیت کے لئے ایک نقصان دہ بات ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ ہندوستان میں کسی بھی مذہب کے ماننے والوں نے اپنا رشتہ کسی خاص زبان سے نہیں جوڑا۔ سکھ، مسیحی، لیکن انھوں نے بھی پنجاب کے علاوہ کسی دوسری ریاست میں پنجابی کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی مانگ کبھی نہیں کی!

اگر مسلمان بچوں کو بھی اسی ذریعہ تعلیم کا پابند بنایا جائے جو ذریعہ تعلیم دوسرے بچوں کا ہے تو اس سے مسلم ذہن پر اس میں ایسی بے جا بڑے سماجی سیاست کی نگاہی ہوئی آگ بڑھتے ہوئے ہونے لگی۔ آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اگر مسلمان امد ذہن مسلمان بچے ایک ہی کلاس میں، ایسی، ایک ہی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کریں، ایک ہی کھیل کھیلیں، امد بھی، امد بھی، ایسی میں جھگڑا بھی، کرکٹ، رگبی، ایک ہی زبان میں! تو اس سے دونوں فریق کے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان دونوں میں بنیادی عداوت کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہر جگہ انسان ایک ہی جیسا ہوتا ہے، خاص طور پر بچے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی یہ باوجود اس کے کہ یہاں مختلف زبانیں ہیں، مختلف ہند ہیں، مختلف مذاہب ہیں، مختلف براس ہیں، غرض ہر چیز مختلف ہے!

علاقائی زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے امدان کو اپنی مادری زبان قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلم بچے امدو نہ پڑھیں، مسکرت امدو کی طرح امدو بھی ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے! بلکہ امدو سے پڑھنے کی خواہش کریں۔ امداس کے لئے ممکن امد بوجہ سہولت فراہم کرنی چاہئے۔ امدو کو اسکول امد کالج میں ایک اختیار دینا کا مدد دیا جائے۔ بلکہ ایسی طرح جس طرح مسکرت، امدی، فرانسیسی، جرمن یا کسی بھی دوسری ہندوستانی!

غیر ملکی زبان کا مقام ہے فی حال اسباب نہیں ہے۔ اس بلکہ میں کئی ریاستوں کے سرکاری ماہرین تعلیم کو یہ غلط فہمی ہے کہ مسلمان یا تو اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھتے ہیں یا پھر پڑھنے ہی نہیں ہیں۔ مثلاً ہمارے مدرسے میں سرکاری فارمولے پر اس طرح لکھا ہوتا ہے کہ اگر ایک مسلم طالب علم درویشی کو مادری زبان کی طرح اس سے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہے تو اسے ہندی اور انگلش کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھنا پڑے گا۔ اسے ہندی یا انگلش کی جگہ اردو اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر وہ اردو میں تعلیم سے تعلیم حاصل کرے تو اسے درویشی کی تعلیم ناواقف بنے گا۔ اس طرح امور کے لئے وہ ہی راستے رہتے ہیں کہ یا تو وہ درویشی ذریعہ تعلیم سے تعلیم حاصل کرے اور اردو کو مکمل طور پر چھوڑ دے، یا پھر اردو کے لئے تعلیم حاصل کرے اور درویشی پر مکمل دسترس حاصل نہ کر سکے! اس سلسلے میں یہ بالکل ایمان بخش قسم مٹا دیا جاسکتا ہے کہ درویشی کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھنے والے بچے کو ہندی یا انگلش کی جگہ اردو لینے کی اجازت ہو۔ یہ ایک اچھا قدم ہے اور ترقی کی جستجو

ان کے مات کو نقصانی ہے کہ یہ تبدیلی کوئی ہی چاہیے! ان کے حدود حکومت کو تعلیم کے ایک دوسرے پہلو پر بھی دھیان دینا چاہئے۔ ہندوستانی تعلیم محض ان کی ہوجو علی ہے، بعد سائنس اور جدید طریقے کا نفاذ ہے۔ یہ بہت سے خیر مسلم تعلیموں نے اسکولوں میں تو اس سے بھی

زیادہ دھڑلایا جاتی ہے۔ اکثر پالیسی بنانے والے اوزار ذہن کے مالک اور ان کے منیر مسلمانوں کو خاص سہولت اور ان کے عام ادراک تکلیف دہ سکولوں کو خاص رعایت دی جانے کی بات کہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ اس قسم کی باتوں سے مسلمانوں میں دوسرے خبری ہونے کا احساس پیدا ہو جائے گا، وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے اور ان میں دوسرے سے مقابلے کی ہمت ختم ہو جائے گی۔ مسلم بچوں کو نہ تو اسکول کے لئے کسی خاص رعایت کی ضرورت ہے اور نہ تو کسی کے لئے کسی خاص سہولت ہی کی! ضرورت یہ ہے کہ ان میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ بھی دوسرے ترقی یافتہ فرقوں کی طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ ان کے مائول ہی میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ کیوں کہ مسلم بچے جس ماحول میں پرورش پاتے ہیں وہ ماحول مقابلہ کرنے کے جذبے کو ابھانے میں قطعی طور پر ناکام ہوتا ہے اور کام کرنے کی تربیت کے لئے بالکل بے کار۔ جدید زمانے سے بالکل الگ انداز اسباب۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلم فتنے کی اکثریت معاشی طور پر پس ماندہ ہے، اور پس ماندہ گئی تھی میدان کی ترقی میں ماننے ہے۔ خاص طور پر ٹیکنیکل اور پروڈکشن ٹیکنیس میدان میں۔ یہ دونوں مسائل بہ آسانی حل کئے جاسکتے ہیں بشرطہ کہ مسلم قیادت اس بات اپنے وقت کو مناسب طور پر استعمال کرے اور اس سلسلے میں مرکز کو کسی قسم کی مداخلت کرنے پر مجبور کرنے کی حد تک غافل نہ رہے!

اوپری اور زبان

”جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے، ہندوستان کے بعض سنی اسے دھرم میں مبتلا نہیں ہے۔ ہندوستان کے اردو ختم نہیں ہو سکتے۔ مگر ہندوستان مسلمانوں کے اسے خیال ہے میں متفق نہیں ہوں اور اپنے خیالات کا کئے بار ریاست میرے ہمارے اظہار کو بچکا ہوتے اور میرے یہ قطعے رائے کہ پچاس ہاں کہ بعد اگر کسی ہندوستانی کو پاکستان میں لکھا ہوا خط ملا۔ تو اس ہندوستانی کو خط پڑھوئے کیلئے بالکل اسے خرچ ہے کسی مسجد میں ملنے کے پاس جانا ہو گا جسے طرح طرح کی ہندو کو عربی زبان میں کو خط سے خط کو پڑھوئے کیلئے کسی سے ملنا کو تلاش کرنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ زبان دنیا میں زندہ نہیں ہے بلکہ صرف ہندوستان میں ہی ہے۔ یعنی یہ کیلئے روٹی اور زبان کا بہت بڑا مفت ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج اردو زبان کے مرکز حلقے کے کسی بچے میں بھی کوئی ایسا غیر مسلم نہیں ہے جو گلاب اور دھواں اور دھو کر ہندی پڑھتا ہے۔ اس کے والدین جتنے ہی کہ مستقام بہت ہندی ہی معاش کا ذریعہ ہوگا (دیوان کا مضمون)

ہندوستانی مسلمان

ان کا وطن ہے۔ دراصل اس میں اسلام کافی نفسی اتناہات نہیں ہے بلکہ اسلام کی یہ وہ مخصوص تعبیر اور تشریح ہے جو ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ عام مسلمانوں کے سامنے کرتی رہی ہے اور اسلام کی اس مساحت آمیز تشریح کے اثر سے ہندوستانی مسلمان ان بے شک ذہنی پائیا۔ اب ضرورت ہے کہ نئے حالات کے مطابق اسلام کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا جائے جس میں تقسیم ہند سے پہلے کا مسلمانائی رنگ نہ ہو بلکہ ایسی متحرک چمک رہو جو ہندوستانی مسلمان کو آج کے مسائل اور مواقع سے برادر آواز ماننے کا حوصلہ بخشنے۔

ہندوستانی مسلمان اپنی آج کی حالت کے لئے ٹھنڈی اسی لئے ذمے دار نہیں کہ انھوں نے قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی حالت کو ابتر بنانے میں ان مسلمان لیڈروں کا بھی ہات ہے جو ۱۹۴۰ء کے بحران دو میں پاکستان چنے گئے تھے۔ پڑھے لکھے مسلمان، آج اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو باتیں مسلمان تھے ان کی اکثریت نے پاکستان کا راستہ لیا اور عام مسلمان بڑی حد تک کاروان بے یوسف بن کر رہ گئے مسلم لیگ کے اس ہجرت کی حمت افزائی کی اور یہ نہ سوچا کہ وہ جانے والے مسلمانوں پر کیا گزرتے گی۔

پاکستان کے نظریے اور وجود میں ہندوستانی مسلمانوں کی "خوابی" کی ایک صورت "مغز" رہی ہے لیکن ان کی خوابی کا اس سے زیادہ اہم سبب خدا ان کا اپنا ذہنی رجحان اور رویہ ہے پاکستان کی حکمت عملیوں کا اثر نسبتاً ان پر کم ہوتا اگر وہ اپنے نظریے اور برتاؤ کو درست کر لیتے۔ ہندوستانی کے مسلمان نے پاکستان کے وجود سے زیادہ نظریہ پاکستان سے لگاؤ رکھا ہے اور تقسیم ملک کے بعد بھی یہ لگاؤ ختم نہیں ہوا ہے اور یہی لگاؤ ان کے جذباتی اور سماجی انتشار کا سب سے بڑا سبب ہے جب تک ہندوستانی مسلمان اسی طرز پر سوچتے رہیں گے اور اپنے رجحان اور رویے سے پاکستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس کا موقع دیتے رہیں گے کہ وہ انھیں "ہندوستانی مسلمان" نہ سمجھیں اس وقت تک ان کی پوزیشن غیر واضح ہے رنگ اور بھم ہے گی اور انجام کار ان کی ساری صلاحیتیں منتشر ہو جائیں گی۔

ہندوستانی مسلمان کا مذہب، اسلام ہے۔ وہ چیز ہے جو حالات کی پیچیدگیوں میں ان کا سہارا ہے۔ ایک ایسا تفسیق سہارا جو عالم کس پیڑ میں ان کی ڈھارس بندھاتا ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمان یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ اسلام ہی ہے جو انھیں پاکستان سے جوڑتا ہے اور اُس ہندوستان سے الگ رکھتا ہے جو دراصل

یہ معاملہ اتنا زیادہ اختصار کا سبب نہ بننا اگر ہجرت (فرار) کا یہ سلسلہ جاری نہ رہتا ہوتا۔ ۱۹۴۷ء میں جن مسلمانوں نے پاکستان کا انتخاب کیا۔ بہر صورت وہ ایک فیصلہ تھا۔ غلط یا درست۔ مگر ان کی بات بالکل الٹی ہے کہ جنہوں نے پہلے ہندستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور وفاداری کی قسم کھائی۔ لیکن بعد میں بے وفائی کی۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں کی بے چارگی کس پیرسی اور اس تلخ احساس میں اضافہ ہوتا رہا کہ وہ بے رہنما ہو کر رہ گئے ہیں یہی نہیں بلکہ اس مسلسل ہجرت کا یہ اثر ہوا کہ جو مسلمان ہندستان میں رہ گئے تھے ان کی وفاداری بھی خشک ہو گئی۔ اور جن مسلمانوں کے اہمال اور شلوں سے یہ ثابت ہوتا گیا کہ وہ اپنے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ ایسے فوجی مسلمانوں کی تعداد خاصی ہے جنہوں نے ہندستان کی یونیورسٹیوں سے ڈگری لی اور ہندستان میں ملازمت تلاش کرنے کے بجائے پاکستان چلے گئے۔ کئی مسلم رہنماؤں نے (بعض سائنس تو ایسی ہیں کہ انہوں نے اس ملک کی وفاداری کا حلف اٹھایا اور وقت دار تھے حاصل کئے) بعد میں ایسے موقعوں کی تلاش کی یا انہیں ایسے موقعے پیش کئے گئے کہ وہ فوراً اور اچانک سرحد پار کر گئے۔ اولیٰ اور دومی دنیا سے تعلق رکھنے والے بعض انھاس نے بھی یہ کیا اور غالباً سب سے زیادہ ملک کے لئے مفرت رساں واقعہ وہ تھا کہ جب ہندستان فوج کے بڑی گنڈیر جنرل انیس ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کرنے دے دار اور طے عمدے تک پہنچ جانے اور فوج کے خفیہ معاملات تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اپنی درخواست پر ۱۹۵۵ء میں ریٹائر ہوئے اور پھر پاکستان پورج کو حکومت پاکستان کے ملازم ہو گئے۔ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے روئے سے ان مسلمانوں کی پودیش کتنی خراب کر دیتے

ہیں جو ہندستان میں رہتے ہیں اور جنہیں ہندستان میں رہنا ہے بری گنڈیر انیس نے جو حرکت کی ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اب ہندستان میں کسی مسلمان کا بری گنڈیر ہونا مشکل ہے (اور حقیقت یہ ہے کہ چراسی ہونا بھی مشکل ہے) اندو کے ہندو شاعر جوش کی ہجرت کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ ہندستان میں ان کے جانے کے بعد اردو کا مستقبل تاریک تر ہو جائے۔

حیدر آباد کا المیہ (۱۹۴۸ء) اور اس کے خلاف مسلمانوں کا جذباتی احتجاج اس کی واضح مثال ہے۔ یہ واقعہ مسلمانان ہند کی اس کوشش کا ایک اور ثبوت ہے کہ وہ جمہوری ہندستان میں اپنی نئی پوزیشن تسلیم کر لے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک شان دار ماضی کی دھندلی جاہ و حشمت سے تعلق ان کے جذبہ فخر داری کی چوٹ اندر گڑے ہوئے زلزلے کی اس یادگار کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی پرجوش لیکن بے سود کوششیں... حیدر آباد کے مسلمانوں کو حالات کی غلط تاویلات کی جو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے اسے بھی نہ بھولنا چاہیئے۔ ایک مسلمان نے مجھ سے کہا: جب مجھے معلوم ہوا کہ حیدر آباد میں پولیس ایکشن ہو رہے تو میں مسلمانوں کی حالت پر رو دیا، لیکن آخر میں ان کے تمام کلام و مصائب کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے حق میں یہ بہت مفید ثابت ہوا۔ یعنی یہ کہ احمقانہ جذباتیت کا چرلے آخری بار ہو کر کرکھ گیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انھیں زندگی کی حقیقتوں کا جیسی کچھ بھی وہ ہیں مقابلہ کرنا چاہیئے۔

ہندستان میں مسلم اقلیت کی کم زوری کا بنیادی سبب اسکا پاکستان سے (ذہنی اور جذباتی) تعلق ہے اور یہی وہ کم زوری ہے جس کی وجہ سے یہ مسلم اقلیت اس تعلق کو ختم کر دینے کے لئے

سلسلہ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اکثر مسلمان غلاری سے وفائی اور دشمناس گھات کے ترکب ہوئے۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کو اپنی قومی حکومت کا نمکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے نہ ان سے انتقام لیا اور نہ انھیں دوسرے دوسرے کا شہری سمجھا۔ انیس اور جوش کی دغا کے بعد وہ مسلمانوں کو ملک کا سبب سے بڑا عداوت کا عطا کیا یعنی وہ صدر جمہوریہ بن گئے۔ سلمان لطیف کو ہوائی فوج کا اعلیٰ ترین افسر مقرر کیا گیا۔ اولیٰ اور مسلمان عبداللہ کو سب سے بڑے سرکاری صنعتی ادارے کا مہم اعلیٰ بنایا گیا۔ اس کے باوجود ہندستانی مسلمان اگر اب بھی اس قومی حکومت کو ہندو حکومت ہی سمجھتے رہے اور ہندو کو اپنا دشمن گردانتے رہے تو پھر ایک دن حقیقت یہ ہندستان جنت نشان امریکہ لئے اسپین بن جائے گا۔

شے کے

آباد نہیں ہوتی۔ برہمن متعلق ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کو با تہا جان
لو جھک کر تسلیم نہیں کرتی یا اسے مان لینے کی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ مسلم
اقلیت جتنی زیادہ غیر محفوظ رہے ہے اتنا ہی اس نے اس تعلق
کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

دراصل یہ سارا معاملہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اس سیاسی
حالت کی المناک اور واضح شرح ہے کہ جس کے وہ حالت یاں
اور عالم افسردگی میں مرتب ہوئے۔ یہی نہیں بل کہ اس سے اس امر
پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ذہنی اور اخلاقی طور پر اس بات کا اندازہ
کرنے اور تسلیم کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ آج آنے والے زمانے
میں اسلام کی بری اور غیر مری عظمت کوئی شکل اور مختلف انداز
میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ان مسلمانوں کے لئے جو کچھ کی طرف دیکھنے
کے عادی ہیں یہ جان کر بڑی تکلیف ہوئی ہے کہ خدا اور انہیں
اقوام متحدہ کو بھی اس بات سے قطعی دیکھی نہیں ہے کہ اسلامی قدروں
اور کارناموں کی وہی قدیم شکل برقرار رہے۔ ہندوستان میں اسلام

کے عظیم اور پر شکوہ مستقبل کی تعمیر ان کے ہاتھوں نہیں ہوگی جو ایک
نظام کے نامندوں کی برائی اور کھوکھلی جاگیروں کے خاتمے پر قائم ہے
جس میں کہ یہ بڑا کام وہ لوگ انجام دیں گے جو اسلام کی آفاقی اور
ابدی سچائیوں کی تلاش میں کوشاں ہیں اور اس بات کی جدوجہد
کرتے ہیں کہ ان کا پورا اندر آج کے حالات پر پڑے۔

یہ یقین ہے کہ مسلمانان ہند کی مادی اور روحانی ظلال
وہود کلارا اس میں ہے کہ وہ خدا کے بھروسے پر اپنے پیروں
پر کھڑے ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنے نئے
اور بدلی ہوئی حالت کو تسلیم کر سں اور اس میں خود اپنی قسمت
بنانے کے لئے اپنی نئے ماریوں کو پہچانیں اور قبول کریں
دوسروں پر بھروسہ اور اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرنے کی
صلاحیت پیدا کریں، اور آزادی، ایمان داری اور تخلیقی قوتوں
کے ساتھ نئی قوم کی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہوں۔

پاکستان کی تحیل و تشکیل کا سہرا اقبال و جناح کے زیر

دراصل پاکستان دو قوی نظریے کی تخلیق ہے۔ نظریہ پاکستان ڈاکٹر اقبال کے نظریات ملی اور مسٹر
جناح کے سیاسی رجحانات کی تخلیق ہے۔ اپنے سیاسی مشن میں مسٹر جناح کو ڈاکٹر اقبال سے بڑی مدد ملی ہی
ہے۔ اقبال اپنی تقریر اور مراسلت دونوں ہی سے مسلمانوں کے لئے ایک الگ حکومت بنانے کی تلقین
کرتے رہے ہیں۔ 21 جون 1937ء کو اپنے ایک خط میں ڈاکٹر اقبال مسٹر جناح کو لکھتے ہیں: ”آپ
ہی ہندوستان میں وہ واحد شخص ہیں جس سے تمام قوم کو اس طوفان کے خلاف جو کہ شمال مغرب اور شاید
سارے ہندوستان میں آرہا ہے رہنمائی مل کرے کا حق حاصل ہے!“ 7 اکتوبر 1937ء کو اپنے ایک دوسرے
خط میں اقبال نے جناح کو پھر وہی بات لکھی: ”ہم لوگ ایک امتحانی دور میں ہیں اور ہندوستان کے
مسلمانوں کو امید ہے کہ آپ کا خطبہ صدارت (لیگ کے سالانہ اجلاس الکا باد) قوم کے مستقبل کے لئے اُن کے
ہر ممکن کوشش کرے گا۔“ مارچ 1940ء میں مسٹر جناح نے جو تقریر کی وہ دو قوی نظریے کے حق میں تھی۔
اور اسی کی بنیاد پر پاکستانی تحریک مل میں آئی۔ اس لئے پاکستان کی تحیل کے ذمے دار ڈاکٹر اقبال تھے اور تشکیل کا
سہرا مسٹر جناح کے سر بندہ!

ڈاکٹر شان محمد

پاکستان کا فضلاء عالی شان

زبان اردو اور متعصب اردو دان

حقیقت میں میر صاحب نے اں چار شعبوں میں بہت غوطے کھائے ہیں اور اخلاط کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ لیکن انتخاب کرنے پر کچھ الفاظ کام کے بھی نکل سکتے ہیں جیسے اوپر مثال میں ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اردو کے سب سے دانا کون بزرگ تھے۔ ان کے بھی حالات پر اس قدر پردہ ڈالا گیا ہے کہ وہ کسی سے اٹھائے نہیں اٹھتا۔ ان کی جائے پیدائش، حالات زندگی، تاریخ وفات نام صحیح امداد تو کیا معنی اصلی نام تک مسخ کر دیا گیا۔ اں بزرگ کا اصل ام رائے بنو الی داس جٹن گر۔ لقب ولی نام تخلص رکھا تھا۔

یہ اکبر اعظم کی سلطنت کے آخر دور میں جلوہ افروز ہوئے جب پرورش دربان اور رہن سہن میں مسلمانوں اور ہندو مشرفاد میں بظاہر کوئی اختلاف نہ تھا۔ مسلمان ہندی اور سکوت پرٹھنے کے شائق تھے تو ہندو خاص کر کاسیتھ اور کشتری برہمن عربی اور فارسی کے جید عالم و مسلمان زبان دانوں کے دوش بدوش پائے جاتے تھے۔ گیتا یا فارسی میں منظوم ترجمہ فیضی ہی نے سب سے پہلے کیا تھا وہ آج بھی موجود ہے فیضی سے پہلے گیتا کا کوئی ترجمہ نہیں۔ جہانگیر کے دور حکومت میں ہمارے بنو الی داس شاہی قیل خانہ کے دروغ تھے ۱۶۱۹ء میں جہانگیر نے رائے کے خطاب سے نوازا۔

شاہ جہاں کے عہد میں منصب ہزاری پر سر بلند ہوئے عالمگیر کے عہد میں آپ کے اعزاز میں وہ لائٹانی امانت ہوا کہ کسی دوسرے

اردو زبان کی ابتداء کے بعد لکھنؤ اور دہلی کا جھگڑا شروع ہوا۔ خواجہ عشرت لکھنوی جان اردو ۱۹۲۰ء میں دہلی میں جب دہلی اور لکھنؤ کے مقابل ہوئے تو دونوں میں رقابت پیدا ہوئی۔ دہلی کے رہنے والے شاعر تو ہمیشہ آپس میں دھڑکتے تھے۔ لکھنؤ کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اور یہ جھگڑا اعلیٰ پڑھانا گیا۔ پہلے تذکرہ تانیث کا سلسلہ شروع ہوا۔ دہلی والے سانس کو مذکور ہوتے ہیں۔ لکھنؤ والے کہتے ہیں سن قلیہ کے جتنے الفاظ ہیں سب مونس ہیں اور قرینہ بھی یہی کہتا ہے کہ ہر مونس دہلیں جیسے ناس، آس، گھاس، چپراس، مٹھاس، مساس، ساس، اسی طرح اور بے شمار جھگڑے ہیں۔ دہلی والوں کا خیال تھا کہ اس جنگ میں ہمارا پتہ بھاری رہے گا اور لکھنؤ کو نیچا دیکھنا نصیب ہے گا مگر لکھنؤ وہ لکھنؤ نہ رہا تھا کہ جو اپنی مادری زبان میں کسی دوسرے کا محتاج رہتا۔ اس نے بھی ٹھونک کر مقابلہ کیا مگر بالآخر پالا اسی کے ہاتھ میں رہا!! اب حضرات دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اختلاف آج تک موجود ہے۔

حضرت میر لکھنوی نے ایک فرست تیار کی جس میں اردو کو چار شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہندو۔ مسلم۔ لکھنؤ۔ دہلی

مثلاً ہندو	مسلم	لکھنؤ	دہلی
پتاجی	وہا، باباجان، آبا جان	گرٹھنا	گھڑنا
جیہا جی	دہڑی، بھن، آپا	پکھنا، کھنا	یکھنا، کرنا
جیہا جی	دو لہا، جیانی	ناپنا	مپنا

ہنگن سلکھن ستانی ملان جبر

درباری کو میسر نہ ہوا۔ ذیل کے دو شعروں میں اپنا نام اور تخلص کا اظہار فرمایا ہے۔

باد نون و الف زینوالی
رنت از پیش ماند صرف ولی
اسم بدترم نیست بجز بنوالی
در شعر تخلص و بیانی اسے والی

ولی صاحب دیوان ایک ہی شاعر گزرا ہے۔ ان کی آہستہ شعری محیط المعرفت پر بودہ چند موسومہ گلزار حالی (فارسی) دیوان (ریختہ) دیوان فارسی گنج عرفان۔ راجا ولی شاہان دہلی کی تاریخ وغیرہ آخری عبارتوں میں وہ سب ساز و سامان اولاد اولاد کی تقسیم کر کے بھگوت گجین یا محو ہو گئے تھے لیکن انہوں نے جہانگیر شاہ جہاں اور عالمگیر تین کا ابتدائی دور یعنی مغلیہ بادشاہوں کا عہد حکومت دیکھا۔ ۱۵۵۵ء کی تاریخ وفات لکھی ہے لیکن معلوم نہیں کہ حضرت احسن مارہری نے کس بنیاد پر لکھا ہے کہ ۱۵۵۵ء کی تاریخ تک ان کا زندہ رہنا پایا جاتا ہے۔

حضرت آسن لکھنوی لکھتے ہیں۔

تاریخ دیکھ لیجئے اردو زبان کی
وہی ہی یہ زبان ہے ہندستان کی
اردو کو سلسلوں کی زبان کہنے ملا وقت
ہے ریختہ میں پہلی غزل چند بھان کی

چند بھان نام اور برہمن تخلص تھا۔

تعبص جسے میں پہلے کہ چکا ہوں کوئی بیاری نہیں میں پوچھنا
ہوں کہ کیا ذوق۔ غالب اور موتی کے عہد میں اور مصحفی، تاریخ، آتش
کے دور میں کوئی ہندو شاعر نہ تھا۔ ضرور تھے لیکن تعبص کا بیل بالا
ہونے کی جہ سے ان کے نام و کلام مفقود ہیں۔

اردو کے ساتھ جبے انصافی اور علم ہوتا رہا ہے وہ بھی کوئی
نئی تخلیق نہیں۔ مسلمان ہر قیمت پر اردو کو فارسی عربی الفاظ کے جانے
پہناتے رہے اور ہندی الفاظ متروکات کی زہر میں بھی ہوئی پھری
سے زہن کرتے رہے۔ میں پوچھنا چوں کہ لفظ سدا خالص اردو
کا لفظ ہے جو سدا سے بننا ہے اس کے متروک کہنے کی وجہ فرماتے

ہنگ ہنگ ہنگستانی ملان نہر

میں کہ صد عربی میں آواز کے معنی پر ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا
ہے ایسے بکراؤں الفاظ ہیں انہیں بھی ترک کر دیجئے۔

مخلّا ارض (الف سے) یعنی زمین اور عرض (نیں سے) گزراش چوڑا
ایم ۔ رنجینے والا علم ۔ جاننے والا
امارت ۔ حکومت عمارت ۔ مکان
ثواب (ث سے) نیکی صواب (م سے) ٹھیک صحیح
نثر ۔ پھل سمر اس سے) کہنا

لیکن پھول کا نام آج بھی سدا بہار ہی ہے اور ایک فرقہ بھی ہے
جو سدا سہاگ کے نام سے مشہور ہے۔

لفظ ختم خاص اردو کا لفظ ہے۔ ہندی میں حرف خ نہیں۔
جان صاحب لکھنوی فرماتے ہیں۔

اول ختم ہی کرنا نہ تھا جو کیا کیہ
کر کے جو رند ہی چھوڑ دیا یہ برا کیہ

محاورات سنو! میں لکھا ہے کہ لفظ سین اور تفتین صحیح ہے انکو
صادراکن سے لکھنا غلط ہے اس کے معنی دشمن کے ہیں اور تماشا
دیکھ کر خواجہ عشرت لکھنوی اصلاح زبان اردو میں فرماتے ہیں
پہ (پہ) کے بدلے۔ امیر مینائی۔ داغ۔ اور جلال کے اشعار پیش
کر کے لکھتے ہیں۔ پہ کا استعمال اب اکثر نص نے ترک کر دیا ہے اس کے
بدلے پہ۔ بولتے ہیں آخر میں جلال و داغ نے بھی ترک کر دیا تھا
لیکن خود ان کا شعر ہے۔

آستانے کا ترے ادب بیاں ہو کس سے

مجھ کو پہنچا دیا گردوں پہ جبین سائی نے

(جلوہ یا سئی جون ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۷)

پہ۔ داغ اور جلال تو کیا ترک کرتے آج تک تو ترک ہوا نہیں۔
ہندوؤں کی فارسی دانی کا یہ عالم تھا مرزا ہر گوال بھٹنا اگر تفتہ
سکند آبادی کی تمام تصانیف فارسی میں ہیں۔ غالب۔ برتن و غیرہ
کے اردو کلام موجود ہیں اور خود تفتہ صاحب کے شاگردوں کے
کلام مع اصلاح اردو میں پائے جاتے ہیں لیکن تفتہ صاحب کا
کوئی شعر اردو کا نہیں ملا۔ حضرت مخدوم صاحب نے جو ایک قطعہ
اردو کا تفتہ صاحب کی طرف منسوب کیا ہے، وہ مرزا لکھنہ کا

نہیں۔ اس سے صرف ۴۹۵ اعداد نکلے ہیں اور یہ غالب کی تاریخ وفات نہیں ہے

فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق

چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی انکساری سے متعجبین کا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ وہ بغیر جھجک یہ کہنے لگے کہ اردو ہماری زبان ہے کثرت ہر چیز کی نقصان پہنچاتی ہے آخر ایسی بھی انکساری کیا کہ متعجب حضرات سر پر ہی چڑھ جائیں۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔

آج بھی اگر تمام ادباء و شعراء مل کر چاہیں تو ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ تعصب، حسد اور احساس برتری کو بالائے طاق رکھ دس میں ابھی ایک مثال منصفانہ فیصلہ کی پیش کرتا ہوں محترم علام عشق آبادی تذکرہ تانیث کے تحت فرماتے ہیں۔ اس وقت تک تذکرہ تانیث کا کوئی فیصلہ کسی بزم یا مرکز ادیبانے کیا ہی نہیں۔ ہر چند قواعد کی کتابوں کے مولفین نے سراوا۔ قواعد بنائے مگر قواعد صرف کتاب کا ایک محدود حصہ عام و عوام کو کیا بڑے بڑے اہل قلم اس معاملہ میں دھینگا دھینگے سے کام لیتے ہیں کیا مزہ ہے کہ سینچے دیئے ہوئے الفاظ جو شاعر ایک جگہ ذکر لکھتا ہے دوسری جگہ وہی مونت کتا ہے۔ مثلاً ناسخ لکھنوی لکھتے ہیں۔

بجی اس کے میل کی بتی اگر کی بن گئی ذکر

ریزہ ریزہ میل صندل کا بڑا وہ بگیا

بوتری زلفوں کی جاتی ہے جو اکثر کان میں

میل ہو جاتی ہے رشک رشک و ہنر کان میں مونت

اسی طرح ابو۔ فکر۔ بجنہ۔ بلبل۔ طوطی۔ قلم۔ قلمرو۔ خرہ۔

معدن۔ نال۔ نقاب۔ ہما۔ وغیرہ۔ اور بہت سے لفظوں کی تذکرہ

تانیث کا یہ حال ہے کہ ایک ادیب ذکر کرتا ہے تو دوسرا مونت

اب فیصلہ کون کہے بعض الفاظ کی تذکرہ تانیث میں دہلی اور لکھنؤ

کا فرق پیدا کیا جاتا ہے ایسے الفاظ کم و بیش ایک ہزار ہوں گے۔

اور چند الفاظ ایسے بھی ہیں جو واحد و کثرت کے جاتے ہیں اور بصورت

جمع مونت مثلاً "لفظ" ذکر ہے لیکن لفظیں مونت ہے۔

گلن کا ہند نہ سائی نہ سمان نہ

ناسخ لکھنوی

ہو طلب سے اس قدر نفرت کہ رہتا ہے خیال

آز جاے لفظ طلب پر باب استفعال کا

رشک لکھنوی

جمل کی رات بنا نامہ شوق گیسو

شام لفظیں ہیں پیدی کی ہر حرکت کا غل

اسی طرح دو دو ذکر، دو دیں مونت اور مزار و مزار میں مونت۔

دویر لکھنوی

دو قدم جب مرا مزار را

بیرقی میر

جب ہم گئے دو چار نئی دیکھیں مزار میں

بلبل۔ طوطی۔ چیل۔ بیڑ۔ تتلی۔ مینا کی تذکرہ کچھ نہیں۔ لال کی

مادہ کو اہل دہلی جیتی کتے ہیں مگر اہل لکھنؤ لال ہی کتے ہیں اور پیمپاک

مونت کچھ نہیں۔ ساری دنیا تو حشر کو ذکر کرتی ہے مگر میر تقی میر مونت لکھتے ہیں۔

خلق یکجا ہوئی کتا رے پر

حشر بر پا ہوئی کتا رے پر

قامت ہزار فی ہزار مونت ہے لیکن آتش لکھنوی کو ذکر نظر آتا ہے۔

قامت موزوں تصور میں قیامت ہو گیا

چشم کی گردش نے کار فتنہ دو راں کیا

جان۔ کبھی ذکر سنا ہے؟ نہیں سنا تو میر تقی میر کی زبانی سنئے۔

آج اُس مریض غم کا، بچی میں جان لڑا

اب چند الفاظ ایسے کہ جو ایک معنی میں ذکر اور دوسرے معنی

میں مونت ہیں۔

لفظ	معانی	تذکرہ تانیث
آب	پانی	ذکر
۔	کچھ رونق	مونت
بار	بوجھ۔ پھل	ذکر
۔	نوبت۔ غل مرتبہ	مونت
بحر	سمندر	ذکر
۔	وزن شعر	مونت

لفظ	معانی	تذکرہ و تائید	مد	حساب کی	مونث
گنڈ	گنڈ	مذکر	مذکر	سورج	مذکر
چاند	فذل توتقی	مونث	۔	محبت	مونث
چاہ	قر۔ بیٹا	مذکر	نال	ناف	مذکر
چمن	کھوپڑی	مونث	۔	بندوق کی نال	مونث
چاند	کنواں	مذکر	نیاز	حاجت	مذکر
چمن	خواہش، محبت	مونث	۔	نذر	مونث
چمن	ملک کا نام	مذکر	دون	حرف تہی	مذکر
چمن	شکس سلوٹ	مونث	۔	پھلی	مونث

فصلہ :- جتنے پرندے اور جاندار ہیں سب زراۃ ہوتے ہیں۔ بلبل زبھی ہوتا ہے اور راہ بھی۔ اسی طرح چل۔ طوطی بیٹا اگر آپ کا بلبل نہ ہے تو کئے کو بلبل چمک رہا ہے اور اگر راہ ہے تو کئے کو چمک رہی ہے۔ اس میں کھنڈ یا دہلی کے پھر لگانے کوئی وجہ نہیں۔ اب رہا سوال غیر جان چیزوں کا اس کے لئے تو اعدیں کافی مواد ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پانچ فصیح عالم شعرا کی اسناد ہیں اور بس۔
(بھول۔ جون ۱۹۵۷ء)

اب آخر میں سب سے اہم سوال اردو کی بقا کا ہے۔ مسلم کا نفرنس یا ناں مسلم کا نفرنس سے مطلب حل نہیں ہو سکتا بل کہ بقول ابراہیم خاں عمر موجد کی طرح لڑو مگر ایک رہو

یعنی تمام اہل قلم حضرات متحد ہو کر زبان اردو کا حق سوائیں۔ مدرسوں میں باقاعدہ اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو۔ سرکاری وغیرہ سرکاری سکولوں، دفاتروں، عدالتوں میں اردو کو وہی مقام ملنا چاہیے جو پہلے تھا۔ اردو اہل قلم کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ آج ہمارا اردو دشمن آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں جنگ آزادی کے وقت وہ کہاں سو رہے تھے۔ اہل اردو نے میدان جنگ آزادی میں جواڑا ادا کیا وہ کیا اسی وقت کہ ہمید پر کیا تھا۔ دشمنان اردو ذرا اپنے مگر یا توں میں جھانگیں تو کسی محال بجانے اور تھوک بلونے سے اہل اللہ کی حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ کوئی بھی اردو تباہ اور ادیب ایسا نہیں جس نے مادہ وطن کے گیت نہ گائے ہوں اور

خلال	دانت کریمہ کا آکر	مذکر
دار	بازی میں ات کھانا	مونث
مال	گھس	مذکر
دھپہر	سولی	مونث
شام	حمدی جی	مذکر
عرض	مشہور غلہ	مونث
فصل	گھنے کا وقفہ	مذکر
میت	وقت خاص دن کا	مونث
سکان	ملک کا نام	مذکر
گدڑ	وقت غروب۔ مونٹھ	مونث
معدن	چوڑائی	مذکر
گدڑ	گزارش	مونث
معدن	فاصلہ فوری	مذکر
گدڑ	نوسم کتاب کا حصہ	مونث
معدن	گھس	مذکر
گدڑ	شعر	مونث
معدن	گوش	مذکر
گدڑ	معدن	مونث
معدن	گدڑنا۔ جانا۔	مذکر
معدن	بہر اوقات	مونث
معدن	کلام اخبار میں ہر گز نہ	مذکر

اپنی پوری قوت سے آزادی کے رہنماؤں اور پیروؤں کی حوصلہ افزائی نہ کی ہو اور نہ معلوم کتنے شاعروں نے فرنگی قید و بند اور دیگر صوبوں میں شانہ بشانہ رہنماؤں کا ساتھ دیا حضرت علامہ عشق آبادی فرماتے ہیں :-

پہلے والے ہیں جو نصف آستیں کی قمیص پہنے
وہ آستینیں چڑھائیں گے کیا زبان کیلئے

دشمنانِ زبانِ اردو ہمارے سلسلے آئیں ہم ان کو بتا سکتے ہیں کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ اہل عرب تمام ساز و سامان سے زیادہ تحفظ و قدر اپنی زبان کی کرتے ہیں یہ فعل ان کا قابلِ آفریں ہے۔ ہمیں بھی ان سے یہ سبق لینا واجب ہے جس بھی اپنی زبان کی قدر اور تحفظ کے لئے دشمنوں سے لڑنا پڑے گا۔

جب تک مدرسوں میں اردو پڑھائی نہ جائے گی یہ زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ہمیں خواہ اردو کا یہ اذلیں فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے اسکولوں اور کالجوں میں مطالبہ

کریں تاکہ حکومت اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم ملائیکا انتظام کرے۔ حکومت کی طرف سے نااہل اردو مصنفین شعرا ادبا کی جو ناجائز مالی امداد کی جاتی ہے۔ وہ بھی اردو کی بقا و حیات کے لئے خطرناک ہے۔ جیسا کہ اتر پردیش اور دہلی کی کمیونٹی نے جن طلبہ و طالبات اردو پر انعامات دینے میں ان میں سے اکثر و بیشتر فنی غلطیوں سے بھرپور اور بے تکلفی تو قابلِ قبضی ہیں۔ اردو کی بقا کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سرکاری اعلیٰ دستی اور باسٹور مصنفین کو روکی جائے۔

حکومت کی طرف سے حرکتیں اردو میں شائع کی جا رہی ہیں ان کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور یہ اس وجہ سے نااہل مترجمین مصنفین اور مصلحتین کو بھاری بھر کم معاوضہ دیکر کتابیں تیار کروائی جاتی ہیں اور پھر اسے خوشامداری اداروں کی سرفرت چھوڑی جاتی ہیں جو چار گنا اُجرت چارج کرتے ہیں اور اکثر یہ کتابیں صحیح واقعات سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی ہیں اور حکومت کا یہ طرز عمل بھی اردو کی ترقی میں خطرناک ہے۔ ●●

اردو اور سیاست

اس سے پہلے بھارتیہ ہندو مت پرشاد کے اجلاس کے موقع پر لکھا تھا جسے اودائے کے ساتھ ساتھ بڑا سرکہ ہوا۔ وہ ہندی کے حق میں تھے اور جسے ہندوستان کے حمایت میں۔ میں نے بہت کما۔ آپ ہندوستان فرمائیے "میں آپ کے ساتھ ہوں۔" میں نے کہا کہ نیشنل کانگریس کا ریزولوشن ہے کہ ملک کے زبان ہندوستان ہوگے کہنے لگے وہ ریزولوشن بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ اس جلسے میں انڈین نیشنل کانگریس کے نمائندے بیٹھے جاگنے پر بیٹھ موجود تھے، جو بت بنے بیٹھے تھے۔ ایک کے لئے کچھ نہ بھوٹا، اور کسی نے میری کیا۔ کانگریس کے ریزولوشن کے لئے تائید نہ کی۔ آخر میں حضرت مہاتما نے فرمایا۔ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ تو میں نے کہا۔ ہم اردو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم ہندی انھوں ہندوستان کے دھوکے میں نہیں آ سکتے۔ ہم لفظوں کو نہیں ملے کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق

مکتبہ کائنات، دہلی

اسلام اور مسلمان

جناب مغربی انجیئر کے چند انگریزی مقالوں کا مجموعہ 'اسلام اور مسلمان' کتابی صورت میں من قریب شائع ہونے والا ہے اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر غلام انصاری نے لکھا ہے۔ غلام صاحب کا یہ دیباچہ چون کہ 'گلن' کے مزاج کے مطابق ہے اور زیر نظر 'ہندوستانی مسلمان نمبر' کے مقصد کو بھی بخوبی کرتا ہے۔ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین 'گلن' کی سیر فرمائیں گے۔ بیشک

ہے جیسں قوتوں کو زنجیر تڑا کر آگے بڑھنے کا موثر مل جائے، اساج اٹلی منزل تک قدم بڑھائے۔ اور پھر بالے ہوئے حالات سے دوچار ہو مغایین کا یہ مجموعہ دوسرے مکتب خیال کی تر جمائی کرتا ہے۔

ایک نوجوان راہرو، اد کسی سائنسی فنکر کی فنی میں لئے ہوئے اسلام کے آغاز اور مسلمانوں کے انجام کی تلاش میں نکلا ہے؛ قصص الانبیاءؑ پر کھری کوئی حدیثوں، کہا نیوں، روایتوں اور دریافتوں، تفسیر و تاویل، وصت ذہن کا حاشیہ آر ایفوں کے گنگے جنگل پر، نقبت و تصدیق کا قدم اب یک جہاں پہنچا تھا، وہاں تک بھی سامنے نشانات اعتبار کے قابل نہیں اُن سے آگے بڑھنا یا ڈگر بنانا تو خود کی بات ہے۔ ردے نے علمی چیلنج آت ہیستے ہیں اور تلاش کے کسی ایک نتیجہ کو آخر کی نہیں کہا جا سکتا۔۔۔ ازیتہ واقعات اور عقیدوں کے سینے میں اُتر کر باؤں اور ناری بنادواں کن بھیج اگر یہ منبرانہ علیٰ ہنس تو کم از کم اُس فرض کی ادائیگی فرود ہے جو برسوں کی عبادت سے بڑی آزمائش اور صد یوں پورا نے عقیدوں سے زیادہ باطنی پتا ہے۔ اگر یہ فرض وقت وقت سے ادا نہ ہوتا ہے تو کوئی بھی دین رُسنے ہوئے پانی کی طرح اپنی تاثیر کھو بیٹھے، حال کی سمزیت اور مستقل کا نادیت دونوں سے محروم ہو جائے۔

ہماتے قذائف ایک معری عالم اور اسلامی مفکر محمد قطب نے اپنی

مذہب عقیدے سے یہ راہزنما ہے اور عقیدے کے بغیر محض رسم و رواج
 یا آئینی جلی اختیار کر لینے سے بھی۔ اللہ عقیدہ ہے جو کسی مذہب کو سماجی
 یا ذہنی رشتے کو قوت عطا کرتا ہے۔ قوت عقیدے میں ہے۔ عقیدے کی یہ قوت
 مذہب کی فراعلاذہبیت کے بھی کام آتی ہے۔ سائنس اور فنون کی ترقی میں بھی
 کلیر ماہرین۔ یہ کوئی عقیدہ جس قدر سائنسی بنیادوں پر قائم ہوگا، اتنا ہی وہ
 نئی تبدیلیوں کے لئے آمادہ رہے گا۔ تبدیلی یا تجدید۔ جسے خداوند کے ہر کام
 اُتار ہی ہے۔ روح اور کھوکھلا ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُس عقیدے
 نے پناہ قوت کا خزانہ ہونے کے باوجود کبھی نے پناہ بنائی اور نفع کا سبب
 بھی ہی جاتے ہیں۔ مذہب کا عقیدہ اور رسم و رواج یا طرز زندگی، دونوں سے
 گہرا رشتہ ہے۔ خود مذاہب کچھ لوگوں کے نزدیک غیب سے نازل ہوتے ہیں
 لیکن ارضی حالات کی ضرورت کے مطابق۔ اُن کی اصلاح کی خاطر اور کچھ لوگوں
 کے نزدیک مذہب اُس آئینہ یا توتی، فکر و فکر کے نمونے کا نام ہے جو زمیں
 سے ہی آگئی ہے، خاص تاریخی حالات اس کا تقاضا یا جو پیش کرتے ہیں اور
 تاریخی حالات محض مادی سرگرمی اور سپردِ اُن نسلقات کا نام نہیں بلکہ اُن
 سے دلالت خود ہی کو شش اند شش ہی شامل ہے۔ جنی مانتے اور جن کی
 بائبل، انجیل اور آج رشتہ کے ذخیرہ کوئی بڑی شخصیت اُبھرتی ہے۔ جو سماج کی
 نشہ و تکمیل اور دیکھ دیا رشتہ میں سے کامیاب ہو جاتی ہے کہ دلی ہوئی،

ایک اہم تصنیف کے آخر میں اسلام اور کونزوم سے بحث کرتے ہوئے کونزوم کو لکھا ہے :-

”وہ مس زہد مت انتھاب کی جو اسلام نے عرب میں برپا کیا، کوئی متول تو حید نہیں کر سکتے کیوں کہ جیو کا عرب یا اس قدر کی تمام اسلامی دنیا میں معاش پیداوار کے ذرائع کی کسی ایسی تبدیلی کا نام نشان نہیں ملتا جسے وہ سب قبول دینا کے اس خطے میں ایک مکمل نفاذ تک کے ساتھ رسول پاک کے آمد کا۔“

ہم اسے یہاں جماعت اسلامی کے نقیب بھی کچھ اسی قسم کے سوال اٹھاتے ہیں معاشی پیدائش کی ذرائع اور پیدائش کی حالت کا تقاضا۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی کڑیوں کی حیثیت اس پہلی جماعت اسلامی کا مقصد ہے۔

اگرچہ یہ مضامین اتحاد اہل حدیث اور اتحاد اہل علم کے نقطہ نظر اور تلاش نے، اور خطرات کی شکل بھی باقی رہی، تاہم کھنے والے کے نقطہ نظر اور تلاش نے، منطقی فکر نے اور موضوع کے باقی رہنے نے ان میں ایک مربوط نظر یہ اور جملہ کچھ اوجھار دیا ہے۔ خصوصاً پہلے اندر سے مقالے میں اسلام کی ابتدا اور اصلاحات، اور مسلم پرسنل لا اور بخیر کہ حول کوٹ، جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یوں دیکھتے تو یہ کتاب نہ اتحاد و تفاق کے حادی اہل جان کے لئے ہے نہ ان اہل علم و فضل کے لئے جس کی جب میں ہر رسول کا آخری جواب بڑھتا ہے، ایت نہ دلناری ہے نہ دل جوئی۔ بلکہ اتحاد و جذبات سے بالکل بے نیاز ہو کر ماضی کی تین وحشیانہ حقیقتوں کو اسرار کے پردے سے باہر لے کر کشش ہے جو عمر ما انسانی تہذیب اور عموماً مسلم سراج کی ذہنی تربیت میں کام آسکے۔ نتائج سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر معنی کی نیت یا صحت پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔

معنی کے تفاوت میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ :

ایک نہایت ہی مذہبی گروہ میں آنکھیں کھلیں۔ ان کے علم و سیدہ والدہ محمد نے جوڑے تعبیر میں ملائی جوہو جماعت کے حامل ہے، جیسے تیسے گز بسر بھلی۔ مادی زبان مگر حق، ماحول کی زبان ہند کی وہ دوا بدلتی تعلیم لاسکی علیہ اور جب کالج میں پیچے تو اس میں مضامین کے ساتھ جملہ تجزیہ و تفسیر کے

یہ نوٹ بھی میں جو میں زبان اور ادبیات کے سیمینار مطالعے نے، معاشیات، فلسفہ اور تاریخ کی فن نے قضا کا بنیاد کو نہیں چھوڑا، دیواریں البتہ ملا دیں۔ کبھی میں ملازمت ملی۔ کبھی ہڈی دنیا دیکھی۔ جماعت کی سماجی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ شدید مذہبی ماحول میں پتے دلوں کی کڑی تنقیدی نظر سب سے پہلے اپنے مذہب پر ہی پڑتی ہے۔ یہاں لئے تعلیم یا نثر نوجوانوں کا ایک نئی گردہ بن گیا۔ چند سال انتظار و مشغول سے بہت اور حرارت لینے کے بعد نوروں، جسموں اور جڑوں کے بعد گردہ کو کھڑا کیا، ان کا مطالعہ جاری رہا۔

تاریخ عالم اور فلسفہ اسلام کے علاوہ ادبی رجحانات اور سماجی موضوعات پر انہوں نے جی لگا کر کئی اچھے مضامین لکھے اور باوقار انگریزی اخبارات میں طبعی کتابوں پر تبصرہ کرنے لگے۔ مضامین کا یہ مجموعہ انہی کا انتخاب ہے مادہ کئی دعوئے کثیر دلیل ہے اس بات کی کہ مصنف نے بن مائذوں کے حوالے لئے ہیں ان کی تفصیلات پر ادھ مائذوں کے مائذ پر اس کی گہری نظر ہے وہ مانگے کے پردوں سے پردا نہیں کرتا۔

چند ضروری نکتے جو ان مضامین سے ابھر سکتے ہیں یوں ترتیب دیئے جاسکتے ہیں :

۱۔ اہل علم کا یہ خیال اصلاح طلب ہے کہ قرآن عرب کے وحشی بعدوں میں اُترا، اس نے قبائلی پسماندگی کو دور کر کے انہیں جاگیر دہی نظام کی طرف بڑھایا۔ اسلام کی آمد سے پہلے مکہ اور عموماً قریش کا قبلہ دولت مند ”جوہر“ اسلام بڑھا۔ یہاں زعفرانی سرگرمی آئی تو تھی ہی نہیں اور تھی بھی تو اسی نہیں کہ سماجی حالات پر اثر انداز ہو سکے۔ مکہ سماجی اخلاقیات کے خلاف سے اثراتی گردہ کی انفرادیت پسندی کا نمونہ تھا اور فرد و واحد کے اختیار و حلق یا بادشاہی سے بالکل بیگانہ۔

۲۔ بدوی اخلاقیات میں سرکشی اور آلودہی کے علاوہ جو پہلو اہم ہے وہ ہے قبیلہ دارانہ ہیومنزم۔ یہاں نہ کوئی محدود ملکیت ہوتی ہے نہ کوئی ایک فرد اس کا مالک۔

۳۔ بدوی معاشیات فرہیت کے وقت کلادوں بونے پر منحصر تھی۔ مال قیمت، تبادلے میں تقسیم ہو جاتا تھا اہمیت کا کوئی تصور نہ تھا، ”ٹیٹ کا“ نہ حاتم و شومو کا۔

۴۔ اسلام نے قبائلی ہیومنزم کی مصلحت و اخوت کا دائرہ وسیع کیا تاہم یہاں ہی دولت سمیٹنے، سماجی حرمت و خیر کرنے اور خودی پر فخر کی

اُن کی انفرادیت پسندی اور ذاتی املاک قائم رکھنے کا حجاز تلاش کیا۔ سلسلہ وہ فوج کا اس طرح جوڑ بٹھایا کہ خانہ بدوش تباہیوں سے بے بسی بے حقوق غلاموں کا احتجاج بھی ظاہر ہو اور ایک باقاعدہ اسٹیٹ کے سلسلے میں تجارتی حقوق کو، تجویز سلامتی کی ضمانت کے ساتھ پیداواری قوت (منافع اور اقتصاد) بڑھانے کا بھی موقع ملے۔

۵۔ ماحول کے جبر کے خلاف اُن فوجوں میں جو تھوڑی بہت نسیم یا تجارتی سرگرمی کی بدولت باہر کے حالات اور خیالات سے باخبر تھے مسلم کڈ بیچ گئے اور ایمان لانے کی زیادہ صلاحیت تھی۔ چنانچہ مکہ سے ہجرت کے وقت ۴۰ برس سے کم عمر کے لوگ زیادہ تھے، یوں اسلام کو محرم جلتے یعنی غلاموں، بدھوں، کھٹھوں، دیہاتی جلتے کے فوجیوں کی تائید بھی حاصل ہو چکی تھی۔

۶۔ قرآن کی کئی اہم مدنی آیات کے روحان، خطاب اور پیغمبر میں نمایاں فرق ہے۔ اول میں سخت اور مظلوموں کی حمایت، دوم نیک جابروں کو تحریف اور مبالغہ انداز سے پزیری کا رنگ ہے۔ مدنی آیات میں قوت مساوات اور انسانیت کا اعلان ہے۔ مدینے کی آبادی کی لبقائی بناوٹ مختلف تھی۔ یہاں زرعی پیداوار کا جاجایا ماحول تھا اور طاقتوں کا تقاضا نکتے سے مختلف ہیں۔ قبائل کی حد بندی تو نہ کر سہو نہ گناہیں اور مسلم کو ایک اہم حق تہذیبی کی پسلی صدائیں ملتی اور طاقتور مسلمان کا وہ تصور کا جاب بھی جس کی بدولت قتل و غارتگری، ہجو، انصاف مل کر اپنی ہمسایہ خوشحال مسلمانوں کا سامنا کر سکے۔ محمد عربی کی برکت، بھائی میں کارزار اس حکمت عملی یا سیاسی تدبیر میں بھی پوشیدہ ہے کہ انھوں نے قبیلہ ہاشمی، ملائی، تجارتی اور ذہنی اجتماعوں کی ٹانگ الگ بہروں کو ایک دھارے میں ملا کر انھیں 'نہ صرف خوب قومیت کے منہ اندھا کی صورت دی' بلکہ اسے بھی الا قوامی اسٹیبلشمنٹ کے اس قابل بنایا کہ روئے زمین کے ایک بڑے حصے تک آسانی سے پھیلنا اور رہے ہوئے فوجوں کی تعمیر بنا چلا گیا

۷۔ عرب مرکز سے اٹھنے والی یہ تحریک دو سمتوں میں پھیلی؛ خوشحال با اقتدار اور بدتر شاہی امیر کے ہندو مرکز دشمنی کی جانب اور ایرانی عراقی دستاویز ہندوؤں، سپاہی پیشہ اور اہلکار

جلیقہ کے کوٹہ بدھوں کی طرف، ایک چرباز ملینی سلطنت کے اور دوسرے پر ایرانی سلطنت کے اثرات اور سختی ایسی باقی تھے۔ یوں بدھ کی سیاست میں مکہ کے بجائے ان مقامات کی اہمیت برسی تھی جو اول بنی امیہ بعد بنی عباس کے دور کے میں اہم آگے چل کر سنی شیعہ کی تفریق میں ظاہر ہوئی۔ اس تفریق کے اذہین مرحلے پر "خوارج کا ظہور دراصل خانہ بدوش عرب صحرائوں کی سرکشی اور آزادانہ کاجار خانہ اندھا تھا جس نے قرآن کے علاوہ کسی فرد یا خانہ کو نہیں ماننے سے انکار کر دیا۔ انکار کی کایہ بدھ اور ملین جس نے بھی ناکام ہوا کہ اسلام کی تحریک نے ایک بدولت اسٹیٹ کی تشکیل کی راہ چھوڑ کر دی تھی۔

۸۔ فتوحات اور پیداوار کا ذریعہ بڑھنے کے ساتھ اور پر کی آمدنی سے خوش حال کا وہ ماحول بنا جس میں فلسفہ، فنون اور فنکارانہ ترقی ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے سیاسی عروج کا زمانہ ہی اُن میں فلسفیانہ تحریکوں اور عقلی بحثوں کا زمانہ ہے۔ امام غزالی کا دور آنے آئے سیاسی سماجی قوت کا قلعہ ٹوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ عقلیت کی شاخ جسے علماء اسلام نے یونانی فلسفے سے لے کر پروان چڑھایا تھا اس کو گنگی اور غزالی نے از حدانہ فکر، فلسفہ اور عقلی کے مقابلے میں وجدان اور عقیدے کی قوت پر زور دیا۔ مسلم ملکہ نے فلسفے پر تعصبات کا غلبہ مایا یا ادیبوں فکر پر فحشی حاوی ہو گیا۔

۹۔ مسلمانوں کا پرنسپل لائزلی ہے، نہ اُن کی دینہ مقدس، اقتصادئے زمانہ کے مطابق ہی وہ مہم وقتوں سے اور تبدیل ہوئے۔ ترمیم یا تبدیلی سے ان کا خود شریعت کے منشا کے خلاف مسلم سماج کے لئے نقصان پہ ہے۔ خود شاہ ولی اللہ دہلوی نے شریعت کے اسی مفہوم پر زور دیا کہ ۱۰۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی پیداواری میں ان قدامت پرست علماء

کا اہم رول ہے جو مسلم توسط جلیقہ کے بہ نسبت محنت کش عوام اور چھوٹی حیثیت کے برسرے نزدیک اور ان کی ابقائی درجہ سماجی نقطہ نظر میں مصنف نے اگرچہ ۱۸۵۰ء کے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست پر ملاحظہ سے کوئی مضمون نہیں لکھا تاہم مذہبی پرستی کا عالمی جائزہ دینے وقت بعض اچھے لکھے اچھے ہیں، اسی قدر توازن رائے چس کی سہ جو اسی موضوع کی کئی تازہ تصنیفوں کی گرفت

میں نہیں آئی — یہ اس لئے کہ فرقہ وارانہ مصلحتی کے ہندوستان کے تاریخ میں
نیریز میں ہوں اور گہری تحقیقوں کا ادبی سنگ پسلی طرح جائزہ نہیں لیا گیا
مردم ڈاکٹر محمد اشرف نے یہ بھاری چھوڑا تھا تھا — اب اس خطی انجیل اس
کام کو آگے بڑھانے کی نیادری کر رہے ہیں۔

مضامین کا یہ مجموعہ نفس ملی تحقیق نہیں، ملی اجمت بھی رکھتا ہے کیوں کہ
میں ہم کم از کم تین مضامین کا ترجمہ کے ہندوستان ماحول اور مباحث سے
گہرا اور براہ راست تعلق ہے۔ غالباً انہی کی تحریک پر یہ سب قلم لکھی گئے
ایک زور بولتے اور دوبرہ جتنی کے سلسلے میں مجھے مصنف کی رائے اور
پچھے دونوں سے واضح اختلافات ہیں جن کی اظہار کا یہ موقع نہیں، البتہ
پرسنل لا کی تاریخ کا تسلسلہ دریافت کرنے میں مصنف نے جو دیرینہ
کی ہے وہ قابلِ داد ہے اگرچہ انہیں داد کے بجائے میدانے کا اور خاص
انہی مضامین پر شور اٹھنے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ یہی مقدور ہے ان

تمام دانشوروں کا جو مقصد ہے کی ڈگر چھوڑ کر اپنی راہ تلاش کرنے
نکلتے ہیں۔

یہ سطر اس لیے دقت پر ہیں بھی جاری ہیں جب ہندوستانی مسلمانوں کے
نام پر کالی ہوئی اسلامی رپبلک پاکستان میں برصغیر کے سب سے شیعہ اور
تعلیم یافتہ اور مومنہ مسلم فرقے کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے۔ آگے
جوں کو ملی تحقیق بتائے گی کہ اس مذہبی جنون کے پس پردہ کون سے مادی اور
فہمی مفاد کام کر رہے تھے مگر یہ انفسانگ واقعہ ایک نازیبا نہ ہے، ان اہل علم
اور اہل رائے حضرات کے لئے جو کچھ بیٹھنے کے کہ عالم اسلام میں مذہبی
دست اور بددلی کی تازہ لہر چل پڑی ہے۔ تیل کی سیاست کی
کامیابی سے مسلمانوں میں مادی خود اعتمادی اور ذہنی نشاۃ ثانیہ
کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اگر یوں تو یہی مذہب، افتاد اور سائنسی
جستجو کے درمیان پھر ڈھونڈ رہے ہیں۔

وہ دکھی تو میں کب لکھی !

مولانا گرامی کے کوفے اولاد نہ تھے۔ لاہور میں سے کسے
دوست نے عقد ثانی کا مشورہ دیا، اور مولانا نکاح کو بیٹھے۔ چند دنوں کے
بعد حرمِ اولہ یعنی محترمہ ترک گرامی کو اطلاع ہوئی، وہ لاہور آکر علامہ اقبال سے ملیں
علامہ نے اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا، محترمہ ان کے سلسلے فرشتہ پر بیٹھ گئیں، ان کا
بیٹا اقبال اسے گرامی کے بدعصبیوں سے بولے۔ اُن کا کیا اور کچھ بدھ گئی، علامہ نے ان سے کہا کہ مولانا
کے بچوں کے کوئی افلاک نہیں ہے، اسے انہوں نے نکاح ثانی فرمایا ہے اور یہ شرعاً کوئی معیوب بات
نہیں۔ اس پر ترک گرامی نے جواب دیا: گرامی کے اگر اولاد نہیں تو میری بھی کہاں ہے۔ میں اس
پیمانہ سالی سے کہا کہ جاؤں، علامہ نے ان کو تسلی دے کر رخصت کیا اور خود گرامی سے جاکر
لے اور فرمایا: مولانا آپ جلتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عالمِ انبیت پر کتنا احسان
فرمایا ہے؟ گرامی بولے: عاتق اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ علامہ نے پھر کہا کہ: یہ بھی آپ پر شیعہ
نہیں کہ رحمتِ عالم نے صفتِ نازک کو کس قدر نواز دیا۔ بولے: خدا دلی وائی اس میں بھی کوئی
شک نہیں۔ اس پر علامہ نے فرمایا: پھر خدا دلیا ہے کہ ہر روز جزا آپ کے رفیقہ حیات تھوڑے
کا دامن پکڑ کر فریاد کرے کہ تو آپ کی جواب دیں گے۔ مولانا کچھ دیر کے لئے سوچ
میں پڑ گئے اور پھر قلم برداشتہ حرمِ ثانی کو طلاق لکھ کر بھیج دیے

بنگالے - اور بنگالی مسلمانوں کے مسائل

سلسلے میں کہہ رہے تھے مسلمانوں کا ذکر خیر کرنا ہوں۔
علامہ اقبال نے کہا :-

"مذہب نہیں سکھانا آپس میں پیر رکھنا"

سرسری نظر ڈالی جائے تو بات کھلی معلوم ہوتی ہے اور دل میں خوشی ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ چلے مذہب پیر رکھنا سکھائے یا نہ سکھائے مذہب ہی پیر کی جڑ ہے۔ اور کسی مذہب کی بنیاد کے لئے وہی ہے کہ دوسرے مذہب کی کمزوریاں بیان کی جائیں۔ اُس مذہب کو بُرا بھلا کہا جائے مذہب تمام تر مشکلات اور تمام تر اختلافات کی جڑ ہے۔ دشمنی کی بنیاد مذہب نامی قوی برسرِ بھوت پر ہے جو اکثر سرور پر چڑھ کر بوتا ہے اور اس عسرت بوتا ہے کہ انسانیت کا خون کرتا ہے گردن سرور کر رکھ دیتا ہے۔ ہم یہ مذہب کہتے ہیں وہ صرف عبادت کا کئی مخصوص طریقہ نہیں ہے بلکہ ایک مذہب کے ماننے والوں کے لئے ان کا مذہب ایک مکمل تہذیب کہلاتا ہے جس تہذیب میں اس مذہب کو ماننے والوں کی زندگی بندھی ہوتی ہے۔ مذہب کا فلسفہ

وہ ہے جس پر اس مذہب کے ماننے والوں کو عمل کرنے کی ہدایت ہے۔ روضہ کے مذہبی فرائض ہیں اور اس مذہب مذہبی زندگی کے ہر شعبے پر اپنا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ رسم و رواج کا ایک جال پھیلا ہوا ہے جس کے گوشے گوشے میں مذہب کے ماننے والے ہر کی طرح جکڑے ہوئے ہیں اور اس طرح سینکڑوں فرسودہ رسم و رواج کو اپنے کاندھے پر صلیبوں سے لادتے پھرتے آ رہے ہیں۔ چونکہ ایک مذہب کے ماننے والے اس مذہب سے پیار کرتے ہیں۔ لہذا دیگر مذہب کے ماننے والوں سے دھڑک دھڑک اپنا مذہب پیارنا ہے، ان کے اختلافات بالکل فطری ہیں اور یہی اختلافات آپس میں

شمس صاحب کا حکم ہے کہ میں "لگن" کے مسلمان نمبر کے لئے بنگالی مسلمانوں کے مسائل اور ان کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کروں مسلمانوں کے سلسلے میں کچھ لکھنا میرے لئے بہت مشکل ہے چونکہ "مسلم مسائل" کے سلسلے میں میرے معلومات نہ بھنے کے برابر ہیں اور پھر جب کہیں میں کسی مسلم مسئلہ کے لئے سوچنے لگتا ہوں یا سوچنے کی کوشش کرتا ہوں تو ساتھ ساتھ "ہندو" بھی اُبھر آتے ہیں اور باوجود لاکھ جتن کے میں "مسلمان" اور "ہندو" دونوں کو جدا کرنا نہیں کر پاتا۔ میں جتنا بھی غور کرتا ہوں دونوں کے مسائل آپس میں آکر ایک ہی منزل پر مل جاتے ہیں۔ چاہے روٹی روزگار کا مسئلہ ہو، تعلیم کا مسئلہ ہو، گوانی یا قسط ہو، رہن سہن کا مسئلہ ہو، چاہے وہ مسئلہ سماجی ہو یا تہذیبی۔ سب اس طرح آپس میں آکر گلے مل جاتے ہیں کہ میں ان کو الگ الگ کسی طور پر نہیں کر پاتا۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے۔ پھر میں خالص "مسلم مسائل" پر کیونکر لکھوں۔

میرے خیال سے ہندو مسلم قوم دونوں کے مسائل مشترک ہیں۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ چاہے سوال بنگال کے مسلمانوں کو یا ہندوستان کے کسی اور صوبے کا۔ سب کو اسی سرزمین پر لبر کرنا ہے اسی ملک کی تعمیر و ترقی، اسی ملک کی خوشحالی پر ان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ جنہاں اور مسلمان دونوں ہی ہندوستانی سماج نامی عمارت ہے، ہم ستون ہیں اور ان میں سے کوئی ایک ستون بھی کمزور ہو تو سماج نامی عمارت دھواؤں سے نیچے گر پڑے گی۔ ہر حال شمس کنول صاحب کے حکم کے مطابق بنگال کی تاریخی پس منظر میں جتنا بھی ممکن ہے ہندوؤں کے

گٹھ گٹھ مسلمان مسلمان

"بیرنگنا" سکھاتے ہیں، ہندو ملی طور پر مذہب انسانی مسلح کو تقسیم کرنا اور
اختلافات پیدا کرتے ہیں، بڑھاتا ہے۔ نفرت اور دشمنی کو پروان چڑھاتا ہے
اجتنابی سنوں میں زیرکنا سکھاتا ہے۔ چاہے یہ بات کتنی ہی تلخ
کیوں نہ معلوم ہو لیکن یہ حقیقت ہے۔

آج سے نصف صدی قبل راجندر ناتھ سیگور نے ایک مضمون
"ہندو مسلمان" میں مذہب کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے
ہوئے لکھا تھا۔ "جس ملک میں خاص کر مذہب کا
بندھن ہی انسانوں کو باندھ رکھتا ہے، جہاں دیگر کوئی بندھن اُن کو
ایک ساتھ نہیں رکھ پاتا، وہ ملک نہایت ہی بد قسمت ہے۔ اُس ملک میں
مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں وہی اختلافات سب سے
زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ درحقیقت "انسانیت" کا نام مذہب پر چڑھایا
جہاں انسان کو بطور انسان ہی پہچانا جائے۔ جس ملک میں مذہب اس انسانیت
پر چڑھ جائے اور انسانی عقل پر حملہ کرے، کیا اس ملک کو سیاست چا سکتی ہو
پہچاننا میں بار بار دیکھنے میں آتا ہے کہ جب سے عظیم قوم میں حیات نو
کی تعمیر کے لئے کوئی سیاسی انقلاب آیا ہے اس وقت اس انقلاب کے
ساتھ ساتھ وہاں کے مذہبی خیالات اور اصول پر سخت چوڑی پڑی ہیں۔ مذہب
سے نفرت کے شعلے بھڑکے ہیں۔ انقلاب خراس اس کی مثال ہے۔ سمیت دس
بھی مذہبی فلسفہ اور اصول کا سخت قحط ہے۔ حال میں اسیہ میں بھی
مذہب کے خلاف شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ میکسیکو کے انقلاب میں بار بار
مذہب کے تلخے پر حملہ ہوا ہے۔ حالہ کوئی ترکی میں مذہب کو ختم نہیں کیا گیا
ہے پھر بھی سختی سے مذہب کی طاقت پر وار کیا گیا ہے اور مذہب کی طاقت
بڑی حد تک ٹوٹ چکی ہے۔"

سارل مارکس کی بات کو غالباً آپ یہ کہہ کر اڑا دیں گے کہ وہ کیرنلٹ
فلسفہ کا بانی ہے لیکن انہی فلسفے کے گاہک مذہب کے نام پر ہی صدیوں
سے انسانی آپس میں لڑنے جھگڑنے آئے ہیں۔ مذہب کا فوہ نگار مذہب کی
دہائی کے مذہب کا سہارا ہے کہ عقل و فہم کے دیا سب سے زیادہ پہلے
گئے ہیں۔ مذہب نے ان کو غازی قرار دیا جو حکمران کے بل پر اپنے مخالف
مذہب کے سامنے دلاں کا خون بہا ہے۔ چاد کیا ہے؟ جلیبی جگ
کی تلخ تاج کیلے؟ مذہب کے نام پر تزل و فزل کی تاریخ ہی تو ہے۔
ہندوستان کی تاریخ میں بھی مذہب کے نام پر خون کی ہلکی بار بار کھیل گئی ہے

ہنگ کا ہندوستانی مسلمان نمبر

اور کھیل جاتی ہے۔

بنگالی مسلمان کون ہے؟ پہلے اس کی تشریح ضروری ہے۔ عام طور پر کسی
ملک کے سیاسی حدود پیشہ ایک نہیں رہتے۔ سرحدیں بدلتی ہیں۔ ملک بنگالہ
کے ساتھ بھی چلی ہوا ہے۔ خلل مد میں جس علاقے کو بنگالہ زور دیا جاتا تھا،
اُس میں صوبہ بنیاد اور آسام کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ اس کے بعد
بہار کا وجود عمل میں آیا۔ اور پھر سرحد اور آخر کار مشرق میں ایک بار اور
بنگال کی تقسیم عمل میں آئی۔ بہر حال اب ہم بنگالی مسلمان اُس کو کہتے ہیں جن کی مادری
زبان بنگلہ ہے لیکن ان تمام کو بھی میں بنگالی مسلمان قرار دوں گا جو دو تین پشت
سے سرزمین بنگال پر آکر بس گئے ہیں۔ چاہے اُن کا آبائی وطن دہلی، صلی، تیرہ،
یا بہار وغیرہ کھلا نہ رہا ہو لیکن وہ لوگ تجارت یا ملازمت یعنی روٹی و دوکار کے
سطح میں یہاں چلے گئے اور پس کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہزاروں ایسے ہیں جن کے
دادا دادا باہر سے آئے تھے اور اُن کی موجودہ نسل نے کبھی اُن کے دادا پر دلا
کی سرزمین نہیں دیکھی ہے لہذا وہ بھی بنگالی ہیں اور ان کے مستقبل کا دار و مدار
اسی سرزمین کی خوشحالی ہی سے وابستہ ہے۔

ہندوستان کے دیگر کسی بھی ریاست سے بنگال (بزرگ قسم شدہ) میں مسلمانوں
کی آبادی زیادہ ہے۔ سیکڑے سے قبل دہلی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۵ فیصد
سے زیادہ رہی ہے اور آج جسے ہم مغربی ہندوستان کا بنگال کہتے ہیں اُس کی
کل آبادی میں چھان تو رہتا ہے۔ سیکڑے ہندوستان میں دہلی بنگال کا ایک گروہ مسلمان ہیں
لہذا یہ حان ہے کہ چاہے کتنی باتیں ہو تجارت ہو ملازمت ہو، بنگال اب یا
بہار ہو یا بنگال کی سیاست، ایک لفظ میں بنگال کی زندگی کے ہر شعبے میں
مسلمانوں کی اہمیت پیشہ مسلم رہی ہے۔

بنگال کی سیاسی قسمت ہندوستان کے دیگر صوبوں سے نرالی ہے۔ مسلمانوں کیلئے
ایک سرزمین چاہئے اس سوال تک جھگڑا ۱۹۳۵ء میں سننے میں آیا لیکن یہ سرزمین
کہاں ہوگی؟ کسی کو طم نہیں تھا۔ لفظ "پاکستان" پہلے ہی مل مغربی حصے کے لئے ہی
سننے میں آیا تھا کہ ۱۹۴۷ء کی دہائی کا فرانس میں بھی مسلم لیگ نے صان الفاظ
میں مسلمانوں کی سرزمین کا لفظ پیش نہیں کیا اور نہ ہی لفظ "پاکستان" کا کہیں
استعمال ہوا ہے۔ پہلی بار سیکڑے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے کشمیر پر یہ واضح ہوا کہ
۱۹۴۷ء کی دہائی کے مطابق مغربی بنگال میں ۳۴,۱۸,۵۶۶ مسلمان ہیں
غیر بنگالی ہندو بھی شامل ہیں اور ۹,۶۲,۳۸۸ مسلمان ہیں۔ شمس۔ لکھنؤ
۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا حصہ کب سے دیکھنے کیلئے بڑی تصنیف "مختصر تاریخ بنگالہ" لکھی
وہ جسے شمس لکھنؤ نے اردو ہندوستان علی گڑھ۔ شمس۔ دہلی

بنگال میں بلکہ پورے ہندوستان میں) ہندو مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں یہ حوت پیدا کرنا انگریزوں کے لئے آسان رہا ہے کہ تم لوگ کا مقام کہاں؟ انگریزی حکومت نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو زیادہ ہولناکیوں کا شکار کیا ایک پلان بنایا، جسے لاٹ صاحب نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کے لئے چلا گاندھ ایکشن اور اس طرح بنگال اسمبلی میں ان کی اکثریت میں آنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کا لالچ دیا۔ مشرقی بنگال کے زیادہ تر کاشت کار حالانکہ بنگالی مسلمان تھے لیکن وہاں کے زمیندار زیادہ تر ہندو تھے۔ کسانوں میں زمیندار سے نفرت کا جذبہ ہوتا ہی ہے۔ چونکہ یہ طبقاتی کشمکش کا سوال ہے لیکن اسے طبقاتی جنگ کے بدلے ہندو مسلمان جنگ میں بدل دیا گیا اور اس طرح نفرت کی آگ بھڑکائی جاسکی۔ ہندو انقلابی رہنماؤں میں سے کسی کو بھانسی کے تختے پر لٹا دیا گیا اور باقی کو قتل بھی سزا دی گئی۔ راجل خاں میں بھڑک دیا گیا۔ دوسری طرف بنگال کی اہمیت کو کم کرنے اور بنگال کو کمزور کرنے کے لئے کلکتہ کے بدلے (۱۹۱۲ء) دہلی کو انگریزوں نے پایہ تخت قرار دیا۔ مملکت کی اس تبدیلی سے کلکتہ کی اہمیت گھٹ گئی اور مرکز پر بنگال کا جو اثر تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔

لیکن پھر بھی بنگال کے مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہی رہے۔ ایسا جو دوئے مسلم رہنماؤں نے بنگال پر ابھرے وہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور اے۔ کے فضل الحق۔ مولانا آزاد تو ہمیشہ ہی فرقہ پرستی سے دور رہے ہیں لیکن فضل الحق کو بھی فرقہ پرست قرار دینا مشکل ہے۔ ان کو بڑی مشکل سے مسلم لیگ نے اپنا یا۔ ۱۹۳۵ء کے انتخابات میں بنگال اسمبلی میں کانگریس کے ۲۱ مسلم لیگ کے ۴۹ نمائندے تھے جبکہ کل مسلمان ممبران کی تعداد ۱۱۷ تھی۔ باقی مسلم نمائندے فضل الحق کی کرشمہ پر جا پاؤں کے نمائندے تھے

فیصلہ فیصل میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہم دنا جانتے ہیں کہ آپ اپنی بھاری زبان بنگلہ کے علاوہ انگریزی اردو اور فارسی بھی اچھی جانتے تھے۔

گپ کا نہایت مختصر ذکر شری سہری کو براجم کی بنگلہ تصنیف "جدید آزادی میں بنگال" کے علاوہ مغربی بنگال مسلم ریسرچ سوسائٹی کے ایڈیٹر جناب ایم عبدالرحمن صاحب نے اپنی تصنیف "Mudra of Freedom" کو ۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے۔

قی تو میر۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۵ء بنگال کا ایک نامور ڈاکٹر جو لاڈلی گھٹانے میں ملہر استاد بنے تھے وہ فیصل ۳۲ پر گئے مغربی بنگال میں پیدا ہوا۔ وہ انگریزوں پر خوب حملے کرتا تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ویم پیٹنگ نے اس کے خلاف فوج بھیجی اور

حکومت ہندوستانی نے اس پر

اور بعد چار آزاد ممبر بھی تھے۔ حالانکہ کرشمہ پر جا پاؤں کے لئے بھی مسلمان تھے لیکن وہ مسلم لیگ نہیں تھے اور بھی پاؤں کے فضل الحق کی حالت تھی فضل الحق مسلم لیگ کی فرقہ پرستی سے نالاں تھے اور لیگ سے بہت زیادہ ہی وہ انگریزوں کے دشمن تھے۔ ان کے کسانوں سے ذاتی لگاؤ تھا انہوں نے کسانوں کی بھلائی کے لئے چند قابل ذکر اقدامات کئے تھے مثلاً پاٹ (پٹسی) کی قیمت کا معرکہ کر دینا، میاں اور ساتھ کلاس کے کسانوں کو پچانے کے لئے سروریزہ معرکہ کر دینا، بھاری صنعتوں کا قیام، فردوروں کی مزدوری مقرر کرنے کا قانون دینا، چند ایسے اقدامات ہیں جن سے انگریزوں سے ناواں ہو گئے محمد علی جناح چاہتے تھے کہ لیگ ان کے اثنا سے پر چلے۔ لیگ کے پارٹنر میسز بونٹو میں سہروردی کا اہم مقام حاصل تھا۔ بعد از لیگ کے نمائندے بڑے زمیندار یا رئیس تھے مثلاً ذاب ٹھاکر سرتاظم الدین اور نواب فاروقی وغیرہ۔ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پر دیش کانگریس کمیٹی کے ہر دس زمیندار تربورہ کے مولوی اشرف الدین جو دھری نے یہ مشورہ دیا تھا کہ مشترکہ طور پر مسلمانوں کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی اشرف الدین احمد کا بھتیجا ایک ترقی پسند اور حق بجانب تجویز تھی کل ہند کانگریسی رہنماؤں کو بھی اس کے معنی ہوئے میں کوئی وہم و گمان نہیں تھا لیکن ان میں چند کا خیال تھا کہ ایسے اسم مسئلہ پر جو کل ہند مسئلہ ہے اور جس کے فیصلے کا حق کل ہند کانگریس ہی کو ہے۔ وہ صرف پر دیش کانگریس والے کریں تو یہ کل ہند کانگریس کے خلاف ہوگا۔ بعد ازاں ہر لال نہر دے شرت چند بوس سے سوال جواب کرنا شروع کر دیا اور اسی جھگڑے کی وجہ سے بنگال میں مشترکہ انتخابات کا مسئلہ ٹھپ ہو کر رہ گیا اور کڑی کانگریس نے کشتان کرل صاحب سے جنگ میں مقام رکھ لیا جاتا تھا جب فوج نے اس کے ہانس کے قتلے میں آگ لگا دی تب ایک کان کے گھمے سے گھائل ہو کر قی تو میر چل بسا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ م۔ فضل الحق :- پورا نام ابوالکلام اسم فضل الحق۔ پیدائش بمقام بریشال مشرقی بنگال ۱۸۸۵ء اور ایم۔ اے۔ بی۔ ایل سے کامیابی کے بعد وہ کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے تھے بعد میں دست بردار کانگریس میں شامل ہوئے۔ آپ کانگریس کے سکریٹری بھی رہے۔ پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس میں بھی شریک رہے۔ بنگلہ کارپوریشن کے ممبر (۱۹۳۵ء) بھی بنے اور پھر کل ہند

اس طرح فضل الحق کو کھڑا کیا۔ اور فضل الحق مجبوراً مسلم لیگ کی طرف جھک گئے
 دسمبر ۱۹۷۷ء میں اچانک بیگن دزدانوں نے استغنیٰ دے دئے اور حق خدا
 منشی میں پڑ گئی۔ تب فضل الحق نے شیبا پر سادہ مگرچی پر ہتھ بند پھلے
 دینرو کو لے کر لکھنؤ کی وزارت قائم کی جس فدایت کو شہرت چند بوس کا خادون
 حاصل تھا۔ ان حالات کے تحت فضل الحق کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ
 کانگریس کی مخالفت کریں۔ اس بات کو مد نظر رکھ کر انگریزی حکومت نے
 مئی ۱۹۷۸ء میں حق صاحب کو کنا دیا اور شیبا میں ہائی کمنٹر بن کر بنگال
 سے ہٹا دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ۱۷ جولائی کو بڑے لاٹ صاحب نے
 گورنر بنگال مشر ماربرٹ کو لکھا کہ حق صاحب کو کچھ اچھا کر گا دھن ہی کے خلاف
 ایک بیان دینے کے لئے راضی کرو۔ لیکن حق صاحب اس کے لئے راضی نہیں
 ہوئے اور ۲۳ جولائی کو ماربرٹ نے اپنی ناکامی کا جواب دہل بھیج دیا۔ لہذا
 اب فضل الحق کو راستے سے ہٹانا انگریزوں اور مشر جارج کے لئے ضروری
 ہو گیا تاکہ حق کی طاقت بنگال پر برقرار نہ رکھے۔ اس کے بعد حق جارج
 خود کتابت کا دود شروع ہوا۔ آخر کار فضل الحق کے لئے اتنی مشکلیں پیدا کر دی
 گئیں کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر تیار ہو گئے۔ لیکن جارج سے انھوں
 نے اپنے غلط میں مطالبہ کیا کہ بنگال کا وزیر اعلیٰ کون ہو گا اس کا فیصلہ بنگال
 اسمبلی کے اراکین کریں گے۔ مشر جارج اس تجویز پر راضی نہیں ہوئے اور خواجہ
 ناظم الدین و سہروردی کو انھوں نے بنگال میں مسلم لیگ کو پروان چڑھانے
 کے لئے پورے دند شد سے کام کرنے کا حکم دیا۔ مارچ ۱۹۷۸ء کے انتخابات
 میں کانولس کے چھ سیٹ پر ہی لیگ نے قبضہ کر لیا۔ اس سیاسی حالت کے
 مد نظر فضل الحق نے کہا کہ جب قومی حکومت قائم ہو جائے گی تو وہ استغنیٰ
 دے دیں گے لیکن ۲۸ مارچ کو مشر ماربرٹ نے ان کو گھنہاؤں میں بنا کر
 ایک طرح زبردستی ان سے استغنیٰ لے لیا۔ ۲۹ مارچ کو بنگال اسمبلی میں فضل الحق
 مسلم لیگ کے عہد بھی ہتھ بنگال کے ۳۷ تا ۳۸ مارچ کو آپ فدر اعلیٰ رہے۔
 ۱۹۷۸ء میں آپ نے کرشنک پر جا کر اس (مرد) پارٹی کے نام سے ایک پارٹی
 قائم کی تھی۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد آپ پھر مسلم لیگ سے ہٹ گئے تھے اور
 ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں مشرق بنگال میں مسلم لیگ کو شکست دے کر انھوں
 نے عوامی حکومت قائم کی تھی لیکن ان کی حکومت کو غیر قانونی قرار دے کر کئی دزدانوں کو
 سلاخوں کے چھپے بند کر دیا گیا اور اس کے بعد فضل الحق سیاسی زندگی سے
 ہمیشہ کے لئے ہٹ گئے۔

نے یہ اعلان کیا کہ اسپیکر نے نئی وزارت کے قائم ہونے تک اسمبلی کو
 ملتوی کر دیا اور گورنر نے حکومت اپنے ہاتھوں لے لی۔ لیکن قومی حکومت
 قائم کر چکے بجائے گورنر نے خواجہ ناظم الدین کو ایک ماہ کے عرصہ ہی میں
 لیگ وزارت قائم کرنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد ہی پہلے ناظم الدین اور
 پھر سہروردی کے عہد میں بنگال بھر میں فرقہ وارانہ فسادات نے زور پکڑا اور
 ساتھ ہی صوبے بھر میں قحط پڑا۔ بنگال کے اس قحط سے کتنے لوگ مرے
 اس کا دست اندازہ آج تک نہیں لگایا جاسکا۔

اس کے بعد سیاسی حالات نہایت تیزی سے بدلے۔ ۲۲ تا ۲۴
 زیادہ تر کانگریسی رہنما جیل میں تھے جس کا لیگ نے پورا فائدہ اٹھایا۔
 اسی دوران بنگال میں خواجہ ناظم الدین اور سہروردی گروپ کے اختلافات
 بدوین چڑھے اور خواجہ ناظم الدین، لیگ کے رہنماؤں (محمد علی جناح) لیگ
 سے ختم کر کے کئی اراکین اسمبلی کو اپنے ساتھ ملا کر سہروردی کو ہٹانے میں کامیاب
 ہو گئے۔ لیکن ۲۴ مارچ کے انتخابات کے بعد جب پھر سے لیگ کو مشترکہ وزارت
 کے سلسلے میں سوچنا پڑا تب مجلس قانون ساز کے انتخابات میں سہروردی نے
 ناظم الدین کو ہرا دیا اور اس طرح وہ لیگ کے عہد ہو گئے۔ انھوں نے اس سلسلے
 میں کرن شنکر رائے اور مولانا آزاد سے مشورہ لیا تھا۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ
 فضل الحق اسپیکر ہوں لیکن سہروردی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

۱۹۷۸ء کو لیگ کی جانب سے ۱۸ تا ۲۰ مارچ ۱۹۷۸ء "رست اقدام"
 کا نعرہ بلند کیا گیا جس کے نتیجہ میں تین دن تک کلکتہ میں دن رات فرقہ وارانہ
 فساد ہوا اور ہر شہر انسانی خون میں ڈوب گیا۔ اس خون کے دیا کو پہانے کی
 بڑی حد تک ذمہ داری خواجہ ناظم الدین اور انگریزی حکومت پر ہے۔ ناظم الدین
 کا مقصد صاف تھا وہ چاہتے تھے ہندوؤں کا قتل عام کر کے اس کی پوری
 ذمہ داری سہروردی پر ڈال دیں اور اس طرح سہروردی کو اپنے راستے سے ہٹا دیں
 ۱۷ مارچ۔ ایس۔ سہروردی یا حسین شہید سہروردی کا خاندان کلکتہ کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ
 خاندان ہے اس خاندان میں مولانا عبید اللہ عبیدی جیسے عربی فارسی اور اردو
 کے عالم اور اردو و فارسی کا شاعر پیدا ہوا۔ مقررہ ختمہ آخر پاؤں ملا عبیدی کا اختر
 نیک اور خاتونہ اختر مرحسان سہروردی کی صاحبزادی دونوں کی اردو خدمات بھی
 کم نہیں ہیں۔ ان کی کئی تصانیف موجود ہیں جس میں شہید سہروردی مقام ڈھاکہ
 ۱۹۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے مسلمان (۱۹۷۸ء) فائرس جانلر
 بنے ہیں۔ ۳۱ مارچ میں یونیورسٹی کانگریس کے نمائندے ہر کر آپ بنگلستان گئے تھے

تین طرح کے ہیں۔ ایک بنگلہ دیش کے بنگالی مسلمان دوسرے مغربی بنگال کے بنگلہ زبان والے مسلمان اور تیسرے مغربی بنگال اور بنگلہ دیش کے غیر بنگلہ زبان والے مسلمان۔ ان تینوں کے مسائل کو ہی میں مسلمان کا مسئلہ تسلیم کرتا ہوں۔

جب بنگالی مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے تب ظاہر ہے کہ ان تینوں کے مسائل بھی جدا جدا ہیں۔ بنگلہ دیش کے بنگالی مسلمان اور بنگالی بنگال کے بنگالی مسلمانوں میں چند باتیں مشترک ہیں۔ ان دونوں کی مادری زبان ایک ہے، ادبی وراثہ ایک ہے، بہت بڑی حد تک (مقامی رسم و رواج کے علاوہ) ان کی تہذیب بھی ایک ہے۔ لیکن نیلہ کی فرق یہی ہے کہ دونوں کو دو مختلف سیاسی ماحول دو الگ الگ ملک میں رہ کر اپنے دی گئے گزرنے پڑتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں وہاں کے بنگالی مسلمان اکثریت اور بھارت کی اکثریت میں ہیں اور مغربی بنگال کے بنگالی مسلمان ملک کا سب سے بڑی اقلیت ہے۔ لہذا اکثریت اور اقلیت کے جو مسائل ہمارے سماجی ڈھانچے میں ہیں وہ موجود ہیں اگر بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو صرف یہ کوشش کرنی ہے کہ وہاں کے ہندو جو اقلیت میں ہیں (انڈیانا لگ بھگ ۵۰ لاکھ ہندو) کو بنگلہ دیش میں ہیں) ان سے ان کے تعلقات کو نہ کر خوشگوار ہوں تو مغربی بنگال کے مسلمانوں کو یہ کوشش کرنی ہے کہ کس طرح وہ یہاں کی اکثریت (بنگالی ہندوؤں) سے اپنے پیتر تعلقات کو برقرار رکھیں یعنی ان دونوں کے مسائل اس نقطہ نظر سے جدا گانہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ زبان تہذیبی زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور اس میں اختلاف پیدا کرنے کی بڑی قوت ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ مشرقی بنگال میں بنگلہ زبان نے وہاں کی جنگ آزادی میں بنگالیوں کو متحد کر کے جو اتحاد نامیہ قائم کیا ہے اور ایک طرح سے جنگ آزادی میں بنگلہ زبان کا سیاسی نہایت اہم مقام ہے۔ لہذا جب اندک مشرق بنگال کے بنگالیوں پر لادیا گیا تب بنگالی مسلمان اپنی زبان کے حقوق کی حفاظت کے نام پر لڑ کر کھڑے ہوئے اور زبان کی جدوجہد سے لے کر آزادی کی جدوجہد تک پہنچے لیکن زبان ہی اتحاد کی واحد شے نہیں ہے۔ چونکہ ہم ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے قیام کے بعد انھیں بھارت میں ایک تحریک، تلنگانہ تحریک کے نام پر لڑ کر کھڑی ہو چکی ہے اور اس تحریک سے وابستہ لگ بھگ نصف مسلمان کے حق میں ہیں حالانکہ تلنگانہ مسلمانوں میں مسلمانوں کی زبان نیلگوڑی ہے یعنی زبان ایک چیز ہے لیکن اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس اختلافات

کی اصل جزا ہے مقامی غیر مساوات۔ لہذا اصل مسئلہ مقامی ہے، روٹی روٹکار کا ہے ترقی کی مساوی سہولتوں کا ہے۔ سیاست کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا اور نہ صرف کسی سیاسی پلاٹ فارم سے ایک قرارداد منظور کر دینے پر کوئی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ چونکہ سیاست میں پارٹی مفاد شامل ہوتے ہیں لہذا سیاست، ہندو یا مسلم مسائل کو صرف کوئی قرارداد پاس کر کے یا قانون بنا کر حل نہیں کر سکتی بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سیاست نے نئے مسائل کو پیدا کر دیے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں اردو زبان کا مسئلہ ہندو اکثریت کے دلوں میں اثر پذیر نہیں اور یہاں بغیر اس خاص اہمیت اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک کے بعد دیگرے انتخابات ہوتے جاتے ہیں اور اردو کا مسئلہ ہی سنا رہا جاتا ہے اور سیاسی جماعتیں اس مسئلہ کو لے کر الیکشن کے میدان میں خوب اُچھل کود کرتی ہیں۔

مغربی بنگال کے غیر بنگلہ زبان والے بنگالی مسلمانوں کا مسئلہ سب سے زیادہ نازک ہے۔ بنگالی مسلمانوں اور بنگالی ہندوؤں میں اتحاد کا ایک ذریعہ مشترکہ مادری زبان بنگلہ ہے لیکن غیر بنگلہ زبان بولنے والے مسلمانوں کا وہی اس سہارے سے بھی خالی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مغربی بنگال میں ایک نو مسلم ہی اقلیت میں ہیں اور اس پر غیر بنگلہ زبان والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے یعنی کوئی ۱۰ تا ۱۲ لاکھ ہیں اور ان میں کوئی ۳ لاکھ ایسے ہیں جو بنگالی ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں باقی مسلمانوں میں سے زیادہ تر کابھلی تک ان کے آبائی وطن سے قطع برقرار ہے اور وہ لوگ وطن گئے جاتے رہتے ہیں۔ تین چار لاکھ مسلمان جو یہاں کے ہو کر رہ گئے ہیں ان کی زبان اور تہذیب پر بنگلہ زبان اور تہذیب کے اثرات نے کچھ ایسا اثر ڈالا ہے کہ ان کا ایک ادبی طبقہ وجود میں آگیا ہے جس طبقہ کی کچھ مخصوص خصوصیات ہیں۔ ان کی زبان کو باہر کے مسلمان انگریزی اُتھد کہتے ہیں۔

غیر بنگلہ بولنے والے مسلمان زیادہ تر شہر کلکتہ اور اطراف کلکتہ کے صنعتی علاقوں میں آباد ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے حال ہی میں غری جوگ ناٹھ لکھ رہا تھا نے (بنگلہ ہفت روزہ امت) "مورخہ ستمبر ۱۹۵۷ء" لکھا ہے۔ "کلکتہ میں اردو طالبان کی آبادی تقریباً سات لاکھ ہے۔ دیگر زبانوں سے جو لوگ یہاں آئے، جاب، براہیم جوش، جو بنگال کے ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے علاوہ معذناور، آبشار، کلکتہ کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ خاص کلکتہ کے باشندے ہیں اور کلکتہ اردو کے ایک نامور شاعر ہیں اور کلکتہ اردو میں انھوں نے جو غزلیں اور نظمیں دیں ہیں ان میں اس کا ایک مجموعہ بنام جنگی کاہلہ چند سال پہلے منظر عام پر آچکا ہے۔

اگر آباد ہو گئے ہیں ان میں اُردو والوں کی حالت سب سے خراب ہے۔ مثلاً برصغیر، جیت پور، بھوپال، پارک سروس اور راجا بازار کے محلوں میں ہی ان کی اکثریت ہے ہے اور ان میں سے اسی (۸۰ فیصدی) سے زیادہ لوگ ہستی علاقوں کے گندے گھول میں رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پان بیڈی کی دکانیں، موٹیل، رستورنٹ، پھل اور گوت کی دکانیں، درزی وغیرہ کے کام پر ان لوگوں کی روٹی روزگار کا دار و مدار ہے۔ گھوڑا گاڑی چلانا یعنی کوچران کا کام اور زبان والوں کا ایک اور بڑا پیشہ تھا لیکن اب کلکتہ میں گھوڑا گاڑیوں کا کام تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ لوگ کلکتہ کے لوگ ہی ہیں اور کہیں کے نہیں، عظیم کلکتہ سے انتخاب میں کامیاب ہونے والے اسمبلی کے ممبران میں چار ہندی دالے اور چار اُردو زبان والے نائبانہ شامل ہیں۔

بنگلہ زبان بولنے والے مسلمان پورے مغربی بنگال میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر کاشت کار ہیں اور دیہاتوں میں آباد ہیں لیکن اردو دالے مسلمان صرف شہر کلکتہ اور دیگر صنعتی علاقوں میں رہتے ہیں۔ اس طرح اگر بنگالی زبان والے مسلمانوں کا مسئلہ دیہاتی زندگی اور کھیتی باڑی سے متعلق ہے تو اردو والوں کا مسئلہ شہری زندگی کے مسائل ہیں۔ اردو دالے زیادہ تر کرایہ کے مکانات میں رہتے ہیں۔ دیہاتی بنگالی مسلمانوں کے تعلقات ان کے پڑوسی ہندو بنگالیوں سے بڑی حد تک خوشگوار ہیں لیکن یہ شہری مسلمانوں کے تعلقات مقامی بنگالیوں سے نہ ہونے کے برابر ہیں جس کی وجہ سے جب بھی فرقہ وارانہ جذبات بھڑکتے ہیں تو ان کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

جننے بار خدشات ہوئے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان مسلمانوں اور ساتھ ہی پورے مغربی بنگال کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تاکہ ان کے تعلقات بنگالی ہندوؤں سے بہتر ہوں اور ان کے پچھلے بھولے اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو۔

مغربی بنگال کے مسلمانوں کے لئے یہ نہایت فروری ہے کہ وہ یہ یاد رکھیں کہ دیہاتوں میں وہ اگر مگر گھر سے پرکھنا غلط فہمی نہیں ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی تہذیب و تمدن کی اچھائیوں کو کھودیں بلکہ صرف یہ ہے کہ انہیں سے مقامی باشندوں سے اپنے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ محکم اور خوشگوار بنانے کے لئے اقدامات کریں۔ ان مسلمانوں کے چند مخصوص مسائل فرد ہیں مثلاً ان کی تعلیم، اردو تعلیم کے مسائل ہیں۔ میں یہ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ مغربی بنگال میں اُردو سے نفرت کا جذبہ

ہنگو کلسد مسلمانانہ

پایا نہیں جاتا۔ چونکہ اردو کی ترقی و نشوونما سے مغربی بنگال میں بنگالیوں کو کوئی فائدہ لاحق نہیں ہے اور نہ مستقبل میں ایسا ممکن ہے۔ زبان سے نفرت کا جذبہ لوگوں میں اسی وقت ابھرتا ہے جب زبان کو سیاسی مسئلہ بنایا جائے۔ مغربی بنگال کے اُردو محلوں میں جو اسکول اور کالج ہیں ان میں اردو تعلیم کا انتظام ہے اور کلکتہ یونیورسٹی میں بھی اردو موجود ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ طلباء کو اسکول اور کالج میں داخلہ کے لئے دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہ سوال صرف اردو والوں کا نہیں ہے بلکہ اسکول اور کالج وغیرہ کی ابھی بہت کمی ہے اور مزید سیکڑوں تعلیم کاہوں کی ضرورت ہے اس لئے صرف اردو والوں کا مسئلہ سمجھنا یا اس نظر سے دیکھنا غلط ہوگا لہذا اُردو والوں کو چاہیے کہ بنگالی قوم کے ساتھ مل کر وہ تعلیم کو عام کرنے کے لئے جدوجہد کریں۔ اُردو کے علاقوں میں اردو تعلیم کی مزید بہتر سہولتوں کا سوال بھی اسی میں شامل ہے۔ اگر صرف اُردو تعلیم کا مسئلہ چھوڑ دیا جائے تو کابالی کے امکانات کم ہو گئے جو کہ اس سے اکثریت کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ تعلیمی معیار کو بلند کرنے، تعلیم کو گاؤں گاؤں میں پھیلانے کے لئے جو اقدامات ہوتے ہیں، بنگالی قوم جو جدوجہد کرتے ہیں ان کے ساتھ کنکھا ٹھکر ہی اردو والوں کو بڑھنا چاہیے تاکہ ان کی ہمدردیاں بھی ساتھ ہوں اور مسئلہ حل ہو جائے۔

ہمارے یہاں مختلف رسم و رواج کی پابندی ہی مذہب کے رتب میں قائم ہے۔ مسلمان اس سے متنبہ نہیں ہیں لیکن بنگالی مسلمانوں اور ساتھ ہی ہندوؤں کے مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی ڈیڑھ منٹ کی مسجد الگ نہیں نہ کریں یعنی جہاں تک ہو سکے مقامی سماج سے مل کر ہیں اور مقامی لوگوں کو اپنا بھائی سمجھیں، اور ساتھ ہی ان کی خوشی میں اپنی خوشی کا بھرپور اظہار کرنا چاہیں یہ نہایت فروری ہے۔ مغربی بنگال کے حالات سے اردو دالے مسلمانوں کو خاص کر سبق لینا چاہیے۔ تعلیم کے بعد مغربی بنگال میں جو اردو دالے (خاص کر بہار اور اتر پردیش کے مسلمان) مسلمان جا بے تحقہ وہ وہاں کے بنگالی مسلمانوں کو اپنا نہ سکے۔ انھوں نے علی طور پر کچھ ایسا برتاؤ کیا کہ وہ ہی اصلی مسلمان ہیں، مذہب کے ٹھیکے دار ہیں، بلند تہذیب و تمدن کے مالک ہیں، حاکم ہیں۔ حالانکہ مغربی بنگال کی اکثریت بھی مسلمانوں کی تھی لیکن یہ باہر کے مسلمان بہت جلد بنگالی مسلمانوں کی نفروں کھٹکے گئے اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے نفرت کا آگ تیز ہوتا گئی جس کا نتیجہ آج بھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اردو دالے مسلمانوں کو اس کی جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے

اس سے ہم آگاہ ہیں۔ اس لئے مغربی بنگال کے مسلمانوں کو بھی یہ سبق لینا ہے کہ جیسا دیش ویسا ہی بھیس ہو۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ روم میں رہو تو رومی بن کر رہو۔ اپنی تہذیب کو، اپنی زبان کو، اپنے اصولوں کو اپنے عقائد کو، دیگر مقامی لوگوں سے بلند یا بہتر گننا نہ صرف غلط ہے بلکہ نادانی ہے، خطرناک ہے اور یہ اقدام نہ ہی اپنی زبان سے محبت ہے اور نہ ہی اپنی تہذیب و تمدن سے محبت کا اظہار ہے۔

مغربی بنگال کے مسلمانوں (خاص کر اردو والے) میں بھی ایسی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اردو دہلے یہ مسلمان جو مرے سے بنگال میں آباد ہیں، جن کی ردی روزگار کا سوال اس سرزمین سے ہے، ان میں بھی ٹریڈ کنک بنگالی سماج، بنگالی تہذیب و تمدن، بنگالی زبان و ادب کے سلسلے میں جلنے کا جذبہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے لاکھوں اردو دہلے ہیں جو دو تین پشت سے یہاں آباد ہیں لیکن انھوں نے بنگالی سماج کے سلسلے میں جلنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

مقامی اردو کے اخبارات و رسائل، اردو کے ادباء و شعرا بھی اس طرف اردو دہلیوں کے رجحانات کو موڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کلکتہ میں اردو کے شعور کی کمی نہیں لیکن ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالنے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنگال میں رہتے ہوئے بھی بنگالی تہذیب و تمدن کا انھوں نے کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا ہے۔ بنگالیوں کے ہتوار درشتا درگاپوجا، بھائی بھوٹا دیون بنگالیوں کی ہندی ہی سرگرمیاں مثلاً یوم شیگور، یوم ننداسوام، یوم نینتالی پوس، دیوہ سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ کیا اردو کے اخبارات و رسائل کے لئے یہ فردوسی نہیں کہ یوم شیگور، یوم نندل دیوہ کے موقع پر ہر سال وہ شیگور اردو نندل کی شاہی پر مغا میں نظم و نثر شائع کریں، جلسہ دیوہ کریں اور اس سلسلے میں بنگالیوں سے تعلقات قائم کریں۔ بنگال کے اکثر اردو شعرا و شاعروں نے درگاپوجا دیوہ کے سلسلے میں جو جشن منائے جاتے ہیں، دھوم دھام ہوتا ہے، سچے ہوتے ہیں، جاترا اور ڈرامے ہوتے ہیں ان پر ایک بھی شعر نہیں کہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی بھی اردو شاعر نے کلکتہ کا ذکر نہیں کیا۔ کیا ہے۔ اشک افروری مرحوم کی نظم ”تب دیکھ بہار کلکتہ“ یا حور الاکرام کی نظم ”کلکتہ۔ اک بہار“ کو شال کے طہر پر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سمجھ میں ایک فطرہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کے یہ اردو شعرا و بنگال میں نہیں بلکہ بیارلدر اتر پردیش ہی میں ہیں۔ چونکہ ان کے کلام میں بنگال کی

کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ آخر بنگال کے کسی شاعر نے خود مٹی الہین کی طرح کوئی نظم ”تنگن“ کے بجائے ”بنگلہ“ کیوں نہیں کہی۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ بنگال میں رہ کر بھی بنگالی سماج سے دُشمن ہیں۔ یہ بات چاہے کتنی ہی تلخ ہو لیکن حقیقت ہے۔

اردو اخبارات اور رسائل کو پڑھئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ کلکتہ میں ہزاروں پنجابی، سکھ اور اتر پردیشی ہمارے کے ایسے ہندو بھی آباد ہیں جو اردو جانتے ہیں لیکن کلکتہ کے اردو اخبارات میں ان کے مسائل، ان کی دکھ سکھ کی خبریں، یعنی ان کے سلسلے میں کچھ شائع نہیں ہوتا۔ کلکتہ میں ہزاروں پنجابی ہیں جن کا خاص کر تعلق ٹرانسپورٹ سے ہے لیکن اردو اخبارات میں ان کے جو تجارتی مسائل ہیں پر مغا میں شائع نہیں ہوتے۔ پنجابی لوگوں کی ہندی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوئی خبر نہیں جھپتی۔ پنجابی حلقے میں اردو اخبارات کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔ کلکتہ کے سکھ ہر سال یوم گورناک دھوم دھام سے مناتے ہیں، طویل رنگ برنگی جلوس نکلتے ہیں۔ جلسے ہرے ہیں لیکن مقامی اردو اخبارات ان طویل جلوسوں کے تعادیر اعلان کے جلسوں اور تقاریر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی رادری کی خبریں، ان کی دلچسپی کی خبریں شائع نہیں کی جاتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں اردو جلنے والے، کلکتہ کے اردو اخبارات سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے بلکہ وہ لوگ مستانہ مایہ ”اردو پرتاب“ پڑھتے ہیں جو کلکتہ میں دہرے کے بعد برائی ڈاک سے آتے ہیں۔ مقامی اخبارات اگر ان کے مسائل سے دلچسپی لیں تو کیا یہ اردو جلنے والے بنگالی اخبارات کو اپنا بے خبرہ جلے گا؟ کیا اس سے اردو دہلیوں کو نمائندہ نہیں ہوگا؟ کیا اردو بنگال کی تحریک میں ان اردو جاننے والوں کو نہیں لایا جاسکے گا؟ ہر سال یہاں کے اردو اخبارات اور رسائل جدید خبر اور قدیم خبر شائع کرتے ہیں لیکن کوئی بھی گورناک بئر، درگاپوجا بئر، شیگور بئر یا ”نندل بئر“ کا نمائندہ کے سلسلے میں سوچتا تک نہیں۔ اگر کوئی گورناک بئر نکالے اور اس سلسلے میں مقامی پنجابیوں کے حلقے میں گھومے تو کیا پنجابی ان کا ساتھ نہیں دیں گے؟ کیا ٹرانسپورٹ کے کاروبار دہلی سے اس سلسلے میں اردو اخبارات کو اشتہار نہیں مل سکتے؟ ”درگاپوجا“ نمبر نکال کر کیا بنگالی ہندوؤں کے حلقے میں مغام پر نہیں کیا جاسکتا؟ سکولرزم کا فطرہ بلند کرنے ہی سے کلام نہیں ہوگا بلکہ مسلمانوں کو عملی طور پر حنا بھی پڑے گا۔ مسلمان بھی سوچیں کہ سیکولرزم کے بات کو مضبوط کرنے کے لئے انھوں نے کیا کیا اقدامات کئے ہیں؟

غلط ہے۔ کہنا لینا چاہیے کہ بے روزگاری ختم کر دے۔ سب کو مزدگار اند
ظاہر ہے اس لفظ "سب" میں وہ بھی شامل ہیں۔ بے روزگاروں کو
مزدگار نہ کہم کر دے مگر کہا جائے تو مسلمان بھی آجاتے ہیں۔ لیکن اگر
مسلمان کے لئے مزدگار نہ کہم کر دے کہا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ کیا
صرف مسلمان ہی بے مزدگار ہیں؟ ہندو فرقہ پرستوں کو مرنے سے لگا اور
اس سے ہندو فرقہ پرست فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کسی بات کی مخالفت کرنے وقت اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ مخالفت
کا انداز کیا ہو۔ اخبارات عام لوگ پڑھتے ہیں ہذا اخبار دلوں کو جابھٹے
کہ وہ پڑھنے والوں کا شعور بلند کرنے کی طرف دھیان دیں مدد کبھی کبھی
مخالفت کا اثر اٹھا بھی جاتا ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ چند سال
پہلے کلکتہ کے ایک انگریزی سینما ہال میں ایک انگریزی فلم آئی تھی جس میں
صلیبی جنگ کا ایک منظر تھا اور جنگ میں جب صلیبی ہار گئے تو مریدان جنگ
میں اسلامی پرچم آہستہ آہستہ حرک کر گیا بتایا گیا تھا۔ اردو کے اخبارات نے
اس فلم کو "اسلام دشمن" اور اسلام کی توہین کہہ کر خوب خوب کھسکا لیکن اس کا
اثر اٹا ہوا۔ اردو اخبارات پڑھنے والے ایسے ہزاروں لوگ جو نہ انگریزی جانتے
ہیں نہ کبھی انگریزی فلم دیکھتے ہیں وہ اس سینما میں ٹکٹ کے لئے گھنٹوں
قطار کھائے سبے تاکہ دیکھیں "اسلام کی توہین" کیونکہ کون کونسی ہے۔ اردو فلم
نا کام ہونے کے بجائے خوب چلی۔ یعنی اردو اخبارات نے اس فلم کو مفت
کی تبلیغی شے دی۔ ہذا مخالفت کرنے کا انداز بھی سیکھنا ضروری ہے۔
کبھی کبھی اردو اخبارات میں کسی کتاب کے خطوط خوب لکھا جاتا ہے کہ نکال
سب اسلام دشمن ہے "اسلام کی توہین" کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اس
میں زہریلی زہر ہے وغیرہ۔ لیکن یہ مخالفت بھی اس انداز سے کی جاتی ہے۔
کہ اردو پڑھنے والے بازار میں اس کتاب کی تلاش میں جھگڑاٹنے لگتے ہیں لہذا
وہ کتاب بلیک مارکٹ میں بکتی ہے۔

مسلمانوں کے جاری کئے ہوئے اخبارات و رسائل کو خاص کر فرقہ پرستی
سے آزاد ہونا چاہئے۔ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے زمانے کی مثال پیش
کرتا ہوں۔ بنگلہ دیش سے ایک اردو ہفت روزہ "نیشن" کلکتہ آتا ہے۔ یہ
ہفت روزہ بنگلہ دیش کی مخالفت کھل کر کرتا رہا ہے اور ساتھ ہی ہندوستانی
حکومت کی بھی کہ اندرا گاندھی کی ذات پر بھی کچھ اچھا اتار رہا ہے لیکن یہ
دیکھا گیا اور سب ہی جانتے ہیں کہ کلکتہ میں اس ہفت روزہ کی اشاعت ان دنوں

اردو اخبارات کی لاکھ دھڑکی کر رہی کہ وہ حق گو و بیباک ہیں،
نیشنلسٹ ہیں، سیکولر ہیں، قومی یک جہتی کے پیالہ میں ہیں، لیکن ہمارے
ہمارے اخبارات کے صفحات کچھ تو ایسی کہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ
جین اتواہی مسائل پر اخبارات مضامین شائع نہ کریں رچو کر بنگلہ دیش
(انگریزی اخبارات بھی کہتے ہیں) لیکن اردو اخبارات میں یہ بین الاقوامی
مسائل عموماً وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق "اسلامی ممالک سے ہو۔ مثلاً
اردو اخبارات نے ان "اسلامی مسائل" پر جتنے صفحات آٹھ تک
سیاہ کئے ہیں ان کا مقابلہ اگر بنگلہ دیش کی جنگ آزادی سے کیا جائے
تو یہ بات صاف ہو جائے گی۔ بنگلہ دیش مغربی بنگال کا پڑوسی ہے لیکن
پچ تو یہ ہے کہ وہ لاکھوں مسلمانوں کی حکومت ہند بنگلہ دیش کی جنگ آزادی
کا ساتھ دیتا رہا ہے، اکثر انھوں نے اس جنگ آزادی کی مخالفت کی ہے
بنگلہ دیش کی آزادی پر کسی اردو اخبار نے "بنگلہ دیش آزادی نہیں" شائع
نہیں کیا۔ مغربی بنگال کے اردو اداہ و شعرا نے بنگلہ دیش کی آزادی
کا کھٹے دل سے سواکت نہیں کیا۔ جی دھند لاکھوں مشرقی بنگال کے باشندے
مغربی بنگال میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے ان دنوں یہاں کے لکھو اخبار
دلے پناہ گزینوں کے کیمپ کا حصہ کرنے خود سے نہیں گئے۔ ان سے
دلی ہمدردی کے مضامین نہیں لکھے بلکہ حالت یہ رہی ہے کہ خود حکومت ہند
کو آکر کار اردو اخبارات کا ایک وفد لے کر دورہ کرنا پڑا ہے۔ بنگال کے
اردو شعراء میں غالباً ساک لکھڑی ہی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ایک
فلم بنگلہ دیش پر کھل کر کہا "جو مفتلہ" آتش میں شائع ہوئی اور خود
ساک صاحب اس کے گواہ ہیں کہ اس فلم کے شائع ہونے پر کئی نظروں
نے ان کو گھور گھور کر لال لال آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کتنے لوگوں نے کہا
کہا ہے کہ یہ آپ نے کیا کیا؟

پہلا صانع طبقاتی صلح ہے۔ مسائل بھی طبقاتی ہیں۔ لیکن جب مسلمان
اپنے خاص مسائل کے لئے فوج بلند کرتے ہیں تو ان کو اس بات کا خیال
رکھنا چاہئے کہ اس فوج کا اثر اٹا نہ ہو۔ مثلاً ایک فوج ہے۔ مسلمانوں کو
محفوظ دے۔ "سرکاری نوکری دے" فوج حق کا پاب ہے لیکن کتنے کا انداز
جی ہاں آپ نے دوست فرمایا کہ اردو اخبارات نے اپنے نادہیں سے ڈر کر
بنگلہ دیش پر شائع نہیں کیا۔ اردو مسائل میں صرف ہندو گھنٹے نے
بنگلہ دیش پر شائع کیا ہے۔

گھنٹے کا ہندوستانی مسئلہ نہیں

بہت بدل ہوئی ہے۔ آج کوئی مولوی یہ اعلان نہیں کر سکتا کہ وہ مسلمانوں کو جو نہایت کے مطابق عبادتیں نہیں رکھتے مسلمان نہیں ہیں یا وہ عورتیں جو اسکول کا درجہ میں پڑھتی ہیں یا دفاتر و فرموں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں مسلمان نہیں ہیں۔ وہ آرٹس جو تصاویر اُبھارتے ہیں، وہ فوٹو گرافر جو فوٹو کھینچتے ہیں۔ وہ اداکار جو ناچتے گاتے ہیں، مسلمان نہیں ہیں۔ قدیم زمانے میں محرمِ عرب اندک زوروں کے لئے یہ مذہبی پابندیوں میں رہی ہیں۔ انہوں نے بادشاہوں کے لئے کوئی مذہبی قانون نافذ نہیں کیا۔ وہ رنگتے لیام مانتے ہوئے وہ ایک کے بجائے ایک سو سو روپے دل پہکتے تھے۔ چاہے وہ شادی شمع ہو رہی ہوں یا دمِ خانے کی پرسیاں، لیکن سب ہی بیگمات تھیں۔ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان مذہب نے کمزوروں کی کو دیا یا ہے۔ ان ہی پر حکومت کی ہے۔

مذہب کے معاملے میں ہندوؤں کا ادب اتنا کٹر نہیں ہے اور نہ انسانیت ہے جتنا کہ آج بھی مسلمانوں کا ادب ہے۔ وید، اوشد، راساں اور ہابھارت پر ہندو اہلِ علم کھل کر مخالفت کرتے آئے ہیں۔ ہندوؤں کا ادب میں ایسے اہلِ علم حضرات سے نفرت نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی ان کی تخلیقات کو نذرِ آتش کیا گیا۔ نیکو چند، راجندر مال، نر، نیگور اور مدھو سو دھن دت نے ہندو مذہب کے کئی پہلوؤں پر سخت ترین چوٹیں کی ہیں۔ مدھو سو دھن دت نے رام کے کردار کی کئی کمزوریوں پر کھل کر قلم اُٹایا ہے۔ چند نے رام سے کشش کے کردار کو بہتر فرمایا، چند نے رام سے ہلی کو اور مدھو سو دھن دت کی منظم تخلیق "میگھ ناتھ" کو رکھا گیا ہے۔ لیکن ہندو بنگالی ان کی تخلیقات کی قدر کرتے ہیں۔ ہندو مصنفین کو یہ اجازت ہے کہ وہ تیر، کراد پر یا مذہب کے جس پہلو پر چاہیں اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کریں۔ یہ ان کی مصنفین بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں ہیں۔ انجیل مقدس کے خلاف کئی یورپین اہلِ علم نے کھل کر کھنسا ہے۔ لیکن اب تک "اسلامی دنیا" میں یہ بات پالی نہیں جاتی۔ بنگلہ ادب کے نامہ ادیب سترھی ان ناشرین کے لئے ایک مضامین میں لکھا کہ حال ہی میں تی بی اے نوٹس والے ایک بنگالی نے ان کو بتایا ہے کہ وہاں علمِ حیاتیات ۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء کے طلبہ ڈارون کا فنڈز ارفار پڑھنے سے انکار کرتے ہیں اس لئے ڈارون کا فلسفہ ارتقاء درست تسلیم کرنا گیا تو قرآن کی بات محوِ ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا علم نہیں کہ دیگر اسلامی ملک میں علمِ حیاتیات کے طلباء کو دارون کا تصدیق فرمایا جاتا ہے یا نہیں۔ مگر نہیں تو واقعی ان کی سائنس کی تعلیم میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

چند سال ہوئے کہ میری نظر سے ایک اردو تصنیف "مضامینِ ماسٹری" اسلامِ مسلمین، گزری تھی جس کے مصنف کوئی ڈی۔ ایچ۔ احمد ہیں یہ کتاب ککتھ سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی تھی مصنف احمد صاحب نے اس کتاب میں اظہارِ خیال فرمایا ہے کہ اس وقت تک مسلمان بگڑتے نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ فرمودہ روایات پر قائم ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ جب تک مسلمان ہر روز نماز کے پابند رہیں، ہندو رکھیں، اس وقت تک ان کی ترقی ممکن نہیں ہے چونکہ بقول مصنف ان مذہبی فرائض کے ادا کرنے میں ہی مسلمانوں کا زیادہ تر وقت صرف ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کو وقت میسر نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ترقی کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر قدم اٹھائیں۔ مصنف کے خیال کے مطابق مذہب کے سخت پابند ہونے کی وجہ سے مسلمان ہندو روایت کی طرف جاتے ہیں۔ یہ باتیں احمد صاحب نے اپنے سے تو جیاً ایک صدی قبل لکھی ہیں۔ لیکن علم نہیں کہ مسلمانوں نے ان کی کتب کو جھٹلایا یا نہیں، لیکن مصنف کی ہمت کی داد فردوسی بڑی ہے کہ آج سے ایک صدی قبل انھوں نے ایسی ہمت کی ہے حالانکہ آج کے دنوں میں ایسے مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں جو ہر مذہب بندی سے بالا ادا کرتے ہیں اور ماہِ رمضان المبارک میں روزہ پابندی سے رکھتے ہیں لیکن آج بھی اگر کوئی مسلمان اس طرح کی بات لکھ دے تو اس کے ساتھ کیا سوچ کیا جائے گا اس کا درست اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

میری مذکورہ باتوں سے یہ نہ بھٹکا پائے کہ میں مسلمانوں کو ان کے مذہب پر قائم رہنے سے روکنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو جہاں تک ہو سکے دنیا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا چاہئے۔ دنہ آج بھی ترقی کے ہر میدان میں وہ ہندوؤں سے پیچھے ہیں اور اگر وہ بیدار نہ ہوتے تو وہ اندھی زیادہ پیچھے چلے جاتیں گے۔ آخر مسلمانوں میں کتنے نامی گرامی فاکر ہیں، انجنیئر ہیں سائنس دان ہیں اعلیٰ قیسی ریافت رکھنے والے کتنے ہیں؟ یہ بات خود مسلمانوں کو ٹھنڈے سونے درمیان سے سوچنا چاہئے۔ مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کیا ایسے قابل لوگوں کی ضرورت نہیں ہے؟ یا یہ کہ صرف ملکی یا مولانا ہی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل حل کریں گے۔؟

"یگور نے اپنی ایک نظم میں مادرِ وطن کی دیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے "ماں، تو اپنے پیارے بچوں کو پیار سے اپنے دامن میں چھپائے نہ کہ بلکہ ان کو اپنی گود سے اتار کر ٹھنڈے ٹھوکریں کھانے کے لئے بھگا دے تاکہ وہ دنیا کی تلواروں کی کھاؤں، دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھیں۔ دنیا سے سبق لیں اور تب ہی تیرے بچے اس وطن میں گئے کہ وہ اس دنیا میں اپنے پاؤں پر کھڑے نہ سکیں"

ہندوستانی مسلمان کی ٹریجڈی

مستقبل مرنے والے مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں تقریباً دو سو سال پہلے کے مسلمانوں نے اس بات پر کان نہ دھرا اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ پچیس سالوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہو گئی ہے۔ اس واقعہ سے کچھ سمجھ ہی آیا، بیان یہ کہ ہندوؤں کے نام کا قحط ہو رہا ہوگا۔

ہندوؤں کی آزاد ہونے کے بعد بھی ایک مسلم ملک ہی ہے لیکن اس کی جانب ہندوستانی مسلمانوں کا ایسی سرد مہری کا سلوک کیوں؟

صرف یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تائید و حمایت سے ظہور میں آیا ہوا پاکستان اب بھی ان کی حمایت کا مرکز بنا ہوا ہے۔ پاکستان میں شکل میں ظہور میں آیا تھا اور جس شکل میں آج ہے یہ دونوں تعلق مختلف ہیں۔ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کیلئے پاکستان کا کوئی جزیرہ نیالی حدود اور بعد نہیں ہے، کوئی دوسرا ملک یا ریاست ہے اور نہ وہ پاکستان جسے سڑ بھٹو پھر سے بنانا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ صرف خیالی مفصلی غیر حقیقی اور علامہ کی پسندیدگی کی دلیل ہے۔ اس میں ماضی کے تاریخی ہندوستان دس بیس یا کروڑوں کی تعداد میں تعدادی طور پر ساتھ میں رہیں اور وہ سب اس اسلامی زمین کی دیکھ بھال کریں اور (خیال) ہندوؤں کو روٹی اور کھانے سے آزاد کریں۔

اس طرح ۱۹۴۷ء کے جنرل الیکشن میں تائید کردہ پاکستان کسی جزیرہ نیالی حدود میں قید نہ تھا جو مسلم اکثریتی صوبے میں بننا جس کو وہ ان کے فائدے اور خوش آمد مستقبل کی امید میں تھا۔ وہ ایسا خیالی

ہندوستان کی تاریخ میں پاکستان کے قیام سے زیادہ عجیب و غریب اور غیر معمولی واقعہ اور نہیں ہوا۔ یہ یقیناً بے حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ پاکستان کی مانگ اور اس کی تائید مسلمانوں نے کی جو مسلم اقلیتی علاقے جسے مل رہے تھے اور تعلق رکھتے تھے، یعنی وہ علاقے جو آزاد ہندوستان میں شامل کئے گئے جبکہ بنگال کے اکثریتی مسلم علاقے کے مسلمانوں نے پچیس سال کے تغیر کے بعد اب بھی ایک آزاد بنگال دیش قائم کر لیا ہے۔ باقی ماندہ شمال مشرقی حصے (جی کھا پاکستان) میں اب اس ذہنیت کے لوگ شکل ہی سے پائے جاتے ہیں یہ صورت ۱۹۴۷ء کے جنرل الیکشن نے بنائی تھی

قد قیام پر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ہندوستانی علاقے کھلے ہوئے مسلمان (جنہیں اب ہم ہندوستانی مسلمان کہیں گے) جنسی طور پر نہ کشی کیوں کی؟ یقیناً کوئی بھی سمجھا رہے ہیں کہ کھل سکتا تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے کے پاکستان میں تبدیل ہوجانے کے بعد بھی مسلم اقلیتی علاقے کے مسلمانوں کو تو یہ ہر حال اسی ہندوستان میں رہنا ہوگا۔ اور اسی حالت میں یا شاید اس سے بھی زیادہ غلاب حالت میں، ہندوؤں کی زیرکوتی کو ہمداشت کرنا پڑے گا۔ اس ذہنیت سے وہ پاکستان بنانے کی صورت میں کس طرح چٹکانہ پڑتے ہیں؟ مولا ابوالکلام آزاد اور دیگر نیشنل مسلم لیڈروں نے بار بار اس ذہنیت کی طرف اشارہ کیا، لیکن کسی نے بھی اس طرف ذرا برکت نہ کی کیوں؟

کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس وقت اپنے وقت کے طور پر فائدے کے لئے لی کر یہ کچھ کر لیا ہوا

پاکستان تھا بد اسلام کی اس برصغیر میں مخالفت کرتا۔

لیکن پھر جو پاکستان وجود میں آیا وہ اصولی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے خالی پاکستان سے قطعی طور پر مختلف نکلا۔ اور اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی مسلمانوں کیلئے نیا پاکستان ایک شاک ثابت ہوا۔

دشمنی ملی کے مسلمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جس کے اس بار تو پاکستان کا وجود ہی نہیں ہے۔ راتم نہ ایسے دھوکا کھاتے ہوئے مسلمانوں کا تو یہی دوست تھا۔ اور اس وقت ان کی گفت گو سننے کا اسے کئی بار موقع ملا۔ دوم۔ نسلوات کی لہر اور اس سے بھی زیادہ خراب صورت اس خوف و دہشت کی لہر نے کی جو شمالی ہند میں عیسیم کے نتیجے میں اٹھی۔ اس طرح تقریباً کل طور پر مسلمانوں کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ رنجی سبھی کی ان لیڈروں نے پوری کردی تھیں ایسے موقع پر مسلمانوں کی ہمت بندھا جا بیٹے تھی۔ اس دلانا چاہیے تھی۔ وہ ہجرت کر کے پاکستان جا لے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی ذہنی کش مکش اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اور وہی کش کش آج بھی ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو قسقی طور پر سوناٹے تھا کہ ان فہم عرس ایٹھوں سے بڑھ کر ان کا کوئی دشمن نہیں ہے جو انہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ لیکن برصغیر سے شمالی ہند کے مسلمانوں نے اس بات سے بھی کوئی سبق نہیں لیا جس طرح سکھ اور ہندو پاکستان چھوڑ کر چلے آئے تھے اسی طرح انہیں ہندوستان چھوڑ کر چلے جانا تھا اور اپنے لیڈروں کی طرح پاکستان میں پناہ لینی تھی۔ اس کا خیال وہ شمالی ہند کے مسلمانوں کو سمجھنا پڑ رہا ہے۔

یقیناً تمام مسلمان یہاں تک کہ صرف شمالی ہند کی مسلمان بھی فوراً ہندوستان کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ دراصل انہیں اس قسم کے حالات کا شکار نہیں ہونا پڑا، اس طرح کے حالات کا شکار ہندو اور سکھ بھی ہند پر مغربی پاکستان کے چھوٹے تھے۔ لاکھوں مسلمانوں کے چلے جانے کے۔ اور جو کچھ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے۔ اب یہ ڈر ہے کہ مسلمان اپنے ان لیڈروں کی طرف دیکھ رہے ہیں جو چلے جانے والے لیڈروں کی خالی جگہ کو پر کر رہے ہیں۔

یہ نیا لیڈر شپ ان غوی ملاؤں کی ہے جو پاکستان کی تشکیل

نگاہ کا ہندوستانی مسلمان بنو

سے قبل اپنی قوم پر ذرا بھی اثر نہیں رکھتے تھے اور اب یہی لوگ ڈرے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی خوف سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور چون کہ یہ امنی میں قوی تحریک ہیں جو موجودہ حکمران جماعت نے مسلمانوں کو شامل کیا تھا، اس لئے اب اپنی قوم کے رہنما اور نڈا سفر بھی بن گئے ہیں۔ اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ صرف ایک ہی سبق بڑھا سکتے ہیں اور وہ ہے مذہب کا کیوں کہ عام مسلمانوں کو مذہب سے جوڑے رہنے پر ہی ان کی کامیابی ہمیشہ مشتمل رہی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ عام مسلمان خود بھی ڈرا سہما اور وہ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اس لئے اسے بھی ملایا اس غاب آمد دوا کی پی ٹی ٹی ڈال سے بہت کون سا ہے۔ اس طرح تقسیم کے صرف چند ہی سال بعد مسلمان کم از کم شمالی ہندوستان کے مکمل طور پر مذہب کی مخالفت میں آگئے۔ لیکن یہ قدم مسلمانوں کیلئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس سے نہ صرف وہ آزاد ہندوستان کی نئی جمہوری قیادتوں کے لئے رہے، بلکہ ان کے لئے یہ بھی دور رہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملی زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ گئے اور اس طرح ان کا یہ قدم بلاشبہ دشمنان کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔

ان قیادت پرست ملاؤں نے مسلمانوں کو صرف یہ سبق بڑھا دیا کہ اس بات پرست بھارت میں ان کا اسلام سخت خطرے میں ہے، اس لئے ان کا اولین فرض ہے کہ ہر قیمت پر وہ اپنے مذہب کو بچائیں، اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ خود سوبیدی مسلمان بن جائیں! حکومت نے بھی اس طرف سے آنکھ بند کئے رکھی کیوں کہ وہ خود بھی دو قوی نظریے کو چھوڑنا ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح تجویز اسلام قومی فائدے کے حق میں استعمال کیا گیا۔

دوسری جانب ملاؤں نے حکومت کی اس لاپرواہی سے فائدہ اٹھا لیا۔ اور اپنے مذہبی پروپے گٹھے کے ساتھ ہی ساتھ کچھ غلط فہمیں بڑے پیمانے پر اٹھانا شروع کر دیں۔ اس قسم کا ایک پروپے گٹھا یہ تھا کہ اگر تمام مسلمان ملاؤں کے بتلاتے ہوئے طریقے سے سوبیدی مذہبی زندگی گزارنے لگیں گے تو وہ کج بات کے ہندوؤں سے پریشان شدہ نچلی جات کے لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ہندوستان ایک مسلم اکثریتی علاقہ بن جائے گا۔ اور تمام مسلمان خد بخد مل بوجائیں گے۔

اس بے وفائے قومیت کی تشکیل اور اپنے مذہبی تجربے کے علاوہ

سیاسی مضامین نے تہذیب کی بنیاد پر ایک اور تحریک چلائی جو دراصل اصلی
 اور نظریاتی خیالات کا آئینہ تھی۔ پہلی بات یہ کہ ہندوستان کی تمام کھیتی
 پوری توہین کو ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کے خلاف منظم کر لیا جائے۔
 مسلمانوں میں یہ بات پھیلائی گئی کہ مسیحی معنوں میں ہندوؤں کی آبادی
 ۹۴ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے جبکہ باقی ماندہ ۶ فیصدی ہندوؤں کا حصہ
 دراصل شذوذ نہیں اور دوسرے کچھ طبقات پر مشتمل ہے اور یہ سب ہی
 ادنیٰ ذات کے ہندوؤں سے نمروانما ہونے کیلئے تیار ہیں۔ (اور جیسا کہ
 خلاصہ مطابق مسلمان پیداؤں کی طرف پریشہ اور حکمران ہے اس لئے اسے
 ہی یہ کل ہندو تنظیم قائم کرنا چاہیے۔ اور اس طرح وہ سب سے بڑی اکثریت
 کی حیثیت پر آئندہ اس جمہوریت کی باگ اور سنبھال سکتے ہیں جو کسی بھی
 حالت میں قدرتی طور پر ان ہی کی ہے۔
 آج مسلمانوں کو ہندوؤں سے بظن کرنے کیلئے سیاسیوں
 کا خواہ کر دیا شروع کیا کہ ہندو جو اقلیت کے خلاف غیر انسانی محرکات کا
 مظاہرہ کرتا ہے۔ سیاسیوں کے ساتھ خلاف معمول نرم رویہ اس لئے لکھا
 ہے کہ ایسا امریکا اور یورپ کی عظیم طاقتوں کی وجہ سے ہے جو مسیحیوں
 کے خلاف کئے گئے ظلم کا ہندوؤں سے بدلہ لے سکتے ہیں۔

اس بے بنیاد تنگ نظری کے مطابق اب یہ ضروری ہو جاتا ہے
 اسی طرح دوسرے مسلم ممالک بھی مسلمانوں کی اسی طرح پشت پناہی کریں۔
 مثلاً کاہلیم ممالک کہہ کر یہ مطلب ہوتا ہے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک۔
 لیکن اسی وقت ایک عام مسلمان یہ دیکھتا ہے کہ ان مسلم ممالک میں
 کتنی ایک کے ساتھ ہندوستان کے خوش گوار تعلقات استوار ہیں اور وہ
 عظیم ممالک ہندوستانی حکمرانوں کو ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ اہمیت
 دیتے ہیں تو وہ ان سے کوئی خاص امید نہیں رکھتا۔ اب اخیر میں عرب
 پاکستان ہی رہ جاتا ہے۔ جس کی تخلیق میں ہندوستانی مسلمانوں نے عام دل
 آد کیا تھا۔ اور جس کا خدا کرنا بھی عام طور پر ہندو مخالف ہی ہوتا ہے۔ اس
 کے علاوہ وہ صرف بحر اوقیانوس کی طرف سے زیادہ قریب واقع ہے
 میں کہ اجماعات و خیالات کی بنا پر بھی ہندوستانی مسلمانوں سے سب سے
 زیادہ قریب واقع ہے اور اس قدرت کی بنا پر وہ (پاکستان پر) ہمارا
 ہے اور وہ ہندوستان کو جس قدر کم زور اور پالان کو موقوف دیکھتا ہے
 ہندوستان کے دہن میں دیکر زیادہ وسیع کی حکم مانی کا جواب دیتا

ہندوستان کی مسلمان نمبر

ہو ہے۔ اس طرح ملاؤں کا یہ مذہبی ہندو پے گنڈا طبقہ ہوتی آگ پر تیل کا کام
 کرتا ہے۔

اس میں منظر کے بعد اب ہم ہندوستانی مسلمان کا کشمیر کے متعلق
 نظر آسانی معلوم کر سکتے ہیں۔ ایک گروپ کی حیثیت سے ہندوستانی مسلمان
 کشمیر کے اندرونی حالات کے متعلق علم رکھتا ہے اور اسے اس بات
 کی مسلم اکثریت سے کسی خاص قسم کی ہمدردی ہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے
 کہ ہندوستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ان کشمیری مسلمانوں سے بھی نفرت
 کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہونے کی وجہ سے کشمیر کو
 پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم اکثریتی کا
 نکتہ صرف شکایت کرنے والوں کیلئے اٹھایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ
 کی طرف کوئی توجہ نہیں دیکھا۔ اور وجہ وہی ہے جو ہندوستان میں بیان کی گئی ہے
 کہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی مخالفت کے لئے اسے سوچا جاتا ہے کہ
 پاکستان کیلئے مثبت اور ہندوستان کیلئے منفی طاقت کا توازن رہے۔
 اور زیادہ تر ہندوستانی مسلمان اپنی لاعلمی استراحت کی بنا پر یہ سمجھتے
 ہیں کہ کشمیر کے کل جانے سے جوڑ دیا جائے اس وہ ہوجائے گا۔ حیرت
 ہے آج بھی ایسے بے وقوف ہائے جاتے ہیں۔

میں یی یا ست کی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر کشمیر بھارت سے
 علاحدہ ہوا یا پاکستان میں شامل ہوا تو اس کا سب سے زیادہ اثر ہندوستانی
 مسلمان ہی پر پڑے گا کیوں کہ سیکولر ازم کی جو اصولی عمارت بھارت ہی
 میں تعمیر کی گئی ہے اس کی بنیاد بھی کشمیر ہے اور جس سے مسلمانوں کو کتنی
 فائدہ حاصل ہیں۔ پھر بھی جیسا کہ ہندوستانی مسلمان ذہنی اور روحانی
 حریف میں مبتلا ہیں اور جس طرح اب اور تب ہر نوازے قسامات ان کے
 لئے نقصان کا موجب بن رہے ہیں ان کو کشمیر کا بھارت میں شمولیت
 کا فائدہ نظر نہیں آتا۔ اور اسی لئے ان کا کشمیر کے متعلق بالکل غلط خیال ہے
 لیکن اسی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن میں کوئی اہم خیال نہیں ہے۔
 دیکھو پیش کو اب ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ بہاری قومی زندگی
 میں شامل ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ اس
 خیال میں مبتلا ہیں کہ انھیں شکست خوردہ پاکستان مسیح مذہب کا پیش
 کی بہ نسبت زیادہ دے گا۔

کشمیر اور دوسرے ہندوستانی مسائل کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کا
 183

نظر بہت حد تک سفر ادا کی زندگی کے متعلق نظر تھے ملتا جلتا ہے جب سفر ادا کیا ہو دیا گیا تو اس نے کہا کہ وہ نہیں جانتا کہ موت ابھی آ یا ہو گی وہ ابھی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ خود بھی طرح جانتا ہے کہ زندگی ہو گی اس لئے وہ موت ہی کو بھی کہے گا جو دراصل بری ہے۔ یہی بات ہندوستانی مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ کشمیر کا ہندوستان سے نکل جانا ان کیلئے اچھا ثابت ہو گا یا برا۔ یہ اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ بات ابھی طرح جانتے ہیں کہ وہ حالات برے اور ناقابل برداشت ہیں اس لئے وہ بعد میں آنے والے حالات کو اچھا ہی کہے گا حالانکہ وہ برے ہو گئے۔

قدش کے اس نظریے کے دائرے اس خیال سے جا کر ملتے ہیں کہ ہندوستان کے باہر کشمیر کا مطلب ہے کہ کبھی نہ کبھی کشمیر کا پاکستان میں شامل ہو جانا۔ اور اس طرح پاکستان فوجی قبضے اور مضبوط ہو جائے گا۔ اور اسی نسبت سے ہندوستان کو مذہب ہوائے گاہ جیسا کہ یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کیلئے پاکستان کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح جیسا کہ درشکوتہ Ahamis حدیث ظاہر کرتے ہیں کہ اس سے ہندوستانی مسلمانوں کیلئے سخت مشکل پیدا ہو گئی غلط ثابت ہو گا بل کہ ان کے لئے بہتر حالات پیدا ہو جائیں گے۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کا کشمیر کے متعلق مذہبی جو مکمل طور پر ناجائز بھی اور بربادی والی بات ہے انھیں منطقی اعتبار سے کافی خوش گوار اور خوش ناظر آتا ہے۔

اب ہم ہامانی ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو بنگلادیش کے قیام کا مدد مل ہے۔ بنگلادیش کے تمام سے زمین پاکستان کے نظریے اور اس کی حالت کو نقصان پہنچا ہے بل کہ ہندوستانی مسلمانوں کے سپنوں کی دنیا بھی تباہ و برباد ہو کر رہ گئی ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اگرچہ آزادی کے بعد بھی بنگلادیش ایک مسلم ملک ہی ہے۔ لیکن اس کے جمہوری اور سکولر نظریے کا ہونے کے اعلان سے پاکستان کے نظریے کو نقصان پہنچا ہے۔ جو کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن پر فرار کیلئے بہترین پناہ گاہ تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناجائز اور اپنے ہماروں میں بڑھ چکی کہ بنگلادیش کے قیام کے فائدہ کے بعد جب سے زیادہ غیر محفوظ ہونے والا طبقہ کھلی اور نہیں بل کہ ان ہی کے ہندوستانی بھائی (وہابی) ہیں۔ انھوں نے ایک سٹے کیلئے بھی نہیں کیا کہ ان کے بھائی بنگلادیش میں اس سے بچھ پاکستانی فوج کے ساتھ اس کو قتل عام میں برابر کے شریک تھے۔ اس کے باوجود انھیں دہان کی شہرت

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

اختیار کرنے کا موقع دیا گیا۔ آج کا پاکستان اور مشرق وسطیٰ کا پاکستان۔ ہندوستانی مسلمانوں کیلئے کسی خاص کشش کا باعث نہیں ہے خاص طور پر وہ مشرق وسطیٰ کو قطعی طور پر ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر کسی ایک آدمی کو پاکستان کے ٹوڑنے کا جرم ٹھہرا سکتے ہیں تو وہ بھٹو۔ کیوں کہ بنگالیوں کی اکثریت اور حبیب الرحمن کے جوتے جوتے وہ پاکستان کے صدر بن نہیں سکتے تھے۔ یہ ایک کڑی حقیقت ہے جسے ہندوستانی مسلمانوں کو نگہناٹے گا۔ پھر بھی جیسا کہ وہ اب پاکستان سے ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ذہنی طور پر اپنا فائدہ ٹھکانے کیلئے بنگلادیش اور بنگالہ بندھو کو گالی دیتے ہیں۔ وہ بنگلادیش کے دوست بن سکتے ہیں۔ اگر وہ پاکستان کی جانب سے نظریں پھیر لیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈر سے یہ امید کھنا کہ وہ اس نازک موقع پر ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ انھیں ایک بھول ہے جیگڈھ مسم لونی دہشتی کے معاملے سے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی۔ کی مخالفت تک برسرِ اقدام اس کی گواہی دیتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈر انھیں اب تک اسی اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں جن میں وہ گزشتہ ایک سال سے تھے۔ اسلئے اب اس کام کو دوسروں کو کرنا ہو گا۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کو طاقتوں کے تحفے سے بے باک کرنا ہو گا اور اس کیلئے ضروری ہے کہ ہندوستان کی اکثریت عام نظریے سچی مضمون میں سیکولر اور بلاخط مذہب و ملت والا ہونا چاہیے۔ اکثریت کا بھی مضمون میں سیکولر ہونے کے بغیر صرف دستور کے الفاظ کوئی فائدہ نہیں دکھا سکتے۔

اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جو احتیاجات تقریباً ہر میدان میں کیا جاتے ہیں اسے بغیر کسی تاخیر کے یک منہم کر دینا چاہئے۔ مسلمانوں کو کسی طرح زندگی بھلنے داد اور عزت کی ضمانت دیا جائے جس طرح دوسرے مذہب کے لوگوں کو حاصل ہے۔ کسی گڑبڑ اور فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر سخت اور فوری طور پر ایکشن لینا چاہئے اور بغیر کسی قسم کی پچ کچاٹ 'جانب داری کے حق و انصاف پر مبنی ہونا چاہئے مسلمانوں کے کسی فرقہ کی زبان 'تہذیب اور دوسرے خاص معنی معنی کے لئے مناسب اور معقول حفاظت کا بندوبست کرنا چاہئے۔ تعلیمی پالیسی ایسی ہونی چاہئے کہ اس سے ملک کے کسی بھی حصے کے مسلمان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونی چاہئے۔ مختصر طور پر عرض ہے

ہی ایسا کھ ہے جسے وہ بھی سمنوں میں اپنا اور وطن کہہ سکتے ہیں اور
 اسی طرح ہندستان کی سرزمین بھی ان سے ایک سال کا فرق نہیں آئے گی۔
 اسی طرح سکھ پارسی جہن اور جہ مت کے دانش ور بھی کہتے ہیں۔ یہی
 وقت ہے کہ مسلمان بھی اپنا مذہبی سے اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ یہی
 وقت ہے جب انھیں مرہ نامی کو بھول جانا چاہیے اور انہی میں کی نہیں
 غلطیوں کو دفن کر دینا چاہیے۔ (ترجمہ - صادق علی)

کہ ہندستان میں بسنے والے مسلمانوں سے اس قسم کا برتاؤ کیا
 جائے کہ انھیں یہ احساس ہو کہ دنیا میں اگر ان کیلئے کوئی غمناک ترین جگہ
 ہے اور جہاں انھیں دن کی تابیت کے مطالق ہر قسم کی ترقی کا غلاف
 مواقع حاصل ہوں تو وہ ہے ہندستان کی مقدس سرزمین۔
 حال ہی میں اینگلو انڈین یڈر مسٹر فریک انٹھونی نے اپنے
 اینگلو انڈین بھائیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں صرف ہندستان

رُوگی مذہبیت

اُم ایس وقت جس نہ ہیت کاشکار ہو رہے ہیں یہ مذہبیت روگی
 ہو چکی ہے۔ یہ سنی کو شیعہ سے لڑاتی ہے۔ دہابی کا دل سنی سے میلا
 کرتی ہے۔ احمدی اور غیر احمدی میں لغت و ذاتی ہے۔ غیر مسلموں
 اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بناتی ہے۔ اس مذہبیت
 کے طفیل انسان، انسان کے خون کا پیسا سا ہو گیا ہے۔ میں اس
 روگی مذہبیت کو مٹانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے
 کہ ہم شاہ ولی اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر مسلمان بنیں۔
 ایس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی آپس کی فرقہ پرستی مٹ
 جائے گی۔ بل کہ ایک مسلمان کے دل میں اتنی وسعت پیدا ہو سکے
 گی کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اور معاشی معاملات میں
 پورا پورا تعاون کرے گا۔ اور ان دونوں میں وحدت الوجود کا مشترک
 دینی فکر اس میں موالات بن سکے گا۔ پھر ایس ہندوستانی کو میں آج
 کھڑیا کے بیچ اقوامی ترقی پسندانہ ترقی کا حال دیکھنا چاہتا
 ہوں۔ اس لیے میں اسے یورپ کے علوم، سائنس اور تنظیم کو
 اپنانے کی دعوت دیتا ہوں۔

حبیب اللہ سندھی

احقرام باہمی

مجلسِ ختم کے پاس آنسانی کتاب پر اس نے جھکاؤ نہ کر دیا مگر اس جہت
آپ نے فرماتے ہیں اس قوم سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو ظالم ہیں اور ان سے
کہو کہ جو احکامِ خدا سے عداوت رکھتے ہیں انہیں نازل ہوئے ہیں پر ہمارا تعین ہے
ہمارا اور ہمارا معبود ایک ہی ہے ہم سب اس سے سوتے جھکتے دیے ہیں۔
(عنکبوت۔ ۲۵)

میں بھی جگہ حکم جاری ہوئے ہیں۔
 غمہ ایمان والو! اسی قوم پر نہ ہنسو، ممکن ہے اس میں نیک آدمی ہوں
 اسی طرح غریبوں پر بھی نہ ہنسو، ممکن ہے ان میں بھی نیک ہوں۔"
 (اصحاحات ۶-۳)

کہو ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور ہماری طرف جو قرآن مجید نازل ہوا اس پر لگد جو کچھ ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، یعقوب، اور اولاد یعقوب پر نازل ہوا اس پر یقین رکھتے ہیں اور موسیٰ، عیسیٰ اور مسیح علیہم السلام تمام پیغمبروں کے پاس جو احکام ان کے پروردگار کی طرف سے آئے ان پر یقین ہے ہم ان میں سے کسی کو ٹھکانے نہیں سمجھتے۔ (آیہ ۲-۱)

یہ ایمان لے لو! اہل ایمان! اور جو تم پر ایمان نہیں لکھا چاہے تم لوگ اسے
 روک لے! اور اس کی عبادت کی طرف غماز کرو! کہ اگر قرآن مجید میں نہیں کیا گیا۔۔۔
 جیسی جگہ فرمایا ہے: ہر ایک قوم میں ایک رہنما جو ہے (زر: ۲۰-۲۱)
 ساتوں حکم ارشاد ہوا۔

کئی قوم ایسی ہیں جس میں کلمہ اے والا خیر ہو یا برا
 انھوں میں جو اچھا ہو وہ کلمہ اے ہے
 جو نے ہر رسول کو جس کلمہ کو زبان میں رکھا تاکہ وہ احکام الہی
 پر عمل کیا کرے۔ (ابو ہریرہؓ)

اور بے شک ہم نے ہر قوم اور ہر جماعت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے
ذریعے ہی حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور سرکش اور شیطان
قوتوں سے بچو۔ (نمل۔ ۶۔ ۵)
دوسری جگہ لکھا ہے۔

(۱) ہر قوم میں عبادتِ عزت خالصتاً واحد کی مقصود تھی جس کا کوئی شریک نہیں
(۲) ہر قوم میں ایک مردِ ادنیٰ کی عورتیں ہوتی ہیں
(۳) دنیا کے تمام پیغمبروں کو سچا سمجھو اور ان کی عزت کرو
(۴) خالصتاً ہر قوم میں رہنا اور پیغمبر بھیجے ہیں

۱۶) خدا نے پیغمبروں کو صرف عربی زبان ہی میں پیغام نہیں دیا بلکہ ہر اس زبان میں پیغام دیا جس قوم میں خدا کا حکم نازل ہوا۔

۱۷) قرآن مجید میں بہت سے پیغمبروں کا ذکر موجود ہے اور بہت کا ذکر نہیں بھی کیا گیا۔ ان کی واضح احکام کی روشنی میں مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ گو ان کے پاس خدا کی بھیجی ہوئی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو ابتداء سے لیکر آج

تک جوں کی توں موجود ہے جس سے ایک حرف آمد ایک نقطہ بھی کم نہیں ہوا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خدا کے دوسرے مذاہب کا مذاق اڑائیں اگر ہزاروں برس کی دست برد سے دیگر مذاہب کی عظمت مسخ ہو چکی ہو پھر بھی مسلمانوں پر واجب نہیں ہے کہ دوسروں کی تکفیر کریں۔ اللہ پاک نے قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے ان سے ان کے دینوں کے مطابق حساب کتاب ہو گا جن پر وہ باپ دادا کے ارتکاب سے قائم چلے آئے ہیں گو یا اللہ پاک نے ہر مسلمان کو بھی اپنا الہامی اور فی حق کسی کسی صورت میں قائم رہنے دیا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو جو ادھر بیان کی گئی ہے تو مسلمانوں سے براہ راست سوال کرنا پڑے گا کہ اگر وہ دوسرے مذاہب کے تعلق ایسی نفرت و حقارت نہ پھیلائیں جس کے وہ مستحق نہیں ہیں تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہونچتا۔ ہندوستان میں تبلیغ اسلام میں کتنی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں۔ دوسرے مذاہب والے کشادہ دلی سے اسلام کا مطالعہ کرتے اور جب دیکھتے کہ اسلام کو صرف پہلے دینوں کا مصدق ہے اور خدا کے ان احکام کو معصف مجملہ حالت میں پہنچانے والا ہے جو ہزار ہا سال کے عرصے میں انسانوں کی دست برد و ذاتی انحراف سے مستور ہو چکے تھے تو اس سے خدا کے آخری پیغام کی نشر و اشاعت میں زیادہ آسانیاں پیدا ہوتیں۔ مسلمان علماء نے کافر۔ کافر اور شرک شریک کا لغو بلند کر کے خدا کے دو دینوں کو ایک جگہ جمع ہونے سے روک دیا۔ بڑے انہوس کا مقام ہے کہ اس نزک دور میں مسلمانوں کو نزدیک انتشار اور شرک و بدعت کے چھٹا ۱۰ ہیں۔ یہ فرصت نہیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کا اُن پرہ تو اُن پرہ پڑھا لکھا اب بھی کٹ جتنی کے مرض میں مبتلا ہے۔ انجام کار۔ کیا مسلمانوں کی کثیر تعداد۔ علاوہ شرک میں مبتلا ہیں؟

ایک قبروں۔ گنبدوں۔ مسجدوں اور پیروں فقیروں سے وہی کچھ نہیں مانگا جا رہا ہے اور اُن کی ویسی ہی پرستش نہیں کی جا رہی ہے جیسی خدا کی کی جاتی ہے؟ جب مسلمان شرک کرنے لگیں اور خدائے قدیر کے نام کو سبقت ڈال کر برحق کے سامنے جھکیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی توثیق اور تعویذ میں بننے میں ٹھوکر کھائی ہو اور اُن کے وسیلے سے پرمیشور۔ تک رسائی چاہتے ہوں یا وسیلہ کے لئے رب کو قربان کر چکے ہوں تو انصاف سے بتائیے کہ ہندو مشرکوں اور مسلمان مشرکوں میں خدا کے نزدیک فسوق زیادہ رہ جائے گا یا دونوں اس کی نظر میں یکساں مجرم ہوں گے۔ میرے خیال میں تو مسلمان مشرکوں کو ہندو مشرکوں سے شاید زیادہ ہی منہ ہائے۔

اللہ کا دین ایک ہے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی سب اللہ کے بندے ہیں۔ میں اس سے جو نفرت کے قوانین کی زیادہ پابندی کرتا ہے اس کی دھاریت کا قائل ہے اور اس کے پیغمبر کو برحق ماننا ہے وہ عروج اور ترقی پانا۔ ہے۔ حد سے بڑھنے اور اعمال بد کی سزا سب کے لئے یکساں ہے مسلمان خدا کے آخری پیغام کا حامل ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

بے خبر! تو جو ہر آئینہ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!

عجیب نہ ہندوستانی مسلمان خیر

اس مسئلے اُن کی دہر داریاں زیادہ ہیں انھیں تو لا دھلا قرآن کے احکام پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں میں جو مذہبی تعصب ہے۔ ہندو جو مسلمانوں کے خلاف زہر اُٹھتے ہیں۔ یہ تمام کا تمام بے اثر رہ جاتا ہے۔ اگر مسلمان قرآن مجید کے احکام کی متابعت میں ہندوؤں اور دوسری قوموں سے معاشرہ کر کے اور خدا اور اس کے رسول کے احکام بحمت انھیں سنائیں۔ کیونکہ مذہب نہیں سکھانا آپس میں بُر رکھنا

(۱۲) معاشرتی اتحاد

• قوموں کے میل ملاپ اور دلی کد دلیوں کو دودھ کرنے کے لئے معاشرتی اتحاد کی اشد ضرورت محسوس ہو ا کرتی ہے اور اس سلسلے میں ہمارے ملک نے بھی کسی قدر ترقی ضرور کی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے طرز معاشرت اور لباس خوراک میں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ایک دوسرے کے قریب ہونے کی کوشش دہی کی ہے۔ آج سے سو سال بعد لباس و طرز معاشرت، شکل و صورت میں دونوں میں بہت کم فرق رہ جائے گا اور شاید ہندو اور مسلمانوں کو شناخت کرنے کے لئے نام پوچھنے کی ضرورت پیش آیا کرے گی۔ یہ یک جہتی بھی ملکی ترقی کے لئے لازمی ہے لیکن اس مسئلہ کو مرد ایام کے سپرد کر دینا مناسب نہیں۔ اب بھی دونوں قوموں کا فرض ہے کہ وہ مناسب پیش قدمی کرتی رہیں۔ جب تک ہندوستان سے جھوٹ جھات دندنہ ہوگی ہندوستانی کبھی ایک نہیں ہو سکتے، چونکہ ہمارا رواج و رگندہ سے ایسا جھوٹوں کو سیاسی دوجہ برنگے مکانا چاہتی ہیں وہ صاف ستھرے خوش پوش خوش حال مسلمانوں کو گلے گھانے سے گریز کرتی ہیں؟

کیا وہ خدا کی نظروں میں کبھی سُرخرو ہو سکتی ہیں؟

وہ اپنے مفاد میں کبھی کامیاب ہو سکیں گی؟

معاشرتی اتحاد کے لئے ہر تہر میں ہندو مسلم شریک کر کلب کھولے جائیں دونوں قوموں کے مہوت کھانے پینے میں یک جالی اور یک رنگی کا پس منظر پیش کریں یہی چیز اتحاد کا سنگ بنیاد بن جائے گی۔

(۱۳) اخباری اتحاد

ہندو مسلم اتحاد کے لئے اخباری اتحاد کی بھی اشد ضرورت ہے۔ دونوں قوموں میں نفاق کی آگ کو ہوائے میں اخبارات نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی یٹھوں کی نفاق انگیز تقریریں تو کبھی کبھی ہوا کرتی ہیں مگر اخبارات ہر بعد تازہ ترین زہر ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیتے ہیں

کارنہ ہے جو خون کے رشتے سے بھی قوی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان ہو جسے ہندوستانی سمجھ سکیں اور بول سکیں کیا ہندوستان میں اردو کے سوا کوئی ایسی دوسری زبان ہے جسے سب سمجھ سکیں؟ گاندھی جی نے بھی شروع سے اس بات پر زور دیا۔ "ہندوستان میں لسانی اتحاد کی اشد ضرورت ہے" تاکہ ہندو مسلم اتحاد ایکٹا اور قومی یک جہتی کے کام میں معاون ہو سکے۔

یوں تو ہر ریاست میں اپنی زبان "سرکاری زبان" ہے اور آزادی کے بعد تمام ملک کی سرکاری زبان ہندی بن گئی ہے جس کا ہم احترام کرتے ہیں۔ لیکن جن ریاستوں میں اردو سرکاری زبان تھی وہاں اسے ثانوی درجہ دینے کے عوض سرے سے تمام دفاتری سے خارج کر دیا گیا ہے۔ براہوئے تعجب کا۔ حالانکہ اردو جتنا میں اتحاد پیدا کرنے میں بڑی موثر ثابت ہو سکتی ہے۔

اس لئے جو لوگ چاہتے ہیں کہ ملک میں اتحاد قائم رہے انہیں چاہئے کہ ملک کے اخبارات میں اتحاد کرائیں۔ اس غرض کے لئے اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس ہونی چاہئے جس میں اس مسئلہ پر شرح و بسط سے بحث کی جائے بعدہ قواعد وضع کئے جائیں جن کے تحت چل کر وہ اتحاد کے لئے مفید بن سکے ہیں۔ ایک ہندو دہلی کا فراز کی جگہ ایک عورت کا فراز اور ایک مسلمان بریلی کی گرفتاری کی جگہ ایک بدعاش کی گرفتاری لکھنے سے اخبار نویسوں میں کچھ کمی نہیں رہ جاتی۔۔۔۔

دہم، لسانی اتحاد۔۔۔ کوئی ملک اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک لسانی اتحاد نہ ہو۔ اگر ہندوستان میں مدراسی کی بات پنجابی نہ سمجھے تو بتلائے کہ ہمارا ملک کہاں اور ہم کہاں؟ ہم ہندوستانی نہ ہوئے انگریزی اور روسی ہوئے جو ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے حالانکہ ہمارا رشتہ وطن

ہندو مسلمان دو آنکھیں

ہندوستان میں ہندو کے فضل سے
دو قبیلے اسے طرح آباد ہیں کہ ایکے کا گھر دوسرے
سے ملا ہے ایکے کے دیوار کا سایہ دوسرے پر پڑتا ہے
ایکے آب و ہوا میں دوسرے شریک ہیں عقیدے
گنگا و جنا کا پانی ہم دونوں کے پتے ہیں
ہم دونوں نے مل کر ایکے نئے زبان
پیدا کی ہے جو ہمارے زبان
تقریباً نہ اُن کے ہے — ہندوستان
ایکے دلہن کے مانند ہے جسے
کے خوب صورتے اور سیرے آنکھیں
ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر
دلا دونوں آپسے میں اتفاق
نہ رکھیں گے تو وہ پیار کے دلہن
بہت گئے بھائے گئے۔ (سید احمد ظفر)

جَنید احمد

مسلمانو! اچھے انسان بنو

مُسْلِمَانُو! اچھے انسان بنو!

[illegible]

گنگو میں جہل و ستمانی مسلمان پر غصہ و شامت کا طوفان دھکڑھکڑاتا
 - کفر کے خلاف جدوجہد کے فراموشان کریمین؟ سیکڑوں کے غمت
 آج کے ۲۰۰۰ سال پہلے شام کی آفتاب تھی۔ آج صبح کی آفتاب
 کارکنانِ حق پر اس سورج کی برکت ہے۔

ہندوؤں کے ہمسازہ اور اس حیرت طبع کو قلوب میں رکھنے کے لئے
مگر زہنی نے سالانہ مشین سے کام لیا انہیں بڑھایا لکھا یا دوز گاہ کے
ان پر دروازے کھولے۔ انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال میں جتنے ہمساز
ہندو اور مسلمان کو یہاں بنا کر تعمیر اور عرصہ لگا جیسا کیا مسلمان علماء
کچھ سو برس کے قیام خدستان میں اس سے نصف تعداد مسلمانوں کو
یہاں کا اوڑھنے بڑھنے کی صلاحیت بھی نہ بخش سکے۔ دینی تعلیم کے
فارغ شدہ ہندو مسلمانوں اور تعلیم خاؤں کے لئے چننے سے جمع کرنے
اور ہندو وہ ہے زیادہ کران اور ان کی روٹی بڑھانے سے آگے نہیں
بڑھ سکے۔ لہذا ہی تعلیم کو ان سے منکے ہوئے تو سے فی صد معاشرے میں
بے احساس کتنی بکاشکار اور اس کا جبر، عمر بھر چہرے سے شہمی کے آثار
نکلتے چھڑتے ہیں۔ آئندہ چھ سو سال انہر اور ان ای مصادر سے فارغ ہو کر
نکلتے ہیں۔ یہاں کی کہاں کسبت ہوگی۔ اس پر آج تک کسی کی نظر اور

نہایت انی مسلمان بولنگو کا دھوکا مانتی حال اور مستقبل سے متعلق
ماہی ایک دور انگریزوں سے قبل کا ہے جس میں کوئی عیسائی حکمران
میں حکمرانوں کا تسلط رہا ہے اس دور میں حکمران اور سلطنت کا نظم و نسق
سنبھالنے والے چند افراد اور دولت پر عیش کرتے تھے، کچھ مذہبی علماء اور
بعض اہل علم بھی دربار سے متعلق رہ کر دینی و دنیوی تعلیم دیتے تھے۔ ان
کی نظریں خصوصاً یہ دیکھتی تھیں کہ عوام یا شاہ کے حالات کوئی تحریک
نہیں دیکھتیں۔

شکر و رُزوں روپے کی دولت ذاتی تھی اور یہ روپیہ مولیٰ تھی اور کچھ
 حصہ فوج اور لنگان کی وصولیائی پر، شہر انبص و دوسروں اور تعمیرات کے
 ساتھ سرکاریں اور سرائیں بھی تعمیر کرتی تھیں۔
 لیکن مسلمانوں کے عہد حکومت کے کچھ عرصے میں مولیٰ
 بگھنے پڑھنے کی مصیبت عام کر ایک فی صد بن چکی تھی۔ دی جا سکتی۔
 زمینوں میں روشنی ہی نہیں تو ملا جیتوں کے اور نہ کھانے والے

۔ اگر بڑے اپنے دور حکومت میں لاش کوٹ، آپس کی چھٹ کے
 سلسلہ پیر و رشتہ بھی دی رہے تار بقی شلیفون، ویڈیو، اسٹیم
 تصویر، سوٹر کلاسیائی جہاز، ڈاک خانہ، اسپتال، انکیرٹوں اور کلاؤٹو
 کا قیام، صنعت و تجارت اور تجارت کا فروغ سائنس اور مشینری کے سیکڑا
 سرے ہندستان کو دے گیا، لیکن ان سے بھی فائدہ نہ اٹھانے والوں
 میں برہمن رست مسلمانوں کی زندگی کو تباہ کرنے لگے

190

شمس و سناں اور طاؤس درماب کی منزل سے دو گنا فاصلہ پر پہنچے۔
 صدیوں سے مڑا پننے اور دکھا سوکھا کھلے گڑھے کے مالک بن گئے
 تھے۔ انگریز نے اپنی حکومت قائم رکھے کی تیرہ ہریکودھے کے ادا
 بہر قسم کے ظلم کئے اپنے دوسرا اقتدار کو زیادہ سے زیادہ قائم رکھنے کے
 لئے ہندوستانیوں میں **۱۹۰۵ء** نفرت کے بیج بوسے کہیں ہندو کا عالم
 تھا۔

اب سوال مستقبل کا ہے: ہندو دودھ، مسلمان شہر

دنیا کا سیاسی ڈھانچہ بدل رہا ہے۔ دنیا کی تہذیب اور تمدن، خوبیاں سرعت کے ساتھ ایک عالمی کچر ڈھال رہی ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ہر سطح پر اتحاد میل جول ہمارے ذہن کے ان بند و بچوں کو کھول سکے گا جن پر صدیوں سے رنگ کی تہیں چڑھی گئی ہیں۔

جلائی تعلیم، جمہوریت، اشتراکیت، لفظی اسلامی اگر ان میں سے کسی کو غور کرنے کی بات ہے کہ خلاف راستہ ہے۔ بعد اسلامی نظام کیوں قائم نہ ہو سکا؟ سستی اور شیعہ کا اختلاف بارہ سو برسوں بعد بھی کیوں قائم ہے؟

نواز، ایوب عباسیہ اور دوسرا وقتا بہت سے ہزار سال دور میں اسلامی نظام کیوں نہیں قائم ہو سکا؟

اگر مڑوں کے قہر میں کیوں قائم نہیں کیا جاسکا؟ اگر مڑ مڑیہ، غلطین، ترکی، اشقر، ایران اور عراق میں نظام اسلامی برپا نہ کیا جاسکا۔ اور ارض اللہ یعنی خاندان کبھی شخصی موروثی اور مصلحتی

الغنا حکومت نہ بنے اور دنیا بھر کے مسلمان علماء کے اضطراب میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوئی تو ہندوستان میں جہاں مسلمان ایک اقلیت میں ہیں۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر پھرتے ہوئے

اور تعلیمی میدان میں پس ماندہ ایک برسر کار دیکھنے پڑھنے کی صلاح سے ۹۹ مسلمان محروم ہیں کیوں کہ نظام اسلامی برپا کر سکیں گے؟ ہندوستان کا بنیادی دستور بہترین اصولوں پر قائم کیا ہے

آج اگر حضرت عمر فاروق حضرت عثمان غنی اور حضرت عثمان غنی ہندوستانی دستور کو دنیا کے دوسرے دستوروں پر غور کرتے دیکھتے اچھے انسان بنتے، اچھے مسلمان بنتے تو جہاں جیسے یہاں ہندوستان بننا چاہئے گا۔

کی صدائیں اگر گاؤں کو کھلی نہیں مسلم جو تیس ذہنیت کو ختم کرنا ہوگا۔ اگر اکثریت کے ذہن سے تعصب نفرت اور فرقہ پرستی ہم ختم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں خود سامندہی اور سماجی اداوں کے سیاست وغیرہ کی بنیادیں۔ دوسروں کے تعاون پر رکھنا ہوں گی،

مسلم لیگ، مسلم مجلس، جماعت اسلامی اور غیرہ کی موجودگی، رائے سیدک سنگھ، جن سنگھ، ہندو ہنساجا کے فرد اور مسلمان کا باعث بنی رہیں گی، شہر کے سطحی بھر سفید پوشوں اور پیسے بھروں کی ضرورتیں خود غرضی، طبع، لالچ، خوت اور دفریجے ہی اور سبھی ہوں ہیں، ضرورت

میں مسلمان وہ نوے فی صد ہندوستانی مسلمان ہیں، جو شہروں میں مزدور اور دیہاتوں میں کسان ہیں ان دونوں کو کہیں کی تعداد پار کر دے زیادہ ہے۔ تعلیم روزگار، مکان، علاج اور دوسری سہولتیں ملنے لگیں کیا ان اور دوسروں کی تنظیموں میں تباہی ہو کر حال میں کھانا پانا ورنہ ڈال کر اپنی ارمیت قائم کر کے ہندوستانی عوام کے مسائل کو اپنا مسئلہ بنا کر حل کرنا ہیں۔

آزادی کے بعد جس کے بعد سب سے زیادہ بڑھاؤ مسلمانوں کا متوقع ہے جس کی سفید پوشی انگریزوں کی بخشش تھی، جس کے مضامین میں اضافہ تقسیم وطن کی تھی ہے اور رنگ نظر اور رنگ دل احیاء

پرست ہو بدل کی تنظیمیں ہیں۔ اس طبقے کی فلاح کا انحصار ہے تعلیم تجارت صنعت اور ٹیکنیکل تعلیم کے حصول میں۔

انگریزی میں بالا قومی زبان ہے، جو نچے ذہینوں میں جن کے سر پرست اعلیٰ تعلیم دلا سکیں وہ اپنے بچوں کو انگریزی بھی سکھائیں دیکھ کر سیکھ کر ہی تک ہندی اور علاقائی زبان ہر مسلمان لڑکا اور لڑکی ضرور پڑھے۔

اور مسلمانوں کی زبانیں اور تہذیب کا جامعہ اور دوسرے دور کا علم و ادب کا ذخیرہ دنیا کی ہر ایم زبان کے شاہکاروں میں سے ہے۔

اس لیے جسے بھی اردو سے محبت ہے وہ یہ دیکھے کہ اس کے گھر میں اس کا خاندان یہاں کے خاندان سے زیادہ پڑھ لکھتے ہوئے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ اسے ہر نام کو آدھ گھنٹہ اور دوسرے پڑھنا

حکومت ہندوستان کی مسلمان بنو

کہ کہو ہا رہے گا جو دل میں عثمان کی
یہ شہریت غنیمت امور تیرا
حسرت ہندوستانی

تہذیب اور مذہب

معاشرے میں ملے۔

ان ہاجر دانشوروں اور مفکروں میں شاعر انقلاب آفتاب سہیل، رستمی، ملک ترمز فوراً ذہن میں آجاتے ہیں کیونکہ جب یہ لوگ ہجرت کر کے گئے بھارت میں ان کا طبعی ولولہ تھا۔ یہ سب سلمان تھے جس سرزمین نے انھیں اپنی قدسی سے آسمان شہرت پر پہنچایا تھا اسی کو ٹھکانہ انھوں نے آسمان فراموشی تو کی تھی لیکن ان پر تعبیروں کو معلوم نہ تھا کہ ان کے چلے جانے سے مردم خیز بھارت کا کچھ نہ بگڑے گا لیکن ان کی اپنی ذات اور خاندان ذیل ہوں گے۔ پاکستان میں مذکور کے ٹھکانے کہا میں گئے اور گناہ گشتے میں زندگی (دشمن) سے زندگی کہا جاسکتا ہے (م) کی گھڑیاں گشتے رہیں گے۔ ان بے چاروں کے ہونگیاں میں بھی نہ تھا کہ پاکستان کا سماں ان ہاجروں کو اس سلوک کے قابل بھی نہیں سمجھے گا جو سلوک وہ غیر مسلموں سے کرتا تھا پاکستان میں مقامی مسلمانوں کو کسی یہ طوطی نہ کہتی تھی کس پر کرنا؟ ہندو سکھ وہاں سے چلے آئے تھے مقامی مسلمانوں کو رعایا کی ضرورت تھی اور ہاجر مسلمانوں سے بہتر یا بدتر؟ رعایا اور کوئی نہ تھی۔ کیونکہ یہ لوگ خود رعایا بننے کے لئے ان مسلمانوں کے حضور میں چل کر گئے تھے۔

پاکستان میں مقامی مسلمانوں نے ہاجر مسلمانوں سے جو سلوک کیا ہے وہ کسی جی غیرت مند مسلمان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے بشرطیکہ وہ مسلمان اپنی آنکھیں کھولنے اور اس صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو کہ مذہب اللہ سب امت ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نہیں چل سکتے۔ مذہب کو سیاست میں داخل کرنا ضرر کنی ہے۔ اگر مذہب سیاست کی بنیاد بن سکتا تو مشرقی پاکستان کے سارے سات کوڑ مسلمان عربی یا انڈین کے مسلمانوں سے الگ نہ ہوتے، عرب و دشمن ہم مذہب ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہ ہوتے، عیسائی

آج کی زندگی میں ایک ناظم اہل ہے وہ یہ کہ جو دم ذہانت کا قد نہیں کرتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ کپ کی تمام تر دلدلی، معاشرتی بھڑی، تیز ہنسی، خفگی و تری پر برتری، غرض کوئی بھی امتیاز وقت کے تقاضوں کو نہیں بل سکتا آج ہم یہاں ہیں، کل سائنس اس سے بھی آگے بڑھ رہی ہے وہیں پہلے وہ جتنے بلکہ کو کبھی بھی جگہ نہیں ملے گی۔

پاکستان کی پوری تاریخ شاید ہے کہ اس بدعصب ملک میں جس کسی نے ترقی پسندی، اصلاح، دوستی اور محبت کے اسلام کی صحیح تفسیر کرنے کی جرات کی اس پر طعن طبع، ظلم ٹھکانے گئے اور اسے مسموم کیا گیا۔ ہر قدم پر رتند اور ترقی پسند قوم کا یہ مشرب رہا ہے کہ نہ صرف اپنے دانشوروں کی عزت کرے، انھیں ہر قسم کی سہولتیں اور مراعات دے تاکہ وہ اپنے معاشرے کی خدمت پر اسے اہمک اور پوری دل جوئی سے لگیں، بلکہ ان قوموں نے باہر کے دانشوروں کو بھی سرنگھوں پر بٹھایا اور جنسی حالات میں باہر کے دانشوروں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی تاکہ اپنی قوم اور اپنا معاشرہ ان کی عقل و دانش کو فہم و فراست سے فیضیاب ہوں۔ دعوہ کیوں جائیں۔ ہندوستان نے مذاکرہ فرینش سے لے کر آج تک اپنے دودانے ہر قوم اور ہر ملک، خیال کے دانشوروں پر کھلے رکھے ہیں۔ ان کی تعداد و منزلت کی ہے اور انھیں سینے سے لگایا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ من بستان کی ترقی اور عظمت کا ایک لازمی حصہ ہے۔

اس کے برعکس پاکستان میں دانشوروں کو اذیتیں دی گئیں۔ انھیں قید و بند کی صورتیں پیش کرتی ہیں جو بصورت سے ہاجر دانشوروں سے تو وہ ہیں تاہم مذہب سلوک کیا گیا اس کی مثال شاید ہی کسی مذہب

ہوتے ہوئے کئی ملک آپس میں نہ ملتے۔ ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو پاکستان میں ہمارے مسلمان بالخصوص ہمارے مسلمان دانشوروں اور فن کاروں سے جو سلوک ہوا ہے اس کے وہ نتیجے بھی تھے کہ چونکہ جو مسلمان یا اس عقیدے کے حامل شخص اپنے اُمیدوار کو ٹھکرا سکتا ہے اپنی ہندوب کو ٹھکرا سکتا ہے، اسے دوسرے ملک کے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہو مسلمان بھی شک اور حقارت کی نظروں سے دیکھے میں تھی یا نہیں شاعر انقلاب خان شیر حسن خان جوش ملیح آبادی کو اسلامی مملکت خدا داد پاکستان سے جو کچھ ملا ہے اس کے بارے میں بہت کچھ یہاں چھپ چکا ہے اور خود انھوں نے بھی اپنی رسوائی اور تذلیل کا اعتراف کیا ہے۔ پاکستان والوں نے جوش کی خاندانی وضع و آبرو کی پرہیزگاری نہ ان کی شاعری کی ان کے ٹھکان ہونے کی کوئی قدر کی نہ "فنائی اللہ" ہونے کی جس کی خاطر وہ اپنے خوابوں کی جنت پاکستان میں گئے تھے۔ پاکستان میں اس ہمارے دانشور کا جو شر ہوا ہے وہ قدرتی بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ اس بدسلوکی کی جو تفصیل ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں وہ اس تبصرہ کے بغیر تشنہ رہیں گی جو پاکستان میں ان کی خودنوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" پر کیا گیا ہے۔ پہلے تو کسی پاکستانی اخبار یا مجلہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور اگر کسی نے تبصرہ کیا بھی تو جوش کی تذلیل بنی کچھ کچھ کسریوں کی کرنے کے لئے۔ مثال کے طور پر لاہور کے ماہنامہ آؤڈ وڈ انچسٹ نے یہ تبصرہ کیا :-

زیر نظر کتاب ریاضوں کی برات، میں متقی پسند کے امام اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنے اپنے خاندان اور اپنے دوستوں و دوبرہ کے حالات بیان کئے ہیں جوش صاحب زندگی بھر جس مذہبی اور اخلاقی کڑھ میں مبتلا ہے وہ اسے وہ اس کتاب کے ذریعہ اس ملک خدا داد کی نوجوان نسل میں منتقل کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کے نام پر ناکام کی گئی ہے اور جس کی مخالفت وہ سکندریہ کے عہد میں پاکستان آنے تک نہ ملت نہرو کے حلقہ اجاباب میں شام ہو کر کرتے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اس کتاب پر لکھنے سے ظلم کو بکائی آتی ہے۔

جوش ملیح آبادی کے پایہ کے ایک اور عظیم ہمارے فنکار کا جو درگت پاکستان میں نہیں ہے اسے دیکھ کر جوش کو اتنا قلبی سکون ضرور ہوتا ہوگا اور ہونا چاہئے کہ وہ اس محدود ایکہ نہیں۔ یہ دوسرے ہمارے مسلمان فنکار آفتاب موسیقی استاد

اسد علی خاں ہیں۔ پاکستان جانے سے پہلے ہندوستان میں استاد اسد علی خاں کا جو مقام اور مرتبہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ریاست ہندوستان کے صوبائی موسیقار آفتاب موسیقی استاد فیاض علی خاں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں اپنے بھتیجے استاد اسد علی خاں کو آل انڈیا میوزک سافٹو میں شرکت کے لئے آگرہ بھیجا جہاں استاد اسد علی خاں نے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ ان کے فن کے چرچے سن کر آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل سٹریٹلینڈ نے استاد اسد علی خاں کی قدردانی یوں کی کہ جدید ٹرانسمیٹر سے ایس آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کا افتتاح ان کے ساز و آواز سے کیا۔ استاد اسد علی خاں بیس سال تک آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے اور انھیں ملی گڑھ، بھٹی اور جیس میں آل انڈیا میوزک کانفرنسوں میں تین تین بڑے تحفے عطا کئے گئے جو بہت کم ہندوستانیوں کو ملے ہیں۔

پاکستان میں اس عظیم فن کار کا جو حال ہوا اور ہوتا ہے اس کا ذکر معذرتاً حریت کراچی کے کالم نویس شہزاد حلیس نے نہایت حد تک اندازہ میں کیا ہے۔ "خاندان موسیقی کے آخری چشمہ و چراغ" کے عنوان سے کالم نویس نے اپنے فخر میں استاد اسد علی خاں کی بدحالی کے پردے میں ان تمام ہمارے فن کاروں کی بدحالی کی جملہ صفات تصویر کشی ہے جو نہ جانے کیسی کیسی امیدیں کر سیکور ہندوستان کو چھوڑ کر اسلامی مملکت پاکستان چلے گئے تھے ادب و دہان نہایت عسرت اور اذیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فن کے دیویوں میں زندگی کی ہمارے نذرانہ پیش کرنے والے استاد اسد علی خاں کے درخشندہ ماضی سے جو ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور سیکور آب و ہوا میں گانا ہوتا اور ہندوستان چڑھتا رہا، ان کے حال اور اس حال کی روشنی میں ان کے مستقبل کا موازنہ کرتے ہوئے ابراہیم حلیس نے لکھا ہے کہ "آفتاب موسیقی غروب ہو رہا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے شہنشاہ استاد اسد علی خاں جن کے سینے میں فن موسیقی کی ایک ہزار سالہ تاریخ دفن ہے، زلزلے کی ناقص کا داغ لئے گناہی کے اندھیروں میں آخری سانس لے رہے ہیں۔"

ابراہیم حلیس کے بیان کے مطابق ہندوستان کے بڑے بڑے اعزازات ٹھکانے والے اس "خوددار" موسیقار کو پاکستان میں تاید و ملت (نواب یاقوت علی) نے آفتاب موسیقی کا خطاب بخشا تھا لیکن قابضیت کی آنکھیں بند ہوتے ہی آفتاب موسیقی کو ریڈیو ڈی سے نکال باہر کیا گیا یہی نہیں بلکہ فن کے ذریعہ ملیک کی مشکل ہو گئی۔ راولپنڈی سے استاد اسد علی خاں کراچی پہنچے ایک چھوٹے سے سرٹھپایا۔ تلاش ماضی کے سلسلہ میں ریڈیو پاکستان کراچی میں بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھار انھیں اپنے اپنے کاروبار کو مٹا کر نا اوروں کو گمبائیں پر امنی حکام کا احسان تھا۔

ان نادری سے بیزار ہو کر اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ دنگ روڈ پر اپنے ٹوٹے
بھونٹے گھر میں مقید رہے اور مقید ہیں۔

یہ تو معلوم نہیں کہ آیا جو شریع آبادی بھی پٹان ہونے ہوئے اتنے خصلت
نصیب میں کہ نہیں کہ اپنے عزیزوں کو اردو جس کے غم میں آپ بھارت چھوڑ کر پاکستان
گئے تھے، پھر وہاں بڑے کرادی ہے لیکن استاد اسد علی خاں کے تعلق مدائن حیرت
کراچی کے اس کالم نویس نے اپنے تجربے میں لکھا ہے کہ "استاد اسد علی خاں اپنی اولاد
کو موسیقی سے پرہیز کر رہے ہیں۔ اپنے سات بچوں میں سے کسی کو بھی اپنا صدیقی
فن نہیں سکھا رہے۔ استاد کا کہنا ہے کہ اگر ان کے بچے یونیکس گئے تو بھوکوں
میں گئے۔ یوں لگتا ہے کہ فن موسیقی کا یہ ناخوشگوار گمیا ہے اور آگے نہ بڑھ سکے
گا۔ آج وہ ماضی کی حسین یادوں کو ہرگز وقت گزار رہے ہیں۔ ان کے اس
خاندان میں اب کوئی آفتاب موسیقی طلوع نہ ہوگا۔"

پاکستانی فوجی حکمرانوں نے ہنگامہ دیش میں دانشوروں کو جس طرح جین کر
ذبح کیا اس کی تفصیل سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس قبل عام سے پہلے
دانشوروں کو جس ذہنی اذیت، کوفت اور کرب میں مبتلا رہنا پڑا تھا اس کے
تصور ہی سے ذہن متزلزل ہوا تھا ہے۔ مگر فضل احمد کریم فاضل دانشوروں
کے اس زمرے میں آتے ہیں جو ذہنی اذیت میں اس درجہ مبتلا ہوئے کہ بس
مرنے مرنے لگے۔ مگر فاضل ایک سابق سینئر آئی سی ایس ہیں اور اردو کے
بلند پایہ شاعر، نقیم ملک سے بیسے کے فنی حلقے جانتے ہیں کہ فاضل برادران
کے نام سے ایک علمی ادارہ تھا جس کی کمی تھیں مقبول ہوئی تھیں۔ وہ ادارہ
بھی دراصل انہی فاضل صاحب کا تھا۔

کون سی کمی وہ بلا جو میرے گھر آئی نہیں؟ کے عنوان سے مگر فاضل نے
اپنی جو آپ بیتی لکھی ہے وہ پاکستانیوں کے اس تعصب کی مزبونی تصویر ہے
جو انھوں نے اپنے ہم مذہبوں سے روا رکھا ہے۔ یہ آپ بیتی جون سنہ میں
شائع ہوئی تھی جس وقت ہنگامہ دیش میں پاکستان کے صدیقی خاں کی فوجوں
نے گشت و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ آپ لکھتے ہیں: "ان سانحوں کو
لکھنے بیٹھوں جن سے دل میں زخم پڑے تو اچھی خاصی سولہ عمری بن جائے۔
اور اس کا یہ مہم نہیں۔ مگر شاید میرے تجربوں سے اردو کا بھلا ہوا نہ
وہ کہ خطہ ماقدم کو چھٹیں اس نے ان کا خیر ذکر کئے دیا ہوں۔ ان ناگفتی
باتوں کو جسے صرف ان چند باتوں کا ذکر کر دیا جا جو چند ان ناگفتی نہیں اردو
دلائل ملنے پر معمول سے زیادہ زور دینی چاہی ہے ان میں خانی رنگ اور صدیقی

ہنگامہ دیش کا بیان

اور انھیں شامل نہیں۔
اس قہید سے جہاں ہے کہ مگر فاضل جن ناگفتی باتوں کا ذکر کرتے ہیں وہ
سیاسی اور سرکاری حالات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں آپ بھی ہیں انھوں نے اسکی
دفاعت بھی کر دی ہے جس سے یہ قہودہ خد کرنا مشکل نہیں رہتا کہ پاکستان
بننے کے فوراً بعد بھی حجاز و انشوروں کے ذہنوں میں پاکستانیوں کے بارے
میں شکوک تو تھے مگر ان کی مسلمانیت نے ان شکوک کو زور دینا نہ کہا یا
رکاوٹ نہ بنے دیا۔ مگر فاضل لکھتے ہیں کہ: "پاکستان بننے کے بعد جب
قائد اعظم ڈھاکہ تشریف لائے تو وہاں کے آئی سی ایس افسروں کا ایک دستہ
ان سے علاج کی قیادت کا شرف لکھے بکشا گیا۔ قائد اعظم سے عرض کی۔
"اب تک تو ہم اپنے رائے بلا خوف و خطر اور بغیر دروغی کے دیانت داری
سے اس لئے انجام دیتے رہے ہیں کہ قاعدہ و صابلا اور سرکاری آف انٹیلیجنس
تعمیل حاصل تھا۔ اب خدا کے فضل سے پاکستان وجود میں آگیا ہے اور ہماری دیلی
خواہش ہے کہ ہم پہلے سے بڑھ چڑھ کر اس کی خدمت کریں اور فاضل شناسی کی
وہ روایت قائم کریں جو ملک کے استیقام و دروغ کا باعث ہیں۔ مگر یہی بد
ہے کہ اب موبائی و مرکزی مجلس قانون ساز کے اراکین و وزراء جن کی وزارت
کا دار و مدار ان کے دوٹوں پر ہوگا، ہیں اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال
کرنا چاہیں گے۔ اگر ہم نے ان کا آلا کار بننے سے انکار کیا تو یہاں لکھنے
پہنچائیں گے جن کا اندیشہ پہلے نہ تھا۔"

مگر فاضل یہ بات کہ طاہر اعظم نے انھیں جواب دیا کہ آپ کی مشکلات
مدد کرنے کے لئے دستور میں فردی بندوبست کیا جائے گا۔ انی الحال آپ اپنے
فرائض پوری دیانت داری سے اپنے عمیر کی روشنی میں سرانجام دیں اور اگر اس کی
پاداش میں آپ کو تکلیف اٹھانی پڑے تو خود پشانی سے اٹھائیں۔

اس سے قطع نظر کہ ان آئی سی ایس افسروں کو مگر ضابطہ کا یہ جواب بھی کچھ اس
نرم کا تھا کہ "جڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا" مگر فاضل لکھتے ہیں کہ میں
نے اس ہدایت پر عمل شروع کر دیا اور جب تک خواجہ ناظم الدین مرحوم اور ان کے
بعد اور امین صاحب (دونوں بنگالی) انھوں نے کمر بڑا رہے تھے وہ دوا بیل
تو ہیں ان میں کو ایسی نہیں کہ ضمیر کے خلاف کوئی بات کرتی پڑے۔ اس کے بعد
جب میرا تاملہ وزارت امور شہر میں کر دیا گیا تو وہاں میری کاروائی کا یہ نہ
شروع ہو گیا جو بہت سخت تھا۔ مجھ کو اللہ میرے پائے نیات میں جو کوئی خوش
نہ آئی لیکن اس ثابت تدبیر نے دل و دماغ روئ کر رکھ کے وہ تو یہ کہنے

کہ اللہ نے مجھے شعر گوئی کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس کی بدولت
ڈھل گیا شعر میں کچھ دل کا تبار
دور سے سینہ مرا شقی ہو جانا

لہذا امتیاز اور بھی ہونا ہے تو ہاں اور سہی
سیکڑوں نم ہیں جہاں ایک دہاں اور سہی
اور ہر طوقی گراں اور ہر زنجیر کوڑی
ناز برداری آشفستہ سراں اور سہی
یہ بنا ہیں راہیں کہیں، حکم زباں بندی کہیں
بنوہ پروریوں بھی ہوتی ہے غم اور اندی کہیں؟

پاکستان کی وضاحت اور کشمیر میں مشرفی کے اپنے بیان کے مطابق ان کی
سخت آزمائشوں کے دور کے ذکر اور پھر ان اشعار سے یہ بات عیاں ہوتی ہے
کہ وہ شدید ذہنی کشش میں مبتلا ہے یعنی انھیں ان کے ضمیر کے خلاف بعض فیصلے
یا پلٹیں کرنے پر مجبور کیا گیا اور دوسرے یہ کہ مشرف قسلی نے ہمیر کا دامن نہیں
چھوڑا جس کا ثبوت مشرف قسلی کے ان الفاظ سے ملتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ
مجھ پر بڑے سنگین الزامات لائے گئے۔ میں نے مطالبہ کیا کہ ایک جج کے ذریعہ
ان کی باضابطہ تحقیقات کرائی جائے۔ اس تحقیقات کے بعد میری بم اللہ
بازت برائت ہو گئی لیکن یاروں کی ریشہ دوانیاں رنگ لائے بغیر نہ رہیں اور
مارشل لا کے ان اختیارات سے جن کے خلاف انصاف ملی کے جلدیوانے
بن کر دئے گئے تھے مجھے پربنائے، پہلی سبوت سے روٹ کر دیا گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ان اشعار میں خصوصاً نفلی جیسے سیزر
آئی سی ایس اور سیاہ پاکستان کے روز قیام ہی۔ تہائی خد سے اور دوسرے
تھے اس کا ذکر انھوں نے مشرف جراح سے کیا بھی تھا مشرف نفلی نے پاکستان
بننے کے کچھ ہی دن بعد قبل از وقت پیش کی خود باضابطہ درخواست کی تھی کہ
مشرف نفلی لکھتے ہیں، ”میرے کی بات یہ ہے کہ حکومت نے میری درخواست
اس بنا پر منظور نہیں کی تھی کہ میری قیمتی خدمات کی حکومت کو بہت ضرورت
ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اسی شخص کو جس کی خدمات اتنی قیمتی تھیں انھیں
پربنائے نااہلی پر روٹ کر دیا گیا۔

مشرف نفلی اپنی آپ جی میں لکھتے ہیں کہ ”میرے دل نے کہا چلو
آئے دن کی کوفت سے تو نجات ملی کیونکہ
مانا کہ بڑے کامیاز ہے۔ آئی سی ایس

گلبن کا مہنتانی مسلمان تیر

چاندی کا سہی ہے تو مگر ایک قفس
اس قید کا کیا حال بتاؤں ففلی
دم گھٹے لگا رہنے سے ظالم بس بس
مگر یہ بھی میری خوش فہمی نکلی۔

یہ سمجھ گئے گزر جائے گا دور امتیاز اک دن
مگر یہ زندگی ظالم مسلسل امتیاز نکلی !

تایید اعظم کے ارشاد پر ضمیر کی روشنی میں فرائض مرا انجام دینے میں مشرف نفلی
کو پاکستانی حکمرانوں نے جو سخت سزائیں دیں ان کا مزید ذکر کرتے ہوئے آپ
اپنی آپ جی میں لکھتے ہیں کہ :-

”یہ داستان طویل بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ یہاں صرف اس قدر عرض
کر سکتا ہوں کہ میں نے (سرکاری ملازمت سے تعلق ٹوٹ جانے کے بعد) اپنے
اس دیرینہ شوق کی تکمیل کی طرف توجہ دی جس کے تحت میں نے بہت عرصہ پہلے
”نفلی بلوچان کی بنیاد ڈالی اور چند سال قبل امریکہ اور یورپ میں فلم سازی
کے جدید ترین طریقوں کا مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا۔ یہ شوق تقریبی قسم کا نہ تھا
بلکہ جذبہ خدایت ملت اس کا اصل محرک تھا۔ مگر باوجود کوشش کے جب کوئی
شخص نہ ملا جو اس کا تنظیم میں میرا ہاتھ بٹانے کو تیار ہوتا تو یہ ناچیز ہی اللہ
کا نام لے کر تنہا چل کھڑا ہوا اور اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا۔ گھر رہن رکھا
اور رہنے بھی لے میں نے وطن عزیز کے بارے میں ایک دوا لنگر فلم
”وقت کی پکار“ کے نام سے شروع کی فلم بن کر تیار ہوئی تو عام خیال یہ تھا کہ
انہی (جھی فلم اس سے پہلے پاکستان میں نہ بنی تھی۔

”لیکن ستم یہ ہوا کہ جب فلم سنسر کے لئے پیش کی گئی تو میرے کسی گرم زما
نے بونڈ کے ماننے حکومت کا وہ حکم پیش کر دیا جو اعلانِ ناشتہ کے بعد جاری
کیا گیا تھا اور جس کی رو سے ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ مشیر فرار دیا گیا
تھا۔ بونڈ کے حکم سے ہندوستان کے خلاف جس قدر جتنے تھے کاٹ دئے گئے اور
فلم نامام ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرض خواہوں نے میرے خلاف مقدمے دائر کر دیئے۔
میں سب کچھ بچ کر اور بے خاٹاں ہو کر جس ان کے قرضے ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میرا
خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ فرود میرا ہاتھ بٹانے کا جسے اللہ نے دولت
بھی عطا فرمائی ہے اور نظر بھی۔ مگر کسی نے دستِ تاحانہ بڑھایا ہی نہیں حالانکہ
لاہور تک کی مشیر فلموں میں وہ پیرنگ لگانے والے عموماً کراچی کے ہی صاحبِ ثروت
لوگ ہوتے ہیں۔

اس مہاجر مسلمان دانشور نے تیس پاکستان کے مقامی حکمرانوں اور صاحبِ ثروت لوگوں کے جذبہٴ انتقام، جذبہٴ نفرت اور جذبہٴ عناد نے اس شہرت کے ساتھ ملی شکل اختیار کر لی کہ فہشتی صاحب ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳

پاکستان کی ہر زبان کے سیاسی بہت روزہ انہما استیں سب سے زیادہ
چھپنے والے اردو بہت روزہ زندگی لاہور سے اپنے ادارہ میں حکومت سے
مطابقت رکھتا ہے کہ اکثر عبادت بریلوی کے خلاف تحقیقات اور سب کارروائی
کی جائے۔ مہاجر دانشور کے خلاف مقامی پنجابی اشتراکی ادارہ کا یہ انصار
لکھتا ہے کہ:-

گلزارِ ستانی مسعود

کہ ابجی تک متعلقہ حکام نے اس مسئلے کی سنگتیں کا احساس نہیں کیا۔ ہم شیخ الجامعہ اور رئیس الجامعہ و گورنر پنجاب جناب عقیق الرحمان سے گزارش فرمادے گئے ہیں کہ مکہ کالج کے معاملات اور اس کے پرنسپل کے افکار و نظریات کی تحقیقات سے عاجلانہ حیدر ایہام فرما کر مناسب کارروائی فرمائیں۔“

لو آپ اپنے دامن میں حیا ڈالیں گے۔
اداریہ میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خلاف "بھارت نوازی" اور "تقصیب" کا
جو داویلا بھجایا گیا ہے اسے درست ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر عبادت بریلوی
کی تحریروں کے کچھ اقتباسات اسی ادارہ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ ان
اقتباسات کو خود سے پڑھنے والے ہر ترقی پران الزامات کا کھوکھلا پن عیاں
ہو جائے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عبادت صاحب کی جن تحریروں کے اقتباس
بطور ثبوت پیش کئے گئے ہیں وہ چوتھائی صدی سے کسی تحریر میں ہیں اور دوسرے
یہ کہ ان میں آزاد خیابری کا حقیقی استعمال کیا گیا ہے۔

اس تباہی کے ہم خود مدار ہیں۔ ایک ساحر نے ایک کہیں کھیلایا تھا ہم سب اس کی زد میں آ گئے۔ ایک جال بچھایا تھا ہم سب اس میں پھنس گئے بغیر تقسیم کی تقسیم رہ کھن الاؤ، یا بندوقی فوس، سحر منوں کے تانے سے سب ایک ساحر کی شبیرہ بازی نہیں تو ادا کیا تھا؟ ہائے رہنا سب کی تہ نہکت پہنچ سکے انھوں نے مزاج پار کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ مزاج یاد میں جو کچھ بھی آیا کرنا رہا۔ فزہ برستی کی آگ کو بھڑکانے، نئے حالات پیدا کئے گئے۔ وہ آگ بھڑکی کہ اس نے سب کچھ جس دھاتاک کی طرح جلا ڈالا۔ مستقبل کا منہ جب ان تمام چیزوں کو بے نقاب کرے گا تو آئندہ نسلیں اسے ٹرھو کر کانٹ اٹھیں گی۔ اسی کے

رد گئے کھڑے ہو جا کریں گے اور سالہا سال تک ان کی آنکھوں سے خون بہتا رہے گا۔ یہ بات مستمم ہے کہ ہماری زندگی کی موجودہ عام الجھنوں کا مشورہ وہ فرق پرستی ہے جس کا زہر ہماری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ (ادب لطیف سالانہ نمبر ۱۹۸۳ء)

اس محرر کو پڑھنے سے عبادت صاحب کا اگر کوئی جرم ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ انھوں نے فرق پرستی کی مذمت کی ہے اور اس زہر کی چونکیوں کا نشان دہی کرتے ہوئے اس سے آئندہ احتراز کرتے ہوئے مشورہ دیا ہے۔ فرق پرستی کی بنیاد پر قائم اسلامی مملکت پاکستان میں واقعی اس سے زیادہ سنگین جرم اد کیا ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دوسرا سنگین جرم یہ کیا کہ انھوں نے مولانا آزاد کا نام لے لیا۔ اس جرم کو ثابت کرنے کے لئے سامانہ زندگی لاہور نے یکم جنوری ۱۹۸۳ء کے ماہنامہ "آج کل" میں عبادت صاحب کی اس تحریر کا حوالہ پیش کیا ہے:-

"مولانا آزاد کی سیاست کو سمجھنے کے لئے کسی طرح کی ترقی نہیں ہوتی کیونکہ وہ آئینے کی طرح عاف اور شفاف ہے۔ وہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے علمبردار ہے۔ ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ہندو مسلم ملے کا حل آپس میں میل جول اور ایک دوسرے پر اعتماد ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی ساری زندگی گاندھی جی کے ساتھ گزار دی کیونکہ خود گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے۔۔۔۔۔ بھٹک ہے کہ اس سیاست میں انھیں کوئی بڑی کامیابی نہیں ہو سکی کیونکہ ہماری تاریخ بعض ناسازگار حالات کے باعث عدم اتحاد اور رجعت کے ایسے فوٹانوں کی تاریخ بنی گئی جس نے معنویت اور ترقی پسندی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔۔۔۔۔ بہر حال مجھے مولانا کی سیاست کے بارے میں کچھ زیادہ ہمیں کہنا ہے کیونکہ میں خود کو کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور نہ مجھے سیاست سے کوئی خاص دلچسپی ہے۔۔۔۔۔ لیکن اتنا مجھے ضرور کہنا ہے کہ ان کی نظر صدیوں کے انداز پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سر سٹیفورڈ کرسچن نے ایک دفعہ مولانا سے ملنے اور سیاسی حالات پر گفتگو کرنے کے بعد اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "میں نے ایسا یا یہ نظریہ اور ندریں اور دوسرے سیاست دان نہیں دیکھا۔"

پاکستان میں جابر مسلمان دانشور ڈاکٹر عبادت بریلوی مقامی مسلمانوں کی آنکھوں میں اس لئے بھی کڑا بن گئے ہیں کہ انھوں نے ادب اور ثقافت میں

سیاست کو داخل نہ کرنے کی دکالت کی ہے۔ انھوں نے اس بات پر دکھ ظاہر کیا ہے کہ تقسیم نے جو سیاسی تھی "انسانیت کو بھی اس بری طرح مجروح کر دیا کہ ابھی بہتا ہوا خون ان کے چہرے میں نہیں آتا۔ انسانیت دوستی اور محبت کی فریاد کرنے والے عبادت بریلوی کو اس لئے مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ جابر دانشور ہیں۔ اس سلسلہ میں زندگی نے ڈاکٹر عبادت کی مندرجہ ذیل تحریر ماہنامہ "نقوش کے آزادی نمبر ۱۹۸۳ء سے نقل کی ہے۔

"صورت حال یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے باعث ہماری سماجی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ تقسیم کے سیاسی نتائج سے مجھے مطلب نہیں لیکن تہذیب اور کلچر اس تقسیم نے بری طرح زخمی کیا ہے۔ ایک ہی ملک کے رہنے والے ادیب ایک دوسرے کے لئے ابھی بنائے گئے ہیں تقسیم جن امیدوں پر ہوئی ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں رجائی رجائات زور پکڑ رہے ہیں زندگی کے بنیادی موضوعات کی طرف سے جس نے توہم کسی حد تک کم کر دی ہے۔ بظلمات اس کے اس صورت حال نے نفرت کے شعلوں کو ہلادیا ہے۔۔۔۔۔ ادب ہندوستانی یا پاکستانی نہیں ہوتا، انسانی ہوتا ہے۔ وہ آج کا انسانی رہا ہے اور آئندہ بھی انسانی رہے گا۔ اس کو منزل کی طرف بڑھنا ہے وہ بڑھتا ہے گا۔"

پاکستان میں جابر مسلمان دانشوروں کے خائفوں کے ان چند رہنماؤں کے ساتھ وہاں کے مقامی مسلمانوں کی اس بدسلوکی سے جو حقائق ابھر کر سامنے آجاتے ہیں یہ ہیں کہ ملاقاتی اور انسانی تعصب مذہبی تعصب سے بھی زیادہ طاقتور اور اس سے لحاظ سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس نوع کا تعصب مذہب کو بھی جسے مضبوط ترین رشتہ کہا جاتا ہے خاطر میں نہیں لاتا۔ جوش شاعر ہیں، اسرار علی خاں موسیقار ہیں، فضلی آئی سی ایس ہیں اور عبادت مابہر تعلیم لیکن پاکستان نے ان میں سے کسی کو اپنا نہیں سمجھا۔ اپنا وطن چھوڑنا بہت بڑی قربانی ہے اور دوسرے ملک میں جا کر اپنے آپ کو وہاں کے حالات کے تابع کر دینا اس سے بھی بڑی قربانی ہے لیکن ہندوستان

کا اصل پاکستانیوں نے یہ بھی تو یہ کہ دیکھ مجھے وہ دیدہ وخت نگاہ میری سند جو گوش نصیحت یروش ہو

پاکستان کی بنیاد و نفرت پر

میرے نزدیک پاکستان سے دوستی ممکن ہی نہیں کیونکہ پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔ پاکستان کی گٹھ میں نفرت، بغض و حسد کیلئے دشمن اور حشرات جذبات جبرے پڑے ہیں، پاکستان کی تشکیل انگریزوں کی مروجہ تہذیب ہے۔ پاکستان انگریزوں نے اس لئے بنایا کہ زندگی بھر کیلئے ہندو اور مسلمانوں میں فساد پھیلے۔ خاتون عبدالغفار خاتون

ہم سب ستانی ہیں

تاریخی قوموں نسلوں، مذہبوں اور زبانوں کے اس دشمن کی محبت میں ہم مسلمان بھی پہلی صف میں کھڑے ہیں۔ ہماری تاریخ نے ہیں یہ سبق دیا ہے کہ ہم اپنے وطن کی محبت پر گواہی دیں اور اُس کے اتحاد کا ترانہ گائیں۔

آج سے صدیوں پہلے ایک مانے ہوئے مسلم مورخ عبداللہ دھوات نے ہندوستان کی بڑی اور خوشحالی کا ذکر کیا ہے۔

البوریان البرونی (۳۶۲ھ) نے ایک ہزار سال پہلے ہندوستان پہنچ کر اس ملک کی مذہبی، سماجی اور علمی حالت کو دیکھا اور کتاب "ہندوستان کا نقشہ ساری دنیا کو دکھایا۔

مورخ یسعیان ندوی کی یہ ریسرچ ہماری تاریخ کا جوہر ہے:

۶۰۰ سال پہلے کہ ہندوستان سے اُس کا تعلق چند ہزار برس کا نہیں جدید افسانہ شروع ہے نہ اُن کا پدری وطن ہے۔

حدیثوں، خبریں اور اصحاب تاریخوں سے ثابت ہے کہ پہلا انسان اور پہلا اسلامی مسلمہ کا پیغمبر۔۔۔ یہی حضرت آدم جنت سے نکلے تو ہندوستان جنت نشان میں اُٹا ہے گئے۔ یہی نہیں جنت کی چار نہروں میں سے ایک نہر ہندوستان میں بہتی ہے۔ مورخ سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"کیا اس جو تھے دریا کو گنگا سمجھا جائے۔"

ہندو اور مسلمان ہند کا ہی ہند ہیں نہیں بلکہ مورخ آزاد بلگرامی کہتے ہیں:

ہندوستان، میں کہتے ہیں:

حضرت آدم کے سے خدا کی یہی وہی اسی ملک میں، نازل ہوئی۔ چونکہ خود محمدی حضرت آدم کی پستان میں امانت تھا اس لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی گھر اسی سرزمین میں ہوا۔ اسی لئے حضرت نے فرمایا: مجھے

"ہندوستان ہمارا وطن ہے اور ہم سب ہندوستانی ہیں۔ یہ اس لئے نہیں بلکہ ہماری روح کا حقیقی تقاضا ہے، تاریخ کے سینے میں بہت سے زخم ہیں مگر اُن زخموں کو گریہ سے کوئی نادمہ نہیں ہزار اختلاف ہو سکتے ہیں مگر ہم سب اس بات پر متحد ہیں کہ ہم سب ایک ہیں اور چاہا یہ ایک وطن کی جدوں سے قائم ہے ہندوستان ہماری زندگی کا قطعہ ہے اور یہ قطعہ قومی اتحاد کے فواد سے تیار ہوا ہے۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ گنتی سچائی سے کہا ہے۔

"ہندوستانی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے، اس کے بے گننے کلچرل بندن ہیں اور سیکڑوں برس کی ترقی کے نشان ہیں۔ یہاں چھ ہزار سال پہلے سندھ کا کلچر پھیل۔ ایشیا کی ادنیائیوں سے اُن گنت تاریخ سیاح، زائر اور طالب علم آئے اور ہندوستان کے جیوں سہا اور آرٹ پر اپنا رنگ چڑھا۔ یہ ہے۔ لیکن یہ اُن گنت آئے والے اس ملک کی مٹی میں جذب ہو کر رہ گئے، ہندوستان تھا جس نے محمد کی طرح ہزاروں ندیوں کو اپنے سینے میں گزاریا لیکن سندھ سندھ ہی رہا۔

فلاسفہ ڈاکٹر ادھاکرشن نے اسی ایک اور وطنی بوٹی پر ایک بار کہا تھا:

"ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس ملک میں رنگارنگ کثرت کے اندر وحدت کا باریک رشتہ موجود ہے۔ جو باخدا انسانوں، روحانی بزرگوں، فلاسفوں اور فن کاروں کی کوشش سے قائم ہوا ہے اور ہم سب ایک مشترک میراث کے مالک ہیں۔"

یہ تحفہ ہم ہندوستان، تاریخی قوموں کا محمد جہاں درادے آئے اور اُن آئے یہی آئے۔ مثال سے عرب مسلمان افغان اور نسل آئے۔ مشرق کی اور سے نزد قوموں کے قافلے آئے اور اس ملک کی زندگی میں گہلیں مل کر شیر و گریز گئے

ہندوستان کی طرف سے خداوندی خوشبو آ رہی ہے۔
شاہر مشرق اقبال اسی بات پر مجھوم گیا اور بڑی بے ساختگی سے
’پکار اٹھا‘

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میراد وطن وہی ہے میراد وطن وہی ہے

امام عالی مقام حضرت مولانا علی کرم اللہ وجہہ نے ہیں یاد دلایا۔
’ہندوستان بہت اچھا دیس ہے‘ (راٹیل وریکا اس الہند)
یہ ہے ہندوستان سے ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ۔

ہم مسلمان ہیں اور ہیں اپنے اسلام پر اور ایمان پر اتنا فخر ہے کہ
کئی کوئی مثال نہیں لائی جاسکتی۔ ہیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ ’وطن کی محبت
کا سرچشمہ ایمان‘ ہے۔ (حب الوطن من الایمان)

ہم اپنے ساتھ اردو زبان کے اس فخر کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس
نے ملک کی پہچان، قومی لبائوں کو یہ کہہ کر پیچھے چھوڑ دیا۔ ج

سائے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

ادھ خود آگئے نکل گئی۔

یہ ہم مسلمان ہیں جو اس ملک کی خاک پر قبلہ رخ ہو کر اور اللہ اکبر کا
نعرہ بلند کر کے پانچ مرتبہ سجدہ کہتے ہیں اور مٹی صاف کئے بغیر سر اٹھا کر
پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے عقیدہ کو نہ ہے جسے یہ فخر حاصل ہے
یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ملک کی محبت سے دستبردار ہونا ہماری
طاقت سے باہر ہے۔

اگر ہمارے ہموطنی بھائی نہیں جانتے تو آج جان میں کہ اگر ہم نے
حب الوطنی کا دعویٰ کیا ہے تو تاریخ اس پر دلیل لانے کے لئے موجود ہے
مصنف یعقوبی ۲۲۷ھ ہجری میں ہند آیا اور اُس نے کہا کہ ہندو آئندہ
’لا سرفراہ کا ملک‘ ہے۔ عرب مصنف لفظ سرفراہ نے سنسکرت
نہاں کے کمال پر اپنی کتاب میں ایک باب لکھا ۱۰۱ھ میں ۲۲۷ھ میں ہندوستان
کا کتابوں کے نام دنیا کو بتائے۔

الموفق ۳۹۰ھ نے ہندوستانی طبعیہ و دینیہ کے نام دنیا کے
سلسلے پیش کیے۔

محقق نے چاک ’محققین کا ترجمہ کر کے انھیں محفوظ کیا۔ اور یگان
’البرہنہ نے ہندوستان کا نام کتاب لکھ کر روشن کیا۔ خواہزی نے بھی اس

کلام میں اپنا حق ادا کیا۔ ابو معشر فکلی نے دس سال ہندوستان میں رہ کر
سنسکرت سیکھی۔

ملا میسج نے راسائ لکھی، امیر خسرو نے ہندی زبان کو کھارا اور سنوارا۔
نیرود شاہ نے سنسکرت کتابوں کے فارسی ترجمے کرائے، اکبر کے شہزادے
دانیال نے سنسکرت کے لئے اپنا خزانہ کھول دیا۔

تاسم خروستہ نے اختیارات نامی ’کتاب لکھی اور فارسی زبان میں
ہندو علم طب (دیوگ) کو زلفہ کیا۔ کتیمیر کے سلطان زین العابدین نے اکبر سے
پہلے تہنی اور فارسی کے ہندی کو سرکاری زبان بنایا۔ ادھ ہا بھارت اور راج
ترنگی کے فارسی ترجمے کرائے۔

حضرت امیر خسرو نے مغربی نہ شہر لکھی اور اس میں ایک باب میں
ہندوستان کی عظمت کا اقرار کیا۔ چنانچہ مشہور سنساری اور عالم ویدانت
جد روپ سے خود ملے گیا۔ پہلے مسلمان تاریخ محمدی تاسم نے سندھ کی
فتح کے بعد ہندوؤں کی آزادی کا اعلان کیا اور حکومت کے کاموں میں آزادی
دی۔ ابراہیم شاہ عادل (۱۶۲۷ء) نے حکومت کا دوبارہ ہندوؤں کو
سپرد کیا اور فارسی کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔

بنڈت جواہر لال نہرو ان تاریخی باتوں کے گواہ ہیں انھوں نے بجا طور پر
یہ دعویٰ کیا ہے:

ہندوستان کی ہندی تاریخ میں ہمیشہ مذہبی مساوات اور ایکسا کارلج رہا ہے
انگریزوں سے پہلے محل بادشاہی میں ہندو مسلم رشتہ کا اعجاز اس سے
ہو سکتا ہے کہ اکبر کے عہد میں ہندو کا نمبر اعلیٰ عہدہ دار ۷۵ تھے۔ چنانچہ
کے عہد میں ۶۶ شاہجہاں کے عہد میں ۱۱۲ اور عالمگیر اورنگزیب کے
عہد میں ۶۷ اول درجہ کے ہندو، فوج کے کمانڈر اور اول درجہ کے سرکاری
عہدیدار تھے۔

اکبر کے نورتن، تو مشہور ہیں لیکن رائے گوڈرمل، شاہجہاں اور عالمگیر کے
بہاں مد ہندی منصب پر فائز تھے اور کانگراہ کی فوجداری پر چار لاکھ
سکہ شاہی سے سرفراز ہوئے۔ ہمارا جہیز سنگھ راجپوت چھ ہزاری منصب
اور پانچ ہزار سوار پر مقرر ہو کر اورنگزیب کے ساتھ قندھار مامور ہوئے
راجہ جے سنگھ سوائے عالمگیر کے زمانہ میں منصب دوزاری پر تعلق رکھنا
پر دوزار سواروں کی کلن پر مامور ہوئے۔ جے سنگھ بھی عالمگیری عہد کے
کمانڈر تھے۔

چتر گپتی جرات ہندو شاہجانی ۵۵۵ء ہجری میں سات مو کے منصب اور پانچ سو سال کے کمانڈر تھے۔ پنج اور بدیشاں نے مورچہ پر بیٹھا ہوا کے جو ہر دکھا چلے تھے۔

راجہ چندر سین جادو اور مہر سوار فرخ میر کے دیار میں سات ہزاری منصب اور چار ہزار سوار کے کمانڈر تھے۔ راجہ منوہر اس شہنشاہ عالمگیر کے بعد میں پچاس ہزار روپیہ کی مشاہیر سخاوت کے ساتھ دستگیر ہوئے۔ میں شولا پور کے قلعہ دار ہوا۔ بہادر مرہٹہ سردار نیپا سیندھیہ ۱۸۱۹ء میں بہادر شاہ کی طرف سے سات ہزاری کمانڈ مقرر ہوا۔ ۱۲ خاندان کا منصب چالیس ہزار تھا اور تیس ہزار سوار کمان میں تھے۔ دو لاکھ روپیہ نقد انعام حاصل کیا۔

مسلمانوں کے بعد میں ہندو مسلم رشتہ کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ شیہر سلطان کا متحد دیوان سردار پورنیا برجن تھا۔ سراج الدولہ کا صدر دیوان موہن لال اور پٹنہ کا گو۔ رام نرائن تھا۔ آصف الدولہ صدر دیوان اور وزیر اعظم ہاؤ لال، نواب حافظ جنت خاں روہیلہ کا وزیر اعظم راجہ مان رنے، بہار راجہ رنجیت سنگھ کے وزیر محمد پیر زادہ عزیز الدین اور توجانہ کا چیف کمانڈر الہی بخش تھا اور اسی کے نام سے توپخانہ موسوم تھا۔

جنگ آزادی کے مجاہدین علی مولانا سید احمد شہید کا اصرار توپخانہ راجہ رام راجپوت تھا۔

تقریباً کہ اس ملک میں ہندو مسلمان بار بار لڑے مگر ایک کے دل میں دوسرے کی بگڑہی ان کا ملک ایک تھا باکس ایک زبان ایک، ہزار سال تاریخ ایک رنگ ایک اس لئے وہ ہمیشہ ایک ہے۔ آخر پانچ ہزار میل دور سے، زیر آئے۔ اور کالے نوے کا فرق پیدا ہوا۔ یہی انگریز تھے جنہوں نے ہمارے ان کی زنجیر کو ٹوٹے ٹوٹے کر دیا۔

اختلاف دال حکومت کرنا دھرمیوں کا اصول تھا اور جی ہمارا اصول ہے۔ یہ تھا وہ اعلان جو ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو بمبئی کے گورنر لارڈ الٹسٹن نے کیا جس سے معلوم ہوا کہ انگریز ہندو مسلمانوں کو لڑتے ہیں اور حکومت کرتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ یہ انگریز تھے جنہوں نے ہندوستان میں مذہبی اختلافات کو ابھارا جس سے ہندو مسلم تصادم شروع ہوا۔ قندیلان مذہب اور کلیجہ کے معاملہ میں کسی قسم کی اگلی

نہیں تھی۔ (ہندوستان کا اتحاد۔ نہرو ۳۲۲) ہندو مسلم تعلقات کے سلسلہ میں دو باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ایک یہ کہ ہندوؤں نے شمال سے آئے والے مسلم فاتحوں اور جنوب سے آنے والے یا خدا مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ برداشت کیا بلکہ ان سے بھونڈو لڑائی برتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اسی طرح مسلمانوں کا وطن بن گیا۔ ۱۔

دوسری بات مسلمانوں نے حکومت کے کاموں میں ہندوؤں کو برابر کا حصہ دیا اور دونوں نے ایک دوسرے کے کلیجہ اور دایات زبان یکساں اور آرت پر اثر ڈالا اس طرح پر اچھی ہندو اور نے ہندوستان کا خیر قرار دیا۔ پنڈت سندھال کا کہنا ہے کہ مغل زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے حقوق ایک تھے ان میں مذہبی رواداری انتہا پر تھی۔ مسلمان صوفیا اور ہندو جوگی دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور مذہب کی بنا پر کسی سے کوئی فرق نہیں برتا جاتا تھا۔ مر جادو ناتھ سرکار جیسے فاضل مورخ نے یہ مانا ہے کہ مذہبی حکومت میں ہندو مسلمانوں کی حالت یکساں تھی۔

ایک انگریز ڈبیر وٹارنس نے یہ اصرار کیا ہے کہ شیواجی ادیشی سلطان تک کے زمانہ میں ہندو مسلمان ایک تھے۔ مگر باسو نے بھی اپنی تاریخ ہند میں صاف لفظوں میں اس بات پر اصرار کیا ہے:

مسلمانوں نے انگریزوں کے برخلاف ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ ان کے زمانے میں ملک کے لوگوں کو ہر قسم کے حقوق حاصل تھے۔ مرد و بیگ شہر و انیسارے ہند کو بھی یہ ماننا پڑا: مسلمان ہم انگریزوں سے زیادہ مدبر تھے وہ اس ملک میں بیوی بچے اور اپنا وطن بنایا۔ فارغ ذہنیت ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور ان کے فائدے ایک ہو گئے۔

تاریخ کی ان سچی اور سیدھی گواہیوں سے ہیں وہ زمانہ یاد آتا ہے جب ہندو مسلمان اس عظیم ملک سے سرحدوں میں زندگی گزارنے لگے اور باجا۔ کائے اور زبان کے مسئلوں پر لڑنے لگے اور فرسا کر سننے سے بالکل بیگانہ تھے۔ اس کی حرب ایک دہر تھی وہ خود ایک دوسرے سے بیگانہ نہ تھے اور کوئی اجنبی اور بیگانہ طاقت ان کے درمیان نہ تھی۔

پنڈت نہرو فرماتے ہیں۔۔۔۔۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں ایک ایسی قوم کی حکومت ہوئی جس کی جڑیں کسی دوسری زمین میں

انہی خلیص اہل اس لئے یہ قوم ہمیشہ ہندوستان میں بیگانہ اور غریبی کر رہی جس کا مقصد اپنا فائدہ کرنا اور ہندوستان کو فاجائز طریقوں سے لوٹنا تھا۔ اس قوم کا ہندوستان میں گھل مٹ جانا ناممکن تھا یہاں تک کہ وہ کسی کا لازمی نتیجہ ہوا کہ اس اچھی قوم اور اہل ہند میں ٹکڑے شروع ہوئی اور مسلسل چارہاں رہی اور پھر ہندو مسلم اختلاف کا ہر ہندوستان کے جسم میں داخل کیا۔

پنڈت جی اور زیادہ کہتے ہیں :

”برطانیہ ہی نے مذہبی ترغی وارانہ فساد پیدا کیا انہیں ابھارا جس سے ہندو مسلم ٹکڑے ہوئے۔“

ایک مسلمان فاضل سید عبد الباقی ایم۔ اے عثمانیہ مدرسہ نعیمیہ اکادمی حیدرآباد نے ہندو مسلم اختلاف کے بارے میں انگریزی ڈیپوسیٹ کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

”ظاہر کی سورت پر اقلیت کا مسئلہ ۱۹۰۵ء کی دستوری اصلاحات میں اُجاگر ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا بیج الیٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے سالہا سال پہلے بویا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کو رنج کرنا تھا اس لئے انہوں نے وہ اصول بھی تیار کئے جس سے ان کا شہنشاہیت مضبوط ہو۔ ایک اچھی قوم اس سے غافل نہیں تھی کہ ہندوستان میں اس کی بنیاد ہلا دینے والے عناصر موجود ہیں۔ اور مسلمان مرہٹے، سکھ، سرائیکی، بلوچ، برہمن، گجراتی، بنگالی، سندھی، کشمیری، پنجابی، اور دیگر قومیں اس سے زیادہ اور کوئی چیز خطرناک نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں ۱۹۰۵ء میں غیر ملکی سامراج کے لئے خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ انگریزوں نے سمجھ گئے کہ یا تو ہندو مسلم اتحاد برقرار رہے گا۔ یا سلطنت برطانیہ یہ دو الگ الگ چیزیں بنیں، ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ کرے

کے۔ انگریزوں نے دونوں قوموں کے درمیان عاشقی تینوں بنگالہ اور اسی طرح ہمیشہ کے اچھے تعلقات بگڑ گئے۔ لارڈ کلاؤ نے اپنے مراسلہ میں لکھا : میر جعفر میر تاسم اور نواب اور کات پڑھو۔ یہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ انگریزی غلبہ کو اپنی سب سے بد نامی سے ہر موقع سے کام میں لے گا۔ اس طرح مسلمانوں کی تباہی کا بیان اور ہندو مسلم اختلاف کا منسوبہ شروع ہوا۔ پنجاب ایڈمنسٹریٹو کونسل نے ممبر سر جان مینارڈ کا بیان ہندو مسلمانوں کی ہٹکلیں کھولنے کے لئے کافی ہے وہ لکھتا ہے :

”انگریزی اثر سے پہلے ہندو مسلمانوں میں کوئی مذہبی جھگڑا نہیں تھا۔ ہندو مسلم مخالف نہ ہوتی تو ہماری حکومت قائم رہ سکتی۔“

یہ ہے وہ تاریخی داستان جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ہندو مسلم فساد سے بد نامی کے لئے کس طرح ہر فرد کو کشش کی مگر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء کی سازشوں کا ایک جواب تھا اور اس بات کا اعلان کہ مفلس سردار مرہٹے اور ہندو اور مسلمان ہر گز ہندو مسلم اتحاد سے الگ نہ رہیں۔ ان کی تاریخی غلطیوں اور انگریزی کوششوں کی وجہ سے ان میں فرق ضرور تھا مگر انگریزوں نے ان کے مل جلانے اور ملک کو آزاد کرانے کے لئے ان کی رگوں کا گرم خون ایک ہی سمت حرکت کرنا تھا۔ ۱۹۰۵ء کی جنگ آزادی کے شہیدوں کا خون اس پر گواہ ہے کہ ان کو گورنمنٹ سے اور ہندو مسلمانوں کو آپس میں دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

تاریخ کے سینے پر وقت کا وہ قافلہ گزر چکا ہے جو ہندوستان کے قومی اتحاد سے بنا تھا۔ اگرچہ چاہیں تو اس اتحاد کو تیرا پھٹ سکتے ہیں مگر ہم تم کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ اتحاد ان کے لئے ایک نیا ہے خواہم ہندو یا مسلمان سکھوں یا عیسائی اچھوتوں یا کمزوروں کا۔

عقیدت و نفرت

آقا شورش کشمیری

میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں نے پچھلے صدی میں دو عظیم علمی وجود پیدا کئے ہیں۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ ان کے مسلمانوں کی بے پناہ عقیدت نے دنیوی اور دینی امور کو مسلمانوں کی بے پناہ نفرت مسلمانوں نے علامہ اقبال سے جو عقیدت استوار کی ہے اس کا دنیوی دماغ نہیں دیکھ سکتا ہے اور ظاہر ہے دل کی محبت سے ہمیشہ اندھے ہوتی ہیں۔ مسلمان اقبال کے نام کی محبت سے کہتے ہیں لیکن اقبال کے کام کو صرفنے لگاتے اور گواتے ہیں۔ میرا بار بار غزل خوانے شہر وند

قومی مزاج کی تشکیل

کئی بنیادیں ہیں جس سے شروع ہوئی ہیں۔ یوں بھی ہیں
اس غیر جمہوری اقدام کوں کا۔ کلچر، تہذیب، تمدن
تہذیب اور رسم و رواج کے سلسلے میں داخلی عوامل
زیادہ کام کرتے ہیں۔ خارجی فکری اور تمدن کے
بل لاتے پر کسی اقلیت کے کلچر، اس کے مذہب۔

اس کی تہذیب اور تمدن زندگی کو رہانا نامناسب
اقدام کے مترادف ہوگا۔ یہ اقدام کامیاب بھی
نہیں ہوتا۔ اقلیت کی شخصیت چوٹ کھا کر ادھڑکتا
ہے۔ اور اس میں علاحدگی پسند خیالات اور
زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں
کی فرقہ پرستی، فرقہ پرستی ہندی مسلمانوں کا
فرقہ نہیں ہے۔ اکثریت اس کے لئے بڑا بڑا
ہے اور اسے اس ذمے داری کو قبول کرنا چاہیے۔

لیکن صرف کلچر، تہذیب، مذہب اور ان کی حفاظت سے ہندی
مسلمانوں کے سب کام پورے نہیں ہوتے۔ یہ بھی سوچنا ہے
کہ اگر کلچر کے رنگا رنگ دھارے ہیں تو اس کے برعکس ہماری
قومی معیشت اور اس کے مسائل ایک سے ہیں اور یہ وہ مسائل
ہیں جنہاں ہندو اور مسلمان سمجھ اور عیسائی سب کو یکجا ہو کر
ان سے نمٹنا ہے۔ غریبی، جہالت، سب کا رکی، زراعتی اور صنعتی
پسماندگی ایسے مسائل ہیں جو ہندو اور مسلمان میں کوئی تقربیت

یہ کتنا عجیب نہ ہو گا کہ ہندوستان میں صرف ایک کلچر ہے۔
ایک تہذیب ہے، ایک تمدن ہے اور اگر ہندو مسلمان کسی
ایک مخصوص کلچر، تہذیب اور تمدن میں جذب ہو جانے سے انکار
کرتے ہیں تو کوئی بہت بڑا گناہ کرتے ہیں۔ یا اس لگ کے بنیادی
مفاد سے غداری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں کلچر کے ایک سے زیادہ دھارے ہیں ایک
سے زیادہ تہذیبیں ہیں، ریت اور رسم و رواج ہیں۔ جنکس پرل
جلتے ہیں، کیس پر علاحدہ ہو جاتے ہیں، کیس پر حسین سنگ بناتے
ہیں، کیس پر اپنی سفر شخصیت کا جادو جگاتے ہیں، کلچر، مذہب
تہذیب، تمدن، ریت اور رسم و رواج کی یہی رنگارنگی، اور
تو قوم کی ہندوستانی شخصیت کا خاصہ ہے۔ ہندوستان بھی
اسی شخصیت کا ایک عنصر ہیں۔ وہ علاحدہ بھی ہیں اور گھٹلے بھی
ہیں۔ انھوں نے اپنی مخصوص تہذیب اور تمدن زندگی کے مختلف
تاثرات، مختلف شعبوں میں ہمارے سماج پر چھوڑے ہیں تو زندگی
کے بہت سے شعبوں میں ملکی اور مقامی رنگ روپ بھی قبول کیا ہے۔

قبول و رد کا یہ عمل ہر ملک کی اقلیتوں میں جاری
دساری رہتا ہے اور انہی کو اس سلسلے میں حروف
آخر کھنا چاہیے۔ ہندوستان میں کچھ لوگ ایسے
بھی ہیں جو اس سلسلے میں اکثریت کو یہ حق دینا
چاہیں گے اور یہی چاہتے بھی ہیں۔ فرقہ واری تناؤ

نہیں کرتے اعداد ان مسائل کا علاج فرقہ دارانہ سیاست کے
ہاتھ میں ہے۔ ان مسائل کا علاج وہی سیکولر اور غیر جمہوری جماعتیں
کر سکتی ہیں جو غیر فرقہ دارانہ انسان دوستی، مساوات اور سائنسی
راویہ نگاہ میں یقین رکھتی ہوں ایسی کسی ایک جماعت میں یا ایک سے
زیادہ تعداد میں شامل ہو کر ان مشترکہ مسائل سے عمدہ بل ہونے
کی کوشش اور جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس طرح جواہر مندو

اور مسلمان اپنی قومی حیثیت کے مسائل کو اکٹھے رہ کر اور کندھے
سے کندھا لگا کر حل کرتے جائیں گے تو دھیرے دھیرے ایک
قومی مزاج کی تشکیل ہوتی جائے گی اس منزل تک پہنچنے کے
لئے اکثریت اور اقلیت دونوں کے دلوں میں عبرت قوت برداشت
اور رزاداری کی روح کا ہونا بہت ضروری ہے اس لئے اتحاد بنانے اور
ایک بلے روح رنگ اکوڑ متعصب سیاست کی کارفرمائی نہایت کمزوریت کو اپنی
سے اور اقلیت کو اکثریت سے الگ اور جدا رکھا ہے۔ ●

تیرہ سو برس گزر گئے مگر....

مذہب کے معاملے میں ایک میر خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال
کے دیکھو۔ اسلام ایک، خدا ایک، پیغمبر ایک، شیعہ اور سنی کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس
کے واقعہ کو آج کچھ کم تیرہ سو برس گزر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں جنھوں نے
یا۔ حق لیا۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ نہیں حق اور دل کا تھا ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھا جائے کہ انھوں نے
اپنا حق آپ کیوں نہ لیا۔ جواب یہی دیں گے کہ صبر کیا، اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے لے کر اس
وقت دلوں سے ہو؟ نہیں لینے والے موجود ہیں؟ نہیں۔ طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں! اچھا جب یہ
صورت ہے تو آج تیرہ سو برس کے بعد اس معاملہ کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا
ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزہ جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں دوت
ہوں تو دشمن ہو جائے۔ دنیا، جو مزرعۃ الآفرۃ ہے۔ اس کا وقت کار ہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے
میں جا آجے۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند گٹے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور ہے، بہت خوب
تم ہی حق پر سہی۔ لیکن انھوں نے سکوت اور صبر کیا۔ پس اگر ان کے ہو تو تم بھی صبر اور
سکوت ہی کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی، اور بھٹیادوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے؟ اور کیا
انسانیت ہے! کیا تہذیب ہے؟ اور کیا حسن خلق ہے؟

مولانا محمد حسین آزاد

ہندوستانی مسلم حکمرانوں کے سیاسی اصول

مرعات دی گئیں اور اپنی رعایا سمجھ کر ان کے ساتھ انصاف کو داد دی اور محنت کو بڑا دیکھا گیا ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو نہ صرف مذہبی آزادی بلکہ رعایت کی اجازت دی بلکہ خود انھوں نے اسلام بھیجے اور دیکھنے کی عمل کو شش کی انھوں نے اپنے سفیروں کو مسلم ممالک میں بھیجا، عللئے اسلام کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور قرآن کے ترجمے کرائے۔

سلطان منصور کے زمانے میں عرب و ہند میں علمی اور تہذیبی تعلقات استوار ہوئے اور مسلمانوں نے ہندوستانی علوم کو سیکھ کر دنیا میں نام کیا۔ بدھ پندتوں کا ایک وفد ہندوستان کا پیش ہا علی خزانے کے روبرو گیا تاکہ اسے سلطان منصور کے دربار ترجمے میں عربی زبان میں منتقل کیا جاسکے۔ ایک بڑی جماعت مسلم علما کی ان بدھ پندتوں کی شاگرد بن گئی اور ان میں سے بعض نے ناقابل فراموش خدمات، ہندوستانی علوم کی اشاعت میں انجام دیں۔ بدھ پندتوں کے ان شاگردوں میں سے ایک البیرونی تھا۔

جن ہندوستانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا وہ طب، نجوم، موسیقی، کیمیا، منطق، ہیئت، جغرافیہ، سیاحت اور ادب وغیرہ موضوعات پر تھیں۔ سب کا علم بھی ہندوستان سے عرب پہنچا، محمد بن موسیٰ خوارزمی کی کتابوں سے ہندی حساب عربی قالب میں ڈھالا گیا۔ جو بدھ متی پندت ہندوستان سے گئے ان میں امیر، ہیل، منک، بازیکو، فلیوفل، سندباد، احیاء، فالہ اور براہمنی کے زمانے میں جن ہندوستانی اطباء نے عربی زبان میں طب اور نجوم پر کتابوں کا ترجمہ کیا، ان کے نام، باکھر، اجا، مسک، واہر، انکر، زرشکی، ابوسبک، جھیر، عندی اور جیاری ہیں۔ ان ہندوستانی علما اور اطباء نے مسلم شاگردوں کو بڑی لگن سے ہندوستانی علوم سکھائے اور ابوہریرہ رازی اور یعقوب بن طارق جیسے عالم اند تحقیق پیدا کئے۔ یہ علمی سلسلہ بغداد سے لے کر اسپین تک بڑھتا گیا۔ ہندوستانی دوا کے اکتساب اور استعمال میں جن عربوں نے نمایاں حصہ لیا، وہ ہیں جن بن صبا، الحسن بن حبیب، فضل بن حاتم، تبریزی، احمد بن عبد اللہ اور دوسری

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے تعریف ہوئی صدی مسیحی کے آخر تک ہندوستان اور مسلم ممالک میں تجارتی علمی اور ثقافتی میل جول کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا، اس زمانے میں عربوں کی تجارت چین تک پہنچا ہوئی تھی، اور انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھی اپنی تجارتی منڈیاں قائم کر لی تھیں۔

ملا باریک ناظر سے پتا چلتا ہے کہ ایک بار بڑی ڈرویشوں اور عرب مسلمانوں کا تجارتی طیارہ ہندوستان آجائے تو جو اسے ملا باریک سے ملے، ملا باریک نے اجازت دینے سے ان کی دھمکتی دہانے کے مذہب کے اصولوں سے متاثر ہوا اور اسلام کے متعلق مزید واقعت حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی عظمت دیکھا اور اپنے وزیر اور اس کے پاس مسلمانوں کو مسیحی مرعات اور ہمیں آزادی دینے کے لئے دواں بھیجا۔ ہندوستان کو طے ہونے کے بعد وہیں کا سمندر سفر میں انتقال ہو گیا، جس کے نراں کی تعمیل کی گئی اس طرح ملا باریک میں مسلمانوں کی آمد سے ایک نئے تہذیبی باب کا اضافہ ہوا اور ہم دہ راج اور تہذیب و تمدن کے ایک خلیہ کو کھینچے جہم لیا۔

پس سے تجارت کے زمانے ہی میں مسلمانوں کا لنگھاس آجائے اور ہوجا تھا، لنگھاس میں ایک پہاڑی ہے جسے مسلمان حضرت آدم کا قبیلہ سمجھتے ہیں۔ یہاں کا اور شیو متی مشیوکا نقش قدم ہے جس میں اس طرح لنگھاس میں ایک منبرک مقام کی وجہ سے نین مختلف تہذیبوں کا سنگم ہوا جس سے

وہاں کا عام زندگی متاثر ہوئی اور ایک مخلوط تہذیب ظہور پذیر ہوئی۔ ساحلی علاقوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اندر دی علاقوں میں بھی مسلمانوں کے قدم پہنچے گئے۔ دھرم شمال میں مٹان سے نیکر کتیر اور اچھر کچھ سے لے کر گجرات تک کے علاقوں میں مسلمان پہلے جا۔ ہندوستان کے ہندو ہندوستان میں تجارتی اور صنعتی ترقی ہوئی، اس سے ہندوستان میں

خاک کا ہندوستانی مسلمان بنیں

عبداللہ اور ابوریہ ان بیرون، جو ہندو اسلامی اشتراک کے سلسلہ کا آخری بڑا عالم تھا اور ایک علمی و تہذیبی سفر کی حیثیت سے یہ بھی آ رہا تھا۔ ملک تھا کہ ایک ملک دوسرے ملک والوں کو بھی منہوں میں سمجھ سکے۔ البریل ایک سائنسی ذہن کا آدمی تھا اس کی راری زبان کی تحصیل علم میں گزری، جس وقت محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ کر رہا تھا، البریل بنارس میں پڑھتا تو روس سے سنسکرت سیکھ رہا تھا۔ آخر میں اس کے استادوں نے اسے دریاب گڑ کا خطاب دیا۔ اس نے متنوع موضوعات پر اعلیٰ پائے کی کتابیں لکھیں۔ کتابت الہند کے مطالعے پنا چلا ہے کہ وہ ہندی اور اسلامی تہذیبوں کا زبردست عالم اور محقق تھا، اس کا علمی ذوق غیر متعصبانہ تھا۔ وہ اس بات پر رنجیدہ تھا کہ محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے گی۔

پدمرادر شرطت کے لکھیل بھی ہندوستان سے عرب پہنچے۔ یعقوبی ہندوستان کی تاریخ میں لکھتا ہے کہ یہ دونوں دونوں فلسفیانہ دستانوں کی تشریح کرتے ہیں۔ پومر کا کھیل یہ ثابت کرتا ہے کہ ان دنیا میں جبر کے قانون کے ہاتھوں جکڑا ہوا ہے اور وہی کچھ پاتا یا کھاتا ہے جو اس کی قسمت میں ہوتا ہے، اس کے برخلاف، شرطت کا کہنا یہ بتاتا ہے کہ ان کو کچھ حاصل کرنا یا گننا ہے اس کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

عربی عہد حکومت

مسلمانوں کے ذہن میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں پیدا ہوا۔ لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک وفد بھیجا گیا کہ ہندوستان کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ وہ مہم کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد تقریباً دو سو برس تک بڑی اور بھری دونوں راستوں سے ہندوستان فتح کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ بحر قہضم میں عربوں نے سترہ صدی شروع کر لیا۔ سیدہ کی فتح یا بے بھر چھین کا کہنے والے اسلامی حکومت

گنگا کا ہندوستانی مسلمان نمبر

کی بنیاد رکھی۔ سندھ میں وہ ایک حکومت دو سو برس تک رہی۔ عربی حکومت نے ریا کی کے ساتھ رواداری بڑی، حاکم و محکوم قوموں میں تہذیبی و معاشرتی تعلقات استوار ہونے اور ایک نئی سرحدیں تہذیب کا بننا۔ سندھ کی زبان، سندھ کی رسم و رواج اور سبزی زبان کی تعلیمات و پاپ اس کی تہذیب کا تھا۔ عربوں نے ہندوستان میں بڑی تہذیبیں اٹھائے ہوئے تھے لیکن انھیں دباؤ استقامت حاصل نہ ہو سکا اور انھیں واپس لوٹنا پڑا۔

۱۰ویں صدی کے وسط میں ابوشامہ کے کپڑے کی سامی سلی نے یہ کم زوری پیدا ہونے لگی، اس انتشار کے دور میں ترک فوجی انہیں نے سر اٹھایا اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں، اس طرح عربی حکومت کا قیام مکمل میں آیا۔

غزنوی حکمرانوں کے پر تگس عہد میں شاہ کابل نے ان فوجی آزمائشیں اس لیے کی کہ ان کے سیاسی اثر اور تنظیم کو توڑا جائے۔ یہ تصادم ہندو مسلمانوں کا پہلا تصادم تھا، اس میں غزنویوں کو کامیابی ہوئی۔ غزنوی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ ایک مضبوط اور پائے دار حکومت کے لئے حسری قلعوں پر قبضہ اور دولت کا حصول ضروری ہے۔ سلطان بک تگین نے پہلے حسری قلعوں پر قبضہ کیا، پھر بلوچستان پر حملہ آور ہوا۔ راجا جے پال اور افغان و ترک قبیلے ہندوستان کی حسری حفاظت نہ کر سکے اور بک تگین نے پھوٹا ٹالوا اور حکومت کر دے اصول پر عمل کر کے ہندوستان کی حسری قوت کو ختم کر دیا۔

غزنوی عہد حکومت

سلطان بک تگین نے غزنوی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کیا۔ سلطان محمود، ان کی حکومت کی ترقی۔ ان دنوں صوبہ نظام میں دو دولت اور حکومت کو ہم نام شے سمجھا گیا۔ دولت کے معنی سیاسی اقتدار اور سیاسی اقتدار بغیر دولت کے ممکن نہیں۔ اسی اصول کے تحت محمود کی تربیت ہوئی، وہ غزنوی حکمرانوں میں سب سے بڑے ترین حکمران تھا۔

فیروز شاہی عہد حکومت

خراج : قابل کاشت زمین کے ایک سے $\frac{1}{4}$ حصہ زمین کی پیداوار کا محصول کی صورت میں لیا جاتا تھا۔

جذریا :- یہ ایک قسم کا ٹیکس تھا جسے اسلامی مملکت غیر ملکیوں
 سے وصول کرتے تھے اس کے ساتھ ہی معاشی، مذہبی اور سیاسی حقوق کی
 حفاظت کرتی تھی۔

خاص :- عیسٰی کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ مفتوحہ علاقوں کے مال فہرست کا ۱/۵ حصہ حکومت کو لینا چاہئے اور بیکہ حصہ خارجہ میں تقسیم ہونا چاہئے۔ فتوحات فیروز شاہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں میں فیروز شاہ کے علاوہ کسی نے اس قانون پر عمل نہ کیا۔

فیروز شاہ نے زمین و مکان کے سلسلے میں پرانے قوانین و مضابطہ کو منسوخ کر دیا اور نئی شرح زمین کی پیداوار کی نسبت کا خیال رکھتے ہوئے یہ عین کہ فیروز شاہ پہلا بادشاہ تھا جس کی حکومت دہری

گان و مہمانانی مسلمان

لیکن ایک لمحہ میں ان ہونے کی وجہ سے وہ تنگ نظرانہ قدامت

پرست تھا۔ علماء کا امورِ حکمرانی میں ضرورت سے زیادہ دخل تھا۔ محمد نے علماء کی سیاست میں مداخلت کر رکھا اور ان کے مذہبی اثر کو کم کیا تھا۔ اُس کے زمانے کی مذہبی دنیا میں مختلف کتبِ خیال کے علم برداروں نے دھڑیت سے لے کر دہریت تک کے نعرے لگائے تھے، ظلم، نا انصافی، سہا پرچار بھی کیا تھا اور نامِ ہندی کی آبدھار اعلان بھی، لیکن محمد تھیں اُن قوتوں کو فروزہ کر سکا تھا۔ فیروز شاہ نے اسلامی طرز کی حکمرانی کا شکل دینے کے لئے ملک کو تمام بد اعتقاد نازک حانات سے پاک کیا، جس کی لیٹ میں ہندو بھی آگئے۔ انھیں نئے مناد پر تعمیر کرنے کا اختیار نہ رہا، تعلق پورا صالح پورا اور کواٹا میں ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کیا گیا۔

ہندوستانی مسلم راج کا سرسری جائزہ

بعض مورخین کا یہ خیال تعجب و حیرت اور کتناہ نظری پر مبنی ہے کہ مسلم حکمرانوں کا ہندوستان پر اسلام قبول کر دیا جان سے ہاتھ دھوؤں کا تھا۔ اسلام کی بطور مذہب توسیع و اشاعت صوفیوں اور دُرویشوں کی رہنمائی سے ہوئی ہے، جو دنیا کے مختلف گوشوں میں جا کر اسی دُستار کا پیغام پہنچاتے رہے اور اسلامی تہذیب کی تشکیل کرتے رہے، مسلم بادشاہت و عورت باطنی سیاست کے محرک بنے رہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلم ممالک میں چند کھوپڑ کر جتنے بھی غلام ہوئے، انہوں نے اقتدار کی ہوس اور اولوالعزمی کو اپنا شعار بنایا، اس کے علاوہ مسلم حکمرانوں کا یا بھی افتراق و اختصار اور ان کی آپس کی جنگیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایک خدا، ایک مذہب اور ایک کتاب کے ماننے والوں کی اسلامی دنیا میں بھی یک جہتی اور اتحاد کا فقدان رہا اور حضرت محمدؐ کی وفات کے ۱۰ برس بعد اصلی اسلامی سیاست و دناسے غائب ہو گئی۔

غرض کہ جتنی بھی مسلم ملکیتیں وجود میں آئیں وہ اپنی طاقاتاً خالصتاً

محمود نے ہندوستان پر 17 حملے کئے، ان حملوں کا سب سے بڑا مقصد ہندوستان کی دولت لوٹنا تھا۔ اُس نے عظیم اٹان مندروں کو خوب لوٹا جو خزانوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان مندروں کو ہاتھ بھی دیا جن میں دولت نہ تھی تاہم تاریخ تعطلی سے اس کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اُس نے مسلم علاقوں میں بھی اسی طرح غارتگری اور لوٹاؤ کا بازار گرم کیا جن طرح ہندوستان میں۔ ان باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اُس کا مقصد اسلام کی ترویج تھا نہ کفر دشمنی۔ اُس کی ہموں میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ مذہبی نہ تھا بلکہ سیاسی، معاشی اور دنیوی اغراض کی تکمیل کا تھا۔ وہ ایک جبری سپلائی مار ضرور تھا لیکن ایک ذہند اندیش سستیا داں نہیں۔ اُس نے غزنی کو ایک ممتاز تہذیبی مرکز بنایا لیکن ایک پائے دار حکومت قائم نہ کر سکا۔

غزنی حکمرانوں کی سیاسی تربیت دراصل ترک روایات اور ماحول میں ہوئی تھی، اُن کے مزاج و طبیعت، تہذیب و معاشرت سب پر ترکی اثر تھا۔ ہندوستانی ریاستوں سے محمود غزنوی کے معاہدے اُس زمانے کے عام سیاسی اصولوں کے تحت تھے نہ کہ اسلامی اصولوں پر۔ غزنی حکمرانوں کی فوج میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں ہندوؤں اور جاٹوں کی پشتیں بھی تھیں، اُن میں بڑے بڑے فوجی افسر بھی تھے اور مسلم علاقوں پر دھاوا بولنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔

غزنی عہد حکومت

غزنیوں میں سیاسی تنظیم اور دولت کی کمی تھی، انھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مذہب کا سہارا لیا۔ لشکر کی اتحاد اور ہم آہنگی کے لئے انھوں نے اسلام خطرے میں ہے اور جہاد فرض ہے کے نعرے بلند کئے۔ ہندوستان پر حملوں میں اُن کو اکثر شکست اور بعض مرتباً کامیابی حاصل ہوئی۔ دیسی ریاستوں سے اُن کے جو معاہدے ہوئے وہ ہندوستان میں مرد جاش رائے پر مبنی تھے۔ غزنیوں نے ہندوستانی رجواڑوں سے شادی بیاہ کے تعلقات بھی جوڑے۔ قطب الدین ایبک ایک جبری سپلائی مار اور زبردست تنظیمی صلاحیت کا مالک تھا۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے اپنا دار حکومت غزنی سے ہٹا کر ہندوستان میں منتقل کیا۔ قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش کا زمانہ غزنی

طبقہ میں انتشار و باہمی رشک و حسد اور سیاسی رجحانات کے تضاد کا ایک نازک دور تھا۔ التمش کی راہ میں ترک شیخی کا علیٰ غیہ وہ ایک حاکم کی حیثیت سے مسلوں کی چھان بین نہ کر سکا، صرف یہ ہی کوشش کرتا رہا کہ ترک جماعت کے جذبات کو کہیں نہیں نہ لگے، اُس کے دور حکومت میں ترک فوجی طبقہ زیادہ دغبن تھا۔

بلبن کا عہد حکومت

التمش کے نواسی دور کے بعد شمس الدین بلبن پہلا مسلم حکمران تھا جس نے محکم شہنشاہت کو قائم کیا، تو دغبن اُسے بے رحم آمر بتاتے ہیں لیکن اُس نے آمرانہ اقتدار کو سیاسی شودشوں اور نواسی ختوں کے سد باب کے لئے استعمال کیا۔ بادشاہت کے مستقل بلبن کا نظریہ تھا کہ: بادشاہت خدا کی طرف سے بندے کو دی گئی امانت ہے اور حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کے احکام پر عمل پیرا ہو کر رعایا کو حکومت کے ذریعے امن و امان اور تہذیب و رواداری کا پابند کرے۔ عمل ہونے کی حیثیت سے اُس نے اس پر عمل کیا اگرچہ اُس کی دلی آرزو تھی کہ ایک اسلامی حکومت قائم کرے لیکن حکمرانی کے اصولوں اور سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے وہ مجبور ہو گیا کہ مذہب کا دخل سیاست میں نہ ہونے دے۔

کیقبادی عہد حکومت

بلبن کے تھوڑے عرصے بعد کیقباد کے زمانہ بادشاہت میں ہندوستانی تہذیب نے ایک اور کر دھلی۔ اُس دور میں ہندو اسلامی عناصر تہذیب کے میدان میں اپنے اپنے کمال کا اظہار کر رہے تھے اور ایک ملاحلا کلچر اپنی شکل نکھندا دکھائی دے رہا تھا۔ امیر خسرو اسی زمانے کا عظیم مثال ہستی ہے۔ کیقباد ایک عشرت پسند بادشاہ تھا، اُس کا کہنا تھا کہ زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں میں ہر آن برابر کا فریق ہے۔ اُس نے رعایا کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ کیقباد کے زمانے میں بعض سیاسی مسلوں پر بھی غور و فکر کیا گیا، جیسے حکومت کے دفائن، ملک کی خوش حالی اور رعایا کی فلاح و بہبود کی تدابیر حکومت کی عظیم دستخط کام کے طریقے، حکمرانی میں مشیروں کی ضرورت اور حکومت کے لئے دستور کی پابندی وغیرہ۔

خلجی عہد حکومت

کیتھارڈ کے بعد خلجی بادشاہت کا دور شروع ہوا جلال الدین خلجی ایک اجساد اور دلکش شاہ تھا، گو جلال الدین کا تمام میدان جنگیں کٹی، لیکن اُس نے اپنی طبیعت پر جنگجو یا اثر نہ آنے دیا، اُس نے اپنے فوجوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر بادشاہت کا مقصد ملک گیری اور غارتگری ہے تو وہ اس قابل نہیں اور بادشاہت سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔ اُس کے سامنے ایجنوں کو کب گرفتار کر کے لایا جاتا تو وہ پند و نصیحت کر کے انہیں رہا کر دیتا۔ اُس کے ایسے غیر سیاسی طرز عمل سے ظاہر ہے کہ وہ سیاسی قاتلون اور ضابطوں کو نوا اور غیر اہم سمجھتا تھا۔۔۔

جلال الدین کے قتل کے بعد علاؤ الدین تخت پر بیٹھا جو ایک سیاسی سمجھ بوجھ کا سلجھا ہوا انسان تھا۔ اُس کے نزدیک دولت اور بادشاہت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے، اُس نے دولت کے بل پر شاہی تخت حاصل کیا، دولت لٹا کر عوام کی مخالفت اور دشمنی کو ختم کیا اور ان کی خوش فہمی حاصل کی۔ امیر طبقہ کی دولت، باغیا ناجذبات اور سازشیں پیدا کرتی تھیں، اُس نے ان کی دولت چھین لی۔ اُس زمانے میں حکومت کے خلاف چھوٹی چھوٹی تحریقات تھیں پیدا ہو گئی تھیں، اُس نے علاؤ الدین کا جبر و تشدد اور اُس کی سیاسی کارروائیاں حالات کی خبر دی، کا نتیجہ تھیں جن سے ملک میں امن و امان قائم ہوا۔

اُس کی غذائی پالیسی، سیاسی مجبوریوں کا نتیجہ تھی نہ کہ محض سیاسی سہارا کے لئے۔ علاؤ الدین کی نظریں غریب اور سیاست دو علاحدہ علاحدہ دنیا میں تھیں، وہ غریب کو حکومت کے کاموں میں خارج سمجھتا تھا اُس کا کہنا تھا کہ فرقا داریت کے قتلے کو صرف سیاسی تدبیروں سے دور کیا جاسکتا ہے، غریب فرقا داریت کے شعلے کو اور جوا دیتا ہے۔ کیتھارڈ کے زمانے میں جن "ہندو مسلم" کلچر کی ابتدا ہوئی تھی، اُسے خلجی عہد میں فروغ حاصل ہوا۔ رفتہ رفتہ شاہی دیوار اور سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا اثر، اقتدار بڑھ گیا، یہاں تک کہ مہارک شاہ بادشاہ بنا تو ہندوؤں کا اثر حکومت پر حاوی تھا۔

اس کے بعد تغلق دور شروع

تغلق عہد حکومت

ہیں غیاث الدین کی روشنائی

ہماری ساری ساری باتیں

انصاف پسندی اور رعایا پروری، اس کے حکومتی نظام کے اصولوں میں صاف نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ غیاث الدین تغلق کے بیٹے محمد تغلق جیسا جدت پسند اور نئے خیالوں والا حاکم شاید کبھی دلی کے تخت پر بیٹھا ہو۔ وہ مختلف علوم و فنون کا ماہر تھا۔ اُس نے ان لوگوں اور اداروں کو سنے ڈھنگ سے چلانے کی کوشش کی، ملک کے ماحول اور لوگوں کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنا چاہی اور بادشاہ اور رعایا کے رشتے کو مضبوط اور پلے دار بنانا چاہا لیکن اُس وقت کا قدامت پرست سماج اس کا ساتھ نہ دے سکا۔

اُس زمانے کا آمر طبقہ سمجھتا تھا کہ اطلاع ان کی جوہر صفت اور سوسائٹی کے افراد میں مل سکتے ہیں لیکن محمد تغلق نے پسماندہ طبقوں کی سرپرستی کی اور انہیں اونچے منصبوں پر فائز کیا۔ اس بنا پر اُس زمانے کی روشنیوں نے اُسے اپنا دشمن سمجھا اور اُس کے خلاف سازشیں کیں۔

محمد تغلق غیر ملکیوں کو بہت عزت دے رکھتا تھا، انہیں اُن کی تاق اور صلاحیت کے مطابق عہدے، ملازمتیں اور سہولتیں دیتا تھا۔ محمد تغلق کے خلاف سازشوں میں رعایا کا بدلیسیوں کے ساتھ جذبہ نفرت بھی کامیاب رہا تھا۔ غریبہ کہ بدلیسیوں نے بھی تھک جاتی تھی۔

اُس نے حکومتی مصلحت کے لئے راج دھانی، دولت آباد و مستقل کرنا چاہی لیکن آئی کو اجاڑنے اور دولت آباد کو بدلنے کے سلسلے میں اُس کا اقدام دانشمندانہ تھا۔ طبقہ اعلیٰ، اعلیٰ میں تغلق کے نئے سکے کے اجرائی کے اقدام کو سراہا گیا ہے، جو اُس نے سیاسی و معاشی ضرورت کے تحت رائج کیا تھا۔ لیکن لوگوں نے بے اعتمادی اور کم عقلی سے اُس کی بھی پذیرائی نہ کی۔ قلعہ سالک کے زمانے میں عزیز زے دارانا اہل اور بڑا اختطایہ کی وجہ سے وہ لوگوں کو راحت و اطمینان نہ پہنچا سکا۔ ملک میں بد امنی پھیل گئی اور بغاوتیں سر اٹھانے لگیں، محمد تغلق نے بھی جبر و ستم کا بازو گرہ کر دیا، اُس نے کہا "میں باغیوں کو سخت سے سخت سزاؤں دوں گا" شامدوہ لوگ مصائب برداشت کر کے اچھے راستے پر لگ جائیں، دنیا و الدین بولی نے اُسے سخت چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا "نہ راجا شاہ زادوں میں سے کسی اہل ترین شخص کو حکومت سونپ دی جائے گی کیوں کہ تمام سیاسی بیماریوں میں سے بڑی اور بوائے

ہیں دھل گئیں اور ان کا ارادہ اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ہے؛
مسلم بادشاہ اسلام کے نہیں وقت اور زمانے کے پابند ہے۔ ان کی
ملک گیری کی ہوس اور ان کے سیاسی منصوبے ان ہی کے حد میاں
نفاذ و دشمنی کے بیچ ہو گئے اور ان میں لڑائیاں ہوئیں یہی وجہ ہے کہ
اسلامی تاریخ کے اوراق سے خون کی بو آتی ہے۔

ہندوستان کے چند مسلم بادشاہوں نے علماء کی مدد سے اسلام
کی توسیع و اشاعت کی کوششیں کیں لیکن درباری فسادوں میں پلے ہوئے
علماء خود اسلام کی روح سے ادا تھ گئے، اسلام کو پیچھا ہٹتے
اور کڑے قانون کی طرح پیش کرنا اور اس پر عمل کرانا ان کا شیوہ رہا۔
تاریخ گواہ ہے کہ علماء کے طبقے نے اکثر بادشاہوں کو بدنام اور ان کی
حکومتوں کو متزلزل کیا اور ان کا دامن مظلوم انسانوں کے خون سے
ہمیشہ داغ دار رہا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے بت پرستی کے
خلاف رد عمل ہوتا رہا تھا اور یہ سمجھے کی کوشش کی گئی کہ دھرت کا
اصول ان فی تہذیب اور روحانیت کی جہاں ہے، لیکن ہمارے
پردہ پوشوں نے مسلم علم کی طرح کبھی زمانے کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور
لوگوں کو اصل راہ سے گمراہ کرتے رہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مذہبی گرد و جوں میں
تصادم بھی ہوا، لیکن تلوار کبھی نہیں اٹھی اور جبر و تشدد سے کبھی مذہب
نہیں بدلا گیا، اس کی وجہ یہ بھی کہ ہندوستانی مسلم حکمرانوں کا دار و تحفہ
لیکن ۱۷ ویں صدی سے ۱۹ ویں صدی تک برہمنی تحریک 'سیاسی توڑ
کا مدد سے ملک پر مسلط رہی۔ اس نے صرف دھرم شامترک
مذہب قائم رکھا اور تلوار اٹھائے بغیر بد مذہبوں کے دائرہ
اثر کو اس طرح ختم کیا کہ تاریخ ان گشت بد مذہب ہے۔

ضمیمہ قاسم کے بعد صرف فیروز شاہ تغلق اور اورنگ زیب
نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر رکھیں۔ ان کے
علاوہ جتنے بادشاہ گذرے اسلامی قوانین پر عمل پیرا نہ رہے بلکہ
کی ساری کا محرک بھی کفر دشمنی کا جذبات تھا بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ یہ
مندرجہ حکومت کے لئے ہوئے خزانوں سے تعمیر ہوئے تھے ایسی شاہنشاہی
بھی ملتی ہیں کہ یہ مقدس عبادت گاہیں بد اخلاقی، رعب کاری کا

گہرا رہ بن گئی تھیں، یا پھر زمانہ جنگ تھا کہ وہ تباہ ہوئے۔ یہ وجہ
ان کی ساری کا باعث بنے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دور
حکومت میں غیر مسلموں کے ہاتھوں مسجدیں بھی ڈھائی گئیں اور ایسے
ثبوت بھی ملے ہیں کہ مسلمانوں نے مندروں کے لئے مستقل اتفاقات قائم
کئے، ذمیوں سے جزیاء وصول کرنے کے بعد بھی ان پر جبر و ستم روا رکھنا
کہاں کا اسلامی قانون ہے، جیسا کہ چند مسلم حکمرانوں کے دور حکومت
میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ
ہندوستانی مسلم حکمرانوں کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، اس لئے ان
مسلم مورخین ہمیشہ غلط مندرجہ کر انھوں نے اسلام کے لئے کچھ نہ کیا۔
اسلام کے سب سے بڑے خادم صوفیہ کرام تھے، جنھوں نے
بادشاہوں کے آتشیں غضب اور زمانے کے بے رحم جہرت کی کبھی
پروردہ کی اور شاہی سرپرستی کی چھاؤں سے دور خانقاہوں کے
نمٹتے دیو سے لوگوں کے دل ایساں کر رکھنے سے منور کرتے رہے
اسلام کی خدمات میں ان کے کارہائے نمایاں تاریخ اسلام کے روشن
باب ہیں۔

اب ہم ہندوستانی مسلم حکمرانوں کے سیاسی نظریات کا تاریخ کو
فیروز شاہ تغلق کے بعد پھر شروع کرتے ہیں۔ تغلق دور کے بعد افغان
کا زمانہ آیا، افغانوں میں ملک گیری کی ہوس تھی اور وسیع النظری و بلند
خیالی کی کمی تھی۔ افغان حکمرانوں میں ایک نمایاں ترین شخصیت شیر شاہ
سوری کی ہے، وہ ایک عقلمند اور دور اندیش سیاست دان اور
مدبر تھا، اس نے عوامی فلاح و بہبود کی ایسے کام کئے کہ اس کا نام
تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مسلم حکمران اب بدیسی نہیں رہے تھے۔ دقت کی خزانے
انھیں بندیا لیا تھا، اب انھیں ملک کے اعراض و مقاصد سے گہری
دل چسپی اور وابستگی ہو گئی تھی، انھوں نے ہندوستانی طرز زندگی کو
اپنا یا اور ہندوستانی اصول و نظریات، رسوم و رواج، جذبات و
عادات اور تہذیب و معاشرت نے ان کی زندگی کا سا بنایا۔
ڈالا، انھوں نے اپنی ساری توانائی اور دولت ملک کی تعمیر و ترقی میں
مروت کر دی اور لوگوں کی فن کارانہ صلاحیتوں کو درجہ کمال پر پہنچایا۔
ان کا تحت اسلام تھا لیکن عبادت بندی، ہندوستان کی وسیع

تب رعایا نے بھی ایسے مثالی حکمرانوں کو غلط الہی اور دیتا سمجھا۔

مغل دور کے چند ممتاز بادشاہوں کی تمدنی فیاضیات

مغلوں کے عہد سے قبل سیاسی و سماجی قوتوں نے تسادم و تہارب کی منزلوں سے گزر کر اپنی شکل کو نکھار لیا تھا۔ 'مغل راج کا آغاز' بابر سے ہوتا ہے، بابر زمانے کی تختیوں کی آگ میں تپ کر گندن بن کر نکلا تھا، اُس کی سیاسی بعیرت نے مار لیا تھا کہ مغل راج کے استحکام کے لئے گہری اور مضبوط بنیادوں کی ضرورت ہے، اُس نے انسانی ت کے اعلا اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اس ملک کے اہلیوں کا دل موہ لیا، گردن لگنے بابر کو راج نیتم کے سبق دیئے اور جہاں گیری دجہاں بانی کے اصول بتائے۔ بابر نے ہمایوں کے نام اپنی وصیت میں حکم مغل سلطنت کے قیام کی تدابیر بتائی ہیں۔ بابر کی وصیت کا مغل حکمران کسی نہ کسی اعتبار سے پابند رہا۔

وصیت میں بابر نے لکھا ہے کہ ہندستان قریب قریب کی تہذیبوں کا گہوارہ ہے، یہاں کے باشندوں پر تلوار کے بل پر حکومت کرنا چاہیہا شکل نہیں، لیکن اُن کے دلوں پر انصاف، رواداری، داد دینا، دیکھنا اور اُن کے نواح و بہودی کے کاموں سے حکومت کی جاسکتی ہے، ہندوستان کی مختلف و محفلوں میں اتحاد قائم رکھنا ہی حاکم و ک دانشمندی ہوگی۔ اس وصیت کی روشنی میں بابر ایک زبردست سیاسی مفکر نظر آتا ہے، ہمایوں کو سیاسی انقلاب کی وجہ سے باپ کی وصیت پر عمل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ بابر کا خواب اکبر نے پورا کیا۔

اشوک اور اکبر دو ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنہوں نے اپنے دلوں میں ہندستان اعظم *Great India* کا نقشہ بچایا اور ہندستان اعظم کی تعمیر و ترمیم سے نہیں انسانی اصولوں اور کلی چری آٹا شے پر گزرا چاہی۔ اکبر نے عہد وسطی کے ہندو کی خامیوں اور قدامت پرستیوں کو دور کر کے 'صلح مغل' کے نظریے اور ترقی پسندانہ اصولوں پر ہندوستانی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھ گیا تھا کہ انسانی و تہذیبی اتحاد کی جڑ اصل

ہے کہ ہندوستانی مسلمان صبر

صلح کل میں مضمر ہے۔ اکبر مذہب کو کتا بی چیز نہ سمجھتا تھا۔ اُس کے ہاتھ خانے میں محفلت مذہب کے علاوہ اصل مذہبی دنیاؤں میں اتحاد کی تحقیق و تلاش اور مذہب سے انسان کے رشتے کی حقیقت پر غور و فکر کرتے تھے۔ اُس کا دین الہی ان ہی جستجوؤں کا نتیجہ تھا، اکبر کے دل میں حق کی تلاش کی سچی تڑپ تھی، اگرچہ دین الہی مقبول نہ ہو سکا لیکن اکبری عہد کے کلچر میں اُس کا نمایاں حصہ تھا۔ وہ اصل انشوک نے عہد وسطی میں اکبر کے روپ میں جنم لے کر قدیم ہندستان کو نئے ہندستان کے رنگ میں ڈھالا تھا۔

اکبر کی دینی ریاستوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوششیں ہندوستان اعظم کے خواب کے تعبیر کے لئے تھیں۔ راجپوتوں کی فوج میں بھرتی ہندوؤں کے شاہی بیہ اور تعلقات کی استواری، ہندوستانی رسوم و رواج کو اپنانا، سب اکبر کی وہ سیاسی حکمت عملیاں تھیں جن کی بنا پر مغل حکومت کی حفاظت و استحکام میں ہندی فوج کی ونا داری اور جہاں شاری ہی اسی طرح مسلم ہے جس طرح مسلم فوج کی غرض کہ اکبری دور مغل تاریخ کا نہیں ہندستان کی تاریخ کا درخشاں باب تھا۔ جہاں گریپ کے اعلا اصولوں کا حامل اور اُس کا دور اکبری عہد کے سلسلے کی آخری کوئی تھا، انصاف جہاں گیری نقطہ نظر سے اس کے دھاروں کا ایک سنگ ہے۔ وہ ایک عظیم منصوبہ ایک اچھا مصنف، ایک پرستار فطرت اور ایک وسیع النظر کشادہ دل عشرت پسند بادشاہ تھا۔

شاہ جہانی عہد کی فنی یادگاریں ہیں جن کی آس کے عہد میں کلچر اور آرٹ کا لحاظ اپنے نقطہ اوج پر پہنچ گیا تھا۔ شاہ جہانی دور نے اپنے سماجی پس منظر میں جمالیاتی، نفسیاتی اور تہذیبی و تمدنی قدروں کو جلا بخشی۔ کلچر اور آرٹ اُسی ملک میں پروان چڑھ سکے ہیں جہاں امن، خوش حالی اور اطمینان کی نعمتیں میسر ہوں اور شاہ جہانی عہد میں ان نعمتوں کی فراوانی تھی۔

مغلیا سلطنت اور رنگ زیب کے دور حکومت سے متزلزل و بے اثر شروع ہوتی ہے، اور رنگ زیب کے بارے میں ہندی مورخین کا کہنا ہے کہ وہ متعصب اور تنگ نظر حکمران تھا اور ہندوستانی روایات اور اداروں کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ مسلم مورخین نے اسے ایک آئینہ سلیم بادشاہ تصور کرتے ہیں جس کا مسک ہندستان میں

کرنے کے باوجود ان کی جان و مال کی حفاظت نہ کر سکا۔ لیکن اورنگ
زیب میں ایک چھپا ہوا سیاست دان بھی موجود تھا۔ یہ اس کے
معدروں کے لئے اوقات قائم کرنے اور ملک حلال غیر مسلم افسروں کو
اعزاز و مرستہ بخشنے سے ثابت ہوتا ہے، وہ ملک گیری کو شاہی
کام ملک قرار دیتا تھا اور فوج کی قوت کو حکومت کی جان سمجھتا تھا۔
اگرچہ ملحد مذہب کیسیاسی انتظامی کارکردگیوں سے زمانا اور لوگ متاثر
ہوئے لیکن ملک کی اندرونی بے چینی غیر مسلم رعایا کی بے وفائی اور لوگ کی کج
سیاسی شروعاتیں اسی کی مذہب پرستی اور سلطنتِ مغلہ کی دشمنی تھی۔

اسلامی رواج قائم کرنا تھا، لیکن اس لئے کی تاریخ کے تجربے سے
پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کو پہلے بارابری کی مغلہ
دستور اور طریقوں پر برقرار رکھا، اس کے بعد کے بارابریوں میں غلام
کے نظام حکومت میں عمل و دخل اور ان کے دباؤ کی وجہ سے حکومت
کو اسلامی ڈھنگ سے چلانے کی کوششیں ہوئیں۔ اورنگ زیب کی اسلامی
سلطنت کا تخیل اکبر اعظم کے تخیل کا تقاد تھا۔

اورنگ زیب ایک خشک زمانا تاشاں اور روکا پھیکا انسان
تھا وہ ایک سچا مسلمان بھی نہ تھا، وہ ہندوؤں سے جبراً دھول

ہمارے بدکردار بزرگ

پھول والوں کے میلے کی تعزیم سے جب حضرت جہاں پناہ (اکبر شاہ ثانی) قطب صاحب
کی درگاہ میں رونق افروز ہوتے تھے۔ اکثر سواری بھولنے پر جہاں پناہ حضرت ماگ سننے
اور زمانے بندوبست میں نہانے کا تاشہ دیکھتے، خواہیں کس کس خوبی سے آپس میں جھپٹتی
لڑتیاں اور جھڈ کے جھنڈ باہم لپٹ کر کنارے سے پانی میں گر پڑتیاں، کوئی مسکرا کے باؤں کو
چھوڑتی، کوئی شرم کرانگیا مڑ پڑتی، ایک ایک کے کڑی چاک کرتی۔ دوسری شرم سے انگلی
دانوں میں پکھیتی، کوئی پکارتی، بواہاؤ میں نہ جاؤ وہاں بڑا اندھے، کوئی لٹکارتی دو گانہ چڑھتا
پڑاؤ دیکھ کر کیا توہم غرض ان پری پکیروں کی پھر مچھاڑا دیا پس میں احتیاط کی ملکہ دھارے خوں
نے دیکھی وہی جانتے ہیں لکھنے سے فائدہ، سننے والے کب بچ جائیں گے،
شاہ جہاں آباد کی خیر

اختیار جام چلن نا

اور وضعیم یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء

قَوْمِیَّتِ دِیْ حُکُومَتِ اُوْر جِهَادِ

سندھ کے جی ایم سید اپنے وقت ہی ایک بااثر لیڈر رہے ہیں۔ مولانا آزاد کے اخبار 'آل ہلال' کے مطالعے سے وہ میدان سیاست میں آئے اور اقبال کی بقی شاعری سے متاثر ہو کر وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ابتدائی قومی وزارتوں کے دور (1937ء) میں وہ صوبہ سندھ کی مسلم لیگ وزارت کے وزیر اعلیٰ رہے۔ سید صاحب نے مسٹر جناح کی قیادت میں مطالبہ پاکستان کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ مگر نیا پاکستان کے قیام کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لئے نقصان دہ رہی اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان ہندوستانی ملا اور اقبال کے سامراجی د فرقدارانہ نظریات سے پسپا ہے۔ 1947ء کے بعد مسٹر جناح سید صاحب کے مخالف بن گئے اور اسی مخالفت کے نتیجے میں شاید سید صاحب آج تک جیل میں ہیں۔ حال ہی میں ان کی تصنیف کردہ دو کتابیں 'پاکستان جو ماضی، حال و مستقبل' (پاکستان کا ماضی، حال اور مستقبل) اور 'سندھ کو' (انی، سید جی زبانی) (سندھ کی کہانی، سید کی زبانی) سندھی زبان میں شائع ہوئی ہیں جو حکومت پاکستان نے ممنوع قرار دے دی ہیں۔ یہاں سید صاحب کی دوسری کتاب کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے جو جناب صوف چادلا نے مزید اضافہ سے اور اس میں تیار کی ہے۔

دوم، لفظ کا اطلاق مختلف زمانہ ادل مالک کے لوگوں کے زبان انک انک مل ہے۔ اس مسئلے کے تاریخی پس منظر پر اگر نظر ڈالی جائے تو قومیت کا ارتقائی تصور کم و

بیش ان دو دہوں سے گزرا ہے :

- 1۔ نسلی بنیاد والی قوم۔
- 2۔ مشہوری زندگی کی حکومت والی قوم۔
- 3۔ مذہبی اعتقادات کے گرد مہل والی قوم۔
- 4۔ سامراجی حکومت والی قوم۔
- 5۔ وطن کی بنیاد پر عبید قومیت والی قوم۔

فلسفہ قومیت کے ماہرین نے 'قوم' بننے کے لئے جن باتوں کا ہونا ضروری سمجھا ہے ان میں سے چند یہ ہیں :-

1، ایک ہی نسل (2) ایک جیاد رسم و رواج (3) ایک ہی زمان (4) احساس ہم جنسیت (5) تاریخی روایات (6) جغرافیائی حدود کا احاطہ

(7) ایک سے مذہبی اعتقاد (8) ایک ہی کلچر (9) ایک ہی سیاسی اور اقتصادی مفاد ۱۰۔ قومی کردار

ان سب باتوں کا وجود ہر قومی تخیل والی قوم میں ہونا لازمی نہیں رہتا ہے مگر ہر قومی تخیل والا گروہ حالات کے مطابق ان میں سے جزیائیں باتوں کا حامل ضرور ہوتا ہے۔

۱۔ نسلی بنیاد والی قوم کسی زمانے میں ایک ہی نسل کے قید یا کینے کے لوگوں کو قوم کہا جاتا تھا جیسے بنی ہاشم، بنی امیہ، بتوچ، برہی، چٹھان، راجپوت وغیرہ۔ گو اس قبیلائی قوم کی بنیاد نسل پرستی، مگر ان میں ایک ہی زبان، رسم و رواج، تاریخی روایات، وطن یا مٹی، سیاسی اور اقتصادی مفادات اور قبیلائی مذاہب کی یکسانیت کی وجہ سے ہم جنسیت کا احساس رہتا تھا مگر کافی وقت گزرنے کے بعد مختلف نسلوں کے ملاپ، بڑی حکومتوں کے قیام، قبیلائی مذاہب کی جگہ پر عالمگیر مذاہب کے پیدا ہونے اور دوسرے کئی اسباب کی وجہ سے چند محدود ممالک کی یہ نسلی قومیت اپنی ایک جہتی اور خصیبت گنوا بیٹھی ہے۔

2۔ شہری زندگی والی قوم ایک زمانہ ایسا بھی تھا جس میں ایک خاص شہر کے آس پاس میں رہنے والے لوگ خود کو قوم کہتے تھے۔ اور اس بنیاد پر انھوں نے اپنی حکومتیں قائم کی تھیں۔ یونان کے شہر ایتھنس اور اسپارٹا، اٹلی کے شہر روم کے شہر یونان شہریت کی بنیاد پر خود کو قوم کہا۔

ان کی اس قومیت کی تلافی بنیاد ایسی باتوں پر بھی جنہیں قبیلائی وحدت کی خصوصیات شمار کیا جاتا تھا۔ البتہ آگے چل کر مذہبی اعتقادات کی ایک سانیت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اگرچہ حکیم سقراط جس کو ایتھنس کے شہر یونان نے عقائد کے اختلاف کی بنا پر زہر کا پیالہ پلا کر مارا تھا۔ مگر اس کے پیروکار اس اختلاف کی بنا پر ایتھنس قوم سے خارج نہیں ہو جاتے تھے۔

3۔ مذہبی اعتقادات پر مشتمل قوم کوئی وقت ایسا تھا جب ایک ہی مذہب کو ماننے والوں کو اس اشتراک کی وجہ سے قوم تسلیم کیا جاتا تھا۔ 3۔ مذہبی اعتقادات پر مشتمل قوم جیسے ہندو قوم، یہودی قوم، عیسائی قوم، مسلمان قوم وغیرہ۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لوگوں میں اجتماعی زندگی پیدا کرنے میں مذہبی نظریات کے عقائد نے کافی حصہ لیا ہے۔

قبائل کی عصبیتوں اور اختلافات کو کم کر کے بڑی جماعت بنانے میں مذہب نے کافی سہارا دیا ہے۔ یورپ میں قبیلائی اختلافات اور عصبیتوں کو کم کر کے موجودہ مستقل اقوام کو وجود میں لانے کے لئے دوسرے کئی اسباب کے ساتھ مسیحیت بھی ایک سبب بنی۔ عورتان کے مختلف قبائل کو ان کی صدیوں کی فوریزی سے نجات دلا کر اسلام نے ان میں کافی اتحاد پیدا کر دیا۔ مگر جب مذہب اپنے محدود دائرے سے باہر نکلا اور اس نے بین الاقوامی صورت اختیار کی تو اس نے اپنا اثر کھو دیا۔ وہ اتحاد کے بجائے انتشار کا باعث بنا۔

مگر کیونکہ ان مذاہب کے بانی ہزاروں برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں ان کی جائے پیدائش کے معاشرے کے حالات کچھ اور تھے۔ زمانے اور معاشرے کی تبدیلی، مختلف ممالک کی ضروریات زندگی، الگ الگ ممالک کے رہنے والوں کی تاریخی روایات، کلچر وغیرہ کی بنا پر مذہبی عقائد اور عمل میں ٹکراؤ پیدا ہونا اور پھر الگ الگ فرقوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اس لئے ان کی ابتدائی ہم جنسیت اور یک جہتی کم ہونے لگی۔ مذہب شروعات میں لوگوں پر غلامی اور غشی سے انرا غلام ہوتا تھا، مگر بدلتے ہوئے حالات میں ان کا اثر ٹوٹنے لگا۔ تب مذہب پرستوں نے اپنے مذہب کی زندگی کے لئے طاقت کا استعمال ضروری سمجھا۔

(الف) ہندو مذہب کے بانی کاروں نے حکومت اور مذہب کو علاحدہ علاحدہ جاتوں کے سپرد کر دیا۔ حکومت کھتری راجاؤں کے ہاتھ میں رہی اور مذہب کا کاروبار براہمنوں کے حوالے ہوا۔

(ب) عیسائیوں میں پہلے مذہب کا سیاسی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مگر جب مذہب کے ابتدائی اثر میں کی محسوس کی جانے لگی تو مذہب کے سرپرستوں نے مذہبی نظام قائم کر کے پاپائے روم کے ذریعے سیاسی طور پر حکومتوں پر اقتدار حاصل کر لیا۔ یہ بات مذہب کے استحکام اور

فروع کے لئے کارآمد ثابت ہوئی

(ب) بدھ دھرم کا شروع سے سیاست سے واسطہ نہیں تھا اور یہی فروع کے لئے تبلیغ اور ترقی کے نفس ہی کو کافی سمجھا گیا تھا۔ مگر آگے چل کر جب ہشتاد اشوک نے بدھ دھرم کو سیاسی طور سے شدت رکھ ساتھ بھیلانے کی کوشش کی تو رد عمل ہی برا بہتر مں نے رد کر دیا اور بدھ دھرم کو ہر سارا سے باہر نکال دیا۔

(د) اسلام بھی ابتدا میں سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ سوائے مختصر عہد یعنی دور کے مگر رسول مقبول کے انتقال کے بعد عربی خلیفوں کے دور حکومت میں مذہب کو سیاسی طور سے بڑھا دیا۔ یہی کی کوشش کی گئی۔ جس کا بالبد اثر یہ ہوا کہ سلطان مسلمانوں نے فروع میں بٹ گئے۔

اس قسم کی قوم کو تصور چند سامراجی حکومتوں کا پیدا کیا ہوا ہے جس طرح بعض سامراج نے اپنے مکتب 4۔ شہنشاہی بنیادوں پر بنی ہوئی قوم اقام کو ایسے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ عرب سامراج، جی سامراج، برطانوی سامراج، یا کسانوں اور پہلے سامراج وغیرہ۔ یہ سب اپنے مکتب اقام کو ایک مخصوص ذہنی تربیت اور تعلیم کے ذریعے ان کے فروع کو ختم کر کے لچندنگ میں رنگنے اور اپنے تسلط میں لانے کا ہمارا پیدا کرتے ہیں۔

عروں میں بنی اثیر گھلانے نے اپنا سامراج بھیلانے اور مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے مختلف ممالک پر حملے کئے اور وہ سب ممالکوں پر قبضہ کیا۔ نام اسلام کا یہ مگر بنی اثیر کا روح اسلام سے دور بھی دھڑکتا ہے۔ حرس اور برنگالی سامراج کے ادوات تادہ ہیں جس کے طریق کار اور نظریات کا سب کو پتہ ہے۔ میں نے سامراج کی اس فہرست میں پنجابی مسئلہ مفاد کو بھی سامراج کا نام دیا ہے۔ یہ بھی بنی اثیر سامراج کی نقل میں اسلام کے نام پر نہ ہو، بلنگالی، بلوچ اور پنجاب احوال پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے مسلم قوم کا نظریہ پیدا کر کے ان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مسلم قوم کے تخیل کا جواز قرآن پاک سے ملتا ہے۔ جو یہ ہے۔ کیونکہ اس قومی نظریہ کا مدد لاشعور اور دھوکا بازی پر ہوتا ہے اس لئے اس کا اثر زیادہ دھڑکتا ہے۔

5۔ جدید تخیل مالی وطنی قوم اس قسم کی قوم کی بنیاد ایک وطن، زبان، کچھ قومی کردار، تاریخی ادایات، اقتصادی اور سیاسی مفاد پر رکھی جاتی ہے۔ یہ تخیل پہلے تین سو برس سے یورپ میں اور ۵۰ برسوں سے ایشیا، افریقہ اور امریکا میں سوج رہا ہے۔ چونکہ دنیا کی اکثر ممالک اس نظریے کو ماننے ہیں۔ اس لئے اقوام متحدہ نے اسی نظریہ قومیت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کی بنیاد پر آزاد اقوام کو بطور نمبر ہونا کیا ہے۔

مذہبی قومیت

مورخوں کو معلوم ہے کہ کس طرح تجربہ کی گئی پر ہندوؤں، بدھوں اور عیسائیوں نے مذہبی قومیت کی بنیاد پر سیاست کو مذہب کے ساتھ ملا کر چلانے سے جو نقصانات پہلے ہونے ان سے بیزار ہو کر اس سے طبعاً اختیار کی ہے۔ اس طرح سے دنیا کے کئی مسلمان ممالک نے بھی کافی تجربوں کے بعد مذہبی نظریہ قومیت کو خیر باد کہہ کر جدید وطنی نظریہ قومیت کے مطابق حکومت چلانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ مگر اب تک مسلم ممالک میں صرف پاکستان ہی ایسا ملک ہے جس کا پنجابی مفاد وطنی پاکستان میں شامل دوسری اقوام پر اپنا سامراج قائم رکھنے کے لئے اس فرسودہ نظریہ کا راگ الاپتا رہا ہے۔

اسلام ایک نیا اور ناک مذہب ہے یا پیغمبر اسلام نے قدیم مذاہب کے ارتقائی تجویز کے امتزاج کا نام اسلام رکھا۔

ہمارا جہاں پنجابی اور مولوی کچھ جگہ کے مگر قرآن شریف کی چند آیتیں یہ واضح کر دیتی ہیں کہ اسلام مذاہب نہیں ہے۔

” (پیغمبر) انہیں کہو کہ ہم اللہ اور اس کی طرف سے جو ہم پر نازل ہو رہا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں (اس کے علاوہ) جو کچھ ہمارا ہم، اسامیل، یعقوب اور ابراہیم کے علاوہ، موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں پر نازل ہوا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے، اس لئے ہی ہم مسلمان ہیں۔“

” (پیغمبر) انہیں کہو کہ کیوں اختلاف کرتے ہو اللہ میں۔ وہ ہمارا اور آپ کا پالنے والا ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال اور آپ کے لئے آپ کے

اعمال۔ ہم اس راہ ہدایت پر مستحکم ہیں!"

"کیوں کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، یعقوب اور اس کی اولاد یہودی یا نصاریٰ تھے۔ آپ کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو جو حقائق کو چھپا لکھے وہ بڑا ظالم ہے آپ کی اولاد (ارادوں اور نیتوں) سے اللہ بے خبر نہیں ہے نہ"

قرآن پاک میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے ہر ملک، قوم و زمانے میں پیغمبر بھیجے گئے، جو سب دینِ فطرت پر تھے۔ دینِ فطرت اور اسلام ایک ہی بات ہے۔ اسی طرح کثرتِ مذاہب کے پیچھے بنیادی وحدت ثابت کرنے کے لئے یہ آیتیں گواہی دیتی ہیں، اس نقطہ نگاہ پر غور کرنے کے بعد صاحبِ نظر کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نیا مذہب نہیں ہے بلکہ کل مذاہب کی بنیادی تعلیم کا انتزاع (synthesis) ہے۔ یہودیوں، نصاریوں اور دوسرے مذاہب کے کارکنوں نے خواہ مخواہ حقائق پر غور نہیں کیا کہ انسانی ذات میں تفریق ڈالی، اسلام ان فرقوں کو مٹا کر کل انسانی ذات کو ایک ہی پیشگی شاخیں ثابت کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ رسولِ مقبول صلیم کی زندگی کے دو ادوار تھے۔ پہلا دور مکے والی زندگی کا تھا اور دوسرا مدینہ والی زندگی کا۔

یہ حقیقت ہے کہ مکے والی زندگی میں انھوں نے سیاست سے علاحدہ رہ کر عدم تشدد کی بنیاد پر اسلامی تعلیم کی تبلیغ کی، مگر جب بنی لفظین نے ان کو تنگ کیا اور تکلیف دینے لگے تو پہلے انھوں نے اپنے ساتھیوں کو ان تکالیف سے بچانے کے لئے حبش بھیجا اور پھر جب بنی لفظین اُن کے قتل پر آمادہ ہوئے تو یہ خود بھی ہجرت کر کے مدینہ نہیں رہنے لگے، دستِ بخت تھے کہ وہاں وہ کروہ آرام سے اسلام کی تعلیم اور تبلیغ کرتے رہیں گے، مگر وہاں بھی انہیں اختلاف رائے کی بنا پر بنی لفظین کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے عدم تشدد والی پالیسی کو عارضی طور پر بدل کر مدافعت کا طریقہ اختیار کیا۔ مکے کی زندگی میں پالیسی کی بنیاد قرآن کی ان آیتوں پر تھی۔

"مذہب (نظریہ یا اعتقاد) کے معاملے میں تشدد کا استعمال مذکورہ چاہئے"

"آپ اپنے لئے اپنے عقائد قائم رکھئے اور ہم اپنے عقائد پر قائم رہیں"

ان دونوں آیات کی تشریح جدید زمانے کی زبان میں یہ ہو سکتی ہے کہ مذاہب، نظریات اور عقائد کے معاملے میں عدم تشدد اور بقولے باہمی سے کام لینا چاہئے۔ مگر آنحضرت نے مدینہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد حالات سے مجبور ہو کر عارضی طور پر قرآن کے اس حکم پر عمل کیا۔

"معا لظنین سے سختی برتو اور آپس میں محبت اور نرمی کا ہوتا دکر د"

رسولِ مقبول نے دو طرح کے حکم دیئے۔ ایک کا واسطہ زندگی کے بنیادی اصولوں سے تھا جو دائمی تھے اور دوسروں کا واسطہ پیدا ہونے والے حالات کی بنیاد پر تھا، جو عارضی تھے اور جن کا بنیادی اصولوں سے براہِ راست واسطہ نہیں تھا۔ ان کی رحلت کے بعد اُن کے جانشینوں نے اپنی اپنی سہولت اور طبعی رجحان کے مطابق الگ الگ راستے اختیار کئے۔

کچھ نے ان کے مکے والی زندگی والی دائمی تعلیم عدم تشدد اور بقولے باہمی کو اپنایا اور دوسروں نے مدینہ والے عارضی احکامات کو اپنے دنیوی مفاد کے لئے کارآمد سمجھ کر اس کی پیروی کی۔

پہلے اہلِ طریقت کہنے لگے اور دوسرے شریعت کے پیروکار۔ پہلے کے ماننے والے حضرت علی تھے اور دوسرے کے حمایتی ہیں تین خلیفہ تھے۔

پہلے کا مقصد مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھنا تھا۔

دوسرے کا مقصد مذہب کو سیاست سے ملا کر چلانا تھا۔

پہلے کا کہنا تھا کہ اسلام اتحادِ انسانی، امنِ عالم اور نرمی بنی آدم کا دین ہے اس کی تعلیم اور تبلیغ کے لئے دورِ زبردستی کا استعمال احکامِ خداوندی کے خلاف تھا۔ انھوں نے اپنے عقیدے کی حمایت میں یہ آیت پیش کی۔

"لوگوں کو راہِ حق کی طرف دانائی اور نیک نصیحت کے ذریعے بلائیے۔ یہ راستہ بہتر ہے، خدائے تعالیٰ لوگوں کی نیک اور بُری

طریقے واقعت ہے اس کو راہِ حق کے طلب گاروں کا علم ہے" رسولِ مقبول کی یہ حدیث پہلے نظریے والے اپنے راہبر کی حمایت میں

پیش کرتے ہیں۔

”دین علم کا مرکز ہوں۔ علی اس کو پہنچانے کا راستہ ہیں۔“

حسن کا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت چالی حضرت علیؓ کے پاس تھی، حضرت علیؓ کا قبیلہ بنی ہاشم تھا۔ اس لئے عربوں کی کثرت نے دنیوی اقتدار کو ترجیح دی۔ یہاں تک کہ رسول مقبولؐ کی لاش مقدس دفن نہیں ہو پائی تھی کہ دوسرے نظریے والے اقتدار کے حصول کے لئے فیصلے میں مشغول رہے۔ اور دین میں شریک نہ ہوئے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو رسول کا جانشین خلیفہ مقرر کیا۔

مسلمان اس وقت دو گروہوں میں بٹ گئے، ایک گروہ نے اسلام کے فروغ اور بقا کے لئے دنیوی اقتدار کو ضروری سمجھا۔ دوسرے گروہ۔ انہیں اس کو غیر ضروری اور بدعت سمجھا۔

پہلے گروہ کی تشریح میں پہلے ہی بہت لٹریچر موجود ہے اس لئے میں یہاں دوسرے گروہ کا نقطہ نظر پیش کرتا ہوں، اس موضوع پر مصری عالم علی عبدالرزاق نے ایک کتاب ’الاسلام والاصول المحکمہ‘ لکھی جو 1925ء کے قریب قاہرہ میں چھپی، جس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خلافت خاص دنیوی (سیکولر) ادارہ ہے اس کا مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے، مصنف نے ثبوت میں یہ دلائل پیش کئے ہیں :

1۔ دین اسلام میں واضح طور پر کسی بھی قسم کی حکومت کا ذکر نہیں ہے۔

قرآن کریم اور حدیث میں مسلمانوں کو آزاداں دی ہے کہ وہ کسی بھی قسم کی حکومت بنائیں۔

2۔ جس صورت میں قرآن میں خلافت کا ذکر نہ واضح طور پر اور نہ اشارہ ہی کی طور پر آیا ہے، اس لئے خلافت اسلام کے بنیادی اصولوں میں داخل نہیں ہے

اس کو قدامت پسند مولویوں نے صرف فقہ کے ذریعے اعتقاد کا جز بنایا ہے۔

مصنف مولویوں کی اس دلیل کو رد کرتا ہے جس کے ذریعے انھوں نے خلافت کو اسلام کا لازمی حصہ بنایا ہے، اس کا کہنا ہے کہ خلافت کسی احکام الہی یا پیغمبر کے کہنے کے مطابق بنائی گئی ہے اور نہ مسلمانوں کی رائے عامہ کے مطابق وجود میں آئی، کیونکہ پہلے تین خلیفہ خاندان کے بعد خلافت ہتھیاروں کے زور پر قائم رکھی گئی، اور اس کو مسلم عوام کی رائے کا ماتحت ہونے کا شرف کبھی بھی حاصل نہ ہوا۔

3۔ پیغمبر خداؐ کو رسالت کا پیشینہ شخصی طور سے سپرد ہوا تھا، ان کو حکومت قائم کر کے اپنے جانشینوں کے ہاتھ میں دینے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، خلافت کو مذہبی حیثیت نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی حکومت کا نظریہ ہی غلط اور خود ساختہ تھا، اگر خلیفہ کو مذہبی حاکم تسلیم کریں تو یہ دوسری بات ہے، مگر ابتدائی مسلمان حکومتیں کوئی منظم دستور، عدالت، مالیات، پولیس و سیرہ کی انتظامات سے محروم تھیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کو حکومت قائم کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا، اگر ان کا ارادہ تھا تو وہ اس کے کچھ بنیادی اصول مقرر کرتے اور کچھ چھوڑ جاتے، مصنف اس نظریہ کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ پیغمبر صاحب مسلمانوں کے کوئی دنیوی حاکم تھے، ان کا دنیوی اختیار جو ان کے روحانی پیش کا جز تھا، وہ پیغمبرؐ منصب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دوسروں کو منتقل نہیں ہو سکتا تھا، مصنف کی رائے میں پیغمبر کے مشن کا لوگوں کے عقائد اور اخلاق کی درستی سے واسطہ تھا، نہ حکومت چلانے سے۔

مصنف کا خیال ہے کہ چند عرب قبیلوں نے اپنی حکومت کے استقام اور وسعت کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو پیغمبر کا جائے نشین ظاہر کیا مگر اس کے لئے کوئی مذہبی سند نہیں تھی، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمرؓ اور بعد میں حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے۔

ان کے دور حکومت میں ان کے مقرر کئے ہوئے بنی امتیہ قبیلے کے گورنر اس اسطو قائم کر گئے کہ جب حکومت کی ہانگ ڈور حضرت علیؓ کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور آخر انھیں شہید کر دیا۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کو شہید کر کے بنی امیہ گھرانے نے حکومت اپنے قبضے میں لے لی۔

اگر اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دنیوی اقتدار کے حامیوں نے یہ دونوں باغیہ یودیوں اور عباسیوں سے سیکھی تھیں۔

مسلمانوں کے الگ مذہبی ہونے کا تصور یہودیوں سے لیا گیا ہے۔

خلافت کا یہ تصور عیسائیوں کے پوپ کے ادارہ سے نقل کیا گیا تھا۔

ادراپ دونوں باتوں کا رواج اسلام سے کوئی بھی واسطہ نہیں تھا۔

بنی امیہ، بنی عباس، ترک سب دنیوی حاکم تھے۔ اس طرح دنیا میں دوسری جگہوں پر بھی مسلمان حاکم تھے اُن سب نے مذہب کے نام کو استعمال کیا۔ حکومت اُن کے ہاتھوں میں ہوتی تھی اور مولویوں کو محض خوش کرنے کے لئے رسول کی ملائیں ان کے سپرد کر دی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ تعلیم، نماز، نکاح اور تجیز و تکفین دینے کے کام بھی ان سے لئے جاتے تھے۔ لیکن حکومت کے داخلی، خارجی، اور انتظامی معاملات سے مولویوں کو دور رکھا جاتا تھا۔

اُس وقت حکومتیں مذہبی، عباسیوں، مغلوں، ترکوں اور ایرانیوں کے نام سے وابستہ ہوتی تھیں۔ تاریخ میں کبھی بھی مسلمان قوم کے نام پر حکومت نظر نہیں آئے گی۔ اور نہ حاکموں ہی پر مذہبی مولویوں کو برتری حاصل تھی۔ مولویوں کی اکثریت بعض حاکموں کی تعریف میں مصروف رہتی تھی۔ چاہے حاکموں کے کارنامے کیسے ہی بُرے ہوتے تھے۔ چنگیز خان جیسے ظالم حاکم کو مولوی جبوتی نے ”جہاں نشانی“ کا لقب دیا تھا۔ تیمور لنگہ کی بے انتہا خونریزیوں کے باوجود اسے ”صاحب قرآن“ کا لقب دیا تھا۔

مولویوں نے اورنگ زیب کو، باپ کو قید کرنے، بھائیوں اور سرد کو شہید کرانے کے باوجود بڑے فخر سے ”عالمگیر“ کہہ کر پکارا۔

مسلمانوں کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کتنی بار مذہبی مجنوں کی طرف سے اسلامی حکومتیں برپا کرنے کی کوششیں ہوئیں مگر سب باطل کی آگ میں پڑ گئیں۔ مثال کے طور پر سوڈان میں ہمدی سوڈانی دلیلیا میں شیخ منوسی، اندھوستان میں سید محمد میلن جو پوری اور سید احمد بریلوی سب نے اسی اسلام کے لئے مہدی کہلانے کی کوششیں کیں مگر سب بے کار گئیں۔ اس مسئلے کو پوری طور پر سمجھانے کے لئے مسلمانوں کے چند فرقوں میں چند مروج عقائد کی تشریح ضروری ہے

۱۔ خلافت ۲۔ دینی نظام ۳۔ مہدی ۴۔ رجاؤ

یہ سب عقائد مذہب اور سیاست کو ملا کر چلانے والوں کی طرف سے ایجاد کئے گئے ہیں۔ رواج اسلام سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان عقائد کی نیتیں کسی بھی ہوں مگر تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق اور خونریزی کا باعث یہی عقائد بنے ہیں۔ یورپ کے مشہور تاریخ دان آرنالڈ کانہن نے: ”اگر مسلمان مذہب کی تبلیغ اور فروغ کے لئے تشدد کا استعمال نہ کرتے تو اسلام کی تعلیم اتنی

دل فریب تھی کہ اس وقت انسان ذات کی اکثریت مسلمان ہوتی۔“

اب آئیے اوپر ذکر کئے ہوئے چار عقائد کی افادیت سے بحث کریں۔

۱۔ خلافت: خلیفہ کے معنی رسول کا جانشین، اسلامی جماعت کے نظام کا منتظم، فروغ اسلام کا مدیر لئے جاتے ہیں مگر یہ تینوں تصورات غلط ہیں۔ رسول کا جانشین کوئی نہیں ہو سکتا۔ رسالت کا مشن شخصی طور پر سپرد کیا گیا تھا۔ اس کو کسی دوسرے کے سپرد کرنے کی ذمہ داری رسول کریم کو اجازت تھی اور نہ انھوں نے کسی کے سپرد کیا۔

پیغمبر کی وفات کے بعد لوگوں نے اپنی مرضی سے جانشین مقرر کئے جس کے لئے کوئی مذہبی سند نہیں ہے۔ البتہ اپنی تعلیم کی تبلیغ کے لئے چند ادا سے قائم کرنے کی ممانعت نہیں تھی۔ کیونکہ سیاست اور حکومت کے ذریعے طاقت کے استعمال سے ان کے فروغ کے لئے کوشش کرنے کی وجہ سے فائدہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ

نظا۔

دوسری سے مسلمانوں نے اسلامی جماعت کے نظام اور نظام حکومت کو ملا کر چلانے کی جو کوششیں کیں انھوں نے فرقہ بندی اور خانہ جنگی پیدا کر دی۔ فرقہ کی اسلامی حکومت کے نظام کا تخیل غیر اسلامی ہے۔ اور نصاروں سے مستعار لیا گیا ہے۔ لہذا بعد نے اپنی جماعت کے نظام کے لئے پوپ کے تحت ایک امامہ قائم کیا۔ بعد میں اس کو سیاست میں شامل کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس کے ذریعے کوششیں کو فروغ ملے گا۔ مگر جب ان کو پتہ چلا کہ اس کی وجہ سے خانہ جنگی

اور فوج بندی جیسی ہے تو تجربے سے فائدہ حاصل کر کے سیاسی، مذہبی کا ردبار کو الگ الگ کر دیا۔ مسلمانوں نے جی ان فادکھا دیکھیں خلافت کے نام کے سیاست اور مذہب کو مل کر چلا کر شروع کیا مگر اس کے نقصانات بے غریب سے کیا اور گمراہ لوگ اب تک اس کی افادیت میں اعتبار رکھ کر مذہبی نظام حکومت کی گفٹ کر رہے آئے ہیں۔
 فروغ اسلام دلیہ کے کام اور پختہ عالموں کے ذریعے ہو سکتا ہے مگر گمراہ مولوی اور ناسخ و ناجو حکام وقت کے ذریعے اسلام کی ترقی ناممکن ہے۔
 مسلمانوں کی تعداد تو اتنی خاصی ہے مگر ان کا اخلاق اور صلاحیت دوست نہ ہونے کی وجہ سے دنیا میں بھی بڑے ہوئے ہیں۔ اگر خود سے مسلمانوں کی تلویر
 بد نظروالی بنے تو معلوم ہو گا کہ خلافت نے مسلمانوں کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے جس سے سنی کے ترکوں نے آخر سے حم کر دیا۔

۲۔ نظام دین اس سے اصل مقصد یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم اور تربیت کے لئے ادارہ قائم کر کے رسول مقبول کی جلائی ہوئی جیوتی کو جالی رکھا جائے مگر
 اسی راہ میں مسلمانوں سے ابتدا میں جو غلطیاں ہوئیں اس وجہ سے یہ مقصد بڑی طور سے حاصل نہیں ہو پایا۔

پہلی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب اور سیاست کے امتزاج سے خلافت قائم کی۔

دوسری غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ظاہری باتوں پر زیادہ زور دیا اور اخلاق اور تزکیہ نفس کو پیچھے ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اپنے اصل مقاصد اور
 اور صرف انسانی میں کامیاب نہ ہوا، بلکہ ایک علاحدہ مذہب بن کر سینکڑوں ذوقوں میں جٹ گیا۔

چند دکانیہ نظام براہمنزم اور جمہوریت بن لایا۔

یہودیوں کے دینی نظام نے قومی برتری اور دستانی تصور پیدا کیا۔

عیسائی دینی نظام نے یوپی کی مومیت اور شفاعت کا نظریہ پیش کر کے لوگوں کو بایاؤں کا محتاج بنا دیا۔

مسلمانوں کے دینی نظام نے خارجہ جنگی، فرقہ بندی اور تشدد کو فروغ دیا۔

مگر مولوی اب تک اخیر کسی سوچہ بوجھ کے نظام دین اور اسلامی نظام حیات کا راگ گائے تھے آپ ہے ہیں۔

یہ مقصد مذہب کے زوال کے وقت مذہب کے، نئے والوں کو امید دلانے کا خاطر پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ مہدی (آخر الزماں) تقریباً ہر مذہب کی پیروی کرنے والوں میں یہ عقیدہ مروج ہے۔

۱۔ ہندو مذہب میں دشندو دھوتا کا ادا تارے لڑانے کا عقیدہ موجود ہے۔ اس کے مطابق کئی لوگوں نے اپنے کو دشندو کا ادا تار کہہ کر ہندو دھرم کی دکھائی

کا دعویٰ کیا ہے۔

۲۔ عیسائیوں میں یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں اور عیسائیوں کے فروغ کے لئے بھرنوٹ آئیں گے۔

۳۔ مسلمانوں نے بھی اس تہذیب پر یہ نظریہ ایجاد کیا ہے کہ آخری زمانہ میں مہدی پیدا ہو کر ساری دنیا کو اسلام قبول کرائیں گے۔ یہ پہلی سنت کا عقیدہ ہے۔

اس عقیدے کے مطابق کئی لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر کے احیاء اسلام کے لئے کوشش کی، مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ شدید حضرات تو بارہویں امام کو غائب

کر کے اس کے لوٹ آنے کی امیدیں کئے بیٹھے ہیں۔ دراصل یہ عقیدہ ہی غلط ہے اور لوگوں کی بہت افزائی کے لئے۔

۴۔ اور انھیں باپوس کن حالات میں پڑے۔

اسد بنانے کے لئے ایجاد کر گیا ہے۔

یہ عقیدہ بھی کئی مذاہب میں مروج ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مذاہب کے فروغ کے لئے تشدد کا استعمال لازمی ہے۔ اس عقیدہ کو ماننے والوں کا خیال

۴۔ جہاد ہے کہ انہی کی اکثریت حیوانی صفات سے موصوف ہے اس لئے دھنڈے کے بغیر وہ مسلمان نہیں ہو سکتے۔

ہندو براہمنوں نے کھتری راجاؤں کا اصلاح کار بن کر ان کی معرفت ہندو دھرم کو عوام پر زبردستی تسلط کرنے کا خیال پیش کیا۔

عیسائیوں نے یوپی کو کئی عیسائی حاکموں پر بالا دھرمی دلا کر مذہبی فروغ کے لئے کوشش کی۔ صلیبی جنگیں اسی مقصد کے حصول کے لئے لڑی گئیں۔

مسلمانوں میں وہ کہ جن کا عقیدہ سیاست اور مذہب کو مل کر چلانے کا تھا انھوں نے اپنے سامراج اور حکومت بڑھانے کے لئے اس نظریہ کے ذریعے

جو از پیدا کر کے جنگیں کیں اور مولویوں اور ان کے ہم خیال لوگوں نے ان جنگوں کو جہاد کے مقدس نام سے دیکارا۔

اسلام محبت اور امن کا پیغام لایا۔ اس کی تبلیغ کے لئے قرآنی احکام کے مطابق داناؤں اور نیک مصالحت سے کام لیا ہے۔ زور زبردستی کا دخل نہیں۔ مگر مسلمانوں کے مستقل مفاد کے حاکم احکام کے حوالے مولوی جہاد کو اپنے ایمان کا جُڑ بنائے چلے آئے ہیں۔

جس صورت میں مسلمانوں کی علیحدہ قوم کا نظریہ غیر اسلامی ہے اسی طرح اس کی بنیاد پر کیا دئے گئے مفاد بھی بے معنی اور بے فائدہ رہیں گے۔ **مسلم تاریخ پر نظر کر کے دیکھیں** کہ تو کتنے مسلمان بادشاہ اور خلیفہ اخلاق سے عاری تھے بعض ذاتی تھے بعض شرابی، بعض سفاک اور بعض فاضل تھے۔ اگر ان کو اسلام کا علمبردار بنا جائے تو خود اسلام ایک مضحکہ خیز مذہب بن جائے گا۔

کیا بنی امین، عباسیوں، ترکوں اور خنوں وغیرہ مسلمان حاکموں کی جنگیں اور غوریزی جہاد یا اسلامی جنگیں شمار کی جاسکتی ہیں؟ اب ذرا ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں:-

سب سے پہلے ہندوستان کے ایک حصے سندھ کو بنی امیر سامراج کے ایک سپہ سالار محمد بن قاسم نے حملہ کر کے فتح کیا۔ سندھ کے راجہ ڈاہر کو بڑی میں شکست دے کر کئی ہزار مرد اور عورتیں غلام بنا کر عرب میں بکری کے لئے بھیجی گئیں۔ لوٹ کے گرد و زون روہیے امیر بادشاہ کے خاص گورنر حجاج بن یوسف کو بھیجے گئے اور سپہ سالار قاسم نے راجہ ڈاہر کی بیوی سے شادی کی اور تاریک کی ایک روایت کی بنا پر اس فی حد بھٹیوں سے بھی ذنا کیا۔

حجاج اور اس کا سپہ سالار یزید بن خالد نے حاکموں کے کارندے تھے۔ راجا ڈاہر نے سرتے گھرانے کے چند افراد کو حجاج میں بھیج دیا۔ ان کے غم سے بھانک کر سندھ میں آئے تھے پناہ دی تھی وہ باوجود براہمن ہونے کے بدھ دھرم والوں کی حفاظت کرنے والا اور متبع مسیحی عالم تھا۔ سندھ دس کی حفاظت کے لئے لڑتے ہوئے وہ سرف کر شہید ہوا۔ مولوی محمد باہق داس کو غازی پور اس کے حملے کو بنیاد بنا کر پیش کرتے ہیں۔ سادہ دل لوگ اس بات پر یقین لے آتے ہیں۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی نے آترہ ہند پر کئی بار حملے کئے۔ لوٹ اور غوریز کے درمیان یا ر دلت ہندوستان سے لے گیا۔ بے ایمان مولوی آپ کو بھی غازی کا لقب دے کر اس کے ان حملوں کو بھی اسلامی فتوحات میں شمار کرتا ہے۔

بعد میں سلطان علاؤ الدین خلجی نے ہندوستان کو اپنے حملوں سے فتح کیا۔ اس کو بھی مولویوں نے مشورہ دیا تھا کہ خود کو اسلام کا علمبردار کہلائے مگر اس نے انکار کیا۔ پھر ہار بادشاہ نے ہندوستان کو فتح کر لیا اور مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے پوتے اکبر بادشاہ نے بھی لوگوں کو متحد کرنے اور اپنے خاندان کے سامراج کو مستحکم بنانے کے لئے مذہب کے نام کو استعمال کیا مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ اس کے بعد اورنگ زیب بادشاہ نے اسلام کے نام پر اپنے سامراج کو مضبوط کرنے کے لئے کئی جنگیں لڑیں۔ فتح بھی پائی مگر ان کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے مغل سلطنت کا جبریں اظہار نہیں پاکستان مذکور تاریخی ملک ہے اور اس کا کوئی جغرافیائی وجود ہے۔ یہ مختلف وجوہ سے برصغیر ہند کے بٹوارہ کی بنا پر پانچ ملکوں پر مشتمل ایک یونین ہے۔ دراصل "پاکستان" ایک منجانی اختراع ہے۔

برصغیر ہند نے تاریخ میں کوئی بار کچھ ایک جہتی حاصل کی ہے مگر زیادہ تر سیاسی حیثیت سے بٹا ہوا رہا ہے۔ اس کے موجودہ بٹوارے کے حیرت انگیز اسباب سے خیال میں یہ ہیں:-

1. برصغیر ہند میں مختلف آب و ہوا والے علاقوں، علیحدہ علیحدہ زبانوں، مختلف مذہبی اعتقادات، الگ الگ نسلوں، رسم و رواجوں اور سماجی درجوں کے لوگ رہتے ہیں جن کو اتفاقی تاریخ کی چکی اب تک پس کر پوری طور سے مفلوج نہیں کر پائی تھی۔

2. انگریز گورنر برصغیر کو مل کر ایک حکومت کے زیر اثر لے آئے تھے مگر متحدہ قوم بنانے کی ان کی کوشش اور ایک پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

3. مذہبی طور پر برصغیر ہند کے رہنے والے دہموں اور تعصیوں کے اثر سے ابھی تک آزاد نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے مذہب کے نام پر دھوکے میں آ جاتے تھے۔

4. لوگوں کی اکثریت غریب اور معصوم تھی جن کو نو مولود مل کلاس کی اقتصادی رتائوں نے گمراہ کر رکھا تھا۔

5۔ صحیح قومی تصور کی کمی تھی۔

ڈاکٹر محمد اقبال کو ہندوستان کے جدید زما دین مسلمانوں کی متحدہ قوم کے نظریہ کا موجد سمجھا جاتا ہے اس نے ہندوستان کے براہمنوں، برہمن فلسفی
نسطیے اور ترکوں کے متبع پر پنجاب سامراج کے لئے اس نظریے کی ہندوستانی مسلمانوں کو تسلیم دی۔ براہمنوں، جرموں اور ڈاکٹر اقبال کے قومیت کے نظریے
میں فرق یہ ہے کہ جس قوم نے آریہ قوم کو بہترین نسل قرار دے کر دوسری اقوام کی راہبری کے لائق اپنے آپ کو سمجھا، ان پر تسلط قائم کرنے کی آواز اٹھائی۔ رسانی
قوم کے یہودی راہ میں راڈاٹ بنے۔ یہاں اقبال مسلمانوں کو دنیا کی چندہ قوم و دولت قرار دے کر اور مذہب کو بنیاد بنا کر اپنا تسلط جمانا چاہتے تھے۔
اقبال کے خیال میں ان کی راہ میں ہندو راڈاٹ بنے۔ شہل نے جب آریہ قوم کا نام لیا تو اس سے اس کا مقصد جس سامراج تھا کیونکہ آریہ سے واسطہ
رکھنے والی اور بھی اقوام موجود تھیں۔

علامہ اقبال جب مسلم قوم کا نام لیتے تھے تو اس سے ان کا مقصد پنجابی سامراج ہوتا تھا۔ درہ اور بھی کئی مسلمان تھے جو یہ راگ نہیں گا رہے تھے۔
یہ نظریہ سندھی، بلوچ، پنجون، اور بنگالی اقوام کو پنجابی سامراج کے ذریعہ ترلانے کی نیت سے ایسا دیکھا گیا تھا۔
علامہ شرفی اسلام کے بینہ بنی عالموں میں سے ایک تھے، ان کا کہنا تھا:
"دنیا کا صالح آدمی مسلمان تھا اور غیر صالح غیر مسلم تھا۔"

اس نقطہ نگاہ سے مسلمانوں پر موجود ہجواریہ غلط تھا کیا استحصال اور غریب مظلوم ایک ہی جماعت میں ہو سکتے ہیں؟
کیا بڑا خلق اور اخلاق والے ایک ہی زمرہ میں شمار کئے جاسکتے ہیں؟
قرآن کی یہ آیت ہے: "بہشتی اور دوزخی اور نیکو براہمن ہیں۔ بہشتی بہتر ہیں۔"

یہ نظریہ کسی بھی مسلم ممالک میں رائج نہیں ہے۔ عرب ممالک ایک ہی زبان، کلچر اور مذہب والے کویت، عمان، بحرین، عراق، لبنان، شام، یمن
موجودی عربیہ، یمن کے دوفول ملک، مصر، یمن، الجزائر، مراکو، سوڈان وغیرہ الگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ملک دوسرے کے ماتحت رہنا قبول نہیں کرتا۔
انڈونیشیا اور ایران کی زبان، کلچر اور مذہب ایک ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ماتحت رہنا تو چھوڑیے وہ تو ذاتی میں رہنا بھی قبول
نہیں کرتے لیکن یہاں اسی نظریے کی بناء پر چار اقوام (بنگالی، سندھی، بلوچ اور پنجون) کو بڑی غلام رکھا جا رہا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی الگ کرنا ہے تو ان کا
ہنگاموں کی طرح خون بہایا جاسکتا ہے۔

یہ نظریہ پہلے ہندوستان کے درمیان لفظ کا کارن بنا اور ملک کے ٹوٹنے کا باعث ہمارا داراب پاکستان میں رہنے والی مختلف اقوام کے درمیان
لفظ اور لغت پیدا کر کے خون خرابی کی وجہ بنا رہا ہے۔

میرے ایک دوست کو سیاسی اختلاف کے بنا پر جیل میں رکھا گیا تھا اس کو ایک دن سیرٹنڈرٹ جیل نے جو ایک پنجابی تھا، کہا "ہم سب مسلمان
ہیں، ہمارا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، مذہب ایک ہے، ملک ایک ہے، پھر اختلاف کیوں کرتے ہو؟"

اس کے مک پر بہادری کی گئی تھی۔ لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا اس لئے اس کا دل جلا ہوا تھا۔ وہ مسلمان تھا اور وہ بھی مسلمان تھے جنہوں نے
ان کے اور ظلم ڈھائے تھے۔ اس ظلم کے بعد یہ نسبت آمیز گفتگو تھی

میرے دوست نے بڑا مدنیہ کو یہ براہمن دیا

"آپ کا اور ہمارا خدا ایک ہیں۔"

پنجابی شاعر نے کہا تھا،

"خودی کو کر بلدا اتنا کہ ہر قدر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے"

اس لفظ نگاہ سے خدا بندہ کا محتاج بن جاتا ہے۔ مگر ہمیں، ہمارے بزرگوں نے دوسری طرح سے بتایا ہے۔ "میرے خدا میری بلگ ڈو تو
تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں تو بس محتاج ہوں۔ ہم احکم الحاکمین، الے خدا کو ملتے ہیں۔ آپ ملک خدا کو ملتے ہیں۔ اس لئے ہمارا خدا آپ کے خدا سے ملجود ہے۔"

ہمارے ہندوستانی مسلمان

”اسی طرح پیغمبر خدا کو آپ جس نظر سے دیکھتے ہیں، ہم اس سے الگ دیکھتے ہیں، آپ نے پنجاب سے پیغمبر پیدا کیا، ہم نے خدا کو بچایا، آپ رسول مقبول کو ایک گروہ کا لیڈر بنانا چاہتے ہیں، ہم اُن کو رجحان اللعالمین سمجھتے ہیں، اس لئے ہمارے ادراپ کے رسول کے متعلق عقائد میں فرق ہے، مذہب کے متعلق ہمارا اور آپ کی رائے میں بہت فرق ہے، آپ کے اسلام کے مطابق نفرت جائز ہے، ہمارے یہاں کفر ہے، آپ کی مذہبی تشریح کے مطابق بلوچیوں کے حقائق پر قبضہ کرنا جائز ہے، ہماری مذہبی تشریح کے مطابق ہر ایک بھائی اور برادر قوم کو مساوی حق ملنا چاہئے، اس لئے ہم پنجابی تصور کے اسلام کو نہیں مانتے۔ ایک ملک کے متعلق بھی ہم الگ رائے رکھتے ہیں۔ پاکستان ہمارے یہاں ایک ملک نہیں ہے مگر پانچ ملکوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں اگر ایک صوبہ دوسرے صوبے پر قابض رہنا چاہے گا تو دوسرے کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اس سے الگ ہو جائے، جس طرح ایک گھر میں رہنے والے بھائی اختلافات وقت حساب کتاب نہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔“

ایسا کہہ کر اس نے سپر سٹنٹ سے کہا: ”آپ پنجابیوں نے ہم کو اتنا تنگ کیا ہے کہ اگر آپ بہشت میں ہوں گے تو ہم دوزخ میں جانا زیادہ پسند کریں گے آپ کے ساتھ رہنے سے غیر مسلمانوں کے ساتھ رہنا زیادہ جتر ہے۔“

ایک بار مولانا دوددی نے کہا تھا کہ ”جیسے سندھ“ (سندھ زندہ رہے) معنی ”سرے پاکستان“۔ اب اس کا رد عمل یہ ہوا ہے کہ اہل سندھ کے غیر مندیہ سمجھے لگے ہیں، جب یہ سامراجی گروہ ”جیسے پاکستان“ کا نعرہ لگاتا ہے تو اس سے ان کی مراد سرے سندھ ہوتی ہے۔ اس لئے سندھ تب زندہ رہے گا جب یہ دھوکے کی دیوار ٹوٹے گی، شاہ باجوہ اور گرونانک کے ہندو مسلم اتحاد اور محبت کا پرچار کیا، مگر علامہ اقبال نے ہندو مسلمانوں کو الگ کرنے کی تعلیم دی۔

شاہ باجوہ اور گرونانک کی تعلیم نے سکھوں اور انگریزوں کے دور حکومت میں پنجابیوں کو متحرک کیا، اور انھوں نے ’دلیاں دچ دلیں پنجاب دا‘ کا کلاہ فخر سے اگایا، اور اقبال کی تعلیم نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دربر در ایک دوسرے کا خون بہانے پر آمادہ کیا۔ سر فضل حسین کی دور رس نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ سکھ، ہندو اور مسلمان پنجابی متحد ہوں گے تو سامے ہندوستان پر حاوی ہو سکیں گے اس کا وجہ سے ہندوستان کی پوری فوج میں یہ ۲۵ فیصد تھے، اور سول سروس میں بھی ان کی تعداد کافی تھی۔

سر سکندر حیات ایماندار نہ طور پر اس پالیسی پر گامزن رہا، مگر وہ دن پنجاب کے لئے ختم ثابت ہوا جس دن جناح صاحب اور اقبال کی ملی جلی سیاست اور فلسفہ اس پر اثر انداز ہوئے، مرحوم مولانا غلام رسول تہر کا کہنا تھا ”جناح صاحب کی سیاست اور اقبال کی تعلیم نے مسلمانوں کو اتنا نقصان پہنچا یا ہے جتنا چنگیز خان اور ہلاکو نے بھی نہیں پہنچا یا تھا۔“

ملک کے بڑے کاسب سے زیادہ نقصان کس کو ہوا ہے؟ اہل پنجاب کو، ملک بٹ گیا، انھوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا، تین جنگوں میں پنجاب کا لٹا خون بہا ہے، مگر پھر بھی ان کو سمجھ آئے گی یا نہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔

جنرل سچائی خاں کہتا ہے ”گرونانک کی تعلیم ملک اور لوگوں کے لئے مفید ہے،“ پھر نہیں اس بات میں کتنی صداقت ہے کیا اسے سلو ہے کہ گرو نانک کی تعلیم کے کیا معنی ہیں؟

پاکستانی حکومت لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے مذہبی بنیاد پر تھی نظریہ کا اظہار کرتی ہے، دنیا بھر میں اقوام متحدہ میں پاکستانی قوم کہلاتی ہے یہ دونوں باتیں غلط ہیں، یہ مسلم قوم کا کوئی وجود ہے اور نہ پاکستان ہی کے اندر رہنے والے ایک قوم ہیں، مسلمانوں میں 55 سے زیادہ فرقے ہیں، جن میں سے ہر ایک خود کو حق پر اور دوسرے کو ناحق پر کہتا ہے، کچھ وقت ہمارا پنجاب میں قادیانیت کے خلاف مجاہدائی گئی تھی، کہہ سکتے تھے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں، ناسادات ہو گئی جانشین نہیں، اوائل لا لگا دی گئی، جس محمد زید احمد جس قسم کیالی کی ترجمانی نے کئی موبیوں کے بیان لئے اور ان سے پوچھا کہ مسلم قوم کیا ہے؟ کس کو کہتے ہیں؟ اور اسلامی نظام کیا ہوتا ہے؟ نچ صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ اکثر موبیوں نے ایک دوسرے کے خلاف باتیں کیں۔ سب کے خیال متضاد تھے، اگر سب کی باتوں پر یقین کریں گے تو پھر کوئی بھی آدمی مسلمان نہیں رہے گا۔

لاہور کا مشہور ترین دیال سنگھ کالج

دیال سنگھ ٹرسٹ کے زیر اہتمام لاہور میں ۱۹۰۹ء میں جاری کیا گیا تھا جہاں غیر
تقسیم پنجاب کی ہزاروں ہستیوں نے اس کالج میں تعلیم حاصل کی اور اپنے ملک
کا نام مختلف طریقوں سے روشن کیا۔

تقسیم ملک کے بعد لاہور کا یہ مائے ناز کالج اپنی سابقہ روایات کے مطابق ۱۹۴۹ء میں

دیال سنگھ کالج کرنال

کی شکل میں عوام کے سامنے آیا اور گزشتہ ۲۵ سال سے یہ کالج اپنے ملک کی
خدمت انجام دے رہا ہے اور پنجاب بھر میں یہ کالج اپنی سابقہ روایات کو یہ طریقہ حسن
زندگی رکھتے ہوئے ہے۔

آزاد ہندستان میں یہ دیال سنگھ کالج کرنال کی اس ۲۵ سالہ سلور جوبلی کے موقع پر کالج
کے چیرمین، ٹرسٹی، اور اسٹاف ممبران

عوام کی خدمت کا پھر حلف لیتے ہیں
عوام کے خیر خواہ ٹرسٹیانے

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

بہارِ قِلاط



پڑھ لکھوں کی صحبت تنہائی ہے بہتر ہے۔

سایف

ٹیکسٹائلز ٹریڈرس

پاورلوہ کاھر قسم کا سامان فراہم کرنے والے

SAIFEE TEXTILES TRADERS

174. PRABHU AALI, BHIVANDI

174. پرہو آلی، بھونڈی (تھانا)، مہاراشٹر

پہلے ہندوستانی بعد میں مسلمان

ایک جیب کار، ایک اسٹیشن واں، ایک اسکول، دو چوکی دار کی چار نگہ بان آنکھوں اور ایک خوں خارا کتے سے گزر کر بالاصاحب کے ڈرائنگ روم تک پہنچنا پڑتا ہے۔ مارا شٹر کے اس منہم ہنسا کی یہ چونک اور یہ احتیاط دراصل ممدونی ہے جو ان کو اپنے عورت اعلا جعفری راجا خواجی سے درانت میں ملی ہے۔ مگر بالاصاحب بالکل ناریل ہیں باہر سے سخت اندر سے نرم۔ قری بال کیشوٹھا کرے جرنلٹ باپ کے گھر 23 جولائی 1927ء کو پونے میں پیدا ہوئے۔ ایک کارٹونسٹ کی حیثیت سے ان کے پیشے کی ابتدا (1943ء) میں کی گئی تھی۔ انگریزی روزنامہ نے ان کی جرنلٹ سے ہوئی۔ 13 اراگت 1960ء سے انھوں نے مراٹھی ہفت روزہ بارکسا جاری کیا۔ جب بالاصاحب کے قریبے اور شاہ سے نے یہ بتایا کہ کبھی کو محض نام کے لئے کاسمو پولیٹن کہا جاتا ہے مگر بالاصاحب کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے میں کاسمو پولیٹن ازم کا ثبوت نہیں دیا جاتا۔ صرف یہی نہیں بل کہ ساؤتھ کارا جینڈرن خد بھی آتا ہے اور ساؤتھ میں سندھم کو بھی لایا ہے تو۔ 19 جون 1966ء کو انھوں نے مارا شٹر کے بیڑوں کے تحفظ کے لئے شروع سینا کی بنیاد رکھی۔ بالاصاحب نے جئے کارٹونسٹ ہیں ان کے کارٹون امریکا کے سب سے بڑے اخبار نیوا رکل ٹائمز اور دنیا کے سب سے بڑے اخبار آسای شیون (جاپان) میں چھپ چکے ہیں اور اس سے بھی زیادہ جب لندن کی کیسل اینڈ کمپنی نے مرحل کی 47 سالہ سیاسی زندگی سے تعلق کارٹونوں کا آئی ٹی بورڈ "A CARTOON BIOGRAPHY" شائع کیا تو اس میں بالاصاحب کے بنائے ہوئے بھی تین کارٹون شامل کئے گئے، بالاصاحب پاپ نرش ہیں، کرکٹ اور باغ بائی ان کی ہلی ہے۔ وہ شس مزاج اور بااخلاق ہیں۔ ایک ملاقات میں بالاصاحب سے میری جو گفت گو ہوئی وہ حسب ذیل ہے۔

سے : جے آپ قوی دھارا کہتے ہیں، مسلمان اپنے آپ کو اس دھارے میں کیسے شامل کرے۔ ؟

ج : دراصل مسلمانوں کو دنیا کے معاملات کے سلسلے میں اپنے مذہب کو درمیان میں نہیں لانا چاہیئے بل کہ ہر حال میں ملک و قوم کے لئے مفید نہیں تھا مگر آج کے زمانے میں فیملی پلاننگ ضروری ہے مسلمانوں کو چاہیئے مذہب نے ایک حدت زادہ شادیاں کرنے اور

زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کرنے کی اجازت دی ہو مگر قوی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مذہب کو نہیں نبھتی کو اپنے سامنے رکھیں۔ مذہب قطعی طور پر ایک ذاتی معاملہ ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قوی مفاد پر اپنے مذہبی مفاد کو قربان کر دے۔ مذہب خدا انسانیت کو دوسری ساری قدروں سے مقدم قرار دیتا ہے۔ یہ بات تو کسی جانتے ہیں کہ جب ہندوستان اور پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کا مقابلہ ہوتا ہے تو ہندوستانی مسلمانوں کی ہم دردی پاکستانی ٹیم کے ساتھ ہوتی ہے یہی نہیں بل کہ کسی دوسرے ملک کی سرزمین پر جب ہندوستان اور پاکستان کی ٹیم کا کسی دوسرے ملک کے ٹیم سے مقابلہ ہوتا ہے تو فخر کے مقابلے پر پاکستان کے جیتنے پر ہندوستان کے مسلمانوں کو زیادہ خوشی ہوتی ہے اور جب ہندوستان کی ٹیم کسی غیر ٹیم پر فتح پاتی ہے تو ہندوستانی مسلمانوں پر اس کا کوئی اچھا اثر نہیں ہوتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ہندوستان کی ٹیم کو اپنی ٹیم کیوں نہیں سمجھتا جب مجھے تو عابد علی پر فخر ہے وہ مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی۔ مجھے اس سے غرض نہیں میں کو اتنا جاننا تھا ہوں کہ وہ ہندوستانی ٹیم کا کھلاڑی ہے اور اس کا قابل تعریف کھیل ہمارے ملک کے لئے عزت کا باعث ہے۔ قوی دھارا نہ کوئی دھڑ ہے اور نہ ٹھریک۔ بس ہندوستانی جذبے کا نام قوی دھارا ہے اور جو اپنے عمل سے اور خلوص دل سے اپنے اس وطنی جذبے کا اظہار کرتے ہیں وہی قوی دھارے کا ساتھ دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بتا دوں کہ میں مسلمانوں کا نہیں مسلم لیگوں کا مخالف ہوں۔ آپ خود سوچئے کہ جنھوں نے ملک کا بیڑا راگرایا اور جو فرقہ وارانہ فساد کے بانی ہیں وہ اب اس ملک میں کیوں موجود ہیں؟ یہ بات دالا جیسے مسلم لیگ پاکستان کیل نہیں جلتے؟ مسلم لیگیوں کو اس ویش میں، اپنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم ہندو، ہم خود سینک جب کسی سے پیار کرتے ہیں تو دل سے پیار کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں بناوٹ نہیں ہے۔ جاس ویش کا پچا خیری ہے وہ ہمارا بھائی ہے جیسے کیا ان دلسے ماہر شیخ۔ ان کو بھی اس ویش میں رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہمیں۔ بلکہ کئے کا مقصد یہ ہے کہ پیار سے اس ملک میں نہ رکھتے ہو اور ہو گئے کھنڈی مسلمان کی کہ نہیں بل کہ ہندوستانی بن کر

ہنگو کا ہندوستانی مسلمان نمبر

مس : اردو مسلمانوں کے لئے ایک نازک اور جذباتی مسئلہ ہے اس سلسلے میں آل انڈیا سطح پر مسلمانوں کی پالیسی کیا ہونا چاہیے؟

ج : میں اردو کو پسند کرتا ہوں اردو ایک شاندار زبان ہے، اگر بڑی زبان کا بھی قدر کرتا ہوں کسی زبان کے کسی کو یہ نہیں ہوتا چوں کہ مسلمانوں کا اپنی اچھا نہیں ہے اس لئے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ وہ اردو کے لئے بغض کیوں ہیں؟ کیا پھر کوئی پاکستان بنانے کا ارادہ ہے؟ مسلمان پہلے اپنے عمل سے اطمینان دلائے پھر ہم اردو کے حق میں کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بات میں اس لئے کہ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے فرقہ پرستی کا امتحان ہی دی اعلان ہے جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھا۔ پچھلے دنوں جو کشمیری (دبئی) میں مسلمانوں نے روٹی نہیں، مکان نہیں، ہم کو ہار جھنڈا چاہیے، کانفرنس کا جو فائدہ برپا کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۲۶ برس گزرنے کے بعد بھی ہندوستان کے مسلمان تھوڑے ہوئے حالات کو نہیں سمجھا۔ مسلمان کو جاننا چاہیے کہ یہ اردو تک ذہب کا نام نہیں اردو اب انگریز کی حکومت ہے یہ جتنا راج ہے، اب تو یہی دین چلنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ بتوی ہے کہ ہندی کو قریب زبان سمجھا جائے اور مسلمان اپنے علاقے کی اپنی زبان فردیس کے مدد سے زیادہ پکڑ جائے گا۔

مس : میں طرح واداشٹر میں ہمارا شٹر میں کوہ از دست نہ ملنے کی شکایت آپ کو ہے کیا آپ کے خیال میں عام طور پر مسلمانوں کو کلامت نہ ملنے کی شکایت درست ہے؟

ج : میں یہ کبھی نہیں کہنا کہ ہمارا شٹر ہمارا شٹر میں کسے جھالیا لکھتے ہیں وہ میری غلط ترجمانی کرتے ہیں ڈاکٹر یٹھوی کیل کے اٹھی رٹ ختم دنت سنگھ نے کہا اس سلسلے میں میری غلط ترجمانی کی ہے۔ میں تو انڈیا کو ماننا ہوں۔ البتہ یہ غلط کہتا ہوں کہ ہمارا شٹر کی گودن منٹ کو چاہیے کہ وہ ہمارا شٹر میں کے ساتھ رعایت سے پیش آئے۔ اگر ہمارا شٹر کے لوگوں کی طرح میری حکومت ہمارا شٹر میں کرے گی تو کیا پھر ان پر ویش یا پنچاب کی سرکار میں ان پر دم کھائیں گے؟۔ جہاں تک مسلمان کی کسی شکایت تعلق ہے اس کی بات الگ ہے وہ مسلمان ہمارا ہمارا نہیں گئے ہیں ہندوستانی بن کر وہ جو چاہیں گے وہ ہو جائے گا۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے مسلمان کو بہت سے حق ملے ہیں بل کہ ایک ہندوستانی

مسلمان کا بھی وہی حق ہے جو ایک ہندوستانی ہندو کا ہو سکتا ہے مگر یہ تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی نہ مان کر اپنے حق سے خود محروم رہنا چاہتا ہے۔ یعنی انھوں نے مسلمان کو اپنا حق لینا نہیں کہا۔

مسلم مالک سے ہندوستانی مسلمانوں کو جڑی اور دلی تعلق ہے یا دوسرے لفظوں میں پاکستان اور عرب ملک سے ہندوستان کا مسلمان جس ہم دھڑکی کا ثبوت دیتا ہے اس کے سلسلے میں آپ کی کیا ہدایت یا نصیحت ہے۔؟

ج: دنیا کے کسی بھی انسان یا ملک سے ہم دھڑکی رکھنے میں کوئی برائی نہیں بلکہ انسانیت کے ناطق ہیں مالی بھائی چارے پر زور دینا ہی چاہیے مگر کسی بھی معاشرے میں اپنے دلکش پر کسی دوسرے پیش (جیسے وہ دوسرا دلکش اپنا ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو) کو ترجیح دینا بڑی بات ہے۔ میں غلطی اگلی یہ کہ چکا ہوں کہ کھیل کود کے میدان میں بھی ہندوستان کا مسلمان ہندوستان دوستی کا ثبوت نہیں دے پاتا ہے اس سلسلے میں مسلمانوں سے صرف اتنا کہنا ہے کہ پاکستان یا عرب ملک سے ان کو جو ہم دھڑکی ہے اس سے ان مالک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا

البتہ نتیجے میں خود ہندوستانی مسلمان اپنے ہندوستانی پڑوسیوں کی ہم دھڑکی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے وجود کو مستحکم بنا لیتا ہے مسلمان کو سمجھنا چاہیے کہ خون، نسل، فرقہ، یا مذہب سب بعد کی باتیں ہیں پہلی بات دلش ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے مذہب کو حکومت سے الگ کر کے حکومت قائم کی سب کو فائدہ ہوا۔ کون ہے جو ترک کی کامیابی سے انکار کرے۔

س: اگر قدرت آپ کو پھر سے زندگی شروع کرنے کا موقع دے تو آپ کیا بننا پسند کریں گے۔؟

ج: ڈک ٹے ٹر! (بالا صاحب نے برہمہ جواب دیا) مس: کیوں۔؟

ج: یہ گندگی، یہ غلامت، لحد یہ ذلالت جو ہندوستان میں بھری ہوئی ہے یہ جمہوری طریقوں سے مدد نہیں ہوگی، ٹاؤن پلاننگ کی صورت میں جمہوری طرز حکومت مرکز کے راج میں سے مندرجہ بالا کو ہٹنے نہیں دیتی اور ٹاؤن پلاننگ کو نا کام بنادیتی ہے کسی حالت میں ڈک ٹے ٹر شپ ہی ٹاؤن پلاننگ کو کامیاب بنا سکتی ہے یہ تو کہنے کے لئے ایک مثال تھی درحقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جمہوری طرز پر اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔

مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے

سید کا نظریہ تھا کہ انسان انسان ہے اور مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جس کو انسانی معاملات میں مخل نہیں ہونا چاہیے۔ ۱۸۶۵ء میں جب مراد آباد میں زبردست قحط پڑا تو راجا بے کش داس نے سرسید کو پک ایسے ہندو کہ بیمار داری کرتے ہوئے دیکھا جو اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھا اور جس کے رشتے دار بھی اُس کی گندگی کی وجہ سے اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ راجا صاحب کی سرسید سے ملاقات نہ ہوئی تھی بلکہ وہ سرسید کی چند کتابیں پڑھ کر ان کو ایک متعصب مسلمان سمجھ گئے تھے مگر جب انھوں نے سرسید کو ہندوؤں کی ایسی خدمت کرنے دیکھا تو ہمیشہ کے لئے سرسید کے دوست بن گئے۔

کئی سیکڑوں کی ضرورت

جن وہ ہے جس کا اعتراف سوکن بھی کہے شمیم کے مخالف بھی شمیم کے حق تقریر اور حق تحریک معترف ہیں۔ شمیم احمد شمیم تقریباً 35 برس پہلے سری نگر سے 40 میل دور ناسور نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ کثیر کایہ کاؤں کا دیامیوں کی مشہور سستی شمیم نے آئی قادیانی آب و ہوا میں پرورش پائی۔ والد بزرگوار نے بیٹے کو گمراہ ہونے سے بچا جب روکا تو بستی کے ہی دیانوں نے بزرگ بازو اپنی بات منوانا چاہی اور انہوں نے شمیم کے والد محترم کو سماں بانی کاٹ کر داتا بھجورن وہ اپنے اہل عیال کے ساتھ ناسور سے ہجرت کر کے شویان آگئے۔ مذہب کے واسطے نکل کر شمیم احمد بیاں سرور ادب کے دائرے میں داخل ہو گئے اور شمیم غلط اختیار کیا۔ شاعری چوں کر اپنے آپ سے برسرِ سرکار ہونے سے کھینچ پاتی ہے اور شمیم دنیا سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے اس لئے وہ شاعر تو نہ بن سکے البتہ نظمیں اور سچائی ضرور بن گئے۔ کہتے ہیں کہ ہرنی تو پہلے ہی تیر بھگم تھی مگر جب اسے گھونگر پھنار دیئے گئے تو پھر کوئی زدیکھ سکا کہ وہ گدھ کی۔ شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں جب شمیم کو سیاسی تجربے حاصل ہوئے تو ان کی زبان شعلہ نشاں بن گئی۔ ان کے شہنشاہی سان بزرگی گئی مگر وہ پھر ایک بار مذہب کی زد میں آ گئے اور 1947ء کے دلوں میں وہ بھول سے سترہ ہزار کو اپنی قوم کا جات دہندہ سمجھنے لگے لیکن جلد ہی انھیں اپنے بھٹک جانے کا احساس ہوا اور وہ لوٹ آئے۔

سری نگر سے شمیم نے میٹرک کیا اور ایف۔ ایسی سی بھی ادا کی۔ اسے علی گڑھ یونیورسٹی سے ان دنوں وہ فزکس تھے۔ مگر 1956ء میں وہ جب علی گڑھ سے کثیر واپس ہوئے تو کثیر کی سیاست کا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا اور اسی بنا پر وہ حکومت کثیر کے اردو ماہ نامے "تیسرے" کی ایڈیٹر بنادیئے گئے اور پھر وہی برس بعد وہ کل پریل آفیسر مقرر ہوئے مگر ان کے ادا دلوں نے پھر ملٹا کھلایا اور وہ اپنی اس لازمت سے شمیم کو علی گڑھ آئے اور ایل ایل۔ بی کرنے کے بعد انھوں نے سیاست کو قطعی طور پر اپنا اور ہٹا بھجونا بنایا۔ اپنے آزاد سیاسی نظریات کو تقویت پہنچانے اور اپنی سیاسی ذات کو بلند کرنے کے لئے انھوں نے 1963ء میں شری نگر سے ہفت روزہ آئینہ جاری کیا۔ 1967ء کے عام چناؤ میں کثیر آسلی کے لئے منتخب ہوئے اور 1971ء کے عام انتخابات میں وہ پارلیمنٹ کے لئے چنے گئے اور آج وہ ایک کامیاب پارلیمنٹری دیار یا منٹ کے مباحثے میں مہارت رکھنے والے ہیں

مخبر کو محافت میں مہارت حاصل ہے یا فنِ خطابت میں کمال؟ یہ جاننا مشکل ہے۔ اصل وہ ان دونوں خبریوں کے حامل ہیں بل کہ وہ سیاسی دنیا کے منہ بول ہیں، وہ چونکا دینے اور دھمکا پیدا کرنے کے ٹیکہ نگار سے واقف ہیں۔ شیمم پروگرو ہیں، خوش گو ہیں اور منہ بھٹ ہونے کی حد تک صاف گو ہیں۔ اپنے آپ کو منوانے کے فن سے واقف ہیں۔ اپنے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیتے ہیں اور تربیت دینا جانتے ہیں، اپنی شریک حیات کا احترام کرتے ہیں اور اس بات میں انھیں غرض نہیں آتا کہ ان کا کوئی دوست اپنی بیوی کی برائی اُن کے سامنے کرے۔ شیمم انتہائی متواضع انسان ہیں مگر حساس اتنے کہ ان کا کوئی دوست اگر ان کو کبھی نظر انداز کر دے تو وہ اس کو مشکل ہی سے معاف کرتے ہیں۔ شیمم انتہائی روشن خیال، ترقی پسند اور حقیقت شناس قلم کار اور سیاست داں ہیں۔

شے کے

کے طلب گاروں کو معنی میں برناز و نعمت سے محروم کر دیا جائے گا لیکن میرے نزدیک فیروز بن اور زبان کی آزادی بھی ایک بہت بڑی طاقت اور مجموعی اعتبار سے سیاسی طاقت اور اقتدار سے بھی زیادہ محرم، معتبر اور استحکم طاقت، اگر آپ مجھے میری خود ستائی کیلئے معاف کریں گے تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ میں نے اپنے قلم اور زبان کی طاقت سے بارہا اقتدار و اختیار کے الزاموں میں درازے پائے ہیں۔ اور میں اپنے اس رول سے بخوبی لطف اندوز ہوتا ہوں۔ مجھے پستی سے زیادہ بے شکنی میں مزہ آتا ہے۔ اور میں اپنے گلے میں کسی پارٹی کی رنجش ڈال کر اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ منظم مقاصد کے حصول کے لئے فرد کو اجتماع کا حصہ بننا پڑتا ہے اور اقبال کے الفاظ میں قطرے کو گہر بننے کیلئے دیا میں غرق ہونا پڑے گا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ بڑے بڑے سیاسی سماجی اور مذہبی رہنماؤں نے جماعتوں یا تنظیموں کے ذریعہ ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کی ہے۔ اور ہم یا کسی اور نقاد جس دوسرے گزر رہے ہیں اس میں جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی مضبوط یا سیاسی جماعت کا رکن بننے سے میری بہت سی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ اور میں ملک و قوم کیلئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی طبیعت اور مزاج نہیں جاتی۔ بقول علامہ جانا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت اور مزاج نہیں جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ میری افتاد طبع، دراصل میری عمر اور میری خام کاری کی علامت ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں زیادہ حقیقت پسند اور مصلحت شناس ہو جاؤں۔ لیکن جب تک ذہن اور ضمیر پر نگرانی اور تجربہ کاری کا سایہ نہیں پڑتا۔ میں اپنی جوانی کی نادانیوں سے مطمئن ہوں۔

س : آپ کے کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ ہونے اور آزاد بننے میں کیا مصوت ہے ؟

ج : میری حالت ایک ایسے کنوارے کی سی ہے جس سے ہر شخص یہی سوال کرتا ہے کہ اپنے اگلی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اب شادی ایک ایسا مارشل معاملہ ہے کہ ہر شخص کو اعتماد میں لے کر اس کے بارے میں ہر بات ہمیں بتانی جا سکتی۔ اور میرے سیاسی کنوارپن کی بھی کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ ہر کنوارے سے ان کا ذکر مناسب نہیں۔ لیکن آپ کا شمار چوکھڑے میرے مہذب، محرم، معتبر اور مفلس دوستوں میں ہوتا ہے اسلئے آپ سے دن کی بات کرنے میں کوئی مصلحت نہیں۔

بات یہ ہے کہ میں مصلحتی نہیں۔ مغلز آزاد و طبیعت ہوں میں اپنے ذہن اور ضمیر، فکر اور سوچ، اپنے گفتار اور انداز، ہر قسم کی پابندی ماحد کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ اور سیاسی یا قانونی مسئلے میں سب سے پہلے اپنے آپ کو تنظیم پر دوگرام، قواعد و ضوابط، اصول و آداب اور مصلحت کا تابع بنا پڑتا ہے۔ لیکن میری کہنا پڑتا ہے جو پارٹی کی اکثریت کہتی ہے وہی سوچنا پڑتا ہے جو پارٹی والے سوچتے ہیں۔ وہی کرنا پڑتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر آپ کو اپنی انفرادیت کو کھو کر مجرم کا حصہ بننا پڑتا ہے اور جب ایک بار آدمی مصلحت اور تقاضائے وقت کے نام پر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی فیصلہ کر لیتا ہے۔ تو پھر بار بار اس قسم کے نادار سمجھوتے کرنے میں کوئی قیامت محسوس نہیں ہوتی۔ سیاسی جماعتوں کا مقصد جمہوریت، اقتدار کا حصول ہے۔ اور اس مقصد کے سامنے دوسرے تمام مقاصد کی حیثیت ثانوی ہے۔ میں اس مقصد کو برا نہیں سمجھتا۔ اور مذہبی مصلحتیں کا علاج میرا مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ کوئی ایسی ناپسندیدہ شے ہے کہ اس

۱۔ انتخابات کے بعد مسلم اقلیت کے ساتھ کئے گئے وعدے بھلائے جلتے ہیں۔ اور مسلم اقلیت برابر چمک کھا جاتی ہے۔ مسلم اقلیت اپنے مطالبات منوانے کیلئے کون سا جمہوری طریقہ اپنائے؟

۲۔ جب تک اس ملک میں پارلیمانی جمہوریت کا نظام قائم ہے۔ مسلم اقلیت سے وعدے ہوتے رہیں گے۔ اور جس دن خدا نخواستہ اس ملک سے جمہوریت کا جنازہ نکلے گا۔ اس کے بعد سے پھر کوئی جماعت مسلم اقلیت سے کوئی وعدہ نہیں کرے گی۔ وعدہ انگیزی کی بنیاد اور پارلیمانی نظام حکومت کا اہم ترین جز ہے۔ اور اگر ہر جماعت انتخابات کے موقع پر مسلم اقلیت سے طرح طرح کے وعدے کرتی ہے۔ تو اس سے صرف مسلم اقلیت کی سیاسی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ آپ کو شکایت ہے کہ انتخابات کے بعد مسلم اقلیت کے ساتھ کئے گئے وعدے بھلا دیئے جاتے ہیں۔

۳۔ اور مسلم اقلیت برابر چمک کھا جاتی ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا اکثریت کے ساتھ کئے گئے سبھی وعدے پورے کئے جاتے ہیں اور کیا مسلم اقلیت کے ساتھ ساتھ ہندو اکثریت بھی برابر چمک نہیں کھا گئی۔ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی اس ملک کی پچاس کروڑ جیسا کہ ساتھ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ہر صبح اس کے لئے اجداد حسرت اور خوشحالی کا ایک نیا منوان بن کے نمودار ہوگی۔ غربت، افلاس، بے چارگی، بیماری اور بیکاری کا خاتمہ ہوگا۔ ملک سے رشوت تانی، بدعنوانی، فردِ وارِیت، اقتصادِ استعمار اور سیاسی بے امنیوں کا قلع قمع ہوگا۔ یہ وعدے پچھلے ۲۰ برسوں میں کم سے کم ۲۰ لاکھ بار دہرائے گئے۔ ہر بار ملک کی اکثریت نے ان وعدوں پر اعتبار کر کے گناہ گس کو اقتدار اور اختیار سونپا۔ اور اقتدار حاصل ہونے ہی کا گڑبگڑی جتاؤں نے سب وعدے بھلا دیئے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ مسلم اقلیت کے ساتھ ہوا ہے وہ ایک وسیع پیمانے پر ملک کی اکثریت کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اس لئے ہمیں ہمدِ شکنی اور وعدہ خلافی کے اس عمل کو اس کے وسیع پس منظر میں دیکھنا پڑے گا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ سرکاری اور پرائیویٹ ملازمتوں دونوں میں بے امتیاز برتا جا رہا ہے۔

۴۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آئے دن کے فرقہ وارانہ مناسبات نے ان سب ہم محفوظ اور بے اطمینان احساس پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنے ہی وطن میں "اجنبی" نظر آتے ہیں۔

ہنگامہ کشد ہندوستانی مسلمان نہیں

انتخابات میں ان کے ووٹوں کی اہمیت کے پیش نظر سبھی جماعتیں ان سے زبانی ہمدردی کا رنگ الاتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کی بنیادی مشکلات اور مسائل کو حل کرنے کیلئے کسی سیاسی جماعت نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی موجودہ بے بسی اور بے کسی کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت یا محکمات جماعت پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے اور انھیں موجودہ صورت حال کو بدلنے کیلئے خود کو بدلنا پڑے گا۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنی سوچ اور اپنا انداز فکر بدلنا ہوگا۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ پچھلے چار سو سالوں میں مسلمانوں کی ذہنی نگرانی اور سیاسی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے ہندوستان میں کوئی بنیادی فرق محسوس نہیں کرتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اقدار سے کم از کم تیس چالیس برس پیچھے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس مصلح کو پاٹنا ہوگا۔ یہ موقع تفریل سے بات کرنے کا نہیں، لیکن یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بدستور ہوتے حقائق اور بدلی ہوئی دنیا سے آنکھیں لاکر اپنے منصب اور اپنے رول کا دورہ، تمسین کرنا پڑے گا۔ انھیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ انھیں بنیادی مسائل کا سامنا آج ہے کیا وہ صرف مسلمانوں کے مخصوص مسائل ہیں؟ اور کیا سیاسی اور اقتصادی نوعیت کے پیچیدہ مسائل کو "مسلم اقلیت" سے مخصوص اور منسوب کر سکتے ہیں؟ ان کے لئے جس سے یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی کہ آپ یہ آراء خیال اور اہم دشمن مسلمان نے بھی اردو زبان کے ساتھ دوا کر گئی تھی نا انصافیوں و مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال دیا۔ حالانکہ اردو کے ساتھ جتنی زیادتیاں ہوئی ہیں وہ ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک نسل کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہیں۔ اور یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم نے اردو کے مسئلے کو بھی مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ الجھا کر اور پیچیدہ بنا دیا۔ آپ نے پوچھا ہے کہ مسلم اقلیت اپنے مطالبات منوانے کے لئے کون سا جمہوری طریقہ اپنائے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کیلئے جمہوری طریقہ کار کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اور اس ملک میں مسلمانوں کو ضرورتاً جمہوریت سے کوئی دل چسپی ہے یا نہیں مسلمانوں کے لئے آبرو مند اور طریقہ پر زور دہنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اعلیٰ مسلمانوں کی صورت کو محکم بنانے کیلئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے۔

اور اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ مسلم اور ہندو فرقہ پرست جماعتوں کے خلاف منفرد اور ہرگز ملک کی ترقی پسند اور سیکولر جماعتوں میں شامل ہوں۔ اور ان جماعتوں میں اپنا اثر و سوج استعمال کر کے مسلمانوں کو دیش مسائل کیلئے اکثریت کا اعتماد تعاون حاصل کریں مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ وہ اس ملک میں تلوار کی نوک پر اپنا کوئی مطالبہ نہیں منوا سکتے۔ انھیں اکثریت کا اعتماد اور اعتبار حاصل کرنا ہوگا۔ اور خوش قسمتی سے اس ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مسلمانوں سے بھی زیادہ مسلمانوں کے ہم درد اور غم خوار ہیں۔

س۔ اس حقیقت سے شاید آپ انکار نہ کریں کہ مسلم اقلیت میں فرقہ پرستی کا عنصر خوب خوب موجود ہے۔ ظاہر ہے یہ نقصان دہ ہے مگر یہ کیسے دور کیا جائے؟

ج۔ فرقہ پرستی پر صرف مسلمانوں کی ہی اجاب داری نہیں ہے بلکہ ہر ایک اس خباثت میں مبتلا ہے۔ اور صرف مسلمانوں کی فرقہ پرستی دور کرنے کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ پورے ملک کی نفاذ نہیں بدلتی۔ اہم فضا بدلنے میں جتنی ضروری مسلم اقلیت پر مامور ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ ملک کی اکثریت کے رویے پر اس کا انحصار ہے۔ اقلیت کی فرقہ پرستی بنیادی طور پر احساس کمتری، عدم تحفظ کے احساس اور ذہنی —

تعلیق سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی ہریت ترکیبی میں حقیقی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اس کی ہریت ترکیبی میں حقیقی شکلات کے علاوہ فرضی اندیشے اور دھمکی بھی بکثرت شامل رہتے ہیں رفتہ رفتہ وہ گمان کی بنیاد پر حقیقی اور یقینی بن جاتی ہے کہ اس میں بسنے والے اس کو ازل اور ابدی حقیقت سمجھ کر ساری زندگی سالیوں کے حلقہ میں گمراہ رہتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے کہ جہاں فرقہ پرستی طرز فکر کی نہیں، طریق زندگی بن جاتی ہے۔

اور انسان موسموں کے تغیر و تبدل کو بھی فرقہ پرستی کی بینک سے دیکھنے لگتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی فرقہ پرستی بد قسمتی سے اب اپنی سرحدوں میں داخل ہونے لگی ہے۔ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے دانش ور طبقے نے مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر کے اس صورت حال کو بدلتے کی کوئی

کوشش نہ کی تو ہندوستانی مسلمان ایک زندہ حقیقت کی بجائے ایک تاریخی داستان کا حصہ بن کر رہ جائے گا۔ صحت مند اور ترقی یافتہ سماج میں فرقہ پرست سیاست کو کبھی بھی پسند ہرگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور ہندوستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کے سب سے زیادہ نقصان یہاں کے مسلمانوں کو پہلے سے ملک کی تقسیم سے پہلے فرقہ وارانہ سیاست کیلئے کوئی جواز تھا انھیں اس پر بحث کی گنجائش ہے اور اس سے تعلق دورائیں ہو سکتی ہیں لیکن تقسیم کے بعد مسلمانوں کیلئے فرقہ وارانہ سیاست زہر قاتل سے کم نہیں ہے اور مجھے حیرت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نام نہنا لیڈر اپنی لیڈری کی ہوس میں اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں مسلمانوں کی نئی نسل کو صرف جماعت اسلامی سے ہی نہیں ہر فرقہ پرست جماعت سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ہندوستانی مسلمان فرقہ وارانہ سوچ کی "عیاشی" کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ فرقہ پرست جماعتوں کے زہر سے مسلمانوں کی نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لئے ہندو اکثریت کو مسلمانوں کے تئیں اپنے رویے میں خوش گوار تبدیلی پیدا کرنا ہوگی۔ اسے مسلم اقلیت کے اندیشوں کو دور کرنا ہوگا۔ اور ان میں اعتبار اور اعتماد کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ روشن دماغ، ترقی پسند اور برل ہندوؤں کے اشتراک کے بغیر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کا ذہن صاف نہیں ہو سکتا۔

اس طرح تسلیم یافتہ دور اندیش اور سیکولر طرز کے مسلمانوں کو تنگ نظر اور جماعت پسند طاؤں کے سامنے اختیار ڈال کر گوشہ نشینی اختیار کرنے کے بجائے مسلمانوں کی سیاسی سماجی اور مذہبی اصلاح کا بیڑہ اٹھانا چاہیئے۔ اس ملک کو اس وقت کئی سرسیدوں کی ضرورت ہے۔ لیکن بد قسمتی سے سرسید مرحوم جیسا ایک بھی شخص مسلمانوں میں آج موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ ان کی فرقہ پرستی ان کی تنگ نظری اور ان کی عظیم گدگد پنڈی سب سے زیادہ ان ہی کو۔ نقصان پہنچائے گی اور ملک کی ہندو اکثریت کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ملک کی اتنی بڑی اقلیت کو ترقی کی دوڑ میں پیچھے چھوڑ کر یہ ملک آگے نہیں بڑھ سکتا۔

سُورِح کلا زخم

نام حمید عمر خان والی نام دلوالی، وطن چیلپان، ضلع رتناگری، بہار، ۱۹۵۲ء میں میٹرک کرنے کے بعد حمید سبھی آگے
 ریوے میں ایک سڑک کی جھٹ سے ملازم ہونے ایک پرائیویٹ ٹیکسٹائل فیکٹری میں بھی ملازمت کی اور کچھ عرصے میں ٹرانسپورٹ کے کام بھی کیا۔
 کیا۔ جب سیاست سے دل جیسی پیدا ہوئی تو حمید دلوالی سوشلسٹ لیڈر بن گئے اور جموں کی راشٹرپریہ سبھا میں بھی شامل ہو گئے۔ اور مراٹھی
 اخبارات میں اکثر سیاسی مضامین لکھنے لگے۔ اور پھر وہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک اترے کے مراٹھی روزنامے 'مراٹھا' میں اسٹنٹ
 ایڈیٹر رہے۔ اسی اثنا میں انہیں ایک سرسبز بڑے کی ہدایت پر مسلم معاشرے کے حالات جاننے کے لئے ہندوستان کا دورہ
 کیا اور کراچی پرائیڈین سیکولر سوسائٹی کی بنیاد رکھی مگر اس سوسائٹی سے مسلمانوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی، تب انھوں نے مسلم ستر
 شو دھک نام کی ایک جماعت قائم کی۔ دراصل یہ ایک مسلم ری فاریسٹ تحریک ہے۔ اسی تحریک کے تحت پانچ مسلمان عورتوں کی
 ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ مسلم پرسنل قانون میں ترمیم کی جائے۔ چیلون میں بھی مسلم خواتین کا ایک میلان لگا
 جس میں نوے نائندہ مسلم خواتین نے شرکت کی اور انھوں نے ایک سال سولی کوڑا کا مطالبہ کیا۔ مسلم۔ شو دھک ہی کی جانب
 سے ۱۹۷۳ء میں آنکھ کشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس کے ذریعے اسکولوں میں مراٹھی زبان کو میڈیم بنانے پر زور دیا گیا اور
 کہا گیا کہ اردو کو اختیار دی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اسی جماعت کی جانب سے دو جریڈے بھی جاری ہیں۔ ایک انگریزی ماہ نامہ
 'سکولسٹ' اور دوسرا مراٹھی سرماہی مسلم ستر شو دھک پتریکا!۔

جناب حمید دلوالی کا ایندھن، نام کا ایک ناول اور ڈراما، نام کے انساؤں کا ایک مجسمہ بھی مراٹھی زبان میں شائع
 ہو چکا ہے، حکومت بہار اسٹرکٹ کی جانب سے اس ناول پر انعام لی چکا ہے۔

در اصل سماجی مسائل کا تعلق علاقے سے ہو سکتا ہے یا پھر سے، فرقے سے بلکل نہیں
 ہو سکتا اس لئے مسلمان اگر اپنے روز کا کسی پرالم حل کرنا چاہتے ہیں
 تو وہ سب کے ساتھ مل ہی کر مل ہو سکتے ہیں۔ روزی حاصل کرنے کے لئے
 دوسرے جس طرح کو سناں میں مسلمانوں کو بھی اسی طرح کوشش کرنا چاہیے
 حکومت کی دی ہوئی سہولتیں بھی سب کے لئے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی سب کے
 ساتھ اُن سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اکثر اوقات یہ آواز اُٹھتی ہے کہ سارے مسلمان ایک ہی بیلٹ فارم
 پر اکٹھے ہو جائیں۔ سارے مسلمانوں کا ایک ہی جماعت میں آجانا ممکن
 نہیں ہے۔ فرقہ بندی، ایسا ہو بھی جائے تو وہ کون سے مسائل ہوں گے
 جو ہمیں طور پر مسلمان حل کرنا چاہیں گے۔ اگر ایک جماعت بنا کر وہ
 اپنے سماجی مسائل حل کرنا چاہتے ہیں تو سماجی مسائل سب کے لئے یکساں
 ہیں، ہندو ہر مسلمان کے ہر ایسا ہی روزی کا مسئلہ سب کے لئے ایک مسئلہ ہے۔

مسلمانوں کے مذہبی مسائل ضرور اُن کے اپنے مسائل ہیں مگر ان مذہبی مسائل کو حل کرنے کے لئے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی ضرورت نہیں ہے مذہبی باتوں کا تعلق چوں کہ جذبات سے ہوتا ہے اس لئے اور ضروری ہے کہ دوسرے فرقوں کی مخالفت سے بچا جائے اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی حمایت حاصل کی جائے اور اپنی کھول بنائی جائے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں مسلمان صرت تیرا پودانی صدی ہیں اور ہمارا شتر میں صرت ساڑھے پانچ فی صدی۔ ایسی حالت میں کیا وہ اکثریتی فرقے کے سامنے اپنا کوئی عہد بنا کر اپنی بات منوا سکتے ہیں؟ یہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی اپنی کوئی پارٹی دوسرے فرقوں کے لئے استعمال کا باعث بنتی ہے میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سال ساشی ہوا یا ساشری سیاسی ہوں یا مذہبی وہ دل چاہ کر ہی حل ہو سکتے ہیں۔ جیسلمج دے کر نہیں۔ اور درحالیہ کہ ہندوستان ہی اپنی بات منوانے میں سادہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان بھی دوسروں کی طرح کسی بھی سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کے لئے آزاد ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ مسلم لیگ جماعت اسلامی یا ترمیمیت جیسی کوئی فرقہ پرست پارٹی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان جس پارٹی میں شامل ہو، شامل ہونے سے پہلے وہ اُس پارٹی کے اغراض و مقاصد، مزاج و مبہجان کو خوب سمجھ لے اور پھر اُس پارٹی میں ایک ایسی کیفیت سے رہے مسلمان کی حیثیت سے نہیں لیکن کانگریس پارٹی میں اُس کو کانگریس ہونا چاہیے اور کیونٹ پارٹی میں کیونٹس۔ یہ بات میں اس لئے کہ رہا ہوں کہ کچھ مسلمان سوچے سمجھے بغیر سوتنتر پارٹی میں شامل ہو گئے تھے مگر جب مصر اور اسرائیل میں جنگ شروع ہوئی تو انھوں نے سوتنتر پارٹی کو خیر باد کہہ دیا حالانکہ یہ بات پہلے ہی سے دھکی چھی نہیں تھی کہ سوتنتر پارٹی اسرائیل کی طرف دار ہے۔

اُدھی ٹرنگلن تانا چاہتے ہیں کہ قومی دھارہ کیا ہے۔ اور مسلمانوں کے سلسلے میں میرا شورہ کیا ہے۔ جو دراصل بنیادی طور پر ایک قوم کا نظریہ یا ایک قوم کا تصور قائم کر لینا ہی قومی دھارے کے ساتھ جیلنا ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مذہب کی بنیاد پر اپنے آپ کو ایک الگ قوم

نہ سمجھیں بلکہ وہ اپنے اس ملک ہندوستان کو ایک قوم خیال کریں یعنی یہ ہندوستانی قوم ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی جیسے، بدھ وغیرہ کہتے ہی فرقوں پر مشتمل ہے کسی کے لئے بھی اپنے علاقے کو ملحوظ رکھنا برا نہیں ہے۔ مگر علاقے کے مفاد کو ملک کے مفاد سے ٹکراتا نہیں چاہیے۔ یعنی علاقے کی بہ نسبت ملک کا مفاد اور فرقے سے زیادہ قوم کا مفاد اہمیت رکھتا ہے۔

تعبیب کی بات تو یہ ہے کہ غیر ملکی مسلمانوں کا مسئلہ تو ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مگر ہندوستان باشندوں کے کسی بھی مسئلے سے ہندوستانی مسلمان کوئی دلچسپی نہیں لیتے، ہمہکت ہمارا شتر کی تحریک سے ہمارا شتر کے مسلمان بکلی الگ رہے۔ کچھ دنوں دیوبند ہڑتال سے بھی انھوں نے کوئی بل چسپی نہیں لی غرض کہ ہر قومی تحریک سے مسلمان الگ تھلگ رہتا ہے۔ مگر جب پرشاد بننا ہے تو پرشاد لینے کے لئے مسلمان سب سے آگے نظر آتا ہے میرا شورہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان جن برابر اور کھابرا بر کے نظریے پر عمل کریں۔

فلسطینی مسلمان مظلوم ہیں مجھے اُن سے ہمدردی ہے، اُن پر ظلم کرنے والے یہودیوں کی میں بڑی مذمت کرتا ہوں اور اسی طرح مجھان بنگلہ دیشیوں سے بھی ہم دردی پیدا ہوئی تھی جزیرہ پاکستانی قومی نے ظلم دھکا دیا مگر اس بات کی کیا وجہ تھی کہ مظلوم فلسطینیوں کے لئے تو ہندوستانی مسلمان زار و قطار رو رہے مگر جب بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر کوئی ستم توڑتا ہے یا دیت نام کے انسانوں پر ہم باری کرتا ہے تو وہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتا اس سلسلے میں بھی میرا ہی کہنا ہے کہ ظالم اپنا ہم مذہب ہو یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو قابل مذمت ہے۔ ظلم اپنے سے ہوا یا غیر سے ہر صورت ظلم ہے اور کسی بھی صورت میں اُس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ مسلمانوں میں مدرٹیر کی طرح عوام کی سیرا کرنے والے کیوں نہیں پیدا ہوتے جس طرح عام کرشن آشرم میں ہر کسی کو شرن بل سکتی ہے مسلمانوں کا ایسا کوئی ادارہ کیوں نہیں جو سب کو سنا دے، مسلم کو بھی اور غیر مسلم کو بھی۔

ہر دوسرے دوسرے ہیں، دنیا کے کسی نہ کسی مسلم ملک میں اسلامی

۲۸ فرانس مستعد ہوتا ہے، اور ہر کان فرانس میں مسلمانوں کے تحفظ کے لئے زور دیا جاتا ہے کہ مسلم ممالک میں اتحاد و اتفاق قائم ہو جب اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے تو پھر انسانیت کی حفاظت کے لئے غور کیوں نہیں کیا جاتا اور کس بات پر زور کیوں نہیں دیا جاتا کہ سارے عالم میں اتحاد قائم ہو۔ آخر یہ مسلمان ادارے دوسرے انسانوں سے اتنے بے نیاز کیوں رہتے ہیں۔ اور اسلام میں انسانی جنبہ کی تہن کی کیوں ہے؟ جی ہاں! کہنے کو یہ بات بھی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کے عمل سے اسلام کو نہیں ناپا جاسکتا مگر میرا کہنا یہ ہے کہ جس طرح عیسائیوں کے بڑاؤ سے حسانت کا پتہ چلتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے عمل سے اسلام کو پکھا جائے گا۔

بہر حال! میرا مشورہ یہی ہے کہ مسلمان اپنے سیاسی شعور کو بے وار کریں اور ملک کی جو غیر فتنہ دارانہ اور جہودی سیاسی پارٹیاں ہیں ان میں شامل ہوں اور انہیں پارٹیز کے توسط سے اپنے مسائل حل کریں مگر مسلمان بن کر نہیں بل کہ اپنی پارٹی کا ایک ہندوستانی کریں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے مذہبی مسائل پر زور دینے بل کہ اپنے اقتصادی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ مذہبی مسائل کے حل ہونے یا نہ ہونے سے مسلمانوں کی انفرادی یا اجتماعی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مسلم فتنے کے بگڑنے یا سنورنے کا سامنا دار و مدار اقتصادیات ہی پر ہے۔ اپنی اقتصادی حالت سدھارنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زراعت، صنعت و تجارت اور تجارت کی جانب توجہ دیں، اند اس سلسلے میں اس کی بہترین سامٹی فیک ہو۔

یہ عام لکھائیت ہے کہ مسلمانوں کو لازمت نہیں ملتی، یقیناً اس کو لازمت لانا ہی نہیں چاہیئے اس لئے کہ مسلمان نوجوان ری سرچ کرتا ہے غالباً یا اقبال کی شاعری پر اور لازمت چاہتا ہے بیک ہیں۔ اس کی آپرودچ نہ صنفق ہوتی ہے نہ سائنسی، پھر آج کے صنعتی دور میں اس کو لازمت کون دے۔ مسلمان نوجوان کامریج لو کہیں سے ہاشخانہ ہوتا؟ اور اس مزاج کے قدردان تھے واجد علی شاہ یا مہار شاہ۔ انھوں! اس جہوری جدید میں ایسے تھردادوں کا اب گزر نہیں۔ چنانچہ آج کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ شکوے شکایات نہ کریں بل کہ کام کریں

گلن کا ہندوستانی ملان شیر

اور سب کے ساتھ مل کر کام کریں۔

اس بات پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ بعض مسئلے علاقائی ہوتے ہیں اور بعض ملک گیر۔ مسلمانوں کا اپنے ہر مسئلے کو ہندوستان گیر بنا دینا درست نہیں۔ جیسے مسلم ریپورٹوں کا مسئلہ اتر پردیش کے علاقے کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ سارے ہندوستان کا نہیں۔ اسی طرح اُردو زبان کا مسئلہ صرف اتر پردیش اور بہار سے تعلق رکھتا ہے دوسرے علاقوں سے اس مسئلے کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ کسی ایک علاقے کے کسی مسئلے کو اٹھا کر سارے ملک میں انتشار پیدا کرنا بھی بات نہیں۔

مختصر طور پر مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ سارے مسلم اوقات کو سرکاری کنٹرول میں آجانا چاہیئے تاکہ سرکردہ روپے کے اوقات سے دس کروڑ روپے سالانہ کی جتنی مدد ملتی ہوئے ہے وہ اس کو ان اور صنعتی اور ٹیک نی کل اداروں، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش و تعلیم پر صرف ہو اور مسلمان اپنے اوقات سے جائز اور درست فائدہ اٹھا سکیں۔

مسلمان اپنی عورتوں کو برابری کے حقوق دیں اور یہ بات نہ ہی ممکن ہو سکتی ہے جب وہ ایک ساں سول کوڈ کو مان لیں۔

مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے سارے ماننے والے مسلمان ایک قوم نہیں ہیں بل کہ وہ مختلف قوموں میں جٹے ہوئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک قوم مختلف فرقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ قومی اتحاد چٹان اور دوسرے طریقوں سے ممکن ہے۔ وہاں انٹریکٹو میسج (دین مذہبی شادی) بھی قومی اتحاد کے لئے ایک اچھا ذریعہ ہے۔

اُردو زبان کے سلسلے میں بھی میرا یہی کہنا ہے کہ مسلمان اُردو کے معاملے کو اتنا زیادہ گھبر نہ بنائیں اور نہ اس سلسلے میں ان کو زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ خوب سمجھ لیں کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملے گا۔ ہر ریاست میں انٹرنیٹ کی مادری زبان ریاست کی سرکاری زبان ہوگی۔ اور ہندی پہلے ہی سے قومی زبان ہے اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ہندی سیکھیں اور ریاست کی سرکاری زبان۔ ورنہ وہ پہلے سے بھی زیادہ پھپھڑ جائیں گے۔

جی ہاں! مسلمان مجھ سے بدگمان ہیں اور میں مسلمانوں کے لئے
 ایک ناپسندیدہ شخصیت ہوں۔ سبب واضح ہے۔
 اک آئینہ میرا ہلے بیٹھا ہوں
 جس میں ایسا ہے کہ ہر شخص مرادے مجھ کو
 میں مسلمانوں کے سامنے بھوٹ بولی کر رہا ہوں کہنے کے لئے تیار نہیں
 کہ ان کا سامنے بہت شاندار ہے۔ میں اعلانیہ طور پر کہتا ہوں کہ ان
 کا حال برا اور کدوہ ہے جب کہ ان کو اپنی برائی کرنے کی طاقت نہیں
 اب تک ان کے ہر لٹے لٹے ان کی ساری غلطیوں کا ذمہ دار دوسروں کو
 کرتا رہا ہے۔ شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے مسلم فرقہ پرستی پر پے

دہ پے ضربیں لگائی ہیں۔ اور اعلانیہ حملے کئے ہیں۔ اور مسلمان بادشاہوں
 کی عیاشیوں اور غیر جمہوری طور پر نفوذ کا پردہ فاش کیا ہے۔ اب
 ظاہر ہے کہ نادان مسلمان مجھے اپنا دوست کیوں سمجھے گا۔ مگر مجھے
 مسلمانوں سے اور مسلمانوں کے ہر جائز کام سے ہمدردی ہے۔ یہ وقت
 دور نہیں ہے کہ مسلمان جن پر تکیہ کئے ہوئے ہیں وہی ان کو چھوڑ دینے
 اور ان کو کان لپٹا پڑے گا کہ ان کے بچے حافظہ وہ ہیں بلکہ ہم ہیں
 آج کا مسلمان اگر ہماری سہائی کو تسلیم نہیں کرے گا تو آئندہ نسل ہمارا
 قومی خدمات اور مٹی دہائی کا اعتراف ضرور کرے گی۔

دُنیا کے مسلمان

600 ملین

1	شمالی امریکہ	41000	ایک لاکھ
2	اوشیانا	11800	
3	جنوبی امریکا	50000	
4	برطانیہ	100000	ایک لاکھ
5	افریقا	103000000	10 کروڑ 30 لاکھ
6	مشرقی یورپ	13576000	1 کروڑ 35 لاکھ 76 ہزار
7	سوئٹیزین	24000000	2 کروڑ 40 لاکھ
8	مغربی ایشیا	113000000	11 کروڑ 30 لاکھ
9	پاکستان	55000000	5 کروڑ 50 لاکھ
10	چین	28000000	2 کروڑ 80 لاکھ
11	بنگلادیش	72000000	7 کروڑ 20 لاکھ
12	ہندوستان	61400000	6 کروڑ 40 لاکھ
13	روس	821672	8 لاکھ 21 ہزار
14	ملائیشیا	4500000	45 لاکھ
15	فلپائن	1732800	17 لاکھ 32 ہزار
16	انڈونیشیا	121000000	12 کروڑ 10 لاکھ

ترقی۔ قلت خرچ سے ممکن ہے کثرت آمدنی سے نہیں

محبتِ مہرِ صورت ہی سے نہیں برقی، انسان جس سے بھی اپنا دل نکالے وہی محبوب — حافظ صاحب کو بھی اپنے کام سے عشق ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے!

اُن کا اچھا سا نام محمد یوسف ہے۔ دہلی کے شہر تجارت پیشہ نرے پنجابیان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے والد مرحوم شیخ محمد یعقوب اپنی برادری کے باعزت اور مالوگوں میں سے تھے۔ 6 دسمبر 1904ء کو حافظ صاحب پیدا ہوئے۔ دہری برس کے تھے کہ ماں کی وفات ہو گئی۔ سو تلے ماں نے مشرقی مزاج کے برعکس اُن کو بہت ہی پیار و محبت سے پالا اور تعلیم دلائی۔ 14 برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور پھر چوڑے کے آبائی کاروبار میں اپنے والد صاحب کا ہاتھ بٹانے لگے۔ 1921ء میں شادی ہوئی اور 1924ء میں مشفق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اگرچہ سوتیلی ماں اپنے غل سے حقیقی ماں ثابت ہوئی تھیں۔ مگر نانا جان جس معافی میں سوتیلے ثابت ہوئے۔ ہرادر جانے داد کا مطالبہ اُنہوں نے کچھ اس طرح کیا کہ معمولی سی بات نے بھی گڑھے کی صورت اختیار کر لی۔ حافظ۔ جب نے نفرت کا جواب محبت سے اس طرح دیا کہ جائے داد کے تقسیم ہونے پر جو کچھ اُن کے حصے میں آیا وہ اُس سے بھی اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کے حق میں دست بردار ہو گئے اُن کی اس درباری پر اُن کے نانا جان کو بھی دلِ شش کن حیرت ہوئی۔

1937ء میں ریشی اہلیہ کی بیماری کے سلسلے میں حافظ صاحب کو دو برس تک ہر دلی میں رہنے کا اتفاق ہوا اور وہیں سے انہوں نے دسمبر 1939ء میں ماہ نامہ 'شیع' جاری کیا، ایک پرچے کی قیمت چھ آنے تھی اور سالانہ قیمت ایک روپیہ۔ لیون تو یہ رسالہ وقتِ گذاری کے لئے نکالا گیا تھا مگر جب ایک ہی برس میں تعداد اشاعت 6 ہزار تک پہنچ گئی تو حافظ صاحب اپنے آبائی کاروبار کو ترک کر کے 'شیع' کی جانب سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔ پہلے میں چند رادن شہر دہلی میں گھر گھر کر بھینسیا قائم کئے اور چند رادن گھر گھر کر رسالے کی اشاعت کا انتظام سنبھالنے لگے 1946ء میں 'شیع' کی اشاعت جب 25 ہزار ہوئی تب باقاعدہ ایک دفتر بھی قائم ہو گیا۔ جون 1951ء میں 'شیع' کی تعداد اشاعت جب 51 ہزار تھی تب حافظ صاحب کے بڑے صاحبِ قلم جہاں یونس دہلوی نے شیع سے شروعات کئے۔ ماہنامہ شیع کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی تعداد اشاعت ایک لاکھ تیس ہزار تک ہی ہے اور اردو کی دنیا میں یہ ایک ریکارڈ ہے۔

اچھے خان دان ہیں سطر اور زندگی کے انیک تجربوں نے حافظ صاحب کو ایک کڑھابو انسان بنا دیا ہے اسی لئے انہوں نے امیر اندرز اور دعا گیت کو اپنے دل و دماغ پر کبھی غالب آنے نہیں دیا۔ اُن کو دیکھ کر، اُن سے مل کر تو فیاض خیال دل میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ قدرت ہم کو بھی انہی جیسی بزرگی اور بڑائی عطا کرے۔ — شیع کے

آج کے ہندوستان میں حافظ صاحب کا شمار صفِ اول کے کامیاب مسلمانوں میں ہوتا ہے اور اپنے میدان میں وہ کامیاب

گلن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

ترین انسان ہیں۔ اسی لئے ایک ملاقات میں میں نے اُن سے چند سوالات کیے تاکہ اُن کی بتائی ہوئی تجربہ شدہ باتیں ہم سب کے لئے اور خصوصی طور پر مسلمانوں کی نسل کو سکے لئے مفید ثابت ہوں۔
سے : اُردو رسالے کو کامیاب بنانے میں کن کن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے ؟

ج : رسالے ہی کو کامیاب بنانے کا سوال نہیں ، کسی بھی کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے ایمان داری ، محنت ، لگن اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ میں یہ مانتا آیا ہوں کہ کار بار کثرت آمدنی سے نہیں بلکہ قلتِ خرچ سے ترقی پاتا ہے۔ اسی سلسلے میں آپ کو برسوں پہلے کا ایک واقعہ متاؤل کہ میں جب دہلی سے دہلی سے منظور کرانے کے لئے الہ آباد گیا تو جس دلی الہ آباد پہنچا اتفاق سے وہ اتوار کا دن تھا ، دہلی کا آؤں بندھا میں دن بھر شہر میں گھومتا رہا اور شمع ہی سے متعلق دوسرے کام انجام دیتا رہا رات ہوئی تو کبھی ہٹل میں نہیں بلکہ شہر کی سرائے میں پہنچا جس کا نام گھوڑے والی سرائے تھا معلوم ہوا کہ ایک آنہ کی کھاٹی رات کرایہ ہے۔ میں نے چار پیسے ادا کئے۔ اپنی شیردانی آٹاری کھڑکی چارپائی پر سرہانے رکھ کر سو گیا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ضرورت ہو تب ہی اور جتنی ضرورت ہو اتنا ہی خرچ کیا جائے۔ فضول خرچی کا رد بار کو بری طرح متاثر کرتی ہے ، کفایت شعاری ہر پہلو سے ہونی چاہیے۔ شروع شروع کی بات ہے کہ میں شمع کے پرچے اپنے کندھے پر رکھ کر ڈاک گھر لے جایا کرتا تھا ، اپنا کام آپ انجام دینے میں میں نے کبھی شرم نہیں کی چنانچہ ایک بار میرے ایک بھائی نے مجھے کوٹھکا : تم جو کندھے پر یہ پرچے اٹھائے پھرتے ہو اس سے تم کو نہ ہی مگر مجھ کو شرم آتی ہے۔ ہم باعزت اور خوش حال لوگ ہیں کم سے کم تم کو اس بات کا تو خیال رکھنا چاہیے !۔ میں اپنے بھائی کی یہ بات سن کر مائل گیا۔ برسوں بعد جب پاکستان میں ہم دونوں ملے۔ تو انھوں نے میرے پاؤں پکڑ کر مجھ سے کہا : مجھے غمزہ ہے کہ تم میرے بھائی ہو ! میرا اپنے بھائی کے لئے باعثِ فخر ہونا دراصل یہ میری محنت کا انعام ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ پھر 2 روپے کے سرائے سے شمع شروع کیا گیا تھا اور آج جو کچھ بھی ہے وہ خدا

کی ہر باری کے ساتھ ساتھ محنت اور عصبِ حر کے چار مولے پر عمل کرنے ہی سے ہے۔

جو چاہت پر نکلے۔ پرچے کی کامیابی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے ، شمع ہی کے سلسلے میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں آٹھ ماہ ایس آٹھ ماہ گھٹے کر کسی پر بیٹھا رہا ہوں اور کتابوں کو سامنے بٹھا کر کتابت کا کام کام مکمل کر آیا ہے۔

سے : ہر کار بار میں اکثر کٹھن مڑاتے ہیں ، آپ بھی کبھی اپنے کار بار کے سلسلے میں کسی آزمائشی دور سے گزرے ہیں ؟
ج : جی ہاں ! کار بار میں مالی پریشانیوں کو اکثر پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ ہمارے ادارے نے فلم دستری پوشن کے سلسلے میں 50 ہزار روپیہ لگایا تھا 15 لاکھ کا فائدہ ہوا۔ مگر آگے 2 لاکھ روپے کا نقصان ایک بار ہوا۔ اور آٹھ لاکھ کا کھاک مار۔ اُن دنوں دفتر پر بھی 2 لاکھ روپے کا قرض چڑھ گیا تھا مگر میں نے خدا کی ذات پر بھروسہ رکھا ، ہمت نہیں ہاری ، بدل نہیں ہوا مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرتا رہا اور خدا کا شکر ہے کہ حالات نابلو میں آگئے۔
سے : (حسین عورت اور کامیاب مرد کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے خد کا کا نشانہ بنتے ہیں مگر جو لوگ فطرتاً نیک ہوتے ہیں برے لوگ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جیسے صندل پر دھواڑ نہیں کرتا حالانکہ سانپ اُس پر لیٹ رہتے ہیں) آپ کی ذات اور آپ کے کار بار کے خلاف اکثر لکھا جاتا ہے اپنے خلاف پڑھ کر یاس کر آپ کا رد عمل کیا ہوتا ہے ؟

ج : مجھے خشتی ہوتی ہے اس لئے کہ میرے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے یا کہا جاتا ہے۔ وہ حدودِ لفظ کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں میرا عقیدہ ہے اور تجربہ بھی کہ کسی کے بُرا جانے سے میرا بھلا ہوتا ہے یعنی میرا کار بار اور بڑھ جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی درست طور پر اور دیانت داری سے مجھ کو برا کہے تو مجھ کو نکر بھی ہوا اور میرا روزگار بھی متاثر ہو۔ اس سلسلے میں اُستادِ وقت کا ایک بہت ہی اچھا شعر ہے ۔

جو خد کسی کو تجھ پر ہو ، تو ہے یہ تیری خوبی

کہ جو تو نہ خوب ہوتا ، تو وہ کیوں حسود ہوتا

س : آپ کے خلاف دوزبان کا مستقبل روشن ہے یا

ج : اردو کا مستقبل روشن ہے۔ اردو تفکری زبان ہے۔ سب کی زبان ہے۔ اس لئے اردو کو بھی زبانیں ہر سطح پر ہمارے ادارے سے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں پہچے شائع ہوتے ہیں اور آج بھی تعداد اخراجات کے اعتبار سے اردو زبان کے پہچے زیادہ کامیاب ہیں۔ اور اب تو حکومت بھی اردو کی جانب متوجہ ہوئی ہے۔ اس لئے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

س : (خیال داری کا چاہا جنگ کے چاد سے کم ٹھنیں نہیں ہوتا۔ ہی لئے صالح اولاد۔) نیربہ اور یا بولہ، آپ کے سینہ نے آپ کے کام میں بھی صلاح و مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ سعادت مند اور باادب بھی ہیں۔ پستے پوتیوں کا بھی یہی حال ہے یہی نہیں بل کہ غیر گھروں سے آئی ہوئیں آپ کی ہوئیں بھی آپ کا بہت زیادہ پاس دلچاط کرتی ہیں۔ آپ نے اس صوبہ کو تربیت دینے میں کس بات کا خیال رکھا۔

ج : اپنے گھر کا بڑا ہونے کی حیثیت سے میں نے اپنے گھر میں اپنی محنت اور شفقت سے کسی کو محروم نہیں رکھا۔ جہاں میرے بیٹوں نے میرے بھائیوں سے کام لیا وہاں کا غلط پر میں نے بھی ان کو سب کے لئے نصیحت کی نہیں کی۔ جب بھی میں نے ان کو کوئی بات بھائی بھینہ بھائی میں بھائی اور نصیحت کر تھنفت اسے لب و لہجہ کو نرم ہی رکھا۔

س : قسیم ہند کے بعد بہت سے کاروباری مسلمان خصوصاً بر آپ کی پنجابی بھادری سے تعلق رکھنے والے تاجر پاکستان چلے گئے مگر آپ نے پاکستان مستقل ہذا کیوں نہیں چاہا۔

ج : جی ہاں یہ درست ہے۔ ملک کی قسم کے بعد میرے پیڑھی بھی پاکستان گئے اور بہت سے میرے عزیز رشتے دار بھی۔ مگر مجھے تو اپنے اس دیس سے محبت ہے، میں نہیں پیدا ہوا ہوں اور یہیں مردوں گا۔ میں نے تو اپنے بچوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ تم پاکستان میں اگر بسنا چاہتے ہو تو پاکستان جاسکتے ہو مگر میں تو ہندوستان ہی میں پیدا ہوا۔ آپ کا یہ بہت درست ہے کہ ابتدا میں جو لوگ دہاں گئے وہ کاروباری طور پر کامیاب بھی رہے۔ مگر میں تو ہندوستانی ہی

ہنگوئے ہندوستانی مسلمان احمد

میں رہ کر کام پائی حاصل ہوئی ہے۔ جب پاکستان بنا تو شیعہ، کٹھنہ اشاعت 2 ہزار تھی اور بعد میں یہ تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تک پہنچ گئی۔

س : آپ ہمارے بزرگ ہیں، ہمارے محترم ہیں اور آج آپ جہاں دیکھ، تجربہ کار اور دیکھ کامیاب انسان کی زندگی بسر کر رہے ہیں، براہ کرم بتائیے کہ آج کا ہندوستانی مسلمان اپنی زندگی کو خوش حال کیسے بنائے؟ آپ کا جواب مسلمان کے لئے مشکل راہ ثابت ہوگا۔

ج : اگر محنت، ہمت، مستقل مزاجی اور لگن کے ساتھ کام کیا جائے دیانت داری کا دامن ہات سے نہ چھوڑا جائے تو اللہ کا فضل شامل حال رہتا ہے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں اللہ کام پائی خود بخود کرم چوم لیتی ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ محنت کرے۔ مستقل مزاجی سے ہمارے رکاوٹ کا پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ بغیر حشر ج نہ بنے، جو رسینے۔ کامیاب ہونے پر اپنے تکلیف دہ مانگنا کہ ہمیشہ یاد رکھے اور ترقی و دولت پا کر مغرور بھی نہ ہو۔ نہ کسی کی کام پائی پر اُس سے حسد کرے اور نہ اُس کی ترقی میں رکاوٹ بنے ہی کہ یہ دھیان میں رکھے کہ ہر ایک اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنے اس ملک سے محبت کرے اس کی حفاظت کرے اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ بین اس ملک کی ترقی اس کی اپنی ترقی ہے۔ اللہ اس ملک کی بقاء اس کی اپنی بقا ہے۔

میں ہندوستانی مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ جب تک تم ہندوستانی نہ بنو گے،

نہ تمہاری اپنے ملک میں عزت ہوگی اور نہ اسلامی ملکوں میں تمہیں احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

عَبْدُ اللّٰہِ سَندھئے

قومی یک جہتی

کنور صاحب گرو نانک کی 14 ویں پشت میں سے ہیں۔ ان کے جدا جدا چار سسر بابرکیم سنگھ، واسن لائے کی ایگزیکٹو کے سربراہ، اندیشہ کر پنجاب کے سب سے زیادہ دولت مند انسان تھے۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں کنور صاحب نے اپنے وطن عزیز کے ساتھ اپنی 22 کروڑ روپے کی جائے دار بھی چھوڑی۔ پنجاب کی بول سروں سے کنور صاحب کی طرہت کی ابتدا ہوئی۔ پنجاب کے کئی اضلاع میں ڈپٹی کمشنر رہے، چارٹرڈ ٹیکسٹائل اطلاعات بھی رہے اور ایک مدت تک دہلی میں بھی ٹی بٹریٹ رہے اور اب ریٹائر ہوئے کے بعد ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ درجنوں سماجی اداروں کے سرپرست، نگماں، اوکس برادہ ہیں۔ اپنی اردو شاعری، مشاعروں کی نظامت و صلاحت کی بنا پر ادبی حلقوں میں بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ قومی یک جہتی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اور خصوصی طور پر وہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوپاک ملاپ اپنے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ ایک طاقت میں مختلف موضوعات پر میری ان سے جو بات چیت ہوئی وہ ذیل میں درج ہے۔

حکومت کی سرپرستی کے بغیر بھی اردو ترقی کرے گی اور دہائی رہے گی کیا آپ بھی اس بات سے متفق ہیں جب کہ انگریزی زبان نے مرنے حکومت کی سرپرستی میں ترقی کی اور سنسکرت جب حکومت کی سرپرستی سے محروم ہوئی تو وہ ختم ہو گئی۔ ج : جی ہاں اس میں شک نہیں کہ حکومت کی سرپرستی کسی حد تک ضروری ہے مگر قطعی طور پر نہیں۔ اگر زبان میں جان ہے تو وہ ضرور زندہ رہے گی۔ حکومت کی حمایت کسی زبان کو ضرورت ضرور ہو پختائی ہے مگر زندہ اس کو اصل زبان ہی رکھتے ہیں۔ خطوں کے لئے میں ہندی زبان منظم حکومت کی سرپرستی سے محروم رہی مگر ہمیں بھی زندہ رہی۔

سے : آندو میں ہندی الفاظ ہوں۔ اس کی اس کا

سے : کیا آپ مشاعروں کو اردو کی ترقی، ترویج و اشاعت اور فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کیوں اور کس لحاظ سے؟

ج : جی ہاں! میں مشاعروں کو بھی اردو زبان کی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اگرچہ مشاعرے کے سامعین میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو شعرا کے اشارے سے نہیں بل کہ ان کے ترجمے سے محفوظ ہونے کے لئے آتے ہیں مگر ماہر ہے جس نے ہند کے شعروں کو وہ ترجمے سننے میں ادب و لطیف انداز پر ہنسنے پر آمادگی پات ہے کہ اس زبان سے بھی ان کی ہم صدی پیدا ہو جاتی ہے اندکی کے حق میں ہم ہندی مفید ہی ہوتی ہے مگر نہیں۔ چنانچہ مشاعروں سے INDIRECT اردو زبان کو فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔

سے : ہر مشاعرے کا ایجنٹ سے بیانات کی جاتی ہے کہ

ایک گراؤ میں مبتلا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تہیں
اور اس کے چش نظر اردو کو ہندوستان سب کی زبان کیجی؟
ج: اردو ہندستان کی پیداوار ہے تاریخی طور پر
ہندستان کی تہذیب پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا
کہ ہندستان میں جو لوگ بھی آئے انھوں نے اپنے اموات چھوڑے
منظور کی تہذیب بھی انرا وار ہوئی۔ چنانچہ مثل تہذیب کے
ایک گراؤ کا بھی اردو میں آنا لازمی تھا۔ مگر بعض تشبیہوں اور استعاروں
کی بنا پر اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا درست نہیں۔ اگر اردو مسلمانوں
ہی کی زبان ہوتی تو بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان میں اردو
دستی کی جگہ پر مل رہی ہے وہ نہ ملتی۔ اب پاکستان میں اردو متاعوں
کے بجائے پنجابی مشاعرے ہونے لگے ہیں چوں کہ اردو کا بیک گراؤ
فارسی سے اس لئے ایرانی تہذیب کے اثرات اردو زبان پر پڑنا
لازم تھے۔

س: قومی یک جہتی پیدا کرنے کے سلسلے میں کون سا طریقہ
اختیار کیا جائے۔ جو کارآمد ثابت ہو۔

ج: دراصل قومی یک جہتی کے جذبے یا تحریک کو اب تک عام
ہونا چاہیے تھا مگر اس جذبے کے عام ہونے میں سیاست ہی
مانع آئی ہے۔ یعنی کانگریسوں کی فرقہ جیسی قوم میں یک جہتی پیدا
ہونے نہیں دیتی۔ میرا مطلب کانگریس کے اصولوں سے نہیں بل کہ
ان کانگریسوں سے ہے جو اپنے دل سے نہیں بل کہ اپنے سر
کی گامدھی ٹوپ سے کانگریسی بنے ہوئے ہیں ایسے کانگریسی سب سے
بڑے فرقہ پرست ہیں۔ لوگ دھرم، ذات، فرقے اور علاقے کے
نام پر دوڑتے ہیں۔ ایکسٹین کامیاب ہوتے ہیں اور اسانوں
کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں۔ دراصل چناؤ کا جو طریقہ رایج
ہے قومی یک جہتی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ میرٹھ میں جب ریلوے
منایا گیا تو اس کے جلسے میں میرے جہاز قومی یک جہتی کا بھی ذکر کیا
گیا۔ میں نے جواب میں کہا کہ میری ایک بیٹی ہے، شادی شدہ ہے
ظاہر ہے کہ اسکا شوہر کھسے جو میرا داماد ہے مگر یہ جو سلسلے
شا کا بازار حال بنتے ہیں یہی میرے داماد ہیں ان کی بیوی کو جس
اپنی بیٹی بنایا ہے اور باپ کا فرض بھی ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ قومی یک جہتی

گلن کا ہندوستانی مسلمان

پیدا کرنے کے سلسلے میں میری رائے تو یہی کہ ہر قسم کے ہندو بزرگ
اپنے بڑیوں کے بچوں کو لینے کے قرار دیکر ایک شش ماہ کیس اور دس گھنٹے کو بھیجیں
تو قومی یک جہتی کا جذبہ پروان چڑھ سکتا ہے۔
س: تاریخ کے بعد شاید اب ہندو شعراء میں جو کتنی بھی مدد رکھتے ہیں کہ
اس سلسلے میں کئی پہلوؤں سے ملے اور کہاں کہاں گئے۔
ج: ہندوستانی کتنی میں فرعون اور بن عرب گونگا کو میں مانتا ہوں
وہ گالے بھی بڑا پہلوان تھا۔ گانا، گونگا اور جسم بخش وغیرہ سب
کی کہانیاں میں نے دیکھی ہیں۔ میں خود بھی کشتی لڑتا رہا ہوں۔ دلائل
پچھلے 50 برس سے مجھ کو یہ شوق ہے دینے کتنی سے میر تقی آبادی
ہے۔ جی ہاں، جہاں تک پاکستانی پہلوانوں کا تعلق ہے وہاں کے
دوسرے دے جے کا پہلوان بھی ہمارے صف اول کے پہلوان سے
زیادہ بہتر ہے اور حادی ہے کشتیوں ہی کے سلسلے میں مجھ کو خوب
لنگا، اور دوم کے اولیکس میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

س: غالب صدی کے سلسلے میں جب آپ انگلستان گئے
تھے تو وہاں آپ نے اردو کو کس حد تک مقبول پایا۔

ج: پنجاب (جالندھر اور لدھیانہ وغیرہ) کے جو لوگ انگلینڈ
میں موجود ہیں ان کو شاعروں سے توجہ دیکھی ہے مگر اردو زبان سے
کوئی خاص رنگ نہیں۔ پاکستانیوں کو شاعروں سے بھی زیادہ
دیکھی ہے اور اردو زبان سے بھی۔ اگرچہ ہندوستانی اور پاکستانی جو
انگلینڈ میں مقیم ہیں ان میں آپس میں کوئی عناد نہیں۔ مگر غالب صدی سے
متعلق ہمارے جلسوں میں وہ بہت کم شریک ہوئے۔ ویسے انگلینڈ
کا جو اچھا لکھا طبقہ (کانگریس کے اساتذہ) ہے وہ انگریزی ہی سے
دیکھی رکھتا ہے کسی اور زبان سے نہیں۔

س: جدید شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: جلدی اور سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اگر جدید
مقتصدی تعمیری اور اصلاحی ہو تو قابل تریف ہے مگر جو نوجوان طبقہ اس جدید
ٹیک بک کو اپناتے ہوئے ہے اسکے لئے اپنی شاعری کو تعمیری بنادینا
ٹیک بک کھڑے جس شاعری کو آج جدید کہا جا رہا ہے اس میں نہ شعریت
ہے نہ عذوقیت، تعمیری جدید شاعری وہاں ابھی نہ ہو جس طرح کاہلی
کی ہے۔ یعنی ترقی پسند شاعری کا بھی ایک مقام ہے مگر جدید کا
بالکل نہیں۔

منو سمرتی اور مار کسین ازم

دیوان آئند گمار جی مشترکہ پنجاب کے صفِ اول کے برہمن رئیس راجا نریندر ناتھ کے صاحب زادے ہیں۔ دیوان صاحب کے جدا جدا لہجہ دار لہجہ دارن جیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ دیوان صاحب جب ولایت سے بارڈر لاپورکھ ہندستان آئے تو برسرِ کوٹیشہ نہیں بنایا بلکہ فروج کا ایک اعلیٰ عہدہ قبول کر لیا۔ مگر قصبہ ہی دن بعد پنجاب یونیورسٹی میں زولاجی کے استاد بن گئے۔ دس دہائیوں میں دیوان صاحب کا رجحان اتنا بڑھا کہ نو برس تک پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آج کل دیال سنگھ کلچر (دہلی) دیال سنگھ کلچر (دکنال) دیال سنگھ لائبریری ٹرسٹ موساسٹی، سادھو آشرم اور درجنوں عوامی اداروں کے پریذیڈنٹ، چیرمین، ممبران سرپرست اور سربراہ ہیں۔ آتی سالہ کٹیری نژاد دیوان صاحب خرافت، تہذیب و اخلاق و رحم دلی، خدا ترسی انسان دوستی، اور ہندو مسلم بھائی چارے کی متنبہ دہلی تصویریں۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بڑی شفقت سے پیش آئے اور علم و ادب اور سیاست کے موضوع پر بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ شکر

لیکن ہندی کی ددی کتاب میں مے بدل مکے بجائے۔ اُتلیت لکھا ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسے ٹھکانے ہوئے فیرانوس ہندی الفاظ نعلاب کا کتابوں سے نکال دیئے جائیں تو پھر وہی زبان رہ جائے جو ہم اور آپ بولتے ہیں یعنی ہندستانی! سہ لسانی فارمولے کو بھی ختم کرنا ضروری ہے یعنی انگریزی جس کو اس فارمولے سے خارج کر دیا گیا ہے اس کو ضرور شامل کیا جائے۔ انگریزی، سنسکرت اور فارسی پر یہ فارمولہ مشتمل ہو۔ جو سنسکرت پڑھے گا وہ ہندی بھی سیکھ جائیگا اور جو فارسی پڑھے گا اسے اُردو بھی آجائے گا۔ اور انگریزی بولنے والے انگریزی دنیا کی زبان بن چکی ہے۔ روس میں روسی ضروری زبان ہے باقی دو زبانوں کو اختیاری حقیقت دے دی گئی ہے مگر غیر ملکی زبانوں میں 75 فی صدی روسی انگریزی ہی زبان سمجھتے ہیں۔ انگریزی نہ سیکھنا ایسا ہی ہے جیسے ہم نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے

ستے: حصول آزادی سے پہلے ہم سب اس سلسلے میں گاندھی جی سے متفق تھے کہ آزاد ہندستان کی توئی زبان نہ ہندی ہو اور نہ اردو، بلکہ ہندستانی ہو مگر ملک کی تقسیم نے اس نظریے کو متاثر کیا۔ اب لسانی مسئلے کا حل کیا ہو؟

ج: دراصل اس سلسلے میں ہندی کی زبان کی ددی کتاب میں ہیں۔ ان کتابوں نے، سکولوں اور کالجوں کے اعلیٰ کلاس کر دیا ہے۔ ہندی زبان کے معمولی رانٹروں نے رشتہ دے دے کر اپنی کتابیں نصاب میں شامل کمال میں اوتاب وہ بڑی بڑی قومیں لکھی ہیں پارہ ہے ہیں۔ ہندی کے ان نام ہندو رانٹروں نے جان بوجھ کر زبان کو گھٹن بنایا ہے۔ لفظہ اورہ اگرچہ فارسی زبان سے لفظ نہیں رکھا مگر ہندی کا رانٹرو اورہ کی جگہ اُتھوا رکھے گا اسی طرح لفظ مے بدل میں مے بھی ہندی ہے اورہ بدل بھی

میں اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔

مس : کیا اردو کا موجودہ رسم خط اردو زبان کی ترقی اور اشاعتی کام میں رکاوٹ نہیں ہے؟

ج : اس رسم الخط سے زیادہ خوبصورت شارٹ ہینڈ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہندی کا ہر حرف چوں کہ مکمل لکھنا پڑتا ہے اس لئے ہندی لکھنے میں زیادہ وقت لیتی ہے۔ اردو جلدی اور کم وقت میں لکھی جاتی ہے۔ لندن میں میرے ایک انگریز پروفیسر تھے وہ اردو رسم خط کے متعلق کہتا تھے، A WONDERFUL SHORTHAND IS IT (ایک ایسا خوب خط کہ لکھنا پاپ ہوگا۔)

مس : کیا اکثریتی فرقہ (ہندو فرقہ) کا یہ کہنا درست ہے کہ اقلیتی فرقہ (مسلم فرقہ) قومی دھارے کا ساتھ نہیں دیتا۔؟

ج : قومی دھارے کہاں؟ نہ برہمن ساتھ ہے، نہ جاٹ، نہ ہندو، نہ مسلمان کس طرح کس دھارے میں شامل ہوا اور کس دھارے کو قومی دھارا کہا جائے۔ (در اصل سب کو ایک دھارے میں بہا لے جانے والی بات کیونکہ ہم والی بات ہے مگر یہ یاد رکھئے کہ کیونکہ ہم اسلام اور ہندو دھرم دونوں کی نظرت کے خلاف ہے۔ کیونکہ ہم کسی باری پیدا ہوا اور نہ ناکام ہو کر ختم ہو گیا وہ یہ ہے کہ جو حکومت عام ذات کے ان افراد کے بن پر بنائی جائے گی وہ ختم ہو جائے گی۔ پس مذہب کا دھرم تاخیر و تاوان ہے۔)

مس : بے روزگاری، مہنگائی اور غریبی کا خاتمہ کیسے ہوا اور ملک خوش حال کیسے بنے۔؟

ج : بات یہ ہے کہ اکثر گنت ہمارے مزاج کے بالکل خلاف ہے جب کہ ہماری حکومت کا رجحان اسی طرف ہے۔ سماج کا شیرازہ بکھونے پر کیونز آیا کرتا ہے۔ مگر ہمارے سماج کا شیرازہ بالکل نہیں بکھولا۔ لیکن ہاں ہماری حکومت ہمارے سماج میں مردانہ انتشار پیدا کرنا چاہتی ہے۔

مس : گندم پر حکومت کا قبضہ زمین کی تقسیم کو ٹٹے پر حکومت کا اختیار دینا کیوں کو قومیا اینا نہیں ملک کے ملے پر میر نہیں بد پر ہزیاں ہیں۔

ان نام نہاد اصلاحات سے غریبی بڑھی ہے بے روزگاری پھیلی ہے اور گرتی میں اضافہ ہوا ہے کسی ایک بات میں کی نہیں ہوئی۔ اگر نہ ہندو عورت برترس کھا کر تھی کو بند کیا اور مسلمان ہو کر بند کیا۔ اگر گرج

بھی کوئی اکبر جیسی ہمت اور عقل کا حاکم ہو تو ہر بگڑی بات سدھر سکتی ہے۔ ہمت و دھارے، کسی قرآن کریم کے ہمت۔

مس : براہ کرم اُن چند کتابوں کے نام بتائیے جو آپ میں ذہنی انقلاب لانے کا باعث بنیں۔ یا جن سے آپ بے حد متاثر ہوئے۔؟

ج : دنیا کی دس کتابوں کو آپ کی کتاب کہا گیا ہے، قرآن مجید، گیتا، رامائن، تہذیب، مہابھارت، بھگوت، کن فیوٹیس اور باقی دس کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ بھگوت نے مجھ کو ہر پہلو سے اپیل کیا ہے، گیتا اور مہابھارت، انسانی کردار کو بنانے اور سنوارنے میں مدد دیتی ہیں۔ فارسی زبان میں مجھ کو شیخ سعدی، اور حافظ شیرازی کے کلام نے متاثر کیا ہے مگر اس کا فلسفہ مجھ بالکل متاثر نہ کر سکا۔ بعد کے لکھے والوں میں مولانا آزاد سے بہتر میں نے کوئی نہیں پایا۔ ان کے مقلد، عیدین، کو میں نے بار بار پڑھا ہے دیے میں مولانا آزاد کے اخبار ال ہلال، اور ال باغ۔ یہی ہمارے پڑھنا رہا ہوں۔ ●●

مطربیک کی پیش گوئی

کانگریس کا 5 واں (1984ء) اجلاس

بہی میں ہونا قرار پایا۔ اس اجلاس کی سب سے بڑی کشش برطانوی ہاؤس آف کامنز کے ممبر

مطربیک لاکسٹرکٹ تھی جو اپنے ساتھ ایک ایکٹرم بھی لائے تھے۔ تاکہ کانگریس میں غور

ہونے کے بعد وہ برطانوی ایوانِ عام میں پیش کریں اور سفارش کریں کہ ہندوستان جمہوری نظام قائم کیا جائے

انگلستان واپس ہونے پر مطربیک لائے ہاؤس آف کامنز میں اپنا مسودہ پیش بھی کیا مگر ہندوستان میں ملی گروہ کا لگنے کے

استاد مطربیک نے اس بات کی مخالفت کی اور اپنے ایک مضمون میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اگر جمہوری نظام قائم کیا جائے

تو اس کا لازمی نتیجہ قتلِ عام ہوگا، ایک فرقے کے خلاف دوسرے کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھیں گے اور ملک کی نواں جہ

نکلیں گی۔

مسلمان اور سرکاری ملازمتیں

پرتاب گروہ (انٹرنیشنل) میں پیدا ہوئے۔ ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ شری دویا شکر ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس میں مردار پٹیل کے بیکر ٹری رہ چکے ہیں۔ اسدو فادوی میں کافی حد تک دست رس رکھتے ہیں۔ خوش مذاق ہیں، خوش گفتار ہیں۔ مشاعروں کی صدارت و نیابت کئے بہت مشہور ہیں۔ اپنی اس ریٹائرڈ زندگی میں بھی کئی اداروں کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ایک ملاقات میں ہندوستانی مسلمانوں کے موضوع پر میری جو بات چیت ان سے ہوئی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

پوس اور فوج کی ملازمت میں ساتھ سترنی صدی سے بھی زیادہ نمائندگی حاصل رہی ہے۔ انگریزوں کے دیے ہوئے ضرورت سے زیادہ پروٹیکشن کا بڑا تجربہ ہو کہ مسلم فرسٹے کا پورا اپنے بل پر پٹیل کی قوت کھو بیٹھا۔ اور یہ عام بات ہے کہ جب کوئی کڑواں گھوڑ کر پانی نہیں پی سکتا تو وہ دوسرے پر یہ الزام لگایا کرتا ہے کہ فلاں بھے پانی پیئے نہیں دیتا۔ 1947ء کے بعد ہر فرسٹے کو آگے بڑھے گا بلکہ ادما یک ساں موقع دیا گیا، مگر مسلمان کو بیساکھی (انگریز) کا مدد کے بغیر چلنے کی عادت نہیں تھی اس لئے وہ دوسروں کے ساتھ دوڑ میں ہار گیا۔ اکثر ملازمتیں انٹرویو یا تحریری مقابلوں ہی کے ذریعے ملتی ہیں اور ان ذرائع کے لئے تعلیمی صلاحیت اور ڈگری کی یاقوت دیکھا جاتا ہے اور یہ کون سا جاننا کہ تعلیم کے میدان میں مسلمان ہر دوسرے فرسٹے پر ہوتا ہے۔ اگر مسلمان نوجوان تعلیم حاصل بھی کرتا ہے تو وہی کام نہ آئے دے مضامین لے کہ جدید علوم سے توشاد و ناورد ہی کسی مسلمان نوجوان کو رغبت پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال اب بات بدل رہی ہے۔ آئندہ پندرہ بیس برس میں

سے : سرکاری ملازمتوں میں تناسب کے اعتبار سے مسلمان بہت کم ہیں۔ کیا مسلمان خود سرکار ملازمت کے اہل نہیں یا اس سلسلے میں حکومت نا انصافی سے کام لیتی ہے۔ ؟ ج : سوال حکومت کی نا انصافی کا نہیں ہے بل کہ بات اس طرح سمجھئے کہ پودا اگر خرد و سب تو اسے کسی بھی پروٹیکشن کی ضرورت نہیں ہے لیکن خرد و پودے کو اگر آپ تحفظ بخشیں گے تو وہ مرجائے گا پتہ نہیں پائے گا۔ اگر پودے کو قدرتی طہ پر اُگنے دیا جائے اور اسے اپنے ہی بل پر پتہ لے کر موقوف دیا جائے تو وہ ہمیشہ خود کفیل رہے گا۔ اس کی بقا کے لئے زمین کے مرد گرم ضروری ہیں۔ اگر یہ اپنے دور حکومت میں اپنی حکمت علی کے تحت مسلمانوں کو اپنے سایہ عاطفت (PROTECTION) میں لئے رہا۔ ہر معاملے میں دوسرے فرقوں پر انگریز نے مسلمان کو ترجیح دی۔ ہر حالت میں اس کو ملنے کی نہیں بل کہ اپنی زبان پڑھے کا موقع ملا۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمان کو اپنے تناسب سے زیادہ نمائندگی ملی۔ انگریزوں کے عہد میں مسلمان کو

مسلمان اپنی صلاحیت کے بل پر ملازمت حاصل کرنے لگیں گے۔

سے : آج کے عوام میں یہ جیسے پنی، داسنی، نپٹنی بے قاری ادبے اطمینانی پائی جاتی ہے اور حکومت کے ہر شعبے میں یہ جو کرکشن موجود ہے اسکا سبب اور علاج کیا ہے۔ ؟

ج : دراصل بڑے تعجب اور اندیش کی بات ہے کہ 1947ء کے بعد سے آج تک ہمارا قومی طریق تعلیم بدلا اور نہ سدر اندرنگ کے ہر شعبے میں تبدیل بھی ہوئی اور ترقی بھی مگر وزارت تعلیم پچھلے 70 برس میں بھی طور پر تبدیل نہیں ہو سکی۔ پتہ نہیں ہے کہ ہر کون سے تعلیم کا شعبہ بری حالت میں ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جب دھرم، ہستہ پریم ہٹ گئے تو پھر زندگی کی بنیاد کس پر رہے گی؟ ہم اپنی اعلا قدروں کو اپنے تعلیمی افسانے سے مانی سنس کر چکے ہیں اس کے معانی ہیں کہ ہم اپنی تعلیم و تربیت ہی ختم کر چکے ہیں۔ آراء ان کے بعد سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ مدرسہ کی محض شریعتیں بن گئے ہیں۔ دوسرے کتب فیکٹریوں پر بدل گئے ہیں اور تعلیم علم نہیں، طلسم بن کر رہ گئی ہے۔ ساری اعلیٰ تعلیم کا سبب سبب یہ ہے کہ جب تک اس بنگلہ کو نہیں سدھا جا جائے گا بات نہیں ہے۔

س : اردو زبان کے حال و مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اسے کس طرح زندہ رکھا جائے۔ ؟

ج : دراصل اردو کو نہ صرف محالوں نے بل کہ برتاؤ نے بھی MIS-UNDER STOOD (تعبیر غلط پیش کی ہے) کیلئے اردو کو ادبی طور پر فروغ حاصل نہیں ہوا بلکہ عام استعمال کی صورت میں (بولی کی صورت میں) اس نے ترقی پائی ہے۔ 19ویں صدی میں اردو نے فارسی زبان کی جگہ لے لی تھی اور انگریزوں نے صرف انگریزی اور اردو ہی کو استعمال میں رکھا تھا یعنی انگریزوں نے اردو کو عام استعمال ہی کی زبان سمجھا تھا مگر یہ بھی برا ہوا کہ اردو کھنڈ اور دلی سے حیدرآباد اور دلا بھر پھیل گئی۔ اہل پنجاب اور اہل دکن نے ہندوستان کی اردو کو فارسی و عربی آمیزت کر کتابی زبان بنادیا۔ اردو کا کتابی زبان بن جانا اردو کے عوامی ہونے میں رکاوٹ بن گیا۔ مگر پنجابیوں اور حیدرآبادیوں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا، ان کی اپنی اپنی مادری زبان

موجود تھی اس لئے انھوں نے اردو کو حیاتی بنانا ضروری سمجھا میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو کو جو ملک گیر مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس کے زبان ہونے کی بنا پر نہیں بل کہ بولی ہونے کی بنا پر۔ ہم گری بنی، چنانچہ اس کی بھا کے لئے ضروری ہے کہ اسے کتابی نسبت دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ زبان فروغ پائے۔ ہندوستانی فلموں کی زبان ہے۔ حصول آزادی کے دوران بعد سیاست کے دوار سے اردو مرنے لگی تھی مگر اب اس نے دوبارہ زندگی پائی ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کو سیاست کے سائے سے دور رکھا جائے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ کوئی زبان محض بول چال کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتی ادنیٰ اعتبار سے کالجوں اور اسکولوں میں اردو کا ہونا ضروری ہے یعنی اردو کی زندگی کے لئے حکومت کی سرپرستی لازمی ہے۔

س : آپ ایک قابل اعتماد میکر ٹری کی حیثیت سے سردار پٹیل کے ساتھ ایک عرصے تک رہے ہیں۔ اس لئے آپ کا فرمایا ہوا مسئلہ ہر گاہ واقعی سردار پٹیل مسلمانوں کے مخالف تھے؟

ج : 1947ء کے بعد ایک دن سے دار ایڈمنسٹر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے خرائع جس طرح انجام دیئے اس سے

یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ وہ متعصب تھے یا غیر متعصب۔ برادر سے 1947ء میں اپنے عہد میں ماہ نامہ آج کل، کو بند نہیں کیا

بل کہ اس کی تجدید کرائی اور جو شخص طرح کی آبادی جیسے قوم پرست شاعر کو اس کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا۔ اسی سلسلے میں دھڑی کاروائی میں کچھ دیر ہوئی تو محکمہ ان فارمیشن اینڈ برادر کاشنگ کے میکر ٹری کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا۔ یہ ملحوظ خاطر ہے کہ آج کل ایک اردو رسالہ ہے اور جو شخص مسلمان ہیں۔ بول چال

نے 1947ء کے دوران بعد سردار کو دھکی دی کہ اگر اب آل انڈیا ریڈیو سے کسی بھی قسم کا اردو پروگرام نشر کیا گیا تو ہم دہلی کا یہ ریڈیو سٹیشن ٹوہا دیں گے۔ سردار نے اس کا رد کرتے ہوئے کہا کہ تو آجاؤ۔ چنانچہ سردار کا مقابلہ کرنے کی کوئی ہمت نہ کر سکا۔ 1947ء کے بعد دہلی کے پہلے چیف منسٹر صاحب زادہ غفر احمد تھے، ظاہر ہے وہ مسلمان تھے اور ان کو سردار ہی نے تعینات

کیا تھا۔ 1947ء میں دہلی کے فسادات میں فادرہ مسلمان نظام اذین میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ قرب و جوار کے جاٹوں نے ان مسلمانوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی، مگر سردار خٹک نے پرہیزگار گئے اور وہاں کے پولس افسران کو ہدایت کی کہ اگر مسلمانوں پر حملہ ہوا تو میں آپ سب کو برخواست کر دوں گا۔ ایک سیاسی حلقہ اس بات پر بضد تھا کہ حیدر آباد سے اردو کو ہٹایا جائے اور نظام کو بھی برطرف کیا جائے مگر سردار نے اپنی زندگی میں کسی کی ایک نہیں سی۔ ریاستی سمجھوتوں کے تحت سب سے زیادہ مراعات رام پور اور بیرواں جیسی مسلم ریاستوں کو دی گئیں۔ ادب سے دانشور پرسیو کو سنگھ کے جتنے آدمیوں کو انھوں نے جیل

میں بھیجا ان کی 1/10 تعداد بھی مسلم لیگیوں کی جیل میں نہیں گئی۔ کیا اب بھی آپ سردار خٹک کو ایک متعصب انسان یا مسلمان ٹھن کر سکتے ہیں؟ البتہ 1947ء کے بعد سردار کا مسلمانوں سے اٹل طہ پر یہ کہنا تھا کہ بیک وقت دو گھوڑوں پر سواری نہیں ہو سکتی، جو مسلمان پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں بہتر ہے کہ وہ پاکستان چلے جائیں مگر جو مسلمان ہندوستان کے دفا دار ہیں ان کو یہاں ہر طرح سے تحفظ ملے گا اور اس ملک پر ان کا بھی وہی حق ہوگا جو ہندو کا ہے۔ دراصل سردار یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک انسان ذاتی طور پر اپنے مذہب پر بھی چل سکتا ہے اور سیکولر بھی رہ سکتا ہے۔

مرسید کے رفقاء و مخالفین

مرسید کے پہلے رفیق مولوی سمیع اللہ تھا۔ مگر مرسید کے طرفداروں میں جو سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ مولیٰ علی (نواب محسن الملک) تھے۔ مرسید سے جو سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ حالی تھے۔ ثانی بھی مرسید سے متاثر تو ہوئے مگر انھوں نے پوری طرح ان کی پے دی نہیں کی۔ نواب وقار الملک اور مولوی ذکا الدین بھی مرسید ہی کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ مرسید کے مخالفوں میں کان پور کے ڈپٹی کلرک مولوی امداد علی اور گوردھ پور کے سبج مولوی علی بخش پیش پیش تھے۔ مرسید کی مخالف فوج کے یہ دو بولوں زبردست جڑ تھے۔ مرسید کی کتاب طعام اہل کتاب کے جواب میں مولوی امداد علی نے "امداد ال احتساب" اور مولوی علی بخش نے "تائید اسلام" لکھی۔ مرسید تحریک کے خلاف مولوی امداد علی نے مختلف شہروں سے 60 فتوے منگوائے جس پر ہر مسلک کے عالموں نے دست خط کئے تھے۔ مولوی علی بخش کئے گئے اور وہاں کے مفتیوں سے مرسید کے خلاف فتوے حاصل کئے اور مینے پیچھے اور وہاں وہ سارے بائیں طرہ اپنے ساتھ ہندوستان سے مرسید کے خلاف چھپو کر لے گئے تھے۔ ان سارے فتوؤں کو ایک رسالے کی صورت میں شائع کر کے ملک بھر میں بڑے بڑے مفت بھیجا گیا۔ اکبر آبادی بھی مرسید کی تعلیمی تحریک کے مخالف تھے مگر مرسید کے خلوص اور مشن کے خش گوار نتائج دیکھ کر بعد میں مرسید کے حامی بن گئے تھے اس کے ساتھ ساتھ "ندال آفاق"، "ندال انوار"، "لوح محفوظ"، "امداد ال آفاق"، "تائید اسلام"، "شہابِ نایب"، "اعدہ تیردیں صدی جیسے درجنوں اخبار جاری تھے جو نہ صرف مرسید کی تحریک کی مخالفت کرتے تھے بل کہ ان کو کافر، دجال، نیچری، ملحد، اسلام دشمن کہہ کر گالیاں بکتے تھے۔ گالی گلوچ سے بھرے ہوئے خط تو ان کو اکثر موصول ہوتے تھے اور کئی بار ان کو جان سے مارنے کی بھی دھمکی دی گئی تھی۔

نامانوس زبانیں

پشاور میں پیدا ہوئے، زندگی کے بہت سے دن لاہور اور کلکتے میں گزرا ہے۔ پچھلے 27 برس سے دہلی میں۔ ادیب، نقاشی طرز پر دہلوی بن چکے ہیں۔ اردو کے شاعر ہیں اور انگریزی کے نثر نگار۔ جرنلسٹ بھی رہے اور ایڈیٹر بھی۔ کئی صدیوں کی کتابوں کے مولف و مرتب ہیں۔ پبلشر اور بک سیلر بھی ہیں۔ ناشاد صاحب کو حسین کرکری اور حبص صورت فریخ کا بے حد شوق ہے۔ 1947ء کے فسادات میں لاہور سے لوگ اپنی جان بچا کر نہیں آئے گروہ ترک بھر کر اپنی گرا کر ان اور فرنی پر لے آئے۔ حسن، شراب، شعر اور موسیقی پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ خوش اخلاق ہیں۔ بزرگ سنے ہیں اور تواضع انسان ہیں۔ میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور گردنوں باتیں ہوئیں، کچھ باتیں آپ بھی سنئے۔

شے کے

کے گوارا سے وہ بدلتی بھی رہتی ہیں۔ اپنے سماج کی قدروں کا لحاظ کرنے والا ہے، اچھا سہری بھی اجاڑا ہے آپ کے خیال میں کیا فن کار کے لئے اچھا انسان ہونا ضروری نہیں؟

ج : ایک شاعر، ایک ادیب، ایک مدیر یا دوسرے الفاظ میں ایک فن کار کے لئے ایک اچھا انسان ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ انتہائی ضروری ہے۔ دماغی میلز تو یقیناً ہے کہ ایک فن کار جب تک اچھا انسان نہ ہو اچھا فن کار بن ہی نہیں سکتا۔ یا توں سمجھئے کہ بدکردار فن کار کے فن کو بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص طبعاً ادبی اور قرآن گو رکھیو کی کافیت عزت نہیں پاسکا۔ میں جب شعر کہتا ہوں تو سر پریم کو رٹ کی جانب منہ کر کے کہتا ہوں چونکہ مجھ کو اپنے خالق شاعر ہونے کا یگانہ ہے اس لئے ہر لمحہ محتاط رہتا ہوں۔

مس : قدیم انداز کے شاعروں اور نثر نگاروں میں آپ کو کون سا شاعر اور کون سا نثر نگار پسند ہے؟

مس : فن کار پیدا ہوتا ہے بنانا نہیں مگر ہر انسان کی زندگی میں کوئی واقعہ، حادثہ یا کوئی موڑ ایسا ضرور آتا ہے جس کی اندر چھپے ہوئے فن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ وہ کون سی بات تھی جس نے آپ کو شاعری کی طرف مائل کیا؟

ج : کوئی واقعہ ضرور نہیں ہوا اور نہ کوئی حادثہ پیش آیا البتہ غالب، داتا، اقبال، مجروح، افسر، بیگم اور فاطمہ بیگم جیسے جیسے شعرا کا کام میرے مطالعے میں اکثر رہتا تھا۔ جب بھی میری طبیعت اداس رہتی یا کسی بنا پر میں غم زدہ رہتا تھا تو شعری مطالعے سے سکون ملتا اور طبیعت بحال ہوجاتی۔ اب ظاہر ہے کہ جب مطالعہ زیادہ ہو گیا تو نگہ کے تالاب چھلکے لگا ادا خرمیں خد شاعری کرنے لگا۔ اس حقیقت کے وجود پر بھی ظاہر ہے کہ فطری ہی رجحان نے مجھے شاعر بنادیا۔

مس : ہر سماج کی کچھ قدیمیں ہوتی ہیں۔ وقت اور نطق

ہلکے پھلکے ستانی سندان ہست

ج : قدیم نظم کا اردو میں اکبر الہ آبادی کی نظم اور سر عبدل قادر کی نثر سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں بطور کلاسیک اور مزاجہ شاعر کے اکبر الہ آبادی جملہ پسندیدہ شاعر ہے۔ مزاجہ نثر نگاروں میں آج کل میں کہنا الال کبود کو پسند کرتا ہوں کبھی نسلے میں پنڈت سدھن اور منفی پریم چند کے نسلے بہت پڑھا کرتا تھا اگر آج کل اپنے دست کرشن چندر کا ہر افسانہ پڑھتا ہوں۔ کرشن چندر آج کا سب سے اچھا افسانہ نگار ہے۔ آپ کے کہنے پر جب میں نے اپنی پسند کا ذکر کیا ہے تو میری ناپسندیدگی کا بھی حال جان جائے۔ وہ یہ کہ جو شخص کو میں اچھا ساغور نہیں سمجھتا۔ اس کے یہاں لغات بہت سہے وہ صرف لغت کا شاعر ہے بطور انسان بھی وہ اچھا آدمی نہیں ہے یہی حال فراق گہ ہے۔ اس کے شعریں روایت قافیہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فنی اعتبار سے بھی فراق کا کلام زیادہ درست نہیں ہوتا۔ بس یوں کہے کہ فراق کے یہاں کائناتی ہولت ہے کو الٹی نہیں۔ پچاس شعروں میں ایک شعر کام کا نکلتا ہے۔ فراق کے شعری مجموعے مغل غفرہ میں ہزار عیب یہاں

نہرو نے کیوں نوازا ہے مگر فراق کو
ہر ایک پوچھتا ہے سر برزم شاعر کو
گل ہے نہ کوئی لغت ہے اس کے کلام میں
میراجی دہسکی ڈال دی کیوں اسے جام میں

سے : کوئی ایسا راقم سنائیے جس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ متاثر کیا ہو۔

ج : جن واقعات نے اتار چھوڑا ہے یا جن حادثات نے اپنی زندگی کا رخ بدلا ہے وہ تو بہت سے ہیں اور ان کو کہاں تک سناؤں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جو واقعات مجھ کو پیش آیا اس کے نتیجے میں مجھ کو بھلائی ضرور ملی یا یوں کہے کہ میں نے ہر بری بات سے

ایک اچھی بات سیکھی اور ہر تکلیف کے بعد راحت پائی بگڑی ہوئی بات کو بھی نلے گاں نہیں ملنے دیا یعنی جیسے پٹے ہوئے دودھ سے بھی سکھر عورت پنیر بنالیتی ہے ویسے میں بھی ہر بری کی جڑ میں نیکی ڈھونڈ لیتا ہوں۔

جو تاپڑتے ہی وہ نازک سی کلائی دیکھی

ہر بری بات میں ہنسنے کو بھلائی دیکھی

سے : اردو زبان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ج : زبان اردو ہریانہ ہندی زبان کو علم فہم ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو خالص ہی رہنا چاہیے اس میں لگاؤ نہ ہو۔ اردو ایک مکمل اور جامع زبان ہے اردو کو گولے اور ذیل کرنے کے لئے اسے کم تر اور نامکمل زبان ثابت کرنے کے لئے ہندی کے الفاظ شامل کئے جاتے ہیں جو لوگ ایسا کرنے ہیں وہ حکومت وقت کو خوش کر کے اپنے پیٹ کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ جس طرح دودھ کے بعد پھل کھا کر گڑھ پیدا ہوتا ہے اس طرح اردو کے جسم میں دوسری زبانوں کے الفاظ ٹھونس کر اس کے عظمیٰ کو مسخ کرنا ہے۔ صرف یہی بات نہیں بلکہ وہ مسلمان بھی اردو زبان کے دشمن ہیں جو محض اپنی (جھوٹی) قابلیت کے اظہار کے لئے اردو میں عربی و فارسی الفاظ شامل کرتے ہیں اور اردو میں طیف زبان کو بوجھل بناتے ہیں جس طرح یڈیو سے ہندی میں خبریں سن کر ہندی ماں بھی ہندی سے بظن ہونے لگتے ہیں اسی طرح عربی و فارسی آمیز اردو بھی اکثر اردو ماں حضرات کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔

وہ ہندی ہی کیا جس کو ہندو کہیں وہ اردو ہی کیا جس کو مسلم بھی پڑھیں
کٹھن کر دو دونوں زبانوں کو اتنا ہے محبوبہ کا میری دل سنت جیتا

کارآمد زبان

دوسری زبان کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ نثر لکھنے کے لئے ایک اچھا میڈیم ہے۔ ایک اچھے زبان کے لئے ضرورت ہے کہ وہ صنعت و معرفت، تجارت، سائنس، ادبیات، نو لو جیسے کے لئے بھی کارآمد ثابت ہو۔ — اندرا گاندھی

یوگ۔ ایک عبادت

کہتے ہیں کہ فلمی کمانی لکھی نہیں جاتی بچی جاتی ہے یعنی فلم کی دنیا کا رائٹر داستان نویس کم داستان گو زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس حقیقت کے برخلاف جناب جاوید اختر کے ساتھی جناب سلیم خان نہ بسیار گو ہیں اور نہ فضول گو لیکن وہ اور ان کے ساتھی جاوید آج کے مقبول ترین فلم رائٹر ہیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی۔ پوس کے بیٹے سلیم خان ۱۹۳۵ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے، اندو۔ میں تعلیم پائی، بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے۔ کے پہلے سال میں داخل ہوئے مگر فلمی شوق کی شدت ۱۹۵۸ء میں بھئی لے آئی، ہیرو بننا چاہا، بات، دیوانہ، پرو فیسر اور راموداد اسی فلمی میں نمودار بہت کام بھی کیا۔ مگر بات زیادہ آگے نہ بڑھی تب انھوں نے فلم ایکٹر سے فلم رائٹر بننے کے کوشش کی۔ جولاٹر اپنا مقام باچکے تھے بہت دنوں تک سلیم خان ان کے معاون بنے رہے۔ آخر وہ دن بھی آیا کہ سلیم خان اور جاوید اختر نے حقیقی معانی میں ہم قلم بن کر اپنی حوڑی بنالی اور فلمی کمانیاں کھٹھنے لگے ان کی پہلی کمانی "انداز" (سٹی کپور، ہیمامالنی، راجنیش کھٹنا بھی اور دیگر بھی بہت سی تھیں، سیتا اور گیتا، زنجیر، یادوں کی بات، بات کی صفائی، اور مجبور جیسی کامیاب فلمی کمانیاں) نظر تارے اور کالوں کے ساتھ انھوں نے پیش کیں۔ ان میں ۵ نے سلور جوبلی اور ۲ نے گولڈن جوبلی منائی۔ ۱۹۶۴ء میں سلیم خان نے ایک ہمارا شریں قلم یافتہ ہندو خاتون سے شادی کی اور اب وہ چار خوبصورت اور محصوم بچوں (ایک لڑکی تین بیٹے) کے شوق بلب ہیں۔ فلمی دنیا میں رائٹر کو مٹی یا مٹی کا گلیہ ہے اور جواد اکاڑ جتنا بڑا ہوا اتنے ہی بڑا اس کے خمرے ہوئے اور ہر خمرے والے اداکار نے یہ غرور کی کھما کہ وہ فلم کے سڑے میں دخل دے مگر سلیم جاوید نے اداکاروں کی اس مداخلت کو روکا ہے۔ قلم کو عزت اور قلم کار کو احترام بخشا ہے۔ اپنے فن اور پیشے کو مشترکہ بنا کر انہیں دینے کے سلسلے میں سلیم خان کا کتنے ہی کوہ اس حدیث پر یقین رکھتے ہیں: "جب دولہا کام کرتے ہیں تو ان کے درمیان ہوا ہوتا ہے اور جب دو الگ ہو جاتے ہیں تو ان کے درمیان شیطان آ جاتا ہے؟" سلیم خان یوگ (YOGA) کے طالب علم ہیں ان کے کہنے کے بموجب ریاضت کے اس طریقے سے انسان کے ذہن و جسم دونوں کو صحت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل انہی کی زبانی سنئے _____ شے کے

لے ہندو فلسفے کے مطابق مزاجیہ اور ریاضت کا ایک مخصوص طریقہ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ فاجک روح کائنات کی روح حقیقی سے متحد ہو جائے۔ شے کی

میں لوگ کھانا استاد پہلے نہ مہر بل کریں لوگ کا ایک طالب علم
 پہلے۔ بات یہ ہوئی کہ وہ ۱۹۵۰ء میں جب میں بمبئی گیا تو میری صحت بہت اچھی
 تھی مگر میں یہ بات اب کہہ رہا ہوں کہ میں ان دنوں خاصا صحت مند ہوں
 تھا۔ لیکن ان دنوں مجھ کو اس بات کا احساس تھا اوند میں سے اپنے اچھے
 صحت کی قدر ہی کی۔ میں ۱۹۵۵ء تک اپنے مفصل خاطر مدد چھوڑ کر
 رہا اور پھر فوراً یہ ہے کہ اگر میں چاہتا ہوں تو دوسرے لوگوں کے ان دنوں
 میں اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بیماری کی
 زندگی کے جو پہلے دس برس گزرے ان کے ساتھ میری صحت بھی گزر
 گئی۔ جب بیماری ظہور پاتی تھی میرے ساتھی ہٹ ہوئے۔ میں نے سمجھا کہ میری
 مشکلات ختم ہو گئیں۔ مگر ایسا سمجھنا میری بھول تھی۔ مسلسل مشکلات تو اب
 سرورع ہوئی تھیں۔ ٹی دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب ظلم کا سیلاب چلتی
 تو جو ظلم سے متعلق ہوتے ہیں کام ان پر برسرے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے ساتھی
 کی کام بالی نے میری مصروفیت کو بھٹی جتنا بھاری اور بڑا بنا دیا۔ نتیجے
 میں ذہنی کشاکش (TENSION) میں بھی اضافہ ہوا۔ سکون عقاب
 گیا اور دنوں کی نیند غلام ہونے لگی آخر میں ڈاکٹروں سے رجوع
 ہونے لگا۔ جتنی دوائیں بڑھتی اتنی ہی بے چینی میں اضافہ ہوتا
 اور طبی ہولی بے چینی دواؤں کے لئے اور زیادہ راہ گھولتی۔ اور پھر
 ساری بات جو نشی کا وہ لطیفہ بن گئی کہ تم پانچ برس تک تکلیف میں
 رہو گے۔ پانچ برس کے بعد؟ پھر تم اس تکلیف کے عادی ہو جاؤ گے
 ذہنی پریشانی اور دوائیں، دوائیں اور ذہنی پریشانی۔ میں بھی
 ان دونوں باتوں کا عادی بن گیا۔

اور پھر کچھ دن بعد میں مکمل طور پر اپنے آپ کو نہیں سمجھنے لگا
 اور میرے مرض کی جو علامتیں تھیں وہ وہی تھیں جو دل کے ایک مریض
 کی ہوا کرتی ہیں اور ایک دن اچانک مجھ کو محسوس ہوا کہ دل کے مرض
 نے مجھ پر حملہ کیا، فوبت بہ این جا رسید کہ مجھے ہسپتال میں داخل ہونا
 پڑا۔ اپنی جس صحت پر مجھ کو ناز تھا جب وہ اس حد تک مار کھا گئی کہ
 ہسپتال کے بستر پر پہنچ گیا تو پھر میری غذا اعتدالی بھی نہ تھی ہو گئی۔
 اسی اثنا میں کاوش صاحب نے مجھ کو لوگ سے متعارف کرایا۔
 گو میں ان دنوں بڑا بوس تھا مگر زندگی کے پیاری نہیں ہوتی۔ میں نے
 سوچا کہ اس طریق علاج کو بھی آزمادگیوں۔ میں نے کبھی (منتکروں)

کے لوگ آخر میں پورے گراہی ساری انھیں بیان کر دیں۔ آخرم کے
 پھر دل نے میری تکلیف یا بیماری جاننے کے باوجود یہ تو امید ظاہر کی
 کہ ایک کے ذریعہ میں دوبارہ صحت تو بالوں کا مگر انھوں نے پھر بھی لوگ
 کے طریق علاج کو بھروسہ قرار نہیں دیا۔ آخرم کے پھر دل نے مجھ کو بہت
 سی ورزشیں بتائیں اور ان کو کرنے کا طریقہ بتایا مگر ساتھ ہی ساتھ
 مجھ کو پابندی سے ناز پڑنے کا بھی مشورہ دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جتنا
 صحت کے لئے کسی قسم کی ورزش یا دوا سے زیادہ ضروری وہ جتنا
 ہے جو مریض کے مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتی ہو۔ مجھ ان کے
 ہدایت پر بسہ حرج ہوا۔ مگر انھوں نے واضح کیا کہ طریق نمازی لوگ
 کے اصول سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ یوگ اور نماز دونوں میں
 روح حقیقی (خلا) کو یاد کرنا ضروری ہے اسی لئے نماز کا پڑھنا جسم
 ذہن دونوں کے لئے مفید ہے۔ لوگ آخرم کے استادوں کی اس
 وضاحت کے بعد اس دن میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو لوگ یوگ کو ایک
 ہندو انا عبادت، پارہنہ یا ہندو انا طریق علاج سمجھتے ہیں وہ غلطی
 پر ہیں۔ یوگ کو اپنلے پر نہ کسی کا مذہب مجرد ہوتا ہے اور نہ کسی کا
 ایمان خطرے میں پڑتا ہے بل کہ باسی ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور کمزور
 ایمان کو قوت ملتی ہے۔

انسان جسم سے بعد میں مرنا ہے مگر ذہنی طور پر پہلے مر جاتا ہے
 بھی ذہنی طور پر چکا تھا مگر لوگ کے ذریعے آٹھ ہی دن کے اندام خدا ہوا
 زندہ ہو گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ مجھ میں توانائی آتی گئی اور مجھ کو لوگ سے
 ہر طرح فائدہ پہنچا۔ میری یہ بڑی مادت رہی ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی کام
 کا پابند نہیں بنانا چاہتا مگر یوگ کا یہ کمال ہے کہ اس نے مجھ کو پابند بنالیا ہے۔
 یوگ اب ہندوستان میں روز بروز مقبول ہوتا جا رہا ہے اس لئے
 نہیں کہ ہندوستانی اسے شرف قبولیت بخشی رہے ہیں بل کہ یوگ کے عمل
 اور فلسفے کو امریکی اپنانے لگے ہیں وہاں فوجی حمانوں کی ذہنی ترقی
 کو دور کرنے کے لئے یوگ کو ضروری قرار دیا گیا ہے امریکی لوگوں
 کی اس قدر دانی کی بنا پر اب ہندوستانیوں کو بھی اپنی اس نعمت کی
 اہمیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ دراصل یوگ کی ورزش سے
 جسم کے سارے اعضاء کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ••

اپنی شخصیت کو جوان بنائے رکھنے کیلئے



مینارِ براند

مشہور کالی مہندی

(میشد استعمال کیجئے)

یہ بالوں کو قدرتی جیسا سیاہ بناتی ہے

مینارِ براند

پال صفا پودر

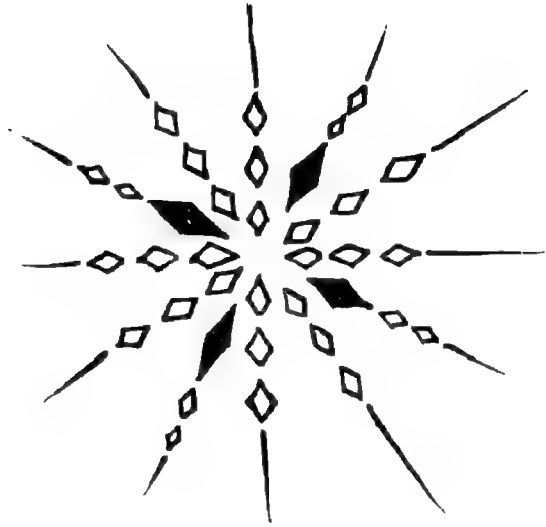
تکلیف کے بغیر 5 منٹ میں غیر ضروری بالوں کو صاف کرتا ہے
(یہ پودر خوشبودار ہے)

بٹلے والے: مشہور دو اخانہ - پائیدہونی، بمبئی 400003

خرد کی غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
- اقبال



ظفرِ وصالِ سحر کی صُورِ حیدرِ ہنم



انسانی ذہن
ایک صحرائی چشمے کی طرح آزاد ہے
اُس پر تقلید کے بند مت لگاؤ



اسے دور کا ہر انسان سفر میں چاہتا ہے آرام

دینا آرام اور خدمت انسان
بلا تخصیص مذہب و ملت
دیتے ہیں سب کو مناسب سہولت

یاد رکھیے ہمارا نام
ہم ہی آئیں گے آپ کے کام

سفر گیسٹ ہاؤس | میڈی گیسٹ ہاؤس

آرام دہ: روشن، ہوادار اور کشادہ کمرے، چوبیس گھنٹہ
ٹھنڈا و گرم پانی، فون، لفٹ کی سہولت اور بدل خش کن فوری سروس

سیکندرفلور، بلڈنگ نمبر 200-202
تری وینی ہاؤس کھیت واڑی بیک روڈ بمبئی 4
فون: 381007
384107

تھرڈ فلور ڈی بلاک وسم اللہ بلڈنگ
چرنی روڈ بمبئی، گرانٹ روڈ بمبئی 7
فون: 362872 - گلام: سٹی ہرٹ

ہندوستانی معیشت میں مسلمانوں کا مستقبل

یہ بات واضح ہوتی جائے گی کہ اب ذات اور مذہب کی بنیاد پر گروہ بندی کرنا غیر ضروری اور ناپسندیدہ طریقہ کار ہے۔ اب گروہ بندی پیشوں کی شکل میں بہتر زندگی گزارنے کے لئے جدوجہد کر سکنے کی جگہوں پر ہوگی۔

آزادی کے گزشتہ ۲۵ سال ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سوئے ہوئے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ زمانہ دوسرے تمام شہریوں کے لئے بھی امتحانات کا مستقبل کی اسکانی سمت کے بارے میں ابھام کا اور مخالف سمتوں میں کام کرنے والی قوتوں کی زور آزمائی کا دور تھا۔ اب ملک اس دور سے کچھ آگے بڑھ رہا ہے۔

ایک سمت متعین ہوئی ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں جدوجہد کرنے کے خطوط واضح ہوئے ہیں۔ وجہت ہندی کو کوئی ماحول پر شکست دی جا چکی ہے، اب وہ گتے لٹکا بدل کر سامنے آئے گا، یہ بات آگے کے حالات پر اور نئی ہندو قوتوں کے ذریعہ عام لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کر سکنے کی کوششوں پر منحصر ہوگی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آج تک مخالف سمتوں میں کام کرنے والے وجہت ہند عناصر ٹھہر کر نئی ہندی کاروائی کر گئے۔ بہر صورت ملک میں سیکولر جمہوری سوشلسٹ سلیح کی فیسر کے راستے میں ابھی تک بہت سی مشکلات حائل ہیں۔

اس عام صورت حال میں مسلمانوں کے اپنے کچھ خاص مسائل مشکلات اور اور پریشانیوں رہی ہیں جو الگ سے توجہ چاہتی ہیں۔ مسلمانوں کی ٹرستی ہوئی جنات، افرات، اور مہماندگی کے اسباب کو کچھ لینا ضروری ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد پڑھے لکھے اور اچھی کارکردگی رکھنے والے مسلمانوں خاص کر نوجوانوں کی بڑی تعداد بہتر مواقع کے خواب لے کر چند ملک چلی گئی جاتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلے قلعہ دار اور دفتر کا رخنہ اور مختلف اچھے پیشے ان مسلمانوں کے سامنے خالی ہو تے چلے گئے جو پہلے بھیجے

اب ملک کا تجربہ یہ بناتا ہے کہ تمام غیر سوشلسٹ ممالک میں اکثریت کے افراد کی فائیسٹ ذہنیت اقلیتوں کو نہ صرف ان کی زبان اور تہذیبی ورثہ سے محروم کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے بلکہ ذرائع پیداوار جیسے زمین، روزانہ مشینوں، پیشوں اور ملازمتوں کے مواقع بھی چھیننے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ وجہ واضح ہے۔ انفرادی بنیاد پر قائم سماج میں کچھ افراد کو محروم کر کے ہی دوسرے افراد کو زیادہ زمین، روزانہ مشینیں اور ملازمتوں کے مواقع بہم پہنچائے جا سکتے ہیں۔ مگر کچھ جیسے دولت مند اور ذرائع مال مال ملک میں بھی سیکرور، سیکرین، جا پانی، اطامی اور دوسری چیزوں کے ساتھ یہ سب کو ہوتا سا ہے۔

لیکن ایک سوشلسٹ ملک میں جہاں غذائے پیداوار زیادہ تر اجتماعی ملکیت کا حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ ایک دولت مشترکہ کا صبر کرتا ہے اور تمام افراد کا بہتر کارکردگی، بہتر غذائے پیداوار میں شامل کبھی جاتی ہے۔ اس طرح کے مسائل کے اٹھنے کا سبب بہت کم پیدا ہوتا ہے اس سماج میں ہر فرد کی زیادہ بہتر زندگی اور اس سے پیدا ہونے والی زیادہ بڑ کارکردگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستان جمہوری سوشلزم کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ بات ہندوستانی اقلیتوں کے لئے بہت امید افزا اور شگوش ہے اس طرح ہندوستانی معیشت میں ان کا مستقبل بہتر کرنے والے دن کے ساتھ زبان محفوظ رہتا جائے گا۔

جتنی تیزی سے ہم سوشلزم کی طرف قدم بڑھا سکیں گے اتنی ہی تیزی سے ہم اقلیتوں میں معاشی عدم تحفظ کو کم کر سکیں گے۔ اس کا کہہ کر تے جائیں گے جسٹس اور کارکنان میدانوں میں ملک معنی تیزی سے آگے بڑھتا جائے گا۔ لوگوں کے ذہنوں میں

اُسے دعووں کی ایک لادھوں پر چلے کے لئے رہنمائی اور امداد کر سکتے تھے اور ان ہم جگہوں پر مسلمانوں کا سب سے پہلا پہنچ کر ہرگز ان کے ہر ضلالت دوسرے لوگوں کا خاص تر تھا گیا اور وہ اپنے سے متعلق رہتی راہوں پر بھیجے گئے والوں کی رہنمائی اور امداد کرتے رہے اور یہ اعزاز جاری با

زمین دلائی۔ یہ مختار کرنے والے مسلمانوں اور ان کے مسلمان کار عملوں نے کاستکار کا خوف سے عدم تر بھی مرنے والی تعلیم پر کی توفیق میں دھیان نہیں پایا تھا پھر بھی انہی حامد اہل بیت کے لئے تعلیم پر بھی سلسلہ جاری تھا۔ زمین دلائی کے نام سے مسلمان لوگوں کو مدد پہنچا، امامان حکومت میں جلسہ کے لئے مصلحت اور سید ہوشی پر قرار دینا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ ہی کو سہارا بھی دیا اور بھی اپنے بچہ کی تعلیم پر توجہ نہیں دی۔ سادہ دینی سماج میں ان کی حیثیت غیر محترم ہوئی تھی جبکہ دوسرے لوگوں نے ایک طرف سائنس کا راز، دوسری طرف تعلیم اور ملازمت اور تیسری طرف کسی قسم کی خدائی صنعت اور کاروبار سے ان کی جہلیت کو بہتر سے بہتر بنانے خاص جاری رکھا۔ اب ان جہلیتوں میں رہیں سماج کا فرق بہت زیادہ ترسواں ہے میں میں یا کم زمانہ مارنے والے ہیں جو دوسروں کی زمین میں شرکت سے کاستکار ہی کرتے ہیں یا فاضل وقت میں مزدور دیکھ کر کے اپنی گزرتے کی کوشش کرتے ہیں۔

معاشرتی ماحول نے مسلمانوں کی تعلیم کا طرف سے مایوسی کو پیدا دیا تاہم یا فائدہ افراد کے مقابلے میں مصلحت پیشوں اور شخصوں میں لگے ہوئے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا غالب بہتر ہونے کی وجہ سے بھی ان لوگوں کی تعلیم کی طرف سے بددلی میں افساد جو تمام پشتوں اور صنعتوں کو اونچی سطح پر کنٹرول کرنے والے زیادہ تر تعلیم یافتہ افراد ہی ہوتے ہیں۔ اس امر پر غور رکھنے کے ان لوگوں کو جہلیت پر مبنی ملی اور وہ معاشرتی و سماجی طور پر پست تر ہوتے گئے۔

ایک خاص باب جس کی وجہ سے مسلمان تعلیمی اور معاشی میدانوں میں ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام مائستریوں میں بھڑکی ہوئی ان کی بہت بڑی تعداد کو اردی زبان اور دو بے سرکاری ذہن سرکاری تعلیمی اداروں اور دھڑل سے اردو کے پٹ چلنے سے بدادوں کے وہ تعلیم یافتہ لوگ جو ہزاروں کی تعداد میں منشی، محاسب، دانا اور صلحہ کی حیثیت سے اردو کا کمانے سے بخلت جاہل اور سکار ہو گئے۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں داخلے کے سلسلے میں سہولت کی اور دوسری نامی زعفران اطباء خیال کا مذہب بھی بلکہ گزشتہ دو ان زبانوں کا تھاں ہی رہا ہے وہ گویا جن کی مار

زبان اردو ہے۔ دوسری زبانوں میں اظہار خیال اس روانگی سلسلے اور فصاحت کے ساتھ نہیں کر سکتے جس سے کہ اپنی اردی زبان میں کر سکتے ہیں وہ اب آپ کو گفت فزہ محسوس کرتے ہیں انہی مقابلوں میں بیٹھنے سے بچ گئے ہیں اور اگر بیٹھتے ہیں تو دوسری اردی زبان والوں سے مقابلہ کر کے مشکل ہوتا ہے۔ مسلمان ہندی اور دوسری علاقائی زبانیں سیکھ بیٹھے ہیں لیکن اپنی مادری زبان میں اظہار خیال کر سکتا ان کے لئے آسان بھی ہوتا ہے اور دوسروں کو سکھ مقابلے میں ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلہ کا یہ ترجیحی موقع حاصل نہ ہوتا۔ اب ذرا دار لوگ اردو کے مختلف مسائل پر توجہ دے رہے ہیں اور امید کرنا چاہیے کہ ملک میں فائنسٹ جذبہ بابت پر مباحثہ کے طلبہ کے ساتھ ساتھ اس نقصان کی خدائی ہوئی جائے گی۔

مسلمانوں کی اس معاشی بد حال کا ایک سبب یہ بھی بنایا جاتا ہے کہ فائنسٹ ذہنیت کے رجعت پسند لوگوں نے مسلمانوں کو ان کے اچھے کاروباری علاقوں میں فسادات کر کے اقتصادي میدان میں جھٹکا دیا ہے۔ دھیکھنے کی کوششیں کی ہیں اس سے بحث نہیں کہ یہ کوششیں منظم تعین یا غیر منظم، لیکن ان کوششوں کے پیچھے ایک ہی مقصد کی فائنسٹ ذہنیت کام کر رہا تھا یہی مقصد قابل مزید ہے۔ آج اگر یہ رجعت پسند فائنسٹ قوتیں، مسلمانوں کو گلے لگانے کی کوشش کرتی ہیں تو وہ صرف ان کو ترقی کے راستے پر گمے پڑھ سکے سے روکنے کے لئے کیا کرتی ہیں۔ اگر عام مسلمان، اپنے گھر نام نہاد، ہمدرد دولت رہنماؤں کی کوششوں سے اس رجعت پسندی کے حالی میں پھنس گئے تو یہ ایک نوساک بات ہوگی جس طرح وہ ملک کی پچھلی ۵۰ سالہ معاشی ترقی میں پھنسر گئے ہیں، اس طرح وہ اس سوشلسٹ ترقی میں بھی پھنسر جائیں گے۔

مسلمانوں کی دینی کچھ ماذہیں بھی ہیں بد حال کا سبب ہیں۔ ان میں عام طور پر بخت کی عادت کم ہوتی ہے۔ وہ سرمائے کو خرچ کرنے اور ضرورت میں کام کرنے والی چیزوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس لئے بددیانتی اور رشوت خوری کے معاملے میں مسلمان کافی احتیاط سے کام لیتے ہیں کیونکہ ان کے سماج میں اس لئے حال گئی کاسدگت کرنے والوں کی خاص وقعت نہیں ہوتی۔ لوگ چاہتے سانسے کھل کر کہہ نہیں سکتے ان کے دلوں میں ایسے لوگوں کا احترام نہیں ہوتا اور وہ ان کی ان اعمال کو محبوب سمجھتے ہیں یعنی مسلمانوں نے ابھی تک رشوت خوری اور بددیانتی کو اپنی سماج میں شرف قبولیت نہیں بخشا ہے۔ وہ ان کی سماجی زندگی میں ایسا محبوب مرد و عورت فعلی ہے جیسے مرد لین یا جو اکھیلنا۔ اس کے علاوہ مسلمان ملازمین

بکڑے جانے کے زیادہ دُور سرپرست کا تعاون حاصل نہ ہونے کے خوف کی وجہ سے
بھلا دشمن لینے اعدائے ایمان کہنے میں اہیتا دہرتے ہیں۔

لیکن یہ باتیں کہ مسلمان عالم طر پر تر پرست نہیں ہوتے اسود لینے
رشتہ لینے اعدائے ایمانی کے افعال کو آج بھی ان کے سماج میں مینوب
کھاتا ہے، ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر میں ان کو زیادہ بہتر کارکنوں کی
حیثیت میں آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ اس طرح وہ زیادہ دُور
دوست، زیادہ قابل اعتماد اور زیادہ دُور دار شہریوں کی حیثیت میں ابھر کر
آگے آسکتے ہیں۔

حالات ایسے ہیں جن سے امید بندھتی ہے کہ مسلمان جمہور کا سوشلزم
کے راستوں پر بہت تیزی سے گامزن ہوں گے تعلیم کی کمی اور معاشی
پہچان کے نتیجے میں ان کی بہت بڑی تعداد میری بنانے والوں، رکٹ پلوں،
اٹومو بائیل ڈرائیوروں اور سٹریٹ کی شکل میں ملتے آئی ہے۔ طرے طرح کی بڑی
اور چھوٹی صنعتوں میں کارنگریوں اور مزدوروں کی شکل میں بہت سے مسلمان
کام کر رہے ہیں۔ دیہی علاقوں میں بہت سے مسلمان بے زمین یا کم زمین
والے کسان مزدور ہیں متوسط طبقہ کے پیش میں کام کرنے والے مسلمانوں کی مالی
حالت بھی کچھ بھی نہیں ہے اور وہ آسکتے مالی معاشی بد حالی کے خوف میں
میتلا ہیں۔ ان مزدوروں اور دیہاتی پیشے والوں کی اپنے اپنے علاقوں میں
تخلی میں ہیں یا بن رہی ہیں۔ کچھ تجربہ کار اور مضبوط ہیں، کچھ تجربے کر رہی
ہیں۔ ان تخیلیوں میں ہر ذات اور مذہب کے لوگ بنا امتیاز شریکیت
ہوتے ہیں۔ ان سب کے یکساں مسائل ہوتے ہیں، یکساں ضرورتوں کا احساس
ہوتا ہے، یکساں جدوجہد ہوتی ہے اور اس طرح ان لوگوں کو یہ سمجھنے کا

واقعہ ہے کہ مذہب اور اس کے ارکان کی اتائیگی اپنی جگہ ہو سکتے ہیں
لیکن معاشی زندگی کے یہ یکساں مسائل ہمارے سب ساتھیوں کے لئے اپنی جگہ
ہیں۔ نہ یہ مسائل ذات اور مذہب دیکھتے ہیں اور نہ ان کو حل کر سکنے کا مذہب
سوشلزم کی دعوت ان پر لازمہ غریب لوگوں کو زیادہ بہتر زندگی گزار سکنے کے
کے لئے جدوجہد کی دعوت ہے۔ اگر کوئی پس ماندہ طبقہ اس دعوت سے منہ
مڑتا ہے تو وہ خود اپنی بھلائی سے منہ موڑتا ہے۔

مسلمانوں کو اس کی تری ترک کر دینا چاہیے، ایسی اور بد دلی کے
بجائے اس لئے امید افزا سوشلزم کو قائم کر سکنے کا جدوجہد کرنے والوں کے
ساتھ شریک ہو کر اس راستے پر تری اور منہ مڑنے سے آگے بڑھنا چاہیے۔
دوسرے ہونٹوں کے ساتھ قدم سے قدم اور غار سے غار مل کر چلنا چاہیے۔
اپنے اپنے دائرہ کار میں سوشلزم کو آگے بڑھاتے چلنے کے لئے جدوجہد
کرتے جانا چاہیے۔ رحبت پسندی اعدائے ایمانی کو بے نقاب کر کے شکست
دیتے جانا چاہیے۔

آج مسلمان معاشی طور پر اس سطح پر پہنچے جہاں سے ایک سیکولر
سوشلسٹ نظام کی تعمیر، اس کو اپراٹھ سکتے اور زندگی کو بہتر بنا سکتے کے
مواقع فراہم کر سکتی ہے۔ اس لئے اس جمہور کی سوشلزم کی نئی سمت میں سماج
کوئے جاسکتے اور زندگی کو بہتر بنا سکنے کے مواقع فراہم کر سکتی ہے اس لئے
اس جمہوری سوشلزم کی نئی سمت میں سماج کوئے جاسکتے کی کوششوں میں
مسلمانوں کو دل سے شمول کے ساتھ شریک ہو جانا چاہیے۔ اس میں ان کی
اور ان کی آئندہ نسلوں کی معاشی حالت کی بہتری اور سماجی ترقی کا راز
مخپ ہے۔

انقلاب ایک سیلاب

”انقلاب ایک سیلاب ہوتا ہے۔ اس میں فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی، اس سے
قومیں آباد بھی ہوتی ہیں اور برباد بھی، اس سے گون سی قومیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں، جو جاگ رہی ہوتی ہیں، جن قوموں میں بھائی چارہ
بھی پیارا اور قوم پرستی ہوتی ہے اور جن قوموں میں پریم محبت اور اتفاق ہوتا ہے۔ انقلاب ایک سیلاب ہے اور جو قومیں سیلاب
پہنچی ہیں وہ سیلاب کے اضطراب میں کھڑی رہتی ہیں اور جو قومیں سیلاب آتا ہے وہ سیلاب کے ساتھ بہ جاتی ہیں اور اسے اپنی زمینوں
کی طرف موڑ دیتی ہیں اس سے استفادہ حاصل کر لیتی ہیں اور جو قومیں خوابیدہ ہوتی ہیں جن میں بھائی چارہ، باہمی میل طالب اور قوم پرستی
کا فقدان ہوتا ہے اور جو خود غرض ہوتی ہیں ان پر جب یہ سیلاب آتا ہے تو وہ قومیں بہ جاتی ہیں۔ سیلابی قوموں کو بہا لے جایا کرتا ہے اور ان کی
زمینوں کو بھی۔“
خان عبدالغفار خان

علاقائی زبان اور مسلمان

اس مادی کا ہر ایک عنوان علامہ اقبال کا یہ منظر گنگنا رہا ہے :-

عمل سے زندگی نئی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاک اپنی فطرت میں نہ توری ہے زار کا

لیکن علاقائی زبانوں کی تعلیم کے مسئلے میں جس نے عملی کامیابی اور

سستی سے کام لیا جا رہا ہے وہ قابل افسوس ہے جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ
عملی جدوجہد اور وقت و مشقت ہی سے زندگی میں بہاؤ آسکتی ہے تو ہمیں
چاہئے کہ ہم عمل کے میدان میں دوسروں سے سبق لے جانے کی کوشش
کریں اور یہ غلط فہمی نہ پیش کریں کہ جب دوسرے جاری زبان نہیں
سیکھتے تو ہم کیوں اپنے بچوں پر ایک زائد مضمون کی پڑھائی کا بار ڈالیں؟

یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محنت سے کام
کریں اور اردو کو ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ذریعہ تعلیم رکھتے ہوئے
بھی اپنی اپنی ریاست کی علاقائی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی
کوشش کریں تاکہ ہمارے اردو میڈیم کے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ضرورت
پڑنے پر ایسے مائیکروں میں بھی داخلہ لے سکیں جہاں کا ذریعہ تعلیم علاقائی
زبان ہے۔ اس طرح ہم ملک و قوم کی ترقی کے میدان میں اپنے ہونٹوں کے
ساتھ شانہ نشاں لگائے بڑھ سکتے ہیں۔

ریاستی حکومتیں سوچیں چاہیں گی کہ علاقائی زبانوں کو لازمی طور
پر پڑھایا جائے۔ لیکن غائب اس میں یہ وقت ہے کہ علاقائی زبانیں بولنے
والے طلبہ کا پڑاؤ اقلیتی زبانیں بولنے والے طلبہ کے مقابلے میں بھاری
رہے گا اور ایسی حالت پیدا کرنا مساویانہ سلوک کے منافی بات
ہوگی۔ ہمارے شریوں نے نصاب تعلیم کے محتاذ کے ساتھ حکومت نے

ایس۔ ایس۔ سی۔ کے لئے مرہٹی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا۔ علاقائی زبانوں
کی اہمیت کے پیش نظر یہ ایک مناسب و موزوں اقدام تھا۔ اقلیتی زبانوں
کے وجود سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ لہذا اقلیتی زبانوں کی نمائندگی
کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت ہمارے شری نے اپنی اس پالیسی میں ترمیم کی اور
مرہٹی کو پھر سے محض بطور ایک اختیاری مضمون برقرار رکھا۔

علاقائی زبانوں کی تعلیم کی اہمیت سے انکار کرنا جو اسکے رُخ سے
بے اعتنائی برتنے کے برابر ہو گا۔ ریاستوں کی نئی تشکیل خالص سانی
بنیادوں پر تو نہیں ہوئی ہے لیکن اس سے کئی مساوی ریاستیں وجود میں
آئی ہیں اور ہر ریاست اپنی ریاستی یا علاقائی زبان کو سرکاری یا دفتری زبان
کا درجہ دست چنگ ہے یا دے رہی ہے۔ بعض ریاستوں میں یا ریاستوں کے
بعض حصوں میں اردو کو بطور علاقائی زبان تسلیم کئے جانے کے لئے سیاق
سطح پر اردو کے حامیوں کی جدوجہدیں جاری رہی ہیں۔ ایک جمہوری نظام
میں کسی زبان، کچھ یا نہ ہو سکتی ہے۔ انسانی نہیں ہو سکتی۔ اگر کہیں کوئی
ایسی شہادت پیدا ہو بھی جائے تو وہ وقتی ہوگی، مستقل نوعیت کی ہرگز
نہیں ہو سکتی۔ جمہوری نظام کی ہی خوبی اور خصوصیت ہے جس کی بناء پر اس
ملک میں کہ جہاں مختلف زبانوں، ثقافتوں اور مذاہب کے رنگا رنگ بھولوں
سے بہار کی سی کیفیت ہے، وہ نظام جات اپنا ایک ہے کہ جس میں ہر بھول
کے لئے اپنی شگفتگی و تازگی کے ساتھ جنم پانے کا موقع ملے۔

اردو کی بقاء اور ترقی و ترویج کے مسئلے پر بحث کرنا اس مضمون
کا مقصد نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ اردو پر نہیں، اور اردو دلائل طبقہ، جس
میں خصوصیت کے ساتھ مسلمان ہیں، اس زبان کی بقاء اور ترقی کے لئے

ہر وقت ہر شہار اور چوکتا رہتے ہیں، بلکہ ریاستی حکومتیں، مرکزی حکومت اور بعض سیاسی جماعتیں بھی اس زبان کی بقا و ترقی کو ضروری سمجھتی ہیں۔ حال ہی میں ترقی اردو بورڈ کی جانب سے بی بی، حیدر آباد اور دہلی میں اردو کتب خانہ کی تربیت کے لئے جو مراکز کھولے گئے ہیں وہ یقیناً ایک قابل قدر اور مستحسن اقدام ہے۔ حکومت اور ملک کا سنجیدہ طریقہ جاتا ہو کر اس زبان میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی بہترین روایات محفوظ ہیں، علاوہ ازیں، علم و ادب اور دنیاویات کے خزانوں سے یہ زبان مالا مال ہے، اس کا مثلاً آج محل، قطب مینار اور گول گیند جیسی حسین و عظیم یادگاروں کے ٹٹنے سے زیادہ المناک ہو گا۔ اور اس زبان کو زندہ رہنا چاہئے اور وہ یقیناً زندہ رہے گی۔ لیکن اس زبان کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اردو داں طبقہ خصوصیت کے ساتھ

— مسلمان —

(۱) علاقائی زبانوں سے بے اعتنائی برتیں اور روزگار کے وسیع تر دائرے سے استفادہ کرنے کی اہل نہ رہیں؛

(۲) علاقائی زبان سے بے اعتنائی برتیں اور اپنے پڑوسیوں کو خود ان کی زبان میں غلط کر کے بل ملاپ نہ بڑھائیں اور انہیں قریب سے سمجھ کر قومی یک جہتی کو تقویت پہنچانے کا باعث نہ بنیں؛

(۳) علاقائی زبانوں سے بے اعتنائی برتیں اور ان کالجوں میں داخلہ نہ لے سکیں جہاں ذریعہ تعلیم علاقائی زبان ہوتی ہے۔

اس قسم کے کالج آج کل، ہندوستان کے ہر شہر بلکہ ہر بڑے گاؤں میں بھی کھلے جا رہے ہیں۔ اکثر مسلمان بچے ان کالجوں میں داخلہ اس لئے نہیں لے سکتے کہ میٹرک یا ایس۔ ایس۔ تک ان کی تعلیم کا میڈیم اردو رہا ہے اور اس کے ساتھ علاقائی زبان جو پڑھائی گئی تو اس پر اتنی توجہ نہیں دی گئی کہ اسے آگے چل کر ذریعہ تعلیم اختیار کر سکیں

اردو ذریعہ تعلیم کے ہائی اسکولوں میں انگریزی بھی بطور ایک مضمون ہی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن اس پر خاص توجہ دینا چاہیے ہے طلبہ اس میں تدریس اچھی عبارت رکھتے ہیں۔ لہذا انگریزی کو کالج میں ذریعہ تعلیم بنا کر کسی نہ کسی طرح اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھا سکتے ہیں۔ لیکن آج کل نئی نئی یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں اور ان کے ساتھ کئی کالج کھل رہے ہیں جن کا ذریعہ تعلیم علاقائی زبانیں ہیں

ہمارے اردو میڈیم سے آنے والے طلبہ ان کالجوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے لئے آپ کتنے انکشن میڈیم یا اردو میڈیم کالج کھولتے رہیں گے؟ اگر بغرض نمایاں ہر ضلع میں ایک ایک کالج بھی کھول دیا جائے تو بھی اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کو تعلیم منگنی پڑے گی ان طلبہ کے مقابلے میں جنہیں اپنے ہی شہر یا گاؤں میں اعلیٰ تعلیم کی سہولت رہے گی۔

کالج میں اردو ادب یا تاریخ ادب اردو پڑھانا اور اس میں پی ایچ ڈی تک کی سہولت رکھنا اور بات ہے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر اس میں آرٹس سائنس، کامرس، انجینئرنگ اور قانون وغیرہ کی تعلیم دینا ایک بالکل الگ بات ہے۔ اول الذکر سہولت بعض کالجوں میں حاصل ہے اور جہاں نہیں ہے اس کے لئے کوشش کی جاسکتی ہے۔ لیکن مؤخر الذکر طریقہ تعلیم کو اپنے سے پہلے کئی باتوں پر سوچ بچار کرنا ضروری ہے جن میں سے بعض کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ اردو زبان ان علوم کے لئے ذریعہ تعلیم نہیں بن سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان اس قدر قابل ہے اور اس میں بعض کامیاب تجربے کئے جا چکے ہیں

عملی طور پر یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے موجودہ اسکولوں کا میڈیم تعلیم بلند کیا جائے اور مزید اچھے اسکول کھولے جائیں تاکہ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طلبہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن ضروری ہے کہ ان اسکولوں میں علاقائی زبانوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے یعنی:

(۱) مسلمانوں کا ہر تعلیمی ادارہ اپنے مدارس میں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے علاقائی زبان کے حسب ضرورت تربیت یافتہ مدرسین رٹنڈ ٹیچرس، ملازم رکھے؛ طلبہ کو علاقائی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اہمات تقسیم کر کے ترغیب دے اور اکثر اسکالرشپس کا بندوبست کرے؛ نیز

(۲) طلبہ کے سرپرستوں کو چاہئے کہ علاقائی زبانوں کی ترویج کے لئے اگر کچھ ادارے ہوں گے تو ان کے خاص امتحانوں میں اپنے بچوں کو شریک کر انہیں؛

دعویٰ نہیں ہے اس کا کہ اہل زبان ہیں ہم

ہاں یادگار قافہ رنٹ گھاں ہیں ہم

قول و فعل کی یاد اعمالِ انسان

۱

شہابی ملاحظہ ہو۔ یہ عید کے نمازوں کے باندہ قرآن شریف اور احادیث نبوی کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والے، نماز کے فرائض سے بے بہرہ اور روزوں سے بے نیاز ہیں میرے دیانت کرنے برحق ہیں۔ اسلامی کتابوں کے پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچاؤ، مراکھ مستقیم پر چلو، جو اور جیسے دو کے مقولے پر عمل کرو۔ اپنے ضمیر سے اپنے عمل کا احتساب کیا کرو، اور نماز زکات و حج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ مجب ہما نے پوچھا تو انھوں نے فرمایا 'خدا کو نیکوئے توجہ ادا کرو۔ ہم ٹیکس سسٹم ٹیکس، ڈائری ٹیکس وغیرہ دیگر ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد میں یہ عزوری نہیں سمجھتا کہ زکات بھی دی جائے۔' 'اگر نماز؟' جب جی چاہے نماز پڑھی جائے میں نے جب جب نماز پڑھی ہے تب تب اپنے آپ کو خدا سے حضور میں پایا ہے۔ اور قرآن کے مطالعہ نے مجھے ہمیشہ سکون بخشا۔

کھاد اور باندرہ کے لنگنگ روڈ پر مسیحائیوں کا ایک موٹل ہے اور اس موٹل کے اوپر ہے ایک گیٹ ہاؤس اس گیٹ ہاؤس کا ایک کمرہ — جی ہاں ایک کمرہ ایک حکیم صاحب نے اپنے رہنے پہنے اور طبابت کرنے کے لئے کچھ چھوڑا ہے عرب تین روز قبل کی بات ہے ایک چوڑی فروشن نے اس حکیم پر یہ الزام لگایا کہ وہ حکیم اس چوڑی فروش کو مرقی، میرے، جاڑی اور سونا بہاں تک کہ کو کہیں بنانے کا نسخہ بتائے گا۔ اور آں واحد میں ملینیر Millionaire بنانے کا بیچارہ چوڑی فروش

تورمہ اور پراٹھا کھا چکنے کے بعد جب برائی کی پلیٹ ہلدے سامنے آئی تو بہتری گفتگو بھی دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔ میں نے پوچھا 'حال میں آپ نے کون سی بھی نعم دیکھی؟' 'نہیں؟' وہ چنکا میں رمضان کے دن میں غلیں نہیں دیکھتا۔' 'لیکن قبلہ اسی ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ آپ روزے نہیں رکھتے تو غم دیکھنے میں کونسی قیامت ہے؟' اس کا چہرہ بلی سونہ ہو گیا جیسے شہر کی کوئی میٹھی بوسہ دے گئی ہو۔ 'آپ کیا جانیں رمضان اہل مبارک کا احترام، اس کی برکتیں، فضیلت، سمجھا تو مہینہ ہے کہ.....' میں یہ جملہ مکمل طور پر نہ سنا سکا اور میں سمجھا کیسے لگتا تھا اس ہوئی میں پہلے ہی بڑا تعفن تھا کہ اس کی بالوں سے آئی ہوئی دودھ کی بو نے میرا ایک بلی زہاں بیٹھنا دو بھر کر دیا۔

میرے ملاقاتیوں میں شمالی ہند کے ایک صاحب ہیں جو ڈھاکا ہار، بڑے شہر چہرہ اکٹہ وہ پشانی، سترائیاں، غرض کہ خوبصورت اور شریف آدمی ہیں جلی اصباح لگتے ہیں نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید فرماتے ہیں۔ دن بچکے ہی روزی روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ وہ اذانوں سے کر لیک نہیں کہتے اور نہ نماز بہامت ادا کرتے ہیں۔ نمازی جب تمام سنتیں اور غلیں پڑھ کر مسجد کے داخلی دروازے پر چپلوں اور جوتوں کے ڈھیر میں اپنی اپنی چپلیں اور جوتے تلاش کرتے ہیں تو اس وقت یہ صاحب لگتا حاضر ہوا کہ کہہ کر بڑی تیزی سے مسجد کے اندر چلے جاتے ہیں۔

ایک سوڈان اور پڑھے مجھے دوست کی اسلام

۱۔ مسلمان = اسلام (نماز + روزہ + زکات + حج) ؟

جو کہ اپنے کانڈھوں پر چوڑیوں کا ذنی شریکس اٹھائے گلیوں گلیوں
 چوڑیاں لیسلو۔ فیشن ایبل چوڑیاں لیسلو، کی آواز لگا پھرتا
 تھا اور اپنے پسینہ کی تر روٹیاں کھاتا تھا اس حکیم کے مکر و فریب
 کا شکار ہو گیا۔ اور پانچ ہزار نقد بیوی کے زیورات اور اپنے
 متعلقین سے لئے ہوئے ہزاروں کی قرض سے ہاتھ دھو بیٹھا
 اس واقعہ کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ ان دونوں میں صلح و صفائی
 کرانے والوں کے چورہ طبق روشن ہو گئے جب یہ دونوں حضرات
 باہم ہو کر حلف اٹھا گئے حکیم نے یہ کہہ کر کہ اس چوڑی فروش
 نے ایک پائی بھی اسے کسی صورت میں نہیں ادا کی اور اس
 چوڑی فروش نے یہ کہہ کر کہ وہ نہ صرف نقد پانچ ہزار بلکہ اپنا سرمایہ
 ہستی اس حکیم کا نذر کر بیٹھا ہے۔

ایک ڈاکٹر صاحب ہیں مسلمان ہیں اور بیکر ملاقاتی
 ہیں۔ کراچی رہتے ہیں اور پریکٹس کرتے ہیں کرنے کے
 فوراً بعد مشرق وسطیٰ کے کسی شیخ کے شیخ دم میں بڑی اونچی تنخواہ پر
 نوکر ہوئے چند ہی سال میں وہاں سے اتنا کچھ بچا لائے کہ وہاں پر اپنی
 ڈسپنری (کھول بیٹھے۔ ایک روز
 دوران گفتگو فرمانے لگے۔ 'یار یہ جو مسلم لگی ہے ناگت گیان
 اس سے بڑا بھلا ہوا ہے۔ بیسیویں ۷۰ء کے مہینہ روزانہ علان
 کے لئے آنے لگے ہیں لیکن میں بھی انہیں آؤ بنائے ہوئے ہوں،
 بجائے پاورنل ڈور دینے کے (بغیر ۱۰)
 چینی سلین کا دیک ڈوز دیتا ہوں یعنی جو کام پچھ انجکشن میں ہوجاتا
 ہے اسے میں بارہ سے بیس انجکشن میں کر رہا ہوں۔ آخر اپنے کو بھی
 تو دھندلا کرنا ہے۔

غرب گلی بڑی بدنام جگہ ہے کیا کیا جائے کہ سعادت حسن
 منٹر کو بھی کچھ عرصہ کے لئے وہاں قیام کرنا پڑا تھا اور میں بھی وہاں
 بیس سال تک رہ چکا ہوں۔ وہاں ایک نوجوان رہتا ہے اتفاق سے
 پندرہ روز پہلے میری اس سے بات چیت ہوئی پہلے موضوع
 ادب بنا سبھر سنا اس کے بعد طوائفوں کے بارے میں ہم ایک
 دوسرے کو اپنے تجربات بتاتے رہے کہ بات مذہب تک نہ پہنچی
 تمہارے نزدیک خدا کا کیا تصور ہے ؟

خدا ایک سفید ریش، بڑ جلالی، بڑ نور اور بڑی پر حلم شخصیت کا مالک
 ایک نہری تخت پر بیٹھا ہے اور اپنی نظر کے اشارے سے پوری
 کائنات کے نظام کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ ۶
 مذہب اسلام ہی دنیا کا سب سے حقیقی، دیر ساندھک مذہب ہے
 نہ تو بھرتہ اس پر عمل کیوں نہیں کرتے ؟

مسل۔ عمل میں ضرور کردیں لیکن ابھی میں اس کی روح کو سمجھنے
 کی کوشش کر رہا ہوں۔ دراصل ان سولہویں ملاؤں نے اس کا صورت
 مسخ کر دی ہے اور اس پر اتنی گمراہی ڈالی ہے کہ اصلیت کئی
 تہوں میں جا چکی ہے :

تر اس کی روح کو سمجھنے میں تمہیں وقت لگے گا۔ ۶ میں ابھی
 ستائیس سال کا ہوں۔ تین تیس سال کے عرصے میں میں ضرور اس
 کی اصلیت کا سراغ لگا لوں گا۔ پھر دوبارہ کا مکان ہے ایک
 توبہ کہ میں یہ مسلمان ہو جاؤں اور دوسرے یہ کہ دہریہ نہ

میرے محترم دوست ایک روز عرب خانہ پر تشریف لائے
 ایک طغزے کو دیکھ کر فرمانے لگے 'آج پہ جلائے آپ مسلمان ہیں،
 حضرت یہ میرا نہیں میرے والدین کا گھر ہے میں یہاں نہیں کہیں
 اور رہتا ہوں۔

انسان آخر کب تک حقیقت سے اسکا ہونے کے بعد
 بھی اپنے آپ کو بہلاتا رہے گا اپنے ضمیر کو تھپکیں دے کر سلاتا
 رہے گا۔ اپنی سمجھ پرست اٹھتے ہوئے پردے کو بار بار گزرتا رہے گا
 اپنی آنکھوں میں نابینائی کا ستر لگاتا رہے گا شخص اس حقیقت سے
 واقف ہے کہ کسی مذہب کی مسلک یا کسی ازم کو تسلیوں میں نہیں
 بلکہ مکمل طور پر قبول کیا جاتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں مسلک فلاں
 ازم میں یہ یہ اچھائیاں اور یہ یہ برائیاں ہیں اس لئے ہم اچھائیوں کو
 اپنائے ہوئے ہیں اور برائیوں کو چھوڑے ہوئے ہیں لیکن یہ کہنتا
 مذہب اسلام میں قطعی طور پر نہیں برتا جا سکتا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے
 کہ قرآن اُسمان کتاب ہے محمد رسول اللہ خدا کے بھیجے ہوئے
 پیغمبر ہیں اور مذہب اسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ظہور
 میں آیا ہے اور ان پر مکمل ہو چکا ہے کہ سب اس میں اپنی سہولت
 اپنی سستی، اپنی کالی اندنا بھی یا دانشمندی کی بنا پر اپنی اور کئی ہونے

فلک کی دہ سے یا دوسرے مذاہب و ازموں کا بھی تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ترمیم و تنسیخ کرنا یا اسے مکمل طور پر نہیں بلکہ قسطوں میں ایسا درحقیقت اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔

مندرجہ بالا چھوں مناظروں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ مذہب اسلام کے پیروؤں نے اپنی کچھ بوجھ اپنا قابلیت اپنی بات ط کے مطابق اس کی پیروی قبول کی ہے۔ ہر مثال ظاہر کرتی ہے کہ نہ تو مسلمان کے روزے ترک کئے جاسکتے ہیں نہ نماز قضا کی جاسکتی ہے نہ زکوٰۃ سے کسی مسلمان کو مستثنا سمجھا جاسکتا ہے نہ حرام روزی اسلام کی رو سے حلال کبھی جاسکتی ہے اور نہ کبھی جھوٹی قسم کھاؤ جاسکتی ہے نہ کسی کا مال غصب کیا جاسکتا ہے نہ کسی رضی کا استحصال کیا جاسکتا ہے اور نہ خدا کو ایک بزرگ و برتر شخصیت کے روپ میں تصور کیا جاسکتا ہے نہ تو کلمہ پڑھنے کے بعد اپنے وجود کو دو کشتیوں پر سوار کر لیا جاسکتا ہے اور نہ دس سے بیس سال کے طویل عرصے تک اسلام کی روح کو سمجھنے کے لئے تعیش پسندی اختیار کی جاسکتی ہے۔

در اصل ہر مسلمان کی زندگی اس کے رسول خدا اور خلفائے راشدین کی مس ہونی چاہیئے۔ اسے فکر و اہمال میں بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے اس کے لامحکم عمل کو اپنانا چاہیئے۔ حضرت اگر معصومیت سے اپنے اپنے طور پر اسلام کی پیروی کر رہے ہیں تو خدا کے یہاں ان کی بخشش ہو سکتی ہے اور اگر جان بوجھ کر اس مذہب کو اپنی سہولت یا خواہش کے اعتبار سے اپنا لئے ہوئے ہیں تو شاید ان ہی کا نارجم انتظار کر رہی ہے ایسے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانا چھوڑ دیں یا پھر اتنا دل و جسگ پیدا کریں کہ مذہب اسلام میں یہ تمام (اصلاح) کی ضرورت پر زور ڈالیں وقت پہلے ہی بہت بیت گیا ہے۔ زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے۔ یہ فیصلہ ہر شخص کو خود ہی کرنا ہے اور فوراً کرنا ہے۔

★

جو ایسا ہے وہ مسلمان نہیں

دروغ گو، وعدہ خلاف، دغا باز، ختاں، سوس، لالچ، چور، بے ایمان، راکشی، شود خور، شرابی، غصہ ور، حاسد، چھپورا، نمائشی، فضول خرچ، زلف، ملعون، دشنام دہان، اور حرام خور یعنی اپنے کاروبار میں آٹے میں نمک زیادہ ملائے کمانے والا۔ ”یہ مسلمان دنیا میں نیکی کا پیام بن کر دیتا ہے، نیکی پھیلتا ہے، اور اپنے مفاد کو قربان کر کے برائی مٹاتا ہے۔“

(حکایت)

فصل در بیان مسلمان

اس زہر بھری دنیا میں جنہیں اپنا بھی مرض معلوم نہیں

در اصل ہندوستان کی تاریخ کے صفحات سے

ہندوؤں مسلمانوں کے جس مشترکہ کلچر اتحاد و یکگاہت کا بار بار حوالہ دیا جاتا ہے، وہ عبارت تھا: اکبر، جودھا بائی، منٹوی تحفۃ الہند، مٹیابرج، داراشکوہ، لڑائیوں، پھولوں والے میلے، کبیر، امیر خسرو، محمد بن تغلق، دین الہی، میرزا مظہر جان جاناں اور درویش کے بھڑکے سے۔۔۔۔۔ آج بھی اس تاریخ کو دہرا یا جھلکا ہے۔ اور اندازہ لگتا ہے پیدا ہو سکتا ہے، لیکن اس کے لئے دونوں طرف آگ ہو جاوے گی ہوئی۔ درویش کوئی قسمت کی شکایت نفی ہے۔

یہ دونوں فرقوں کے دلوں میں خلاص دیم دردی

ایشور دھرمانی اور پیار و محبت کی بھڑکنی ہوئی آگ ہی تھی کہ۔۔۔۔۔ دشمنوں نے ایک رات شاہ عالم گزرائی کو قتل کر کے جہنم کے قتل پر ڈال دیا تو برہمن زادی رام کو رات بھر اپنے باؤں کا سر زانو پر لئے بیٹھی روتی رہی۔۔۔۔۔ کہ ایک ہندو رانی کی راکھی پاکو، اس کے دشمن کا قلع قمع کرنے کے لئے سپاہیوں میدان جنگ میں کود پڑا۔۔۔۔۔ کہ جہاں گیر اور جودھا کی شادی ہوئی تو شہنشاہ اکبر خدا بچا بہو کے چنڈول کو کندھا لگا کر لایا۔۔۔۔۔ کہ پشیمنے کے ایک ایرانی سوداگر نے ایک برہمن زادے کی حسین آنکھوں پر زینت ہو کر اپنا ایمان بیچ دیا۔۔۔۔۔ کہ قیدی خانہ خاناں جنگ میاٹ کے فاتح رانا پرتاب کے مہر و کرم کو نہ بھول سکا اور چوبیس برس بعد جب رانا نے اپنا سراٹھاتے غم کرنا چاہا تو اکبر کے رتن خاص نے لئے جنگ جادی اور خدا پر بھروسہ کرنے کی ہدایت دی۔۔۔۔۔

ہندوستان پر مسلمانوں نے، ایک ہزار برس

تک حکومت کی، اس سڑھے میں یہاں کے ہندو مسلمانوں کے محکوم رہے لیکن انہوں نے وقت کے فیصلے پر مسلح ہونے کا اور زمانے کی پیشانی پر شکن خوردار نہ ہونے دی۔ انہوں نے مسلمانوں کے دوش پر دوش ہندوستان کے ہزار شیوہ درنگ، بکھرے وہ آب و تاب پہلا کی ادا سے وہ انداز دلیرانہ بننا، جسے تاریخ عالم کے دشمن باب سے تعبیر کر سکتے ہیں انہوں نے ہر شعبہ حیات میں اپنے یادگار نقوش چھوڑے وہ اپنے عقل الہی اور جہاں پسناہ کے لئے ہر کڑے وقت میں سینا ہر ہو گئے، دشمن نے ملک کی جانب نگاہ عطا انداز ڈالی تو وہ شمشیر کھنڈ نظر آئے، اکثر مواقع پر جب ہندوستانی نظام معیشت، معاشرت میں رخنے پڑ گئے، اس وقت عقل و ہمت مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو سیاسی مفیروں، مبلغ کاروں، اور وزیروں کے فہم تیز کرنے کا ملک کو سنبھالا دیا، اس ملک کے منبع شناس ہونے کا وہ سے ان لوگوں کا ایک گروہ ہمیشہ مسلم حکمرانوں کا دست راست بنا رہا۔ وہ اسلامی رسوم و رواج، اخلاق و عادات، مسلک و عقائد اور تہذیب و تمدن کے رنگوں میں رنگ گئے اور ان کی کٹناہ دلی، وسیع مشربی اور خد سپردگی سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے بھی ان کی تہذیب و تمدن کو گلے لگا لیا، اور ہر قدم پر ان کے غلوں خدمت کو سراہا اور نوازا، کبھی بول بھی ہوا کہ مسلم حکمرانوں نے ان کی کم چٹائی کا جلن اختیار کیا، لیکن اس وقت بھی وہ اپنے 'آن داتا' اور 'خدا داتا' کے گن گاتے رہے۔

کہ اکبر نے جب دو راجپوتوں سے ان کی بیادری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کہا تو انھوں نے تیز سے کی انیاں اپنے سینوں میں بھردیں۔

تاج محل، گرانٹ ٹرنک روڈ، دیوان قاب حیدر آباد اور ایسے کتنے ہی نقوش، اس مہدی پارسیا سے آج بھی زندہ ہیں۔

دست قدرت نے اس بے مثال کلچر کا سانچا ڈھالنے میں جس حسن کاری اور ہنرمندی کے کمال کا ثبوت دیا تھا، اسے پاش پاش کرنے میں بھی اپنے قوتِ بازو کا بڑی نراچی سے استعمال کیا۔ آج وہ کلچر مورتِ اساطیر کہیں کا حصہ ہے۔

دو یا میں ایک لہر جس طرح دوسری لہر کو مٹاتی اور فنا کرتی چلی جاتی ہے۔ وقت کے دھارے میں بھی اسل جلد بدل سنبھل نہیں سکتا۔ تمدن سو تو تمدن مقدم کو اور حکومت نو حکومت ہمیشہ کو ختم کرتی گزر جاتی ہے۔ کل فرق مثل سے تاج محل کی رانی تیار لیا گیا تو آج دستِ افروز سے زمام حکومت چھین لی گئی۔

انگریزی حکومت کی عمل داری کے خانے پر جن مسلم راہ نمادوں کی کوششیں کے نتیجے پاکستان کا قیام ظہور میں آیا، انھوں نے اپنے بے مثال تہذیبی دشنے اور اپنے عظیم تاریخی کردار کو فراموش کر دیا تھا، درحقیقت انھیں ان کی حکمرانی اور جہاں باقی کے خاتمے نے ایک طرح کے عدم تحفظ اور احکام کی کمی سے دوچار کر دیا تھا۔ بہر حال ان کے دامنوں پر تقسیم ہند کے خونیں المیے کا دانا، آج بھی ہمارے سینے کا رستا ہونا سورا ہے۔

جس سیاست اور جن حالات کے تحت ملک کی تقسیم عمل میں آئی تھی، اس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کا باقی رہ جانا جبرتِ گاندھی اور نہرو کا سچہ نہیں بلکہ پوری ہندو قوم کی ردا داری کی روشن مثال ہے۔ نفرت، تعصب اور فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا نفا میں بھی ملک کی بہت بڑی اکثریت نے بڑی سمجھ داری سے کام لیا اور یہاں جذبات فرو ہو جانے کے بعد وہ طریقے اپنائے اور پالیسیاں اختیار کیں جو صحیح سستہ تھیں،

ہندوستان مسلمانوں کی تنگ اور فرقا دارین

بھی کی دوسرے سرزمین ہند آج تین حصوں میں تقسیم ہے۔ بیسن ہندوستان مسلمان نے اپنے اعمال و کردار کے اعتبار کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ بستی آزادی کی گھڑی سے آج تک وہ کی تم پرید اور بغاوت کشیدہ عافیت کی طرح حکومت کا ٹکڑہ سمجھ رہے وہ حکومت کی کم نکامیوں، بے مروتیوں، ستم آزمائیوں اور خفاشیوں کی ایک فہرست طوفانی رکھتا ہے جب کہ خیرات کے گھوڑے کے دانت نہیں دیکھے جاتے۔ اور اس کی خفا تیں بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

کل ہندو ملکیت اور ہندو شہیت کے دوسری زندگی بسر کر رہا تھا، آج مسلمان سیکولزم اور سوشلزم کی نفا میں راسخ لے رہا ہے۔ کل ہندو اکثریت مسلم اقلیت کی حکومت تھی، آج مسلم اقلیت ہندو اکثریت کی حکومت نہیں۔ کل یوں بھی ہو کہ ہندو ذاتی کہلایا اور اسے جزایا اور کرنا پڑا، آج مسلمان پر اس قسم کا کوئی یبل نہ چپاں ہے، مذہب ایسا کوئی ٹیکس ہی ادا کرتا ہے۔ کل کا ہندو عہد وسطا کے بندھے ٹکے ڈھرتے پر محسوس تھا اور ایک غیر صنعتی دور میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا، آج کا مسلمان ایک صنعتی اور سائنسی ننگ عہد اور ایک جدید نظام مناسرت میں کاروبار و بائیں طے کر رہا ہے، اب بکھنا رہے کہ ان مقامی سے باوجود آج کا مسلمان اپنے اس عہد کے لئے کس حد تک کارآمد ہے؟

ایک مشہور دولت مند حسینا نے ایک مصور سے اپنی تصویر بنوائی، جب تصویر بن کر مکمل ہوئی تو حسینا نے مصور کو ڈانٹتے ہوئے کہا: پچھلی بار جب تم نے میری تصویر بنائی تھی تو وہ اس سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ مصور نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا، مسیوم! یہ بھی تو دیکھئے کہ آٹھ برس پہلے جب آپ نے تصویر بنوائی تھی تو میں کافی جوان تھا۔

مرد زمانے ہرنے کی صورت بدل دی ہے لیکن ہندوستانی مسلمان آج بھی لذتِ ظاہر و دوشینا میں طے ہوئے، آئینہ آیام میں اپنے عہدِ رفتار کا ادائیں دیکھنے کے متمنی ہیں

اے سیکورڈ میوکرسی اپریل ۱۹۷۷ء میں شہباز حسین کی ایک تقریر سے ماخوذ ہے۔ ادنا قیر کے ساتھ۔ ... ج۔ غ

اور دوسرے جدید کی تبدیلیوں سے انجان رہ کر اور زمانے کے مزاج کو نہ پہچان کر اس حدیث کے سے بھولے بن کا ثبوت دیتے ہیں۔

وہ آج کے سیکولر جدید میں عملی گزرمیونی درستی کا اقلیتی کردار بحال رکھنا چاہتے ہیں۔ گہرے معاشی بحران سے گھرے اور آبادی کے اضافے سے تنگ ملک میں بحران سول کو دے دیں کے غلات کم دن شن منعقد کرتے ہیں اور اپنے نرنے کے لئے چارخادلوں کے حق کا تحفظ چاہتے ہیں۔۔۔

ان کا فرقہ پرستی کی انتہا ہے کہ آسام کے سیلاب یا بحال دہیار کے معصیت زدگان کے واقعات س کر ان کا دل نہیں پسجتا لیکن شام و فلسطین کے در انداز حالوں کے لئے ان کا دست کرم ہن برسائے گھٹا ہے اور وطن عزیز کی راہ میں خون بہانے والوں کے لئے احسن و مرجا کی صدائیں بھی بلند نہیں کی جاتیں لیکن اسرائیل کے ہاتھوں پٹ کر کھنے والوں کے لئے باتامہا طبعی رند بھیجے جاتے ہیں۔ وہ آج کے مشینی

دور میں دیوندار سلاٹر باؤس کی مخالفت میں طوفان برپا کر دیتے ہیں اور ان کی شرہ پر غیر قانونی اور غیر سائنسی یک مذبحوں کا قیام فروغ پاتا ہے۔۔۔۔۔ وہ تعلیم کے میدان میں سب سے پیچھے اور اٹھ گنگ اور غیر قانونی تجارت میں سب سے آگے رہ کر کرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اپنے عدم تناسب کا رزاروتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ اپنے لئے مراعات اور سہولتیں حاصل کرنے کے لئے سیکولرزم اور سوشلزم کی دہائی دیتے ہیں اور پس پر اسلام لگیا مسلم مجلس، جماعت اسلامی اور جمعیت علماء عیسوی فرقہ پرست اور متعصب پارٹیز کی پیٹھ تھکتے ہیں۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ وہ مدعی ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو ربستی اور تنزل کے گردھے سے نکال کر، انھیں ان کا جائز مقام عطا کیا اور ان کے حقوق کی حفاظت کی، لیکن اس کے برعکس مسلم عورتیں دنیا کے کسی بھی نرنے کی عورتوں سے کہیں زیادہ جہل، نا برابری ہستم آزمائی اور ہوس رانی کا شکار نظر آتی ہیں۔

وہ فرقہ پرست خیالات اور نظریات کی تبلیغ کو صحافت کی آبرو، ترقی پسندی، اور جدیدیت کے نام پر تنگ

بندی اور اقتدار دہی کے مرے سجائے کو ادبی تری، اور اردو کے آؤٹ آف ڈیٹ، رسم خط کی تبدیلی یا اس میں اصلاح کی حقانیت کرنے کو اردو زبان کی خدمت کہتے ہیں۔

وہ شریعت اور اسلام کو ایک دوسرے کا مترادف گروانتے ہیں اور ان کا دائرہ شریعت کر معشوق سے زیادہ تنگ واقع ہوا ہے، جہاں شریعت میں ترمیم یا اصلاح کی بات ہوتی۔ انھیں اسلام کی بنیادیں ڈوٹی نظر آتی ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی، جس پر بر اتفاق سب کا عمل درآمد ہو۔

ان کی رسوم و قیود کے خمار کی سرگشتگی ہنوز نہیں گئی اور وہ آج بھی بے شمار کوہکات و خرافات میں مبتلا ہیں۔ وہ اپنی آشفتہ حالی کے کلامتہ نہ ہرتے ہیں، لیکن اپنے تصور نہم کا احساس نہیں کرتے۔

ان کی گم راہیوں کا سب سے بڑا سبب مسلم علماء ہیں، جنھوں نے انھیں مار جہنم کے شعلوں سے ڈرا کر اور جنت کے سبز باغ دکھا کر ہمیشہ اپنا آؤسیدھا کیا اور انھیں مذہب کا نشا گھول گھول کر اس حد تک بلایا کہ انھوں نے ذوق عمل کی کوتاہی کو بخت نارسا کا نام دے دیا۔ وہ محمدی قسمت کو نوشتہ تقدیر اور ستم روزگار کو مرضی ٹو کا سمجھ بیٹھے، اور رنج دمن زمانہ کو باعث نجات احمدی اور تنزلی قومی کو قرب قیامت کی نشانی یقین کر لگے۔ یہ غلط سمجھ نہیں ان کا قومی تنزل، دوسروں کے لئے نہیں توان کے لئے ضرور قیامت کا پیغام ہے۔

اس زہر بھری دنیا میں جنھیں اپنا بھی مرض معلوم نہیں اکثر وہ بزرگ چارہ گری میاں کی باتیں کرتے، میں



بے نقد عمل جنت کی طلب کیا شے ہیں جناب داعط بھی سٹھی میں نہیں ہیں دلم و درم بازار کی باتیں کرتے ہیں

لہ شریعت نام ہے فقہاء اسلام کے مرتب و مدون کئے ہوئے قوانین کا۔۔۔ ج۔ خ

مسلمانوں کے معاشی مسائل

کی جڑ ایک ہی ہوتی تو دوسرے درمیان فرق نہ پانت کرنا محض ایک سی مہم ہوتی۔ لیکن اگر ہم ذرا گہرائی سے اس بات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کچھ خاص تاریخی واقعات نے دوسرے فرقوں سے زیادہ مسلم فرقے پر اثر ڈالا وہ واقعات کیا ہیں؟ یہ سمجھنا بہت مندرجہ ذیل ہے۔

اول تقسیم نے مسلم فرقے کو منفی طور پر جتنا متاثر کیا اتنا کسی بھی دوسرے فرقے کو متاثر نہیں کیا تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کو اور خاص طور پر شمالی ہند کے مسلمانوں کو ذہنی طور پر ایک حلقہ کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ جو لوگ انگریزی تعلیم سے ذرا بھی مایوس تھے، وہ ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اور ان لوگوں سے جو نسل زمین قربت رکھتی تھی وہ ہندوستان ہی میں رہ گئی تھی۔ اس نسل کو غیر وفاداری کے عظیم سیلاب میں تنہا کر رکھا تھے رہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایسے غیر مستحکم حالات اور ماحول میں جہاں دار رکھنا سیلاب میں مکان بنانے کے مراد ہوتا تھا۔ اگر ہم آزادی کے بعد پہلے دس پندرہ سالوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے بہت کم کارخانے اور ورکشاپ قائم کئے اور اس کی صورت ایک ہی وجہ تھی کہ ایک شخص اسی وقت گھر بناتا ہے یا کارخانے قائم کرتا ہے، جب اسے کچھ دن تو موجود رہنے کی امید ہو! تقسیم نے ان کے اعتماد کو ٹھیکس پہنچائی تھی اور وہی ہی کمی آئے دن کے فسادات نے بڑی کر دی لیکن مسلمانوں کو یہ اعتماد دوبارہ قائم ہی کرنا پڑے گا۔ اور سیکولر ریاست کی بنیاد کو مضبوط دیکھنے کی خواہش مند لوگوں کو اس اعتماد کو برقرار رکھنے میں ان کی بڑی پوری اور ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

کیا مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے معاشی مسائل کے بیچ کسی قسم کا امتیاز کیا جاسکتا ہے؟

یقیناً نہیں! ہندوستان میں مسلمان معاشی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم انہیں نہ قومی خاص پیشے سے منسلک کر سکتے ہیں اور نہ کسی خاص آمدنی کے گروپ سے۔ اور نہ انہیں سرمایہ دار کسان یا مزدوری کے گروپ میں مستقیم کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت معاشی نقطہ نظر سے انہیں کسی حلقے میں رکھنا بہت مشکل ہے مسلمانوں میں بھی دوسرے فرقوں کی طرح ایک گروپ صرف اپنے ذاتی اور نقصان تک دل نہیں دیکھتا ہے۔ مشن زمینوں اور بلڈنگوں کے مسلم مکان کو مسلم مزدوروں کے مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کی معاشی حالت مختلف جگہوں پر مختلف ہے شمالی ہند کے مسلمانوں کے مسائل جنوبی ہند کے مسلمانوں کے مسائل سے قومی طور پر مختلف ہیں مسلمانوں کی معاشی حالت پر جب غور کرتے ہیں تو دوسری حقیقت یہ برآں ہے کہ معاشی حالت و مسائل قومیت کی بناء پر تقسیم نہیں کئے گئے ہیں۔

اس صورت میں ذہنی طور پر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا الگ سے جائزہ لینا مفید ہوگا؟ کیا اس سے ملک و قوم کی رہنمائی ہو سکتی ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ معاشی طور پر مسلمان کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے لیکن پھر بحالہ ایک خاص سماجی رتبے کے مالک ہیں۔

اگر مسلمانوں کے معاشی مسائل اور دوسرے فرقوں کے معاشی مسائل

سے منہ موڑ لیا تھا۔ پھر بھی دست کاری اور گھریلو صنعتوں کو بڑھانے اور حمایت ملنے سے مسلمانوں کو بہت حد تک مدد ملی۔

پھر بھی یہ مہم اس زخم کا مداوا نہ کر سکا جو قیادت کے فقدان تعلیم یافتہ طبقے کی ہجرت اور زمین داری کے خاتمے کا نتیجہ تھا۔ سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔ ایک یا متعدد تھک اور بے لوث قیادت کا فقدان!

سماجی سطح پر خانہ ان کی تقسیم بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے طرہیجذی ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں سماجی زندگی کا بنیادی ستون فرد نہیں بلکہ خاندان ہوتا ہے۔ مشترکہ خاندان ہماری قومی زندگی کا ایک خاص پہلو ہے۔ تعلیم یافتہ اور با شعور لوگوں کی ہجرت ایک بڑے مسئلہ کی پیداوار کا باعث بن گئی۔ مشکل لوگوں کی شادی کے لئے لڑکے اور لڑکوں کے لئے لڑکیاں! معاشی اور نوکری کا پیشہ موانع کے دائرے میں ایک منطقی قوت کام کرتا ہے اگر گھر کا ایک فرد کسی انجینیئرنگ پر فائز ہو جاتا ہے، یا سماجی لیڈر بن جاتا ہے، تو وہ گھر کے دوسرے افراد کو اس میدان میں لانے کا بہانہ بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نوکری کے مقابلے میں بھی اس کی امید زیادہ روشن ہوجاتی ہے۔ یہ کسی طرف داری کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ احمول ٹریننگ اور خاندانی پوچھ گچھ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو آدمی کو ترقی کرنے پر اکساتا ہے۔

مسلم آفیسروں کے رشتے دار ہیں۔ برائے پوت اور گورنمنٹ آفسروں میں ملتے ہیں لیکن اپنے عہدے پر مسلمانوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کی ذات سے بہت کم مسلمانوں کو فائدہ پہنچ پاتا ہے۔ ملک دو قوم کی معاشی حالت میں مسلمانوں کا حصہ ان کی آبادی کے لحاظ سے اتنا سناگ حد تک کم ہے۔

تقسیم کے فوراً بعد کے دنوں میں ہجرت اور جائیداد کی منتقلی کے قانون نے مسلمانوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔ سرسری طور پر دیکھتے ہی معلوم ہوجائے گا کہ اب ان کی بہت کم جائیداد رہ گئی ہے۔

انتظامیہ اور اسکولوں سے اردو کی بجائے دہلی نے بھی مسلم

معاشی زندگی کو بہت حد تک متاثر کیا۔ پرانی اور نئی نسل کے بیچ کی کڑی ٹوٹ کر رہ گئی اس کے علاوہ مسلم گھرانوں اور نامہ انکولو کے بیچ ایک خلیج بن چکی ہوئی۔

مجموعی طور پر ان تمام چیزوں کا مسلمانوں پر منفی اثر پڑا۔ وہ ذہنی پسماندگی اور غیر محفوظی کا شکار بن کر رہ گئے جس نے معاشی میدان میں ترقی کی راہیں مسدود کر کے رکھ دیں۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا مدد نقطہ نظر سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

کس حد تک خود مسلمانوں کی نااہلی انہیں معاشی میدان میں ترقی کرنے سے روک رہی ہے؟

کس حد تک مسلمان اقبیاز برتتے جلنے کا شکار بن رہے ہیں؟ اور کس طرح ان کی معاشی حالت پر یہ اثر انداز ہوتا ہے؟

جہاں تک مسلمانوں کی اہلیت کا سوال ہے ہمیں اس کا جواب خود ان کی سماجی اور تعلیمی اہلیت سے اخذ کرنا ہوگا۔ اور اس راہ میں جو حور روڑے آئیں، انہیں ہٹانا ہوگا۔

جہاں تک اقبیاز برتنے جانے کا سوال ہے جیسے عام طور پر فرقہ پروری کہا جاتا ہے اس سلسلے میں کوئی خاص اعداد و شمار یا حقائق نہیں ہیں پھر بھی ہندوؤں کے منسلکے اور غیر سرکاری طبقہ جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے، وہ بہت بے پھر بھی اس سلسلے میں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

گو فرقہ وارانہ فسادات ملک میں عام نہیں ہیں لیکن اب اور تب ہوئے ملتے یہ فسادات نہ صرف اس علاقے کے مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیتے ہیں بلکہ دوسرے علاقے کے مسلمانوں کے دل بھی ان دیکھے خوف سے ذہنت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں یہ تمام فسادات نئی نسل کے اس پر بھی سستہ برا اثر ڈالتے ہیں۔ بے شک معاشی ترقی کے لئے محفوظ ہونا بھی بہت ہی ضروری ہے بلکہ مار کا اصولوں میں سے ایک ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان صرف چند خاندان ہی میں کمال کا دورہ رکھتے تھے اور تقسیم کی وجہ سے وہ میدان ترقی ان کے احوال سے بڑے سہے نئی نسل نے گھٹے گئے

ماحول ذہنی طور پر ہرگز نہ اور کم مواقع والے ماحول میں آنکھ کھولی
اندیشہ یہ ہوا کہ جہاں پرانی نسل سختی دلائل تک بھی نہ پہنچ سکی۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مہم اسلام کیا
کرے؟ یہ سوال خد مسلمانوں کے ہی سامنے رکھا جائے اور وہ آنکھوں
سے اپنے بے لاگ نظریے کا اظہار کریں تو ہمیں تین قسم کے سرچے
دلائل کے جواب ملیں گے!

۱۔ پہلا طبقہ اپنی فرقہ پرست لوگوں کا ہے، جو اب بھی ماضی
میں سستہ ہیں، اور اگر ان کے اقاؤں میں تمام سیاسی اختیارات دے
بھی دیئے جائیں تب بھی یہ غیر مطمئن ہی ہوں گے انھیں اس سے ملکی
مطلب نہیں کہ مسلم فرقہ اس قابل ہے بھی یا نہیں۔ یہ طبقہ نہ تو مسلمانوں
کے مسائل پر توجہ دے گا نہ کسی تعمیری ہی کام میں
حصہ لیتا ہے۔ دوسرے فرقوں کے ساتھ مسلمانوں کا بیل جول دیکھتے
ہی یہ سمجھتے ٹپکتے ہیں۔

دوسرا طبقہ قومی لوگوں پر مشتمل ہے۔ انھیں چار طرف
سامیروی ادھما دھما ہی نظر آتی ہے۔ یہ آدھے بھرے گلاس کو ہمیشہ
آدھا حاشی گلاس ہی کہتے ہیں۔

تین دلوں طبقات کے نظریات سے ایک یہ بات سمجھنے
محدود ملتی ہے کہ جب تک مسلمانوں کو سیاسی اقتدار نہیں مل جاتا ہے،
تو ترقی نہیں کر سکتے مسلمانوں میں اس قسم کی ذہنیت عام ہے اور یہی
ذہنیت فرقہ کی علاحدہ پسندی کی آگ کو ادھما دھما ہے۔ اسی
لئے جو مسلمانوں کو ایک دھما سے میں بہتا ہوا دیکھتا جاتے ہیں انہیں
چاہیے کہ وہ اپنی قوم کی بستی کی وجہ کو سمجھیں اور ہر حالت میں مسلمانوں
کو دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع دینے میں
مدد کریں۔

تیسرا طبقہ معاشی مسائل کو ہمیت دیتا ہے ملک کی معاشی
زندگی میں مسلمانوں کا کیا مقام ہونا چاہیے؟ حالانکہ یہ طبقہ آج
فوائد نفوس پرستی نہیں ہے لیکن اس کی تعداد میں روز بروز
تعداد ہوتا جا رہا ہے مسلمانوں کا مستقبل اسی طبقے پر منحصر ہے یہ طبقہ
اس نظر سے کا حامل ہے کہ ملک کی تعمیر میں مسلمانوں کو بھی دوسرے
فرقوں کے دوش بدوش ہونا چاہیے لیکن ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنا

چاہیے کہ گولی ہمارے پاس خود بخود نہیں آجائے گا بلکہ ہمیں اس
تک جانا پڑے گا۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی معاشی حالت کو بہتر بنانے
کے لئے تین اہم مرحلوں کا پروگرام بنایا جاسکتا ہے:-

۱۔ مسلمانوں کی خد کی پیدا کردہ ذہنی بیماری کی صحیح تشخیص۔
۲۔ ایسا شعبہ ڈھونڈنا جس میں انکی اکثریت جذب ہو سکے۔

۳۔ ایسے دوسرے ذرائع ڈھونڈنا جن میں دوسرے فرقوں کے
ہمراہ مسلمان بھی درج بدوش حصہ لے سکیں اور اس طرح قوم کو
مضبوط بنانے کا براہ راست کام ہو سکے۔

یہ بہت صحت مندانہ خیال ہے کہ ملک کا ذہنی طبقہ بھی اس
بات کو محسوس کرتا ہے کہ مسلمانوں کو قومی زندگی میں برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔
اس طرح یہ بات بھی خدشہ آئندہ ہے کہ قومی ریس بھی بنیاد کے مسلمان
کے مسائل پر زحمان درمل ہے۔ خد مسلمانوں میں یہ احساس جاگا ہے کہ
انھیں نہ صرف اپنی حالت کو بہتر بنانا ہے بلکہ اس جمہوری ملک میں
ملک کی بنیاد کو مضبوط بنانا ہے۔ آزادی سے کچھ پہلے اور فوراً بعد
کی نسل بھی ان مسائل کا ڈھونڈنے میں کو شل ہے!

مستحق ہونا جمہوریت کی روح ہے اور تعلیم، جہالت کا خاتمہ
اس کے مضبوط ستون۔ معاشی میدان میں تنگ ذہنی اور مذہبی منافرت
کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ اگر سوشلزم آیا جمہوریت کی فتح ہوگی جمہوریت
قوتوں کا مضبوط ہونا ہی مسلمانوں کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔
لیکن مسلمانوں کی سماجی اور معاشی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اکثر
اور اقلیت کے بیچ کی نفرت اٹک، ڈر اور آپسی غلط فہمی کی خلیج
کو پاٹ دیا جائے اکثریت اقلیت کے حفاظت کی ضمانت دے اور
اقلیت اکثریت پر اعتماد رکھے یہ اعتماد اور بھروسہ ہم سب کی
جذبے کو اور ابھارے گا۔

ہمیں اس بات کو نہیں سمجھنا چاہیے کہ فرقہ پرستی معاشی
مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ دراصل یہ کوئی حل نہیں
بلکہ خد ہی ایک مسئلہ ہے کبھی کبھی تو معاشی مسائل کی غلط فہمی سے
فرقہ پرستی کو اور بڑھا دیا جاتا ہے مسلمانوں کو اس ملک کی معاشی
زندگی میں کس طرح ایک اہم مقام مل سکتا ہے؟ دو نظریے ہیں

نقل دستور کے مطابق ان کے لئے جلیں محفوظ کر دی جائیں جبکہ دوسرا طبقہ صرف اس سے مطمئن نہیں ہے بلکہ کچھ اور مراعات چاہتا ہے۔ سب سے زیادہ انوکھا یہ حقیقت ہے کہ اس نکتے پر بات کرنے کے لئے صرف سیاسی پلیٹ فارم ہی مخصوص ہو کر رہ گیا ہے اور عملی طور پر اس پر کسی نے گنجیدگی سے غور نہیں کیا۔

کہا سرکار کی سرپرستی میں کچھ کیا جائے، یا سرکار کا اعلان ہے، یا پھر کسی غیر سرکاری تنظیم کے زیرِ نگرانی۔ اصل مقصد تو ہے کہ ایک تنظیم قائم کی جائے جس کی تمام رپورٹیں حقائق اور احکام پر مشتمل ہوں نہ صرف خیالوں، شکایتوں اور حکایتوں پر مبنی ہوں اس قسم کی تنظیم کے قیام کے لئے سرکار کی سرپرستی ضروری ہے کیونکہ ایک غیر سرکاری تنظیم کو حکومت کے بعد گرام و پلاٹوں کے متعلق معلومات کی ذرہ بھر میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مرکزی طور پر تیار رہے کہ اس تنظیم کا کام صرف اعداد و شمار

پیش کرنا نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کا کام ہو گا معاشی مسائل کے حل ڈھونڈنا اور مختلف شعبوں میں نئے مواقع فراہم کرنا اور بین الاقوامی مارکیٹ کے متعلق معلومات فراہم کرنے والے مرکز کی طرح کام کرنا اُسے جدید ٹیکنالوجی اور انتظام کے طریقے کے سلسلے میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا ہو گا۔ نہ صرف یہ بلکہ مسلمانوں اور دوسری تنظیموں اور محلوں کے بیچ کی کڑی جبا ہو گا۔

اس کا اشد ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں سنجیدگی سے کام کیا جائے اور یہ کام مسلمانوں کی کوشش کے بغیر کسی صورت میں بھی ممکن نہ ہو گا۔ یہی وقت کی پکار ہے۔ ابھی دورہ کبھی نہیں ہے۔

زندگی کا رُخ بدلنے کے لئے
ایک مدت کم ہے، آگ لمحہ بہت

آدمی کی بچپان

مطلب پرست خود غرض انسان سے بچ کر ہی رہنا چاہئے۔ ترقی کرنے والا انسان دوسروں کے عیبوں کے بجائے اپنے ہی کمزوریاں تلاش کرتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے پتھوں سے آگ بجھا نہیں کرتے اور بھڑک جاتا ہے۔

وہ تو گائے سے سوتے لیتا ہے جو گھاس کھا کر دودھ دیتے ہیں، سانپ کی پیروی نہیں کرتا جو دودھ پلے کر بھی ڈس لیتا ہے۔
انسان نہیں جانتا فضل رب سے جو لوگ ترقی کرتے ہیں وہ حجام کے قینی کے طرح غل زیادہ کام کم پر عمل نہیں کرتے بلکہ درزی کے قینی بن جاتے ہیں جسے کہے آواز کو کم ہوتے ہیں اور کام زیادہ۔

یوسف دہلوی

مسلم نوجوانوں کا المیہ

پھر حیب جلدیاد پر سچائی سے واسطہ پڑتا ہے تو غبارے کی مانند اچانک پھٹ پڑتا ہے اور فیضاً مایوسی و انتشار کے سوا کچھ آئندہ نہیں آتا۔ یہ بھی حضرت مسلمان کی بوجہی ہے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو موردِ الزام قرار نہیں دیتا۔ بلکہ ساری ذمہ داری گرد و پیش کے سر منظر دیتا ہے جب تک مسلمان حال میں جیا اس نے ترقی کی لیکن جو مہمی اس نے حال سے رشتہ توڑا اور ماضی کے کارناموں سے ناتہ جوڑا اس کا زوال شروع ہو گیا۔ تاریخ کے صفحات اس امر کے شاہد ہیں کہ کسی بھی قوم کی تباہی و بربادی میں خارجی و ترات سے زیادہ اندرونی اسباب کار فرما رہتے ہیں۔

اس پر طرہ یہ کہ ہماری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے اور جب کوئی مقصد ہی نہ ہو تو آدمی ٹانگ ٹوٹیاں مارے تو کیا کرے جب ان ٹانگ ٹوٹیوں کا نتیجہ صفر برآمد ہوتا ہے تو مزید تاریکی پھیل جاتی ہے اور قیامت کا گنگاں ہونے لگتا ہے

اگر زندگی کا کوئی مقصد ہو تو انسان اپنے وسائل و ذرائع کو جمع کر کے بلند حوصلگی اور جدوجہد کے ساتھ اپنے مقصدِ حیات کو پانچے کا سعی کرتا ہے۔ اگر یہ مقصدِ حیات تعمیری ہو تو نہ صرف فرد بلکہ سارے معاشرے کو نفع پہنچتا ہے اور نہ بصورت دیگر فرد خود ایسا فنا ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

اگر کسی معاشرے کو ترقی کرنا ہے تو یہ اس کے افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتیں تعمیری کاموں میں صرف کرے کیونکہ معاشرہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور فرد کی مضبوطی معاشرے کے استحکام کا سبب بنتی ہے

اگر یہ کہا جائے کہ آج کا مسلمان ذہنی طور پر بیمار ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ کہنے کو تو مسلمان وحدانیت پر۔ اپنا ایمان رکھتا ہے لیکن جب بات عمل کی آتی ہے تو اس کا دوغلا بن طرح طرح کی حیلہ سازی کرتا ہے۔ نتیجتاً جو خطہ پیدا ہوتا ہے وہ اسے تباہی کے خار میں ڈھکیل دیتا ہے۔ سب سے اہم امر یہ ہے کہ اسلام نے نیت کو مقدم ٹھہرایا ہے۔ لیکن آج کے مسلمان کی نیت ہی صاف نہیں تو عمل میں برکت آئے کہاں سے؟

دینی اعتبار سے مسلمان اپنے آپ کو فوق الفطرت سمجھتا ہے۔ ان تو کفار سے وہ اسلام کو راہِ سعادت ثابت کرتا ہے لیکن جب عملی مظاہرے کا وقت آتا ہے تو اس میں ملک، قوم، خاندان، پیشہ اور سب و نسب وغیرہ کی بات در آتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آج کا مسلمان ان تمام برائیوں میں مبتلا ہے جسے مٹانے کے لئے خدا کو اسلام پیدا کرنا پڑا۔ روایتوں نے مسلمان کو کہیں کا نہ رکھا آج معاشی اعتبار سے وہ گمراہا ہے، تعلیمی اعتبار سے پچھڑا ہوا ہے تہذیبی اعتبار سے پاماندہ ہے اور روحانی اعتبار سے شدید ترین احساسِ کسری میں مبتلا ہے احساسِ کسری کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ بس شخص کے بارے میں اسے گمان ہو جائے کہ پہنچا ہوا ہے تو اس کے آگے یہ وحایت کا پرستار، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنا سر جھکا کر کوتاہ رہ جاتا ہے۔

اگر ہم اپنی پسماندگی کا کلمے دل سے جائزہ لیں تو یہ بات روز روشن کی طرح حیاں ہو جائے گی کہ ہمارے غور و فکر کا منبع حقیقت پر اپنا انحصار نہیں رکھنا۔ بلکہ وہ تو اسلاف سے بھی برے اترتا پھرتا ہے

آج ہمارا ذہن افشار میں مبتلا ہے ایک طرف تو قدریم نکست اور
 کمزور قدیں سسک سسک کر دم کوڑ رہی ہیں تو دوسری طرف نئی تہذیب
 تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اپنے قدم جا رہی ہے اس نئی تہذیب میں
 سب سے بڑی کشش یہ ہے کہ یہ پوچھنے کی اجازت دیتی ہے
 سوالات کرنے کی آزادی دیتی ہے اس کے برعکس قدیم قدردوں
 کے پاس ایسا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک بات کہانی
 ہے اور وہ یہ کہ اس کی تمام قدریں *Established* ہیں
 اور اسے اپنانے ہی میں اپنی خیریت معزز ہے تعلیمی اعتبار سے پھر
 رہنے کے سبب ہم فیصلہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کونسی قدریں
 ہمارے حق میں مفید ثابت ہوں گی۔ لہذا ہم اسی میں غافیت
 سمجھتے ہیں کہ پُرکھوں سے چلی آئی ہوئی روایتوں کو توڑنا گتہ
 کبیرہ سے کم نہیں اور پھر بغیر حتمی کئے چپ چاپ ان روایتی
 لاخوں کو اپنے کانٹھوں پر اٹھائے چلتے رہتے ہیں۔
 زندگی جینے کے لئے ہے لیکن کیا زندگی کا قصور بغیر کسی
 مشکل، گھٹنائی، تکلیف اور دھم کے ممکن ہے زندگی جب تک
 دواں دواں ہے تب تک مشکلات بھی ساتھ لگی رہیں گی صرف
 عام آدمی ہی مصائب میں گھرا ہوا نہیں رہتا۔ بلکہ خواہیں ہی اللہ
 میں مبتلا رہتے ہیں اور پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جنھوں
 نے ظاہروں کی دنیا میں رہتے ہوئے ایک الگ مملکت قائم کر لی،
 کیا ان کے پاس کسی قسم کے مسائل نہیں ہیں۔ روٹی روزی دہاں
 بھی تنگ ہے، پہنچانے دہاں بھی ہوتے ہیں، چور بانداری
 اور رشوت کا بازار دہاں بھی گرم ہے۔ فسادات دہاں بھی جوتے
 ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ جہاں بھی انسان ہو گا۔ دشواریاں الگ الگ
 نام سے دہاں ضرور موجود ہوں گی۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم خواہوں
 کی دھرتی سے نکل کر حقیقت کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھیں
 اور حالات کا صحیح تجزیہ کر کے ذہنی مزاج کو اس سے ہم آہنگ
 کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی کامیابی کا مرامی کے دور
 سے گزر دیں۔

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کا صحیح معرّف ہو
 صحیح منصوبہ بندی جو ہم سیاست میں جتنی دلچسپی رکھتے ہیں اس کی

جو حیاتی دلچسپی ہے اگر ہم تعلیم حاصل کرنے سے کام میں تو ہمارے
 مسائل روز بروز کم ہوتے جائیں دراصل ہم اپنے مصائب کے
 ذر ذرہ وار ہیں۔

نوجوان نسل کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس
 صحیح رہنمائی کا فقدان ہے تعلیم کے میدان میں صحیح رہنمائی نہ ہونے
 کے سبب وہ آج نہ گھر کا بے نہ گھاٹ کا۔ ہمارے کتنے والدین
 ایسے ہیں جو اپنے بچوں کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں؟ کتنے والدین
 اپنے بچوں کی پڑھائی میں دلچسپی لیتے ہیں؟ کتنے ماں باپ ایسے
 ہیں جو بچوں کی مشکلات حل کرنے میں معاون ہوتے ہیں؟ کتنے
 اپنے بچوں کی جستجو کی صحیح پذیرائی کرتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں
 جو اپنے بچوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں؟

سچ بولجئے تو بچہ اسکول اس لئے جاتا ہے کہ اتنی دیر
 گھر میں شانتی رہے گھر میں اودھم نہ مچے رہے اور ماں باپ آرام سے
 کام کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ جب طرز فکر ایسا ہو تو بچہ کیا خاک پرے گا
 اور کیا مستقبل میں معاشرے کے لئے باعثِ رحمت بننے کی
 بجائے زحمت ثابت نہ ہو گا؟

ہمارے نوجوان جن قسم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس کا نتیجہ
 استاد اور شاگرد کی ہوتا ہے اس کے علاوہ دوسرے کسی میدان میں
 کچھ کر بھی لیا تو بس کلک بن گئے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے
 کہ ہمارے نوجوان کو دوسرے شعبوں کے بارے میں معلومات ہی
 نہیں ہوتی بلکہ یہ معلومات کہاں سے حاصل کی جائیں گی؟ اگرچہ ہمیں
 ہر دن اس پر طرہ یہ کہ ان کی اکثریت درجہ سوم تا بیالیسواں تک رہتی ہے
 جو اس امر کی عمارت کرتا ہے کہ انہیں مسائل سے پہلے سے متنبہ کیا جاتا
 ہے۔ خدا اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کسی ایسے معالجہ کی جانب رجوع نہ کریں
 جو یہ کہے کہ میں آپ کے نمونہ کا صرف تیس فیصدی صلاح کرتا ہوں
 اور بقیہ کا خدا حافظ ہے تو ان صورت میں آپ اپنے خدا حافظ
 کہہ کر چلتے نہ نہیں گئے۔ اسی طرح درجہ سوم میں بھی دراصل ذہن کی
 رمان *Approach* کی نشاندہی کرتا ہے اب اگر آپ کو کہیں کام
 نہ ملے یا آپ کی کوئی قدر نہ کرے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

آج کل تعلیم کا روزگار سے جتنا تعلق ہے اتنا بے کھیا نہ تھا

سائنس ترقی نے ہر شعبے میں آسانی کا خاطرہ اپنی جھجکیاں بیدار کر لیا ہیں کہ مختلف شعبے کا جب تک صحیح علم نہ ہو کوئی نقص خوش اسلوبی سے اسے انجام نہیں دے سکتا لہذا نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اندھا حد تعلیم حاصل کرنے کی بجائے منصوبہ بنا کر تعلیم حاصل کریں تاکہ آگے چل کر انہیں پچھتا نا نہ پڑے۔

سب سے پہلے تو وہ یہ فیصلہ کریں کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ان میں اتنی ذہنی صلاحیت ہے جتنی یا نہیں۔ پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے کہاں کہاں کی خاک چھانی پڑے گی۔ کتنا عرصہ درکار ہو گا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں یا تعلیم حاصل کرنے پر کتنا خرچہ آئے گا۔ سب سے خراب یہی ذہن نشین رہے مختلف علم فنون کی تکمیل کے بعد اس میدان میں نئی نئے مواقع پائی رہیں گے یا نہیں۔ اگر آپ اپنے طور پر ان تمام امور پر غور نہیں کر سکتے آپ حکومت کے قائم کردہ ادارے *Vocational Guidance Bureau* سے مدد لے سکتے ہیں جو خصوصاً آپ کی تعلیمی رہنمائی کے لئے قائم کیا گیا ہے یہ ادارہ ممبئی میں دوسری ملاؤں میں الفنسٹ میکینیکل پلاننگ اسکول کی سمارت میں اپنا کام کرتا ہے۔ یہی ادارہ گرد و نواح کے رہنے والے طالب علموں کو شخصاً معلومات فراہم کرتا ہے اور بھارت کے دیگر شہروں اور غیر ملک میں رہنے والوں کو بذریعہ خط و کتابت صلاح و مشورہ دیتا ہے یہ ادارہ تعلیمی صلاح و مشورہ کے لئے کسی طرح کی فیس نہیں لیتا لہذا نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے تابناک مستقبل کے لئے اس ادارے کی خدمات ضرور نامہ اٹھائیں۔

نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ محض آرٹس، کامرس اور سائنس کے چند مضامین اور جملہ نمبر پانچ میڈاؤں میں ہی داخلہ نہ لیں۔ بلکہ ایسے شعبہ جات میں بھی دلچسپی میں جہاں *Demand* زیادہ ہے درج ذیل مختلف علوم و فنون کی ایک مختصر فہرست دی جا رہی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ آپ ان میڈاؤں میں جا کر بھی نمایاں کام انجام دے سکتے ہیں۔

ایروناٹیکل انجینئرنگ - سول انجینئرنگ - ڈال انجینئرنگ
ایلیکٹریکل انجینئرنگ - میکینیکل انجینئرنگ - کیمیکل انجینئرنگ -

میٹالرجیکل انجینئرنگ - مٹلرگ انجینئرنگ - انڈسٹریل انجینئرنگ
اگرکچرل انجینئرنگ - پروڈکشن انجینئرنگ - میٹاسٹیل انجینئرنگ
مرین انجینئرنگ - ریڈیو انجینئرنگ - ٹیلریشن انجینئرنگ
ٹیل کپوٹا کینز - آڈیو وائیل - سیز انجینئرنگ
ایر کرافٹ مینٹنس انجینئرنگ - ادیشنرگری -

میکینولوجی :-

کیمیکل ٹیکنولوجی ، ڈیری ٹیکنولوجی ، فوڈ ٹیکنولوجی

گلاس اینڈ سٹراکس - جوٹ - لیدر -
آئل اینڈ ٹینٹ - پیپر - پینٹ اینڈ وائٹس
پیرولیم - پرنٹنگ - شوگر -
ٹیکسٹائل - پلاسٹک - الیکٹرک -

ایلائیٹڈ فرسٹ ، ایلائیٹڈ سیکنڈ ، اینٹروپولوجی ،

اسٹروٹومی ، بیکٹیری - ہومانی ، کیمسٹری ، کومولوجی اینڈ فزیکس

سائنس ، جیولوجی جیو فزکس ، این آر کینک کیمسٹری ، میتھمٹکس

انالیٹیکل کیمسٹری ، میتھمٹیکل فزکس ، میتھمٹیکل اسٹاتسٹکس ،

ماتری سائنس ، نیوکلیئر فزکس ، نیوٹرکل میتھمٹکس ، فائبرسٹیکل

کیمسٹری ، فزیولوجی ، سائیکولوجی ، پیرکیمسٹری ، زولوجی ، ایکٹرو

اسکوپ - اوپریٹنگ اینڈ روٹ ، ریفریجریٹا ، میکینیکل ڈرائنگ

میوزولوجی ، آرکیالاجی ، نوٹیشن ، آجمن اینڈ پبلک ہیلتھ -

ان کے علاوہ میڈیکل میں آرٹو وڈیک ، ایلوپتھک ، یونانی

اور ہالو کیمک

آرٹس و کامرس :-

چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس ، کاسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹنٹس ،

ایکم ٹیکس پریکٹسز ، سٹیز ٹیکس پریکٹسز ، پرنٹل سکرپٹری ، کمپنی

سکرپٹری ، بینک آفیسر ، مینجمنٹ اکاؤنٹنٹس ، بزنس آرگنائزیشن

بزنس ایڈمنسٹریٹیشن ، مینجمنٹ ایکریڈیٹو ، انڈسٹریل ایڈمنسٹریٹیشن

ایڈمنجمنٹ ، پرسنل مینجمنٹ ، سٹیز مینجمنٹ ، ایڈمنسٹریٹنگ

مینجمنٹ ، فنانشل مینجمنٹ ، آفس مینجمنٹ ، مارکیٹنگ مینجمنٹ

مارکیٹنگ ریسرچ ، میٹرل مینجمنٹ ، پریچر انیسر ایکسپورٹ پموشن

پریکٹیکل اینڈ ایڈوانسڈ سائیکولوجی ، صحافت ، رپورٹنگ ، ایڈیٹری

فیڈریشن کورس، پبلک ریلیشن۔ انٹرنیشنل لاء، فوڈ اینڈ
(غیر ملکی تجارت) فوڈ اینڈ اینڈ پلو میسی، فوڈ اینڈ لیجو سیر، فلم
ٹورسٹ گائیڈ۔ ٹاؤن، لائبریری سائنس۔ سوشل ورک۔ پبلک اینڈ
منسٹرین۔ کمپیوٹر سوشل منجمنٹ۔

جو لوگ میٹرک کے بعد ریونیو سٹی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے
ہیں تو ان کے لئے بھی ان ریونیو سٹی کورسز دستیاب ہیں مثلاً:
ایگریکلچر:-

ایگریکلچر آرکیٹیکٹ، کاشن ٹیکنالوجی، ڈیری ٹیکنالوجی
بروڈ پریری ڈولیشن، بروڈ ٹیکنالوجی، سوشل کنزروکیشن
جینٹک، ٹریڈر ٹریننگ وغیرہ۔

آرکیٹیکچر:-
ٹاؤن اینڈ کنٹری پلاننگ، ٹاؤن پلاننگ اینڈ دیولپمنٹ
آرٹ:-

پلاننگ آرٹ، کرسٹل آرٹس، ڈرامیٹکس، ٹائن آرٹ
میوزیکل انشرومنٹ میٹنگ وغیرہ۔
ای۔ وی ایشن:-

ایئر سہش، اسٹنٹ فلائٹ پرسنل، کرسٹل پائلٹ
ایئر کرائٹ:-
بین ٹینس انجینئرنگ۔

ڈیفنس سرورسز
گورنمنٹ سرورسز
مرچنٹ نیوی:-

ڈمرن، مرٹن انجینئرنگ
میونسپل اینڈ الائیڈ سرولینڈر:-
فائر فائٹنگ، میونسپل سرولینڈر، پبلک ہیلتھ۔

ریلوے کیئریر:-
سوشل ورک
تعلیم و تدریس:-

پبلک ایجوکیشن، کرائٹ ایجوکیشن، ایجوکیشن
فار ہینڈی کیپڈ چلڈرن، فزیکل ایجوکیشن، ہری

پرائمری ایجوکیشن، پرائمری ٹیچنگ، سکینڈری ٹیچنگ،
یوگٹا ٹیچنگ وغیرہ۔
ٹیکنیکل:-

یوٹیلٹی اینڈ اینجن سازی، پبلک اینڈ ٹو گرائی،
فورٹین شپ، اینڈ پروڈن، ایمر ٹریننگ، ٹیکنیک، ماس
سازی، گرڈ اور کھانڈ سازی، ہینڈ میڈ سپر کھادی، ٹان اینڈ ٹیل
آئیل اور سوپ میکنگ، ویلج پوٹری (ہرٹن سازی)
دیگر:-

کیٹرنگ، ڈومیسٹک سائنس، ایوم سائنس، فشریز،
میٹر پوٹری، ٹیلیفون ریلیکس آپریٹر۔

اور جو لوگ کسی وجہ سے ثانوی تعلیم پوری نہ کر سکے ہوں اللہ
عرف کاہن جماعت یا اس سے بھی کم پڑھ کر اسکول چھوڑ چکے ہوں انہیں
بھی مندرجہ ذیل کورسز میں داخلہ لینے کی اجازت ہے۔

ٹرنڈ منسٹری، ٹریس، ایڈ لوم ویلنگ، کاشن ویلنگ
(پاد لوم) کاشن اسپننگ، اون ٹائنگ اینڈ ویلنگ، آرٹس
انڈ سٹریٹل کیدر گروس مینو فیکر، آرٹ سن فٹ ڈر مینو فیکر، لیسر
ٹیکنالوجی، کرائٹ مین شپ کورس ان ریٹیوٹائیٹ اینڈ کانسٹر
سردس، کیننگ اینڈ نوڈ پریری ڈولیشن، کمپوزنگ، پرنٹنگ،
لیٹر پریس مشین ورک، لیٹرو مشین ورک، خلاصی (سیلر،
سکانو (کوآرڈیٹر) ٹیلرنگ اینڈ کٹنگ، ایمر ویڈری اینڈ
فینسی ورک۔

اس کے علاوہ دستکاروں اور کارپنڈرس کے لئے بھی
تربیتی اسکیم جاری کی گئی ہے جہاں ہر متعلقہ فن کے بارے میں تازہ
ترین جانکاری مہیا کی جاتی ہے۔ فی الحال مندرجہ ذیل شعبوں میں
تربیتی اسکیم کے تحت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

پبلک اسمتھی (لہوری)، کارپنٹری، الیکٹرک ٹیکنیک، فیشری،
گر اینڈ ٹنگ، ڈامین، میٹنٹ، میکاٹک، سولڈر، پینٹر ٹیٹ
میٹل ورکنگ، ٹرنر، وایج ریپیرنگ، ویلڈنگ (گیس الیکٹرک)
پلمبنگ وغیرہ۔

آکائی فیشن کے تحت بھی اس اسکیم میں مندرجہ ذیل شعبوں

ہے۔ اگر خدا توفیق عطا کرے تو غیر مالک میں بھی جا کر
بنت نئے علوم و فنون سے بہرہ ور ہو کر سارے عالم کو نفع
پہنچایا جاسکتا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم صرف شکایت کرنے
کا بجائے ٹیکہ مٹی سے، غلوں سے، لگن سے، محنت سے ان علوم و
فنون کو حاصل کر کے نہ صرف اپنی زندگی کا سہارا بہتر بنائیں بلکہ ساری مخلوق
کو نفع پہنچائیں۔

میں تربیت دی جاتی ہے :-

گورنمنٹ اسکول (سندھ کے لئے)، ان لے ہدک
(جٹاؤ کام) انیسوری اینڈ ہندل وڈ کارونگ، اسٹون کارونگ
انگریز ونگ اور کارپٹ دیونگ وغیرہ۔
علوم و فنون کی دنیا بہت ہی وسیع ہے یہ تو صرف ان
علوم کی فہرست تھی جنہیں ہندوستان میں حاصل کیا جاسکتا

نصف درجن زبانوں کا ماہر ایک مسلمان

مولوی عبد رحیم گورکھپوری، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور مولانا اسماعیل شہید کے ہم سفر
تھے۔ سکلتے کے ورثہ دہیم کالج میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر مارٹن کی صحبت
میں رہ کر انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں۔ انگریزی میں تو ایسی استعداد پیدا کر لی تھی کہ
ان کے متعلق مشہور تھا کہ پردے کی دوسری طرف وہ بٹھا دیئے جاتے تھے اور انگریزی
میں وہ تقریر کرتے تھے اور اس جانب سے بڑے بڑے قابل انگریز بیٹھے تھے
اور مقرر کی شخصیت کی نسبت دھوکا کھا جاتے تھے۔ سب یہی کہتے تھے کہ یقیناً کوئی
انگریز بول رہا ہے۔ دراصل ان کا لب دلجو حد درجہ فصیح اور مثل اہل زبان کے
تھا۔ وہ لیبٹن بھی بڑی فصاحت سے بولتے تھے، عربی، فارسی، ترکی، پشتو،
اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے سلسلے میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ تحفہ عالم کے
مصنف نے ایک ایسی محفل کا حال لکھا ہے کہ جس میں بیک وقت کئی عرب، ایرانی
انگریز اور افغانی جمع تھے مگر مولوی عبد رحیم عرب سے بلکل عرب کی طرح
ایرانی سے ایرانی لب و لہجہ میں، انگریز سے ٹھیک انگریز کی طرح اسی کی زبان
میں باتیں کرتے تھے اور ساری محفل مولوی عبد رحیم کی اس غیر معمولی ذہانت
کی بہت پر محو حیرت تھی۔ ریاضی، فارسی، عربی اور انگریزی کی کئی کتابوں کے
مصنف بھی تھے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی بہت پر دہریہ مشہور ہو گئے
تھے۔ اس لئے ان کو آج تک عبد رحیم دہری کہا جاتا ہے۔ سرسید احمد
خان سے قبل جو مسلمان علماء انگریزی زبان کے طرف دار بنے ان سب میں
مولوی عبد رحیم مقدم ہیں۔

گہری اور مضبوط بنیادیں بلند اور مستحکم عمارتیں

میں دو مختلف اور مختلف نظریاتی اور عملی تہذیبوں کے درمیان تضاد دکھاؤ
کا بڑا اہم حصہ ہے، جس کے نتیجے میں ایک ایسی گنگا گہری تہذیب، یہاں رونما ہو
پاتی تھی جس میں ایک طرف مسلمانوں کی شان و عظمت کے رنگ جھلک رہے
تھے تو دوسری طرف مقامی تہذیب کی روایتی پیچیدگیوں کے رنگ بھی جلوہ گر
تھے۔ لیکن ہے اس ملی ملی تہذیب کے زیر اثر مسلمان اور مقامی باشندے سب سے
ہو کر ایک مثالی معاشرے کے قیام کا باعث بن سکتے تھے کہ برطانوی سامراجیت
کے شکنجے نے ان کو کس لیا اہمیت جو اس تہذیب کا ہیئت بگڑ گئی
بلکہ ان اقوام کو جو ایک نئی مہندوستانی تہذیب کے فعال ہمار بن رہے تھے
اپنے دھم اور اہمیت کا اس طرح اندازہ ہونے لگا کہ ان میں انانیت،
خود پرستی، خود غرضی اور نفرت نے اپنا ڈیرا لیا۔ ان منفی جذبات کے
زیر اثر جس طرح کا بگاڑ معاشرہ میں پیدا ہو سکتا تھا، اس کے نتیجے میں نہ صرف
ملک تقسیم ہوا، انہوں نے اپنے پیچھے گئے بلکہ خدا کا ایک ملک میں بسنے والا
اقوام کے درمیان بھی وہ باہمی ربط اور کھلی جارہی ہے ان میں توہمیت
جی کا وہ تصور رہا ہے جو ایک جزائی اکائی سے مربوط ہونے کی وجہ کسی خطہ
زمین کے باشندوں میں نظر نہ نہیں تو خارجی عوامل کے زیر اثر بھی پیدا
ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا عوامل نے ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی
اسی قدر متاثر کیا جس قدر کہ دوسری اقوام کو لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو طبعاً
ہندی اور غیر ہندی کے احساس نے جو اس وقت کے ملکی حالات کا تعاف
بنائے گئے تھے مسلمانوں کو بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ نقصان پہنچایا
ہے۔ اس بے پناہ نقصان کے باعث بھی ہندوستانی مسلمان اپنے طور
پر آج ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

ہندوستانی مسلمان ایک منفرد کائی ہیں۔ ان کا اس انفرادیت میں
ان کے مخصوص ماحول کا بھی اور اسی قدر مخصوص حال کا بھی بڑا ہاتھ ہے مگر ان کے
تعلق سے کہا جائے کہ وہ ہمیشہ شاد و ہرما ہے لیکن ہے بعض مفروضہ پر لیکن
تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب سے ہندوستان میں داخل ہوئے خواہ ان کا
حقیقت ایک جاہر سلطان کی رہی ہو یا خفا ترس و دوش اور مردم شناس مونی
کی، ان کے ارد گرد دیگر اور دلنما عظمت و شوکت کا ایک عالم بنا۔ اس
عظمت و شوکت میں تاہلہ شان کے ساتھ ساتھ جمالی جو دو کم کے جلوے بھی
شامل رہے ہیں۔ تاریخ ہارین کے ادراک اللہ کے بجائے میں یہاں بعض چند
ایسے اخراجات و نتائج کی کٹ اندازی کرتے ہوئے آگے بڑھوں گا جن سے تعین
حال حاضر ہوا ہے بلکہ اس کے پر تو سے مستقبل کا خاکہ بھی روشن ہو سکتا ہے۔

ایک محفل سے دوسرے محفل میں جا بسنے سے ایک فرد اور خاندان کو
جتنے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل
(اور گہرے بھی) مسائل سے ایک قوم کو اس وقت دوچار ہونا پڑتا ہے جب کہ وہ
بوجہ نقل مکانی کر کے کسی دوسرے ملک میں جا بس رہی ہے ان مسائل کی سنگینی
اور بڑھ چکی ہے جب کہ ایک طرف خود ان کا تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ بے حد
گراں قدر ہو اور دوسری طرف مقامی تہذیب اور ثقافت بھی اسی قدر مالدار
ہو۔ یہ سنگینی اور شدت اختیار کر جاتی ہے جبکہ دونوں فوجوں کو اپنے اپنے آثار
کا شہرت کے ساتھ احساس بھی ہو اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی کوشش
کریں کہ دوسرا اپنے رنگ میں رنگ جائے۔

مسلمان ہندوستان میں چاہے فاتح کے روپ میں آئے ہوں۔ حاکم کا
کسی پر براہمان رہے جس یا ان کے اثر و شوخ کی رعایت میں ہے تو ان کے
ہاتھ مرنی اور تفرقہ کا حصہ رہا ہو۔ موجودہ ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تفریق

ہندوستان میں اگر مذہب کے مسئلے کے بعد سے ترقی پذیر معاشرہ کا ساتھ دینے کے لئے جو انفرادی اور اجتماعی گمشدگیوں کی گتیس اس سے غفلت برتنے یا مخالفت کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو حیثیت قوم جو نقصان اٹھاتا ہوتا ہے اس نے بھی ان کو ایک امتیاز بخلا ہے۔

ایک کثیرالذاتیت ہونے کے باوجود آج ملک کی ترقی اور خوشحالی میں وہ ایک بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں یہ حیثیت بھی ان کا انفرادیت عطا کرتی ہے۔

مسلمانوں کے مسائل کے نقطہ سے سوچتے ہوئے ہم کو مسلمانوں کی انفرادیت کو نظر انداز نہیں کرنا ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

انفرادیت کے ساتھ میں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک اکائی سے بھی تعبیر کیا ہے۔ مسلم آبادی پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے، علاقہ داری طور پر ہر صوبہ کے نقطہ سے اور ضروریات علاقہ میں۔ اسی طرح ہر ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کے مسائل بھی ملحدہ ہو سکتے ہیں خصوصاً اس لئے بھی کہ حکومت کی سطح پر بعض ریاستوں میں مسلمانوں کو منفی سیاسی مراعات حاصل ہیں جو دوسری ریاستوں میں ان کو نہیں ملی ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود عام طور سے مسلمانوں کو جن مسائل سے دوچار ہونا ہے اور ان کے حل کے لئے جو طرح اجتماعی گمشدگیوں کی گتیس ہیں اس سے ان کو ایک اکائی تصور کرنا ہی زیادہ صحیح اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور خود مرکزی حکومت بھی جب کبھی مسلمانوں سے منسوب کئے جانے والے مسائل کا ذکر کرتی ہے تو کسی علاقہ تک محدود کرنے کے بجائے کلی طور پر ملک کی سطح پر ہی سوجتی ہے اس طرح ان کے اکائی ہونے کی حقیقت ایک طرح سے دستوری بن جاتی ہے۔

آج جتنے بھی مسائل سے مسلمان دوچار ہیں ان کا بالآخر سیاسی بلواسطہ بھی نفعی اس جذبہ بغیریت اور ملحدہ ہندی سے ہے جو سیاسی افراط و تفریط کی خاطر ان میں پیدا کر دیئے گئے تھے اور جو آج مسلمان کی ذات میں مستقل بن گئے ہیں

سیاست سے ہٹ کر بھی مسلمان اپنے آپ کو مذہب کے اعتبار سے ایک منفرد اکائی منظرِ ناچتے ہیں اس سے پہلے کہ دیگر عملی پر نظر ڈالی جائے مسلمان کی مذہبی حیثیت پر اجماعاً غور کر لینا مناسب ہوگا۔

آج دنیا میں مذہب کا تصور بالکل بدل گیا ہے۔ مذہب کو حجت پرستی اور قدامت پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کو فی زمانہ غیر ضروری قرار

دیے جا رہا ہے۔ اس کے باوجود جن افراد کو آج بھی اخلاقی اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ قطعی طور پر مذہبی اقدار ہی ہیں۔ ممکن ہے نام بدل دیئے گئے ہوں لیکن ایک فرد اور افراد کے ذریعہ ایک قوم کی صالح تعمیر اور تربیت کے لئے مذہبی اقدار کو قبول کرنا، اپنانا اور ان کو مرد و عورت کو آج بھی اسی قدر لازمی اور ناگزیر ہے جتنا پہلے تھا یا آئندہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے اسی طور پر آج کا انسان اس قدر ترقی یافتہ اور خود کفیل ہو گیا ہے کہ اس کے لئے اتنا کم پر ماتما سے مربوط کرنا ضروری نہ ہو۔ روح کو جو کہ خالق حقیقی کی ذات میں گم کر دینا محض زبانی دعوے ہوں، لیکن بذات خود ان مادی وسائل کو منفعہ اندازہ مشترکہ طور پر برتنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھی ان اخلاقی اقدار کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی جن کے ڈاٹھ سے مذہبی اقدار سے ملے ہیں، ہو سکتا ہے مذہب کے نام پر مذہبی پیشوا مذہب کے پیروں کو کوٹ کھسٹ رہے ہوں، اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہوں، لیکن اس بے جا اور غلط استعمال کے لئے مذہب کو مورد الزام نہیں ٹھہرا جا سکتا آج کا ہندوستانی مسلمان مذہبی پیشواؤں کے اس جاہلانہ رویے سے کہیں زیادہ ایک منظم اور با ترتیب استحصال کا فکرمند ہے اور یہ اس ذلت تک ہوتا رہا ہے کہ جب تک مذہب کے صحیح مفہوم سے ہر مسلمان بچہ روشناس نہیں ہو جاتا، اس کے دل اور دماغ علم کے نور سے سوز نہیں ہو جاتے اور مالی طور پر بدستور مستحکم اور خود کفیل ہو کر اپنے آپ کو نہیں پہچان لیتا ممکن ہے یہ بات بھی صحیح ہو کہ اس طرح کی روشن فہمیری اور علم دوستی کو اپنے لئے خطرو سمجھ کر بیشتر مولوی اور کلمہ خواہوں کو جاہلی ہی بنا رہے ہیں اور ہر ایسے انداز کی باہمی ٹی جھگٹ سے مخالفت کریں جو علم کی روشنی کو بلا تفریق چاروں طرف پھیلانے کے لئے اٹھایا جائے ممکن ہے یہ بھی ایسی کوئی غلط بات نہ ہو کہ ریسے ملاؤں کی بیگمنی کے لئے کسی آتما ترک کے طریقہ کاری کو اپنا جانا ہو لیکن بری اپنی دانست میں آج کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایسے طبقہ کو جس کو دانشور (Intellectuals) کہا جاتا ہے اور جو محض اپنے مضمون کی حد تک پڑھے لکھے نہ ہوں بلکہ جن کا شعور جاگ رہا ہو انھیں کھلی ہوئی ہوں اور جو اپنے ارد گرد کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں اور ترقیوں کی جانکاری رکھتے ہوں یہ امر ناممکن نہیں ہے کہ وہ مذہبی پیشواؤں کی ایسی گمشدگیوں کا مقابلہ ہر محاذ پر کریں، اور اپنے کچھ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اور جاہلی حوام میں صحیح مذہبی شعور پیدا کریں اور علم کی روشنی سے ان کے

ذہنوں کو جلا آئیں۔ آج کے دور کو مقابلہ کا دور (Competitive Age) کہا جاسکتا ہے، تعمیت اور اخلاق اقدار اس دور میں آگے بڑھنے، مقام بنانے اور ایک قابل احترام زندگی بسر کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

صحیح مذہبی شعور کے ایک مفہوم کو سمجھنے میں ممکن ہے، اور ذیل واقعات سے کچھ مدد ملے۔

ممدوے چند تہذیبی ذہنوں کو سمجھ کر ایک ظالم مسلمان دنیاوی اور دنیوی دونوں نقطہ نظر سے اپنے آپ کو دیگر افراد عالم سے برتر اور بہتر سمجھتا ہے ایسا کوئی تقدیر اسلام جیسے حوکی اور حقیقت پرست شخصیت پسند مذہب میں موجود نہیں ہے یہاں تو اعمال پر ہی سزا و جزا کا اعلان محض ربانی طور پر کلمہ پڑھ لینے یا مسلمان کے گھر میں جنم لینے یا ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہنے سے کوئی بزرگ، برتر یا قابل احترام نہیں بن جاتا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ہمیشہ عبادت گزار اپنی نجی اور دنیاوی زندگی میں نہایت کرہیہ اخلاق کے حامل غلط قسم کے افراد ہوتے ہیں۔

میرے ایک دوست کی بہن کا نکاح کچھ اسی طرح کے ایک فرد کو ہوا تھا، جو نہ صرف بیچ و تنہ ساز ہی ہیں بلکہ اشتراق و چاشت اور ہجو کا اہتمام بھی کرتے ہیں سرکاری ملازمت کے باوجود کلکیر جاتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے ان کے لہجہ میں تسبیح ہوتی ہے اور زبان پر نام خدا ہوتا ہے۔ ان کی سبکدوشی قدرتی نہیں یہ اسی قدر معاملات میں اٹلے تھے ان کی سبکدوشی میں ملازم تھیں وہ سبکدوشی پوری تنخواہ ہر مہینہ کی یکم کو ضبط کر لیا کرتے تھے سبکدوشی رقم حوالہ کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن اس کا کچھ حصہ اپنے پاس خیرات کے لئے رکھ لیتی تھیں۔ اس پر شوہر نہ ملامت کو کھلتے "سجرات اور جنت حاصل کرنے کے لئے محض عبادت کافی ہے خیرات کا درجہ عبادت سے بلند نہیں، اس رقم کو ہم اپنے بچوں کے لئے ایک بینک میں جمع کر سکتے ہیں حساب ہم دونوں کے نام

Joint account کا صورت میں ہے لیکن اس صورت میں صورت تمنا ہے وہ بچے جمع ہوتے رہیں گے روزمرہ کا اذد و اہی زندگی سے قطع نظر ہر ایک کو ان کے لیے جا اور بجا مطالبات کی تکمیل اور ظالمانہ بڑاؤنے سبکدوشی کی جان لے لی جبکہ ان کی گود میں ایک ننھے بچہ چھلے چلے چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ بچہ اپنے نانا نانی کے یہاں پل رہا تھا۔

بھل بھول رہا تھا۔ باپ نے پہلے تو اپنی مرحوم بیوی کے زیورات ہتھیلے کی کوشش کی، پھر اس روپے پر اپنا حق جتنا شروع کیا جو مرحوم کو اپنی ملازمت کی ابتدا میں نکالی گئی، انشورنس پالیسی پر ملتا تھا اور میں Nominee ان کے والد بزرگوار ہیں۔ یہ مسئلہ تو کھلی امارت شرعیہ کے سامنے زیر بحث ہے اب ان کے پرداز رحمت نے جو ضار اور بولیس میں بھول رہا پورٹ کھائی کہ نانا نانی بچہ کو چھین لے گئے ہیں، معاملہ عدالت تک پہنچا دیا گیا جہاں خدا کے نام پر بیچ بولنے کی قسم کھانے ہوئے صریحاً جھوٹ بولا گیا کہ بچہ ابتدا ہی سے باپ کے پاس تھا نانا نانی چھین لے گئے۔ ان کے اس بیان کی تصدیق ان کے ایک قریبی رشتہ دار نے کی جو نام نہاد پریسنگاری میں ان سے دس قدم آگے تھا۔ عدالت میں جب موصوت بطور گواہ حاضر ہوئے تو حاضرین حیران تھے کہ ان کی گڑبگڑی ڈاڑھی کا کیا بنا؟ پوچھا، تو سنا ہے دوستوں کہ جواب ملا: "عدالت میں گواہی (جھوٹی!)، نانا نانی ہے ڈاڑھی لے ہوئے سرکاری عدالت میں کیسے آیا جاسکتا ہے!" اب پھر سے وہ مومن بارشیں بن گئے ہیں۔ اس طرح کی دوغلی حال ریاکاری اور دہریہ زندگی ایک عام مذہبی انسان کا روزمرہ زندگی بن چکی ہے جب کہ اپنے آپ کو برتر و افضل قرار دینے کے لئے تو مجسم اخلاق بننا ہے کہ اس دارمکافات میں دعوؤں سے اہم اور مقدم تو اعمال و انحال ہیں۔ اسی طرح ایک اور واقعہ سے مولوی کے ذہن کے رخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مجھے چند سال پیشتر ایک ہمدردی مقام کے ہائر سکولری سکول میں منصفہ مسرت ہوئی کے ایک جلسہ میں تقریر کی دعوت دی گئی تھی انگریزی زبان میں اسوہ حسنہ اور حیات طیبہ بیان کرتے ہوئے قرآنی حوالے کے ساتھ میں نے کہا تھا کہ حضور اکرمؐ ہمارے آپ جیسے ہی ایک فرد تھے اور جس امر نے آپ کو ممتاز و مقرب بنا یا وہ وہی تھی جو آپ پر نازل ہوئی۔ اسی وحی کے ذریعہ سے آپ نے پیغام الہی کو ہم تک پہنچایا۔ آپ اس پیغام کے Messenger تھے وغیرہ وغیرہ۔ میں تو تقریر کر کے چلا آیا لیکن ایک عرصہ کے بعد مجھے یہ معلوم کر کے بہت دکھ ہوا کہ مقام مسجد کے امام صاحب نے Messenger اور حضور صلعم کے نام ان دونوں جیسے ہونے والی بات پر مکرر کر کے کئی ڈیڑھ مہینہ تک ہر جمعہ کے خطبہ میں اسی موضوع کے تعلق سے دھواں دھار تقریریں کیں اور انگریزی زبان میں سیرت

پاک بیان کرنے کو غلط کہا۔۔۔ ان کی اصل گرفت انگریزی لفظ پر تھی جس کو ان کی دانست میں محض اکرم کے ساتھ منسوب کرنا گستاخی اور غلامیابی ہے اور گمراہ کن بات ہے۔

ایک عام مولوی اور ملا کی اس کوتاہ نظری، بے علمی، بے عقلی اور بے شعوری کا دھم اس طبقہ کو بالکل صحت برائوں کا حامل نہیں قرار دیا جاسکتا اگر اس طبقہ کے افراد اور مذہب سے بے تعلق افراد کے درمیان صرف اعمال سیاہ کے تعلق سے تناسب نکالا جائے تو مؤخر الذکر افراد ہی سبقت لے جائیں گے۔ اس کے باوجود یہاں سوال یہ ہے کہ آخر دس سے پچاس فیصد ایسے ہی لوگ بھی کی آڑے کر۔ ذاتی مفاد کی خاطر کیوں ایک طرف اخلاقی اقدار کو پامال کرتے ہیں؟ اسی وجہ سے ان کا برائوں میں الجھ جانا قابلِ تکرار ہی نہیں بلکہ قابلِ نفیر بن جاتا ہے۔ اس لئے محض ان کی کوتاہیوں، کمزوریوں اور برائیوں کی بار بار سخت سے سخت الفاظ میں نشاندہی کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ایک مثبت رویہ اختیار کرنا ہے جس سے ان افراد کی اصلاح، بلکہ دوسری سطح پر ان کی شخصیت کی تعمیر میں مقصد کے حصول کے لئے دو طریقے اپنائے جاسکتے ہیں۔ اول نو مسلموں کا دانشور طبقہ ان کے ہر رجعت پسند اقدام کا ڈٹ کر مقابلہ کرے دوم یہ کہ میری دانست میں دراصل ان افراد کی یہ حالت ہمارے مذہبی مدرسوں کے نظام تعلیم کا ایک کھوٹ ہے۔ برسوں کا پرانا نظام تعلیم آج بھی اسی پرانے اور روایتی طریقے پر قائم ہے جو صدیوں سے چلتا رہا ہے۔ بدلتے زمانہ کے بدلے اقدار اور پالیسی کے تحت آج تعلیمی نظام میں بار بار تبدیلی اور ترمیم ہوتی رہتی ہے اسی طرح کے ترمیم کی ان کے ہاں کے سلیبس میں سخت ضرورت ہے اس کے ساتھ آج ہونے والی سائنسی ترقی کی کم از کم بنیادی جانکاری بھی ان سے لئے لازمی بنانا ہے۔ ہر مکتب کے سلیبس میں جدید علوم کی باقاعدہ شمولیت سے نہ صرف مولوی کے ذہن میں وسعت کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے بلکہ جدید علوم سے آگاہ ہو کر وہ آج کے زمانے کے زمپوں کو، آج کے تقاضوں کے تحت بھی روشنی بخش سکیں گے۔ جس طرح جدید علوم کے طالب علم کے لئے بنیادی ذہنی معلومات نہایت اہم ہیں اسی طرح ایک مولوی کے لئے بھی جدید علوم کا پڑھنا ناگزیر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی اقوام کی نشاندہی ان کے مذہب سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی اپنے مذہب کے ذریعہ ہی پہچانا جاتا ہے لیکن مذہب کے اس رول کے علاوہ مسلمان ایک ایسی قوت بھی بن سکتا ہے جو ان کو باہمی اکٹھا رکھ سکتی ہے لیکن انوس کہ اتفاق اور یک دلی کی ضامن اس قوت کو ابتدا ہی سے اپنے ملک میں باہم کشمکش اور اختلاف کا ذریعہ بنا کر آپس میں سر پھول ہی نہیں کھاتا بلکہ قوت خوں ریزی اور جان تلفی تک پہنچی ہے اور یہ سلسلہ ہے کہ سنی، شیعہ، مقلد، حنفی، متقلد، اسماعیلی و خارجی، دیوبندی اور بریلوی اسی طرح کے تمام فرقوں کو یکجہت مل کر ایک ہی جھنڈے تلے سب کا جمع ہونا ناگزیر ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات مجذوب کی بڑے معلوم ہو لیکن اپنے تمام فردی اختلافات کو مٹا کر اکائی بن جانے سے نہ صرف جان و مال کی حفاظت ہو سکتی ہے بلکہ ایک باعزت زندگی کی ضمانت بھی مل جاتی ہے۔

مذہب کی حقیقی پسرٹ کے شعور اور عمل کے ساتھ ملک میں ایک باوقار اور خود مختار زندگی گزارنے کے لئے دو امور کی طرف فوری اور مکمل توجہ دینی لازمی ہے ایک کی طرف تو میں نے مضمناً اوپر اشارہ کر دیا ہے یعنی یکجہت فرد اور یکجہت قوم اور پراٹھنے کے لئے تعلیم ایک لازمی کوالیفیکیشن ہے حالانکہ فی زمانہ مسلمان تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ اور ان میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب آناً ذیلاً سے پہلے کا یہ نسبت بڑھ رہا ہے لیکن عام طور پر یہ دھیما گیا ہے دیگر اقوام کے مقابل میں مسلمانوں کی اکثریت اپنے بچوں کے لئے قلم لو غیر ضروری قرار دیتی ہے یا ان کے پاس تعلیم کا ایک ناقص تصور موجود ہوتا ہے۔ خط لکھ لینے اور اخبار پڑھ لینے کی حد تک پڑھ لینے کو تعلیم کہتے ہیں نہ محض قرآن پاک کو کسی کتاب کے پاس ناظرہ پڑھ لینے کو تعلیم کہتے ہیں۔ اور نہ ہی تعلیم کو محض روزی کا وسیلہ سمجھ کر حاصل کرنا ہے۔ برقی کی دور میں شاہ زبیر نہ چلنے کے لئے ہی نہیں بلکہ آگے بھٹکنے اور اپنی شخصیت کی صحیح نشرو نما کے لئے بھی تعلیم لاپرواہی اور ناگزیر ہے اور اس کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ علم کا دولت کے ساتھ مادی

طور پر بھی جب تک مالی دولت نہیں حاصل ہو جاتی نہ ہی اپنی دنیا
 سرحدھ سکتی ہے نہ دین، مسلمانوں کے دین کی طرف توجہ نہ دینے یا
 کم توجہ دینے کے دیگر کئی اسباب ہیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ
 یا تو مالی طور پر اپنے بچوں کا تعلیم کا بوجھ اٹھانے سے کہیں زیادہ
 اپنے بچہ کو چھوٹی عمر ہی سے سرسبز و زگار لگا دینا، افضل سمجھتے ہیں
 یا وہ اپنے بچہ کو اعلیٰ یا صنعتی تعلیم دلانے کا قدرت نہیں رکھتے
 اس طرح ان کے مالی کمزوری دیگر تمام کمزوریوں کا باعث بنتی ہے
 قوم کے نوجوان یقیناً اس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں جس کی مضبوطی پر ہی
 قوم کی توانائی، مضبوطی اور استحکام کا انحصار ہے تعلیم کی اہمیت کو
 محسوس کرنے والے افراد کی اقلیت اپنا پیٹ کاٹ کر ہزار تکلیفیں
 اٹھا کر اپنے بچوں کو تعلیم کی دولت سے مالا مال کرنے کا ہر ممکن کوشش
 کرتی ہے۔ لیکن اس فرض کو محسوس کرنے ہوئے بھی مجبوری کے عالم
 میں دل سوس کر رہ جاتے والوں کی اور تعلیم کی اہمیت کو بالکل
 نہ جاننے والوں کی تعداد بھی خاصی کثیر ہے اس امر کی طرف مسلمانوں
 کو مکمل ہی نہیں فوری توجہ دینی چاہیے اس معاملے میں ہمارے حسب
 حیثیت اور مالدار اہباب پر دوسری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ایک
 طرف تو وہ ایسے نوجوانوں کا ہاتھ پیر سکتے ہیں اور قوم میں تعلیم یافتہ
 افراد کا تناسب بڑھا سکتے ہیں دوسری طرف وہ ان تعلیم یافتہ افراد کو
 اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دے سکتے ہیں اس کے لئے ایسے
 ٹرسٹ قائم کئے جاسکتے ہیں جن کے ذریعہ صحیح تعلیم و تربیت کی
 سہولتوں کے ساتھ ایک پائدار مستقبل کا تعمیر کے سامان بھیجاہم
 پہونچائے جائیں۔ اس ضمن میں ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دیر از دیر
 نشین کر لینا چاہیے کہ ملازمتوں کی طرف توجہ دینے کے بجائے وہ ایسے
 پیشوں کو اختیار کریں جن میں نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں
 بلکہ ایک مرتبہ اپنے گھر کا چرانع بن سکیں گے بعد اس سے دوسرے
 چرانع بھی چلائے جاسکیں۔ آج بھی سابق کی طرح بلکہ اس سے کہیں
 زیادہ تجارت، صنعت اور زراعت میں ترقی کے روشن امکانات
 نہ صرف موجود ہیں بلکہ دگنے اور تگنے ہو گئے ہیں۔ ابتدائی سرمایہ
 کی صورت میں پیدا ہونے والی عملی مشکل کا حل یوں نکالا جاسکتا ہے
 کہ حکومت اور بینک سے ملنے والے قرض کی سہولت کا پورا پورا

فائدہ اٹھایا جائے اور نہیں تو محولہ بالا ٹرسٹوں سے مدد لی جائے
 ممکن ہے میری اس تجویز کو محض خیالی یا کت لیا سمجھا جائے
 لیکن اگر انفراد اور قوم کو بحیثیت منفرد اکائی کے آج کے سماج میں
 کوئی مقام بنانا ہے تو ایسے چھوٹے چھوٹے منکر فعال اور بائیل یونٹوں
 کے قیام سے ہی کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ میرا یہ مشاہدہ ہے
 کہ کسی خاص مقصد کو (چاہے وہ غلط ہو کہ صحیح) بے کرجب بھی چند
 ”دیوانے“ آگے بڑھے ہیں وہ ضرور اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا ہے
 حاصل کر سکے ہیں بشرطیکہ وہی غلو میں نہ رہا ہو جس سے کام لیا گیا
 ہوئی تھی اور آگے چلکر وہ پیسے بن بڑے پردہ آسمان پر نہ
 اڑنے لگے ہوں۔

زمانہ کے اشیاع پر مسلمانوں کو ایک خود کمتنی، خوشحالی اور ترقی
 پذیر معاشرے (قوم) کے روپ میں لا کھڑا کرنے کا انفرادی اور جماعتی
 کوششوں میں ہمارے قومی ادارے نمایاں رول ادا کر سکتے ہیں۔
 ایسے اداروں میں مقامی انجمنوں سے لے کر ریاستی اور کل ہند ادارے
 بھی شامل ہیں ان اداروں کے مقاصد اور کام سے قطع نظر اکثر
 دیکھا گیا ہے کہ جن بڑے بڑے منصوبوں کے لئے اتنے ہی بڑے
 دعووں اور شاخ و مار طریقے سے کام کی ابتدا کی جاتی ہے چند ہی دن
 بعد دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے یا انہیں تو قوم کے نام پر ادا کرے
 کو چند گئے چنے افراد اپنے ذاتی مقاصد اور مفاد کے لئے استعمال
 کرتے لگتے ہیں۔ ایسی کمزوریوں کے علاوہ ایک بہت بڑی کمزوری
 جو میں نے اپنے بچانے فیصدی قومی اداروں میں دیکھی ہے وہ اس
 کے سربراہوں، عہدہ داروں اور کارکنوں میں خالی ارادے متعلق
 ہے۔ ان تمام آسامیوں کے لئے چن چن کر ریٹائرڈ افسروں کو ٹھکانا
 جاتا ہے ممکن ہے ایک پچیس سالہ سے لے کر ساٹھ سالہ افسر
 کو دفتری کام کا بے حد تجربہ ہو، وہ بے حد مقبول آئی اے۔ ایس
 افسر ہے ہوں اور ان کے پاس ایسی معروفتیوں کے لئے وقت
 کی کمی نہ ہو، لیکن ایک مرتبہ کسی سنبھالنے کے بعد قومی اداروں
 کے دفتر اکثر ریٹائرڈ افسروں کی رقت گزاری کے کلب بن جاتے
 ہیں اور اگر کبھی بھولے سے برائے نام کوئی کام ہو گیا تو قوم پر کئے
 گئے اس احسان کا اس قدر چھایا جاتا ہے کہ اس کو خدا کی سند

کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

قوم اور نوجوانان قوم کے لئے کام کرنے کے لئے بھگتے مانگے ذہنوں اور کمر درجہوں کے بجائے جوش و دلور اور نئے عزم سے بھرے نئے خون اور جوان خیالات کے حامل باوجود اسی صلاحت نوجوانوں کو ان اداروں سے منسلک کرنا بے حد ضروری ہے۔ اگر کارکن کی حیثیت سے ان نوجوانوں کو متغول مگر یقینی متغول پر لگایا جاسکے تو نہ صرف ان سے خوب اور بہتر کام لیا جاسکتا ہے بلکہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری کا مسئلہ بھی معقول اور جائز طور پر ہم حل کر سکتے ہیں۔ خردان بوڑھے ریٹائرڈ افراد کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ وہ تو دنیا کے مزے لوٹ چکے ہیں۔ ان کے کچھ تجربات، واقعات اور مشاہدات کی ایک دنیا ہے۔ اب اسی طرح کی ایک نئی دنیا سے واقفیت نئے خون کے لئے بھی ضروری ہے۔ ویسے پس منظر میں رہ کر قابل احترام بزرگ وقت و وقت اپنی پختہ رائے اور گراں قدر مشوروں سے ان نوجوانوں کو نوازتے رہ سکتے ہیں جو نہ صرف نا تجربہ کار اور خام ذہنوں کے لئے نشان راہ بلکہ ہمیشہ ثابت ہو سکتے ہیں اس کے برخلاف ان بزرگوں کے ہمساحہ ہی میں ہمارے قومی اداروں کی باگ ڈور سنبھالنا نہ صرف غلط طریق کار ہے بلکہ اپنی ترقی کی رفتار کو گھٹانے کے مترادف ہے۔

ان ہی قومی اداروں میں ایسا قومی اثاثہ ہے جس کو برابرا دیکھا جا رہا ہے جس کا استحصال کیا جا رہا ہے جس پر بھی سابق سرکاری ملازموں یا غیر سرکاری بورڈوں کی اجارہ داری ہے اور جہاں ایک سرکاری محکمے کے باقاعدہ تمام کے باوجود حکومت کی سطح سے لے کر شخصی سطح تک صرف دھاندلی ہی دھاندلی مچی ہوئی ہے۔ ایک لوٹ ہے جس میں سرکاری عہدہ داروں سے لیکر غاصب اجارہ دار تک برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ محکمہ ہے اتفاق کا، اور قومی اثاثہ ہے وہ بے درد حساب جائداد جو کسی مسجد، درگاہ یا امام بارگاہ سے متعلق ہے۔ ایسی جائداد کے وقف ہونے کی بنا پر اس پر کسی فرد یا افراد کی ذاتی ملکیت ثابت نہیں ہوتی لیکن انیسویں کا مقام ہے کہ کیا تو ایسی جائداد پر کوئی فرد سانپ کی طرح

پھن پھیلائے بیٹھا ہے یا اس پر ایسے افراد حاوی ہیں جن کی نظروں سے اس جائداد کی آمدنی کا اصل مقصد بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔ بعض جگہ اس کے نگہبان اپنا فرض اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ باتو ملک فردخت کر دی گئی ہے۔ رہن رکھ دی گئی ہے یا اس کو بیڑ براٹھا دیا گیا ہے یا سازشوں کے درمیان اس کو غیر مستحق ہاتھوں میں پیچھا دیا گیا ہے۔ بعض اور جگہ ملکیت کے بے شمار خورد رافتمہ دعوی دار آپس میں اس طرح الجھ گئے ہیں کہ ان کے دعوے برسوں سے خود وقف بورڈ یا ریاستی عدالت میں چل رہے ہیں اور یہ سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔ ہائضر کہیں واقعی ٹرسٹ کی آمدنی کا باقاعدہ حساب رکھا جا رہا ہے تب بھی اس کا صرف صحیح امور کی بجائے ایسے غلط طور پر سہو رہا ہے کہ جس سے قوم کے عریب اور ہونہار نوجوان تو ایک طرف خود ٹرسٹ سے متعلق خاندان کی صحیح ترقی ہو رہی ہے نہ کفالت، ٹرسٹ سے تعلق رکھنے والے جاہل اور قابل افراد کا اخلاقی تھوڑوڑی ہے ہی لیکن انیسویں اس امر کا ہے کہ حکومت کی جانب سے تشکیل دیئے گئے ٹرسٹ بورڈ میں بھی سرے سے صحیح، متخص، درد مند اور کام کرنے والے افراد نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو ان کی تعداد اتنی قلیل ہوتی ہے کہ وہ اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے۔

بیشمار ریاستوں میں وقف بورڈ کی رہنمائی اور دیکھ بھال کی ذمہ داری دہائی کے کاہینہ کے کسی مسلم وزیر کے سپرد ہوتی ہے اور اس مسلمان وزیر کو قوم سے زیادہ اپنی کرسی اور نوجوانوں کے مستقبل سے زیادہ اپنی اور اپنے گھروالوں کی آئندہ زندگی کی فکر ہوتی ہے۔ اول تو عزت مآب وزیر وقف کے کسی حوالہ میں ذاتی دلچسپی نہیں لیتے اور مکمل ذمہ داری اپنے کسی سیکریٹری کو سونپ دیتے ہیں اور اگر کچھ دلچسپی بھی لیتے بھی ہیں تو اپنے مفاد کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ریاست اور ضلع کی سطح پر جو وقف، بورڈ تشکیل دیا جاتا ہے وہاں پھر سے حیرت کی حیثیت سے کسی بااقتی افسر کو مامور کیا جاتا ہے جس کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں کہ اول وہ سلف ہر ناما ہے۔ دوم وہ حکومت اور وزیر بائبر کا سید و نا دار ہوتا ہے سوم اس کو کام سے زیادہ اجلاس اور دوروں کا بھرتہ بھی کرنے کی فکر

ہوئی ہے چیرمین کے ارد گرد جو مہیچہ کئے جاتے ہیں ان کا بھی کچھ یہی حال ہوتا ہے ان میں سے بیشتر کو وقف بورڈ کے قیام، اہمیت اور فرائض بلکہ خود ان کی ذمہ داریوں کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ ان میں سے کچھ بیشتر سابق سرکاری عہدہ دار ہوتے ہیں یا ایسے سرمایہ دار مار جو باری جن کی دنیا داریاں "غیر مشکوک" نہیں ہوتی ہیں اگر نام کی خاطر کسی عالم یا جانکار فرد کو کوئی مقام ملتا ہے تو وہ بے چارہ اکیلا ہوتا ہے اور اس کی آمد و آمد حد ہوتا ہے ملک بھر میں، موجود صرف درگاہوں سے وابستہ جائیداد کے صحیح استعمال سے اس قدر آمدنی ہو سکتی ہے کہ اس سے ملک بھر کے غریب مسلمانوں کے تمام سائل با سالی اور منظم و مرتب طریقہ سے حل کئے جاسکتے ہیں۔ پچھلے رشتہ انسان کی بات ہے میں نماز جمعہ میں یہاں کے ایک محلہ کی مسجد میں شرکت کئے لئے گیا ہوا تھا، نماز کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے غاروں سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لئے ٹھہر جائیں۔ ایک بچہ ان کے سامنے کچھ کہنا چاہتا ہے پھر انہوں نے دس گیارہ برس کے ایک بچے کو پیش کیا۔ اور میں اس ننھے مقرر کا سلاست بلاغت کی داد دیتے بیٹہ زہرہ سکا۔ قرآن پاک کی آیتوں، حدیثوں اور دوراوی کے واقعات سے زیادہ فارسی اور عربی کے الفاظ کے بڑی حد تک صحیح استہلال کے ساتھ اس لڑکے نے حق تعالیٰ کی اس کا حاصل تھا انٹر کے نام پر خیرات کرنے والے کا مقام، اللہ اور اس کے رسول کے پاس نہایت اعلیٰ درجہ ہوتا ہے اس زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اس طرح حاضرین کے ذہن کو بہت کامیاب طریقہ پر تیار کرنے کے بعد خود رسولانے فرمایا: "میں فلاں صوبہ کے فلاں مقام سے آیا ہوں وہاں بعد اللہ ایک راہنشی دینی درس گاہ قائم ہے جس میں کوئی سو سو اسو بچوں کی رہائش اور تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جا رہا ہے اور یہ آپ جنزت کے دینی جذبہ اور آخرت میں مالا مال ہونے کے انتظام پر منحصر ہے محدود بھر دوپہر دیتے جائیے۔" اس لڑکے کی رٹ رٹائی تقریر سے جو ایک تاجر قائم ہوا تھا وہ آن واد میں مالی میں مل گیا مجھے اتنی ذہنی کوفت ہوئی کہ میں نے ان مولوی صاحب سے پوچھا اس ننھے بچہ کی زبان سے اتنی جبری بڑی باتوں کے بعد آپ نے دست سوال کیوں دراز کیا؟ اس کا جواب بلا اس کو جانے دیجئے لیکن یہ واقعہ ہمارے لئے ایک لمحہ فکر فرمایم کہ ہے۔ ہمارے بیشتر قومی ادارے صرف چندوں پر زندہ ہیں۔

اور زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ امر بھی نہایت الموسنگ اور اذیتناک ہے کہ ہمارے معاشرت میں جب کبھی کوئی ادارہ قائم ہوتا ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا سماجی اور قوم کے نام پر جب کوئی اجتماعی یا انفرادی کام کا پیشراٹھا یا جاتا ہے تو قوم کے سامنے بے تکلف ہاتھ پھیلا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ کسی ٹیکنیکل ادارے، اسکول یا کالج کے قیام اور انتظام کے لئے بھی بار بار دست سوال دراز کیا جاتا ہے۔ اگر کسی ہنگامی مقصد یا ضرورت کے تحت، ایسا اقدام ناگزیر ہے، تو اس غلط اقدام کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، لیکن ہر قومی یا غیر قومی کام کے لئے کشکول لئے پھرنا غلط بات ہے۔ اور اگر چندے ہی پر کوئی نیک کام انجام پانا ہے تو ایسے مقصد کے لئے جمع کئے ہوئے روپیہ سے شروعات کے ساتھ ساتھ، جاہلاد کی صورت میں مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا کر لینا چاہیے، تاکہ اس سے آخر تک کام چلتا رہے ترقی کی جائے۔ اور قوم کے سامنے بار بار ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہ پڑے۔ اگر جائیداد نہیں حاصل کی جاسکتی تو اس روپیہ کو کسی صنعت تجارت، یا مالی طے پر مستحکم کمپنی کے شیر خرید کر ضائع حاصل کیا جاتا ہے۔ آمدنی کے مستقل ذریعہ کے بغیر صرف خواہش و عوام کے جود و سخا، نظر عنایت اور دست کرم کے بل پر قومی اداروں کی تشکیل یا قومی فلاح و بہبود کے کام اور ان کی شروعات کو میں بالکل غلط سمجھتا ہوں۔

درگاہوں کی بات چلی ہے تو میرے ذہن میں وہ سوال نامہ ابھر آیا ہے جو میں نے پچھلے دنوں کو الیپسڈ (لیٹینیا) کے ایک اخبار نور الاسلام المحدث بہ *Light of Islam* میں پڑھا تھا۔ یہ ہماری کیسی بد قسمتی ہے کہ ہم اپنے بزرگ دلی، صوفی اور فقیروں کا ایک غلط روپ باہر کے ملکوں میں بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان بزرگان دین کی صالح کوششوں اور باخالی زندگی سے اسلام کی ترویج و اشاعت ہوئی، اس کا پہلے نمایاں کا دہرے ان کے آگے ہمارے سر تقیدت سے جھٹک جاتے ہیں اس کیلئے ہم نذرانہ تشکر و سپاس ان کی خدمت میں نہیں کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے ان کو خدا کا درجہ (نور اللہ علیہ) کہنا اپنی اداروں، خواہشوں اور مقاصد کی تکمیل کے لئے ان پر تمکیر کرنا

صرف ایک اور ایک خدا کی عبادت اور بندگی کی تعلیم دیتا ہے۔
 درج بالا حوالہ سے پانی پانی جانے والی ایک عقیدے کی بنیاد
 غامی کائنات دہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہمیں بے علی اور کاہلی ہی
 نہیں پیدا ہوتی بلکہ اپنے زمان میں بھی عقل و ادق کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ
 متحمل اور عاجز احباب کا ہے شمار وہ یہ ضائع ہوتا ہے اور بس
 دو چار خاندانوں کی ناچار روزی کا سامان ہم پہنچتا ہے۔ ان خرافات
 سے ہٹکار قوم کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے۔
 ان چند مسائل کے بعد اپنی توجہ چند ایسے امور کی طرف مبذول
 کرنا چاہتا ہوں جن کی ذمیت کچھ مختلف ہے ان کا تعلق ہمارے علاوہ
 اپنے اندر گرجنے والوں سے بھی ہے اور اگر کسی طرح کی غلط فہمی ہو
 اور گرد بنے والوں میں ہمارے تعلق سے پانی جاتی ہے تو اس کی بیشتر
 ذمہ داری اچھی ہے اور کم تران کی۔

ایسے مسائل میں اولیت ”مسلم پھر“ کو ہے۔ میرا مطلب مسلم پھر
 کے اس تصور سے ہے جو ہمارے ارد گرد بنے والوں کے ذہن میں بن
 چلا ہے مسلم پھر کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں تواریخ مجھے۔ مخصوص ممالک
 ہندوہ، چار شاہیاں، حرم، لوڈی، غلام، آداب، تسلیم کے لکھنوی انداز
 جیسے امور ابھر آتے ہیں۔ اس غلط تصور کو پیش کرنے میں ہماری بیشتر
 فلمیں بھی ہیں جن پر مسلم سوشل کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ اس تصور کی ترویج
 کا ایک انوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ خود آج کے مسلم نوجوان کے ذہن
 میں اس تہذیب کا کوئی تصور نہیں ہے جو علم کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے
 کہ آج کے مسلمان میں وہ اجتماعی خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی جس کو
 نیشنل کیرکٹر سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں رہنے بسنے کے باوجود ایک عام مسلمان ذہنی
 طور پر دوسرے اسلامی ممالک سے اور زیادہ تر پاکستان سے قریب
 رہتا ہے یہاں تک کہ برطانیہ میں کھیلنے جلنے والے کرکٹ میچ میں بھی
 وہ مخالف ہندوستانی ٹیم کے بجائے مخالف پاکستانی ٹیم کی جیت پر
 زیادہ خوش ہوتا ہے اور ہار پر رنجیدہ۔ اپنے ملک میں ہونے والا کوئی
 عظیم واقعہ اس کو اتنا متاثر نہیں کرتا جتنا کہ پڑوس کے ملک میں ہونے
 والا ایک معمولی واقعہ ممکن ہے یہاں کی ہندو اکثریت کے مسلمان کے آ
 سے جو کئے ہوئے اور بدظن بنے رہنے کی وجہ سے یہ بھی ہٹ

کتنی صریح غلطی ہے جو ہم سے سرزد ہوتی ہے۔ اصل ضرورت تو
 گوشش، ہمت اور تدبیر کا ہے۔

اخلاذ مذکور کی اس راگت ۱۹۶۷ء کی اشاعت کے دوسرے
 صفحہ کے پہلے کالم میں *Do Not Ignore Allah* کے عنوان سے خواجہ غریب نواز
 کی درگاہ شریف سے کسی صاحبزادہ الدین کے بھیجے ہوئے ایک
 سرکار کا حوالہ دیتے ہوئے اخبار نے درج ذیل سوال کئے ہیں:-
 ۱- کیا ہم ان حضرات سے دریافت کر سکتے ہیں کہ آیا خدا
 کی ذات عظیم ہے یا وہ مقدس شخصیت، جن کی اسلام کی
 ترویج میں ان کی کوششوں اور خدمت کی بنا پر ہم انکی
 عزت کرتے ہیں؟

۲- ہم کو یقین ہے کہ یہ صاحب نے دنیا کے مختلف ممالک
 کی ٹیلیفون ڈائریکٹریاں حاصل کر کے اور ان میں شامل ہوں
 پر سرکلر بھیج دیئے ہیں اور وہ یہ منگواتے ہیں ان کو تہ نہیں
 کہ ان میں سے کتنے ہی پتے بیکار ہو گئے ہیں۔

۳- آخر صاحبزادے صاحب جواب کے لئے اسٹامپ
 کوہن کیوں نہیں منگواتے؟ بینک ڈرافٹ یا پوسٹل
 آرڈر کیوں طلب کرتے ہیں؟ نیکی اور سچائی کوششوں
 میں بینک ڈرافٹوں کا کیا کام؟

۴- ہزاروں، لاکھ اور معصوم افراد جو اتنا ڈھیر سار دوسرے
 بھیجتے ہیں یہ حضرت اس کا کیا کرنے ہیں؟ کیا وہ کبھی حکومت
 کو انکم ٹیکس بھی ادا کرتے ہیں؟

۵- قرآن مقدس کی تعلیمات کے مطابق کوئی فرد خواہ وہ
 پیغمبر ہی کیوں نہ ہو دوسرے آدمی کے گناہوں کی مغفرت کا
 ذمہ دار نہیں بن سکتا۔ ان کو معاف نہیں کر سکتا۔ بلکہ دوزخ
 کی نازدوں میں تو ہم اپنے پیغمبر صلعم کے حق میں بھی دعا کرتے
 ہیں تو ایسے میں کیا کئی مرحوم دلی چاہے وہ کتنے ہی متقی و
 پرہیزگار رہے ہوں ہمارے حق میں دعا کر سکتے ہیں؟

۶- ہم ان صاحبزادے کو مغرورہ دیتے ہیں کہ وہ عوام کو غلط اور
 گمراہ کن راستے پر نہ ڈالیں، اس لئے کہ اسلام اپنے پیروں کو

وجہ ہو۔ لیکن جہاں معمولی طور پر دوسری اقوام کا اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ ایسا رویہ ناقابل فہم اور قابل مذمت ہے وہیں مسلمان نوجوان کے بس اپنی افلاس اور واقعاتی خامی کو دور کرنے کا بھی اشد ضرورت ہے۔ دراصل اس ذہنی حالت کی وجہ برسوں کا وہ فرقہ وارانہ ماحول رہا ہے جس نے دونوں طرف کے ذہنوں کو مسموم کر دیا ہے۔ غام اور ابھرتے ذہنوں کے سامنے کسی قوم کے افراد کو ظالم، ماضی، غیر مذہب اور گندے بنا کر پیش کیا جائے اور دوسری جانب الکفار کا اعتبار جیسی مثالوں کو منسوب کرتے ہوئے تنگ شبہ اور عقارت کے جذبات کی پرورش کی جائے تو وہی ہوگا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں لیکن اب جبکہ علم کی جوت جل چکی ہے اور اس کی روشنی سے اندھیرے من روشن ہو رہے ہیں، باہمی منافرت کی تائیدیں کو بھی ایک محنت خیز ہونا ہے، مثلاً ہے۔ آج اسی رواداری پر عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعلیم ایک کا مذہب دیتا ہے تو دوسرے کی تہذیب کے غیر میں جو گھلی ملی ہوئی ہے یہاں انوس اس بات کا ہے کہ آج فرقہ وارانہ رواداری کو ایک دائمی قدر کے بجائے آئینی اور دستوری قدر سمجھا جانے لگا ہے۔ جس کو معمولی سے اشتعال پر تہ تیغ کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ محض اتنی ہے کہ جہاں آئین کو مقدس سمجھا جاتا ہے آئین کی پابندی کو مقدس نہیں قرار دیا جاتا۔ مشہور انگریزی ضرب المثل ہے قانون داں ہی قانون شکن ہوتے ہیں اور اس طرح قانون شکن افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے ویسے قانون شکنی کے لئے یہ بھی عزدی نہیں ہے کہ خود حکومت کے افراد بھی اس کے مرتکب ہوں۔ اکثریتی طبقہ کی محدود نقطہ نظر کی حامل پارٹیوں کے اتھن بھی ان قوانین کا قتل کیا جاتا ہے۔

در اصل رواداری کا جذبہ بھی خود بخود اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب آدمی اپنی سطح سے بلند ہو کر انسان بن جاتا ہے۔ یہاں مجھے شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال کے وہ اشارے یاد آ رہے ہیں جو میں نے عظمت آدمیت کے حوالہ میں کسی کتاب میں دیکھے تھے:

آدمیت احترام آدمی باخبر شد از مقام آدمی
حریت بدر لب: اور لب خلعت کافر و مومن ہم خلق خداست
بندہ حق از خدا گیرد طریق می شود بر کافر و مومن شریف

ہنگن کا ہندستان فیضانِ تعمیر

کفر و دیں را گیرد پستان دل دل اگر بگیرد از دل دلے دل
جمہور معترضہ کے طور پر اگر میں یہاں ایک معمولی سے تجربہ کے بارے میں بتاؤں جو مجھے آج سے پندرہ سولہ برس پہلے ہوا تھا تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں مجھے کورس کی ایک انگریزی کتاب میں انگریزی نظم ابو بن ادم سے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ میں نے اس نظم کا اردو میں ترجمہ کر کے اسی انسانوں سے محبت کے عالمگیر جذبہ کو اپنانے اور عام کرنے پر زور دیتے ہوئے اس کو بچوں کے ایک مذہبی رسلے میں بھیجا تھا۔ جواب میں ملا نا مدیر نے کچھ اس طرح کی باتیں لکھی تھیں "در اصل آج انسان سے محبت کے ردپ میں گمراہی پھیلانی جاتی ہے۔ اصل ضرورت مسلمان کو مسلمان بنانا ہے۔ وغیرہ۔ مسلمان کو مسلمان بنانے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن گمراہی کیسے پھیل رہی ہے؟ صحیح معنوں میں ایک مسلمان تو انسانیت کا بدستار اور ہر چارک ہی نہیں اس کا عامل بھی ہوتا ہے انسانیت کے تقاضے پورے کرتے ہوئے وہ اگلمان کے تقاضے بھی پورے کرتا رہتا ہے۔

نیشنل کیکرٹ کے سلسلہ میں ایک عملی مشکل کے ازالہ کی سخت ضرورت ہے۔ ممکن ہے ترمیم اور خود انکشاف کے ذریعہ مسلم نوجوان میں قومی کردار پیدا بھی ہو جائے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر ملک میں اس کیکرٹ کے نام لیوا تو بہت سارے ہیں لیکن اس کی صحیح اسپرٹ کو اپنا کر اس پر پورے اترنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ خود سیکولر نظریات کے چمکے میں جس قدر اپنے دل قدم قدم پر مذہبی رسومات انجام دیئے جاتے ہیں اس سے ان ہی نظریات کی نفی ہو جاتی ہے۔ مہورت کے وقت ناریل پھوٹنا اور جھوٹے جمع ہر سرکاری دفتر میں پوجا اور پر ساد کی بانٹ سے لے کر صدر جمہوریہ کے کرسی بٹھانے کے وقت مذہبی ریتھوں سے آئینہ دالینے یا نامزد صدر کے ہاتھ میں دیوتاؤں کی تصویر سے کرشمہ بر لینے کے جیسے نامذہبی ڈھکوسلوں تک، سیکولر طریق کار کو طاق پر اٹھا کر دکھ دیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خواہ مسلمان ہو کہ ہندو، ہر مذہب و نسل کی کو گھٹی کے دودھ میں مذہب گھول کر ملا دیا ہوتا ہے۔ وہ مہد سے لے کر لمحہ تک کبھی اپنے آپ کو مذہب

سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کا انشکوبی ذہن اور یا استعداد طبع سیکولر ازم کے نعرے لگتا رہے۔ ایک نظریہ حیات لے جو ہر سیکولر ازم، اس سیکولرزم سے بالکل علیحدہ ہے جو اپنے بین مدینہ ہے سیکولر ازم کے اصل مفہوم کو مسخ کر کے، اس سے نام کی خاطر جیسے رہنے یا حسب ضرورت اس کی توشیح کرتے رہنے کے بجائے یہ کہیں درست ہو گا کہ اس کو بالکل ختم کر دیا جائے تاکہ کم از کم اس کی وجہ جاری زندگی میں در آئی دورخی ختم ہو جائے اور زندگی مزید پیچیدہ ہونے کے بجائے بہن سے پہل ترینی جائے۔

سیکولر ازم کی طرح ایک اور اصلاح ہمارے معاشرے میں غلط طور پر مرد ہے۔ وہ ہے قومی دھارے میں بہن اور قومی یکتہیت۔ میں جہاں تک کچھ سکا ہوں ان کا مطلب دراصل یہ ہے کہ ملک کا مشترک سماجی اور معاشرتی ترقی میں ملک کے تمام باشندے باہم فکر ایک ٹیٹ کے طور پر کام کریں۔ یہ صحیح اور ترقی پسند تعلیم میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں لیکن اس نعرے کی پشت پر کچھ ادا ہے کہ اجتماعی مفاد کے بجائے واحد تہذیب، واحد کلیم، اور واحد معاشرت کو تمام باشندوں پر غور سے کی کوشش کام کر رہی ہے۔ دراصل اجتماعی مفاد کی بنیاد انفرادی مفاد پر مبنی ہوتی ہے اور انفرادی مفاد سے مراد ہر اس فرد اور گروہ کا مفاد ہے جن کے باہمی اجتماع سے ہندوستانی قوم کا تصور ابھرتا ہے۔ اس طرح باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کے تحفظ سے ہی آج کے ہندوستان میں وہ فضا پیدا ہو سکتی ہے جس کو سیکولر ہندوستان میں قومی یکتہیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

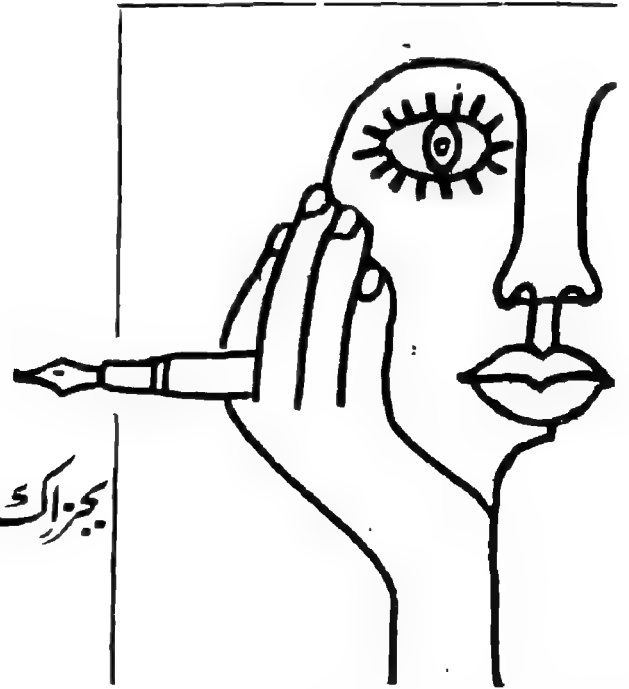
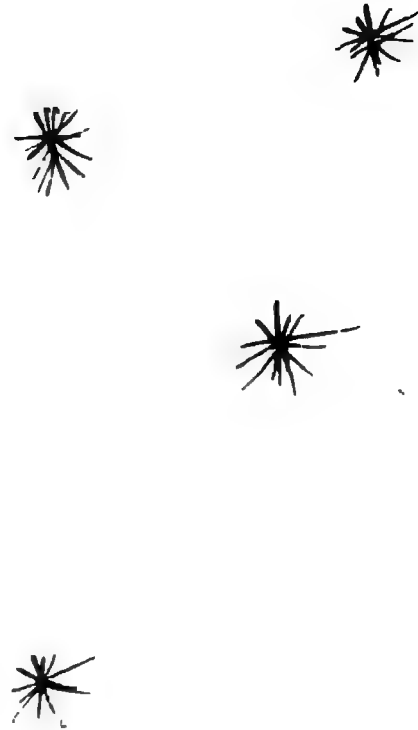
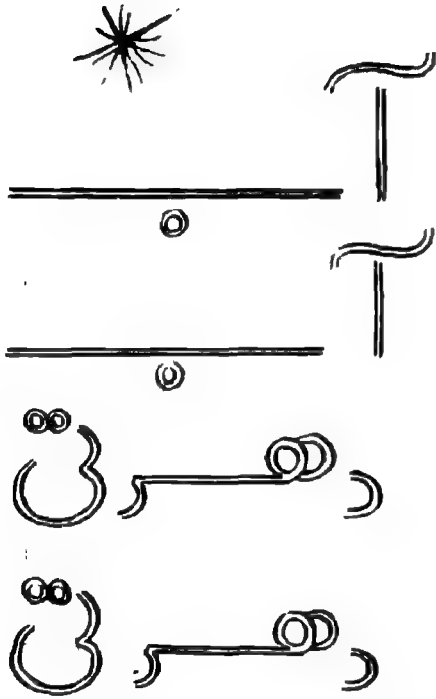
آج کے ہندوستانی مسلمان کی دفا دار کیا ممکن ہے تین جانب بٹی ہوئی ہوں۔ ایک طرف اس کا تعلق غلیم مسلم برادری سے ہو جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہو۔ دوسری طرف قومی سطح پر ایک سیکولر

نام نہیں ریاست کی ترقی کی کوششوں میں اس کا امکان بھر پور ہوتا ہوتا ہو، اور دوسری جانب اس کے اپنے غلط فہم کے سماجی اور معاشرتی تقاضے ہوں کہ اس کو اپنی طرف ہمارے ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ مسلمان کے عقیدے کی مضبوطی ایک ایسی قوت ہے کہ جو اس کو اخلاقی جرات کے ساتھ عمل طاقت بھی عطا کرتی ہے۔ اور جس کے صحیح استعمال کی وہاں بھی ضرورت ہے جہاں ملک دنیا میں ایک نئی اور مستحکم قوت بن کر ابھرنے کی طرف واں دواں ہے۔

ہر دم جواں، ہر آن رواں، ہر لمحہ بدلتی دنیا میں اپنے مقام کے لئے ملک میں پڑنے اور نئے، روایت اور جدیدیت، نظریہ اور تجزیہ کے درمیان ایک کشش جلی آرہی ہے۔ زرعی نظام، صنعتی نظام میں بدل رہا ہے۔ وقتی طور پر اقتدار کی کوس اور ذاتی مفاد کی دھج، ممکن ہے زندگی کے ہر محاذ پر بے شمار دے آئی ہیں۔ بسیکن آزادی کے بعد ملک نے جس خوش حال، خود کفیل معاشرے کے خواب دیکھے ہیں اس کے حصول کی ہر ترقی پذیر کوشش میں ہندوستانی مسلم نوجوان کو پوری طرح ہاتھ ملے گا اور حصہ لینا ہے اس کے لئے ممکن ہے اس کو اپنے آپ کو بڑی حد تک بدل دینا پڑے۔ لیکن مسلم نوجوانوں کو اپنے مقام اور فرائض کا صحیح احساس ہو جائے، وہ سودے کے لئے ہر آن دام لیکر بازار میں جائے بلکہ ملک میں جاری سکڑاواں سے اپنے جڑے کو ہڑ کر کے نکلتے، اس کی شخصیت کا تعمیر میں جس سنٹ فولاد، چرنے اور پانی کا استعمال کیا گیا ہے ان کی مقدار صحیح ہو تو وہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے زمانہ ساز بن سکتا ہے اور ملک ساز بھی۔

★★

ملا عبد القادر بدایونی کی آنحوں سے دیکھا جائے تو ایوا الفضل، فیضی، اور نہیں معلوم اور کتنے عہد اکسیری میں بھی دہری تھے۔ لیکن وہ جیسے پوری تھے، اس کا حال ایسے معلوم ہے، یوں ایسا ہوا ہے کہ جہاں ایک شخص نے شاہ راہ عام سے باہر قدم اٹھایا یا مذہبی عقائد کے باب میں استدلال و احتجاج کی کوئی نئی شکی اعتبار کی، یا اس طرح کا مشرب، جیسا کہ دوسرے کا تھا، تو عام طور پر اُسے دہریت ہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ————— مولانا ابوالکلام آزاد



یجز ایک خامہ بے باک میرے پاس ہے ہی کیا
— شمس کنول

ہندستانی مسلمان بھائیوں
کے لئے

نیک آرزوئیں

آئی۔ این۔ بلہوٹرا (رٹنام)
کے بجانب سے

کوئی شے مستقل نہیں تبدیلی کے سوا

(یعنی پرویز، جو تیسریں کا شوہر تھا) تھا۔ پیغمبر اسلام کی جانب سے اسے قبول اسلام کی دعوت دی گئی مگر اس نے مسلمان ہونا قبول نہیں کیا اور جو تحریک اس کو بھیجی گئی تھی وہ اس نے چاک کر دی تب مسلمانوں نے اپنی بات بڑبڑا کر دینا شروع کیا مگر ان دنوں مسلمانوں کی فوجی قوت بہت کم تھی۔ آخر عبداللہ بن مسعود نے قوت اکٹھا کر ایرانی فوج کو قسم کی سپہ سالاری میں اور عرب فوج سعد بن وقاص کی قیادت میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں اور مغیرہ بن شعبہ اسلامی فوج کے قاصد بن کر یہ کہہ کر رستم کو لاکار رہے تھے۔

”اشر تقالے ہمارے درمیان اپنا رسول بھیجا۔ انہوں نے ہم کو توحید کی دعوت دی اور یہ کہ ہم کتاب اللہ پر عمل کریں، ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کی نصیحت کی۔ آپ نے جہاد کا حکم دیا۔ جو شخص اسلام کو توحید کی دعوت کو قبول کرے گا اس کے اور ہمارے حقوق برابر ہوں گے جو انکار کرے گا اس سے ہم جزیرہ طلب کریں گے جو جزیرہ دینے سے بھی انکار کرے گا اس سے ہم جنگ کریں گے میں تم کو بھی اس کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم انکار کرتے ہو اپنی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (تو یہ تلوار ہے)۔ ہا۔ ہا۔ ہا تمہارے درمیان یہ تلوار فیصلہ کرے گی۔“
ال اخبار ال طوال ص ۱۲۱

”کیا تم واقعی دل و جان سے مجھے چاہتے ہو؟“
”یقیناً۔۔۔!“

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی ہوں۔؟“
”بلکل۔۔۔“

”کیا تمہارے خیال میں میرے لب گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہیں، میری آنکھیں شفاف جھیل جیسی اور میرے بال لہریں کی طرح ہیں؟“
”ہاں میں تو یہی سمجھتا ہوں۔۔۔!“

”واہ! تم کہتے سچے اور اچھے مرد ہو۔!“
ہندستان کا مسلمان بھی ایسے ہی سچے اور اچھے انسانوں کو پسند کرتا ہے جو اسے ہر اعتبار دنیا کی بہترین قوم قرار دے دیں۔ مگر کون نہیں جانتا کہ مسلمان ایک بریض قوم ہے، اس لئے اس کی خوش فہمی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ضروری ہے کہ اس کو اس کے مرض کا سبب بتایا جائے اور اسے دوائے تلخ پینے کی ترغیب دی جائے۔
”مے“ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ بات ”ا، ب“ سے شروع کی جائے۔

مسلمان اور تشدد

عرب کے مسلمانوں نے جب دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی پہلی نظر ملک ایران پر پڑی۔ اُن دنوں ایران کا بادشاہ خسرو دوم

”بنتیہ ال مل تس“ (106-105) میں صریح ہے: ”ایس کے حکم
 ابوعامر محمد بن مسعود نے اس پاس کے عیسائی مالک سے جہاد کو فرض
 فرمودہ یا تھا وہ مسلسل جہاد میں رہتے تھے جو یہ کہ عید کے دن بھی
 دو گنا زاد کرتے ہی کہیں عیسائی ملک پر چڑھائی کی نیت کرتے اور عید
 کا جہاد ہی سے جہاد پر مدعا نہ ہو جلتے فوج بھی ہر لمحہ تیار رہتی تھی ابوعامر
 نے اپنی زندگی میں پچاس سے زیادہ لڑائیاں لڑیں اور بیٹے میں انیس
 کوبال غنہ سے بھر دیا اور دولت سے مالا مال کر دیا۔ 393ھ میں
 ایک جہاد کے سلسلے میں ان کا انتقال ہوا۔ ابوعامر جہاد کو ادھار
 کے نتیجے کی ہر بات کہ اس حد تک منبر کہتے تھے کہ میدان جنگ
 سے واپس آکر اپنے خیمے میں جب اپنے بڑے بھائی جلتے توجہ کر د
 مکتی اسے جمع کرتے اور پھر محفوظ کر لیتے۔ انھوں نے وصیت کی کہ جب میں
 مردل اور مجھے کفن پہنا دیا جائے تو میرے کفن پر بل جع کیا ہو یا یہ سارا اگر د
 دغبار چھڑک دیا جائے۔ چنانچہ ان کے روتے پڑا ہی کیا گیا۔“

یہ دونوں تاویذ کئی واقعات جہاں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام نے
 اپنی اشاعت کے لئے تشدد اختیار کرنے کی تلقین نہیں کی وہاں
 یہ بھی واضح ہے کہ مسلمان نے اسلام کو بڑبڑا زور ہی پھیلا یا ہے۔
 اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے طاقت کا استعمال کرنا

مسلمان کا کوئی دوش نہیں بل کہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تبلیغی مذہب
 کی اشاعت کے لئے REGIMENTAL - FORCE (مردہ قوت) کا ہونا ضروری ہے۔ وہم تشدد کے سب سے بڑے پرچار
 گوتم بھٹے نے اپنے وقت کے پرچار کے لئے یہاں سے وہاں تک گشت
 کیا مگر ان کے نت کو اس وقت تک استحکام حاصل نہیں ہوا جب تک کہ اپنے
 وقت کے سب سے بڑے حکمران اشوک نے بدھ مت کو اپنا مذہب
 نہیں بنالیا۔ حضرت عیسا کا اگرچہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ
 اپنے ایک دشمن پر ٹھانچہ کھلانے کے بعد اپنے دشمن کے سامنے اپنا دوسرا
 رخسار پیش کر دینے کے لئے تیار رہتے تھے مگر وہ اپنی زندگی میں اپنے
 چند ہی حواری پیدا کر سکے۔ چنانچہ عیسائی مذہب کو عالم گیر
 مقبولیت انکسار سے نہیں بل کہ صلیبی جنگیں لڑ کر حاصل ہوئی۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ہندوستان میں اسلام کو اپنے اعلیٰ
 عنصر کے بل پر فروغ حاصل ہوا یہاں بھی اس کی اشاعت میں براہ

راست یا بل واسطہ قوت و اقتدار ہی نے مدد پر پکالی ہے مثال
 کے طور پر سلطان قطب الدین ایبک کا ایک کلکٹر سید حسن شہید
 خاں غریب نواز کا مرید و ملاح تھا اس نے اپنے خاں کے مشن
 (تبلیغ اسلام) کو اپنے اقتدار سے بڑی مدد پہنچائی۔ وہاں ہی
 تحریک ایک معمولی سی تحریک تھی مگر سعودی حکومت کے تعاون
 سے سارے عالم اسلام میں پھیل گئی۔ جب کہ کبیر نے طبقہ
 وادیت کو ختم کرنے کے لئے جی جان سے کوشش کی اور نظریہ
 کبیر کی افادیت سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا مگر یہ ایک بڑا نفع
 تھا کہ کبیر کو کسی حکمران کا قاتل نہ حاصل نہیں ہو سکا اور کبیر کی تحریک
 اس کی زندگی ہی میں ختم ہو چکا کہ وہ گئی۔

آج کے سیاسی نظریے بھی طاقت اور دولت کے بغیر عام
 نہیں کئے جاسکتے۔ شہل کی نازی پارٹی کو تب ہی کامیابی حاصل ہوئی
 جب جرمنی کے ڈیئر (RUHR) صنعت کاروں نے شہل کو مالی مدد
 دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی کامیابی کا سبب ہی یہ ہے کہ اس
 کو حکومت کا تعاون حاصل ہے اور سرمایہ داروں کی امداد۔

تحریر و تقریر اور ضمیر کی آزادی کے اس وعدہ میں بھی اسلام
 کی تبلیغ میں مسلمان تشدد سے کام لیتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں
 اپنی آنکھوں سے یوں کے مغربی اصحاب دہرا دہا باد، سمارن پورہ مجبور
 میٹرڈ وغیرہ) میں ایسے مسلمان بزرگوں کو دیکھا ہے جو اپنے ہاتھوں
 میں دتے (بائس کی گلائی کے دتے میں بندھی ہوئی دو دو گز
 لمبی فار) لئے ہوتے تھے اور چلتے پھرتے ان فوجی مسلمان
 لڑکوں کی پیٹھ پر سید کرتے تھے جو ناز نہیں پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر
 ذاکر حسین خاں مرحوم نے بھی اپنے سلسلے میں ایک بار ذکر کیا تھا کہ
 قائم گج کے جس اسکول میں وہ کبھی تعلیم پاتے تھے اس کے پوٹل میں
 رہنے والے لڑکوں کو نماز پڑھنے پر کوئی سزا نہیں دی جاتی تھی جنھیں
 حدیث کہ کھانا تک بند کر دیا جاتا تھا۔

اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے کہ اکتوبر 1971ء کو جمہیت
 عل پاکستان کے امیر مولانا عبدالحق نے اپنی حکومت سے یہ مطالبہ
 کیا تھا کہ پانچ نازوں میں سے ایک وقت کی بھی ناز چھوٹنے والے
 کو ایک ہفتے کے لئے جیل بھیج دیا جائے۔ مولانا عبدالحق کے اس

ہمارے پروفیشن کا اور ہمارا ریس پیکٹ (RESPECT) کرنا ہے مگر میں بھائی تو ہماری یونی فارم کا بھی ریس پیکٹ نہیں کرتا؟ یہ اس کو سچین نرس کا جواب تھا۔

میرے ایک بزرگ دوست ہیں، انتہائی ماڈرن، ریشٹل اور ترقی پسند خیالات کے حامل انگریز لائش سے مسلمان ہیں چند برس ہوئے کہ انہوں نے ایک ہندو خاتون سے شادی کی جو ڈبل ایچ۔ اے۔ ہیں اور لیکچرر ہیں۔ شادی کے کچھ ہی دن بعد وہ اپنے ایک میلی فرینڈ سے اپنے شوہر کے متعلق بڑی حیرت سے کہنے لگیں: "میں نے ان کے ہر کوٹ اور ہر تیلن کی ہر جیب دیکھ لی مگر کچھ کو کوئی چاقو نہیں ملا۔ میں نے تو سنا تھا کہ ہر مسلمان اپنی جیب میں ایک چاقو ضرور رکھتا ہے۔"

چند دن ہوئے میں مل بازار سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا مختلف قسم کے چھوٹے بٹے چاقو بیچ رہا ہے۔ وہ آواز لگا رہا تھا: "اے مرغا کاٹو، بکرا کاٹو، اسے جس کا چاہے گلا کاٹو۔۔۔" یعنی اس کے خیال میں دنیا میں چاقو کا اور کوئی مصروف ہی نہیں۔

درخت اپنے پھل سے، انسان اپنے عمل سے اور مسلمان اپنی گڈول سے پہچانا جاتا ہے اور مسلمان کی گڈول مومن و کافر اور جہاد کی ضرورت سے ہی طرح بخرورج ہو چکی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے مسلمانوں کو نبھاتے ہوئے ایک بار کہا تھا:۔

"دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں، خدا کا خدا کیا مذہب ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا کے لحاظ سے ایک مذہب نہیں ہے ورنہ وہ کل عالم کی پرورش کیوں کرتا؟ اپنے فیض کو عام کیوں لکھتا اور سب کو تہی کیوں دیتا؟ ایک مذہب جو حق ہے اسی کو رکھتا، باقی سب کو فنا کر دیتا مگر یہ بات نہیں ہے۔"

یعنی مسلمان اپنی ہی انگلی کی انگوٹھی کو سونے کی زنجیریں، دوسرے کی انگلی کا پھلّا بھی سونے کا ہو سکتا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تشدد آمیزی کا جو حملہ

مطالبہ پر بہت حد تک عمل ہوا بھی عیسائی پشاد میں ایک ہسپتال کے کینٹین کے مالک کو حکومت پاکستان نے اس لئے ایک ہفتے کی قید کی سزا دی کہ اس نے ماہ رمضان میں ایک مسلمان گاہک کو اپنے کینٹین میں کھانا کھانے کی اجازت دی تھی۔ مولانا مفتی محمد وزیر ممبر سید کا یہ آرڈی نیٹس تھا کہ رمضان کے مہینے میں دن کے وقت تمام پڑھل بند رہیں گے اور ہر قسم کی کھانے پینے کی چیزیں ٹھنڈے دگم مشروب فروخت کرنے اور پانی پلانے تک کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ آرڈی نیٹس کی خلاف ورزی کرنے والے کو قید ہینس تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ انگریزوں کے عہد میں ہندوستان کی اکثر مسلم ریاستوں میں بھی ماہ رمضان میں دن کے وقت کسی گھر سے دھواں اٹھنا گھر والوں کا جرم قرار دیا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی اس ذہنیت نے کہ ہر مخالف نظریے کو فنا کر دیا جائے اور ان کی اس دست درازی نے کبھی دنیا نے جہاد کی صورت میں دیکھا، اسلام کو تو فروغ بخش مگر مسلمان کی گڈول کو سخت نقصان پہنچایا۔

اب تبین واقعے سنئے۔

تین برس پہلے کی بات ہے کہ میری بیوی شہناز کو ایک بیماری کے سلسلے میں بھئی کے ایک نرسنگ ہوم میں دس دن رہنا پڑا وہاں ان کی مخصوص تیمارداری کے لئے ایک فری لانس نرس کی خدمات عارضی طور پر حاصل کر لی گئیں، وہ نرس جوان تھی، جیسا کہ تھی انڈیا پلوا یافتہ تھی، دس دن کے بعد نرسنگ ہوم کے ڈاکٹر نے شہناز کو گھر لے جانے کی اجازت تو دے دی مگر یہ بھی مشورہ دیا کہ گھر پر کم سے کم دو ہفتے تک ایک نرس کو اپنی تیمارداری کے لئے آکر رکھا جائے تو بہتر ہے شہناز نے اسی نرس کی خدمات کو جاری رکھنا بہتر سمجھا۔ اس لئے اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ گھر پر نرسنگ کی یہ ڈیوٹی انجام دینے کے لئے تیار ہے؟ اس پر نرس نے پوچھا: "تم کہہ رہے ہو؟" شہناز نے بتایا: "ہم یوں تو ہمیں بوڈیورہجے ہیں، مگر میری اتنی بھٹی بازار میں رہتی ہیں، میں یہاں سے اتنی ہی کے گھر جاؤں گی۔" تم اگر اپنے گھر میں بوڈیورہجے تو ہم تمہارا سگر ڈیوٹی پر آئیں گا مگر بھٹی بازار میں نہیں۔ بات یہ کہ سب لوگ

نگن کاہت دستا ئی مسلمان نمبر

ہندوؤں جیسا کہ جو جنتی خصلت مسلمان میں پائی جاتی ہے اس کو بلا جائے جس طرح بادشاہ غان نے جاہل اور جنگ جوشوں میں سے تشدد کے رجحان کو دور کر کے ان میں باہمی پیار اور محبت پیدا کر دی اسی طرح عام مسلمانوں کو بھی غرضیت کے سلسلے میں روادار بن کر ان میں بھائی چارہ اور قومیت کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ سیاست کی بساط پر صرف ہندوؤں کا مسلمان مات کھائے ہوئے نہیں ہے بلکہ سارے عالم کا مسلمان پٹ چکا ہے۔ جب تک وہ اپنی گڑبگڑ میں بنائے گاتھ تک دوسرے اس کے مسائل پر ہم دھی سے غور نہیں کریں گے۔

مسلمان اور جنگ آزادی

پچھلے سو برس سے یہ مقدس جھوٹ بولا جا رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان نے جنگ آزادی میں ٹھہر چڑھ کر حصہ لیا ہے یا مسلمان بھی آزادی کی جدوجہد میں اتنے ہی پیش پیش رہے ہیں جتنے کہ دوسرے فوجی حقیقت یہ ہے کہ پچھلے سو بڑھ سو برس میں مسلمانوں نے تحریک آزادی میں بس بڑے نام ہی حصہ لیا ہے۔ جس طرح چند مسلمان اپنے ساتھ لے کر جن سنگھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ وہ ایک فرقہ پرست جماعت نہیں ہے، اسی طرح ہرستی سے ایک دو غیر فرقہ پرست مسلمانوں کے نام لے کر ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو قوم پرست ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جب کہ بات غالب اکثریت کے اعتبار سے ہو کر آتی ہے۔

بات پھر "ب" سے شروع کیجئے۔

بہادر شاہ کو جنگ آزادی کا پہلا ہیرو کہا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک نہایت کم زور اور اہم پرست انسان تھا اس کا منشا محض یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کا تخت محفوظ رہے چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فیروز تخت کے مستبد سے بہادر شاہ شیعہ ہو جانے پر تیار ہو گیا تا کہ اودھ کے شیعہ نوابین سے اس کو دولت بھی ملے اور ان کی مدد سے اس کی بادشاہت بھی برقرار رہے ہندوستان کے مسلم ملازمے انگریزوں کے خلاف جنگ ضرور کی مگر جتنی کے جذبہ کے تحت نہیں اور نہ انھوں نے اپنے کسی سیاسی شعور کی بنیاد انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مہم کرکے رکھی کہ وہ ابتدائے غری

تھیں کہ ہندوستانی مسلمان نمبر

ہندوؤں کی مخالفت اور انگریز دشمنی میں آج تک مبتلا ہیں۔ مسلم علماء نے مولیٰ ہندو اور انگریز کی تعلیم کی اس حد تک مخالفت کی کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے معقول عالم بھی سرسید سے بلا ہی بعض میں مبتلا تھے۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ علی گڑھ کالج کے تحت اپنی ہی مرضی سے دینیات کی تعلیم کا انتظام کریں تو انھوں نے جواب دیا کہ پہلے سرسید مدد سے کاموں سے دست بردار ہو جائیں۔ اس پر سرسید نے یہ کہہ کر اطمینان دلانا چاہا کہ وہ خود دینیات کی کمیٹی کے ممبر نہیں بنے ہیں۔ مگر مولانا نانوتوی اس کے باوجود اپنا تعاون دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ دلاصل دنیا کے ہر مسلمان عالم کا ہر ترقی پسند تحریک کے خلاف ایسا ہی رویہ رہا ہے۔ ترکی کے شیخ اسلام نے بھی فتوا دیا تھا کہ جو لوگ مصطفیٰ اکمال اور اس کے ساتھیوں کو قتل کریں گے وہ جنت میں جائیں گے۔ شیخ ہند مولانا محمد حسن بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے اور وہ اپنی مخالفت کو اس طرح پھر کر بیان کیا کرتے تھے۔

"میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوا نہیں دیا۔ ہاں یہ بتے تک کہ کیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عوام کو دیکھا گیا ہے کہ لوگ نطریات کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخوں سے اپنے مذہب اور مذہب دالوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت و قیام کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل و ہنہا ہی اچھا ہے۔

اپنے مقلد "بیر عقیدہ" میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا تھا۔ "اگر میرا پس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے لئے سو واپس سے بھی اتحاد کرنے میں گہیزہ نہ کروں کیوں کہ ان کی زندگی سے اسلامی تہذیب و تمدن اور انسانیت کی موت ہو جائے گی اور ان کی موت سے اسلام اور مسلمان زندہ ہو جائیں گے مجھے ایک چیز سے محبت ہے وہ ہے قرآن مجید ایک چیز سے نفرت ہے وہ ہے انگریز"۔

مولانا حسین احمد مدنی بھی اپنی تقریر میں اکثر یہ فرمایا کرتے تھے۔

رہی اگرچہ میرے مذہب میں بخش ہے گروہ انگریز کی طرف نہ کر کے اگر
بھونکے تو میں اس کا منہ چوم لوں۔ ۱۰۔ ایک مولوی عبدل عزیز بھی تھے
ان کو انگریزوں سے اتنی نفرت تھی کہ راہ میں انگریز نظر آجاتا تو
وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔

یہ حقائق واضح کرتے ہیں کہ مسلم علماء انگریز کے دشمن تھے
مگلاس نے نہیں کہ انگریز نے ہندستان کو غلام بنا رکھا تھا بلکہ
اس نے کہ انگریز اپنے ساتھ جو تہذیب لایا تھا اس سے وہ فرسودہ
تہذیب مٹ رہی تھی جس کے نمائندہ مسلم علماء تھے اور انگریزی تعلیم
مسلم نوجوانوں کو وہ شعور بخش رہی تھی کہ جس کی مدد سے مسلم نوجوان
مسلم علماء کے بے جا کنٹرول سے آزاد ہونے لگے۔ لگاتار مسلم علماء کے
ہاتھ سے جاتی ہوئی اجارے داری مسلم علماء کو انگریزوں کے
خلاف چارغ پلکے ہوئے تھی ورنہ مسلم علماء نہ یہی شور مچاتے تھے
نہ ان میں حب وطنی کا جذبہ تھا اور نہ ان کو ہندستان کی آزادی
سے کوئی دلی چسپی تھی وہ تو محض انگریز کے دشمن تھے۔

یہ ذکر غیر ضروری نہ ہو گا کہ مسلمان مولویوں سے گاندھی جی کا رویہ
بہتر ثابت ہوا۔ گاندھی جی نے ان سے نہیں، ان ان کے بے فلول
سے نفرت کی ان کی زندگی کا نصب عین ہی یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے
تہذیب سے اپنے اور وطن کو نجات دلائیں یعنی ایک طرح وہ انگریزوں
کے سب سے بڑے دشمن تھے مگر انھوں نے بھول کر بھی انگریزوں
کی ذات سے نفرت کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس سلسلے میں کبھی
جھجھلاہٹ مٹ ہی کا ثبوت دیا۔

جہاں تک ہندستان کے عام مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں
نے بھی اپنے ملک ہندستان کو آزاد کرنے میں کوئی نمایاں رول نبھایا
نہیں دیا۔

مولانا الطاف حسین حالی سرسید کے بولی ٹی کل کارنامے کے
عنوان سے مئی ۱۸۹۸ء کے محرمین ایگلوا اور ٹیل کالج میگزین
علی گڑھ میں لکھتے ہیں :-

”انڈین نیشنل کانگریس جو حقیقت کوئی باغیانہ
یا خلاف قانون مجمع نہ تھا اگر مسلمانوں کی بولی ٹی کل حالت
کے لحاظ سے ان کا اس میں شریک ہونا سرسید کے

نزدیک خلاف مصلحت تھا، جس وقت سرسید نے اس
کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس میں شریک نہ ہونے
کو کا تو یہ اعتنائے محدود سے چند تمام ہندستان کے
مسلمان، کیسا سنی، کیا شیعہ، کیا دہائی اور کیا فرودال کیا
پڑھے لکھے اور کیا آن پڑھ، کیا وہ لوگ جو سرسید کی
پارٹی میں گئے جلتے تھے اور کیا وہ جماعت کثیر جو ہرات
میں ان کی مخالفت کرتی تھی، سب نے مل اتفاق نیشنل
کانگریس سے ہمیشہ مرث اس بنا پر ملاحدگی اختیار کی
کہ سرسید احمد خاں کے نزدیک ان کا شریک ہونا مناسب
نہ تھا اور لاکھوں مسلمانوں نے ان کا غدول پڑ نکھیں
بندہ کے دست خطا کر دیئے جو پٹر پانک ایسی ہی پیش
نے اس بات کے ظاہر کرنے کو ثابت بھیجے تھے کہ ہند
کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔ ۱۔

محدہ ہندستان میں سات لاکھ گاؤں تھے اور کئی ہزار شہر اگر ہر گاؤں
۱۰۰ ہر شہر میں بڑے نام ایک ایک مسلمان ہی قوم پرست ہوا تو گنتی کے
محاط سے وہ کئی لاکھ ہو جاتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ میں حیثیت ال قوم چند
لاکھ کسی شمار میں نہیں آتے۔ مولانا حالی نے ۱۸۹۸ء کی حالت بیان
کی تھی مگر واحدی دہلوی ۱۹۰۵ء میں دہلی کے مسلمانوں کی سیاسی
حالت کا یوں ذکر کرتے ہیں :

”مجھے غیب یاد ہے ۱۹۰۵ء میں ان کی دانتوں ٹنڈل
کانگریس کے مسلمان ممبر، تعداد مرث و تھی۔ انھیں
لیڈر کہلانے کا فخر حاصل تھا باقی بے روی آن کی کوئی
مسلمان نہیں کرتا تھا گویا وہ خدوئی راہی اور غدوئی رہا
تھے۔ سات میں سے پانچ، بل کہ چھ کے اب نام بھی
مٹ چکے ہیں۔ سات میں مولانا حسرت موبائی تھے
جو استقلال اخلاص اور لائیت کی دہرے زندہ
رہے اور زندہ رہیں گے۔ چھے دلی کے سید رحمت

اب ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۵ء تک کی بات سنئے کہ جب مولانا حالی
آناد کا اپنے ایک خط میں عبور ہو کر ہندستان کے مسلمانوں سے یہ
کہنا پڑا :-

مجبور ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی محنت سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی ٹھیکریاں جو خداس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہسکے گاجس کا ہونا ضرور ہے فرض کر لیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی زندگی ایک تار بج نکلی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کے متعلق کیا کھاجائے گا؟ اس میں کھاجائے گا کہ ایک بد بخت اور بیوں طالع قوم جو بیڑہ ملکی ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی خلاصہ کے لئے ایک برسی، راہ آزادی میں سنگ گراں، حاکم طبع کا کھلونا، دست اجانب میں بازو کی لیب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گھمراہم اور گمنام منٹ کے بات میں ملک کی مسنگوں کو پال کھانے کے لئے ایک پھرن کر رہی۔ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابل رحم گمناموں کا گلاب جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منہ پر جاند بنایا تھا جو اپنے نجات دہانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتی اور شش ہوتی تھی جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انساں دماغ، کوئی انساں حرکت اور کوئی انساں زندگی کا تہوت نہ تھا جو اپنے دماغ سے نہ سوچ سکتی تھی نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتی تھی، ایک مومل جو مسراترے کا ارادہ پر زندہ ہوا ایک وجود بل جو صرف زمین کے لئے بار ہوا، ایک درخت جو ہوا کے لئے ہوا کا منتظر ہوا ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح سے جو کھینچنے پر نہ سکتا ہوا در سب سے آخریہ کہ ایک بھتی کا دایعہ جو انسانیت کی پیشانی پر ہوا۔ اور ہر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی، جگہ ہم آہ اگر مسلم تھی۔

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان ہندو

۱۹۳۵ء میں جب سیاسی اعتبار سے سارا ہندوستان ایک واحد ملک ہو گیا اور ۱۹۳۷ء میں صوبائی دارقوں کا قیام عمل میں آیا ان دنوں میں بھی مسلمان فرقہ پرست تھا اور ان فرقہ پرست جماعتوں کو خصوصی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ تھا جو آزادی وطن کی راہ میں روڑا بنی ہوئی تھیں چنانچہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں غیر کانگریسی ہی وزارتیں قائم ہوئیں۔

آزادی وطن کے لئے جو کوششیں جاری تھیں وہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ہر سیاسی پارٹی میدان میں آگئی اور ہر فرقے نے اپنے رجحان سے یہ واضح کر دیا کہ وہ اصول آزادی کے لئے کس حد تک مخلص ہے۔ چنانچہ اس وقت کے نندوے بی صدی مسلمان نے مسلم لیگ کے پرچم سے آگریہ ثابت کر دیا کہ اسے ہندوستان کی آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ میں مراد آباد کے گورنمنٹ انٹر کالج کا طالب علم تھا اور ان دنوں شہر مراد آباد میں جو اسٹوڈنٹ کانگریس قائم تھی اس کا میں صدر تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس اسٹوڈنٹ کانگریس کے ممبران کی کل تعداد ۲۵۰ تھی جب کہ ۲۵۰ میں صرف ۳ مسلمان تھے اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ چھوٹے بڑے کسی بھی عمر کے مسلمان کو پھر ایک آزادی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نہ خود قوم پرست تھے اور نہ کسی دوسرے کو قوم پرست یا محب وطن دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم کانگریس کے (بقول جوش ملیح آبادی) ”عشوہ فروش لوٹے“ آزاد جیسے مرد حق کو ضمیر بوائے کہتے تھے اور مولانا دینی جیسے بزرگ کے علمائے پرہات ڈالتے تھے۔

اسی لئے مولانا سیل طفیل احمد منگلوری مصنف ”مسلمانوں کا رومن مستقبل“ ایک بار یہ لکھنے پر مجبور ہوئے تھے۔

”یہ بڑی اسہ کہ ۱۸۵۸ء سے لے کر اب تک جب انگریزوں کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات منتقل ہوئے کا مطالبہ کیا جاتا تو ہر موقع پر رجعت پسند مسلمان آٹے سے آدنت نئے مطالبات پیش کر کے حکام وقت کی اعلا کرتے رہے

اور کہ ادنیٰ ہند کی راہ میں سنگ گراں نہیں بل کہ خیل
کوہ گراں ثابت ہوئے۔ ۱

اگرچہ قریہ ہے کہ ابتدا سے آج تک ہندستان کے مسلمانوں
کے غیر قوم پرستانہ رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تقسیم ملک
کے بعد اثرات بھی ان میں سیاسی شعور پیدا نہیں کر سکے۔ غرض کہ
جولوگ سچ (شاید کسی مصلحت سے) مسلمانوں کے سیکولر مزاج کا ذکر
کرتے ہیں اور اس بات کا دعو کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے دوسروں
کے ساتھ مل کر جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے وہ مولانا آزاد جیسے مرد
حق کی اس تقریر کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اہل
نے 15 اگست 1947ء کے بعد دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے کی تھی۔

”میں یاد ہے میں نے نہیں میں سے پکارا، اور تم نے
بہری زبان کاٹ لی، میں نے تلم اٹھایا اور تم نے میرے
ہات قلم کھینچے، میں نے چلنا چاہا اور تم نے میرے پاؤں
کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری
مکڑی میں سے تھیں خطرے کی ہر شاہ راہ پر مجھ بٹھا
لیکن تم نے میری صلیب سے نہ صرف اغراض کیا بل کہ نفقات
وانکار کی ملہری سنئیں۔ مارہ کروں۔ بیستون جن
پر تم نے بھروسہ کیا تھا وہ تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں
لیکن تم نے سنی اور ان سنی برابر گردی اور یہ نہ سوچا
کہ وقت اور اس کی رفتار ہمارے لیے ایسا خطا ط
تبدیل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ کی بساط تمہاری تباہی
کے برخلاف لٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بہت
جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی زخا دے گئے حالانکہ
تم نے یہی سمجھا تھا کہ یلب تا ہمیشہ کے لئے بھائی
گئی ہے۔ تمہارے گردہ نے جو سات کروڑ انسانوں
کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ
اختیار کیا جو مغربی ہستی سے خوب جڑنے والی قوموں کا شیوہ
ہو کر رہا ہے۔ ۱

ہندوستان 5 ہزار برس پرانا ہے۔ چک، قوت برداشت، دلاوری
اور دگر کرنے کی مارت ہندو سماج کا مزاج ہے اور ہندوستان کا

سیکولر نہیں اسی مزاج کا مینہ ہے۔ مہندہ کہ درخ دل سے اور
آئین کی بخشی ہوئی مساوات سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ میں ہو سکتا
ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ماضی کی ساری سیاسی لغزشوں سے
تائب ہو کر قومی دھارے میں شامل ہو جائے۔ قومی دھارے
میں شامل ہونے کا طریقہ کیسا ہے؟ اس کا جواب مولانا آزاد کی
دبان میں یہ ہے: ”آؤ عہد کر دو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے
لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر
ادھورے رہیں گے۔ ۱“

اردو صحافت مسلم لیڈری مولوی۔ مٹلا

آزاد ہندستان کے ان 27 برس میں مسلمانوں کے ساتھ
اردو صحافت، مسلم لیڈری اور مولوی لٹاؤں نے سب سے زیادہ
دشمن کا ثبوت دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو صحافت در آزادی سے قبل اندازاً
کے بعد کبھی بھی ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح راہ نمائی نہیں کر سکی۔
اردو صحافت کی تاریخ میں ”پلیہ اخبار“ ال ہلال، ”زمین دار“ ”ہم“
”خلافت“ ”مدینہ“ ”ال ایمان“ ”دعوت“ ”انصاف“ ”احسان“
”شہباز“ ”آزاد ہند“ ”عصر جدید“ ”ال جمعیت“ ”یارس“ ”بیامت“
”پیام“ ”بیامت“ ”انقلاب“ ”مناہی“ ”نظام گروٹ“ ”انصار“
”انجام“ ”مشور“ ”تنویر“ ”قوی آواز“ ”نجات“ ”مسلمان“ ”پاسبان“
”نولے وقت“ ”زم زم“ ”ہم دم“ ”حقیقت“ ”حق“ ”ہندستان“
”قوی اخبار“ ”اجل“ ”خلافت“ ”ویف کو بڑی اہمیت اور نام وری
حاصل رہی ہے مگر ان اخبارات میں ”انجام“ ”مشور“ ”تنویر“ کی قدر
پرستی اور زمین دار کی نامعقولیت نے ان دو ماں مسلم تاریخ کو جتنا
متاثر کیا ہے اتنا ”ال ہلال“ ”مدینہ“ ”ارد“ ”قوی آواز“ کی صحیح
مگر کم زور آواز مترجم نہیں کر سکی۔ ہرنانے میں اردو زبان میں فرقہ
پرست اخباروں کی تعداد ہمیں زیادہ رہی ہے۔ ایک بار کسی نے

علامہ تاج درغیب، مادی سے پوچھ اٹھا کہ سندھستان میں مہی قوم پرست احادیث کون کون سے ہیں، علامہ نے مزار شاہ اردو بہاؤ کو نظر رکھنے والے حجاب میں ذرا احتیاجی معافی میں نوم مست اردو اخبارات سندھستان میں مست کم ہیں۔ روزانہ ہینڈ رولکٹا ریاست راجی، اور پارس۔ (۱۱ برس) اخبارات قوم پرست ہیں یہ واقعہ ہے کہ اردو زبان کی ساری تاریخ میں چند ہی اخبار شکل حال ہائی رہندہ، ریاست، اردو قومی ادارہ وغیرہ جیسے یا پاپا اخبار قوم پرست رہے ہیں اور انھوں نے حب وطنی کا ثبوت دیتے ہوئے تحریک آزادی کا ساتھ دیا ہے۔ روزہ اکثر اردو اخباروں نے فرقہ پرستی، منافرت، ملک دشمنی، غلامی اور ہیکل پائین کے وہ مظاہرے کئے ہیں کہ اردو زبان کو اپنی زبان کہتے ہوئے شہر آتی ہے مولانا ظفر علی خاں جو اپنے وقت کے سب سے بڑے اردو صحافی تھے گئے ہیں ان کی ذہنیت اور ان کے قلم کا معیار یہ تھا کہ

بھارت میں ملائیں دو بی تو ہیں اک ساور کوک گاندھی ہر ایک جھوٹ کا چلچکا جھک رہے اک کمر کی لٹھن آندھی ہر

دوسرے اردو صحافیوں نے بھی اپنے کردار کے پختہ ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ جمہور کا مدبر۔ اخبار ہمیشہ جمعیت مل کا ترجمان اور قوم پرست اخبار رہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی، بدر علی، ظفر علی خاں، عزیز، ابوالیث ندوی، مولانا مودودی، امیرال قادری اور مولانا عثمان فاروقی کبھی نہ کبھی مدبر کے ادارے سے وابستہ رہے ہیں۔ مگر مدبر کی ادارت جیسے ہی بات سے گئی کوئی مسلم بن گیا اور کوئی جماعت اسلامی میں بلا گیا۔ مولانا فاروقی پندرہ بیس برس تک جمعیت علماء کے ارگن، ال جمعیت کی ادارت بھی فرماتے رہے اور جماعت اسلامی کے ایک روزنامے کے لئے شذرات بھی لکھے رہے اور جب ال جمعیت کی ادارت سے سبک دوش ہوئے تو مسلم لیگ مفت روزہ، نئی دنیا کے مدیر اعلیٰ بن گئے۔

آزادی کے بعد اردو صحافت کا حیار اور گلاب ہے۔

کہتے ہیں کہ ریلوے پلیٹ فارم پر قتل گیر دیکھنے کے لئے بھی ایک بیج (BADGE) دیکھ ہر تلبے کو غلام کا ڈاکٹر اکثر امداد دوجا کا ڈی ٹرینے کے لئے کسی ڈیڑھ یا سارے ٹیکٹ کی ضرورت نہیں۔

گلن گلہستانِ عالی نستانِ شیر

اخبار کی پالیسی کے متعلق مولانا حسرت موہانی کا کہنا تھا:، عقیدہ عام ان سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو کہ خونِ مصیبت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہ ہے بلکہ بتائے گئے ہیں کہ انکے کئی تربیت پذیر آزاد خیال لائبریرس کے دل میں مولانا بھی پڑھیں گے انھیں پڑھانا اور حضرت مولانا کے سوانح کی کاپیوں کو لائبریرس میں رکھنا، ان دنوں اردو اخبار جاری کیا نا میں نہیں روز گاہ سے وہ بھی سرکاری اشتہارات اور کاغذ، سرکاری کوٹے کے بل پر چلنے والا روزگار جب اخبار محض ذریعہ روزگار ہو گا تب قلم کی آبرور اور صحافت کی حریت کے پاس و محافظ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ۷۷ برس میں فی ہزار ۹۹۹۹ اردو اخبارات نے مسلم سٹیل علی گڑھ یورپی کورٹ، اسرائیل و عرب جنگ، بنگلادیش فیملی پلاننگ، اور اردو زبان سے متعلق غلط بیوز اور غلط دیوز سے کر اپنے مسلم قارئین کو گمراہ کیلئے اور ان کو ایک ترقی پسند راہ دکھانے کے بجائے رجعت پسند کو گمراہ کر دئے رکھا ہے۔

آج کی اردو صحافت دردناک حد تک بقیمہ خد قلم کاروں کے ہاتھ میں ہے۔ جماعت اکثر اردو مدیرین ادارت سے اس حد تک الجھتے ہیں کہ وہ اکثر اوقات اپنے اڈی ٹوریل کے کالم میں سہارت خانوں کے اشاعتی شعبوں یا پریس ان فارمیشن بورڈ سے آیا ہوا مواد یا اپنے کسی تیار کی کا کوئی مراسلہ ہی شائع کر دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے ایسے اردو مدیران کی تحریروں میں عالمی اپیل تو کیا قومی اپیل بھی نہیں ہوتی۔

اسی بات کا ایک دوسرا نمونہ ناک پہلو یہ ہے کہ اردو اخبار کو جب تک فرقہ پرستی کا پٹ نہ دیا جائے وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور زندہ رہتا ہے تو سبک سبک کہ اردو کا قوم پرست اخبار قومی آواز، تیس بیس برس پرانا ہو چکا مگر آج بھی اس کی تعداد اشاعت تین چار ہزار سے زیادہ نہیں۔ چند ہی برس میں اردو سیکولر ڈیموکریسی کا جو انجام ہوا وہ معلوم ہی ہے۔ دراصل ترقی پسند یا قوم پرست اخبار کو زندہ رہنے کے لئے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اخبار کی پالیسی سے متعلق سنو نے کی بنا پر کاتب سے اخبار فروش تک کوئی بھی گناہ نہیں سنا، اخبار

بات پاؤں مارنا قدرتی بات ہے مولوی کی یہ آخری نسل ہے جو دنیا
کے لیے دیے گئے ہر مولوی کی اولاد انگریزی تعلیم پا رہی ہے، کوٹے
پتلون پہنتی ہے اور دارا بھی موٹھ صاف کھتی ہے اور توکان ٹٹ
کو حافظ بننے کے لیے تیار نہیں اور نہ مکتور کے لیے چندے
بٹورنے کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے وہ آمادہ ہے۔

فرقہ دارانہ فسادات

یہ کڑی حقیقت گلے نہ شکل ہی سے اترے گی کہ ہندوستان
میں فرقہ دارانہ فسادات کے ذمے دار خود مسلمان ہیں۔ یہ ضروری نہیں
کہ ہر سار کا ابتدا مسلمان ہی کی جانب سے ہو مگر اپنی طاقت بالادستی
کی بنا پر مسلمان جو معاملات پیدا کرتا ہے وہ اسی کے لیے منفرت ثابت ہو گیا۔
مسلمانوں نے گویا ایک نیکلے کے طور پر یہ طے کر رکھا ہے کہ اسی
کی انفرادی و اجتماعی ذات مجموعہ محاس ہے اور غیر مسلموں کی مجمع معاش
یہی ذہنیت یا طرز عمل تمام مغزوں اور فسادوں کا اصلی سبب ہے۔ ہر
مسلمان کے دل میں یہ خواہش دلی ہوتی ہے کہ ہر کوئی مسلمان ہو جائے
بل کہ سارا جہان مسلمان ہو جائے اور مسلمان کے سوا کوئی نظر نہ آئے
اس خواہش کے نتیجے میں مذہبی جیلے اور تبلیغی اجتماعات بپا ہوتے
ہیں۔ خود لیے مسلمان (جن کو ہر پہلو سے ثواب کمانے کا طراشوق ہوتا ہے)
ایسے جلسوں کے خانی غنیمت بنتے ہیں۔ تقریر مدقہ مر کے ذریعے مذہبی
تبلیغ کی آزادی انگور کے زمانے میں بھی تھی اور آج بھی ہے (جہاں چہ
فرقہ دارانہ فسادات انگریز کے عہد میں بھی ہوتے تھے اور آج بھی
ہوتے ہیں) اور آزادی کے ساتھ برسر عام یہ کہنا کہ دین صرف
اسلام ہی ہے ضمنی طور پر یہ واضح کر دینا بھی ہے کہ دوسرے سارے
دین یا دھرم جھوٹے ہیں۔ جب مسلمانوں کا ایک ذمے دار مذہبی غیڑا
چور ہے پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتا ہے کہ جنت صرف مسلمانوں
ہی کے لیے ہے اور اپنی ہزار نیکیوں کے باوجود گاندھی جی جوں کے
وہ کافر تھے، بھی جنت کے مستحق نہیں ہیں تو یہی مسلمان اور غیر مسلمان
کے درمیان نفرت کی ایک دیوار کھڑی نہیں ہو جاتی؟ اور پھر یہ نفرت
ایک نسل بل کہ بہت سے اختلافات اور فسادات کو راہ دکھاتی ہے
پاکستان بننے کے بعد سندھ سے جو ہندو دھارماشر میں مقفل

فروش دوسرے اخباروں کے منڈل کے نیچے اس طرح دبا کر رکھتا
ہے کہ نہ گا کوں کو نظر آئے اور نہ وہ خریدیں۔ بات دہاںل یہ ہے کہ مذہبی
اور مسلم فرقہ پرست جماعتوں نے مسلم اخبار میں جیلے کے ذہن کا اس حد
تک سرچ کر دیا ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے رنگ کے سوا دوسرا کوئی رنگ
پسند ہی نہیں کرتا۔

اور اخباروں کی ذمہ داری جو مسلمان پر جاتے ہیں وہ سوشل
وکروں کے ہتے چڑھ جاتے ہیں۔ سوشل وکر کہنا آج کے مسلمان
کا محبوب مشغلہ ہے۔ دہاںل اس مسئلے کے پردے میں روزگار کے مسئلے
کو حل کیا جاتا ہے ان سوشل وکر کوں کا نہ اپنا کوئی سیاسی نظریہ ہوتا
ہے اور نہ کوئی ازم الیکشن کے زمانے میں یہ جدھر رخ کرتے ہیں اُدھر
اپنے حلقے کے غریب مسلمانوں کا بھی منہ مڑ دیتے ہیں۔ اگر مسلم فرقے
کو مرکزی قیادت حاصل ہوتی تو مسلم فرقہ ان سوشل وکر کوں کی ذمہ داری
بجارتا۔

مسلمانوں کا آج تیسرے پڑاؤ میں مولوی ملے ہے۔ یہ (خصوصی طور پر
پچھلے 27 برس میں) ہر اس بات کی مخالفت کرتا ہے جو مسلمانوں کے حق میں
مغفیانہایت ہو سکتی ہے جیسے مسلم پرسنل لایں ریمیم، خاندانی منصوبہ بندی
مسلم لوئی ورٹی کا قومی کردار، مسلمان عورت کا سماج میں مساوی مرتبہ،
مسلمان عورت کا پردے سے باہر اگر مرد کے دوش بدوش چلنا، وراثت
میں عورت کا حصہ وغیرہ مولوی مسلم معاشرے میں ایسی اصلاحات
کی مخالفت درودجہ سے کرتا ہے۔

(1) وہ نفسیات (CHOLGY) (2) جنسیات
(SEXUALOGY) اور غریبیت (SOCIOLOGY) سے ناواقف
(2) ذاتی غرض۔ مذہبی و نیم مذہبی معاملات کی اجارے داری
اگرا سے حاصل رہے گا تو وہ بار در بار گار رہے گا اور نہیں۔ مولوی نے انگریز
کی مخالفت اسی لئے کی تھی کہ مسلم معاشرے پر جو کنٹرول اسے حاصل تھا
مغربی تہذیب کی آمد سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی آج کی
قوی حکومت کا بھی مولوی اسی لئے مخالف ہے کہ آج اس کو اپنا
وجود خطرے میں نظر آ رہا ہے۔

برنور! اب مولوی مسلم معاشرے کے لئے زیادہ دن تک
دشمن بن کر نہیں رہ سکتا۔ اب وہ چراغ بج رہی ہے ایسی حالت میں اسکا

گلن کا مستثنائی مسلمان صبر

فرستے کے عقائد و اعمال سے تیرہ میں اور یہی فیصلہ رد فرستوں کے
درمیان نفرت پیدا کرتا ہے۔ دربار اکبری کے صنعتی مولوی محمد
آزار نے اکبر بادشاہ کے متعلق ایک بات کہی تھی اسکا یہاں محل
ہے وہ سنتے :-

”اے یہ بھائی تیں تھاک ہر مذہب میں حق پرست
اور صاحبِ معرفت لوگ ہوئے ہیں۔ یکایت
بادشاہ جو سب سے اعلا رہے کی بات کھتا تھا
وہ یہ کہتی کہ پورے کار رب ال مالین ہے اور
قادر مطلق ہے اگر مارا حق ایک ہی مذہب کے مجھے
میں بند ہوتا اور وہی خدا کو پسند ہوتا تو وہی کو دنیا
میں رکھتا باقی سب کو نیست دنا بود کر دیتا۔ لیکن
جب اس نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسکا ایک
مذہب نہیں سب اسی کے مذہب میں !“

اردو اور مسلمان

اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہندوستان کے مسلمان جہاں بھی
دوسرے علاقائی زبانیں بولتے ہیں اور کئی علاقائی زبانیں ان کی
مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں شمالی ہندوستان کے
مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ آج اور ہمیشہ شمالی ہندوستان
کے مسلمانوں نے اردو کو اپنی ہی زبان کہا ہے۔ چنانچہ مولانا
الطاف حسین حالی نے فرزندِ تنگ آصفیہ کے تبصرے (علی گڑھ
اسٹیٹ پبلیکیشنز، ۱۹۸۷ء) میں فرمایا تھا :-

دوسری شہرہ طبعی کہ طو کثیری لکھنے والا شریف
مسلمان ہو کیوں کہ خندہ دہلی میں بھی فصیح اردو صرف
مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی
شوشیل حالت اردو سے مملوکان کی مادری زبان
نہیں ہونے دیتی۔ کمال خشی کہ بات ہے کہ پہلی
لکھی زبان کی پہلی ڈکشنری جس پر تمام آئندہ ڈکشنریوں
کی بنیاد بنائی گئی ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس میں
دو ذوقِ فردی شریں موجود ہیں۔“

ہوئے وہ ضلع تھانہ کی لٹی اناس نگر میں آکر رہے۔ چند برس کی جدوجہد
کے بعد جو سنی اپنے روزگار میں ترقی کر گئے وہ مکان کو لڑ پھوڑ
کر اناس نگر سے شریں میں آئے۔ ان خالی کو اڑوں کو لٹی سے
گئے ہونے چند سالانہ گھرانوں نے بھاسایا اور تھوڑے ہی عرصے میں
اناس نگر کا وہ خالی اور ویلان حد جو ریلوے اسٹیشن سے ملحق
تھا مسلمانوں سے بھگیا۔ پھر ہی اناس نگر کی لٹی کو لٹی مدی سہو گیا
ہاں چشتی زب۔ یہی کے جو لوگ اناس نگر کے دیالے میں جا کر رہے ان
میں ایک میں بھی تھانہ پانی اور کھلی سے خالی دیالے میں بسنے والے
پٹین سے سامنے بھی نہ لے پاتے تھے کہ ایک رات چند مسلمانوں نے
ایک میٹنگ کی اور لوگ نے یہ بات یہاں ایک مسجد تک لے ہوئے
وہ میرے کو اور میرے اپنے اور ان میں سے ایک صاحب نے فرمایا :
”ہم سب مسلمانوں نے یہاں ایک جماعت قائم کی ہے۔ اس کا اسم غلام
انجمنِ اہل مسلمان رکھا ہے تاکہ عیدِ بقرعید کے موقع پر نماز کا انتظام
کیا جائے اور ہم میں وقفہ وغیرہ کا۔ میں نے انھیں سمجھانے کے
انداز میں جواب دیا : ”یہ مسجد میں کی جاتی ہے یہاں رہنے ہی انہی کو یہاں
رہنے کا حق نہ ہے۔ یہ مسجد میں کی جاتی ہے نہ سمجھتے کہ یہاں مسلمانوں
کے بسنے پر انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے آپ نے اگر اپنی مسلمانیت
کا دھڑلہ وہ پٹینا نہ کر لیا تو ان میں جنک پیدا ہو جائے گا اور پھر
آپ کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہی عیدِ بقرعید کی مار کی بات
نوکیاں اور اہل مذاہب یہاں سے ایک ایک ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ
پر دانت ہیں، نماز وہاں بھی پڑھی جاسکتی ہے !“ لیکن وہ ٹھان ہی کیا
جو معقول بات مان جائے۔ یہی بات کا ان پر کول اثر نہیں ہوا تفصیل
کی یہاں گنجائش نہیں بسن تیرے کچھ کو ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ ڈھ
اسی سلم ملتے میں حاسب پڑا ہوا اور آئینہ رنی اور لوٹ مار سے
کئی مسلمان گھرانوں کو کاٹنا نقصان پہونچا۔

ہوتا یہ ہے کہ پیشہ ور مولوی ملا اور واعظ مسلمان سنیوں
میں پہونچتے ہیں۔ ثواب کمانے کی خواہش میں بسنی کے دولت مند
مسلمان ان ملاؤں کی آؤ مہنگت کرتے ہیں اور جیسے میں وعظ و
تبلیغ کے جیسے منعقد ہوتے ہیں اور ہر جلسے میں جو کچھ کما جاتا ہے
اسکا خلا سہی ہوتا ہے کہ ہمارے فرستے کے عقائد و اعمال کا

غیر مسلموں نے اردو کو اپنی مادری زبان بنا کر کبھی نہیں سیکھا
محض دفتری اور کاروباری ضرورت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اردو
زبان پڑھیں۔ غیر مسلم اردو کو اپنی مادری زبان کا مرتبہ دے بھی نہیں
سکتے تھے اس لئے کہ ان کی تہذیب و تمدن اور مذہبی ادب سماجی
روایتوں اور قدروں کا تعلق اردو زبان سے بالکل نہیں تھا۔ اسی
لئے دنیا داری اور کاروباری مصلحت کی بنا پر غیر مسلم اردو زبان
سیکھتے تھے اور اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے مذہبی رسم و رواج
کی بقا کے لئے اپنی خواتین کو اپنی مادری زبان (ہندی) ہی
سکھاتے تھے۔ اسی لئے پنجاب میں ہندی کو عورتوں کی زبان
کہتے تھے۔ اردو کس حد تک مسلمانوں کی زبان ہے یہ بات جناب
سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے سنئے :-

”خاص طور پر مسلمانوں کو تو بہت ہی سہمہ ہوا کیوں کہ
اردو کے خاتمے سے نہ صرف یہ کہ ان کا سماجی و ثقافتی
نقصان تھا بلکہ ان کے عقیدے اور مذہب کے
مستقبل کا بھی سوال تھا، اردو زبان ہی اسلامی
ثقافت و تہذیب سے رابطہ کا تہا ذریعہ تھی، اس
زبان میں ہندوستانی مسلمانوں کا سارا مذہبی لٹریچر ہے
اس کا رسم خط عربی رسم خط سے قریب تر ہے جس کی
وجہ سے بزرگانِ محمد پڑھے میں آسانی ہوتی ہے اس
زبان سے مسلمانوں کی محرمی کا مطلب ان کی قومیت
ملی امتیازات اور مذہبی سہماے کی بڑی کمی۔“

۱۹۴۷ء کے بعد باطل پٹ گئی۔ چونکہ مسلمانوں سے اپنے مطالبہ
پاکستان کو تقویت پہنچانے کے لئے اردو کو اپنی زبان قرار دیا تھا
اور ان کا یہ اعلان درست بھی تھا اس لئے پاکستان بننے ہی ہندو
کی اکثریت نے بھی اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا کہ اب ہندوستان میں
اردو کا کوئی مقام نہیں ہے۔ جمہوریت میں گنا گتے ہیں تو لائیں کہتے
ایک ہزار میں نو سو سناوے (بلکہ ایک لاکھ میں سناوے ہزار نو سو
سناوے) مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں دوت دیا۔ پاکستان بن
گیا، اب ہندوستان کی اکثریت اردو کو ہندوستان میں وہ مقام دینے
کے لئے تیار نہیں جو اس کو ۱۹۴۷ء قبل ہندوستان میں حاصل تھا

گلشنِ کائنات منانی مسلمان ممبر

عذر یہ ہے کہ یوپی جہاں اردو کا گڑھ ہے وہاں صرف اردو ۱۹ویں
صدی اردو والے زبان اردو بولنے والے، مگر ضرورتاً نہیں کہ وہ اردو
زبان لکھنا پڑھنا جانتے (مطل) پاسے جاتے ہیں (جب یوپی کا یہ
حال ہے تو دوسری ریاستوں کا حال معلوم) اس لئے اردو کو کوئی
سرکاری درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اب دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ
مسلمانوں کو جمہور کا یہ فیصلہ مان لینا چاہیے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اس سلسلے میں مسلمانوں نے ایک پٹا کھایا
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات گزرتے ہی ہندوستان کا مسلمان اردو کو
کی زبان کہنے لگا مسلمانوں کی اس سیاسی صحت (باریکاری) کا وہ
چند غیر مسلم بھی ساتھ دینے لگے جو صحافی ادیب، افسانہ نگار، شاعر، پتہ
کے بنا پر اردو کے ذریعے اپنی روزی کرانے کے لئے مجبور تھے یا پڑھے
تو تے ہونے کی بنا پر ہندی یا کوئی دوسری نئی زبان نہیں سیکھ سکتے
تھے اور اپنی تھوڑی سی بقیہ عمر کی خاطر اپنی ساری پچھلی زندگی کے علمی
و ادبی کارنامے کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے لئے تیار نہیں
اس سلسلے میں کسی غیر مسلم اردو والے کو شہنشاہِ ہند آئندہ نراٹھ
یا کسی رگھوپتی سہماے فراق کے نام نیسے کا مطلب ہے اپنے کان
کو مصنوعی تقویت پہنچانا۔ آج کے ہندوستان میں جو غیر مسلم اردو والے
پلے جاتے ہیں وہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو والے نہیں بنے بل کہ
انھوں نے اپنی روزی کی خاطر ۱۹۴۷ء سے قبل تب اردو زبان
سیکھی تھی جب پاکستان کے قیام اور قبل آبادی کا حکم کسی کو نہیں تھا
اور ۱۹۴۷ء سے قبل کثرتِ دینی و دینی غیر مسلم اردو پڑھتے تو اور
کیا پڑھتے اور یوپی کا کائنات نہ تھوڑا سا نہ سیکھتا تو پھر کیا تھا!
چوں کہ فراق صاحب نے اردو زبان پڑھی ہے اور اردو زبان
میں وہ شاعری کرتے ہیں تو کیا محض اس بنا پر اردو کو فراق صاحب
کی مادری زبان کہا جائے گا؟ ہر چند زنا تھوڑا پادھی بھی انگریزی زبان
کے شاعر ہیں اور میر تقی میر انگریزی زبان کی شاعر بھی ہیں اور
مشہور مقرر بھی گرد و نول میں سے کسی ایک کی بھی مادری زبان انگریزی
نہیں بن سکی۔

سوال :- سے اس کا جواب ناں مسلم اردو رائٹرز کانفرنس کے
شہرت یافتہ شری رام دھل دیں تو اچھا ہو کہ اردو کے سلسلے میں جن

غیر مسلم اردو درازاں حضرات کا نام بار بار دیا جاتا ہے اور بڑے فخر سے لیا جاتا ہے کیا وہ آج اپنے بچوں کو جس اردو پڑھا رہے ہیں؟ میری یہ بات سن کر جناب شہید اعظم نے کچھ جواب دیا تھا: ہم غیر مسلم کی بات کرتے ہو: آج تو مسلمان بھی اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھا رہے ہیں!

اردو اور سیکولرزم

اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کا مزاج کبھی سیکولر نہیں رہا۔ اس لئے اردو زبان کو سیکولرزم سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو نے ہندوستان میں فروغ و جنم لیا مگر اس کا مزاج ہمیشہ مسلمان ہی رہا اس کی ساری تشبیہات اور کیفیات، تمام جذبات اور استعارات و مقامات اور حالات سرزمین ایران و عرب سے لئے گئے ہیں۔ زکریا، سبل، بنفشہ، بلبل، قری، مہر، نعل، بام، چلن، ناقہ، نامہ بر وغیرہ سب ایران و عرب ہی کی دین ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بہار جیسا کوئی موسم نہیں ہوتا جب کہ اردو شاعری بہار و خزاں کے ذکر کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی جس طرح گنتی کے چند بود پرست مسلمانوں کا نام لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان کے بچے نے جنگ آزادی میں جتہ لیا ہے۔ اسی طرح ہزاروں اور ہزاروں اردو نثر نگاروں اور شاعروں نے صرف نظیر کبریا کی چند نظموں اور اقباک کے ثوالے کا ذکر کر کے اردو کو سیکولر زبان ثابت کرنا چکا نہ بات ہے۔ اس بعد لیکر بلبل CONTRIBATION (حصہ) سے اردو کو سیکولر بنا نہیں کہا جاسکتا۔

اردو کو سرکاری زبان بنائے جانے کے موضوع پر میں نے جب کبھی غیر مسلم (غیر اردو وال بھی) ہندوستان سے بات کی ہے اس نے اپنے اس اندیشے کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے کہ جنگ آزادی کے دنوں میں اردو زبان نے اپنے ہزاروں اور ہزاروں ادوار و اخبارات

کے ذریعے دو قومی نظریے کا پرچار کیا ہے، یہ اردو ہی ہے جس نے مسلمان کو آج تک سیکولر بننے نہیں دیا اور اس اردو ہی نے پاکستان بنایا ہے اگر اردو کو پھر پڑھا دیا گیا تو پھر ایک پاکستان بن جائے گا۔ اب مندرجہ بالا بات کی تائید میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وہ بات سنئے جو انھوں نے اردو زبان سے متعلق بلوچستان کے ایک سالانہ جلسے میں 27 مارچ 1948ء کو اپنے خطبہ صدارت میں فرمائی تھی:-

”اردو نے ہر مسلم تحریک کی مدد کی ہے۔ دہلی تحریک کو اس نے مدد دی۔ سرحد کے مشن کو اس نے چمکایا۔ غلات کا پیغام گھر گھر اس نے پہنچایا۔ لیگ کی آواز اس نے تھر تھر اردو گانوں کا گلو سپنائی۔ پاکستان کا پرستگندہ جس برق رفتاری اور قوت سے اس نے یہ اعظم کے کونے کونے تک میں کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں جوتیا دلوا دیا۔ جو اس اور ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہمارے اس وطن کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں!“

جو کچھ اوپر کہا گیا اس کے ثبوت میں ایک بات اور عرض ہے کہ کسی انگریزی روزنامے میں یا کسی بھی علاقائی زبان کے روزنامے میں ”جواہر لال قرآن“ یا ”احوال و معارف“ یا ”محراب و منبر“ قسم کے کالم کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر کوئی بھی اردو روزنامہ (جب کہ ہفت روزہ یا ماہ نامہ کی بہت روزنامہ زیادہ عوامی ہوتا ہے) اپنے مسلمان قارئین کی مذہبی نمائندگی کیلئے بغیر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ شری گوبال سنگھ، جوش ملیح آبادی، سردار دیوان سنگھ معزز، داد بابائے اردو مولوی محمد حق اپنے اس اندیشے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں اردو زبان کا روزگار سے تعلق ختم ہو چکا ہے اس لئے اب اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ روزنامہ ”ملپٹ“ کے اڈیٹر ٹرنری دل پیر کا بھی یہی کہنا ہے:-

”آج پنجاب میں جو لوگ سرکاری ملازم رکھے جاتے ہیں

اے اگر ایک کروڑ میں کوئی ایک غیر مسلم راہنہ مارا اپنے بچوں کو اردو پڑھا رہے تو اس سے بات نہیں بنتی، بات غالب اکثریت کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے۔ (دشک)

مجلس کا ہندوستانی مسلمان نہ ہو

ان کے لئے ہندی جاننا لازمی ہے۔ انگریزی جاننا بھی، اردو جاننا لازمی نہیں ہے۔ اگر وہ اردو جانتے ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں جانتے تو کوئی یہ نہیں کہتا کہ تمہیں سرکاری ملازمت نہیں ملے گی۔ اردو جاننا مانجانا بلکہ، ایسا ہو گیا ہے جیسے سبھی کا علم یا اعلیٰ ہو۔ کوئی آدمی اگر لگا سکتا ہے تو اسے ملازمت میں ترجیح نہیں ملتی۔ اگر نہیں لگا سکتا تو کوئی اسے ملازمت حاصل کرنے سے روکتا نہیں۔ یہ اس کا اپنا شوق ہے، شوق کے لئے وہ اردو دیکھتا ہے تو اچھا ہے، نہیں دیکھتا تو کوئی یہ نہیں پوچھتا: آپ اردو کا شوق کیوں نہیں فرماتے؟ اسی حالت میں لوگ اردو دیکھنے میں وقت کیوں خرچ کریں گے۔ ان حالات میں یہ خیال ہے کہ اردو کا مستقبل نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہزار اردو بورڈ قائم کئے جائیں اور سرکار کرڈول روپے نہیں کرڈول ڈالر کیوں نہ خرچ کرے جب تک سرکاری ملازم کے لئے اردو جاننا لازم نہ ہوگا اردو کا مستقبل ہونے ہی کے برابر ہے گا۔ مگر اندھیری گٹھائیں تارے فنا نہیں ہوتے سرکاری سماروں سے بے نیاز ہر کار اردو وال خدایا جس تو مندرجہ ذیل طریقوں پر عمل کر کے اردو کے مستقبل کو روشن بنا سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ جذباتی نہیں محض پسند یا بوائے۔

رسم خط کی تبدیلی

اردو زبان کے تحفظ کے لئے اردو کا عربی کے بجائے دیوناگری رسم خط میں لکھا جانا بہت ضروری ہے اس کی وجہ حسب ذیل ہیں۔ (۱) اردو رسم خط غیر مائٹھی ٹک ہے۔ اردو رسم خط، رسم خط ہی نہیں ہے بلکہ شامٹ، ہندو سماجی لئے اس کے دیکھنے میں کمی ہے دوسرے رسم خط (خصوصی طور پر دیوناگری) کی بہ نسبت زیادہ مشکل پیش آتی ہے اور ساری زندگی صرف کرنے کے بعد بھی کوئی اردو وال اپنے اردو لکھنے کو صحیح المانیں کہہ سکتا۔ اردو رسم خط زنگی کا سارا وقت صرف کرنے کے بعد بھی مکمل طور پر نہیں دیکھا جاسکتا جب کہ

دیوناگری پچھلے چند گھنٹے میں سیکھی جاسکتی ہے اس لئے کہ اردو حروف ہمارے لفظ ہوتے ہیں اور ہندی حروف سُر۔ اسی لئے بچے کو کہنا ہے کہ ہندو رسم خط دنیا کا سب سے زیادہ سائنٹیفک رسم خط ہے۔ (۲) اردو کا یہ ناقص اور نامکمل رسم خط مسلمانوں میں: خواندگی کے اخلائے کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہندوستان میں جو اردو کے علائے (یوپی اور بہار) کہے جاتے ہیں وہاں ناخواند مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ (۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے یوپی کے ضلع رام پور میں ناخواندہ انجم کی تعداد ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے) جنوبی ہند کے مسلمانوں میں نسبتاً تعلیم زیادہ ہے اس لئے کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں بلکہ جنوبی ہند کی علاقائی زبانیں ہیں سے کوئی ایک ہوتی ہے بات یہ ہے کہ جہاں تک اردو حروف پہچانے کا سوال ہے اردو زبان دیکھنے والا بچہ بہت تھوڑے وقت میں اردو حروف پہچانے لگتا ہے مگر جب اُن کو لکھنا دیکھنا ہے اور جوڑنے کی منزل میں پہنچتا ہے تو اس کا جی اچاٹ ہو جاتا ہے (۳) اردو زبان کا یہ عربی رسم خط اردو اخبارات کی تعداد اشاعت میں کمی کا باعث ہے۔ ہندوستان میں اردو اخبارات دہرائی کی تعداد اگرچہ ہزاروں تک پہنچ چکی ہے مگر انھوں نے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سارے اردو اخباروں اور رسالوں کی مجموعی تعداد انگریزی کے کسی ایک اخبار یا رسالے سے یا جنوبی ہند کی کسی ایک علاقائی زبان کے جریدے کی تعداد اشاعت سے زیادہ نہیں ہے۔ اردو میں گنتی کے دواہ ناموں، دو ہفت روزہ اور چار روزناموں کی تعداد اشاعت کو تسلی بخش کہا جاسکتا ہے آج ہی کے دور میں اردو اخبارات کی تعداد اشاعت میں کمی واضح نہیں ہوئی بلکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزوں کے راج سے بھی پہلے یعنی غدر (۱۸۵۷ء سے بھی قبل ۱۸۴۵ء کے ٹک بھگت جب اردو کے مقلد میں نہ فارسی تھی، نہ انگریزی اور نہ ہندی ہی ان دنوں) صادق ال اخبار اردو کا سب سے بڑا ہفت روزہ تھا اور اس کی تعداد اشاعت صرف ۲۵۰۰ کا پیاں تھیں۔ ذرا آگے پڑھئے، اتنی لکھتا ہے: "۱۸۵۶ء میں اخباروں اور رسالوں میں سب سے زیادہ مقبول اور کثیر اشاعت اخبار لاہور کا

کہو نورہ تھا۔ لیکن اس کے خریداروں کی تعداد 349 سے زیادہ نہیں تھی۔ انگریزوں کے عہد میں جب نہ کانگریس برسرِ انداختی اور نہ اردو دشمن جن سگ بن کا وجود تھا اردو کو اگر یہ کی حمایت حاصل تھی اور بھرپال اور حیدر آباد جیسی مسلم ریاستوں کی اور بھی ان دنوں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ملک آباد میں انجمن ترقی اردو نے بیٹھتے تھے۔ اسی دنوں انھوں نے انجمن کے جریدے ”اردو“ کے تعلق بڑی محنت سے لکھا تھا کہ ان دنوں اردو کے سالانہ خریداروں کی تعداد صرف 3 ہے۔ آج کے اردو جریدوں کی تعداد بھی چند سو سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اکثر اردو رسالوں میں مولد کے نام قارئین کے خط (نام و پتے کے ساتھ) تالے ہوتے ہیں بہت سے اردو ہفت روزہ اخبارات و ماہانہ رسائل انہی بڑوں پر اعزاز کی طور پر اپنی کوسیاں بھیج کر اپنی تعداد و شاعت بناتے ہیں اور خطِ قریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ سب واضح ہے کہ قارئین مسلمان ہیں اور ماحرہ ہیں اردو سر کی وجہ دی ہے کہ اردو رسم خط طریقی طباعت کو مشکل بنائے ہوئے ہے۔

(4) ترکی کے مددِ ظاف کمال پاشا نے ماہِ تعلیم تھے اور نہ ماہِ رسائیات نکلا ہے نہ وقت کی سیاست کو سمجھتے تھے اور ان کو اپنی قوم کے مستقبل سے دل چسپی تھی چنانچہ جب انھیں یہ احساس ہوا کہ خان قاجاروں میں ایسے والے صوفی اور مجرمان میں رہنے والے قاکلک کی زبان میں عوارب تخلیق کرتے رہے ہیں وہ ادب اب آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے اور اب وہ قوم کے لئے گمراہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ ترکی زبان کی ہر کتاب کو تو ضائع کر دینا ممکن نہ تھا اس لئے کمال پاشا نے اپنے ملک کا رسم خط بدل دیا اور اس طرح پرانے ادب کی ذہن آلود تعلیم سے نئی نسل محفوظ ہو گئی۔ آپ یقین کیجئے کہ اردو کی بھی سوکتا بول میں سے نواہے کہ میں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں اور اب ان کا مطالعہ گمراہ کن ثابت ہو رہا ہے مثال کے طور پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی لکھی ہوئی کتاب ”حضرت مولانا محمد اویاس اور ان کی دینی دعوت“ سے ایک قیاس ملاحظہ ہو۔

مولانا محمد اویاس کا اخلاق کے متعلق نظریہ

حکامِ اسلامیات کی تسلسلہ تصویر

کہا۔ ”خدا جب تک جناب محمد علیہ السلام کے قدموں کے نیچے نہ آئے، وہ اخلاق نہیں کہی اور بدعت۔ سدا کے تسبیح ہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمت اللہ علیہ سے رہا، بزرگِ تشریف لائے تھے ایک دعوت میں یہ بھی تھا اور حضرت کے پاس بیٹھا تھا صاحب دعوت دیر تک کسی انگریز انسر کی خوش اخلاق کا تذکرہ اور اس کے حسن اخلاق کی تعریف بڑے دوق اور نوبت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا (شیخ مہمند) نے کچھ دیر تک کو صبر و ضبط سے سنا مگر طبیعت پر بہت گراں ہوئی، مجھے آہستہ سے فرمایا کہ کیا کانفرس بھی اخلاق ہوتے ہیں؟“

اپنی گمراہ کن معلومات اور ذہن آلود درس کی بنا پر کیا یہ کتاب بھونک دینے کے قابل نہیں۔ اسی کتاب سے ایک دو ملاحظہ

مولانا (مولانا محمد اویاس) نے فرمایا کہ آج تک غیر موم نے میرے جسم کو مس نہیں کیا۔ صرف ایک مرتبہ ایک عورت بمبار تھی، میں گیا تو نزع کی سی کیفیت تھی اس جلدی میں میرے ہات میں اپنے ہات دینا چاہیے میں نے اپنے ہات بچھنے لئے، صرف میرے پورے اسکا ہات لگ گیا۔“

سچ تو یہ ہے کہ آج کے سائنسی ٹک عہد میں اردو کی تقریباً ہر کتاب صرف بے کار بل کہ مضر بن چکی ہے۔ ساری کتابوں کو ضائع کر دینا تو ممکن نہیں ہے البتہ رسم خط بدل کر آج کی اور اُنے والی نسل کا

لے بیٹی کے منہ صحری مارکیٹ کے غیر مسلموں کے اخلاق کا موازنہ اگر نل بازار کے مسلم دکان داروں کے رویے سے کیا جائے تو یہ فیج ہجائے گا کہ مومن با اخلاق ہوتا ہے یا کافر؟۔ شک

تھے یہاں وہ مسودات مانج ہو جاتی ہے کہ مولوی انتہائی شفیق طلب ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ہمارا مولوی علم جنسیات سے نہایت متکنا بلکہ ہے قابلِ رحم ہے کہ وہ قوم کے جس کی راہ نماں ایسے مولوی کریں!۔

اردو زبان کی آؤٹ آف ڈیٹ اور گمراہ کن لوگوں سے تعلق قطع کیا جاسکتا ہے۔

(5) اردو زبان کے پرچوش اور معصوم حامی اردو کو ایک ہندستان گیر زبان قرار دیتے ہیں جب کہ اردو زبان ہندستان گیر نہیں ہے اردو بولی نرود ہندستان گیر بنایا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فارسی و عربی زبان کے غیر افوس اور قتل الفاظ سے اردو کو پاک کیا جائے۔ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ تشبہات و استعارات اور تعلیمات کے استعمال کے سلسلے میں عرب و ایران کی تاریخ کو نہیں بلکہ ہندستان کے مزاج کو ملحوظ رکھا جائے۔ مترادف طور پر یہ بھی کہنا ہے کہ آج پاکستان کے اردو شعرا میں اپنی تخلیقات میں ہندی الفاظ داخل کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی اردو کو آج پنجابی، سندھی، اڑیسہ، توجی، عوامی زبان کا سامنا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اردو درختوں کے مواد میں عوامی اپیل ہو اور اردو قاری کو اردو اخبار مسلم فرتے ہی کا ترجمان نہ محسوس ہو۔

(6) اس سلسلے میں دنیا کی تاریخ اور قوموں کی تعلیمات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آزاد ملک اپنی ہی زبان اور اپنے ہی رسم خط کو اپنا سکتے ہیں۔ چین و جاپان۔ بھارتی مادری زبان اور اپنے رسم خط کو بھی نہیں بدلا۔ اب ہندستان اگر اسے قدرتی بات ہے کہ وہ بھی اپنی ہی زبان اور اپنے ہی رسم خط کو ترجیح دینا اس کے ساتھ ساتھ لغویاتی حقیقت یہ بھی ہے کہ مفتوح قوم اپنی فاتح قوم کو دل سے کبھی پسند نہیں کرتی، مفتوح قوم کو فاتح قوم کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور زبان و رسم خط سے بھی عداوت ہوتا ہے، ترکوں، مصریوں اور ایرانیوں نے بھی عرب قوم کی کسی چیز کو کبھی پسند نہیں کیا۔ مسلمان مصریوں کو اپنے غیر مسلم آبادیاء و ذریعوں پر اور مسلمان ایرانیوں کو اپنے ذرشت بزرگوں پر کج بھی نظر ہے اس لئے بھی انھوں نے عربی زبان پر اپنی زبان کو اور عربی رسم خط پر روئیں رسم خط کو فوقیت دی۔ اس لئے جو ہندستان میں وہ کسی بھی رسم خط کی نسبت اپنے دیوناگری رسم خط ہی کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ ہندستان کے مسلمانوں کے قومی مفاد کے لئے یہ بات بہتر

ہوگی کہ وہ اپنی زبان اردو کے عربی رسم خط پر دیوناگری رسم خط کو ترجیح دیں۔

یہاں میں خصوصی طور پر نوجوانوں سے مخاطب ہوں کہ رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں ہمارے جنگ مخالفت کریں گے۔ مگر اس سلسلے میں ان کی مخالفت کی پروا نہ کی جائے۔ اس مشرقی تہذیب نے ان کو ہمیشہ رگتاخی سمات (منافقت اور دیکاری کا سبق دیا ہے کون نہیں جانتا کہ ہندستان کے (خصوصی طور پر دیوبند کے) ہر مولوی نے سرسید کی انگریزی تحریک کی دلیخ طور پر مخالفت کی تھی مگر آج ہر مولوی (خصوصی طور پر دیوبند کا) اپنی اولاد کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ انگریزی پڑھا رہا ہے۔ اور سرسید کا جہاد ہر مولوی کے سر چوڑھ کر بول رہا ہے۔ آج بھی جو حضرات اردو زبان کے بڑے حامی بنے ہوئے ہیں انہی کے بچے اردو زبان سے نہ صرف تعلق توڑ چکے ہیں بلکہ وہ کان وینٹ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا ہمیشہ (بڑا راست یا بل واسطہ) اردو رسم خط سے تعلق رکھتا ہے۔ رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں ان کی مخالفت ایک لازمی بات ہوگی مگر ان کا احتجاج اُن گھوڑا نا۔ گئے والوں کے احتجاج سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا۔ جہاں شہر میں بس سروس کے آنے پر اپنے روزگار کی دہائی دے کر شور مچایا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چند بھی بھرا شخاص کے مفاد پر سارے شہر کے انسانوں کے آرام و سہولت کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔

ہندی اور علاقائی زبان

ڈاکٹر شان محمد اپنی کتاب "سرسید، تاریخی و سیاسی آئینے میں" میں لکھتے ہیں

"راجا رام موہن رائے کی کوششوں سے ہندوؤں نے مسلمانوں سے پہلے انگریزی تعلیم کو قبول کر لیا تھا 1824ء میں سرکار نے سکھتے میں جب ہندوؤں کے لئے ایک سنسکرت کالج کھولنا چاہا تو موہن رائے نے گورنمنٹ سے مدد و اعانت کی کہ ان کو سنسکرت نہیں بلکہ انگریزی کا بھوں کی ضرورت ہے۔ اس

افسوس! آج کے مسلمانوں میں ایک بھی راجا رام موہن رائے نہیں جو دوسالہ کی کثرت دینے ہوئے اپنی قومی حکومت پر یہ کہے کہ میں نے اردو متنی پورہ کی ضرورت ہے اور نہ اردو میں اسکول لگا دیا۔ بل کہیں تو پہلے بڑھتے ہیں ہی سکول اور نصف پڑھنے کے ۱۲ برس گزرنے کے پس مسیحی مذہب کے مسلمانوں کے مذہب سے لیا۔ لیکن لے اردو میڈیم ہے اسکولوں کے ذریعے ایک پوری نسل کو گونا گونا بنا دیا ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں پر ہے۔ ہر مسلمان بچے جب ہندی یا انگریزی میڈیم کے میں داخل ہوتے ہیں (اول تو داخلہ ہی مشکل ہوتا ہے) تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور وہ چند ہی دن میں بھاگ کھڑے ہو جاتے۔ بس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان بچے ہندی پڑھیں۔ انگریزی زبان سیکھیں اور اپنی ریاست کی علاقائی زبانیں۔ مسلمان کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ سرکار اردو کے سلسلے میں جو سہولتیں دیتی ہے یہ سب اس کی راج مکتی ہے اور یہ ساری نوازشیں جیسی بڑی اور پائیدار کام دینے والی اقلیت کی خوش نوازی کے لئے ہیں۔

غیر کی آگ میں مسلمان

شاید دنیا میں ہندوستان کا مسلمان ہی وہ واحد فرقہ ہے کہ جس نے غیر کہ آگ میں جلنا سیکھا ہے۔ جب طرابلس کے مسلمانوں کا اپنا مسئلہ پیدا ہوا۔ جب جنگ بلقان چھڑی، جب ترکی نے ایک نئے دھم میں قدم رکھا، جب ایران میں جنگ ہوئی اور جب

محمد تقی مصطفیٰ علی سلمان سیر

میری بو بو چھتے ہر نو دیتا ہوں اُن پہ جان،
ان کا یہ حال ہے کہ ادھر دیکھتے نہیں

اگر کبھی دیکھتے ہیں تو ہنس کر کہتے ہیں: "کیا تمہارے اپنے مسائل نہیں ہیں جو ہماری حکیر بڑی ہے۔" معتزہ طور پر ایک بات سنئے کہ جب شیخ ہند مولانا محمد حسن مجاز میں ترکی کے گورنر جمال پاشا سے ملے اور جمال پاشا سے دریافت کیا کہ ہم ترکی کی کس طرح مدد کریں؟۔ آپ ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتے، اپنے ملک واپس جا بیٹے ہندوستان کی رائے عامہ کو ہندوؤں کے تعاون سے ہم داریہ کیجئے اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کیجئے! ایک سیاست ناشا، ہندوستانی مولوی کو ترکی کے عظیم مہر کا یہ وجہ تہ اود واضح جواب تھا، مولانا محمد علی جوہر ہندوستان میں خلافت تحریک کے مہر تھے مگر ترکی میں جب انھوں نے صلیطہ اکمال پاشا سے ملاقات کرنا چاہی تو آتا ترک نے مولانا محمد علی کو ایک دتیا نویسی اور جدید سیاست سے نا آشنا لاکھ کر مٹنے سے انکار کر دیا۔

مگر اتنی ساری ناقدری اور اتنی بہت سی ٹھوکروں کے باوجود ہندوستان کے مسلمان کتنا جتنا تک عقل نہیں آئے وہ پاکستان (جس کے وجود نے ہندوستانی مسلمانوں کی پٹھانی پر کلنگ لگادیا) کی ہم دودی میں بھگلہ لوٹیں کہ آزاد کی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور حکومت سمونی عربی کا حق نو دی کی خاطر بادشاہت کا کھیل ہی کو دن رات جو دی قدروں اور عمان کی خدمت کو کرنے میں لگا ہوا ہے جسے طمان

ندوی، دیوبندی، اور جماعت اسلامی کے ملاؤں کے لئے مولانا آزاد کی بیان کی ہوئی اس بات میں بڑی عبرت ہے:

”اسلام نے بادشاہ کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کر دیا ہے اور صرف ایک رئیس جمہوریت (پریزیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی خلیفہ کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معانی نیابت کے ہیں گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے اس سے زیادہ وہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن نے نظام حکومت کے لئے شوریٰ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ”دائمہ شوریٰ بنیم“ چنانچہ ایک پوری صورت اسی نام سے قرآن مجید میں شوریٰ کے معانی باہم مشابہت کے ہیں یعنی جو کام کیا جائے جماعت کی باجم رائے اور شوریٰ سے کیا جائے شخصی رائے اور حکم سے بہتر۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بادشاہ چاہے مسلمان ہو وہ کتنا ہی نیک اور انصاف پسند ہو اور چاہے اس نے اپنی رعایا کی فلاح کے لئے کتنے ہی کام کئے ہوں، اس کی اچھائی تو تسلیم کر لی جائے گی مگر اس کا وجود ناجائز و ناانصافی ہی رہے گا۔ اگر کوئی شخص ہمارے گھر پر تافض ہو کر بہت اچھا انتظام کرے اور سلیقے سے ہماری گرفتاری چلائے تو اس کے حسن انتظام کی وجہ سے اس کے قبضہ بے جا کو بجا یا جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غیر ذل کی غیر ضروری طور پر تعریف و توصیف سے کوئی فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ اپنوں کی نظریں اپنے وجود کو مستحسب بنایا جائے اور اپنے حق کو اپنے ہاتھ سے دے دیا جائے۔

ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے پس کی تک وہاں میں پرورش پاتا ہے ہمیں کتا ہے، کھاتا ہے، اپنی اولاد کے لئے شیش محل اور لال قلعے تیار کرتا ہے، جامہ ملیہ دارلعلوم مسلم یونیورسٹی جیسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھتا ہے اور پھر حاج محمد اور تاج محل جیسی مقدس اور خوبصورت یادگاریں چھوڑ کر ہندوستان ہی کی پتھر مٹی میں دفن ہو جاتا ہے اس کے باوجود اس کا اپنے ہندوستان کی نسبت کسی دوسرے استعمار کو زیادہ پاک سمجھنا

وانش مندری نہیں بل کہ اس کے سارے تار کھنی کر دار کو مسخ کرنے والی بات ہے عقل کی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کرے کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا وہی بات میں اس کے سامنے ملو، کا ایک حل مختصر ہے یعنی جس طرح 1857ء کے بعد انگریز کے ملنے مسلمان کے لئے قابل اعتماد ثابت ہونا ضروری تھا۔ اسی طرح 1947ء کے بعد ہندو کے سامنے اس کو اپنا اعتماد بحال کرنا چاہیے۔

اسلام اور ہندوستانی مسلمان

اسلام کبھی ایک بہت بڑی سچائی تھی مگر آج وہ سچائی بوجھ ہو چکی ہے جب کہ سچائی کو متحرک ہونا چاہیے۔ ہندوستانی مسلمان خدا کو ماننے یا نہ ماننے، اس سے زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ مافوق فطرت طاقتوں پر اعتماد کرنے سے اپنی خدا اعتمادی ختم ہو جاتی ہے اور تخلیقی صلاحیت بھی کام کرنا بند کر دیتی ہے۔ تو یہاں جذبات اور غیر عقلیت کے بل پر اپنی زندگی کو نہ اپنے کام کا بنایا جاسکتا ہے اور نہ دوسرے کے کام کا۔ عقل کی راہ نہائی میں سائنسی خاک طریقے سے جو مسئلہ حل کیا جاتا ہے وہی قابل قبول ہوتا ہے اور وہی قابل عمل بھی۔ جاہل مولوی نے معصوم مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ 14 سو برس پرانی بات آج بھی کا کاسمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ دنیا میں اس سے بڑی غلط فہمی دوسری کونسی ہو سکتی۔ ڈرائی ڈن نے کہا تھا: ”خدا کو بھی یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ ہمیں کو دلپس لے آئے، یقیناً وقت اور فاصلہ بڑی ہے، بڑی حقیقت کو بدل دیتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں دوسروں کے عقیدوں کے بتوں کو توڑ دینا ایک سہل حقیقت تھی مگر کبھی کا یہ کار ثواب آج جڑ ہے۔ اخلاقی بھی اور قانونی بھی۔ کبھی حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اپنی تلوار کھینچ کر اپنے مقابل رستم کو اسلام کی دعوت دی تھی مگر آج ایسا عمل ممکن نہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ 14 سو برس پہلے تھا موجودہ حالات میں بائبل نہیں چل سکتا اور وہ آج کے بوجھوں کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان اُسی

کہ معاملہ سپہ قہر و مدد کا اسکے چاہنے پر بھی مسلمان ترقی نہیں کر سکیں گے

اسلام اور معاشی مسائل

یہ بات اسلام ہی پر موقوف نہیں بل کہ جہ مذہب بھی رد مل جائے
مسئلہ حل نہیں کر سکتا وہ موجودہ حالات میں انسان کے ساتھ نہیں
چل سکتا یعنی وہ مذہب آج ناکام ہے کہ جس کے پاس معاشی مسائل
حل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اور ناکامی کی پہچان یہ ہے کہ جو مذہب
اپنے ملنے والوں کو روٹی دینے میں ناکام اجتا ہے وہ حد سے
خیرات، زکات، بیت مال، دان یا چیزیں پر زور دے کر اپنی
بی کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ بھولے مسلمان کو جانتا چاہیے
کہ آج کی ٹیک نالوئی نے وہ صورتیں پیدا کر دی ہیں کہ معذور سے
مستعد انسان کو بارود زکا اور خفیل بنایا جا سکتا ہے۔ خیرات گھر
یا یتیم خانے قائم کرنے کی بہ نسبت زیادہ بہتر یہ ہے کہ معذور انسانوں
کو روزگار فراہم کرنے والی ٹیکسٹائل کھول جائیں جن سے ثواب کمانے
کا مغلطانوں کو خیرات و زکات کا مادی بنانا انتہائی مدغرضی ہے
اذا یک غیر انسانی حرکت ہے۔

قرآن برحق مگر...

اس میں شک نہیں کہ مسلمان کا قرآن برحق ہے مگر مسلمان کو
فلح دلی ہے اور اپنے کھلے ذہن سے اس حقیقت کا بھی اعتراف
کرنا چاہیے کہ قرآن کے ابھر بھی بہت کچھ ہے اور فقہ بھی حق ہے۔ دنیا
میں مسلمان ہی صاحب حق نہیں بل کہ کچھ دوسرے انسان بھی
معرض حق ہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کا مولوی، ہندوستان
کے مسلمانوں کو حالی حالات و واقعات کی سچی رپورٹ (ایسی بے خبری
اور بدعزائی کی بنا پر) ہی نہیں دیتا جنہاں پر جب کوئی کافر کا درجہ
مصلحت کی بنا پر نامہ کمال بس جاتا ہے تو مولوی اس ناجوازہ دھرم پٹے
کو عالم اسلام کا سب سے بڑا معرکہ قرار دیتا ہے اور نیک دل مسلمان
خشی سے بظنیں بجانے لگتے ہیں اور اس خش می میں مبتلا ہو جاتے
ہیں کہ بس اب ساری دنیا مسلمان ہوئی جاتی ہے حالانکہ انہیں
نہیں معلوم کہ آج کل ہرے کرسٹنا ہرے رام کی جو عالمی تحریک جاری

ہے وہ مسلمانوں کی غلط فہمی

ہے اس سے متاثر ہو کر ایک ایک وقت میں تیسری تیسری نہیں
یعنی تیس ہزار تھیں اس مسلک کو چارہ ہے ہیں۔ اس حقیقت
کے قطع نظر آج اسلام (یا کسی مذہب) کے کال یا ذوال، ترقی
یا منزل، فتح یا شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج مقابلہ محنت
اور رائے کا ہے، فتح محنت کش کی ہوگی یا سرمائے دار کی۔ ان
دووں کے تصادم کا نتیجہ ہوگا وہی انسانی زندگی کے مسائل کو
حل کیے کا مقابلہ کے اکھاڑے میں اسلام (یا کوئی بھی مذہب) ہے ہی
نہیں۔ اس لئے اس کی فتح کی امید ہی کرنا غلط ہے۔ یہ وضاحت
بھی ضروری ہے کہ اسلام غلط نہیں اس لئے نہیں ہے کہ اسلام (اور
دوسرے ہر کوئی مذہب) معاش کا مسئلہ حل کرنے میں بہت پہلے ناکام ہو
چکا ہے اس لئے اب وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہے۔

کوئی شے مستقل نہیں

کہتے ہیں کہ کوئی شے مستقل نہیں تبدیلی کے سوا۔ ٹیکس پیئر نے
اس بات کو اس طرح بدل دیا ہے: "ہر چیز میں تبدیلی بل کہ ہم
مل جلتے ہیں" ہر صورت انسان کی فطرت تغیر پسند واقع ہوئی
ہے اگر وہ اپنی تغیر پسندی کو روک نہ لے تو یحییٰ کے بقول: "ہر جوبی
باتوں کو قبول نہیں کرتا وہ نئی نئی برائیاں کو دعوت دیتا ہے" بہ فرغ
جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا یہی
فطرت کا قانون ہے اور یہ قانون ہر شے پر نافذ ہے۔ کوئی مذہب
ہو یا مسلک، کوئی ازم ہو یا سیاسی نظریہ۔ ہر نیا خیال ایک نہ
ایک دن پرانا ہو جاتا ہے۔

دیبا کے لوگوں کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ سوشلزم
(اشتراکیت) ایک نیا خیال ہے یعنی انسان کی معاش کا مسئلہ
حل کرنے کے لئے بہترین فارمولہ ہے۔ یہ یعنی بات ہے کہ مستقبل
میں یہ فارمولہ اپنانا، ناقابل عمل اور غیر مفید بن جائے گا۔ مگر اشتراکیت
آج کی سیاست کی آخر تو یہی شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نصف
سے زیادہ دنیا اس کو اپناتے ہوئے ہے اور اس سے فائدہ
اٹھا رہی ہے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اشتراکیت سے
بتراد کوئی راہ نہیں۔ ہندوستان کی ہر سیاسی و مذہبی پارٹی بعض

کمل طرز پر کسی نہ کسی حد تک فرق پرست ضرور ہے اور اس کی فرقہ وارانہ سیاست ہندوستانیوں کے اور خصوصی طور پر مسلمانوں کے مابین مسائل (اور دوسرے مسائل بھی) کے حل ہونے میں مانع آتی ہے اس لئے آج کے ہندوستانی مسلمان کو صرف اور صرف اشتراکیت ہی کے لئے میں پناہ دل سکتی ہے

تم وقت کے دھاروں کا رگوں کے سفر تک

ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی ہندوستانیوں کا مولوی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں خان عبدال غفار خان کی زبان میں مولوی سے بھی کہنا ہے:-

"یہ آدمی (بادری) جو تم دیکھ رہے ہو فرنگیوں کا ملا ہے اور یہ بھی دیکھئے کہ اس قوم نے ترقی کی ہے تو اس کے ملانے بھی ترقی کی کہتا ہے تو یہ قوم جو جنگلوں میں رہتی ہے موٹروں میں گھومتی ہے اور سیر کرتی ہے تو اس کا ملا بھی جنگلیں میں رہتا ہے اور موٹروں میں پھرتا ہے اور ہم لوگ جب خود ذلیل و خوار ہیں اور ترقی یافتہ نہیں ہیں تو ہمارا ملا بھی ذلیل و خوار رہے۔ اس لئے ملا صاحب! آپ اگر یہ بات ذہنی نشین کر لیں کہ اگر ہم لوگوں نے ترقی کر لی تو آپ بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے اور اگر ہمارا حال بڑے ترقی تو آپ سوچیں کہ ہمارے ساتھ آپ کبھی حال بڑا رہے گا۔ آپ کے اتوں میں ہر وقت یہی ٹوکر رہتی ہے اور آپ گلی کوچوں میں روٹی وٹیفے مانگتے پھرتے ہیں۔ اپنی موجودہ زندگی اور اس انگریز ملا (بادری) کی زندگی پر کچھ سوچ بجا کیجئے اور دونوں میں فرق سمجھنے کی کوشش کیجئے!"

مولوی کوئی نئی بات سوچنے کے لئے اس لئے تیار نہیں کہ اس کو اپنے روزگار کے چلے جانے کا اندیشہ ہے، لیکن اس کا ڈر ہے دروازہ روزگار کے ساتھ دے اور سارے مسلمان سوشلزم کی راہ پر چل کر اپنے حالات سدھار لیں تو مولوی کے حالات بھی خود بخود سدھ جائیں گے بلکہ باعزت روزگار کے بہتر مواقع اسے حاصل ہوسکیں گے اور پھر

وہ اپنے آج کے اس ذلت آمیز پیتے (جموں کی روٹیاں، امیروں کے دسترخوان کے ٹکڑے، مکتیوں اور عدسوں کے نام کے چندے عیٹے، اور نڈلے) کو بھی ترک کر سکے گا اور بادشاہ خانی کے فعل ایک پادری کی سی باعزت اور خوش حال زندگی گزار سکے گا۔ اسی لئے ہمارے مولوی مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے بلکہ ان کی خاطر نہ سہی کم سے کم اپنی ہی خاطر۔

"میں" کو تو "ہم" بنا

بات ختم کرنے سے پہلے مسلمانوں کو جو شکل درپیش ہے اس کا بھی اعتراف کر لینا چاہیے دراصل آج کے ہندوستان میں وہ اپنے آپ کو ADJUST (کھپا) ہی نہیں کیا رہا۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کو اپنے ہی میں نہ کبھی جمہوریت سے واسطہ پڑا اور نہ سیکولرزم سے وہ تو حاکم رہا یا محکوم۔ برابر کی سطح پر اس نے رہنا سیکھا ہی نہیں مسلمان نے اب تک جزئی زندگی گزار دی وہ عمومی زندگی تھی۔ اب اسے حاکم و محکوم کے رشتے سے ہٹ کر فطرت کے تقاضے کے مطابق دوسروں کے ساتھ EQUAL TERMS پر برابری کی صورت میں) پر عینی مساوی حیثیت سے رہنے کی کوشش کرنا چاہیے

تری قوم ہے تری آبرو، اسی آبرو کو تلامش کسو کبھی تو ہے۔ آپ بھی ہی چلے جائے گا چلے جائے گا تو نہ ہوتا مٹے دیو کعبہ کی کشمکش، یہی شیخ کعبہ کو کام کر کہ منہم کرے کے جاریں کو شریک، بزمِ حرم بنا

"میں نے کبھی حق بات کہنے میں
تامل نہیں کیا
میں سیاہ کو سفید کہنے سے
انکار کرتا ہوں
مولانا آزاد

اکبر الہ آبادی کی روح ناشاد دہلوی کی قالب پیش

مشہور رحمان تعریف "اردو شاعری کے ارتقا میں نمود شعراء کا حصہ" کے قابل مصنف و مؤلف

جناب پروفیسر بی۔ ایس۔ سی۔ واسٹوٹ الہ آباد یونیورسٹی کی رائے گرامی

دیوان ناشاد کی بہت سی نظمیں پڑھ کر محظوظ ہوا۔ ان کا کلام واقعی طنز و ظرافت کا پھلکتا ہوا جام ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کی روح کو جب اپنے تنگ عرصہ حیات میں اپنے محدود و مزاحیہ کلام سے تسکین نہ ہوئی تو شریعت اسلام کو بالائے طاق رکھ کر ہندو نظریہ کے مطابق دوبارہ حضرت این۔ بی۔ سین ناشاد کے قالب میں نمودار ہوئے اور کچھ ظرافت و تمسخر کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تخلیقات و جذبات کا اظہار دل کھول کر کرے یا نہ کرے اپنی شاعری کا نصب العین بنایا۔ اس مجموعہ میں غالباً کوئی نظم ایسی نہ ہو گی جو شعریات و جاذبیت سے معرا ہو۔ دل نہیں چاہتا کہ ایک بار ہاتھ میں کتاب لے کر اسے جلد چھوڑ دیں۔

دیوان ناشاد ہر اچھے کتب فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست پتہ ذیل سے طلب

فرمائیے

قیمت: دس روپے

نیوبک سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲ نئی دہلی

تری تقدیر مرے نالہ بے باک میں ہے

الحکیم خاں

یونانی فلاسفوں نے شعر و شاعری کو خیالی باتیں کہا ہے،
مگر جب یہ عمل و تعمیر کی تلعتیں کرنے پر آتی ہے
تو قوم کا دامن موتیوں سے بھر دیتی ہے!



نیک خواہشات

(اسٹینڈرڈ راج کپنی کلیان کے مالک اور انٹریسٹر ڈیکورمٹر)

شیخ اقبال حسین

کی جانب سے

درد و جزا و اسقام

کسی نے یہ بقرط سے جا کے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک میں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہونہ پیدا

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں

کہے جو طبیب اس کو ہزیاں سمجھیں

سبب یا علامت گراں کو سمجھائیں تو تشخیص میں سونکالیں خطائیں

دوا اور پرہیز سے جی چرائیں یونہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں

طبیعوں سے ہرگز نہ مانوس ہوں وہ

یہاں تک کہ جینے سے مایوس ہوں وہ

یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے بھنور میں جہاز آ کے جھلک گھرا ہے

کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے

نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی

پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

سکھائی انھیں نوع انساں پہ شفقت کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت

کہ ہمسایہ سے رکھتے ہیں وہ محبت شب و روز پہنچاتے ہیں ان کو راحت

کرد مہربانی تم اہل زمیں پر

خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

رَحْمَتُكَ كَاشِفَتِ الْبُؤْسَ إِلَى سُلُوكِ سَبِيلِ

ڈرا یا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اُس کے یاد
نشاں راہ منزل کا اک اک دکھایا

بنی نوع کا ان کو رہبر بنایا
زمانہ میں ہیں ایسی قومیں بہت سی نہیں جن میں تخصیص فرماں دہی کی
پرافت کہیں ایسی آئی نہ ہوگی کہ گھر گھر یاں چھا گئی آکے سستی
چکورا اور شہباز سب اوج پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں
وگر نہ ہماری رگوں میں لہو میں ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں طبیعت میں عادت میں فطرت میں نہیں

نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلمان
نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت نہ اپنوں سے الفت نہ غیور گلمت
مزا جوں ہیں سستی دماغوں میں نخوت خیالوں میں سستی کما لوں سے نفرت
عداوت ہناں دوستی آشکارا

غرض کی تواضع غرض کی مدارا
نہ اہل حکومت کے ہماز ہیں ہم نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

سیاحت کی گلیاں نہ مردِ سفر میں خدا کی خدائی سے ہم بے خبر ہیں
یہ دیواریں گھر کی جو پیش نظر ہیں یہی اپنے نزدیک حدِ بشر ہیں

نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے

نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارہ کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا مجھے ان سے کرنا پڑے گا کسارا

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

مشقت کی ذلت جھفوں نے اٹھائی جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
حکومت ملی ان کو صغار تھے جو وہ قطبِ زمان ٹھہرے عطار تھے جو

جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں

کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پہناں

بس ابِ وقت کا حکم ناطق ہی ہے کہ جو کچھ ہے دنیا میں تسلیم ہی ہے
دلوں سے مٹاتی ہے نقشِ عداوت جہاں سے اٹھاتی ہے رسمِ بناوت

مقید بھی کرتی ہے اور یہ رہا بھی

بناتی ہے آزاد بھی یا دلت بھی

ترقی کے یوناں کے اسباب کیا تھے ہنر پر جہاں پر دبرِ نافدا تھے
نہن کے میداں میں زور آتا تھے وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے

اس امید پر کوششیں تھیں پیاری

کہ ہو قوم کے دل میں عظمت ہماری

جھینس ملک میں اپنی کھنی ہو وقعت جھینس سلطنت کی ہو مطلوب قربت

جھینس تھامنی ہو گھرانے کی عزت جھینس دین کی ہو نہ منظور ذلت

جھینس نسل و اولاد ہو اپنی پیاری

انھیں فرض ہے قوم کی غم گساری

الطاف حسین حالی

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے سلا نو! کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پچانو
 وہ ناصح اور ہونگے جن کا کناٹن بھی جاتا اگر میری نہ مانو گے تو کھپتا دے گئے نادانو
 مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو! خبر تم کو بھی ہے کچھ لے مری چالوں کی بیگانو
 گئے وہ دن کہ ثروت باپ داد چھوڑ جاتے بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ لے کر آسانو
 گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل مری جانو!

نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ

پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

گیا دورہ حکومت کا بل ب حکمت کی باری جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
 جنہیں دنیا میں رہنا ہے بے معلوم یہ ان کو کہ میں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خوار
 ضرورت علم و دانش کی ہر فن اور صنعت میں نہ چل سکتی ہے اب بے علم تجارتی نہ معاری
 جہاں علم و تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری
 نہ آئے گی پسندان نوکروں کی خدمت و طاعت جنہیں پائیں گے آقا زبور تعلیم سے عاری
 کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز نہ فساد دی نہ جراحی نہ کحالی نہ عطاری

جہاں تک دیکھے تعلیم کی فرما روالی ہے

جو بچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انساں کا اک زیور ہوئی ہے زندگی اب منحصر خود علم و دانش پر
 کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا نہ زر گر اور نہ آہن گر نہ بازی گر نہ سوداگر
 ہندس چاہئے مزدور اب اور راج اقلیدس بس اب دنیا میں بے طلوں کا ہے اللہ ہی یاد
 گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے برابر تھا بے کا گھونسلہ اور آدمی کا گھر
 یہ دور ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا جو آج اک کام ہے اعلیٰ توکل ہے اس سے اعلیٰ تر
 نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
 کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دوں گا



جھٹ پٹے کا وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
 ایک بڑھیا نے سیر راہ لا کے روشن کر دیا
 تاکہ رہ گیر اور پرہیزی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
 راہ سے آسان گزر جائے ہر ایک چھوٹا بڑا
 یہ دیا بہتر ہے اُن جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
 روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

عَلَامَةُ اِقْبَال

سالی نامہ

ذرا دیکھ اے ساتی لا لافام ساتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز کہ آتی نہیں فصل گل روز روز
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل وہ مے جس سے کہتا ہے راز ازل
اٹھا سا قیا پردہ اس راز سے

لڑا دے مولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
گراں خواب چینی سنہلنے لگے ہمارے چشمے اُبلنے لگے
مسماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابی تاب ہے زباں پرش
حقیقت خسرا فات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب مگر لذت شوق سے بے نصیب
بیاں اسکا منطق سے سلجھا ہوا لغت کے بکھڑوں میں ابھا ہوا

بھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا مری خاک جگنو بن کر اڑا
خسرہ کی غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر

جگر سے وہی تیرہ پھر پار کر تمنا کو یلوں میں بیدار کر
 ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
 جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق میسری نظر بخش دے
 مری ناؤ گر داب سے پار کر یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
 مرے دیدہ ترکی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
 سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی

فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
 سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
 زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
 بڑھے جایہ کوہِ گراں توڑ کر
 طلسمِ زمانِ دمکاں توڑ کر

•
 ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
 خودی تیری مسماں کیوں نہیں ہے
 عجب ہے شکوہِ تقدیرِ یزداں
 تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
 اقبلہ

گھس گھس نہائی مسلمان سیر

آبرالہ آبادی



آبرالہ آبادی ہمیشہ مغربی تہذیب کا مذاق اڑاتے رہے اور سرسید کو بھی خوب برا بھلا کہتے رہے مگر جب سرسید کی تحریک چل نکلی اور علی گڑھ کالج نے کافی ترقی کر لی تو وہ بھی سرسید کے طلوع سے متاثر ہوئے اور ان کے حامی بن گئے۔

سب جانتے ہیں علم سے ہو زندگی کی روح	بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناقص
تعلیم گر نہیں ہے زمانے کے حسب حال	پھر کیا امید دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا	ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خشت کا نام
صدے اٹھائے رنج سے گائیاں ہمیں	لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی	کالج ہوا دست بعد نشان و احتشام
مرزا یہ میں کمی تھی سہارا کوئی نہ تھا	سیہ کا دل تھا درپے تکمیل انتظام
آخر اٹھا سفر کو وہ مرز مجستہ پے	احباب چند ساتھ تھے ذی علم خوش کلام
قسمت کی رہبری سے ملی منزل مراد	فرمان روائے ملک دکن کو کیا سلام
حالت دکھائی اور ضرورت بیان کی	خوبی سے التماس کیا قوم کا پیام
رحم آگیا حضور کو حالت یہ قوم کی	پھر کیا تھا موجزن ہوا دریائے فیضی عام

آخر سرسید نے آبرکتے متاثر ہوئے کہ سرسید جیسے نبوی کے ہاتھوں سے اپنے آخری وقت میں مسلمان ہو گئے۔

اب کہاں تک کہے میں صرف یاں کچھ	تا کجا عشق بیتاں میں سست پیاں کچھ
ہے یہی ہر علی گڑھ جگہ کے سید سے کہوں	ٹھہرے چندہ لیجئے مجھ کو مسلمان کچھ

سرسید کا جب انتقال ہوا تو اکبر نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا ۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کمنے والے کرنے والے میں
کے جو چاہے کوئی میں تو یہ کتا ہوں لے اکر
خدا بچتے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں



مسلمانوں بتاؤ تو تمہیں اپنی خبر کچھ ہے تمہارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے

اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اسکا اثر کچھ ہے حریفوں کی تسلی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے

تمہیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر

کہ ہر آنکھ ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنس سیکھو

بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو خواہیں خشک و تر سیکھو، علوم بھر دے سیکھو

خدا کے واسطے اے نوجوانوں ہوش میں آؤ

دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جو شش میں آؤ



دورِ حیات آئے گا قاتلِ قضا کے بعد بے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
 جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیسری آرزو باقی ہے موت ہی دلِ بے دعا کے بعد
 تجھ سے مقابلے کی کستہ تاب ہے فوٹے میرا لہو بھی خوب ہے تیری جتنا کے بعد
 اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجسل ہل مین مزید کہتی ہے رحمتِ عا کے بعد
 لذتِ ہنوز ماندِ عشق میں نہیں آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد
 قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اسلامِ زندہ ہوتا ہے ہر کر بلا کے بعد
 غیروں پہ لطف ہم سے الگ حیف ہے اگر یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد
 ممکن ہے ناہِ جبر سے رک بھی سکے مگر ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
 ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

ستم اور جور کی جس وقت ہوتی ہے فراوانی دلوں سے محو ہو جاتی ہے جب تہذیب انسانی
 غنا کا نشہ ہو جاتا ہے جب سرمایہ داروں کو ٹھکانہ جب نہیں ملتا کہیں قسمت کے ماروں کو
 کسی گوشہ میں جب تکین و آسائش نہیں ملتی غریبوں کو زمیں پر کوئی گنجائش نہیں ملتی
 تو فطرت قوم میں کرتی ہے صفا شکن پیدا دلِ حق میں ہوتی ہے شجاعت کی کرن پیدا
 غریبوں بے نواؤں بکیوں کا راہبر ہو کر نکلتا ہے مجاہد خلق میں سینہ سپر ہو کر

مجاہد قوتِ باطل کے آگے خسم نہیں ہوتا

چلی جائے بلائے جان اس کو غم نہیں ہوتا

صدائے خاتون

بوجہ ایمان محمد علی کی
 جان بیٹا خلافت پر دے دو
 ساتھ بیٹے کے شہادت علی بھی
 جان بیٹا خلافت پر دے دو
 بڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
 کلمہ پڑھ کر خلافت میں اترنا
 پورے اس امتیاز پر دے دو
 جان بیٹا خلافت پر دے دو
 ہوتے میرے اگر سات بیٹے
 کرتی سب کو خلافت پر مدد
 ہیں بی بی دین احمد کے رستے
 جان بیٹا خلافت پر دے دو
 حشر میں حشر بپا کروں گی
 پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
 اس حکومت پر دعویٰ کروں گی
 جان بیٹا خلافت پر دے دو



حکیم دامتہ تعالیٰ اسد ان شہر

جوش ملیح آبادی

پیرانِ سِالِ الوُس

قبروں پہ مریدوں کو بھکاتے رہیے ڈھولک پہ سفیہوں کو بچاتے رہیے
اشراگر روٹھ رہا ہے روٹھے کیا اس سے غرض عرس مناتے رہیے

پر ہول شکم، عریض سینے والو خوں، قوم تہی دست کا پینے والو
تم اہل خرد سے کیوں نہ رکھو گے عناد خیرات پہ احمقوں کی جینے والو

اے شیخ کبھی تو رنج اٹھایا ہوتا اس دل پہ کبھی زخم تو کھایا ہوتا
اس طرح لگاتا نہ دادم ضر میں بابا! دل اگر کہیں لگایا، ہوتا

ہم دیکھ کے ہوشوں کو کیا کہتے ہیں اتنا ہی کہ بس صلّ علی کہتے ہیں
لیکن یہ غلام زربہ ایندیش دراز موقع ہو تو ہر بت کو خدا کہتے ہیں

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے انساں کو بہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گناہ جو احمق بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

پاکستانی عوام سے خطاب

لاکھ چاہا تھا کہ ایسے میں بھی خاموش رہوں بے نیاز اثر چشم و لب و گوش رہوں
عادی درگزر و زود فساد خاموش رہوں وقفِ مینا صفتِ بادِ سر جو ش رہوں
لیکن افسوس کہ اب ضبط کا یارا نہ رہا
صاف گول کے سوا کوئی بھی چارا نہ رہا

سب سے پہلے مجھے کہنا ہے کہ اے پاکستان تیری دم رتی نے مجھے جہنم دیا میں قسربان
میں یہی خواہ ترا ہوں مجھے بد خواہ نہ جان میں اگر تیرا بڑا مانگوں تو کٹ جلے زبان
مجھ میں، میں نغمہ سرا تھا، تو بچن تھا میرا
کس طرح تجھ کو بھلا دوں، تو وطن تھا میرا

مجھ کو پیارے ہیں دل جہاں سے سوا تیرے عوام اُن کی ہمت میں شجاعت میں نہیں کوئی کلام
وہ پھلیں پھولیں ہنسیں کہلیں رہیں شاد و دام اُن کی خدمت میں بصدِ عجز سلام اور پیغام
ہر گلی کو چمے میں، ہر پیر و جواں تک پہنچے
"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

اُن سے کچھ بغض نہ کینہ، نہ کدورت ہے مجھے اُن سے کچھ رنج نہ دشت ہے نہ نفرت ہے مجھے
اُن سے سچ کہتا ہوں میں اب بھی محبت ہے مجھے باں! مگر اُن کی حکومت سے شکایت ہے مجھے
اُن کو کہئے، نہ کدورت، ہی نے برباد کیا
اُن کو خود اپنی حکومت ہی نے برباد کیا

وہ حکومت کہ جو خود میں رہے مغرور رہے وہ حکومت، جو حقانیت سے بہت دور رہے
وہ حکومت، کہ جو نادانِ واجب و دستور رہے وہ حکومت کہ جو بیگانہ جمہور رہے
وہ حکومت نہیں ہوتی ہے یہی خواہ عوام
جس کا منشا ہو کہ سب بن کے رہیں اُسکے غلام

نفع ذاتی کے طلبگار تھے یحییٰ کہ ایوب عیش و عشرت کے پرستار تھے یحییٰ کہ ایوب
امن سے بربر پیکار تھے یحییٰ کہ ایوب جین کے حاشیہ بردار تھے یحییٰ کہ ایوب
سبز باغ اُس نے ہر اک باد رکھ یا ان کو
جین نے اپنے اشاروں پہ نچایا ان کو

اب ذرا غور سے سن لو کہ یہ کیا ملک ہے چین اسکا مولا ہے نہ معبود ہے نہ مذہب ہے نہ دین
اس میں تقویٰ نہ عبادت نہ عقیدت نہ یقین اس میں ہے ذکرِ خدا جیسے کہ ہو بھینس کو بین

چلن کو تم نے رہ دیں کا مسافر بھیا

اہل بھارت کو مگر ملحد کا سر بھیا

ہم کسی دین سے ہوں صاحبِ کردار تو ہیں ہم شناخوانِ شہِ حیدرِ کرار تو ہیں
نام لیوا ہیں محمدؐ کے پرستار تو ہیں یعنی مجبور ہیں احمد مختار تو ہیں

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں

صرف مسلم کا محمدؐ یہ اجارہ تو نہیں

میری نظروں میں تو اسلام محبت کا ہے نام امن کا آشتی کا ہر و مروت کا ہے نام
وسعتِ طلبِ اخلاص و اخوت کا ہے نام تختہ دار پہ بھی حق و صداقت کا ہے نام

میرا اسلام بیکو نام ہے بد نام نہیں

بات اتنی ہے کہ کبھی کا وہ اسلام نہیں

سُن لے کبھی کہ مجھے تجھ سے بھی کزنہ ہے خطاب راہِ شمشیر و سناں سے نہ گیا پایہ رکاب
منزلِ اول و آخر تری طاؤس و ریاب لیکن ہشیار کہ نزدیک ہے اب روزِ حساب

روز و شب سا غو دینا سے تجھے کام ہا

تیرے ہاتھوں میں تو قرآن کی جگہ جام رہا

بانگِ دلش میں کیا روپ دکھایا صد حیف بنتِ حوا کے تقدس کو مٹایا صد حیف
اس کی عصمت کو سیرا دلایا صد حیف قتل لاکھوں کو کھلے عام کرایا صد حیف

”بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے تم نے“

ماؤں کی گود میں بچے بھی نہ پھولے تم نے

لوٹا شہِ خون، زنا، جبرِ تشدد، اُفتاد قتل، غارتگری، آتش زنی، ہڑ بونگِ فساد
غیرت، انقبض، ضرر، رنجِ تعصب بیدا اور ستم یہ ہے کہ ان سب کو دیا نام جہاد

لفظ جو پاک تھا، ناپاک بنا یا تم نے

اُس کی تقدیس کو مٹی میں ملا یا تم نے

نہ مساجد ہی کو بخشنا نہ مسنم خانوں کو قتل چن چن کے کیا دلش کے فرزانوں کو
جہانے کیا حکم دیا فوج کے بلوانوں کو قتل کرتے تھے مسلمان مسلمانوں کو

اور اس پر ہے یہ دعویٰ کہ مسلمان ہو تم

شکلِ انسان کی یہی، اہل میں حیوان ہو تم

ہو مسلمان تو روایات کُن یاد کرو کچھ
خدا متِ خلق کی وہ اُن کی لگن یاد کرو
خیر سے احمد مرسل کا چلن یاد کرو
منزلِ کرب و بلا، دار و رسن یاد کرو

بیکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

صاحبِ عزم و عمل، مردِ عجب ہر وہ عجیب
ذکوئی اُس کا مقابلہ کوئی اس کا رقیب
سخت مشکل ہے بے مردِ مصلحاں ہونا
صبح صادق کا موذن وہ بہاروں کا نقیب
یہ سچ ہیں اُس کی نظریں وہ ہوں مند کہ صلیب

اس کا پسِ دانشی حق ہے کہ وہ آزاد ہے

اک نئے دیش کا خالق ہے نہیں یاد ہے

تم نے چاہا تھا کہ وہ نیند سے بیدار نہ ہو
تم نے چاہا تھا کہ وہ مالک و مختار نہ ہو
تم نے چاہا تھا کہ وہ حق کا طلب گار نہ ہو
تم نے چاہا تھا کہ وہ برسرِ پیکار نہ ہو

سر، کہ ایثار ہو جس میں وہ کہاں بھکتا ہے

چند تنکوں سے کس سیلِ رواں رکتا ہے

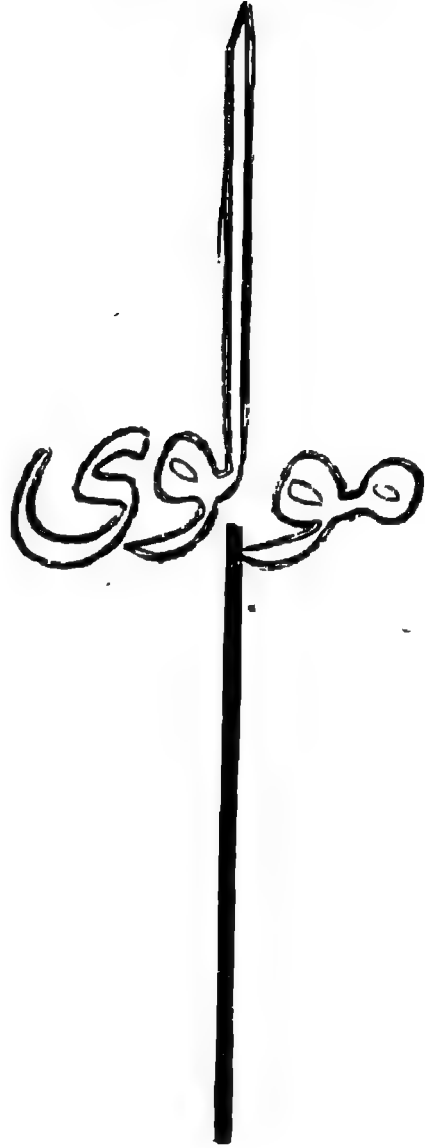
پھر میں اب تجھ سے مخاطب ہوں اے پاکستان
میں ہی خواہ ترا ہوں تجھے بدخواہ نہ جان
تری دھرتی نے مجھے جنم دیا میں قسربان
دوست دشمن میں، دعا ہے کہ تجھے ہو پہچان

اس لئے تم سے یہ کہتا ہوں کہ ہمسائے ہو

اور ہمسائے بھی ایسے ہو کہ ماں جلتے ہو

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی • اپنی اپنی روش پہ نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

— اکتبر الہ آبادی —



سر پہ مذہب کے اصولوں کی پچک باندھے ہوئے
 ایک مولانا ملے تحت اسٹک باندھے ہوئے
 کاسٹہ ابھام پر تفسیر شک باندھے ہوئے
 فرق انسانی کو ہے اب تک شک باندھے ہوئے
 بیچ ہیں ایسے مڈ در آپ کی دستار کے
 بیٹھتا ہے جیسے کالا ساپ کنڈل مار کے
 گھومتی ہے ہاتھ میں تسبیح اور ملتے ہیں لب
 چلتے پھرتے، بیٹھتے اٹھتے، مسلسل روز و شب
 قورمہ، حلوا، غرض ہر حال میں ہے شکوہ رب
 ہے خدا اُن کا مسبب وہ خدا کے ہیں سبب
 .. فاتحہ کی دعوتوں میں باوجود رہتے ہیں وہ
 ہانگ سن کر مرغ کی لا تقنطو کہتے ہیں وہ
 اس قدر پاکیزہ جُبہ، دے کفن کو بھی جو مات
 چھوڑ کر داغ جبین اُجلی ہیں انکی سب صفات
 نیک نظریں، نیک ہے داڑھی کی جنبش نیک ذات
 پاؤں گے مشغول تقویٰ روزِ روشن ہو کہ رات
 روح کی طاقت بڑھائیں شغلِ مالِ اقل سے
 پائیں دسترخوان کی خوشبو کو روڑوں سے

میں رنگ اور صحرائی گپڈنڈیوں سے نکل کر جو اس روشنیوں
کی نگری میں پہنچا تو دیکھا کہ میرے قوائے بدن اس قدر محل ہو چکے ہیں
کہ میں اپنے گھٹنوں کے بل بھی سر کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

میرے سامنے میرے بچے ہواؤں کی پوشاک پہنے ہوئے
اس طرح بے نیازانہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں میں بے
کبھی راہ پیا نہیں تھا۔!

میں اپنے زمانے کی بولی میں کہتا ہوں: اے میرے بچو!
مرے پاس آؤ، اور اک بار تم میری انگلی پکڑ کر مجھے
پھر سے دھرتی پہ چلنا سکھاؤ۔!

اشعار
سفر
میں

کر بلاے جو کچھ پہنچا ہے وہ پیغام دے
یعنی عزمِ کار ہائے دیں کو استحکام دے
کلمہ طیب کے منشا اور معنی کو سمجھ
پھر اخوت کا زمانے بھر کو ازلی عام ہے

بن آتالیق جہاں دریں رفاہ عام دے
فرضِ انسانی ہے یہ پہلے اسے انجام دے
آہ نالوں سے نہ یوں ماتمکدے تعمیر کر
کام وہ دنیا میں کر جو حشر کے دن کام دے



مشورہ ایسا نہ کوئی تجھ کو عقلِ خام دے
تو خودی کے زعم میں اغیار کو دشنام دے
ورنہ یہ دنیا ہے اسے ثاقب کیلِ یسا نہ ہو
پاک ناموں کو ترے کوئی برسا نام دے

محبت کے دنوں میں دنیا رشکِ فردوس بن جاتی ہے
مگر حالتِ فراق میں دوزخ اپنا آتش نشاں منہ کھول دیتا ہے

وہابی ایجنے

اور وہ مجنوںے — اور پھر
دونوں کا عشق بوئے گل کی طرح رسوائے زمانہ ہو گیا

حُسنِ و عشق کے روح افزاد استات

سہیلی محبوں

ایسٹ مسین پبلشر

الف بہار کنول رشتی کمپور ————— مجلس مجبور رنجیتا

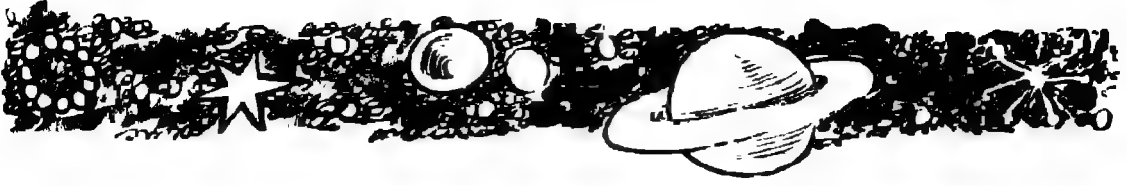
دینی ☆ رنجیت ☆ افتخار ☆ اجلا سچیدو ☆ اسرانی ☆ پنٹال ☆

گیت ☆ ساحر لہیا نوی سنجیت ☆ مدن موہن

ہدایت کار

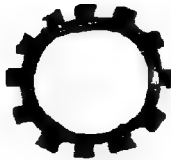
ایچ ایس رویل

فلم ساز: ڈی کے کسے انٹرنیشنل



سندھ

تہذیب و تمدن کا معمار انسان ہے
بازار و محل اور لباس نہیں



”پہچان اور بے ایمان“

جیسی ناقابل فہم آموزش، جیسے انگلیسز
مسلموں کو بلے فلموں کے خالق

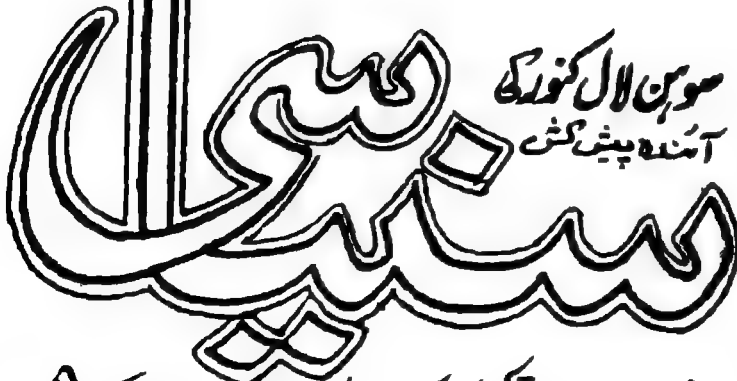
سوہن لال کنور

کئی جانب سے

قارئین ہندوستانی مسلمان نمبر کو

غالب کا پیغام

ہم کو حدیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
لتیں جب مٹ گئیں اجڑے ایاں ہو گئیں



سوہن لال کنور کا

آئندہ پیشکش

جو تیسری سے تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہے

جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ

بنگال کے آخری نواب مرزا محمد سراج الدولہ نے اپنے مختصر دور حکومت میں برٹش حکومت کو جیسے اکھاڑ دینے کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ انگریزوں کی نکلنے میں قلعہ بند کیا کرنے پر سراج الدولہ نے نکلنے پر حاکم الدولہ محمد علی محمد سراج الدولہ کو فورٹ ولیم فتح کر دیا۔ لیکن صرت سات ہی مہینے بعد کلائیون نے شہر فتح کر دیا۔ اور سراج الدولہ کو علی گڑھ کا علاقہ برٹش گورنمنٹ کے حوالے کرنا پڑ گیا۔

انگریزوں نے سراج الدولہ کی جگہ ایک انگریز پند شخص کو نائب بنا دیا۔ اور اس کے لئے ان کی نظر نواب کے بیرونیاد جزل سپہ جعفر پر پڑی۔ جب ۳۰ جون ۱۷۵۶ء کو کپاسی کے میدان جنگ میں کلائیون اور سراج الدولہ کی فوجوں کا آمناسا ہوا، کو قلعہ میر جعفر راہ رائے زیر لہنے نواب کے ساتھ دھوکے بازی کی۔ جب کو میر علی اور موہن لال کی قیادت میں مٹھی بھر مسلم فوج نے انگریزوں کا جی دلی سے مقابلہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز فوج کی پوزیشن کمزور پڑ گئی اور کلائیون کو جنگ گریو کے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بے محقر پر لڑنے والے کو میر جعفر نے فوج کو پیچھے ہٹانے کا مشورہ دیا۔ جب کہ موہن لال کی فوج کام باہی دھام رانی سے قریب تھا۔ اسے یہ حکم ملا اور اسے اس کی خواہش درمیان کے خلاف پیچھے ہٹنا پڑ گیا۔ اس طرح برطانوی فوج کو کام باہی لگ گئی۔

شاہر میسور :- میسور کا ٹیپو سلطان جو انگریز حکومت کا سخت دشمن تھا، ۱۷۵۹ء کو انگریزوں کے خلاف لڑا تھا

ملا گیا۔ جب ٹیپو کی مریت کی خبر برطانوی کمانڈر جنرل ہارڈنس کوئی تو وہ خلی سے چلا اٹھا کہ اب ہندوستان ہمارا ہے۔ میسور کی تیسری اور چوتھی جنگ ٹیپو ہی نے لڑی تھی۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو ہندوستان سے ہارنے کے لئے فرانسسین اور دوسری قوموں سے خط و کتابت بھی کی تھی۔ اس نے کابن۔ قسطنطنیہ، درسل اور مکسیٹیمک اپنے ایلچی بھیجے۔ لادو دلی کو ٹیپو کے اس پلان کا علم ہو گیا اور اس نے آخری حملہ کی تہیاری شروع کر دی۔ یکم ستمبر ۱۷۵۹ء کو نظام احمد آباد نے انگریزوں کے ساتھ میل کر لیا۔ اور مرہٹوں نے فتح ہونے کی صورت میں اپنا حصہ بھی مقرر کر لیا۔ ٹیپو کا فوج میں کئی میر جعفر تھے پھر بھی اس کی فوج نے کالی بہادری سے دواہنگ انگریز فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن ۳۰ جون ۱۷۵۹ء میں ٹیپو ملا گیا۔ جس کے بعد اس کی باد سلطنت برہمچاٹم کو انگریز فوج نے اپنے جوتوں سے روند ڈالا۔ اور ایک تیل عام برہمچاٹم کو لٹا۔ میسور کی شکست اور ٹیپو کا شہادت سے انگریزوں کا ماہ کا ایک بہت بڑا مدد پڑ گیا۔

آخری مغل شاہنشاہ بہادر شاہ ظفر ایک کمزور و ضعیف شخص ۱۷۵۹ء کا جنگ آزادی کا ایک نشان تھا۔ اس پہلی جنگ نادری میں ہزاروں ہندو اور مسلمانوں کی قیادت ظفر اور ادوہ کی حکمران سلیم حضرت محل نے کی تھی!

بھارت کبھی دی گئی، دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، فیصلہ مارشل لاڈل رابرٹ نے اپنی کتب "ہندوستان میں اکٹالیس سال" میں یہ دل دوز بیان درج کیا ہے کہ تیس ہزار باغی مسلمانوں کو بھانسی

دی گئی۔ اور نکل عام میں مارے گئے لوگوں کا کوئی حساب کوئی نمائندہ نہیں!
 صبحی یا غلط، برطانوی حکومت نے اسے ایک ایسی ہی بددعا
 قرار دے دیا تھا۔ ہنری میڈ نے لکھا: موجودہ صورت میں اسے
 سپاہیوں کا جلوہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگرچہ یہ سپاہیوں کی بدولت سے شرمناک
 ہوئی۔ لیکن جلد ہی اس کا فطرت ظاہر ہوگا۔ وہ اصل یہ ایک سلاخی ہڈ تھا!
 مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں، ناندرے، مزدوریوں اور تجارت
 سے نکال باہر کر دیا گیا۔ سرولیم ہنشر نے انڈین مسلمان میں لکھا ہے کہ
 ”کھلتے ہیں اب سنگلی سے کوئی مسلمان اب اپنے گھر جو حال سے
 یا ہسٹ بننے سے اپنی پوسٹ پر ہوا!“
 گورنر جنرل لارڈ ایلی بروڈی نے سومرہ کے مندر کا دورہ
 کھوتے وقت بغیر کسی ایجنے کے گھر کے آگے آکر ۵ سو سال بے
 عزتی کا بدلہ لے ہی لیا گیا۔ ایک دوسرے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹن
 نے نوپہ تجویز رکھی کہ تاج محل کو توڑ دیا جائے اور اس کے ٹکڑے کر
 بیچ ڈالا جائے!“

اسٹار میں صدی کے سربراہی مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب
 کی ”دہلی تحریک“ کو رائے بریلی یو۔ پی۔ کے سید احمد کی حمایت حاصل
 ہوئی اور پٹنہ دہلی تحریک کا ایک مرکز بن گیا۔ ۱۸۵۷ء میں
 بھی دہلیوں نے بامیوں کی کھل کر حمایت کی تھی۔ دہلیوں کی دوسری تحریک
 ۱۸۵۷ء میں ابھری اور پورے بنگال میں پھیل گئی۔ اس کا بنیادی
 مقصد انگریز سرکار کو کھانا نہ پینے کا تھا۔ یہ کل ہندو بیانیہ پر کام باقی
 سے سرکار کے خلاف لوگوں کو ابھار دی تھی۔ تمام بنگال، بہار اور
 پنجاب میں مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاری شروع ہوئی۔ بعد میں
 معلوم ہوا کہ اس میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے لوگ شامل تھے۔
 ۴ مئی ۱۸۵۷ء اور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے درمیان پانچ ہفتے ہوئے
 جس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو باجھائی دی گئی یا سزائے موت باعمر
 قید ہوئی۔

بہت سے مشہور علماء دین محمد بن مولانا احمد انڈر عظیم آبادی،
 مولوی عبدالرحیم صاحب، مولانا فضل حق خیر آبادی مفتی صاحب احمد
 ساکوردی اور مفتی منیر کریم دریا آبادی شامل تھے، کو برطانوی حکومت
 سے خلاف جذبات بھڑکانے کے جرم میں انڈمان جہاز میں عر قید کی

سزا کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ اکثر وہیں پر انتقال کر گئے۔

ان مقدمات کے دوران برٹش حکومت کے خلاف مسلمانوں کی

نفرت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی جس کا ثبوت اس وقت لکھا ہے کہ
 بنگال کے تمام مقام جیف سٹیشن جان پکیٹن نورہاں کو ایک مسلمان نے
 اچھڑا کر ہلاک کر دیا اور مارٹن کو خیر علی نامی، علم نوبان نے
 انڈمان کے جزیرے میں ۸ فروری ۱۸۷۷ء کو حکومت کے گھاٹ
 آ کر دیا۔

سن ۱۸۵۷ء میں بنگال کے کانگریس سٹیشن میں رحمت اللہ دیم
 بیانی اور ایم نے دھرم کی بھی شامل تھے۔ لندن ٹائمز کے اس بیان نے کہ
 ایک بھی مسلمان نے شرکت نہیں کی تھی۔ درود گولی کی انتہا کر دی تھی
 ۱۸۵۸ء کے حالات کے سٹیشن میں مدراس، بمبئی، شمالی سرحدی
 صوبہ، اور دہلی اور بنگال سے مسلم دود نے شرکت کی تھی۔
 ۱۸۵۷ء کے مدراس میں منعقد کانگریس سٹیشن کے صدر
 تھے بدرالدین طیب جی، اور اس میں ۸ مسلم دود کے علاوہ
 مختلف جماعتوں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس سٹیشن میں
 میرجاہوں جاہ نے کانگریس کو ۵۵۵ روپے عطیہ دیا۔ ان آباد کے
 سٹیشن میں ۲۲ اور ۱۵۵۹ کے سٹیشن کے سٹیشن میں ۵۵۹ مسلم
 دود نے شرکت کی تھی۔ ۱۸۵۶ء کے کانگریس سٹیشن کی صدارت
 رحمت اللہ بیانی نے کی تھی۔ پچھتر سٹیشن میں مسلمانوں کے ۵۵۳
 سے زیادہ دود نے شرکت کی تھی۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو ترضیب دی تھی کہ وہ اس توہمی
 تحریک سے خدا کو علاحدہ کر لیں اور گورنر منٹ کی ناراضگی کو ختم
 کر لیں۔ ان کی دانست میں اس وقت ان کے لئے وہی ایک راستہ تھا۔
 علماء کی رہنمائی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد نے کانگریس کی
 پوری پوری حمایت کی تھی ۱۸۵۷ء مولانا رشید احمد گنگوہی
 علی گڑھ کے لطف اللہ اور مغربی ایشیاء کے کئی مشہور علماء نے
 مسلمانوں کے لئے یہ فتوا دیا کہ انھیں کانگریس میں شامل ہونا چاہیے۔

اسے مولانا محمد لدھیانوی نے چھپوایا اور شائع کیا
 ۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو بنگال کی تقسیم کی گئی اور لارڈ
 کرزن نے ظفر کوٹلی ریاست کا لفٹنٹ جنرل بنایا سن ۱۸۵۷ء

کے کانگریس سیشن میں نواب زادہ خاجہ مفتی اصفیٰ نے اس بات پر خاص طور پر مسترد دیتے ہوئے کہا کہ ”یہ بالکل غلط بات ہے کہ شرقی نبال نے مسلمان تقسیم بنگال کے حامی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چند ہی مسلمان ایسے ہیں اور وہ بھی صرف اپنے مفصلہ کے لئے اس کی حمایت کرتے ہیں۔“ مشہور جیوگرافی اور موسخ ایمر علی نے مرکز کائنات میں مسلمانوں کی حیثیت کے بارے میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ بنگال کو جسٹس کے ماتھے کے نیچے کا کوئی بھی حصہ بنگال سے الگ نہ کیا جائے !

پھر رے بنگال میں صوفی مظاہر کیا گیا۔ سر سیدزادہ تھانوی اور عبداللہ رسول کی صدارت میں کئی جلسے منعقد ہوئے۔

۱۸۷۳ء میں ۱۲ نومبر کو نواب وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کا مآل غایت میں انڈین مسلمان ایمری ایشین کی جنب و جلیت کے ایک جلسے میں ڈلی گئی۔ جلسے کی صدارت مولوی غلام احمد خان نے کی تھی۔ ۱۸۷۳ء میں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں صدر کی حیثیت سے نواب سید محمد انور کیا گیا۔ اور محمد علی جناح نائب صدر میں سے ایک تھے۔

سن ۱۸۷۴ء میں جنگ بلقان نے عام مسلمانوں میں یورپی ممالک اور خاص طور پر برطانوی حکومت کے خلاف غصے کا ایک لہر دوڑا دی تھی۔ اس جنگ سے ترکی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

۱۸۷۴ء میں ترکی کا جرمی سے اتحاد کرنا تھا کہ روس، فرانس اور برطانیہ نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جو ہر حال میں روکے مضبوطی ”ترکی کی ہمدردی نے عام مسلمانوں کو حکومت کے خلاف کھڑا کر دیا“ مسلمانوں نے چندے جمع کئے اور ان کے کچھ لیڈروں نے قسطنطنیہ جاکر ترکی قوم پرست لیڈروں سے ملاقات کی۔ مولانا محمد علی نے ترکوں کی حمایت میں کلکتے سے ایک انگریزی روزنامہ کا مریڈ نکالا۔ مولانا ابدلکلام آزاد نے پہلے اہل لال اور پھر ابلانغ کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا ظفر علی خان نے لاہور سے زمین دار کا اجراء کیا۔ ان مخالف برطانوی اخبارات کو عوامی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ نتیجے میں بہت جلد ہی کارٹون ”اہل لال“، ”اہل لال“ برسرکاری قانون کا نذر گرہ۔

سن ۱۸۷۵ء میں فتح احمد مولانا محمد حسن دہلوی نے

اپنے ہونہار شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی جو پہلے کچھ تھے نو دوسروں کے ساتھ قابل روانہ کیا تھا تاکہ وہ راجہ مہندر پرتاب کی نظمی پارٹی اور جمعی، ترکی اور افغانستان کی حکومتوں کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چین، برما، جاپان، فرانس اور امریکا بھی زور دیا۔ برقیہ برکت اللہ کے ہم راہ باپچ آدمیوں کا ایک وفد جاپان گیا۔ مولانا عبید اللہ الرحمن چین اور برما گئے۔ چودھری رحمت علی فرانس گئے۔ مولانا محمود الحسن کو جہاز کے انگریز پرنسپل حکمران نے مدینہ میں گرفتار کر کے برطانوی حکومت کے معاملے کرنا۔ مولانا کو ان کے دوسرے ساتھیوں شمس مولانا حسین احمد دہلوی، مولانا علی یزید علی، حکیم نصرت حسین اور مولوی احمد احمد کے ہم راہ ۱۲ نومبر کو میں دہلی میں جمعہ عید کا قیام کیا ہوا۔ دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد قاسم نانوتوی کی نگرانی میں قوم پرست مسلمانوں کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ جہاں سے انقلابیوں کی ہمیشہ نوبت انصاری کی جاتی رہی !

۱۸۷۵ء میں منعقدہ خلافت کانفرنس کے صدر تھے مہاتما گاندھی۔ خلافت تحریک کا مقصد تھا، ترکی کی حمایت کرنا اور ہندوستان کو آزاد کرنا اس تحریک کے خاص ممبر تھے مولانا محمد علی، مولانا نوک علی ڈاکٹر محنت راجہ انصاری، ڈاکٹر سیف الدین کھلو اور مولانا سرت مولوی۔

۱۸۷۵ء میں منعقدہ خلافت کانفرنس نے مہاتما گاندھی کی عدم تعاون تحریک کی پوری طرح حمایت کی۔ اسی سال میں علی برادران نے پورے ملک کا دورہ کیا مہاتما گاندھی کی جے ”محمد علی نوک علی“ کی جے ”ہندو مسلمان کی جے“ کے نعروں سے ملک کا نفاذ گرجا اٹھی اس قسم کا منظر اس سے قبل اس ملک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

۱۸۷۵ء کے کانگریس سیشن کی صدارت کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے ملک کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ رکھا۔

تحریک خلافت کے دوران جیتے اعلیٰ ہند ایک منظم و موثر قوت کا شکلی میں ابھری۔ اس کی بنیاد فرنگی محل کے مولانا عبدل باری مسیحی کتاب اللہ مولانا آزاد اور مولانا حبیب الرحمن دہلوی نے ڈالی تھی۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی سیاسی و سماجی معاملات میں رہنمائی کرنا

اور تمام مسلمان مذہبی لیڈر مل کر ایک مشترک پلیٹ فارم پر فکرمک کے لئے ملائے گئے۔ مولانا مین احمد علی کی قیادت میں اس جماعت نے کانگریس کی مخالفت پر جماعت کی نئی یہ جماعت کانگریس کے ہر وزیرام سے پوری طرح متفق تھی۔

۱۹۵۵ء میں ناگ پور میں منعقد کانگریس میں جب کانگریس نے تحریک یکہ مردم خاں ہٹن کی، جو جمعیتہ احمدیہ نے ایک خواہشات کی، جس میں مسلمانوں سے نہم انگشتوں، کاجوں اور عدالتوں کا باقی کاٹ کر اس کی اپیل کی گئی تھی۔ اور غیر ملکی حکومت کے غداروں کو عام خطا باٹ فرازیت کو دہاں کرینے کے لئے کہا گیا۔ اس نئے پر ۵۵ء میں طار نے دستخط کئے تھے جس میں ان کے دے طار تھے جو اسلامی قوانین و اصول پر مبنی است رہے رکھتے تھے ۵۵ء میں طار نے کانگریس نے یہ تجویز پاس کی مذہبی دے سے منعقد حالت میں برطانوی فوج میں نوکری جاری رکھنا، فوج میں بھرتی ہونا، یا کسی کو فوج میں بھرتی ہونے کے لئے اکساف، بلکل غلط ہے۔ مسلم جوام کو طعون اور طار کو خصوصاً فوج سے کہ اس مذہبی حکم کو ملک کے ہر مسلم گھر میں پہنچا دیں۔

۱۹۵۵ء میں مولانا محمد رفیع، مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خواجہ عبدل حمید، اور مولانا آزاد نے جامعہ اسلامیہ کا بنیاد رکھنے کی نئی نئی مسلمانوں میں فوجی جنبہ کی تعلیم پیلے۔

۱۹۵۶ء میں ۱۷۷۷ء کے موجد مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت چھ پینے تک جاری رہی جس میں تقریباً ۳۵۰۰۰ موجد مارے گئے، ۵۰۰۰ موجد بچے گئے اور ۵۰۰۰ موجد کے قریب لگائے گئے گئے۔ ایک سو موجدوں کو الٹا ڈری کے ایک ڈھپے میں بھر دیا گیا۔ اور کال کٹ سے دھماکے جا یا گیا، دھماکے میں مسلم موجد اگر آدمے سے زیادہ لوگ دم گھٹنے کا دے گئے۔

بہ نسبت سے موجدوں کا ہندوؤں سے تعداد ہو گیا۔ اور موجدوں کی تعلیم کر دی۔ اور حکومت کے لئے بائیس کام باب رکھا ۱۹۵۱ء کے بعد ملک بھر میں فوج دارانہ فسادات پھوٹ پڑے، ہندوؤں نے تجدید مذہب کے لئے شدھی، اور سنگٹن کا رواج شروع کیا جبکہ مسلمانوں پر تبلیغ اور تسلیم نے غلبہ زور پڑا ۱۹۵۲ء میں مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس کا ایک خاص سیشن طلب کیا گیا اور اس مسئلے

پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں ہندو مسلم ٹکڑوں اپنے عروج پر پہنچ گئی، جب موت چھ ماہ کی مدت میں ۵۵ء سے فسادات برپا ہوئے!

۱۹۵۶ء کے کانگریس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی، اس سیشن میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا کہ مسلمان ہندوؤں پر بھروسہ کرتے ہیں اور ہندو مسلمانوں پر، لیکن وہ دونوں برطیش گورنمنٹ پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے سامعین سے دعا کی کہ وہ ہندوستان کے دستور کا سلسلے کو جانچنے والے جان سائی میں کے کمیشن کا باقی کاٹ کر یہ مسلم لوگ کے ایک گروپ نے محمد علی جناح کی قیادت میں کانگریس کی حمایت کی۔ اس سلسلے پر جناح اور سر محمد فیض کے دوران ایک اختلاف رونما ہو گیا تھا۔ بیک وقت لاہور اور کلکتہ میں با ترتیب سر محمد فیض اور سر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کے کانگریس منعقد ہوئے۔ کلکتہ کے کانگریس نے اتفاق رائے سے سامعین کمیشن کو ہندوستانی عوام کے لئے ناقابل قبول کر دیا، جب کہ لاہور سیشن نے مسلمانوں سے کمیشن سے تعاون کرنے کا اپیل کی کمیشن کے تین مسلم ممبران میں سے ڈو ناب سر ڈاکٹر انصاری خان اور سر عبد اللہ سہروردی نے لاہور لیگ کمیشن کی پر زور مخالفت کا اور علامہ الکاشی کرانے کا مطالبہ کیا۔

۱۹۵۵ء میں سرول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی ابس تحریک میں سب سے پہلے جمعیتہ العلماء ہندوستان ملی ہوئی اور بھرپور جواب کی احزاب پارٹی اشتیاعی، لیٹیکل پارٹی اور شمالی مشرقی سرحدی صوبے کے خدائی خدمت گاروں نے خان عبدالغفار خان کی قیادت میں اس تحریک میں زور و شور سے حصہ لیا۔ جب ۱۹۳۱-۳۲ء میں کانگریس نے Non-vent-Campaign نامی تحریک چلائی تو غفار خان نے بربخ پٹاؤں نے، ایک اہم رول ادا کیا۔

۱۹۳۶ء کے بعد محمد علی جناح اور مسلم لیگ ہندستان کے سیاسی افق پر ایک عجیب شکیلی میں ابھرے۔

۱۹۴۰ء کے لاہور کے لیگ سیشن نے پاکستان کی تجویز منظور کر لی۔ اس کے دوران محمد علی کچھ قوم پرست مسلم لیڈروں نے دہلی میں سندھ میں اشتیاعی کی صدارت میں ایک نئی تنظیم آزاد مسلم کانفرنس

گگن سکھندستانی مسلمان نمبر

منعقد کی اس میں تقریباً ۷۵۰۰۰ لوگوں نے شرکت کی اور جس نے ایک حقہ آزاد ہندستان کا مانگ کی مکمل حمایت کی۔ پھر بھی مسلم لیگ کو رفتہ رفتہ قوت حاصل ہوئی گئی۔

مولانا آزاد۔ رفیع احمد قدوائی، اصطفی علی خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خاضع صاحب کی قیادت میں قوم پرست مسلمانوں نے ”ہندستان چھوڑ دو“ تحریک میں حصہ لیا۔ مولانا حسین احمد دینی کی قیادت میں دہلی کے علمائے کرام نے کانگریس کی پوری حمایت کی۔ مولانا مدنی اور مولانا حفیظ الزمان نے پورے ملک کا دورہ کیا اور اپنے ہم مذہبوں کو پاکستان کا مانگ کے نقصانات سمجھائے۔

جب ۱۹۴۳ء میں سبکدوش چند روپوں نے سنگا پور میں آزاد ہند گورنمنٹ اور آزاد ہند فوج کی تشکیل کی تو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد برٹش انڈیا فوج سے نکل کر بنگالہ کے ساتھ ہو گئی۔ جنرل شاہنواز خان، عبدالرشید بیگ، عنایت وحیدہ آزاد ہند

کے ذمہ لگے جانے والے افسران ہیں۔

سورما پت ۱۵۷۰ء کو برٹش وزیر اعظم نے ہندوستانی ریت کے سرکاری لارڈ جیمز کلاک لارنس کی سرکردگی میں ایک کمیٹی ٹیسٹ مشن کا تقرر کیا جس کا کام تھا ہندوستانی لیڈروں سے معاملے کرنا۔ کانگریس کی نمائندگی کے صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی جبکہ تقسیم کے حاسلوں کی نمائندگی محمد علی جناح نے کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک تجدد عالم، محب وطن اور اعلامیہ برتتے۔ ”اہلسلام“ (۱۹۷۰ء) اور ”ابلاغ“ (۱۹۷۱ء) کے ذریعہ مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کو دروس صلاح دی۔ اول مذہب کی کچی روح پیدا کرنا اور دُعا میں مذہبی و سماجی اتحاد و اتفاق پیدا کرنا اور دوم خدا کا آزادی کی کچی روح پیدا کرنا اور کانگریس کی آزادی حاصل کرنے کی قومی تحریک میں حصہ لینا۔ ۱۹۷۰ء کے رام گڑھ کے سیشن میں مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندوستانی مسلمانوں کی قومیت کا بڑے واضح الفاظ میں ذکر کیا تھا

قیادت کا حق

ہندوستان ایک بیکو لرمک ہے، بیکو لرمک ہی اس ملک کا خصوصیت ہے اور اسی حق کے تحت عوامی معاملات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی فرد کسی فرقے کے معاملات کا تنقیدی جائزہ لے اور وہ فرد اس فرقے سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس فرد کو محض اس بنیاد پر تنقید کرنے سے نہیں روکا جاسکتا کہ وہ اس فرقے کا فرد نہیں ہے۔ ایک ہندو کو بھی پھوٹ بھجات یا گاؤ کشی کے سلسلے پر بروئے کار ہو رہا ہے۔ یہ حق صرف شکر اچاریہ ہی کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح مزدوروں کے کار کے لئے ایک غیر مزدور بھی جسد و جہد کر سکتا ہے۔ گاندھی جی کو ناسرک اور پراؤں کا عالم نہیں مانا گیا مگر پھر بھی وہ زندگی بھر اچھوتوں کے حق کے لئے برابر لڑتے رہے اور کوئی اس سوشل جنگ کے سلسلے میں ان کو چیلنج نہیں کر سکا۔ اگرچہ ابراہیم لنکن نیگرو نہیں تھا مگر کوئی بھی اس کو نیگرو لوگوں کے حق میں آواز اٹھانے سے نہیں روک سکا۔ آج اسلام اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں، روح معرور ہو چکی ہے۔ فرد ذات واضح ہیں مسلمان جاہل ہے اور غریب ہے۔ چنانچہ نام نہاد مسلم علماء کا ایک بڑا گروپ ہے جو مسلمانوں کی فیزی اور جہالت کو اپنے مقصد میں ایکس پلاٹ کر رہے ہیں۔ انہماں چہ جو لوگ اب اسلام اور مسلمانوں کی فلاح کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ خواہ کسی بھی فرقے، مذہب یا فطریہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کو فلاحی کام سے روکا نہیں جاسکتا۔

اے۔ بی۔ شاہ

حکومت ہندوستانی مسلمان مذہب

مترتباً: عزیز الرحمن جامع لدعای نوری معلوی

مسلمانان ہند کی تین سو بائیس سالہ قسری بانویں کا تاریخی جائزہ

1585 ————— 1947

آغاز تحریک حریت ملک و ملت
حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ ۱۵۶۵ء

شکاء ولی اللہ اسکول

شاہ ولی اللہ شاہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی، سید احمد شہید
شاہ اسماعیل شہید، سراج الدولہ، امجد سلطان شہید۔

پہلی جنگ آزادی:- ۱۸۵۷ء: بہادر شاہ ظفر، جلال شاہ
شہزادوں کا قتل، زمین عمل کی جنگ، مولانا شاہ عبدالقادر لدھیانوی
اسلحہ بھارت کے رہنا، مولانا شاہ فضل حق پور دھری، اسلحہ بھارت کے رہنا،
لال تلخی کی بھٹی، حاجی مسجد کی تجویز فروخت، بیگمات کی بے حرمتی اور
حضرت گل کامقابلہ۔

شہید ۱۸۵۷ء:- نواب عبدالرحمان خان
نواب مصطفیٰ خان شہید،
نواب مظفر الدولہ، نواب فرخ آباد، نواب محمد حسن خان، نواب
نواب محمد علی، نواب اکبر خان بنگش، نواب میر خان شہید، نواب
محمد حسین خان، نواب مجید الدین خان، نواب موصی خان، نواب مضر
خان، نواب احمد علی خان، نواب حفیم اللہ خان رساوار، صفدر جنگ

نواب صفدر بابر جنگ، نواب شرف الدولہ، نواب تفضل حسین خان،
نواب غضنفر حسین خان، نواب نظام الدین خان، نواب محمد علی خان
نواب عبداللہ خان، نواب خان بہادر خان، جنرل کالے خان، میجر
محمد حسین خان، قاضی فضل اللہ دہلوی، میجر جرج خان میواتی، مولانا احمد
شاہ مدد علی، مولانا احمد شہ فیض آبادی، مولانا رضی اللہ بھاروی،
مولانا امام بخش مہبائی، نواب، صفدر بابر جنگ، مولوی محمد حسن امروٹی
میاں امیتسر خوش نویں امیر پنج کشش خوش نویں، قاضی فیض اللہ
کاشمیری، مرزا عاشورہ بیگ، میر احمد حسین خان بیگش، جنرل بخت
خان، مرزا مارہ رخ، داروغہ محمد بخش، دیوان حکمت اللہ، مولانا محمد بابر
بیر علی شاہ، نواب امان اللہ خان، حکیم عبدالحق دہلوی، ڈاکٹر ظہیر علی
ڈاکٹر امرا علی، مرزا امجد صو، مرزا جھوک، مرزا نواب کرناوی، مرزا فاضل علی،

جراہیں بیگم فقیر، منشی غلام رسول، دلہری، لڑاہی، غلام محمد خان،
سید اکبر نزل، سید کریم علی، سید گلشن، سید محمدنا، شہید
ہجوہری شہت خان، مہاس مرزا دلہری، خان غلام محمد خان،
شیر علی خان۔

ہیگمات :- بادشاہ بیگم نریت محل، لڑاہی بیگم ستر محل
اور ہانی بیگمات اور وہ اور دہلی جن کی تعداد ایک سو کے قریب تھی
باشہید ہیگمات باجلا وطن ہو کر ختم ہو گئیں۔

شہدائے ترک موالات : خان صاحب اشفاق اللہ خان
کا کوری، غازی حبیب نوہ پادری
غازی عبدالرشید پادری،

پچھانسیاں : سن ۱۸۵۶ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو
سنسارے موت دی گئی، چالیس لاکھ خدائی
خدمت گار جنگ آزادی کی قریب ہی قربانیاں دیتے رہے۔ تین
سو خدائی خدمت گار اپنے سینے پر گولیاں کھا کر قتلہ خولی بازار
میں شہید ہوئے۔

نظر بندیاں : سن ۱۸۵۶ء میں تین ہزار مسلمان
اندھان میں نظر بند کئے گئے۔ سن
۱۸۵۹ء کی جنگ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی
مولانا ظفر علی خان کے علاوہ تین ہزار مسلمان نظر بند کئے گئے۔
ہے مشق سمن جاری چسکی کی مشقت بھی
کیا طرزہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

تقیدی : مولانا اسماعیل حسین شکوہ آبادی ۱۸۵۲ء
منشی کریم علی (۱۸۵۶ء) مولانا ولایت علی (۱۸۵۶ء) مولانا
محمد علی منصور انھاری (۱۸۵۹ء) مولانا شاہ عبدالعزیز
لہریانوی (۱۸۵۶ء) مولانا شاہ عبداللہ (۱۸۵۶ء) مولانا شاہ
محمد لہریانوی (۱۸۵۶ء)

مقدمہ ہائے سازش : لہریانوی، ۱۸۵۹ء۔ مولانا
آغا محمد العزیز، مولانا شاہ
عبداللہ جناب جوہری محمد شفیع صاحب پنجابی دہلی کو عمر

تقید ہوئی۔ یہی میں انتھان ہو گیا۔

پیشہ ۱۸۵۵ء مولانا احمد اللہ صادق پوری کو موت
کی راہ تھی کہ کو عمر قید میں تبدیل اور کلے پانی میں موت ہو گئی۔

انسبالہ : ۱۸۵۸ء۔ مولانا محمد علی صادق پوری
مولانا عبدالرحیم صادق پوری، قاضی میاں جان، بیابان علیہ غفار
مولانا جعفر خان میری۔ کالے پانی کی سزا ہوئی اور صوبہ کے سب سے بڑے
میں موت کی فیصلہ سلا دیئے گئے۔

دلوہ : ۱۸۶۵ء۔ مولوی امیر الدین کو عمر قید کالے
پانی کی سزا جسے اندام ضبط۔

راجہ محل : ۱۸۶۵ء۔ راجہ ابراہیم مندل
کو عمر قید، جائیداد ضبط۔

مذہب مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سامنے میں
خاز عشق ادا ہوتے ہیں تلواروں کے سائے میں
پیشہ : ۱۸۶۱ء : کل سات ملزم تھے جب انھوں
نے سنا کہ ہم کو بھانسی دی گئی تو خوشی اور مسرت سے ان کے چہرے
جھک رہے تھے۔

دیوبند تحریک : دہلی مرکز، محمود الحسن

امیرالشاہ (۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۰ء تک) باکشیہ شاہ کے
مقتدا شاہ عبدالرحیم ملک (۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک) بجاہر
وطن مولانا حبیب اللہ سندھی (۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۴ء تک)
شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد علی (۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۶ء)
سیاسی لیڈروں کے رہنما حضرت شاہ عبدالقادر رائے بھٹی
(۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء) باکشیہ شاہ اور علماء کے قائد
علامہ انور شاہ کاشمیری (۱۹۲۰ء سے ۱۹۹۲ء) حاجی ابراہیم
مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی۔

شہداء و مجاہدین آزادی سن ۱۸۵۶ء
اور جلیان والا باغ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۷ء
منشی عبداللہ آرزو، دہلی، مولانا محمد مسر سہارن پور

مولانا رحمت اللہ کیرانی کرانہ۔ ڈاکٹر ذہیر خان بہادر۔ نواب ولی خان
بلند شہر۔ اکبر بردھان گوجر۔ بلند شہر۔ مولانا فیض احمد خان۔ منشی
علاء الدین۔ سید محمود شاہ۔ شیخ مسیح الدین ہریون جرنل نیاز احمد
حان، مولانا کافی، مولانا دیان الدین، مولانا نواب محمود خان، شاہ
غلام محبوب، مراد آباد۔ نواب غلام قادر خان، شاہ نادرہ، منہار
خان، بشا، بھاد پور۔

جلیان والا پٹیخ اور 1919ء تا 1922ء کے دیگر مجاہد

ڈاکٹر سیف الدین کپلو، امرتسر۔ خواجہ فیروز الدین ایڈوکیٹ لاہور۔
حافظ محمد اکرم، میاں سراج الدین، ملک عبداللطیف، پہلوان
شہق جیٹھڑ، لاہور۔ مشرف الدین، میاں فیروز الدین، امرتسر۔
شیخ عطا محمد ایڈوکیٹ، حبش دین محمد گجر، نوالا، شیخ محمد حیات
تلم، اسٹر محمد شفیق خٹا، حکیم عبدالحمید، میاں سراج الدین پراچہ،
میر علی الدین، لاہور۔ غلام حسین امرتسر۔ رشید الدین، تاج الدین
(مکس)، روشن علی (مکس)، لاہور۔ محمد مجید دور کاوڑی، احسان ابنی
میر سبط سرائی، مکس، لاہور۔ جرنل ذوق محمد خان، حکیم محمد یعقوب کھٹ
بگم شین عبدالقادر جہلم۔ ڈاکٹر نذر محمد جہلم، حکیم نور الدین، ناکل پور
مولانا عبدالغادر قصوری، اقبال شیدائی لاہور۔ پروفیسر برکت اللہ
بھوپال، مولانا محمد کسحاق مانیرہ۔ شیخ فضل احمد، جینیوٹ۔
عاجی دوست محمد جینیوٹ، مولانا اسکیل سجادہ نشین، راولپنڈی،
مولانا طاہر مہسوی، دہلی۔ عبدالعزیز انصاری ایم۔ اے۔ دہلی،
مولانا خانبخش انظر، امرتسر، صحر گل خان جڑا فالہ، راجہ غلام علی خان
جڑا والا، ملک امیر خان، گجرات۔ ڈاکٹر لہام الدین میرپور، ملک ملو دین
فیضو کامریہ محمد دارت، کامریہ عزیز، مہندی داد انستور۔ دادا ایمر
حیدر، شوکت عثمانی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا اختر علی خان لاہور
میر عبداللہ کاشمیری، شملہ، چاچا محمدی، امرتسر۔ مولانا سید حبیب کامر
ملک لال خان، گجر، نوالا۔ غازی عبدالرحمن، نواتنا لہویانہ۔ خواجہ
عبدالرحیم عاتقہ امرتسر۔ ڈاکٹر محمد عالم ناہور۔ مولانا حفیظ اللہ لہویانہ
چودھری قادر بخش وزیر آباد، مولانا رفیع احمد خان میکش ہوشیارپور
خان صاحب عبدالغفور، لہویانہ۔ مولانا محمد یحییٰ، لہویانہ۔ ڈاکٹر محمد
باسین، لہویانہ، حکیم سکندر خضر، امرتسر۔ کامریہ عبدالباری لائل پور

مجاہدین آزادی 1920ء تا 1947ء

راؤ عبدالغفار خان اٹالہ۔ خواجہ غلام الدین لہویانہ، محمد یحییٰ تار
امرتسر۔ منشی احمد دین امرتسر۔ مسٹر منظر جیل، لہویانہ، فضل الہی زمان،
لاہور۔ پہلوان سراج الدین لہویانہ۔ غازی عبدالعزیز لہویانہ،
برکت جٹ، لہویانہ، بابا محمد ترک، امرتسر۔ مولانا عبدالحی علی ڈار، ہرنوڑی
میاں اختر الدین، لاہور۔ سلا سراج الدین لاہور۔ خواجہ غلام محمد
لاہور۔ احمد یار خان رومی لاہور۔ غازی عبدالرحمان ایڈوکیٹ، امرتسر،
مرزا غلام نبی جانباز، امرتسر۔ محمد اشرف عطا، لاہور، بابا عبدالحی علی
بیگم غلام محمد لاہور۔ میاں عبدالعزیز، میر سبط لاہور، گلبرگ خان ایڈوکیٹ
راولپنڈی، مبارک مانگر، بٹالہ۔ راؤ عبدالغنی، رینگ، مولانا محمد
علی پالوی، جالندھر، حکیم عبدالغنی، راولپنڈی۔ غازی عبدالرحمان،
ذریہ آباد۔ مولانا لال حسین اختر، بٹالہ۔ منظر علی سوختہ، کانپور۔ مولانا
محمد اسحاق نبیل، سید سہا، طیسر۔ سید علی طیسر۔ مولانا عظمت اللہ۔
تصدق احمد خان، شیروانی، لکھنؤ۔ رفیع احمد تودائی، یقین احمد
تودائی، بارہ بنکی۔ عبدالمجید، علی گڑھ۔ مولانا وحید احمد بہاؤپور
مولانا اختر اسلام، مراد آباد۔ ڈاکٹر زید احمد۔ ڈاکٹر محمد اشرف آباد
مولانا ابو الحسن، مولانا احمد اللہ احرار۔ زید الرحمن انصاری غازیپور
منظر حسین وزیر پوٹی، الہ آباد۔ غازی مٹے خان، کھنہ، مولانا
عبدالقیوم، مولانا امیل ذبیحہ، کانپور۔ مولوی فضل حق بنگالی،
پروفیسر ہالون کیر کلکتہ، محمد عارف، مولانا شوکت علی، عابد علی بھائی،
کامریہ، میر علی، میر شکر اللہ، بیسی۔ مولانا بسا بانی، عداس۔ فیض عبداللہ
اللہ رکھا ساغر۔ ڈاکٹر امام الدین، چودھری، غلام عکس کشر، منشی
عبدالقدیر، کلثوم بی عورت اردو، آصف علی، مصطفیٰ خان عکسی
بابا محمد کریم۔ چودھری عبدالستار۔ سلا، عبدالجبار، میر شتان احمد
مسٹر آصف علی، دہلی۔ پروفیسر اسحاق وحشی۔ مولانا منظر الحق، میر سبط
عبدالقیوم انصاری بہار۔ سید انیس الرحمن، بہار۔ مولانا عبدالوہاب
در کھنگ۔ پروفیسر عبدالہادی، ڈاکٹر سید محمود۔ پٹنہ۔ اکبر خان پٹا،
کامریہ محمد عثمان خان آخاری۔ سید لال شاہ پٹنہ، مدد عاشق حسین خان
ارباب محمد الغفور پٹنہ، درخان غلام محمد، پٹنہ، سردار عبدالرب نشتر

دیگر مسلم جماعتیں

"خلافت کمیٹی" (۱۹۱۷ء) بانی مولانا محمد علی جوہر
 "جامعہ تہیہ اسلامیہ" (۱۹۲۵ء) بیا دگار شیخ الہند
 "کابل کانفرنس" (۱۹۲۲ء) بانی مولانا عبید اللہ سندھی
 "خدا کی خدمت گار" (۱۹۲۴ء) بانی خان عبدالغفار خان
 "مومن کانفرنس" (۱۹۲۵ء) بانی محمد عظیم بہمدی
 "مجلس احرار" (۱۹۲۹ء) بانی مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی
 "کشمیر نیشنل کانفرنس" (۱۹۳۵ء) بانی شیخ محمد عبد اللہ
 "شہید پولیٹیکل کانفرنس" (۱۹۳۵ء) بانی سر سید دزدھی
 "انجمن وطن بوجہ تان" (۱۹۳۴ء) بانی عبدالصمد خان اچک زئی
 "برہاکریشک پارٹی" (۱۹۳۴ء) بانی مولوی فضل الحق بنگالی
 "آل انڈیا مسلم مجلس" ۱۹۴۰ء بانی فیض جان محمد جاپان

جنگ آزادی کی اردو زبان کے مسلم وزنامے

زمیندار (لاہور) انقلاب (لاہور) احسان (لاہور)
 شہباز (لاہور) اسرار (لاہور) نشیر جنگ (لاہور)
 وکیل (درتسر) پاسوان (درتسر) انجمنیت (دہلی)
 انصاری (دہلی) ہمدرد (دہلی) ہمارا دور (دہلی)
 ملت (دہلی) حقیقت (دھند) اجیل (بمبئی) الہلال (لکھنؤ)
 ساقی (پٹنہ) آزاد مہند (کلکتہ)
 ہفت روزہ :- الہلال (کلکتہ) لسان نصرت
 (کلکتہ) حریت (دہلی) روشنی (دہلی) افضل (سہارن پور)
 بے پاک (سہارن پور) انیس (لکھنؤ) خدائی نگار (پشاور)
 اردو مصلحت (علی گڑھ) روزنامہ آزاد اجراء ۱۹۳۳
 سہارن روزہ :- انصاری (دہلی) احوار (سہارن پور)
 ہدینہ (بجھو) نزع (لاہور) اینٹے دار العلوم (دہلی بند)
 ہمدردی آواز (کامپور)
 ماہ نامے :- معارف (دہلی) شاہراہ (دہلی) میثرا (دہلی)
 مولوی (دہلی) دین دنیا (دہلی) مختصر خیال (دہلی) صافی (دہلی)

خان اللہ داد خان، مولانا فضل ریل، ڈاکٹر خالص صاحب، بیگم لائبریا
 بخت و شہباز خان، خان لالہ رنج، خان جبرگی، خان نصیب خان
 خان مجسم خان، آزاد قبیل، پیر نظام محمد شہید، بولہ محمد سنگ، ندو

آل انڈیا کانگریس کے مسلم صدر :-

بدر الدین طیب جی - (مدراکس) - ۱۸۸۶
 محمد رحمت اللہ سیانی (کلکتہ) - ۱۸۹۵
 نواب سید محمد بہمد (کراچی) ۱۹۱۳
 سید حسن امام - (بمبئی) ۱۹۱۸
 سلیم اجمل خان (احمد آباد) ۱۹۲۱
 مولانا ابوالکلام آزاد (دہلی) ۱۹۲۲
 مولانا محمد علی جوہر (کوک ناڑہ) ۱۹۲۳
 ڈاکٹر مختار احمد انصاری (مدراکس) ۱۹۲۶
 مولانا ابوالکلام آزاد (رام گڑھ) عہدہ صدارت :
 (۱۹۴۰ تا ۱۹۴۵)

۱۸۸۸ء میں علامہ لدھیانوی نے کانگریس میں شامیل
 ہونے کا فتویٰ دیا۔

جمعیتہ العلماء ہند

قیام : ۱۹۱۷ء بانی : مفتی کفایت اللہ
 پہلے صدر :- مولانا عبد الباقی فرخی مولوی
 حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن : ۱۹۲۵
 مولانا ابوالکلام آزاد : ۱۹۲۱
 مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی : ۱۹۲۲
 مولانا سید حسین احمد مدنی : ۱۹۲۳
 مولانا سید محمد سجاد بہمدی : ۱۹۲۵
 مولانا سید انور شاہ کانپوری : ۱۹۲۶
 مولانا سید محمد سلیمان ندوی : ۱۹۲۹
 مولانا ابوالکلام آزاد : ۱۹۳۱
 مولانا عبد الحق مدنی : ۱۹۳۲
 مولانا شاہ معین الدین اجمیری : ۱۹۳۰

جمعیت العلماء کے ہائی کمان

1919 — 1947

جو اکثر و بیشتر نظر بند و اسیر رہے :- مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سلات اللہ (یوپی)، مولانا ابوالرشاد اللہ (امرتسر)، پیر محمد امام شاہ (سندھ)، مولانا اسد اللہ شاہ (سندھ)، سید محمد فاضل (الکراچی)، مولانا محمد انیس نگرانی - مولانا غلام نظام الدین (یوپی)، مولانا محمد ابراہیم (سیکوٹ)، مولانا سید کمال الدین (یوپی)، مولانا قدیر بخش (یوپی)، مولانا مولانا بخش (امرتسر)، مولانا تاج محمد (سندھ)، مولانا محمد ابراہیم (درہنگا)، مولانا عبدالحلیم (بہار)، مولانا محمد آرم جان (بنگلہ)، مولانا منیر الزماں (بنگلہ)، مولانا محمد صادق (کراچی)، مولانا محمد داؤد (امرتسر)، مولانا سید اسماعیل (امرتسر)، مولانا عبد اللہ (پنجاب)، مولانا آزاد سبجانی (یوپی)، مولانا سید حسین احمد مدنی (یوپی)، مولانا حبیب الرحمان (لدھیانوی)، مولانا عزیز گل (سید)، مولانا معین الدین (اجیر)، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا ابوالکلام آزاد - حکیم حبیب اللہ خان (دہلی)، مولانا عبدالحق (جہان آباد)، مولانا حسرت سہانی - مولانا محمد علی جوہر، سید عطاء اللہ شاہ بھاری - مولانا محمد سیدی - مولانا رکن الدین - مولانا خدابخش - مولانا حبیب الرحمان (دہلی)، مولانا عبد اللہ (سندھ)، مولانا محمد صادق - مولانا محمد ابراہیم سیاحٹ، مولانا بقا اللہ (پٹی)، مولانا عرفان سہروردی - (سبجانی)، مولانا منظور الباقی (سہارن پور)، مفتی مشتراحمد (کانپور)، مولانا احمد حسن (امروہی)، ڈاکٹر انصاری (دہلی)، مولانا احمد اللہ (پٹی)، مولانا احمد علی (مفسر قرآن) (لاہور)

اسٹران فرنٹ مجلس احرار

1929 — 1947

مولانا حفایت اللہ سہروردی، حکیم عبدالحق دہلوی، داؤد محمد کمال خان (یوپی)، مولانا عزیز الرحمان جامی (لدھیانوی)

خاتون مشرق (دہلی)، سید تعلیم جامعہ (دہلی)، انعام، دیوبند، استقلال (دیوبند)، دارالعلوم (دیوبند)، الحمد (گوجران والا)، ادب لطیف (لاہور)، تعلیم (الکراچی)، السندھ لکھنؤ، زندگی (الکراچی)، الفرقان (برٹن)، جامعہ ایسٹ (نقیب)، اعظم گڑھ

مجلس احرار ہند کے ہائی کمان

1919 — 1947

جو اکثر و بیشتر نظر بند و اسیر رہے :- مولانا بشیر احمد سہروردی، مولانا حفایت اللہ سہروردی، جو دھری الغل، مولانا سید محمد غازی، مولانا سبط العلہ (پنجاب)، سید آدین (دہلی)، غازی عبد الرحمان (امروہی)، مشرف الدین انصاری، مولانا فیروز الدین، جو دھری، عبد العزیز کپور، تارن عبد الرحمان، سکھری، جو دھری، عبد الرحمن ایم اہل سی - ڈاکٹر عبد الفتاح نقان، مولانا احمد علی شاہ غسر قرآن - مفتی محمد راجہ سہروردی - مولانا محمد صاحب (ڈیرہ)، خیل خان، مولانا عبد الرحیم پوٹلی زئی، مولانا عبد القیوم پوٹلی زئی (پٹنہ)، مولانا محمد اسماعیل امیر جہاں ت اہل حدیث - مولانا سید عبدالغفار غزنوی - خواجہ احمد دین سبیلوئی - امیر شریعت - عطاء اللہ شاہ بھاری - حکیم عبدالغنی (دراویشی)، حکیم عبد السلام، ہزاروی، حکیم نور الدین لکھنوی - میاں تبر الدین لاہوری، مولانا نور الدین لاہوری - مولانا محمد صدیق (کراچی)، مولانا گل شیر (پٹنہ)، مولانا تاج محمود - مولانا محمد قاسم، مولانا حسن عثمانی (یوپی)، آن سرگیش کشمیری - مولانا سراج الدین (دہلی)، صاحبزادہ سید سلیمان (پنجاب)، سید علی رفوی (بہار)، جو دھری محمد تیفیق، سید انجم احرار، حافظ علی بہادر خان، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا شیر محمد لدھیانوی - محمد حسن جنتی، بھادول پور - علامہ محمد ارشد بھادول پوری - علامہ تالوت لسانی - حکیم آفتاب احمد امروہی - مولانا محمد علی جالندھری - مولانا خلیل الرحمان لدھیانوی - مولانا نور علی (بنگلہ)، حافظ محمد مشتاق لدھیانوی، بدال دہلی (بنگلہ)، خان محمد علی سہارن پوری - مولانا عبد الوہاب لدھیانوی - سید حفایت اللہ کشمیری - مولانا سید امجد ناسی

مولانا شاہد شیرانی، علی گڑھ، کامریہ محمد بشیر علی گڑھ، کوثر میرٹھی
 یو۔ پی، علامہ انور صاحبی، دیوبند، عبدالغفور انوری، ملتان۔
 مولانا محمد احمد کاشمی، الہ آباد۔ حاجی محمد فادق آل کلامتہ دالے،
 دہلی۔ انواب زادہ نصر اللہ خان ڈیرہ غازی خان۔ خان محمود علی خان
 سہارن پور۔ میان قمر الدین، لاہور۔ میر عبد القیوم، لائل پور۔ میر
 احمد حسین، دہلوی۔ غلام ارشد بھادول پور۔ غلام فوارت، بھادولپور
 حکیم آفتاب احمد امرہری۔ خان عزیز احمد خان، بریلی۔ محمد حسن
 چغتائی، بھادول پور۔ مولانا عبدالرشید فاروقی دہلوی۔ ٹاکر محمد طرکھر
 حصہ۔ خان محمد احمد رخان ہشتانی۔ بلوچستان۔ فیض محمد وسیع گھڑی
 مولانا حامد الانصاری غازی۔ قاضی محنت احمد کانپوری۔ خواجہ محمد
 اعظم لدھیانوی، خواجہ محمد یوسف لدھیانوی، ملا عبدالرحمن لدھیانوی
 مولانا محمد چراغ گوجران والا۔ مفتی محمد عبدالرشید لدھیانوی۔ شیخ
 عمر الدین بیک، بوٹا ڈاس، لدھیانہ۔ چودھری علی محمد خروٹ، مریض

اسیرانِ فرنگ مجلسِ جمعۃ العلماء

1929 ————— 1947

مولانا حفظ الرحمن سیوہادی۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی طبع آبادی
 مولانا بشیر محمد بھنوری۔ مولانا نور الدین بھاری، مولانا عبد الصمد حاتی
 مونگیر۔ مولانا سید فخر الدین مراد آبادی۔ مولانا سید محمد بیان دیوبندی
 مولانا ابوالوف شاہجہاں پوری۔ مولانا عبدالوہاب آردی (دہار)
 مولانا عبدالماجد دہلوی۔ مولانا شاہد غازی، لکناؤ۔ مولانا اکمل
 سنبھلی۔ مولانا منت اللہ بھاری۔ مولانا محمد قائم شاہجہاں پوری
 مولانا ابوالخاف سم سیف بناری۔ مولانا عبدالرحمن حلی۔ مولانا وحید الدین
 قاسمی شیرکوٹی۔ مولانا محمد داز بیگ مراد آباد۔ قادی محمد طیب
 دیوبند۔ مفتی عتیق الرحمن دہلی۔ مفتی نثار احمد کانپوری۔
 مولانا عبدالنعم، بسبی۔ مولانا صیف الدین، بسبی۔ حکیم ابو یوسف مہمانی
 بسبی۔ محمد حسین بیرسٹر، میرٹھ۔ سید محمد میان حاجی، حاجی موسیٰ خان
 شیردانی علی گڑھ۔ قادی مبکس سین، پری، مولانا شاہد الدین
 مولانا عبدالقدیر بریلوی۔ خان بہادر جان محمد دہلوی، کلکتہ۔
 حافظ رحمت الہی مختلف، دہلوی۔ خان عبدالغفور کونسلر دہلی۔
 سید محمد یعقوب، مدراس۔

گلستانِ ہندوستانی قلمدانِ نیر

شاعرانہ صحافی۔ ادبی اور قلمی مددگار

قاضی نذر الاسلام، فیض احمد فیض لدھیانوی، مٹوئی
 قدامت مسطفی تبسم۔ ڈاکٹر تاثیر، لاہور۔ بطرس کب رے، لاہور۔
 مولانا مظہر علی اختر۔ م۔ حسن لطیفی لدھیانوی، شعری بھوپالی۔ اقبال
 سمبھلی اعظمی۔ اعظم لدھیانوی۔ حامد اللہ آفرنگھنوی، سکر
 رامپوری۔ خباب ابن رحمت جالندھری۔ بسمل سعیدی، یوٹن ناٹھیری۔
 وزیر علی آغا لدھیانوی۔ سیاتب اکبر آبادی۔ اختر شیرانی، لاہور۔
 حفیظ جالندھری۔ مولانا گرامی جالندھری۔ شاہدانی رام پوری۔ کامریہ
 نرمی لاہوری۔ م۔ راشد، دہلی۔ مبین احسن جٹوئی۔ جمشید
 شغائی، لاہور۔ احمد ندیم قاسمی لاہور۔ سرمد الحق لدھیانوی۔ غمیرت
 بخاری لاہور۔ مجید لاہوری۔ سلام بھلی ٹھہری۔ علامہ شفیق جہوپا
 علامہ طاقت ملستانی۔ محی الدین ملک لدھیانوی۔ ظفر اقبال لاہور۔
 احمد مشتاق لاہور۔ انیس الرحمن لدھیانوی، غلام ربانی ناٹھانی دہلی۔
 اسد عثمانی، ملتان۔ مہر القادری، مہرہ۔ مولانا احمد سید دہلی مولانا
 فیض الدین نیر حاجی۔ مولانا حاتی۔ حکیم اجمل خان خیدا۔ عبدالحکیم عاجز
 امرت سری۔ مرتضیٰ میکیش لاہوری۔ انعام اللہ خان ناصر لطیف مہنڈی
 پوری۔ ابو زر بخاری ملتان۔ داسق بونہری۔ آغا حشر کاشمیری کپڑی
 آل احمد سرمد علی گڑھ۔ اسحاق دانش، لاہور۔ دوسر کاشمی کانپور،
 حیات حسین میر کاشمیری۔ حسن عثمانی۔ بولہ۔ عبدالحکیم عظیم لاہور۔ اکبر
 الہ آبادی۔ الطاف مشہدی۔ ڈاکٹر عابد حسین عابد۔ سرمد جعفری۔
 نشور واحدی۔ نشتہ جالندھری۔ اختر الدین ٹونک۔ علامہ انور باری
 وقار انب لوی، انار۔ امین گیلانی امرت سر۔ نکوش صدیقی، حاجی بلال
 لاہوری۔ سحیل اعظمی۔ مولانا حسرت مولانی۔ علامہ اقبال گجہد۔ مولانا
 محمد علی جوہر۔ مولانا منشی نعمانی۔ مولانا کفر علی خان۔ جوش ملیح آبادی
 اہم بھو بھوئی، کوثر میرٹھی۔ عبدالحکیم دیر آبادی۔ سائر نفی
 راحتہ لدھیانوی۔ مرزا غلام نجف آباد۔ مولانا الہ کلام آزاد۔
 مولانا غلام رسول جہ لاہور۔ عبدالحکیم راکٹ لاہور۔ اختر لدھیانوی۔
 مولانا عثمان قد نطی۔ بولہ۔ کامریہ عبدالہار لاہور۔ شاہ مبین الدین
 ندی عبدالمجید انصاری، انجمن شاہ کاشمیری، کامریہ عبدالرشید ملک۔

محمد قاری کمال، یوپی۔ مولانا عبدالباقی، امید عبد اللہ بریلوی
نصر اللہ خان عزیز، حافظ علی بہاؤ خان، حیات اللہ انصاری۔
علامہ بدر جلالی، یوپی، محمد شرف خطا، لاہور، حسین عظیم آبادی، جٹ
سلطان صاحبزادہ، یوپی۔ مولانا عبد الرزاق، وحید قاسمی، قاضی عبدالغفار
رئیس امر دہلی، قاضی زمین العابدین، مولانا سلطان الحق، دیوبند،
لیکٹر ناکر حسین، بدر ایمل رحمان، چراغ حسن حسرت، ابوسعید بزی
جھوپال، قاضی عدیل عباسی، قاضی احسان اللہ، بلال احمد بیری، یوپی۔
غاز انصاری، یوپی۔ مولانا سید حبیب، کوثر خانہ پوری، ابوالفتح

ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی سہارن پوری، اسرار احمد آزاد، یوپی
دقار فہاروی، ڈاکٹر حامد حسین، یوپی، عزیز حسن بھائی، یوپی۔
ذکرہ اسعدی، یوپی۔ قاری یونسی جھوپال، ریاست علی ندوی۔
مولانا حامد الانصاری، قادی، شرکت علی نبی، سید محمد حفیظ، یوپی،
حاتر جاسمی، ممبئی، امیر اصغر علی جاسمی، ممبئی، سید زین العابدین
عبد اللہ یوسف علی، ٹھہر دہلی، یوپی، سجاد طہیر بھٹوی، رتن چن اعلیٰ
جو دھری افضل الحق، مولانا سعید کبریا، یوپی، مولانا منظور نعمانی، سید فیروز عاتق
مولانا محمد نجیب، بادی، عزیز رحمان جاک، لاہور، فیض احمد فیض لاہور۔

ہندوستانی مسلمان کے دورِ خ

مصطفیٰ زیدی مرحوم (تبیح الہ آبادی) کے والد نعت حسین یمن بھٹیڑاضلع بجنور (اتر پردیش) کے
رہنے والے تھے بدھیں الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی، سی آئی ڈی انسپکٹر تھے۔ خلافت کی تحریک
کے دنوں میں نعت حسین نے جہاں دوسروں کو گرفتار کیا وہاں مولانا محمد علی کو بھی انھوں نے
گرفتار کر لیا۔ مسلمان الہ آباد نے اپنی ناراضگی کا اظہار ایک نظم کا صورت میں
کیا۔ اس نظم کے دو مصرعے تھے

محمّد کا دشمن علی کا عدد کہاں کا ہوا نعت حسین تو

حکیم صادق علی خان کے بیٹے حکیم محمود خان (حکیم محمد اجل خان کے والد) اور حکیم مرتضیٰ خان جو
خان دانی مسلمان تھے جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی تو ان دونوں بھائیوں نے لوگوں کے
ساتھ بڑی سمدردی کا ثبوت دیا۔ مارے اہل محلہ، اقرباء و احباب بلا امتیاز امیر و غریب تقریباً 500
آدمیوں کو اپنے گھر میں رکھا اور جب تک یہ ہنگامہ فرو نہیں ہوا اس وقت تک ان کی ہر طرح کی
خبر گیری اور خاطر مدارات کرتے رہے۔ ایک دن کسی مخبر کے مخبری کرنے پر وہ سب
لوگ جو حکیم صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انگریزی سپاہیوں کے ہاتھوں
گرفتار ہو کر کو توالی چلے گئے۔ حکیم مرتضیٰ صاحب کو بھی اپنے مہازوں کے ساتھ تین دن
تک کو توالی کی حوالات میں قید رہنا پڑا۔ پھر بڑی مشکل اور کوشش سے ان سب
کو رہ کر لایا۔ خد بھی جھوٹے اور پھر ب کو اپنے ساتھ لے کر ریاست پٹیالا چلے گئے اور
اپنے بڑے بھائی محمود خان کی جگہ سلب کرنے لگے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ یوپی
میں حکیم محمود خان اپنے مرحوم والد حکیم صادق علی کی جگہ سلب میں بیٹھ گئے۔

تاریخ ہندوستان

6 ہزار برس قبل مسیح سے 20 ویں صدی عیسوی تک

- ہندوستان میں 6 ہزار برس قبل مسیح آریوں کی آمد۔
- ہندوستان پر وسطی ایشیا کے ہنوں کا وحشیانہ حملہ 520 قبل مسیح میں۔
- سکندر کا حملہ 326 قبل مسیح میں یعنی پہلے یورپی حملہ آور کی آمد۔
- ہندوستان کی پہلی آزاد حکومت چندرگپت موریہ، 323 قبل مسیح میں جس نے یونانی فوج کو ملک سے نکال باہر کیا۔
- ہندوستان پر دوسرا غیر ملکی حملہ 305 قبل مسیح میں۔ حملہ آور یونانی جنرل سلیوکس تھا جو ناکام رہا۔
- ہندوستان میں پہلی عوامی حکومت، عہد اشوک 373 قبل مسیح۔
- آریوں اور یونانیوں کے بعد غیر ملکی نسل، کشن کی آمد 120ء میں یہ نسل چین سے آکر ہندوستان پر حکم ران ہوئی۔
- ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت مختلف حکومتیں۔
 - 1۔ دہلی میں نزار راجہ
 - 2۔ اجمیر میں چوان راجہ
 - 3۔ فتوح میں راٹھور راجہ
 - 4۔ بہار میں بال راجہ
 - 5۔ بنگال میں سین راجہ
 - 6۔ مالوہ میں پرمار راجہ
 - 7۔ بندھیل میں کھنڈر چنڈ راجہ
- عہد لوہ کا پہلا حملہ 712ء میں۔
- افغانوں کے حملے، عہد محمود غزنوی میں 997ء سے 1030ء تک۔
- مغلوں کی آمد و فتح۔ 1522ء میں
- ہندوستان میں انگریزوں کی آمد۔ عہد جہاں گیر میں۔ انگریز سیف ٹامس روجس نے انگریزوں کی تجارتی کمپنی کے لیے حقوق حاصل کئے۔ 1615ء میں۔
- ہندوستان میں عوامی سوسائٹی کا عہد۔ 1500ء سے 1538ء تک۔
- احمد شاہ ابدالی کا حملہ۔ 1761ء میں
- پانی پت کی جنگ
- تیسری جنگ
- افغان مرہٹا جنگ
- برٹش گالوں کی آمد (داس کوڈی گا) 1498ء
- گواہ پر پریگیز قبضہ۔ عہد آل بوری 1510ء
- ڈچ کی آمد۔ ڈچ کمپنی 1602ء
- انگریزوں کا اقتصادی حملہ، کیتانہ مکس نے سورت میں پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ 1608ء
- ہندوستان میں پہلی انگریز نوآبادی۔ راس شہر جسے راجا چند گری کی زمین ہجرا دیا گیا۔ 1649ء میں
- بمبئی میں انگریزوں کا قبضہ۔ 1668ء

- انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی۔ کچھ انگریز سپاہی قتل کئے گئے مگر کام نہ ہوئے پرویز نے ہڈی کٹی کر لی۔ بندھیل کھنڈ کے سوا کچھ نہیں بچا۔
- نے بھی اس زمانے میں بغاوت کی ۱۸۵۸ء
- کپٹی کا نیا چارٹر اس کی رو سے ہندوستان کو مشنری (تبلیغ) کے ذریعے عیسائی بنانے اور مشنری اسکولوں کے لیے ایک لاکھ روپے کی منظوری کا منشور انگریز کپٹی کو حاصل ہوا۔ نتیجے میں سائے انگریزوں کے لیے ہندوستان کی تجارت کھول دی گئی ۱۸۱۸ء
- ۱۸۵۹ء میں ہمارا جارج جیت سنگھ اور انگریزوں کی صلح۔
- سکھ حکومت کی ابتدا ۱۸۳۹ء میں۔
- جنگ یونا۔ پیشوا جی راؤ نے مرہٹا سرداروں کی مدد سے انگریزوں کی پونا ریڈی ڈنسی پر حملہ کیا اور اسے جلا ڈالا۔ بھونسلے اور بکر نے بھی انگریزوں پر حملہ کیا مگر ناکام رہے۔ ۱۸۱۵ء
- سکھوں کی پہلی جنگ آزادی۔ ۱۸۳۹ء میں ہمارا جارج جیت سنگھ کے انتقال کے بعد سکھوں نے انگریزوں پر حملہ کیا مگر ناکام رہے۔
- ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی، آزادی کے لیے کئی جنگ لڑنے کے بعد ۱۵ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے پہلی جنگ آزادی کا مومکو گرم ہوا۔ دہلی، کانپور، بکھنوا اور جھانسی جنگ آزادی کے مرکز بنے۔ مگر یہ جنگ ہندوستانی ہار گئی۔
- ملکہ انگلستان و کٹوریا کا فرمان۔ کپٹی کی حکومت کا خاتمہ رہا۔
- آزادی، مذہبی آزادی، عہدوں میں نسلی برابری، باغیوں کو معافی اور اقتصادی ترقی کا وعدہ۔ انگریزی تاریخ میں اسے پہلا اعلان آزادی قرار دیا گیا۔ پہلی نومبر ۱۸۵۸ء
- حکومت برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کا پہلا وائس رائلٹ کننگھم ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۲ء تک۔
- انڈین نیشنل کانگریس۔ ملک کی آزادی کے لیے سب سے بڑی قومی جماعت کا قیام ۱۸۸۵ء میں
- آزادی کی پہلی قسط۔ منٹو مار لے ری فارم، ہندوستانوں کو حکومت میں کچھ اختیارات دیئے گئے، مسلمانوں کو عطا کردہ حق نیابت دیا گیا اور لارڈ سنہا کو وزیر ہند کی کونسل میں لیا گیا ۱۹۰۵ء سے

- کلکتہ۔ ہندوستان میں تیسرا انگریزی شہر جس کی بنیاد دریائے ہنگی کے کنارے ڈالی گئی۔
- ڈو پٹہ وہ فرانسیسی دہر جس نے ہندوستان میں فرانسیسی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۷۹۱ء سے ۱۷۵۴ء تک
- ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی، ۱۷۵۶ء میں کلکتہ پر سراج الدولہ کا حملہ اور قبضہ۔
- ہندوستان کی غلامی کی ابتدا، ۲۳ جون ۱۷۵۷ء، بلاسی کی جنگ اور میر جعفر کے لڑکے میرن کے ہاتھوں شیرنگال سراج الدولہ کی شہادت۔
- خیر علی غلامی پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ جو میر قاسم، شجاع الدولہ، بکھنوا اور شاہ عالم دہلی کا متحدہ محاذ بنا کر کیا گیا، جنگ بکسر ۱۷۶۴ء
- عہد نامہ الہ آباد۔ بنگال، بہار، اڑیسہ پر انگریزوں کی حکومت کی شروعات ۱۷۶۵ء
- دوسری جنگ آزادی۔ میسور کا سپہ سالار حیدر علی جس نے نواب کرناٹک کی حیثیت سے میسور کے محاذ پر جنگ آزادی کا مورچہ لیا، کرنل سیلی اور بکسر کے فاتح میجر منرو کو شکست دی ۱۷۸۲ء
- ہندوستان کی غلامی کی ابتدا۔ پہلا انگریز گورنر جنرل وارن ہسٹنگز ۱۷۷۴ء سے ۱۷۸۵ء تک۔
- تیسری جنگ آزادی۔ میسور کی چوتھی جنگ مرٹھا ٹیم، جس میں ٹیپو سلطان شہید ہوئے۔ اس جنگ میں ٹیپو نے نظام، مینی اور مدراس کی انگریزی فوجوں سے مقابلہ کیا۔
- مراٹھوں اور انگریزوں کی جنگ، جس میں سندھیا اور بھونسلہ انگریزوں سے لڑے، ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۵ء تک۔
- پہلا فوجی خدر۔ مدراس دیلو کی جنگ آزادی، دکنی سپاہیوں نے بغاوت کر کے ایک سوا انگریز انیسویں اور سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ اس بغاوت کا الزام انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے لڑکوں پر لگایا ۱۸۰۶ء
- انگریزوں کے خلاف دوسری بغاوت۔ ٹراند کوہر کے وزیر نے

- برطانوی وائس رائلٹی - مارچ ۱۹۳۳ء
- گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ - اس کے ذریعے صوبائی خود مختاری اور مرکزی فیڈرل حکومت کا اعلان ۱۹۳۵ء
- صوبائی آزادی اصولوں میں خود مختار وزارتوں کی حکومتوں کی ابتدا۔ اپریل ۱۹۳۷ء
- وزیر ہند کا اعلان - 'ہندوستان دولت متحدہ برطانویا میں آزاد اور برابر کے رکن کی حیثیت سے شریک ہوگا اور ہندوستانی خطائی دستور ساز اسمبلی میں اپنا دستور مرتب کریں گے؟'
- اسٹے فورڈ کرسچن - اسٹے فورڈ کرسچن کی آمد اور ہندوستانی لیڈروں سے گفت و شنید - ۱۹۴۲ء
- بیان ملک معظم انگلستان - نانائڈ اسمبلی اور آزادی کا وعدہ ۸ اگست ۱۹۴۲ء
- انڈین نیشنل کانگریس کی 'ہندوستان چھوڑو' کی تحریک - ۹ اگست ۱۹۴۲ء
- دوسری بڑی جنگ کا اختتام - ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء
- دے دل مشن - ۱۹۴۵ء
- کینیٹ مشن کی آمد - ۱۹۴۶ء
- عبوری مرکزی حکومت - ۱۹۴۵ء
- تقسیم ہند - ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
- آزادی ہند - ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء
- آزاد دستور ہند کا لفاظی، جمہوریہ ہند - ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء
- پہلے جمہوری عام انتخابات - ۱۹۵۲ء
- دوسرے عام انتخابات - ۱۹۵۷ء
- اشاریہ سسٹم کے تحت نئے سکولوں کا احرام - پہلی اپریل ۱۹۵۷ء
- ناپ و تول کے میٹرک سسٹم کی ابتدا - پہلی اکتوبر ۱۹۵۸ء
- گوا کی آزادی - ۱۹۶۱ء
- تیسرے عام انتخابات - ۱۹۶۲ء
- چین کا جارحانہ حملہ - ۱۹۶۲ء
- ہندوستان پاکستان جنگ - ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء
- چوتھے عام انتخابات - ۱۹۷۱ء

- ۱۹۱۵ء تک
- پایہ تخت کلکتے سے دہلی منتقل ہوا۔ دہلی دربار کے نتیجے میں - ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء
- ۱۹۱۴ء کی بڑی جنگ میں ہاتھ کا گندھی کی فوجی خدمات کی بنا پر ان کو انگریز سرکار سے قیصر ہند کا تمغا - ۱۹۱۵ء
- بنارس ہندو یونیورسٹی قائم ہوئی ۱۹۱۴ء
- اعلان خود مختاری - مانٹگو وزیر ہند نے ۲۵ اگست ۱۹۱۷ء کو حکومت برطانیہ کی جانب سے انگریزوں کی پارلیامنٹ میں یہ اعلان کیا: 'سرکار برطانیہ کا ہندوستانوں کو ایسے ملک کے انتظام میں زیادہ سے زیادہ حصہ دینا اور قدم بہ قدم پل کر دے دار حکومت عطا کرنا ہے، البتہ ہندوستان برطانوی کامن ویلتھ کا ایک حصہ رہے گا۔'
- رولٹ ایکٹ - انگریز سرکار نے آزادی کی سازشوں کا سراغ لگانے کے لیے رولٹ ایکٹ کی مقرر کی اور رولٹ ایکٹ پاس کیا۔ اس ایکٹ کو ناکام بنانے کے لیے گاندھی جی نے عدم تشدد کی بنیاد پر جنگ آزادی شروع کی اسی برس جلیان والا باغ کا حادثہ بھی آیا۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء
- تحریک عدم تعاون کی ابتداء - ستیا اگرو، انگریزی ملازمتوں، انگریزی کالجوں، کونسلوں، خطابوں اور انگریزی کپڑے کا بائیکاٹ - ۱۹۲۰ء
- ۱۹۲۱ء
- گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت مانٹگو چیمس فورڈری فارم کی صورت میں انگریز سرکار نے ہندوستانوں کو آزادی کی دوسری قسط ملی صوبائی مرکزی اسمبلی کو کنسل میں مزید سائنسنگ ملی ایک کے بجائے تین ہندوستانی وزیر مقرر ہونے لگے - ۱۹۱۹ء
- پنڈت جھرو نے لاہور کانگریس کے اجلاس میں صدر کی حیثیت سے مکمل آزادی کے مطالبے کا اعلان کیا - ۱۹۲۹ء
- سول نافرمانی بینک ستیا اگرو - مارچ ۱۹۳۰ء
- پہلی گول میز کانفرنس لندن - نومبر ۱۹۳۰ء
- گاندھی اردن سکھوتہ - مارچ ۱۹۳۱ء
- دوسری گول میز کانفرنس لندن - ستمبر ۱۹۳۱ء
- تیسری گول میز کانفرنس لندن - نومبر ۱۹۳۲ء

ہندستانی مسلمانوں کے تیوہار

کسی قوم کی زندگی میں تیوہاروں کی بہت اہمیت ہوتی ہے قوم کی روح کو بیدار کرنے میں تیوہار ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان تیوہاروں اور جشنوں سے صرف اس کی دنیاوی تسمہ یک کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ کس کس موطن پر کیا کیا تبدیلی ہوتی ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ کسی نامکن اصول پر مبنی نہیں ہوتا۔ خدا کے متعلق اس کا عقیدہ سادہ مگر اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کا سجدہ غیر کسی زور و جبر کے بھی پر شکوہ ہوتی ہے۔ اس کے مذہب میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ اس کے تیوہار کم ہیں۔ انھیں نہایت سادہ مگر متاثر کن انداز میں منایا جاتا ہے۔ یہ ایک الفاظ بات نہیں ہے کہ ایک مسلم کا عقیدہ اس کی عبادت کا طریقہ، اس کے تیوہار سب ہی اس کی تلقین کرتے ہیں۔ انہی تمام ذرائع سے اسلام کی روح نے ایک ملت کو جنم دیا۔ اور توہیت و رنگ و فصل پر وحدت کی مہر لگا دی۔

اسلامی تیوہاروں کی سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انھیں قسری سال کے حساب سے منایا جاتا ہے کسی سال اور موسم ایک ہی ساتھ چلتے ہیں۔ اسی لئے ہندو اور عیسائی تیوہاروں سے اس کے اعتبار سے بھی منانے چلتے ہیں۔ عربوں میں آج حضرت سے قبل قمری شمسی سال کا رواج تھا۔ مہینہ چاند کے نظر آنے پر شروع ہوتا تھا، لیکن ہر تیسرے سال میں ایک مہینے کا اضافہ کر کے اسے شمسی سال کے برابر کر دیا جاتا تھا، لیکن حضورؐ نے یہ طریقہ ختم کر کے صرف قمری سال کو قائم رکھا۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ تیوہاروں کے منانے پر ان کا روحانہ

منہیت پر زور دیا جاتا ہے۔

مسلم صلعم کے زمانے میں بھی مسلمانوں کو کئی نوعات ہوئیں، اور خشیان منائی گئیں لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک نفع کو جشن یا تیوہار کا درجہ نہیں دیا گیا۔ سب سے اہم تیوہاروں میں سے ایک عید الاضحیٰ ہے۔ یہ تیوہار دراصل قربانی کے عہد کا سالانہ تجدیدی رسم ہے۔ جب کہ عبد الفطر اس نیکوئے میں منائی جاتی ہے کہ خدا نے انھیں روزے رکھنے کے قابل بنایا۔

اسلامی تیوہاروں کی تیسری نمایاں خوبی یہ ہے کہ انھیں منانے میں مذہبی رسوم اور سماجی رواجوں کو بڑے مسلم طریقے سے ادراک کیا جاتا ہے اخلاقاً خدا کو ذرا بھی مجبور نہیں کیا جاتا اور نہ کسی قسم کی بدتمیزی ہی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ نہ ناکھانے کی محفل جتنی ہے اور نہ شراب کباب اور جوئے کی مجلس۔ اس طرح مسلمانوں کی خشتیاں بھی مقدس درجہ رکھتی ہیں۔

مذہبی تیوہاروں کے لئے اسلامی لفظ ہے عید، جو یا تو عربی لفظ جس کے معنی ہیں واپس یا ارامانی لفظ تیوہار سے اخذ شدہ ہے عید الضحیٰ :- دو عیدیں ہیں۔ بڑی عید عید الضحیٰ یا ہندستانی بقر عید ہے، اسے اسلامی کیلنڈر کے آخری مہینے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ مسلمان اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عید گاہ جا کر ناز ادا کرتے ہیں۔ یہ دو رکعات اور خطبے پر مشتمل ہے۔ اور اسلامی عبادت ہی کی طرح سادہ ہوتی ہے۔

بھرتراہی ہوتی ہے قربانی سنت سرکدہ علی الکفایہ (بہر کمال)

مسلم پر فرض ہوتی ہے، جو ایک قربانی کے قابل جانور خرید لکھا ہو، اگر قربانی کرنے والا ایک یا تہوں اس مقصد کے لئے ایک بھری یا بھری خرید لکھا ہے، اور اگر زیادہ لوگ ہوتے ہیں تو ادنیٰ یا بھری خریدنے میں قربانی اور اگر لے کے لئے تین دن کا وقفہ ہوتا ہے، جو ایام شریک کہلاتا ہے۔

ذبح کرنے والا خدا کا نام لیتا ہے، (تسمیہ)

اور جانور کا منہ قبل کی طرف کرتا ہے۔ تجیر اور مخصوص زحار ہوتا ہے اور جانور کو ذبح کر دیتا ہے قربانی کرنے والا ایک حصہ اپنے لئے رکھتا ہے اور باقی حصہ دوسروں میں تقسیم کر دیتا ہے، پھر ایک دوسرے کے گھر جا کر عید کی مبارکباد دی جاتی ہے۔

یہ تیوہار صبح کا ایک حصہ ہے اس لئے صبح کے لئے بھی کچھ کہنا چاہیئے یہ سالانہ مقدس سفر کیسے (کئے) گئے لئے ہوتا ہے جن میں تھکتا ہوا ان کے لئے فرض ہوتا ہے (ومن استطاع اللہ سبیلاً) ریلاؤن، علاموں اور غیر محفوظ طوروں کے لئے استثنا ہوتا ہے صبح سے مستقل کچھ رسوم یہ ہے۔

۱۔ احرام :- مگر پہنچنے پر یہ لباس رب تن کیا جاتا ہے اس حالت میں حاجی دنیا سے قطع تعلق کر لیتا ہے، اور پرہیز کرتا ہے۔ اور مکمل طور پر خدا کا ہو جاتا ہے۔

۲۔ طواف :- گیسے کے سات طواف اور حجر اسود کو بوسہ دینا۔
۳۔ سعی :- مقام ابراہیم پر نماز کے بعد صفا اور مراد کے درمیان سات مرتبہ آنا اور جانا۔

۴۔ منیٰ کا وادی میں تھوڑے قیام کے بعد عرفات کو جانا۔
۵۔ شیطان کو سات پھرتا ہے اور وادی منیٰ میں قربانی ادا کرنے کے بعد عرفات کو واپسی۔

جودہ اور دوسرے اسلامی ملک کے درمیان جہاز کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے۔ دوسرے حجاج کرام جہاز ریلوے یا کارواں کی شکل میں چلتے ہیں۔

خانہ کعبہ ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا ان کے ساتھ ان کے فرزند اسماعیلؑ بھی تھے۔ اسلام کے پیغمبر محمدؐ ان ہی کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ قرآن مجید میں ایک واقعہ درج ہے کہ کس طرح خدا نے ابراہیمؑ کو ان کے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دے کر آزمایا۔ اور کس طرح ابراہیمؑ

اس آزمائش میں کامیاب اُسے اور ان کی یہ قربانی بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی۔ اور ان کے فرزند کو بچا لیا گیا۔ اسی لئے قربانی کی تہنیت سنت پر ہوتی ہے۔ اس پر نہیں کہ کس چیز کی قربانی دی گئی ہے۔

ما قبل از تاریخ کعبہ میں یمن سوسے زائد بت تھے اور تجارت کا ایک مرکز ہونے کی وجہ سے وہاں ہر سال ایک میل لگتا تھا۔ محمدؐ کی مدینے کو ہجرت کے بعد ہی کعبہ اسلامی دنیا کا قبل بن گیا اور ہر نماز میں اس کی جانب رخ کیا جانے لگا۔ فتح مکہ کے بعد اسے بتوں سے خالی کر دیا گیا۔ اور حج کا مرکز قرار پایا۔ وہی طریقہ آج بھی رائج ہے۔

اب حج ایک عظیم انسان نثانی بن گیا ہے اس سے ہمارا ذہن ابراہیمؑ کے اس خیال کی طرف جاتا ہے کہ پوری امت کے لئے ایک مرکز ہو اور خدا کا نام لیا جائے۔ ہر سال تاریخ اسلام ایک لمحے کے لئے سمٹ کر سی جاتی ہے اور مستقبل کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے اپنے آغاز کی جانب ایک نظر کرتی ہے اور ماضی سے اپنا اتحاد اور مضبوطی لگتی ہے۔ ان ہی رسوم کی بنا پر ہم میں قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص

کے لئے پوری دنیا اپنے تمام اختلافات کو بھول کر اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو جاتی ہے۔ خدا کو اس طرح حاضر و ناظر جاننے کا جذبہ یقیناً بہت مضبوط اور پرانا لیکن پھر بھی تازہ تجربہ ہے!

عید کا نماز اور قربانی سے گزرا ہوا روضہ پہلے ہوئے تمام مسلمان حج کی روح کو محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح یہ حج پوری امت کو ایک مرکز پر متحد کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر مسلم تہواروں میں اسی عید کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

عید الفطر :- عید الاضیٰ کے بعد عید الفطر کی اہمیت ہے اس عید کو رمضان کے روزے ختم کرنے کے بعد منایا جاتا ہے۔

علی الصبح سے غروب آفتاب تک کچھ بھی کھا یا پیا نہیں جاتا۔ تاکہ کان و منہ اور آنکھ کو بری چیزوں سے بچایا جاتا ہے شب میں مناجات اور نماز میں قرآن کا ایک حصہ پڑھا جاتا ہے اس طرح پورے مہینے میں قرآن ختم کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک انوسناک بات ہے کہ اب یہ صرف ایک رسم بن کر رہ گئی ہے اسی لئے امام بڑی تیزی سے تلاوت کرتا ہے جس سے مقدس کو برا سمجھ میں نہیں آتا۔ چینیے کے آخری دنوں کو خاص طور پر مقدس سمجھا جاتا ہے اور کچھ مسلمان اس کا نایاں میٹھے

ہر دستر ہو ہی رمضان کو محمدؐ کے ماداد چچا زاد بھائی ہرکتہ طیف
اور شیعوں کے عقیدے کے مطابق پہلے امام حضرت علیؑ کو ایک خارجی
نے بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ تین روز بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس
روز شیعوں کی عید الفطر منائی جاتی ہے۔

پہلی شوال کو عید الفطر منائی جاتی ہے اسے روزے ختم
ہونے کے شکرانے میں منایا جاتا ہے۔ اس کی نماز عید الضحیٰ کی نماز ہی
کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن اس کی نماز ادا کرنے سے پہلے ہر مسلمان پر فرض
ہوتا ہے کہ وہ فطرہ ادا کرے۔ نئے کپڑے پہننا۔ دوستوں سے ملنا
کرنا۔ رمضان کے پہینے میں پوری سلام دینا ایک روحانی اور اخلاقی تہذیب
کے مرکز میں تبدیل ہر جاتی ہے۔ ہر مسلمان استقلال ثابت قدمی اور انسان
دوستی کا سبق پڑھتا ہے۔ اور عہد کرتا ہے کہ وہ پورا سال ایسی طرح
گزارے گا۔

محرم :- گو کہ یہ ایک تیرہ نہیں ہے لیکن عام طور پر اسے
ایک تیرہ ہی کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ یوم عاشورہ کو اب خاص
اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ جب کہ نہ محمدؐ کے زمانے میں اس کی کوئی اہمیت
نہیں تھی سوائے اس کے۔ اس دن روزہ رکھنا چاہیے۔ محمدؐ کے زمانے
میں یہ کسی بھی حیثیت سے منایا جاتا تھا۔ اب تو اس کے پورے معنی
بھی تبدیل ہو گئے ہیں اور ایک نئے واقعے نے پرانی بات کو تازہ کر دیا۔
یہ واقعہ محمدؐ کی وفات کے 5 سال بعد ظہور پذیر ہوا۔

محمدؐ کے بعد ان کے صحابیوں میں سے ماتر تیب ابو جہر
عمر، عثمان، علی کو خلیفہ مانا گیا۔ انھوں نے اسلام کو اسی شکل میں
رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور محمدؐ کے نقش قدم پر برابر چلتے رہے
تیسرے خلیفہ بھی زمانے میں کچھ شرارتیوں نے سراٹھایا۔ اور علیؑ کے
زمانے میں اتنے طاقت ور ملے ہو گئے کہ وہ نہ ان کی زبان ہی سے
دُورے اور نہ تلواریں!

معاویہ کے بعد خلافت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ بادشاہت نے
لی۔ علیؑ کے بڑے (بڑے حسن کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی رو سے
اپنے بیٹے یزید کو خلافت کے لئے نامزد کیا۔ یزید ایک نااہل شخص تھا
یزید کی جیسوی 40 عیسوی میں ظہور ہوا۔ علیؑ کے دوسرے بیٹے
حسن (حسن کو خبیہ طوطہ پر زہر دیا گیا تھا) نے بیعت نہیں کی۔ کرنے

مگر کچھ عیسائی مسلمان

کے لوگوں نے ان سے مدد چاہی۔ اور ان کی آواز پر انھوں نے لبیک
کہا۔ وہ اہل و عیال اور چند احباب کے ساتھ کوفہ روانہ ہوئے جب
وہ صحرائے عرب میں دوڑ کر کے عراق پہنچے تو معلوم ہوا کہ کوفے والوں نے
ان سے فداوی کی۔ وہ اپنے جھوٹے سے تعلق کے ہمراہ دریائے فرات
کے مغربی ساحل پر واقع کربلا نامی مقام پر مقیم ہو گئے۔ اس کی فوج نے
ان کا محاصرہ کر لیا۔ اور انھیں فرات کے پانی سے محروم کر دیا۔ جس سے
قافلے والوں کو بے حد تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ دشمنوں کے سردار کے
امانات پر حسین نے عین شرطیں رکھیں کہ انھیں مدینے جانے دیا جائے
یا سرحد پر مقیم ہونے دیا جائے یا یزید سے وفات کرنے دیا جائے
لیکن دشمنوں نے ایک ہی بات نہیں مانی۔ اور کہا کہ انھیں مجرموں کی
طرح یزید کے پاس لے جایا جائے گا۔ اور پھر اس کی دربار میں انھیں
ہوگا۔ ان خاموشی سے حسین نے یہ آخری التجا کی کہ ان کے بے یار و
مددگار اہل و عیال کو چھوڑ دیا جائے اور ان کی جان لے لی جائے
لیکن اس بات پر بھی ظالموں نے کان نہ دھرا۔ حسین نے اپنے ساتھیوں
سے کہا کہ اگر کوئی جانا چاہے تو چلا جائے۔ کوئی نہ گیا۔ آخری جنگ شروع
ہوئی ایک ایک کر کے حسین کے حامی شہید ہونے لگے۔ آخر میں پیغمبر کے
نواسے سمیت میں بخش رہ گئے۔ حسین بڑی بہادری اور جواں مردی
سے لڑے۔ لیکن آخر بے قوت ہو کر گر پڑے اور زخمی شیر پر پھیر دیے
اٹھ۔

جس (Gibbon) نے کہا تھا کہ سخت سے سخت دلی
دلہ آدمی کا انہر بھی کربلا کی دلازات کو بڑھ کر پریم ہو جاتی ہے اسے
اس لئے کم اہمیت نہ دی جانی چاہیے کہ یہ اسلام کا ایک تاریخی واقعہ ہے
یہ گہرے معنی اور لافانی قیمت کا حامل واقعہ ہے۔ یہ اصول کی فتح ہے
طاقت پر!

اس واقعے کی یاد مختلف طریقوں سے تازہ کی جاتی ہے۔
اسلام کے دو بڑے فرقے شیعہ اور سنی الگ الگ طریقے سے مناتے ہیں۔
ایک اس سے دلیری کا سبق لیتا ہے، دوسرا اس کے ظہور رخ کو اہمیت
دیتا ہے۔ شیعہ عام طور پر امام کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں جلوس بھی نکالا
جاتا ہے۔ جس میں کبھی کبھی ایک گھوڑا (حسین کے گھوڑے ذوالجناح کی یاد میں)
بھی ہوتا ہے۔ اجرت اور تعزے بھی ہوتے ہیں کبھی کبھی یہ تعزے کٹ

کے نظریے کافی اعلیٰ ہوتے ہیں اسے یا تو طالب یا دریا میں بہا دیا جاتا ہے یا کر بلانہ می مقام میں جو اسی مقصد کے لئے ہوتا ہے، دفن دیا جاتا ہے۔ کر بلانہ می مقام پر ہی حسین نے جنگ کی جتنی جلوس کے شرکاء نکلے پیراؤں کے سرورشیہ خالی کھتے ہیں اور سینہ کو پی کرتے ہیں، اور کبھی کبھی خد کو زخمی بھی کر لیتے ہیں۔ اس موقع پر یہ ذکر کرنا ہے۔ ہر گاہ کہ ارد کے یہ سرشیہ دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں اپنی نوعیت کی بالکل مختلف تخلیق ہیں۔

یہ بات فرٹ کرنے کے قابل ہے کہ جہاں مسلم فرنے کا ایک حصہ تیزی کو بہت اور باہن رنگا ہوا دینا ہے یہاں تک کہ بت پرستی کی مثل انسانا ہے وہیں بہت سے ہندو قورسہ کو بڑی عقیدت سے رکھتے ہیں۔ آزادی سے قبل گوالیار ایسٹ میں سرشا راجا کی سرپرستی میں تیزی نکالا جاتا تھا اور اس کے تمام اخراجات ریاست برداشت کرتی تھی۔

سراج کا مطلب ہے پہنچنا۔ جب کہ شب معراج :- ۶ دین شب کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تشریف لے گئے تھے۔ حالت سفر کے متعلق مختلف خیال ہیں کچھ خیال ہے کہ یہ آسانی سفر تھا اور کچھ سے روحانی سفر قرار دیتے ہیں عام طور پر یہی نظریہ ہے کہ انھوں نے جہان طوری پر بیت المقدس اور پھر وہاں سے ساتوں آسمانوں کا سفر کیا تھا۔

رجب کی ۶ دین تاریخ کو مسلمان روزہ رکھتے ہیں اور سنت نمازیں ادا کرتے ہیں۔ شب برکت۔ شبان کی ہفتہ رات کو نماز پانچ دالہ ایک عجیب تہوار ہے۔ مفسرین نے حدیث ہے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے اسے لیلۃ القدر کہتے ہیں۔ کچھ خیال ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ پھر بھی کچھ کا خیال ہے کہ یہ بزار حبیب اللہ سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس رات فرشتے زمین پر اترتے ہیں۔ اور ہر شخص کے لئے آئندہ سال کے لئے چیزوں کا حصہ مقرر کر دیتے ہیں۔ مسلمان زندوں اور مردوں کے لئے نمازیں پڑھتے ہیں۔ قبروں کی زیارت کرتے ہیں اور مومن کا مدد کو دینا چاہتے ہیں کے لئے خیر خیرات کرتے ہیں۔ طرہ بہن یا جانکے اور دوسروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی سالانہ سیر

معلوم نہیں کس طرح اس شب کا قتل جنگ احد سے کر دیا گیا ہے۔ جب کہ جنگ احد رمضان کے مہینے میں لڑی گئی تھی۔ جنگ احد میں ہی حضور کے چچا امیر حمزہ شہید ہوئے تھے اور خود حضور کے دو دانت شہید ہوئے تھے۔ بچے آتش بازی پھوڑتے ہیں۔ کچھ لوگ آپس میں آتش بازی کا مقابلہ کرتے ہیں۔

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے بارہویں امام مہدی کی ولادت اکی روز سن ۸۵۳ء میں ہوئی تھی۔

عید میلاد :- ان حضرت کی پیدائش کی ٹھیک تاریخ تو مسلم نہیں۔ حالانکہ بہت سی تاریخیں کہی جاتی ہیں لیکن اکثریت کی رائے دو تاریخ پر متفق ہے ۱۲ دین اور ۱۷ دین ربیع الاول۔ سنی ۱۲ دین ربیع الاول کو پیغمبر کی تاریخ پیدائش مانتے ہیں اور ہفتے بھر منہ کرتے ہیں۔ جب کہ شیعہ ۱۷ دین تاریخ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مجلس میلاد منفقہ کا جائز ہے جس میں حضور کے حالات زندگی بیان کئے جاتے ہیں۔ کچھ حقیقی، کچھ خیالی۔ مصلح ان مجلسوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ جگہوں پر جلوس بھی نکالے جاتے ہیں۔

تہواروں کے متعلق یہ مفسرین کامل عرس و زیارت گاہیں :- رہے گا۔ اگر اس میں درگاہوں اور زیارت گاہوں پر منعقد ہونے والے سالانہ عرس کا ذکر کیا جائے۔ عام طور پر عرس کسی بزرگ کی تاریخ وفات کو منعقد کیا جاتا ہے۔ ہندو حضرات بھی اس کے بڑے منعقد کرتے ہیں اور بڑے اعتبار سے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔

عرس کے موقع پر مزار پر تلوات قرآن کی جاتی ہے اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ درگاہ پر سماع یا تواری ہوتی ہے۔ چستی اور ہر دروہ حضرات کو موسیقی سے بہت دل چسپی تھی۔ اس لئے ان کی درگاہوں پر تواری کا خاص طور پر انتظام ہوتا ہے۔ نقشبندی بزرگ حضرات موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے عرس میں موسیقی کا ہر گرام نہیں ہوتا۔

حضرت معین الدین چشتیؒ ۱۱۵۵ء میں پرتھوی راج کے

عید میں اجیر آئے۔ ۱۲۵۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا عرس ۵ تہ ۱۴ دین رجب تک منعقد ہوتا ہے۔ ہندوستان میں منعقد ہونے والے تمام عرسوں میں سب سے بڑا عرس اجیری کا ہوتا ہے۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ اجیر کے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ بابا خسر بد گنج شکر (وفات ۱۲۵۵ء) کا مقبرہ پاکستان پنجاب میں واقع ہے۔ ان کا عرس ۵ سے ۶ محرم تک منعقد ہوتا ہے۔ ان کی درگاہ میں ہر شق دروازہ نامی ایک دروازہ ہے۔ ہر ایسا عقیدہ ہے کہ جو اس دروازے سے گزرے گا وہ ضرور بہشت میں داخل ہوگا۔

بابا کے دو نائب تھے۔ ولی کے حضرت نظام الدین (وفات ۱۲۵۵ء) جو بہت مشہور اور ہر دلعزیز تھے اور پیران کلیر کے مخدوم علی احمد صاحب (۱۲۵۰ء) جو بہت مزاح و مہفکہ دست تھے۔ ۱۴ دین ربیع الاول کو نظام الدین

ادلیا کا عرس منعقد ہوتا ہے، جب کہ سہارن پور کے نزدیک پیران کلیر نامی مقام پر ۲ سے ۳ دین ربیع الاول تک مخدوم کا عرس منعقد ہوتا ہے۔ مخدوم ادلیا کو شمال ہند میں بڑی عقیدت کا نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

غوث اعظم محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی (۱۱۵۵ء - ۱۲۰۶ء) کو سنی مسلمان سب سے بڑا ادلیا، مانتے ہیں حالانکہ انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر کبھی قدم نہیں رکھا۔ پھر بھی بہت سے گھروں میں گیارہویں ربیع الثانی کو ان کے نام کی نیب زک جاتی ہے۔ ان کا عرس اسی دن منعقد ہوتا ہے۔ اس دن گویا میوں شریف بھی کہتے ہیں۔ کئی جگہ جلوس بھی نکالا جاتا ہے جلوس میں پنجبہ شریف لے جایا جاتا ہے۔ سٹائٹوں پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اور پھر اسے دوسروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (ترجمہ: صادق علی)

شکر یہ

انگریز جب اس ملک میں آیا ہے، سکرے کا لفظ بے معنی ہو گیا ہے۔ انگریز بات بات میں "تھینک یو" (Thank you) کہہ دیتا ہے۔ تو کر پانی کا گلاس پیش کرے تو "تھینکس" (Thanks) گلاس واپس ہر تو "تھینکس"، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کسی شین سے نکل رہا ہے، جس میں دلی جذبات کو کوئی دخل نہیں پہلے سکرے کا لفظ ہادی زبان میں نہیں تھا۔ پھیلی صدی کے آخر میں انگریزی کے اثر سے ہماری زبان میں آیا۔ جیڈی ٹیکس جس نے VERDICTON INDIA لکھی ہے، ہندوستان کی سیاحت کے دوران میں جگہ جگہ پوچتا تھا کہ "تھینکس" کے لئے تمہارے یہاں کیا لفظ ہے؟ کسی نے جواب دیا۔ "عنایت"۔ کسی نے کہا۔ "مہربانی"۔ پرنس اعظم جہا سے جب پوچھا تو انھوں نے بتایا۔ "شکر یہ"۔ دوسرے لوگوں نے تائید کی۔ اس نے کہا، "یہ بڑا اچھا لفظ ہے۔ غالباً شکر پر شکر یا (SUGAR) سے نکلا ہے، جیسی اس لفظ میں بڑی شگفتگی ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق

ہنگ کا ہندوستانی نسلان نمبر

ہندوستانی موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ

نوبت بنانے کا رواج مسلمانوں ہی کا ایجاد کردہ ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم پڑتا ہے کہ سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی (۱۳۱۶ء - ۱۳۹۹ء) کے زمانے میں ہندوستانی موسیقی میں مسلمانوں نے تبدیلی کرنے کی پہلی کوشش کی۔ اسی کے دور میں فرخ دکن کے بعد اس کے دربار میں بہت سے ہندو گویوں اور سنگیت کاروں نے شاہ کی سرپرستی حاصل کی۔

علاؤ الدین ہی کے دربار میں امیر خسرو بھی تھے، جنھوں نے دہلی کے لگانا مسات بادشاہوں کا نمانہ دیکھا تھا۔ اس سلسلے میں ایک قصہ عام طور پر مشہور ہے کہ قلن گانہ کے ایک سنگیت کار گوبال نالکے اُن کو یہ چیلنج دیا کہ وہ بھرے دربار میں ان کا مقابلہ کریں۔ گوبال نالک کی باگی کو اُٹھانے کے لئے اُن کے دو پیارے شاگرد اپنی خدمت پیش کرتے تھے۔ امیر خسرو کو فقدان ہی یہ چیلنج قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جب گوبال نالک ریاض کرتے وہ اُن کے تحت کے سینچے ٹھپکے ساتھ تنک تک وہ اسی طرح اپنے دوش گودوں صفا اور نیاز کے ساتھ ٹھپکے سنتے رہے۔ اُنھوں دن اُن کے پاس آئے اور اُنھوں نے بغیر کسی غلطی کے گوبال نالک ہی کے انداز میں گاکر بتایا۔ وہ گوبال نالک کے گیت کے لہروں کا جواب اپنے قول سے دیتے اور اُسی تانہ اور تال کے ساتھ اس کے بعد اُنھوں نے اپنا فی جیش کیا اور ہر خاص و عام سے داد و مول کی۔ انھیں ہندوستانی سنگیت پر اتنا مجبور حاصل ہو چکا تھا کہ کم از کم گیارہ راگ اُن ہی کے ایجاد کردہ ہیں جن میں کئی راگ آج بھی نالک کے ناموں سے مشہور ہیں۔ امیر خسرو کے ایجاد کردہ راگ میں ساز گری ہی، 'مین'، عشاق، معاف، غاتم، غار، زلف، فرخانہ، سر بورد، صنم اور دوست خاص طور پر مشہور ہیں۔ انھوں نے دھوک کی جگہ بکھراج کا استعمال کیا اور نئے راگ ذمال ایجاد کئے جنکی خسرو سہادی، نردوست، سپوان، جاٹ، پستو، قوال، جلدیلا، جھرا، پانی ناظر

میں جس علم موسیقی کی توانائی کو ٹھیک طور سے جان نہیں کر سکتا یہ نکتہ بھی کبھی اُس بات کا اظہار کر دینا ہے جس بات کو ان کرنے کے لئے زبان قاصر ہوتی ہے جس بات کو کہنے کے لئے زبان کو الفاظ نہیں ملتے وہ بات بات کی حرکات سے ساز و سامان موسیقی اور کرتے ہیں۔ ان باتوں کی حرکات سے آدمی خوش بھی ہوتا ہے اور غم گین بھی۔ اس موسیقی سے ساری دنیا کو فوج کی جاسکتا ہے۔" ابو الفضل، آئین اکبری، ص ۶۹

جب ہندوستان میں مسلمان تاریخ کی حیثیت سے آئے تو اپنے ساتھ جو ساز لائے وہ یہاں کے قدیم سازوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ اسی طرح راگوں میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ غلن، شہرہ، خالک، ریم، کلی ہی کی دوسری شکل تھی۔ اسی طرح عراقی بھیرادن کی، دلہا سرار، پوہیا ادمالہ کی، مغلوب، جاس کی، قندھاری، عراقی مالکوس اور پوہیا کی، خود ذلت، پنجم کی۔ یہ صرف ایک ثبوت ہے کہ ہندی طرز پر آنے والے مسلمان اور ہندوستان میں کئی چیزیں مشترک تھیں اس کے ساتھ ساتھ کچھ فرق بھی تھے۔ مسلمانوں میں موسیقی کو روحانی اہمیت نہ تھی نہیں تھی، نہ اُس کے استعمال میں، نہ اُس کی بنیاد میں اور نہ اس کے اختیار میں۔ مسلمانوں کے نزدیک موسیقی صرف خوش رہنے کا ایک ذریعہ تھی۔ وہ ہندوستانیوں کی طرح اس کا سلسلہ نہ تو عبادت سے جوڑتے تھے اور نہ اس میں اس کا استعمال ہی کرتے تھے۔ مسلمان ہندوستان میں ایرانی، عربی سازوں کے ساتھ آئے تھے، خف، باب، چنگ، طنبورا، شہرود اس کی بدلا ہوئی شکل ہے (پروہ) تان، مودائے، دت، نقارہ، ڈھول۔ یہاں کے ساز تھے دینا، سلندہ (اسی کی بدلا ہوئی شکل ہے سارنگی، گم، ملی بانسری۔ مسلمانوں نے اپنے قیام کے دوران ہی بعد یہاں کے سنگیت میں شامل ہو گئے۔ نئے ساز بنائے۔ کچھ تہذیبیاں کیں، نئے راگ بنائے۔ بادشاہ و مشرق کے گوروں کے مدد و ازادوں پر بھی و شام

چند ایک کا خیال ہے کہ سنا بھی انھیں سنا اچھا دکھ رہا ہے۔ انھوں نے ہندستان عرب۔ ایران کی ملی سنیٹ کا راج بویا جس نے ہندستان کی کلاسیکی سنگیت سے برابر کا مقابلہ کیا۔

ہندستانی سنگیت کے لئے پھر ہوں صدی کافی مبارک ثابت ہوئی یہ تجدید بادشاہوں کی سرپرستی اور نئے راگوں کا نتیجہ تھی۔ ابتدا میں گوالیار کے راجا مان سنگھ اور اخیر میں بھکتی تحریک نے کافی مدد کی۔

مسلم بادشاہوں نے اس بات سے بالکل نا پرور ہو کر کہ اس بارے میں مذہب کے محسوس کیا فرماتے ہیں موسیقی کی کہیں کر اور بھر پور سرپرستی کی۔ اور ان ہی کی سرپرستی کی وجہ سے رن غلام سنتوں اور فن کاروں میں

مقبول عام ہو گیا۔ کشمیر کا سلطان ذین العابدین (1467-1476) تو اس فن کا اس حد تک دیوانہ تھا کہ اس کے رباب اور میں سونے کے بنوائے کا حکم دیا اُس کے دور میں شاعر و سنگیت کار وادی بھٹ نے سنگیت پر مامک نامی

کتاب لکھی تھی۔ وہ بھی سنگیت کا دیوانہ مشہور تھا۔ اسی لئے گوالیار کے راجہ سین نے سنگیت کے متعلق کئی کتابیں اُسے لکھیں۔ اُس کی وفات کے بعد اس کا شیا کرت سنگھ بھی وادی بھٹ کو یوں ہی نواز مارا۔ جو پور کا آخری بادشاہ

حسین شاہ شرفی اس فن میں طاق تھا۔ عام خیال ہے کہ سنگیت میں خیال رکھ کر اُس کی ایجاد ہے۔ جسے شاہ ایک ذہین موجد تھا اس نے خود کئی راگ ایجاد

کئے ایک مورچ یوں راقم ہے: "وہ بے مثال فن کار تھا اور ہندوستان میں چیار طرٹ اس کی دھوم مچی تھی پوئے ہندستان میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔"

اس کی ایجادات میں بارہ شیشام بھی شامل ہیں دگر شیشام، ملبا، شیشام، بھوپال شیشام وغیرہ، اس کے علاوہ چار ٹوڈی میں سے جو ن بدی کا جینی ٹوڈی بہت مشہور ہے۔ چون بدی نامی اسادی اور مشہور حسینی کا را بھی اسی کی

ایجاد کردہ ہیں۔ سنگیت کے ایک محقق کا خیال ہے کہ نارسا زانگو لاہی سے انھوں نے ہندستانی سنگیت میں 'جنگلا' نامی راگ کا تعارف کروایا۔

لودی خاندان مان کے دوسرے شہنشاہ سلطان سکندر ٹوڈی 1489-1500 یوں نویت صدی آدمی تھا اور مذہبی اصولوں سے ایک راج بھی ہٹنا لگا ہوا تھا۔ لیکن وہ موسیقی کے سلسلے میں تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرنا۔ اُس کے دربار میں دو عظیم سنگیت کار تھے۔ رُوح اللہ اور عبد اللہ رسول۔ حرموں رات میں یہ محفل جیتی۔ سلطان کے چار

خاندانوں میں سے ایک قانون بجانا دوسرا چنگ، تیسرا لہورا اور چوتھا جین ان کے

علاوہ دس شہنائی نواز تھے۔ سکندر لودی کی پسندیدہ راگ تھیں:۔ "مالی گسا" کلیان کا نرا راجے بعد میں اکبر نے دوبار نام دیا اور حسینی کا نرا۔

دوسری جھوٹی جھون ریاستیں بھی موسیقی کی سرپرستی میں پیچھے نہیں رہیں۔ مایہ کے آخری راجا باز پساد اور اُس کی بیوی سوبھتی دونوں ہی سنگیت کے رسیاتھے علاوہ

بیات میں اب بھی وہاں کی قدیم سوبھتی کی دھنیں گاتی ہیں۔

گجرات کا بادشاہ ہسادشاہ (1537-1538) بھی موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اُس کے دربار میں ناٹک، بخشو تھا، جو مہاراج مان سنگھ کے زمانے میں مشہور تھا۔ بخشو

بہت اچھی آواز کا مالک تھا۔ وہ ایک وقت دو آوازوں میں گاتا تھا۔ اچھا باد میں اپنے قیام کے دوران اُس نے ہسادی ٹوڈی نامی کا نرا اور ناٹکی کلیان نامی راگ ایجاد کیا۔ مراد سکندر ہی میں مدح ہے کہ ناٹک، جو بھی ہسادشاہ کے

دربار میں تھا اور جب یہاں نے گجرات کو فتح کرنے کے بعد قتل عام کا حکم دیا تو اُس نے فارسی میں ایک غزل سنائی دہ

کے نہ ماند کہ اورا بہ تیغ ناز کشی جو مگر تو زخہ کنی عالمے و باز کشی اور اس سوز سے گالی کہ ہمایوں نے قتل عام کو روکنے کا حکم دیا۔ اسی طرح

بہادر شاہ کے دربار میں ناٹک گوالی نامی سنگیت کا بھی تھا۔ یہ ناٹک جو 'کاشا گرد تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود سوم دقت نشین 1537ء کے زلزلے میں غلام میں موسیقی کا شوق اس قدر بڑھ چکا تھا کہ ہر گھر سے موسیقی کی آواز آتی

ہوئی سنائی دیتی تھی۔

گوالیار کے راجاؤں نے بھی موسیقی کے ذوق کے لئے بہت کچھ کام کئے۔ خاص طور پر راجا مان سنگھ تون دلہ (1517-1546) نے غازی اور ہندوستانی راگ پس میں اس طرح غلط ملط پر گئے تھے کہ ان کی اصل منہم ہی نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے اُس نے اس وقت کے مانے ہوئے سنگیت کاروں کو جمع کیا

جس میں تھکانیکہ ناٹک، بخشو، ناٹک، بھانو اور ناٹک پانڈے بھی شامل تھے۔ ادا خد راجا کے دوبار سنگیت کا زلی ناٹک کرن، ناٹک، محمود، ناٹک، لوہنگ بھی شریک تھے۔ ان لوگوں نے سنگیت کے متعلق معلومات اکٹھا کیں اور اس کا نام رکھا 'مان کو تول' (مان کی جستجو)۔ موجودہ دھرب راگ کا ترتیب مان سنگھ ہی ہے

مان سنگھ کے اس کارندے سے سنگیت کی دنیا میں گوالیار کو ایک خاص مقام حاصل ہو گیا ہے!

ہندستانی سنگیت کی ترقی میں چند صدیوں میں صدیوں صدیوں کے چشتیوں اور سنی

امیر خسرو کے شاگرد محمد اور نیر ساز حضرت نظام الدین کی خانقاہ میں قوالی گانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں گانے والی دوسرے ہی محلہ دلی کی گلیوں میں سُنی جاتی تھی۔ اسی طرح ہر بائی دیوار کے رانا کتھہ کے بیٹے راجہ بھوج کی پوتی بابا رام داس، سورداس، سواہی پری داس نے اپنی جھلکی تحریک کے پرچار کے لئے سنگیت کا بہت سہارا دیا۔

مغلوں کی دلی چسپی نے موسیقی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ نہ صرف نئے لگنے بلکہ وسط ایشیا کی نئی تہذیب بھی لائے۔ غزل سلطنت کا بانی بابر نہ صرف خود ایک اچھا موسیقار تھا بلکہ فن کا ایک اچھا نقاد بھی تھا۔ بابر نے اپنی تعصیف میں ایران ہی کے موسیقاروں کا ذکر کیا ہے۔ شاید اس لئے کہ ہندوستان میں آنے کے بعد اُسے جنگ سے کم ہی فرصت ملی۔ ہالوں کو کوئی سے کوئی خاص شخص نہیں تھا۔ اکبر کی تخت نشینی کے موقع پر دھرم پد کی موجودگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ہندوستان آنے کے بعد غزل سنگیت کی طرف سے بالکل ہی غافل نہیں ہو گئے تھے۔

خیر شاہ سوری کے جانشین اسلام شاہ سوری نے موسیقی کی بہت سرپرستی کی تھی، اُس کے دربار میں مبارک خان بابا رام داس اور ہارپاثر جیسے سنگیت کار تھے جس میں آخر ذکر بعد میں اکبر کی سرپرستی میں آ گئے۔ جس پر اُسے اُڑیسہ کے راجا مکھن دیو کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ سکندر نے بھی سنگیت کا صیانت کیا تھا اُس نے نان سین کو اپنے دربار میں آنے کی پیشکش کی تھی جو اُس وقت راجہ چنڈ بھٹ دیوار کے دربار میں ملازم تھا۔ عادل شاہ نے دم نے ہندی میں سنگیت کے متعلق ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔

اکبر کی عظیم سرپرستی نے موسیقی کی تالیف میں اس کے بعد کو ایک سنگ میل بنادیا ہے۔ ابوالفضل نے اڑتیس کے قریب سنگیت کاروں اور سازندوں کے نام دیئے ہیں۔ کئی سنگیت کار کشمیر، تبریز، گوالیار اور مشہد سے آئے تھے۔ ابوالفضل یوں رقم ہے: اعلیٰ حضرت محمد بھی موسیقی کے شوقین تھے اور موسیقی کے شوقین حضرات کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ دربار میں ہندی، ایرانی، تودانی اور کشمیری سنگیت کار اور سازندے موجود تھے۔ نان سین کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے کہ گزشتہ دہائیوں میں اُس جیسا سنگیت کار پیدا ہی نہیں ہوا۔ راجا رام چند نے میت دل برداشتہ ہو کر نان سین کو اکبر کے پاس جانے کی اجازت دی تھی۔ اور پہلی ہی نشست میں اکبر نے دولاکھ بیچے نقد انعام دے دیئے تھے۔ اکبر کھڑا رہا تھا۔ درباری ہم اُس کا دیا ہوا ہے۔ برہنہ بن کے

سواہی پری داس کے شاگردان میں نے اکبر کی خدمت میں آنے کے بعد شاہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ نان سین نے یہاں کی مہاراجاں کی سازگاری اور میاں کی لڑکی ایک لڑکے کا سبکی سنگیت میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ متحدہ تہذیبیت ختم ہونے کے بعد بابا رام داس نے ہرم خان کی سرپرستی حاصل کر لی تھی، وہ دھرم پد کے ماہر تھے۔ دربار میں نان سین کے بعد اُن ہی کا رتبہ تھا۔ مالوے کے بادشاہ بازید کو اکبر کی خدمت میں آنے کے بعد دو ہزار روپیہ کے منصب سے نوازا گیا، پورے ہندوستان میں اُن کا مقابلہ نہ تھا۔ سچان خاں، سیرا گمان خاں، پتھر خاں، دل سچان خاں، سرود خاں، میاں لال، تن ترنگ خاں، دل تان سین، ٹالک گرجو، دگجو کی مہاراجا موجد، پرنسڈل خاں، شہاب خاں بن کر تھے ان کے علاوہ باقی لوگ ہندوستانی اسکول میں تھے۔ فیضی محمد خاں، دھڑی، ڈاؤد خاں، دھاری، ملا اسحاق، دھاری، رحمت اللہ خاں، آگرے کے رنگ سین، بابا رام داس کے اندھے بیٹے محمد داس، پدی سین خاں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی اسکول کے شاگرد تھے شہد کے استاد دوست، نورمان کے شیخ دادلی، شہد کے میر سید علی، حرث کے سیرام علی، احمد استاد دیوسف، شہد کے استاد ہاشم محمد حسین، استاد محمد امین، ہاشم بیگ اور استاد شاہ محمد۔

جہاں گیر بھی موسیقی کا علاوہ تھا۔ اُس نے اپنی تعصیف میں میاں لال کا تذکرہ کیا ہے۔ حفیظ نادر علی کو جہاں گیر اکثر و بیشتر تحفے کاائف سے نوازتا تھا۔ نان سین کا انتقال جہاں گیر کے بعد کے ۳۰ دس سال میں ہوا اور اُسکی جگہ اُس کے بیٹے جاس خاں کو ملی جو بلاس خاں لڑکی کا موجد تھا۔

شاہ جہاں کا بعد کافی پُر امن رہا۔ احمد نے دوسرے فنون کا فروغ موسیقی کی طرف بھی کافی توجہ دی۔ شاہ جہاں کے دربار کے ایک سنگیت کار فقیر اللہ (صیغہ خاں) نے رگ دہن میں ۳۰ سے زائد سنگیت کاروں اور سازندوں کو استعمال کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ۱۰۰۰ سے بھی عظیم تھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں گانے کے فن کے ساتھ ساتھ الفاظ اور زبان پر بھی کافی زور دیا جانے لگا۔ ہندوستانی اور ایرانی سنگیت سے پہلی پہلی طرح کی تھی اور ہندوستانی سنگیت کے نام سے پکاری جانے لگی۔ اکبر کے بعد میں ایران کے آدھے میں فن کار تھے جب کہ شاہ جہاں کے بعد میں صرف دکن کار ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کے بعد میں ہندوستانی سنگیت اپنے عروج پر تھی۔ اسی زمانے میں دھرم پد انجیل کو تلفظ گردانا گیا۔

دھرم میں بھگوان کی رشتہ کا محل بیان کیا جانے لگا۔ اس طرح اس کا تعلق ہندو سے ہو گیا۔

شاہ جہاں کے عہد میں برہما کے شیخ پادوالہی بھی گز رہے ہیں۔ انھوں نے پچاس سال کی عمر تک ریاضت کی۔ یہ امرت بین بھانے میں وجاہ تھے۔ انھوں نے خیال نالی ایک ساز ایجاد کیا تھا۔ ان کے شاگرد شیر محمد اور بہاؤ دو مشہور سنگیت کار اور سازندے تھے۔ شاہ جہاں کے دربار میں سب سے زیادہ قابل تھے۔ آل خان جنھیں نفی کا مسند رکھا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ دھرم کے ماننے والے استاد تھے۔ وہ تان سنی کے بیٹے، بھوس خاں کے شاگرد اور داماد تھے۔ شاہ جہاں نے انھیں کئی خطبات اور اخلاعات و اکرامات سے نوازا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے 'غش محل خاں' کو نفی کا مسند کا خطاب ملا۔ بانیہ خاں 'میر حسین' نے ان کے بیٹے سہیل سین دھرم کے ماہر تھے۔ شاہ جہاں نے شجاع کے ساتھ سردی خاں اور گل خان کو بنگال روانہ کیا تھا۔ گجراتی سنگیت کار نے قوال گانے کا ایک شکل ہی آگے انداز ایجاد کیا تھا۔

وقت نشینی کے دس سال بعد تک اندک زیب ایک عام بادشاہ ہی کی طرح تھا۔ اُسے بھی تمام چیزوں کا شوق تھا۔ خاص طور پر موسیقی کا۔ اس کی وقت نشینی کے عرصہ میں نصر آباد سے موسیقار اور سازندے شریک تھے۔ تخت نشینی کے جشن میں بھی موسیقی اور نازک کا بھرپور گرم شامل تھا۔ اسے نہ صرف موسیقی کا شغف تھا بلکہ وہ خود بھی موسیقی کا ماہر تھا۔ لیکن امام شافعی کی تعلیم کی وجہ سے سلف شاہ سے وہ ان تمام چیزوں سے پرہیز کرنے لگا تھا اگر کوئی موسیقار موسیقی سے توبہ کر لیتا تو وہ اسے خلعت سے نوازا۔ زمین داری سے سرفراز کرتا۔ جہننا بیت کی سرپرستی میں چلنے والی موسیقی کے لئے لہنگے سیاہ کا دھڑ حکومت بہت بڑا زمانہ ثابت ہوا۔ بادشاہ کے دربار میں منع ہو گئے۔ انھیں موسیقی کا جائزہ اٹھ گیا۔ موسیقاروں کو دھرم اور مذکورہ مذہب پڑ گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نکلتے الاسرار نامی کتب کی کئی جلدیں موجود ہیں جو مولا محمد (وفات 1689ء) کے فرزند میر احمد کی تصنیف کردہ ہیں۔

عادل کا 18 ویں صدی کی موسیقی کی تاریخ میں سہرا زمانہ مانا جاتا ہے، لیکن منہ دمانے کے موسیقاروں کا نام عام طور پر معلوم نہیں ہے۔ شاہ جہاں کے زمانے ہی میں نہ صرف فیض آباد کی احمدی اور فیض بخش خاں کو درج نصیب ہوئی بلکہ فیض موسیقی نے بھی ترن کی کئی مساز لے کر بنگال، بھارت، بھارت، بھارت

کے ہندوستان سے اخراج کی وجہ سے وہاں سے موسیقی کی مدد و مدد حاصل کر بند ہو گئی لیکن ہندوستانی سنگیت بھی میں کئی نئی راہیں نکالی گئیں۔ اور اس کی متحرک تھی راجاؤں اور نوابوں کی وہ دل چسپی، بھانگہ بڑی آمد کی وجہ سے تھی کہ اب انھیں کسی قسم کی فکر نہیں تھی، اس لئے جس طرح وہ کبھی جگ یا دوسرے کام میں دل چسپی لیتے تھے، موسیقی میں دل چسپی لینے لگے۔

برہادر شاہ (12-1707ء) نے تو شاہو بے خبر کا خطاب ہی حاصل کر لیا تھا 'وہ دن بھر سوتا اور رات بھر جاگتا۔ یہ موسیقی کا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں عظیم سنگیت کاروں کا بیگ تھا۔ بھارت تھا۔ نعت خاں طہر زلیٰ گلے بھارت خیال اور ترانے کا ماہر تھا۔ نعت خاں نے نیازی قوال اور لالہ بنگالی کی مدد سے بے شمار گیتوں کی دھنیں بنائی تھیں۔ اُس کے پورے چاروں دربار شاہ اور پھر شاہ (48-1719ء) کے دربار میں بھی شامل رہا، اُس کا تعلق تھا سارا رنگ۔ تاج کے مشہور خیال کا، تقریباً 70ء کی دھنیں یا تو شاہ (دیس اور بنگال) نے ترتیب دی ہیں یا نعت خاں نے، جس کے علاوہ دوسرے موسیقار تھے شیخ حسین الدین (شاہ جہاں کے دربار کے موسیقار شیر محمد کے پوتے)، اور فرزند خاں نعت خاں کے شاگرد و داماد)۔ مگر فرزند خاں نے تو اپنے استاد سے بھی زیادہ مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ دھرم کے خیال اور ترانے کا ماہر تھا۔ استاد تھا۔ نعت خاں کے خاتمے کے بعد دہلی سیاست کا مرکز بن کر رہ گیا۔ اس لئے فن کاروں اور ریستاروں نے یا تو خلعت یا ستون میں پہن لیا یا پھر مریشا حکمرانوں کی سرپرستی میں۔ آخر ذمہ سنگیت کی اتنی ذہن پرستی کی کہ اُس کے نتیجے میں آج شمالی ہندوستانی شہری ہندو سے زیادہ سنگیت کا ذوق اسی علاقے میں ہے۔

موسیقی کو بھی اسی طرح اپنا دھار میں طرح مخلوں سے اُن کا پہننے پہنے کا ڈھنگ دوسرے طور طریقے، لباس، حالت اور حکمرانی کا طریقہ اپنا لیا تھا۔ 1857ء تک لکھنؤ نواب وزیر کی سرپرستی میں رہا۔ اس وقت رام پور شمالی ہند میں موسیقی کا مرکز بنا رہا۔ آصف الدولہ کے عہد میں پٹنہ کے محمد خاں نے 1913ء میں نجات مصفی نامی کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں ہندوستانی رنگ اور راگینوں کا درجہ بندی کی گئی ہے۔ اس سے شمالی و جزیری ہند کے دربارہاں آسائے انیساز کیا جاسکتا ہے۔ اس سے مختلف راگوں کی اصیبت کے متعلق برسوں چرانے سہولت بھی ختم ہو گئے۔

مخلوں کے دور کے خاتمے ہی سے وہ مشہور اند ختم ہو گیا۔ اور خیال اور دھرم جیسے راگوں کے کہنے لگے بھی کہہ گئے۔ اس لئے لکھنؤ میں ٹھہری اور پٹنہ جی

دعویٰ بنائی گئیں۔ ٹھہری کو پریم رنگ کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں محبوب اور محبوبہ کے جذبات کا بیان ہوتا ہے۔ ثناء کا موجد تھا سہری جس نے اصل میں ادنیوں کے قدحوں کی آواز سے یہ دھن تیار کی تھی۔ یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ ٹھہری اور ثناء محض دھنیں ہیں اور ان خاص احوالوں کی پابند نہیں ہیں جس طرح دھریہ اور خیال۔ اور دھریہ کے آخری نواب دراج علی شاہ (1857ء) کو نہ صرف موسیقی کا شوق تھا، بلکہ اُسے اس میں ہمارے بھی حاصل تھے۔ دراج علی شاہ نے موسیقی کو مقبول عام کر دیا۔ اور لکھنؤ کو ہندوستان کا دینا بنادیا تھا، ناجوٹائی تصنیف کردہ کتاب میں اُس نے اپنے دربار میں گائے جانے والے خیال اور دھریہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۹ ویں صدی میں موسیقی کے فن کو ایک بہت بڑا چمکا پیچھا، نہ صرف متعل دھریہ کے خاتمے سے، بلکہ پہلی نالام جگ آزادی کے بعد انگریزوں کے قیام اور ان کی لاپرواہی سے بھی۔ موسیقاروں کی علم موسیقی کو دھریہ سے بچا کر رکھنے کی عادت کے علاوہ موسیقی کی کسی خاص ترتیب کی غیر حاضری نے موسیقی کو بہت نقصان پہنچایا۔ میرا خیال ہے کہ اس جانب سب سے پہلے کلکتے کے ہمارے جاسر سندر ناتھ شیکور نے توجہ کی جس سے پُرتے بھوئے ہرے راگوں نے پُرتے ہوئے۔

۱۹ صدی سے آزادی تک وہاں کے حکمرانوں کی دل چسپی نے رام پور کو شمالی ہند کی موسیقی کی دنیا میں ایک خاص مقام عطا کر دیا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس فن کی جنت بنادیا۔ اس فن کے لئے رام پور کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس دربار نے فن کا دھن کی ایک لمبی چوڑی فہرست بنائی ہے جس میں نواب کلب علی خاں، شہزادہ سادات علی خاں، نواب حامد علی خاں، رضا علی خاں، وزیر خاں، سکر، بیاسے صاحب دھریہ، مستان علی خاں، علی رضا خاں، فدا حسین سرودی، بندھا دیو، استاد مشتاق خاں، صادق علی خاں، سکر، احمد علی، قمر کوٹا۔ اور اچھی مثالیں ہیں۔ غرض رام پور نے اس فن کی کڑھکے غراب حالت میں منظم سرپرستی کی۔

گوشہ نشین اور موجودہ صدی کے سنگیت کا وہاں کی فہرست جوں پورے ماحول خاں، قلعہ، ہرنگ، اور بیٹی کے پنڈت دی۔ ان بھٹ کھنڈے کے بغیر ناممکن رہے گی۔ راجا نواب علی علی کی تصنیف، معارف النغمات، میں درج ہے کہ محمد علی خاں دھریہ کے لاثانی ماہر تھے، معارف النغمات میں لکھنؤ کے نواب چیم صاحب، سہارن پور کے ابق خاں، ملو آباد کے وزیر خاں، لکھنؤ

کے امیر خاں اور رضا خاں جیسے مانے جتے دھریہ کے استادوں کا نام بھی درج ہے۔ اس فہرست میں لکھنؤ کے نواب جانی صاحب کا نام ضرور شامل کرنا چاہئے جو بہت مشہور سنگیت کا رہی تھے اور *Theorist* آگے کی زمرہ بانی جو پچھلی نسل کی تھیں سنگیت کی دنیا پنڈت بھٹ کھنڈے کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انھوں نے اپنی تحقیقی تجربہ و تقریر اور تعلیم کے ذریعے شمالی ہند کی موسیقی کی موجودہ شکل کو ترتیب دیا ہے۔ یہ محض ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی سنگیت *Scientifically* طور پر دس ٹکٹوں میں مرتب ہو گئی۔ ان کی پوری زندگی سنگیت کی خدمت ہی میں گزری گئی۔ ان کی تحریر کردہ کتابیں سنگیت پر حوت آخر کا دھریہ رکھتی ہیں۔ ان کے لکھنؤ گیت دراصل کلاسیکی سنگیت کی جدید فواد ہیں۔ یہ بھی ان کے ٹھیک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی سنگیت نے پُرتے ہوئے ہوا۔ اور پنڈت جی نے اپنی زندگی ہی میں بڑودہ (۱۹۱۶ء) اور لکھنؤ (۱۹۲۶ء) میں مشقہ آل انڈیا مرکز کانفرنس کی کامیابی کو دیکھ دیا تھا۔

موسیقی قیام کی چیز ہے اور زیادہ تر افراد کی سرپرستی میں ملی پڑی۔ فی الحال سنگیت ہندو تہذیب سے گندہی ہے جہاں اس کا شہنشاہت دوریلے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آل انڈیا یوزک کانفرنس عوام میں سنگیت کا شوق ابھارنے کی کوشش کر رہی ہے اور سنگیت کا راد عوام کے چرخ کی چلیج کو پاٹ رہی ہے ساتھ ہی ساتھ صحت مند مقابلے کی طرح کو بیدار کر رہی ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا کام یہ کر رہی ہے کہ سنگیت کے متعلق ملاقاتی زبانوں میں کتابوں کا انتظام کر رہی ہے۔ جو اس سلسلے کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اب تک لکھنؤ گیت سنگیت پتہ کی چھ جلدیں اور راجہ علی خاں کی معارف النغمات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اس کے علاوہ دھریہ کی کتابیں بھی معارف النغمات کے منظر عام پر آچکی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ تہم بڑا اچھا کام کیا گیا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی رفتہ رفتہ موسیقی کی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے شلن گوالیار کے ماس یوزک کالج کو بھٹ کھنڈے نے یونیورسٹی کی طرح بنایا جا رہا ہے۔ آلہ آباد یونیورسٹی نے یوزک نیٹلٹی قائم کر دی ہے جو فی الحال سنگیت میں ڈیپلوما اور ڈگری دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی یونیورسٹیوں میں امتحان کے بعد متعدد سنگیت کو انٹر تک ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کر رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کسی خاص ماحول میں گائے ہوئے محبت کا گیت بھی رکارڈ بنانے کی محبت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے

بھر بھی دلی بھٹی اور کھٹو کے بیڑا شیخوں کے سنگت کے پروگراموں نے
- سنگت کی جتنی مدد کی اتنی مدد کسی اور نے نہیں کی۔ وہ نہ صرف عوام کو مذہبی لوہ
پر سنگت کی طرف مائل کرتے ہیں بلکہ سنگت کو بے اثرات سے محفوظ
رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کالے بچانے والوں کو مادیات بھی ملتا ہے اور
سماجی رتبہ بھی۔

حال کے سنگت کاؤں کے ذکر کے بغیر مضمون نامکمل ہے گا۔ استاد
یاض خاں شمالی اور شمال مغربی ہند میں خیال کے سب سے بڑے اور مانے
ہوئے لاکھڑے ہیں۔ انھیں آفتاب موسیقی سے نواز ایگ تھا۔ وہ پنڈت
کرشن راؤ رتن جھنکر دھارم کالج آف ہندوستانی میوزک کھٹو کے پرنسپل
اور بھٹی کے استاد و فیت خاں کے استاد تھے۔ اس کے علاوہ اسد علی اور
لطافت علی بھٹی اُن کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ لاہور کے عبدالواحد خاں،
کوٹلا پور کے اللہ دیا خاں، رائے گڑھ کے محمد خاں، دلی کے امیر خاں خیال کے
مانے ہوئے ماہروں میں سے تھے۔ مطلق میں دلی کی شمشاد بائی کا رہنے اور پچا
دھرم رہا ہے۔ بھٹی کی ریڈس آزاد بھی ایک قابل فن کارہ رہی ہیں۔ گوالیار کے
شکر گندھرب گندھرب کے پرنسپل پنڈت کرشن راؤ، قندھل خاصو خاں کے
خاندان کے انداز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جے پور کے کریم علی خاں بھی دھرم
کے مانے ہوئے آرٹسٹ ہیں۔ اس کے علاوہ دھرم کے فن میں آگرے کے
تصدق حسین خاں، پنجاب کے مبارک علی خاں، احمد کے اللہ ہندے خاں کے

فرزندان حمید الدین خاں، لکھنؤ، حمید الدین خاں بھی ماہر ہیں لیکن رحم الدین صاحب
میں ایک بلکل ہی مختلف انداز میں دھرم بھگوانے مانے مانے گئے ہیں۔
سب میں مستان ہیں۔ جے پور کے حیدر حسین، کھٹو کے دیوت علی خاں
کھٹے کے مرحوم فایت خاں کے بھائی، مادیات اور بھٹی و فیت خاں اور
کھٹے ہی کے مشتاق حسین بھی ستارے کے عظیم فن کار ملنے گئے ہیں۔

سرود بھانے والوں میں علاؤ الدین خاں کا نام سرفہرست ہے۔
یہ عظیم فن کار اور علم کا خزانہ تھے۔ دانش بھانے میں ان کا خانی نہیں تھا
کئی ساز اور راگ کے مجموعہ ہیں۔ سرود ہی کے میدان کے صوبہ اول کے
فن کار ہیں۔ حافظ علی خاں سرودی، علاؤ الدین اور حفیظ علی خاں دونوں
ہی رام پور کے ذبیح خاں کے شاگرد ہیں۔ شہنائی نواز مدد ہرود کم ہی
ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اندیزہ بن ہے بھی بے شک بہت مشکل۔ فیصل
بڑودہ کے بابو خاں اور بنارس کے بسم اللہ خاں ہی اس میدان کے
حب کہ ہیں بھانے والوں میں مستور رام پور کے صادق علی خاں ہی
صوبہ اول کے فن کار نظر آتے ہیں۔ علاؤ الدین کے سرورند
اکبر علی خاں سرورند نواز ہیں۔

فلسوں میں محمد ربیع، طلعت محمد کو جو شہرت حاصل ہے
اتنی ہی سیگم اختر نے غزل کے میدان میں مکہ غزل
بن کر پیدا کی۔ (ترجمہ : صادق علی)

عزیزان طوائف

کابوہ کی ہندو اور مسلمان عورتیں اس وقت اپنے گھروں سے نکل نکل کر گولہ بارود اور ادھر ادھر
لے جاتے، فوجیوں کو کھانا پہنچانے اور ٹھیک انگریزی قلعہ کی دیوار کے نیچے تو بچیوں کو مدد دینے کا
کام کر رہی تھیں۔ ان سب عورتوں میں اس وقت کابوہ کی ایک طوائف عزیزان کا نام بہت مشہور ہے۔
ایک مورخ لکھتا ہے کہ یہ عزیزان ہتھیار باندھے ہوئے گھوڑے پر چڑھی ہوئی بھٹی کی طرح
شہر کی گلیوں اور چھاؤنی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی وہ گلیوں کے اندر نکلے ہوئے اور گھانسی سپاہیوں کو
دھمکے اور شالی باشتی تھی اور کبھی انگریزی قلعہ کی دیوار کے نیچے رٹنے والوں کے حوصلے بڑھاتی تھی۔

سن ستادہ از پخت سندھال

ہفت گھنٹہ ستانی مہمان نگر

مسلمان اور مزاح

جیسے کہ: 'دیروہزم' مسجد ختی کہ رفوان فرشتہ مسیحا بھی اُن کے دار سے نہ بچ سکے۔ مسلمانوں نے کبھی کسی اور مذہب کی یا اس کے پیرو کی ذرہ برابر بھی دل شکنی نہ کی بلکہ 'نکم دینکم دی دیں' پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ اس قسم کے طنز و مزاح میں حضرت غائب کا مرتبہ سب سے اونچا ہے انھوں نے فرشتوں پر کس خوبی سے چوٹ کا ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر نا حتی
کدی کوئی ہمارا دم خسہر پر بھی تھا!

اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کبھی جھکے اور نہ اپنے عالمی اور گنہگار ہونے پر پردہ ڈالا۔ یہی نہیں اپنے گناہ نگار ہونے کا برملا اظہار کیا۔ تا کہ کس منہ سے جاوگے غائب! شرم نہ کم کر سکیں آتی ہر سنان کی عبادت حصول جنت کے لئے ہوتی ہے لیکن انھوں نے اس کا بھی تمسخر اڑایا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت یسکن
دل کے ہسلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اور اسی جنت کو اپنے ایک شعر سے کس طرح سب کے دلوں میں زماختی ہیں ملاحظہ فرمائے۔

ایسی جنت کو کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

واقعہ کی ہستی قابل احترام اور اس کا درجہ مغفرت و اعلى ہوتا ہے لیکن سب ہی اساتذہ نے واقعہ پر چارہ پر بھی ستم آزمائی کی ہے۔ غالب فرماتے ہیں کہ ان کے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واقعہ

دوسروں پر ہنستا اُن کی کمزریوں کا مذاق اڑانا مقررے کتنا بھتی اڑانا ٹھٹھا بھول کسی کو گرتے دیکھ کر اُس کی ہنسی اڑانا یہ سب گھٹیا مذاق ہے اس سے ہنسے داے یا اس کا ساتھ دینے والے کچھ دیر تو مزہ اڑا لیتے ہیں لیکن جو بدعت ملامت بننا ہے جس کی شبکی ہوتی ہے اُس کے لئے تو یہ سخت تعطل کا باعث ہوتا ہے۔ خود ہنسنے والے کچھ زیادہ دیر تک اس سے لطف و انبساط نہیں حاصل کر پاتے۔

طنز و کتا یہ تعلیمی کسی کی پگڑی اچھاننا کسی کو نشانہ مذاق بنانا کچھ ایسے ذوق یا آداب و تہذیب کے معمول میاں پر بھی نہیں اُترتے۔ سب سے اچھا مزاح وہ ہے کہ جو کوئی خود اپنے آپ کو چھیڑ کر یا اپنے آپ پر طنز کے دار کر کے دوسروں کو ہنسی کا موقع عطا کرے۔ اپنی کمزوری کو آشکارا کرنا اپنی حما یا غلطی کو دوسروں کو سننا کہ ہنسانے کے لئے بڑے دل مجرورہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے علاوہ خود اعتمادی بھی لازمی ہے۔ اگر آپ کی صلاحیت کسی میں ہو تو اس سے بڑا آدمی کوئی نہیں ہو سکتا۔ راہبند نا تھ میگو نے کہا ہے " میں جب خود پر ہنستا ہوں تو دل کا بو جھڑکا ہوتا ہے۔ "

یہی بات کچھ میں ہندوستان کے دانشور مسلمانوں میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔ بالخصوص اردو کے ممتاز ادیب اور شعرا نے ہمیشہ اپنے جھیر خود پر داخستہ طر زت میں دکھائے ہیں۔ مسلمانوں نے واعظ، محاسب، زاید، نامح، شیخ، پارسا، رخصتہ صوفی کو نشانہ ملامت اور بدعت طنز و استہزاء بنایا۔ باوجود اس کے کہ مسلم معاشرہ میں ان کا بڑا ادنیٰ مقام ہے اور بالعموم اس قسم کا گستاخانہ روا نہیں رکھتا جاتی ہیں۔ ان شخصیتوں سے ہٹ کر خود اپنی مقدس عبادت گاہوں کے تعلق سے بھی مگلفشان کی ہے

کہا اے خانہ کا مدعو غائب اے کبھی واسطہ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نے
جاہری تبت غیب پر جو نظر داخل کیا
وال مدعو ہی پر گری نہیں بھرتا پانی
حضرت کوئی بھی داخل کی مٹی پیدا کرتے ہیں

وامطہ کی بزم و مضاف کیا بھڑ بھاڑ تھی
تھے ہیں مدائے تو میداں صاف تھا
ریاض فرماتے ہیں

کم بخت نہ شراب کا ذکر اس قدر کیا
وامطہ کو منہ سے آنے لگی تو شراب کی
ریاض نے سخت میں ملنے والی پاک و صاف شراب اور وامطہ دونوں ہی کی خوب
مٹی پیدا کی ہے

وامطہ نہ خود بچو نہ کسی کو چلا سکو
کیا بات ہے تمہارے شراب زہور کی
حضرت اکبر الہ آبادی وامطہ عاشق کا رویہ سنندھ تک خیال سے جاتے ہیں
فرق کیا وامطہ عاشق میں بنائیں تم سے
اس کی بخت میں کئی اس کی بخت میں کئی

مسلمانوں کا زہر بطور خود بڑا خشک نرانی ہوتا ہے اور اپنے زہر و نفوس کے
ذہم میں دوسروں کو بیخ کن ہے۔ وامطہ بذات خود چاہے کچھ ہو تو کون کو موقع
ہے موقع وامطہ لکچر سے پریشان کرتا ہے۔ ان کے سماں غیب و شخصیت
ہے کہ جو نہ باندھ موم وصلہ ہے نہ اپنے ناز و نفوس کا اعلان کرتا ہے بلکہ یہ ایک
خالق و جہاد ہوتا ہے کہ جو ہر ایک کی خاموشی پر نظر رکھتا ہے اور ان کو برائیوں
سے روکنے پر تیار ہوتا ہے۔ اس نے بزرگ کے عالم میں جگر مراد آبادی فرمائی ہے
اے محسب نہ بھینک مرنے غیب نہ بھینک

قالم شراب ہے اسے قالم شراب ہے
اسی خیال کہ حضرت داغ اپنے خاص رنگ میں اور طرح پر فرماتے ہیں
محسب توڑ کے شیشہ نہ ہر موقت شراب
لے لے کم بخت چھڑک لے لے لے خواروں پر
فیض صاحب محسب کو ہر جہاں کہیں مگر اس کو کچھ ایسے انداز میں یاد
فرماتے ہیں کہ اس کی شخصیت کا بدلہ کل جاتا ہے

محسب کی خبر و بچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ساتھی کاٹے کا خم کا بیانا کا نام
اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے اور اپنی پاکبازی کے گھمٹ میں زائد
ہر دم ہی اعلان کرتا ہے کہ وہ شراب نوشی سے بہت دد ہے اس پر
کس قدر یا معنی طعنے کے تیر چلائے جاتے ہیں
زائد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بنا دے جہاں پر خدا نہ ہو

زائد کو اپنے تقدس پر بڑا ناز ہے لیکن اس کی تقدیس کا حضرت دار نے
کس خوبی سے سید سے سادے لفظوں میں مذاق اڑایا ہے۔

نظہ نے تجھ سے کیا کہوں زائد
ہائے کم بخت تو نے بلی ہی نہیں
وامطہ زائد محسب کے ساتھ حضرت شیخ بھی کالٹوں میں گھسے جاتے ہیں
اور وہ بھی اس لطیف انداز میں کہ شاید وہ اپنا منہ چھپانے میں ہی اپنی خبریں
حضرت کو فرماتے ہیں

تردانی پر شیخ ہماری نہ جاوے
دہن جوڑ دین تو فرشتے دھوکہ کریں
ایر سنائی اپنی صفائی میں حضرت شیخ سے محال ہو کر کیا خوب بخت پیش
کر رہے ہیں

بارے چلائے تو بھر کیوں نہ پیوے
زائد نہیں ہیں تیرا کچھ دلی نہیں
عرش ملیانی سے نہ شیخ کو جہنم اور حرام روایا
بس اسی دھن میں دھارے کی گنت
تجھ کو لے شیخ نہ جینے کا قریب آیا
شیخ جی سے اُن کو بھاگنے کی انتہا ہے کہ اس سے چٹکا کا پانے کے فیض
کو دوزخ بھی قبول ہے۔

خبر و زح میں لے لے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گ۔
اکبر آبادی نے اپنے زہر خد سے شیخ کا روبرو واضح کیل ہے
خلد شراب کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے میں چونک بھی نہیں

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ مسلمان پارسائی کا دعویٰ کر سکے البتہ زندگی تو عام ہے ان کا ملاحظہ فرمائیے۔

جس دن سے شب کوئے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
زندہ کے زندہ رہے باقہ سے جنت نہ گئی

اسلامی نقطہ نظر سے توبہ واستغفار کے ساتھ اگر کوئی راہِ راست کو اختیار کرے تو وہ صحیح مسنون میں مسلمان اور جنت کا حقدار ہو سکتا ہے لیکن مومن فرمانے میں سے

عمر تو ساری کئی عشقِ میناں میں رہی

آخری وقت میں کیا خاکِ سلسل ہو گئی

ایسی کیفیت کو سکندر جیسا بیگم مینا نے اس طرح پیش کیلئے ہے

جی میں تو فکرِ تہاں ادب پہ ہو کر خدا

لے دل پہ تابِ تجھ سے پارسائی ہو چکی

امیر مینائی عالم سکندر نشاط کو اپنی بدستی سے اس طرح منسوب کرتے ہیں

مسجد میں بلاتے ہیں ہیں زلزلہ نامم

ہونا جو ہوش تو مے خانہ نہ جلتے

خواجہ حیدر علی آتش کا پیام ناخلف فرمائے

نعل پہاڑ آئی پیرِ صوفیو شراب

بس ہر چل نمازِ مصلیٰ اٹھائیے

اکبر الہ آبادی کا مشاہدہ کچھ اور بھی ہے

زمانہ کہ رہا ہے صب سے بھر جا

نہ مندر جا نہ مسجد جا نہ گر جا

علامہ اقبال نے بھی طنز کے میدان میں قدم رکھا تو خود اللہ تعالیٰ سے

جھگڑا کھڑا کیا اور اُن سے نہایت ادب کے ساتھ شکوہ و شکایات کا

دختر کھول دیا۔

اساتذہ کے کلام سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے کبھی اور کے

اختلافات کو دیکھا اور نہ کسی کو مخالف سمجھ کر اُس سے بخول کیا بلکہ اُن صب

کے طنز و استہزاء کے دار اپنے ہی معتقدین اور مستعین جیسے زاہد و اعظا

معتسب شیخ صوفی پر ہوا کئے خود کو زندہ دیا کارگردانا۔ جنت، حور

شراب، لہو، فرشتے، رضوان، سہر، کعبہ و حرم کے تعلق سے بے باک تمسخر

اور بخول کیا۔ انتہا یہ ہے کہ ع مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہئے کی صدا

حکیم کا ہندوستانی مسلمان تعمیر

بھی نکادی۔ اس قسم کا مزاج کسی اہلِ باطن میں نہیں سنا اور کسی مذہب کے پیروؤں نے کلمہ نکالا اپنے تقدس مآلیوں یا مقدس چیزوں۔ اس طرح بے باک جملے نہیں کئے۔

شاعروں کے ان نمونوں سے ہٹ کر دیکھئے تو خیر میں بھی مسلمانوں نے

مزاج کا رنگ ادا کیا ہے۔ خود مرزا غالب نے اپنے خطوط میں بڑی

چابکدستی سے گل افشانی کی ہے۔ دیگر اساتذہ میں میر امن کی داستان

بارخ و دیار، وجہ علی سرور کے فسانہ عجائب، داستانِ امیر حمزہ، بوستانِ خیال

میں فرہی اور بیکار لوگوں کی چالاکیوں پر مزاج کس انداز میں بنائی گئی ہیں۔

اسی طرح بھور کی کتاب نورتن میں غزالت کا بخور پیش کیا گیا ہے۔ شہباز

نے مذہب و ملت کے نام پر کی جانے والی بُرائیوں کو ہدفِ طنز بنالیا ہے۔

مسلمانوں کی بہذیب اور ثقافت نے کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ آپس میں ایک دوسرے

پر کچھ اچھا جائے۔ جب کبھی طرفت کی رگ پھڑکتی ہے یہ کوئی کردار کھڑا

کر دیتے ہیں اُس کی بوکھلاہٹ اس کی دینگس اس کی حماقت اور اُس کی

کم فہمی پر لوگوں کو ہنسیا جاتا ہے۔ شیخ علی ایک ایسا زبردست کردار ہے کہ

آج بھی ایک منکر مدبر اید منفر شہر دہلی پر رہنا شخصیت میں اس کی بھٹک

صاف و مرتج نظر آتی ہے۔ یہ بڑے بڑے دوسے کرلمے ہوائی قلعے بناتا

ہے۔ ریت پر محل تعمیر کرتا ہے خوش فہمی کا شکار رہتا ہے۔ اُس کا حکایتوں

میں ہر کوئی ایک خود کی شخصیت کو پہچان دیکھتا ہے۔ لال بھگت وہ عقل کا

اندھا ہے کہ جو اپنے آپ کو دانا و مینا پیش کر کے سب کام اوندھے کرتا

ہے۔ یہاں بھی ہر آدمی اپنی کز دریاں دیکھتا ہے اندھوش ہوتا ہے کہ وہ اس

سے منسوب نہیں بلکہ کسی ادا کی پتا ہے۔

قیصر مار خاں اور پائے خاں بھی ایسے ہی کردار ہیں اور وہی کیفیات پیش

کرتے ہیں۔ دراصل یہ ایک نیک جذبہ ہے کہ کسی ادا کو محدود و مومن

بنانے کے بجائے ایک خاص کردار کی تخلیق کی اور اُس کو نشانہٴ ملامت

بنایا مگر مطلق و لطافت کے ساتھ۔

پچھلے دور میں سماج جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ زندگی دوبار اور ہشتا ہوں کے

محلوں کے گرد گھومتی تھی۔ چنانچہ شہنشاہِ اکبر کے دوبار میں بھی ایسی لطافت

بہتا تھا۔ اُس کے لئے راجہ بیربل اور علاء دہ پیاڑہ کے کردار کھڑا کر کے

اُن کی آپس کی جھگڑا اور نوک جو تک کرائی جاتی ہے لیکن اُن کا دار کسی اور

پر نہیں ہوتا بلکہ آپس میں ہی محکم گھما دکھائی دیتے ہیں۔ اُن سے ہٹ کر

منا میں سنی ہیں کہ جہاں مزاج کی جس کاگز نخر آئے ہے بعد باتوں باتوں میں
 بھلے پڑیاں جھڑتی ہیں۔ ایک بار کسی بڑھیا نے آنحضرت سے پوچھا —
 کیا تم بڑھیا کو جنت میں داخلے کا؟ سرکارِ مد عالم نے مسکرا کر فرمایا
 ”ہرگز نہیں“ یہ ٹری پریشان ہوئی اور اُن کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے تھے
 کہ حضور اقدس نے فرمایا: تمہیں معلوم نہیں مدحشر میں نہ کوئی بڑھا ہو گا لہذا
 پھر تب ایک سے ہونے لگے۔ تم میری امت سے ہو جنت کی تمہیں کوئی فکر
 نہ ہونی چاہیے۔

ماںِ نبوت کی نفیس دقت کسی تاجر نے ابھاری کہ اُس کے کاہنہ کے لئے اُسکو
 ایک اونٹ عطا ہو۔ رسولِ خدا نے آواز بلند فرمایا ”اس کو ایک اونٹ کا پچھ
 لئے دیا جائے۔ اُس شخص نے آنحضرت سے بغیر کہا: حضور اقدس مجھے سالانہ
 لادنے کے لئے اونٹ چاہیے۔“ سرکارِ مد عالم نے مسکرا کر کہا ”کیا بڑا اونٹ“
 اونٹ کا پچھ نہیں ہوتا۔“

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک صحابی نے دریافت کیا ”تو لڑکا کنہ ہے؟“
 جواب دیا جو جنت میں ہمیشہ تسکین کی سوچتا ہے۔“ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
 جب بیتِ اہل کا سارا اثاثہ تقسیم کر چکے تو کسی نے کہا ”اب کیا ہوگا؟“
 آپ نے جواب دیا ”ہمارا کام بیتِ اہل خالی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کام
 اس کو بھرنے ہے۔ ہم اپنا فرض بجالائیں تو اس کی نیامی سے کیسے محروم رہیں گے؟“
 حضرت علیؑ کی خدمت میں ایک شخص آیا جس کو کیا اور سونا بنانے کا جہ تھا اور
 اُس نے عرض کیا ”میں اُس کی ترکیب پوچھی۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: شمع کی نو کو
 منہ کر دے سونا جائے گی۔“ اس نوبی سے اشارہ کر دیا کہ فضول باتوں کا سوچنا
 وقتِ برباد کرنا ہے۔

ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ جن میں فہرہ مزاج کا ہتھکار اور کوئی دوسرا نہیں
 بلکہ خود اللہ اپنے دے ہوئے ہیں اور یہ ایک قوم اور صفت کی سمت
 کی نشانی ہے۔

ترک سے ایک کردار کو در آمد کیا گیا۔ مگر نصیر الدین کے نام سے اور ان کو
 ترک بہ ترک حمد و ثناء کرتے ہوئے بنا کر بڑا ہی لطیف مزاج پیدا
 کیا ہے۔ ان سے ہٹ کر بھی ایسے نے خاص خاص کرداروں کی تخلیق
 سے اپنی جولا ئی بیج کا منظر پرو کیا ہے۔ جیسے اس زلفِ ناز کے چچا چچلی
 سرشار کھوجی، عظیم بیگ، عینائی کی خاتم، منشی سجاد حسین کے حالی جنوں
 شریک تھانوی کے منشی جی و قاضی جی، اور اسلم کے مزاحی اور دیگر
 معروف اور غیر معروف ادیبوں کے ایسے بے حساب کردار ہیں جیسے
 صاحبِ انبی، جعفر زلمی، مرزا ہندو، احمدی، امین و فیرو، بطور خاص ذکر
 کے قابل ہیں۔ مگر روزی نے تحریک نگاروں کی نواہوں نے کام مجید
 کے لفظی ترجمے کی تعریفی اور اس کو نکال کر اُردو کا نام دے دیا۔

حضرت امیر خسروؒ نے پہیلیوں میں کافی مزاج پیدا کیا ہے لیکن اُن کی
 اصولِ شاعری کی صنف بہت خاص ہے جس میں وہ اُلٹی پُلٹی بے جہز باتوں
 میں ربط یہ کر کے اُن کو پُر مسمیٰ بناتے تھے۔ روایت ہے کہ وہ ایک بادگسی
 قندہار سے گزر رہے تھے اور انھیں پیاس پی۔ کوئیں پر نہابیوں سے پانی
 مانگا۔ یہ ان کو جان گئیں اور پوچھا آپ ہی امیر خسرو ہیں جس کے گیت مقبول
 ہیں۔ انھوں نے پانی کہا تو سمجھوں نے نہ گشت کی کہ ہم ایک ایک لفظ کہتے ہیں
 آپ سب کو جوڑ کر کوئی اچھا سا شعر موزوں کیجئے۔ ایک نے کہا ”کھیر“ دوسری
 نے کہا ”جرخ“ تیسرے نے ڈھول“ چوتھی نے قنا“ حضرت امیر خسروؒ کا
 پیاس سے بڑا حال تھا، گراں پہناریوں نے مانا نہیں۔ آخر کار انھوں نے ٹری
 خوبصورتی سے ان سب سے اس طرح جوڑ دیا۔

کھیر پکائی جس سے اور جرخ دیا حلا
 آیا کتا کھا گیا تو مینھی ڈھول بجیا
 بددستانِ سلاطین کے مزاج کی یہ کچھ باتیں تھیں۔ لیکن یہ بات سلسلہ ہے کہ
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے غلام و مراد کی زندگی میں بھی سیکڑوں

احتیاط

میں نے ادنیٰ ایڑی کی سینڈل میں اس لئے پہنا چھوڑا۔ میں کہ میرے اوشاہِ طیف کے
 قدموں کا باجی ترک کم نہ ہو جائے اور وہ بڑے معلوم ہونے لگیں۔ میں نے لکھنا کہ کر دیا تاکہ میری شہرت وہ
 اس کا کتری میں مبتلا نہ ہوں۔ میں نے اچھے لباس پہنے چھوڑ دیئے تاکہ لوگوں کی نظریں مجھ پر کم پڑیں۔“
 رعیتِ ختائی

گلن کاہندستانی مسلمان تعبیر

امداد صابری

ہندوستان میں خبر رسانی کے ذریعے

ابتداء سے آج تک

ملک اور ملکی افسران کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے ہر بھی مقرر ہوتے تھے منوہار راج کا ارشاد ہے :-
 ”ذریعہ علم گاؤں اور نگر وغیرہ کے مالکوں کو یہ مطلب بھی وقتاً فوقتاً اپنی نیت سے دیکھتا رہے اور خبروں کے ذریعے سب کے دل کی بات جانے، راجا کے اکثر عہدہ دار دوسرے کے مال پر قبضہ نہا کر کر لیتے ہیں اس واسطے ان سے رعیت کی حفاظت کرے۔“

اسی طرح شہروں کے حالات جانے اور خبریں حاصل کرنے، دوسرے راجاؤں کی سیاسی پوزیشن سے باخبر رہنے، دشمنوں کے ملکوں اور ان کی فوجوں کے حالات جانے، رعایا کی خواہشات سے آگاہ ہونے کے لئے جاسوس و مخبر مقرر کئے جاتے تھے جو سچاؤں، گنڈوں، شراب خانوں، علف فروشوں، چوراہوں، جنگلوں، باغوں اور کاری گروں کے کارخانوں وغیرہ کی خبریں تک راجا کو پہنچاتے تھے۔

چور، ڈاکوؤں، جیب کتروں، اٹھائی گروں، غرض ہر قسم کے مجرموں اور تمام جرائم و مقدمات کی تحقیقات کے لئے مخبر و جاسوس مقرر ہوتے تھے۔ جن کو چوروں کا جاسوس کہا جاتا تھا، جو چوروں اور بہو معاشوں کو اس بہانے سے پھانستے تھے کہ تم ہمارے گھر چلو تم کو لڑو کھلا کر ایک ایسے برہمن سے ملو ایسی گے جو انسانی اسکیوں کو پاپے تکس تک پہنچانے کی تدبیریں جانتا ہے۔

راجہ، وزیر اعظم اور اپنے رشتہ داروں پر بھی جاسوس و مخبر مقرر کرتا تھا جو ان کے ذریعے ان کی طاقت اور ارادوں سے باخبر رہتا تھا۔

راجہ سفیروں، جاسوس اور مخبروں کی جہت پریشام کو عبارت کے وقت خلوت گاہ میں منسا تھا۔

جب سے آدم نے ہوش سمجھا لیا اس وقت سے خبر رسانی کا سلسلہ برابر جاری ہے ابتدائی دور میں مسافروں، تاجروں اور قافلہوں کے سفر پہلے خبر رسانی کا ذریعہ بنے جب کوئی مسافر تاجر اور قافلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تو وہاں پہنچ کر اپنی جگہ مقام و قصبہ یا شہر کے حالات اور خبریں بیان کرتا تھا، اور جب واپس آتا تو ان مقامات کے حالات و خبروں سے اپنے لوگوں کو آگاہ کرتا تھا۔

جب حضرت انسان نے رتی کی طرف توجہ دی اور تنظیمی شکل میں آئے اور راجا پر جا کے پھندروں میں پھنس گئے تو عہد برہمنی میں خبریں پہنچانے اور خبریں حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا، راجا ملکی نظام چلانے کے لئے تین یا پانچ گاؤں کے درمیان ایک حفاظتی مکان (سرے) بنواتا تھا جس میں اس کے اہل کار اپنی ڈیوٹی انجام دیتے تھے۔ اور حسب ذیل طریقہ خبر رسانی کا ذریعہ بناتا تھا۔

”گاؤں میں کچھ داردار ہوتے تو گاؤں کا مالک دس گاؤں کے مالک سے کہے اور وہ میں گاؤں کے مالک سے کہے۔ میں گاؤں کا مالک سو گاؤں کے مالک سے کہے اور وہ ہزار گاؤں کے مالک سے کہے۔“

اسی زمانے میں دوسرے ملکوں کے حالات جانے کے لئے دوت یعنی سفیرجا پکرتے تھے جن کی ٹوٹی منوہار راج نے یہ مقرر کی تھی۔

”دوت (سفیر) دوسرے راجاؤں کی دل کی بات اپنی مملکت کے لئے معلوم کرے۔ دوت کے اختیار میں صلح یا جنگ ہے۔ دوت بگڑے کو طمان ہے اور ملے ہوئے کو بگاڑتا ہے سب اہل کاروں میں دوت ہی راجا کی بات اور اثر مندہ آثار، قیافہ سراجا کے کام کرنے کے لائق سب کام جانے۔“

گلن کھنڈستانی سلمان نمبر

جند گیت کے دور میں حکمرانوں نے اخبار رسائی نے ادا آگے قدم بڑھایا ،
سلطنت کے اہم محکموں ستا ہی درباروں اور بڑے بڑے دمداروں اور عوام کی
ہر نفس و حرکت یہ جادی ہو گیا تھا اور ان کی نگرانی کرتا تھا ، بادشاہ کو ان کی خبریں
پہنچاتا تھا جن کو یونانی اہل علم نے منظم اور مستظم رکھا ہے اور ان کا ذکر آشوک کے
فرائض شاہی ملازمین یعنی یلسانی یا اخبار نویس کے نام سے کیا ہے ۔ جاسوسوں
کے متعلق قواعد و ضوابط مقرر تھے جس میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ حکومت
کے نظام کو درست طریقے سے چلانے کے لئے خفیہ خبریں حاصل کرنا ضروری ہیں ۔

ماحضر مورخین بھی جاسوس کے فرائض انجام دیتی تھیں ، یہ فاحشہ عورتیں
دعا کی ملازم ہوتی تھیں ناظم اور نائب ناظم کے حکم کے مطابق ستا ہی جتر کے سونے
کے آدابے اور سیکھے اٹھاتی تھیں اور جب کبھی بادشاہ تخت پر بیٹھے یا رتھ یا پاک
پر سوار ہوتے تو اس کے ہم نکاب رہتی تھیں ۔ ان فاحشہ عورتوں کے بارے میں آئین
خبر رسائی میں ایک مخصوص باب ہے ۔

فاحشہ درباری عورتوں پر ہی جاسوسی منحصر نہ تھی بلکہ بازاری بیٹہ در
اور چھانڈنی کی فاحشہ عورتوں کو بھی جاسوسی کرنے پر لگایا جاتا تھا جو بازار کی چہ
می گوئیاں تک انٹران مالا ایک پہنچتی تھیں ۔

جنرل کوئی کئی زبانیں آتی تھیں وہ ہمیں مل کر خبری کرتے تھے مکان
کا بھیس بدلتے تھے ۔ جاسوس خطہ بروز استعمال کرتے تھے اور خفیہ خبریں پہنچانے
میں کوششوں سے بھی کام لیا جاتا تھا ۔ خفیہ پولیس حکمران جاسوسی کی نگرانی میں ہوتی تھی
وہ ان کی تمام بلاؤں کی جانچ اور پڑتال کرتی تھی ۔

عہد قدیم میں غیر ملکیوں یا بددراز مٹھالوں سے خبریں حاصل کرنا اور
ان میں خبریں پہنچانے کا بار زیادہ تر جاہل و پل اٹھاتے تھے ۔ چنانچہ انجیل مقدس کی
کنایوں سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاک جو صوبہ داروں ، ناظموں ، منصب داروں اور
ہر فرقہ کے چوہدریوں کو بادشاہ کی طرف سے بھیجی جاتی تھی اس کو لکھوٹے تانگے
خچر سانڈی ، اونٹ لے جاتے تھے ۔ چنانچہ بادشاہ افریسیس نے ہودیوں کو قتل
کرنے اور اس کے بعد عیسائیوں کے قتل کرنے کے فرمان اسی ڈاک سے روانہ ہوئے
تھے ۔ اس فرمان پر بادشاہ کی انگوٹھی کی ہر لگائی جاتی تھی یہ ڈاک سلطنت کے
ایک سو ستائیس صوبوں میں روانہ ہوتی تھی ۔

نہایت جاہلیت میں عرب ممالک اکثر قبیلوں میں تقسیم تھے ، اسلامی
ابتدائی دہائیوں کے ڈاک کے مذکورہ طریقے پر باقاعدہ عمل نہیں کیا جاتا تھا جب حکومت
کا نظام مضبوط ہو گیا تو حضرت امیر معاویہ نے پہلے سرکاری ڈاک اور خبر رسائی کا

باقاعدہ محکمہ برپا کر دیا ۔ اس کا طریقہ نظام یہ تھا کہ ایک جہیز تھوڑی تھوڑی فاصلے
پر تیز رفتار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے ۔ ہر نکلے ہر کاہے منزل پر منزل انھیں
بدلتے ہوئے ایک مقام کی خبریں دوسرے مقام پہلاتے اور لے جاتے تھے ۔
قدیم ایران میں بادشاہ ایچ کے حیند کے بعد میں اس قسم کے لوگ خبریں
ماحول کرنے کے لئے مقرر کئے جاتے تھے جن کو بادشاہ کی آنکھ اور کان سمجھا جاتا تھا ۔
جو سلطنت کے ہر گوشے سے جا کر بادشاہ کو دہاں کے حالات و واقعات سے باخبر
کرتے تھے ۔

عباسیوں نے اس طریقہ کو اہم سمجھ کر اس پر عمل کیا اور اس کو ” حکومت
کے ستون “ سے تعبیر کیا ۔ غزنویوں کے ان بھی ایسا ہی محکمہ بنا ہوا تھا جن کو غزنوی
نے جاری کیا ۔ قطب الدین ایبک کے ہاں واقعہ نویسوں کا اساتھ تھا شمس
بادشاہوں کے زمانہ میں اس محکمہ کے خبروں کے علاوہ بادشاہ خود راتوں کو گشت
نگار رعایا کی حالت حیات اور ملک کی کیفیت سے آگاہ ہوتا تھا خواجہ
قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

” شمس الدین اقدس بادشاہ رات کو بھیس بدل کر شہر میں گشت لگاتے
تھے ، غریبوں کے گھر جاتے اور عزیز آباد مقامات کے حالات کی خبر گیری کرتے تھے
اور ان میں بلا کر ان کی امداد کرتے تھے ۔

مطبوع نے بھی اس محکمے کو بہت اہمیت دی ، اس محکمہ کا حکم لفظاً
منا جاتا تھا ۔ برید کی ذمہ داری بہت اہم سمجھی جاتی تھی ، اس اہمیت کو مد نظر
رکھتے ہوئے اکثر کوئی حکیم کا آدمی ملطاطر پورٹ کر دیتا تھا تو اس غیر ذمہ داری
کی وجہ سے اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھوئے پڑتے تھے ۔ چنانچہ بنیائے شاہین
ملین نے یہی کیا ۔

ملک نصیر یونیوں کا صوبہ دار تھا اس نے ایک فراش کو مار ڈالا ، تھوڑے
دنوں کے بعد سلطان غیاث الدین بدایوں آیا ، فراش کی بیوی نے فریاد کی ۔
اس نے ملک نصیر کو اس قدر دتے لگوائے کہ وہ دوسری دنیا کو سدھار گیا
اور جس برید نے خبر نہیں دی اس کو مار پر کھینچوا دیا ۔

علاء الدین خلجی کی اصلاحی کامیابی بھی اس برید دار جاسوسی محکمے پر منحصر
تھی نرغ غلام اور منڈلوں کے مصلح کی خبر بادشاہ کے پاس پہنچانے کا کام ان
تین اہل کاروں کے ذمے تھا (۱) ششمہ منڈی (۲) برید منڈی (۳) جاسوسان
منڈی ۔ اگر ان تینوں کی خبروں میں آپس میں کوئی فرق پڑتا تو ششمہ منڈی کی کم
نہی آجاتی تھی اور باز پرس ہوتی تھی ۔

بازاروں کے حالات جانتے لئے جاسوس مقرر تھے اگر بازار کے مصدّی بادشاہ کو خبر اطلاع دیتے تو جاسوسوں کی رپورٹ پر ان کو سزا ملتی تھی۔

نزروں کی دیکھ بھال کے لئے بادشاہ اس قدر مستعد تھا کہ وہ ان جاسوسوں اور مجرّدوں پر بھی اعتماد نہیں کرتا تھا، نوجوان لڑکوں کو روپیہ دے کر فروخت دیکھنے کے لئے بازاروں میں بھیجتا تھا اگر مقررہ قیمت پر فروخت نہ کرتے تو سزا دی جاتی تھی بہت کم سزا یہ تھی کہ ناک کاٹ لئے جاتے تھے۔ جتنا کم توڑا اتنا ہی گوشت اس کے کوہے کاٹتے تھے اور اس کے سامنے پھینک دیتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ اناج مقررہ نرخ کے خلاف آدھی پتل زیادہ فروخت کر دیا تھا تو حکم برید کی اطلاع پر محاسب کے درے بکوائے گئے۔ جس مقام و ملک میں لڑائی ہوئی تھی وہاں بھی بادشاہ ڈاک چوکی بٹھاتا تھا۔ روزانہ کی خبریں اس کو بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب تلنگا دیر مخالفت کی زیادہ فوج کی وجہ سے ڈاک چوکیاں اٹھائی گئیں تو بادشاہ کو سختی پہنچا۔ بند ہو گئیں جس کی وجہ سے اس نے سمجھا کہ حالات امید افزا نہیں ہیں تو گھبرا کر حضرت شیخ نظام الدین ادویا کی خدمت میں دو امیر قاضی غیاث الدین بیالوی اور ملک قرامیگ کو بھیجا اور دعا کے واسطے التجا کی اس وقت بادشاہ کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ ہی حکم برید تھا جس نے علاء الدین غلی کو قتل ہونے سے بچایا اور دشمنوں کی اسکیم سے اس کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کی کارگزاری سنئے۔ علاء الدین نے بے حس مخلوق کو موقوف کر دیا تھا دہلے کا درہستہ تھے اپنی جان سے عاجز آ گئے تھے انھوں نے مادہ کیا کہ بادشاہ روزانہ سیر گاہ جاتا ہے اور شکر اڑاتا ہے اس وقت سب کی نظریں اوپر ہوتی ہیں کسی کے پاس ہتھیار نہیں ہوتے دو تین آدمی جا کر بادشاہ کا کام تمام کر دیں چونکہ خلوق بادشاہ کے اصلاحی کاموں اور ٹیکسوں سے تنگ اور ناخوش ہے اس کے ختم ہونے سے وہ خوش ہوگی۔ بادشاہ کو اس اسکیم کی خبر مجرّدوں نے سپہائی بادشاہ نے حکم دیا کہ سارے ملک میں ایک ہی دن میں فوسلم غسل تیل کر دے جائیں اور ان کا نام تک باقی نہ رہے چنانچہ میں تیس یا سولہ ہزار غسل تیل ہوئے۔

جہگ کا دار و مدار بھی اسی حکم کی خبر رسانی پر تھا، ڈاک چوکی کے ذریعہ سامان حرب منگایا جاتا تھا اور جنگ کی خبریں رھاہ کی جاتی تھیں۔ اگر ڈاک چوکی میں کچھ خرابی پیدا ہو جاتی تھی تو اس سے فوج میں بدگنیاں پھیل

جنگ سے پہلے مسلمانوں کے

جاتی تھیں اور دشمنوں کو فوج میں انتشار پیدا کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ چنانچہ طاہریت تنگ کی جنگ میں کچھ کامیابی کی صورت نظر آنے لگی تو رائے رد در دیو صلح پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن غیاث الدین کا امیر جنگ الخ خاں صلح پر آمادہ نہیں ہوا اور قلعہ انکل پر قبضہ ہونے لگا۔ ہفتہ میں دو مرتبہ دہلی سے خبریں آیا کرتی تھیں وہ ایک ماہ تک نہیں آئیں اور ڈاک چوکی کے سلسلے میں خرابی پیدا ہو گئی تو عین اسی وقت الخ خاں کی فوج کے منافقین نے یہ اڑا دیا کہ بادشاہ فوت ہو گیا۔ اس سے فوج میں اضطراب اور کم ہمتی پیدا ہو گئی، فوج منتشر ہونے لگی منافقین چاہتے تھے کہ الخ خاں کو بھی ختم کر دیں۔ دشمنوں کو جب فوج کے اس انتشار کی خبر پہنچی انھوں نے قلعہ احصار توڑ کر فوج کو غارت و تباہ کرنا شروع کر دیا اور الخ خاں کے قتل کے ارادے کرنے لگے۔ اتنے میں ڈاک چوکی (جس کو الاغ کہتے تھے) کے ذریعہ دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ زندہ سلامت ہے۔ منتشر فوج میں جان پڑ گئی اور متحد ہو گئی۔ الخ خاں نے دشمنوں کو شکست دی۔ منافقین ملک مل، افغان، عیدت، عرب دہلی لائے گئے تو ان کو مل قیدیوں سے کچلوا دیا گیا۔

علاؤ الدین کا حکم برید ملک پر اس قدر حاوی ہو گیا تھا اور خبر رسانی اور جاسوسی سے اس قدر فروغ حاصل کر لیا تھا کہ جاسوس معمولی کوچوں اور گھروں تک میں مقرر تھے۔ بادشاہ خلق کے اچھے برے کاموں اور حالات سے واقف ہوتا تھا۔ مجرّدوں کی آنی کثرت تھی اور اس قدر دیانت دار تھے کہ جو امیر اپنے گھر میں بیوی بچوں سے باتیں کرتے تھے اس ناک کی رپورٹ بادشاہ تک پہنچ جاتی تھی جس کی وجہ سے امیر اور عوام نے اس قدر احتیاط برتنی شروع کر دی تھی کہ دن میں گھروں میں بات چیت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آدھی رات گزرنے کے بعد اور کھانا کھانے کے بہت دیر بعد ہی گھسٹو کرتے تھے۔

محمد شاہ تغلق نے بھی اس حکم میں کافی ترقی کی اس بطور لکھتا ہے: "سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پچاس دن کا جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں وہ اس کے پاس ڈاک سے پانچ دن میں پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک کو اس ملک میں برید کہتے ہیں۔ ڈاک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک برید الخیل گھوڑے کی دوسری برید الرجال پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو اطلاق کہتے ہیں۔ ہر چار کوئی کے بعد گھوڑا بدلتا ہے۔ یہ گھوڑے بادشاہ کی طرف سے رہتے ہیں۔ پیادوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہے کہ ایک میں جس کو کوہے کہتے ہیں چوکیاں ہر کاروں کی

ہوتی ہیں، اس بولک لودوان کہتے ہیں۔ ہر ایک تہائی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہکاؤں کے لئے برجیاں بنی ہوئی ہیں ہر ایک برجی میں ہر کسے کے لئے ایک شہر ہے ہیں ہر ایک ہکاؤ کے پاس ایک چھتری دو گز لمبی ہوئی ہے جس کے سر پر تانیر کے گھنگرو بندھے ہوئے ہیں جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو وہ ایک ہاتھ میں ٹھکانہ لکھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ میں چھتری ہوتی ہے تمام طاقت خیریت کے وہ دوڑتا ہے دوسرے ہکاؤ اس گھنگرو کی آواز سن کر تیار ہو جاتا ہے اور لٹے کر فوراً دوڑتا ہے اس طرح یہاں نہ سنیانا، بوتا ہے پیچا دیتے ہیں یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک پہنچا دیتی ہے کبھی کبھی سگس محرم کو بھی چار پائی پراٹھا کر اسی طرح چمکے چوکی ہر کارے لے جاتے ہیں۔ دولت آباد دسیاے گنگ سے جالیں دن کے فاصلے پر ہے اخبار نویس ہر سانس حال تغصیل دار لکھتے ہیں کہ اس کی صورت ایسی ہے لباس ایسا ہے۔ نوکر ساقی اور جانور اس کے پیچ لٹے ہیں اس کے حکام و سکنات اس قسم کے ہیں الغرض کوئی مات نہیں چھوڑتے۔ سلطان سے دہلی جائے کارا ستر پاس روز ہے میرے لئے خبر (میرے) کے دل پر پانچ روز میں پہنچے گی تھی۔ ملتان کا اخبار نویس سمرقندی ہے جس سے میری ملاقات ہوئی۔

ہندستان کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ ہر ایک چھوٹے اور بڑے امیر کے پاس بادشاہ کا ایک غلام رہتا تھا جو بادشاہ کو امیر کے حالات سے ماخبر رکھتا تھا اور اسی طرح لائیاں جو کچھ امیر کے گھر میں ہوتا تھا اس کی خبر بھگنوں کو دیتی تھیں اور یہ بھگنیں میزوں کے اندر کوہنپا دیتی تھیں اور وہ بادشاہ کو پہنچا دیتا تھا۔

چنانچہ ایک امیر کی انوریت کے ساتھ رات کو سو رہا تھا اس نے اپنی بیوی سے جماع کر کے کارا دھڑا ہر کیا عورت نے اس کو بادشاہ کی قسم دی کہ وہ ایسا کرے۔ امیر نے اس کی مات نہیں مانی، اس کی یہ خبر رات ہی کو بادشاہ کے پاس پہنچ گئی۔ بادشاہ نے سچ ہی اس امر کو طویا کر تو نے ایسا کیا ہے جس کے جرم میں بادشاہ محمد رفیع نے امیر کو قتل کر دیا تھا۔

فیروز شاہ گھوڑوں کے علاوہ اونٹوں سے کام لیتا تھا جہاں چہ فیروز شاہ جب کبھی سوئی سے دہلی روانہ ہوا اور راستہ میں جنگلوں میں بھینک گیا اور بڑی مشکل کے بعد صبح راستہ پر آیا تو اس وقت بادشاہ نے فوجوں کے رشتہ داروں کی پریشانی دور کرنے کے لئے اپنے لشکر میں اعلان کیا۔

ہلکے ہاتھ دستانے مِلانِ خبر

کہہ شخص ایسی خبر کی اطلاع اپنے رشتہ داروں کو دینے کے لئے دلت سرے شاہی تک اپنے خطوط بھجوادے چنانچہ فوجیوں نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ خطوط جمع ہو گئے تو ان کو ایک اونٹ پر لاد کر دہلی بھجوا دیا گیا جہاں فوجیوں کے رشتہ دار اپنے اپنے خطوط لے گئے۔ فیروز شاہ کے خبر سانی کے وزیر اعظم خاں تھے۔

خاص خبریں اور خاص خطوط بھیجنے کے لئے بادشاہ اپنے خاص آدمیوں کو مقرر کرتا تھا جہاں پہنچے اسلام بولانا جلال الدین رومی کے خط کے جواب کھولنے کے لئے بادشاہ نے اپنے مستند امیر کو روانہ کیا۔ مولانا جلال الدین رومی شاہی دربار سے اپنے گھر پہنچے بھی نہ پائے تھے کہ ان کی خانہ ماہ میں ان کے خط کا جواب پہنچ گیا۔

سیر شاہ کو جب یہ علم ہوا کہ اعمال و ثبوت لے کر لوگوں کو زیادہ نہیں دیتے ہیں تو حکم دیا کہ ریگنڈ کے متعلق جو فرمان بھیجے جائیں وہ میرے پاس لائے جائیں، وہ خوران فرامین کو ایک خط لپیٹیں، بند کر کے ہر گاہ کسی بڑے مستند آدمی کے حوالے کر کے ریگنڈ بھیج دیتا تھا۔

اسی طرح سلیم شاہ سوری نے جب کرنا کارمان کے لئے اپنے خیوں کے پاس ایک حمید لکھایا تھا تو اس نے ان کے حانات سے آگاہ ہونے کے لئے کیرک خواجہ سرے اور غلام بھیجے تھے۔

مرید کا علم صحیح خبر پہنچانے سے نہیں چوکتا تھا کسی کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ خواہ افسر ہو یا عام آدمی ہو اس کے نزدیک سب برابر تھے حمایت حکومت کے خلاف دیکھتے انجام سے بے خبر ہو کر اس کی اطلاع بادشاہ کو بھیج دیتے تھے۔

”جہاں چہ فیروز شاہ کے دوہوشت یا روزادار عامل مجبوروں نے دربار میں اگر بادشاہ سے کہا کہ ستن گانی سکھ میں عمال نے رد و جہ فقر و کم کر دیا ہے بادشاہ اس کی تحقیقات کروائیں، فیروز شاہ نے یہ معاملہ جہاں جہاں پر اعظم کے سپرد کیا۔ وزیر نے کہا کہ اس معاملہ کی پوشیدہ تحقیقات ہونی چاہئے اور مجبوروں کو قید میں ڈال دینا چاہئے۔ چنانچہ قید کر دیئے گئے دارالغریب (محسنان) کا انچارج گجرات کے وزیر اعظم نے بلایا اس سے حقیقت پوچھی تو اس نے تحقیق کرنے کے بعد بتایا کہ ایک جہ فقر و کم مزدور ہے۔ وزیر اعظم نے مشورہ دیا کہ سکھ شاہی کی دھاک بٹھانے کے لئے زرگوں کو تیار کر دے کہ کوئی ایسی صورت نکالیں جس سے سکھ شاہی ورنہ جہاں پسا

اترے۔

ہزار چار سو تھے۔

گجراتہ کو زبردستی لے کر انگلیشی والوں کو کہو کہ وجہ بادشاہ کے پاس انگلیشی لے جانے تو انگلیشی کے درمیانی حصہ کو خالی کر کے چند نفوس میں ڈال دیں اور انگلیشی کے دہانے میں بم لگا دیں۔ گجراتہ نے انگلیشی والے کو بھی تیار کر دیا۔ بادشاہ کے سامنے زرگر اور انگلیشی والے پیش ہوئے۔ زرگر کو برہنہ کر کے سنگوت بندھوا دیا۔ وزیر اعظم نے بادشاہ کو باتوں میں مضبوط رکھا اس عرصہ میں زرگروں نے چند دانہ نفقہ کے بود میں ڈال کے نکال کر وزن کیا تو وہ مقررہ وزن کے برابر نکلے۔ بادشاہ نے دونوں خبروں کو جلا وطن کر دیا مورخین لکھتے ہیں کہ چند ماہ بعد گجراتہ کو اس الزام میں نہیں بلکہ اس پر دہلے الزام لگا کر معزول کر دیا تھا۔

بنگال کی خبریں تین روز میں رہتاس پہنچی تھیں۔ بنگال سے رہتاس ایک ہزار پانچ سو کوٹس تھا۔ ہر سرائے میں گھوڑوں کے ساتھ ایک نقارہ تھا رہتاسیادشاہ کا حکم تھا کہ جب بادشاہ کے لئے دسترخوان بچایا جائے تو نقارہ بجایا جائے اسلئے آواز سن کر سلسلہ دار سرائوں میں نقارے بج جانے تھے۔ اس وقت سرائوں میں مسلمانوں کو بچا ہوا کھانا اور ہندوؤں کو اٹھائیں ملے تھا اس ڈاک میں ہر روز بادشاہ کے پاس نیلاب آگے اور بنگال کی سرحدوں کی خبریں آتی تھیں اس ڈاک میں ایک حسین طلشت دار ایک دن میں تیس کوس گیا۔ واقعاتی مشتاقی میں لکھا ہے کہ حسین طلشت دار تین رات دن جن کر گورہ سے چتوڑ پہنچا۔ جب وہ سو جاتا تو چارپائی پر بیٹھ جاتا اور گنوار اس کی کندھے پر بٹھا کر چلتے۔ جب آگہ کھل جاتی تو پھر گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔

سکندر لودھی کا حکم برید بھی بہت ہو سیتا اور چالاک تھا۔ خبریں اس دانائی اور قابلیت سے حاصل کرتا تھا کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ کہ اس نے اس کی خبریادشاہ کو سپیائی گھر گھر کے خاص خاص واقعات و حالات بادشاہ کے پاس پہنچ جاتے تھے بعض اوقات بادشاہ ہمیں بدل کر محلوں اور بازاروں میں گشت لگاتا تھا اور رہایا اور اپنے امراء کے حالات معلوم کرتا تھا لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی جن بادشاہ کو سارا حال بتا جاتا ہے بعض لوگوں کا گمان واقعات یہ تھا کہ بادشاہ کے پاس ایک طلسمی چراغ ہے جس کو وہ دوستیں کرتا ہے اور جن حاضر ہو کر روئے زمین کے خاص خاص اہم امور سے ملکیوں نے فرماں رواؤں کے پوشیدہ حالات بادشاہ کو بتا دیتا ہے۔ دورادور کس کے خزانے اور دفتے بادشاہ کو لکھ دیتا ہے۔

یہ قدرتی بات ہے کہ حکومت میں اچھے اور بُرے امراء و افسر و حاکم ہوتے ہیں جنان شیرشاہ کے زمانے میں ایسے مقرران اور امراء بھی تھے جو اپنی مصلحت سے بادشاہ کو ایسے حالات سے آگاہ نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے جو بدعنوانیاں عدالت وغیرہ میں ہوتی تھیں اس کو بادشاہ دور کر سکتا تھا اس لئے شیرشاہ نے جو قانون افذ کر رکھے تھے ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ضروری سمجھا کہ لشکر دار اور اپنے مستند مخبر مقرر کرے اور ان کے پوشیدہ حالات معلوم کر کے بادشاہ کو باخبر رکھے تاکہ بادشاہ ان کی غلط کاریوں کو دور کرنے کی کوشش کرے ان مجرور کی وجہ سے شیرشاہ کے پاس امراء کی شکایتیں بہ آسانی مل جاتی تھیں مثلاً شیرشاہ نے مالوہ کی جاگیر شجاعت خان کو دی کہ وہ یہ جاگیر سپاہیوں میں تقسیم کرے۔ شجاعت نے اس جاگیر میں سے ایک حصہ خود لے لیا اور باقی سپاہیوں کو تقسیم کر دیا تھا سپاہیوں نے اپنا ایک وکیل اس الٹانی سے آگاہ کرنے کے لئے بادشاہ کے پاس روانہ ہی کیا تھا کہ اس سے پہلے اس قلعہ کے کاحال بخیر دلنے بادشاہ کو لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے شجاعت خان کو لکھا ایسی حرکت نہ کرے سپاہیوں میں جاگیر کا بقایا حصہ بھی تقسیم کر دے۔ درندہ تجھ کو سزا دی جائے گی۔

سکندر لودھی قاضیوں پر بھی اپنے جاسوس دیکھ بھڑکرتا تھا۔ جو بادشاہ کو ان مقدمات کی ایک ایک لمحہ کی خبر دیتے تھے اس خدمت پر خاص جہان غلام مامور ہوتے تھے۔

اسی طرح جیسے کسی ہم پرینچیا تو ہر روز اس کو دفتران بھیجتا ایک صبح کے وقت جس میں یہ حکم ہوتا کہ لشکر سفر کرنے کے بعد کہاں قیام کرے اور دوسرا حکم ظہر کی نماز کے بعد بھیجتا کہ لشکر قیام کے بعد کیا کام کرے۔ سرائوں میں گھوڑوں کی ڈاک تیار رہتی تھی۔

ڈاک چوکی کا اس زمانہ میں اتنا زور تھا کہ راجہ بھی اس طریقے کو رائج کرے ہوئے تھے۔ چنانچہ راجا کمارن سلیم شاہ نے مخبروں کی نگرانی میں کسی زمیندار کی معرفت کسی راجہ سے سازش کر کے ڈاک چوکی میں برقعہ اڑھ کر فرار ہو گیا تھا۔

شیرشاہ نے سرائوں پر سترہ سو سرائیں بوائی تھیں۔ پہلے ہاؤس ڈاک جاتی تھی لیکن ان سرائوں کے بننے کے بعد ڈاک سرائوں سے جانے لگی۔ ہر سرائے میں ڈاک کے گھونٹے بندھے رہتے تھے۔ ڈاک کے کل گھوڑے تین

خلیفہ دوم میں تیز زبانی کسی کا انچارج ایک وزیر بریلہ مالک ہوتا تھا جو تمام صوبوں کی خبریں حاصل کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ ہر صوبہ کا بریلہ خطوط کے ذریعہ مرکز میں خبریں روانہ کرتا تھا۔

اس عہدہ پر قندھار، تاجیک، بھارتی، امداد لوگ لگائے جاتے تھے بعض اوقات معزز، متقی، دیانتدار اور غیر جانب دار لوگ اعزاز حاصل دیر بریلہ کے فرائض انجام دینے کے لئے بھیجے جاتے تھے ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ باوجود باغی اور دوزخ دار افسران کے منہ کرنے اور اثر ڈالنے پر بھی بریلہ نے مرکز کے اطلاع دی۔ بریلہ کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے۔ ہر ملک کے چھوٹے بڑے مسئلے اور چھوٹے بڑے افسران کی حرکات و سکنات کی وہ رپورٹ کرتا تھا۔ سرکاری اسٹور کی خرید و بیع، تجارت، زراعت، مسکن وغیرہ کی تحقیقات کر کے رپا دامانہ رائے لکھ کر بھیج دیتا تھا۔ فوجی معائنوں کے وقت اس کا جانا ضروری تھا تاکہ بادشاہ فوجی حالات سے پوری طرح آگاہ ہو جائے۔ بریلہ جو اطلاع پہنچتی وہ عنوانات کے ماتحت جمع کر کے سلسلہ دار مرکز میں براہ راست بادشاہ کو روانہ کرتا تھا۔ سلطنت میں جو غیر ملکی لوگ آتے تھے اس کے بارے میں اذہ بانداروں میں جو غلط شبہ ہوتی عوام کے خیالات و جذبات پائے جاتے وہ بھی روادار کرتا تھا۔ امرا و درباریوں کی موت کی خبریں بھی ڈاک سے جاتی تھیں چنانچہ شاہجہاں اور عالمگیر کو ان کے والد کے انتقال کی خبر ڈاک سے ملتی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں داقو اور خبر رسائی کی شکل یہ تھی:-
”تجربہ کار جہاندیہ اور با اثر لوگ اخبار نویسوں کے لئے مقرر کیے جاتے تھے جن کی تعداد ہر بڑے مقام پر موجود تھی جن کی جگہ کیا جاتا تھا ان میں سے روزانہ سلسلہ جنگی اپنا کام انجام دیتے تھے۔ چودہ دن کے بعد نوٹ (پوری اطلاعات) بادشاہ کو روانہ کی جاتی تھیں۔

بادشاہ نے بھی داقو نویسوں کے لئے دار الحکومت میں لوگوں کو مقرر کر رکھا تھا۔ دار الحکومت میں ایک دن جنگی کی ڈیوٹی ہوتی تھی ان چودہ جنگیوں میں سے اگر کوئی کسی ضروری کام کی وجہ سے نہیں آ سکتا تھا تو ان میں سے ایک کی ڈیوٹی لگادی جاتی تھی جس کو قتل کہتے تھے۔

جب اس روز نامہ کی تصدیق ہو جاتی تھی تو بادشاہ کے پاس روانہ کئے جاتے تھے اگر وہ اس کو پسند کرتا تو راجدھانی کا جنگی ہر داقو اور ہر سالہ کی خبر کی نقل کر کے اس پر اپنی ہر لگادیتا تھا اس کے بعد اس پر ہر

عرض اور پروا کی ہر لگتی تھی جس نے بادشاہ کو رپورٹ سنائی تھی اس کی بھی ہر شے کی جاتی تھی، اس رپورٹ کو تعلیق کہتے تھے اور کھٹے والے کو تعلیق نویس کہتے تھے۔

ان داقو نویسوں کو کسی کسی خبروں سے اپنی رپورٹ مرتب کرنی پڑتی تھی وہ حسب ذیل ہیں۔

”بادشاہ اور امراء کے احکام ان کی حرکات خورد و نوش، بیماری، خواب و بیداری، شہنشاہان اقبال میں جانا۔ بارگاہ خاص میں خرامش کا ذکر، شکار کی تمام حالت جانوروں کا زخم ہونا کیوچ و مقام، رہنمائی، اندر دلاؤ و برکتی، دانش کی باتوں کا سننا، غیرت، درویش، امرا و تاجران کا منصب، دشمنوں کے حال، معافی زمین، خراج کا گھٹنا بڑھنا، اجارہ بیع، توپل پیش کش، ارسال، لغاؤ فرما، عرائض کا آنا، جواب کا دیا جانا، ملازمت و خدمت، تعین کی مدت، چوکی میں آنا، جنگ، فتح، صلح، روشناس جس کو بادشاہ پسپا ہوتا ہو یعنی بڑے آدمی کا مرنا، جانوروں کی شرطوں کی پارت گھوڑوں کا مرنا، بادشاہ کے جرموں کا معاف کرنا، دربار عام کی سرگزشت کتدرائی، ولادت، جوگان بازی، چوسر، شطرنج، گنبد، اس کے علاوہ عوام آسانی، اور زمینیں، سال کی فصلیں۔

ڈاک اکبر کے عہد میں اس طرح بھیجی جاتی تھی۔

ہر گاؤں میں پانچ میل کے فاصلے پر گھوڑے اور چند ہر کا بے مقرر کئے جاتے تھے جہاں یہ لوگ رہتے تھے اس کو ڈاک چوکی کہتے تھے، سرحدی امراء کی ضروری عرصہ داشت اور فرمان امی چوکی سے چلتے تھے سوار شدہ ہر کا بے اس کو دوسری چوکی پر پہنچا دیتا تھا۔ چنانچہ شب و روز کی لامٹے کر کے یہ ہر کا بے اگر سے احمد آباد ڈاک پانچ روز میں پہنچا دیتے تھے۔ اور چن کو بادشاہ خبریں پہنچانے کے لئے متعین کرتا تھا وہ جلدی خبریں پہنچا دیتا تھا۔ چار ہزار ہر کا بے اس کام پر سمور تھے جو گھوڑے پر سوار ہو کر ڈاک پہنچاتے تھے اور جو ہر کا بے پیرل ڈاک لے جاتے تھے وہ سات سو سولہ دس روز میں طے کرتے تھے۔

۹۱ھ میں بادشاہ نے راجہ جے مل کو جو بیار تھا اس کو گھوڑے کی ڈاک میں بھیجا تھا جس کا راستہ میں ہی انتقال ہو گیا تھا اسی طرح اکبر بھی ایک دفعہ ازراہ شوق دو روز میں گھوڑے کی ڈاک پر دوسو سولہ میل کی مسافت طے کر کے اجیر سے آگرا گیا تھا۔

دوسرے صوبوں میں کتنی تعداد میں واقعہ نویس تھے اس کا اندازہ دار السلطنت کے واقعہ نویسوں سے لگایا جائے۔ اس کی حالت یہ ہے ڈاک چوکی میں دو تین ہزار آدمی ہر روز ناچ کھڑے بھیجتے تھے۔ عدالت خانہ کچہری اور چوڑہ میں یہاں تک کہ گلی کوچوں اور بازاروں میں جاسوس مقرر تھے جو انہیں عوام میں سنتے وہ تحریر میں لاتے، اگر کے واقعہ نویسوں میں انعام اللہ ابن شہباز خان نے تمام عمر واقعہ نویسی میں گزاری۔ جب کہ اتنی بڑی تعداد میں ظلم و ستم اور بد عنوانیوں کو مٹانے والے تھے، جاسوس اور برید ہوں اس عظیم الشان منظم حکومت میں ٹپے ٹپے ذمہ دار حاکموں سے حسب ذیل انسانیت سوز اور شرمناک افعال مرتبہ ہو جاتے تھے۔

۱۔ مرزا جانی بیگ اور خواں جو اگر کے دور میں منصب سرہزاری اور جہانگیر کے دور میں منصب مہنت ہزاری حاصل کئے ہوئے تھے اور البرو جہاں گیر کے زمانہ میں سندھ اور ملتان کا صوبہ دار تھا ان کی حرکات خبیثہ یہ تھیں:

”وہ شراب پی نہیں پیتے تھے بلکہ ہر روز ایک یا کمرہ عورت سے مباشرت فرماتے تھے۔ تمام مقامات، سے ان کے لئے یا کمرہ عورتیں جمع کی جاتی تھیں، شہتے میں کوئی رندی ایسی نہ تھی جس سے ان کا تعلق نہ ہو“ ۱۔ ۲۔ اسماعیل خواں برادر خورد خواں جہاں مالوہ اور کالپی کے جاگیردار اور پہلے منصب سرہزاری ویا نصدی اور سرسدر میں منصب پنج ہزاری یافتہ تھے

بادہ سعورتیں ان کے پاس تھیں جب وہ دربار میں جاتے تو ان عورتوں کے ازار بندوں کو قتل لگا جاتے تھے، آخر ان عورتوں نے عاجز آکر ان کو زہر دے کر مار ڈالا۔“

تعجب ہے کہ تاریخ کے صفحات ان کے اعمال بد کی مزائیکہ تذکرہ سے خالی ہیں۔

جہاں گیر کے دور میں طامس ودا اور ہائکس سفیر برطانوی درباری واقعہ نویسوں کا تعجب خیز الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ بہت سے واقعہ نویس ہوتے ہیں جو سب باتیں لکھتے ہیں یہاں تک کہ عورتوں کے ساتھ جو باتیں ہوتیں وہ بھی لکھتے تھے جب بادشاہ کا انتقال ہو جاتا تو ان خبروں سے بادشاہ کی تاریخیں مرتب کی جاتی ہیں۔

گلن کاہنہستانی

واقعہ نویس اگر غلط فہمیاں لکھتا تھا تو اس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ چنانچہ جب دربار جہاں گیری میں ایرانی سفیر آیا تو بادشاہ نے اس کو شراب کا جام دیا۔ غلط فہمی کی وجہ سے درباری واقعہ نویسوں نے جام شراب دینا بخوشی سے منسوب کر کے لکھ دیا۔ بادشاہ نے جب روزنامہ دیکھا تو غصہ سے بے آپ بے ہو گیا۔ اس نے کسی پرچہ باز کیا کسی کو کوڑے لگوائے، بعض کو لٹا گھونٹ مارنے کا حکم دیا۔ جس میں مجروح بھی ہوئے اور ایک آدمی مر بھی گیا۔

جہاں گیر نے خرمیچا نے کا ہندستان میں یہ نیا طائفہ ایجاد کیا تھا۔ جہاں گیر نے جب یہ سنا کہ غلامی عباسی بھڑادی کو تروڑ کر کونامہ بری سکھاتے تھے تو بادشاہ نے کبوتر بازوں کو حکم دیا کہ ان کبوتروں کو یہ کام سکھائے ان کبوتر بازوں نے جوڑے ایسے آموختہ کئے کہ مانند سے وہ پرداز کرتے تو ایک پہر میں بارش کی صورت میں دو پہر میں بران پور میں بچ جاتے تھے بعض کبوتر چار گھڑی میں پہنچتے تھے۔

عالمگیر نے ڈاک و جہر رسائی کا محکمہ باقاعدہ اور مکمل بنا رکھا تھا۔ کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جس میں سوانح نگار رجسٹر جگہ مقرر نہ ہوں وہ عزیمات و کلیات صوبیداروں اور حکام کو پہنچاتے تھے، کوئی صوبیدار شہزاد یا امیر کسی شخص کو اس کے جرم یا قہر و عتاب کی وجہ سے قتل نہیں کر سکتا تھا۔ بادشاہ ہی حاکموں، صوبیداروں کی عزلت اور واقعہ نگاروں کی رپورٹوں سے اس کی حقیقت معلوم کر کے شریعت کے مطابق سزا دیتا تھا۔ خاص طور پر اپنے لڑکوں کے اعمال و حرکت اور چال ڈھال سے باخبر رہتا تھا۔ آٹھوں پر خفیہ نویس اور جاسوس ان کے پیچھے لگتے، رکھتا تھا جب ان کو فوج کے ساتھ روانہ کرنا تھا تو ان کے ساتھ اتالیق مقرر کرتا تھا (تاریخ ہندستان، ششم ص ۷۸)

بکال، دکن، سورت، جوینور، ملتان، ملو آباد، گلشن آباد، جیدر، لاہور، دارالسلطنت وغیرہ میں واقعہ نویس مقرر تھے آثار عالمگیری کے مولف نے اپنی تاریخ میں ان کا تذکرہ کیا ہے البتہ ان کے نام نہیں لکھے ہیں جن کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) عبدالرحمن (دکن)، (۲) خدمت گوار خواں (۳) عنایت اللہ خان (۴) فضل الہی بن مرشد علی خواں (۵) سعادت خان (۶) محمد رسائی مستعد خواں (۷) محمد حسن

واقعہ نگاروں کے تین محکمہ تھے۔ واقعہ نگار، خفیہ نویس (مستند خفیہ) اور جاسوس۔

سزاوارتوں کو خبریں مہیا کرنے کے لئے بادشاہ نے واقعہ نوپس مقرر کر رکھے تھے ڈاک چوکی کے مشہور دروغ محمد شریف برادر ابوالفتح، قابل خان اور فاضل خان تھے۔

واقعہ نوپس کی غلطی پر عالمگیر حرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا دیتا تھا۔ عبدالرحمن واقعہ نوپس نے جو تمہیداً درخان مرزا بن سے وصول کی تھی اس کا بیع انداز نہیں کیا تھا اس غلطی پر اس کو پھانسی دیا۔

مخلیہ دور کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان کے زیادہ تر اہل واقعہ نوپس میں اور جو بھی تاریخ لکھی گئی ہے وہ واقعہ نوپس کے لغو ہونے کے نہیں لکھی گئی ہے۔

ترکانہ بیابان گیری میں جہاں کٹر لکھتا ہے، اس نے کتاب خانے کے متعدد لوگوں کو حکم دیا کہ دائرہ احوال کی ایک جلد مرتب کرادو متعدد نسخے خاص لوگوں اور اہم ناموں میں بھجوائے اس نے تاکداریاب دولت اس عاینا دستور العمل بنائیں، ایک واقعہ نوپس مرزا محمد عزت محمد خان بخشی نے جہاںگیر نامہ قلعہ بند کر کے کھوکھلی پیش کیا جس کو میں نے اپنے بیٹے شاہجہاں کو دے دیا۔ دین مآثر عالمگیری کا مستفید محمد سانی مستوف خان عالمگیر کا واقعہ لگا تھا جو بعد میں عالمگیری کے زمانہ میں انشاء نظارت پر مامور ہو گیا تھا اور حادثہ نے اسے صاف مزادہ کو اس کی طرف واقعہ لگاری پر لگا دیا تھا۔

شیواجی کی حکومت میں بھی واقعہ نوپس تھے جو رپورٹوں کا ذخیرہ رکھتے تھے یہ سلطنت کے فرمان و احکام اور سلطنت کے حالات مرتب کرتے تھے اور انتظام خبرداری اور جاسوسی بھی کرتے تھے شیواجی کو ہر ایک حکم و ہر قلعہ اور ہر جگہ کی خبریں پہنچائی جاتی تھیں دشمن کے لشکر، راستوں، دروہوں کی اطلاع، خبر، جاسوس اور مخبر پہنچاتے تھے۔

مخلیہ بادشاہوں کے آخری دور میں بھی خبر رسائی اور ڈاک کا طریقہ باقاعدہ تھا۔ چنانچہ مزاج الدولہ کے بارے میں ڈاکٹر مہرن اپنی تصنیف منہل پالیسی میں تحریر کرتے ہیں۔

”واقعہ نوپس بخشی کے ماتحت ہوتے تھے اس صوبہ میں صوبیدار سے لے کر محکمہ لکھنے کے اعمال کی رپورٹ درج ہوتی تھی جو براہ راست بادشاہ کے حضور پیش کی جاتی تھی۔ خفیہ اطلاع کا واقعہ نوپس سے علیحدہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ کام سوانح نویس، خفیہ نویس یا رپورٹ نویس انجام دیتے تھے وہ ملک کے جگہ جگہ ہوتے ہوئے حالات بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دیتے تھے اس حکم کی اہمیت اور درجہ بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ صوبیدار اور دیوان بھی اس سے

لکھن کا ہنگستاں مسلمان ہند

کاہنیتے تھے۔ حیدر علی نے بھی ہر محلے میں خفیہ نوپس مقرر کر رکھے تھے جو تمام حالات سے اس کو باخبر رکھتے تھے۔

خبریں اور ڈاک پہنچانے کا طریقہ مملکت نظام میں ڈاک کے جدید نظام سے قبل تک جاری تھا۔ ڈاک کے مقررہ اوقات کے علاوہ بھی ضروری احکام و خبریں اسپیشل طور پر روانہ کی جاتی تھیں جو بہت جلد پہنچتی تھیں اس کو ”کوٹھنگرو“ کہتے تھے، اس کی فیس چار آنہ کو اس کے حساب سے لی جاتی تھی۔

ڈاک پہنچانے کے جو مناسبت پرانی حکومتوں نے بنائے تھے اس کی یادگار اب بھی دہلی میں موجود ہے۔ پرانے قلعے کے مشرقی دروازے کے سامنے کھڑا دیلم ہے جو خاص محل اور عظیم گنج کے پرچم ہے بلکہ عظیم گنج کے سولے سے بہت پاس شمال کی طرف لکڑی دو سو قدم پر کوس مناسبت کے چار حصے ہیں نیچے کا حصہ ہشت پہل ہے جس کا دور ۲۹ فٹ ہے جو ۶ مربع اور دو فٹ اونچے پختہ۔ جو ترے پر پتھر اور چونے کا بنا ہوا ہے۔ بیٹھک کا ہشت پہل حصہ ۸ فٹ اونچا ہے کل بلندی اندازاً ۲۴ فٹ ہوگی۔ ادھر کا سرنگل مٹی پر ختم ہوا ہے اس طرح کے مناسبت کو کوس بھر کے فاصلے پر تھے۔

قلعہ کا آخری اخبار نوپس مارج تھا جو ہمارا شاہ کے زمانہ میں اخبار نوپس کی خدمت انجام دیتا تھا اور اہم خبریں ساتھی سوارے جاتے تھے۔

انگریزوں نے ہندوستان آنے کے بعد ابتدا میں خبریں پہنچانے کے لئے مخلیہ طریقے پر عمل کیا جو چند قدم چلتے گئے تبدیلیاں آتی گئیں بڑے بڑے محکمہ اور سپردوں کی جگہ لکھی سے ڈاک بھی شروع ہوئی اس کا شیکار ملتا دھند سوار لگتا جس نے لکھیاں بنوائیں اور ان سے ڈاک بھیجانی شروع کر دی۔

جہاں جہاں ریلیں نہیں دہاں ریل سے ڈاک جاتے لگی ہو جو وہ دور میں ہر جگہ خبریں حاصل کرنے کے لئے ایک سا انتظام ہے ہر ملک اور ہر طبقہ مقام میں خبریں حاصل کرنے کے لئے رپورٹر ہوتے ہیں جو مختلف نیوز ایجنسیوں کو خبریں فراہم کرتے ہیں، وہ ایجنسیاں عام طور سے والٹیس، ریلوے ٹیلیفون تار بستی، ہوائی جہازوں اور ریلوں سے خبریں حاصل کر کے اپنی مشینوں کے ذریعہ بڑے بڑے اخباروں میں پہنچاتی ہیں خبریں سننے اور پڑھنے کا ذریعہ زیادہ براخبر ہیں یا رپورٹر ہے۔

حکومتوں کی خبریں حاصل کرنے کا وہی پرانا طریقہ ہے پولیس خفیہ پولیس کو کے لئے متعلقہ خبریں فراہم کر کے حکام کو پہنچاتی ہیں۔

غذ سے قبل کے اخبارات کی فہرست

سنہ	اخبار کا نام	ادبیر کا نام	مقام	زبان	نمونہ اشاعت	سنہ	اخبار کا نام	ادبیر کا نام	مقام	زبان	نمونہ اشاعت
1724	انڈین گزٹ	سرکاری	کلکتہ	انگریزی	ہفتہ وار	1846	مارتھرا اخبار	مولوی نصیر الدین	کلکتہ	اردو	ہفتہ وار
1781	بنگال گزٹ	جیمس گفر کی	"	"	"	1846	شمال اخبار	شیخ عبداللہ	شمال	دکنی	"
1818	ڈگ درشن	ڈاکٹر کیری	"	بنگالی	ماہانہ	1846	سابقہ اخبار	جمال الدین	دہلی	اردو	"
1818	ساجار درپن	ڈاکٹر مائٹن	"	"	ہفتہ وار	1846	نوائے التائین	پرسہو یال	"	"	"
1821	سمباد کوڈی	راجہ رام پری	"	"	"	1847	اسعد انوار	قمر علی	آگرہ	"	"
1821	بھئی سماچار	فیروز علی خان	بھئی	گجراتی	"	1848	سداکار اخبار	مارا سو بنات	بنارس	اردو	"
1822	جام جہان نامہ	مفتی سدا سکھ	کلکتہ	اردو	"	1848	گوالیار اخبار	لکشی پرنس	گوالیار	"	"
1822	مرآۃ الاخبار	راجہ رام پری	"	فارسی	"	1848	بنارس اخبار	گھوش رگوناتھ	بنارس	"	"
1823	شش الاخبار	مفتی رام شکر	"	اردو	"	1848	عمدۃ الاخبار	پنشن پرنس	بریلی	اردو	"
1826	ادونت مارتھ	پنڈت جگن کھن	"	ہندی	"	1849	مالوہ اخبار	دھرم نرائن	انور	اردو	"
1831	آئینہ سکندر	"	"	فارسی	"	1849	المحقق	مرتی لال	آگرہ	اردو	ہفتہ وار
1833	ماہ عالم افروز	مولوی حاج الدین	"	"	"	1850	کوہ نور	مفتی ہرکھن	لاہور	اردو	ہفتہ وار
1834	لوحیانہ اخبار	مشرقی	لوحیانہ	"	"	1850	خورشید عالم	مفتی دیوان چند	سیالکوٹ	اردو	"
1835	سلطان الاخبار	سید جعفر علی	کلکتہ	"	"	1851	نور علی نور	مولانا محمد حسین	لوحیانہ	"	"
1836	دہلی انداز اخبار	مولانا محمد امین	دہلی	اردو	"	1851	جام جہان نامہ	میرٹھ	"	"	"
1836	زبدۃ الاخبار	احمد علی	آگرہ	فارسی	"	1851	بارغ و بہار	ہزار جہاں	بنارس	"	"
1837	سیدال اخبار	مولوی سید محمد	دہلی	اردو	"	1852	مفتاح الاخبار	مولوی محمد یوسف	میرٹھ	"	"
1837	خیر خواہ ہند	پادری پتھر مرزا	لاہور	اردو	ماہانہ	1851	قطب الاخبار	آگرہ	"	"	"
1841	سراج الاخبار	سید اولاد علی	دہلی	فارسی	ہفتہ وار	1852	زائون ہند	بنارس	"	ہندو روزہ	"
1844	حسن الاخبار	بھئی	"	"	"	1852	معیار الشعراء	آگرہ	"	ماہانہ	"
1845	گل رخ کیم اخبار	مولوی کیم الدین	"	اردو	ماہانہ و ہفتہ وار	1852	جام الاخبار	سید رحمت علی	ہدراس	"	ہفتہ وار
1845	دوق السعدین	دھرم نرائن	دہلی	"	ہفتہ وار	1853	نور الانوار	مفتی سدا سکھ	آگرہ	ہندو	ہفتہ وار
1845	عمدۃ الاخبار	مدرس	"	"	ہفتہ وار	1853	آفتاب ہند	بابو گووند رگھو	بنارس	اردو	"
1846	نوائے المناظرین	ماسٹر امجد	دہلی	"	ماہانہ و ہفتہ وار	1853	فتح الاخبار	علی گڑھ	"	"	"
1847	مکتب ہند	ماسٹر امجد	"	"	ماہانہ و ہفتہ وار	1853	صادق الاخبار	مصطفیٰ علی	دہلی	"	"

نور شتی لورسری	دہلی	اردو	ہفتہ دار	۱۸۵۶	سحر سمری	منشی گھزنرائی	لکھنؤ	اردو	ہفتہ دار
۱۸۵۳	ڈاکٹر مینیر	دیوان چند	ایا کٹوت	"	۱۸۵۶	طلسم لکھنؤ	"	"	"
۱۸۵۳	۷۰ لے بہا	منشی دیوان چند	لاہور	"	۱۸۵۶	مفید خلافتی	شیونرائی	آگرہ	"
۱۸۵۳	کشف الاخبار	منشی مان علی	بکینی	"	۱۸۵۷	خلاصۃ الاخبار	مکتہ اداس	دہلی	"
۱۸۵۳	صادق الاخبار	سید محمد صادق	دہلی	"	۱۸۵۷	اخبار سندھین	کراچی	"	"
۱۸۵۴	مہراج القلوب	محمد رفیع	کراچی	فارسی	۱۸۵۷	طلسم حیرت	مدرااس	"	ہیندین تبار
۱۸۵۶	منظر الاخبار	محمد خواجہ بادشاہ	مدرااس	اردو					

آج کے ہندستان میں اردو وال

۷۸,۹۱,۷۱۴	اتر پردیش
۴۱,۴۹,۲۴۵	بہار
۲۷,۲۵,۷۳۷	بھاراشہ
۲۵,۵۳,۷۵۳	آندھرا پردیش
۲۰,۳۴,۴۸۲	میسور
۸,۳۲,۸۴۷	مغربی مال
۷,۴۰,۱۸۵	مدرید پردیش
۶,۱۵,۵۰۳	مال ماڈو
۵,۹۴,۶۷۰	گجرات
۵۰۹,۶۷۳	استھان
۲,۱۲,۸۹۱	اڑیسہ
۲,۰۵,۹۰۹	ہریانہ
۱,۵۳,۲۵۱	دہلی
۲,۳۳,۲۳,۵۱۸	میزان
اردو کے سب سے زیادہ آبادانہ علاق	
۹,۶۶,۶۱۰	پورنیا (بہار)
۶,۵۵,۲۶۸	مراد آباد (اتر پردیش)
۵,۳۳,۹۳۹	حیدر آباد (آندھرا پردیش)
۵,۱۲,۲۹۰	درہنگا (بہار)
۴,۵۱,۱۱۴	سہ پان پور (اتر پردیش)
۴۵۰,۷۱۲	میرٹھ (")
۴۰,۶۱۶	نئی دہلی (بھاراشہ)
۳,۸۸,۵۱۵	بجور (اتر پردیش)
۳,۷۵,۰۸۳	منظر پور (بہار)
۳,۵۰,۱۳۵	بستی (اتر پردیش)
۳۲۸,۲۳۱	سرانی (")
۳,۰۹,۸۷۴	موتی پوری (بہار)
۳,۰۴,۱۱۲	رام پور (اتر پردیش)

دُنیا کے مسلم ممالک

رقبہ — آبادی — زبان

اَلْجَزَائِر

رقبہ : 23,81,743 مربع کلومیٹر
آبادی : 1 کروڑ 95 ہزار
تعداد مسلم : 90 لاکھ 45 ہزار
دیگر : 10 لاکھ 50 ہزار
پایہ تخت : اَلْجیزیرس
زبانیں : فرانسیسی، عربی
افغانستان

اَلْجَزَائِر

محل وقوع : وسطی ایشیا
رقبہ : 6 لاکھ 50 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی : 1 کروڑ 9 لاکھ 94 ہزار
پایہ تخت : کابل
آبادی کابل : 2 لاکھ 36 ہزار
مسلم : 99 فی صدی

زبانیں : پشتو، فارسی اور مقامی بولیاں

برآمدات : قراقلی کھالیں، خشک میوہ، بادام، تازہ پیم، ادن،
کپاس، قالین، غالیچے وغیرہ
سودنیات : کوٹا، لوب، سونا، چاندی، تانبا، منگیز، نکل، گندھک
جست، گرنیٹ، آسبلطس، ابرق، چشم سفید،
تیل، رنگین پتھر

سترکی

محل وقوع : یورپ، سرکاری زبان : ترکی
رقبہ : 2 لاکھ 96 ہزار 503 مربع میل
آبادی : 2 کروڑ 90 لاکھ 59 ہزار
مسلم : 99 فی صدی
پایہ تخت : اُن قرہ (انگہ)
مراکش
محل وقوع : افریقا

رقبہ : 10 ہزار 50 مربع کلومیٹر
آبادی : 1 کروڑ 16 لاکھ 28 ہزار 232
مسلم : 98 فی صدی
سرکاری زبان : عربی (اور فرانسیسی بھی بولی جاتی ہے)
صومالیہ
محل وقوع : افریقا

رقبہ : 2 لاکھ 70 ہزار کلومیٹر
آبادی : 45 لاکھ
مسلم : سو فی صدی
پایہ تخت : مقدیشو

سرکاری زبان : صومالی (عربی، اطالوی اور انگریزی بھی بولی جاتی ہے)
سودان
محل وقوع : افریقا

رقبہ : 25 لاکھ 8 سو مربع کلومیٹر

سرکاری زبان: فرانسیسی (عربی اور دوسری علاقائی زبانیں بھی رائج ہیں)
اسیران

محل وقوع: مغربی ایشیا
رقبہ: 6 لاکھ 28 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی: 20 لاکھ 67 ہزار 800
مسلم: 98 فی صدی

پایہ تخت: تہران
زبان: ایرانی (فارسی)
لی بیہا

محل وقوع: افریقا
رقبہ: 6 لاکھ 85 ہزار مربع میل
آبادی: 12 لاکھ 50 ہزار
مسلم: تقریباً سو فی صدی

پایہ تخت: بیہیمہ
سرکاری زبان: عربی
لیب نان

محل وقوع: مشرق وسطا
رقبہ: 10 ہزار 400 مربع کلومیٹر
آبادی: 7 لاکھ 50 ہزار
مسلم: 57 فی صدی
پایہ تخت: بیروت
زبان: عربی، انگریزی اور فرانسیسی

سعودی عرب
محل وقوع: جزیرہ نمائے عرب (ایشیا کا مغربی سر)۔
رقبہ: 10 لاکھ مربع میل
آبادی: 1 کروڑ 10 لاکھ
مسلم: سو فی صدی
پایہ تخت: ریاض
سرکاری زبان: عربی

آبادی: 3 لاکھ
مسلم: 82 فی صدی
پایہ تخت: خرطوم
سرکاری زبان: عربی و انگریزی
مارا لطانیہ

محل وقوع: شمالی مغربی افریقا
رقبہ: 4 لاکھ 19 ہزار مربع میل
آبادی: 7 لاکھ 25 ہزار
مسلم: سو فی صدی
پایہ تخت: نوکشوت
زبان: عربی و فرانسیسی
نائی جبر

محل وقوع: افریقا
رقبہ: 12 لاکھ 67 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی: 31 لاکھ 27 ہزار 565
مسلم: 85 فی صدی
پایہ تخت: نیامی
اُردُن

محل وقوع: مشرق وسطا (جزیرہ نمائے عرب)
رقبہ: 96 ہزار 610 مربع کلومیٹر
آبادی: 18 لاکھ 60 ہزار 693
مسلم: 91 فی صدی
پایہ تخت: عمان
سرکاری زبان: عربی

سینیگال
محل وقوع: افریقا
رقبہ: 20 لاکھ 14 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی: 2 لاکھ 32 ہزار
مسلم: 95 فی صدی
پایہ تخت: ڈکار

سنگاپور

یکمسن

محل وقوع : جزیرہ نما عرب

رقبہ : 75 ہزار مربع میل

آبادی : 50 لاکھ

مسلم : 99 فی صدی

پایہ تخت : صنا

زبان : عربی

یکمسرون

محل وقوع : افریقہ

رقبہ : 4 لاکھ 75 ہزار 34 مربع

آبادی : 45 لاکھ 2 ہزار 18

مسلم : 55 فی صدی

پایہ تخت : ددار

زبان : بانوسواصل عربی اور فرانسیسی

کویت

محل وقوع : مغربی ایشیا

رقبہ : 15 ہزار مربع کلومیٹر (57 ہزار مربع کلومیٹر غیر جانبدار)

آبادی : 5 لاکھ

مسلم : 99 فی صدی

پایہ تخت : کویت

سرکاری زبان : عربی

مصر

محل وقوع : مشرق وسطا

رقبہ : 10 لاکھ مربع کلومیٹر

آبادی : 3 کروڑ

مسلم : 91 فی صدی

پایہ تخت : قاہرہ

سرکاری زبان : عربی

انڈونیشیا

محل وقوع : ایشیا سے نیوگنی تک جنوب مشرقی ایشیا اور آسٹریلیا

کے درمیان

رقبہ : 19 لاکھ 4 ہزار 45 مربع کلومیٹر

آبادی : 9 کروڑ 70 لاکھ 85 ہزار

مسلم : 85 فی صدی

ہندو : 6 فی صدی

عیسائی دیگر : 11 فی صدی

پایہ تخت : جکارتہ

پاکستان

محل وقوع : ایشیا

رقبہ : 2 لاکھ 10 ہزار 340 مربع میل

آبادی : 6 کروڑ 10 لاکھ

مسلم : 68 فی صدی

پایہ تخت : اسلام آباد

سرکاری زبان : اردو اور انگریزی

بنگلہ دیش

محل وقوع : ایشیا

رقبہ : 55 ہزار 126 مربع میل

آبادی : 7 کروڑ 50 لاکھ

مسلم : 6 کروڑ 50 لاکھ

ہندو، جہلم

اور عیسائی : 1 کروڑ

پایہ تخت : ڈھاکا

سرکاری زبان : بنگلہ اور انگریزی

○ مسلم آبادی کے لحاظ سے دنیا میں پہلا

بڑا ملک انڈونیشیا، دوسرا بنگلہ دیش اور

تیسرا ہندوستان ہے۔

○ ○ ○
’میں نہ آیتھن کارہنے والا ہوں اور نہ یونانی میں تو دنیا کا شہری ہوں‘ سقراط

اردو کے آٹھ سو برس

اس ہندی بھاشا کی بڑی سہ سے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی گئی ہے یعنی اردو کو مغربی ہندی کی ایک شاخ بھی کہہ سکتے ہیں مگر آج کی جو اعلیٰ ہندی ہے وہ اردو ہی سے پیدا ہوئی ہے وہ اس طرح کہ جب اردو سے فارسی و عربی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیئے جلتے ہیں تو وہ شندھ ہندی بن جاتی ہے اور اسی ہندی میں شرکی اعلیٰ اور معیاری کتابیں تصنیف کی جاتی ہیں۔ اپنے ماخذ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو ہندی ایک ہی زبان ہے، بس دونوں کی پرورش مختلف طریقے سے ہوئی ہے۔ اردو کو پلٹنے پلٹنے والے چلنے کے مسلمان کہتے ہیں اس لئے اپنی مذہبی و تمدنی قدروں کی بنا پر وہ اردو میں فارسی و عربی الفاظ، ترکیبیں، تلمیحات اور استعارے شامل کرنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے اردو کو اس حد تک فارسی و عربی آمیز بنا دیا کہ وہ غیر کی زبان معلوم ہونے لگی اسی طرح ہندی سنسکرت سے جا ملی اور نتیجے میں ہندی اور اردو میں شرق و مغرب کا سابقہ پیدا ہو گیا۔

دیکھی ہندی یا اردو پر فارسی اس لئے بھی اثر انداز ہوئی کہ فارسی خارج سلاطین کی زبان تھی اور ہندی مفتوح قوم کی مفتوح پر فاتح ہمیشہ اثر انداز ہوتا ہے بلکہ فاتح مفتوح پر و استہ اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اگر جیسے بیکولر بادشاہ کے عہد میں بھی اپنے آقا کی خوش نودی کی خاطر ہندو وزیر مال ٹوڈرل

آریائی رشتے سے سنسکرت اور قدیم فارسی (زرتشت) ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔ ہندو سماج جب چار ذاتوں میں تقسیم ہو گیا تو براہمنوں نے اپنی زبان سنسکرت کی پاکیزگی کو محفوظ رکھنے کے لئے شوروں سے سنسکرت میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اپنی زبان کے تقدس کو اتنا بڑھایا کہ سنسکرت کو دیوبانی یعنی زبان الاهی قرار دیا اور اس زبان کا اتنی بلند آواز سے بولنا یا پڑھنا کہ خود کے کان تک پہنچے پاپ سمجھا گیا۔ چنانچہ براہمنوں نے فتورہوں اور عام لوگوں سے جس زبان میں بات چیت شروع کی اسے پراکرت کہا گیا۔ جس طرح سنسکرت آواز سے پیراستہ، معشقا، مقدس تھے یا مذہب لوگوں کو کہتے ہیں اسی طرح پراکرت طبیعت سے خارج کی ہوئی چیز کو یا غیر مذہب زبان کہتے ہیں۔ چوں کہ پراکرت میں بے شمار الفاظ سنسکرت کے موجود ہیں اور تقریباً گرامر بھی وہی ہے اس لئے پراکرت کو سنسکرت ہی کی بڑی سمجھا گیا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں ہندستان کے ہر علاقے کی اپنی ایک بولی تھی اور جہاں کے لوگوں کی بول چال کی ضرورت کو پورا کرتی تھی سنسکرت لکھنے پڑھنے اور خواص کی زبان تھی۔ پراکرت عام زبان تھی اور ہر علاقے کی زبان اپنے علاقے کے تعلق سے بھاشا کلاسی تھی۔ مقرر کے علاقے کی برج بھاشا کو اب حیات دے کر لانا عجیب اور آدے اردو کی ماں کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو

ہنگن کاہنستائی ملان نمبر

الفاظ خلط خلط ہوئے تو ایک نئی زبان پیدا ہوئی جس نے اردو نام پایا۔ جب اردو خاصی میٹاری ہو گئی تو شاہ جہاں نے اس کو اردو مطلقاً کہہ دیا۔ اردو نام بہادر شاہ ظفر کے عہد میں زیادہ مقبول ہوا۔

اردو کا رسم خط

اردو زبان کا رسم خط وہی ہے جو عربی و فارسی کا ہے۔ حروف بھی تقریباً وہی ہیں۔ وہ آدھائیں جو عربی و فارسی میں نہیں پائی جاتیں ان کے لئے ہندی سے چند حروف لیے گئے ہیں جیسے ٹ - ٹھ - ڈ - ڈھ - ڈڑ - ان آوازوں کو شکل دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ت - د - ز - پر چھوٹے سا ئز کی د بنا دی جاتی ہے۔ پہلے ط کی جگہ چار نقطے (:) لگا دیا کرتے تھے۔

اردو نے کیا لیا اور کیا دیا

ہندی بھاشا نے اردو بننے کے لئے ان چیزوں کے نام جو عرب و ایران سے ہندستان میں آئی تھیں ویسے کے دیے ہی لے لئے۔ جیسے لباس میں فرغل - بادہ - کڑا - تبا - چوفا - آستین - گریبان - پانجام - انار - عامہ - دوال - شالی - دوشالہ - کیکہ - کھاڈیکہ - برقع - پوتین - دیوہ - کھانے کے سسلے میں دسترخوان چٹا - شیرمال - باقرانی - پلاؤ - زردہ - مڑ عفر - طیبہ - قورمہ - منجن - فرنی - ماقوی - حریرہ - حریرہ - لور - مڑی - اچار - فالودہ - گلاب - بینگ - خوان - طبق - رکابی - تشری - کف گیر - چچہ - سینی - کشتی - چائے - جوش وغیرہ - متغقات میں حمام - کیکہ - مابون - شیشہ - شمع - شمع دان - فانوس - گل - گیر - نمود - رفیدہ (بھوس بھری ہوئی گول گدی جس پر روٹی رکھ کر نمود میں لگاتے ہیں) - مشک - ناز - روزہ - عیب - شب برات - قاضی - ساتی - حقہ - پنچہ - چلم - تنگ - بندوق - گنجھ - پستہ - بادام - منقا - شہوت - بیدانہ - خوبانی - انجیر - سیب - بھی - ناشپاتی - انار وغیرہ۔ اور بھی عربی و فارسی کے الفاظ ایسے ہیں کہ جو کثرت استعمال سے اپنا مستقل مقام بنا چکے ہیں جیسے دقل - فراش - مزدودہ - دکیل - جلاؤ - مڑت

نے حکم جاری کیا تھا کہ ہر سرکاری ملازم کے لئے فارسی لکھنا ضروری ہے۔ جب دربار کی زبان فارسی قرار پائی اور دربار کے لئے فارسی زبان کا جانا لازمی ہو گیا تو فارسی کی زبانوں پر بھی اثر انداز ہوئی اور عربی قابلیت کے اعتبار سے لے بھی عربی و فارسی الفاظ کا استعمال بڑھ گیا اور اس طرح ہندستان کی اردو مصنوعی والدین کی گود میں پلنے لگی

اردو کی وجہ تسمیہ

۱۷ ویں صدی سے یورپی سیاح ہندستان میں آنا شروع ہوئے۔ انھوں نے شمالی ہند کی زبان کو آندھستان "پنڈھستانی" اور پھر بعد میں "ہندستانی" کہنا شروع کیا۔ ۱۸ ویں صدی کے مورخوں نے لاطینی زبان میں اس کو "لنگوا ہندستانی" کا بھی لکھا ہے اور بیس انگریز تاریخ دان اس زبان کو "مورز" (Moor) بھی کہتے تھے ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلے جان گل گرائٹ نے (اردو) کو "ہندستانی" کہا مگر بعض جگہ اس نے "ہندستانی" کے لئے "اردو" لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کو "ہندی" بھی کہا گیا یعنی جو لوگ عربی و فارسی نہیں سمجھتے تھے ان کے لئے ہندی زبان استعمال کی جاتی تھی۔ ریختہ (مختلف الفاظ سے ملی جلی) اردو کو تب کہا گیا جب وہ بول چال کی منزل سے نکل کر ادبی اعتبار سے معیاری بننے لگی اور کسی الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے الفاظ بھی کثرت سے شامل ہونے لگے۔ بازار اور جاہل فوجیوں کی اردو اور ادبی اردو میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے بھی معیاری زبان کو ریختہ کہا گیا۔ مگر زبان کے عام ہوجانے پر ریختہ کا لفظ خارج ہو گیا۔ بعض مورخین نے "اردو" کو سنسکرت زبان کا لفظ قرار دیا ہے مگر زیادہ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ "اردو" ترک زبان کا لفظ ہے جس کے معانی فوج یا کیمپ یا لشکر کی بولی کے ہیں۔ چنانچہ اردو زبان ہے جو سنسکرت، بھاشا، عربی، فارسی، ترکی، اور انگریزی دیو سے مل کر بنی ہے۔ شاہ جہاں کے لشکر میں ہر ملک کا آدمی موجود تھا۔ ان کی آپس کی بات چیت، میل جول اور بازار سے خرید و فروخت کرنے کے سلسلے میں جب ہر زبان کے

گلن کا ہندستانی مسلمان تعبیر

مضامین - کماں - توشک - چادر - صورت - شکل - چہرہ -
 طبیعت - مزاج - برف - فاحشہ - قری - آتما - کبوتر - بلبل - پر
 دوات - قلم - سیلاب - جلاب - رتھ - عینک - صندوق - کرسی
 تخت - کام - رکاب - زین - تنگ - پوزی - نعل - کول - عقیدہ
 دفا - بے دفا - ہمار - بادبان - تہمت - پردہ - دالان - رخا - تنخواہ
 لوح - تانہ - غلط - صحی - کسد - کادک - ترازو - شترخ - دیگرہ -
 مگر بہت سے عربی و فارسی اور ترکی الفاظ جب اردو میں آئے
 تو کسی حد تک ان کی صورت بھی بدلا اور بہت حد تک معانی بھی بدلے
 فیلسوف : جسے عربی میں حکیم اور انگریزی میں ٹانکر
 یا فلاسفر کہتے ہیں مگر اردو والے فلسفی کو دفاباز اور دکار کے معانی
 میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

آبا - امّا : آب اور ام سے نکلے ہیں۔
 خصم : عرب میں مقابل کو یا دشمن کو کہتے ہیں مگر اردو
 میں یہ لفظ شوہر کے لیے عزیز رشتہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
 اخلاص : عربی میں خاص کرنے کو کہتے ہیں۔ اردو میں
 پیارا یا محبت کو کہتے ہیں۔
 خیرات : عربی میں نیکیوں کو کہتے ہیں۔ اردو میں خیرات
 کے معانی چیرٹی یا دان کے ہیں۔
 متکدر : عربی میں دوبارہ کہنے یا کرنے کو کہتے ہیں اردو
 میں جھگڑنے کو کہتے ہیں۔
 طوفان : عربی لفظ ہے مگر فارسی میں کسی نے کی زیادتی
 کو کہتے ہیں۔ مگر اردو والے اس لفظ کو تہمت کے معانی میں بھی
 استعمال کرتے ہیں۔

خفیف : عربی میں ہلکی چیز کو کہتے ہیں مگر اردو والے
 رخصت کرنا - ختم ہونا کہنے کے معانی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔
 مصالح : مصلحت کی جیسے : عربی زبانی میں نیکیوں
 یا بھلائیوں کو کہتے ہیں مگر اردو میں عمارت کے تعمیر سامان
 (چونا، گالہ، مٹی) کو اور سالن میں پڑنے والی چیزوں (مرج، دھنیا
 اورک، میاز، لہسن، وغیرہ) کو کہتے ہیں۔

خاطر : عربی فارسی میں دل یا خیال کے معانی میں
 گھٹن کا ہنسنائی مَلان نمبر

استعمال کرتے ہیں مگر اردو میں تو اس کے معانی میں بولتے ہیں
 اور اس طرح بھی کہتے ہیں۔ کام تو ہماری خاطر ضرور کیجئے۔ !
 افراق (فراق) : اصل میں یہ افراط و تفریط جیسے دو لفظوں
 سے بنا ہے اور معانی ہیں انتہائی بہتات اور انتہائی کمی۔ مگر اردو
 میں جلدی یا اہل محل کے معانی میں بولتے ہیں۔

قلاہنج : ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کے خالص
 کو کہتے ہیں۔ اسی کے کڑا اپنے کے گڑ کو بھی قلاہنج کہتے ہیں مگر اردو
 میں چوہا کے کی چوڑی یا چھلانگ کو کہتے ہیں۔
 آکا : ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ اردو والے آکا
 یا اردو دست کہتے ہیں۔

قبورق : ترکی میں محفوظ شدہ چیز کو کہتے ہیں۔ مگر اردو
 میں جسے سرکار ضبط کر لے اسے (قرق) کہتے ہیں۔
 منشاطہ : عربی میں مشط لکھی کو کہتے ہیں۔ فارسی میں خط
 اس عورت کو کہتے ہیں جو عورتوں کو بناؤ سنگار کرتی ہے جیسے
 ہندستان میں نائیں مگر اردو میں منشاطہ (سیم پریش) اس عورت کو
 کہتے ہیں جو لڑکے یا لڑکی کے لئے رشتہ تلاش کرے۔ منشاطہ کو
 انگریزی میں MATCH-MAKER کہتے ہیں۔

مرغ : فارسی میں پرندے کو کہتے ہیں اردو میں مرغافان
 (FOWL) کو کہتے ہیں۔

چخ : ترکی میں باریک پرندے کو کہتے ہیں اردو والے
 چن بولتے ہیں اور بایس یا سروے کی تیلیوں کے پرندے کو کہتے ہیں
 کتّا : ترکی میں بڑے کو کہتے ہیں اردو میں مٹے کو بولتے
 ہیں۔ ہٹاکٹا اردو محاورہ ہے۔

روزگار : فارسی میں زمانے کو کہتے ہیں مگر اردو میں نوکری
 یا ملازمت کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

بہت سے الفاظ کے معانی بھی بدلے اور صورت بھی بدلی جیسے
 روپاک یا دست پاک : رومال
 خیر و صلاح : خیر سلا
 شوربہ یا سوربہ : شوروا
 کیسہ : کھنسا

میں دال (غلے کی) بنانا یا ڈالنا کہتے ہیں
 کشیں : دودھ یا پھیر۔ اردو میں دودھ اور چاول سے
 تیار ہونے والی کھیر کہتے ہیں۔
 گامٹا : اردو میں گٹا بن گیا مگر گندیری میں ڈبائی رہی
 ماش : یا مکھ، ہندی میں ماس مگر سنسکرت کا ماش اردو
 میں مینا بن گیا۔

اگر بزدل کے دور حکومت میں جب انگریزی زبان نے فروغ
 پایا تو اردو زبان نے بھی اس سے اثر لیا اور اردو میں انگریزی کے
 خوب خوب پیوند لگ گئے۔ اب کسی کو مشکل ہی سے یقین آئے گا
 کہ مکالمہ اٹالوی لفظ ہے۔ نیلام : بڑا گلی۔ پادری۔۔ لاطینی
 اور بوتام : فرانسیسی لفظ ہے۔ لالٹن (لین ٹرن) اظام راجا (پس)
 جس (پکس) دجہ (ڈزن) پستول (پشٹل) ارٹل (ارٹل) بلانم
 (میٹم) بگھی (بگھی) بکٹ، پش، سردس، اسٹیشن، ٹکٹ
 ریل۔ کچن، بوتل (بائل) ٹین، مٹکاس، موٹر۔ سائی کل، مشین
 پوس وغیرہ سیکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں بھرے ہوئے ہیں۔
 کہتے ہیں انسان کے جذبات پہلے کام کرتے ہیں دماغ
 بعد میں۔ شعر کو انسانی جذبات تخلیق کرتے ہیں اور نثر دماغی فکر
 کا نتیجہ ہوتی ہے اسی لئے انسان قافیہ پیمانی اور یک بندی پر عمل
 کر کے شعر پہلے کہتا ہے پھر کاغذ پر لکھتا ہے۔ پہلے
 شعری ایک موثر میٹیم اور زندہ قوت تھا۔ چنانچہ دنیا کے
 سب سے ادیبوں کی ابتدا شعری سے ہوئی۔ اردو ادب کی شروعات
 ایمر خسرو کے کلام سے ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے اردو
 زبان میں شعر کہا، اردو زبان میں غزل کہی۔ مگر وہی دکنی پہلے صاحب
 دیوان شاعر ہیں۔ محمد شاہ کے عہد میں جب دکنی پہلے پہنچے تو وہی
 کے امراء ان کے ساتھ بڑی سربدہری سے پیش آئے۔ دکنی کے
 صوفی شاعر گلشن نے دکنی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی شاعری کی دکنی
 اردو کو فارسی الفاظ سے ریختہ کہہ کے فصیح بنائیں۔ چنانچہ
 1722 میں جب دکنی دوبارہ دکنی پہنچے اور اپنا نظریاتی کیا
 ہوا کلام دکنی فالوں اور اہل دربار کو سنایا تو ان کی بڑی آواز
 بھگت ہوئی اور وہ ریختہ کے مجدد قرار دیئے گئے۔

کاگل : کھل
 ہاون دستہ : ہام دستہ
 بزاز : بھار
 پزاوہ : پجواہ
 تار بانی : ٹاٹ بانی
 زری کہنہ : زری کوتا
 طعن و تشنیع : تانے بٹانے
 زرق زق : بق بق
 قیورق : قرتی
 سنسکرت زبان کے بھی بہت سے الفاظ اردو زبان میں
 داخل ہوئے گزشتہ کے ساتھ ساتھ ان کی شکل و صورت بھی کافی بدل
 گئی جیسے :
 چورن : سنسکرت لفظ ہے معنی ہے آٹا۔ بھاشا میں
 چورن کہنے لگے اور اردو میں چورن یعنی پسی ہوئی دوا۔ اسی لئے
 کٹی ہوئی چیز کے نیچے جوار یک اجزاء جلتے ہیں اس کو چوڑکتے ہیں۔
 پشت : یہ سنسکرت کا لفظ ہے اردو کا لفظ پنہاری
 (آٹا پیسنے والی عورت) اس سے بنا ہے۔
 آٹ : ہندی اور اردو دونوں میں آٹا کہتے ہیں۔
 وارثا : یا ورت۔ اردو میں بات بن گئی۔
 چتوڑھر : سنسکرت کا یہ لفظ اردو میں آکر چوڑھی
 بن گیا۔

چند : سنسکرت کا چند اردو کا چاند ہے اور چاندنی
 یعنی چاندنی۔
 گڑھ : اردو میں گھر بن گیا اور فارسی کا کدہ بھی اسی سے
 لیا جاتا ہے۔

ہست : اردو میں ہاتھ یا ہات
 ہستی : سنسکرت میں اردو کے ہاتھی کو ہستی کہتے ہیں۔
 بارد : سنسکرت میں بارو، ہندی بھاشا میں بادراوہ
 اردو میں بادل یعنی آب۔
 دل : ایک چیز کے دودھ کو گڑھے کہنے کہتے ہیں اردو

اردو زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھانے کا بھی سلسلہ شروع ہوا اور ۱۸۴۲ء میں دہلی میں ترجمہ کے لئے ایک سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی۔

ڈیٹی نذیر احمد اور عبد الحلیم شرر سے واضح طور پر اردو ادب کی ابتدا ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" لکھ کر تنقید اور تبصرہ نگاری میں پہل کی۔ پریم چند سے اردو افسانہ شروع ہوا۔ سر سید نے اردو شعر کے تکلف و تصنع کو دور کر کے زیادہ سہول بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں مولانا حالی کی فنی نظموں اور نچرل شاعری اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلی اور مولانا ذکاوانہ کا اثر کا تاثر بھی تصانیف، مولوی چلرخ علی اور نواب محسن الہ آبادی کے اخلاقی و پولی ٹی کل اور تعلیمی لیکچروں نے سرسید کے کارکردہ زیادہ تقویت پہنچائی۔ اردو کے دربار میں اردو ڈرامے نے جنم لیا جو آغا حشر کشری کے عہد میں بہت زیادہ ترقی پا گیا۔

اردو کی اشاعت کا ذریعہ

ہندستان میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت بھکتی یا تصوف کے ذریعہ ہوئی۔ دہری زبان فارسی تھی اور عوام کی زبان بھاشا تھی یا وہ زبان تھی جو بعد میں اردو کہلائی چنانچہ صوفیوں نے اپنے بھکتی مشن کے لئے عوام ہی کی زبان کو اپنا میڈیم بنایا۔ دکن کے اردو شعرا، ہوں یاد علی کے اردو شعرا، اردو کے ابتدائی دور کے تمام شعرا، صوفی تھے اور انھوں نے اپنے مشن کی جو تبلیغ کی اس کے نتیجے میں اردو کو فروغ حاصل ہوا دکن کے بہمنی حکمران بھی اردو کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے وہ چول کہ شیعہ تھے اور ماہ محرم میں مجلس منعقد کرتے تھے اس لئے اپنی مجلسوں کی جانب عوام کو رجوع کرنے کی غرض سے انھوں نے فارسی مرثیوں کی جگہ اردو (دکنی اردو) مرثیوں کو رائج کیا۔ خزانہ، سراج اور مینائے جیسے اردو شاعروں

شاہد اردو شعر کی سب سے پہلی کتاب "تہ جہار درویش" جو دہلی فارسی، فخر زمر مستح کا اردو روپ تھی۔ مترجم تھے میر محمد علی خان تھیں، یہ لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ (۱۷۹۸ء) کے عہد کی بات ہے۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان رگل گرائسٹ نے چاہا کہ اسی کتاب میں تیار کر لائی جائیں جو انگریز محاکوں اور ہندوستانی مایا کے مابین میل جول پیدا کرنے میں مدد دیں اور وہ میل جول کی انتظام کے سلسلے میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ اسی لئے جان رگل گرائسٹ کے زیر انتظام ۱۷۹۹ء میں میر شیر علی انیسویں نے باغ اردو ۱۸۵۵ء میں "آرائش محفل" لکھی۔ میر اسد دہلوی نے ۱۸۵۲ء باغ دوبارہ لکھی اور "اخلاق حسنی" کا ترجمہ کیا۔ جان رگل گرائسٹ نے انگریزی زبان میں "قواعد اردو" تیار کی۔ ۱۸۵۳ء میں لوی ہال کوئی نے "پریم ساگر" تصنیف کی محمد شاہ کے عہد میں مہر نال پسی "جو سنسکرت سے بھاشا میں ترجمہ کی گئی تھی ۱۸۵۵ء میں مظہر علی نے اسے عام فہم اردو کا روپ دیا۔ میر انشا راشر خاں نے ۱۸۵۷ء میں قواعد اردو اردو میں لکھ کر پہل کی۔ اور اردو کی مقبولیت دیکھ کر ۱۸۵۷ء میں مولوی شاہ عبدل قادری نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا۔ مولوی اسماعیل نے بھی چند اسلامی رسائل اردو میں لکھے۔ وہ اہل تہذیب انگریزوں کے لئے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں ترجمہ کرنے اور آسان اردو میں نئی کتابیں تصنیف کرنے کے لئے جمع کئے گئے تھے ان میں سید محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میرامن جعفری، احمد اکرام علی، مرزا علی لطف دہلوی کے نام اہم ہیں۔ ابتدائی عہد میں مرزا وجہ علی بیگ سردار کی نثر مقفائیں "فسائے عجائب" تصنیف کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

جان رگل گرائسٹ ہی کی کوششوں سے ۱۸۳۵ء سے اردو سرکاری دفاتروں کی زبان بننے لگی اسی سلسلے سے اخبار کو آزادی حاصل ہوئی اور دہلی سے ایک اردو اخبار جاری ہوا

لے ایک شاعر جو فضل بخش کہتے تھے انھوں نے محمد شاہ کے عہد (۱۱۴۵ھ) میں ایک مجلس بھی تھی اس کا دیباچہ ظاہر ہے نثر میں تھا چنانچہ اس دیباچہ کو بھی اردو کی پہلی تصنیف کہا جاسکتا ہے۔

قری، شمشاد، نرگس، فائزہ گل گوشت، الی و بہ زاد۔ راہ ہفت خواں
کوہ الوند، کوہ بے ستون، جوئے خیر، قہر شیریں، بھول بھول، فرودجا
بریں، طوطی کی چمک، بلبل کی نغمہ سنجی، ایران لودان، خواسان اور
اردو پرستی جیسی چیزیں یا باتیں نہ ہندستان میں پائی جاتی ہیں اور
نہ ان کا ہندستان کی سرزمین سے کوئی تعلق ہے۔ اردو نظم کار
جو اردو کو ہندستان کی اور ہر فرستے کی زبان کہتے رہے ہیں انہوں
نے بھول کر بھی اپنے وطن کی ایک حسین چیز کی بھی قدر نہیں کی جبکہ
اپنے وطن عزیز میں بھونرا بھی تھا اور کنول کا پھول بھی۔ مولانا بھی
تھا اور سنس بھی، میگھ جاسن کی ٹہنیاں، شیشم کی چھاؤں، کھرنی
کی شاخیں۔ فلسفے کے پیر، چاندنی کی بیل، کم رنگ کے درخت
عشقی پیچ، نیم کے چوں کی سبزی، آم کا مور، موسی کے پھول،
بھونرے کی آواز، کوئل کی کوک، کولے کے بول، موٹی بھنگار
پیسے، اک پکار، چنبیلی کا جھرمٹ، سارس اور بنگوں کی قطار و بادل
کی کوک، بجلی کی چمک، اسنت رت کا سما اور کیا کچھ نہیں تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب (نثر و نظم) میں مصنوعی
رنگ پیدا ہو گیا اردو شاعری فارسی و عربی ادب کا محض پرہیز
کرہ گئی اور قافیہ سہائی نے اسے ایک رسمی چیز بنا دیا۔ نثر میں خلقت
کھلائی اور تاثیر ختم ہو گئی۔ اردو شاعری کا اگر ہندی شاعری سے
موازنہ کیا جائے تو ہم جس پرستی کی بنا پر اردو شاعری غیر فطری
ہے اور چوں کہ ہندی شاعری میں عورت عاشق بن کر اپنے
پتی کے فراق میں گر کر رہتی ہے اور اخلاق اعتبار سے ہی ورتا
ہونے کا ثبوت دیتی ہے اس لئے ہندی شاعری پھل ہے
تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے اردو شاعری قابل تعریف نہیں
مغربی شاعری کی دعوت کو دیکھتے ہوئے اردو شاعری کا دائرہ
ہمت ہی محدود نظر آتا ہے۔ مغربی شعراء جن قدرتی مناظر سے
متاثر ہوتے ہیں وہ اردو شعراء کے لئے باعث کشش نہیں بنتے
اردو شاعری رونے دھونے و حزن و یاس کی شاعری ہے
یا خشاہد پسندی (قصیدہ خوانی) کی یہی وجہ ہے کہ اردو زبان
کا شاعر عمل کی دنیا کا انسان نہیں ہوتا غرض کہ غیر ملکی اثرات
نے اردو کو ایک ہی فرستے کی زبان بنا دیا ہے اور اردو مخصوص

نے خواہی دربار کی ہمت افزائی پر اردو زبان میں بہت سے
رشتے کئے اور نتیجے میں اردو عوام میں مقبول ہوتی گئی۔ عیسائی
پادریوں کی تصانیف نے بھی اردو زبان کو آگے بڑھایا۔ خصوصاً
طور پر وہ پادری جو بنگال کے میراج پور کے علاقے میں رہتے تھے
انجیل مقدس کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کرتے تھے اور عوام تکمیل
کا پیغام پہنچاتے تھے اردو زبان بھی عیسائی تبلیغ کا ذریعہ بنی 1859ء
1814ء تک انجیل کے جو ترجمے ہوئے وہ زیادہ تر اردو ہی میں ہوئے
اور اس کے ساتھ ساتھ عیسائی تبلیغ کے لئے بہت سے رسل اور
کتابچے اردو ہی زبان میں تصنیف کئے گئے۔ یہ مناظروں کا بھی عہد تھا
مسلمانوں کے مذہبی مناظرے پادریوں سے ہوتے، ہندوؤں سے
ہوتے اور آپس میں بھی ہوتے مناظروں سے پہلے اور بعد میں
رسل تصنیف ہوتے اور عوام میں ان کو تقسیم کیا جاتا۔ نتیجے میں
اردو زبان کی بھی اشاعت ہوئی۔

اردو زبان پر غیر ملکی اثرات

اردو زبان اگرچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ہندستانی ہے
مگر اس کا مزاج قطعی طور پر غیر ملکی ہے۔ قواعد علم و عروض، تلمیحات
استعارات، ترکیب اور محاورے، ہر لحاظ سے اردو نثر و نظم کا
مزاج ایران و عرب سے تعلق رکھتا ہے۔ جن قدروں کا اردو زبان
کے ذریعے پرچار کیا جاتا ہے وہ اسلامی ہیں یعنی جن باتوں کو
اس ملک سے کوئی تعلق نہیں وہ تمام اردو نثر و نظم کی اساس
ہیں۔ اردو نثر نگاروں اور شاعروں نے خود ہندستانی ہونے کے
باوجود ہمدردی کے سلسلے میں ہمیشہ رستم و سہراب کو یاد کیا جب کہ
یہ بھیہم دارچن کا دس ہے۔ حسن و جمال میں بیلا یا آئی یا شیریں مگر
میر یا سوسنی کو کبھی یاد نہیں کیا۔ دجل و فرات یاد ہے مگر آنکھوں
کے سانچے بننے والی گنگا و جہا یا نہ آئیں۔ آب زمزم کو تو تبرک
سمجھا۔ لیکن گنگا جل کی خوبوں پر کبھی غور نہ کیا اور نہ کبھی آنکھوں کے
بجائے مانجھا یا دیا۔ بلبل، شبنم، بنفشہ، مشک، ریحان، بکبک
دری و خوشتر، فتنہ، قیامت، بہار، خزاں، نسیم، صبا، سکندر، یونانی
ارسطو، ثانی، یوسف، ثانی، حاتم، عنقہ، ہما، ماتی، سوسد

گلن کا ہندستانی مسلمان شاعر

ذہبی حدود اور تہذیب و تمدن کی ترجمان بن کر رہ گئی ہے۔
سہولت کی خاطر اردو کی تاریخ کو اگر تین دور میں بانٹ دیا
جائے تو ہر دور کا خلاصہ یہ ہوگا۔

پہلا دور : اردو اس ہندی بھاشا بھڑی بولی سے نکلی
ہے جو کبھی دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی، امیسو نسرو
(1325-1255ء) ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے پہلے
شاعر مانے جاتے ہیں۔ دلی دکنی پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں
دلی کی دکنی اردو وراہل ہندی، ہمال، تلنگو اور اسلائی اصنامات
کا مرکب تھی۔ دلی جب ریختہ میں گئے تو ان کا کلام صاف، سلاوا
اور فصیح ہو گیا۔ صوفیا کرام کے ذریعے اردو ہندستان کے ہر گوشے
میں پہنچی یہاں تک 18 ویں صدی میں اردو جہاں مگر آباد تھا
اور سند آباد تک پہنچ گئی۔ اور اس اور میور میں قطب شاہی عہد
سے اردو کا چلن شروع ہوا۔ مگر گجرات میں ابتدائیں اردو کو
گہری کہتے تھے۔ اردو کے اس سے پہلے دور سے جو اردو تصنیفات
تعلق رکھتی ہیں ان میں خاجہ سید اختر جہاں گیر سمائی کا رسالہ
"اخلاق و تعویض" جس کو اردو کی قدیم ترین (1308ء) نثری
کتاب سمجھا جاتا ہے۔ قاضی محمد صالح کی نثری "اخلاق حسنہ" کا بھی
قدیم اردو کتابوں میں شمار ہوتا ہے جو 1707ء کی تصنیف ہے بعض
اہل دکن شہر مید آباد کے بانی محمد علی کو اردو زبان کا پہلا صاحب
دیوان شاعر کہتے ہیں اسی کے مدداری شاعر اسد اللہ وجہی نے
"قطب شہر کی گہری جو دکنی اردو میں پہلی نثری مانی گئی ہے۔ اور
عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں جو "سب رس" تصنیف کی
اس کو اب دکن اردو نثر کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔ قدیم نثری تصانیف
میں خاجہ سید محمد حسینی کے تصنیف کردہ (1708ء) "رسالے
"معراج عاتقین"، "شکار نامہ"، "ہدایت نامہ"، "سہ بارہ" اور
ان کے صاحب زادے سید محمد اکبر حسینی کے "رسالے نفا و عشق"
اور نظامی کی ایک "ستفہ متون" "کم راؤ اور پدم راؤ" کو بھی
شمار کیا جاتا ہے۔ دلی و دکن کی بھی دو مشہور زبانیں ہیں۔ جو
1119ء سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوسرا دور : 1780ء میں لارڈ ولزلی نے ایسٹ

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

انڈیا کمپنی کے ملازمین کے بچوں کے لئے سکھتے میں فوٹ و لیم
کالج قائم کیا۔ ڈاکٹر جان گل گراؤٹ کو اس کا پرنسپل مقرر کیا
گل گراؤٹ کو علم ادب اور تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا
انہوں نے ایک ادبی انجمن بنائی جو میلسن دہلوی، حیدر بخش حیدر
میر شیر علی آٹوس، لالہ ہلال چند لاہوری، مرزا علی لطف، مرزا
کاظم علی عوان، منظر علی دلا، اور سہری لالہ کو پر مشتمل
تھی۔ لالہ ہلال ہندی نثر میں کہانیاں بھی لکھتے تھے اور اپنے ساتھی
قلم کاروں کو ہندی سے اردو ترجمہ کرنے میں مدد بھی دیتے تھے
اس انجمن نے جو کہ میں تیار کیں ان میں باغ و بہار، توہا کہانی،
آرائش محفل، باغ اردو، گل زادہ نش، نثریے نظیر گل بکا دلی
وغیرہ اہم ہیں۔ اس دور کی اردو پہلے دور سے کافی بولی تھی۔
پہلے بے ربط جملوں، بے جوڑ فقروں اور مشکل تلفظ والے لفظوں
کا بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ دکنی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی اور
لفظوں کو بے موقع اٹھا بٹھا کر اور مطلب کو غیر ضروری طور پر الٹ
بھیر کر وضع کرنے کی کوشش سے عبارت ناقابل فہم بن جاتی تھی
دوسرے دور کے مصنفین نے الفاظ کو تراش تراش کر مترنم بنایا۔
اور جملوں کو سادہ اور سلیس بنایا اور صحیح معانی میں اردو کا ایک
زبان بن گئی مگر اسی دور میں رجب علی بیگ مترنم دکنی (کھنوی) نے
زبان کو "اردوئے معلّے" "اردوئے مطلق" بنادیا اور تکلف
و فصیح سے آراستہ کر دیا۔ اسی دور سے مفق و بسیج کی بدعت
شروع ہوئی۔ سہروردی کے خزانہ عجائب کا طرز و سہروردی نے
بھی اپنا یاد دہیہ ہے کہ مرزا غالب جو خدا اردو نثر میں ایک طرز
کے موجد ہیں سہروردی کی پیدا کی ہوئی بدعت کو اختیار کر بیٹھے۔
تیسرا دور : اگرچہ یہ دور مرزا غالب کے ان خطوط سے
شروع ہوتا ہے جو اردوئے معلّے کے نام سے شائع ہوئے اور
آج تک اپنی طرز کی بنا پر سب سے جلا اور سب سے ممتاز ہیں اور
اب تک اس سلسلے میں غالب نے اپنا حریف پیدا ہونے نہیں
دیا۔ مگر یہ اردو زبان کا اصلاحی دور ہے اور غالب کے اسی دور
پرنسپل سید اسکوئی آف اردو کی بنیاد رکھی گئی۔ پرنسپل کی دوزخی
نگاہ نے یہ باطل یا تھا کہ سہروردی مفق و نثر مستقبل میں مقربیت

ہوگی۔ اس لئے انھوں نے مرزا غالب کی ترقی کو نمونہ بنا کر اردو زبان کو سلیس، عام فہم اور سادہ بنانے کی کوشش شروع کی چنانچہ سرسید امدان کے ساتھیوں نے اسی سلیس اور سادہ زبان اردو میں آبی یادگار کتابیں تیار کیں جو اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ بن گئیں۔ اس تیسرے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ سرسید امدان کے ساتھی پروفیسر ذکا، اسٹو، نواب محسن ال ملک، نواب قتال ملک مولوی چلغ علی، مولانا شبلی، مولانا حالی اور سرسید کے ہم عصر تھے۔ آزاد، پنڈت رتن لال سرشار، مولانا عبدل علیم شتر، وغیرہ نے اردو زبان کو سادہ، سلیس، عام فہم بنایا اور زبان کو عالمانہ بیان بھی عطا کیا۔ زبان کو اس طرح صاف ستھرا بنا کر اس میں اصلاحی، مذہبی، سماجی، تاریخی اور علمی کتابیں لکھی گئیں۔

اس تاریخ اردو کا حاصل یہ ہے کہ اردو کی عمر آٹھ سو برس ہو چکی ہے مگر اس کا دامن ابھی تک ٹیک ٹی کل، سائنسی ٹیک اور جدید علوم سے خالی ہے۔ اردو پر جاگیر دارانہ دور کی ذہنیت بدستور حاوی ہے۔ جمہوریت اور سیکولرزم کا عرفان بھی اسے ابھی حاصل نہیں ہو سکا ہے اس لئے اردو ادب کا آج کے عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں۔

اردو کی اس سدا بہار کس میر سی کا سبب ؟
برسوں پہلے اب حیات کے صاحبِ رائے مُسنف

شمس ال علی مولوی محمد حسین آزاد نے کہا تھا: ”خاتمہ کلام اس فقرہ پر ہو گا کہ کوئی پند اپنے بازوؤں سے بڑھ کر نہیں مار سکتا۔ اردو کے بازو فاری بھاشا اور سنسکرت وغیرہ ہیں، پھر وہ بھاری انگلیٹ، روم یا یونان کے علوں پر کیوں کر جلیٹھے۔ ہر ایک شے کی ترقی کسی ملک میں اُسی قدر زیادہ ہوتی ہے جس قدر شے مذکورہ ملک سے تعلق ہو تا ہے!“ کہنے کو یہ کتنا ہی کہا جائے کہ اردو عوام کی زبان ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو بادشاہوں، نوابوں (مغل عہد کے آخری چند بادشاہ اور کھنڈ کے نوابین اور انگریزی دور حکومت کے مسلم والیان ریاست) کے مابین عاطفت میں پلی اگر اردو زبان نے کچھ ادب تخلیق کیا تو زیادہ سے زیادہ بادشاہ کی شان میں چنا۔ دیوان سپا کر دیئے نہ کوئی جوہر سپیدا ہوا اور نہ کسی نے اس طرف توجہ کی۔ اردو دلی میں روشن ہوئی تھی، دکن کی بادشاہت کا چراغ گل ہوتے ہی ستے بھی بجھ جانا چاہیئے تھا مگر قہر الوں اور کٹھنے والوں نے اس کی ٹوکرا بھارے رکھا اور کج بھی مشاعرے باز اور نظم دا۔ برائے نام اردو کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ جو زبان تفریح طبع اور دل لگی کا سامان بن جائے اس سے کسی بے مقصد کی کیا توقع کی جاسکتی ہے!۔

چلتے ریل میںے انگریزی لکھیے مگر اردو نہیں

یہ عجیب بات ہے چلتے ریل میںے انگریزی لکھے تو دقت محسوس نہیں ہوگی لیکن اردو لکھے تو کھانسی جانا اور حرکت چلنے نہیں دیتے جو لوگ سامے رسم الخط کے مخالف ہیں وہ اگر چاہیں تو اپنے دلائل میں اسے نئے دلیل کا بھی اضافہ کر لیں۔ بات یہ ہے کہ عربی رسم الخط میں ددرا رہتے ہیں ٹھن اور نیچے ہونے والے لکیریں نہیں ہوتیں جیسے کہ لاطینی میں ڈرائنگ میں ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اول الذکر بغیر کاملے کوٹنے کے کھانسی جاسکتا۔ حرکت سے ددرا کے زامے بگڑ جاتے ہیں۔ مگر لاطینی خط پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔ ہاتھ کتنا ہی بے لکیریں کھینچتے ہیں چلے جائیں گے۔

مسلم قیادت

مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے (۱۸۹۴ء) ملی گروہ کے اجلاس میں نواب محسن ال ملک نے فرمایا تھا: صاحبو! قوم کی ترقی کا آغاز ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے کہ پہلے کوئی عالی دارغ مستقل مزاج جس کا دل دنیا ایسے کام کے لئے بتلے گا وہ قوم کی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے اور ایک ایک مدد کو آدمی اس کی باتیں سمجھنے اور اس کے کئے پر چلنے اور اس کی تائید کرنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ایک ایسا مختصر گروہ بن جاتا ہے جسے لوگ اپنے خیالات پھیلانا اور اپنی جماعت کو بڑھانا شروع کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کا اثر ساری قوم پر بھاتا ہے اور قوم ترقی کے درجے پر پہنچ جاتی ہے مگر صاحبو! بغیر خیالات کے بدلنے اور بغیر کسی شخص کے پیشوا ہونے اور بغیر کسی ایک مضبوط اور مستعد لوگوں کی جماعت قائم ہونے کے، اگر کسی قوم کی بھی اصلاح ہو سکتی ہو تو مجھے اس کی نظیر بتائیے !

تھیں آئین ہوگی جہاں فرض شناس لیڈر نہ ہوں گے وہی تنظیم اپنا وجود کھو بیٹھے گی جس کی قیادت کر دو ہوگی اور اسی فوج کے قدم اکٹھا جائیں گے جو اپنے قائد سے محروم ہو چکی ہوگی آج کے ہندوستان مسلمان کی پریشان حالی، پرگنہ کی اور انتشار کا سبب بن یہ ہے کہ مسلم فرقہ صحنی اور پٹلوں لیڈر شپ سے محروم ہے یعنی ہندوستانی مسلمان کو پھر ایک سرسبز سرسبز درکار ہے۔

آزادی کو آئے ہوئے اگرچہ ۲۷ برس ہو چکے مگر مسلمانوں کو ابھی تک کوئی قائد ہی نصیب نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے کوئی نصب عین ہی نہیں ہے۔ مسلمان آگے بڑھنا چاہتے ہیں مگر انھیں یہ پتا نہیں کہ جانا کہاں ہے، انھیں نہ منزل کا علم ہے نہ راستے کا۔ کچھ ہیں جو وقت کی سوئی الٹی گھما کر جھوٹے سوئیں پہلے کے زمانے کو واپس لانا چاہتے ہیں اپنے لئے اور ان کے لئے بھی

اگر آپ جھاڑی میں پھنسے ہوئے خرگوش کو بھلائیے تو حکمت درحقیقت دوڑے گا، سیل کی مسافت طے کرے گا اور پھر اسی جھاڑی میں آچھپے گا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے مسلمان کے جمود کو توڑا اس نے ترقی کی غامی مسافت طے کی مگر ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمان ہیں آکھڑا ہوا جہاں سے ۹۰ برس پہلے چلا تھا۔ آج سے پھر ایک پیشوا کی ضرورت ہے، اسے پھر ایک سرسبز درکار ہے۔

دننگ انگریزی اور بنگالی صحیح لیڈر شپ (درست راہ نمائی) کے بغیر راہ راست پر نہیں آتی جس گھر کی سی پور جو نام کی ترکیب برقی ہے جس کے کتبے کے نیچے الامت اور فراہ برادری کے جذبے سے محروم ہوتے ہیں، اور جو خان دان و ملقات قدس سے ناموافق ہوتا ہے وہاں دھماکے درست قیادت ہی کی کمی ہوتی ہے۔ انہی غلطیوں میں ٹکریں ٹوٹی ہوئی ہو چکی ہیں۔ یہاں کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی گلی اور نصف

مسلم قیادت

جو مسلمان نہیں ہیں، بعض حال سے بے خبر ہیں، مستقبل کی فکر نہیں ہیں اپنے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہیں اور غر سے اپنا سینہ پھلایاتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کو صرف یہ فکر داس گیر رہتی ہے کہ "پرسنل لا" کو فرو بنکر آسلی کی سیٹ حاصل کی جائے یا پرنسپل کانسٹری کے لئے "بندے ماترم" کو موضوع بنایا جائے ایک گردہ وہ ہے جو مذہب کی آزادی کے لئے کوشاں ہے اور پھر ایسے مسلمانوں کی تعداد تو کافی ہے جن کو یہ فکر پڑی ہے کہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی قدروں کی شدھی سنوئے پائے اور اگر ہو سکے تو دوسروں کی سبھتا کو مشرف بہ اسلام کر لیا جائے غرض کہ یہ انتشار برکرت نہیں پیدا ہونے دیتا اور نتیجے میں مسلمانوں کو کوئی قائد نہیں مل پاتا جب کسی قوم کا دائمی کوئی نصب عین ہوتا ہے تو اُسے اپنے راستے کا بھی پتا ہوتا ہے اور اپنی منزل کا بھی۔ اور وہ اپنے راہ نما کو بھی پہچانتی ہے اور اپنے راہ زن سے بھی چوکتی رہتی ہے ہندو فرقہ کا ایک متفقہ نصب عین ہے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے جب کرشن سین نے اسے گم راہ کیا تو اس نے اُس کو اس حد تک بھلایا کہ بس رہنے ہی پر یاد کیا اور جب مزاحی ڈیسائی اور کام راج جیسے جگادری نیتا بھی اعتماد کو بیٹھے تو اسی ہندو فرقے نے ان کے پیٹھ پر ایسا ہاتر دیکھا کہ جب جب پُر واپلجتی ہے تو یہ دلوں اپنی کرتیں دھو محسوس کرتے ہیں۔

مگر مسلمان کی ثابت ہی الٹی ہے۔ تقسیم ملک کے مابعد قزاق نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ مسلمان کے لئے اتنی ہی ضروری ثابت ہوئی جتنی یونیک فورج حسین کے لئے ملک ثابت ہوئی تھی۔ مگر آج بھی مسلم لیگ آشفہ حال مسلمانوں کی گود میں خوب پھیل پھول رہی ہے۔ حیدر آباد کی اتحادی مسلمین نے ہندوستان کے نصف مسلمانوں کو تباہ کر دیا یہی آج بھی نہ صرف برقرار ہے بل کہ اس کے پلیٹ فارم سے حیدر آبادی مسلمان چناؤ میں حصہ لیتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ دراصل نیک و بدیں امتیاز نہ کر کے چٹک بپا ہے۔ مسلمان محض قیادت سے محروم ہے۔

مسلمان کی زندگی انفرادی زندگی ہے اور انفرادی زندگی انسان کی نہیں حیوان کی ہوتی ہے، ترقی یافتہ قوم کے ہر فرد کی زندگی

حکومت کی زندگی نہیں

اجتماعی زندگی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات بر قوم کے وجود کو ترجیح دیتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے جذبے کے بغیر کسی قوم نے آج تک ترقی نہیں کی۔ جس قوم کے افراد میں قربانی اور تیگ کا جذبہ نہیں ہوتا وہ ہمیشہ پھٹی رہتی ہے۔ یوں کہنے کو آج ہندوستان کی ہر مسلم بستی میں لیڈر دل کی کھپ کی کھپ موجود ہے مگر ان کو نہ اپنے فرقے سے پیار ہے نہ قوم سے وہ تو ذوق باد سننے، بار پہننے جلسوں میں صدر یا مہمان خصوصی بننے اور ان راستوں سے دولت پیدا کرنے کے لئے لیڈر بنتے ہیں۔ جو اپنی جیب سے چادینار سگڑٹ اور چانے کی ایک پیالی نہیں پی سکتے لیڈر بننے ہی چند برس میں بے کار سے صاحب کار بن جاتے ہیں ان کے فلیٹ میں ٹیلی فون بھی آ جاتا ہے اور ٹی وی بھی ملک وقیم کے نام پر لیڈر بنتے ہیں۔ مگر لیڈر بنتے ہی عیسیت کرنے کو زندگی کا مال سمجھنے لگتے ہیں۔ غرض گولی ان دونوں کو مارو، ڈٹکے تو ال سنو! آج کے مسلم راہ ناؤں کا موازنہ راٹا اُس انجی نیر سے کیجئے جس نے سر سوڑتیار کی تھی، لوگوں کا طریقہ انہر کا نام اس انجی نیر کے نام پر لکھا جائے مگر وہ چاہتا تھا کہ اس نیر کو کنال آف فرانس (CANAL OF FRANCE) کہا جائے۔ اسی لئے بہادر یار جنگ نے ایک بار کہا تھا: "قائد وہ نہیں جو کلاخ داپوان کے نقش و نگار بن کر نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتا ہے بل کہ قائد وہ ہے جو بنیاد کا پتھر بن کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے سینے پر عمارت کے قیام اور اسکے استحکام کی ضمانت قبول کرے" مسلمان کی جماعت میں تو شک نہیں مگر اس نے اپنی حکمت کا شاذ ہی ثبوت دیا ہے۔ لیڈر کو باہمت اور بہادری تو ہونا چاہیئے مگر ایک لیڈر کے لئے بہادری سے زیادہ تیر فہمی ضروری ہے۔ یہی نہیں بل کہ لیڈر کا خلوص بھی اپنی قوم کے اتنا کام نہیں آتا جتنا کہ اس کی ختم و فرست کار آزمائش ثابت ہوتی ہے۔ فہم و فراست کے ذیل میں مصالحت انوشی بھی آتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اگرچہ اپنی ماری زندگی سیاسی جدوجہد میں گزاری اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ مجسم خلوص تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سیاست کے دوزخ و نکات سے ناواقف تھے۔ سیاست میں قدم قدم پر حالات کو دیکھ کر وقتن و وقتن پروگرام میں تبدیلی

کرنا پڑتی ہے کبھی مطالبات بڑھا چڑھا کر پیش کئے جلتے ہیں انہیں
مقابل کی بخشش ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے مگر مولانا حضرت موبانی اپنے نظریے
اور پروگرام کو اٹل منائے رکھتے تھے ان کی برصغیریت بھی کہ وہ گاندھی
جی کے اس عمل پر حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ وطن پرست گاندھی وطن
دشمن اگر بڑے مسامحت کے لئے کیسے تیار ہو جاتا ہے گاندھی جی
درحقیقت انگریزی راج کو ہندستان کے لئے ایک تباہ کن بات
سمجھتے تھے۔ اور کامل آزادی ان کا نصب عین تھا مگر سیاسی حالات
کا مدح و تحقار کبھی وہ دوسرے نوآبادیات کی جو بے نظمی کرنے پر مجبور
ہوتے تھے اور کبھی اردو ان سے معاہدہ کرنے پر لیکن دوسری
بڑی جنگ جب شروع ہوئی تو حالات کا رخ بدل گیا اور گاندھی
جی کا نعرہ "ہندستان چھوڑ دو" سارے دیش میں گونج اٹھا اور
آخر گاندھی جی نے انگریز کو ہندستان چھوڑنے پر مجبور کر ہی دیا۔ اصل
حسرت موبانی کی طرح "آتش فزود" میں بے خطر کو چڑھایا سیاست میں
بل کہ گاندھی جی کی طرح مبروہ محل کے ساتھ منزل کی جانب کڑا کڑا کر
چلے کی سیاست کہتے ہیں۔ بوقت ضرورت اپنا رخ تو بدلا جاسکتا
ہے مگر منزل نہیں، منزل بدلنے کا مطلب ہوتا ہے اپنا کردار اور
اپنا نصب عین بدل دینا۔ جب کوئی لیڈر بار بار اپنا نصب عین بدلتا
ہے تو وہ اپنی قوم کا اعتماد کھو دیتا ہے اور قوم سمجھ جاتی ہے کہ
اس کا فلاں لیڈر اعتمادی سے محروم ہے۔ یہی ملحوظ رہے
کہ خد اعتمادی بڑے کاروائے نمایاں انجام دیتی ہے۔ مینی بال
کو اپنے اوپر اعتماد تھا کہ وہ کوہ الپس کی برفانی چوٹیوں سے اپنی
ساتھ ہزار پیدل فوج اور ہاتھیوں کے بہت سے دستوں کو
گزار کر دشمن پر حملہ کر سکتا ہے۔ یہاں چہ اپنے اسی اعتماد کے
بل پر اس نے قیامت خیز مفاتی ہواؤں کے باوجود پہاڑی چوٹیوں
کو طے کیا، وطن پر حملہ کیا اور فتح پائی۔

لیڈر شپ کے لئے مبروہ محل اور ضبط انتہائی ضروری ہے
اسی سلسلے میں ایک واقعہ سنئے۔ خلافت تحریک کے دن تھے
کلکتے میں خلافت کو سب جیکٹ کمیٹی کا اجلاس جاری تھا ایک
پنجابی لیڈر اپنی تقریر میں مولانا محمد علی کو کسی سلسلے میں برا بھلا
کہنے لگے مولانا سے ضبط نہ ہوا اور وہ غضب ناک ہو کر اس

گن بھگتستانی مسلمان تعمیر

پنجابی مقرر کو گالی دینے لگے۔ پاس ہی ماسچین میں سے ایک
پنجابی نوجوان نے کھڑے ہو کر مولانا کو جوابی گالی دی اور چاقو
نکال کر ان پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا کہ فزول ہی خان
عبدل غفار خاں اور ان کے چند بھائیوں ساتھ لڑنے کے لئے
پیدا ہو کر آیا اور مولانا محمد علی کو اس پنجابی نوجوان سے چھٹکارا
دلایا۔ انہی دنوں کلکتے میں کانگریس سب جیکٹ کمیٹی کا بھی
اجلاس ہو رہا تھا۔ اگلے ہی رات کانگریس کے جلسے میں جب
گاندھی جی تقریر کر رہے تھے تو راجا نام کے ایک نوجوان ہندو
لڑکے سے مداخلت کی اور گاندھی جی کی شان میں ایک نازیبا
بات کہی مگر گاندھی جی کو بالکل غصہ نہیں آیا بلکہ وہ ہنس رہے اور
پھر تقریر کرنے لگے۔ اس لڑکے نے کئی بار کھڑے ہو کر گاندھی جی
کی شان میں گستاخی کی مگر گاندھی جی نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا
اور زرا برا نہیں مانا۔ خان عبدل غفار خاں اس جلسے میں بھی موجود
تھے۔ وہ گاندھی جی کی اس ملاحظہ اور اخلاق کی تحسین سے بہت
ہی متاثر ہوئے اگلے ہی دن خان عبدل غفار اپنے چند ساتھیوں
کو لے کر مولانا محمد علی کی قیام گاہ پر پہنچے اور گاندھی جی کے ساتھ
جو ناخوش گوارد واقعہ پیش آیا تھا اور جس کو انھوں نے بڑی خوبی
سے ٹال دیا تھا ان کو سنایا اور پھر ان سے درخواست کی کہ وہ
بھی اپنے اندر مبروہ ضبط کا مادہ پیدا کریں۔ "اچھا جگلی
پٹھان محمد علی کو سمجھانے آئے ہیں"۔ یہ غیب آلود مولانا محمد علی کا
جواب تھا۔

مولانا محمد علی اور گاندھی جی کی لیڈر شپ کے درمیان اتنا
ہی فاصلہ تھا جتنا ایک ناکام اور کامیاب لیڈر شپ میں پایا
جاتا ہے اور وہی فاصلہ آج بھی مسلم لیڈر شپ اور ہندو لیڈر
شپ کے درمیان موجود ہے۔

دقت کا کہنا ہے: یہ ایک لائق گراں نرس ہے۔ لیڈر
کے بے رج کاروں میں تھوڑے دن کے بعد سرد مہری ٹہنے
لگتی ہے اور دقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لیڈر کی ذمہ داری
میں بھی اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ان مشکلوں سے گزرنے کے بعد بھی
کوئی لیڈر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا اپنے مقصد میں کامیابی

ماہل ہری جائے گی !

جولینڈر غیر مخلص ہیں (جیسے کہ مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں) ان کے لئے لیڈری پھولوں کی بیج ہے، ایک پیشہ ہے اور منافع بخش کاروبار ہے مگر جو راہ ناماد و دمسند ہیں ان کے لئے قوم کی راہ نمائی کرنا کانٹوں بھری راہ پر چلنا ہے اسی سلسلے میں نواب محسن الملک کا کہنا تھا :-

”اے مرے بھائیو! کیا آج تک کوئی بڑا کام بغیر وطنوں کے برداشت کرنے اور دل نگار باتوں کے سنے نہیں دنیا میں ہوا ہے۔ صاحبو! قوی اصلاح اور قوی ترقی کوئی کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے تمام کاموں میں اور سب سے زیادہ مشکل نازک اور تکلیف دہ ہے حقیقی اصلاح اور سچی ترقی دینی اور دنیوی اصلاح اور معاش اور معاشرہ کا فلاح، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ مگر دنیوی اصلاح اور دنیوی ترقی بھی ایسی مشکل ہے کہ اس کے لئے بھی خدائے تعالیٰ خاص لوگوں کو پیدا کرتا ہے اور اس کے لائق ان کے دل و دماغ بناتا ہے مگر پیغمبروں یا مصلحان قوم خدائے سب کے لئے یہ قاعدہ رکھا ہے کہ ان کی کوشش کو منزل مقصود تک پہنچنے میں بہت سے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اول ان کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور ایک نامکن کام کے خیال سے وہ دیوانے ٹھہرائے جاتے ہیں پھر ان پر ظن و دمنز ہوتے ہیں پھر ان پر تمہتیں کی جاتی ہیں اور ان کے اماندے بدیہی بہر محمول کئے جاتے ہیں پھر ان کے مقاصد میں غلط بیانیوں کی جاتی ہیں۔ پھر کچھ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور ان کے کاموں کی عظمت اور وقت کا خیال ہونے لگتا ہے اور آخر مفید کچھ کر لوگ مرد میتے ہیں اور اس کی کامیابی دیکھ کر تعجب کرتے ہیں اور خدایٰ کہنے لگتے ہیں کہ پہلے ہم کیوں ایسا نہ کئے اور کیوں اول ہی اس کام میں شریک ہوئے!“

ہنگ کانہستانی مسلمان نیر

(خطبہ صدارت: مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ علی گڑھ۔ ۱۸۹۴ء)

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کا جو حال تھا، ۱۹۴۷ء سے اسی حال میں وہ پھر مبتلا ہیں۔ پچھلے ۲۷ برس میں ہندوستان کے مسلمانوں میں کئی بار حرکت پیدا ہوئی مگر آج تک ان کا کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا جو حال اسے مستقبل کی جانب ہوتا اور اس بات کی دلائل کترا کہ اب مسلم فرقے کے بہتر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ۲۷ برس گزر گئے مگر مسلمانوں میں اس ملک کی ایک عظیم اقلیت ہونے کی حقیقت سے آج تک اپنے مسائل و امور کا صحیح اور سنجیدہ شعور پیدا نہیں ہوا اور اس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے ۲۷ برس سے ہندوستان کی مسلم اقلیت ایک صحیح قسم کے لیڈر سے محروم ہے۔

آج بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک سرسید جیسے حکیم وقت شناس مستقل مزاج، مخلص اور باعزم لیڈر کی ضرورت ہے جو حالات کی خصوصی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی طرز پر کام کرے جس پر ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے کیا تھا، یعنی وہ ایک طرف اخباروں و رسالوں، کتابوں سننے، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے ان تلخوں اور غلط فہموں کو دور کرنے کی کوشش کرے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں، دوسری طرف ملک کا دورہ کرے مسلمانوں کی ہمت بندھا کرے، ہندوؤں سے میل بڑھائے غیر فرقہ وارانہ جلسوں میں تقریریں کرے۔ عید بقرعید پر غیر مسلموں کو اپنے یہاں مدعو کرے، ہولی دیوالی پر دوسروں کے یہاں جا کر ان کی خوشی میں شریک ہو، وہ اپنا رشتہ حکومت سے بھی قائم کرے اور عوام سے بھی۔ حکومت کی ہر اچھی بات کو فراخ دلی سے سُر ہے، ناسید کرے، حمایت کرے، تعاون کرے، فلاحی کاموں میں حکومت کا ہات بٹائے مگر حکومت کے غلط اقدام پر تنقید بھی کرے اور غیر خواہ بن کر اپنے فرقے کی درست اور جائز ترجمانی کرے، مسلم اقلیت کو یہ ذہنی نشیں کرا دے کہ یہ ملک ہماری جہم بھری ہے اور یہ حکومت قومی حکومت ہے جہاں تک زبان کا مسئلہ ہے سرسید نے

ہائی کو قوم اپنا سب سے بڑا محسن تسلیم کر لیتی ہے مسلم عالم کی ضرورت کے تحت 80 برس پہلے علامہ خلی نے جو کہا تھا جو آج بھی حال کے مطابق ہے۔

مگر وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے ہمارا حال خدِ عبرت خزاں ہے آج متراسر گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہم دودی کہ دو آنسو بہا لیں قوم کی درماندہ حالت پر ضرورت ہے گرم کتوس ہے ان بزرگوں کی کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جو ہر فقط باتیں ہوں کچھ کام بھی بنائے باتوں سے کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اسے کچھ بڑھ کر نہیں کریں تو بس اک گری صحبت کے سماں ہیں یہ قوی مرثیے، یہ وعظ، یہ اسبج، یہ لکچسہ طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن گئے فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلنا نہیں منتر تمہیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل سے مشکل ہیں مگر کرنے پہ آ جاؤ تو آ سال سے ہیں آ سال تر

لیڈر کی پہچان

”بڑا آدمی وہ ہے جس کے آواز بیکروں ہزاروں تک پہنچتی ہے، اور دنیا میں سب سے بڑا وہ ہے جس کے آواز تمام بننے نوع انسان تک پہنچتی ہے جسے کامیاب جسے قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسے قدر زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔“

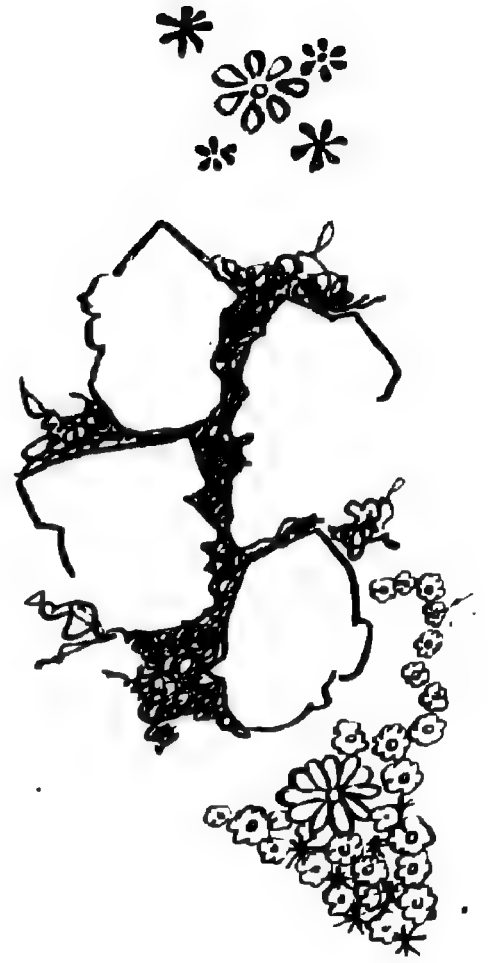
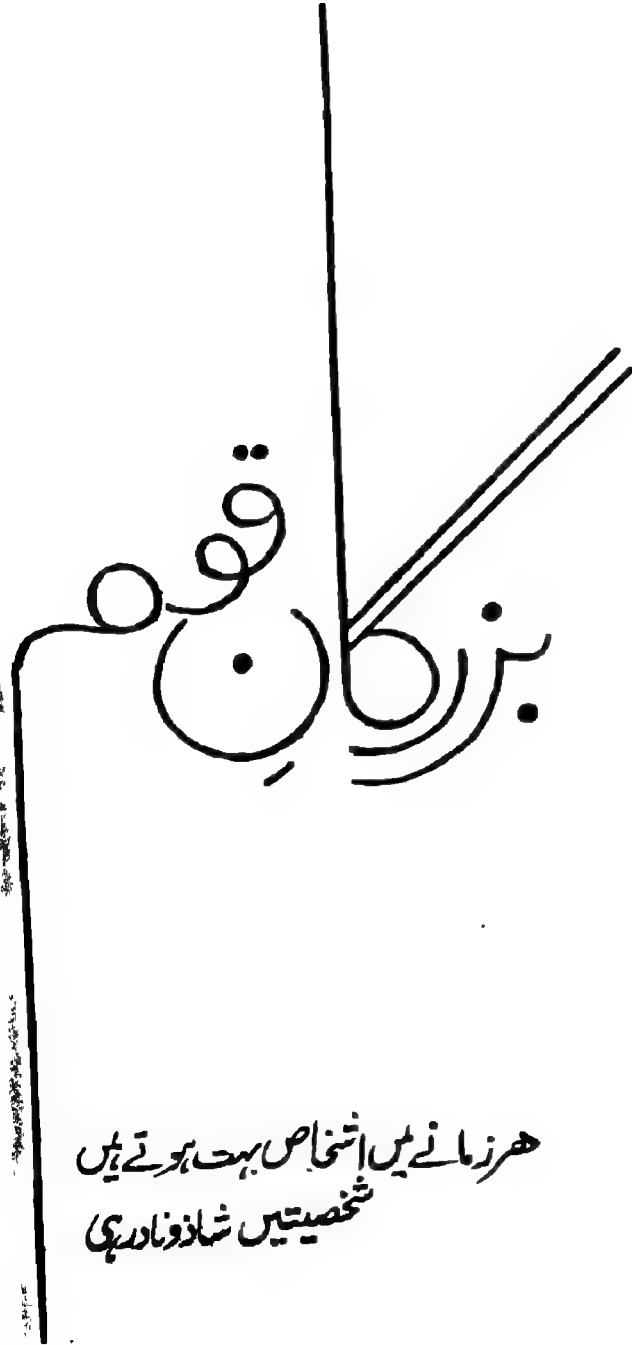
بابائے اردو
مولوی عبدالحق

ماکوں کی زبان انگریزی کو مقدم سمجھا تھا چنانچہ آج کے سرسید کو چاہیے کہ وہ آج کی سرکاری زبان ہندی کی حمایت کرے اور مسلمانوں کو تاکید کرے کہ وہ اس زبان میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا کریں۔ آج کا وہ مسلم قائد جو سرسید کی جگہ لے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلم اقلیت کے لئے ایک دس سالہ پلان بنائے اور اسے کرے کہ اس مقررہ مدت میں اتنے مسلمان جو انوں کو انجی نیر، ڈاکٹر، پلیڈر، میجر، لیکنر، صنعت کار، تاجر، انگریزی اور ہندی کے صحافی، ادیب، معنف بننا ہے اتنے تعلیم یافتہ اور زمین مسلم فور جانوں کے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا ہے اتنے مسلمان لڑکوں کو ترقی یافتہ ممالک جاکر جدید علوم اور ٹیکنالوجی تعلیم حاصل کرنا ہے اس مدت میں مسلمانوں کے لئے اتنے کارخانے اتنے مل ادا تھے بینک کھل جائے ہیں اور اسی مدت میں مسلم معاشرے کے برے رسم و رواج کو بھی ختم کرنا ہے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اسمبلی پارلیمنٹ کا ممبر بنے مسلمانوں کی خدمت نٹ یا تھر پورہ کی جائے جتنی ہے ایوان میں پہنچ کر نہیں غرض کہ آج کے سرسید کو ایک مسلم اقلیت کے لئے کئی محاذ پر کام کرنا ہوگا۔

مگر آج کے مسلمانوں میں جو بھی سرسید کی جگہ لے گا اسے نیلے سے یہ حال لینا چاہیے کہ اس کی قیادت سے جن نام نہاد مسلم لیڈروں کے مفاد پر صرب پڑے گی وہ اسے حکومت وقت کا ایجنٹ اور ہندوؤں کے بات بکا ہو اکیس گے مگر اسے اس تاریخی حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دنیا میں جب بھی کسی نے اپنی قوم میں انقلاب لانا چاہا ہے اس نے اپنی ہی قوم سے پہلے کام لیاں کھائی ہیں اور انہوں نے ان کے ہاتھوں سے بدست کئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عربیہ عام روایت برست اور امراء مناد پرست ہوتے ہیں۔ عام قوم کی خاطر اپنے انہی عقیدوں اور فرسودہ رسم و رواج کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور امارا و غریب عوام کے لئے اپنے مفاد کو ترک کرنا نہیں چاہتے اس لئے دعوتِ انقلاب قبول کرنے کے لئے مشکل ہی سے کوئی تیار ہو پاتا ہے اور اٹا یہ ہوتا ہے کہ داعی انقلاب کے

حکامِ مصلحتی مصلحتی

دُھونڈا ہے آسماں نے جِنہیں خاک چِمان کر



ہر زمانے میں اشخاص بہت ہوتے ہیں
شخصیتیں شاذ و نادر ہی

گلن ماہندستانی مہمان نواز

فلساز او می ار وڑا
 کے
 ایک انتہائی جذباتی مینی خیز سوشل فلم

یہ کام

بہن بھائی کے ایک رشتے کی جذباتی کہانی
 ایثار و محبت، عزم و یقین کی داستان

ناظمہ ☆۔ بلدیو کھوسا ☆۔ ریتا ☆۔ جے شری ٹی ☆۔ لکشی چھایا

کسان ☆۔ مکالمے ☆۔ اسکرین پلے ☆۔ گیت و سنگیت
 چندر کانت کاکورکر ☆۔ ایم جی حشمت ☆۔ رام کیل کر ☆۔ گمنیش

☆۔ ہدایت کار ☆۔

ولیمپ بوس

جاری کردہ: گیتا شری فلمز، بھارت فگر بمبئی۔ 400007

باقی اسلام

مکے (عرب) کے قبیلہ قریش کے ہاشمی خان دان میں ۵ مارچ 571ء کو پیر کے دن حضرت محمدؐ پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ تھا اور والدہ کا اسمہ۔ حضرت کی پیدائش سے قبل والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادا عبدالمطلب نے پوتے کا نام محمدؐ رکھا۔ محمدؐ جب ۵ برس کے ہوئے تو والدہ کا سایہ کھنسی سے اُٹھ گیا۔ اور پھر ایک برس بعد دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ چچا ابوطالب نے حضرت محمدؐ کی پرورش کی۔ بارہ برس ہی کی عمر سے چچا کے ہم راہ دور دور ملکوں میں جانے کا موقع ملا اس طرح اُن کو عیسائی اور یہودی علماء کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مزاج، عادت اور طبیعت کے اعتبار سے محمدؐ جدا ہی سے دوسرے بچوں سے بہت مختلف تھے۔ کھیل کود سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بکریاں چراتے یا گھر میں رہتے، صبر و شکر کا جذبہ بھی زیادہ تھا۔ اور بہت پرستی سے بھی کوئی رغبت نہیں تھی۔ 25 برس کی عمر میں حدیبیہ نام کی ایک شریف اور متمول تاجر بیوہ خاتون سے شادی کی۔ پھر مکے کے قریب غار حرا میں باکرہ خدا کی عبادت کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت محمدؐ چالیس برس کے ہوئے تو 22 فروری 510ء کو آپ پر وحی نازل ہوئی اور آپ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور اسی دن سے آپ نے تبلیغ شروع کر دی۔ قریش نے آپ کے بارے میں سخت مخالفت کی۔ مخالفوں نے حبشانی تکلیفیں بھی پہنچائیں اور مال و دولت کا بھی لالچ دیا مگر محمدؐ نے اپنی راہ نہیں بدلی۔ جب زیادہ رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں تو وہ 25 رستم 622ء کو مکے سے مدینے ہجرت کر گئے اور وہاں تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت محمدؐ کی اس ہجرت سے سنہ ہجری کی ابتدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اور مدینے کے مسلمانوں نے مکے والوں سے کئی لڑائیاں لڑیں جن میں بدر اور احد اہم ہیں آخر محمدؐ نے 10 ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر مکے پر چڑھائی کی اور مکے کو فتح کر لیا۔ ہجرت کے دس برس بعد حضرت محمدؐ نے آخری حج کیا اور اس موقع پر انہوں نے جو خطبہ دیا وہ اسلام کی اعلیٰ کج پوڑ سمجھا جاتا ہے۔ حج کرنے کے دو مہینے بعد وہ بیمار ہوئے اور تیرہ دن بخار میں مبتلا رہ کر 6 برس کی عمر میں 27 مئی 632ء کو وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ حضرت آدم سے 6155 برس بعد اور حضرت ابراہیم سے 12 ہزار برس بعد پیدا ہوئے تھے۔

حضرت محمدؐ نے جاہل اور جنگ جوعز لوہ میں جس طرح تنظیم پیدا کی اور اُن کو انسانوں کی طرح رہنا سکھایا

وہ تاریخ انسانی کا ایک بہت بڑا کام ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

نام: آدین احمد، تاریخی نام فیروز بخش، کنیت: ابوالکلام اور غلام آزاد۔ ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو مکتے کے محلے قدوہ متصل باب اسلام میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے مورث اعلیٰ شیخ بہلول دہلوی اکبر کے عہد میں علوم دینیہ اور فلسفے کے امام مانے جاتے تھے۔ دوسرے اصناف میں شیخ ہمال آدین (اکبر کے بہن میں) اور شیخ محمد (جہاں گیر کے زمانے میں) مشاہیر علماء و صوفیہ میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان کے نام مولوی منور آدین شاہ عالم اول اکبر نانی کے دربار میں وزیر تعلیم تھے۔ دادا مولانا محمد باری دہلی کے ایک خان دانِ علم و فلسفہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کی والدہ محدث شیخ محمد بن ظاہر و تری مفتی مدینہ کی بھانجی تھیں اور ان کے والد مولوی خیر آدین قادری نقشبندی حید عالم، سونی، مصنف اور مشہور سیرت تھے۔ اور ان کے لاکھوں رید تھے۔ قصور (پنجاب) سے تعلق رکھتے تھے بعد میں دہلی منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی تباہی سے دل برداشتہ ہو کر کتے چلے گئے جہاں اپنے مدینہ سے گیا رالاکھ روپے فراہم کر کے ہنزہ سیدہ کی مرمت کرائی اور آخر اپنے مدینہ ہی کی خاہش پر ۱۸۹۳ء میں ہندوستان واپس ہوئے اور کلکتے میں سکونت اختیار کی۔ گھری کی چار دیواری میں مولانا آزادی کی تعلیم شروع ہوئی۔ مولانا کی مادری زبان عربی تھی عربی و فارسی کا چودا برس کا پورا کورس (درسی نظامی) انھوں نے صرف ۱۰ برس میں مکمل کر لیا۔ دس گیا رہا برس ہی کی عمر سے انھوں نے شعروے ساعی اور مضمون نگاری شروع کر دی تھی اور 'مخزن'۔ 'خندنگ نظر'۔ 'حسن ال اخبار' اور 'تحفہ احمدیہ' جیسے جرائد میں ان کے مضامین چھپنے لگے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے پہلی تقریر کی تھی۔ اور پھر ۱۹۰۵ء میں انھوں نے انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے اجلاس میں خطبہ پڑھا تھا اور 'ال مصباح' وہ پہلا (مہفت روزہ) اخبار تھا جو (۱۹۰۵ء کے آخری دنوں میں) مولانا نے ایڈیٹ کیا۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے اپنا پہلا رسالہ 'لسان ال صدق' جاری کیا۔ بعد میں وہ 'الندوہ'،

گلن سائنس سٹانی مسلمان نمبر

وکس'۔ اور 'نیرنگ عالم' کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کے لئے قاہرہ گئے۔ اور آل انڈین روٹری دسٹی میں درس لینے کے بعد ۱۹۰۷ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ۱۹۰۹ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۱۲ء میں مولانا نے کلکتے سے مہلت روزہ اخبار 'آل ہلال' جاری کیا۔ اس کا انداز نرالا اور مجتہدانہ تھا۔ اس اخبار کے بارے میں شیخ ہند مولانا محمود آل حسن نے فرمایا تھا: 'ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے۔ 'آل ہلال' نے یاد دلایا، اقبال کی 'اسرارِ حُدی' اور 'رموزِ بے حُدی'، 'آل ہلال' ہی کی صدقہ بازگشت تھی۔ دوہی برس میں 'آل ہلال' کی تعداد اساعت ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں حکومت نے 'آل ہلال' کی صفات ضبط کرنی مگر مولانا نے نام بدل کر (آل بلاغ) اُسے جاری رکھا۔ ۱۹۱۵ء میں حکومت کا پھر عتاب نازل ہوا اور مولانا بنگال سے جلا وطن کر دیے گئے اور پھر ۱۹۱۶ء میں رانچی (بہار) میں نظر بند کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں حبس سے رہا ہوئے تو دہلی میں گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور کانگریس میں شامل ہو گئے۔ تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا، گرفتار ہوئے اور دو برس کے لئے قید کر دیے گئے۔ ایک برس قیل رہا ہوئے اور تیس سالہ علماء و ہند کے لاہور کے اجلاس میں صدر منتخب ہوئے اور اسی اجلاس میں ان کو امام آل ہند تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس (دہلی) کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں خلافت کمیٹی کے اجلاس (دہلی) کے بھی صدر رہے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے قائم مقام صدر بنے پھر گرفتار کر لئے گئے اور ۱۹۳۲ء تک جیل میں رہے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس پارلیامنتری سب کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ حصول آزادی کے سارے مرحلے انہی کی قیادت میں طے ہوئے یعنی کانگریس کے خصوصی ترجمان کے حیثیت سے ۱۹۴۲ء میں انھوں نے سر اسٹیفورڈ کراکس سے بات چیت کی۔ ۱۹۴۷ء کی 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کی تجویز بھی ان کی صدارت

میں کانگریس نے منظور کی اور اسی سلسلے میں وہ گرفتار ہوئے اور تین برس تک قید رہے۔ وہ قید ہی میں تھے کہ 1943ء میں ان کی سیگم کا انتقال ہو گیا۔ 1945ء میں رہا ہوئے اور وائس رائے لارڈ ڈے ول کی مندر کی ہوئی شملہ کانفرنس میں کانگریس کے ترجمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ 1946ء میں برطانوی کینیڈیشن کے ساتھ مذاکرات میں شریک ہوئے۔ عبوری حکومت میں تعلیم اور فنون لطیفہ کے ممبر بنے۔ آزادی حاصل ہونے پر 15 اگست 1947ء سے حکومت ہند کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ 1947ء میں ان کا انڈیا مسلم کانفرنس (بھٹو) کی صدارت کی۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ پہلے عام انتخابات (1951ء) میں گورگاؤں کے حلقہ انتخاب سے کامیاب ہو کر وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ 1955ء میں پارلیامنٹ میں دوبارہ کانگریس کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔ 1956ء میں یونیسکو کی 9 ویں کانفرنس (دہلی) کی صدارت کی۔ 1957ء کے عام چناؤں میں گورگاؤں کے حلقے سے پھر کامیاب ہوئے اور وزارت تعلیم کے عہدے پر برقرار رہے۔ 22 فروری 1958ء کو دہلی میں انتقال فرمایا۔

مولانا آزاد جامع صفات اور ہشت پہل نگینہ تھے۔ زبردست عالم، انشاپرداز، سیاست دان، بلند پایہ خطیب فارسی و عربی دان اور اردو میں ایک مخصوص طرز تحریر کے وہ موجد تھے۔ ادب عالیہ میں ان کو ایک ستارہ مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی تصانیف میں ”ترجمان القرآن“ شاہ کار ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی بلکل منفرد تفسیر ہے۔ اس کے ذریعے مولانا نے اسلام کی حقیقی تعلیم کو روایت سے ہٹ کر فطری اور عقلی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ ”غبارِ خاطر“ مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہے جو ادبیات کی دنیا میں بلکل نرالا ہے۔ مولانا کو تقلید سے نفرت تھی ان کا خیال تھا کہ انسان کی ذہنی ترقی کی راہ میں تقلیدی عقائد رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم چڑھ لیتے ہیں دنیا میں اس سے بھی زیادہ کچھ موجود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدا میں وہ حکومت الہیہ کے حامی تھے مگر عمل سیاست میں

محققانِ مباحثہ نے ان کی مسلمانیت پر

ان کے بعد وہ جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے ایک مستحکم ستون ثابت ہوئے۔ وہ سرسید احمد خاں کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں سے اس لئے ممتاز تھے کہ حق گوئی بے باکی اور جرات میں کوئی سیاسی شخصیت ان کے ہم پلہ نہیں ملتی۔ ان کا ایک دماغ کی سوداغلوں کا پتھر تھا۔ آج کی ہندوستان میں اس دنیا میں مولانا سے بڑا مفکر پیدا نہیں ہوا۔ وہ اسلام کے مفکرِ عظیم تھے۔ دینی علوم پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔

مگر ان کے سلسلے میں مسلم لیگیوں نے بدویت اور بربریت کی ساری روایتیں دوہرا دیں اور ہر مسلم لیگی مولانا آزاد کے سامنے ہمیشہ ابو جہل بن کر آیا۔ مسلمانوں نے جتنی گالیاں مولانا کو دی ہیں اسلام کی تاریخ میں شاید اتنی گالیاں کسی اور پھلے مسلمان کو نہیں دی گئیں۔ اسی بنا پر ایک بار حضرت شیخ عبدل قادر رائے پوری نے کہا تھا: ”مسلمانوں نے حسین احمد اور ابوالکلام سے سب دشتم کا جو برتاؤ کیا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں جیسے احمد کا تھا اور ابوالکلام کا صبر انھیں لے نہ ڈوے!“ اسے اکثر مولوی طاہر اور مولانا عبدل ماجد دریا آبادی کی سی ہلکی طبیعتیں بھی مولانا سے حد کا شکار رہی ہیں۔ لیکن ”الہا“ کے زمانے میں مولانا نے یہ عہد کیا تھا: ”اگر کوئی مناظرہ طلب پر میرے خلاف لکھے گا تو اس کو کبھی جواب نہیں دوں گا اور نہ اس کی تحریر سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا، مگر انسانیت اور گوشت پوست کے بنے تھے اس لئے انھیں آخری دم تک یہ قلق رہا کہ وہ اس عہد و محل کے آدمی نہ تھے۔“

مولانا خوش پوش تھے، 1920ء سے کھدڑ پہننا شروع کیا تھا اور جو وضع اپنالی تھی وہ آخر وقت تک برقرار رہی۔ خلوت پسند تھے اور سخت مزاج، عوامی انسان بلکل نہ تھے۔ سگریٹ نوش تھے اور مے نوش بھی مگر ملحوظ رہے کہ شراب پیچھے کو شیر بناتی ہے، بے وقوف کو وحشی اور جی نہیں کے لیے آب حیات ہے۔ مولانا آزاد کی طبیعت میں استغنا، مزاج میں انا اور جہم پر بے نیازی آخر دم تک مسلط رہی۔ وہ پچھلی صدی کے عظیم مسلمان تھے۔

ابو الفضل

شیخ مبارک۔ کابینہ فیضی کا بھائی ابو فضل نو اجڑوری
1554ء میں پیدا ہوا۔ اپنے کنبائی فیضی کے ساتھ مغل بادشاہ
اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی اور اپنے بہت سے حروف کو
سکرت دے کر اکبر کے دوزیروں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔
ابو فضل نے باب شیخ مبارک شیخ علوی کے مدد سے بھائی
اپنے آپ کو مہدی کہتے تھے۔ سلمان علماء کے حکم سے ان کو سزا ہوئی
مبارک علماء سے بظن بدل گئے۔ باب کے نظریے کو فضائل فیضی نے بھی
قبول لیا۔ وہ ہمیشہ مآذوں کے کثرین سے ہمیشہ بے زار رہے۔ چنان
چہ ابو فضل نے ملاؤں کی اجارہ داری کوڑنے اور ان کی پیدا کی
ہوئی رکاوٹوں کو ختم کرنے کے لئے اکبر کو ایک نئے ذریعہ کی تحریک
سروغ کرنے کا ستورہ دیا، اگرچہ جوہر ابو فضل کی کٹھنی مگر اکبر
دیں الہی کا بالی لبس لایا۔

ابو فضل عالم، دانش ور، مدبر، سیاست دان، مہکوت
پسند، مناظر، مردم و زمانہ شناس، زیرک اور آزاد مشرب انسان
تھا۔ 'آیت ال کرسی' کی تفسیر لکھ کر اکبر کی قربت حاصل کی اور
صفت حق پرست کی حسرتیں اکبر کو ذرا عظم بن گیا۔ مختلف مذاہب
کے سلسلے میں اس کا معاملہ بہت دین تھا۔ مذہبی بخت و مباحثہ کے
وقت وہ شے سے شے عالم کی پیش کی ہوئی دلیل رد کرتے ہوئے یہ
آواز بلند کرتا تھا، 'فلاں حوالی، فلاں نالی یا فلاں جنت ساز
کا قول ہمارے لئے محنت نہیں'، غرض کہ ملایان فرعون صفت
کے لئے وہ موسائیت ہوا۔ اسی نے عبداللہ ایک کہہ کرتا تھا،
'میں اکبر کی تلوار سے اتنا خاکہ نہیں سوں حقا ابو فضل کے قلم سے'۔
لیکن وہ بڑا قدرتش اس بھی تھا، ادیبوں، شاعروں اور دوسرے
فن کاروں کو دربار سے اکثر انعامات دلاتا تھا۔ اس کی تصنیف
'اکبر نامہ' اس کا لازمی کارنامہ ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا اور
جس میں عربی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ 'اکبر نامہ'
کا تیسرا حصہ 'آئین اکبری' سے جس سے اکبر کے نظم و نسق کا علم
ہوتا ہے۔ چار ہزار فوج کے سپرد لارہوئے کامر نہی اسی حاصل

دھکرت و عتہ ستانی فہم۔۔۔

تھا۔ چون کہ ابو فضل اکبر کے مزاج میں بے حد داخل تھا اس لئے ولی
عہد جہاں گیر اس سے بدظن تھا اور کہا جاتا ہے کہ 1602ء میں جب
کہ وہ دکن کی ایک مہم سے واپس آ رہا تھا جہاں گیر کے اشارے سے
ایک سندیلے نے اسے قتل کر دیا۔ گواہی دے آٹھ دس سال کی دوری
پر انٹری میں اس کی قبر موجود ہے جس پر ہر جمعرات کو لوگ چراغ جلاتے
ہیں۔ ابو فضل ذیل دہلی میں معتدل تھا مگر رنگ کالا تھا۔ وہ متین اور
پُر وقار تھا۔ اس کے تین بیویاں تھیں، ایک ہندوستانی، ایک کشمیری اور
ایک ایرانی۔

حکیم اجمل خاں

حکیم اجمل خاں 11 فروری 1863ء کو پیدا ہوئے۔ حکیم
صاحب کا خان دان صدیوں تک مغلیہ دربار سے وابستہ رہا۔ وہ
انقلابی ذہن رکھتے تھے ان کی زندگی کے دو منصب عین تھے انگریز
سے ہندوستان کو آزاد کرانا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا
کنا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم سب اس ملک کے باحضرے ہیں اس لیے
ایک قوم ہیں ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ قرآن و حدیث گائے کی قربانی کو ضرور
قرار نہیں دیتے۔ اس لیے محض ضد میں اگر کاؤ کشی کا مرتکب ہونا اچھا
فعل نہیں۔ وہ عورتوں کے پردے کے حامی نہیں تھے۔ انھوں نے مدر
طبیہ کے مت۔ ایک زمانہ شعبہ بھی قائم کیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے
طبیہ بالیج میں یونیورسٹی اور یہاں ملتی زبان کو پہلو پہلو جگہ دے کئی
روادار کے ساتھ ایک قومی و صنعتی نظریے کا بھی ثبوت دیا تھا۔
1921ء میں دہلی انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے
آخر عمر میں انھیں دو کاموں سے زیادہ لگاؤ رہا، طبیہ کالج کے ذریعے
دسی طب کو فروغ دینے کا کام اور ہندو مسلم اتحاد قائم کر کے
ہندوستان کو آزاد کروانے کی کوشش۔ اگرچہ حکیم صاحب کی دہلی سے
باہر جانے کی ایک ہزار روپے فیس تھی۔ مگر وہ غریبوں کا علاج مفت
کرتے تھے اسی لیے انھوں نے نظام حیدر آباد کا ملازم ہونا اور صرف
ایک فرد کا باندہ ہونا پسند نہیں کیا۔ انھیں حکومت کی جانب سے 'حاذر
ملک' کا خطاب اور قوم کی جانب سے 'مسح ملک' کا اعزاز حاصل تھا
کا دھن جی انھیں 'خاموشی کا دیوتا' جو اہل لال نہرو ان کو بے تاج

کا بادشاہ، اور لارڈ ہارڈنگ انھیں 'میگ نیٹ آف انڈیا' کہتے تھے اور دلی کے عوام انھیں دلی کی آبرو سمجھتے تھے۔ وہ ایک حاذق طبیب تھے، اچھے خطیب تھے، شاعر تھے، شیدائے خلص فرماتے تھے اور جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی پہلی صف سے تعلق رکھتے تھے۔ 26 دسمبر 1927ء کو ان کا انتقال ہوا۔ حکیم صاحب دہلی کے طبیب کالج اور جامعہ ملیہ کے بانیوں میں سے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا 1863ء میں تھانا بھون (ضلع مظفرنگر، اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدل حق تھا۔ بچپن میں گزرا تعلیم میرٹھ، کانپور اور سہارن پور کے مدرسہ مظاہر علوم میں ہوئی۔ زندگی کا نصف دویم درس تدریس اور تالیف و تصنیف میں گزرا۔ تھانا بھون میں مولانا کی خانقاہ ان کے آخری دم تک دینی علوم کا ترجمہ بنی رہی۔

مولانا کا بچپن بڑی آسودگی سے گزرا، ان کے والد گھٹی چپری دلی شکر سے لگا کر اپنے ہات سے ان کو کھلایا کرتے تھے۔ مولانا جب کسی مٹھائی کی فرمائش کرتے تو ان کے والد اتنی زیادہ مٹھائی منگولے کہ مٹھانا کھاتے کھاتے سیر ہو جاتے۔ بچپن ہی میں ان کو ہزاروں روپے لینے ہات سے خرچ کرنے کا موقع ملا اور نتیجے میں ان کے مزاج میں سودگی پیدا ہو گئی اس لئے وہ زندگی میں کسی دولت مند سے مرعوب نہ ہوئے اور کسی کی شان و شوکت نے ان پر اثر ڈالا۔

مولانا اشرف علی کو دینی علوم پر عبور حاصل تھا اور فنی طور پر فقہی مسائل سے وہ خوب واقف تھے۔ وہ بڑے اچھے واعظ تھے۔ ان کے 19 تصانیف میں 'ترجمہ قرآن' معیار کے اعتبار سے اور خواتین کی اصلاح سے متعلق 'بہشتی زیور' مقبولیت کے لحاظ سے قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ہندوستان کے کئی ہزار مسلم علماء میں سے وہ چند عالم جو تمام معاملات زندگی میں احکام شریعت اور سنت نبوی پر چلے ہیں مولانا اشرف علی ان میں سے ایک تھے۔ 20 جولائی 1943ء کو انھوں نے وفات پائی۔ انھوں نے اپنی کسی تصنیف کے حقوق اپنے نام محفوظ نہیں کئے ان کی طرف سے اجازت تھی کہ معاضد یا لٹ

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

دیے بغیر کوئی بھی ان کی تصنیف شائع کر سکتا ہے۔ ان کے دو بیویاں تھیں مگر اولاد کوئی نہیں تھی۔ طبیعت میں اس حد تک نفاست اور مزاج میں اتنی نزاکت تھی کہ اگر کسی کا تنکا پیٹ دیکھ لیتے تو فوراً نفع ہو جاتی۔

احمد بخش گاما

احمد بخش گاما 1882ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ریاست دتیا میں گاما کے باپ درباری پہلوان تھے مگر گاما چاری برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ چچا نے یرورش کی اور خان دانی فن کشتی ہی کی تعلیم دی۔ 1908ء میں گاما ہاراجا پٹیلالا کے درباری پہلوان مقرر ہوئے۔ گاما کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب لندن کے جان بل کلب نے درلودینین ریشپ آف ریس لنگ کے لیے کشتیوں کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کیا تو 12 اگست 1910ء (سنچری) کو لندن کے شیفرڈس ٹینس اسٹیڈیم میں گاما کا مقابلہ روسی پہلوان زلس کو سے ہوا۔ تین گھنٹے تک دونوں نبرد آزما رہے آخر گاما کو فاتح قرار دیا گیا اور گاما کو رستم ہند سے رستم زمان بنا دیا گیا۔ اٹھارہ برس بعد کھر گاما اور زلس کو کا مقابلہ ہندوستان میں ہوا اور یہاں صرف دھائی سینکڑ میں گاما نے زلس کو کو کچھا ڈر دیا۔

گاما نے دو شادیاں کیں۔ پہلی سے 5 لڑکے پیدا ہوئے جو کم سنی ہی میں مر گئے، دوسری سے چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ گاما فنی طور پر غیر تعلیم یافتہ تھے۔ وہ بمشکل تمام اپنا نام لکھ سکتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا تھا: 'آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟' 'ایکیزہ زندگی'، یہ ان کا جواب تھا۔ وہ 3 مئی 1950ء کو اختلاج قلب میں مبتلا ہو کر لاہور میں انتہائی مفلسی کی حالت میں انتقال کر گئے۔

احمد رضا خاں بریلوی

ردہیل کھنڈ کے مشہور مفتی، عالم و مستفت احمد رضا خاں (ولد مولوی لقی علی خاں ولد مولوی رضا علی خاں) 1855ء

میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ جاری برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور پھر اپنے والد سے سارے علوم و دروس حاصل کیے۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد کے جانشین بنے اور فتوٰی نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سید اکرموں مارہروی کے مرید بن گئے اور بعد ازاں سے سندِ حدیث لے کر ایسے والد کے ہم راہ بن گئے چلے گئے اور یہاں کے علماء سے فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کا درس لیا۔ مولوی احمد رضا خاں مسلمانوں میں بریلوی مسنک کے بانی ہیں اور 75 سے زیادہ کتابوں کے مسنک ہیں۔

حضرت سید احمدؒ ۱۶۸۷ء میں بریلی (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے لیے رتھ عدل غزنیہ کے پاس دہلی پہنچے۔ شاہ صاحب نے سید صاحب کی غیر معمولی ذہانت اور روحانیت کے پیش نظر ان کو طریقت کی تعلیم دی۔ تعلیم مکمل ہونے پر چن بڑے بڑے علماء نے سید صاحب کے ہات پر بیعت کی ان میں مولانا اسماعیل شہید اور مولوی عدل حسنی کے نام قابل ذکر ہیں۔ کچھ دن بعد مسلم عوام کی عقیدہ ان سے اتنی بڑھی کہ وہ جہاں جاتے مخلوق ان پر ٹوٹ یرٹتی اور کسی کا دوشالے کر اُسے دست بخت و در تک سچا دیا جاتا، دوپٹے کا ایک سر اسید صاحب کے ہات میں ہوتا اور اس طرح بیک وقت بہت سے لوگ دوپٹا لکر بیعت ہو جاتے۔ سید صاحب کا مسلک عمگیر تھا۔ اہل سنت کسی اُس سے تعلق رکھتے تھے اور حدیث کو اپنا اُخذ ماننے والے بھی، حنفی بھی اور محمدی بھی غرض کہ سید صاحب نے اپنی تعلیم سے عیاشی، استہزائی، شرک و بدعت کو ہیبت تک ختم کیا اور بہت سے قہر خانے توڑے۔ سید صاحب علم لغت کے ساتھ فن سپر گری کے بھی ماہر تھے۔

گلن کا ہندوستانی ملین نمبر

سید صاحب ۱۸۲۹ء میں ایک جمعیت کے ساتھ سکھوں پر چادے اراچی سے روانہ ہوئے مگر مری سرکار غیر جانب دار بن گئی حیدر آباد سندھ اور دہ لولہ کی راہ سے افغانستان میں داخل ہوئے اور پھر وہ خیر سے گزر کر سید صاحب نے ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو پنجاب پر حملہ کیا۔ چار برس کی جنگ کے بعد جون ۱۸۳۰ء میں سید صاحب نے ہندو فتح کر لیا برہمنی احکام جاری کر دئے گئے۔ سرحدی مسلمانوں کو مذہبی آزادی دلانے میں ۶ برس کی مدت صرف ہوئی اور جب تسلط قائم ہوا تو سید صاحب کے ساتھی اقتدار پرستی اور جاہ طلبی کی رقابتوں میں مبتلا ہو گئے اور آپس میں خون ریزی ہونے لگی۔ سید صاحب نے بدلہ ہو کر دسمبر ۱۸۳۰ء میں وہاں سے ہجرت کی۔ راہ میں سکھوں سے جبراً مذاہب ہوئی اور ان کو شکست دے کر سید صاحب نے بالا کوٹ پر قبضہ بھی کر لیا مگر اس کے بعد سکھوں سے ایک دوسرے معرکے میں سید صاحب مئی ۱۸۳۱ء میں شہید ہو گئے، خلیفہ محمد اسماعیل بھی دیں شہید ہوئے۔

۱۸۸۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے ایسٹ پیس کالج اور لندن لیکنسنس این میں تعلیم پائی اور وہیں سے بیسٹری کا امتحان پاس کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریکوں میں حصہ لینے کے سلسلے میں کی بار جیل گئے۔ ۲۵ برس تک دہلی کی میونسپلٹی کے ممبر رہے۔ ۱۹۲۸ء میں الہ آباد کے ایک ہندو بنگالی خان دان کی خاتون اُردنا سنگولی سے شادی کی۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے سرگرم رکن اور کانگریس ورکنر گشتی کے ممبر رہے۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی کے حلقے سے ہندو مسلمانوں کے مشترکہ دفتوں سے بھاری اکثریت میں کامیاب ہو کر ایم۔ ایل۔ اے بنے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک ’ہندوستان چھوڑو‘ تحریک میں حصہ لینے کی بنا پر جیل میں رہے۔ اس تحریک کے بعد ان میں اور ارونا میں ذہنی و نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا۔ ۱۹۴۶ء میں انگریزی حکومت کے عبوری دور میں، مرکزی حکومت میں وزیر ریلوے بنے۔ ۱۹۴۷ء میں امریکا میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ریاست اوہائیو کے گورنر رہے۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی ہندوستان کے سفیر

کس میں بارور ڈیوٹی ورٹی اور مغربی ممالک کی دوسری کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ بین الاقوامی طور پر اسلامک لائبریری ایک مستند عالم مانے جاتے ہیں اور وہ دنیائے اسلام کے چند بڑے عالموں میں سے ایک ہیں۔ حکومت ہند کی جانب سے ان کو پیمنٹ کا اعزاز مل چکا ہے۔ وہ پائپ نوش ہیں۔

آغا حشر کشمیری

آغا کے والد کشمیری شالوں کی تجارت کرتے تھے بعد میں بنارس جا کر آباد ہو گئے۔ آغا محمد شاہ حشر کشمیری اہم ترین سر میں 3 اپریل 1879ء کو پیدا ہوئے۔ آغا صاحب کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ والد چاہتے تھے کہ بیٹا دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے ساتھ تجارت ہی میں لگ جائے۔

1896ء میں جب وہ 17 برس کے تھے، ممبئی سے پارسی الفریڈ تھے ٹری کل کمپنی بنارس پہنچی۔ انھوں نے جب اس کے کام شروع کیے تو ڈرامے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کی پہلی ڈرامائی تصنیف (1897ء) 'آفتاب محبت' تھی جسے بنارس کے ایک کتب فروش نے 10 روپے میں خرید کر شائع کیا۔ 1901ء میں گھر بار چھوڑ کر ممبئی آ گئے اور کاؤس جی کھٹاؤ کی کمپنی الفریڈ تھے ٹری کل 14 روپے ماہ وار پر ملازم ہو گئے۔ ان کا پہلا ڈراما 'جواشیخ' ہوا وہ 'مرید شک' تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً ساڑھے تین درجن ڈرامے تصنیف کئے۔ شیکسپیر کے ڈرامے ترجمہ کرنے میں وہ سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ اسی لئے انھیں انڈین شیکسپیر کہا گیا۔ ان کے جن ڈراموں کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ یہ ہیں: 'پہلا پیار'، 'ہیرو دی کی لڑکی'، 'رستم و سہراب'، 'سورکنگ'، 'ستیا بن باس'، 'خون کا خون'، 'پاک دامن'، حشر نے اپنی ایک تھیٹر ٹری کل کمپنی بھی کھولی مگر نقصان کے باعث بند ہو گئی۔ حشر نے اگرچہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر جیسے جیسے ضرورت پیش آتی گئی وہ ہندی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی سیکھتے گئے۔ انھوں نے نہ صرف اندر ڈرامے لکھے بلکہ ہندی دھارمک ڈرامے بھی لکھ کر کامیابی حاصل کی۔

رہے۔ برن میں اپنے قیام کے دنوں میں اُس ہندوستانی وفد کو بلوایا۔ ان میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ انھوں نے اکثر مفید مشورے دیے۔ 2 اپریل 1953ء کو ان کا انتقال ہوا۔ 7 اپریل 1953ء کو دہلی میں نظام اُردین اولیہ کے قبرستان میں ان کو دفن کیا گیا۔

اسمبلی بمبیس کے سلسلے میں مسٹر آصف علی نے شہید بھگت سنگھ کی وکالت کی۔ آزاد ہند فوج کے قیدیوں کے مقدمے میں بھی وہ وکیل تھے۔ اور پنجاب کے انگریز گورنر کو جب گولی سے مارا گیا تب بھی وہ دفاعی وکیل بنے۔ شکار اور اسکیٹنگ اُن کے پسندیدہ شغل تھے۔ وہ انگریزی زبان کے صحافی اور اردو زبان کے شاعر تھے اور اُن کی آواز بڑی باریک تھی۔

آصف فیضی

آصف علی اصغر علی فیضی (لے۔ لے۔ لے۔ لے۔ فیضی) 10 اپریل 1899ء کو مہاراشٹر کے بلی اسٹیشن، ممبئی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی جی سیگم جیگر نے اُن کی پرورش کی۔ لندن کی کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم (ایم۔ اے۔، ایل ایل۔ بی) پائی۔ کیمبرج اور میک گل یونیورسٹی میں وہ کچھ عرصے ڈیٹنگ پروفیسر بھی رہے اور وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنہیں وہاں ری سرچ کرنے کا موقع ملا۔ 1938ء تک (21 برس تک) انھوں نے ممبئی میں میسٹری کی۔ ممبئی میں گورنمنٹ کے لاکاچ میں استاد رہے اور کھیراؤس کالج کے پرنسپل مقرر کئے گئے۔ 1947ء میں ممبئی پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے اور کچھ 3 برس تک یو این پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ مصر میں ہندوستان کے سفیر بنے اور 1962ء میں اُن کو کامن ویلتھ فیلوشپ ملا۔ اب تک انہیں اعزازِ صوفت چار اشیاء کو ملا ہے۔ اورنٹیل ری سرچ کے سلسلے میں ممبئی کی ایشیا ٹیک سوسائٹی کی جانب سے اُن کو سلور میڈل عطا ہو چکا ہے۔ وہ آج بھی قاہرہ اور دمشق کی عربک اکادمی کے آئیری ممبر ہیں۔

آصف فیضی دنیا کے بڑے بڑے رسائل میں تقریباً 90 مضامین لکھ چکے ہیں۔ وہ 5 کتابوں کے مصنف ہیں جن میں 'آؤٹ لائنز آف محمد لا'، 'اہم ہے۔ اسلامک لائبریری کی کئی

ہنگن بک مہندستان مملکت

ختم کی شخصیت متضاد خصوصیات کی حامل تھی۔
 وہ ڈراما نویس تھے، شاعر تھے، ادیب، خطیب، واعظ تھے
 اور کامیاب، مقرر اور مناظر تھے، اور میلاد خوب پڑھتے تھے مگر
 تعصب نہیں تھے۔ یہ مذہب کی بنیادی باتوں سے واقف
 تھے اور ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔ سیوی سے یہاں محبت
 کرتے تھے۔ خدا اور مال سے بے حد ڈرتے تھے۔ ایک بار افریقا
 کی ایک کھیت پر کھیتی لے ایک برس کے لیے 8 لاکھ روپے کی پیش
 کش کی تھی، انھوں نے جانا بھی جا یا مگر مال نے اجازت نہیں
 دی چنانچہ نہیں گئے۔ اُن کو طوائف سے بھی نفرت تھی، انھوں
 نے اپنے ڈرامے میں جب بھی طوائف کا کردار پیش کیا اُس کو مارج کا
 نامور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ جوش و فحول خراج تھے
 شراب روزانہ پیتے تھے۔ ہر بات پر گالی باتے تھے۔ کھیتے ڈاکٹر کیس
 محنت و سہم کو اپنی دانتہ نہ لے ہوئے تھے، اُس کو بہت چاہتے تھے
 مگر گالی اس کو بھی دیتے تھے۔

سر آغا خان

کو ۱۰ اپنا امانتدار فریقے کے امام حاضر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے ساتھ ساتھ برٹش ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی میں شرکت کی اور ۱۹۵۵ء میں وہ امپریل ایگس لیٹیو، کونسل آف انڈیا کے مقرر ہوئے۔ سر سید احمد خاں کی ترغیب پر وہ ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں داخل ہوئے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کی ری سپریشن کمیٹی کے پیرین مقرر کئے گئے اور ۱۹۵۹ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی اجلاس میں صدر منتخب کئے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں انھوں نے امر آباد میں ہندو مسلم یونیٹی کانفرنس منعقد کی اور وہ قیلاہ روپے علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کے لیے جے کئے ۱۹۶۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں جو آل انڈیا آر پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی انھوں نے اس کی صدارت لی۔ ۱۹۷۳ء میں برٹش انڈین ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے راولپنڈی کانفرنس لندن میں شرکت کی۔ ۱۹۷۴ء میں راولپنڈی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۶ء تک وہ لیگ آف نیشنز میں ہندوستانی وفد کے لیڈر رہے اور پھر ۱۹۷۷ء میں وہ لیگ آف نیشنز کی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ جاریہ تحیم کے جشن تاج پوشی میں وہ ترائوی ہندوستان کی حاسب سے نمائندہ اول کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

بطن سے پرنس علی خاں پیدا ہوئے تھے، تیسری (انڈری کیرن) فرانسیسی نژاد بھینس جن سے صدر آئین پیدا ہوئے تھے۔ انڈری کیرن کو بعد میں آغا خاں نے طلاق دے دی تھی اور جو تھی (لابراڈ سے) بھی فرانسیسی خاتون تھیں اور جن کو 'امانا سلامت' کہا جاتا تھا۔

آغا خاں اپنے اعلانِ نسل کے برس کے گھوڑوں کی سائپر بھی پیش مت ہو رہے۔ انھوں نے زندگی میں تین بار ڈوبی جیتی۔ دنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد انہی کے ہند میں ایک کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے جولائی 1957ء میں فائنا بائی۔ اُن کے بعد اُن کے پوتے پرنس کریم خاں اسماعیلیہ مسلم فریق کے 49 ویں امام مقرر ہوئے۔

اکبر

اکبر ولد ہمایوں ولد بابر ولد عمر شیخ مرزا، ولد ابو سعید مرزا، ولد سلطان محمد مرزا، ولد بابران سادہ، ولد میر تیمور۔ ہمایوں جب دایس ایران جا رہا تھا تو 21 برس کی عمر میں غوث زین العابدین کے قدم پر بیٹھ کر بانو کے لطف سے علاء الدین محمد اکبر پیدا ہوا۔ ہمایوں جو تختہ کوہِ کالمبر تھا، بیٹے کا زائچہ دیکھتا تو خوشی سے اٹھلتا کودتا، تالیاں بجاتا اور کہتا کہ اس بچے کا زائچہ تو امیر تیمور کے زائچہ پر بھی فائق ہے۔ اکبر کو برس بچھینے اور لٹے دن کا جب ہوا تو ہمایوں نے بسم اللہ کرائی۔ ملّا حسام الدین اسکا استاد مقرر ہوئے مگر کافی دن گزر گئے اکبر نے کچھ نہ پڑھا۔ اکبر تیرہ ماہ کی عمر میں لکڑیوں، ہمالیوں، پیر ملّا، بایزید، ملّا عبدل تادر، ملّا پیر محمد میر عبدل لطیف اور شیخ مبارک کو یکے بعد دیگرے موقع دیا کہ وہ اکبر کو لکھنا پڑھنا سکھائیں مگر کسی کو کام پایا نہ ہوئی۔ البتہ پیرم خاں اکبر کو امورِ سلطنت سکھانے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ ہمایوں کے انتقال کے وقت اکبر صرف 3 برس کا تھا جہاں چہ پیرم خاں ہی نے حکومت کا کام سنبھالا۔ البتہ اکبر کو اپنی حکومت کو مستحکم بنانے میں ہوا برس لگے اور اس نے اپنی حکومت کو ہندو کش سے گورداری اور بنگال سے گجرات تک پھیلا دیا۔ علما و اساطیر نے دنیا داری، احبابہ داری اور جاہ پرستی کی بنا پر وہ پیشہ اُن سے متنفذ رہا۔ اُن کا علاج کل اور کامیو پولیٹیشن حکمراں کی حیثیت سے اُس نے اپنے وزیر ابو فضل کی تجویز پر

گنگا کا پانی پینا شروع کیا۔

دین الہی جیسے ایک نیکو لڑکے کی دنیا درکھی۔ اگرچہ کمرِ غرہ تعمیر یافتہ تھا مگر وہ عقل کو اعتقاد کا غلام بننے کا قائل نہ تھا۔ اسی لئے اس کو معراج اور معجزوں پر یقین نہ تھا۔ وہ ایک آزاد مشرب انسان تھا۔

اکبر نے ہندوؤں سے حریر اور ہندو یا تریوں سے شیش بن بن کر دیا تھا۔ دربار میں سجدہ کرنے کے رواج کو بھی ختم کر دیا تھا۔ اس نے بہت سی مذہبی اور کلاسیکی کتابوں کے فارسی ترجمے کرائے، اُس نے فارسی زبان کو ہندوستانی رنگ دیا اور عربی کو بھی اُس نے ہندوئی بنا دیا یعنی اس نے شریعت، مذہب، اور طوائف جیسے عربی حروف کے استعمال کو ضروری نہیں تھا۔ وہ 'میدانہ'، 'لوا'، 'امداد'، 'کھنہ' کے حق میں تھا۔ اُس نے فقہ جیسے ذمہ علم کی تعلیم کو بڑھا دیا دینا لہند نہیں کیا بل کہ اس نے دقت اور تنزید کے مطابق حکمت، طب، ریاضی، تاریخ اور ادا ن نویسی کی تحصیل کو ضروری سمجھا۔ اُس کا طرزِ نظام قطعی طور پر سکولر تھا۔ اور اس کی رعایت سب کو لازم نے اُن کو رواداری کا سبق دیا تھا کہ وہ اپنی مذہب آگاہ بننا طریقہ، حسن اور حقہ مند نہیں سمجھتا تھا اور اس کی کوئی صورت بھی برسوں میں صرف تین چار مہینے رہتی تھی۔

اکبر نے 6 برس کی عمر میں 1605ء میں وفات پائی۔ یہ ایک برا اتفاق ہوا کہ اس نے نیزوں میں مراد، دانیال اور جہاںگیر اُس کے نسبی وارث ثابت ہوئے۔

اکبر کو نہ جیتی سے خاص دل چسپی تھی۔ اُس کے دربار میں مختلف مذاہب کے لوگ تھے جو دتھے جن میں 6 حتی گو تھے تو بہت ہی اہم تھے۔ اکبر خود بھی گویا ترقی اور تقاریر بجانے میں ماہر تھا۔ البرشاہ بھی تھا۔ اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ وہ بہادر، جنگجو اور ہوشیار سپاہی تھا۔ سیلوں چیلر، چلڑا تھا۔ ایسی جان جو انھوں میں ڈالنا اُسے پسند تھا۔ دلیر ہونے کے باوجود غصہ و درد تھا۔ اکثر شگستہ رہتا تھا، پُرسکوا اور بادشاہِ حاکم تھا۔ مگر مزاج سدا دیا یا تھا۔ اکثر سخت سے اتر کر نیچے فرش پر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ غریبوں سے چھل مل کر باتیں کرتا تھا۔ اُس کا نظم بہت فوری تھا۔ اُس نے ہزاروں ماضی، گھوڑے، سیر، چیتے، بیل گائیں، بارسا، سیکھے، سن، آجوت، ناز، بہری، وغیرہ بال رکھے تھے اور اُن کے پیارے پیارے نام رکھ دیے تھے اور ہر ایک کو اُس کے نام سے پکارتا تھا۔ شکار کھلتا تھا مگر شکار کو انھوں کا شغل بھی کہتا تھا۔ اگرچہ

فہ نے کئی شادیاں کی تھیں مگر وہ عام مرد کے لئے بیک وقت کئی بیویاں پسند نہیں کرتا تھا اور نہ مہر کے لئے وہ بڑی رقم پسند کرتا تھا۔ کم خرگ تھا، ایک وقت کھانا کھاتا تھا اور رات میں وہ صورتیں گھنٹے سوتا تھا۔ کبھی کبھی بیس بل کر میلا دیکھنے بھی چلا جاتا تھا۔ اکبر کی کئی ایجادات قابل ذکر ہیں۔ اس نے ہاتھی بکڑنے کا ایسا آسان طریقہ ایجاد کیا۔ پلوں کے لیے ایک روشن کینڈا ایجاد کی تاکہ شام گزرنے پر رات میں بھی کھیل جاری رہے۔ چار اہواں کے نام سے بحث و مباحثے کے لئے علامہ ابن کی ایک اہم قائم کی۔ اوقات کو تقسیم کیا یعنی معمولات کو گھنٹوں میں بانٹ دیا۔ گنگولی کے نام سے بچوں کا ایک گھر بنایا یہ جاننے کے لئے کہ بچے کی زبان سے پہلا کلمہ کیا نکلتا ہے اور وہ اپنے مذہب کا کس طرح اعلان کرتا ہے۔ ترکستان کی نقل میں سینا بازار کی بھی اس نے ابتدا کی۔ مردم شماری شروع کروائی۔ بڑے بڑے شہروں میں ہندو مسلمانوں کے لیے قیام گاہیں بنوائیں۔ مسلمانوں کی قیام گاہ کا نام خیر پور اور ہندوؤں کی قیام گاہ کو دھرم پور سے کا نام دیا گیا۔ کسمیر کی جھیلوں کے لیے ماؤس بوٹ بھی اکبری کی ایجاد ہے اس نے ایک جہاز بھی بنوایا تھا جو دریائے راوی میں تیرتا تھا۔ اکبر جوئے کو بھی جلتا داس کہتا تھا۔

علوم و فنون کی سرپرستی کرنے اور اپنی حکومت کے مثالی نظم و نسق کی بنا پر اکبر کا شمار دنیا کے چند بڑے مطلق عہد حکم رانوں میں ہوتا ہے۔ ہندوستانی قوم اکبر جیسے سیلوں حکم ران، کبیر جیسے سچو صوفی اور غالب جیسے آفاقی شاعر پر فخر کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر اقبال 9 نومبر 1877ء (جمعہ) کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن موضع چچو، برگڑہ ادون تحصیل کوٹل گام، کشمیر تھا۔ آبا و اجداد براہمن تھے اور گوٹ کے اعتبار سے سپرو تھے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اقبال نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی سید محمد میر حسن سے حاصل کی۔ سیالکوٹ سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد اقبال لاہور

گئے۔ **ہمیں ہندوستانی مسلمان ہمارے**

آگے اور 1899ء میں یہاں سے فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ 1905ء میں لندن گئے اور کیم بریج یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا اور پھر 1907ء میں جرمنی چلے گئے اور وہاں کی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی۔ 1908ء میں لندن سے بیسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1903ء میں اقبال لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ یاد وہ لندن یونیورسٹی میں بھی چھ مہینے تک عربی کے پروفیسر رہے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد 22 اکتوبر 1908ء سے انھوں نے لاہور میں بیرسٹری شروع کی۔ 1911ء میں وہ پھر لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ شذو سخن کی جانب اقبال کا رجحان ابتداء ہی سے تھا اس لیے دماغ کے شگورہ سے اور 1896ء میں پہلی بار لاہور کے ایک شاعر سے میں شرکت کی۔ 1915ء میں لاہور سے ”اسرارِ خدی“ کی اشاعت ہوئی اور 1924ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام ”بانگ درا“ شائع ہوا۔ اقبال پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹی کے عربی اور فلسفے کے امتحانات کے ممتحن بھی رہے۔ انگریزی میں جھوٹی جھوٹی تصانیف کے ساتھ ساتھ انھوں نے ”فلسفہ ایران“ کے موضوع پر ایک مفصل رسالہ بھی لکھا۔ لندن کے قیام میں اقبال نے بین الاقوامی سوسائٹی کے جلسوں میں شرکت کی اور بہت اثر کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کی صحبت نے بھی اقبال کے جذبہ قوم پرستی کو جذبہ فرقہ پرستی سے بدل دیا۔ چنانچہ انگریز حکومت اُن پر نہر بان ہونے لگی۔ پہلی جنوری 1923ء کو اُن کو ”سر“ کا خطاب ملا۔ 1926ء سے 1929ء تک وہ پنجاب ہائس لیٹور کے ممبر رہے اور 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ (الہ آباد) کے صدر منتخب ہوئے۔ مسلم لیگ کے اسی اجلاس میں خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ اکثریت کے اصولوں میں ایک آزاد حکومت کا نظریہ پیش کیا۔ گویا پاکستان کا یہ پہلا مطالبہ تھا۔ 1931ء میں انھوں نے مؤتمر عالم اسلامی (فلسطین) میں رستم برادر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس (لندن) میں اور 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور 1933ء میں وہ روم میں سولینی سے بھی ملے۔ دسمبر 1933ء میں لاہور کی پنجاب یونیورسٹی

نے انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی۔

9 نومبر 1914ء کو اقبال کی والدہ امام بی بی کا انتقال سیال کوٹ میں ہوا اور ان کے والد نے 17 اگست 1930ء کو دہلی پائی۔ اقبال نے دو شادیاں کیں پہلی بیوی مختار بیگم 2 اکتوبر 1924ء کو اور دوسری بیوی سردار بیگم (والدہ جاوید) 1935ء میں انتقال کر گئیں جنوری 1934ء سے اقبال کی علالت شروع ہوئی جو بکر عید کی نماز کے بعد انھوں نے گرم سوتیاں دہی میں ملا کر کھائیں، نزلہ اور کھانسی کے بعد دہی کا مرض لاحق ہو گیا اور آخر ایک طویل علالت کے بعد 2 اپریل 1938ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ موتیابند سے ان کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔

اقبال کی شاعری کو تین زمانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلا زمانہ دہلی بھگتی، دوسرا نقیوت، اور تیسرا فرقہ پرستی۔ مگر اقبال اردو دنیا کے صف اول کے شاعر ہیں۔ ان کی تصانیف میں 'اسرارِ مخفی'، 'اوارے بے خدی'، 'ارمغانِ حجاز'، 'جاوید نامہ'، 'پیامِ مشرق' اور 'زبورِ مجسم' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اقبال تخلیق پسند تھے اور انتہائی سخت مزاج تھے۔ حقہ نوشی ان کا محبوب شغل تھا۔ اپنا کلام سناتے سے وہ ہمیشہ گریز کرتے تھے مگر شاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سناتے تھے۔ نواب محمد اللہ خاں والی بھوپال سے ان کو 500 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

امیر خسرو

دصال 18 شوال 725ھ کو دہلی میں ہوا۔ سیدالش کے سنہ میں اختلاف ہے 52ھ (1253ء) کے لگ بھگ سمجھے جنم بھوی ہندوستان۔ پٹیالی ضلع ایٹ لوہی۔ مکمل نام خسرو ابوالحسن بن امیر سیف الدین محمود شمس تھا۔ شاعر ادیب، موسیقار، ہجوید سپاہی، درباری، فقیر۔ حضرت امیر خسرو سب کچھ تھے۔ بقول مولانا سبلی کھیلے سات سو برس میں ہندوستان نے ان جیسا جامع کمالات آدمی اور کوئی پیدا نہیں کیا۔

باپ دادا ترک تھے۔ ننھیال ہندوستانی۔ ہندوستان اور ہندوستانیت سے انھیں جوشن تھا وہ شاید ماں کا ورثہ تھا کرہنکی

گلن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

تو وہ پیر نے پوری کر دی جو پریم کی موت تھے اور کسی کو پر دیا اور غیر سمجھا ان کے ماں جائز ہی نہ تھا۔ روایت ہے کہ حضرت امیر خسرو نو برس کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہوئے تھے۔ شعر اس سے بھی پہلے سے کہتے تھے۔ علم و فضل اور شعر گوئی نے انھیں کم عمری ہی میں سلطان ملین کے لائق ولی عہد شہزادہ محمد خاں کے دربار میں پہنچا دیا اور اس کے بعد سلطان محمد تغلق تک ہر بادشاہ نے ان کی قدردانی کا حق ادا کیا۔ لیکن امیر خسرو نے عجیب طبیعت پائی تھی۔ دن دربار میں گزرتا تھا تو رات فقیر کی چوکھٹ پر گزرتی تھی۔

سرکاری نوکری قصیدے لکھوانی تھی تو درویشی، خودداری، اشعار میں برہمائیہ اعلان بھی کرتی تھی کہ بادشاہوں کی تعریف کرنے سے دل بردہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ گو کہ ہے کہ انھوں نے حق کی خاطر دربار میں جان ناسک پروا نہ کی۔

حضرت امیر خسرو بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ اہل ایران ان کے سوا اور کسی ہندوستانی کی فارسی دہلی کے آج تک فائل نہیں ہیں۔ حضرت امیر خسرو کا سب سے بڑا کارنامہ دہلی سے ہے کہ انھوں نے مختلف دیسی اور بدیسی زبانوں کے الفاظ کو ایک نئی زبان ایجاد کی۔ وہ اس کو "ہندوی" کہتے تھے۔ اردو اور ہندی اسی ہندوی کے سنورے ہوئے دو روپ ہیں۔ موسیقی میں بھی بہت سے راگ لگائے اور ساز خاص حضرت امیر خسرو کی ایجاد ہیں۔ نثر میں غیر منقوط عبارت ان کا کمال ہے۔ عام پسند ایجادات میں دو سخنیں، 'کہ مکرمیاں'، 'دھوکو سے'، 'پہلیاں' وغیرہ بھی انھیں کی رہیں ہیں۔ نظم و نثر میں وہ ہر صنف سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔

حضرت امیر خسرو کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو ہندوستان اور ہندوستانیت کے حسن سے آگاہ کیا گل و بلبل، دجلہ و جیہوں کی روایات کی جگہ کوئل اور پیسے چمپا اور چنبلی، گنگا و جمن کے ذکر کی بنیاد ڈالی۔ ہر دیسی چیز کا بدیسی سے مقابلہ کر کے دیسی کو بہتر تلیا۔ حد ہے کہ سنی اور بت پرستی تک کے بارے میں کہا کہ محض ان کے بڑے پہلو کو نہ دیکھو۔ اچھے پہلو پر بھی نظر ڈالو اور وفاداری عقیدت گزار کی سبق لو۔ انھوں نے مسلمانوں میں ہندوستان کے موسمی تیوہاروں کو بھی مقبول بنایا۔ چنانچہ ان کی

دہ سے آج بسنت کا موسمی تیوار ہندوستان اور پاکستان کی تقریباً سبب بچی درگاہوں میں منایا جاتا ہے۔ راداس سلسلے میں دہلاؤ اور راگ راگنیاں گائے جاتے ہیں جو حضرت امیر خسرو نے خاص اسی موقع کے لئے تصنیف کئے تھے۔

ملاحاجی نے حضرت امیر خسرو کی ۶۲ تصنیفات بیان کی ہیں مگر افسوس کہ ان میں سے بہت سی آج کل نایاب ہیں ان کا ہندو کلام بھی بہت کم محفوظ رہا ہے اور فارسی کلام کو ایڈٹ کرنے اور شائع کرنے کا بھی کوئی خاص اہتمام ابھی تک نہیں ہوا ہے ہندستان مٹ رہا ہے، ہندوستانیت بکھر رہی ہے اور سیٹھے والے، ایاک کرنے والے کی طرف سے ہم بالکل غافل ہیں۔

حضرت امیر خسرو کا آخری کلام ایک ہندی دو بابا ہے۔ ان کے یہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا وصال ہوا تو وہ بادشاہ کے ساتھ بنگال میں تھے۔ یہی سنا دینی سنی تودلو لوں کی سی حالت ہو گئی کپڑے بھاڑنے، آنسو بہانے دہلی پہنچے، دوسرے پیر کے مزار کو دیکھ کر یہ دم دکھا اور اسی وقت جان دے دی۔

گوری سودے بیچ پر اور مکھ پڑا دیکس
چل خسرو گھ آئے سانج بھئی چو دیس

محبوب بیچ پر سو رہا ہے اور چہرے پر گسو کھڑے ہیں۔ چل خسرو! تو بھی اپنے گھر چل۔ چاروں طرف رات جھاگئی ہے! (خامہ حسن ثانی نظامی)

امیر علی

امیر علی 6 اپریل 1849ء کو ولندیزیوں کی بستی چنیرا (بنگال) میں پیدا ہوئے۔ ان کا شجرہ نسب حضرت امام علی رضاعی تھا۔ ہے۔ امیر علی کے والد سید سعادت علی خاں نے انھیں ہنگلی کالج میں داخل کرایا جہاں سے انھوں نے ایم۔ اے۔ (تاریخ اور اقتصادیات) میں) اور بی۔ ایل کیا اور پھر وہ کلکتا ہائی کورٹ میں دکنات کرنے لگے مگر تھوڑے ہی دن بعد حکومت ہند کے وزیر برقا الزام کی بدولت تسلیم کے لئے وہ ولایت چلے گئے۔ ہندوستان کے وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے ولایت جا کر قانون کی تعلیم حاصل

کے گناہدستانی مسلمان تعمیر

کی۔ 1873ء میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر کلکتے میں پریکٹس کرنے لگے۔ 1874ء میں وہ کلکتا ہائی کورٹ کے فیسوٹرو ہوئے۔ 1875ء میں انھیں کلکتے کے پریسی ڈپٹی کالج میں اسلامی شریعت کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ 1876ء میں انھوں نے مرکزی قومی اسلامی انجمن قائم کی اور 25 برس تک اس کے صدر رہے۔ اس انجمن کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے سہولتیں دلوانے کی کوشش کرتے تھے۔ 1876ء سے 1904ء تک وہ ہنگلی کی امام باڑا کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ 1878ء میں وہ پریسی ڈپٹی مجسٹریٹ بھی بنائے گئے مگر انھوں نے سرکاری ملازمت پر اپنی دکان کو ترجیح دی اور ملازمت ترک کر کے اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ 1883ء تک وہ بنگال کی قانونی کونسل کے ممبر رہے پھر وہ فائرس رائے لارڈین کی قانونی کونسل میں بھی مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے ممبر رہے۔ 1887ء میں انھیں سی آئی ای کا خطاب دیا گیا۔ 1890ء میں وہ کلکتے کی ہائی کورٹ کے جج مقرر کئے گئے سید محمود (مرسید احمد ضل) کے بڑے (چچا) کے لئے مسلمان تھے جو (الہ آباد کی کورٹ) جج بنے اور امیر علی دوسرے مسلمان کچھن کو یہ عہدہ ملا۔ 4 برس تک ججی کے عہدے پر فائز رہ کر جب انھوں نے پٹنہ ہائی کورٹ وہ انکلتا چلے گئے اور پھر شامڑ میں اپنا مکان بنا کر وہیں سکونت اختیار کر لی مگر وہاں بھی انھوں نے ہندوستان کی خلافت کمیٹی کی اکثر نمائندگی کی۔ انھوں نے لندن میں مسلم لیگ کی شاخ بھی قائم کی۔ 23 دسمبر 1909ء کو انھیں بریڈی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ہندوستانیوں کو وائس رائے کی انتظامی کونسل اور صوبائی انتظامی کونسلوں میں نمائندگی کا موقع ملا۔

وہ پہلے ہندوستانی تھے کچھن کے مضامین لندن کے مجلے سے "نائنٹھ سنچری" میں شائع ہوئے اور وہ سارے یورپ میں صحت اول کے انشاء پر دوا زمانے لے گئے۔ "سیرت نبوی" "سیرت آدم اسلام" "اخلاق اسلام"، "عربی سمرانیوں کی مختصر تاریخ"، "شرع عمومی کا خلاصہ"، "شریعت احمدی" اور "قانون شہادت" ان کی اہم تصانیف ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے قانونی تعلیم اور تجارت پسند کرنے

تھے۔ اُن کا نظریہ تھا کہ ہندوستان، ترقی یافتہ عورتوں کی دائمی تربیت پر منحصر ہے۔ وہ عورتوں کو مردوں سے بھی اونچے درجے پر دیکھنا چاہتے تھے۔

آزاد جیل جیس مولانا سید امیر علی کی بیگم انگریز تھیں اور ہندوستان کے دس رائے لارڈ کرنل کی سالی تھیں۔ (مناظر عاشق بگاونی)

سیرائیس

میر خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے میر بہار علی آئیس 1852ء میں فیض آباد (اتر پردیش) کے محلہ کلاب واڑی میں پیدا ہوئے۔ دیگر بھائی کی پیدائش کے بعد والد اپنے پورے کنبے کے ساتھ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ آئیس نے اپنے والد ہی کے ساتھ میں تربیت پائی۔ وہ فیض آباد ہی میں تھے تب ہی سے شعر کہنے لگے تھے پہلے حزیں تخلص کرتے تھے لکھنؤ آنے پر اور ناسخ کی ہدایت پر حزیں سے آئیس ہو گئے۔ ابتدا میں غزلیں کہیں پھر اپنے والد کے کہنے پر مرثیہ کہنے لگے۔ اُن کی شاعری حسن و خوبی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ مشکوٰۃ الفاظ، چشتی بندش، تلازم و تشبیہات، مناظر قدرت کی عکاسی اور پھر اہل بیت کے مراتب کا پاس و لحاظ آئیس کی شاعری کے چہرے ہیں۔ آئیس خلیق شاعر تھے۔ شاعری اُن کو دہلے میں ملی تھی اور ان کو اپنے شعری خان دان پرناز تھا۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے 1/2 لاکھ شعر کہے مگر اُن کا کلام صرف پانچ ہی جلدوں میں چھپ سکا۔ کہتے دالے آئیس کو ہندوستان کا شیکسپیر، خداے سخن، نظم اردو کا ہومر، درجہ اول اور بال میک کہتے ہیں۔

واجد علی شاہ کے عہد میں آئیس لکھنؤ سے باہر نہیں نکلے مگر لکھنؤ کی تباہی کے بعد (1859ء سے) باہر نکلنا شروع کیا۔ پٹنا حیدر آباد، الد آباد اور بہار گئے اور مجلسیں پڑھیں۔ آئیس وندش کے شائق تھے اور فن سپہ گری سے بھی واقف تھے۔ وضع دار تھے لباس کی وضع کو بھی آخری دم تک نبھایا۔ وقتِ معینہ پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے یہاں تک کہ اُن کے گھر والے بھی اطلاع کے بغیر اُن کے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ اردو زبان کی تاریخ میں مرثیہ گوئی میں اُن کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا۔ اور مرثیہ خوانی میں بھی دمِ بے نظیر

تھے۔ 874ء میں وفات پائی اور اپنے ہی مکان (کوچہ سہرائیس)، لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

اورنگ زیب

اورنگ زیب عالم گیر 4 دسمبر 1618ء کو مالوا اور گجرات کی سرحد پر قلعہ دوہڑ میں پیدا ہوا۔ وہ کمپن ہی میں بڑا بہادر اور جراتی تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں اُس نے ایک بڑے مامی کو قابو میں کر کے شاہ جہاں سے انعام پایا تھا۔ بڑے ہو کر اورنگ زیب نے اپنے بیمار باپ شاہ جہاں کو قید کر دیا اور اپنے تینوں بھائیوں کو قتل کروادیا۔ اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس نے اپنی فتوحات کے ذریعہ اپنی سلطنت کو کابل سے چاٹ کام تک اور تبت سے راس کاری تک وسیع کر لیا۔ وہ کٹر مسلمان تھا اس نے اکبر اور جہاں گیر نے قائم کئے ہوئے سیکولر طریقوں کو بدل کر اسلامی طرز حکومت کی بنیاد رکھی اس تبدیلی سے ہندو چونک پڑے بشیعہ ناراض ہو گئے اور مان پوت بدل ہو گئے اور مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔

اورنگ زیب نے فقہ اسلامی کے احکام 'فتاویٰ عالمگیری' کے نام سے مرتب کروائے۔ وہ خود بھی نازک زبان کا ادیب تھا۔ رعایتِ عالمگیری اس کی مشہور کتاب ہے۔ وہ شاعر بھی تھا اور عورت تخلص کرتا تھا۔ اس کا حافظ بلا کا قوی تھا وہ اپنی فوج کے سپاہیوں کی حاضری زبانی (رجسٹر کے بغیر) لیتا تھا۔ وہ اپنا ذاتی خرچ قرآن شریف لکھ کر اور گولے کی ٹوپیاں کاڑھ کر لپٹا کرتا تھا۔ مرنے کے بعد اُس کی وصیت کے مطابق اس کی جمع شدہ رقم 309 روپے 2 آنے میں سے 10 روپے 2 آنے کھدر کے کعبے پر خرچ کئے گئے اور 305 روپے خیرات کر دیے گئے۔

مگر یہ زاہد خشک انسان بھی 35 برس کی عمر میں اپنی خالہ کی کنیز زین آبادی پر مری طرح فریفتہ ہوا، ایک عرصے تک اپنے شب و روز زین آبادی کے ساتھ عیش و نشاط فرمایا و طرب میں گزارے مگر جب وہ مرضِ دق میں مبتلا ہو کر مری تو یہ عشق کی پہلی اور آخری کہانی بھی ختم ہو گئی۔ اورنگ زیب نے 90 برس کی عمر پائی اور 1707ء میں وفات پائی وہ مغلیہ خان دان کا ایک جلیلِ قدر بادشاہ تھا مگر ناکام مرنے والا اس نے کہ وہی مغلیہ حکومت کے زوال کا باعث بنا۔

بابر

عسکر شہزاد اور قلعہ نگار سلیم کا بیٹا محمد ظہیر الدین بابر 14 فروری 1483ء کو پیدا ہوا۔ نان پوس خاں لفظ 'محمد' کا درست تلفظ ادا نہ کر سکا اُس کی زبان سے 'محمد' کے بجائے بابر نطق تھا۔ چنانچہ ظہیر الدین کو سب بابر ہی کہنے لگے۔ 21 برس کی عمر میں (5 دسمبر 1499ء) وہ فرغانہ کا بادشاہ بنا اور 6 برس کی عمر میں چچاں لڑائی کا شہ سلطان بیک سے اُس کی شادی ہوئی۔ 19 برس کی عمر میں اُس نے اپنے چچا زاد بھائی سے سمرقند چھین کر اس پر قبضہ کر لیا۔ 1526ء میں جب بابر ہندوستان میں داخل ہوا تو پانی پت کے میدان میں اس کا مقابلہ ابراہیم لودھی سے ہوا اور لڑائی کی فوج 5 لاکھ سپاہیوں اور ایک ہزار ہفت سو پستل تھی بابر کی فوج صرف 12 ہزار تھی مگر لودھی کو شہست ہوئی اور بابر نے آگرے میں منلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بابر نے ریاضی، نجوم، تاریخ اور مذہب اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ ترکی اور فارسی میں وہ شعر کہتا تھا۔ فن سپہ گری میں بھی اُس کو بہارت حاصل تھی۔ وہ ہمہ وقت ایک سپاہی کی ہی زندگی گزارتا تھا۔ امن کے دنوں میں بھی وہ زہ پہن کر سوتا تھا۔ ایک ایک آدمی کو اپنے دونوں اخیلوں میں دبا کر قلعے کی فصیل پر وہ دوڑ لگاتا تھا اور وہ اکثر سنگے پاؤں چلنے کی مشق کرتا تھا تاکہ وہ لمبے سخت ہو جائیں کہ وقت پڑنے پر کھنکھیر کی سختی محسوس نہ ہو۔ دریا یا نہر خواہ بج بستہ ہو جہاں پانی دیکھتا وہ غسل کرتا تھا۔ اُس کی عمر کے پہلے 30 برس میں 18 برس جنگ کرنے ہی میں گزر گئے۔

27 اپریل 1522ء (1516ء میں رجب 932ھ) کو جمعہ کے دن اُس نے اپنے 'بادشاہ و کابل و دہلی' ہونے کا اعلان کیا۔

بابر کی بیگم ماہم سے بہاولوں اور گل بدک پیدا ہوئے اور بابر کی اولاد میں انہی دونوں نے زیادہ نام پیدا کیا۔ بابر کو تصدیق سے بھی لگاؤ تھا اور علم موسیقی سے بھی۔ اس نے کئی رنگینار

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان تعمیر

رکھائیں۔ اُس نے اپنے نام پر ایک رسم خط (بابری رسم خط) بھی ایجاد کیا۔ وہ شراب، بھنگ اور فیون استعمال کرنے کا عادی تھا اور مرد پرست بھی تھا۔ مگر انا سالگ سے جنگ کے وقت اُس نے شراب نوشی سے تو یہ کمی تھی۔ بابر نے اپنی تزک میں ہندوؤں کے تہروں کو غلیظ لکھا ہے اُس کو اپنے وضع داروں اور اپنے آباؤ اجداد سے بھی شکوہ تھا کہ وہ ان کو مفعل نہیں مفعول کہتا کرتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اگر مفعول فرشتے کی نسل سے بھی ہو تب بھی وہ بُرا ہے، مفعول کا نام آبِ زر سے لکھا جائے تب بھی وہ بُرا ہے۔ 22 دسمبر 1530ء کو بابر کا انتقال ہوا۔ اُس کی لاش کو کابل لے جا کر دفن کیا گیا۔

یہ تاریخ کا مقدس جھوٹ ہے کہ بابر نے اپنی دغا سے اپنی بقیہ عمر اپنے بیمار بیٹے ہمایوں کو بخش دی اور پھر اس کی موت واقع ہو گئی۔ دراصل بابر کی موت اُسی زہر کی بنا پر ہوئی جو کبھی ابراہیم لودی کی ماں نے باورچی کے ذریعے بابر کو دلوایا تھا اور کئی برس گزرنے کے بعد بھی جس کا اثر باقی تھا۔ بابر کا علاج کرنے والے طبیبوں کی بھی یہی تشخیص تھی۔

بدر الدین طیب جی

10 اکتوبر 1464ء کو وہ سلیمانی پور، خان دان میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے ہندوستانی پیر سرستھتے جن کو ممبئی کی ہائی کورٹ نے تسلیم کر شہر ممبئی کے سدھارکے لئے انھوں نے کئی تحریکیں چلائیں۔ ممبئی کی انجمن اسلام کی بنیاد رکھنے والوں میں یہ بھی تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے اجلاس (دراسن، 1887ء) میں وہ کانگریس کے صدر منتخب کئے گئے۔

بدر الدین طیب جی کو جنوبی ہند کا سرستید سمجھا گیا ہے وہ بھی مسلمانوں کے سامنے دکھوں کا مداوا تعلیم ہی کو سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں اپنے غیر مسلم دوستوں سے بھی مشورہ لیتے تھے۔ وہ مسلم فرقے کے مسائل کو دوسرے فرقوں کے مسائل سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے آخری دنوں میں عین سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور قجی کا عہدہ

سنجال کرا ایک کام یاب بیج ثابت ہوئے تھے مگر وہ اپنے آخری دم تک قوم پرست ہندوستانی ہی رہے۔ 1906ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

بی اماں

نام آبادی بیگم تھا مگر عدلی ہمدردان کی ماں تھیں اور بی اماں کے محترم نام سے پہچانی جاتی تھیں۔ امروہے کے ایک معزز خان دان میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے چھ اولادیں تھیں پہلی اولاد ایک بیٹی تھی جو پانچ تھی اور جبراً چودا برس کی عمر میں مر گئی۔ باقی پانچ بیٹے تھے جن میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے نام پیدا کیا۔ بی اماں کے جب شوہر کا انتقال ہوا تو وہ 23 برس کے تھے اور بی اماں کی عمر صرف 27 برس تھی اور اس وقت مولانا محمد علی سب سے چھوٹے تھے اور اُن کی عمر صرف 2 برس تھی۔ مرحوم نے جو اثاثہ چھوڑا وہ 53 ہزار روپے قرض تھا۔ بڑھاپے کے بعد بی اماں نے خدمت بھی انگریزی پڑھی اور اپنے بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ جیسٹم، بھتیجیوں کی انگریزی تعلیم سے نا آشنا تھے۔ اس لیے انھوں نے مالی مدد بلکل نہیں کی۔ بی اماں نے ایک ہندو عورت کو راز دار بنا کر اپنے سارے زلیور بیچ ڈالے اور بیٹوں کی انگریزی تعلیم جاری رکھی۔

1921ء میں وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ خلافت تحریک میں حصہ بھی شریک ہوئیں۔ ابتدا میں وہ برقیہ میں کریموں کے ساتھ دورہ کرتی تھیں بعد میں برقیہ ہنسنا ترک کر دیا تھا انھوں نے اپنی ممتاز پر جبر کر کے اپنے بیٹوں کو انگریزوں کے ظلم و ستم کے آگے بڑھا دیا تھا وہ اس حد تک انگریز دشمن بن چکی تھیں کہ بیٹوں کو انھوں نے مار دی تھی کہ اگر انھوں نے انگریزوں سے کبھی کوئی صلح کی تو وہ اُن کا گلا گھونٹ دیں گی۔ ایک بار مولانا شوکت علی نے کھنڈ کے اپنے ایک دوست کو ایک فوٹو بھیجا تھا۔ فوٹو میں بی اماں ایک کرسی پر بیٹھی تھیں تھیں اور دونوں بیٹے کرسی کے کچے صوب انداز میں کھڑے تھے۔ فوٹو کے نیچے مولانا شوکت علی نے لکھا تھا: - Lioness and her cubs یعنی شیرنی اور اُس کے بچے!

گلن کاہنڈستانی مسلمان تمبر

علامہ تاج درنجیب آبادی

احسان اللہ خاں نام، تاج در تخلص، تاج درنجیب آبادی (ضلع بجنور، اتر پردیش) کے ایک پوسٹ زنی پٹھان خان دان میں پیدا ہوئے۔ دیوبند کے دارالعلوم میں تعلیم پائی اور وہاں مولانا ڈو شاہ کے شاگرد رہے۔ پنجاب یعنی دہلی سے پہلے مولوی فاضل اور پھر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ملازمت کی ابتدا لاہور کے دیال سنگھ ہائی اسکول سے ہوئی جہاں وہ علوم شرقیہ کے استاد تھے۔ پھر دیال سنگھ کالج میں شعبہ اردو، عربی و فارسی کے پروفیسر اور صدر ہو گئے۔ رٹا عری میں حضرت رسالہ پوری کے شاگرد تھے۔ 1915ء سے قلمی زندگی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے لاہور کے رسالہ 'مخزن' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ تنخواہ صرف 5 روپے ماہ وار ملتی تھی۔ پانچ برس 'مخزن' کی ایڈیٹری کرنے کے بعد 'ہلالوں' کے ایڈیٹر بن گئے یہاں بھی پانچ برس گزارے اور پھر 1929ء میں اپنا رسالہ 'ادبی دنیا' جاری کیا اور کچھ عرصے کے انھوں نے اپنی بیوی کا زلیور بیچ کر یہ طرہ سولی لیا تھا۔ یہ رسالہ اتنا زیادہ مقبول ہوا کہ دنیا کے ہر اس خطے میں پہنچنے لگا جہاں غور سے بھی اردو دان موجود تھے اور اشاعت بہ نسبت جیسی کہ علامہ تاج در کو اُس کے ایک شمارے کے لیے 3 من کاغذ خریدنا پڑا تھا جہاں جہ اس سلسلے میں اُن کو جتن کامیابی حاصل ہوتی تھی ان کے حاسدوں کی فحش اتنی ہی بڑھ جاتی تھی۔ 'ادبی دنیا' کی کامیابی کے بعد اکثر رسالوں کے نام میں 'دنیا' کا لفظ شامل ہونے لگا۔ آخر جب استغاثی اور بدانتظامی کی بنا پر 1933ء میں 'ادبی دنیا' بند ہو گیا۔ دو برس بعد مئی 1935ء میں علامہ تاج در نے 'شاہکار' جاری کیا۔

علامہ کا خیال تھا کہ پنجاب میں اردو کی ترقی تب ہی ممکن ہے کہ جب ہندو اور سکھ بھائیوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ وہ بھی انہی اردو ترقی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو اردو کی جانب راغب کیا اور اُن میں شعور و تحریر کا ذوق پیدا کیا اور مشہور وادی بنادیا۔ کربال سنگھ بے دار، سرور اور سے سنگھ شاکتی اور سی۔ ایل۔ کاؤنٹی اُن کے بڑے پیرو شاگرد رہے ہیں۔ پنڈت بھٹارام

و قاضی انہی کے شکر کرتے رہے۔ دوسرے چار سالوں میں انہوں نے
بروزان چڑھایا انھیں رہا کر دیا اور ان کے علقہ کے نام سے ہی
کے تختہ ستارے سے مندرجہ ہوئے تھے۔ وہ قیامت میں پہلے جوتے تھے
ماہور کے ادیب دست مکتبی میں تھے۔ یہاں سے اپنے وطن
علاقہ تیار کیا۔ اور شہرہ آفاق ہوئے۔ انہوں نے قیامت میں
چلے گئے۔ یہ علاقہ تاج و رنے سب کا رت اور مقابلہ کیا۔ ایسا نام
اور کھیر ہی دھاک بھادی۔ ان کے قدراؤں نے ان کو 'مبلغ ال ملک'
کا لقب دیا۔ اور پھر بعد میں سرکار نے انھیں 'مبلغ ال ملک'
کیا۔ ماہور کے مشہور ناسترخہ پیر اور پیر کے سلسلے میں
علامہ کا خصوصیت ہے۔ انہی کے متعلق ہے کہ انہوں نے تصنیف
تالیف اور شہادت کا ایک ایک درجہ نام کیا۔ علامہ کی علمی
الترجیمہ اور سبھی سوں کے لغات میں شامل ہیں۔ وہ قریب کے نام
بھی اترتے تھے۔ وہ شعر و شاعری میں درست اور راجح مشورہ
میں بہت مشہور تھے۔ اگرچہ یہاں میں ان کو 'نکستی سے غمی' کی
مکروہ محفل آرا، بذراست، کمزور اور طبعی ہو ادیب تھے۔ ان کے
تھیں اور پاک بکے۔ دو تین برس قتب کے رہیں۔ مگر جو
ایک اور کو لاہور میں غفلت نے وفات پائی۔

ٹیسو سلطان کے باب حیدر علی کے پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے حیدر علی نے اپنی دوسری شادی ایک قلعہ دار کی بہن، فاطمہ میکم سے کی۔ چار برس تک فاطمہ میکم کے بطن سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تب حیدر علی ایک برہگ ٹیسوستان ولی سے رجموع ہوئے۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۷۵۰ء کو فاطمہ میکم کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ان مرگ کے نام پر بیج علی ٹیسو رکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ ان مرگ نے یہ بیٹن کوئی کنکھ کر حیدر علی کا بیٹا بنا دیا۔ وہاں سے کا جنان حیدر علی نے خدما خاندانہ ہونے کے باوجود اپنے بیٹے کو مختلف علوم سکھانے کے لیے علی حیدر اور علی آفرین آخر جیسے نام سقر کیے۔ اس اعتبار میں حیدر علی ریاست میسور کے ایک معمولی ملازم سے بڑی کرتے کرتے ڈنڈی گل کے گورنر اور پھر فوج کے سپہ سالار بن گئے۔

بیس کی عمر میں شیپو ایک فوجی افسر بن گیا اور ۱۷۶۷ء میں اس نے
 ملہ اس پر چڑھائی، فتحیاب ہوا اور اپنی اس کامیابی سے اُس نے اپنے
 ساتھیوں کو اپنا نرید بنالیا اور ۱۷۸۵ء میں وہ انگریزوں
 کے خلاف لڑنے لگا۔ ۱۷۶۲ء میں حیدر علی کے انتہاں کے بعد دہلیسور
 کا حکم ران بن۔ ۱۸ویں صدی عیسوی میں شیپو وہ پہلا ہندوستانی حکم
 ران تھا جس نے ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں انگریزوں کے خطر
 کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے اُس نے پوری کوشش کی
 کہ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جمنے نہ دے اور اس نے اپنے ۱۸
 سالہ درحکومت میں زیادہ وقت میدان جنگ ہی میں گزارا مگر
 ۱۷۹۹ء کو وہ انگریزوں کے خلاف لڑتے لڑتے "لنگا پٹم"
 کے دروازے پر شہید ہوا۔ شیواگریجہ مرد بجا ہوا تھا۔ مگر وہ مرد دشمن اس
 نہیں تھا۔ اس لیے وہ انگریزوں کی غداری کا نشانہ بن۔

ٹیپو انگریزوں کا دشمن تھا اور انگریزوں کو شیپ سے سخت
بغضت تھی۔ الشرفی اسرائیلی جن کی خاطر اپنے گتوں کو 'ٹیپو'
کہہ کر ہٹا رہے تھے۔

حسین نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی چاندنی بی 560

کے لگ بھگ پیدا ہوئی۔ باپ کی نگرانی میں اس نے عربی، فارسی اور
 انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور وہ شکار کھیلنا بھی سیکھ گئی۔ دس
 ہی برس کی تھی کہ بیجاپور کے حاکم علی عادل شاہ سے اس کی شادی
 ہو گئی۔ شوہر نے اس کی بڑی قدر کی، امور سلطنت میں بھی وہ اس
 سے مشورے لینے لگا۔ بیجاپور میں وہ کراس نے کنٹری زبان بھی سیکھ
 لی۔ مگرتادی کے 16 برس بعد وہ سوجہ ہو گئی، جوں کہ وہ لاؤلہ تھی
 اس لیے اس نے عروج شوہر کے کم رسن ہستے کو تخت پر بٹھار حکومت
 کا کام خود نبھال لیا۔ باپ کے انتقال کے بعد اس کا بھائی برہان ال
 ملک احمد نگر کے تخت پر بٹھا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد اس کا انتقال
 ہو گیا اور پھر احمد نگر میں بدامنی پیدا ہو گئی، کئی امیر تخت کے دعوے
 داسے اور جب بات زیادہ بڑھ ہی تو وہ دلی کے بادشاہ اکبر سے
 رجوع ہوئے۔ یہ دیکھتے ہی چاند بی بی نے بیجاپور اپنے دیوار برہم عادل
 شاہ کے سپرد کیا اور پھر احمد نگر آکر امیروں اور سرداروں کو وطن
 کی خاطر قید ہونے پر مجبور کر دیا۔

اکبر بادشاہ کے حکم سے شاہ زادہ مراد زاعبد رحیم خان ملتان
 کی سرپرستی میں احمد نگر پر حملہ آور ہوا اور اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک
 عرصے تک ناکام رہنے پر مغل فوج نے سترنگ لگا کر قلعہ کی دیوار کا ایک
 حصہ بارود سے اڑا دیا۔ چاند بی بی نے بڑی جمل مردی سے ڈٹ کر
 مغل فوج کا مقابلہ کیا، ضہ اپنے ہات سے بندو قیں بھر بھر کر اپنے
 سپاہیوں کو دیں۔ اور مغل فوج کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ رات ہوئی
 اور وہ تلوار سونت کر شہر پر آئی، راج مزدور، ان اور بی داروں کو
 کھد دھکایا اور کھلے لیا اور مٹھیاں بھر کر اسٹرنیاں ان کو بانیں۔ وہ
 بات میں مشعل لیے کھڑی رہی اور راج مزدور چو نے پراہنت پتھر
 طبع، لکڑی حدیہ کہ انسانی لاشیں جو بات آیا چلتے گئے۔ صبح ہوتے
 ہی تفصیل پر تو میں چڑھا کر چاند بی بی نے مغل فوج پر اداوں کی
 طرح گولے برسائے، ہزاروں مغل سپاہی ہلاک ہوئے۔ قلعہ میں
 جب کچھ ذرا تو چاند بی بی نے سونے چاندی کے گولے ڈھال ڈھال
 کر مغل فوج پر مارنا شروع کئے۔ آخر جب احمد نگر کے قلعہ میں غذا کا
 کوٹا بھی ختم ہو گیا تو چاند بی بی نے صلح کی پیش کش کی۔ مغل فوج کے
 لیے بھی کسدا اور بنجارے کی راہ بند ہو چکی تھی اور شاہ زادہ مراد

کو یہ خبر مل چکی تھی کہ چاند بی بی کے دیوار برہم عادل شاہ نے اپنے
 ایک باندیہ خواجہ سر امیر ہیل خاں کو 25 ہزار فوج دے کر
 چاند بی بی کی مدد کے لیے روانہ کر دیا ہے اور دکن سے آہنگ خان بھی
 بھی 7 ہزار سوار لے کر قلعہ احمد نگر کی حفاظت کے لئے چل پڑا ہے
 تو خان خانان کی مخالفت کے نتیجے میں چاند بی بی نے برہان ال ملک
 پیش کش کو قبول کر لیا۔ صلح کے نتیجے میں چاند بی بی نے برہان ال ملک
 کے پوتے کو احمد نگر کے تخت کا دارت قرار دلوا لیا۔ اور مغل فوج نے
 مجاہدہ اٹھایا۔ احمد نگر کے امراء نے چاند بی بی کی جواں مردی کا ر
 ملت علی سے شخص ہو کر اسے احمد نگر کے تخت پر بٹھایا۔ اور
 "نادرة الزمانی" کا خطاب دیا۔ اور اس دن ت وہ چاند سلطان
 سیگم ہی جانے لگی۔

چار برس بعد 1597ء میں مغل فوج پھر حملہ آور ہوئی۔ احمد نگر
 کی جانب سے امیر ہیل خاں نے مقابلہ کیا مگر اس کی ہار ہوئی، اپنی کمزوری
 اور آپس کے لہذا کو مد نظر رکھتے ہوئے چاند بی بی نے چاہا کہ قلعہ مغل فوج
 کے حوالے کر دیا جائے مگر اس کے امیروں اور سرداروں نے سمجھا کہ چاند بی
 بی مغل فوج سے ساز باز کئے ہوئے ہے اور اسی شے میں انھوں نے چاند
 بی بی کو قتل کر دیا۔ چاند بی بی عقل و تدبیر، سخاوت اور شجاعت کی حامل
 تھی اور دیاب بچانے میں ماہر تھی۔

جوش ملیح آبادی

خان دانی نام شہیر احمد خاں، بعد کا نام شہیر حسن خاں۔
 تخلص شہیر بعد میں جوش۔ والد کا نام شہیر احمد خاں، تخلص شہیر۔ دادا کا نام
 محمد احمد خاں۔ ذات آفریدی پٹھان سگودا دار، رہ خیر سے گزیر کر فرخ
 آباد آئے۔ دادا نے ملیح آبادی میں سکونت اختیار کی 5 دسمبر 1898ء
 کو صبح کے چار بجے ملیح آباد کے محلہ زانچ میں جوش پیدا ہوئے۔ باب
 دادا دونوں شاعر تھے، دادی بھی شعر و ادب کا ذوق رکھتی تھیں۔ شہید
 تھیں۔ (1907ء میں جوش بھی شہید ہو گئے) ساری اور فارسی جوش نے
 گھر پر ہی مزید تعلیم سیتا، پور، لکھنؤ، علی گڑھ اور دارا گڑھ میں سینئر
 کیمبرج تک ہوئی۔ رت انی تئیں میں بھی چھپے ہوئے تک رہے۔ نو برس کی
 میں پہلی شعر کہا۔ عزیز لکھنؤ کو استاد بنایا، حافظ، نظری، خیا

تیس نظیر کربادی، غالب انشمال اور شیلور سے متاثر ہوئے پہلی بار ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ کے ایک مساعری میں شرکت کی۔ ۱۹۱۶ء میں انٹر جہاں بیگم سے سادی ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں نظام حیدر آباد کے دارتوجہ میں ملازم ہوئے۔ ناظر ادب بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد چھوڑ دیا۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی سے ماہ نامہ 'کلم' جاری کیا۔ ۱۹۳۹ء میں 'کلم' کے بند ہونے پر ۱۹۴۰ء میں ماہ نامہ 'نیا ادب' کے مدیر اعلیٰ بنے مگر ایک ہی برس بعد 'نیا ادب' سے بھی علاحدہ ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک پورنے میں فلم ساز و ہدایت کار ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی فلم کمپنی ٹالی مار کچہر میں ایک گیت کار اور مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم رہے۔ 'سن کی جیت' ان کی بہترین فلم ہے جس کے دو گانے (نگری مری کب تک، اونچی ہر بار رہے گی، اور میرے جینا کا دیکھو اٹھارے) غیر معمولی طور پر مقبول ہوئے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک وہ حکومت ہند کے ماہ نامے 'آج کل' کے اڈیٹر رہے۔ ۱۹۵۵ء میں وہ کراچی ایاکستان چلے گئے جہاں ایک ادبی مشیر کی حیثیت سے ترقی اردو بورڈ میں ملازم ہو گئے۔

جوش کا پہلا مجموعہ نظم و نثر 'روح ادب' ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا اور اب تک ان کی دو درجن تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ 'یادوں کی بارات'، ان کی خرد نوشت سوانح ہے۔ ماہ نامہ 'زمانہ' کے اڈیٹر شمس دیان رائے نے جوش کو 'شاعر اعظم' لکھا اور ۱۹۷۳ء میں مولانا عسکری رزاق طبع آبادی نے جوش کو 'شاعر انقلاب'، کالقب دیا۔ ہندوستان کی قومی حکومت نے ان کو 'پدم شروش' کا اعزاز بخشا۔ ۹ برس کی عمر سے ۶۳ برس کی عمر تک جوش نے ایک لکھ سے زائد اشعار کہے۔ ۷۵ ہزار اشعار ان کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ وہ طویل ترین نظم جو انھوں نے ۱۹۷۱ء میں شروع کی تھی ۵۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہو گئی۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی بھی زندہ یا مرحوم شاعر کا اتنا سرباد ادب موجود نہیں جتنا جوش نے تعداد اشعار، ذخیرہ الفاظ اور متنوع موضوعات کے اعتبار سے اردو زبان کو بخشا ہے۔ ہندو دیا کی ساری علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ ان کا کلام فارسی، انگریزی، روسی، چینی، یوگو سلاوی اور چیک زبانوں میں

گان ہندوستانی سداں ہر

منقل ہو چکا ہے۔

جوش مجریٰ اصدا ہیں، صورت و سیرت میں پھیلت
کی جھلک موجود ہے، گہوارے اعتبار سے غالب سے ملنے ملتے ہیں
مے نوشی ہی ان کا محبوب شغل ہے۔ زندگی میں ۸ عشق کر چکے
ہیں اور انھوں نے اپنی جوانی کو اس کے سلسلے شریہ تقاضوں کے
ساتھ گزارا ہے۔ وہ اس صدی کے چند قوم پرست شاعروں میں
سے ہیں۔ تنگ دستی کے باوجود انھوں نے کسی بھی وارفنڈ (دوسری
بڑی جنگ کے دوران میں) کے مشاعرے میں کبھی شرکت
نہیں کی۔

وہ ہندو پاک کے سب سے بڑے اردو شاعر ہیں۔

حالی

الطاف حسین نام، حالی تخلص، شمس العلماء خطاب
ان کے بزرگ ہرات سے ہندوستان آئے۔ حالی ۱۸۳۷ء میں
پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باپ پتی اور ماں شیدہ تھیں، نورس
کے تھے کہ باپ کا سایہ مرے اٹھ گیا اپنی کوشش سے تعلیم حاصل
کی۔ ۱۸۷۲ء میں کی عمر میں شادی ہوئی، غدر کے بعد لاہور میں پنجاب
گورنمنٹ ہک ڈپٹی میں خدمت ہو گئے، پھر دہلی کے عربک اسکول میں
مدرس رہے۔ علی گڑھ جب سپرے تو سیاست حیدر آباد کی جانب سے
ان کو ۱۸۷۵ء میں ۷۰ روپے ملنے لگا جو بعد میں ۱۵۰ روپے ہو گیا
شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد بنے۔ یہ نچرل اور قومی شاعری کے مجتہد
مانے جاتے ہیں، انھوں نے شاعری کے حسن کو فضول گوئی سے پاک
کیا۔ ۱۹۰۴ء میں ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۷ء میں
آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر بنے۔ ان کی تصانیف
میں 'حیات سعدی'، 'مصدق حقی'، 'جو سر سید کی فرمائش پر لکھی
گئی'، 'بانگ درا' اور 'دیوان حالی' کے نام قابل ذکر ہیں۔
مولانا حالی حافظ قرآن تھے، مسرید کے بے حد متراح تھے
اچھے انسان تھے، ہندو مسلمان تھے مسلمانوں کے آپس کے اختلاف
کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ حالی کے قبوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین
آج کے مشہور قلم کار خواجہ احمد عباس کے نانا تھے۔

الہ آباد، فیض آباد، میرٹھ، جمدانا، لیت پور اور سامبھتی کی جلیوں میں اپنی جوانی سے بڑھاپے کے کئی دور گزار دیے۔ قید کے دنوں میں اگر رمضان آتے تو وہ روزے بھی رکھتے اور چکی بھی پیستے اور شاعری بھی کرتے۔

شاعری طالب علمی ہی کے زمانے سے کرتے تھے علی گڑھ میں انھوں نے اردوئے معلّٰی کے نام سے ایک اردو مجلس بھی قائم کی تھی۔ چونکہ پرانی وضع کا لباس پہنتے تھے اور ساتھ میں ایک بڑا سا پان دان بھی رکھتے تھے اس لیے اُن کے ہم جماعت اُن کو خالہ جان کہہ کر یکاریتے تھے حسرت کا شمار اردو غزل کے صفحہ اول کے شعراء میں ہوتا ہے مگر، اصغر اور فانی حسرت ہی کے نجی شاعری کی شاخیں تھیں۔ وہ جن جن مسلمان تھے اور کرشن جی کے پرستار بھی، وہ غزل بھی کہتے تھے اور کرشن بھکتی میں ڈوبی ہوئی کویتا بھی۔

حب وطنی، انسان دوستی، حق گوئی، بے باکی، استندنا اور فقر حسرت کے نمایاں اوصاف تھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ممبر کی حیثیت سے انھوں نے نہ صرف ۷۵ روپے یومیہ الاؤنس لینے سے انکار کر دیا تھا بلکہ وہ اس بات پر بھی مصر تھے کہ دوسرے ممبروں کو بھی ہندوستان جیسے غریب ملک کے خزانے سے اتنی بڑی رقم نہ لینا چاہیے۔ اس طرح ایک پردگرام کے خلع پر انھوں نے کھنور ٹیڈا اسٹےشن سے صرف تین ہی آنے لیے اور باقی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ان پور سے کھنور تک پہنچنے میں اُن کے صرف تین ہی آنے خرچ ہوئے ہیں۔ اپنے رسالے 'اردو معلّٰی' کا سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ بنڈل بناتے، کندھے پر رکھتے اور پوسٹ بھی خود ہی کرتے۔ بڑا قاتی لائب رہے ری بنڈل رکھنے کا اُن کو بڑا شوق تھا۔ ایک بار ایک سیاسی مقدمے کے نتیجے میں عدالت سے اُن پر جرم نامہ ہوا تو وہ جرمانہ ادا کر کے گھر کا سامان قرق ہو گیا، گھر میں کتا بون کے سوا اور کچھ نہ تھا، ساڑھے چار ہزار روپے کی زمین پولیس نے وری بنا کر 60 روپے میں بیچ ڈالیں۔

حسرت کی بیگم نشاط انسا حقیقی معانی میں اُن کی شریک حیات تھیں۔ انھوں نے اُن کے ساتھ نمک کے پانی سے روٹی کھائی۔ اُجرت پر کپڑے سے اور چکی پیس کر بھی گزری۔ اگرچہ حسرت کی یہ

حسرت موہانی

اخبارات کا پلندہ لعل میں دبائے، ٹوٹی کمائی کی عینک۔ لگائے، موٹے دسی کپڑے کی ملگجی شروانی اور پاجامہ پہنے، بنا بھندے کی سُرخ میں آلود ترکی ٹوپی اوڑھے اور ایک پرانی سی چھڑی ہات میں لیے پیدل ہی اسمبلی ہاؤس جانے والے صاحب حسرت موہانی تھے۔ اُن کا نام سید فضل الحسن تھا والد کا نام سید ازہر حسن اور ماں کا نام شہر بانو تھا وہ ضلع آناؤڈ (اُتر پردیش) قصبہ موہان میں ۱875ء میں پیدا ہوئے۔ قراکین شریف اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے قصبے ہی میں حاصل کی اور جب اردو مڈل پاس کیا تو سارے صوبے میں اول آئے اور وظیفہ پایا اور اسی طرح فتح پور، سوا کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے امتیازی نمبروں سے انٹرنش پاس کر کے بھی وظیفہ حاصل کیا۔ ۱903ء میں علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کیا۔ ۱904ء سے سیاست میں آئے اور کانگریس کے ڈیپٹی گیٹ بن کر کانگریس کے ممبئی کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ حسرت وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے کی تلقین کی۔ وہ حسرت ہی تھے کہ جنھوں نے سب سے پہلے بلا شرط مکمل آزادی کا ریزولوشن (احمد آباد میں کانگریس کے اجلاس ۱921ء میں) پیش کیا اور جس کو کانگریس ۱929ء سے قبل منظور نہ کر سکی۔ (ترک موالات - Non-Co-op-ration)۔ جیسی اصطلاح کے حسرت ہی موجد ہیں۔ حسرت کانگریسی بھی رہے، مسلم لیگ بھی، کم یونسٹ بھی اور ٹیڈ یونینوں سے بھی وابستہ رہے مگر کوئی بھی جماعت اُن کے انتہائی شدید اور تیز رو خلوص کا ساتھ نہ دے سکی، نتیجہ یہ ہوا کہ جب کانگریس نے ملک کی تقسیم کو مان لیا اور مسلم لیگ نے اپنا مطالبہ پاکستان منوایا تو حسرت نے یوپی اسمبلی میں جھنجھلا کر نعرہ لگایا: 'ہندوستان مردہ باد، پاکستان مردہ باد' اور اصل حسرت سیاست دان نہیں تھے بلکہ انتہائی مجلس، محب وطن اور جوشیلے مسلمان تھے انھوں نے جنگ آزادی کے ایک جاں باز سپاہی کی حیثیت سے علی گڑھ،

گلن ہندوستانی مسلمان

محنت کی شادی تھی مگر پھر بھی انھوں نے اپنی زندگی میں جہاں ایک درجن کے لئے دہاں نصف درجن عشق بھی قوالی سننے کے شوقین تھے مگر سننے مابقی کے محال۔ درزی کا سلاہو اکبر اکبری نہیں پہنا، بیوی نے حوی دیادہ پہن لیا۔ بچپن میں جنگ بازی کا بہت شوق تھا۔ پھلوں میں شریفی بہت رعیت سے کھاتے تھے۔ 13 مئی 1951ء کو ان کا انتقال ہوا۔

خواجہ حسن نظامی

2 محرم 1296ھ کو بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اویسی دہلی میں پیدا ہوئے۔ 11 ذی الحجہ 1374ھ 13 جولائی 1954ء کو وفات پائی۔

سوفی بزرگ، عالم باطن، قوم کے مصلح، کامیاب تاجر، مشہور اخبار نویس، بہترین مقرر، بیار نویس اور صاحب طرز انشاء پرداز۔ ہر صفت موصوف!

چھوٹی عمر میں ہی وسیع ہو گئے تھے اپنی کوشش اور محنت سے ترقی کی تصوف کو نئے تقاضوں کے موافق لکھا، بیان کیا اور بہت کچھ دکھایا، مخالفاہوں میں اصلاحی تحریک جاری کی اور دنیا کو بتایا کہ تصوف جو اور قنوطیت کا نام نہیں بلکہ حرکت، برکت، خدمت اور امید کا نام ہے۔

اردو زبان کے بے مثل ادیب اور صافی بنے چھوٹی بڑی کتابوں کا شمار پانچ سو تک لکھا گیا ہے۔ انھوں نے زبان و ادب کی ”برتریت“ اور ”ذات بات“ کو ختم کیا یعنی ایسے عنوانات اور موضوعات پر قلم اٹھایا اور لکھا جن کو حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا تھا اور کوئی ان کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ ”غلاب“ کے مقابلے میں ”کسیر“ کو لائے۔ ”دیاسلائی“ اور ”مجھ“ ”مکھی“ تک پر لکھا اور ایسا لکھا کہ حق ادا کر دیا۔

درجنوں اخبار اور رسالے جاری کئے، قوم کے ہیئت سے ہونہار افراد ان کی تربیت کا فیض پا کر اوروہ صوفیت اور قلم کاری کی بلندیوں تک پہنچے۔ اردو زبان کو عام فہم آسان اور دل نشیں بنایا۔ مولانا آزاد مرحوم کو ان کی شکل پسندی کی وجہ سے خواجہ صاحب بر ملا اردو کا قاتل کہا کرتے تھے جس طرح بولتے ہیں اسی طرح لکھتے کی ہم بھی خواجہ صاحب

نے چٹائی۔

میل ملا پیدا کرنے کے لئے انھوں نے مختلف مذاہب کے ہر فرد اور مومنانہ کیا۔ پیغمبر اسلامؐ حضرت عیسیٰؑ کی شری کرشمی گود نامک صلیب کے سوانح حیات بڑے والہانہ انداز میں لکھے۔ آج سے پچاس برس پہلے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔ ہندو سلاہو نے لباس میں تمام تر فقہ کا ہوں کی یا ترائی اور فلسفہ ویدانت چڑھا کی بار ڈیڑھ ڈیڑھ سو مولویوں کے دستخطوں سے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ نکلا۔ آریہ سماجیوں کے نزدیک وہ اسلام کے سب سے بڑے مبلغ تھے اور سوائی مشرودھانند بھی تحریک میں ان کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے تھے انگریزوں کی پولس نے ان کی برسوں عمرانی رکھی گرفتار کیا جیل بھیجا مگر جب انگریز ہندوستان چھوڑنے لگے تو چلتے چلتے ۶۴۶ء میں شمس العلماء کا خطاب بھی دے گئے

خواجہ صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ ”محبوب الی“ کے خواہر زادے بھی ہوتے تھے اور ان کے جڑا اہل حضرت خواجہ سید محمد امامؒ کو جو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے نوادے تھے حضرت محبوب الہی نے مرشد معنوی بنا کر خلافت اور جانشینی سے بھی سرفراز کیا تھا خواجہ صاحب پیر زادے تھے لیکن انھوں نے نذر نیازی آمدنی پر محنت کی روزی کو ترجیح دی، وہ پیشہ ورسا گئے والوں کے سخت خلاف تھے اور کہتے تھے کہ ان کو خیرات دینا قوم کو اپاہج بنانا ہے۔ خیرات کا صحیح صرف ان کے نزدیک یہ تھا کہ اگر چاروں کے خلاف سختی مریدوں کو اس کی اجرت سے زیادہ معاوضہ دے دیا جائے۔ وہ خود روزانہ (چڑھاپے تک) بھارہ لکھتے کام کرتے تھے اور مریدوں سے کہتے تھے کہ کوئی پیر نمازیں اور وظیفے بہت پڑھتا ہے کوئی سنگر بہت بانٹتا ہے مگر میری خصوصیت محنت اور اکل حلال ہے اور میرے جس مرید میں یہ صفیں ہوں سمجھ لے کہ وہ میرا سچا مرید ہے۔ وہ ساٹھ بیسٹھ ہزار مریدوں کے پیر تھے۔ انھوں نے اپنے وصیت نامے میں لکھا تھا کہ میرے ورثہ جو رقم سو گم اور حیلہ وغیرہ کی رسموں میں خرچ کرنا چاہتے ہوں اس رقم سے مترجم قرآن مجید ناداروں میں تقسیم کر دیتے جائیں اور رقم کوئی نہ کی جائے۔ ان کے ماسی وصیت نامے میں یہ بھی درج ہے کہ عقل مندوں کے ساتھ رہنا جنت ہے اور بے وقوفوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دوزخ ہے۔

(حسن نظامی)

ہم کاتھنستالی سلمان نسیم

مولانا حسین احمد مدنی

وہ 6 اکتوبر 1879ء کو سہ شنبہ کی شب میں گیارا بھینٹا
 اناؤ (اتر پردیش) کے قصبہ بانگرہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن ہو
 الہ داد پور (تحصیل ٹانڈا، ضلع فیض آباد، اتر پردیش) تھا تاہم
 نام چراغ منور رکھا گیا۔ مہینے میں کچھ عرصے رہنے کی بنا پر مدنی کہلا
 ذات سے حسینی سید تھے مولانا کے والد سید حبیب اللہ ایک اُردو
 مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے مولانا 12 برس کے تھے تو ان کو مزید
 تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند بھیج دیا گیا جہاں وہ شیخ ہند مولانا
 محمود حسن کے شاگرد بنے۔ سات برس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ
 مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہو گئے مگر حقوڑے ہی دن بعد
 اپنے والد کے ساتھ وہ مدینے چلے گئے اور وہاں ایک استاد کی
 حیثیت سے ملازم ہو گئے اور رہنے کے لئے مکان بھی مل گیا لیکن
 ملازمت کا سلسلہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا ملازمت چھو
 ہی مکان بھی خالی کرنا پڑا، بہت دنوں تک سارا خان دان بے
 گھر رہا اور فاقے کرتا رہا۔ آخر حرم اظہر میں درس دینے لگے اور
 قدرے روزی کا انتظام ہوا اسی اثنا میں مولانا عبدل حق (جو
 بعد میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں صدر مہتمم بنے)
 کو بھی درس دیتے رہے۔ نتیجے میں حالات اتنے مزور سدھر گئے کہ
 گھر کے مردوں، خندوں اور بچوں نے مل کر اپنے ہاتھوں سے ایک کچا پکا
 مکان بنالیا۔ شیخ ہند مولانا محمود حسن چون کہ ترکوں کی خلافت کے
 حق میں تھے اس لیے جب وہ اپنی دونوں بیٹیوں کی غرض سے مکہ پہنچے تو
 شریف مکہ نے انھیں اور ساتھ میں مولانا حسین احمد کو بھی پکڑ کر انگریزوں
 کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے دونوں کو لٹا میں اسیر کر دیا جب رہا
 ہو کر ہندوستان واپس ہوئے تو اس اثنا میں والد صاحب، والدہ، اہلیہ
 اور ایک بیٹے کا انتقال ہو چکا تھا۔ فوجی بھرتی اور پولیس کی ملازمت
 کے سلسلے میں کراچی کے سلسلے میں جو فتوے دیے گئے اس کی بنا پر
 دو برس کی جیل ہو گئی۔ جیل میں مولانا محمد علی بھی ساتھ میں تھے انھوں
 نے مولانا مدنی سے قرآن کا ترجمہ پڑھا۔ 6 برس تک سلطنت (بنگال)
 کے جامعہ اسلامیہ میں شیخ حدیث کے فرائض انجام دیتے رہے اور تبلیغ

کا کام بھی انجام دیا جہاں ہزاروں اشتیاق مند نے آپ کے ہات پر
 بیعت کی۔ سلطنت سے واپس پر دار العلوم دیوبند میں شیخ حدیث مقرر
 ہوئے۔ اٹھارہ سالہ واپسی پر ہی انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر بن گئے تھے
 اور جمعیت علماء ہند کے بھی ممبر تھے چنانچہ 1923ء میں کوکنا ڈاکے
 اجلاس میں جمعیت علماء کے صدر منتخب ہوئے پھر 1942ء میں صدر
 منتخب کئے گئے۔ 5 دسمبر 1957ء (مجموعات) کو وفات پائی۔
 1954ء میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے ان کو 'پدم بھوشن'
 کا اعزاز بخشا گیا مگر انھوں نے یہ کہہ کر یہ ان کے اسلاف کی روش
 کے خلاف ہے اس کو قبول کرنے سے محنت چاہ لی۔

دار العلوم (دیوبند) نے 94 برس میں 6630 عالم پیدا
 کئے ان میں 3356 حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد تھے
 مولانا نے انتقال کے وقت 67 خلفاء چھوڑے۔ جمعیت علماء
 کے موجودہ صدر مولانا آسمد مدنی مولانا مدنی مرحوم کے صاحب
 زادے ہیں۔

مولانا حفیظ رحمان

مولانا حفیظ رحمان 3 جنوری 1901ء کو ضلع بجنور (اتر
 پردیش) کے ایک قصبے سیوہاے میں پیدا ہوئے۔ مولانا کا اصلی نام
 معز آدین تھا۔ ان کے والد شمس آدین صدیقی زمین دار تھے۔ مولانا کی
 ابتدائی تعلیم سیوہاے ہی کے ایک مکتب میں ہوئی اور مزید تعلیم انھوں
 نے مراد آباد کے شاہی مسجد کے مدرسے میں اور دیوبند کے دار العلوم میں
 حاصل کی۔ وہ حضرت النور شاہ کشمیری کے بہت عزیز شاگرد رہے۔
 دیوبند کے قیام میں مولانا نے شیخ ہند محمود حسن اور مولانا عبید اللہ
 سندھی کی قومی تحریک کے مابعد اثرات قبول کئے اور طالب علمی
 ہی کے دنوں میں سیاست میں علی حصہ لینے لگے۔ 1920ء میں
 تحریک ترک موالات کے سلسلے میں جیل گئے اور رہا ہونے کے بعد
 تعلیم بھی جاری رکھی اور خلافت، کانگریس اور جمعیت علماء کے
 تحت مختلف سیاسی تحریکوں میں شامل رہے۔ تعلیم کے خاتمے
 پر وہ دار العلوم ہی میں استاد مقرر ہوئے مگر سیاسی سرگرمیاں پھر
 بھی جاری رہیں۔ جامعہ ڈابھیل میں بھی کئی برس استاد رہے۔

تلموں میں 'شبید'، 'انداز'، 'جوگن'، 'دیدار'، 'مید'، 'بابل'، 'آن'، 'دیوراس'، 'مغل اعظم' اور 'گنگا جنا' کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہ اب تک تقریباً 50 تلموں میں کام کر چکے ہیں۔

۱۹۶۶ء میں دلیپ کمار نے مسلم ایکٹریس سائرہ بانو سے شادی کی، فرصت کا محبوب شغل بیڈ منٹن کھیلنا ہے۔ اُن کا شمار ہندوستان کے صف اول کے اداکاروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر صاحب کے والد ذاکر حسین خاں قائم گنج (ضلع فرخ آباد، اتر پردیش) کے رہنے والے تھے مگر حیدر آباد دکن میں وکالت کرتے تھے، وہیں فروری ۱۹۰۷ء میں ذاکر صاحب پیدا ہوئے، اٹا دے، بکھنؤ، علی گڑھ اور برلن (جرمنی) میں تعلیم حاصل کی، چنانچہ وہ تعلیمی اعتبار سے ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ سی۔ تھے۔ ۱۹۲۵ء میں ترک حوالات کے تحت علی گڑھ یونیورسٹی کو خیر باد کہہ کر جامعہ ملیہ میں آ گئے اور اس کی تعمیر اور فروغ میں لگ گئے، ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۳ء تک وہ جامعہ ملیہ کے دانش چانسلر رہے، جامعہ ملیہ میں ایک استاد کی حیثیت سے اُن کا تقریر ۳۵۰ روپے ماہ وار ہوا تھا مگر انھوں نے صرف ۲۵۰ روپے ماہ وار تنخواہ لینا منظور کی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ ۱۵۰ روپے ماہ وار لینے لگے اور جب اس ادارے کو انھوں نے خیر باد کہا اُن دنوں وہ تنخواہ کی صورت میں صرف ۹۵ روپے ماہ وار لے رہے تھے کئی برس تک ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے صدر رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک مسلم یونیورسٹی کے دانش چانسلر رہے۔ دوبارہ راجپوت سبھا کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر بنا دیے گئے اور پھر ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ بنے اور ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۹ء میں وہ جمعیت علماء کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۴۲ء میں جسٹس سکریٹری بنے، کئی برس تک کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ دہلی میں جب ہندو مصنفین (۱۹۳۸ء) قائم ہوا تب سے مولانا مستقل طور پر دہلی ہی میں رہنے لگے۔ تصنیف و تالیف کا کام، جمعیت علماء اور کانگریس کی تحریکوں میں حصہ لینا ہی اُن کی زندگی کا مشن تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مولانا نے دہلی کے مسلمانوں کو بچانے میں کاروائی نمایاں انجام دی۔ اسی بنا پر مولانا ستارہ عبدل قادر نے کہا تھا: 'دہلی میں فسادات کے زمانے میں مسلمانوں کو بچانے کے سلسلے میں مولانا نے جو خدمات انجام دی ہیں میں اُن کے بدلے میں اپنی پوری زندگی لے اذکار اور اشغال نثار کرنے کو تیار ہوں' مولانا دوبارہ بار لیا منٹ کے ممبر رہے مگر کانگریس اور جمعیت علماء ہونے کے باوجود وہ براہ راست کہتے تھے 'وہ حکومت مٹ جانے کے لائق ہے جہاں کے عوام بھوکے ہوں'؛

مولانا حافظ رحمان خاں خاں سیاست دان تھے، ہندو معتد تھے اور اپنی صفت میں وہ داب مولوی تھے جو باطل تھے اور درحقیقت مجاہد ملت تھے۔ مصنف کی حیثیت سے 'فلسفہ اعتلاقی'، 'قصص قرآن' اور 'رسول کریم' اُن کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔ مولانا کو کھانے میں اُڑدہیت مرغوب تھے اور کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیبز کھانا پسند فرماتے تھے۔ پیچھے کے کینسر میں مبتلا ہوئے اور ۲۲ اگست ۱۹۶۲ء کو وفات پائی۔

دلیپ کمار

ذاتی نام دلیپ کمار، اصلی نام یوسف خان۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پیشاور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم پائی۔ روزگار کی ابتدا پونا میں کینٹین سے ہوئی، پہلی بار ۱۹۴۹ء میں دیوی کاراتی کے توسط سے بابے ٹائیکز کی فلم 'جوار بھانا' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ فلم 'ملن' سے شہرت حاصل ہوئی اور فلم 'جگنو' سے وہ اسٹار بنے۔ دلیپ کمار کی مشہور

ہلکے کا ہندوستانی مسلمان نمبر

کو بادشاہ بنادیا۔ پھنڈا کا جاکم ملک التونیہ نے حب رضیہ کو قید سے چھڑایا تو رضیہ نے اُس سے شادی کر لی۔ دونوں نے فوج بنا کر دہلی پر حملہ کیا مگر مارہوئی اور بہرام شاہ نے وار اختیار کیا۔ 1240ء کو رضیہ اور ملک دونوں کو قتل کر دیا۔ قطب مینار سے گیا رامیل کے فاصلے پر راجہ سچی کی جو قبر کھلاتی ہے وہ رضیہ ہی کی قبر ہے۔ رضیہ حافظ قرآن تھی۔ جن سپہ گری میں ماہر تھی۔ مردانہ لباس پہن کر تخت پر بیٹھی تھی۔ اُس نے 13 برس حکومت کی۔

رضیہ احمد دہلوی

رضیہ صاحبہ 18 فروری 1894ء کو ہسولی (ضلع بارا بکنی راترپڈیش) کے ایک زمین دار خان دان میں پیدا ہوئے۔ باپ زمین دار بھی تھے اور تحصیل دار بھی، چچا وکیل تھے۔ رضیہ صاحبہ نے علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج میں تعلیم پائی۔ 1921ء میں ترک حالات کے تحت تعلیم ترک کر دی۔ بیٹو موتی لال نہرو کے سکریٹری رہے اور انہی کی رہنمائی میں میدان سیاست میں آئے۔ 1922ء سے 1926ء تک کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ انہی دنوں انھیں ایک برس کی جیل ہو گئی۔ سوانح پارٹی کے ممبر اور دب پے۔ 1937ء سے 1939ء تک یو پی کی وزارت میں ہوم منسٹر رہے۔ 1942ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کے سلسلے میں جیل چلے گئے۔ حصول آزادی کے بعد 1947ء میں یو پی کی وزارت میں پھر وزیر بنے اور اسمبلی میں زمین داری کے خاتمے کا بل انھیں کے ہاتھوں پیش ہوا جب مرکزی حکومت میں شامل ہوئے تو وزیر ریل و سائل اور بعد میں وزیر غذا رہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اندرون ملک میں ڈاک بند لے ہوئی جہاز سہی نے اور ٹکڑ ڈاک کے لئے اتوار کی جمعہ کی ابتداء کی غیر متوقع سرکاری دورہ بھی انہی کی ایجاد ہے۔

رضیہ صاحبہ اعلا قسم کے ایڈمنسٹریٹو تھے وہ جس وزارت میں گئے اُس کو سنبھال دیا۔ وزارت غذا کے سلسلے میں صرف وہی کام یاب رہے۔ وزیر کی حیثیت سے کانگریس کی پالیسیوں پر جس طرح انھوں نے عمل کیا اور کہا اُس کی مثال دوسرا کوئی وزیر آج تک نہیں پیش کر سکا وہ اپنے زمانے میں

ڈاکٹر ذاکر حسین آزاد ہندوستان کے پہلے مسلمان تھے جو صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1963ء میں اُن کو بھارت رتن کا اعزاز ملا۔ وہ صوبہ اول کے ماہر تعلیم تھے۔ اُن کی ایک آنکھ بنائی سے عیون تھی۔ بھلواوی لگانے اور طرح طرح کے کشش نہایت پتھر جمع کرنے کا اُن کو بہت شوق تھا۔ انھوں نے جامعہ کے اہل خانے، پیام تعلیم، میں ایک عرصے تک اپنی بیٹی رقیہ ریحانہ (جس کا پانچ ہی برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا) کے نام سے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے کئی اہم انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سالگرہ کبھی نہیں منائی۔ صدر جمہوریہ بننے پر بھی انھوں نے اس بدعت کو نہیں اپنایا۔

سلطان رضیہ

دہلی کے سلطان شمس الدین آل تمش نے اپنے بیٹوں کی نالائقی کی بنا پر اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ 26 برس حکومت کرنے کے بعد آل تمش کا انتقال ہوا اور رضیہ تخت پر بیٹھی دربار کے امیروں نے عورت کی حکمرانی کو مردوں کی توہین جان کر رضیہ کی مخالفت کی اور اُس کے چھوٹے بھائی رکن الدین (فیروز شاہ) کو تخت پر بٹھا دیا مگر وہ اتنا بد چلن ثابت ہوا کہ 28 برسوں کے بعد وہ قید میں ڈال دیا گیا اور وہ قید خانہ ہی میں مر گیا۔ 634ھ میں امیروں کی حمایت پر رضیہ تخت پر بٹھی۔ وزیر اور چند دوسرے امیروں نے پھر بھی بغاوت کی مگر رضیہ نے فوج کی کمان خود سنبھالی اور اپنے ہر مخالف کو شکست دی۔

رضیہ نے اپنے دربار کے ایک حبشی امیر آخو ریا قوت کو امیر امیر بنادیا۔ رضیہ کی نظر کرم سے وہ بے تکلف ہو گیا۔ جب وہ گھوڑ پر سوار ہوتی تو وہ اُس کی بغل میں مات دیے کرا سے سہارا دیتا۔ اس سے بدنامی ہوئی اور مختلف علاقوں کے صوبیداروں نے رضیہ کے خلاف پروپیگنڈا کر کے بغاوت کر دی۔ دراصل بغاوت ہی کی نیت سے امیر ولد نے رضیہ اور ریا قوت کے تعلق کو افسانوی رنگ دیا تھا۔ ایک بغاوت کو فرو کرنے میں ریا قوت مار لگیا اور رضیہ گرفتار کر لی گئی۔ اور امیروں نے رضیہ کے ایک بھائی بہرام شاہ

ایک ہی مسلمان کا ٹیسی تھے جن کے حامیوں میں مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم تھے، انھوں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان کے لیے اتالیکیا کردہ اپنی دلنشین کھٹکی کے کڑیوں کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی آبرور اور ان کے کردار کی شرافت بگاڑی، 21 اکتوبر 1954ء کو جب رفیع صاحب کا انتقال ہوا تو وہ ایک لاکھ روپے کے صفحہ دھن بھنے اور یہ قرض اپنے لیے نہیں بلکہ میواؤں، بیٹیوں اور نادار ماہلہ غمور کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے میا گیا تھا۔

سلطان زین ال عابدین

سلطان سکندر کا بیٹا زین ال عابدین 20 مارچ 1259ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھا، سلطان سکندر کے ظلم و ستم اور کتب سے تنگ آکر موہنڈت اور دوسرے ہندو کشمیر چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے وہ زین ال عابدین کی انصاف پسندی، رواداری، انجمنیں جنوں و محبت کی بناء پر اپنے وطن کشمیر واپس آ گئے، سلطان عابدین نے براہمنوں اور ہندوؤں کو اپنے دربار میں بڑے بڑے عہدے دیے ہندو، مسلمان، بدھ، جین عرصے کے ہر مذہب کے عالموں کی اس نے قہر کیا، اس نے سنسکرت زبان میں تاریخ کشمیر لکھوائی، اپنے ایک دیوانی قلم احمد سے (جو سنسکرت اور فارسی کا بڑا عالم تھا) مہا بھارت اور راج تونگی کا ترجمہ فارسی میں کرایا، سلطان خود بھی اپنی مادری زبان کے کشمیری کے ساتھ ساتھ سنسکرت، فارسی اور تہذیبی زبان بھی جانتا تھا۔ وہ شاعر، صحافی اور مصنف بھی، ہر ملک سے نایاب کتابیں منگوا کر اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کو تعمیر پر توجہ دی تھی اور کئی بڑے بڑے مدرسے کھولے تھے، عابدین کے مات گذار نے اپنے عہد میں گما کی نئی عمارت کردی تھی مگر عابدین نے موسیقی کو پھر سے رواج دیا، اس کے دربار میں کئی بڑے موسیقار موجود تھے۔ اس کے ایک درباری موسیقار نے عظیم موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کی بڑی نگر کے قریب ڈاکٹر اس کا دایہ حکومت لکھا جہاں اس نے لکھڑی کا ایک خوب صورت بارانزرا محل بنوایا تھا۔

سلطان عابدین نے اپنے ملک میں دست کاری، لکھڑی، کپڑے، ک صنعت، کشیدہ کاری، اشال بانی، کاغذ سازی اور جلد سازی کے

ہنر کو بھی فروغ دیا۔ اپنی جتنا کا حال چلنے کے لیے وہ راتوں کو کھینچا جہاں کرکھوتا تھا وہ اپنے انصاف کے سبب میں بہت مشہور تھا، اس نے اپنے ایک عزیز دوست (جو اپنی بیوی کا قاتل تھا) کو پھانسی کی سزا دی تھی، وہ اپنے زمانہ میں ان کے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور سچے مقامات پر بیٹھا دیتا تھا۔ اس نے بازار کی چٹائی کی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ اس کی جانب سے ہر فرقے کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت تھی، وہ خود بھی سب کے تہواروں میں شریک ہوتا تھا۔ بدھ مت کا ایک عالم تو اس کا مشیر خاص تھا، سلطان سکندر نے وہ کیا جو مندر شاہشا اور نگ زیب نے کیا اور سلطان عابدین نے چھوٹے، بچانے پر وہ کام انجام دیے جو ہندوستان گیر سطح پر کبریا دستاویز انجام دیتے، عابدین اپنی جتنا کا محبوب تھا، آج بھی اس کو پیار سے بڈشا کہہ کر کتھیری یاد کرتے ہیں۔

سین آرتھ

عبد سمیع جو سمیع آرتھ کے نام سے مشہور ہوئے ہوشنگ آباد (دعویہ پرنٹنگ) میں پیدا ہوئے، گوان کا اصلی وطن امرتسر ہے، بمبئی کے جے۔ بی۔ اسکول آف آرٹ سے انھوں نے سات برس کے کوئٹہ کاڈپلما پائی کے مشہور انگریزی روزنامے "پاٹن کرانی کل" کے ایڈیٹر والستہ رہنے کے بعد مولانا محمد علی جعفر کے اخبار "ہمس دردا" اور "کامریڈ" میں کارٹونسٹ رہے۔ ان کے شاگردوں کا رٹون اور اس کیچ "ہندوستان" نامی "ڈیٹل کال" "ہندوستان" "ریاست" "ریج" اور "ڈان" دہلی میں انگریز شہر ہوئے انھوں نے "خیابانوں" "دری" اور "پریسی" "تالوں" "ٹائٹل" اور "سلاول" کے سرورق اور پرائنٹ بنائے، وہ متعدد میڈل اور انعامات پا چکے ہیں، جو 2 برس دہلی میں رہنے کے بعد وہ 43ء میں کراچی (پاکستان) منتقل ہو گئے۔

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی ضلع اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے گاؤں بندول میں پیدا ہوئے، گاؤں کے مکتب سے تعلیم کی ابتدا ہوئی، پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ عربیہ میں درس کیا پھر جون پور کے ایک عربی مدرسہ میں داخل ہوئے

گزران تھے، لطیف غذاؤں کے عادی تھے، میٹھا زیادہ کھاتے تھے، پنڈرا
میں ودیے ماہ وار کا باورچی رکھتے تھے، ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی ۱۸۵۶ء میں بجنور (اتر پردیش) میں پیدا
ہوئے۔ دارِ علوم دیوبند میں تعلیم پائی اور پھر وہیں ایک استاد کی حیثیت
سے ملازم ہو گئے اور ۸ برس تک وہاں درس دیتے رہے پھر دہلی کے
مدرسہ فتح پوری میں ۲ برس تک استاد رہے۔ ڈاکٹر (صوت) کے
دارِ علوم میں بھی ۱۲ برس تک ہیڈ ٹیچر رہے، دارِ علوم دیوبند میں سپرنٹنڈنٹ
کی حیثیت کے عہدے پر بھی ۶ برس تک فائز رہے۔ جنگِ بلقان کے دنوں
میں ہلالِ احمر (ریڈ کراس) کے لیے کافی چندہ جمع کیا۔ ۱۹۲۲ء سے
۱۹۴۶ء تک جمعیتِ علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کے ممبر رہے مگر جب ۱۹۴۶ء
میں جمعیتِ علماء سے اختلاف پیدا ہوا تو انھوں نے جمعیتِ علمائے اسلام
کی بنیاد رکھی جس نے مسلم لیگ کی پالیسی کی حمایت کی۔ ۱۹۴۷ء میں برکین
چلے گئے اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے۔ ۱۹۴۹ء میں بھاول
پور (پاکستان) میں وفات پائی۔

اُن کی تصانیف میں 'فتح المسلم'، 'دعوتِ جدیدی'، 'تفسیر فائد القرآن'،
اور 'ایاز القرآن' اہم ہیں۔ ماہنامہ 'حلی' کے اڈیٹر جناب شاعر عثمانی مولانا
شبیر احمد عثمانی کے بھتیجے ہیں۔

سیدنا ملا طاہر سیف الدین

سیدنا حضرت ملا جی طاہر سیف الدین بوہڑیہ ضیہ مسلم
برادری کے داعی ۵ اگست ۱۸۸۵ء کو سورت میں پیدا ہوئے۔
۱۹۱۵ء میں داعیِ فتاوا دیئے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں اُن کے عہد کی
سورجوبی منائی گئی، تعلیم، صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے انھوں
نے ضیہ علمیہ کی بنیاد رکھی جس کے تحت بہت سے مدرسے، اسکول
اور ہوٹل قائم کئے گئے۔ ملا جی نے اپنے فرقے کو فضول خرچی سے بچائے رکھنے
کے لیے 'اجتہامی نکاح خوانی' کی رسم کا بھی اجراء کیا۔ اس رسم کو 'رسم
سیفی' کہا جاتا ہے۔ علامہ حسینی نے ان کے ایک جلیلِ عالم تھے اور
اسلامی کلچر سے متعلق اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ۱۹۸۵ء میں انھوں نے وفات پائی۔

مگر مولانا کی اصلی تعلیم تب شروع ہوئی جب غازی پور آکر مولانا فاروق چٹیا
کوٹی کے شاگرد بنے۔ بعد میں رام پور چلے گئے وہاں حدیث اور فقہ کی تعلیم
حاصل کی اور پھر دیوبند آ گئے اور وہاں کے دارِ علوم میں بھی چند برس زیرِ تعلیم
رہے۔ لاہور پہنچ کر اورینٹل کالج کے پروفیسر مولانا فیض الٰہی حسن سے عربی
کی مزید تعلیم حاصل کی جب اپنے والد کے ساتھ حج کو گئے تو دینے کے سوا
کتب خانوں کی سیر کی، حج سے واپسی کے بعد وکالت پر بھی، ملازمت کی،
تجارت کی، زمین داری سنبھالی اور کچھ زمیں میں فٹل نوٹس رہے اور قرق امین
بھی مگر علم و ادب سے تعلق پھر بھی برقرار رہا اور آخر میں گڑھ کالج میں مشرقی زبانوں
کے اساتذہ مقرر ہو گئے وہاں پروفیسر آرملڈ کو عمری بھی پڑھائی اور خدائے
فرانیسی زبان پر بھی جون ۱۸۸۳ء میں اعظم گڑھ میں مشرقی نیشنل اسکول کی بنیاد
رکھی جو اب ایک ڈگری کالج بن چکا ہے۔ ۱۸۹۲ء میں وہ مصر، ترکی، استام
اور بیروت کی سیاحت کو گئے، جنوری ۱۸۹۴ء میں حکومت کی جانب سے
اُن کو 'شمس العلماء' کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۶ء سے نظامِ جدید آباد
کی جانب سے انھیں ۵۵ روپے ماہ وار وظیفہ ملنا شروع ہوا، چار برس تک
حیدر آباد میں سرستہ، علوم و فنون کی نظامت کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

۱۹۱۳ء میں انھوں نے اعظم گڑھ میں دارِ مسنفین کھام سے ایک علمی، ادبی اور
تحقیقی ادارہ قائم کیا۔

مولانا شبلی ہر صفت انسان تھے۔ وہ مہذب تھے، شاعر، شاعر نگار
نقاد اور سوانح نگار بھی تھے۔ وہ اپنے معاصر حاکم، ہمدرد، آنداد اور ڈپٹی
نذیر احمد کے ساتھ اردو کے معاصر ادب میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسند
مولانا تھے، قدامت پسند اور غیر ملکیوں کے زبردست مخالف تھے اُن کی درج ذیل
تصانیف میں 'آل ماملن'، 'آل فاروق'، 'آل غزالی'، 'سوانحِ روی'،
'علمِ آل کلام'، 'مشرقِ اعجاز'، 'سیرتِ نبوی'، 'سیرتِ نعمان'، 'اورنگ
زیب پر ایک نظر'، 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'، 'موادہ انیس و سید'،
'کتب خانہ اسکندریہ'، 'مقالات'، 'مکاتیب' اور مجموعہ 'کلامِ شبلی'
اسم ہیں۔

ہندو قتل جانے کے حادثے میں شدید طور پر رنجی ہو گئے تھے ایک
ٹانگ کٹوانا چڑی، مصنوعی ٹانگ کی مدد سے چلا کرتے تھے۔ حنیفہ والی علیہ
غنی سے اُن کی خط و کتابت بہت مشہور ہے، علیہ یزید حد تک رشتہ
خفی ہوئے کہ اپنے علمی مرتبے کو بھی فراموش کر بیٹھے۔ خوش خمر اک اور خوش

سرفہر اللہ خاں

6 فروری 1893ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ بہن سائیکم سسرالیں نے خاں کی صاحبزادی تھیں اور بڑی دین دار اور نیک خاتون تھیں۔ ظفر اللہ نے پیدا ہی برس کی عمر میں احمدیہ فرقے کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کے مات پرست کی اور وہ سلسلہ احمدیہ سے وابستہ ہو گئے۔ وہ تعلیمی اعتبار سے بی۔ اے (آنر) ایل۔ ایل۔ بی۔ (آنر) مئجسٹریٹ، ایل۔ ایل۔ ڈی (کنسٹ) باریسٹلا (لیگل سائنس) ہیں۔ سیال کوٹ میں انھوں نے اپنے پیشہ وارانہ کات کی ابتدا کی اور پھر لاہور پہنچ کر بیرسٹری کا سلسلہ شروع کیا۔ 35-1926ء میں وہ پنجاب ہائیسٹیوٹ کانسٹبل کے ممبر رہے، 31-1930ء میں انھوں نے انڈین رائٹڈ مشینل کانفرنس میں ایک نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی، 1931ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے، 1933ء میں جوائنٹ سیلکٹ کیٹی آف پارلیامنٹ آن انڈین ری فارمس میں ایک نمائندے کی حیثیت سے شریک رہے، 41-1935ء میں گورنر جنرل کی ایگری کیو کوئٹل کے ممبر رہے، 1942ء میں حکومت ہند کی جہان سے چین میں ایجنٹ مقرر ہوئے، 47-1941ء تک فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج رہے، 1947ء میں جب کہ وہ نواب بھوپال کے قانونی مشیر تھے، پاکستان بننا پر انھوں نے پورا ایم۔ او میں فلسطین کے مسئلے پر پاکستانی فتویٰ قیادت کی، اور اسی طرح 1948ء میں انھوں نے کشمیر کے سلسلے میں پورا ایم۔ او میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ ان دنوں وہ عالمی کونسل میں جج ہیں۔

جو دھری محمد ظفر اللہ خاں نے سیاست میں ہمیشہ اسی گمراہی کا ساتھ دیا جو برطانوی حکومت کا یہ جوش حامی رہا۔ اُن کو برطانوی عہد میں سرکار کے سی ایس ایس آئی کے خطا بات ملے۔ وہ 32-1916ء میں قانون کے ایک مشہور ریزیڈنٹ "انڈین کمیٹی" کے اڈیٹر رہے اور وہ کئی بلند پایہ قانونی کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور اُن کو اردو زبان سے بھی کافی لگاؤ ہے اور یہ بھی کہ انھوں نے شہید بھگت سنگھ کے مقدمے میں سرکاری وکیل بن کر بھگت سنگھ کے خلاف وکالت کی تھی۔ سرفہر اللہ ہی کے عہد (1934ء) میں مسلم لیگ قلمی طور پر رجعت پسند اور فرقہ پرست مسلمانوں کی جماعت بنی۔

ہمیں تمام ہندوستانی مسلمان تعمیر

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں 1870ء میں سیال کوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہر تھیں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سراج آدین ریاست کشمیر میں پٹنما ستر جنرل تھے ظفر علی خاں بھی 1892ء میں علی گڑھ سے الیت۔ اے کرنے کے بعد اسی محکمہ ڈاک و تار میں ملازم ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن بعد اپنے ایک انسر سے جھگڑا کر بیٹھے۔ اس کی وجہ لکھ ڈالی، ملازمت سے الگ کر دیے گئے۔ علی گڑھ واپس آئے اور فرسٹ ڈی ڈیٹن میں بی۔ اے کیا اور پھر نواب محسن آل ملک کے سیکریٹری ہو گئے۔ محسن آل ملک ہی کی سفارش پر ریاست حیدر آباد کی کوچ میں ملازمت مل گئی اور پھر فوجی دایرہ ترجمہ کو منتقل ہو گئے۔ کچھ دن ریاست کے اسٹنٹ رجسٹرار رہنے کے بعد مرٹھان علی خاں کے تابعین مقرر ہوئے۔ پھر اسٹنٹ ہوم سیکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ہوم سیکریٹری نواب سر ملہند جنگ چڑ چڑے مزاج کے انسان تھے ظفر علی خاں نے اُن کی بھی لکھ ڈالی، ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ یہی میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اورنٹیل کٹرل کمپنی کے نام سے ایم لوٹ وائیکس پورٹ کا کاروبار شروع کیا، جاپان سے شیم منگوا یا اور افریقہ سے ماسخ دانت مگر بات مذہبی، جب اُن کے ایک دوست حیدر آباد میں ہوم سیکریٹری مقرر ہوئے تو اُن کی سفارش سے ظفر علی خاں کو حیدر آباد کی ہائیسٹیوٹ اسمبلی کا رجسٹرار بنا دیا گیا۔ یہاں انھوں نے لارڈ کرزن کی خیابان فارسی کا اردو میں اس حد تک اچھا ترجمہ کیا کہ نچیا بونی دوشی نے 5 سو روپے اور نظام نے 5 سو روپے انعام دیا اور آج دہلی آن دنوں نظام میر محبوب علی کے استاد تھے انھوں نے بھی مولانا ظفر کی زبان کی تعریف کی، "سیر ظلمات"، "فسانہ کندن"، "سنہری گھونگا" وغیرہ ترجموں کے بعد مولانا ظفر نے موساندی کی تباہ کن طغیانی پر ایک ایسی نظم کی کہ جس نے سب کو متاثر کیا اور اس طرح انھوں نے اردو نثر و نظم میں ایسا ایک مقام بنا لیا اور پھر انھوں نے حیدر آباد سے "دکن پلٹ" نام کا ایک جریدہ جاری کیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ حیدر آباد میں ایک یورپین تھے ٹریکل کمپنی آئی۔ اُس نے نیم برتنہ ایکٹر پلس کے رقص پیش کئے مولانا ظفر علی خاں نے اس پر سخت تنقید کی مولانا کی تنقید انگریز ریڈی ڈنٹ سرانیکل کو ناگوار گزری۔ نتیجے میں مولانا ریاست بدر کر دیے گئے

جب مائیکل پنجاب کے گورنر بنا دیے گئے تو مولانا کو حیدر آباد جانے کا پھر موقع ملا مگر کہتے ہیں کہ خارجہ حسن نظامی کی شکایت پر دو برس بعد حیدر آباد سے پھر نکال دیے گئے اور نشین بھی ضبط ہو گئی۔

اخبار 'زمین دار' مولانا ظفر علی خاں کے والد نے جاری کیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے اخبار کے کام کو سنبھالا اور اخبار کو وزیر آباد سے لاہور لے آئے مگر پالیسی کے اعتبار سے بزم کو رزم سے بدل دیا۔ وہ جنگ بلقان کا زمانہ تھا اخبار چند ہی دن میں مقبول ہو گیا قابل اعتراض پالیسی کی بنا پر گورنر پنجاب (سروائیکل) نے اخبار سے ضمانت طلب کی اور مولانا ظفر کو نظر بند یا رہا ہوئے تو انھوں نے پھر اخبار جاری کیا۔ غرض کہ مولانا کی بے باکی اور انگریز حکومت کے عتاب کا سلسلہ جاری رہا۔ اور کہتے ہیں کہ اخبار کی ضمانتوں کی صورت میں مولانا نے مجموعی طور پر جو روپیہ سسرکار کو ادا کیا وہ کم و بیش چھ لاکھ ہوتا ہے انھوں نے ہر سیاسی تحریک میں بھی عمل حصہ لیا اور جیل گئے ان کی قید کی مجموعی مدت 12 برس ہوتی ہے۔ وہ کانگریسی بھی رہے، مسلم لیگ بھی، خلافتی بھی اور احراری بھی، ہر کوچے میں قدم رکھا مگر ٹھہرتے کہیں نہیں، دراصل وہ سرتاپا ہنگامہ تھے۔ ایک بار مولانا آزاد نے ان کے بارے میں کہا تھا :-

'فلک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا ہو تو ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بے حد تمام یہ قلعہ بنا ڈالیں گے لیکن جب قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر نکال دو کیوں کہ وہ پھر اُس قلعے کو ڈھلا دیں گے؛

یقیناً ان کا مزاج مولانا شوکت علی سے ملتا جلتا تھا۔ ان کے سلسلے میں یہ بات مشہور رہی ہے کہ جب انھیں اپنے خرچ کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تو اپنے اخبار 'زمین دار' میں حکومت کے خلاف ادارہ لکھتے نتیجے میں حکومت ضمانت طلب کرتی اور پھر یہ قوم سے چندے کے لیے اپیل کر دیتے، اتنا مل جاتا کہ دونوں کام انجام پاجاتے۔ ضمانت بھی ادا ہو جاتی اور اپنی ضرورت بھی پوری ہو جاتی۔ مگر زمین دار کا ادارہ درحقیقت ایک انشٹی ٹیوشن تھا جس میں وحید اور اسیم بانی تھے۔ تیار فتح پوری، غلام رسول مہر، عبدل مجید

سائیک، چراغ حسن حسرت، نصر اللہ خاں عزیز، حاجی قلی بی اور حفیظ جالندھری جیسے حضرات نے تربیت پائی۔

مولانا ظفر علی خاں کی نثر کی تعریف کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا: 'ظفر علی خاں کا تسلیم مصطفیٰ کمال کی تلوار ہے' مولانا کو کثرت کہنے میں بھی کمال حاصل تھا اسی لئے مخالف ہونے کے باوجود خاصہ حسن نظامی نے ان کی اس خوبی کو یہ کہہ کر سراہا تھا: 'قیامت نے روز وہ اپنی لغتوں کے باعث بخشے جائیں گے'۔ مگر وہ سیاست میں بچو کے بھی باقی تھے۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام 'مہارستان'، 'دلگاہستان'، 'چمنستان'، 'ارمغان قادیان'، 'دجسبات' اور 'روح معانی' ہیں۔ ان کا کلام دراصل سیاسی واقعات کی تاریخ ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی نثر میں علم کی کمی تھی، نثری میں فکر کی اور سیاست میں خلوص کی۔ اس لیے ان کا تاثر زیادہ دقت تک قائم نہیں رہتا تھا۔

ان کی شادی تہ ابرس کی عمر میں کردی گئی تھی اس لیے وہ بیعت دونوں تک اپنی بیوی کو اپنے گھر والوں کی مہمان ہی سمجھتے رہے۔ سفر میں بھی وہ اپنے ملازم اور حقیقہ کو ساتھ رکھتے تھے، ان کا کہنا تھا :-

زندگی کے لطف دو ہی تو ہیں
صبح کی جائے، شام کا حقہ

کالج کے لڑکے آتے شعر کی فرمائش کرتے، پہلے تکلف کرتے، پھر فی کش ایک نازہ شعر فرماتے، طبیعت کی آماجگی کا یہ عالم رہتا تھا کہ بعض اوقات ایک ہی نشست میں دس دس نظموں موزوں ہو جاتی تھیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے اپنی زندگی میں ترکی اور افغانستان کا بھی دورہ کیا وہ اپنے دن کے امیر کی حیثیت سے سلطان ترکی اور جبریل نادر خاں سے بھی ملے۔

وہ پہلے اردو شاعر تھے جنہوں نے طنز کو علمی سیاست میں تیر و نثر کی حیثیت سے استعمال کیا۔ اگر سیاسی اردو صفت سے آزاد کی قسمی ہنگامہ آرائیوں کو خارج کر دیا جائے تو اردو صفت کی تاریخ قطعی طور پر غیر اہم ہو کر رہ جائے۔

شیخ عبداللہ

شیخ صاحب 29 جنوری 1903ء کو موضع سبڑہ (سری نگر کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے دو ہفتے قبل ہی ان کے والد محمد ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ والد پشیمنے کے تاجر تھے والدہ نے اپنے قریبی رشتے داروں کی مدد سے اس تجارت کو جاری رکھا اور بیٹے کی پرورش کرتی رہیں۔ شیخ صاحب دس ویں ہی درجے تک پانچ پائے تھے کہ والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ بمشکل تمام ایف۔ ایس سی کو کے بعد شیخ صاحب نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے بی۔ ایس سی کرنے کے بعد علی گڑھ چلے گئے انھوں نے وہاں سے ایم۔ ایس سی کیا۔ لاہور کے تیار میں جب شیخ صاحب موسم سرما میں تعمیر لیں حکومت مزدوری کرتے ہوئے دیکھتے اور پھر ان کی کمپرسی کا موازنہ ذمہ داری پائی سے کرتے تو ان کو شدید طور پر دکھ ہوتا۔ انھوں نے تعلیم ختم کرنے کے بعد کشمیریوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی مگر ان کا حوصلہ ٹھانے والا کوئی دھما اس لئے عجیبو رکھو انھوں نے کشمیریوں کی ملازمت کر لی۔ یعنی وہ 60 روپے ماہ وار پرسنٹس ٹیکر ہو گئے۔ آخر کشمیر لیں کو سر بندی دینے کی خاطر وہ 1931ء سے میدان ہمایا سمیت چلے آئے۔ اور انھوں نے کشمیر میں جمہوری حکومت کے قیام کے لئے تحریک چلائی اور مسلم لیگ فرنس قائم کی جو 1939ء میں نیشنل کانفرنس میں بیل گئی۔ 1946ء میں انھوں نے کشمیر چھوڑ دو، تحریک شروع کی اور جیل گئے۔ وہ آل انڈیا اسٹیشنس بولر کے صدر بھی رہے۔ 1947ء میں جب کہ وہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے انھوں نے پاکستانی حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 1953ء میں ان کے اور حکومت ہند کے درمیان بھٹی، بدگانی یا کچھ ایسی جے اعتباری پیدا ہوئی کہ 4 اگست کو وہ گرفتار کر لیے گئے اور 1958ء تک نظر بند رہے پھر 1958ء سے 1964ء تک ادھر پھر 1965ء سے 1967ء تک نظر بند رکھے گئے۔

اگرچہ شیخ صاحب کو مطالعے کا شوق نہیں ہے مگر قرآن پاک قرأت سے بڑھنا اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنا ان کو پسند ہے وہ اچھا کھانے، اچھا پہننے اور آرام دہ زندگی گزارنے کی بھی خواہش رکھتے ہیں۔

گل کا مہنت اتنی سہانہ نہیں

بابائے اردو مولوی عبدل حق

مولوی عبدل حق 20 اپریل 1878ء کو بڑا ضلع میرٹھ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ مولوی صاحب کے ابا دادا جواہر ہندو (کاشتکار تھے، شاہ جہاں کے عہد میں مسلمان ہوئے۔ مولوی صاحب نے میرٹھ تک فیروز پور (پنجاب) میں اپنے ماموں کے پاس تعلیم پائی۔ بی۔ اے (1897ء) میں علی گڑھ سے کیا۔ علی گڑھ ہی میں سرسید اور حالی کی صحبت حاصل ہوئی اور سرسید کے مشہور جریدے 'تہذیب اخلاق' سے ان کی مصروف نویسی شروع ہوئی۔ سرسید کی اہماد پر ادھن اہل ملک کی سفارش پر وہ نظام حیدر آباد میں آصفیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل بھی رہے اور پھر عثمانیہ لینی ڈسٹی کے شعبہ ادو کے ہیڈ مقرر ہوئے حکومت نظام میں انھوں نے صدر مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ اورنگ آباد میں ایک عرصے تک انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سیکریٹری رہے اور 1935ء میں انجمن کا دفتر ملے آئے۔ 1947ء کے فسادات میں انجمن کا دفتر لٹ گیا۔ چون کہ مسلم لیگی نظریات کے حامل تھے اس لیے مولانا ابوالکلام سے اختلافات پیدا ہو گئے اور آخر وہاں سے گرا چلے گئے اور وہاں از سر نو انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی۔ مولوی صاحب کی تصانیف میں 'سرسید احمد خاں'، 'انگریزی اردو لغت'، 'اردو کی لغوی نمایاں صوفیائے کرام کا حصہ'، 'تذکرہ اردو' اور 'چند ہم عصر' اہم ہیں۔ مقامات جو انھوں نے دوسرے مصنفوں کی تصانیف کے لیے لکھے اور وہ خطبات بھی جو انھوں نے مختلف ادبی کانفرنسوں میں دیے قابل ذکر ہیں۔ 16 اگست 1961ء کو کراچی میں وفات پائی۔

کم و بیش نصف صدی تک مولوی عبدل حق نے خلوص دل سے اردو زبان کی خدمت کی اسی لئے بابائے اردو کہلاتے۔ کہتے ہیں کہ وہ ننھی بھر ٹھوڑے رہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی عمر میں ان کی شادی ہوئی تھی مگر دو تین ہی رات گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ وہ اچھا کھانا کھانے کے شوقین تھے۔ وہ آزاد و مشرب انسان تھے۔

عبد رحمان چغتائی

محمد عبدالرحمان چغتائی لگ بھگ 1900ء میں لاہور کے محلہ

چاہک سواران کے ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے۔ وہ ایلانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سن کے فن کا سب سے بڑا کانسلمہ 'مرقع چغتائی' اور دیوانی غالب کے اکثر شعروں کی رنگین تشریحی تصاویر ہیں جس کی طباعت 1930ء میں برلن (جرمنی) میں ہوئی تھی۔ اس مثالی مزاج کی بنا پر ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی اور انگریز حکومت نے ان کو خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ صدر ایوب کے عہد میں چغتائی نے کلیات اقبال (مصور) پیش کی۔ اس کے صلے میں حکومت پاکستان نے ان کو 2 لاکھ روپے انعام دیا۔ اس کلیات اقبال کی قیمت 16 سو روپے ہے۔

اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ چغتائی انڈوپرشین یا انڈو مسلم آرٹ کے احیا کرنے والوں میں سے ہیں مگر دراصل وہ غلطی ہیں اور منفرد آرٹسٹ ہیں اس لئے ان کے فن کو چغتائی آرٹ کہا جاتا ہے اور ان کا ہر شاہ کار ایک جمالیاتی کارنامہ ہوتا ہے۔

رو میں ہے رخسار کہاں دیکھیے تھے

نے مات باگ پر ہے، نہ پاپے رکاب میں

غالب کے اس شعر کی تشریح چغتائی نے اس طرح کی ہے کہ کنول میں جلتا ہوا چراغ دیا میں بہتا جاتا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں دوسرا کوئی دستور اس شعر کی اس سے بہتر تشریح نہیں کر سکا۔ چغتائی کا قاعدہ طور پر کسی کے شاگرد نہیں بنے انھوں نے جو کچھ سیکھا اپنی نگاہ اور لادش ہی سے سیکھا۔ انصاف، نزاکت، موضوع اور رنگوں کا حسین امتزاج ان کے فن کی خصوصیات ہیں۔

وہ دراز قد ہیں اور ان کا سر بھی معمول سے بڑا ہے اور ان کی شخصیت ہر دفا رہے۔ پنڈت نہرو ان کے بڑے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بی یا کلکتہ میں چغتائی کے تصویروں کی نمائش ہو چغتائی دنیا کے بڑے مصوروں میں سے ہیں اور ان کی کل اپنی جوانی ہوئی ایک شاندار کوشش (واقعہ پیر میٹ، رادی رڈ، لاہور 1975ء) میں رہتے ہیں۔

(تاریخ و نوات: 17 جنوری 1975ء) (طیف آرٹسٹ)

عبدالرحیم خان خاناں

اکبر جن دلوں دہلی میں تھا اپنے اتالیق بیرم خاں سے ناراض ہو

گیا۔ بیرم خاں انیسویں اور بائیس ہجری کے لئے روانہ ہوا مگر راہ میں گجرات چن کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا اس وقت بیرم خاں کا بیٹا عید الرحمن صرف تین برس کا تھا سال کے ساتھ اکبری خدمت میں پہنچا اور آغا اکبری کی نگرانی میں پرورش ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہین تھا، عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کی تعلیم پائی اور بڑا ہو کر ہندی اور فارسی کا ایک مستند شاعر بنا۔ اس نے سیکڑوں دوہے کہے جو 'رحیم سنت سنی' کہے جاتے ہیں۔ رحیم اس کا تخلص تھا۔ اس نے 'ترک بابری' کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ وہ نچر سپریری میں بھی ماہر تھا۔ اکبر نے اس کو ہفت ہزاری کا منصب دے کر سپہ سالار بنادیا اور اس کو شاہ زادہ سلیم کا اتالیق بھی بنادیا۔ اکبر رشتے میں خلائ خاناں کا خالو بھی ہوتا تھا

خلائ خاناں جوانی میں نہایت حسین تھا رستے کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ 1697ء میں انتقال ہوا۔

خان عبدالغفار خاں

ہشت گھر (صوبہ سرحد) کے اُت مان زئی گاؤں میں 1890ء میں پیدا ہوئے۔ باپ بیرام خاں دادا سیف اللہ خاں اور پردانا کا نام عبدالغفار خاں تھا۔ گاؤں کے مکتب میں قرآن پڑھا، پشاور کے میونسپل اسکول میں تعلیم پانے کے بعد پشاور کے مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ باپ بہت خوش حال تھے اور ماں بہت فیاض تھیں۔ دو زاد ایک باققی زیادہ سالن محلے کے غریب گھروں کے لئے پکانی تھیں گاؤں میں آیا ہوا وہ یہاں جو کسی کا رشتے دار نہ ہوتا اس کو بیرام خاں اپنا بھائی بناتے۔

میٹرک کرنے کے بعد بادشاہ خاں نے فوج میں نوکری کر لی مگر انگریز کی چاکری نہ کر سکے۔ نوکری چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ 1901ء میں جب انگریزوں نے صوبہ سرحد کو پنجاب سے الگ کیا تو بادشاہ خاں میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ 1910ء میں انھوں نے اپنے گاؤں میں ایک بدھ سرفاق قائم کیا جو 1915ء تک جاری رہ سکا۔ انہی دو انھوں نے اپنے صوبے کے سارے 35 ہزار گاؤں کا دورہ کیا اور اپنے عوام سے ملے امی دورے میں ان کے عوام نے ان کو اپنا بادشاہ خاں مان لیا۔ 1914ء میں شیخ ہند مولانا محمود الحسن کی ہدایت پر مدد لینے پہنچ کر ان

سے ملے اور پھر بعد میں ان کی تحریک (رہنمی خطوط) میں ان کے معاہدے ثابت ہوئے۔ 6 اپریل 1919ء کو رولٹ ایکٹ کے رد میں دو باقاعدہ میدان سیاست میں آئے اور نتیجے میں ان کو قیدیوں کی جیل ہو گئی۔ 4-19 میں ان کے عوام نے ان کو 'غیر افغان' قرار دیا۔ 1926ء میں وہ جج کو گئے۔ 1928ء میں انھوں نے اخبار 'پنجون' جاری کیا جو ان کے اپنے سیاسی نظریے کا ترجمان تھا مگر بعد میں انگریز حکومت نے اسے بند کر دیا۔ آزادی کے بعد اسے پھر جاری رکھنے کی کوشش کی گئی مگر حکومت پاکستان نے بھی اسے نہ چلنے دیا۔ 1928ء میں لکھنؤ میں کانگریس کے اجلاس میں بادشاہ خان کی ملاقات کا مذہبی قہر اور سخت نہو سے ہوئی اور انہی دنوں وہ علی برادران سے بھی ملے۔ گاندھی جی کے عدم تشدد سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور علی برادران کی جذباتی سیاست سے وہ سخت بالوس ہوئے۔

1929ء میں بادشاہ خان نے 'خدائی خدمت کار' جماعت بنائی جو دراصل افغان جرگے کو منظم کر کے بنائی گئی تھی۔ اس جماعت کو 'سرخ پوش والذیہ کور' بھی کہا گیا یہ جماعت عدم تشدد کی حامی تھی۔ اس کے والذیہ کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ انگریز حکومت نے اس جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ خان کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ہمیشہ ممبر رہے اور کانگریس کی ہر تحریک میں حصہ لیا اور رہا رہیں گئے اور گاندھی جی کے پے پیکر ہونے کی بنا پر ان کو سرحدی گاندھی کہا گیا۔

1947ء میں وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر رہے مگر کھوٹے ہی دن بعد ان پر ملک کا دفا دار ہونے کا الزام لگایا گیا اور جون 1948ء میں حکومت پاکستان نے ان کو گرفتار کر کے جیل میں قید کر دیا۔ ایک طویل مدت کے بعد 3 جنوری 1964ء کو رہا ہو کر وہ جنرل یحیٰی خان پاکستان سے لندن چلے گئے اور پھر وہ اس سے ملا رہے۔

گاندھی جی کی 100 ویں برسی گزرتے ہی انھوں نے بادشاہ خان کو کابل سے ہندوستان مانگو کیا گیا اور وہ 1969ء میں، خان عبدالغفار بکس گروہ سمیت، کی دعوت پر ہندوستان کے دورہ پر آئے۔

بادشاہ خان نے دوست دیاں کیں پہلی 1977ء میں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد 1920ء میں دوسری شادی کی

گلن گلستان سانی مدان تعبیر

دوسری بیوی جج کے دوران میں بیت مقدس میں میٹرھیوں سے گزرا تھا۔ کنگیں بادشاہ خان کا قدم ڈٹا اور قہر اچھے ہے وہ استغناء و روشی کی ایک مثالی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کا سارا سارا سامان صرف دو جوڑے کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے، ایک جوڑا پہنے ہوئے ہیں اور دوسرا چادر میں چھپا ہوا بغل میں دبائے رکھتے ہیں۔ ریڈر ہو کر دولت کی ناکو کبا انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے باوجود کبھی ریل کا کرایہ تک نہیں لیا۔ بادشاہ خان نے 15 برس انگریزی حکومت کے جیلوں میں گزارے اور 15 برس پاکستانی جیلوں میں۔ گاندھی جی کی خواہش کے باوجود انھوں نے کانگریس کی سہارا کبھی قبول نہیں کی۔

عبدالقیوم انصاری

پہلی جولائی 1905ء کو ڈیری آن سون (پہار) میں پیدا ہوئے علی گڑھ، کلکتہ اور الہ آباد میں نسیم پائی۔ 21-1920ء میں خلائی تحریک اور ترک ممالک میں حصہ لیا اور جیل گئے۔ 'آل اصلاح' اور 'مسادات' نام کے اردو جریدوں کے مدیر رہے۔ 1924ء میں پہار انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری اور 1937ء سے 1938ء تک پہار سہیت کمیٹی کے سیکرٹری رہے۔ 1938ء میں مومن تحریک کی ابتدا کی اور پہار صوبائی جمعیت مومنین کے صدر اور آل انڈیا مومن کانفرنس کے نائب صدر بنے اور سینڈ لوم انڈسٹری کے تحفظ کے لئے بہت سے کام کئے۔ آل انڈیا آزاد مسلم کانفرنس کی ایگری کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ ریاست پہار کی وزارت (1947ء) میں وہ پبلک ورکس اور کاسٹج انڈسٹری کے وزیر بنے۔

عبدالقیوم انصاری پٹنالیونی درستی کے فیلو بھی رہے، 19 جنوری 1973ء کو ان کا انتقال ہوا۔

مولانا عبد اللہ سندھی

10 مارچ 1872ء کو ضلع سیال کوٹ کے ایک گاؤں چیان والی میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام رام سنگھ تھا اور دادا سنگھ حکومت میں اپنے گاؤں کے مختار کار تھے۔ پیدائش سے چار مہینے پہلے باپ کا انتقال ہوا اور دو برس بعد دادا کا۔ ددھیال ہندو تھی اور تحصیل

سکھ۔ ایک مسلمان ہم جماعت کے توسط سے اسلام کے موضوع پر مبنی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ گھر سے چل پڑے اور 7 1886ء میں سکھ سے مسلمان ہو گئے۔ سکھ کے اسلامی اسکول کے ماسٹر محمد عظیم خاں کی ترغیب سے شادی ہو گئی۔ مولانا عبید اللہ نے دیوبند، گنگوہ اور دہلی میں مذہبی تعلیم حاصل کی اور وہ اپنی ذمات اور اسلام دوستی ہونے کی بنا پر شیخ ہند مولانا محمود حسن کے شاگرد رشید بن گئے اور اپنے استاد کی ہدایت پر جمعیت انصار کے تحت، رشی خطوط کی تحریک کے سلسلے میں کاہل چلے گئے۔ جنگی نقشوں کی ترتیب کا کام ان کے سپرد تھا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے روس، ترکی اور کئی کابھی سفر کیا مگر نتیجے میں ان کو امیر افغانستان حبیب اللہ سے یہ مشورہ ملا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے۔ شیخ ہند ماشا سے رہا ہو کر جب ہندوستان پہنچے تو کانگریس میں شامل ہو گئے۔ مولانا عبید اللہ نے بھی اپنے استاد کی تقلید میں کاہل میں کانگریس قائم کی اور اس کے صدر بن گئے۔ 24 برس کی جلا وطنی کے بعد 7 مارچ 1939ء کو مولانا عبید اللہ ہندوستان (کراچی) واپس آئے۔ سندھ کے سرمایہ داروں نے چاہا کہ وہ ان کی جماعت کے قائد بن جائیں مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کے بعد وہ اپنے تجربے کی بنا پر کہا کرتے تھے: ”مسلمانو! جب تک تم ہندوستانی نہ بنو گے ذمہ داری اپنے ملک میں سوات ہوگی اور نہ اسلامی ملکوں میں تمہیں احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا“۔ مولانا عبید اللہ نے مولوی طاہر پر بھی سخت لکھتے جینی کی کہ ان کے کردار اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ اس پر مسلم سماج نے مولانا کو کافر قرار دیا۔ مولانا نے اپنی زندگی کا آخری ایام جامعہ طبع میں گزارے اور 24 اگست 1944ء کو ان کا انتقال ہوا۔

عزیز النساء بیگم

سر سید احمد خاں کی والدہ عزیز النساء بیگم خواب دیر آؤدہ امین آل ملک خواجہ فرید الدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ میر تقی سے ان کی شادی ہوئی تھی ان کے تین اولادیں ہوئیں۔ سید محمد خاں، سید محمد احمد خاں اور صفیہ۔ اگرچہ انھوں نے صرف

گل خانہ ہندوستانی فن تعمیر

قرآن شریف پڑھا تھا اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں مگر وہ افلاک کو تربیت دینے کے فن سے خوب واقف تھیں۔ سر سید نے گلستان کے سبق انہی سے پڑھے۔

انھوں نے اپنے بیٹے سر سید کو یہ تعلیم دی تھی کہ انتقام لینے کی یہ نسبت سعادت کر دینا زیادہ عمدہ کام ہے۔ نوکروں کے ساتھ اچھا بٹھاؤ کرنا چاہیے۔ دوستی نبھانے کے لیے ہوتی ہے توڑنے کے لیے نہیں۔ دوسرا اپنا فرض ادا کرے یا نہ کرے تم اپنا فرض انجام دینے جاؤ۔ کسی کے شکی کے احسان کو بھلایا نہیں جاسکتا، اور ایسی عادت اختیار کرو جو ہر حالت میں نیاہ سکے۔ سر سید کی والدہ بہت اچھی منظم، لائق، فاضلہ شناس، رحم دل اور متناہری خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے مکان کا ایک حصہ نادار، مسکین اور بیمار عورتوں کے رہنے بسنے اور علاج کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ ادام پرست، ملکل نہیں تھیں۔ سنت، نیاز، تعویذ، گندہ، شجر گھڑی یا ساعت بد، سعادت یا نحو پردہ ملکل یقین نہیں رکھتی تھیں۔ دلی سے میرٹھ منتقل ہونے کے ایک برس بعد یعنی 1858ء میں میرٹھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی وصیت تھی کہ ان کو بھلی قبر میں دفن کیا جائے، ان کی مذکورہ غارت گاہ ہے نہ روزہ، صرت بیماری کے دنوں میں نمازیں تھنا ہوتی ہیں اُس کے کفارے میں اسی حساب سے غزبوں میں گیہوں بانٹ دیا جائے سعادت مند بیٹے سر سید احمد خاں نے ماں کی یہ دونوں وصیتیں پوری کر دیں۔

عصمت چغتائی

عصمت 1915ء میں بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آبائی وطن آگرہ تھا بعد میں والدین علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ علی گڑھ ہی سے عصمت نے بی اے کیا۔ اپنے بھائی ارشد زبانی کے مشہور مزاج نگار مرزا عظیم بیگ چغتائی نے انھیں قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھائی۔ اور انھوں ہی نے عصمت کو مطالعے کی طرف راغب کیا اور پھر انہی کے نقش قدم پر چل کر وہ افسانہ نگار بن گئیں۔ ان کا پہلا اضافہ ”شادی“ تھا جن دنوں شاہد لطیف ایک فلم رائٹر کی حیثیت سے باجے شائیر میں ملازم تھے عصمت کی ان سے شادی ہو گئی۔ بیٹی آگرہ بھی فلم رائٹر بن گئیں ان کی پہلی فلمی کانی ”شکایت“ تھی اور ان

کو وہ مزدوروں کی بے گاری یادگار سمجھتے تھے۔

علامہ آدین صابر

شیخ علامہ آدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ شیخ فرید گنج شکر کے بھانجے تھے۔ پتھیاں سے ان کو یہ خلافت ملی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کلیر (ٹکی) ضلع سہارن پور۔ اتر پردیش) ان کی بددعا سے پرانے میں بدل گیا تھا اور ان کی قبر کا پتہ ایک براہمن نے لگا یا تھا۔ شیخ صاحب کا مزار کلیر میں ہے اور حضرت معین آدین جنتی کی درگاہ کے بعد کلیر کی درگاہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سید علی امام

سید علی امام ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء کو اپنے نایابال پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھری پر ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں انھوں نے ضلع آراہ سے امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا اور پھر فوراً ہی انگلستان چلے گئے جہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور وائس آکریٹینا میں بیرسٹر شریع کی سید صاحب کی ذہنی صلاحیت سے حکومت ہند اتنی متاثر ہوئی کہ حکومت نے ان کو اسسٹنٹ جج کا نسل مقرر کیا اور پھر تھوڑے ہی دن بعد وہ لامبر ہدا دیے گئے۔ وائس رائے کی کانس کے نائب صدر بھی بنائے گئے۔ وائس رائے لارڈ ہارڈنگ کو سید صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ بہار کو جنگال سے الگ کرتے وقت اس نے ان سے مشورہ کیا تھا اور سید صاحب کی کے مشورے پر بہار میں ہائی کورٹ قائم ہوئی اور لوئی ورٹی قائم کی گئی۔ وہ بعد میں اس ہائی کورٹ کے جج بھی بنے اور وائس رائے کی مجلس عاملہ کے ممبر بھی مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ لفظ حمید آباد کی دعوت پر حکومت ہند سے اجازت لے کر حیدرآباد چلے گئے جہاں ان کو صدر اعظم کا عہدہ پیش کیا گیا ۱۹۵۹ء سے سید صاحب کی سیاسی زندگی شروع ہوئی جب کہ انھوں نے امرتسر میں سلائیگ کے اجلاس کی صدارت کی ایک آئین شینر (جنیوا) کے پہلے اجلاس میں انھوں نے ہندوستان کے نامتوں کی حیثیت سے شرکت کی اور لندن میں آخری گولی ہیرکان فرانس میں بھی وہ شریک ہوئے۔

سید علی امام کو اپنی زندگی میں کئی خطابات اور اعزازات ملے

کی ضلعی کمیٹیوں میں 'ضلعی'، 'بزدل'، 'سونے کی چڑیا' اور 'گم' ہوا، قابل ذکر ہیں۔

وہ اپنی زندگی میں اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی اور ڈاکٹر رشید جہاں سے زیادہ متاثر رہے۔ وہ ہندو پاک کی خواتین افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ مقبول ہیں اور ان کی تحریروں نے مسلمان لڑکیوں کو لائبریر کے گنبد سے باہر آنے میں مدد دی ہے۔ وہ پان کھانے اور تاش کھیلنے کی شوقین ہیں۔

عطاء اللہ شاہ بخاری

عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد بخاری سے سری نگر (کشمیر) میں آکر بسے۔ کچن ہی میں والدہ کا انتقال ہو گیا والد گجرات چلے گئے۔ نانائی نے شاہ صاحب کو پالا پوسا۔ نانائی علم و دمت انسان تھے انہی کی صحبت میں شاہ صاحب کو بھی ادبی ذوق پیدا ہوا۔ نانائی کے انتقال کے بعد گھر چھوڑ دیا۔ ات سر میں حدیث، قرآن اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، لوگ ریا کرتے تھے اور تحصیل علم جاری رکھتے تھے۔ بنارس میں کچھ دن چاندی کے ورق کوٹ کر بھی اپنا پیٹ بھرا۔ تحریک خلافت سے سیاست میں گئے اور ۱۹۲۵ء میں جیل ہو گئی بعد میں بھی کئی بار جیل جانا پڑا۔ ۱۹۳۱ء میں جماعت احمدیہ کے بھی رکن رہے۔ میدان سیاست میں اپنی مثال آپ خطاب کی بنا پر وہ تھوڑے ہی دنوں میں کافی مشہور ہو گئے۔

۱۹۶۱ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کی سلی علاقائی زبانوں پر ان کو عبور حاصل تھا۔ جہاں تک عوامی خطابت کا تعلق ہے اردو زبان میں شاہ صاحب سے بلا خطیب دوسرا کوئی نہیں تھا۔ خطابت ان کی کلاست تھی۔ وہ کہا کرتے تھے: 'میں دنیا میں سے صرف ایک چیز سے محبت کرتا ہوں وہ ہے قرآن، ایک چیز سے نفرت کرتا ہوں وہ ہے انگریز۔ انگریزوں کو مارنے کے لئے میں سوروں سے بھی اتحاد کرنے میں گریز نہ کروں' شاہ صاحب کی عمر کا زیادہ حصہ جیل میں گزرا۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے لیے جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے مگر ان کو سیاست کا کوئی شوق نہیں تھا۔ ضرورت ہی سے ان کو سیاست سے بھر کرنے پڑے۔ عمارتی حسن سے بھی ان کو لگاؤ نہیں تھا تاج محل سے بھر کر

حکومت ہند کی جانب سے 'سراج' کے سی آئی، کا خطاب ملا اور شاہ ہند کا میل بھی عطا ہوا۔ نظام حیدر آباد کی طرف سے ان کو 'مواہڈل ملک' کا خطاب بخشا گیا۔ سید صاحب انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبان سے خوب خوب واقف تھے اور ان کو فرانسیسی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے شہرست بھی پائی اور دولت بھی اور وہ کتبہ پرورد بھی تھے۔ 64 برس کی عمر میں راجپوتی میں ان کا انتقال ہوا۔ (منظر عاشق ہر گانوی)

علامہ عنایت اللہ مشرقی

عنایت اللہ مشرقی 25 اگست 1888ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی اعتبار سے وہ ایم۔ اے (کنٹب)، بی۔ اے ایس سی، بی۔ ای۔ اے۔ ایل، ایل، اے آر ایس۔ (آرٹس)، ایل۔ اے ایس بی (پری) تھے۔ 1913ء سے 1915ء تک وہ پیشادہ کے اسماعیلیہ کالج کے پرنسپل رہے پھر انسپکٹر آف ہائی اسکولز اور ڈپارٹمنٹل انسپکٹر آف ٹیچنگ کے رجسٹرار بھی بنے۔ بعد میں انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹ کے بھی ممبر رہے۔ 1930ء میں سرکاری ملازمت ترک کر کے خاک سدر جماعت قائم کی، اس وقت ان کی تنخواہ 20 ہزار روپے ماہوار تھی اپنی تحریک کے سلسلے میں جابا جیل گئے۔ 1940ء میں جب ان کی جماعت کا تصادم حکومت پنجاب (ان دنوں پنجاب میں سرسکندر حیات خاں وزیر اعلیٰ تھے) سے ہوا تو خاک سارو آئی۔ لو، اڈھارا لکھ تھی۔ یاس کی گویوں سے بہت سے خاک سارے مارے گئے اور علامہ مشرقی گزشتہ ہو گئے۔

علامہ مشرقی کی تصانیف میں 'تذکرہ' (اردو و عربی میں) 'آزاد ہندوستان کا دستور'، 'اشارات' اور 'قول فیصل' اہم ہیں۔ انھوں نے پہلی بھوی کوہنہ دہیہ کے بعد دوسری شادی کی تھی۔

مرزا غالب

نام مرزا اسد اللہ خاں، عرفیت مرزا نوشہ، تخلص آتم بعد میں غالب۔ مرزا غالب 7/1791ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ وہ توراتی نسل سے تھے ان کے ابا داجہاد ترک قوم کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر قد میں کاشت کاری اور سب گری ان کا پیشہ تھا۔

غالب اپنا سلسلہ نسب ادراسیاب سے ملا تھے وہ پانچویں برس کے تھے کہ ان کے والد عبداللہ خاں ریاست الوری میں ماسے گئے۔ چچا نے پرورش کی۔ آٹھ برس کے ہوئے تو چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ مرزا کے دادا سلجوقی ترک تھے۔ تیرا برس کی عمر میں نواب الہی بخش خاں معتمد کی بیٹی امرو بیگم سے مرزا کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد وہ آگرے سے دلی آ گئے۔ غالب فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اردو اور فارسی کے دیوان کے ساتھ ساتھ

'اردوئے معلّا' اور 'سود جندی' کے نام سے ان کے خطوط بھی مرتب کئے گئے۔ ذوق کے اعتبار سے وہ غالب مرزا اور شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے بھی استاد رہے۔ مرزا غالب نے اپنی زندگی میں کلکتے، کھنور، رام پور، مراد آباد، بنارس، بھوپال، میرٹھ، مرادنگر، شاہ جہان پور، بریلی اور باپوڑ کا سفر کیا۔ اپنے بہن بھائیوں کے جسم میں رہتی تھیں جیل میں بھی رہے۔ ان کو بیرون میں ملتی تھی اور وہ ظیفے بھی مگر خیر زیادہ تھا اس لئے زندگی بھر حاجت مند رہتے تھے۔ ان کی کچھ کتابیں بنے مگر کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔

غالب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور ان میں سادہ اور بے تکلف اسلوب کے موجد ہیں مگر ان کی شاعری میں انھوں نے مشکل پسندی کی ابتدا کی اور ان کی اس بدعت کو اقبال نے اپنا پایا اور پھر یہ بات جوش ملیح آبادی تک پہنچی اور ان میں مولانا آزاد نے غالب کی پے رومی کی اور اس طرح غالب کی مشکل پسندی یا تفریح پوری، غلام رسول تہراد، قاضی کشمیری تک پہنچی۔

غالب اپنے فن کے اعتبار سے بہت ہی فن کار ہیں مگر کردار کے اعتبار سے اچھے انسان نہیں۔ وہ کھانے میں آب گوشت، قند اور شیر بادام، مشرب صبح، دہیر میں گوشت کا پانی، ستام میں تلے ہوئے چارکباب اور سوئے دقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر غرق گلاب۔ کاس ٹین، اولڈ ٹام اور لیگور نام کی انگریزی شرابیں ان کو زیادہ مرغوب تھیں۔ آخری عمر میں بصارت و سماعت جاتی رہی تھی۔ 72 برس کی عمر میں 15 فروری 1869ء کو غالب کا انتقال ہوا۔ دہلی میں نظام الدین ادیب کی درگاہ کے پاس دفن ہوئے۔

غالب نثر لکھے ہیں انگریزی زبان کے اسلوب نثر سے متاثر ہوئے تھے خیال ہے کہ کلکتے کے قیام میں انھوں نے چند انگریزی ناول سے اور ان کے ترجمے پڑھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی

بانی جماعت احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کے آبا و اجداد بارہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور لاہور کے قریب بس گئے، ذات کے منحل تھے، مغلیہ دربار میں رسائی ہوئی، عہدے اور جاگیریں ملیں۔ مرزا غلام احمد 2۰ فروری ۱836ء کو پیدا ہوئے، ولادت تو ام صورت میں ہوئی، قرآن پڑھا، فارسی، عربی، منطق اور طب کی تعلیم پائی۔ حرمت علیہ سے شادی ہوئی بعد میں ان کو طلاق دے دی۔ ۱864ء میں سرکاری ملازمت کرنی۔ ۱868ء میں والدہ اور ۱876ء میں والد مرزا غلام مرتضیٰ کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغ جب اپنے شباب پر تھی تو مرزا غلام احمد نے متعدد بار عیسائی پادریوں سے مناظرے میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں انھوں نے ۱876ء میں 'برائیل احمدیہ' لکھی اپنی اس تصنیف کے کچھ حصے بعد انھوں نے خود دیں صدی ہجری کے مجتہد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مسیح موعود اور مہدی معبود ہونے کا اعلان کیا۔ 22 مارچ ۱889ء میں انھوں نے لکھیا نے انتخاب میں سیلی جیت لی، یعنی اسی دن جماعت احمدیہ کی بنیاد پڑی۔ بعد میں احمدی فرقے نے اپنا ایک الگ کھمبہ ابھی بنا لیا اور راجی نے اپنی زندگی میں بہت سے اشتہارات کے ساتھ ساتھ 84 کتابیں تصنیف کیں جن میں بعض کتابیں تو کئی کئی سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ 26 مئی ۱908ء کو ان کا انتقال ہوا اور قادیان (ضلع گورداس پور، پنجاب) میں دفن ہوئے۔ خلیفہ مولوی نور الدین ان کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

بتایا جاتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں احمدی فرقے کے افراد کی تعداد ایک لاکھ اور دنیا میں ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔

فیض احمد فیض

مکمل نام فیض احمد فیض، تخلص فیض، 13 فروری ۱9۱۱ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کالا قادر ضلع سیال کوٹ ہے۔ خان دانی پیشہ زراعت تھا مگر فیض کے والد جو دھری سلطان محمد خان نے خاص تعلیم حاصل کی اور اندازہً استاد سرور کے پیش کش پر کابل چلے گئے جہاں وہ شہزادوں کے تالیف مقرر ہوئے، بعد میں چیف سکریٹری بھی

گلگت ہائس آف ٹیچنگ سکول سکالر

رہے اور پھر انگلستان میں افغانستان کے سفیر بھی۔ دیں انھوں نے بیسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ سیال کوٹ واپس آ کر بیسٹری شروع کر دی، انھوں نے بن شادیاں کیں۔ وہ انگریزی اور نہ کے مصنف بھی تھے ۱93۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ جہاں چہ خاصے ادبی ماحول میں فیض نے پرورش پائی۔

۱9۱5ء سے جب کہ فیض کی عمر چار برس کی تھی حفظ قرآن سے تعلیم کا آغاز ہو۔ سیال کوٹ میں انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد وہ لاہور آ گئے اور یہاں انھوں نے ڈبل ایم اے، عربی اور انگریزی میں ایک تعلیم پائی۔ ۱935ء میں وہ امرتسر کے ایم۔ اے۔ ماہ کالج میں انگریزی کے پیکچر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ رد مسری بڑی جنگ کے دوران میں (۱942ء) وہ کیپٹن کی حیثیت سے فوج میں ملازم ہوئے، ایک برس بعد محمد اور بصیر ایک برس بعد نقی غنیٹ کرنل بنا دیے گئے۔ ۱946ء میں نوجوی ملازمت سے استعفی ہو کر لاہور آ گئے۔ ۱959ء سے ۱962ء تک وہ پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سیکریٹری رہے۔ ۱964ء میں کراچی کے عبداللہ مارون کالج کے پرنسپل ونگراں بنائے گئے۔

فیض نے ۱928ء سے شاعری شروع کی اور سیال کوٹ کے ایک کالج کے ایک طرحی مساعیرے، اپنی پہلی منزل پر بھی اور ان کی پہلی نظم میر بہ معصوم قاتل، ۱929ء میں لاہور کے گورنمنٹ کالج کے سنگ پیر، رادی، ۳۰، شائع ہوئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ نقش فریاد، ۱۹۱۱ء میں اور ان کا پہلا نثری مجموعہ 'میزان'، ۱962ء میں شائع ہوا۔ ۱۹38ء سے ۱939ء تک وہ ماہ نامہ ادب لطیف کے اڈیٹر رہے، ۱947ء سے ۱958ء تک انھوں نے روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز، اور ہفت روزہ میل بہار کے مدیران کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱938ء اور ۱939ء کے دوران میں کئی ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے اور انھوں نے دولہو (جو اگوستو سویرا) اور دور ہے کچھ کا گاؤں کے لیے مکالمے اور گانے بھی لکھے ہیں۔

۱۹ مارچ ۱۹۵۰ء کو راول پنڈی سازش کے الزام میں سیفی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور چار برس جیل میں رہے۔ ۱958ء میں سیفی ایکٹ کے تحت پھر گرفتار ہوئے اور تقریباً چار مہینے جیل

میں رہے۔ فیضی نے دنیا کے اکثر ملک کی سیاحت کی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے لاہور میں ترقی پسند مصنفین کے قیام میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور وہ ٹریڈ یونین کے نائب صدر بھی رہے ہیں۔ زبان فرانسیسی اور ہسپانوی کے آئی۔ ایل۔ اور کے اجلاس میں وہ مزدوروں کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔

فیضی کی بیوی ایس جارج لندن نژاد خاتون ہیں۔ ان کا نکاح ۱۹۴۱ء میں اسلامی شرع کے مطابق شیخ عبداللہ نے پڑھایا تھا۔ ایس کا اسلامی نام کلتوم ہے۔ فیضی کی تصنیف میں 'نقش فریادی'، 'دست صبا'، 'زندان نامہ'، 'دست تہہ سنگ'، 'اور میزان' قابل ذکر ہیں۔ فوجی ملازمت کے دوران میں ان کو کولیم، جی۔ ای کا خطاب ملا تھا اور ۱۹۶۲ء میں انھیں دنیا کا مشہور لین اس انعام حاصل ہوا۔ ان کا کلام دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے اور وہ اپنے عہد کے صوبہ اول کے کیونسٹ شعراء میں سے ہیں۔ فیضی کم سخن اور خاموش طبع واقع ہوئے ہیں۔

فیضی

شیخ مبارک کے بیٹے، ابو الفضل کے بڑے بھائی، ۱۵۴۷ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ پہلے 'شہور' تھے، 'قبائلی' بنے اور آخر میں قلعہ میں رکھ لیا۔ عسکری و فارسی اور شکر کما در دست عالم تھے۔ فن طب میں اتنے ماہر ہوئے کہ حکیم فیضی کہے: 'اے لکھ۔ ۵۰ برس کی عمر میں اکبر کے دربار میں پہنچے، فقورے کی دن بعد دربار سے چہار صدی کا منصب ملا اور ۱۵۷۷ء میں اکبر نے ان کو ملک ال شہر کا خطاب عطا کیا۔ شاہ زادہ سلیم، دانیال اور مراد کے خاص استاد مقرر کئے گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے شہر کی خدمات بھی انجام دیں فیضی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ 'مواضع آل الہام' ہے یعنی شہر ان کی اس عربی تفسیر میں کوئی ایسا حرف استعمال نہیں کیا گیا کہ جس پر غصہ ہو اور یہ جلد ۷ جز پر مشتمل ہے۔ 'طبائیر اص'، 'ان' نے دیوان کا نام ہے جو ۹ ہزار بیت پر مشتمل ہے۔ ان کی مثنوی 'نیل دس' بھی کافی قبول ہوئی۔ غرض کہ انھوں نے غزلوں، قصیدوں، رباعیوں، قطعوں، غزلیوں کی صورت میں ۹۰ ہزار اشعار کہے۔ کہتے ہیں کہ فارسی مثنوی کے ۶ سو برس

گلے کا اہل مستانی و مسالہ ان جہ

میں ہندوستان میں ہوتے تھے قابل ذکر شاعر پیدا ہوئے جسے اور فیضی۔ 'آب حیات' کے مصنف محمد حسین آزاد کا کہنا تھا: 'انشا پر داری فیضی کے قلم کو سجدہ کرتی ہے' فیضی کا کلام چوں کہ عام فہم ہوتا تھا اور وہ دلی گنتی اور سن بھاتی باتیں بیان کرتے تھے۔ اس لیے ان کی باتیں اکبر کو بہت بھاتی تھیں مگر فیضی ہمیشہ اپنے متعلق ہی کہتے تھے: 'مجھے کیا آتا ہے'۔

ملا بدالونی ہمیشہ درلوں بھائیوں کے حق میں وقت ہی بنے رہے اور ان کو سودا ملے، زندگی اور تہہ ہی کہا لیکن جب ملا بدالونی پر اکبر کا خطاب نازل ہوا تو فیضی ہی نے ملا کے علمی داد کی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ملا کے حق میں سفارش کی۔ فیضی آزاد مشرب الزمان تھے اور مجتہد تھے۔ خوش طبع، شوخ اور شگفتہ مزاج تھے۔ سخی اور مہمان نواز تھے اور ان کا دیوان خانہ الہی کمال کا ہوٹل تھا۔ دے کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ۱۵۹۴ء میں وفات پائی۔ اکبر فیضی کو ادب سے شیخ جیو، اکبر کا مرزا طبع ہوتا تھا۔

کیر صاحب

۱۶۳۸ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ایک مسلمان جولاہے اور داد ان کی بیوی تھانے انھیں پالایا۔ یہ سکندر لودھا کا زمانہ تھا۔ دنیا داری میں کبیر کا سن دلگاہہ اسلام کی روحانی باتوں سے مطمئن ہوئے اور نہ ہندو سماج سے۔ آخر کچھ دن ادھر ادھر بھٹک کر بعد وہ رام نچ کے پیر، کار کھٹکی کے مبلغ رام نند کے پیسے بن گئے۔ کبیر نے اپنی عوامی شاعری کو اپنی تبلیغ کا سرمایہ بنایا۔ ہندوؤں اور وضع قطع اینا نے مسلمان ملاؤں نے بادشاہ سے کبیر کی شکایت کی بادشاہ نے کبیر کو ماضی سے کوادینا چاہا، کہتے ہیں کہ ۵۲ مرتبہ ماضی کو آگے بڑھایا گیا مگر کبیر نے جسم پر اپنا پاؤں رکھنے کے لیے تیار نہ ہوا اور ہر بار تیغے بہت بہت گیا آخر بادشاہ نے کبیر سے معافی چاہ لی۔ مگر کبیر نے کوئی اور دولت، پرست ملاؤں نے کبیر کو بدنام کرنے میں کوئی کسوٹ اٹھا رکھی یہ نہیں مل کر کبیر کی آزاد خیالی کی بنیاد کبیر کی ماں تھا اور بیوی لونی بھی کبیر کو ایک اچھا مسلمان خیال رکھتی تھیں اور پھر کبیر بھی اپنے بیٹے کال سے بے زار تھے جو ہر لمحے دولت کمانے میں لگا رہتا تھا۔ کبیر نے ۱۵۲۰ء میں کی عمر میں ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔ مگر رام کے گاؤں (ضلع بستی) آتر پردیش سے ایک میل کے فاصلے پر آرمی دیا کے کنارے کبیر کے در مقبرہ واقع ہیں ایک کی بناوٹ مسیحی کی سی اور دوسرے کی مانند کی سی ہے یعنی ایک مقبرہ

شیخ مجیب

شیخ مجیب الرحمن ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء کو ضلع فریدپور (بنگلہ) کے قصبہ گوبال گنج میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے وہ سیاست میں حصہ لینے لگے اور اسٹوڈنٹ یونین کے صدر رہے۔ اسی بنا پر وہ ذوالقالت کا اسمان یاس کرنے کے باوجود وہ وکالت نہ کر سکے۔ اسٹریٹ لاء کا نام بھی جس سے متاثر ہوئے اور کچھ دن ان کے ساتھ کام بھی کیا اور پھر سسٹم لگ میں شامل ہو گئے۔ بالکل ان ہی خانے پر بعد میں جب ان کے خیال میں مشرقی پاکستان کے دکھ درد دور نہ ہوئے تو انھوں نے مسلم لیگ سے علاحدگی اختیار کر لی اور ۱۹۴۹ء میں جب انھوں نے ہجرت کے لیے امریکا کے لیے سفر کیا تو ان کو سات دن کی سزا ہو گئی جس سے رہا ہوتے ہی انھوں نے حسین مجیب بہروردی کی قیادت میں عوامی لیگ، سیارہ لکھی۔ شیخ مجیب۔ راصل اس وقت حائے سجا پائے گئے جب ۱۹۵۶ء میں انھوں نے پاکستان کے صدر ایوب خان نے سندھ، ایسا چھ نکاتی مطالبہ پیش کیا جس کے معانی تھے پاکستانی سرکاریوں کی ایک آزاد مملکت۔ مگر نتیجے میں شیخ مجیب کو جیل بھی گئی۔ یہی خان کے دور میں جب پاکستان میں عام انتخابات ہوئے تو شیخ مجیب کی عوامی لیگ کو بغیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر اس کے بعد ان کو ان کی سیاست سے متعلق کرنے میں جب نفع ثابت نہیں ہوا تو انھوں نے ۱۹۷۱ء کے شروع میں شریک بن کر ان کو بنگلہ دیش نام دے کر اس کی آزادی کے لیے عوامی جنگ شروع کر دی اور ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلہ دیش کی مدد سے شیخ مجیب کے عوام نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اپنا بنگلہ دیش آزاد کر لیا۔ اب پاکستان کی ۱۷۰ ہزار فوج نے تیسرا ڈال دیا۔ جنگ آزادی کے دوران میں مجیب پاکستان کے قیدی تھے۔ مجیب بنگلہ دیش کے پہلے براہ منظر ہیں۔ وہ کٹر بنگالی ہیں۔

مجیب جمہوریت، سیکولرزم اور اشتراکیت کے حامی ہیں۔ یا سب فوج میں اور مایہ نوا ہے (بھیل اور چاٹل) ان کی مغرب غذا ہے اور بھیلہ میں بھی ان کو لوتی (ایک قسم کی تلی ہوئی بھیل) زیادہ پسند ہے ان کو کالے کا بھی شوق ہے۔

ہے اور ایک سماجی۔ دونوں کی نگرانی کیے بغیر سادھو کرتے ہیں۔ بہرین کو ہم گواہیں کیے بغیر کا عرس ہوتا ہے۔

کیتنے اسلام آباد ہندو مت دونوں کی ظاہری یا بندہ لودہ غلط آواز اٹھائی۔ اور انسانوں کو انسانیت اور بھائی چاہے کا درس زیادہ سیکولرزم کے بھی مستحق تھے۔

محمد بن قاسم

محمد بن قاسم ۶۹۵ء میں عرب میں پیدا ہوا۔ عرب کے اموی خلیفہ عبدالملک کی خلافت کے زمانے میں عرب تاحر بحر عرب کے راستے سے آتے جاتے تھے۔ ایک بار دونوں کا ایک تجارتی جہاز اسکا یہ سرے جا رہا تھا جس میں سامان تجارت بھی تھا اور بیوہ ہندو عورتیں اور سیم کے بھی تھے۔ راہ میں سندھ کے پوری خاندانوں نے عربوں کے اس جہاز کو لوٹ لیا اور مسلمان مردوں ہندو عورتوں اور بچوں کو بھی بیکر کر لے گئے۔ خلیفہ عبدالملک کی ہدایت پر گورنر حجاج بن یوسف نے سندھ کے راجا دھرم کو آگاہ کیا۔ ان کو ان کو تورا ناں دو مسلمان خیر لوں کو ان سے بھڑکا کر بھیج دو اور جو سامان انھوں نے لوٹا ہے وہ بھی ان سے واپس لے کر تم کو واپس کر دو۔ مگر راجا دھرم نے جواب دیا کہ ان کو یہ سامان باہر ہیں۔ حجاج بن یوسف نے حجاج بن یوسف نے ۷۱۱ء میں حجاج کا امان دینی تھا۔ محمد بن قاسم کی کمان میں ۶۹۵ء میں سپاہیوں کے ساتھ ہر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس کا مقابلہ راجا دھرم کی ۶۵ ہزار فوج سے ہوا مگر راجا دھرم مارا گیا۔ ۲۷ جون ۷۱۲ء کو محمد بن قاسم نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے پہلا راجا ایک بادشاہ کی حیثیت سے سندھ پر سات برس حکومت کی۔ حجاج بن یوسف کی موت کے بعد خلیفہ عبدالملک نے اس کو واپس طلب کیا۔ راہ میں حجاج کے خان دانی دتیس عراق کے گورنر نے اس کو گرفتار کر کے تبراہ ڈال دیا۔ وہیں محمد بن قاسم کی ۶۷۲ء میں موت ہوئی۔

محمد بن قاسم کو ہندوستان کا پہلا مسلمان فاتح کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بات ملحوظ رہے کہ وہ تبلیغ اسلام کی غرض سے ہندوستان میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ ملک گیری کے جذبے اندر تجارتی مفاد نے اس کو ہندوستان کی راہ دکھائی تھی۔

محمد بن قاسم نے اسے ہندو سب کو اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔

سید محمد جون پوری

ہمدیہ جماعت کے بانی سید محمد 847ھ میں جون پور میں پیدا ہوئے۔ دینی علوم کے بعد تربیت باطن اور ترکیہ قلب کی طرف متوجہ ہوئے اور سات برس تک مسلسل روزے رکھے اور گوشہ نشین رہے۔ اسی اثنا میں ان کے کہنے کے مطابق ان پر وحی نازل ہوئی اور انھوں نے ہمدیہ ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر تبلیغ شروع کی سید صاحب نے جن احکام کی تلقین کی ان میں تین اہم ہیں۔ ہجرت یعنی گھروار چھوڑ کر قید وطن سے آزاد رہنا، دولت کی تعلیم یعنی مال کو سید صاحب نے کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں مانا، اس لیے جس کے پاس جو کچھ ہو وہ اپنے رفیقانِ طریقت میں بانٹ دے اور ہر وقت راہ حق میں سر رکھ رہنا جب سید صاحب کی مخالفت زیادہ بڑھی اور ان کو کافر قرار دے کر ان کی موت کو جائز قرار دیا گیا تو وہ گجرات چلے گئے۔ وہاں کا حاکم سلطان محمود کلاں ان کا عقیدت مند بن گیا۔ سید صاحب گجرات سے عرب اور پھر ایران چلے گئے وہاں کے عوام سید صاحب کی تعلیمات کی طرف اتنے زیادہ متوجہ ہوئے کہ شاہ ایران کو سید صاحب کی ذات سے خطرہ پیدا ہونے لگا اور اس نے ان کو ایران سے نکل جانے کا حکم دیا۔ سید صاحب جب ایران سے ہندستان واپس آ رہے تھے تو 911ھ میں فراہ کے مقام پر انھوں نے وفات پائی۔

’ام ال عقائد‘ ہمدیہ جماعت کی مذہبی کتاب ہے جو سید صاحب کے مریدوں نے ترتیب دی تھی۔

ڈالا جہاں میں انگریزوں کا عتاب مولانا کے خان دان پر بھی نازل ہوا اور مولانا کے والد کو انگریز سپاہیوں نے گولی مار دی، مولانا آزاد روزگار کی تلاش میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ چھ مہینہ تک ایک ملازمت کرنے کے بعد بمبئی آ گئے۔ یہاں چند پارسیوں کے تعاون سے فارسی زبان میں کچھ تحقیقی کام کیا۔ بمبئی سے مانوہ پیسے اور فروغ داری میں محافظہ فزکری حیثیت سے چند مہینے کام کرنے کے بعد لومہا نے آگئے۔ 1861ء میں جب وہ لاہور میں پوسٹ آفس میں ملازم تھے تب انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور ’آئینہ صحت‘ تصنیف کرنے کے بعد 1864ء میں انھوں نے عربی کی گرامر کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیا اور پھر علم منطق پر ایک رسالہ لکھا۔ 1864ء ہی میں جب انجنینجیاب قائم ہوئی تو مولانا اس کے سرگرم رکن بنے اور اس انجنین کی جانب سے ہر سالہ جاری ہوا وہ اس کے اڈی ٹری بھی رہے۔ انہی کی کوشش سے اس انجنین نے کئی مدرسے قائم کیے جن میں مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، امتحانات ہوتے تھے اور سند دی جاتی تھی۔ 1867ء سے 1869ء تک وہ بچوں کے درسی کتب لکھنے میں مصروف رہے اور اسی زمانے میں وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں عربی زبان کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور پھر 1885ء میں ایران کی سیاحت کو چلے گئے۔

بیشکی کی موت کا غم برداشت نہ کر سکے اور دماغی توازن کھو بیٹھے، ملازمت چھوٹی، انجنین سے تعلق ٹوٹا اور سہ ہفتہ ہر گھونٹے پھرنے لگے آخر 22 جنوری 1910ء کو لاہور میں وفات پائی۔ مولانا محمد حسین آزاد کی سرکار تصنیف ’آب حیات‘ ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر مختار احمد انصاری 25 دسمبر 1880ء کو ضلع غازی پور کے پوسٹ پونگاؤں کے ایک قاضی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری کے والد صاحبی عبد رحمان بہت دین دار انسان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم گائوں کے مکتب ہی میں ہوئی اس کے بعد انھوں نے بنارس سے مڈل اور اہل آباد سے میٹرک اور الیف، ایس سی پاس کیا۔ حیدرآباد (عثمانیہ کالج) میں بھی تعلیم پائی، پھر ایس بی۔ ایس سی کرنے کے بعد لندن چلے گئے اور وہاں سے ایم۔ آر سی۔ ایس اور ایل۔ آر سی۔ پی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انڈینیرگی کی فونی ورسٹی سے بی۔ ایس سی اور

محمد حسین آزاد

مولانا محمد اکبر جیسے مجتہد دادا کے پوتے اور مولانا محمد باقر کے بیٹے مولانا محمد حسین آزاد 1827ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دینی علوم باپ دادا سے بشعرو شاعری استاد ذوق سے اور اپنے باپ کے ایک انگریز دوست سے انگریزی زبان حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نے اپنے باپ کے اخبار اور پریس کا انتظام لینے بات میں لے لیا 1857ء کے دنوں میں قابیل اعترضی تحریروں کی بنا پر الیف انڈیا پریس نے اخبار ممنوع قرار دے دیا جب صدر پڑا تو مولانا کے والد کے انگریز دوست مشر ٹیلر نے بولانڈ کے گھر میں پناہ لی مگر پناہ پر ٹیلر نے باغیوں نے ٹیلر کو مار

پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ اُن کی اچھی ذمہ داری کی بنا پر نظام حیدر آباد کی حکومت نے اُن کو وظیفہ دیا۔ اور حبیب افغون نے ایم ڈی بھی کر لیا تو وہ لندن میں جارجنگ اسپتال میں ماؤس سرجن مقرر کیے گئے اور پھر لندن کے ملک اسپتال کے ریدی ڈینٹ میڈی کل افسر بھی بن گئے۔ ۱۹۱۵ء میں ڈاکٹر انصاری ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں پرنس شروے کر دی۔ یہاں راجاؤں، لوہاؤں اور عاگیر واردوں نے اُن کی بڑی قدر کی۔ جنگِ بلقان کے دنوں میں وہ ایک میڈی کل مس (جلال احمد) نے ترکی گئے۔ ترکی کے سلطان نے اُن کی خدمات کے صلے میں اپنے ملک کے سب سے بڑے اعزاز ’آرڈر آف میڈیا‘ سے اُن کو نوازا۔ ۱۹۱۷ء سے وہ علیٰ طور پر میدان سیاست میں لگے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بنے اور ۱۹۳۲ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ علی گڑھ کے ایم اے اور کالج کے پرنسپل بھی رہے اور جامعہ ملیہ کی بنیاد کو مستحکم بنانے کے لیے بھی بڑا کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے انداز سے کاغذیں جی کے ساتھ کام کیا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر یاد کرنے کے لیے شمال میں ایک کانفرنس منعقد کی، مال انڈیا کانگریس کمیٹی کے مختلف خیال مندوں کو ایک میٹنگ قائم کرانے کی کوشش کی اور ۱۹۳۲ء کی مولانا فاضل کی تحریک کو، نمایاں حصہ لیا اور ترکہ والات میں بھی پیش پیش رہے اور کانگریس کی تحریکوں ہی کے سلسلے میں دو بار جیل بھی گئے۔ ۱۹۳۵ء میں، ترکی سے جب خالہ ادیب خانم ہندوستان آئیں تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی کی ہمان رہیں۔ ۱۵ مئی ۱۹۳۷ء کو دہرہ دون ایکسپریس میں سفر کرتے ہوئے حرکتِ قلب بند ہوجانے کی ساریاں کا انتقال ہوا۔ ان کی موت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بہت سے سہارا گھراؤ کو بڑی خاموشی سے ماہ وار وظیفہ دیتے تھے۔

محمد رفیع

محمد رفیع ۲۴ دسمبر ۱۹۲۴ء کو کوٹلا سلطان سنگھ (ضلع امرتسر، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بڑے بھائی نے گانے کی طرف رجحان دیکھ کر استاد وحید خان کی شاگردی میں دے دیا۔ اُن سے رفیع نے کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور تیرہ ہی برس کی عمر میں ریڈیو سنگرن گئے۔ پہلی بار ۱۹۵۰ء میں لاہور کی پنجابی فلم ’گل بنوچ‘ میں پہلے سبک گانا گایا ۱۹۵۳ء میں جب وہ ممبئی آئے تو یہاں کورس میں شامل ہو کر پہلے میک فلمی

چنگ سنگھ دستاں نے اسے سیکھا۔

گانے گائے جس فلم میں پہلی بار تنہا گانے کا موقع ملا وہ ’’کاؤں کی گوری‘‘ تھی جنم ’’جگنو‘‘ کے گانوں سے اُن کو شہرت ملی۔ رفیع اب تک چودا پندرہ بارانہ میں تقریباً ۲۳ ہزار گانے گائے ہیں۔ ان زمانوں میں انگریزی، عربی اور جنوبی امریکا کی بھی ایک زبان شامل ہے۔ انھوں نے بہت سے غیر فلمی گانے بھی گائے ہیں جن میں ’’سوسنو باجو کی امرکھانی‘‘ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے رفیع جج کر چکے ہیں اور ان کو یوم سٹری کا اعزاز بھی مل چکا ہے وہ اپنے گانوں کے پروگراموں کے سلسلے میں ۲۵ بار غیر مالک کا دورہ کر چکے ہیں۔

سٹر محمد علی جناح

محمد علی نام، ’جناح‘ اُل۔ مکمل نام محمد علی بھائی جناح بھائی کھوجانی۔ کہتے ہیں کہ سٹر جناح کے آباؤ اجداد پنجابی مسلم راج پوت تھے اور دراصل منٹ گئی کے رہنے والے تھے۔ کوئی بزرگ کا فضیلا وارڈ لگے تھے اور یہاں انھوں نے کسی خود چاخون سے شادی کر لی تھی تب سے اُن کا شمار خوجوں میں ہونے لگا۔ سٹر جناح کے والد پنجابی راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) میں رہتے تھے مگر کراچی میں چھوٹے کا کاروبار کرتے تھے۔ سٹر جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ پہلے کراچی کے ایک کتبہ میں تعلیم حاصل کی، پھر بمبئی کے گولڈ دا س پرائمری اسکول میں، پھر کراچی چلے گئے جہاں ۱۶ برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا۔ پھر لندن بھیج دیے گئے اور ۱۸۹۶ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے کراچی آگئے اور بمبئی میں پریکٹس شروع کر دی۔ لندن کے قیام میں ان کی ملاقات دہاں دادا بھائی نوروجی سے ہوئی اور سٹر جناح اُن سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ جن دنوں (۱۹۰۶ء) ہندوستان میں نوروجی انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے سٹر جناح ان کے سکریٹری بن گئے اور انہی کے توسط سے جناح کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ ممبئی میں پرسی ڈنسی بمسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ میرٹھ امپریل کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں کانگریس کے وفد میں شامل ہو کر مسٹر گوکھلے کی قیادت میں لندن گئے اور وہاں لندن انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے صدر بنے۔ ۱۹۱۹ء میں ہوم رول لیگ کے بھی صدر منتخب ہوئے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۴ء میں بھی مسلم لیگ کے صدر رہے اور پھر ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کے تاحیات صدر منتخب کئے گئے۔ ۳۰-۱۹۲۹ء میں انھوں نے لندن کی رائڈ ٹیبل کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ ۱۹۲۵ء میں جب

گاندھی جی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور کانگریسی جیل جانے لگے تو مشرجاح کانگریس کی رکنیت سے علاحدہ ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں مشرجاح کی صدارت میں قیام پاکستان کی تجویز منظور کی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان بنا تو وہ پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

مشرجاح نے سرحدن شاپے بٹ کی ۱۸ سالہ بیٹی رتن بائی کو مسلمان بنا کر ۱۹۱۸ء میں اس سے تادی کی۔ اس وقت مشرجاح کی عمر ۲۲ برس تھی۔ اگرچہ رنجیت کی شادی تھی مگر رفتہ رفتہ دونوں میں اختلافات پیدا ہوتے گئے اور آخر جنوری ۱۹۲۸ء میں رتن نے جراح سے طلاق لے لی۔ ۲۵ فروری ۱۹۲۹ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ رتن سے موت ایک لڑکی پیدا ہوئی دینا۔ جو پارسی ہی رہی اور جب نے پارسی میٹھ لول ٹاٹا سے شادی کی، مشرجاح نے دینا کو مسلمان بنے رہنے پر زور دیا مگر وہ نمانی اور آخر جراح نے اس کو عاق کر دیا۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں مشرجاح کا انتقال ہوا۔ ایڑنی اور ترکی قاتلین جمع کرنے، بطریقہ کھیلنے، قیمتی لباس اور بٹلر شو پہننے کا ان کو شوق تھا۔ کچھلے ایک ہزار برس میں مشرجاح وہ واحد مسلمان ہیں جنہوں نے سیای اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا اس حیثیت سے ہندوستان کی کسی دوسری مسلم شخصیت کو ان کے ہم پلہ نہیں کہا جا سکتا۔

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۶۸ء میں رام پور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ (بی اماں) نے تربیت دی اور تعلیم دلوئی ابتدائی تعلیم بریلی میں ہوئی اور جب علی گڑھ سے بی۔ اے کیا تو ساسے صوبے میں ادل آئے۔ مزید تعلیم لندن کی آکس فورڈ یونیورسٹی میں پائی ریاست رام پور اور ریاست بڑودلی میں اعلا ملازمتوں پر فائز رہے۔ ۱۹۱۵ء میں ملازمت کا سلسلہ ترک کر کے کلکتہ سے 'کامرنڈ' نام کا ایک انگریزی ہفت روزہ جاری کیا، پھر دہلی منتقل ہو کر وہاں سے اردو روزنامہ 'ہم روزہ' نکالا۔ دوسری بڑی جنگ کے زمانے میں ہم روزہ کی تحریریں انگریز حکومت کی نظر میں قابل اعتراض ثابت ہوئیں۔ اس لیے مولانا نظر بند کر دیے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے تو خلافت تحریک کے سر

گرم رکن بن گئے۔ دوبار (۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۸ء میں) خلافت کے صدر بھی رہے۔ خلافت ہی کے ایک نمایندہ کی حیثیت سے ساسے یورپ کا دورہ کیا اور اس سلسلے میں پایائے روم سے بھی ملاقات کی۔ خلافت تحریک کے خاتمے پر کانگریس میں شامل ہو گئے اور ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے بھی صدر رہے اور پھر کچھ عرصے بعد کانگریس کو خیر باد کہہ دیا۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے وہاں ایک پرجوش، ہنگامہ خیز اور یادگار تقریر کی اور کہا: 'آزادی لے کر ہی جاؤں گا یا مر جاؤں گا'۔ اتفاق سے وہیں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال ہو گیا۔ بیت المقدس میں دفن کیے گئے۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ اردو اور انگریزی کے اچھے صحافی تھے اور اردو زبان کے شاعر تھے جو ہر مجلس تھا۔ پرجوش اور جذباتی مقرر تھے۔ قوت برداشت کم تھی۔ ان کی سیاست پرجوش زیادہ۔ باہوش کم تھی۔ مولانا پہلے مسلمان تھے جنہوں نے قرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔

شیخ ہند مولانا محمود الحسن

۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا ذل فقار علی دیوبندی دارِ علوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شورا کے رکن تھے۔ مولانا محمود نے دیوبند ہی کے دارِ علوم میں تعلیم پائی اور پھر فارغ ہو کر دہلی ایک استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے اور پھر شیخ جابرین کے ممتاز منصب پر فائز ہوئے اور شیخ ہند کا لقب پایا۔

انگریزوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے سلسلے میں ہندوستان میں جو تحریکیں شروع ہوئیں مولانا ان تحریکوں کے بانیوں میں سے رہے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے خدیوہیت انصار قائم کی، اس کے تحت رشی خطوط جیسی انقلابی تحریک شروع کی گئی۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں یہ سب سے پہلی تحریک تھی۔ جنگ بھقان کے دنوں میں جب مولانا جے کے لیے مہینے تو انگریزوں کے دوست شریف مکہ نے ان سے یہ فتوا لینا چاہا کہ علماء اسلام کی ہم دیدیاں انگریزوں کے ساتھ ہیں مگر مولانا نے فتوے پر دست خط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ ۱۹۱۶ء میں گزرتا کر کے انشامیج دیے گئے جہاں مارچ ۱۹۲۵ء تک قید رہے۔ مئی ۱۹۲۵ء میں وہ جب ہندوستان واپس

ہوئے تو انھوں نے مسلمانان ہند کو ستورہ ریا کے انگلیں میں شریک ہو کر ملک کو آزاد کروا دیا۔ کہتے ہیں کہ شیخ ہمد نے اپنی چار اہم خوبیاں ایسے چار بڑے شاگردوں میں بانٹ دی تھیں۔ حدیث کا علم علامہ اقبالؒ کو ملنا تھا، قرآن کی سمجھ مولانا شبیر احمد عثمانی کو ملی تھی، سیاست کی سمجھ مولانا عبد اللہ مدنی کے حصے میں آئی تھی اور مولانا حسین احمد مدنی ان کے جانشین تھے۔ شیخ ہمد کی کئی تصانیف قابل ذکر ہیں اور قرآن پاک کا اردو ترجمہ قرآن کی ذکاوت کا اعلا نون ہے۔ جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد شیخ ہمد ہی نے رکھا تھا۔ 30 نومبر 1920ء کو ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر سید محمود

سید محمود 1889ء میں منٹو غازی پور (مہار) کے قصبے سید پور بھٹری میں پیدا ہوئے۔ 'بھٹری'، 'ہمد' اور 'ری' سے مرکب ہے کہتے ہیں کہ ہمد کی جائے پیدائش ہے سید محمود نے علی گڑھ، لندن اور جرمنی میں تعلیم پائی۔ وہ بی۔ ایچ۔ ڈی تھے اور پیر بھی۔ شش ماہ ان کی وکالت کا نام 1913ء سے 1921ء تک رہا۔ 1923ء میں خلافت لیٹی اور ان کا انگریزی کی کمی کے لیے سیکرٹری بنے۔ ان کو کانگریس کے جزیرہ سیکرٹری بنے کا بھی موقع ملا۔ 1937ء میں جب بہار میں کانگریس کی وزارت قائم ہوئی تو وہ وزیر تعلیم بنائے گئے۔ 1946ء سے 1952ء تک وہ بھار کی حکومت میں صحت و حریت، تجارت اور زراعت کے وزیر رہے۔ 1952ء سے 1956ء تک ان کو مرکزی حکومت میں وزارت کا عہدہ حاصل رہا۔ وہ جنگ آزادی کے سلسلے میں کئی ماہ جیل گئے۔ بہار کے عوام میں تعلیم پھیلانے کے لیے انھوں نے نئی کام کئے۔ فسادات کے عداوت کے لیے انھوں نے 1946ء میں مجلس مشاورت قائم کی ان کی تصانیف میں ان کا مشہور رسالہ 'خلافت' اور 'انگلستان' قابل ذکر ہے۔ 'دیوانِ غالب' کے بدایوں ایڈیشن کو انھوں ہی نے مرتب کیا تھا اپنی عمر کے آخری دن انھوں نے ہمارے مہر چھپر میں گزارے اور ان کا دین انتقال ہوا۔

مولانا مودودی

مولانا کے بزرگ سکندر لودھی کے عہد میں ہندوستان آئے۔ والد سید احمد حسن علی گڑھ کے 'ہمدانی طالب علم' ہیں سے تھے۔ ان کا پیشہ وکالت

تھا بعد میں تارک دنیا ہو گئے۔ مولانا مودودی 25 ستمبر 1903ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد نے مذہبی تعلیم دلائی۔ انگریزی تعلیم سے ہمیشہ دور رکھا یہی نہیں بلکہ محلے کے عام بچوں کے ساتھ کھیلنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اور ان کو مذہبی قصے سنائے گئے۔ 1914ء میں مولانا نے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ 1918ء سے اپنے بھائی کے ساتھ اخبار 'مدینہ' سے اخبار نویس کی ابتدا کی۔ 1922ء سے 1923ء تک 'جمعیت علماء' کے اخبار 'مسلم' کے ڈیٹر رہے اور پھر 1924ء سے 1928ء تک 'جمعیت علماء' کے دوسرے اخبار 'آل جمعیت' میں ادارت کے فرائض انجام دیے۔ 1928ء سے 1930ء تک مولانا کا قیام حیدر آباد میں رہا۔ صحافتی زندگی کے ساتھ ساتھ مولانا کی سیاسی زندگی بھی 1919ء سے شروع ہوئی تھی جب کہ انھوں نے انجمن اعانت نظر میدان اسلام کے تحت کام کرنا شروع کیا تھا اور انھوں نے خلافت اور کانگریس کی تحریکوں میں بھی علی طور حصہ لیا تھا مگر وہ 1947ء میں پاکستان جانے سے قبل قیام پاکستان کے مخالف تھے۔

مولانا مودودی کئی اسلامائزیشن کے مصنف ہیں جن میں 'آل جہاد فی الاسلام' اور 'برہہ' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مولانا جامعہ اسلامی کے بانی ہیں، ان کی تحریروں میں تحریک مسلمانوں کے (تعلیم اور معاشی حالت کے اعتبار سے) متوسط طبقے کو متاثر کرتی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی

خواجہ چشتی 1161ء کے لگ بھگ سجستان میں پیدا ہوئے، اصل وطن خراسان (ایران) تھا۔ ان کے والد غیاث الدین حسن تھے۔ پن چکی اور ایک بارغ ان کے روزگار کا ذریعہ تھے۔ خواجہ چشتی پندرہوی برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابراہیم قندوزی نام کے ایک مجذوب سے متاثر ہوئے اور اپنی ساری جائے داد اور گھر کا سارا ساز و سامان دان کر کے تحصیل علم کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ بحر قند اور بخارا کے علمی مرکزوں پر پہنچے اور قرآن پاک حفظ کیا، پھر نیشاپور کے قصبے ہرون میں شیخ کر خواجہ عثمان کو اپنا سرشدان لیا۔ دن رات اور برسوں اپنے مرشد کی خدمت کی اور مرشد کی ہدایت پر بحر قند، بخارا، بخارا، جبریل، اوش، اصفہان

سبزوآر، مہنہ، جرجان اور استرآباد کے عالموں اور صوفیوں کی صحبت میں رہ کر ادراؤں کے فکری رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے ہندستان میں داخل ہوئے اُن دنوں دہلی پر شہاب الدین غوری کی حکومت تھی۔ دہلی سے اجیر گئے جو پرتھوی راج کی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ خواجہ چشتی نے اجیر میں رہ کر سب کو محبت کا پیغام سنایا۔ 53 برس انھوں نے اجیر میں گزارے۔ اُن کی کل عمر 97 برس کی ہوئی۔ 16 مارچ 1235ء کو انھوں نے وفات پائی۔

خواجہ اجیری اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں پھٹی ہوئی دھنچ میں لپٹے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ دوستی اگر کھٹ جاتی تو کسی بھی کپڑے کا جو ٹکڑا ملتا اُس کا پونڈ لگاتے روزہ روز رکھتے مگر افطار میں شکل سے دو تین ہی لوہے وزن کی مدی کھاتے تھے اُن کا خیال تھا کہ انسانی سماج میں غشی اور خش حالی اس بات پر منحصر ہے کہ انسان برائی کا بدلہ بھلائی دینے کی ہمت اور طاقت پیدا کرے۔ انسانوں نے اپنے درمیان رنگت نسل، زبان اور عقیدے کی جو دیواریں کھینچی ہیں وہ بے حقیقت ہیں انسان کا پہلا رشتہ تو انسانیت کا رشتہ ہے۔

خواجہ اجیری سے چشتی سلسلہ شریعت ہوتا ہے۔ اُن کے نام در مریدوں میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی بھی تھے۔ انگریز مورخ آرمیٹھ نے لکھا ہے کہ خواجہ اجیری کے اثر سے کئی لاکھ انسان مسلمان ہوئے

نذر الاسلام

قاضی نذر الاسلام آسن سول (ضلع بردوان، بنگال) کے گاؤں چورلیا میں 14 مئی 1899ء کو پیدا ہوئے۔ آٹھویں برس کے تھے کہ والد فقیر احمد کا سایہ سرمے اٹھ گیا۔ بھوک اور فاقوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے کسی کیسے طرح اپنی تعلیم جاری رکھی۔ پہلی ہری جنگ کے دوران میں (1917ء) جب کہ وہ صرف آٹھ برس کی عمر کے تھے فوج (بنگال رجمنٹ) میں بھرتی ہو گئے۔ اگرچہ گیارہویں برس کی عمر سے اُن کی ادبی زندگی کا آغاز فساد نگاری، ناول نویسی اور شاعری سے ہو چکا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ شاعری پر زیادہ توجہ دینے لگے اور جب فوجی ملازمت کے دوران میں اُن کو فارسی کے مشہور شاعر حافظ کی شاعری کے مطالعے کا موقع ملا تو انھوں نے اپنی شاعری کو بھی فارسی زبان کی شیرینی بخش

دی۔ اُن کی پہلی نظم ’مکتی‘ 1918ء میں بنگلہ مسلم سہ ماہیہ کے رسالے میں شائع ہوئی۔ 1919ء میں جنگ کے خاتمے پر انھوں نے فوجی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ 1944ء میں اُن کی پہلی پریلا نڈل (جو ہندو تھیں اور کبھی طوائف تھیں) کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد وہ مستقل طور پر بیمار رہنے لگے اُن کے قدر دانوں نے اُن کے لیے چندہ جمع کیا اور 1952ء میں ان کو علاج کے لیے لندن بھیجا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ واپس ہوتے تو تنگ دلی نے ادویات بیمار بنا دیا۔ البتہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد اُن کے حالات قدرے سہل ہو گئے۔

نذر الاسلام شاعر ہیں وہ اسی شاہ کار نظم ’باغی‘ کی بنا پر باغی شاعر کہے جاتے ہیں انھوں نے بنگلہ شاعری کو مسادات سے آشنا کیا ہے اور اس کو عوامی مزاج بخشا ہے۔ شیکور کے بعد نذر الاسلام بنگلہ زبان کے سب سے بڑے شاعریں۔

خواجہ سید نظام الدین اولیا

آپ کے اجداد بھارہ سے ہندستان آئے اور بدایوں میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے والد سید احمد صاحب بدایوں کے قاضی تھے اور دادا خواجہ معین الدین چشتی اجیری تھے حضرت نظام الدین 11 ربیع الاول 652ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے پانچ ہی برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سرمے اٹھ گیا ماں بی بی زلیخا نے تربیت دی۔ 25 برس کی عمر میں والدہ کو لے کر دہلی آ گئے تنگ دستی تھی اکثر فاقے بھی ہوتے تھے۔ دہلی میں تصوف کی تعلیم پانے کے بعد پیش شریف چلے گئے اور بابا فرید الدین گنج شکر کے مرید ہو گئے۔ بعد میں بابا کے خلیفہ بنے جنگلوں میں بہت عرصے تک عبادت و ریاضت کرنے کے بعد غیاث پورہ دہلی میں اگر سکونت اختیار کی۔

یہ سلطان علاء الدین خلجی کا نانا تھا اُس نے آپ کو ملنے کی دعوت دی مگر آپ نے اُس کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا، سلطان نے خدا اگر دیر کرنا چاہے آپ نے اس بات کی بھی اس کو اجازت نہ دی۔ 18 ربیع ثانی 725ھ کو 94 برس کی عمر میں وفات پائی۔

نور جہاں

تبران سے ہندستان آئے ہوئے قندھار کے قریب 98ھ میں (دوران)

نہیں) مرزا خاں بیل کے گھر میں بہرائسا پیدا ہوئی، سائبرے پہنچے پر مرزا کو الہ آباد میں ملازمت میں لگایا۔ ترائیس کی مغرب مہر کی شاہی ایک فوجی عہدے دار مہاسپ ٹا بیگ سے ہوئی جہاں گیر کے بعد میں قلی بیگ و بعد میں تہ انگل کے لقب سے بھی مشہور رہا مردان کا عالم تھا جہاں اس نے جہاد کے قوربان گیر کرنا 65% میں اس کی مہر کو بیگ نے راقطہ لایا کوٹا کو بھی شہر انگل نے اس کو دھوکے سے قتل کر دیا اس کے جہاں گیر کو کاکے آدمیوں نے شہر انگل کو مار ڈالا۔ چار برس بعد یعنی 1611ء میں مہر جہاں گیر کے عقید میں اٹھی اس وقت اس کو پندرہ برس اور جہاں گیر کی 24 برس تھی جہاں گیر نے اس کو مہر النساء سے توجہ جہاں بنادیا۔

لہذا جہاں دربار میں اس پر دنگاڑی اور میان جنگ میں بھی جہاں گیر کے ساتھ رہی تھی۔ امر پستھنت میں بھی کافی دیر تھی جس کے پر اس کی ضرب اور فراروں پر اس کی مہر لگتی تھی نظام سلطنت کو سمجھی تھی اور سیات کی بے چید گئیوں کو سلجھانا جانتی تھی مگر جہاں بازی سنگ دلی اور جلیتر پن میں ایک عام عورت جی جی یعنی ملکہ تھی مگر جوڑو ٹوٹی بادشاہ تھی نو جہاں نے کئی عہدہ لباس اور لوریاں ایجا کئے اور آج کی کئی مشہور مٹھیاں بھی اسی کی ایجا ہیں اور عطر کا بسکی بھی وہی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں گیر بیس گھنٹے میں موسیٰ نے (سہ آفتہ) شراب پیتا تھا مگر نو جہاں کے کہنے پر روتہ روتہ اس نے شراب نوشی کم کر دی، یہاں تک کہ وہ دن بھر میں صرف تین ہی میلے شراب پینے لگا۔ 1539ء میں نو جہاں کا انتقال ہوا، اس کا قبر لاہور میں ہے۔ جہاں گیر سے اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی البتہ شیراٹس سے اس نے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام لاڈلی بیگم تھا۔

نیاز فتح پوری

نام بیاقت علی خاں، نیاز تھکس، 1884ء میں پیدا ہوئے۔ باپ پہلے محکمہ پولس میں ملازم تھے۔ پولس کی ملازمت ترک کر کے 1898ء میں رام پور آ گئے اور یہاں دکانت کرنے لگے۔ مکتب اور مدرسے سے نیاز کی تعلیم کی ابتدا ہوئی مگر انگریزی زبان انھوں نے خود سیکھی اور غریبی ترکی زبان بھی سیکھی البتہ رام پور میں وزیر محمد خاں سے انھوں نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ نیاز کے روزگار کی ابتدا بھی محکمہ پولس ہی سے ہوئی۔

تھے گن کا ہندسہ ۱۰۰۰ پیچہ

جی دونوں وہ بھوپال میں پولس کے دفتر میں میٹرک کر گئے تھے ڈاکٹر بجنوری بھوپال ریاست کے چیف سیکرٹری تھے۔ ان کی سوانح پر نیاز کی ادبی صلاحیت کا انکشاف کیا گیا اور ریاست کی جانب سے ان کو وظیفہ ملنے لگا۔ نیاز کی قلمی زندگی کا آغاز 1911ء میں لاہور کے اخبار 'زمین دار' سے ہوا، 1916ء میں وہ دہلی آ گئے۔ ریاست بھوپال سے ہالی انداز ملنے پر انھوں نے 1922ء میں لکھنؤ سے ماہ نامہ 'نگار' جاری کیا۔ 1945ء میں لکھنؤ ٹائیکز کے نام سے ایک میٹرک کمپنی کی بنیاد رکھی مگر کام شروع ہونے سے پہلے ہی وہ بند ہو گئی۔ 1962ء میں نیاز کراچی (پاکستان) چلے گئے اور 'نگار' کو بھی لکھنؤ سے کراچی منتقل کر دیا۔ 1966ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نیاز اردو شعرا میں تیسرا اور اقبال اور نثر نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں سے متاثر تھے۔ ان کی زیادہ تر تصانیف دراصل دوسری زبانوں سے ترجمے کا نتیجہ ہیں جی میں سے اکثر انہی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ شیگور کی 'گیتا نجلی' کا اردو ترجمہ 'عزلی نغمہ' ان کا شاہ کار ہے۔ نیاز اپنی جوانی کے دنوں میں انگریزی زبان کی فہمیں دیکھنے کے بہت شوقین تھے اور ان کے افسانے بھی دراصل انگریزی قلمی کہاں ہوئے ہی کے ادھار پر لکھے جاتے تھے۔

نیاز کی چند اہم تصانیف 'انتقادات'، 'محاسن'، 'من و بزدان'، 'نگارستان'، 'لور'، 'مکتوبات'، 'نیاز' ہیں۔

نیاز کے تجربے اور شاہدے میں یہ بات آئی کہ مذہبی عالم اور دینی مکتبوں کے ماسخ گیر اور سنگ دل ہیں۔ سب سے پہلے پردہ کیوں کو سزا دیتے ہیں تو ان کے سر دلوں سے دے دے مارتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ مولویوں کے اندر گفتگو میں فروغیت ہے اور مزاج میں رعونت ہے اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو عقل سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا چاہے نتیجہ ہو کہ نیاز کے دل سے مذہبی علما کا احترام اٹھ گیا اور انھوں نے مذہب کو محض عقیدے کی بنیاد پر ماننے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر مذہبی حلقوں نے ان کی ہمیشہ مخالفت کی۔ جہاں جہ نیاز کی طبیعت میں بھی گھٹنیں آتے اور کھڑا بن پیدا ہو گیا اور پھر انھوں نے بھی اپنے باغیاد لفظ 'انظر' کی بنا پر اپنے کسی مخالفت کو معاف نہیں کیا۔ نیاز کا 'نگار' اردو زبان کی تاریخ میں وہ واحد جریدہ ہے جس نے واضح طور پر ایک نئے مکتب خیال کو جنم دیا اور پڑھے لکھے لوگوں کو بے

تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ قبر میں بھی فریب کھڑے لگی ہے، جب تک احیلم نہ ہوئے کہہ
یقین نہیں آتا؛

نواب واجد علی شاہ کی رنگین مزاحی ادراں کے ذوق شوق نے ان کی رعایا کے مذاق کو اس حد تک متاثر کیا کہ آج بھی خطہ اودھ میں اس رنگین تہذیب کے اثرات سوجھ رہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں نواب واجد علی شاہ کا الگیتے ہی میں انتقال ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ تاسیسی نام عظیم
آدین رکھا گیا۔ دادا شیخ وحید الدین اور والد شیخ عبد الرحیم اپنے وقت کے بڑے عالم
تھے۔ شاہ صاحب نے سات ہی برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور عربی و فارسی
کی مروجہ نصاب کی تعلیم اپنے والد سے لینا شروع کی اور فارغ تحصیل ہو کر پڑھا
ہی برس کی عمر میں اپنے والد سے سلسلہ نقشبندی بیعت کی۔ ۱۱۳۰ھ میں بن
کے لیے گئے۔ عرب کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ واپسی پر شاہ صاحب نے
یہ بات شدت سے محسوس کی کہ قرآن پڑھا تو جاتا ہے مگر پڑھنے والے اس کدل
سے سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی زرا بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور اسی طرح
حدیث کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں بلکہ اکثر مسلمان بدعت اور
شرک میں مبتلا ہیں اور قرآن کو محض فال انگ ماننے اور حلف اٹھانے کی چیز سمجھتے
ہیں۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کی آسان زبان میں تفسیر لکھی کہ مسلمان پڑھیں اور
سمجھیں اور اپنی اصلاح آپ کریں اور یہی صورت انھوں نے حدیث کے لیے کی
عربی مدرسوں کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی اور قدیم طرز میں اصلاح کر کے تقلید
کی عادت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ
بھی کیا۔ اقتصادیات کے موضوع پر بھی انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی۔
ہندوستان کے مسلم علماء میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ مجدد اعظم کا ہے اور
ان کی حکیمانہ بصیرت کو سب ہی نے مانا ہے۔ شاہ صاحب کے چار فرزند تھے
ان میں مولانا شاہ عبد العزیز نے کافی شہرت پائی۔ شاہ صاحب کی تصانیف
میں ’’فتح ال رحمان‘‘ (قرآن کا فارسی ترجمہ)۔ ’’ال نور وال کبیر‘‘۔ ’’ال مسوا شجرہ
موطأ‘‘۔ ’’ال قلی ال جمیل‘‘۔ ’’فیوض ال حرمین‘‘۔ ’’عقد ال جید‘‘۔ ’’الغاسق
ال عارنین‘‘ اور ’’ال بدو ال بازغ‘‘ اہم ہیں۔ شاہ صاحب نے ۱۱۶۲ھ میں
کی عمر میں (۱۷۶۲ء) وفات پائی۔

داجہی شاہ کو عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ لکھنؤ کا قیصر باغ انہی نے تعمیر کرایا تھا جس کی تعمیر پر وہ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ قیصر باغ کے ان محلات میں ان کی ہیگیا، لونڈیاں اور دانشتائیں رہتی تھیں۔ چلکے کے قیام میں یہی عمارتوں نے بہت سی عمارتیں بنوائیں اور میا برج میں بھی حسین عورتوں کو جمع کرنے اور ناچ و رنگ کی محفلیں منعقد کرنے کا سلسلہ دن رات جاری رہا مگر یہ تمام عورتوں نے عشق و کھنکھ کے باوجود وہ خدیہ لکھنے پر مجبور ہوئے: ”ایک دن میں میرا صدمہ بگڑا، شب کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا، میں نے کان مائیٹھے کہ ایک سی سے بھی محبت نہ کروں گا اور اب عورتوں کی طرف سے اتنا بظن ہو گیا ہوں کہ اگر کوئی عورت مجھ سے ملے

دلی دکنی

نام سید محمد فیاض تخلص دلی۔ 669ء میں (اورنگ زیب کے عہد میں) اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ دیورویج تھا۔ سات گروں کا اور احمد آباد میں زندگی کے دن گزرے۔ ابتدائی تعلیم اگرچہ اورنگ آباد میں پائی تھی مگر استاد آغا کر شاہ و بیہ ادین علوی نے مدرسے میں تعلیم مکمل ہوئی۔ دوبارہ دلی بھی آئے۔ پہلی بار اورنگ زیب کے عہد میں دوسری بار 1722ء میں محمد شاہ کے دورِ حکومت میں۔ دلی کا کلام سب اصناف میں موجود ہے انھوں نے غزل بھی لکھی، قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترجیع، مراد و جات بھی، غزل کلام بالاسطہ

نہو۔

یاد کرنا ہر گز دی اس یار کا

ہے دلیفہ مجھ دلِ بیسار کا

دلی کو ریختہ کا سجدہ کہا جاتا ہے۔ دلی ہی وہ شاعر ہیں جن سے اردو شاعری کی بنیاد پڑی اور دلی دکنی کا کلام تہائی ہند کے شاعروں کے لیے نمونہ ثابت ہوا۔ 1749ء میں احمد آباد میں اُن کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

فخر الدین علی احمد

فخر الدین علی احمد 13 مئی 1905ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ڈاکٹر علی احمد نوجوان کرنل ڈاکٹر تھے۔ وہ پہلے ہندوستان کے جنوں نے (1870ء میں انڈین میڈیکل سروس کا اسمان یاس کیا تھا وہ، نیپٹے کو بھی آئی سی۔ ایس بنانا چاہتے تھے۔ فخر الدین علی احمد نے ابتدائی تعلیم گودا اور دہلی میں پائی اور مزید تعلیم انگلینڈ میں حاصل کی اور وہیں وہ بارشٹ لاء بھی ہوئے۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد کچھ دن انھوں نے کلکتہ میں وکالت بھی کی۔ حکیم اجمل خان کی توبہ دہنی سے متاثر ہوئے اور سیاست سے لگاؤ پیدا ہوا، اور 1931ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ آسام کی پہلی وزارت (1938-39ء) میں وہ وزیر مالیات رہے۔ 1946ء میں وہ آسام کے ایڈووکیٹ جنرل بنے۔ آسام کی دوسری وزارت میں بھی وہ وزیر رہے۔ 29 جنوری 1966ء کو وہ مکر میں وزیر آب پاشی بنادیتے گئے۔ اور بعد میں وہ وزیر تعلیم اور وزیر دراع بھی رہے۔ 1936ء میں وہ آسام کی کانگریس کمیٹی

حقائق کے ہندوستان کی تاریخ

دورنگ کئی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور پھر کانگریس دورنگ کئی کے بھی ممبر رہے۔ ان کو مرکزی کابینہ کے سیاسی امور کمیٹی کے سینیئر ممبر ہونے کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ وہ یو۔ این۔ او۔ اور ایف۔ اے۔ او۔ (آسٹریلیا) میں بھی ہندوستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کے بنا پر وہ متعدد بار قید ہوئے اور 1945ء سے قبل تو وہ مسلسل 12 قیامیں قید میں رہے۔ اپنی سیاسی زندگی میں انھوں نے سیکولرزم کا سبق رفیع احمد قندلانی سے لیا اور اپنے نظریے سے وفاداری کا ثبوت دینا پختہ نہرو سے کیا۔

فخر الدین علی احمد کے طالب علمی کے دن بڑے آسودہ گزرنے۔ اُن کو اپنے والد کی جانب سے 500 روپے ماہ وار خرچ ملتا تھا اور وہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں صاحبِ موٹر کار تھے۔ وہ کھیل کود میں بڑی دل چسپی لیتے ہیں۔ دکنی برس تک آسام کی 'فٹ بال ایسوسی ایشن، کرکٹ ایسوسی ایشن اور آل انڈیا لائسنس ایسوسی ایشن کے صدر اور آسام اسپورٹس کانسلی کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ برج اور گورڈنسٹریٹ بھی اُن کو کافی شوق رہا ہے۔ ایک بار انھوں نے شاعر بھی بنا جاتا تھا اور اپنی ایک غزل پر سائل دہلی سے اصلاح لینا چاہی تھی مگر سائل نے یہ مشورہ دیا تھا کہ شاعر کی زندگی کو تباہ کر دینے والا شوق ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس شوق سے باز رہے۔ 1945ء میں انھوں نے شادی کی۔ ان کی گیم عابدہ مرحوم افسانہ نگار حیدر جوش کی بیٹی ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجوایٹ ہیں۔

مرزا غالب کی بڑی کے بھائی عارف کی پوتی رفیعہ بیگم فخر الدین علی احمد کی والدہ تھیں۔ عہدہ سلطان اُن کی بہن ہیں۔ فخر الدین علی احمد کم گو ہیں اور اُن کی ذات قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ہے۔ وہ ہندوستان کے 5 دیں صدی جمہوریہ میں ہندوستان جیسے عظیم ملک کا سربراہ ہونا ایک ہندوستانی کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔

کیا کاوش نورِ ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے

انسان کی تڑپ فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

جوش ملیح آبادی

بزرگ قوم

سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے حضرت محمد تک پہنچتا ہے اُن کی نسبیاں خواجہ سیر درد کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُن کے والد سید تقی محل شاہ اکبر شاہ ثانی کے دوست تھے اور محل دربار سے واسطہ پاتے تھے۔ سید احمد کی عمر ۲۲ برس ہی کی تھی کہ (۱۸۳۸ء میں) باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیوہ ماں عزیز انسانا و عجم نے بیٹے کی ایسی تربیت کی کہ یہ ثابت کر دیا کہ ایک اچھی ماں ہزاروں استاد سے بہتر ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد چوں کہ آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا تھا اس لیے سید احمد نے انگریز سرکار میں ملازمت کر لی۔ کچھ ہی میں سرشتہ دار ہوئے۔ پھر نصف بنا دیے گئے۔ جونہی وہ مجبور میں مصنف تھے اُس پہلی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی جس کو غدر کا نام دیا گیا۔ ۱۵ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بغاوت ہوئی۔ ۱۲ مئی کو یہ خبر پورنی سید احمد نے ۲۰ انگریز عورتوں اور بچوں کو اپنے مکان میں پناہ دی اور پھر حفاظت ان کو دے کر پورا دیا مگر اسی اثنا میں اُن کا اپنا گھرا، لڑ گیا اور انھوں نے اپنی والدہ اور خالہ کو جو دہلی کے مکان کی ایک کوشی میں بند تھیں باہر نکال کر شکل تمام میرٹھ پہنچایا۔ انگریز خواہی کو پانے کے صلے میں انگریز سرکار نے سید احمد کو ایک خلعت، ایک ہزار روپے نقد، دوسروں پر مامانہ دو نسلوں تک پولی کی کل پینشن عطا کی۔ ۱۸۵۸ء میں میرٹھ میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔

مواد برس مجبور میں رہنے کے بعد ۱۸۵۹ء میں سید احمد خاں سب جج کی حیثیت سے مراد آباد منتقل ہو گئے۔ وہاں اُن دنوں ایک قحط پڑا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑا کام کیا مراد آباد میں انھوں نے ایک فارسی مدرسہ بھی قائم کیا۔ ۱۸۵۹ء میں وہ غازی پور میں تھے تو انھوں نے وہاں بھی ہندو سلاہین کے لیے ایک مشترکہ اسکول قائم کیا۔ ۱۸۶۹ء میں وہ اپنے دو بیٹوں کو ساتھ لے کر انگلینڈ گئے۔ ۱۱ مارچ ۱۸۷۵ء کو ملکہ وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کی خدمت میں باہر پائی ہوئی۔ سید احمد پہلے مسلمان تھے جو انگلستان گئے اور جرج کو شاہی دربار میں بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی گئی۔ سید احمد کو دربار سے سی۔ آئی۔ ای۔ ایف۔ ملہ۔ انھوں نے اپنے دو بیٹوں کی مدد سے انگلستان کی یونیورسٹیوں کا انجور مطالعہ کیا۔ لندن میں اسٹیل اور ایڈیٹن کے رسالوں کو بھی انھوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور ہندوستان واپس ہونے پر انھیں رسالوں کی طرز پر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو رسالہ 'تہذیب ال اخلاق' جاری کیا جس سے اصلاح معاشرت مقصود تھی۔ وہ سید احمد ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کو صاف اور سلیس بنانے کی کوشش کی۔

سید احمد خاں کی زندگی اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سید احمد نے ۲۳ مئی ۱۸۷۵ء کو مسلمانوں کے لیے علی گڑھ میں ایک انگریزی کالج (ایم۔ اے۔ او کالج) قائم کیا جو جنوری ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا۔

سید احمد نے اپنے غازی پور کے قیام میں ایک سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی جو بعد میں علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ اس سوسائٹی کے تحت انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہوجانے پر مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کے دلوں میں جو زہن پیدا ہو گئی تھی سید احمد نے اپنی تحریروں سے اُسے دور کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے اپنی کتابوں، رسالوں، خطوں، تقریروں اور اشتہاروں کے ذریعے اپنے فریق کے شعور کو بے دار کیا اور انگریز حاکموں اور اسلام کے مخالفوں کے غیبات کو بہت حد تک دور کیا۔ اُن کی تصانیف میں 'خطبات احمدیہ'، 'اسلام دنیا دی ترقی کا نیا لہجہ' نہیں بل کہ معاد لہ ہے، 'آثار و مضامین'، 'تصحیح آئین اکبری'، 'تاریخ مجنوں'، 'اسباب بغاوت ہند'، 'بین کلام'، 'توریت اور انجیل کی تفسیر مختصر' یہ تھا کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اُن کو دور کیا جائے، 'احکام طعام اہل کتاب' (احادیث اور آیات قرآنی سے سید احمد نے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے یہاں کھانا جائز ہے بشرطہ کہ وہ حرام چیزوں سے پاک ہو) اور تفسیر قرآن مجید اہم ہیں۔ انھوں نے سینئر نبوی پر خطبات بھی دیے اور وہ بیرون کی حمایت میں جو ارمضائیں بھی لکھے۔ انھوں نے مذہبی کئی کے اختلافات کو بھی اس طرح ختم کیا کہ دونوں کو اپنی تعلیمی تحریک میں شامل کر لیا۔

جوں کہ مسلمان زمانہ جدید کی جدوجہد سے نا آشنا تھے اور سید احمد ہر طرح کی یورش کو ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے اس لیے

انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکا۔ ان کے خلاف مولویوں کی جانب سے فتوے کا ایک مجموعہ 'نصرت الہیہ' منظرِ عام پر آیا جو اس کے ذریعے
یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مولویوں کے ساتھ مل کر کام کرنا اور کانگریس میں شامل ہونا جائز نہیں ہے۔ ان دنوں سید احمد کا سہ ماہیوں کو سیاست سے علاوہ
رکھنا تو درمیان میں ان کے اندر بڑے بڑے مسائل سرایت کر چکے تھے۔ سید احمد بہت زیادہ متاثر تھے اس لیے یوں ہوا کہ مسٹر بیک کی حکمت عملی
سے سید احمد ہندوؤں کی ذہنی طور پر دور ہو گئے۔

سید احمد رضا کی انگریزی تعلیم، ان کی تہذیب سے متعلق تحریک، ان کی مخالفت میں قدامت پرست مسلمانوں اور مولوی ملاؤں کی جانب
سے کئی اخبار اور رسالے جاری ہوئے۔ سید احمد کو کافر، ملحد، نیچری اور کرکشان کہا گیا اور ان کے ساتھیوں کو بھی بدنام کیا گیا۔ ملا نا الطاف حسین حالی
کی مخالفت میں کوئی خالی سنا کوئی ڈھالی، اکبر الہ آبادی تو زندگی بھر دیکھنے سے پہلے۔ اکثر مولویوں نے سید احمد کے خلاف فتوے دیے۔ علی بخش نام کے ایک
مولوی نے تو علمائے دین سے موت لانے کے لیے سفر حج کا قصد کیا اور کئے سے سید احمد کے خلاف فتوے لکرائے۔

مگر آج تاریخ یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ سید احمد رضا سے زیادہ ہوش مند، درد مند، دراندیش، علی اور صاحب بصیرت مسلمان آج تک
ہندستان میں پیدا نہیں ہوا۔ آج ہندستان میں مسلمانوں کو جو عزت حاصل ہے وہ انہی کی دلائی ہوئی ہے۔ مولانا آزاد ان کو بڑا عظیم کہہ رہے تھے۔
سرکاری ملازمت کا پابندیوں کے باوجود ان کے ہاتھوں عظیم شان کام انجام پائے اور خوبی یہ تھی کہ سرکار اور رعایا دونوں پر ان کی عظمت کا یکساں
سکھٹھا ہوا تھا۔ ان کی غیر معمولی عقل کی اتنی دھاک بیٹھ چکی تھی کہ ان کی زندگی میں یہ خواہ عام تھی کہ سرکار نے ان کا سر خرید لیا ہے اور ان کے انتقال کے
بعد مل جراحی سدا ان کی عقل مندی کی وجہ معلوم کی جائے گی۔

سید احمد رضا تیراکی اور تیر اندازی سے واقف تھے۔ شرنکار تھے مگر اتنی تخلص تھا۔

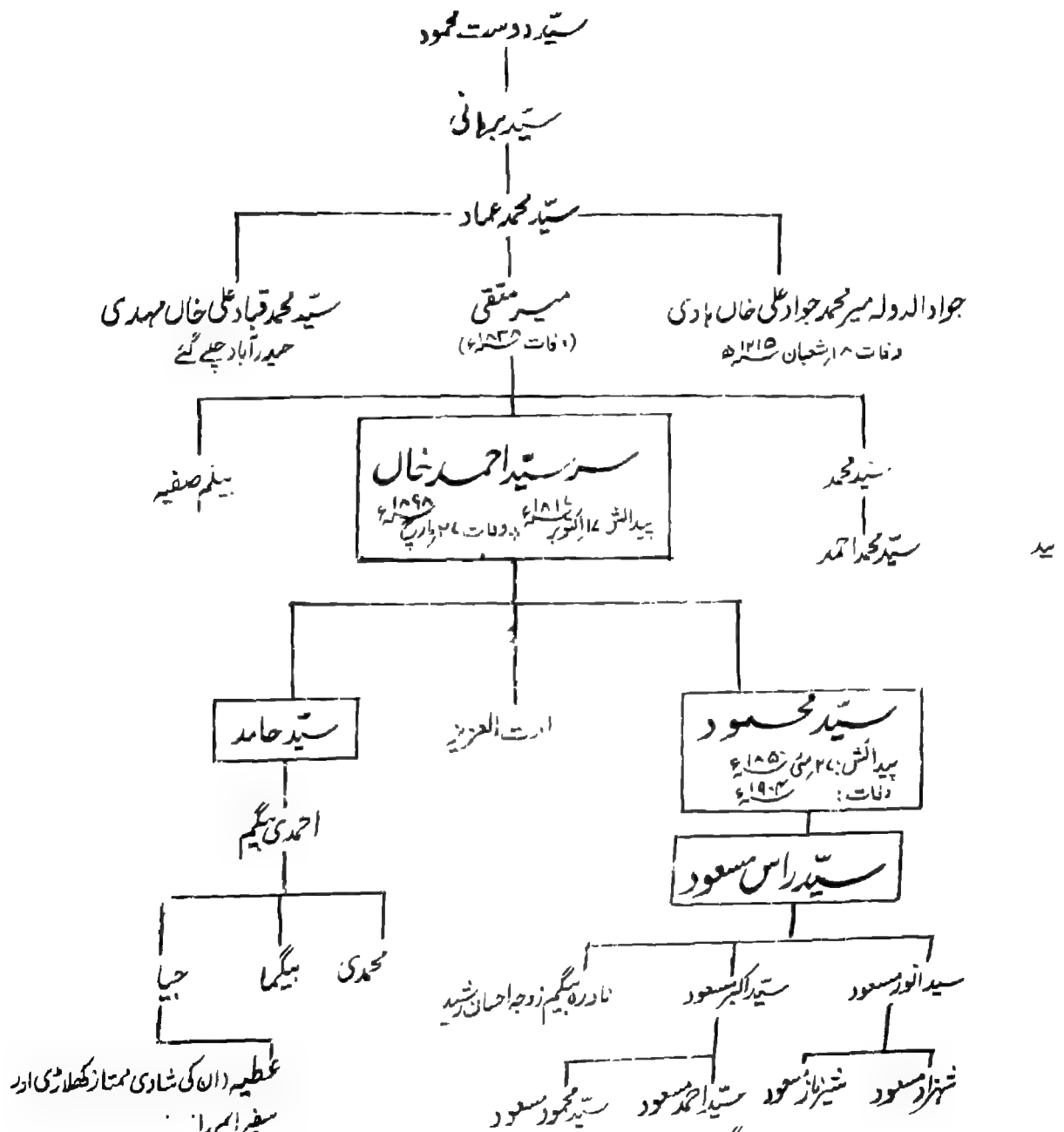
کالہ میں ایک لاکھ ۷۰ ہزار روپے کے عین اور اپنے بیٹے محمود سے اختلاف کے نتیجے میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر بے گھر ہو جانے کے صدمے سے
سید احمد کا پیشاب بند ہو گیا اور آخر 2 مارچ ۱۸98ء کی شب میں سوچے بچار انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کے لیے ان کے ملازم کے پاس چند روپے
بھی نہ تھے۔ نوآبادی کے مالک نے یہ کہہ کر کفن کے لئے 50 روپے دیے: 'یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے پھر کچھ چندہ مانگتے آدیں گے'۔
سربراہ بھی ایک انسان نہیں تھے، ایک تحریک تھے، انھوں نے کالج ہی نہیں بنایا بلکہ ایک قوم بنائی۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ مذہب کا رواجی
نمود مسلمانوں کو بے رمے اور بے تقاضے سے ہم آہنگ ہونے سے روکتا ہے اس لیے انھوں نے عقیدے کی خالیوں اور عقل کی خالیوں کو داغ کیا۔ انھوں
نے تعلیم، رمان، علم و ادب، صحافت، مذہب و سیاست بلکہ زندگی کے ہر حصے کو جدید نظر سے دیکھا۔ وہ مذہب اور دنیاوی معاملات کو دو الگ الگ
چیزیں تصور کرتے تھے۔ ان کو کئی دینی بنیادوں کی رو سے ملت کا سب سے بڑا ملحد، کافر، زندیق اور نیچری کہا گیا اور ایک فتوے کے ذریعے تو بیک
کہہ دیا گیا: 'نہ نو! اس نیچری کے بنائے ہوئے ادارے کو سہارا نہ دے، مگر جواب میں سر سید نے کہا: 'دوستو! میں نے مانا کہ میں کافر ہوں
لیکن کیا تم ایک کافر کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اپنی قوم کی خدمت کرے؟ دراصل مسلمانوں کا درد ان کی سرشت میں اس طرح
جاگزیں تھا جس طرح فولاد میں جوہر۔ اور ان کے مخالف بزدل و پست ہمت، تنگ دل، درنگ نظر تھے۔ سر سید کسی مولوی یا کسی اکبر الہ آبادی کی
سمجھ میں آنے والی چیزیں نہ تھے۔ انھوں نے مخالفت طعن و تشنہ، لغت ملامت، بہتان، الزام، بدنامی و رسوائی برداشت کی اور استقلال اور
عالی حوصلگی کے ساتھ اپنے نیک خیال و عمل پر جبرے رہے اور جو سوچا تھا وہ کر دکھایا۔ یہ ان کے قلب کی وسعت تھی کہ انھوں نے اپنے مخالف مسلمانوں
کو معاف کر دیا۔ وہ پہلو دار شخصیت کے حامل تھے۔ زبردست عزم، استقلال، بے لوث خدمت، انہماک، ایثار، خلوص، ضبط و تحمل،
اخلاقی جرات، کامیابی، خیر و شر شناسی، صداقت، دیانت داری، رواداری، انصاف پسندی، دہم ریزی ان کے اوصاف حمیدہ تھے۔ انھوں
نے ہمیشہ ذاتی غرض پر قوی مفاد کو ترجیح دی۔ وہ غیر متعصب تھے ان کا کہنا تھا: 'میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی دو آنکھوں کے
سمجھتا ہوں!'

سرٹید نے 65 کنالیں تالیف، ترتیب اور تصنیف کیں۔ اگرچہ وہ تعلیم کے زبردست حامی تھے مگر تعلیم پر تربیت کو ترجیح دیتے تھے انھوں نے جو کچھ کہا اور کیا وہ اُن کے اپنے دد کے لیے تھا مگر آج کے حالات میں اُن کے پیام کی اہمیت اور ضرورت کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے۔

ایک جوتے کہستاں کی موجِ رواں

- 17 اکتوبر 1817ء دہلی میں سرٹید کی پیدائش تعلیم و تربیت والدہ، ناننا خاجہ فرید الدین اور شاہ غلام علی کی نگرانی میں ہوئی۔
- 1838ء دہلی کی عدالت میں ملازم ہوئے۔
- 1839ء اگرے میں نائب منشی کے عہدے پر تقرر ہوا۔
- 1841ء بین پوری میں منصف مقرر ہوئے۔
- 1842ء فتح پور سکری تبادلو ہوا۔ اسی برس دہلی کے بادشاہ نے جواد اور عارت جنگ کا خطاب عطا کیا۔
- 1855ء بجنور میں صدر امین مقرر ہوئے۔
- 1858ء مراد آباد میں صدر صدر مقرر ہوئے۔
- 1859ء مدر میں انگریزوں کے خلاف حصہ لینے والوں کی جگہ غلام منضبطہ کے کمیشن میں ممبر نام زد ہوئے۔ مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔
- 1862ء غازی پور تبادلو ہوا۔
- 1864ء غازی پور میں سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی۔ ایک انگریزی اسکول کی بنیاد رکھی۔ علی گڑھ تبادلو ہوا۔ برتانیہ کی رائل ایشیائٹک سوسائٹی کے اعزاز کی نمبر منتخب ہوئے۔
- 1866ء برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ اخبار سائنٹی فک سوسائٹی کا علی گڑھ سے اجرا کیا۔
- 1867ء علی گڑھ سے بنارس تبادلو ہوا۔ بنارس میں ہومیو پیتھک دس ہسپتال قائم کی۔ اندھ ہومیو پیتھک کے طریق علاج کی ترقی کے لیے ایک کمیٹی قائم کی۔
- 1869ء بنارس سے انگلستان گئے۔
- 1870ء لندن سے واپسی، رسالہ "تہذیب اخلاق" کا اجراء، کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی تشکیل کی۔
- 1872ء کمیٹی خزینہ البضائع کی تشکیل۔
- 1873ء علی گڑھ کالج کے قیام کی اسکیم پیش کی۔
- 1875ء علی گڑھ کالج (ایم۔ اے۔ او۔ کالج) کا قیام۔
- 1876ء ملازمت سے پیشینہ لے لی۔
- 1877ء علی گڑھ میں لارڈ الٹن سے ایم۔ اے۔ ماد کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا۔
- 1878ء وائس رے کے بحسب لیٹور کونسل کے ممبر نام زد ہوئے۔
- 1879ء چیپک کا قانون پاس کروایا۔
- 1883ء محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔
- 1886ء مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔
- 1887ء سول سروس کمیشن کے ممبر نام زد ہوئے۔
- 1888ء پیٹر بانک ایسوسی ایشن قائم کی۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔
- 1892ء ایڈمنسٹریوٹی ورسٹی سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزاز ڈگری ملی۔
- 1898ء 19 مارچ کو انشی ٹیوٹ گزٹ میں اردو کی محنت میں ادارہ لکھا۔ اردو کی وکالت میں یہ اُن کی آخری تحریر تھی۔
- 27 مارچ کو وفات پائی اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔

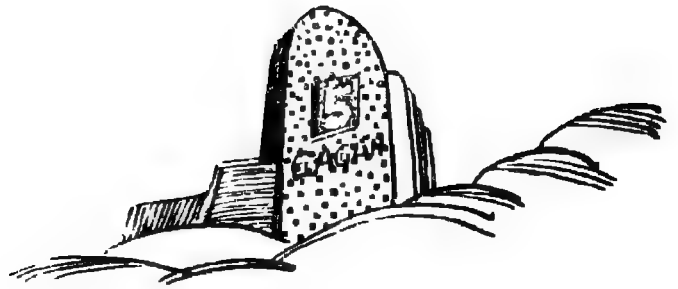
نسب نامہ سید احمد خاں مرحوم



جب سید پیدا ہوئے اور دادا نے گود میں لے کر اپنے بے رنگے پوتے کی سبلی بار دیا تو خوشی سے بولے: بوا آج سیدوں کے گود
در حقیقت سید کی شخصیت میں جانوں کی بہت سی صفات تھیں۔ بھاری بھر کم ڈیل ڈول، بات دار آواز،
بچہ، قول کے سچے، کام کے پکے، مقاصد کے حصول کے لیے وہ مثبت بند جسے دھن و لگن کہا جاتا ہے، کھرے انسان و



نستکین را
 ہر جواب چراغِ راہ ہے منزل نہیں
 - جیوتی -



ہندوستانی مسلمان ہمارے ہی جسم کا ایک حصہ ہیں

اُن کے سلامتی ہمارے فلاح ہے

ہمیشہ

میری نیک تمناؤں اُن کے ساتھ ہیں

وَلَا مَأْثَدَ مُسَاكِرٍ

فلم ساز، ہدایت کار و مصنف

○ مولانا موملے جو بھی بولے سنے ہے اس کے اسباب بتائیے؟

پہلی بات تو یہ کہ ۹ ویں صدی عیسوی میں ملابار کے علاقے میں جو مسلمان عرب اگر لے وہ مولانا کہلائے۔ یہ ابتدا ہی سے تجارت پیشہ اور زراعت پیشہ ہیں۔ جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو مولانا نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلے میں کانگریسی ہند بھی ان کے ساتھ تھے۔ انگریز حکومت نے اس تحریک کو دبانے کے لئے دفعہ ۱۱۲ کا استعمال کیا۔ تحریک کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ تحریک کے خلاف عام مولانا رضا کاروں نے مظاہرہ کیا۔ پولیس نے انھیں زبردستی کو بکیرا مولانا کے دوسرے سیاسی لیڈر اور ان کے مذہبی پیشوا متھل کو بھی گرفتار کر لیا گیا یہی سب بل کہ جیل میں بھی قیدیوں کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر جب مولانا نے ایک جلسہ کی صورت میں اپنے لیڈروں کی رہائی پر زور دیا تو فوج نے ان پر گولی چلا دی جس کے نتیجے میں چار سو مولانا مارے گئے۔ انھوں نے بڑے لیے نارگور کو جذبہ دینا چاہی تو تار بابو نے تار دینے سے انکار کر دیا اس پر مولانا مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے تار کاٹ ڈالے، بیڑیاں اٹھا کر دیں، کئی سرکاری افسروں کو قتل کر دیا، جیلوں سے اپنے بہت سے قیدی چھڑائے، بازار جلا ڈالے، سرکاری دفاتروں کو کافی نقصان پہنچایا۔ اس جنگ کا سبب دہلی وارن رنگ بھی لگتا کر لیا۔ ہندوؤں کی اٹالک کو بھی نقصان پہنچا۔ مولانا مارشل لا قائم کر دیا۔ حکومت کی جانب سے خوب خوب ظلم ڈھایا گیا۔ ہزاروں مولانا کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ہزاروں پر مقتعات قائم کر دیئے گئے۔ اسی سلسلے میں ایک بار ایک سو اشخاص کو مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بھر کر ایک جیل سے دوسری جیل منتقل کیا گیا تو راستے میں ۶۵ اشخاص کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گئے۔ غرض کہ یہ جنگ عام بہت دن چلے اور ان جنگوں کو ختم کرنے میں انگریز حکومت کے ۵۵ لاکھ روپے صرف ہوئے۔

○ کتاب 'رنگیلار سول' کا مصنف کون تھا؟

نگل کا سردار اٹی صلیب

اور اس کتاب عربیہ ماہیوں دیا گیا تھا۔ اس کتاب کو ایک پنجابی نوجوان راج پال نے شائع کیا تھا اور شاید وہ اس کا مصنف تھا۔ راج پال ہندی ہفت روزہ 'دھرم دیگ' کے ایک سابق ایڈیٹر تھے پال کا داماد تھا۔ دراصل اس کتاب میں قصیدہ حضرت مہی صاحب کی توہین کی گئی تھی۔ مگر گاندھی جی وہ پہلے شخص تھے کہ جنھوں نے اپنے اخبار 'ہینگ انڈیا' کے ذریعے اس کتاب کو ایک بڑی اور قابلِ مسموع کتاب قرار دیا۔ انہی کی تحریک پر حکومت نے راج پال کے خلاف مقدمہ چلایا۔ عدالت سے اسے سزا ہوئی مگر اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کی اور وہ بری ہو گیا۔ اس پر مسلمان بہت مشتعل ہوئے اور آخر علم ادین نام کے ایک مسلمان نے راج پال کو قتل کر دیا۔ علم ادین کو غازی کہا گیا۔ حکومت کی جانب سے علم ادین پر قتل کا مقدمہ دائر ہوا۔ مسٹر جناح نے عدالت میں علم ادین کی (محنتانہ کس) رکالت کی مگر علم ادین مقدمہ ہار گیا اور اس کو پھانسی ہو گئی اور پھر اس کو غازی علم ادین شہید کے نام سے یاد کیا گیا۔

○ مغل بادشاہ اکبر کا دراصل مذہب کیا تھا؟

اکبر کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مولوی ملاؤں کی دنیا داری، جاہ پستی اور ریاکاری کی بنا پر ان سے انتہائی طور پر بدظن ہو چکا تھا اور وہ ملاؤں کی تالی ہوئی یہ بات ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا کہ 'صرف اسلام ہی ذریعہ نجات ہے' اکبر اس حقیقت پر یقین رکھتا تھا کہ سارے مذہبوں کے بانیوں نے لوگوں کو نیک راہ پر لانا چاہیے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق نیکی و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے اصول بنائے اور اپنے وقت کے انسانوں کو ان پر چلنے کی تلقین کی۔ اکبر خود سارے عالم کا رب مانتا تھا۔ اسی لئے اس کا کہنا تھا کہ اگر دنیا کی ساری سچائی ایک ہی مذہب کے حجرے میں بند ہوتی اور وہی خدا کو لیند ہوتی تو وہ اسی مذہب کو دنیا میں باقی رکھتا اور باقی دوسرے سارے مذہبوں کو مٹا دالتا۔

مگر ظاہر ہے کہ خدا نے ایسا نہیں کیا اس لئے اس کا ایک مذہب نہیں بل کہ سارے مذہب اُسی نے ہیں۔ اسی لیے اکبر نے یہ خاطر بھی نہیں کی کہ دنیا کے سب انسان مسلمان ہو جائیں۔ چون کہ اُس نے شریعتِ مولوی ملاؤں کو نہ خد مند لکایا اور نہ ان کو اپنی رعایا سے زیادہ میل جول بڑھانے دیا اس لیے مولوی ملا اکبر کو آج تک بدنام کرتے ہیں سب سے زیادہ حاسدا در شفیق اکبر کا درباری ملا بدایونی تھا جس نے اپنی رقابت کی بنیاد ابو فضل اور فیرو کو بدنام کیا اور ان کے ساتھ اکبر کو بھی۔

○ لاڈلی سلیمہ کون تھیں ؟

شیخ مبارک (ابو فضل اور فیرو کے باپ) کے آٹھ بیٹے تھے اور چار بیٹیاں جو تھیں بیٹی لاڈلی سلیمہ تھیں شیخ سلیمہ جنتی کے پوتے اسلام خاں سے بیاہی تھیں جب جہاں گیر تخت نشین ہوا تو اُس نے اسلام خاں کو پنج ہزاری کا منصب دے کر بہار کا مولیٰ دار بنادیا۔

○ مسٹر محمد علی جناح کے نام میں جو یہ لفظ جناح ہے اس کے کیا معانی ہیں ؟

در اصل لفظ 'جناح'، تو بے معانی لفظ ہے۔ ویسے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس لفظ کو ان کے نام سے کیا تعلق تھا اس سلسلے میں آغا شورش کشمیری کا کہنا یہ ہے کہ 'جینا' گجراتی زبان میں دیلے جیسے کہتے ہیں۔ نجیعت اور کم زور ہونے کی بنا پر مسٹر محمد علی کو بچپن میں 'جینا' کہا گیا جو کچھ دن بعد مرنے لگا۔ 'جناح'، بن گیا مگر حاجہ حسن نظامی نے ایک بار لکھا تھا کہ 'ذوال جناح' (حضرت امام حسن کے گھوڑے کی موت) کی منت ماننے پر مسٹر محمد علی پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کے نام کے ساتھ لفظ 'جناح' لگا دیا گیا۔ چنانچہ 'جناح'، نہ لقب ہے، نہ کسبت، نہ کوئی آئی انک نہ آل بس ایک مرادی نام ہے۔

○ اگرچہ والدین، جمع کا صیغہ ہے مگر علی گڑھ یونیورسٹی میں عمومن واحد کے مفہوم میں بولتے ہیں۔ وجہ ؟

ہمیں مسلمانوں کی مسلمان سہی

ترک مولات تحریک کے دنوں میں، قومی لیڈروں کے کہنے پر جب علی گڑھ کالج کے طلبا کالج چھوڑنے لگے تو کالج کے استادوں نے ان کو روکنے کی خاطر ان کے والدین کو اطلاع دی۔ یہ خبر سارے کالج میں پھیل گئی کہ کالج کی جانب سے، والدین کو بلا جا رہا ہے اور جب کسی طالب علم کے والد یا لڑکی سر پرست علی گڑھ پہنچتے تو طالب علم اُس میں ذکر کرتے کہ ظالم طالب علم کے والدین آئے ہیں۔ مغلوں کے شاہی خاندان میں بھی بادشاہ اور ولی عہد کے سوا جو بھی بھائی بند ہوتے تھے ان کو 'سلطانین' کہا جاتا تھا۔ اور مد یہ کہ خان دان کے ایک خرد کو بھی (سلطان نہیں) سلطان ہی کہتے تھے۔

○ کیا جذبہ وطنیت کا ہونا بہت ضروری ہے ؟

یقین بہت ضروری ہے۔ اور ہندوستانیوں میں ہی جذبہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ دراصل ہندوستانیوں کو اپنے ہندوستانی ہونے کا احساس ہی بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی نے اپنوں سے اکثر غداری کی ہے اور باہر سے آنے والوں کا ساتھ دیا ہے اور ان کے غلام بن گئے ہیں۔ اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کی ہی صورت ہو سکتی ہے کہ وطنیت کا جذبہ اہل ہند میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ اس کا ثبوت یہ ملتا ہے جب کہ ایک فرد اپنے مفاد کو قوم کے مفاد پر قربان کر دے۔ بات کو سمجھنے کے لئے پڑوسی ملک افغانستان کا نام لیا جاسکتا ہے۔ انگریزوں کی اس پرستیا اور سمجھنے، وہ بار اُس پر قبضہ بھی کر لیا مگر پٹھانوں کی غیرت اور جذبہ وطنیت نے جوش مارا اور دونوں پارا انگریز کو نکال باہر کیا۔ ہندوستانیوں کے لیے جذبہ وطنیت اور متحدہ قومیت ہی وہ فارمولہ ہے جس کو اپنا کر وہ ایک خوش حال قوم بن سکتے ہیں اور ان کی آزادی ہمیشہ برقرار رہ سکتی ہے۔

○ لفظ 'طفیلی' لفظ ہے یا اصطلاح ؟ اس کی اصل کیا ہے ؟

نغوی اعتبار سے تو 'طفیل' کے معانی ذریعہ۔ وسیلہ ہیں۔

کے ہیں، اسی اعتبار سے دوسروں کے طفیل میں گزارہ کرنے والے کو طفیلی، یا طفیلیا کہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ کوئی شخص ایک شخص تھا جس کا نام طفیل تھا۔ وہ شادی بیاہ کی تقریبوں میں اور کھانے پینے کی دعوتوں میں طلبہ بغیر ہی پہنچ جاتا تھا۔ چونکہ عربی زبان میں 'عرس' شادی یا خوشی کے مجمع کو کہتے ہیں۔ اس لئے طفیل اپنے شہر کے لوگوں میں 'طفیل آل عراس' کے لقب سے مشہور ہو گیا اور یہ بات اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ شخص مدعو نہ ہوئے پر بھی دعوت میں پہنچ جاتا ہے اس کو طفیلی کہتے ہیں۔

○ غالب اور اقبال کا کلام سمجھنے میں وقت بیکش آتی ہے، انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کی شرح کیوں نہ شائع کی؟

ڈاکٹر ذاکر حسین جب جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر تھے اور ان دنوں اقبال بھی زندہ تھے تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک بار اقبال سے درخواست کی تھی کہ وہ چند دن کے لئے جامعہ آئیں اور جامعہ کے طالب علموں کو اپنی مثنوی کا درس دیں اور اپنی مثنوی کے ذریعے انھوں نے قوم کے لئے جو پیغام دیا ہے وہ سمجھائیں۔ اقبال نے جواب میں لکھا کہ اس طرح ان کی مثنوی کے معانی و مطلب، ایک طے شدہ صورت اور رد بدلے والی شکل اختیار کر لیں گے اور ان کے کلام کے سلسلے میں یہ بات مناسب نہیں۔

○ سر سید احمد خاں کے ساتھی 'محسن الملک' کا اصلی نام کیا تھا؟

مہدی علی۔ وہ سر سید کے بڑے گہرے اور اولین رفیقوں میں سے تھے۔ سر سید کے انتقال کے بعد وہی علی گڑھ کالج کے سیکریٹری بنے۔ 9 دسمبر 1837ء کو اٹارو میں پیدا ہوئے اور 16 اکتوبر 1907ء کو شمال میں ان کا انتقال ہوا۔

○ جمہوریت اور اشتراکیت کا فرق بتائیے اور جمہوریت اشتراکیت میں کب بدلتی ہے یہ بھی بتائیے؟

جمہوریت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ عوام کی حکومت، عوام کے

واسطے اور عوام ہی کے ذریعے۔ جمہوریت میں ہر فرد کو آزادی اور مساوات حاصل ہوتی ہے اور بالعموم کے ووٹ سے چنے ہوئے نمائندے حکومت کا کام سنبھالتے ہیں۔ اگرچہ جمہوری نظام میں مساوات کا حق تو ملا ہوتا ہے مگر عموماً ہر فرد کو مساوی موقعے میسر نہیں آتے۔ نتیجے میں مقررے سے لوگوں کے پاس زیادہ دولت پہنچ جاتی ہے اور بہت سے لوگوں کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو پاتیں۔ انسان کی وہ خد غرضی جو جمہوری نظام کو ناکام بناتی ہے اس کے توڑنے کے لئے اشتراکیت پیدا ہو جاتی ہے جو محنت کشوں کے حقوق کی قانونی طور پر حفاظت کرتی ہے۔ اشتراکیت میں انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے، اگر جمہوری حکومتوں اور مذہبی پیشواؤں نے سامراجی پالیسی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت اختیار نہ کی ہوتی اور انسانیت کا احترام کیا ہوتا تو اشتراکیت جنم نہ لیتی۔

○ کیا شاعر کے لیے بدحواس یا مجنون ہونا لازمی ہے؟

اُردو شاعری کے لیے بدحواس ہونا ضروری یا لازم تو نہیں مگر شعرا کی دانشگری کوئی نئی بات بھی نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ذوق پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ صرف تہہ بند پہنے ہوئے ننگے بدن گھومتے گھومتے شاہی قلعے تک پہنچ گئے۔ دربان نے ٹوکا تو چونکے مگر کسی کی طرح بادشاہ کو خبر ہو گئی انھوں نے اُسی حالت میں ذوق کو طلب کر لیا، اشعار سنے اور پھر خلعتِ فاحرہ عطا فرما کر رخصت کیا۔ موسیٰ بھی جب گھر سے باہر قدم رکھتے تو ایک آدھ شالگرہ سا کھد ہونا۔ موسیٰ کو جھوٹے ہوئے چلنے کی عادت تھی، شاگرد احتیاط رکھنا کہ اس نے کسی گاڑی کی زد میں نہ آجائیں۔ غالب اپنے نئے شعر کے کیفیت میں بے اختیار ہو کر اپنے بالا خانے سے دیوان خانے میں اتر آتے تھے جہاں محلے بھر کے بے فکرے چوسر کھیلتے رہتے تھے۔ غالب ان کو اپنے چند نئے شعر سناتے، داد دیتے، خوش ہو کر مٹائی پان اور حقے سے ان کی تواضع کرتے۔ بعض اوقات ایسا بھی

ہوتا کہ دیوان خانے میں کوئی نہ ہوتا مگر غالب نے سینے سے نیچے
اگر کہتے، "تو بھی سزا کی مسنون بات آیا ہے!" اور
پھر شعر پڑھتے، مطمئن ہوتے اور واپس لینے والا خانے پر چلے
جاتے۔

○ مغل بادشاہوں میں کون کون امر دیرست
تھا ؟

مغل بادشاہوں میں بہتر منسل طور پر امر دیرست تھا جس لڑکے
ہودہ عاشق تھا اُس کی خدمت میں اُس نے بہت سے شعر بھیجے تھے
اور اُس لڑکے ہی کی بنا پر باری پٹی بیوی نے بابر سے علاحدگی حاصل
کر لی تھی۔ ایک واقعہ سے یہ اچلتا ہے کہ جہاں گیر بھی اس مذاق کا
انسان تھا رحیم دلوں جال کی رولی بہت تھا شاہی واقعہ تو یہ ایک
غائب رول کے کوئے کہ کھجور لیا جہاں گیر کی پیر سے درباروں نے
انعام کیا کہ وہ لڑکا جہاں گیر کا بھی سامان لکھ تھا۔ پٹان چہ جہاں گیر
نے حکم دیا کہ دونوں کو کھڑا کر لیا جائے۔ کسی مندر دور سے دونوں کو
گرفتار کر کے حاضر کیا گیا جہاں گیر نے اپنی نظروں کے سامنے دونوں
کی زندہ حالت میں کھال کھینچوادی جب اکبر کو یہ خبر ملی تو غائب
گیا اور کہنے لگا: "اللہ! اللہ! شیخو جی، ہم تو کبریٰ کی بھی کھال
اُترتے نہیں دیکھ سکتے، تم نے یہ سنگ دلی کہاں سے سیکھی!"۔

○ مسٹر جناح قائد اعظم کیسے بنے ؟

یہ بات یقین کے ساتھ کہ نہیں بتائی جاسکتی کہ وہ "قائد اعظم"
کیسے بنے مگر اس سلسلے میں مسٹر جناح کی نام نہاد کوئی لہجہ بدیہی یہ بات
زیادہ شہور ہے کہ سب سے پہلے گاندھی جی نے اپنے ایک خط میں
مسٹر جناح کو "قائد اعظم" لکھ کر مخاطب کیا تھا، لیکن یہ بات
بھی کہی جاتی ہے کہ فیروز الدین احمد نام کا ایک جو شیلہ پنجابی
نوجوان تھا جس نے پٹنا کے مسلم لیگ کے اجلاس میں سب سے
پہلے "قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد" کا نعروں لگایا تھا۔

○ 1857ء کے غدر میں جو لوگ انگریزوں
کے خلاف لڑے اُن کو تلنگے اور انگریز فوجیوں کو

خاکی کیوں کہا گیا ؟

خیال ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے
انقلابیوں کا سردار تلنگا نہ (دکن) کا رہنے والا تھا وہ ایسے سارے
انقلابی اودھ اور روہیل کھنڈ (اتر پردیش) سے تعلق رکھتے
تھے، اودھ کے رہنے والوں کو پوریہ بھی کہتے تھے۔ انگریز فوجیوں
کو خاکی اس لئے کہا جاتا تھا کہ اُن کی دردی کارنگ خاکی ہوتا

○ دکن میں مسلم بادشاہت کی بنیاد کب
پڑی ؟

سب سے پہلا مسلم حملہ 1296ء میں دیوگری پر ہوا۔ جو
مہاراجہ اُدین فوجی کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس حملے میں یاروراجا کی
بے بہ دولت چٹائی نے کوئی لیکن دکن میں مسلم بادشاہت کی بنیاد
1347ء میں پڑی اور ظفر خان، علاؤ الدین حسن بہمن شاہ کا
اقب اختیار کر کے حکومت کرنے لگا۔ اور سینی خان دان کا بانی
کہلایا۔

○ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ڈاک بھینچنے
کا کیا طریقہ تھا ؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آج سے چار پانچ سو برس پہلے
عوام زیادہ باخبر رہنا ضروری نہ سمجھتے تھے آپس کے رشتے دار
قریب ہی قریب کی بستیوں میں رہتے تھے۔ بڑے لوگوں یا شاہی
عہدے داروں کی خبر رسائی کے لئے ذرائع تھے۔ پھر بھی شیشہ
سوری کے عہد سے ڈاک کا سلسلہ شروع ہوا جو مغلوں کے زمانے
میں کافی ترقی پایا۔ ڈاک دو طرح کی تھی، گھوڑے کی ڈاک جو اطلاق
کہلاتی تھی۔ یہ شاہی ڈاک تھی۔ ہر چار میل کے فاصلے پر گھوڑے بدل
دیے جاتے تھے۔ عوام کی ڈاک "پیدل" بھیجی جاتی تھی۔ ایک
میل میں تین چوکیاں ہوتی تھیں۔ ہر چوکی پر ہر کارے کر کے تیار
بیٹھے رہتے تھے۔ ڈاک لے کر دوڑنے والے ہر کارے کے مات
میں مڑوی کا ایک ڈنڈا ہوتا تھا جس کی موٹھ پر گھونگر و بندھے
ہوتے تھے۔ جیسے ہی آنے والے ہر کارے کے گھونگر وڈوں کی آواز

آتی چوکی پر بیٹھا ہوا ہر کارہ مستعد ہو جاتا اور آنے والے ہر کارے سے ڈاک کا ٹھیلہ لے کر آگے کی سمت میں دوڑتے ہوئے روانہ ہو جاتا اور اسی طرح ڈاک کا ٹھیلہ ایک ہر کارے سے دوسرے تک پہنچتا اور آخر ڈاک اپنی منزل پر پہنچ جاتی۔ بتایا جاتا ہے کہ احمد آباد سے دہلی تک ڈاک کے پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ 12 دن اور کم سے کم ایک ہفتہ لگتا تھا۔ اگر ڈاک دیر سے پہنچتی تو ہر کاروں سے جواب طلب ہوتا اور ان کا جرم ثابت ہونے پر ان کی تھانہ کا کچھ حصہ کاٹ لیا جاتا۔

○ شکرانہ کس قسم کے کھانے کو کہتے ہیں؟
شکرانہ کے معانی تو احسان یا شکر ہے کہ میں یا کسی کام کے بدلے میں کچھ دینے کو شکرانہ کہتے ہیں۔ آپ کی مراد دراصل شکرانے سے ہے۔ خشکے (اُبلے ہوئے پھلے چاول) پر شکر اور گھی ڈال کر جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو شکرانا کہتے ہیں۔ گاؤں میں رہنے والے لوگ شادی بیاہ کے موقع پر جب برادری کو کھانے کی دعوت دیتے تھے تو کھانے میں شکرانا ہی ہوتا تھا۔ اب تو حالات نے بات کو بدل دیا ہے مگر پہلے یہ شکرانا میزبان کے لیے اکثر تباہ کن ثابت ہوتا تھا یعنی مہمانوں کے سامنے رکھی ہوئی ڈھوبریوں (مٹی کی رکابیاں) میں پہلے خشک ڈالا جاتا، اس پر شکر یا کھانڈ چھڑکی جاتی اور پھر مٹی کے ٹوٹے دار لوٹوں سے دسی گھی ڈالتے اور تب تک ڈالتے رہتے جب تک کہ مہمان منع نہ کر دیتا۔ بعض حاسد مہمان برادری میں میزبان کے بے عزتی کرنے کی غرض سے اپنی ڈھوبریوں میں سوراج کر لیتے، میزبان لوٹے کی ٹوٹنی سے گھی ڈالے جاتا مگر نہ ڈھوبری بھرتی اور نہ مہمان انکار کرتا۔ میزبان اپنی آن کی خاطر اپنا مات نہ روکتا اور نتیجے میں گھی کے کنستر کے کنستر بہا دیئے جاتے۔ دراصل یہ جاگیردارانہ نظام ہی کا کھوٹ تھا جو انسان کو کم تری کے احساس میں مبتلا کرتا تھا اور چھوٹی شان سے رہنا سکھاتا تھا۔

○ کارل مارکس نے کیا پیش گوئی کی تھی۔ کیا وہ سچ ثابت ہوئی؟

مارکس نے جمہوریت کا انتہائی عالمانہ و مفکرانہ تجربہ کرنے کے بعد جمہوریت کے ناقص دور کرنے کی کوشش کی۔ اُس کی کوشش کا جو موثر نتیجہ نکلا وہ سوشلزم کا نظریہ تھا۔ مارکس نے اپنی مشہور تصنیف کمیونیٹل (Communist) کے ذریعے جو پیش گوئی کی وہ یہ ہے کہ مشینوں کے عام استعمال سے انسانی سماج میں دو طبقے پیدا ہوں گے۔ ایک مزدور کا دور سرمایہ دار کا۔ مزدوروں کی محنت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر سرمایہ دار زیادہ اہل سرمایہ اور زیادہ طاقت دار اور بارشور بننے جائیں گے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دن تک قائم نہیں رہے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ محنت کش طبقہ متحد ہو کر سرمایہ دار طبقے کے ہات سے دولت چھین لے گا اور اس دولت کو سماج کی ملکیت قرار دے گا۔ کارل مارکس اقتصادیات کا پیغمبر تھا اُس کی پیش گوئی روز بروز صحیح ثابت ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی صرف نصف صدی گزری ہے اور ایک تہائی دنیا پر محنت کشوں کا راج قائم ہو چکا ہے وہ دن دور نہیں جب ساری دنیا محنت کشوں ہی کی ہوگی۔

○ مغل بیگمات میں سلیمہ بیگم کون تھیں؟
ہالیوں کی سگی بہن گل رخ بیگم کی بیٹی سلیمہ سلطان بیگم تھیں یعنی یہ ہالیوں کی بھانجی اور اکبر کی چھوٹی زاد بہن ہوئیں۔ ہالیوں کی تجویز پر اکبر نے سلیمہ بیگم کی شادی بیرم خان سے کر دی۔ شادی کے وقت سلیمہ بیگم کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ دراصل اس شادی سے بیرم خان کا مغلیہ سلطنت سے رشتہ مضبوط کرنا مقصود تھا۔ سلیمہ بیگم بڑھی نکھی تھیں، مطالعے کا شوق تھا، سخن فہم تھیں اور سخن شناس بھی۔ فارسی میں شعر بھی کہتی تھیں۔ خانہ دان کے مسائل حل کرنے میں اُن سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اکبر کی چھوٹی گل بدن بیگم کے ہمراہ حج کو گئی تھیں اور چار حج کرنے کے بعد واپس ہوئی تھیں 60 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

○ دہلی کی تشریح کیجئے؟

در اصل یہ بہت حد تک مذہبی اور کسی حد تک سماجی اصلاحی تحریک ہے جو کبھی عرب کے علاقے نجد میں شیخ محمد بن عبد الوہاب نام کے ایک عالم نے شروع کی تھی۔ شیخ محمد مدینے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہم سہمی بھی تھے۔ انھوں نے عرب میں بدعتوں اور مشرکانہ رسموں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں دو مقابل حکومتوں میں سے انھوں نے سعودی حکومت کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ عسکری تعاون کی بنا پر اس تحریک میں خاصی طاقت پیدا ہو گئی۔ شیخ محمد کے انتقال کے بعد سعودی حکمرانوں نے اس تحریک کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ آگے بڑھایا۔ حجاز اور ترکی کے تحت تھا جب سعودی حکومت کے قبضے میں آیا تو سعودی حکومت نے اپنی اسی تحریک کے تحت قرآن و سنت کی روشنی میں پختہ مزار اور دوسلوں کو مسمار کر دیا اور ترکی رسموں کو بھی ختم کر دیا۔ اس سعودی اقدام میں بیشتر دھڑ بڑھتی مگر قرآن و حدیث کو روکنے کے اقدام غلط نہیں تھا۔ جوں کہ مہر کا محمد علی خد ختم رہنا چاہتا تھا اس لئے وہ ترکی کا ہم نوا و معاون بن گیا، ترکی حجاز پر دوبارہ قبضہ کرنا چاہتا تھا اور انگریز ہندوستان کے ساتھ ساتھ لبرہ اور بحرین کے علاقے بھی اپنے تحت رکھنا چاہتے تھے۔ رخصت تو سیاسی تھی مگر ان تینوں قوتوں نے مل کر دنیا میں وہابی تحریک کو بدنام کیا اور سعودی فوج پر چڑھائی کر کے حجاز پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یعنی سیاسی مقصد براری کے لئے وہابیوں پر چھوٹے الزام لگا گئے۔ ان کو بزرگوں کا دشمن اور رسول کا مخالف مشہور کرنے کی کوشش کی گئی۔ جب کہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ بھول، ناتجربہ، جاؤ تو الیٰ، ہندو، عیسائی، نڈر، میلاد اور ایسے ہی دوسرے رسم و رواج کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ رسوم بھی ہو سکتے ہیں یا ہندوستانی۔ ہندوستان میں جو مسلمان علماء ان رسوم کو اسلامی عقیدے کے تحت انجام دیتے ہیں اور دہواتے ہیں۔ وہ کتاب و سنت پر عمل کرنے والوں کو وہابی، نجدی، کافر، بے دین اور ملحد و غیرہ کہتے ہیں۔ ہندوستان کا ادغام پرست اور بدعتی مونی اپنے روایتی رسوم اپنی دکان داری کے تحت برقرار رکھے ہوئے ہے اور ترکی، مصر اور انگریز اپنی سیاست اور جذبہ ملک گیری کی

جنگ کا ہندوستانی مسلمان جسیر

خاطر ان بدعتی رسوم کی دکالت کرتے تھے۔

○ چند قریبے اور اچھے شعریاں ہے؟

یہ شعر سنیا اور یہ بھی سنئے کہ یہ شعر اکبر آبادی کے استاد وحید اکبر آبادی کا ہے۔

پڑے میں صورت نقش قدم نہ چھیرا ہمیں

ہم اور خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے

ایک بہت پرانا شعر ہے جو اب ادا امام اثر کا ہے۔

آنکھ والا ترے جوں کا تماشا کیجئے دیدہ کو رو کیا آنے نظر کیا دیکھے

یہ شعر بھی پرانا ہے اور مشہور ہے اور حلیں کی غزل کا شعر ہے۔

دیکھا جو حسن یا ربیعت محل گئی آنکھوں کا تھا تصویر چری دل پہ چل گئی

خارجہ مجذوب کی غزل کا یہ مقطع پرانا بھی ہے اور اچھا بھی ہے۔

قدر مجذوب کی خاصان خدا سے پوچھو

شہرت عام تو اک طرح کی رسوائی ہے

پچاس برس پہلے جگر مراد آبادی کی نعت کا یہ شعر بھی بہت مقبول ہوا تھا۔

میرے بولا بولا مودینے جیسے علم ہجر تو بے گانہ جیسے مجھے

لطیف بدایونی کا یہ شعر بھی پرانے شعروں میں سے ہے اور اچھا بھی

زندہ ہے۔

تو وہ میر غلبي ہے اے جلوۂ جانا

ہر نکل ہے ترا بلبل ہر شمع ہے پروانہ

لاہری پرشاد بسین شہید (جن کو کاکوری ڈکیتی کیس میں پھانسی دی گئی) کی غزل کے یہ دو شعر تو غیر فانی ہیں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

وقت آنے لے دکھا دیں گے تجھے اے آسمان

ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

اگرچہ یہ نظم (بولیں اماں محمد علی کی) بہت ہی مشہور و مقبول رہی ہے

مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس نظم کے خالق مزار طاہر مراد آبادی تھے۔

○ کیا ہندی ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے؟

ہندی اکثریت کی زبان تو نہیں ہے مگر 40 فی صدی ہندوستانی عوام کی مادری زبان ضرور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ 35 فی صدی لوگ ہندی بول سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں چنانچہ لہجہ چوڑا زبانیں 60 فی صدی لوگوں میں بولی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی کو قومی زبان قرار دینا حق بجانب سمجھا گیا۔

○ کیا آپ یہ حقیقت تسلیم نہیں کریں گے کہ مسلمانوں ہی نے دنیا کو پہننا اور پھننا، اکھٹا بیٹھنا اور زندگی گزارنے کے اچھے طریقے سکھائے ہیں؟

جی یہ بات میں بالکل تسلیم نہیں کروں گا بل کہ آپ کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ ہم سب دنیا والے ایک دوسرے کو بہت کچھ سیکھاتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں! ابھی تک آپ نے اپنے فرقہ پرست اور متعصب اخبارات و رسائل میں تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ سہ آئیے میں آپ کو اس تصویر کا دوسرا رخ دکھاؤں۔ بانی اسلام حضرت محمدؐ نے جنگ کے دنوں میں خندق کھودنا (مسلمان فارسی کے توسط سے) ایران سے سیکھا۔

پاجامہ بھی ایران ہی سے عرب میں پہنچا، عربی لفظ 'سروال' شلوار ہی سے بنا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چاہا تھا کہ باجائے ذرا لیے ایرانی تہذیب کو عرب میں نہ آنے دیں مگر جو چیز رواج پا چکی تھی وہ اُس کو نہ روک سکے حدیث ہے کہ وہ لمبی ٹوپی (برنس) جو عیسائی پہنتے تھے حضرت عمرؓ کو اچھی معلوم ہوئی اور وہ خد پہننے لگے۔ عرب میں تابوت کا رواج نہیں تھا مگر حضرت زینبؓ کے انتقال کے وقت حضرت عمرؓ نے اپنی اس فکر کا اظہار کیا کہ جنازے کے سلسلے میں (خصوصی طور پر عورت کے جنازے کے سلسلے میں) مکمل پردہ کیسے ہو۔ اسماءؓ نے ملک حبش کا حوالہ دیتے ہوئے تابوت کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ اسماءؓ کے بتائے ہوئے نمونے پر حضرت عمرؓ نے تابوت تیار کرایا۔ ایران، روم اور یونان میں جب مسلمان پہنچے تو ان کے پہنے اور اچھے سمجھنے بیٹھنے غرضہ کہ زندگی گزارنے کے بہت سے طریقوں میں تبدیلی آگئی۔ ان ملکوں کی عورتوں سے مسلمانوں نے جب شاہیاں کیں تو انھوں نے ان ملکوں کے مخصوص کھانے بھی کھانا شروع کر دیے۔ حضرت محمدؐ سے حضرت ابو بکرؓ تک مسلمان دفتری نظام

کنکس کا ہندوستانی مسلمان معجز

یابیت مال کے حساب کتاب سے بالکل ناواقف تھے حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انھیں محاطات کی ترتیب دتدوین میں وقت پیش آئی۔ وہ صحابہ جو روم میں فوج سے متعلق دفتری نظام دیکھ آئے تھے انھوں نے حضرت عمرؓ سے اپنا مشاہدہ بیان کیا۔ چنانچہ ان صحابہ ہی کے مشورے پر روم کے دفاتروں کے نمونے پر حضرت عمرؓ نے بھی اپنا حساب کتاب رکھنا شروع کیا۔ ایران اور یونان ہی کی دیکھا دیکھی مسلمان خلیفہ اؤں نے پوس کورواج دیا، عدالتیں قائم کیں اور اپنی حدود سلطنت کو صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کیا۔ طب کی ابتدا بھی (قبل مسیح) یونان ہی میں ہوئی تھی جس کو بعد میں مسلمانوں نے اپنایا اور ایسی بہت سی باتیں۔

○ پرانی کتابوں میں 'ساداتِ بارہمہ' کا ذکر اکثر آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

ریاست اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر میں ایک علاقہ ہے جو بارہ گاؤں پر مشتمل ہے۔ ان میں سادات کی آبادی ہے۔ اس آبادی کے سید اپنی بہادری اور اپنے نسب کے صحیح ہونے کی بنا پر ہمیشہ مشہور رہتے ہیں۔ ضلعوں کی فوج میں رہ کر انھوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں اور بلند مرتبے اور منصب پائے ہیں۔ سید محمود کو اکبرؓ نے چار ہزاری منصب عطا کیا تھا۔ سید قائم بارہمہ، سید عبدال مطلب بارہمہ اور سید عبداللہ ظاں بارہمہ میدان جنگ میں ایسی بے جاگری اور دلیری سے لڑتے تھے کہ ان بہادری ضربِ مثل بن گئی تھی۔

○ شمالی ہند کی اکثر بستیوں میں 'چھٹڑیوں' کا میلہ لگتا ہے۔ چھٹڑیوں کو بعض ہندو اتنی میلہ کہتے ہیں اور بعض مسکرمیو ہار۔ حقیقت کیا ہے؟

اس سلسلے میں ایک بار حضرت خاجہ حسن ثانی نظامی کی ایک تحریر نظر سے گزری تھی۔ اُس سے اندازہ ہوا تھا کہ اس بات کی ابتدا تو ہندوؤں ہی نے کی تھی بعد میں اس کو مسلمانوں نے بھی اپنا لیا۔ دراصل ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی کسی پوٹر

استحان کی یا تر کو جاتا تو مدت میں ایک تھنڈی لے کر گھر سے نکل پڑتا۔ وہ تھنڈی اس بات کی علامت ہوتی کہ وہ یا تر کو جاتا ہے جو ہم سفر وہم نہ مل جاتا چاہے وہ ساتھ ہوئے۔ لوگ آتے ساتھ ہو جاتے اور اس طرح ایک قافلہ بن جاتا۔ یا تریوں کا یہ قافلہ جس بستی سے گزرتا اس بستی کے لوگ ان کی بڑی خاطر تواضع کرتے۔ ایک بستی کے لوگ دوسری بستی کے لوگوں کی خبر سے بھی واقف ہو جاتے اور دوسری بستی والوں کو اپنے حال حال سے بھی باخبر کر دیتے۔ سفر کی تکلیفیں ان دنوں اگرچہ کافی تھیں مگر سب یا تری مل جل کر ان تکلیفوں کو منہسی خشی برداشت کر لیتے اور آخر اپنے استحان پر پہنچ جاتے۔ زیارت کو جانے والے مسلمانوں نے بھی اسی طریقے کو اپنا لیا۔ ان کی سب سے بڑی زیارت گاہ حضرت خاجہ معین اودین چشتی اجمیری کی تھی۔ مسلمان زائرین جب اجمیر جاتے تو اپنی اپنی بستی سے ہات میں جھوٹا سا جھنڈا لے کر نکلتے اور دراصل اس جھنڈے کی کو خاجہ کی چھڑی کہتے تھے۔ ایک مقررہ دن ساری بستیوں کی چھڑیاں دلی میں جمع ہو جاتیں اور پھر خاجہ اجمیری کے جانشین قطب صاحب کے مزار پر سیلتا اور میلے کے بعد ساری چھڑیاں ایک بڑے جھنڈے کی قیادت میں اجمیر کے سفر پر روانہ ہو جاتیں۔

○ مولانا شہید کت علی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

مہر صوفی میری رائے یہ تھی کہ اس جھنڈے کے لوگوں نے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں دی۔ منجی کے روزنامہ 'اجلی' کے ایڈیٹر جناب معین اودین حارث نے مولانا شوکت علی کی لغت میں اکثر کھلبے، حافظ علی بہادر خاں تو اپنے اخبار 'ہلال' کے ذریعے بڑے سو فیادہ انداز میں ان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ 'آل ہلال' کے ایڈیٹر احسن مراد آبادی ہمیشہ مولانا شوکت علی کی بنا سٹیو لیڈری کا مذاق اڑاتے رہے۔ انگریزی روزنامے 'پاسپ' کرائی کل کے بانی مولانا ایڈیٹر عبداللہ بریلوی نے مولانا شوکت علی کے مباحثوں پر یہ کہہ کر انہیں کرایا کی مخالفت کی کہ مزاحیہ کالم میں سر سید نے مولانا شوکت علی کا اکثر مذاق بنایا کرتے تھے۔

ہنگامہ ملت اسلامیہ

لاہور کے 'زمین دار' اخبار میں تو مولانا ظفر علی شوکت علی کی ایڈیٹری پر طنز آمیز لکھیں کھا کرتے تھے۔ لاہور کے روزنامے 'الغلاب' میں سالک اور تھر اپنے اداروں میں ان پر زبردست حملے کرتے تھے۔ روزنامہ 'سیاست' لاہور کے ایڈیٹر سید حبیب بھی شوکت صاحب پر اکثر نشانے بازی کرتے تھے۔ لکھنؤ کے روزنامے 'ہم دم' جس کے مدیر عبداللہ خاں کسمندوی تھے نے بھی مولانا شوکت علی کے تعلق کبھی اچھی رائے نہیں دی۔ کلکتے کے روزنامہ 'ہند' کے ایڈیٹر مولانا عبداللہ آق سلیم آبادی بھی مجلس خلافت اور مولانا شوکت علی پر سخت تنقید کرتے تھے۔ دہلی کا روزنامہ 'آل جمہیت' (ان دنوں جس کے ایڈیٹر ہلال احمد زبیری تھے) بھی ان کی غلط بات پر نکتہ چینی کے بغیر نہیں رہتا تھا۔ خاجہ حسن نظامی بھی مولانا شوکت علی کی خوب خوب خبر لیتے تھے۔ قاضی عبدالغفار خاں نے اپنے اخبار 'پیام' (حیدر آباد) کے مزاحیہ کالم 'سرسراہے' میں بڑے دل چسپ انداز میں ان کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ 'تیج' 'غلاب' اور 'میر تاب' تو واضح طور پر مولانا شوکت علی کے مخالف تھے۔ حدیہ کیو فی منش اور فقیر صفت انسان سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار خاں بھی اپنی 'آپ جی' میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ 'شہرت علی کوئی اچھے آدمی نہیں تھے مگر ان کا محمد علی پر بڑا اثر تھا وہ کبھی کبھار محمد علی کو غلط راستے پر چلا دیا کرتے تھے'۔ اگر مولانا شوکت علی کو کسی نے اچھا کہا ہے تو صرف جناب رئیس 'جمہوری' نے۔ دراصل جعفری صاحب نے ان کو اچھا نہیں کہا بل کہ حق تک ادا کیا ہے۔ جعفری صاحب بھی 'خلافت' اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا شوکت علی کی اس ہندوستان گیر مخالفت کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک انتہائی غیر قلمی، جذباتی، جو شیلے، غیر سیاست دان اور ابنِ وقت قسم کے مسلم لیگی ذہنیت کے لیڈر تھے۔ قوم کے نام پر، سمجھوتے وقت میں بہت زیادہ جذبہ جمع کر کے اس کو پیغمبر کہہ دینے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ آغا خاں، جبار جاکشمیر اور یمنی کے کروڑ پتی بیٹے سر سیدان قاسم تھا ان کی بددشمنی فرماتے

تھے۔ انتہایہ کہ جن دنوں شاہ افغانستان بمبئی کی راہ سے یورپ جا رہے تھے مولانا شوکت علی نے اُن کی شان میں سپاس نامہ پیش کر کے اور انھیں خوش کر کے ایک خاصی رقم اُن سے بھی لے لی۔ مولانا شوکت علی چندہ وصول کرنے کے سلسلے میں انسانیت سے اس حد تک گر جاتے تھے کہ ایک بار انھوں نے 'دو شنبہ فند' شروع کیا اور اس کا پروپیگنڈا خصوصی طور پر تعلیمی اداروں میں کیا گیا۔ اسکیم یہ تھی کہ ہم در در انِ خلافت ہر دو شنبے کو گوشت و عذیرہ کے بجائے صرف دال روٹی کھائیں۔ اس طرح جو پیسے بچیں وہ جمع کر کے خلافت فند کے نام بھیج دیے جائیں، دوسرے مکتبوں سے اور لکھنؤ کے ندوے سے بھی سو سو اسوروں پر ماہ وار آنے لگا یعنی مولانا شوکت علی نے اپنے مرغ مسلم کی خاطر قوم کو دال کھانے پر مجبور کر دیا۔

○ قصہ خوانی بازار کس واقعہ کی بنا پر مشہور ہے؟
بادشاہ خاں اور اُن کے خدائی خدمت گار سائقی، جنگ آزادی کے سلسلے میں جب ایک بار گرفتار ہوئے تو پشاور کے قصہ خوانی بازار میں عوام نے اظہارِ ناراضگی کی صورت میں ایک جلوس نکالا۔ عوام کے جذبات کو دبانے کے لیے سرکاری افسروں نے فوجی اگڑکاروں سے نہتے لوگوں کا مقابلہ کیا۔ اس پر ہندو، سکھ اور بھٹان ایک دوسرے سے کمرے کمرے کھڑے ہو کر آمیزش کا رویہ سائنے ایک دیوار بن گئے مگر ظالم انگریز کی اگڑکاری میں سرخ نشان آزادی کی دیوار کو ڈھاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں، کتنے ہی ہندوستانی کچلے گئے۔ اپنے ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر ایک نوجوان سے نرم گیا اور اس نے بڑھ کر ایک اگڑکار کو آگ لگا دی جس سے چار گورے جل کر مر گئے۔ فوج نے غضب ناک ہو کر اندھا دھند گولی باری شروع کر دی بہت سے لوگ مارے گئے۔ اسی دن پشاور کی چوک یادگار پر مظاہرین پر گڑھوالی فوج کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا تو اس نے گولی چلانے سے انکار کر کے اپنی حب وطنی کا ثبوت دیا۔ یہ عمل چکان واقعہ 3 مارچ 1930ء کو ہوا تھا۔

○ مولانا محمد علی جوہر کے جس شعر کا یہ مصرع ہے 'بڑھتا ہے اور ذوقِ اندیشیاں سزا کے بعد' وہ شعر لکھئے ؟
سنگن ہاں سہ سناں سناں سہ

جس شعر کا یہ مصرع ہے وہ مولانا جوہر کا نہیں بلکہ مولانا حالی کا ہے ۔

تقریرِ عشقِ جرمِ ہے بے صرغہ محاسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

مولانا جوہر کا شعر یہ ہے (یہ غزل جیل میں لکھی گئی تھی) ۔

لذت ہو زماںِ عشق میں نہیں آتا ہے لطیفِ جرمِ تناسزا کے بعد
○ مرزا غالب کی گرفتاری کا سبب کیا تھا ؟

مرزا غالب دراصل دوبار گرفتار ہوئے۔ وہ پہلے یہاں جُما کھلائے تھے۔ شاید نعل کی رقم بھی اُن کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ گرفتار ہوئے، ضمانت پر رہا ہوئے اور پھر اُن پر مقدمہ چلا۔ دوسری بار فدر (1857ء) کے دنوں میں جیل گوروں نے اُن کے گھر میں گھس کر کسی شنبہ کی بنا پر اُن کو گرفتار کر لیا اور کرنل برن کے سامنے اُن کو پیش کیا۔ اتفاق سے مرزا کے ایک دوست اُس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے سفارش کی اور مرزا کو رہائی ملی۔

○ دُشمن میں کوئی عورت ہو گزری ہے جو مصنوعی

پھول پتے بنانے میں ماہر تھی وہ کون تھی ؟

دہ عبد الرحیم خان خاناں کی بیٹی جانا بیگم تھی ۔ وہ کم عمری ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ شوہر کی موت کا غم اُس نے اس طرح منایا کہ اُس نے دیکھتے ہوئے انگاروں سے اپنے بدن کو کوئی جگہ سے داغ لیا۔ بیوہ ہونے کی صورت میں وہ آخر دم تک گاڑھے کے کپڑے پہنتی رہی ۔

جہاں گیر جب دکن کے دورے پر گیا تو جانا بیگم نے اُس کو اور

اُس کے درباریوں اور اس کے لشکریوں کو ایک بڑی تکلف و دعوت

طعام دی۔ اتفاق سے وہ موسمِ خزاں تھا۔ جانا بیگم نے مصوٰرے

اور پھول پتی بنانے والوں کی مدد سے درختوں کو کاغذ اور کپڑے

کے پتوں اور پھولوں سے سجایا۔ موسمِ ادھر کڑی کے پھل بڑا کر اُن

میں ٹانگ دئے اور رنگ درون سے اس طرح کام لیا کہ بغل

پر اصل کا لگان ہونے لگا۔ چنانچہ کھانے کے بعد جب جہاں گیر چل

قدمی کرنے لگا تو اس نے ہر پڑ کو سرسبز اور پھول دھندلے سے لہا ہوا

دیکھا، بڑا حیران ہوا۔ روکش پر چلے ہوئے جب ایک پھل توڑنے

کی کوشش کی تو بچا چلا کہ یہ سب تو باریک بینی سے بہت ہنسنا اور خوشی ہی

○ مولانا آزاد اور سرسید کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟

سید کی رائے سے زیادہ مولانا آزاد کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی کی رائے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ مولانا آزاد سے خد کیا کرتے تھے، ہندو ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے، ہمیں تو کسی علمی نائنس گماہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہئے؟ اسی طرح لاہور کے شیخ غلام محمد مالک انبار دہلیں، کانسر سید کے متعلق کہنا تھا، اگر نبوت ختم ہوئی ہوتی تو ان کا دماغ تو نبوت کا دماغ تھا۔ دراصل مولانا آزاد اور سرسید کی اتنی بڑھی ہوئی ذہانت ہی کی بنا پر مولوی ملا ان سے رقابت محسوس کرتے تھے اور اپنے حسد کی بنا پر مختلف پہلوؤں سے آزاد اور سرسید کو بدنام کرتے تھے۔

○ پہلا اردو اخبار کون سا تھا جو ٹائپ میں چھپا؟
مولا محمد علی کا مہم در، پہلا اردو روزنامہ تھا جو ٹائپ میں چھپا۔

○ انسان کی عمر پہلے زیادہ ہوتی تھی یا آج زیادہ ہوتی ہے ؟

مذہبی تصویق کی رو سے کھیلے زمانے میں انسان کی عمر زیادہ ہوتی تھی، وہ ہزار ہزار برس تک زندہ رہتا تھا۔ مگر سائنس دانوں کا اپنے سائنسی فکر اندازے کے تحت کہنا ہے کہ پہلے انسانی عمر کا اوسط صرف ۵۰ برس تھا چونکہ اس وقت کا انسان قدرتی آفات کا براہ راست مقابلہ کرتا تھا اور اس کے اپنے تحفظ کے لیے آج کے سے ذرا آگے اس کے پاس ہتھیار نہ تھے اس لیے اس کی جسمانی قوت کا کوئی جواز ختم ہو جاتا تھا۔ اور پھر وہ ان دلیوں میں یاروں کے علاج سے بھی ناواقف تھا۔ آج بعض ممالک میں تو انسانی عمر کا اوسط ستر برس ہے مگر انسان اس سے بھی زیادہ زندہ رہ سکتا ہے یعنی اس بات کا امکان ہے کہ مستقبل میں انسانی عمر کا اوسط ۱۰۰ برس ہو، زیادہ عمر پانے کے لیے

سچ کا ہندوستانی مددگار

انسان کا گہری اور پرسنل اندیشہ رہنا بہت ضروری ہے۔
○ نجیب الدولہ کا رد و سہیل کھنڈر سے کیا تعلق تھا ؟

مغلیہ حکومت کے زوال کے دنوں میں جو علاقے خد فخر ہو چکے تھے ان میں رد و سہیل کھنڈر کا علاقہ بھی تھا۔ نجیب الدولہ حاکم تھے اور قصبہ نجیب آباد جو انہی کے نام پر آباد ہوا تھا ان کا دار حکومت تھا۔ ان دنوں شمالی ہند کے لوہین میں نجیب الدولہ کو سیاسی اور دینی اعتبار سے ایک ممتاز مقام حاصل تھا اور وہ شاہ ولی اللہ سے بھی سلسلہ رکھتے تھے اور انہی کے شاہی پرانہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی تاکہ مراٹھوں کی برصغیر ہوئی طاقت ایک دم ٹوٹ جائے (اور یہ ان کی غلطی تھی) ○ علی برادران میں کوئی ایک احمدیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے یعنی قادیانی تھے ؟

علی برادران سے مراد ولایت شاہ کے علی اور مولانا محمد علی جانی ہیں ان دونوں نے نوناہ اپنی لودھی ہیں تھا البتہ ان کے تیسرے بھائی جو مالہن ان دونوں سے بڑے تھے وہ قادیانی نہیں تھے۔

○ مراد مانگنے یا سائنس دانے اور اس کے پورا ہونے کی نفسیات کیا ہے ؟

یہ بات بڑی عجیب ہے اور معلوم ہے، دھیان سے سنئے۔ مراد مانگنا یا سائنس دانے عوام کے اعتقاد سے تعلق رکھتا ہے اور عوام کے ذہن کو دلیل یا منطق سے چڑھتی ہے، عوام پر کامیاب سائنس دان کو اتنی فوری سہرت دے دیتے ہیں کہ اسی سلسلے کی بہت سی نا کام سائنس دان چونکہ کامیاب سائنس دانوں پر غالر نہیں آتے اس بات کی واضح طور پر اس طرح سمجھتے کہ ہندو کی فلمی دنیا میں ہر برس کم کم ڈیڑھ ایک ہزار فلموں کا مہوریت (پٹریٹ کے طور پر) نکھل کر جانے مارے لوازمات کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہر فلم کی اپنی فلمی کامیابی کے لیے اپنے طور پر کئی کئی مندرجہ ذیل یا کسی زرگاہ پر یا کسی پیر یا بابا کی خلا یا سائنس دان کی طرح یا مانتا ہے یا مانتا ہے، مانتا ہے، ایک یا انہی کے لیے سائنس دان کے چار مندرجہ ذیل میں جو باقی ہیں اور

چار سو فلیں جب ری لیز ہوتی ہیں تو ان میں مشکل سے پندرہ ایس
ہی فلیں مالی طور پر کام یاب ثابت ہوتی ہیں اور بقیہ فلوں میں
سے ہر ایک اپنے پر وڈیوسر کی تباہی کا باعث ثابت ہوتی ہے
یا اپنے ڈسٹری بیوٹر کا بے اثر غرق کر جاتی ہے لیکن چند فلموں کی
کام یابی کو مراد یا منت کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے اور بہت سی فلموں
کی ناکامی کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ اگر فلم کامیورٹ نہ بھی کیا جائے
اور مراد یا منت نہ بھی مانی جائے تب بھی کام یاب اور ناکام فلموں
کا تناسب وہی رہے گا قطع نظر اس حقیقت کے بات کا ایک
پہلو یہ بھی ہے کہ کم زور دل و دماغ ہی کے لوگ پیروں و سادھو
یا جو نشیوں سے رجوع ہوتے ہیں۔ وہ بڑے قوی اور یقینی جذبہ
اعتقاد کے ساتھ اپنا کام بن جانے کے لیے 'صاحب کرامات'
سے التجا کرتے ہیں اور 'صاحب کرامات' کے ہاں کہہ دینے پر
(الفحیائی طور پر) ان کے اندر ایک انتہائی قوی عزم اور کچھ کر گزرنے
کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے جذبے اور عزم کے نتیجے میں ہر کام سر
ہو جاتا یقینی ہے چنانچہ اپنی کام یابی کو وہ اپنی کوشش کا نتیجہ
نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اس بزرگ کی کرامت سمجھتے ہیں جس سے
وہ رجوع ہوئے تھے۔ ضد عین قلب و منصف ذہن کے ایسے رفیق
کے لیے درگاہیں اور آشرم دار شفا ثابت ہوتے ہیں اگر وہ وہاں نہ
جائیں تو اپنے دل و دماغ کی کم زوری کی بنا پر ان کو اس کام میں
کام یابی حاصل نہ ہو جو وہ انجام دینا چاہتے ہیں۔ ایک اور پہلو
یہ بھی ہے کہ ایسے ضعیف اعتقاد لوگوں کو جب کوئی بزرگ کوئی
مشورہ دیتا ہے یا نصیحت کرتا ہے یا کوئی ہدایت دیتا ہے تو یہ
خش اعتقاد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اس نصیحت پر عمل
کیا تو نصیحت کرنے والے کی کرامت سے ہمیں فتح و کام رانی نصیب
ہوگی۔ پھر قدرتی طور پر ان میں ایک زوردار قوت عمل پیدا
ہو جاتی ہے اور وہ ان کو کام یابی کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ لیکن
نا کام ہونے پر وہ اپنی ناکامی کی توجیہ کرتے خود مطمئن ہو جاتے
ہیں اور کسی قسم کی مراد یا منت۔ یا صاحب کرامت کی شہرت
نظمن اثر انداز نہیں ہوتی۔ اسی سلسلے میں ایک اور مولانا آزاد
نے ایک مثال دے کر بات کو یوں سمجھایا تھا: اگر سو بیارے عہد

کر لی کر دوا کریں گے اور صرف ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہیں گے
تو قدرتی طور پر یہی ہو گا کہ پچاس تو مہر جائیں گے اور پچاس خد بک
اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن کوئی اس کا تجربہ نہیں کرتا۔ اب اگر اراد
و اعتقاد کے ساتھ سو آدمی ایک درخت کے نیچے بیٹھیں اور اس
بات کو شہرت دی جائے تو وہی پچاس فی صدی کا نتیجہ ایک غیر
معمولی مجموعہ بن جائے گا۔ اور کام یاب ہونے والے لطف حقیقت
کے سامنے ناکام حصے کا کوئی ذکر نہ کرے گا، اس ساری بات
کا خلاصہ یہ ہے کہ مرادوں اور منتوں پر اعتقاد رکھنے کے لیے
انسان کے لیے کم زور دل و دماغ کا ہونا ضروری ہے۔

○ اسماعیل شہید کا شاہ ولی اللہ سے کیا
رشتہ تھا ؟

مولانا اسماعیل شہید حضرت شاہ عبدالغنی کے بیٹے تھے اور
شاہ عبدالغنی شاہ دلی اللہ کے بیٹے تھے یعنی مولانا اسماعیل
شاہ دلی اللہ کے پوتے تھے۔ ان میں اسلام کی تبلیغ کا بڑا
جوش تھا۔ انھوں نے شریک اور بدعت کے خلاف کئی کئی جنگیں
مولانا اسماعیل 69 67ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مولانا سید احمد
بریلوی کی قیادت میں سکندریہ کے خلاف جہاد کرتے ہوئے مئی
1831ء میں شہید ہوئے۔

○ قطب دینا کس نے بنوائی تھی ؟

کہتے ہیں جب سلطان قطب اُتھان ایک نے دہلی فتح کر لی تو
اظہار تشکر کے طور پر مسجد قوت اسلام، اور قطب دینار کی
تعمیر شروع کی۔ قطب اُتھان کے عہد میں دینار کے صرف نیچے کے
دو درجے بن پائے سلطان ال تمش نے اوپر کی باقی منزلیں
مکمل کرائیں اور مسجد میں بھی تین دروازوں کا اضافہ کیا۔ سرسید
نے اپنی تصنیف 'آثار اُمتنا دین' میں لکھا ہے کہ جسے قطب صاحب
کی لاٹ کہتے ہیں وہ مسجد قوت اسلام ہی کا ایک مینار ہے مگر
بعض مورخوں کا خیال ہے کہ قطب اُتھان نے یہ لاٹ الگ تعمیر
کیا اور اس کے لیے نام پر اس کا نام قطب دینار یا قطب صاحب
کی لاٹ پڑا۔ نام کے سلسلے میں بعض کا خیال ہے کہ قطب اُتھان
نے یہ مینار حضرت حاجی قطب اُتھان بختیار کاکی کی یاد میں بنوایا تھا

اس لئے اس مینار کو قطب مینار کہتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سلطان آل شمس کو اختیار کا کہ سے عقیدت تھی نہ کہ قطب آدین کو۔ مگر اس سبب سے اس ایک خیالی یہ بھی ہے کہ اس مقام کو مینار کا آخر یا کوٹا سمجھ لیا گیا تھا اس لئے اس رعایت سے اس مینار کا نام قطب کہلایا۔ دراصل پرانے زمانے میں یہ مینار بنوانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ شہر کا پہرہ دار مینار پر چڑھ کر گتے ہوئے دشمن کو پہلے سے اندیشہ اور اپنی فوج کو پہلے سے ہوشیار کر دے۔ پتہ میں کہ یہ دنیا کا خوب صورت ترین مینار ہے اور اپنے نقش و نگار اور بناوٹ کے اعتبار سے انہی کے مینار کے نام سے بھی بہتر ہے اور اونچا ہے اور اب اس کا شمار دنیا کے مشہور آثار قدیمہ میں ہوتا ہے۔

(۱) مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی کا میں منظر کیا ہے؟

بات تو طویل ہے مگر مختصر طور پر یہ عرض ہے کہ مولوی مدن کا مکمل نام سید شاہ مدن تھا وہ صحیحی نسب سید تھے۔ ہردوی (ضلع شاہ آباد۔ اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ وہ آدھ کے وزیر صفدر جنگ کے مشیر رہ چکے تھے، نکال کے دردی خاں اور شمس کے شجاع آدولہ کے بھی وہ صلاح کار رہے۔ اگر یہ بانی پتہ بی تیسری تاریخ (۱761ء) میں مراٹھے سے تاست لکھا چکے تھے مگر ۱77۰ء تک ان میں پھر جان آگئی تھی۔ چھوٹی موٹی جہیزوں اور لڑائیوں کے بعد جب مراٹھوں نے نجیب آباد (ضلع بجنور، اتر پردیش) کے نواب ضابطہ خاں اور ان کے بال بچوں کو قید کر لیا تو مراٹھوں کی شرط کے مطابق نواب شجاع آدولہ نے روہیل کھنڈ کے نواب حافظ رحمت خاں کی ضمانت پر چالیس لاکھ روپے کی ہنڈی لکھ کر مراٹھوں کے حوالے کر دی اور ضابطہ خاں کو رہائی دلا دی۔ لارڈ ہیسٹنگز کے اشارے پر مراٹھوں اور ضابطہ خاں نے شجاع آدولہ کو زیر کرنے کی سازش کی۔ چالیس لاکھ روپے کی وہ ہنڈی رحمت خاں کو دے دینے کا وعدہ کیا اور اس وعدے پر رحمت خاں کو بھی اپنے ساتھ لایا گیا۔ رحمت خاں نے شجاع آدولہ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ مجھے اس ہنڈی کے ضمانتی لوجھ یہ سبک

چھوڑ کر آؤ تو آپ کو رہائی دے دوں گا۔

دش کر دیں تو میں آپ کی حمایت کروں۔ شجاع آدولہ نے مولوی مدن کو اپنا قاصد بنا کر رحمت خاں کے پاس بھیجا اور رحمت خاں کی شرط مان کر اس سے مدد چاہی۔ ادھر شجاع آدولہ نے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے ماہ وار کے معاوضے پر انگریزوں سے فوجی امداد حاصل کی اور رحمت خاں شجاع آدولہ کی حمایت میں مراٹھوں کے مقابلے پر میدان جنگ میں آگیا اور نتیجے میں مراٹھوں کو ہار ہونا پڑا۔ بشرط کے بموجب رحمت خاں نے تمسک کی واپسی کے لئے خان محمد خاں اور عبداللہ کشمیری کو سفیر بنا کر شجاع آدولہ کے دربار میں بھیجا۔ اسی اتار میں شجاع آدولہ انگریزوں سے مل کر روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگا اور اس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ روہیل کھنڈ اور مراٹھے تو پہلے ہی سے ساز باز کر چکے تھے۔ چنانچہ شجاع آدولہ اپنے وعدے سے پھر گیا۔ رحمت خاں کے سفیروں نے کہا: 'وہ جو کہہ دیں گے ہم مان لیں گے'۔ چنانچہ شجاع آدولہ نے اپنے بھروسے دربار میں مولوی مدن کو رحمت خاں کے سفیروں کے سامنے طلب کیا اور آٹھ ماہ کر مولوی مدن سے دریافت کیا: 'کیوں شاہ صاحب، ہنڈی کے بارے میں آپ نے حافظ رحمت خاں سے کیا قول کیا تھا؟' قریب جیسے مولوی مدن کی بلند کرداری اتفاقاً پسندی جی کوئی اور جرات کے کہ انھوں نے واضح الفاظ میں فرمایا: 'میں نے آپ کے ارشاد کے بموجب نواب رحمت خاں سے لکھا وعدہ کر لیا تھا کہ ہنڈی انھیں واپس کر دی جائے گی؟' شجاع آدولہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور غضب ناک ہو کر بولا: 'تم نے سازش کی ہے میں نے ایسا وعدہ ہرگز نہیں کیا'۔ مگر مرد حق مولوی مدن نے تین بار یہی کہا: 'حضور نے ہنڈی کی واپسی کا اقرار واثق کیا تھا'۔ شجاع آدولہ نے روہیل کھنڈ پر انگریزوں سے مل کر تکرار کیا۔ کمرہ میران پور کے میدان میں نواب رحمت خاں شہید ہو گئے۔ سلطان خاں نامی ایک فوجی سردار نے جب رحمت خاں کا سر شجاع آدولہ کے سامنے پیش کیا تو وہ ایک جاگیر سے نوازا گیا۔ نواب ضابطہ خاں کو بھی وہ سر دیکھا گیا۔ سر دیکھ کر اس نے کہا: 'واقعی یہ سر حافظ رحمت خاں کا ہے کسی دوسرے کا نہیں'۔

جامع اودولہ کے ایک نمک خار نواب شہزادہ جنگ نے ہر دیکھ کر کہا: میں ریش فرش جناب عالی سے لڑنے کو آمادہ ہوں۔ تمہارے تھے؟ اور پھر ت خاں کا یہ سرمولوی مدین کو دکھایا گیا وہ سر دیکھتے ہی رو پڑے بدتے ہوئے کہنے لگے: ”ہاں! یہ اسی مسلمان کا سر ہے!“ دی من کو اپنی حق گوئی، بے باکی اور سچ بات کہنے کی سزایہ ملی شجاع اودولہ نے اُن کی ساری جائے دار، مکان اور سارا سازد مان ضبط کر لیا اور اُن کو قید میں ڈال دیا، جہاں وہ محنت مشقت پلٹے جھیلے اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے!

(انگریزوں کے زمانے میں کان پور کی مسجد کی ہادوت کا کیا واقعہ رونما ہوا تھا؟

۱۹۵۰ء میں یوپی کی انگریز حکومت نے یہ تجویز منظور کی کہ دکنر سے شہروں کی سڑکوں کو چوڑا کرنے کے ساتھ ساتھ کان پور شہر کے سڑکوں کو بھی وسیع کیا جائے۔ کان پور میں پھلی بازار کی مسجد بزرگ چوڑا کرنے میں مانع آئی۔ کان پور کے ضلع مجسٹریٹ نے چاہا کہ مسجد ایک حصہ منہدم کر دیا جائے۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا حکومت نے تجویز واپس لینے کے لئے تیار نہ تھی اور مسلمان مسجد کے تحفظ پر رستہ تھے یہ کشمکش کئی برس تک جاری رہی۔ گورنر سے بھی استدعا گئی۔ ضلع مجسٹریٹ جب ایک بار مسجد کے معاملے کے لئے تشریف لے تو وہ مسجد میں جوتے پہنے ہوئے داخل ہو گئے۔ اس پر مسلمان زیادہ ناراض ہوئے، بہر نوع احتجاج کی نوبت والٹس رائے تک بھی مگر نتیجہ لا حاصل رہا۔ اور پہلی جولائی ۱۹۵۳ء کو مسجد کا وہ مشرقی صحن جو ضلع پر مشتمل تھا حکومت پولی نے منہدم کر دیا۔ سارے ملک کے مسلمانوں نے غم منایا۔ چراگت کو مسلمانوں نے ایک احتجاجی لوس نکالا جس نے بولے کی صورت اختیار کر لی، پولس نے گولی چلائی ہتھکڑی مسلمان ہلاک ہوئے اور بہت سے گرفتار کیے گئے۔ سارے ملک میں جلسے ہوئے، ہلاک ہونے والوں کے پس ماندگان اور یتیموں کو جیماؤں تھے اُن کی قانونی پے روئی کے لئے جلد سے ہوئے۔ بااثر مسلمانوں نے اس میں حقہ لیا۔ اور آخر سرکار نے مقدمے واپس لے لئے اور وہ ۱۹۵۶ء میں جو سیٹیں سپرد تھے رہا کر دیے گئے۔

C کلکتہ میں جہاں واجد علی شاہ کو نظر بند رکھا

جنگر کامستانی مسلمان سپر

گیا اُسے مٹیائبرج کیوں کہا گیا؟

وہ مقام پہلے ہی سے مٹیائبرج کہلاتا تھا۔ کلکتہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر دریائے گنگا کے کنارے ایک علاقے تھا جس کو گارڈن بیج کہتے تھے۔ وہاں ایک مٹی کا تودہ مساتھا لوگ اس کو مٹیائبرج کہنے لگے۔ یہاں کئی بڑی اور شان دار کوٹھیاں واقع تھیں جب نواب واجد علی شاہ معزول ہو کر لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے تو انگریز حکومت نے دو کوٹھیاں نواب واجد علی شاہ کو دیں، ایک نواب خاص محل کے رہنے کے لیے دی اور ایک نواب کے خسر علی نقی خاں کو بخش دی گئی۔ چھ سات میل کا ایک بڑا قطعہ نواب کے ملازمین کے رہنے کے لیے دیا گیا۔ جو دو کوٹھیاں نواب کو دی گئی تھیں نواب نے اُن کے نام سلطانہ خانہ اور اسد منزل رکھے اور نواب خاص محل کی کوٹھی کا نام مرصع منزل رکھا گیا۔ چنانچہ وہ سارا علاقہ جس میں واجد علی شاہ، اُن کے ملازمین اور اُن کے رشتے داروں نے سکونت اختیار کی وہ مٹیائبرج ہی کہلایا۔

○ کیا یہ سچ ہے کہ مولانا عبدل ماجد دریا آبادی نے مولانا آزاد کو کبھی پسند نہیں کیا؟

مولانا دریا آبادی کی حیثیت ہی کیلئے ہے کہ وہ مولانا آزاد کو پسند کریں یا نہ کریں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مولانا آزاد ایک ڈارن قسم کے روشن خیال مولانا تھے۔ اُن کا ذہن کئی نہیں بل کہ کئی سو ذہنوں کا مجموعہ تھا وہ محض ایک سیاسی شخصیت نہ تھے بل کہ اُن کی ایک ذات میں کئی شخصیتیں جمع تھیں۔ چنانچہ بسم اللہ کے گنبد میں بند رہنے والے اکثر مولوی ملا مولانا آزاد کے سلسلے میں حسد و رقابت کا شکار رہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کو ہلکا کرنے والوں میں مولانا دریا آبادی ہمیشہ نمایاں رہے ہیں۔ انھیں جب بھی موقع ملا ہے انھوں نے جھکی لے ہے مگر وہ مولانا آزاد کی زندگی میں کچھ نہ کہہ سکے اُن کی موت کے بعد انھوں نے اُن کا کفن میلہ کوٹا شروع کیا اور مولانا آزاد کی اُچلی شخصیت پر اپنے نفس کا گود غبار ڈالنے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد پاکستان کے جلیشروں نے اُن کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن

کرنے والے، سحرے پائے جاتے ہیں۔

دوسرے مذہب کے واعظوں کی نسبت مسلمان داعظ زیادہ لطیف گو اور بزرگ سخن ہوتے ہیں۔

تیسرے ٹراور فلم کے مزاحیہ ایکٹروں میں بھی مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فحش کتابوں کے مصنفوں میں بھی مسلمان مصنف زیادہ ہیں۔

اردو شاعری میں مزاح (لمحی، ہزل، ریکی، سجو، بھستی، دھول و حیا وغیرہ) کا جتنا زیادہ عنصر پایا جاتا ہے شاید دنیا کی کسی دوسری زبان کی شاعری میں نہیں۔

وہ علاقے جہاں کبھی مسلمانوں کی حکومت رہی آج بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی یہ نسبت مزاح کے سلسلے میں زیادہ 'زرخیز' واقع ہوئے ہیں جیسے حیدرآباد۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ 'فصاحت، فصیلت اور خوبی' دیا یہ مکینہ خصلت مسلمانوں ہی کے حصے میں کیوں آئی؟ ایک سلسلے میں سرسید نے کہا تھا کہ نوال کے پرہیز قوم یا ہر فرقے کے فضائل مذاہل میں بدل جاتے ہیں اور ذوال پذیر فرقے کے عوام و خواص میں رفتہ رفتہ ساری سفلہ عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ سرسید نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا وہ درست ہے۔ اسلام سے قبل عرب میں بھی بھگت بن اپنی انتہا پر تھا۔ عرب عورتیں تک ایک دوسرے سے مسخر کرتی تھیں۔ وہ سب ایک دوسرے کو بے اور توہین آمیز ناموں سے مخاطب کرتے تھے۔ ان کے اکثر اشعار بجا آمیز ہوتے تھے۔ آخر حضر محمد کی تعلیم نے ان خرابیوں کو دور کیا۔ ہندوستان میں بھی مغلوں کی حکومت پر جیسے زوال آتا گیا مغلی حکمرانوں کے درباروں میں سحر بن بڑھتا گیا۔ محمد شاہ جو خان دان مغلیہ کے دور زوال سے تعلق رکھتا ہے ہر لمحہ عیش و عشرت میں مشغول رہتا اور دیارِ یو کے سحر بن سے دل بہلاتا، اپنے بادشاہ کی خوش نودی کے لیے اُس وقت کے اُمراء بھی اسی کے رنگ میں رنگے گئے اور وہ بھی لوہے جھونک جی میں مزالینے لگے، محمد شاہ کے درباریوں میں ایک امیر خا تھا جو بڑوں بڑوں کا مذاق اڑانے کی ہمت رکھتا تھا اور انتہائی بے باک اور حاضر جواب تھا اور حد یہ کہ بادشاہ محمد شاہ کے ساتھ بھی گستاخی سے پیش آنے لگا اور آخر بادشاہ ہی کے اشارے پر اپنے

شائع کیے اور جلد بازی میں کتابت و طباعت کے سلسلے میں انھوں نے کوئی احتیاط نہیں کیا، نہ بیروت ریڈنگ سوسائٹی اور نہ لیسٹونگ کرائی گئی، چنانچہ ایسے ایڈیشنوں میں ہر صفحے پر زبان دالے کی ایک دو غلطیاں پائی گئی۔ مسلم لیگی ذہن کے ادیبوں اور صحافیوں کو مولانا آزاد کے 'ایلا و انشا' کو غلط سمجھانے اور اُس کو درست کرنے کا خوب خوب موقع ملا اور یہ مولانا دریا آبادی کے لیے سنہری موقع تھا کہ انھوں نے پاکستانی قلم کاروں کی ایسی تنقیدوں کو خوب اُبھارا۔ 1951ء میں مولانا دریا آبادی نے مرزا یاس لگانہ جنگیزی جیسے عالم، باصلاحیت انسان اور صعب اول کے شاعر کی اہل کھٹو سے جو مدح و تنبیہ کی اُسی سے اُن کی شکر پسند طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بُرا اتفاق تھا کہ مولانا آزاد ایک قدر ناشائستہ فرقے میں پیدا ہوئے اُن کو خود بھی آخری دم تک یہ قلق رہا کہ وہ اس عہد و محل کے آدمی نہ تھے لیکن اس عہد و محل میں پیدا کر دیے گئے تھے۔

○ کیا یہ درست ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی فرقے کی یہ نسبت مسلمانوں میں ظرافت و مزاح (sence of humour) کا مادہ زیادہ ہے اور اسی طرح اردو زبان میں کسی بھی علاقائی زبان کی یہ نسبت مزاح کا عنصر نمایاں ہے؟

یہ نسبت زیادہ ہے بل کہ مسلمانوں میں ہنسی، چیل، دل لگی، شغول اور مسخر بنی اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ سب کچھ ایک 'قومی خصلت' بن گیا ہے اور یہ 'خوبی' یا 'خامی' اتنی عام ہو گئی ہے کہ اب اس پر کوئی غور بھی نہیں کرتا۔ زرا آپ تو غور کیجئے کہ

صلح بھگت بولنے والے اور بھیتیاں کسنے والے مسلم فرقے ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ گالیاں مسلم شریف زادے ہی کو یاد ہوتی ہیں۔ اخبارات و رسائل میں جو مزاحیہ جریدے ہیں وہ اردو زبان ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے اڈیٹر مسلمان ہی ہیں۔

مسلمان امیروں کے دیوان خانوں میں سب سے زیادہ دل خوش چٹکن کا ہندوستانی مسلمان بغیر

قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح نوربائی نام کی ایک طوائف بھی محمد شاہ کے دربار سے تعلق رکھتی تھی اور بھتیجی کسے میں مشہور تھی، غرض کہ نحوست اتنی بڑھی کہ نادر شاہ جیسا افغان گڈریس نے خلیفہ تيموریہ کے حکمران محمد شاہ کے دار حکومت دہلی پر حملہ کیا۔ دراصل جب قوم پر زوال آتا ہے تو اخلاق بگڑ جاتے ہیں، جو عاداتیں بُری عادتوں میں اور اچھی خصلتیں بُری خصلتوں سے بدل جاتی ہیں اور مزاج یا طوائف کو بُری ہی خصلت پرا جائے گا۔ اس بات سے اب یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ کسی قوم پر زوال کیوں آتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ انسان کی ہر نسل کی یہ خاصیت رہی ہے کہ جب کوئی دولت، سلطنت یا کسی قسم کی جائے دامن و محنت، مشقت اور کوشش کے بغیر اسے ہات آتی ہے اور اپنی بزرگی نسل کی نگرانی و سرپرستی اسے حاصل نہیں رہی ہے تو اس نے کبھی اس عطیے کی قدر نہیں کی اور جب سوائے کی نگہداشت نہیں ہوگی تو وہ ضائع ہونے لگے گا۔ سوائے کی نگرانی اور حفاظت کرنے کی صورت میں سوائے کے مالک کو مصروف رہنا پڑتا ہے اور نگرانی نہ کرنے کی حالت میں فرصت ہی فرصت ہوتی ہے اور فرصت میں دل بہلاوے کے لئے مقبول سوچتے ہیں۔ پھر تب ظاہر ہے کہ حُرّات بے شرمی میں بدل جاتی ہیں بہارِ بے رحمی کا روپ دھار لیتی ہے، خواہش ہوس بن جاتی ہے اور جو طلبہ تیس بیسے بند و حکمت سے آسودہ ہوا کرتی تھیں وہ ہزل اور فحش گوئی سے لگتی ہیں۔ اب اسی سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غریب و عسکرِ مسلم عوام میں کیسے پیدا ہوا؟ حکمران طبقے کا مزاج و مذاق عوام کو بھی متاثر کرتا ہے اور خصوصاً طور پر یہ فرقہ زیادہ متاثر ہوتا ہے کہ جس فرقے سے حکمران طبقہ تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ بادشاہ کے ہم مذہب فرقے ہی کو بادشاہ کی زیادہ قربت حاصل ہوتی ہے اسی کو دربار داری اور مصاحبت کے زیادہ موقعے ملتے ہیں۔ چنانچہ مسلم حکمرانوں کے گھٹیا مذاق سے بہ نسبت دوسروں کے مسلمان ہی زیادہ متاثر ہوئے اور اپنے مسلم حکمرانوں کی خوش نودی (انعام و اکرام کی طمع میں) کے لئے انھوں نے بھوکا گانے بجانے، ناچنے کودنے و اسوخت، مثنوی، قصیدہ، ہزل اور ہجو لکھنے، بھانڈ بنانے اور

مسخرہ میں کمال حاصل کیا۔ کسی قوم یا کسی فرقے پر ایک دن میں نواں نہیں آیا کرتا بلکہ مکمل تیزی کے لیے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور نگ زب کے عہد سے مسلم حکمرانوں کا وصال شروع ہوا۔ اور محمد شاہ رنگیلہ کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے واجہ راجی شاہ پر جا کر ختم ہوا چنانچہ اُس بے ہودگی کی ابتدا جسے انگریزی میں ہیومنر (Humour) کہتے ہیں نعمت خاں شیرازی عالمی سے ہوئی جو اورنگ زیب کا دروغہ مطبوع بھی لکھا اور صرف خاص کا دیوان بھی اور درباری ظریف بھی۔ محمد شاہ کا دربار تو مسخرہ اور اداش عورتوں سے بھرا ہوا تھا جن میں امیر خاں جسے گستاخ اور نوربائی جیسی طوائف کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور انھوں کے لوازمین کا تو سارا مذاق بھانڈوں، نقالوں، رنڈیوں اور ڈونڈیوں سے تعلق رکھتا تھا۔ رنڈیوں میں پیارو اور بھانڈوں میں تاجن، فاکم، داکم، راجی، راجو شاہ اور بی بی قدر کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ چنانچہ جسے آپ اور ہم مزاح کہتے ہیں وہ زوال پذیر معاشرے میں جنم لیتا ہے اور اس کا وجود، معاشرے کے لیے اور زیادہ زوال کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت محمد نے ہر وقت کے مزاح کو پسند نہیں فرمایا اور مسلمانوں کو طعن کرنے، بخش بکے، استہزا کرنے اور کسی کی ایسی نقل اتارنے سے کہ جس پر لوگ سہیں منع فرمایا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بھی لوگ صاحبِ مہبت اور صاحبِ وقار ہوتے تھے اور پسندیدہ و جائز مزاح کو بھی پسند فرماتے تھے چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ یہ کہہ کر حضرت علیؓ پر مسخرے ہوئے تھے: "اُن کے مزاج میں مزاج بہت ہے!"۔ خلفائے امویہ کے عہد تک عرب میں مزاح و طرائف بہت ہی کم رہی۔ اُس وقت کے ماں باپ اپنی اولاد کو مزاح سے اسی طرح روکتے تھے جس طرح دوسری برائیوں سے روکا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اردو زبان پر مسلمانوں کا قبضہ رہا ہے اور پھر اردو نے مسلمانوں کے ذریعہ انحطاط میں جنم لیا ہے اُس لئے اس زبان میں بھکڑ بن کا پایا جانا لازمی بات ہے۔ معترضہ طور پر یہ بھی عرض ہے کہ جو قوم اپنے مذہب سے پہچانی جاتی ہیں جیسے ہندو، مسلمان، پارسی، یہودی اور عیسائی وغیرہ اُن میں جو اچھی یا بُری

حاصلت ہوگی اُس کو عام خیال کے مطابق اُن کی مذہبی تعلیم کا نتیجہ سمجھا جائے گا۔ کسی قوم کی نیک خصلت اُس قوم کے مذہب کو بھی نیک نام بنادیتی ہے اور بری خصلت سے قوم بھی بدنام ہوتی ہے اور مذہب بھی رُسوا ہوتا ہے۔ معترضہ طور پر ایک بات اور سنئے بہت دن ہوئے کہ جب ایک انگریز نے اردو زبان کی ایک لغت انگریزی میں تیار کی۔ انگریزی زبان کے اقاد و زرائع اُس لغت پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراض کیا کہ اس سے پہلے فوربس اور شیکس پیئر نام کی جو اردو دکنشنریاں انگریزی میں تیار کی گئی تھیں یہ دکنشری اُن سے صرف اتنی بدلی ہوئی ہے کہ اس میں مرتبے وزراءوں کا لیا اور فحش محاوروں کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اس اعتراض کا جواب کتنی کے مرتب نے یہ دیا: "فوربس اور شیکس پیئر کی وہ دکنشریاں صرف اردو کی لغتیں ہیں اور میری یہ کتاب لغت بھی ہے اور اردو بولنے اور لکھنے والوں کی طبیعت کا آئینہ بھی ہے اس کتاب کے توسط سے یہ اردو دان فرقے کے اخلاق و خصوصیات کی پوری پوری ترجمانی کی ہے" یہ جواب دے کر اُس مرتب نے دراصل مسلمانوں کی بول چال اور عادات و خصلت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ان حقائق کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جب جاگیردارانہ نظام کے تحت کسی معاشرے کی حالت ابتر ہو جاتی ہے تو اس معاشرے کے لوگ بھی مذاق اور دل بھگی کی راہ سے فرما دیتا کرتے گئے ہیں۔

○ لکھنؤ شہر کب اور کیسے آباد ہوا اور یہ نام کیسے پڑا ؟

روایت اور قیاس سے کہا جاتا ہے کہ جب شری رام چندر جی اپنا بن باس پورا کرنے اور لٹکا فوج کرنے کے بعد راجدھیا واپس ہوئے تو انھوں نے یہ سرزمین اپنے رفیق دہم دہم درد بھائی پھن جی کو جاگیر کے طور پر عطا کر دی۔ انھوں نے گوئی کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ایک بستی بسائی اور ظاہر ہے کہ اُس بستی کا نام پھن پور یا لکھن پور مشہور ہو گیا اس سرزمین پر مسلمان گیا۔ دسویں صدی عیسوی سے آباد ہونا شروع ہوئے۔ ۱۵۵۰ء میں جب ہمایوں، شہر شاہ سوری سے جون پور کے مقام پر شکست کھا کر بھاگا تو اس نے تازہ دم ہونے کے لیے پھن پور

سنگن کا مہستانی سلطان شہر

ہی میں صرف چار گھنٹے قیام کیا۔ اتنے مختصر عرصے میں اس بستی کے لوگوں نے سیرابی کا اس طرح ثبوت دیا کہ وہ ہزاروں پے اور ۵ گھوڑے اُس کی نذر کئے۔ ۱۵۹۰ء میں مغل شاہ شاہ شاہ اکبر نے جب سارے ملک کو ۱۲ صوبوں میں تقسیم کیا تو اُدھ کی اسی سرزمین کو ایک صوبہ بنا کر شیخ عبد الرحیم کو اس کا صوبے دار مقرر کر دیا۔ شیخ صاحب ضلع بجنور (روہیل کھنڈ) کے رہنے والے تھے، تلامذہ اور زگار میں اگرے پیچھے تھے، اپنی صلاحیت کی بنا پر اکبر کے دربار میں پایا ہوئے تھے اور پھر قابل اعتماد ثابت ہوئے۔ یہ اکبر نے انھیں اُدھ کا صوبے دار بنا دیا۔ شیخ عبد الرحیم ہی کے عہد میں سولے کے اِس مرکزی مقام پھن پور کا نام لکھنؤ میں بدل گیا۔ لکھنؤ میں شیخ صاحب کا مقبرہ نادان محل کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

○ آپ کے خیال میں ۱۵۵۷ء کے غدار کیا پہلی

جنگ آزادی کے اسباب کیا ہیں اور ہندوستانیوں کو ناکامی اور انگریزوں کو کامیابی کیوں ہوئی ؟

○ اِس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ غدار تھا اور یہ جنگ آزادی۔ بل کہ اپنا اپنا اقتدار واپس لانے کا ایک ناکام کوشش تھی جس طرح بہادر شاہ محض اپنے تخت، سلامتی چاہتے تھے۔ اسی طرح ان نے چچی عزیزوں اور رشتہ داروں کی اُمتیت اپنی عافیت کی خاطر انگریزوں سے ملنے والی تھی اور یہ کہ ملکہ زینت محل اپنے بیٹے جوان بخت کا مستقبل بنانے کے لیے لکھنؤ بھیج دی تھی۔ لٹکا ڈھار ہی تھیں۔ غدار کے بعد ولی عہد جوان بخت نے انگریزوں کے سامنے اس امر کا ثبوت فراہم کیا کہ بغاوت میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ اُدھر جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو صرف اپنی ریاست کی بقا سے مطلب تھا۔ ایسی تحریریں ملی ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رانی کو بقیہ ہندوستان کی آزادی یا غلامی سے کوئی دلی چپ نہیں تھی بل کہ وہ تو کسی بھی شرط پر اپنی ریاست کو اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتی تھی۔

کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ غدار کا سبب یہ ہے کہ جنگ بلا سی (۱۷۵۷ء)۔ غدار (۱۸۵۷ء) تک سورتوں کے عرصے میں انگریز نے تاجربن کرہندستان کو لوٹا اور ہندوستان کی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کو نقصان پہنچایا اور حاکم بن کر دیسی حکمرانوں،

نوابوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور امیروں پر ظلم بھی کئے اور ان کے ساتھ نا انصافی اور برداری سے بھی پیش آیا جس کے نتیجے میں انعام کی آگ بھڑک کر اندری صورت میں ظاہر ہوئی اور جن پر ظلم ہوا تھا انھوں نے اپنے آپ کو غیر ملکی انگریزوں کے چھل سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس معمولی سی حقیقت کے قطع نظر اس حقیقت یہ ہے کہ آخری دور کے مثل حکمرانوں نے اور نا کارہ تھے، ہر گھڑی ناچ درنگ میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے محل قحبہ خانوں سے کم نہ تھے۔ رہنماؤں کو بیگمات کے رستے دے دیے گئے تھے، بھڑدے دربار میں سچ کر صلاح کار، مشیر و وزیر بنے ہوئے تھے۔ بادشاہ زیادہ وقت سنی میں پڑے بہتے تھے۔ جب ہوش میں آتے تھے تو فرل کہتے تھے یا درباری شاعروں سے قصیدہ سنتے تھے۔ شاہ زادے بڑے نام پڑھ کھے ہوتے تھے۔ بعض تو قطعی طور پر جاہل ہوتے تھے۔ وہ سب تیر و کمان یا غیل سے چڑیوں کا شکار کرنا ہی بڑا امر کا سمجھتے تھے۔ خلعت پر لٹا ان تھی، لوٹ مار ہر طرف جاری تھی اور شاہی ملازمین کو چھپے چھپے مہینے تک تھاء۔ طق تھی۔ جن دنوں بہادر شاہ کے شہزادے غلیل کے غلوں سے آتے ہوئے وقت کو اوارا جہلی شاہ کے درباری زنجے، تالیاں بجاؤ سوسے جھاگ جاکیں گے، جیسے کانوں سے انگریز کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کی بجائے اور زمانہ کوشش کر رہے تھے، یورپ میں (1750ء) صنعتی انقلاب آچکا تھا اور جس مارگرٹیز کی بنائی ہوئی spinning Jenny مشین پر صرف ایک آدمی ایک وقت گیا را دھاگے کاٹنے لگا تھا، رچرڈ کرکراٹ کی بنائی ہوئی والٹو ریم مشین محض پانی کے زور پر چل رہی تھی، سموئیل کراپٹن کی ایجاد کی ہوئی اسپننگ میل مشین پر تھوڑے سے وقت میں بہت بڑھیا ململ تیار ہونے لگا تھا۔ جیسے دھاگے، بے بجاپ کا انجمن بنا کر کپڑے کی صنعتی رفتار کو ادریز کر دیا تھا، رچرڈ ٹریوٹھک (1830-1801ء) نے اسٹیم انجن، جارج اسٹیمن سن نے اسٹیم ریلوے انجن اور امریکی نوجوان رابرٹ فیلٹن نے اسٹیم بوٹ بنا کر تجارتی مال لانے اور لے جانے میں بڑی سہولت پیدا کر دی تھی اور پھر (1876-1837ء) بجلی کی طاقت سے پیغام رسانی کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا اور مارکوئی کی لاسکی نے کو دنیا کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب آگے ساتھ ساتھ۔ سائنس دان مسلمان مسند

کر دیا۔ چنانچہ 1857ء میں انگریز اور بہادر شاہ کے درمیان جنگ نہیں ہوئی بلکہ یورپ کے (انڈسٹریلزم - Industrialism) اور ہندوستان کے (امپریلزم - Imperialism) کے سچ جنگ لڑی گئی۔ وقت کا تقاضا تھا کہ فتح انڈسٹریلزم کی ہوئی اور ایس ہی ہوا۔ 1857ء کے فدر میں صرف دو طبقوں نے حصہ لیا۔ حکمران طبقے نے، اپنی حکومت کو بچانے کے لئے۔ دوسرا طبقہ اس بھڑکی مخلوق کا تھا جس نے ٹوٹ کر اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اس بغاوت کو اپنے لیے ایک سنہری موقع سمجھا۔ متوسط طبقہ (جو ان دنوں شرفا کیے جاتے تھے) کے لوگ چھپ کر اپنے گھروں میں بیٹھے رہے یا بعض گھر چھوڑ کر محفوظ مقام پر چلے گئے اور جیسے جیسے انگریز کے قدم چمتے گئے وہ اس کی اطاعت قبول کرتے گئے۔ انگریز اور بہادر شاہ کے اس ذکر پر ایک بات اور یاد آگئی کہ بہادر شاہ ظفر کا نیکہ کل نہ بھٹی ۱۱ تھا۔

○ بھٹو کے حالات زندگی بیان کیجئے اور یہ بھی بتائیے کہ اندرا گاندھی اور بھٹو میں کون بڑا سیاست داں ہے ؟

5 جنوری 1928ء کو سر شاہ نواز جان کی بگیم خرید کے لطن سے لڑکا ناد سندھ میں ڈل فقار مل بھٹو پیدا ہوئے۔ (1934ء - 1953ء تک) یعنی کیتھڈن مائی اسکول، یونیورسٹی آف کیمبی فورینا، برکسل، کراؤسٹ جرج، آکس فورڈ میں تعلیم پائی اور لیکن ان سے بیسٹری کا امتحان پاس کیا۔ (1953ء سے 1958ء تک) وہ وکالت بھی کرتے رہے اور انھوں نے یو این جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کی قیادت بھی کی۔ اکتوبر 1958ء میں جنرل ایوب خان نے اپنی وزارت میں ان کو وزیر تجارت بنادیا۔ 1963ء میں وہ وزیر خارجہ بنا دیے گئے اور انھوں نے پاکستان کو امریکا سے زیادہ چین کا دوست بنا دیا۔ 10 جنوری 1966ء کو ستمبر 1965ء کی ہند پاک جنگ کے خاتمے پر جو تاش قند معاہدہ ہوا بھٹو اس سے متفق نہیں ہوئے اور صدر ایوب سے اختلاف پیدا ہو گیا اور آخر وہ صدر ایوب کی وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ 1967ء میں انھوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1968ء میں وہ گرفتار کر لیے گئے۔

اور فروری ۱۹۶۹ء میں وہ رملہ کر دیے گئے۔ بچیاں خاں کے دور میں بکھر
۱۹۷۵ء میں پاکستان میں جو عام انتخابات ہوئے اُس میں بھٹو
کی پارٹی نے مغربی پاکستان کے ۵۵ نشستوں میں سے ۵ نشستیں
حاصل کر لیں۔ انھوں نے ایک بار اپنی پارٹی کی پالیسی اس طرح
بیان کی تھی: "اسلام ہمارا عقیدہ ہے، جمہوریت ہماری پالیسی
ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے اور سامے اختیارات عوام
کے ہات میں ہیں" ۲۵ مارچ ۱۹۷۶ء کو بھٹو نے شیخ مجیب
اور ان کی عوامی لیگ سے متعلق ہونے سے انکار کر دیا اور پاکستانی
فوج نے بچیاں خاں کے حکم سے مشرقی پاکستان پر چڑھائی کر دی۔
۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کو بھٹو صدر پاکستان کی حیثیت سے برسرِ اقتدار
آگئے۔ آج کل وہ وزیرِ اعظم ہیں۔ اندرا گاندھی سے بھٹو کے موازنے
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھٹو سب کچھ میں مگر سیاست دان
ہی نہیں ہیں۔ اور اگر وہ سیاست دان ہیں تو اندرا گاندھی کے
سامنے پھل مکتب ہیں۔ بھٹو نے اپنی نادانی سے پاکستان کا بہت
کچھ کھوایا ہے جب کہ اندرا گاندھی نے اپنی سیاست سے اپنے ملک
کی حدود میں اضافہ کیا ہے۔ اگر اندرا گاندھی نے غزنی ڈور کر کے
اپنے عوام کو مطمئن کر دیا ہوتا تو وہ نہ صرف ایشیا کی بل کہ دنیا کی قابل
ترن اور سب سے بڑی سیاست دان ہوتیں۔

○ اکبر یا شاہ نے اولاد کے لئے جو منت مانی
تھی وہ شیخ سلیم حشتی کے مزار (واقع فتح پور سکری)
پر مانی تھی یا خاجہ نعین آدین حشتی اجمیری کی درگاہ
پر۔

اس سلسلے میں اکثر لکھنے والوں نے بات کو گھٹا ملا دیا ہے اور نتیجے
میں بات واضح نہیں ہو پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کی اس منت
کا تعلق ان دنوں بزرگ شخصیتوں سے تھا۔ اکبر کے یہاں کئی بچے
پیدا ہوئے مگر کم سنی ہی میں مر گئے۔ ۲۸ برس کی عمر تک جب اکبر
لاولہی رملہ تو اس کو یہ علم کھانے لگا۔ اگرے سے گیا راکوس پرکری
نام کا ایک گاؤں واقع تھا۔ اُس گاؤں میں شیخ سلیم حشتی رہتے
تھے جو سلسلہ حشتیہ سے تھے۔ اکبر ان کے اصوات سن کر خد سیکری
گیا اور ان سے التماس کی کہ وہ دعا کریں اور منت مانی کہ آپ کی دعا
آگے...

سے اکبر پیدا ہوا تو اس کو آپ ہی کے دامن تربیت میں ڈال دیا گیا
گا کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ ملکہ جو دھابائی اُمید سے ہے۔ چنانچہ جو دھابا
بائی کو شیخ سلیم ہی کے زمان خانے میں بھیج دیا اور اکبر خد بھی ایک ملازم
کی حیثیت سے کئی دن تک شیخ سلیم کی خدمت میں رہا۔ اسی عقیدت
اور خوشی کے تحت سیکری میں ایک شان دار حرم سرالتمیر کردائی اور گاؤں
کو شہر کی طرح آباد کر دیا اور سیکری کو فتح پور کا نام دیا۔ آخر جو دھابا
بائی کے لڑکا پیدا ہوا، شیخ سلیم نے برکت کی نیت سے اپنی بیٹی سے دودھ
پلویا، اکبر کو انتہائی خوشی ہوئی کہ باج گزار ملکوتوں کے جتنے قیدی تھے
سب کو رہا کر دیا گیا۔ چون کہ شیخ سلیم حضرت خاجہ اجمیری ہی کے مرید
تھے اس لئے اسی رشتے سے اکبر آگے سے اجمیر تک ۲۵ میل ٹھکانے
کے لئے پیدل چل کر گیا۔ بیٹے کا نام شیخ کے نام پر سلیم ہی رکھا گیا اور
اکبر ہمیشہ کچھ ادب اور کچھ پیار سے سلیم کو شیخ بھی کہتا تھا۔ سلیم کئی برس
تک شیخ سلیم حشتی ہی کے گھر میں ملا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ
شیخ سلیم حشتی کی دعا تو کارگر ثابت ہوئی مگر ان کی تربیت مغل شہزادے
کو ایک نیک انسان نہ بنا سکی۔ جہاں گیر مغل خانہ دان کا وہ پہلا
بادشاہ ہے جس سے اس خانہ دان میں عیاشی کی ابتدا ہوئی۔ اپنی لڑ
پوری ہونے کی بنا پر اکبر کو اجمیر کی درگاہ سے آخر دم تک عقیدت رہی
اس نے اگرے سے اجمیر تک جگہ جگہ باغ لگوائے، کنوئیں کھدوائے،
سرائے بنوائیں اور مینار تعمیر کروائے۔ کبھی اجمیر ایک معمولی سی بستی تھی
اکبر نے اسے شہر بنایا۔ دو بڑی دیگیں جو دہاں رکھی ہوئی ہیں ایک اکبر نے
نذر کی تھی جس میں "دو" لکھا ہے۔ دوسری دیگ جہاں
گیر کی چڑھائی کے نام ہے جہاں گیر بھی جب اجمیر جاتا تھا تو کوس بھر
پہلے سے گھوڑے سے اتر پڑتا اور بھر پیدل درگاہ تک جاتا۔ شاہ
جہاں کو بھی خاجہ اجمیری سے عقیدت تھی۔ درگاہ کے پاس سنگ مرمر کی
جامح سجاسی کی بنوائی ہوئی ہے۔ شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا تو مزار
کے ارد گرد اپنی پلوں سے جھاڑو دیتی تھی۔ اور حد یہ ہے کہ ہر شریک
اور بدعت سے دور رہنے والا اور نگ زیر بھی چار بار اجمیر گیا اور ہر
بار پیدل سفر کیا۔

○ کیا مسلمانوں کے بہادر ہونے کی وجہ ان کا گوشت
خورد ہونا نہیں اور خصوصی طور پر گائے کا گوشت ؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ غذا انسان کی طبیعت اور مزاج کو بنانے اور بگاڑنے میں بڑا کام کرتی ہے یعنی حیوان کے کھانے سے حیوانیت آتی ہے۔ اسی لئے حضرت علیؑ نے فرمایا تھا: "شکم کو حیات کا گورستان مت بناؤ" جہاں تک گلے کے گوشت کا تعلق ہے یہ دیر پضم ہوتا ہے۔ ناقص قسم کا خون پیدا کرتا ہے۔ سوداوی امراض میں بہت ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ عام حالت میں بھی بخار کا رخ دماغ کی طرف کیے رہتا ہے۔ سوزھوں اور ہونٹوں پر ورم لاتا ہے اور کندہن بناتا ہے۔ غذاؤں میں گلے کا گوشت اتنی ہی ناقص غذا ہے جتنی عظیم موسیقی میں توالی کی صیغہ — اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ دونوں چیزیں مرغوب ہیں۔

○ آج کل لفظ انفلیشن بہت بولا اور لکھا جاتا ہے اس سے کیا مراد ہے ؟

و ان فلیشن (Inflation) دراصل اقتصادیات کی ایک اصطلاح ہے اور اس کے معانی ہیں اضافہ زر۔ اصطلاح میں ایسی صورت حال کو کہتے ہیں کہ جب مصنوعی ذرائع سے دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو دولت کی فراوانی کی بنا پر قوت خرید بڑھ جاتی ہے۔ ایسی صورت عموماً کسی بڑی جنگ کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب جنگ کے نتیجے میں کارخانوں کی پیداوار متاثر ہوتی ہے اور حسب ضرورت مال تیار نہیں ہو پاتا اور لوگوں کے پاس دولت زیادہ ہونے کی بنا پر مال کی مانگ بڑھ جاتی ہے اور یہ ڈی مینڈ مہنگائی کو راہ دکھاتی ہے۔ اگر مال کی مانگ بڑھ کر پورے ادوارام پورٹ بڑھ جائے گی تب بھی عام لوگ، دولت مند بن جائیں گے اور ان کی بڑھی ہوئی دولت بھی ضروریات زندگی کو مہنگا بنا دے گی۔ یعنی سہولتیں بھی ان فلیشن کا باعث بنتی ہے۔ اگر کسی ملک میں ان فلیشن زیادہ دن تک رہے تو وہ ملک اقتصادی اعتبار سے دباویر ہو جائے گا۔

○ کیا کسی ملک کے اچھے یا بُرے جغرافی حالات اس کے باشندوں کو ادوارام پرست یا روشن خیال ڈرپوک یا بہادر اور لپست ہمت یا باہمت بناتے ہیں ؟

جی ہاں! جہاں قدرتی حادثات اور خطرات بار بار ظہور میں آتے ہیں وہاں کے لوگ ادوارام پرست، کم ہمت اور دیر سے ترقی کرنے والے ہوتے ہیں۔ جیسے طوفانی بارش جس کی زد سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے سیلاب جو سب کچھ بہا لے جاتا ہے، زلزلہ جس کے آنے پر انسان نہ بھاگ سکتا ہے اور دکھڑا ہی رہ سکتا ہے وہاں سے نکلے ہوئے دریا جن کی دھار کے رخ کو پلٹ دینا آسان نہیں، گھنے جنگل جن سے گزرنا موت کو دعوت دیتا ہے، ریگ زار جہاں انسان ماہ بھول جائے تو بتلنے والا کوئی نہیں، سمندر جس کی طوفانی تہاں سب کچھاڑے جاتی ہیں، دباؤ بیماریاں جو ہنسنے گھروں کو روکے پر مجبور کر دیتی ہیں وغیرہ وغیرہ — قدرت کے ایسے مظاہر کو انسان نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ان سے بچ سکتا ہے بس لڑ جاتا ہے، سہم جاتا ہے اور اپنے آپ کو ایک مجبور، بے بس، عاجز اور لاچار انسان سمجھنے لگتا ہے۔ نا سمجھی یا ناواقفیت انسان کو ادوارام پرست اور بے بسی و مجبوری کم ہمت بنا دیتی ہے، دراصل جب کسی بات کا سبب سمجھ میں نہیں آتا تو پھر وہم پیدا ہو جاتا ہے اور جب رفتہ رفتہ وہم کا غلبہ بڑھ جاتا ہے تو عقل مغلوب ہو جاتی ہے۔ گرم ملکوں میں قدرتی حادثات زیادہ رونما ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر گرم ممالک کے باشندے ادوارام پرست اور کم ہمت ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھی ایک گرم ملک ہے اور یہاں کی ادوارام پرستی واضح ہے۔ اسی طرح ملک پر وجہ ہمیشہ زلزلوں کی زد میں رہتا ہے ایک ادوارام پرست ملک ہے اور وہاں کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے ہیں اور وہ ہجرت کے زور کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ زیادہ ہندوستان کے برخلاف چھوٹا سا ملک یونان ایک تنگ سے سمندر میں واقع ہے۔ یہاں کی آب و ہوا صحت بخش ہے، زلزلے کم آتے ہیں، طوفان اور گولے بھی کم آتے ہیں۔ یونان کا اونچے سے اونچا پہاڑ بھی ہمالیہ کے مقابلے میں پہاڑی معلوم ہوتا ہے، دریا برائے نام ہی ہیں۔ چند چشمے ہیں جو پایاب ہیں، گھنے جنگل نہیں اس لیے درندے یا موذی جانور بہت ہی کم ہیں، غرض کہ وہاں ہجرت کے مظاہر خائف کرنے والے نہیں بل کہ ہمت اور دلیری پیدا کرنے والے ہیں۔ اسی لیے اُس ملک میں رہنے والوں کے دل پر خوف

غالب نہیں اسی لئے وہ خیال پرست کم ہیں اور انسان کی قوت ، اختیار و اقتدار سے واقف ہیں۔ ہندوستان میں ادیان کا جو غلبہ موجود ہے اُس کی وجہ مذہب نہیں ہے بلکہ قدرتی حادثات ہی کی بنا پر مذہب میں ادیان داخل ہوئے اور کسی ملک کی بچری اُس ملک کا مذہب بناتی ہے۔ ادیان انسانی زندگی میں صحت سے بڑی خرابی پیدا کرتے ہیں کہ وہ انسان کے دل میں مجبوری کے بیج بوسیتیں ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی کاروباری میں ہمیشہ کے لیے بریک لگ جاتا ہے اور انسان کسی بڑے یا قابل ذکر کام کے لیے قدم نہیں اٹھاتا اور ترقی رک جاتی ہے۔ یہ بچری یا کی ہوئی تو ہم پرستی کیسے دور ہو؟ تعلیم اور سائنسی تعلیم ہی کے ذریعے نہ صرف قدرتی حادثات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے بلکہ اُن کو زیر بھی کیا جاسکتا ہے اور جب اسی کے نتیجے میں انسان اپنی مجبوری کے خیال کو اپنے دل سے نکال دے گا تو اس لئے وہ ہم پرستی کی عقلی غالب آجائے گی۔

○ اکثر دیکھا گیا ہے (خصوصی طور پر بمبئی میں) کہ بعض لوگ (نوجوان) کسی چھوٹے موٹے اجلاس کے نکلنے پر یا کسی تنگ سرک پر ٹریفک جام ہو جانے پر خد بخد ایک ٹریفک پولس مین کی طرح بڑی سنجیدگی سے ہاتھ پھینک پھینک کر جلوس یا ٹریفک کو کمزور کر کے لگتے ہیں، نفسیات کی رو سے آپ ایسے لوگوں کو کیا کہیں گے؟

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہر صبح دس بجے اور با اختیار و گولڈے ذریعے ڈانس اور ڈبے بجاتے ہیں۔ جیسا کہ اُن کی طبیعت کا یہ شدید تقاضا ہوتا ہے۔ وہ "عالمک" نہیں اور "عالمک" چلائیں اس لیے خوب بھی کوئی ایسا جو ٹاپاسٹی موقع اُن کو مات آتا ہے وہ حکم چلانے کا کھیل کھیلنے لگتے ہیں۔ 7 یو 7 سے قبل یو۔ پی۔ ٹی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا تحصیل دار یا محکمہ در ضرورت ہے۔ چونکہ زمین دار کو مال گزاری ادا کرنے اور اپنے علاقے کے چھوٹے موٹے حکمرانوں کے پاس سے زندگی بھر جیل دار یا درخانے دار کے احکامات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اس

گات کلمہستانی صلاں سبر

لئے وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کے گھر سے بھی احکام جاری ہوں گے۔ مہاراشٹر کے دیہات میں رہنے والے بہ نسبت دوسروں کے قانون کے جنگل میں زیادہ کھینٹتے ہیں اس لیے اُن میں جب کوئی پڑھ لکھ جاتا ہے تو وہ عموماً وکیل بننے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ گجرات کے علاقے میں رہنے والوں کی صحت زیادہ اچھی نہیں ہوتی اس لیے گجراتیوں میں ڈاکٹری کا پیشہ عام ہے۔ دراصل اس انسانی نفسیات کا تعلق میل اور درعمل سے ہے۔

○ فقیرانی کا نام تو سنا ہے مگر حال نہیں معلوم اُن کے بارے میں کچھ بتائیے؟

فقیرانی کو انگریزی میں "طوفان منہ" کہتے تھے۔ وہ صوبہ سرحد کے علاقے وزیرستان کے مذہبی پیشوا بھی تھے اور حکومت بریتانیا کے خلاف جہاد کرنے کی بنا پر مجاہد بھی۔ وہ حاجی تھے اور اپنے عبادت دریا صحت کی بنا پر فقیر کے نام سے مشہور تھے پشاور کے بازار قصہ خوانی میں جب انگریز فوج نے فائرنگ کر کے بہت سے سرخ پوشوں کو ہلاک کر دیا تھا تو فقیرانی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کر دیا تھا اور جب انگریز حکومت نے اُن سے صلح چاہی تھی تو انہوں نے گاندھی جی اور خان عبدالغفار کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔ فقیرانی کانگریس کے حامی تھے اور آزاد پشاور چاہتے تھے۔ 1936ء میں انگریز سرکار نے اُن کے اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف سخت کارروائی شروع کی تھی اور اُن کے مکان تک کو آگ لگا دی تھی مگر انہوں نے بھی دادی خورہ میں چھپ کر انگریزی فوج پر پے در پے اتنے چھاپے مارے کہ اُس کو پاپا ہونا پڑا، فقیرانی ہر اُس شخص کے دوست تھے جو انگریزوں کا دشمن تھا۔ اسی لئے وہ سلم بیگ کے محافظ تھے۔

○ فرقہ پرستی کی تعریف بیان کیجئے؟

فرقہ جو اپنے آپ کو دوسرے سارے فرقوں سے بہتر سمجھتا ہے یا وہ شخص جو صرف اپنے ہی مذہب کو ذریعہ نجات سمجھتا ہے وہ فرقہ پرست ہے۔ ایک بار پرنٹ نہرو نے فرقہ پرستی کی بڑائی کو یہ کہہ کر واضح کیا تھا "فرقہ پرستی اتنی بڑی چیز ہے کہ فرقہ پرست بھی اپنے آپ کو فرقہ پرست کہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا،

○ کشمیر کب سے اس سرزمین پر واقع ہے اور کس کس نے اس پر حکومت کی ؟

کسی تاریخی حوالے سے تو کشمیر کی عمر نہیں بتائی جاسکتی۔ البتہ دیولمالائی روایت یہ کہ پہلے کشمیر ایک بہت بڑی تحصیل کی صورت میں تھا اور تحصیل کا نام سستی سا تھا۔ اسی علاقے میں چند وحشی قبیلے رہتے تھے جن کا سردار جل دیو تھا۔ وہ بڑا ظالم تھا ایک سادھو نے اپنی تپسیا کے زور پر شاری کا نام کی دیوی سے پراگشائی کر دی وہ اس کے ظلم سے نجات دلانے، شاری کا باہل کی صورت میں اپنی چوچ میں ایک سنگ ریزہ لے کر آئی اور اس کو جل دیو کے سر پر گرا دیا وہ مر گیا اور سستی سا تحصیل کا پانی بھی سوکھ گیا اور پھر یہ علاقہ کیشپ مار کے نام سے مشہور ہو گیا اور پھر کچھ عرصے بعد کیشپ مار کو لوگ کشمیر کہنے لگے۔ اندازہ یہ ہے کہ پانچ چھ ہزار برس سے کشمیر ایک جانا پہچانا علاقہ ہے۔ 502 قبل مسیح میں اشوک نے کشمیر کو فتح کر لیا تھا اور اس نے بدھ مت اور بدھ تہذیب کو وہاں خوب پھیلایا مگر اشوک کے قبضے سے نکلنے ہی بدھ مت کا زوال شروع ہو گیا۔ 10ویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے کشمیر میں قدم رکھا۔ مسلم حکمرانی کا ابتدائی دور قابل ذکر نہیں مگر 326ء میں جب زین ال عابدین کشمیر کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے اچھے انتظام سے کشمیر اور کشمیر لوں کی کاپالٹ دی۔ ڈیڑھ سو برس بعد مغلوں (شاہنشاہ اکبر) کی حکومت شروع ہوئی انہی کے عہد میں نشاط اور شالی مار وغیرہ باغات لگائے گئے۔ 1753ء سے کشمیری بھٹیاؤں کے قبضے میں آ گیا۔ مگر جلد ہی کشمیر میں لے ہمارا جہان جیت سنگھ کو دعوت دے کر بھٹیاؤں کو کشمیر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جب سکھوں اور انگریزوں کی جنگ ہوئی تو کشمیر سکھوں کے مات سے نکل کر انگریزوں کی ملکیت بن گیا اور 1846ء مارچ 46ء کے معاہدہ امرتسر کی رو سے انگریزوں نے علاقہ کشمیر کو 75 لاکھ روپے میں ڈوگر خان دان کے راجا گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ہندوستان کے آزاد ہونے تک (1947ء) ہی ڈوگر خان دان کشمیر کا حکمران رہا۔ مہاراجا ہری سنگھ کشمیر کے آخری حکمران تھے۔

تنگ کاہتستانی مسلمان

وہ خط جسے وادی کشمیر کہتے ہیں قدرتی مناظر اور صحت افزا آب و ہوا کی بنا پر دنیا کے چند منتخب شدہ پُر نفسا مقامات میں سے ہے۔ ○ پرانے لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ عالموں کی اولاد اکثر جاہل ہی رہا کرتی ہے یہ کہاں تک درست ہے ؟

جب مال دولت اور علم درختے میں ملتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ورثہ پانے والوں نے ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے خدا کوئی محنت نہیں کی اور جو شے محنت کے بغیر مل جائے اس کی قدر بھی نہیں کی جاتی، جب کہ علم زندہ رہنے کے لیے مستقل عور پر رہانی چاہتا ہے مفت خور وارث دزمید دولت پیدا کرنے کے لیے محنت کرتے ہیں اور نہ تحصیل علم کی خاطر مشقت۔ اسی سلسلے میں ابن خلدون بھی کہ چکا ہے: 'مہر زمانے میں یہ ہوتا آیا ہے کہ دولت اور علم پرانوں خان والوں سے چھتے اور نئے خان والوں میں آتے رہے ہیں !'

○ فقہ کالم کا مطلب کیا ہوتا ہے ؟

اس کے لفظی معانی میں فوج کا پرلا (Fighting Column) مگر اصطلاح میں ان عناصر کو کہتے ہیں جو اپنے وطن میں رہ کر بے رونی دشمن کے لئے دانتہ کسی بھی طرح مددگار ثابت ہوتے ہیں ان کی مدد سیاسی ہو یا فوجی، روپے پیسے کی امداد ہو یا روپے پیسے کے عوض دشمن کو اپنے ملک کے کم زور پہلوؤں سے باخبر کرنا۔ ہسپانیہ میں (1936ء سے 1939ء تک) جب طانہ جنگ جاری تھی تو انہی دنوں جنرل فرانکو نے میڈیڈر پر چار فوجوں سے حملہ کیا۔ حملے کے دوران میں میڈیڈر کے جن لوگوں نے فرانکو کی مدد کی فرانکو کے ساتھیوں نے ان کو پانچ پانچ دلا

دستہ، قرار دیا، تب سے یہ اصطلاح جاری ہے۔

○ آپ 'تنگ' میں اکثر مولوی ملاؤں کی دنیا پرستی، نذرانوں، تحفوں اور عطیوں کی وصولی اور ان کی طمع کا ذکر کرتے ہیں آخر وجہ کیا ہے کہ وہ عالم ہونے اور دین و دنیا کو خوب سمجھنے کے باوجود اتنے لالچی ہوتے ہیں ؟

نفسیات کا یہ فارمولا یاد رکھیے اور اپنے ارد گرد کی بڑی شخصیتوں کے ماضی کا جائزہ لے کر پھر اس فارمولے کو استعمال کر کے دیکھئے یہ فارمولا سو فی صدی درست ثابت ہو گا۔ جن لوگوں کی عزت میں آنکھ کھلتی رہے اور غربی ہی میں زندگی (خصوصی طور پر بچپن) بسر ہوئی ہے وہ موقع پاتے ہیں دولت کمانے یا دولت قبول کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ اس کے برخلاف جن کا بچپن خوش حالی میں گزرتا ہے، کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے، کھیلنے کو دل لگتا ہے اور کھوٹے بھرنے سے تعلق رکھنے والی ساری خواہشات ایسی عمر میں پوری ہو جاتی ہیں تو اپنی بقیہ زندگی میں وہ دوست کے پیچھے نہیں دوڑتے اور ان کی ناہشات ان کے مقصد کوئی بڑا کام انجام دینے میں) کے پورا ہونے میں مانع نہیں آتیں جیسا کہ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا بچپن اس حد تک عیش و آرام میں گزرا کہ انھوں نے جب بھی کسی چیز کی فرمائش کی ان کے استحقاق باب نے پوری کی۔ بیٹے کو مٹھائی کھانے کا شوق تھا، باب خوب خوب مٹھائی کھلاتے ایک دن کہنے لگے: "مٹھا! مٹھائی سے تمہارا پیٹ تو بھر جاتا ہے، نیت بھی بھر جانا چاہئے، چنانچہ حلوئی کو بلوایا اور سامنے سامان اور لوازمات کے ساتھ ڈیوڑھی پر بیٹھا کر حکم دیا جو اور جتنی مٹھائی بیٹا مانگے، بناتے جاؤ اور اسے کھلاتے جاؤ۔ ظاہر ہے بیٹے کا پیٹ تو کئی بار بھر چکا تھا اس بار نیت بھی بھر گئی اور کوئی حسرت باقی نہ رہی۔ اس کا خشر گواہی تو یہ ہوا کہ مولانا کے اکثر متقدم مولانا کے حوتوں میں رو پے بھر دیتے مگر مولانا جب حوتے پہننے کے لیے کھڑے ہوتے تو حوتوں کو مٹھا کر دوپوں سے اس طرح خالی کر دیتے جیسے حوتوں پر سے گرے چھلکا ہوا اور جوتے پہن کر خالی ہت چل دیتے۔ معتقد کبھی اپنے نہ رانے کو دیکھتا اور کبھی دولت سے بے نیاز ہو کر جانے والے مولانا کو۔۔۔ دراصل نو سو سٹا نوے فی ہزار مولوی ملا عزیہ بھگوانوں سے آتے ہیں اس لیے وہ دولت مند لوگوں کے دسترخوان کی کھیاں ثابت ہوتے ہیں۔ نفسیات کا یہ نکتہ مولوی ملاؤں ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ سیاسی لیڈروں پر بھی صادق آتا ہے

سن کا ہر سال ہر سال ہر سال

جو لوگ خان عبدالخالق کے خان دانی حالات سے واقف ہیں ان کو بادشاہ خان کے فقیر صفت اور ایک اصول پرست انسان چلنے پر تعجب نہیں ہو گا۔ سستی میں جب کوئی ایسا مہمان آتا جو کسی کا رشتہ دار نہ ہوتا تو وہ بادشاہ خان کے مہمان خواندہ ہی کا مہمان ہوتا۔ بادشاہ خان کی ماں روزانہ ایک زائد ہندیا پکایا کرتی تھیں تاکہ محلے کے غریب بھگروں میں سالن بھیجا جاسکے۔ بادشاہ خان کے گھر میں قدرت کا دیا سب کچھ تھا اس لئے انھوں نے لیڈری دولت کمانے کی ہوس میں نہیں بلکہ حب وطن کے لیے انتہا بڑھے ہوئے جذبے سے مجبور ہو کر شروع کی تھی۔ بہتان کی سیاسی تاریخ میں حسرت موہانی اپنے فقر و استغنا ہی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ دراصل ان کی ضرورتیں ان کو تکلیف نہیں پہنچاتی تھیں اس لیے کہ وہ اپنی ساری ضرورتیں اپنے لڑکپن ہی میں پوری کر چکے تھے حسرت کے والد (سید ازہر حسن) جاگیر دار تھے مگر حسرت نانی کے گھر میں ملے، نانی کی حویلی اتنی بڑی تھی کہ سستی دے لے اسے بارادری کہتے تھے۔ نانی ناشتے میں ان کو ہمیشہ دودھ چھاتی اور شکر کھلاتی تھیں۔ ماں بھی ان پر جان چھڑکتی تھیں حسرت جب کبھی کوئی کتاب پڑھنے میں محو ہو جاتے تو کھانے پینے تک کا ہوش نہ رہتا تب ان کی والدہ نے ان کے سامنے ان کے سر میں دبی رتیں اور وہ کتاب پڑھتے رہتے۔ کھیل کود میں پیٹنگ بازی اور تیرکی سے ان کو بہت شوق تھا اور وہ یہ دونوں شوق خوب خوب پورا کرتے اور چون کہ ان کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا اس لیے جوان ہوتے ہوئے ڈٹ کر دو چار عشق بھی کر ڈالے۔ چنانچہ جو کچھ کرنا تھا وہ کر غلنے کے بعد ایک نیک مقصد (آزادی وطن) کی خاطر فقر و استغنا سے کام لینا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ سجاد ظہیر کے والد "سر" وزیر حسن تھے اور والدہ "لیڈی" وزیر حسن کہی جاتی تھیں، کوٹھی میں بچپن گزرا اور ولایت میں تعلیم پائی، یعنی ابتدائی سے عزت بھی ملی اور دولت بھی دیکھی۔ چنانچہ ایک اصول کی خاطر (کیونٹس بن کر) جب محل سے جھوٹے میں پہنچے تو جو چیزیں (زندگی کی راحتیں) خوب خوب برتنے کے بعد وہ چھوڑ آئے تھے انھیں دوبارہ حاصل کرنے کا سوا ہی پیدا نہ ہوا۔۔۔ دراصل ہر کسی کے لیے راحت و آرام کا ایک

کو نامقرر ہوتا ہے۔ وہ آخر دم تک اسے حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ جو اپنی زندگی کے نصف اول میں اس کو ملنے کو حاصل کرتا ہے اس کی زندگی کا نصف دوم بڑے اطمینان سے گزر جاتا ہے۔ وہ کسی نیک کام کے لیے اپنی غریب کو بھی ہنسی خشی برداشت کر جاتا ہے مگر جو ابتدائی عشر میں آسودہ حال نہیں رہا وہ اپنی بقیہ زندگی میں دوسرے کاموں پر اپنی خواہشات کی تکمیل کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جو لیڈر، وزیر یا علماء کرام خوش حال گھروں سے آئے ہیں وہ محب وطن، عوامی خدمت گار اور جتنا پرورنا ہوتے ہیں ورنہ جو جنم جنم کا بھوکا ہے وہ سیاسی لیڈر ہو یا دین کا ملا، دولت دیکھتے ہی اپنا ایمان کھو بیٹھتا ہے، ظاہر ہے جس گھر میں دھندلے چراغ جلتے ہوں وہاں اگر سورج نکل آئے تو اس گھر کے ہر فرد کے لیے سورج کی پرستش کرنا لازمی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم دینی ہو یا دنیاوی جتنا ہم سمجھتے ہیں اتنا وہ انسان کے کردار کو متاثر نہیں کرتی بل کہ روٹی انسانی کردار کو بناتی ہے اور اس کے نہ ہونے سے کردار بگڑتا ہے۔

○ ہلالِ احمد کے بارے میں کچھ بتائیے؟

پہلی جنگِ عظیم سے پہلے یعنی 1913ء میں یورپ کے کئی ملک ترکوں کے خلاف ہو گئے جہاں چہ بلقانی ریاستوں نے ترکی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور اسی اثناء میں انگریزوں کے اشارے پر یونان نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ بے شمار ترک سپاہی مارے گئے مگر ترکی نے پھر بھی جنگ جاری رکھی اس وقت مولانا محمد علی نے اپنے اخبار 'کامریڈ' میں اس جنگ کے موضوع پر اور ترکوں کی ہم دردی میں کئی مضامین شائع کئے۔ ترکی کے زخمی سپاہیوں کی تیمارداری کے لئے ایک میڈی کل مشن بھیجنے کی تجویز پیش کی اور اس مشن کے خرچ کے لئے چندے کی بھی اپیل کی۔ آخر اکثر انصاری کی قیادت میں یہ طبی جماعت جو چودھوی حلیق اُتھال، شعیب قزوینی، عبدالرحمان صدیقی، عبدالعزیز انصاری اور عبدالرحمان پٹا وری پر مشتمل تھی ترکی روانہ ہوئی اور چند مہینے وہاں رہ کر اور اپنا کام پورا کر کے واپس آئی۔ یہ طبی جماعت چون کہ 'ریڈ کراس' کی جیسی تھی اس لیے سرخ چاند کو نشان بنا کر اس کا نام 'ہلالِ احمد عثمانی' رکھا گیا۔ ویسے 'ہلالِ احمد' کو آل انڈیا ٹرکس

میڈی کل مشن کا نام بھی دیا گیا ہے۔

○ صنعتی انقلاب سے کیا فائدہ ہوا اور کیا نقصان؟

یورپ کے صنعتی انقلاب سے تو یہ فائدہ ہوا کہ مشینوں کے ذریعے تھوڑے وقت میں زیادہ اور اچھا مال تیار ہونے لگا۔ مگر نقصان بھی کافی ہوا۔ وہ اس طرح کہ اس صنعتی انقلاب نے مہلج میں تین طبقے پیدا کر دیے۔ سرمایہ داروں کا طبقہ، متوسط طبقہ اور مزدور طبقہ۔ سرمایہ دار طبقہ کارخانہ داروں اور زمین داروں پر مشتمل تھا۔ متوسط طبقہ میں دکان دار اور ملازمت پر مشغول لوگ شامل تھے اور تیسرا طبقہ کسانوں اور کاری گروں کا مجموعہ تھا۔ پہلے صنعت و حرفت اور تجارت کے معاملات حکومت طے کیا کرتی تھی لیکن صنعتی دور آنے پر سرمایہ داروں نے دولت کے زور پر تجارت کی پالیسی کو اپنے مات میں لے لیا۔ ایڈم اسمتھ نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت تجارتی معاملات میں دخل نہ دے۔ چنانچہ کارخانہ داروں اور تاجروں کا دولت مند طبقہ انگریزوں کی پارلیامنٹ پر چھا گیا اور سرمایہ داروں نے مزدور کی حالت کو قابلِ رحم بنا دیا۔ صنعتی دور میں جو ملک (افریقا اور ایشیا) کے مالک، پس ماندہ تھے مغربی مالک اپنے کارخانوں کے لئے ان سے کچا مال لینے لگے اور پھر انہی کے بازاروں میں اپنا بنا یا ہوا مال بیچنے لگے اور ایشیا کے بازاروں پر سام راجی طاقتور نے قبضہ کر لیا۔ مگر جب مزدور کو احساس ہوا کہ سٹیٹس ہو کار انہی کے خون پسینے کی گارمھی کمانی سے اونچے اونچے مکانات میں رہتے ہیں اور دن رات عیش کرتے ہیں اور بھوکے شکمے مزدوروں کے جائز حق کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تو مزدوروں نے اعلان کیا کہ دولت مند مزدور پیدا کرتے ہیں ملوں کے مالک نہیں چنانچہ اس اعلان کے نتیجے میں انھوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کیا اور اس طرح باقاعدہ مزدوروں کی ایک تحریک (Labour Movement) شروع ہو گئی۔ مزدوروں کے جانگے پر سرمایہ دار طبقہ چونک پڑا۔ اس نے مزدوروں کی تحریک کو دبانے کے لیے سخت قوانین بنائے۔ قانونی و باقانونی ہمارے مزدوروں کی تحریک کا زور کم تو ہوا مگر وہ فنا نہیں

ہوئی آخر 25 18 میں سرکاری باجیروں میں جب قدرے کمی ہوئی تو مزدوروں کی انجمنیں بننے لگیں۔ مزدوروں کی اصلاح کے سلسلے میں رابرٹ اون نام کے ایک انگریز نے بڑا کام کیا اسی شخص کی بنا پر سب سے پہلے لفظ "سوشلزم" آیا۔ دوسرے مطالبات کے ساتھ مزدوروں کے دو مطالبات سمیت ہی انقلابی طرز کے تھے کہ انھیں بونس دیا جائے اور کارخانوں کے انتظامی معاملات میں انھیں بھی شریک کیا جائے۔ انگلینڈ کے مزدور طبقے میں جو انقلاب آ رہا تھا اس نے یورپ کے صنعتی ملک کو بھی متاثر کیا اور اسی اثنا میں اقتصادیات کے دلیوا کارل مارکس نے اپنا اشتراکی منشور (Communist Manifesto) تیار کر کے شائع کیا جس سے مزدوروں کی تحریک کو کافی تقویت ملی۔

○ "یلمزم" کے کیا معنی ہیں؟ سجاد حیدر یلمزم کے بارے میں کچھ بتائیے؟

"یلمزم" ترکی زبان کا لفظ ہے اور برقی کو کہتے ہیں۔ "یلمزم" سجاد حیدر کا تخلص تھا۔ سجاد حیدر یلمزم قوت الہی حیدر کے والد تھے اور ضلع بجنور (اتر پردیش) کے قصبہ ہنٹور کے رہنے والے تھے۔ سر سید احمد خاں قصبہ ہنٹور کو بڑا مردم خیز خطہ سمجھتے تھے اس لیے وہ ہنٹور کے لوگوں کو عقل مندان ہنٹور کہتے تھے۔ سجاد حیدر قسطنطنیہ میں پولی ٹیکنک گئے تھے۔ وہیں انھوں نے ترکی زبان سیکھی اور پھر سمیت سے ترکی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ اردو زبان کے شاعر بھی تھے جہاڑنگو بارو اندومان (کالے بانی) میں رے ونو کشتربھی رہے۔ ہندوستان آنے پر علی گڑھ یونیورسٹی کے جیٹرا رہنے لگے اور پھر یونیورسٹی میں منتقل ہو گئے۔ مل لیتے کا نظریہ انتہائی طور پر سائنسی بن گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسلک ہوں یا ہندی اور وکاتنا زہر وہ وقت قریب ہے کہ جب مذہب کے قطع نظر جغرافی اور علاقائی بنیاد پر ان مسائل کو حل کیا جائے گا۔ رسم خط کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ جذباتی بن کر دوسرا طے کرنا نقصان دہ ہوگا۔ ہندوستان کے صرف شمال مغربی حصے میں عربی رسم خط رائج رہ سکتا ہے بقیہ سارے ہندوستان

میں کلمہ سنائی انسان کی سیر

میں لامحالہ دلیوا گری اسکریٹ رائج ہو جائے گا۔ جن دنوں اکبر الہ آبادی جسے طاقت نا اندیش "حرف پڑھا پڑا ٹائپ" کا کہہ کر ٹائپ کی مٹی پیدا کر رہے تھے مل درم اردو ٹائپ کو مقبول بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک اردو والے "سمیت" سکی (لیتھو کی چھپائی) سے اپنا رشتہ توڑیں گے اردو کی اشاعت سہل ہو جائے گی۔ وہ ساری عمر تعلیم نسواں اور اردو ٹائپ کے حق میں پروپیگنڈا کرتے رہے۔

○ کیا انسان اپنے احساسات و جذبات پر قابو پاسکتا ہے؟

اگرچہ یہ بات مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور کی پیٹھ میں ایک برس تک سخت خارش رہی مگر اس نے ایک بار بھی اپنی پیٹھ نہیں کھجائی، دراصل اس قسم کے ضبط کا تعلق قوت ارادی سے ہے۔

○ کیا یہ درست ہے کہ اندھیرے میں سایہ بھی سا چھوڑ دیتا ہے؟

نہیں نہیں! جب انسان اوپر سے نیچے گرتا ہے تو اکثر لوگ اس کے ساتھ ہم دردی سے میٹھ آتے ہیں، کبھی کے کام یا باب انسان کو اپنا دست لگ کر بنا کر وہ اپنے جذبہ حسد کو تسکین پہنچاتے ہیں اور دنیا کے سامنے اپنے اس عمل کو شرافت قرار دیتے ہیں اور جب کوئی انسان نیچے سے اوپر چڑھتا ہے تو یہی لوگ اس کی ٹانگیں بکڑ کر گھسیٹنے لگتے ہیں۔

○ کمیون اور کمیون ازم کی تعریف بیان کیجئے اور کمیونزم اور سوشلزم کا فرق بتائیے؟

در اصل کمیون ازم خد کمیون سے مشتق ہے اور کمیون کمیونٹی کے مترادف ہے۔ یعنی اس کے تحت وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جو کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہیں۔ کمیون ازم یا اشتراکیت اس اقتصادی نظام کو کہتے ہیں جس میں محنت، پیداوار، ملکیت اور انتظام اشتراک ہو۔ دراصل اقتصادی نظام کا یہ نظریہ سب سے پہلے فلاطون نے پیش کیا تھا۔ 7-18 ق م میں جب کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے کمیونسٹ مینی فیسٹو شائع کیا تو کمیون ازم کے

معانی سوشل ازم ہی سمجھ گئے مگر 1918ء میں لیبن اور اس کے ساتھی روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی تحریک کو کمیونسٹ تحریک کہا گیا اگرچہ سوشل ازم اور کمیون ازم بنیادی طور پر ایک ہی تحریک کے دو نام ہیں پھر بھی دونوں میں یہ فرق ہے کہ کمیون ازم ہر شخص سے اس کی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق لے کر ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دینا چاہتا ہے اور سوشل ازم ہر شخص سے اس کی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق لے کر ہر شخص کو اس کے کام کے اعتبار سے دینا چاہتا ہے دراصل تحریک کی صورت میں کمیون ازم سرمایہ داری کی ضد ہے اور ایسے معاشرے کے قیام کی ترغیب دیتا ہے کہ جس میں طاقت کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے اور ہر شخص برصا کا راہ طور پر مشترکہ، پرامن اور پرسکون زندگی بسر کر سکے۔

تاریخ کے ہر دور میں معاشی پیداوار ارتقاء کا جو طریقہ رائج رہا ہے اور اس سے جو سماجی ڈھانچہ بنا ہے وہی اس دور کی سیاسی اور ذہنی تاریخ کی ترتیب کی بنیاد بھی رہا ہے۔ اور اسی بنیاد سے اس دور کی تاریخ کی تشریح بھی کی جاسکتی ہے۔ دراصل آج تک جتنے سماجوں نے جنم لیا ہے ان سب کی تاریخ طبقاتی کشش کی تاریخ ہے یعنی آقا اور غلام، شرفا اور بدیل، جاگیردار اور کاشت کار، کارخانہ دار اور کاریگر، غرضے کا ظالم و مظلوم بھی درپردہ یا کبھی کھیلے طور پر ایک دوسرے کے خلاف صفت آرا رہے ہیں اور آپس کی اس جنگ کا انجام یہی ہوا ہے کہ یا تو نیا سماج تشکیل پا گیا یا پھر طرے والے طبقے تباہ ہو گئے۔ آج کا سرمایہ دارانہ معاشرہ چون کہ جاگیردارانہ معاشرے کے کھنڈروں پر کھڑا ہے اس لئے وہ طبقاتی اختلافات کو دور نہیں کر پایا، بس شکلیں بدل گئی ہیں اور اب ہمارا سماج دو بڑی مخالف صفوں، دو بڑے طبقوں یعنی سرمایہ دار اور مزدور طبقوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو کی روش سے کمیون ازم کا مقصد ذاتی ملکیت کو ختم کرنا نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ ملکیت کو مٹانا اس کا نظر ہے۔ سماج کی پیداوار کو اپنے تصرف میں لانے کے حق سے کمیون ازم ہی انسان کو محروم نہیں کرتا البتہ وہ انسان کو اس

نگاہ سے انسانیت کی نظر سے

تصرف کے ذریعے دوسروں کی محنت پر دسترس حاصل کرنے کا اختیار نہیں دیتا مختصر یہ کہ آج کے سرمایہ دارانہ سماج میں حال پر ماضی کی حکومت ہے جب کہ کمیونسٹ سماج میں ماضی پر حال کی حکومت ہوتی ہے۔ جسے ہم سیاسی اقتدار کہتے ہیں وہ دراصل ایک طبقے پر ظلم کرنے کے لیے دوسرے طبقے کے منظم اقتدار کا نام ہے۔ کمیونسٹ سماج میں سارے طبقاتی امتیازات مٹ جاتے ہیں اور ساری پیداوار ایک قوم کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے اور نتیجے میں اقتدار عام کی سب سے اسی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

○ ہر سیرہ کسے کہتے ہیں ؟

مرثیہ کے وزن پر ہر سیرہ۔ مگر نظم کی اس شخص صفت کو کہتے ہیں جو ہجرے کی صورت میں حضرت عمر، ابو بکر اور عثمان کی شان میں کہی جاتی ہے یہ صفت متحرک لکھنوی کی ایجاد ہے۔ اسی سے ملتا جلتا "ہرزہ" ہے جس کے معانی ہیں "نام مقول"، "لغو" یا "بے ہودہ"۔

○ ہندی مسلمان سنگار ہے یا ہندوستانی ؟
مسلمان ہی ہندی کو اپنے ساتھ ہندوستان لائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے جو ان عورتیں اپنے ہات پاؤں شریف رنگ سے ضرور رنگی تھیں مگر وہ رنگ لاکھ کا ایک مرکب ہوتا تھا جس کو "ہندو" کہتے تھے۔ پوربی ہندوستان میں اسے "ہندو" کہتے تھے۔

○ شخصیت صورت سے پہچانی جاتی ہے یا سیر سے ؟

شخصیت نہ صورت ہے نہ سیرت، نہ حرکات و سکنات نہ شکل و مشابہت اور نہ محض کوہ دار ہے۔ دراصل شخصیت کئی باتوں سے مل کر بنتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں جبلت کو بھی دخل حاصل ہے اور راجل کو بھی، واقعات، حالات اور ان کے اثرات بھی شخصیت کو بنانے یا بگاڑنے میں بڑا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شخصیت انسان کا باطنی مزاج ہے جو مختلف قسم کی اخلاقی کیفیتوں سے بنتا ہے۔ انگریزی زبان کے ماہر لسانیات اور نقاد اسپنکارن نے اس سلسلے میں کہا تھا: "ہم اپنے دوست سے محبت کرتے ہیں، اس کی اچھی سیرت، حق

کوئی، دیانت داری، ذہانت، اچھی صورت، خوش مزاجی، تن
درستی اور اُس کے اچھے ادبی ذوق کے گردیدہ ہیں، اگر غور کیا
جائے تو دراصل ہم اس کی شخصیت سے محبت کرتے ہیں جو ان
جملہ خوبیوں سے مل کر بنی ہے اور پھر بھی وہ ان صفات سے
آزاد ہے۔ مختصر یہ کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی
کا پورا پورا اثر لیے ہوتا ہے، بڑا ہو کر جتنا اُسے شعور حاصل
ہوتا جاتا ہے جیسی اثرات اتنے ہی کم ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر
کے اثرات اپنا رنگ جاتے جاتے ہیں اور انہی مختلف رنگوں کے
امتزاج سے شخصیت بنتی ہے۔

○ ایک شاعر تھے مرزا چپائی۔ چپائی اُن کا
تخلص تھا یا لقب؟

جی وہ دہلی کے ایک بگڑے ہوئے رئیس خان دان سے تعلق
رکھتے تھے۔ نام اُن کا نذر اَدین تھا اور تخلص فخر، بڑے مالدار
کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی ماں نے منت مانی تھی کہ بیٹا ہوگا
تو اُسی کے مات سے قطب صاحب کی درگاہ پر جلوہ اور چپائی
بٹواؤں کی چٹان چہ وہ پیدا ہوئے اور جب اُن کو بڑا ہوا
لگا تو اُن کے مات سے چپائیاں بٹوائی گئیں، اپنے والوں نے مرزا
چپائی، 'مرزا چپائی' کہہ کر اُن سے چپائیاں مانگیں، اُسی دن
سے وہ مرزا چپائی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ وہ بلا کے قتلے تھے۔
ت کوٹ بولتے تھے۔ اُن کا ایک شعر انہی کی زبان میں ملاحظہ ہو۔

بنالی شوٹ میں شداد نے پریرہ نہیں سمجھا ؛
نہ میں جنت لے ٹاہل ہوں نہ جنت غیر ٹاہل ہے

آخری مصرع میں مرزا چپائی کو غریب نے اُگھیرا تھا، اُنچھا
اور جنگوں کی ایک چھوٹی سی دکان کر لی تھی بس اسی ذریعے سے
پیت پالتے تھے۔

○ اسلامی تہذیب ایرانی تہذیب سے کس
حد تک متاثر ہوئی؟

اس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے (جواب گرہ میں باندھ
لیں) کہ مذہب ان کی زندگی میں کوئی اہم ردول اور انہیں کرتار
مذہب محض ایک غرو ہے جو تھوڑے سے چالاک لوگ نگلاتے
جنگل سے کھانا کھاتے ہیں۔

ہیں اور بہت سے معصوم انسانوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ دراصل
کسی خطے کی آب و ہوا ہاں کے رہنے والوں کا مزاج بناتی ہے،
وہ مخصوص مزاج رسم و رواج کو جنم دیتا ہے اور پھر اس خطے کے
رہنے والوں کے معاشی حالات اُن رسوں اور رواجوں کو تہذیب
تہون کا رنگ دے دیتے ہیں۔ یہی نہیں بل کہ دولت، قدریں بدل
دیتی ہے اور وقت اور فاصلہ حقائق کو بھی بدل دیتا ہے اور یہ بھی
یاد رکھئے کہ ہر تحریک یا ہر مذہب کی ابتدا میں بے انتہا شد ہوئی
ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نرمی اور لچک آنے لگی ہے۔
اب اپنی بات کا جواب سنیے۔

ابتدا میں اسلامی تہذیب تمدن قطعی طور پر اسلامی تھے
جب اُمویوں نے مدینے سے نکل کر دمشق کو اپنا دارِ خلا ف بنایا
یعنی اپنا مقام بدلا تو نوے سالہ اموی دور میں شاہی تہذیب
نے عربی تہذیب کو خاصا متاثر کیا۔ اُمیہ خان دان کے بعد عباسیہ
خان دان نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا۔ اس خان دان کے مامون
اور ہارون جیسے مشہور خلیفہ اُن کے عہد میں بہت سی فتوحات
ہوئیں اور بہت سے ممالک سے دوستا د تعلقات قائم ہوئے،
نتیجہ میں دولت کی بہتات ہو گئی۔ چنان چہ مسلمان خلیفہ اُن کی
سادگی شان و شوکت میں اور روحانیت عادت میں بدل گئی۔
عرب کے ریگ زار میں مجلسی ہوئی زندگی گزارنے والوں نے جب
اپنے مفتوح ملک ایران کا موسم بہار دیکھا، باغ دیکھا، ساقی
دیکھا اور جام و مینا دیکھا اور ایرانی قصر کا عیش و آرام دیکھا
تو اسلامی قدروں کو بھلا تے ہوئے ایران کی ہر شے اور ہر اچھی
بڑی قدر کو اپنا لیا۔ ایرانی تعریات، آداب مجلس،
ملبوسات، وضع قطع، سیر و شکار، جلوس و جشن، رقص و
سرود، شعر و شاعری، شراب و کباب، فن تعمیر، فنون لطیفہ
غرض کہ زندگی سے متعلق ساری ایرانی لوازمات عرب کے
مسلمانوں نے قبول کر لیے حد یہ کہ 'اپنے اللہ اور رسول کی زبان'
عربی کو ترک کر کے وہ ایران کی زبان فارسی بولنے اور لکھنے لگے
در اصل اسلام کے ابتدائی (صرت) 29 برس قبائلی نظام
کے تحت گزرے اور پھر فوراً ہی اسلام جاگیر داری عہد

میں داخل ہو گیا، چنانچہ جب سلمان فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ جاگیر داری شائستگی کا تصور تھا جس میں محمود دایا ز کا منہیں بل کر حاکم و محکوم کا فرق نمایاں تھا حسب نسب کا بڑا پن بھی اس کے ساتھ تھا اور ہر غیر اسلامی قدر کو وہ اپنائے ہوئے تھا، اسلام کا بس نام ہی اس کے ساتھ تھا یعنی وہ برائے نام ہی اسلامی تھا۔

○ یہ کس کا شعر ہے ؟

اک زرا آب کو ز حمت ہوگی

آب کے پاؤں کے نیچے دل ہے

یہ سراج لکھنوی کا شعر ہے۔

○ نفعیات کی رو سے اُن کی وضاحت کیجئے

کیا یہ بُری چیز ہے ؟

انگریزی میں اُن کو موعہ کہتے ہیں اُردو میں اس کا ترجمہ 'الغو' بھی کرتے ہیں نفعیات میں اُنانیت کی بہت سی قسمیں بتائی گئی ہیں جن میں ایک خُدر پرستی بھی ہے جو دراصل اُنانیت کی ایک بُری ہوئی صورت ہے۔ اُنانیت ایک برائی ضرور ہے مگر فن کاروں کے لیے یہ ایک ضروری برائی بنی رہی ہے۔ ہمارے ادب کی بعض شخصیتیں تو خُدر پرستی کی حد تک اُنائی (Animism) تھیں۔ جیسے مرزا غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد۔

○ 'مدینہ' اخبار کی پیشانی پر جو یہ شعر لکھا ہوتا ہے اُس کے معنی کیا ہیں ؟

معجزہ شوقِ آلِ قمر کا ہے مدینہ سے عیاں

مہ نے شوق ہو کر لیا ہے دین کو کاغوش میں

یہ شعر عزیز لکھنوی کا ہے اور اردو شاعری کی کاریگری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مدہ کاریگری یہ ہے کہ 'مدینہ' کی مہم ایک طوفان اور دوسری طوفان اور پھر درمیان میں صرت 'دین' رہ گیا یعنی م + مہ = جب مہ (یعنی شوق) دو ٹکڑے ہو گئے، جو پیغمبر دین کے ایک معجزہ کی جانب اشارہ ہے، ہو گیا تو ظاہر ہے بیچ میں 'دین' ہی رہ گیا۔

○ کیا تخلص کا شاعر یا ادیب کی شخصیت،

کر دار یا اس کی عام زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے ؟ دراصل تخلص ولی صداقت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہوتا ہے ادیب یا شاعر اپنا ادبی نام یا تخلص رکھتے وقت ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنی فطری کیفیت یا اپنی (ناآسودہ) خواہش کو نمایاں کرتا ہے یعنی بعض شاعر اپنے تخلص کے توسط سے وہ بتاتے ہیں جو وہ ہیں جیسے شوکت علی خاں فانی سائن کی ذات میں شان و شوکت بالکل نہیں تھی بل کہ وہ منہی، ہلاکت اور موت کی زندہ تصویر تھے یا میر تقی میر، زندگی بھر کچھڑے ہوئے رہے مگر اُڑیہ بتاتی تھی کہ وہ دوسروں سے نمایاں ہونا یا آگے نکلنا چاہتے تھے اس ناآسودہ خواہش کا نتیجہ تخلص میر (یعنی سردار، سالار، چودھری) مقدم، ہادی، رہنا، پیشوا، سید یعنی اعلا ذات) تھا۔

○ 'ادھیڑ' اور 'معر' انسان کی عمر کا کون سا حصہ ہوتا ہے ؟

چند برس پہلے جب عالمی ادارہ صحت کے تحت ماسکوس ایک سیمی نار منعقد ہوا تھا۔ اس میں جوانی کے بعد کی عمر کو چار حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا:

1۔ ادھیڑ عمر: 54 برس سے 59 برس تک

2۔ معمر: 60 " " 74 " "

3۔ بڑھاپا: 75 " " 90 " "

4۔ بہت بڑھاپا: 90 برس سے بعد کی عمر

اسی سیمینار کی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو لوگ اپنے

آپ کو قبل از وقت بڑھاپے سے بچائے رکھنا چاہتے ہیں تو

اُن کو چاہئے کہ وہ چلتے پھرتے رہیں اور کام کرتے رہیں، اچھی

خُراک کھائیں اور تمباکو اور شراب نوشی سے دور رہیں۔

○ مغل حکم برائ کسی کو عہدہ دار بناتے وقت

بیچ ہزاری یا ہفت ہزاری کا منصب دیتے تھے مگر

کیا وہ عالموں کو بھی کوئی خطاب دیتے تھے ؟

مغلیہ دورِ حکومت میں عالموں کے لیے چار بڑے خطاب

تھے: (1) ملک اُل علماء: یہ خطاب سب سے بڑے عالم کے لیے تھا۔

(2) نقیب ال اولیاء، صاحب طریقت سنی، کو یہ خطاب دیا جاتا تھا۔

(3) ملک ال اطباء، شاہی طبیب کو اس خطاب سے نوازا جاتا تھا۔

(4) رکن ال مدرّس، ایک ایسا عالم استاذ کہ جس نے ہمے بن لو ملک بھر میں مان لیا گیا ہو اور جس کے زیادہ سے زیادہ شاگرد ہوں یہ خطاب پاتا تھا۔

○ عالمی سطح پر اسلامی معاشرہ کے زوال کی کیا وجہ ہے ؟

جب اسلام آٹھویں صدی میں پہنچا تو اسلامی معاشرے میں عقلیت پسندی اور دین کی آزادی (لبرل ازم) کا رجحان پیدا ہوا۔ مسلمان یونانی علوم کا مطالعہ بڑے ذوق شوق سے کرتے لگے۔ ان کی تعلیم 'رہایتی اسلامی' نہ رہ گئی بلکہ اس میں وسعت پیدا ہو گئی اور اس میں آفاقیت آگئی۔ جنان چہ مسلمانوں نے ذہنی، سماجی، تہذیبی و تمدنی اور اقتصادی طور پر خوب ترقی کی۔ اسی لئے عباسی دور کو اسلامی تاریخ کا سنہری عہد کہتے ہیں۔ مگر دسویں صدی سے اسلامی معاشرے پر زوال آنے لگا۔ زوال کی وجہ یہ ہوئی کہ امام غزالی نے جہاں تسوٹ اور اسلامی شریعت میں ایک امتزاج پیدا کر کے ابھھا کا کیا وہاں اسلامی شریعت کو محض چند بندھے ہوئے نیک اصولوں کا مرکب بنا کر بھول بھی کی۔ انھوں نے یونانی علوم پر اسلامی علوم کو ترجیح دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فکر محروم ہو کر رہ گئی، سوچنے،

اُدلنے بدلیے، سوال اٹھانے جانے یا انقلاب پیدا ہونے کے سائے امکانات ختم ہو گئے اور مذہبیت جامد و ساکت بن کر رہ گئی۔ تازہ علم کے در بند ہو گئے تحقیق کا جذبہ فنا ہو گیا اور مسلمانوں میں کثرین پیدا ہو گیا۔ سائنس اور دوسرے علوم کا وہ اثر ارتقا اور پھیلاؤ بند ہو ابل کہ تازہ علمی ہوا کو اپنے دریچے منہ پر کے آنے میں سے روک دیا گیا۔ نتیجے میں ذہنی ترقی نہ کی اور اس کا دوش نے لوگوں کے مادی اور معاشی مسائل پر حکومت کیا۔ اس سلسلے میں البیرونی کا کہنا تھا کہ بدیشی علم اتنی مخالفت علی وجہ

کی بنا پر نہ تھی بل کہ کچھ پس پردہ مقاصد بھی تھے۔ وہ ان لوگوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے جو غیر ملکی علوم کا مطالعہ کرتے تھے یعنی پیٹھے کی رقابت۔ دراصل ہر زمانے کے مولوی ملا اپنے ذاتی اور دینی فائدے کی خاطر آئندہ کی کئی نسلوں کو نقصان پہنچانے سے کبھی نہیں جوگے۔

○ اپنی احساسِ گم تری کو چھپانے کا طریقہ کیا ہے ؟

سب سے اچھا طریقہ تو یہ ہے کہ اپنی کسی ایک خوبی کو ملحوظ رکھئے اور خوش ہو کر قدرت کا شکر ادا کیجئے اور اپنی خالی کو دُر کر کے یا نظر انداز کرنے کی کوشش کیجئے۔ درہد ایک طریقہ یہ بھی ہے جو برنارڈ رٹشا نے اختیار کیا تھا۔ برنارڈ شلے کے چہرے پر چمپک کے داغ تھے وہ چون کہ خود دوسروں پر تنقید کرتا تھا اس لئے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے چہرے پر نقدانہ نظر ڈالے اس لئے اس نے داغ بھی رکھ لی تھی یعنی انہوں نے اپنی کم تری کے اس احساس کو داغ بھی کے پردے میں چھپانے کی بھول کی تھی۔

○ حسد کیوں پیدا ہوتا ہے ؟

زوال یافتہ یا پس ماندہ فرد یا قوم کی یہ بھی پہچان ہے کہ اس میں حسد اور جلن کا مادہ بے حد بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی کو اچھا کھاتے ہوئے اچھا پہنتے ہوئے یا خوش حال اور اونچے مرتبے پر نہیں دیکھ سکتے۔ کوئی نیک کام انجام دینے کے صلے میں اگر آپ کو نیک نامی حاصل ہوتی ہے چاہے وہ نیک کام دوسروں ہی کے فائدے کا کیوں نہ ہو وہ تب بھی آپ کی نیک نامی سے حلیں گے جو شخص آپ سے حسد کرتا ہے تو وہ اپنے حسد سے یہ واضح کرتا ہے کہ وہ آپ سے کسی دیکھی صحت میں کم ہے۔

○ مسلم لیگی ذہنیت کی پہچان کیا ہے ؟

سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والوں میں سب سے زیادہ لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کر کے بحث کرنے کا شوق کیوں نہیں ہو پتا ہے اور کوئی بات جانے بغیر بات پر اڑنا مسلم لیگوں کو آتا ہے دوسری جماعتوں کے لوگوں کی یہ کوشش زیادہ نہیں ہوتی کہ سارا جہان انہی کا ہم نوا بن جائے مگر مسلم لیگی بہر صورت (بہر قوت

بھی) یہ چاہتا ہے کہ سب اُسی جیسے ہو جائیں۔ دراصل مسلم لیگی کی یہ ذہنیت وہ 'مسلمان ذہنیت' ہوتی ہے جس کے متعلق شوکت تھانوی نے ایک بار کہا تھا: 'اگر اللہ میاں بھی زمین پر اترا آئیں تو مسلمان اُن سے بھی بعد سلام کے ہی کہے گا، اللہ میاں! مسلمان ہو جاؤ'!۔ غرض کہ مسلم لیگی ذہنیت بہت ہی Typical (انتیاری) ہوتی ہے۔

○ جس قوم کا اخلاق اچھا ہوتا ہے وہ ترقی کرتی ہے اور بُرے اخلاق کی قوم کو زوال سے واسطہ پڑتا ہے کیا یہ بات درست ہے؟

ضروری نہیں۔ جن ترکوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور بھٹان کو فتح کیا تھا وہ اُن راج پوتوں کی نسبت زیادہ با اخلاق نہیں تھے جو مفتوح بنے۔ دراصل ترکوں کی فتح یا بی کی وجہ یہ تھی کہ وہ زیادہ باہمت تھے اور جن جنگ میں زیادہ ترقی یافتہ تھے، نسل کی فوقیت اور مذہب ہونے کے احساس نے اُن کو باہمت بنایا تھا اور ظاہر ہے کہ با اخلاق اور نیک بندوں میں یہ احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح جنگ کا ترقی یافتہ فن بھی انھوں نے اپنے مذہب یا اخلاق سے نہیں سیکھا تھا بلکہ اُن کی خانہ بدوش زندگی اُن کو جنگ کا ہر نیا طریقہ سکھاتی رہتی تھی۔ آج کے دنوں میں یہ سامنے کی بات ہے کہ امریکا انگلستان سے زیادہ طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک ہے جب کہ انگریز امریکیوں سے زیادہ با اخلاق ہوتے ہیں۔

○ بھیک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جی ہاں خیرات، زکات اور دان کو ہر مذہب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام میں تو زکات کو پانچ ارکان میں ایک رکن قرار دیا گیا ہے اسی طرح ہندو مت کی رو سے انسان کی زندگی میں دان کو بڑی اہمیت اور دانی کو بڑا مرتبہ ہوا ہے اور عیسائیت میں بھی چیرٹی کو معاشرے کے سدھار کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ مذہب اور مذہبی معاشرے اقتصادی مسائل کو مکمل طور پر حل نہیں کر پائے اسی لیے ہر مذہبی معاشرے میں بھیک، دان، چیرٹی، خیرات یا زکات کی گنجائش موجود ہے

مگر بھگت مستانی نسلاں ہو

مگر کیونست معاشرے میں بھیک یا بھکاری جیسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی کیونکہ انہیں معاشی مسئلے کا مکمل حل موجود ہے۔

○ سکرپٹ پینے کی عادت کس طرح چھوڑی جائے؟

تب کو نوشی ترک کر دینا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ صرف قوت ارادی کے ساتھ عمل سے آپ سکرپٹ نوشی ترک کر سکتے ہیں۔ تب کو نوشی چھوڑنے کے لیے سب سے زیادہ نیک اور شجہ دل بیماری یا بیماری کے فوراً بعد کے دن ہوتے ہیں۔ بیماری سے مراد قدرت نہ کرے کوئی بڑی یا طویل بیماری نہیں، چند دن کا بخار بھی ہو سکتا ہے۔ بہر نوع بیماری کے دنوں میں یا بیماری کے فوراً بعد کے دو تین دن میں تب کو نوشی کی خواہش بھی کم ہوتی ہے اور پینے پر بد مزگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے انہی دنوں قوت ارادی سے کام لے کر سکرپٹ نوشی ترک کر دیجیے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ رفتہ رفتہ (کم کرتے کرتے) تب کو نوشی ترک نہیں ہونی، میں کہ ایک بار میں پیشہ کے لیے آپ کو سکرپٹ چھوڑ دینا ہوگی۔ میں نے اپنی بائیس سالہ پرانی تب کو نوشی (پاؤں نوشی) ایک ہی لمحے میں ترک کر دی۔ تب کو نوشی جہاں صحت کے لیے مضر ہے وہاں خون پینے کی حلال کمائی کا بڑا مضحکہ خیز مصرت ہے

○ پہلا اُردو اخبار کون سا تھا؟

'جام جہاں نما' (ہندوستانی) اردو کا پہلا (مہفت روزہ) اخبار جو کلکتے سے 28 دین مارچ 1822ء کو شائع ہوا۔ فورٹ ولیم کے خزانے میں کام کرنے والے ہری ہر دت نے یہ اخبار جاری کیا تھا اور لالہ اسود ماسوک نے اس اخبار کو ایڈٹ کیا تھا۔

○ 18 ویں صدی میں ہندوستان کے اخلاقی اور معاشرتی زوال کے اسباب کیا تھے؟

کوئی بھی سبب اخلاقی یا مذہبی نہیں تھا۔ اُن دنوں ایک مخصوص طبقہ حکومت کر رہا تھا یعنی محنت دوسرے کرتے اور محنت کے حاصل کو وہ حکم راں طبقہ سیاسی، انتظامی اور فوجی ضروریں بنا کر مختلف شکلوں کے بہانے یا زبردستی اپنے قبضے میں کر لیا۔

تھا۔
○ کیا آپ یہ اعتراف کریں گے کہ عام مسلمان پاکستان نواز ہے؟

جی ہاں ہر خاص و عام ہل کہ ۱۹۹۹ء میں ہزار مسلمان پاکستان نواز ہیں اور اکثر معاملات میں ہندوستان پر پاکستان کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جب تک کرکٹ میچ ہوتا ہے تو ہندوستانی مسلمانوں کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ پاکستانی ٹیم کی فتح ہو کسی پاکستانی کھلاڑی کے اچھا کھیلنے پر ہندوستان کے مسلمان نوجوان اپنے گلی کوچوں میں اس کی تصویر کو بھول ہار پہنا دیتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے وجود کو دنیا کے ہر ملک نے تسلیم کر لیا ہے، یو این او نے اس کو اپنا ممبر بنا لیا ہے اور حد یہ ہے کہ پاکستان اس کو مان کر اپنی شکست کا اعلان کر چکا ہے مگر مدعی سست گواہ حجت کے مصداق ہندوستان کے مسلمان نے پاکستان کی ہم دردی میں بنگلہ دیش کی حقیقت کو آج تک نہیں مانا۔ بنگلہ دیش میں جب کبھی کوئی سلاب یا سمندری طوفان آتا ہے تو ہندوستان کے اردو اخبارات اس کی خبر سب سے پہلے دیتے ہیں اور پہلے صفحے پر دیتے ہیں اور مسلم قارئین ایسی خبریں مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ نہ صرف پاکستان کو بل کہ ہندوستان کا مسلمان ہر سال ملک کو ہندوستان سے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں ایران کا بادشاہ عوام کے نمائندے صدر جمہوریہ ہند سے بہتر ہے۔ ہر اردو اخبار سعودی عرب کی بادشاہت کی تعریف و توصیف میں مبالغے کی انتہا کر دیتا ہے مگر یہ کوئی نئی بات نہیں، ہندوستانی مسلمان کا مزاج ہمیشہ ہی ایسا رہا ہے جب پاکستان نہیں بنا تھا تب بھی وہ 'میرے مولانا کو دینے مجھے' کا کارہ اپنے وطن سے بے زاری کا اعلان کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے وطن ہندوستان کی آزادی کے لئے قربانی دینا ضروری نہیں سمجھا مگر ترکی میں اس خلافت کو برقرار رکھنے کے لیے سرحدوں کی بازی لگا دی جس کو خد ترکوں نے ختم کر دیا۔ اگرچہ خلافت کی 'شہادت' کو نصف صدی گزر گئی مگر ہندوستان میں آج بھی خلافت کی کمی موجود ہے اور خلافت اوس واقع ہے۔

مگر اس سلسلے میں ہندوستانی مسلمان صرف پیس فی

تھا۔ کسان غلہ پیدا کرتا مگر غلہ یا تلے کی قیمت شاید ہی افسران، جاگیردار، زمین دار اور ان کے چلی چلے وصول کر لیتے اور کسان کے پاس بس اتنا چھوڑتے کہ وہ بمشکل تمام کاشت کاری کے تسلسل کو برقرار رکھ پاتا۔ صنعت پیشہ لوگوں کو بھی خام مال حاصل کرنے سے چیزیں بنا کر فروخت کرنے تک بہت سے ٹیکس دینا پڑتے۔ برے لوگ اچھے کاری گروں کو اکثر اپنے قبضے میں رکھتے اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے مال تیار کر دیتے اور اپنی مرضی ہی سے وہ مال فروخت کرتے۔ بادشاہ کے اختیاراً غیر محدود ہوتے تھے اور اس کی سیاست کی تلوار شکنی ہوتی تھی معیشت کے اس نظام کو ہندوستان میں 'جاگیر' کہا گیا اور یورپ میں 'فیوڈل'۔ چنانچہ جب رعایا قطعی طور پر بادشاہ اور امراء کی دست نگر ہو گئی اور بادشاہ اور امراء ہنہ چوہ اور تاجروں سے مل کر جمہور رعایا کو ایکس پلاٹ (Explot) کرنے لگے تو قومی اخلاق پر بھی زوال آیا تو معیشت پر بھی۔

○ انگریزی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کس نے کیا؟

مولانا محمد علی ہندوستان کے وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

○ مغل سلطنت کے زوال کا سبب؟

اورنگ زیب کی ریا کاری۔ اورنگ زیب میں ملک گیری اس کا عالم گیر لقب اختیار کیا بھی اس کی ملک گیری کی انتہائی سعی ہوئی خواہش کو واضح کرتا ہے) کی ہوس بہت تھی جب کہ وہ سیاست سے واقف نہیں تھا اور اپنی اس ناواقفیت پر اس نے اسلامی شریعت کا پردہ ڈال رکھا تھا وہ حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا تھا نتیجے میں وہ ہمیشہ سیاسی گتھیاں سلجھانے کی نا کام کوشش کرتا رہتا۔ اور یہ سیاسی گتھیاں اس کو ہمیشہ جنگ جاری رکھنے پر مجبور کرتا تھا چنانچہ اس کے امراء اس سے عاجز آچکے تھے اور اس کا خزانہ خالی ہو چکا تھا اور پھر اورنگ زیب نے ایسا کوئی وارث پیدا نہیں کیا جو اس کے بعد اس ملک کو سنبھال سکتا جس میں انتشار پیدا ہو چکا

اسماعیل کو اسماعیل، ہارسے میں گوارہ میں، مغفرت کو مغفرت، حضرت کو حضرت، سیرت کو سیرت، زکات کو زکوٰۃ، قوت کو قوت، اٹھیں کو اٹھیں، اُن کو اُن، اُس کو اُس، رسم خط کو رسم الخط، بین الاقوامی کو بین الاقوامی، اُلٹو کو اُلٹو، اچھا کو اچھا، تیار کو طیار، تپش کو طیش، توتا کو طوط، امریکا کو امریکہ، راجا کو راجہ، کل کو کلہ، وہ کو دے، ہے کو ہی، ہاتھ کو ہاتھ، کوسٹ، ی کوی، یہ کو یہ اور ایسے رجحون لفظوں کا اطلاق چکا ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو لفظ کو زیادہ سے زیادہ صوفی اور سائنسی رنگ بنایا جائے یعنی اردو اگر واقعی ہندستان میں پیدا ہوئی ہے تو اس کو اردو رسم خط میں لکھا جائے نہ کہ عربی رسم خط میں۔

○ مرزا الہی بخش کون تھے ؟

انھوں نے تجربہ کر سہا در شاہ ظفر کو انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کر لیا تھا۔ انگریز مصنف باسور تھا اسمتھ نے الہی بخش کو ٹریڈر آف دی کہا ہے پرنٹرس کا بھی مرزا کے بارے میں کہنا تھا کہ وہ فاتحوں کی ادنا بخش لودی کے لیے اپنے باب کو بھی بچھا داسکتا ہے۔

○ 'خانہ ساز آشنا' کسے کہتے ہیں ؟

لکھنؤ میں حسن بازار کی اصطلاح میں 'خانہ ساز آشنا' اس مرد کو کہتے ہیں جسے طوائف اپنے جی کے اٹکاؤ کے لیے لگا رکھتی ہے، اگرچہ ایسا مرد شوہر کا نسیم بدل ہوتا ہے مگر وہ خدا اس کو پالتی ہے وہ خدا اپنے آشنا کے خرچ پر نہیں پتی۔

تراش و تمنا میں لذت وہ پائی
دعا کر رہا ہوں کہ منزل نہ آئے

صدی تصور دار ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر متوسط گھرانے میں ایک آدھ فرد ایسا ضرور ہوتا ہے جو ذہنی طور پر گھر کے دوسرے افراد سے میل نہیں کھاتا۔ اور وہ گھر میں کم باہر زیادہ دل چسپی لیتا ہے۔ گھر کے افراد بھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں ان ناخوش گوار تعلقات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گھر والوں کے مقابلے میں باہر والوں کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ مگر اس ترجیح کے یہ معنی کبھی نہیں ہوتے کہ اس کو اپنے گھر والوں کے مقابلے میں باہر والوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے یا غیروں سے دوستی اُس کے لیے منافع بخش ثابت ہوتی ہے بل کہ وہ یہ سب کچھ اپنوں کو Tease (دق کرنے، جلانے یا ستانے) کرنے کے لیے کرتا ہے۔ گھر والے جس کو اپنا دوست سمجھیں گے وہ ضد کے طور پر اُس کو اپنا دشمن قرار دے گا۔ اور جس پڑوسی یا محلے دار سے گھر والے نہ ملنا چاہیں گے اُن سے وہ ضرور ملے گا۔ دراصل کسی فرد کی مخاصمت کا یہ انداز اُس کے ذہن کے ناچختہ و نابالغ ہونے کی دلیل ہے۔ اگر گھر والوں کے تعاون سے اور دوستانہ فضا میں صحیح طور پر اس کا ذہن نشود نہ پایا اور اس کو درست تسلیم و تربیت ملے تو وہ بھی گھر کے دوسرے افراد کی طرح ایک ذمے دار فرد بن سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ہندوستانی فرقوں کے تعاون سے اگر ہندوستانی مسلمان کے ذہن کو تعلیم و تربیت ملے گی۔ روشن کر دیا جائے تو اس کو اپنے وطن ہی میں وہ خوبیاں نظر آنے لگیں گی جو وہ دوسروں کی سرزمین میں تلاش کرتا پھرنا ہے۔ جس طرح صالح غذا سے انسان کا جسم نشوونما پاتا ہے بلکہ اسی طرح انسانی ذہن کو پختہ، بالغ اور باشعور بننے کے لیے صالح تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ جیسے جیسے مسلمان کے جسم کو گائے کے گوشے جیسی ناقص غذا اور ذہن کو سخی شدہ مذہب کا شہرہ میسر آتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان کے اعمال تو بڑے ہی مگر اس کا ذہن بڑا نہیں۔

○ کیا پہلے کے مقابلے میں آج کا اردو اعلیٰ کچھ بدلا ہوا ہے ؟

نہ صرف کچھ بل کہ بہت زیادہ بدل چکا ہے۔ پہلے بھول کو بھول، بھی کو ہی، جائزہ کو جائزہ، استھان کو استھان، بھٹ کو بھٹ، گاؤں کو گاؤں، چارپائی کو چارپائی، پنچی کو پنچی، نوان کو نوان، دنوں غنہ استعمال میں نہیں تھا، اسحاق کو اسٹن، مولانا کو مولانا

گلن تھانڈستانی ملان نمبر

پیشانیہ محبت
پیشانیہ مسرت

برہنہستانی کے لئے

سَلِیْم اور جَوید

کے جانب سے



جاتا ہے تھوڑی دُور ہر ایک راہ روکے ساتھ
بہچانتا نہیں ہے ابھی راہ بر کو وہ

کاروانیاں کی جست

بے راہ اور مسحور لوگوں کے ہجوم کو نہیں
بل کہ ہوش مند اور راہ شناس انسانوں کی تنظیم کو
انجمن کہتے ہیں

469 -



ہنگن کا مہندستانِ اُردو

پیغامِ امن و امان

سب کے لئے
شانتی سال

(ڈراٹا، پریم پریت، اور آخری ڈاکوٹ کے فلم ساز)

گئے جانب سے

دشنوتیشونی سبھا کلکتا

مسلم جماعت تو نہیں تھی مگر ہندوستان کی پہلی سیاسی جماعت تھی جو 6 ستمبر 1841ء کو کلکتے میں قائم ہوئی۔ بالکل بوس کے مکان پر چند شغافہ و امرا جمع ہوئے اور بنگلہ زبان میں تقریریں ہوئیں اور پھر یہ تجویز پاس ہوئی کہ مذہب و ملت اور رنگ و نسل کے فرق کے بغیر اس انجمن کا ہر کوئی ممبر بن سکتا ہے۔ اس سبھا کی پہلی ہی میٹنگ میں یہ بھی طے ہوا کہ اگلے سال کی خدمت میں ایک عرضی بھیجی جائے اور اپنی غریبوں کی دادرسی کی جائے اور ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا جائے تاکہ اس کے ذریعے ہندوستانیوں کے حقوق کا ذکر کیا جائے۔

مہٹاں ڈی فنس ایسوسی ایشن علی گڑھ

1893ء میں ممبئی میں ہندو مسلم فساد ہوا جس کے نتیجے میں شری بال گنگادھر تلک نے ستمبر 3 1893ء سے یونانی ہر برس دس دن کا گنتی کا ایک میلہ جاری کیا جس کے جنوسوں میں مسلمانوں اور انگریزوں کے خلاف گیت گائے جاتے تھے۔ مسرتیڈ کے ساتھی علی گڑھ کالج کے پرنسپل مشربیک جو ہندو مسلم تعلق کو نبھانے سے کبھی نہ کچے تھے 3 ستمبر 1893ء کو محمدن ایٹکلو اور ٹیل ڈی فنس ایسوسی ایشن آف انڈیا کے نام سے مسلمانوں کی ایک انجمن بنائی۔ مقصد یہ بیان کیا گیا کہ انگریز حکومت کے سامنے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ذرا دکرنا، مسلمانوں میں سیاسی سورش پھیلنے سے روکنا اور ان تدارک میں مدد دینا جو حکومت برطانیہ کے استحکام میں معاون ثابت ہوں۔

تحریک ریشمی خطوط دیوبند

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مولانا محمود حسن (جو بعد میں شیخ ہند کے نام سے مشہور ہوئے) انگریزوں کے سخت دشمن اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے انتہائی مخالف تھے اور سلطنت عثمانیہ کے پرجوش حامی تھے۔ 1895ء سے انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش شروع کی اور اس سلسلے میں انھوں نے سلطنت عثمانیہ کے بعض سربراہوں سے اور حکومت افغانستان سے ملا جلی۔ 1905ء میں انھوں نے آزادی کے لیے ایک خفیہ محاذ قائم کیا۔ دیوبند میں بابو محبوب کی کوششیں کابلے روٹی شمالی کمرہ اس محاذ کی حیدر گریسوں کا مرکز بن گیا۔ پلان یہ تھا کہ محاذ کے دو حصے ہوں، ایک ملک کے باہر اور دوسرا ملک کے اندر۔ بے روٹی ملک کا محاذ ایک آزاد ہند حکومت قائم کرے جس کے تحت ایک فوج تیار ہو جس کو روس، جرمنی، ترکی، ایران وغیرہ کی فوجی مدد حاصل ہو۔ دوسرا حصہ ہندوستان پر چڑھ کرے اور اسی وقت ملک کے اندر کے محاذ سے خان عبدالغفار، مولانا سیف الرحمن، پیر غلام محمد اور پیر لگاڑی کے رہنمائی میں لجنات ہو جائے۔ شیخ ہند کی اس تحریک میں مولانا عبد اللہ سندھی (جو شیخ ہند کے شاگرد رشید تھے)، راجا ہندو پرتاب سنگھ (غدیاری کے رکن) مولانا محمد میاں انصاری (بانی دارالعلوم دیوبند) مولانا قاسم نانوتوی کے نواسے، ناظم دینیات علی گڑھ کالج مولانا عبد اللہ انصاری کے بیٹے محمد نولانا خلیل احمد سہارن پوری کے بھتیجے تھے اور مولانا حامد اللہ انصاری غازی کے والد محترم تھے۔ منصور انصاری ان کا انقلابی رفیق نام تھا، ڈاکٹر سچندر داس، سردار الیشور سنگھ، مولانا حسین احمد مدنی، جرمن فوج کے ایک افسر (مقیم کابل)، سان فرانسسکو (امریکا) اور شکھائی (چین) کے چند انقلابی، کابل سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عبدالرزاق، کپتان ظفر بے (جو 1904ء کی جنگ میں ایک بڑی جنگی قوت کے گولنداز تھے)، شیخ سنوسی (طرابلس)، الورد پاشا (ترکی کے وزیر جنگ)، جمال پاشا (ترکی کے سلاطین)، غالب پاشا (مدینے کے ترکی گورنر) اور لاہور کالج کے چند انقلابی فوجی شامل تھے۔ مولانا عبد اللہ سندھی کو شیخ ہند کا نائبیت باہر جانے کا حکم ہوا اور اہلکار بانی کے بڑے بھائی شیخ عبد الحمید کی بیوی نے اپنا سارا زور پیر مولانا سندھی کے اس سفر کے لیے خرچ فراہم کیا۔ وہ ہندوستان کی سرحد (یا افغانستان) سے گزر کر 15 اگست 1905ء کو کابل پہنچ گئے۔ کابل میں راجا ہندو پرتاب نے ایک آزاد مملکت جمہوریہ ہند قائم کر لی تھی اور شہری اس کے سردار تھے۔ 1915ء میں شیخ ہند مولانا منصور انصاری کو

ساتھ نہ کر دینے گئے وہاں انھوں نے ترکی کے سربراہوں سے امیر افغانستان، امرا افغانستان اور قبائلی سرداروں کے نام خفیہ خطوط اور دستاویزات لے کر مولانا منصور علی خان کو اس سارے کام پر مشرف ملکہ کی مدد سے شیخ ہند مولانا محمود حسن اور ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی، حکیم نصرت حسین سید ہاشم، مولانا سبزوگل مریدی، درویشی وحید بھی کثرت کر لیا گیا، چار چار برس کی سزا ہوئی اور ان میں امیر کر دیا گیا، اسی تحریک کے ایک مجاہد شیخ محمد ابراہیم کو روسی، ہندوستان، انگریز ایجنٹ نے قتل کر دیا، ایک دوسرے مجاہد ڈاکٹر مسٹر اسٹیکو کو حکومت روس نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا، ان کو ایک کم کم کس کے نتیجے میں بھارت کے دی گئی مگر اجا ہند، برتانیہ، گھانا، پاکستان، ہندوستان اور مولانا منصور علی خان نے یہ 30 برس تک افغانستان، روس، ترکی، آزادی کی جان اور پاکستان کے یہاں وہیں پر اب ان حال پھرتے رہے اور آخر مولانا منصور جنوری 1946ء میں کابل میں انتقال فرما گئے اور راجا ہندوستان اور مولانا حسین احمد مدنی ہندوستان واپس آ گئے۔

کہتے ہیں کہ آزادی ہند کی یہ تحریک رشی ودھانی رشی حوط کے ام سے اپنے شہر ہونے کی رشی کی طرح ہے کہ جسے ہوتے دستی رمال پر ایک قسم کی کمی کل سیاسی سے بیخام اٹھا جاتا تھا، اگر تحریر لفظ نہیں آتی تھی، آگ کی کرنی پڑنے سے حرمت نمایاں ہوتے تھے اور پڑے جاسکتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ رشی کی طرح کے یہ رمال ایک محفل میں رسم جڑی کاڑھے جاتے تھے۔ وہ رسم خط دیکھنے میں پھول پتے معلوم ہوتا تھا مگر جاننے والے اس کو پڑھ سکتے تھے۔ قطع نظر ان دونوں باتوں کے ایک اس پر بھی جانی ہے کہ وہ خطوط کڑی کے ہندو توں میں رکھ کر بھیجے گئے، ہندو توں میں ادیر کے رسم نے کھان بھر دیئے گئے تھے اور سچ میں خطر رکھ دیئے گئے تھے۔

محمد بن ابوبکر کی کل آرگنائزیشن لکھنؤ

نواب وقار الملک نے 22، 23، 24 اکتوبر 1941ء کو لکھنؤ میں حامد علی خاں علیک، میر سٹری کی کوٹھی میرا، جلسہ منعقد کیا، جس کے صدر بننے کے میر سٹری محمد شہزاد آدین تھے اس جلسے میں محمد بن ابوبکر کی کل آرگنائزیشن کا فیصلہ کر لیا، مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے رسم و رواج میں اصلاح کریں، اس عقیدے کو عام کر لیں ان کا مفاد اسی میں ہے کہ ہندوستان میں حکومت برپا کرنا اور اسلام حاصل ہو مسلمان اپنی فریاد ادب سے انگریز کے سامنے پیش کیا کریں، اس تنظیم کا یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکا جائے۔ یہ تنظیم صرف 5 برس چلی سکی۔

آل انڈیا مسلم لیگ علی گڑھ

انگریز ہندوستانوں کو ایک قوم کی صورت میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہاں یہ یہ سوچا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اپنی ایک الگ جماعت ہو۔ بسم اللہ خاں نواب ڈھاکہ نے 9 نومبر 1906ء کو ایک خبر برعاری کی جس نے ذریعے یہ اصلاح دی گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت کے نام سے ایک جماعت قائم کی جائے بزرگان قوم کے سامنے جماعت کے اعراس و مقامات اور مجبور کاموں کا خاکہ بھی پیش کر دیا گیا، دسمبر 1906ء میں مسلم فرقے کے نمائندے ڈھاکہ میں جمع ہوئے اور 30 دسمبر کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جہت ٹرا اسٹیم ہو جس کے نتیجے میں مسلم لیگ نے جنم لیا۔ مقاصد یہ تھے کہ مسلمان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارہ حیالات کو برقی دینا اور کس روائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہوئے اسے دور کرنا (2) مسلمان ہند کے پولیٹی کل حقوق و فرائض کی نگہداشت کرنا اور ان کی ریات اور ضابطات کو مودار طریقے سے گورنمنٹ میں پیش کرنا اور (3) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچانے کے لئے مسلمان ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت موافق نہ ہوں۔ مسلم لیگ کے قائم ہونے کی خبر جب انگلستان پہنچی تو دہلی کے اخبار ٹائمز نے بقول سر رضا علی اس بات پر خوشی سے لکھی کہ مسلمانوں کی ایک تنظیم سیاسی جماعت قائم ہو جانے سے اب ہندوستانوں میں اتحاد برقرار رہے گا۔ ملکی ہوائی سیاسی صورتوں کے پیش نظر سید درویش حسن نے (جوان انور) مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری تھے)

ہنگر نہ کھانڈ ستانی مسلمان نہ ہر

مسلم اکابرین کی رائے سے ایک باہداشت مرتب کی اور پھر دسمبر 1917ء میں سرآغا خاں کی صدارت میں لیگ کو سسل کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں سید فزیر حسن کی سفارشات کے تحت مسلم لیگ کا تہذیبی، برتاؤی حکومت کے زیر سایہ ہندوستان کے لیے ایک ایسی قدامتاً حکومت کا مطالبہ قرار پایا جو آئینی اصلاحات کے ذریعے سے حاصل کیا جائے اور جس کے حصول میں ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کیا جائے۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کا صدر فزیر علی گڑھی میں تھا مگر جنوری 1910ء میں سرآغا خاں کی ہدایت پر منتقل ہو کر لکھنؤ آگیا۔ 1930ء کے مسلم لیگ کے ارآباد کے اجلاس میں ڈاکٹر اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جدا گانہ اکثریت کے صوبوں (پاکستان) کا نظریہ پیش کیا مگر مسٹر جناح نے کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ 1940ء میں (22، 23، 24 مارچ) لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں مسٹر جناح نے ہندو اور مسلمان کو دو جدا گانہ قوم قرار دیتے ہوئے پاکستان کی تجویز کو منظور کیا۔

1906ء سے 1947ء تک جو ممتاز مسلمان مسلم لیگ کے صدر بنے ان میں سرآغا خاں، سرارہیم رحمت اللہ، فضل الٰہی حق، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی، ڈاکٹر اقبال، سرفہر اللہ خاں، سر دین حسن اور مسٹر جناح کے نام اہم ہیں۔ مسٹر جناح 1916ء اور 1924ء میں صدر رہے اور پھر 1937ء سے اپنے آخری دم تک (1948ء) بھی صدر رہے۔ آل انڈیا اسٹیشن مسلم لیگ کا الحاق پہلے آل انڈیا مسلم لیگ سے رہا وہ ہندوستان کی مسلم ریاستوں کی نمائندہ مسلم لیگ تھی۔ چونکہ ریاستوں میں جماعتی تنظیم ممکن نہیں تھی اس لیے آل انڈیا اسٹیشن مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے پٹروالوں ہی میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جنوبی ہند کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کو بھرپور قائل کیا اور اس کے پہلے صدر مدراس کے مسٹر اسماعیل بنے۔ آج کل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سلیمان سیٹھ ہیں۔

1937ء سے 1947ء تک ہندوستانی مسلمانوں میں مسلم لیگ ہی وہ سیاسی جماعت تھی جو سب سے زیادہ مقبول رہی، اس کو 99 فی صدی ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی اور وہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی۔

انجمن خدام کعبہ لکھنؤ

لکھنؤ کے فرنگی محل میں مولانا عبدل باری کے مکان پر حکیم عبدل دی لکھنوی، مولانا شوکت علی، مولانا احمد اشرف کچھوچھو، اور مولانا باری نے 1912ء میں انجمن خدام کعبہ بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے صدر کو صدر نہیں بلکہ خدام آل خدام کہا گیا۔ چنانچہ پہلے خدام آل خدام مولانا عبدل باری منتخب ہوئے۔ اور مولانا شوکت علی اور شیخ مشیر حسن قدرانی کو سیکریٹری بنایا گیا۔ مجلس عاملہ میں حکیم عبدل دی (لکھنؤ) مولوی غلام محی الدین دکیل (تصور)، نواب وقار آل ملک بہادر (امر دہم)، مولوی غلام محمد ذاصل (ہوشیار پور)، مشیر حسن قدرانی (بیرسٹر لکھنؤ) اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر (لکھنؤ) شامل ہوئے۔ انجمن کے بعض خدام (جیسے اقبال شیدائی اور ابوب احمد امیر) ایسے بھی تھے جنہوں نے زندگی بھر کعبہ کی خدمت کرنے کا عہد کیا تھا۔ خدام کعبہ پہلی مسلم انجمن تھی جس نے مالک اسلام کی جانب ہندوستان کے مسلمانوں کو متوجہ کیا، خلافت، تحریک کے لیے فضا ہم داری اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بھی کوشش کی۔

آل انڈیا مومن کانفرنس پٹنا

مسلم لیگ کے قیام کے آٹھ برس بعد 1914ء میں مومن تحریک شروع ہوئی۔ چونکہ مسلم لیگ قدیم جاگیر دارانہ نظام کی حمایت میں صرف سرمایہ دار اور اونچے طبقے کے مسلمانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتی تھی اور مسلم عوام کے مفاد کو نظر انداز کیے ہوئے تھی اس لیے مومن برادری اور دوسری پس ماندہ مسلم برادریوں کی نواح و بیہودی کے لیے آل انڈیا مومن کانفرنس قائم کی گئی۔ یہ کانفرنس اندامی سے انڈین نیشنل کانگریس کی ہم نوا رہی ہے۔ متحدہ ہندوستان میں آل انڈیا مومن کانفرنس کی نوعیت سماجی بھی تھی اور سیاسی بھی مگر آزادی کے بعد یہ خاص ایک سماجی و اقتصادی

ترک کی شکل میں زندہ ہے۔

خلافت کمیٹی دہلی

پہلی بڑی جنگ میں (۱۹۱۴ء) ترکی حریف کی طرف سے اتحادیوں (برطانیہ وغیرہ) کے خلاف جنگ میں شریک ہوا مگر جرمنی کے ساتھ ۱۹۱۸ء میں وہ بھی ہار گیا اتحادیوں نے ترکی کو تسلیم کر دیا، اس سے ہندوستان کے مسلمان ناراض ہوئے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں امرتسر میں ایک جلسہ ہوا اور۔
 نتیجہ میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی، مقصد یہ تھا کہ انگریز مسلم خلافت کو زیر توڑیں۔ خلافت کو یکے میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا یہ معظافہ کمال آنا ترک نے 23
 اپریل ۱۹۲۰ء کو انگریزوں کی طرف سے نیشنل اسمبلی قائم کر کے جب حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تو 22 نومبر ۱۹۲۲ء کو ترکوں کی اس قومی اسمبلی نے
 یہ طے کیا کہ حکومت اور خلافت کو الگ الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ کمال آنا ترک نے ۲۶ نومبر ۱۹۲۲ء میں خلافت کے سلسلے کو، طیفہ اور شیخ اسلام کے عہدے
 کو ختم کر دیا۔ ہندوستان کے وہ مسلمان جو خلافت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں آئے وہ ان کے ہاتھوں سے قتل کر دیے گئے ہوئے تھے ۱۵ مارچ ۱۹۲۶ء کو خلافت کے
 ٹوٹنے کی خبر سن کر شیخ بہ بل بلایئے ہندوستان اور مصر کے چند مذہبی ائمہ نے کمال آنا ترک کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ خود خلیفہ بن جائیں۔ جواب میں آنا ترک
 نے کہا کہ 2۵ ویں صدی میں خلافت ایک لے میں ہی خیز ہے اور وہ خلافت کے نام بہاد اور فضول سے عہدے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگرچہ خلافت ہاؤس بلور
 اس کا برائے نام ٹریسٹ کمیٹی میں اب تک موجود ہے مگر دراصل خلافت کمیٹی ۱۹۳۳ء کی تک زندہ رہی، آخری جلسہ کھنڈ میں ہوا اور آخری صدر سید محمد قاضی بہاد
 تھے۔

جمعیت علماء ہند دہلی

23 نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی کے، علی کے اجلاس میں جسے مسلمان علماء نے شرکت کی انھوں نے جمعیت علماء قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ
 28 دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں مولانا عبدعلی باری فرنگی محل کی صدارت میں جمعیت علماء کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، معنی کفایت اللہ جمعیت علماء کے صدر
 منتخب کیے گئے۔ علماء کی اس جمعیت کے قیام کا مقصد یہ بیان کیا گیا :-

’۱۸۵۷ء میں، علماء، حتیٰ کے ساتھ جو ہیما سلوک کہا گیا تھا اور جس بے دردی کے ساتھ علماء ہند
 کو پھانسی اور جلادطنی کی وحشیانہ سزائیں دی گئی تھیں اُس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ علماء کو مجبوراً گوشہ
 نشینی کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔ چونکہ مسلمانوں کی سیاست نے اب ۱۹۱۹ء میں پھر پلٹا کھایا
 ہے تو علماء امت نے دوبارہ سیاسی میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے۔ علماء کا مقصد ہے کہ غیر مسلم
 برادران کے ساتھ ہم دردی اور اتفاق، مذہبی حقوق کی نگہداشت اور مسلمانوں کی راہ نمائی...‘

جمعیت علماء نے اپنے 7ویں اجلاس میں جو ۱۴ مارچ ۱۹۲6ء کو کلکتے میں منعقد ہوا آزادی ہند کی تجویز منظور کی اور اُس نے اپنے 9
 ویں اجلاس میں کانگریس سے استراکھ عمل کرنے کی تجویز کو قبول کر لیا۔ جمعیت علماء ہمیشہ متحدہ ہندوستان کی حامی رہی اور تقسیم ہند کی مخالفت۔ ابتدا میں اس میں
 صرف مذہبی علماء ہی شامل ہو سکتے تھے مگر بعد میں اس کے دروازے ہر مذہب کے لیے کھل گئے۔ ۱۹۴۸ء سے علماء کی اس جمعیت نے سیاست سے دست کش
 رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

جو علماء اس جمعیت کے صدر رہے اُن میں مولانا محمود حسن، مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کے نام
 اہم ہیں۔ دراصل ہندوستان کے تمام بڑے اکابر علماء اسلام جمعیت علماء سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں۔

○ جو اپنے ملک سے محبت نہیں کرتا وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ پارکون

گلن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

خدائی خدمت گارلشاد

۱۹۲۹ء میں خان عبدالغفار خان نے پشاور میں خدائی خدمت گار جماعت کی بنیاد رکھی۔ جوں کہ بچانوں میں تشدد زیادہ تھا، وہ ایسوں ہی پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے، اُن میں بھوٹ تھی، آہٹ، اکاؤنٹس، اخلاق اور نیک عادتوں سے وہ محروم تھے اور اپنی روزی کے سلسلے میں مخلص نہ رہنا اُن کے لیے عام بات تھی۔ اس لیے اس جماعت کے نام میں خدائی حوالہ متبادل کیا گیا۔ خدائی خدمت گار کا نمبر بننے کے لیے قسمیہ طور پر یہ عہد کرنا پڑا ہے۔

خدائی خدمت گار ہوں اور چون کہ خدا کو خدمت کی ضرورت نہیں ہے لہذا خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ میں خلق خدا کی خدمت بغیر کسی غرض و مطلب، صرف خدا کے واسطے کروں گا۔ میں تشدد سے کام نہیں لوں گا، نہ کسی سے بدد یا انتقام لوں گا۔ مجھ پر چاہے کوئی کتنا ہی ظلم و زیادتی کرے میں اُسے معاف کر دوں گا۔ میں باہمی بھوٹ، گروہ بندی، دشمنی، خانہ جنگی سے دور رہوں گا۔ ہر ایک بچتوں کو اپنا بھائی اور دوست سمجھوں گا۔ سادہ زندگی بسر کروں گا۔ نیک کار رہوں گا۔ برائیوں سے جان بچاؤں گا۔ اور میں بے کامی کی زندگی بسر نہیں کروں گا۔ اور اپنی دردی اپنی کمائی کے پیسوں سے بناؤں گا۔

ہر خدائی خدمت گار کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر ۲۴ گھنٹے میں ۲ گھنٹے عہدانی مشقت فرزند کرے۔ اس جماعت کی دوسری سرخ رنگ کی ہوتی ہے اس لیے اس جماعت کو سرخ پوش جماعت بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس جماعت کے دروازے ہمہ کسی کے لیے کھلے رہے ہیں مگر غیر مسلموں کی عدم موجودگی کی بنا پر یہ جماعت مسلمانوں پر مشتمل ہو کر رہ گئی ہے۔

۱۹۲۹ء خدائی خدمت گار جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس، البتہ ہو گئی۔ مسلم اکثریت کے علاقے (صوبہ سرحد) سے متعلق ہونے کے باوجود یہ جماعت پاکستان کے قیام کی ہیئت میں آف اور متحدہ ہندوستان کی حامی رہی۔ پاکستان میں یہ جماعت آج بھی نہ صرف حزب مخالف کی حیثیت سے بل کہ ایک دشمن جماعت کے روپ میں پہچانی جاتی ہے۔

خدائی خدمت گار بچانوں کی ایک سیاسی و اصلاحی جماعت ہے۔ بادشاہ خان کی قیادت اور تربیت نے ایسا معجزہ کر دکھایا کہ جنگ جو بچانوں میں پیار و محبت، بھائی چارے کا جذبہ اور قوم پروری کا احساس پیدا ہوا اور وہ بچان جو اپنی غرض کے لیے اپنوں ہی کو قربان کر ڈالتے تھے وہ ملک و قوم کی خاطر جنگ آزادی میں شریک ہو کر بڑی سے چڑی قربانی سے نہیں چو کے۔

تبلیغی جماعت دہلی

سلطان محمد اسماعیل حسن جھانوی (ضلع مظفرنگر) کے صاحب زادے مولانا الیاس نے تبلیغی جماعت قائم کی۔ دہلی کی بستی نظام الدین کی ایک مسجد میں میوانی مسلمانوں کو کلمہ و نماز سکھانے سے بات کا ابتداء ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے باقاعدہ تبلیغی گشت (سفر) شروع کیا۔ مندرجہ ذیل ۶ باتوں کو اپنا مقصد بنا کر یہ جماعت اپنا کام انجام دیتی ہے۔

- (۱) کلمہ طیبہ کی تبلیغ اور نصیح (۲) نماز کے اندر کی چیزوں کی تعظیم (۳) تینوں وقتوں میں (صبح، شام اور رات) کا کچھ حصہ اپنی حیثیت کے مناسب اپنے آپ کو تحصیل علم و ذکر میں مشغول رکھنا۔ (۴) ان چیزوں کے پھیلانے کے لئے اصل فریضہ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بہ ملک رواج دینا (۵) اس پھرے میں خلق کی مشق کرنے کی نیت رکھنا (۶) اور نصیح نیت یعنی موت کے بعد والی زندگی

بانی جماعت مولانا الیاس کا قول تھا کہ میں نے لیے دنیا کا نفع اکھینچ باڑی کا لقمہ ان اور کار بار کا حرج برداشت کرنا) قربان کرنا بہتر سمجھو اور دین کے فروغ کے لیے جان و پنے کے تئوں کو زندہ رکھو۔ ان کا ارشاد تھا: 'جان کو بے قیمت کر دینا ہماری تحریک کا مقصد اور خلاصہ ہے!'

تبدیلہ فی جماعت کی تعلیم دوسری عام جماعتوں کے برخلاف بہت سادہ اور واضح ہے۔ جماعت کا صدر نہیں بل کہ 'امیر' ہوتا ہے، جماعت کا نہ کوئی حیندہ ہے، سفر میں ہر کوئی اپنا خرچ خود برداشت کرتا ہے جو تبدیلیی گفت و ذکر ہے اُسے 'ستولی کلام' کہتے ہیں۔ 3 جولائی 1944ء کو مولانا الیاس نے انتقال کے بعد اُس کے صاحب زادے مولوی یوسف حسین مقرر ہوئے۔

۱۹۷۸ء میں جب مولانا شوکت علی نے ذاتی ناراضگی کی بنا پر عیاد خلافت کی ناکو غیر آئینی قزاقی دیا تو مولانا ظفر علی خاں، خواجہ عبد الرحمان غازی جو دہری افضل ترقی مولانا غلاما، الشہداء بخاری، مولانا دادا دود غزلی، مولانا مظہر علی اعظم، مولانا حسین زمان دھیا نوری وغیرہ نے عیاد کے مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے ۱۹۷۹ء میں ۱۱ ستمبر کو مجلس احرار اسلام قائم کی۔ احزاب کا پہلا اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۷۹ء کو مولانا افضل خاں کی صدارت میں لاہور میں منعقد ہوا۔ غلاما الشہداء بخاری مجلس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ مجلس احرار کا مقصد یہ تھا کہ ملک آراد ہو اور غریب آسودہ ہوں، مہرستان میں سرمایہ داروں کی حکومت کے بجائے غریبوں کی حکومت ہو۔ مجلس احرار نے غریب مسلمانوں کے حالات کو مددگار بنانا اور خصوصی طور پر کسمپوشی کے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے بڑی حاشائی والی قریبیاں دیں، اور مدت قبل جسے کہ مدت میں ۵۰ ہزار رازداریوں میں چلے گئے۔ مجلس احرار نے بہت کائناتوں کی تائید کی اور مسلم لیگ کی نفی اور ستمبر ۱۹۷۹ء میں میرٹھ کے اجلاس میں احرار نے واضح طور پر دو ممبری بڑی جنم کے سلسلے میں انگریزی نوح میں بھرتی ہونے کے خلاف تجویز منظور کی۔ مگر پاکستان بن جائے کے بعد یہ مجلس احرار نے مسلم لیگ میں متال ہونے کی کھوار کی تاہم باقی علی خاں نے احرار لیون کی سخت مذمت کی اور تہذیب کے بعد مجلس احرار کو مسلم لیگ سے باہر نکال دیا۔

۱۔ کانپنہ اجلاس ۲۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو انارکلی مولانا ابوالکلام آزاد کی عداوت میں ہوا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں حب وطنی کا جذبہ پیرایہ کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ فرقہ پرستی سے دور رہیں۔ بعد میں اس پارٹی کے سب اراکہ اجلاس مقننہ میں متحدہ اردو دوسرے مرکز کی شہرہ میں بھی ہوئے۔ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کو ڈاکٹر سعید محمود، خان عبدالغفار، سید عثمان، ڈاکٹر انصاری، ولفسبرگ، احمد سخا، بشیر، رانا جیسے ممتاز اور قوم پرست مسلمانوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس پارٹی نے تعلیم یافتہ طبقہ کے حضرات میں تبدیلی ضروری کی مگر یہ بانی زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکی اور جو کچھ اس نے کام کیا تھا اس پر بھی بانی پھر گیا۔

۴۔ اپنی خدمت و گارحامی کے کام پائی اور مضبوطیت نے انگیزہ کو اپنی حمایت میں ایک نوجوانیت قائم کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ حکومت نے علامہ عنایت اللہ مشرقی کو اپنے اہل علم میں سے ایک نوجوان شریعتی راہنہ کی حیثیت سے مقرر کیا۔ انہوں نے علامہ مشرقی کی زیر نگرانی ۱۹۰۷ء میں جماعتِ خاک مارہ قائم کی۔ اس جماعت کی بنیاد جمہوریت کے بجائے آمریت پر رکھی گئی۔ خاک مارہ کو لازم تھا کہ وہ "مغرب کے بعدیہ فلسفے میں کم سے کم دھماکوں کو ٹھیک کرے۔ آئینہ کاسرہ برار رہے، اُن کو ایسا قتلوار دکھائے کہ ان کے علم فقہ میں سیدھے دے اور انھیں فوجی قواعد کرایجے۔ اللہ اور اسلام کی راہ میں ہر دے دے اپنی جان و مال بیاں رکے کہ اپنی اولاد بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ دوسرے زمین

اور اسلام کا اجتماعی غلبہ پیش نظر ہے۔ آپس میں اخوت ہو، سالار کا حکم بلا حجت ماننے اور مسلمان سے مذہبی اور سیاسی عقیدوں کے متعلق بحث

آخر مشرقی نے کانگریس، خلافت، احرار اور خدائی خدمت گار جیسی قوم پرست جماعتوں اور گاندھی جی جیسے قومی لیڈروں کی ہمیشہ خدمت کی اور انگریز بری بڑی جنگ میں انگریز حکومت کو 5 ہزار خاک سار جوانوں کی خدمت کی طرہ مشروط پیش کش کی، خاک سار جماعت نے جب لکھنؤ میں مولانا فزائی کی راہ ہوئے اور پھر وہ معافی چاہ کر مدہ ہوئے تو خاک سار جماعت کی سالگرہ گئی۔ 19 مارچ 1940ء کو خاک سار جماعت نے لاہور میں سرکنڈہ حیات خان، خلافت مولانا فزائی کی تولد پس نے گولی پیلا دی جس سے 100 خاک سار مارے گئے اور علامہ مشرقی گرفتار کر لیے گئے۔ اور آخر اس جماعت

شیعہ پولی ٹی کل کانفرنس لکھنؤ

مٹیا شیعہ پولی ٹی کل کانفرنس 1929ء میں لکھنؤ میں قائم ہوئی مگر اس کا پہلا اجلاس (راجا نواب علی خاں کی صدارت میں) 1930ء میں لکھنؤ اس کانفرنس کے وجود میں آنے کی وجہ تھی کہ رائے دہندگان کے حلقے وسیع ہو جانے کی بنا پر عام انتخابات کے سلسلے میں جب شیعہ امیر نذیر مہدی پر دسیا گیا ہوتا تو شیعہ امیر وار محض شیعہ ہونے کی بنا پر ناکام ہو جاتے جیسا کہ شیعوں میں جداگانہ طریق انتخاب کی خامیوں کا ہوا اور انھوں نے مغلوط انتخاب کی حمایت کرنا شروع کی تاکہ دوسرے فرقوں کی مدد سے وہ الیکشن میں کامیاب ہو سکیں اس ضرورت نے شیعوں نے سیاسی جماعت بنانے پر مجبور کیا۔

جماعت اسلامی ہند دہلی

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوت پر 75 مسلمانوں کے مشورے سے 26 اگست 1941ء کو لاہور میں جماعت اسلامی قائم ہوئی، مولانا مودودی بر منتخب کیے گئے، امیر جماعت نے مجلس شورا کا انتخاب کیا، شورا کے اجلاس میں جماعت کا لائحہ عمل وضع کیا گیا اور جماعت کے کام کو متعدد شعبوں میں جماعت اسلامی کا پہلا کل ہند اجتماع 1945ء میں پٹھان کوٹ میں منعقد ہوا، تقسیم ملک کے بعد جماعت بھی دو حصوں میں بٹ گئی آزاد جماعت کا پہلا اجتماع اپریل 1948ء میں الہ آباد میں ہوا جس میں جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ میٹ کو منتخب کیا گیا، مگر کل ہند اجتماع 1949ء میں رام پور میں منعقد ہوا، ابتدا میں ہندوستان کی جماعت اسلامی کامرکری ذریعہ آباد میں قائم ہوا تھا مگر 1949ء میں رام پور منتقل ہو گیا اور اسے دہلی میں ہے تقسیم ہند سے قبل جماعت اسلامی کے ارکان کی تعداد 256 تھی، بعد میں ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ارکان کی تعداد 2400 دلوں پر تعداد 2064 ہے، ابتدا میں جماعت اسلامی کا نصب عین حکومت الٰہیہ تھا، اس کی مترادف اصلاح 'اقامت دین' باقی ہے، یعنی مقصد حقیقی رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے، جماعت کے صدر کو امیر اور جنرل سیکریٹری کو قیّم کہتے ہیں۔ ملک کو 15 حلقوں میں بانٹ دیا ہے اور ہر حلقے کا سربراہ امیر حلقہ کہا جاتا ہے، جو ازاد جماعت کے عقیدے اور نصب عین کو ملتے ہیں جماعت کے نظم میں شریک نہیں ہو سکتے وہ جماعت کے ہم درد کہے جاتے ہیں اور جو جماعت کے مقصد سے حسن ظن رکھتے ہیں ان کی تعداد کی

جماعت کی جانب سے تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم ہے جو جماعت کے لیے لٹریچر تیار کرتا ہے۔ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کے لیے لٹریچر کی طباعت و اشاعت کے لیے علاحدہ دارالاشاعت قائم کیے گئے ہیں۔ اردو روزنامہ دوسرے روزہ 'دعوت' (دہلی)، اردو دہلی، (رام پور) ہندی ماہ نامہ 'کائنات' (رام پور) اور ملیام ہفت روزہ ماہ نامہ 'پروہدم' (کالی کٹ) جماعت کے آرگن ہیں انگریز

ہفت روزہ 'ریڈیفنس' (دہلی)، انگریزی سرمایہ 'اسلامک ٹھاٹ' (علی گڑھ)، اردو پندرہ روزہ 'آل حسنات' (رام پور)، ہندی ماہ نامہ 'مادی' (رام پور) اور اردو پندرہ روزہ 'نور' (رام پور) بھی جماعت اسلامی کے نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند اگرچہ کہنے کو سیاسی جماعت نہیں ہے مگر اس کی کشمیر کی شاخ کھلے کی برس سے واضح اور علانیہ طور پر سیاست میں حصہ لے رہی ہے۔ اپنے کل ہند 5 دیں اجتماع (دہلی 74، 19) میں جماعت نے بھی یہ اعلان کر دیا کہ وہ پنجیت الیکشن میں حصہ لے گی۔ موجودہ امیر جماعت محمد یوسف میں ادریم (جنرل سکریٹری) مولانا حامد حسن صاحب۔

مسلم مجلس بنگال کلکتا

مسٹر جناح نے جب کانگریس سے سکھوتا کرنے میں پس پیش کیا تو کلکتے میں چند ممتاز قوم پرور مسلمانوں نے 1943ء میں 'مسلم مجلس بنگال' کے نام سے ایک جماعت قائم کی، جس کے صدر شیخ جان محمد نمبر کو نسل تھے۔ اس مسلم مجلس کا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ ہندوستان کے لیے سیاسی و اقتصادی آزادی حاصل ہو۔ سب صوبوں کو مکمل آزادی حاصل ہو مگر متفقہ طور پر چار اختیارات صوبے مرکزی حکومت کو دیں مرکز کا 'استعمال' صلاح عامہ کے لیے کرے مسلم مجلس تقسیم ہند کی مخالف تھی۔

آل انڈیا مجلس تعمیر ملت حیدر آباد

1948ء کے بعد حیدر آباد کے مسلمانوں میں جب بے کسی، نا امنی، بے صی اور جوہر کی کیفیت پیدا ہوئی اور مسلم نوجوان طبقہ اشتراکیت کی جانب رجوع ہوا تو اس کو حوصلہ بخشنے اور اسے آستانے اسلام کرنے کے لیے 15 جون 1950ء کو حیدر آباد میں تعمیر ملت و جمہوریت کی پہلے صدر سید خلیل اللہ حسین ایم اے، اہل اہل بی بی نے اور نائب صدر سلمان سکندر۔ اس مجلس کا مقصد ہے اسلامی تعلیمات کی اشاعت، مسلمانان ہند کی تعمیر و ترقی کے لیے منظم جدوجہد، ملک کی مختلف تہذیبی و حدودی اور قومیتوں کے مابین روابط کو انصاف کی بنیاد پر استوار کرنا اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا اور ملک کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے اردو کا تحفظ کرنا اور اس کو فروغ دینا۔

اس مجلس کی جانب سے جو سالانہ تقریب بڑی اہمیت کے ساتھ منائی جاتی ہے وہ 'یوم رحمت' آل عالمین ہے۔ تعمیر ملت اگرچہ ایک غیر سیاسی جماعت ہے مگر اسے بستی کی ضرورت کے پیش نظر اپنے مرکزی اجازت سے سیاسی کاموں میں حصہ لے سکتی ہے۔ مجلس کی مختلف شاخیں غریبوں کے لیے بہت طبی امداد کا بھی انتظام کئے ہوئے ہیں اور کئی بستیوں میں چھوٹے پیمانے پر بیت آل مال بھی قائم کئے ہوئے ہیں۔

مسلم مجلس مشاورت لکھنؤ

کلکتا، جمشید پور، رورکھیل اور رائے پور وغیرہ میں جب بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور جس سے لاکھوں مسلمان متاثر ہوئے تو مختلف مسلم جماعتوں اور اداروں کے سربراہوں نے اگست 1964ء میں لکھنؤ میں ایک مسلم کنونشن منعقد کیا جس کے نتیجے میں مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔ اس مجلس کے سربراہ ڈاکٹر سید محمود تھے اور ان کے معاون تھے آغا جان محمد اور مولانا علی میاں وغیرہ۔ مقصد یہ تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کی جائے۔

مسلم مجلس لکھنؤ

1947ء کے بعد سے چون کہ جمعیت علماء اہلک، غازی، باجوہ جماعت ہے اس لیے عام انتخابات (1967ء) کے سلسلے میں مجلس مشاورت نے جو پالیسی بنائی جمعیت علماء کو اس سے اختلافات پیدا ہوا اور وہ خود مجلس مشاورت سے الگ ہو گئی۔ عام انتخابات کے سلسلے میں ڈاکٹر سید محمود

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان بہتر

کانگریس کے حق میں تھے اور ڈاکٹر فریدی کانگریس کے مخالف، جماعت اسلامی کو بھی مجلس مشاورت کے بنائے ہوئے انتخابی منشور سے اختلاف ہوا جہاں ڈاکٹر جلیل فریدی نے مجلس مشاورت سے الگ ہو کر ۱۹۶۷ء میں مسلم مجلس قائم کر دی۔

بوہرہ یوتھ ایسوسی ایشن اودے پور

مسلمانوں کی بوہرہ برادری کے ترقی پسند و تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کی یہ جماعت ۱۹۵۹ء میں اودے پور (راجستھان) میں قائم ہوئی۔ ابتدا میں اس جماعت کا مقصد یہی تھا کہ بوہرہ برادری میں تعلیم عام کی جائے، برادری کے بیشتر اسیادنا کی جانب سے مستحق طالب علموں کو دلچسپی دے جائیں، درسی کتابیں فراہم کی جائیں وغیرہ۔ مگر کچھ عرصے بعد اس بات میں (۱۹۷۵ء) نوجوانوں کو نمائندگی کا حق نہ ملنے پر اس ایسوسی ایشن نے اپنے مقاصد کو رائج بدل دیا اب اپنی برادری کے دینی راہ نمائندگی سے نوجوانوں کا مطالبہ ہے کہ سماجی اصلاحات کی جائیں، معاشی سدھار پر توجہ دی جائے اور سب سے اہم مطالبہ یہ ہے کہ بوہرہ فرد کے نجی معاملات میں مداخلت نہ ہو۔ بوہرہ فرد کو تقریر و تحریر کی آزادی ہو اور ملاجی کی جانب سے بے جا گرفت اور حیر کا خاتمہ ہو اور یہ بھی کہ بوہرہ برادری کا نظام جمہوری ہو یعنی ملاجی کے نام زد کردہ نمائندے نہ ہوں بل کہ وہ برادری کے انتخاب کردہ ہوں۔ بوہرہ یوتھ ایسوسی ایشن کے صدر صالح محمد نائب ہیں اور عابد علی ادیب جہل سیکرٹری ہیں۔ اب یہ ایسوسی ایشن ایک آل انڈیا جماعت بن چکی ہے۔ بمبئی میں اس کی شاخ قائم کرنے والوں میں ناظم، اسماعیل عطر والے اور عباس علی صاحبان کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس تنظیم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ انتہائی تعلیم یافتہ، با شعور اور ترقی پسند (لیکچرر، وکیل، انجینیئر، ری سرج اسکالرز) نوجوانوں کو روکوں پر مشتمل ہے۔ بوہرہ برادری کے ۵۵ فی صدی نوجوان اس ایسوسی ایشن سے تعلق رکھتے ہیں۔

جمعیت اہل حدیث بمبئی

گیارہویں صدی ہجری میں شیخ احمد بن عبد القادر دہلوی سہ ہندی مجدد الف ثانی نے توحید و سنت کی اس تحریک کو ایک تنظیمی شکل دی۔ یاروں میں دہلی ہجری میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس تحریک کا بھی معانی میں عملی جامہ پیش کیا جس کی تکمیل ان کے بھتیجے مولانا اسماعیل شہید نے فرمائی۔ دراصل یہ ہندوستان میں یہ پہلی اسلامی تحریک تھی۔ جمعیت کی دعوت چار بنیادی اصولوں پر مبنی ہے (۱) توحید باری تعالیٰ (۲) اتباع سنت رسول اللہ (ﷺ) تعلق فی اللہ اور (۴) ایثار فی سبیل اللہ۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے نتیجے میں جب شمالی ہند کے پوربہ مسلم ترک وطن کر کے (احمد آباد، دھوبیا، برہان پور، مالے گاؤں بھیرتری اور بمبئی) وارد ہوئے تو انھوں نے موسیٰ پور اور گھیلانی اسٹریٹ میں ایک مسجد (اہل حدیث) قائم کی اور اس تحریک کو چلانے کا کام مولانا ابو جعفر نے سنبھالا۔ حاجی سیٹھ سلیمان عبدل داحد اور مولانا سرت آدین آل کتبی نے اس تحریک کو کافی فروغ دیا۔ مگر بمبئی میں جمعیت اہل حدیث کی واضح طور پر تشکیل ۱۱ جون ۱۹۳۹ء کو ہوئی اور مولانا محمد الدین قصوری صدر قرار پائے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں جمعیت کے تنظیمی ڈھانچے کو از سر نو بدل دیا گیا اور ۹ ستمبر ۱۹۶۴ء کو بمبئی کے دس مختلف علاقوں میں جمعیت کی شاخیں قائم کر کے جمعیت کو پھر ایک بار نئے طور پر تشکیل دیا گیا۔ جمعیت کے دفتری دینی کتب سے متعلق ایک لائبریری بھی ہے اور جمعیت کے تحت ایک دینی دارالعلوم اور ایک ملی اسکول بھی جاری ہے۔ جمعیت اصلاحی و تبلیغی کاموں کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق اور فرائض کاموں میں بھی مصروف ہے۔ جمعیت اہل حدیث کا آل انڈیا مرکز بنارس ہے۔

مجلس اتحاد اہل مسلمین حیدرآباد

کہتے ہیں کہ نواب بہادر یار جنگ اردو زبان کے ”جادو زبان“ مقرر تھے۔ وہ اپنی پاکیزہ شخصیت اور بلند کردار کی وجہ سے حیدرآباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت مقبول تھے۔ وہ پہلے لیڈر تھے جنھوں نے حیدرآباد کے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا اور ان کو یہ نعرہ دیا کہ نظام سے ہم نہیں ہی بل کہ ہمارے دم سے نظام

دھاکن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

کا افتراء قائم ہے اس بنا پر وہ معذوب دربار ہوئے۔ ۱۹۷۴ء کے لگ بھگ انھوں نے حیدرآباد میں مجلس اتحاد اہل مسلمین کی بنیاد رکھی۔ مقصد یہ تھا کہ (۱) حیدرآباد کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور (۲) ریاست نظام حیدرآباد کی حفاظت کی جائے۔ اس مجلس کے پہلے صدر نواب یار جنگ، دوسرے ابو ال حسن، تیسرے سید مظہر علی کاظم اور چوتھے صدر سید قاسم رضوی تھے۔ ۱۹۷۷ء کے دنوں میں جب ریاست حیدرآباد کی حکومت میں عوام کو ناخوشگی ملی تو اتحاد اہل مسلمین کے چھ نمائندے وزیر بنائے گئے۔ حصول آزادی کے بعد حیدرآباد کا ریاستان سے الوداع ہونے لگا تو اتحاد اہل مسلمین مانع آئی اور اس کے مسلح رضا کاروں نے ریاست کا نظم و نسق سنبھال لینے کی کوشش کی، حکومت نے اسے ناپسندیدہ قرار دیا اور انہیں ہٹا دیا۔ نتیجے میں بہت سے رضا کار مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ اتحاد اہل مسلمین کے صدر و رضا کاروں کے بیٹے قاسم رضوی روپوش ہوئے اور نگرختار ہو گئے۔ اقدار جلا، چوں کہ خدو فوج داری کے وکیل تھے اس لئے انھوں نے اپنے مقدمے کی پوری شہرہ کی مدد میں سزا ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں جیل سے رہا ہوئے تو پاکستان چلے گئے۔ کراچی میں وکالت کرنے لگے اور چند برس بعد ہی انتقال ہوا۔

اس ناکامی کے باوجود مجلس اتحاد اہل مسلمین قلمبند نہیں ہوئی۔ وہ دور شور و غوغا نہیں رہا مگر حیدرآباد میں وہ آج بھی قائم ہے اور میونسپل امیکشن میں اس کے ائمہ اسیہ واردوں کو کامیابی ہو جاتی ہے۔ قاسم رضوی کے بعد کئی برس تک صلاح الدین اولیٰ اتحاد اہل مسلمین کے صدر رہے۔

مسلم سٹیہ شودھک منڈل کمیٹی

مارچ ۱۹۷۵ء میں پونے کے سات نوجوانوں نے جناب حمید لوائی کی قیادت میں مسلم سٹیہ شودھک منڈل کی بنیاد رکھی۔ اس منڈل کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ مسلم سماج میں اصلاح کی جائے، عورتوں کو ماڈرن تعلیم کی نفرت راغب کیا جائے، مسلمانوں کو علاقائی زبان اُپسانے کے لئے مشورہ دیا جائے، رضا اور قانون کے تحت مرد اور عورت کو مساوات حاصل ہو، انسانیت کی سطح پر مسلمان غیر مسلموں سے بھی برابر کا تعلق پیدا کریں، مسلم سٹیہ شودھک منڈل کے تحت اب تک کئی کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ ۱۸، ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جناب حمید لوائی کی صدارت میں فارورڈ لگ بھگ مسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس کا افتتاح پروفیسر مغبول احمد نے کیا۔ اس میں ۳۵۵ نمائندوں نے شرکت کی جن میں ۵۵ بہار استریے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری کانفرنس جو مسلم عورتوں سے تعلق رکھتی تھی پونا میں منعقد ہوئی۔ اس کا افتتاح جناب آصف فیضی نے کیا۔ ۲۵۵ عورتوں نے منعقدہ بین کر شرکت کی اور انھوں نے ایک ساں سول کوڈ کے حق میں آواز اٹھائی۔ تیسری کانفرنس مسلم لیوی ٹی ٹی کے عنوان سے بھی منعقد ہوئی۔ جس کا افتتاح پروفیسر محسن شاہ نے کیا۔ صدارت جناب حمید لوائی نے کی۔ جناب آصف فیضی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ نمائندوں کی تعداد ۳۵۵ تھی۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۳ء میں کولھاپور میں جوہار اسٹریٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی وہ اس منڈل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اس میں ۸۵۵ نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں پروفیسر ل۔ بی۔ شاہ کی صدارت میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ اسکولوں میں اعلیٰ مسلمانوں کے لیے، اعلیٰ میڈیم ہو اور مسلمان اسٹریٹ کا مسلمان اردو کو محض ایک زبان کی حیثیت سے پڑھے۔ مسلمان عورتوں کی اصلاح منڈل کے پیش نظر زیادہ ہے۔ منڈل کی جانب سے کولھاپور میں مسلمان عورتوں کے لیے ایک کوآپریٹو سوسائٹی اور ایک لائبریری بھی قائم کی گئی ہے۔ ان دنوں منڈل کے ممبران کی تعداد ۷۵۵ ہے اور سات ستاجیں (یعنی) پونا، کولھاپور، رستارا، چیلوں، شولا پور، اور علی بارغ) ہیں۔

آل انڈیا سنی جمعیت علماء ربیبی

۱۹۵۷ء میں قائم ہوئی۔ مولانا سید محمد اشرفی جیلانی اور مولانا حسرت علی خاں کی تائید و تحریک میں اس جماعت کو حاصل رہی۔ مرحوم مولانا سید مصطفیٰ اختر اسے اپنے آخری دم تک (۱۹۵۷-۷۴ء) رہے۔ ان دنوں مولانا مشتاق احمد نظامی قائم مقام صدر ہیں۔ سنی جمعیت علماء کی بنیاد و غایت یہ ہے کہ ہر صورت اسلام و مسلمان کا تحفظ کیا جائے۔ آج کی عادی و اڑھی کا شکار ہونے والے مصیبت زدہ و مظلوم مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ سنی جمعیت علماء کی سارے ملک میں ۵ شاخیں ہیں۔ یہ جماعت دین و دنیا، مسلمانوں کے بلکل خلات ہے اور جماعت کا کردار خاص مذہبی ہے۔

گلن کائنات سنی مسلمان نمبر

مسلم رہا ہی سوسائٹی اتر پردیش لکھنؤ

۱۹۷۴ء میں لکھنؤ میں مسلم رہا ہی سوسائٹی اتر پردیش رجسٹرڈ قائم ہوئی۔ یہ سوسائٹی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے چار شعبوں پر مشتمل ہے (۱) شعبہ اصلاح و تربیت، اس کے تحت کوچنگ سنٹر، ملت ہاسٹل، یونٹ کے تعلیمی میلے، مختلف تحریری و تقریری مقابلوں کے جلسوں کا قیام (۲) شعبہ امانت، بچت و قرض، اس شعبے کے ذمے امانتوں اور پس انداز قعوت کو محفوظ رکھنا، وقت ضرورت اُن کو واپس کرنا اور قرض دینا (۳) شعبہ تجارت و صنعت و حرفت، مسلمانوں کو جدید ترین صنعتی و تجارتی معلومات فراہم کرنا اور صنعتی و تجارتی اداروں کے قیام میں مدد دینا اور (۴) شعبہ بہت اُل مال، ننگا و عشر وغیرہ کی تحصیل اور پھر اسے مستحقین میں تقسیم کرنا۔ یہ سوسائٹی ایک سرگرمی کے زیر انتظام ہے۔

بہادر ترک

ترک ہی ایک ایسی اسلامی قوم بانی ہے جو حکومت اور آزادی کے سبب ہمارے مقصد آخریش کی تکمیل یعنی حفاظت حرمین شریفین کر سکتے ہیں۔ عرب یا افغان مقابلتاً ترکوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ افغانوں سے تو ہم کو رات دن سلسلہ پڑتا ہی رہتا ہے، ان کی حالت جیسی خراب ہے اس کا اندازہ ہم کو اچھی طرح ہے۔ عربوں کی حالت میں آگے کسی خاص مضمون میں لکھتے وقت اپنی وہ وجوہ بھی بیان کروں گا جس کا بنا پر میں عربوں پر ترکوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک قصہ مجھے یاد آیا، اس سے کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کے شاہد شاید میرے ساتھی بھی ہیں جو ادنہ کی تسخیر کے بعد میرے ہمراہ شہر مذکور میں گئے تھے ایسے مشاندہ معرکے میں جس کے کفرسان اور عالم اسلام دونوں کو حیرت ہو گئی۔ ہمارے چند بیجا بی مسلمان بھی شریک تھے۔ چنانچہ یہ لوگ ہندوستان چھوڑ کر جہاد کرنے کے لئے ترک پیچھے تھے۔ سات کروڑ مسلمانوں میں سے یوں چند اشخاص کا علم جہاد میں شریک ہو جانا ہی اُن کی بہادری کا کتنا اثر ثابت ہے۔ یہ لوگ ادنہ کے ہمراہ ادنہ کو بخاریوں سے واپس لینے کی غرض سے گئے تھے اور خدا کے فضل سے نہایت ترک اور احشام کے ساتھ جھوٹی موٹی محرکہ آرائیاں کہتے ہوئے اپنے شجاع ترک بھائیوں کے ساتھ ادنہ میں داخل ہو گئے۔ ادنہ ترکی میں ایڈریا نول کو کہتے ہیں۔ یہاں پیچھے خوش قسمتی سے ادنہ کے وکیل و دلال ایک دوسرے سے ملاقات کا شرت حاصل ہوا۔ اس اشار میں مجھے اپنی جماعت سے بھی زیادہ خوش قسمت جماعت یعنی انھیں چند بیجا بی بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ لوگ مجھے بلدیہ یعنی عمارت میونسپلٹی کے سامنے جبکہ دل ہندو خلافت ادنہ سے قرن کلیہ جانے والے تھے نہایت اچھے اندسہ بایوں کے مجمع میں نظر پڑے۔ میں نے اُن سے محضر دریافت کیا کہ مارچ کرنے وقت انھوں نے کیا کیا؟ اس سوال کے ساتھ ہی میرا رشک بڑھنے لگا گو میں نے کتنا ہی چھپایا۔ مگر میری باتوں سے حاکم ظاہر ہو گیا ادنہ وہ کہنے لگے۔ جواب دیتے ہوئے مجھ سے من و عنایت بیان کی میرے اس سوال پر کہ خود بھی کسی کو مارا؟ نہایت شرم سے جواب دیا۔ ہم ہندوستانی ہیں۔ اکثر جھوٹے پیمانے پر لڑائیاں ہوئیں۔ ترکوں نے بڑھ بڑھ کر دشمنوں کی گردنیں اڑائیں۔ لیکن ہم کچھ ہی رہتے تھے۔ اس لئے ہمیں کہ افسران ہم کو روکتے تھے بلکہ اس لئے کہ ہم نے کبھی تلوار لہہ بند و ناپس اٹھائی تھی۔ ہم کو خود بخود ایک رکاوٹ ہی ہوتی تھی۔ ابھیے ایک قاتل قتل کرنے وقت مرعوب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم پر بھی رعب طاری ہو جاتا تھا۔ اب اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم کیسے ہیں۔ افسوس کہ ہم لوگوں کو اتنا بھی نہیں آتا کہ اگر موقع بڑے تو جان بھی بچا لیں۔ چہ جائیکہ جنگ میں مرنا اور مارنا۔ میں نے یہ قصہ اس لئے بیان کیا ہے کہ ہم کو اس کا اندازہ ہو جائے کہ ترکوں میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ مسلمانوں میں حاکم آزاد بہادر اگر کوئی قوم معجز ہستی پر ہے تو وہ ترک ہے۔

منظور محمود دنگو کار طلعت محمود کے والدین ترک سے ایک خط - ۸ دسمبر ۱۹۱۳ء

گلن کھاندہستانی مسلمان نمبر

قَارِئِينَ كَرِيمٍ

کے لئے

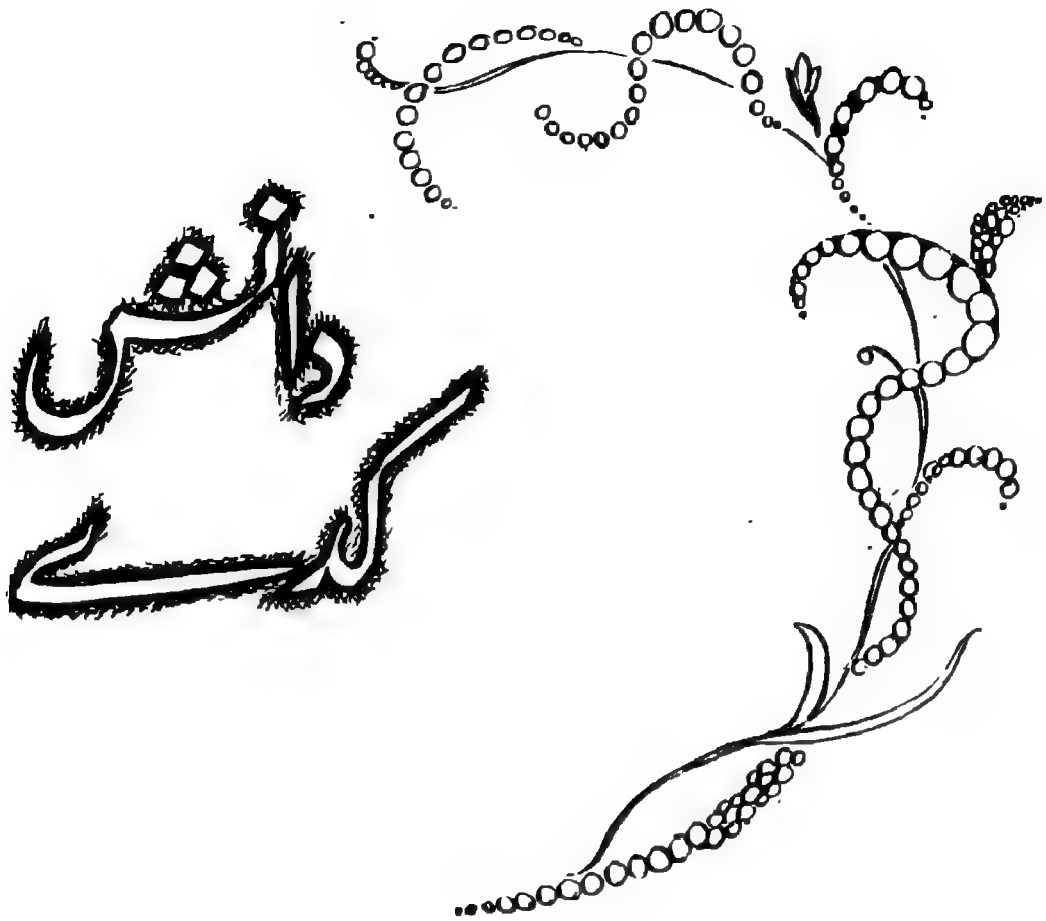
نیک دُعائیں

”ہر فن مولا“

کے فلم ساز

اللہ اکبر اللہ اکبر

کے جانب سے



جہاں قیاس کا اندھیرا کم
 یقین کا اجالا زیادہ ہوتا ہے!

ہمارا

پیغامِ خلوص و مسرت

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے



گستاخِ چریں

B-40۔ نیو سوتھ سوسائٹی، ارلابرج، اندھیری (ویسٹ) بمبئی-58

برودکشن (فون: ہوسن اسٹوڈیوز، گرلاروڈ، اندھیری (ایسٹ) بمبئی-69

مُسْلِمِ اَعْلِيٰ

محمد بن قاسم کی آمد سے — آج تک

ابتداء ہی سے ہندوستان کا ہر مسئلہ نزعی مسئلہ رہا ہے یعنی ہندوستان اختلافی عناصر کا گھر ہے اور اس سلسلے میں دنیا کا کوئی دوسرا ملک یا کسی دوسرے ملک کا کوئی معاشرہ ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کا طریق تعلیم ہندوستان کے حالات، عہد، پورا اترتا ہے اور ہندوستانیوں کے مزاج کو پورے طور پر بھاتا ہے۔ قومی زبان، علاقائی بولیاں، نسل، قومیت، مذہب، علاقائی تہذیب و تمدن اور ہر لحاظ کی بدلی ہوئی آب و ہوا ہندوستانیوں کی وہ مخصوص مشکلات ہیں جن کو حل کرنے کے لیے ایک مخصوص طریق علاج کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں جو بھی فاتح من کے آیا اپنی زبان اپنے ساتھ لایا اور اس نے ہندوستانی زبانوں کے ساتھ اپنی زبان کو بھی رائج کر دیا اور ظاہر ہے کہ سرکاری سرپرستی اسی زبان کو حاصل ہوئی جو حکمران کی مادری زبان تھی مسلمانوں کے ابتدائی دور میں عربی، فارسی اور ترکی جیسی غیر ملکی زبانوں کو ہندوستان میں خاصا بھلا ملا۔ ان دنوں بھی مقامی زبانوں کا چین باقی رہا۔ مگر عزت کی نظر سے عربی، فارسی اور ترکی ہی کو دیکھا گیا جب یورپ کے حکمران فاتح بن کر ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ فرانسیسی بھی آئی، انگریز بھی اور انگریزی بھجی اور چون کہ فرانسیسی اور انگریزوں نے بہت تھوڑی عمر بانی اس لیے ان کی زبانیں بھی ہندوستان کی سرزمین پر زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکیں مگر انگریزوں کے ساتھ ان کی انگریزی نے ہم، ہندوستان میں ترمیم حاصل کی۔

7 ویں صدی عیسوی سے مسلمان عربوں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ تعلیم کی ابتدا قرآن شریف سے ہوئی اور حدیث کا جانتا تعلیم کے لیے وہ درجہ کم سمجھا گیا چنانچہ عرب کی سرزمین پر مسلمانوں کا پہلا اسکول (مدرسہ) 630 عیسوی میں قائم ہوا۔ اور پھر دنیا میں جہاں جہاں مسلمان پہنچے وہاں وہاں انھوں نے مدرسے قائم کیے۔ ابتدائی دور کے مسلم حکمرانوں میں قرآن کی تعلیم کو فروغ دینے کی فرض سے مدرسوں کی بنیاد رکھنے اور مسجدیں تعمیر کرنے کا شدید جذبہ پایا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ہندوستانی سے پہلا اسلامی رابطہ وہ تھا جو 711ء میں محمد بن قاسم کے آنے پر سندھ اور ملتان میں پیدا ہوا مگر یہ رابطہ زیادہ با اثر ثابت نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے نمود غزنوی وہ پہلا مسلمان فاتح ہے کہ اس کے متعدد محلوں کے نتیجے میں اسلامی تعلیم، تہذیب و تمدن نے گہرے اثرات ہندوستان پر چھوٹے اور جب اس نے 1026ء میں پنجاب کے علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور غیر ملکی مسلمان ستغن طور پر پنجاب میں بس گئے تو اسلامی علم و ادب کے نقوش بھی گہرے ہوئے۔ محمود کو علم و ادب سے کافی لگاؤ تھا اس کے دربار میں اس وقت کی دنیا کے مانے ہوئے اسکاں موجود تھے۔ محمود کے بیٹے (90-1030ء) مسعود نے بھی بہت حد تک اپنے باپ کی علمی و ادبی روایات کو برقرار رکھا۔ اس نے اپنی محدود سلطنت میں عوام کے لیے متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے عربی اور فارسی کے علمی ذخیرے کو بڑھانے کی خاطر اس کے عہد میں سنسکرت اور یونانی زبانوں سے بھی خاصا کام لیا گیا۔

غزنوی خان دان دو سو برس تک حکم ران رہا۔ اور جب غزنوی حکمرانوں نے اپنی مرکزیت کو غزنی سے لاہور منتقل کر دیا تو پھر اسلامی تعلیم کے پورے نے ہندوستان کی سرزمین میں جڑ پکڑ لی۔ لاہور اور اسلامی کل چکر کا مرکز بن گیا۔ غری خان دان کے حکمرانوں کا بہت تھوڑے عرصے (1210-1206ء) ہندوستان سے تعلق رہا اور اس خان دان کا صورت یہ کارنامہ قابل ذکر ہے کہ محمد غوری نے انہیں لامی تعلیم کا ایک بڑا مدرسہ تعمیر میں قائم کیا۔ غلام خان دان کا بانی قطب الدین ایبک ایک لامی تھا۔ اس نے دہلی اور دہلی کے قریب جہان پور میں ایک مدرسہ تعمیر کیا اور ہر مسجد میں ایک مکتب قائم کیا جہاں قرآن پاک پڑھایا

جائنا۔ تب آدین کے عہد میں لاہور کے بعد دہلی بھی اسلامی تعلیم کا مرکز بن گیا۔ سلطان آل شمس (1236-1241ء) نے بھی دہلی میں مدرسہ معزی کے نام سے اسلامی تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز قائم کیا۔ سلطان ناصر الدین (1246-1260ء) خد قرآن پاک کی تلاوت کرنے اور قرآن لینے کی بات سے کتابت کرنے کا بڑا ذوق رکھتا تھا۔ اُس نے دہلی میں مدرسہ نادیا قائم کیا اور جالندھر میں بھی ایک اسلامی کتب کی خیا رکھی۔ مسلم حکمرانوں میں شاید عین وہ پہلا حکمران ہے جس نے سب سے پہلے مختلف علوم کی سرپرستی کی۔ وہ عالموں کی بھی اپنی تہذیب کو ارتقا دینے کے لیے خزانے کے گنجینہ کو اٹھا کر اُس نے جو مدرسے قائم کئے تھے اُن میں گرامر، ادب، منطق، تہذیب، فقہ اور تفسیر کی تعلیم دیا جاتی تھی۔ بلکہ اُس نے عہد میں دینی تعلیم کا بولسا بولسا تیار ہوا وہ دوسرے تک (15ویں صدی کے اختتام تک) ہندوستان میں قائم رہا۔ علمی خانہ دان میں عظیم علمی کی نسبت سلطان جمال الدین جلی زیادہ علم دار حکمران تھا۔ خلق عہد میں اگر یہ خیالات آدین نسق نے عالموں کو کافی توانا، مگر محمد تغلق خلیفہ بہت بڑا اسکالر تھا وہ کلاسیکی فارسی تاریخ اسلام، فلسفہ، ریاضی اور نجوم کا مستند عالم تھا اور اپنے وقت کا ایک ماما ہوا شاعر تھا اور اس کے ادبی ذوق کی بنا پر دوسرے مالک کے اسکالر بھی اس کے دربار میں حاضر ہو کر انعامات پاتے تھے۔ مورخ فرشتہ نے فیروز شاہ کی علم نوازی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اُس نے اپنے زمانے میں مدرسوں کی مرمت کرائی اور نئے مدرسے تعمیر کرائے۔ اُس نے تقریباً 500 مسجدوں میں مکتب قائم کیے۔ اُس نے نئے مدرسوں کے لیے زمین وقف کی۔ مالی امداد دہلی کی طالب علموں اور اسنادوں کو اُس نے وظیفہ بھی دیا اور اپنے لیے مکانات تعمیر کرائے۔ اُس نے بھی عطاکا، شہر جون پور کو اس نے تعلیم کا ایک بڑا مرکز بنادیا۔ کہتے ہیں کہ "تغلق عہد" میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے موجود تھے۔

تیمور کے حملے نے ان تعلیمی اداروں کو بڑی طرح متاثر کیا اور بہت سے مدرسے مسمی ہو گئے۔ کاسرہند منقطع ہو گیا، کچھ دن بعد شاید حفظہ انعام کے تحت دہلی کے کئی تعلیمی ادارے دوسرے صوبوں کے مرکزی شہروں میں منتقل ہو گئے اور یہ بھی راجہ بی پور، گولکند، مالوا، خاندیش، جون پور، ملتان اور بنگال میں بھی تعلیمی مرکز قائم ہو گئے۔ تیمور کے حملے کے نتیجے میں تعلیم کو جو نقصان پہنچا تھا سکندر لودی نے عہد میں اُس کی تلافی ہونے لگی۔ بہت حد تک دینی تعلیم کے انصاب میں بھی تبدیلی ہوئی۔ مدرسوں اور مکتبوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ جن اپنے مکانات پر تعلیم دیتے تھے جو شوقیہ طور پر علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ چند طالب علم اُن سے رجوع ہوتے اور وہ اپنے دیوان خانے میں اکثر میشرز دیتے۔ اس میں شک ہے کہ ان دنوں عربی ایک اہم زبان مانی جاتی تھی اور کلاسیکی علوم کے حصول کے لیے عربی زبان ہی ذریعہ تعلیم (میڈیم) تھی مگر فارسی زبان بھی ترقی کرنے لگی تھی اور عربی کے ساتھ ساتھ وہ بھی میڈیم کا کام دے رہی تھی۔ محمد تغلق کو تو فارسی کے بہت سے اشعار حفظ تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں فارسی کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوا اور سکندر لودی کے زمانے میں ہندو فرقے کے مشرفاء فارسی کی تادیب متوجہ ہوئے اور انھوں نے فارسی زبان سیکھنا شروع کی اور اس سلسلے میں سکندر لودی نے زمانے کی بہ خصوصیت سے کاسرہند میں کئی ہندوستانی زبانیں فارسی زبان میں لکھی جانے لگیں اور اسی زمانے میں باقاعدہ فارسی ادب کا انصاب تیار کیا گیا۔ اور علم و سستی کی تعلیم بھی کورس میں شامل ہو گئی۔ مسلم موسیقی کو شاہی دربار کا امر پرستی حاصل ہونے لگی اور صوبائی حکمرانوں نے بھی موسیقی کی تعلیم جاری کی۔ دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان طالب علم کے لیے طب کا مضمون لینا بھی لازمی تھا۔ اسی زمانے میں مباحثوں، مناظروں اور تبادلہ خیالات کے لیے اجتماعوں کی بنیاد پڑی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اُن دنوں اگرچہ تعلیم مفت تھی مگر استاد دینے کے لیے شاہی دربار سے اجازت نامہ لینا پڑتا تھا۔ دہلی کے مسلمانوں کے عہد میں مکتبوں اور مدرسوں کی تعلیم کافی ترقی کر چکی تھی۔ بہر مسجد اور ہر خانہ قاہ میں ایک مکتب موجود تھا اور ان مکتبوں کے ساتھ ساتھ صرف شہر دہلی میں بھی 2 ہزار مدرسے قائم تھے یعنی دہلی میں کئی ہزار مدرسے موجود تھے۔

مغل عہد میں

جب مغل حکمران ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہندوستان میں بہت سے مسلم مکتب اور مدرسے موجود تھے اور تعلیم جاری تھی۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ مغل جو ہندوستان کے ابتدائی مسلم حکمرانوں کی نسبت ذہنی طور پر زیادہ ترقی پسند اور روشن خیال تھے۔ مسلمانوں (یا عام رعایا) کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہوئے۔ ہوائی اور سیکندری سطح کے جو مکتب و مدرسے جس طرح چل رہے تھے وہ اسی طرح جاری رہے۔ مغل بادشاہوں نے ان کو کوئی ترقی نہیں دی اور

ہنگن کاہنستانِ مملکت

دلپسند شای خزانے میں سے ان تعلیمی اداروں کے لیے کوئی رقم مخصوص کی۔ البتہ ایسے مسلمان عالم جو منحل دربار سے وابستہ تھے کبھی کبھی کسی مکتب یا مدرسے کو ذاتی طور پر مالی امداد دے دیتے تھے۔

منحلوں کے عہد میں فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور علیٰ صورت مکتب و مدرسہ محدود ہو کر رہ گئی اور صرف مذہبی تقریروں ہی میں عربی کے الفاظ سنائی دینے لگے۔ عہدِ نغلیہ میں دو طرح کے تعلیمی ادارے ہوتے تھے یعنی مکتب اور مدرسہ جیسے آج کا اسکول اور کالج۔ ہر بڑے شہر کے ہر مسلمان محلے میں ایک مکتب ضرور ہوتا تھا جو محلے کی مسجد سے ملحق ہوتا تھا۔ مسجد کے مکتب کے استاد کی مالہ نہ تھی نہ تنخواہ مقرر ہوتی تھی جو مسجد کے خرچ کے لیے اہل محلہ جو فنڈ قائم کرتے تھے اُس سے لیا جاتی تھی یا پھر مکتب میں تعلیم پانے والے بچوں کے والدین نذرانے کی صورت میں مکتب کے استاد کو وقفِ نفوس پیش کرتے تھے وہی اُس کی آمدنی کا ذریعہ ہوتا تھا۔ محلے کا بعض مسلمان رئیس بھی اپنے مکان پر مکتب قائم کرتا تھا جس میں محلے کے اونچے طبقے کے شرفاء کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ ایسے مکتب میں بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی مکتب کا خرچ باقی مکتب ہی کے ذمے ہوتا تھا۔ مسجد یا کسی رئیس کے مکان سے تعلق رکھنے والے ایسے مکتبوں میں قرآن شریف حفظ و ناظرہ پڑھایا جاتا تھا، فارسی کی ابتدائی ایک دو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور پھر لکھنا سکھائی جاتی تھی۔ اخلاق و آداب اور آدابِ مجلس سکھانے پر بھی زور دیا جاتا تھا اور ہر طالب علم کو رسوم و صلاات کا پابند بنایا جاتا تھا۔ مکتب کے جس طالب علم کو مزید تعلیم حاصل کرنی ہوتی تھی وہ مدرسے میں داخل لیتا تھا۔ مدرسے کا نصاب علوم کی اخلاقیات، دینیات، ریاضی، طب، منطق، تاریخ، تفسیر عربی و فارسی کی نظم و شعر پر مشتمل ہوتا تھا بعض اوقات کسی مفسرِ علم یا فنی کے استاد سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو شہر در شہر بھٹکانا پڑتا تھا۔

بابر جب ہندوستان میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تو اُن دنوں ہندوستان میں کئی تعلیمی مرکز موجود تھے اور ہر مسجد میں ایک مکتب جاری تھا اور رئیس لوگوں کے بچے مکتب جاتے۔ بابر تعلیم یافتہ تھا، فارسی اور ترکی زبان کا شاعر تھا اُس کے کئی مصاحب بھی پڑھے لکھے تھے مگر بابر کو ایسی جنگی مصروفیات سے اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اپنی رعایا کی تعلیم کے لیے کوئی توجہ دے پاتا۔ بابر کا بیٹا ہمایوں بھی ایک اسکالر تھا، عربی، فارسی، ریاضی، نجوم اور جغرافیہ کی تعلیم پائے ہوئے تھا اُس نے اپنے عہد میں دہلی میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا جو عالموں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوا۔ اگر سے میں بھی چند امارتے ہمایوں کی اجازت سے ایک مدرسہ کھولا اور ہمایوں کے انتقال کے بعد بھی دہلی میں اس کے مقبرے میں ایک مدرسہ قائم ہوا جو بہت دنوں تک جاری رہا۔ شیر شاہ بھی عالم تھا اور اس کو تاریخ اور شعری کتب کے مطالعے کا کافی شوق تھا۔ اس کے عہد میں (1520ء) ہمایوں نے دہلی میں (سہارا اور جون پور کے درمیان) ایک بڑا مدرسہ قائم کیا۔ اگرچہ اکبر خود پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اُس نے دوسروں کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اس کے حکم سے اگر سے کی شاہی لائبریری کے لیے قدیم سنسکرت ادب کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ خطاطی کے فن کو بھی اُس کے عہد میں فروغ حاصل ہوا اور اس کی زندگی ہی میں اگر سے کی شاہی لائبریری تقریباً ڈھائی ہزار خطوط پر مشتمل ہو گئی۔ اُسی کی ایما پر اُس کے وزیر مالیات راجا ٹوڈرل نے فارسی کو دفتری زبان قرار دیا۔ اکبر کے عہد میں مدرسوں کا نصاب عموماً دینیات، ریاضی، جغرافیہ، زراعت، نجوم، قیافہ، اقتصادیات، سوسائٹس، منطق اور طب پر مشتمل ہوتا تھا۔ تاریخ بھی ایک اہم مضمون تھا۔ سنسکرت کے طالب علم کو سنسکرت کی گرامر دیا کرتے (ن)، فلسفہ (ویدانت) اور لوگ (انزم) (پاتن جلی) کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندو طالب علموں کے لیے الگ مدرسے نہیں تھے ان کو اپنی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی۔ جہاں گیر مطالعے کا بڑا شوقین تھا۔ صغرِ بچہ ہی سے وہ پڑھتا تھا تو اپنی لائبریری اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ترکی زبان سے وہ خوب واقف تھا، ترکی ہی میں اس نے (میشہ درد و مورخوں کی مدد سے) اپنی ترک لکھی بھی لکھ دی، اس نے فارسی زبان کو بھی لکھی تھی۔ جہاں گیر نے نباتیات اور حیوانیات کے علم سے بھی خدا کا فی دل چسپی لی۔ مگر اس نے دوسروں کی تعلیم کے لیے کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا جس اتنا کیا کہ اپنے ایک فرمان کے ذریعے ان جانے والوں پر قبضہ کر لیا کہ جن کا کوئی وارث پیدا نہیں ہوا ان جانے والوں کی آمدنی سے ان شکستہ و خستہ مکتبوں و مدرسوں کی مرمت کرا دی گئی جو پچھلے پچیس برس سے بُری حالت میں برائے نام جاری تھے۔ اس میں شک نہیں کہ منحل بادشاہوں میں اورنگ زیب سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ وہ ترکی زبان جانتا تھا اور فارسی اور عربی کا عالم تھا۔ حافظہ قوی تھا اور بہت اچھا خوش لوٹ تھا مگر متعجب تھا اس لیے اس نے دوسروں کو بھی اسلامی نظریے ہی کے تحت اسلامی تعلیم دینے کی کوشش کی۔ اُس نے اسلامی مکتبوں کی زیادہ بہت افزائی کی اور خود بھی بہت سے مکتب اور مدرسے قائم

کے لکھنؤ میں جب ایک فرانسیسی تاجر کی کوٹھی ایک مسلمان عالم کو اورنگ زیب نے بخشی تو یہ بات ملحوظ رکھی گئی تھی کہ وہ عالم ایک مذہبی مدرسہ قائم کرے گا اور اس حقیقت پر اس میں دو کچھ (فرنگی تاجر) مذہبی عالموں کا ایک اثر مزید ثابت ہوا۔ مذہبی علو کے ماہرین اور راسخہ کو ان کی اعلیٰ کارکردگی اور خدمات کے صلے میں اورنگ زیب کی جانب سے اکثر انعام و اکرام ملتے تھے۔ بہت سے مدرسوں کو جاگیریں بخشی دی گئی تھیں۔ گجرات میں اس نے دو سو ہزار روپیہ کی تعلیم کے سلسلے میں بھی کافی دل چسپی لی اور پھر سیال کوٹ کو اسلامی تعلیم کا مرکز بنایا۔ اورنگ زیب نے بعد تعلیم کا بھی زوال شروع ہو گیا۔

جہاں تک تعلیم نسوان کا تعلق ہے نہیں کہا جاسکتا کہ ترک اور افغان حکمرانوں کا عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں کیا رویہ رہا۔ البتہ مغلیں کے ہند میں تعلیم نسوان کا مطلب یہی تھا کہ انکی قرآن پڑھ لے اور امور خانہ داری سے واقف ہو جائے۔ شاہی خواتین یا امریکی لڑکیاں کبھی کبھی مزید تعلیم حاصل کرتی تھیں، مگر عام طور پر بچے، متوسط اور اونچے طبقے کی مسلمان عورتوں میں تعلیم کا رواج نہیں تھا۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی 12 سو سالہ (حضرت عمر کے عہد یعنی 15 ہجری سے 1274 ہجری تک مطابق 636 سے 1857ء تک) دور میں طریق تعلیم برائے عورتوں کے دور سے تو ضرور بہتر رہا مگر کبھی بھی مسلمان بادشاہوں نے عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کی اتنی کوشش نہیں کی جتنی کہ اسلام کا تقاضا تھا۔ اور مسلمان بادشاہوں کا اختیار کیا ہوا تعلیمی سسٹم ہی ایسا تھا جو تعلیم پانے والے کو عملی انسان بننے میں مدد دیتا۔ دراصل مسلم حاکموں نے تعلیم کے سلسلے میں اپنی بلند ضرورت کو ملحوظ رکھا۔ ہندوستانی رعایا کے مزاج اور اس کی روایات کی کوئی پروا نہیں کی۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی مسلم حاکم نے حلیہ میں حکومت نہیں کی بلکہ سر ایک نے مطلق عیان حکمران بن کر بادشاہت کی۔ اسلامی معاشرے میں جتنی مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے بادشاہی نظام میں اتنی ہی ادنا و اعلا کا فرق لازمی ہے۔ بادشاہت کے لیے معاشرے کو مختلف طبقوں میں بنانا ضروری ہے۔ چنانچہ پہلا مسلم فاتح محمد بن قاسم ہی جب ہندوستان میں آیا تو اپنے ساتھ (غیر اسلامی) اونچ نیچ کا فرق بھی لایا۔ چنانچہ مسلم حکومت کے ہر عہد میں شیخ، سید، مغل، چٹان، اعلیٰ ذاتیں سبھی جیسے اور ناکی، جہلام، دھولی اور پٹنہ کی اونچ ذات یا کین کہہ کر لکھا گیا۔ چنانچہ ضیاء الدین برہنی نے اپنی کتاب "فتوح جہان داری" میں یہ واضح کیا ہے: "ہن کر کا جات اور دوسرے طبقوں سے تعلق رکھنے والے معتبر مسلمانوں کے لیے سیکولر اور اعلیٰ تعلیم کا دروازہ بند تھا صرف ابتدائی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔" بعد یہ ہے کہ اس سلسلے میں اگرچہ سیکولر مزاج کے بادشاہ کا بھی غیر سیکولر نظریہ تھا۔ ابو الفضل نے "دربار اکبری" میں اکبر کے قول کا اس طرح ذکر کیا: "عام طبقوں میں تعلیم کی توسیع و اشاعت سماج اور مائت کے لیے باعث نفاذ اور ناقص امن ہے؛" ذات کی ادنا اور اعلا فرق حق الیقین اور ملین کے عہد میں بھی عملی طور پر موجود تھی۔ انتہا یہ کہ اس وقت کے سیدائت جہاں گیر نام کے ایک صوفی نے ایک سلسلے میں ملین کو ایک خط لکھا اور اپنے اس خط میں انھوں نے بادشاہ کے اس عمل کو خوب سراہا کہ بادشاہ مدرسے کے طبقوں میں اونچ نیچ کو ملحوظ رکھتا ہے یہی نہیں بل کہ اس بدعت کو برقرار رکھنے کے حق میں مولوی ملا اونچے طبقے کی دکاوت کرتے ہوئے قرآن کی آیات دلیل بھی پیش کیا کرتے تھے اور فتوے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کبیر جو جگہ تھے اسی مسلم معاشرے کے خلاف بطور احتجاج کھڑے ہوئے تھے جس میں اونچ نیچ کا نمایاں فرق موجود تھا۔ چنانچہ کبیر نے اپنے اپنے فرقے کے "اونچے طبقے" سے تعلق رکھتے تھے اس لیے دونوں کبیر کو اپنا دشمن سمجھا، وہ کبیر کو مصلحتی معاشرے میں اصلاح چاہنے والا تو نہ کہہ سکے البتہ انھوں نے کبیر کو اسلام اور ہندو دھرم کا مخالف کہہ کر بدنام کیا۔ بیوقوفوں نے انھیں مسلمان کہہ کر ہندوؤں کو ان کا مخالف بنایا اور ملاؤں نے انھیں ہندو کہہ کر مسلمانوں کو ان کی طرف سے بغض کرنے کی کوشش کی اور اس طرح راجا اور پرجاؤں کو کبیر کا دشمن بنادیا تاکہ سماج میں طبقے داری اور اونچ نیچ برقرار رہے۔ کبیر نے مسلمانوں کے غیر اسلامی معاشرے اور جاگیردارانہ نظام پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی مگر انھوں نے ہندو بیٹوں اور مسلمان ملاؤں کی سازش سے کبیر کی تحریک ناکام ہو گئی۔

غرض کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں عوام کو تعلیم کے بہتر مواقع حاصل نہیں تھے۔ ان کی رسائی صرف مسجد کے مکتبوں تک تھی۔ جاگیر داروں، منصب داروں اور شرفاء کے قائم کئے ہوئے مدرسوں میں ان کا داخلہ ممکن نہ تھا۔ تاریخ میں جن کتب خانوں اور لائبریریوں کا ذکر آتا

تنگن کا سندھستانی مسلمان ممبر

ہے۔ ان سے صرف امراء ہی استفادہ حاصل کر سکتے تھے عوام نہیں۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں

مسلمان بادشاہوں نے اپنے خزانے سے عموماً اسی زبان یا علم کی سرپرستی کی جو ان کی مادری زبان تھی یا جو زبان و علم وہ اپنے ساتھ لائے۔ مگر اس سلسلے میں مسلمانوں کے برخلاف انگریزوں نے زیادہ فراخ دلی، روشن خیالی، دُور بینی اور سہجہ راج یعنی کاشت و بارانگریزوں نے ہندوستان کی ساری راج و وقت زبانوں کو بیک وقت چلنے کا موقع دیا اور ساتھ ہی اپنی انگریزی زبان کو بھی۔

اگرچہ ۱۶۵۰ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی پوزیشن محکم ہو چکی تھی مگر اُس نے آئندہ ایک صدی تک ہندوستان میں تعلیم کے سلسلے میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ اس نے ہندوستان کے تعلیمی نظام کو اُس کی اپنی حالت میں رہنے دیا۔ ۱۶۹۸ء کے چارٹرڈ کی رو سے کمپنی کو اپنے یورپی ملازمین کے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری لینا پڑی۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے زور دینے پر آخر کمپنی نے ہندوستان میں تعلیم کا انتظام بھی اپنے ذمے لینا قبول کر لیا اور عیسائی مشنریوں کو بھی علم کی روشنی پھیلانے کی اجازت دے دی۔ ہندوستان میں برٹش راج کے تحت تعلیم کی ابتدا ۱۸۱۸ء میں صدی میں جو سیاسی تبدیلیاں ہندوستان میں رونما ہوئیں ان سے ہندوستان کے اسلامی مکتب اور مدرسے بری طرح متاثر ہوئے۔ چونکہ ان تعلیمی اداروں کے بانی یا سرپرست اپنے اختیارات کھو چکے تھے اس لیے وہ اس پوزیشن میں نہیں رہے تھے کہ وہ ان اداروں کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ لیکن اس سلسلے میں وارن ہسٹنگز وہ پہلا انگریز حاکم تھا جو ہندوستان میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور بحیثیت ایک حاکم اُس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا۔ ایک انگریز عیسائی ہونے کے باوجود دارلن میں ۱۶۸۱ء میں مسلمانوں کے لیے کلکتے میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا۔ اپنی جیب سے ۵ ہزار ۶۹۱ روپے خرچ کر کے اس نے مدرسے کے لیے زمین بھی خرید دی اور ایک برس تک اس نے مدرسے کے اخراجات بھی خود ہی برداشت کیے۔ وارن ہسٹنگز عربی اور اسلامی قانون کی تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا تاکہ مسلمان سرکاری دفاتروں اور عدالتوں کا کام سنبھالے رہیں۔ دوسرے دور میں تعلیم کے سلسلے میں دو نظریے پیدا ہو گئے۔ میکالے کے خیال میں ہندوستان میں تعلیم کے لیے نہ صرف انگریزی زبان بلکہ مغربی تہذیب بھی بہت ضروری تھی تاکہ ہندوستانی چاہے اپنے رنگ و خون سے ہندوستانی رہے مگر اپنے نظریے، اپنے مذاق اور اپنی سوچ کو لہجہ سے وہ انگریز بن جائے، میکالے چاہتے تھے انگریزی زبان ہندوستان کے ذریعے ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ چاہتا تھا۔ اُن اس کو اپنے دفاتروں کے لیے بالوؤں کی بھی ضرورت تھی۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو پرانے کارکن تھے اس سلسلے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان میں تعلیم کے لیے اب نہ صرف خالص مشرقی کل جو موزوں ہے گا اور نہ قطعی طور پر مغربی کل جو بہتر ہے۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے تعلیم کا نفاذ تیار کیا جائے۔ لارڈ ہسٹنگز فارسی زبان کا طوط دار تھا اُس نے مشنریوں کو قہورے چھوڑے اسکول کھولنے میں مدد دی اور ان اسکولوں میں فارسی کے چلنی کو برقرار رکھا۔ ۱۸۲۲ء کے دنوں میں منرو نے بھی تعلیم کی طرف توجہ دی اور کافی خرچ برداشت کیا۔ آل فنٹن نے ورنایکولر تعلیم کے لیے ایک کمیٹی قائم کی اور تعلیم کے فروغ کے لیے کئی کام کئے۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ فارسی ہی کو ذریعہ تعلیم رکھا جائے یا انگریزی زبان کو۔ میڈیم بنایا جائے۔ میکالے نے اپنی فزوری ۱۸۳۵ء کی تجویز میں انگریزی کی حق میں اپنا فیصلہ دیا اور پھر ۷ مارچ ۱۸۳۵ء سے انگریزی سرکاری اور ادبی زبان قرار دی گئی۔ میکالے کے ساتھ ساتھ ہنٹنگ اور میٹ کاٹ بھی انگریزی زبان کی حمایت میں بولے۔ ۱۸۳۷ء تک فارسی صوبوں کی بھی سرکاری زبان نہ رہی بلکہ فارسی کی جگہ صوبائی زبانوں میں دفاتروں میں کام ہونے لگا۔

۱۸۵۴ء سے سرچارلس ڈوڈ کی کوشش سے تعلیمی نظام مغربی رنگ میں رنگا جانے لگا۔ اوپر کے درجہ میں ادب، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ جیسے مضامین انگریزی زبان میں پڑھائے جانے لگے۔ سرچارلس نے ہر ایک پریسی ڈنسی میں ایک ایک پونی دہی قائم کرنے کی بھی تجویز پیش کی۔ اس نے ہڈی تعداد میں اسکول، کالج، ٹیک نی کل اسکول، سیکنڈری اور پرائمری اسکول کھولنے پر زور دیا اور ان اسکولوں کے لیے اُس نے ورنایکولر میڈیم تجویز کیا۔ سرچارلس کی یہ بھی تجویز تھی کہ ہر پریسی ڈنسی میں لونی نینٹ گورنر کے تحت ایک نکلہ تعلیم الگ ہو۔ وہ مسلمانوں کے لئے اور خصوصی طور پر مسلمان عورتوں

کے لیے تعلیم کا بڑا خانہ لگا دیا تھا اور تعلیم کے سلسلے میں مذہبی تعصب کو درمیان میں نہ لایا جائے بلکہ غیر جانبدار رہا جائے۔ لاہور ڈیولپمنٹ بورڈ نے سرچارلس کنگلی کی تجویزوں کو بہت حد تک عملی جامہ پہنایا اور ۱۸۵۷ء تک کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں بھی قائم ہو گئیں۔ لاہور ڈیولپمنٹ بورڈ ۱۸۵۹ء میں وائس رائے مقرر ہوا تعلیم سے بڑا استغف رکھتا تھا مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ تعلیم کا خانہ لگا دیا اس نے صوبائی حکومتوں کو رو دیا تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم میں دوسروں سے کچھ ڈگنے ہیں اس لیے ان کو تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ ۱۸۸۲ء میں لاہور میں نے ایک سکول مقرر کیا جس کے صدر ولیم بڑے تھے اس کمیشن نے ۲۵۵ صفحات پر سفارشات پیش کیں۔ سکولسٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے تحت پرائمری تعلیم تعلیم نسوان اور مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق سفارشات تھیں وہ بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ بڑے کمیشن کے نتیجے میں صرف ۲۵۰ برس (۱۸۸۵-۱۹۰۰) کے عرب میں یا یونین اسکولوں اور کالجوں کی صورت میں تعلیم نے بڑی ترقی کی اور مغربی تعلیم ہندوستان میں خاصی مقبول ہونے لگی۔

انگریزوں کی توسلہ افرائی سے لینے پڑوسیوں سے کچھ بڑے ہوئے مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں لٹا علی ہسٹ، سر تھامس بی۔ رادکلیف، جی۔ مینولی چراغ علی (نواب اعظم یا جنگ) اور سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی راہ نمائی کی۔ سر سید کی علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ اتنا زیادہ اور واضح ہے کہ اس کے تعارف کی یہاں نہ بدورت نہیں مسلمانوں کی انجمن پنجاب اور انجمن حمایت اسلام کے تحت پنجاب میں، محمدن لٹریچر، اینڈ سائنٹی فک سوسائٹی کے ذریعے سنگال میں اور انجمن اسلام کے تحت بمبئی میں جدید تعلیم کی کافی اشاعت ہوئی۔ انجمنی تعلیمی انکمنوں سے تحریک یا کرپٹا اور در نکلتے ہیں اسلامیک کالج، مدراس میں محمدن کالج، دہلی میں اینٹوونیک کالج اور امرت سر میں ایم اے ادا کالج قائم ہوئے۔ ۱۹ صدی کے وسط تک پنجاب، یوپی، وسط ہند، برار، اجیر اور بلوچستان میں مسلم اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا پھیل گیا۔ ۱۹۰۱ء میں شمالی لاہور کے ڈاکٹر آف پبلک انشورنس کی کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں تعلیم کا شعبہ وزراء کے سپر کر دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی کمیشن قائم ہوا ۱۹۰۴ء میں انڈین یونیورسٹی رپورٹ ہوئی۔ ۱۹۱۳ء میں ۱۴ کمیٹی میں ترمیم ہوئی اس سے اسکولوں اور کالجوں پر یونیورسٹیوں کا کنٹرول بڑھ گیا یونیورسٹی تعلیم و نظام میں مزید اصلاح کی غرض سے ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر سٹورٹ نے تخت ایک اور کمیشن مقرر کیا گیا یونیورسٹی تعلیم و نظام کی طرف مابار توجہ دینے کا نتیجہ خاصا خوش گوار رہا۔ ۱۸۵۷ء میں صرف تین لینڈ درسگاہیں (کلکتہ، بمبئی اور مدراس) قائم ہوئی تھیں۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۵ء تک صرف دہلی یونیورسٹی (پنجاب اور اراک آباد) قائم ہوئیں۔ مگر ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۹ء تک یعنی صرف ۱۳ برس کی فاصلہ مدت میں مزید ۱۳ یونیورسٹیاں وجود میں آ گئیں۔

مسلم بادشاہوں کے عہد میں مسلمان عورتوں کی تعلیم پر کبھی توجہ نہیں دی گئی کسی مائلا مائلائی کے ذریعے مسلمان لڑکیوں کے لیے صرف قرآن ہی کی تعلیم (ناظرہ) کافی سمجھی گئی۔ مسلمان عورتوں کو بھی تعلیم کی ترغیب انگریزوں ہی نے دی شیخ عبداللہ اور ان کی سلیم نے سلم لڑکیوں کے لیے علی گڑھ میں ۱۹۰۶ء میں ایک کالج کی بنیاد رکھی اور جب اس سلم و مینس کالج کا پوئل تیار ہونے لگا تو رجسٹرڈ مسلمان ہر دوں نے اس کی زبردستی مخالفت کی مگر یوپی کے گورنر نے کالج اور پوسٹل تعمیر میں ذاتی طور پر دلچسپی لی اور اپنی جیب سے بلیوگ فنڈ میں ایک بڑی رقم چندے کے طور پر دی اور پوسٹل کی تعمیر میں بھی مدد دی۔ بنگال میں سب سے پہلے سلیم سخاوت حسین نے مسلمان لڑکیوں کے لیے ۱۹۱۳ء میں ایک مائی اسکول قائم کیا۔ دوسرا گرس اسکول ۱۹۱۳ء میں خبیہ اختر بانو بہر دور بدیلم نے کلکتہ میں کھولا۔ ادرہ کے نواب خان دان سے تعلق رکھنے والی شمسہ سلیم نے بھی انہی دنوں شیامراج میں لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔

ہندوستان کے اکثر قریب راہ نماؤں نے انگریزی تعلیم کو ہندوستان میں لے لیے ناگھیں، بے بس، بے جوڑ، غیر فطری اور بے شک قرار دیا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر فلاح قوم کی طرح (جیسا کہ مسلمان فاتحوں نے بھارت، اسٹریٹ و ہندی کے دیش پر ترکی عربی فارسی جیسی بلشی زبانیں مسلط کیں) انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنے مقصد کے لیے انگریزی رائج کی مگر اس زبان نے ہندوستان میں کو بے پناہ فائدہ پہنچایا۔ انگریزی اور انگریزی ہندی ہی نے ہندوستان میں کو آزادی اور جمہوریت کا تصور عطا کیا۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان (ماہر سے آئی ہیں ترک ملی، فارسی وغیرہ) بھی کامزاج جمہوری یا سیکولر کبھی نہیں رہا۔ اردو کو قطعی طور پر غیر سیکولر، غیر جمہوری اور جاگیر دارانہ مزاج کی حامل زبان ہے۔ غیر انگریزی زبان ہٹنے نے ایک عرصے تک آئی ہوئی آزادی کو روکا ہے۔ ترقی پسند رجحان پر یا بندگی لگائی ہے اور نئے علوم کے لیے اپنے دروازے بند رکھے ہیں جب کہ سائنس و حکمت صنعت

وہندوستان میں مسلمانانہ تعبیر

وجہت اور غرب کے دیگر جدید علوم انگریزی زبان ہی کے ذریعے ہندوستان میں آئے غرض علم کی مدد سے ہندوستان کے بہت سے علماء نے غربت کو انسانیت کا مرتبہ بنایا۔ انگریزوں نے اپنی زبان انگریزی کی قوت، ہندوستانی قومیت کو اور خصوصاً مسلمان قومیت کو انسان بنانے کا اہتمام کیا۔ آج بھی مسلمانوں کا جو طبقہ شریعت کے نام پر غور و فکر کو اپنا شعار بنائے رکھتا یا مہذب و درویش نظر آتا ہے۔ ”قوی دین کا بزرگی ترسوت کا اثر“ کے عنوان سے ایک بار سرائی سینٹر نے اعتراض کیا تھا: ”گزشتہ صدی کے آخری ایام نے ہندوستانی بچوں اور لڑکوں کی یہ کیفیت بھی کہ وہ نہایت خاموش، اطاعت شعار اور رکھیلوں سے متعلق تھے۔ لیکن مدرسہ علوم علی گڑھ اور سندھل، ہندو کا دلچسپ بنارس میں ایسے نمونے تیار کئے گئے جو صاف گو، دلیر، شجاع، مہذب، ملک سے محبت اور اس پر ناز کرنے والے ہیں، علی گڑھ اور بنارس کے لڑکوں پر کرسی کو ناز ہونا چاہیے۔ یہ ملک کی امید و قوت ہیں۔ وہ ہمارے ہیں بلکہ علم کی عطاقت۔ رہیں بلاگتافائی کے، مذہبی ہیں مہلتصیب کے، اور خلق میں بلاغی کے۔“ اسی انداز میں انگریزوں نے ہندوستان انہوں کو انگریزی پڑھا کر اپنے عقیدے میں ڈال دیا۔ اگر انہوں نے انگریزی تعلیم دی ہوتی تو وہ آج بھی ہندوستان کے آتا ہوتے۔

مدرسے

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں مدرسوں کی ابتدا ہوئی، مدرسوں میں دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور دنیاوی بھی۔ ان مدرسوں میں جو عام کون کے بعد دنیاوی دفعہ وغیرہ کا کورس بھی آتا ہے وہ عالم کہلاتے۔ تاریخ تحریک ہوجانے پر حکومت کی جانب سے ان کو کوئی مذہبی عہدہ دیا جاتا یا وہ قاضی بنا دیے جاتے۔ درندہ پھر کسی مکتب یا مدرسہ میں ملازم ہو کر درس دیتے تھے۔ مسلم دور حکومت کے خاتمے کے بعد انگریزوں کی آمد پر جب مشنریوں کو قلم نام لگے تب بھی مسلمانوں کے یہ مدرسے متاثر نہیں ہوئے۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد جس تک مدرسوں کے وجود کو قدرے خطرہ لاحق رہا مگر انگریزوں کی عزت میں مسلمانوں کا مذہبی جذبہ جب اور زیادہ بے دار ہوا تو مدرسوں کی مقبولیت پھر بڑھنے لگی یہاں تک کہ دلی ہندو دارالعلوم (۱۸۵۵ء) قائم ہونے کے بعد کے صرف ۴ برس میں اتر پردیش اور بہار میں ۵۰ مدرسے قائم ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزی حکومت (ان مدرسوں کے پھلے پھولنے میں رونا دھنا نہیں بنی، حصول آزادی کے بعد کے عہد کو اگرچہ مولوی طاہر بے دین کا عہد، کہہ کر یہ نام لگے ہیں مگر اسی عہد کے ان ابتدائی ۲۵ برسوں میں ان مدرسوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اپنے (مسلم) دور حکومت میں بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی اس وقت سارے ہندوستان میں مکتبوں اور مدرسوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں ملتوں اور مذہبوں کی کل تعداد کتنی ہے؟ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف دو ریاستوں (اتر پردیش اور بہار) میں ان دنوں ۵۰۰ مدرسے جاری ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان مختلف مذہبی مسلکوں سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح ان کے دینی مدرسوں کا نظام و تناسب مختلف ملکیوں پر مبنی ہے لیکن بیشتر حنفی مسلک کے ماننے والے ہیں ان مدرسوں کی دو اہم قسمیں ہیں۔ ایک مدارس عربیہ تقلیدیہ۔ اسی قسم کے مدرسوں کا تعلق مدرسہ نظامیہ (فرنگی مکتب) سے ہے ان مدرسوں میں علوم عقلیہ کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ رام پور کا مدرسہ عالیہ بھی فرنگی محل ہی کا ہے روکار ہے۔ دوسری قسم غیر تقلیدیہ مدرسوں کی ہے۔ ان مدرسوں میں دلی بند کے داعیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سبھا دن پور کا مظاہر علوم اور رائنڈیٹ کا دارالعلوم اشرفیہ بھی اسی نظریہ سے تعلق رکھتا ہے مگر سرلہ میر کے مدرسے آل اصلاح اور مولگی کے جامعہ رحمانیہ پر کعبہ کے اندوے کا اثر نمایاں ہے اور بریلی کے منظر اسلام اور مظاہر اسلام کا تعلق تو بریلوی ہی عقائد سے ہے۔ بنارس اہل حدیث کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ بنارس کے چند دولت مند مسلمانوں نے کی لاٹھ روپے سے چند برس ہوئے ایک بڑے اسلامی جامعہ کی بنیاد رکھی ہے اور اپنے اس عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ آزاد ہندوستان میں ہر فرقہ کو ہر بات کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اہل تشیع کے دینی علمی مرکز لکھنؤ اور بنارس سے تعلق رکھتے ہیں لکھنؤ میں ان کے مدرسوں میں مدرسہ سلطان آل عار، مدرسہ فقہیہ اند شیعہ علی کا لچ اہم ہیں۔ بنارس کے مدرسہ رحمانیہ اور مدرسہ جواد کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ جواد نے حصول آزادی کے بعد بڑی ترقی کی ہے۔ مدرسے کو ہر اعتبار سے دست دیا گیا ہے۔ گورنر میں فلسفہ جدید کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (ادنیٰ پورہ برادری اگرچہ اسماعیلی عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں مگر اسے شیعوں ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ پورہ برادری کا سب سے بڑا مدرسہ سید غیہ ہے جو سورت میں واقع ہے۔ عربی مدرسوں میں اس مدرسے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے ان دینی مدرسوں کی یہ بات آج بچے زاد رافضیوں کو سن کر ناگہان ہے کہ ان کا نصاب محض وہ ہے جو ادنیٰ درجہ کے عہد میں تیار ہوا تھا یعنی ملا نظام الدین (۱۷۴۸ - ۱۸۶۹ء) کا ترتیب دیا ہوا درسی نظام ہے۔ زمینی کا انسان جانتا کہ شیخ چکا ہے اور انسانی نقطہ نظر لیکن بدل چکا ہے مگر دینی نظام نے اپنا کاد ہی ہے۔ اگرچہ دیوبند کے دارالعلوم نے اپنے نصاب میں تفسیری ہی تبدیلی کی ہے اور تاریخ اسلام، سیرت نبوی، عربی ادب، طب یونانی اور علم مناظرہ جیسے مضامین کا اضافہ کیا ہے مگر یہ تبدیلی بھی درسی نظام میں ہی کی گئی ہے نہ کہ دینی نقطہ نظر کے دائرہ علم (کھنڈ) نے ابتدائی سے یہ کوشش کی کہ نظریات میں انتہا پسندی کو نہ اپنائے اور ردِ مختلف نصاب میں امتزاج پیدا کر کے میانہ روی سے کام لے مگر اس کو کامیابی نہ ہوئی اس ادارے میں بھی ترقی نہ ہوئی ہے۔ ان مدرسوں کے اسباب و قوت ارتقاء کے مطابق لانے کی کوشش مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے کلکتہ میں دارالارشاد کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ مقصد یہ تھا کہ قرآن شریف کو مستند حدیثوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کسی ایک صاحب کی تفسیر کے تحت قرآن کی تعلیم کا سلسلہ بند کیا جائے مگر اس سلسلے میں مولانا آزاد نے ہم عصر علماء نے مولانا سے جانچ لیا۔ چند برس بعد مولانا نے کلکتہ ہی میں مدرسہ اسلامیہ قائم کر کے دینی نصاب میں پھر اصلاح کی کوشش کی مگر اس بار بھی انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی وزارت آنے پر اور پھر ۱۹۴۷ء کے بعد وزیر تعلیم ہو جانے پر مولانا آزاد نے چارٹرڈ دارالعلوم اندوٹ علماء (کھنڈ) کے نصاب کو بہریدہ بنانے کا تجربہ کرے اور اس سلسلے میں حکومت اخراجات کی کفیل ہو مگر مددے کے قدامت پرست علماء نے مولانا آزاد جیسے عالم کی رائے کو بھی ٹھکرادیا۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ ان مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا آج کی زندگی سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ تنگ نظری کی انتہا یہ ہے کہ ان مدرسوں کا کوئی طالب علم اردو کی کوئی ایسی غیر درسی کتاب نہیں پڑھ سکتا جو مدرسے کے در سے حاصل کی ہو کسی بات میں تیرید پیدا کرے۔ دراصل ان دینی علماء کے تنگ نظر اور کوکب منڈوک بنے رہنے کا سبب یہی ہے کہ یہ بدیہی مستشرقین کی علمی تحقیقوں سے ناواقف ہیں۔

اگرچہ سب سے بڑا دعوہ مذہبی خدمات جیسے درس و تدریس، وعظ و تبلیغ، امامت، خطابت، تصنیف و تالیف ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں طب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے جس کو ایسی اور ایک دو قسم کی دسرت کاری بھی دکھائی جاتی ہے۔ فارغ التحصیل طلبہ لکھتے ہوئے کسی بھی ایک فن کو اپنا ذریعہ معاش بنا سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں سہارا پور کے نظامِ علوم کی جانب سے جو جواب ملا وہ یہ ہے: دینی تعلیم سے معاش کا حاصل کرنا مقصود نہیں ہے۔ مگر اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ ان اسلامی مدرسوں سے تعلیم پانے کے بعد (بیس چیس برس کی عمر میں) جب کوئی مسلمان نوجوان باہر جاتا ہے تو وہ کسی اسلامی ادارے میں مدرسے (تنخواہ زیادہ سے زیادہ سو روپے ماہ وار) جاتا ہے یا کسی مسجد میں موزن (باگھی) یا لاس میں جاتا ہے یا اپنی ہی سبزی میں کلاں مکتب قائم کر کے لٹاں جاتا ہے یا محرم اور عید میلاد کے دنوں میں معاذ صالے کر سبزی بستی جا کر وعظ کرتا ہے۔ کسی اسلامی مدرسے کے فارغ التحصیل نوجوان کی یہ معراج بھٹی ہے (جو ظاہر ہے شاذ و نادر ہی ہوتی ہے) کہ وہ ایک اچھا مصنف یا مولف بن جائے۔ ایک دو مثالیں ایسی بھی ہیں کہ بعض فارغ شدہ طالب علم محکمہ ریڈیو میں عربی کے ناؤ لکھنے لگتے یا کسی سفارت خانے میں ترجمان مقرر ہوتے مگر یہ سب کچھ بھی ہوتا ہے کوئی مولوی ملا کسی جالو، حلال یا کھنت و مشقت سے تعلق رکھنے والے پیشے میں مشغول ہی سے نظر آتا ہے۔ ہزاروں مولوی ملا لگنے کھانے کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں ایسی صدیوں، ایسے مکتبوں، مدرسوں اور یتیم خانوں کے لیے دولت مند اور تاجر مسلمانوں (شرعی اعتبار سے جن کی دولت کو جائز و حلال نہیں کہا جاسکتا) سے چندے دے گئے (جو جرات و زکات کی صورت میں دیے جاتے ہیں) لینا اور چندے کی رقم میں سے کیشن وصول کرنا۔ جاہل مسلمان مرد و عورتوں کے ہات تو بڑھ گئے۔ یہ خدمت کرنا، دولت مند مسلمانوں کو مرید بنانا کرانے سے پیش قیمت نذرانے حاصل کرنا، کرائے پر وعظ کرنا اور محض قول معاذ سے پرہیز میں مناظرہ میں ہتھ کرت کرنا مولوی ملاؤں کا عام پیشہ ہے۔

ہندوستان کے مولوی نے اپنے لئے خیرات و زکات کو اس لیے جائز و حلال بنا رکھا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھول سے یہ وصیت فرمائی تھی: "میرا کتب خانہ مدرسہ کی ہمیشہ بخیر چندہ پر نظر رہے" یہ برا اتفاق ہوا کہ وصیت کرتے وقت حضرت نانوتوی یہ حدیث میں ہتھ کرت کرنا مولوی ملاؤں کا عام پیشہ ہے۔

ہندوستان کی مسلمان سیر

بھول گئے، اُنکات کھانے والے کا قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور علم انہیات کے اس نکتے کو بھی وہ فراموش کر گئے کہ دوسروں کی کمائی پر ملنے والے انسان کا کردار مسخ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس وصیت نے آج کے مولوی کو اتنا بے حس بنا دیا ہے کہ وہ اپنے مدرسے کی رپورٹ پیش کرتے وقت بڑے فخر سے لکھتا ہے: **دکال حرم اللہ** اس ادارے کا نفع اہل خیر کی دی ہوئی خیرات و نزکات سے چلتا ہے!۔۔۔ دراصل اس سلسلے میں بات ابتدائی سے بگڑ جاتی ہے۔ یہ دینی مدرسے اپنے طالب علموں کے قیام و طعام، درسی کتب، علاج، ہنہانے دھونے اور حجامت وغیرہ کے اخراجات خیر برداشت کرتے ہیں جو طالب علم دارِ اقامہ (بورڈنگ ہاؤس) میں جگہ حاصل نہیں کر پاتے وہ بستی کی مسجدوں کے حجرہوں میں رہنے لگتے ہیں اور مسلمان علموں کے متمول گھرانوں سے اُن کو دونوں وقت کھانا ملنے لگتا ہے۔ جب بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ اس طرح گزر جاتا ہے تو شرم و حیا اور جھجک ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہ طالب علم مولوی بن کر بڑے اطمینان سے خیرات و نزکات کی آمدنی پر اپنی ساری زندگی گزار دیتا ہے۔

ان اسلامی مدرسوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ اپنے فارغ تحصیل طالب علموں کے لیے بے روزگاری کا کوئی حل پیش نہیں کرتے۔ ان مدرسوں کی دنیا ہوئی عالم و فاضل جیسی کوئی سند ہندوستان کی کوئی یونیورسٹی تسلیم نہیں کرتی دراصل ہندوستان کا ہر مدرسہ اپنے بنیادی ہی مقصد میں ناکام ہے وہ اپنے طالب علم کو دنیا گزارنے کا سلیقہ نہیں سکھایا تا۔ ان مدرسوں کے سربراہ اس مٹی سی بات کو آج تک نہیں سمجھ سکے کہ پس ماندہ قوم کو ترقی کرنے کے لیے مسلمانوں، داعیوں، مصنفوں، اماموں اور سائنسوں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ضرورت کہ دست کاروں، صنعت کاروں اور نامورین اقتصادیات کی ہوتی ہے۔ ان مدرسوں سے بہت کم دینی کا جامعہ ملے گا، ایک ایسا اسلامی تعلیمی ادارہ ہے جس کا مقصد ہی آج تک واضح نہیں ہو پایا۔ کسی نے کہا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پڑھا ہوا نوجوان محض دنیا دار بن کر رہ جاتا ہے دین سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا اور دارِ علوم دیوبند کا فاضل صرف دین سے تعلق رکھتا ہے اور دنیا کے لیے بالکل بے کار ثابت ہوتا ہے مگر جامعہ ملیک اسلامی سندھ یا فقہ الدین کا نہ دنیا کا۔ یہ واقعہ ہے کہ جامعہ ملیک اسلامی ہوا نوجوان زندگی بھر اللہ ہی بنا رہتا ہے اور جامعہ کے سلسلے میں پروڈیوسری بڑی حقیقت ہے کہ جامعہ نے آج تک کوئی قابل ذکر مسلمان پیدا نہیں کیا۔۔۔ جب کہ سرسید نے ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس احسان کو بھلایا نہیں جاسکتا کہ اُس نے ہر میدان میں مثالی اور کامیاب مسلمان پیدا کیے علی گڑھ کا یہ تعلیمی ادارہ اپنے مقصد میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ شاہ جہاں نے تاج محل بنا کر اتنا بڑا کام نہیں کیا کہ جتنا بڑا کارنامہ سرسید نے علی گڑھ کالج بنا کر انجام دیا۔

فراقِ مائیں سستی کے مرکز

یہ بات بلا خوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کا ہر اسلامی مدرسہ فرقہ پرستی کا آڈا ہے۔ ان مدرسوں میں 1947ء سے پہلے بھی فرقہ پرستی ماحولی اور آج بھی موجود ہے۔ دارِ علوم دیوبند کے سلسلے میں یہ بات مشہور رہی ہے کہ اُس نے جنگِ آزادی میں واضح طور پر حصہ لیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ ہند مولانا محمود حسن اور ان کے چند ساتھیوں نے اور ان کے بعد مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے محدود حلقے نے جنگِ آزادی میں علی طور پر حصہ لیا اور ان کے بعد مدنی قبیلے کی قوم پرست ہے درندہ دار علوم کا ہر رکن تقسیم ہند سے پہلے مسلم لیگی تھا اور آج بھی مسلم لیگی ذہنیت کا حامل ہے اور پاکستان کو انہی اسی سلسلے میں لکھنؤ کا ندوت الی علماء بھی قابل ذکر ہے۔ یہ ادارہ ابتدائی سے اپنے مقصد میں ناکام رہا ہے۔ یہ ادارہ مختلف نظریات کے علماء کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے کے لیے قائم ہوا تھا مگر مولانا شبلی ندوی سے اسی لیے علاحدہ ہوئے کہ اُن کو ندوی کے سربراہوں سے اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ یہ عالموں کی اصلاح کر سکا اور نہ اپنے طالب علموں کو دین و دنیا کے لیے موزوں انسان ثابت کر سکا۔ ان حقائق کے قطع نظر آج ندوت الی علماء جامعہ اسلامی کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ اس کے سربراہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے سیکولرزم اور سوشلزم کی مذمت میں اور سعودی عرب کی بادشاہت کی تعریف و توثیق میں اپنی پوری قوت صرف کیے ہوئے ہیں۔۔۔ دراصل اپنی فرقہ پرستی کے باوجود ہندوستان کے اسلامی مدرسوں کا لٹاب ہی ایسا ہے کہ وہ اپنے ہی ماننے والوں کو درست، ماننا ہے کہ دوسروں کو گمراہ یعنی میں اور مجھ جیسے بریں، تو اور تجھ جیسے سارے مشرک یا کافر۔ نتیجہ کہ میں اور مجھ جیسے حتی تو اور تجھ جیسے سارے جہنمی۔۔۔ پس یہی تصور فرقہ پرستی کے جذبے کو جنم دیتا ہے۔ ان مدرسوں کا لٹاب اور رنگ زیب کے عہد میں ترتیب دیا گیا تھا

وہ اسی عہد کے لیے مناسرہ تھا، مہلتے ہوئے زمانے کے ساتھ (جیسا کہ مولانا آزاد کی خواہش تھی) اب ایسے بھی بدل جانا چاہئے۔ دائرِ علوم دلیہ ہند، مظاہرِ علوم سہارن پور، دائرِ علوم ہند، علماء ہند، ازبکستان، پاکستان، بھارت، و غیرہ نے سیمینار و قلم کو فصل کے سوالات کے جواب میں یہ بھی کہا تھا کہ ملک تقسیم ہو جانے اور بدلے ہوئے حالات کے مابین طبعاً کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا ہے اس کے معانی یہ ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں فرقہ پرستی بڑھی ہے کم نہیں ہوئی۔ اور مسلمانوں کی فرقہ پرستی کو بڑھا دینے والے ہیں یہ مدرسے۔

شریف زادہ

ہر اُسی بات کو جو نئی ہو مسلمان اُسے ہیٹھ دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا رہا ہے۔ اُس کے نزدیک انگریزوں سے ملنا جلنا، کھانا پینا اور انگریزی پڑھنا کھنڈ سے کم نہ تھا جو لوگ انگریزی تسلیم حاصل کرتے اُن کے نام بگاڑ بگاڑ کر رکھے جاتے تھے کوئی انھیں کرستان کہتا اور کوئی منترئی۔ عام طور سے مشہور تھا کہ جس نے انگریزی پڑھی اُس نے اپنا مذہب چھوڑا۔ غرض کہ کوئی شریف زادہ انگریزی کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا۔

رام پور کے ایک گھرانے میں تار بیچا، تار عام طور پر گھبراہٹ ہی کا باعث بنتا ہے۔ اُس لئے پہلے تو گھر کے لوگ خوب روئے پیٹے پھسے کسی ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو انگریزی داں ہو، تاکہ اُس سے وہ تار پڑھوایا جاسکے۔ کسی نے اُنہی کے کسی رشتے دار کا نام بتایا کہ اُن کا فلاں بیٹا انگریزی پڑھا ہے وہ ضرور تار پڑھ دے گا۔

یہ سن کر گھر والوں میں سے کسی بزرگ نے بڑے درشت لہجے میں فرمایا: 'استغفر اللہ! آپ کیا بات کرتے ہیں وہ شریف زادہ ہے!'

تَعْلیمی انجمنیں

سائنسی فک سوسائٹی ملی گڑھ

سر سید کا اپنا نفاذ جدید تعلیم اور نئے خیالات کی روشنی میں سے تنگ نظری اور اہم برستی کا کثیر اچھیٹ سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر سر سید نے غازی پور میں 1866ء میں سائنسی فک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کے سلسلے میں سر سید نے مقصد اس طرح بیان کیا تھا: "اس مجمع کو علمی سوسائٹی کہا جائے گا اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔ البتہ ان کے تعلیم مصنفوں کی کتابوں کی تلاش کر کے ہم پرچا کرنا اور چھاپنا۔ سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔" 1864ء میں سر سید جب غازی پور سے علی گڑھ آئے تو یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہو گئی اور 1866ء میں از سر نو اس کی بنیاد صوبے کے گورنر کے ہاتھوں رکھی گئی۔ 30 ہزار روپے کی لاگت سے سوسائٹی کے لیے ایک عمارت تیار کی گئی۔ سوسائٹی کا علم مترجموں، مولویوں، پریس میں، چپراسی، مالی وغیرہ پر مشتمل تھا جس کی تمام ہونے کا خرچ 5 سو روپے ماہ وار تھا ان سوسائٹی نے بہت سی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔ جدید علوم اور نئے موضوعات پر لکھ کر دوائے گئے۔ نچلی سائنس پر بھی ہر مہینے ایک لکچر دلوایا جاتا تھا اور آلات سے تجربے کیے دیکھنے جاتے تھے۔ 1866ء میں سر سید نے اس سوسائٹی کی جانب سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ہفت روزہ اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری کیا جو بعد میں ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار سر سید کے آخری دم تک جاری رہا اور اس کے زیادہ تر ادارے انہوں نے بنائے تھے۔ اس اخبار میں علمی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مضامین شائع ہوتے تھے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی یہ خصوصیت رہی کہ وہ 22 برس جاری رہا اور ہمیشہ اپنی مقررہ تاریخ پر شائع ہوا اور دوسرے اس اخبار کی کوئی تحریر کبھی کی توں نہ تھی یا فرد کے لیے دل آزاری کا باعث نہیں بنی۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے بھی وہ ہمیشہ بے تعلقی رہا۔ سائنسی فک سوسائٹی کے ممبران میں انگریز، ہندو، مسلمان بھی تھے۔ ہندوستان میں یہ سوسائٹی اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی۔ اس نے مغربی علوم و نظریات سے ہندوستانی مسلمانوں کی بیگانگی کو دور کیا اور ایک ایسی فضا تیار کی کہ جس میں سائنس اور جدید علوم کی فکری اور عملی کارناموں کو سمجھنے اور حالات کے مربوط پیش کا جائزہ لینے میں مدد ملی اور اس سوسائٹی نے سر سید کی تعلیمی مہم کے لیے ہر ادلی کا کام انجام دیا۔

انجمن اسلام ممبئی

1875ء میں سر سید اور آئین ظہیر جی، محمود گھلے، قمر آدین سیب جی، غلام محمد اور غلام محمد آدین صاحبان نے مسلمانوں کی فلاح پر مبنی کی خاطر ممبئی میں انجمن اسلام کی بنیاد رکھی۔ 1880ء کے شروع میں ممبئی کے گولڈن داس تین پال اسکول میں انجمن کی جانب سے مسلمان بچوں کے لئے ایک کلاس جاری کی گئی۔ 20 ستمبر 1880ء کو عیسائی گزٹ کے حالات میں انجمن نے ایک اسکول کی بنیاد رکھی اور پھر 2 دسمبر 1893ء کو انجمن نے اسکول کی اپنی عمارت کی تعمیر شروع کی۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ارکان سیشن میں اپنا نمائندہ بھیجے کے بحث طلب سٹیل پر انجمن دو گلوب میں بٹ گئی۔ آخر اختلاف اس فیصلے پر ختم ہوا کہ انجمن مسلمانوں میں دل چسپی نہ لے۔ 20 نومبر 1949ء سے انجمن اسلام انڈین کپنی ایکٹ کے تحت ایک رجسٹرڈ ایسوسی ایشن ہے۔

قرین ایک صدی کے اس عرصے میں 5 اوقات اور فقاہ علم اداسے انجمن کے زیر انتظام آچکے ہیں جن میں انجمن اسلام چیرمین (ممبئی)، محمد حاجی صدیق انسٹی ٹیوشن (ممبئی)، عبدالقادر کریم ہلارڈ چیرمین ٹرسٹ (ممبئی)، عبداللہ و فداؤ اللہ نازانہ ذہیم خانہ ٹرسٹ (ممبئی)، ولی محمد دوست محمدیہ محمد گزٹیم خانہ ٹرسٹ (پونا)، دارالعلوم ٹرسٹ (بنگلہ)، انجمن کونکیشن ٹرسٹ (ممبئی)، انجمن اسلام چیرمین (برائے تعلیمی و سماجی ترقی خواتین و طفلان)، اور انجمن ان کونکیشن سوسائٹی قابل ذکر ہیں۔

انجمن کے تحت 6 تعلیمی ادارے جاری ہیں جن میں ایک کامرس و اکاؤنٹس کالج، ایک علمی و تحقیقی ادارہ، انجمن بزرگ میں سرگئی ٹکٹ اور ڈیوٹا کورس پر مشتمل ایک ہائی ٹیک ٹک، ایک غیر ملکی کالج آف انجمنیشن (برائے خواتین)، تین بوائز ہائی اسکول، ایک ٹیکنیکل ہائی اسکول، پنج گئی میں ایک ہائی

اسکول، یونانی اسکول، لڑائی اسکول، مولائی اسکول اور بالوں کے لیے ایک اسکول شامل ہیں۔ ساتھ ساتھ انجمن لڑکیوں کے درجہ خانے، جھولے بچوں کا ایک تہ خانہ، ایک کالج ہوسٹل، ایک پبلک لائبریری، ایک پرنٹنگ پریس اور ایک اشتاعتی مرکز کا بھی انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور

انجمن حمایت اسلام ۱۹۸۹ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ یہ پنجاب کی پہلی اور ہندوستان کی ابتدائی تعلیمی تنظیموں میں سے ایک ہے۔ ابتدائی اس انجمن کے تحت لاہور میں لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول اور یتیم خانہ قائم کیا گیا۔ بعد میں یہ انجمن ایک تعلیمی مرکز بن گئی اور اس کے زیر انتظام لڑکوں اور لڑکیوں کے کئی ڈگری کالج، کئی ہائی اسکول، پرائمری اسکول اور ٹریڈنگ کالج کھولے گئے۔ لڑکیوں کے لیے ایک انڈسٹریل اسکول بھی کھولا گیا۔ ایک طبیہ کالج، یونانی دوا خانہ اور ایک ٹیس سینسری کاتیام بھی عمل میں آیا۔ انجمن نے اپنے طے کیے ہوئے نصاب کے تحت درسی اور غیر درسی کتابوں کے لیے اپنا ایک پریس بھی قائم کیا اور ان لوگوں کی فراہمی کے لیے اپنی ایک ڈپو بھی بنیاد ڈالی۔ صفت روزہ "حمایت اسلام"، انجمن کا آرگن تھا جو عرصے تک جاری رہا ہے۔ انجمن "حمایت اسلام" کی یہ منصوبہ بندی ہے کہ اس کے سالانہ جلسوں میں مولانا حالی، شبلی، اقبال اور مولانا آزاد جیسے ممتاز عالموں نے شرکت کی ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

دسمبر ۱۹۵۵ء میں سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں انجمن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی بعد میں کانگریس کی جگہ کانفرنس، مجنوں کی جگہ مسلم علماء کا آل انڈیا لفظوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد تھا کہ مسلمانوں کو تعلیمی مسائل سے دل چسپی پیدا کر لی جائے اور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ مغرب کے دیگر علماء اور اصل کرے پر زور دیا جائے۔ اس کانفرنس کے پہلے اجلاس کے صدر مولوی حاجی محمد سمیع اللہ خاں سی ایم جی تھے جو سرسید کے دست راست تھے بعد میں "ام الہند" خاں بہادر، سردار محمد جات خاں سی ایم آئی، آئی ایم ای، نواب محسن الملک، مرزا خاں، جسٹس بدر الدین طیب جی، مہاراجا محمود آباد، خاں بہادر سیال، سر محمد شفیع (جو وائس رائے کی ایگزیکٹو کونسل میں وزیر تعلیم تھے اور اپنی کتب خانہ علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کا چارٹرڈ تھا)، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، خان بہادر شیخ عبدل قادر، سر راس مسعود، سر سید رضا علی، نواب سر محمد مزمل خاں، ڈاکٹر برصیا دین احمد، صاحب زادہ قیامت علی خاں اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جیسے عالم و ممتاز اصحاب صدر رہے۔ اس کانفرنس کے ذریعے ملک کے ہر حصے کے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کی گئی۔ برطانیہ اس کانفرنس کی آواز پھیری۔ دور دور کے نوجوان طلب علم کے لیے علی گڑھ کھینچ کر آئے۔ مسلم یونیورسٹی کی کیمیں دراصل اسی کانفرنس کی کامیاب جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں جو تقریریں ہوئیں، نظمیں پڑھی گئیں اور خطبات پڑھے گئے وہ بجائے حق علی، دینی سماجی اور سیاسی ادب کا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں بچوں کے لیے کانفرنس کی جانب سے مدرسے بھی کھولے گئے۔ ذہین دہونہار طالب علموں کو دلچسپی بھی دیے گئے۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں کو اتنی ہمت بھی دلائی کہ وہ اپنے اپنے صوبے کی حکومت سے تعلیمی مشکلات کو دور کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس کانفرنس کی جانب سے بہت سی اچھی اور گراں قدر کتب بھی شائع کی گئیں اور کانفرنس نے اینا بک ڈپو بھی قائم کیا۔ "کانفرنس رزلٹ"، "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اختتام روزہ آرگن" تھا جو ۱۹۷۹ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

انجمن ترقی اردو ہندوہی

اردو ہندی کا تنازع ملک میں بڑھا تو مسلمان اردو زبان کی حفاظت کے لیے رجوع ہوئے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل

گلن کاہنہ صائی صلیہ ۱۰۱۲

کان فرس (منفردہ دہلی) کے اجلاس میں ایک شعبہ ترقی اردو کے نام سے قائم ہوا۔ دراصل جب برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی تب ہی اردو کے فروغ کے لیے ایک شعبہ قائم کر دیا تھا اسی شعبے نے مسلم ایجوکیشنل کے تحت انجمن ترقی اردو کا روپ اختیار کر لیا۔ انجمن کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی مقرر ہوئے۔ ان کی ترغیب پر ابتدا میں انجمن کے عمل کی توجہ دار تقریبیں چار سو ہو گئی اور شبلی نے وہی برس میں کئی بڑی ادراہم کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اپنی علامت کی بنا پر شبلی نے انجمن کو خیر باد کہا تو مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1910ء میں مولوی عزیز مرزا سکریٹری بنے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی دی ہوئی 5 سو روپے سالانہ امداد اور ٹیوٹی بک ڈپو کی آمدنی سے انجمن کے اخراجات کسی نہ کسی طرح پورے ہوتے رہے مگر 1912ء میں مکھنو کے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا مولوی عبدالحق کی کوشش سے انجمن ایک نئے دور میں داخل ہوئی صرف وہی برس کی مدت میں انھوں نے 7 1/2 ہزار روپے چندوں کے ذریعہ جمع کیا، بیگم بھوپال سے 3 ہزار روپے سالانہ امداد دینے کا وعدہ کیا اور نظام حیدر آباد کی سرپرستی حاصل کی۔ (مولوی عبدالحق اور نظام کے اس تعلق ہی نے حیدر آباد کے عظیم و مثالی دارنزر جہ اور عثمانیہ لونی و سرٹی قائم کرنے کے خیال کو جنم دیا) 1920ء تک انجمن شعبہ ترقی اردو کے نام سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی سے ملتی رہی لیکن مولوی عبدالحق کی اچھی کارگزاری کی بنا پر اس نے انجمن ترقی اردو کی ایک آزاد شکل اختیار کر لی۔ اور پھر اورنگ آباد میں اس کا صدر دفتر قائم ہوا۔ مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن نے نثر و نظم، تنقید، ادب، سوانح، تاریخ و سائنس، فلسفہ و سیاست، گرامر اقتصادیات و نفسیات، قانون، تعلیم و مذہب کے موضوع پر بہت سی اردو کتابیں شائع کیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ انجمن کی جانب سے ایک انگریزی اردو لغت شائع کیا گیا اور سائنس کی انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ جن جلدوں میں شائع ہوا انجمن نے تین اردو جلدیں بھی جاری کئے "اردو سہ ماہی"، "ہماری زبان"، "پندرہ روزہ"، "ماہ نامہ"، "سائنس"، "ادب نامہ"، "معاشیات"، "سہ ماہی"، "اردو" اور "ہماری زبان"، ایک ہفت روزہ کی صورت میں ابھی تک جاری ہیں۔ صوتی اٹل کی ابتدا بھی بابائے اردو ہی نے کی۔ انجمن ترقی اردو ہند کو نظام حیدر آباد، نواب سالار جنگ میاں دار، مرتضیٰ بھائی کریم بھائی، راجا پرتاب گرجی، نرسنگھ گرجی، بیہار اور سرگرمی جیسی متنازعاتی سرپرستی حاصل رہی ہے مولوی عبدالحق نے اس انجمن کے لیے اتنا کچھ کیا کہ وہ بھی معافی میں بابائے اردو بن گئے۔ ان کو اپنے بیافنڈ کے سلسلے میں انٹورس کہنے سے 5 ہزار روپے کی جو رقم ملتی تھی وہ بھی انھوں نے انجمن ہی کی نذر کر دی تھی۔ بابائے اردو ہی انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی لے آئے۔ 1947ء کے فردوارہ ذمالات میں انجمن کا گراں قدر کتب خانہ جل گیا۔ پاکستان بننے پر مولوی صاحب کراچی چلے گئے۔ ان کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری فاضل عبدغفار مقرر ہوئے اور دفتر علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر آل احمد مروت نے یہ عہدہ سنبھالا اور اب 1974ء سے ڈاکٹر خلیق انجم اس عہدے پر فائز ہیں۔ دفتر علی گڑھ سے پھر دہلی منتقل ہو چکا ہے۔ بابائے اردو کے پاکستان چلے جانے کے بعد سچ نک اس انجمن نے اردو خدمت کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر کام انجام نہیں دیا۔ انجمن ترقی اردو ہند کو حکومت ہند سے کم دہش 50 ہزار روپے سالانہ امداد ملتی ہے۔

شعبہ تعلیم نسوان علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دو نمبر اہم شعبوں (شعبہ تعلیم، شعبہ تصلیف و تالیف، شعبہ اصلاح و معاشرت، شعبہ ترقی اردو و فنون میں تعلیم نسوان کے لیے بھی ایک شعبہ تھا۔ اس شعبے کا مقصد تھا کہ مسلمان عورتوں میں تعلیم کی اشاعت ان کی ضرورت اور کیفیت اسلامی روایات کے مطابق ہو۔ اگرچہ یہ شعبہ سرسید کی زندگی ہی میں (1896ء) قائم ہو چکا تھا مگر نصاب و ادب طرق تعلیم کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکی بنا پر یہ شعبہ کوئی کام انجام نہ دے سکا تھا۔ 1902ء میں شعبہ تعلیم نسوان از سر نو قائم ہوا۔ شیخ عبداللہ (جس کو سرسید نے پال پوس کرنا تعلیم دلائی تھی) اس شعبے کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس شعبے کا سب سے بڑا اور قابل قدر کام نامہ علی گڑھ کے مسلم گرنر کالج کا قیام ہے۔

○
عورتیں مردوں کی بہ نسبت زیادہ عقل مند ہوتی ہیں، اس لئے کہ وہ کم جانتی ہیں اور زیادہ سمجھتی ہیں؛ جیسے اسٹیفنس

۱۹۴۷ء میں جب حکومت اتر پردیش نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دے دیا اور یوں کے مسلمانوں نے دہری کتابوں میں ہندو مذہب کی روایات کو پسند نہیں کیا تو ۱۹۵۰ء میں اودھ کے قید مسلمانوں نے لسی میں انجمن تعلیمات دین کی بنیاد رکھی۔ یہ کہہ کر مقصد کی اشاعت کی گئی کہ مسلمانوں کی نفیس نو کے ایمان کو محفوظ رکھنے کے لئے آزاد مکتب کھولے جائیں، اپنی پسند کی کتابیں پڑھائی جائیں، حکومت سے نہ وابہ رہیں اور نہ کسی دوسرے تعلیمی ادارے سے الحاق کیا جائے۔ اس بنیاد پر مکتب کھلنے لگے۔ انجمن کو جب اس سلسلے میں کامیابی حاصل ہوئی تو دسمبر ۱۹۵۹ء میں ایک صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی گئی جس سے انجمن کے مقصد کی اور زیادہ اشاعت ہوئی۔ اتر پردیش کے ۴۶ اضلاع میں انجمن تعلیمات دین کی شاخیں قائم ہوئیں اور نتیجے میں تقریباً ہر گاؤں میں ایک مکتب قائم ہو گیا اور ان دنوں انجمن کے ۱۵ ہزار مکتبوں میں ۶ لاکھ بچے تعلیم پا رہے ہیں۔ ہر شاخ کی ایک کمیٹی ہے اور اس کا ریورنڈ فنڈ ہے۔ اس انجمن تعلیمات کے تحت جو زیر ہائی اسکول بھی کھولے گئے ہیں۔ لسی کی اس انجمن تعلیمات دین اور دینی تعلیمی کونسل لکھنؤ کو مولانا عبد اللہ رحمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا شاہد فاخری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا عبدالقیوم علی گڑھی، صوفی شاہ سلیم قادری، مولانا محمد ستم فرنگی محلی اور مولانا سید الاول حسن ندوی کی سرپرستی حاصل ہے۔

گدقتاری مرزا نویش

سنایا گیا کہ ان دنوں تھانہ گذرقاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قاتل باز پکڑے گئے۔ مثلاً ہاشم علی خان وغیرہ کے جو سابق بڑی ملتوں تک سپرد ہوتے تھے۔ کہتے ہیں بڑا قاتل ہوتا تھا لیکن باسبب رعب اور کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید احمد بہت جبری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے ججدار تھا۔ بہت مت کا نوکر ہے مجداری میں بھی بہت گرفتار تھا۔ مجرموں کی کرتار ہا ہے۔ بہت بے طمع ہے۔ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریئر صاحب کے قریب قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس رئیسوں کی سہمی اور سفارشیں بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے ادا نہ کریں۔ توجہ راہینہ قیہ۔ لیکن ان تھانیدار کی خدائیں خیر کرے دیانت کو تو کام نہ فرمایا انہوں نے۔ لیکن اس علاقہ میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ دقت بے وقت چوٹ پیٹ کریں اور یہ دیانت ان کی جان ہو۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہئے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کیاب ہوتا ہے۔“

دلی سے اردو انصار

۲۸ اگست ۱۹۸۶ء

انجمن خیرال اسلام بمبئی

بمبئی کے محنت کشوں کے گنتی علاقے دن پورے میں اچانک چار بچوں کے قتل ہو جانے پر محرم پیر محمد اور محرم حاجی ملشی محمد کھانے ان کی پرورش کا زمرہ لیا اس طرح 1927ء میں خیرال اسلام نام کی ایک انجمن اور اس کے قیام خانے کی بنیاد پڑی۔ 1960ء میں اس انجمن نے بمبئی (مدن پورہ) میں ایک ملشی اسکول کی بنیاد رکھی۔ آج کل اس انجمن کے تحت 60 بچوں کا ایک تیم خانہ، 200 بچے بچپن کے لیے ایک مدرسہ، تعطیلات میں 200 بچوں کے لیے دست کاری کا ایک اسکول، 12 اُردو ملشی اسکول، ایک کے وجی۔ اسکول، آرٹس، سائنس اور کامرس کے دو کالج، ایرکنڈ ٹیکنالوجی اینڈ ٹریڈ فیکری، شون ٹیکنالوجی کا ایک انسٹی ٹیوٹ، الیکٹریک دائرہ، کورس کا ایک مرکز اور ایک ٹیچر ٹریننگ اسکول جاری ہے۔ بمبئی کے اس طبیہ کالج کو جو ہندو ہونے کے قریب تھا انجمن خیرال اسلام نے ہمارا مشترکہ حکومت کے ذریعہ ڈاکٹر رفیع زکریا اور دہلی کے ہم دردداد خانہ کے سربراہ جناب حکیم عبدالحمید کے تعاون سے اپنے انتظام میں لے لیا اور بمبئی کے مشہور سماجی راہنما ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا نے پرنسپل کی کراس ادارے کو ایک اچھے طبی کالج اور ایک مکمل ہسپتال میں بدل دیا۔ اس طرح انجمن خیرال اسلام بمبئی 7 ہزار بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں اس کو تقریبی 70 لاکھ روپے سالانہ خرچ کرنا ہوتے ہیں اور اس خرچ کا احصاء فطرہ، زکات، جرم قربانی اور عطیات پر ہے۔

انجمن اسلام مردہ

1903ء میں جب آل انڈیا محمدیون ایکویشنل کانفرنس کا 19واں اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا تو مردہ (ریاست جزیرہ) ہمارا مشن کے منت۔ اصحاب نے بھی اس میں شرکت کی اس اجلاس سے جو خرائضوں نے لیا اس کے نتیجے میں انھوں نے 11 اپریل 1907ء کو اپنی ریاست کے مسدود مقام مردہ میں انجمن اسلام قائم کی مقصد یہ تھا کہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی علمی، ذہنی، جسمانی اور مذہبی ترقی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کر کے ان کی طرز معاشرت، تہذیب، اخلاق، تمدن کی اصلاح کی جائے۔ شہر مردہ میں جو ملشی اسکول تھا اس کے لیے اس انجمن نے پہلے ہی برس ایک ہوسٹل قائم کیا۔ انجمن نے مذہبی تعلیم کو اہمیت دیتے ہوئے دینیات کا نصاب بھی مرتب کیا۔ ہوسٹل میں بھی دینی کلاس قائم کیا گیا اور نماز روزہ لازمی کر دیا گیا۔ 1946ء میں حنیفہ کی جمعیت مسلمین کے اشتراک سے مردہ کی انجمن اسلام نے اپنے ہی احاطے میں ایک مدرسہ بنام محمدیہ قائم کیا جس میں تین برس تک ابتدائی دینی تعلیم دے کر طلباء کو مزید دینی تعلیم کے لیے ہندستان کی بڑی بڑی دینی درس گاہوں میں بھیجا جاتا ہے۔ کارکنان انجمن تقریریں تحریر، مباحثوں اور قراردادوں کے ذریعے بے ہودہ وسوسات کی کورانہ تقلید سے پہلے ہونے والے نقصانات اور شادی دہائی کے موقعوں پر ہونے والے فضول اخراجات کے بھلک نتائج سے بھی مسلم فرقے کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن بنگلور

ریاست کرناٹک کے مسلمانوں کی یہ انجمن (صدر انجمن) 1907ء میں نواب غلام احمد کلای، خان بہادر عباس خاں اور میر حمزہ حسین جیسے دردمند مسلمانوں نے بنگلور میں قائم کی۔ یہ ایک تعلیمی سماجی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ صدر انجمن کے تحت عید گاہ جدید میسور روڈ بنگلور سٹی، عید گاہ سر قاضی صاحب چام راج پیٹ بنگلور سٹی، مسجد مرقاضی صاحب سلطان پیٹ بنگلور سٹی، قبرستان قدیم چام راج پیٹ بنگلور سٹی، قبرستان جدید مسجد میسور روڈ بنگلور سٹی، قبرستان قدیم (جالی محل) میسور روڈ بنگلور سٹی، عاشور خاں میسور روڈ بنگلور سٹی اور محمود شریف ایکویشنل ٹرسٹ یسونت پور بنگلور جیسے ائمہ اوقات جاری ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ انجمن سی۔ ایم۔ اے ملشی اسکول، سی۔ ایم۔ اے ملشی اسکول، سی۔ ایم۔ اے نرسری اسکول، سی۔ ایم۔ اے نرسری اسکول، سی۔ ایم۔ اے لائبریری، سی۔ ایم۔ اے لائبرری اور سی۔ ایم۔ اے لائبرری روم کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ ان دنوں

یہ لاپرواہی، سب سے زیادہ 3373 کے تحت یونیورسٹی میں ہے۔ اکثر ذوقدارانہ فادات کے نتیجے میں انجمن نے اپنے فنڈ سے مظلومین کو (بالفاظ غریب دلت) مالی امداد بھی دی ہے۔ نژاد زدہ علاقوں میں امن کمیٹیاں قائم کرانے میں حکومت سے تعاون کیا ہے اور مظلومین کو دوبارہ بسنے میں مدد دی ہے۔ ریاستی حکومت سے مسلمانوں کے لیے تعلیمی سہولتیں اور مراعات حاصل کرنے کے لیے انجمن نے ایک خصوصی کمیٹی بھی تشکیل دے رکھی ہے۔ انجمن کی کوششیں بنظروریونیورسٹی میں اردو شعبہ قائم ہو چکا ہے۔ حکومت کرناٹک کی ریاستی سطح کمیٹی میں انجمن کا بھی ایک نمائندہ موجود ہے۔

انجمن حامی مسلمان بھٹکل

خلافت اور ترک مودالت جیسی سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپریل 1999ء میں الف۔ اے۔ محمد حسن صاحب اور ایم ایم صدیقی صاحب نے ایک نئے قائم کیا تاکہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کو بھی فروغ دیا جائے۔ انجمن نے ایک مدرسہ قائم کیا جو 1992ء میں الی اسکول بن گیا۔ اس انجمن کو اسماعیل صدیقی صاحب کی بھی صدارت حاصل رہی جو علاقہ فاروار کے پہلے گریجویٹ مسلمان تھے۔ انجمن کو اپنی جائے داد سے آمدنی ہوتی ہے چند سے اور عطیات بھی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ انجمن کے تحت تعلیمی ادارے جاری ہیں ان کی عمارتیں ایم۔ ایچ۔ اسماعیل، امین ایم سید محمد اور مولانا کپنی والے ایم۔ ایچ۔ قادری نے بنوائی ہیں۔ اس انجمن کا فیض محض بھٹکل ہی تک محدود نہیں بلکہ کرناٹک کے دوسرے اضلاع کے مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جامعہ اردو علی گڑھ

آگرے میں 21 مئی 1938ء کو جب ہزم اقبال قائم ہوئی تو اس کے تحت اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا بھی ارادہ کیا گیا اور بھڑواری میں 1939ء کو جامعہ اردو کے نام سے ایک مستقل تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ جامعہ کے ذریعے نومبر 1939ء میں امتحانات شروع کئے گئے۔ جامعہ کا نظام ملک کی اہم یونیورسٹیوں کے آئین و اسلوب پر ترتیب دیا گیا اور پہلے رجسٹرار محمد طاہر فاروقی مقرر ہوئے۔ جامعہ ایک آزاد اور جزوی ادارہ ہے۔ ماتر پریش کی تمام یونیورسٹیوں نے اردو دستوں کے صدر، جامعہ علی گڑھ کے ریکٹ، انجمن ترقی اردو ہند، آل انڈیا مسلم ایکویشنل کانفرنس، ہندوستانی اکادمی (الہ آباد) دار مصنفین (اعظم گڑھ) وغیرہ کے نمائندے جامعہ اردو کی مجلس عاملہ کے ممبر ہوتے ہیں۔ جامعہ کو ذاب چغتاری، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مرثا انجی سروپ بھٹناگر، مرتبہ بہادر سید، شری گنرود اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی مقدر شخصیات کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ جامعہ اردو کے امتحانات ہر برس ماہ نومبر میں ہوتے ہیں۔ جامعہ کا کورس ادیب، ادیب ماسٹر اور ادیب کامل پر مشتمل ہے۔ جامعہ اردو کے امتحانات کا یہ فائدہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں (ادیب، ادیب ماسٹر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد) صرف انگریزی میں امتحان دے کر میٹرک، انٹر میڈیٹ اور گریجویٹ ہو سکتے ہیں اور بعد میں وہ ایم اے میں داخلہ لے سکتے ہیں اور بی۔ ایچ ڈی بھی کر سکتے ہیں۔ جامعہ کے امتحانات ملک کے ڈیڑھ سو سے زیادہ مرکزوں پر منعقد ہوتے ہیں اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ مستحق محروم کئے جاتے ہیں۔ مل اخراجات اسیدواروں کی فیسوں کی آمدنی سے پورے ہوتے ہیں۔

اسکول کالج یونیورسٹی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

غور 1857ء میں مسلمانوں کی بربادی سے متاثر ہو کر ان کی پیروی کی خاطر سرسید احمد خاں نے اسول ستحکم طور پر قائم کئے ایک تعلیم دہرا انگریزوں سے اتحاد — خان 24 مئی 1875ء کو، جو کوٹور یا کنڑا نکلتان کی برس گرہ کا دن تھا، علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر مولوی محمد کریم کی صدارت میں اور علی گڑھ کے سب نج مولوی مسیح اللہ خاں کے انتظام کے تحت ایک انگریزی اسکول کا افتتاح کیا گیا۔ ان دنوں سرسید بنارس میں سب نج تھے اور اسی مقصد سے بنارس سے علی گڑھ آئے تھے۔ پہلی جون 1875ء سے چھ ماہوں کے پرانے بنگلوں میں تعلیم شروع ہوئی۔ مابین میں یہ ادارہ مدرسہ علوم کہلایا، کالج

بھگت سارہ بھگت سارہ بھگت سارہ

جتنے پریمک نام ایم۔ اے۔ ادا کالج (مکڑی انکلو اور ٹیکل کالج) رکھا گیا، مگر علی گڑھ کالج کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ ۱۸۷۸ء میں جب یہ اسکول سیکنڈ گریڈ کالج بن گیا تو اس کا الحاق کلکتا یونیورسٹی سے ہو گیا اور ڈگری کالج بن گیا۔ ابتدا میں سب سے مضامین انگریزی میں پڑھائے گئے اور عربی، فارسی اور سنسکرت کو دوسری زبان کا درجہ دیا گیا۔ سکول میں تاریخ، جغرافیہ اور حساب وغیرہ اردو میں پڑھائے جاتے تھے اور انگریزی کو دوسرا درجہ دے دیا گیا۔ علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل مسٹر سنڈرس تھے مگر کالج کے استادوں میں مسٹر فٹنڈر بیک نے ایسی محنت اٹائی اور طلباء سے اپنے مشفقانہ برتاؤ کی وجہ سے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ جن دنوں (۱۸۹۱ء) نواب وقار الملک علی گڑھ کالج کی کمیٹی کے سیکریٹری تھے سر آغا خان نے کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوشش شروع کی اور چند فراہم کرنے کا آغاز کیا۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے۔ ادا کالج یونیورسٹی بن گیا۔ راجا محمد علی خاں آف محمد آباد پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور سلطان جہاں بیگم والیہ بھی بایال چانسلر بنیں۔ اس یونیورسٹی سے جو صاحب سب سے پہلے گریجوایش ہوئے وہ مٹری ایسٹو پرشاد تھے اور یونیورسٹی کی جانب سے پہلا سہاس نامہ مہاراجا آف ٹیلا کو پیش کیا گیا۔ ان دنوں یونیورسٹی میں اساتذہ کی تعداد تقریباً ۸ سو ہے اور یونیورسٹی کی عمارتیں ۸۵۵ ایکڑ اراضی رقبہ پر واقع ہیں۔ طالب علموں کی تعداد ۹ ہزار ہے جن میں ۵۰ فی صدی ہندو ہیں۔ یونیورسٹی کے سالانہ اخراجات کم دہائیس ۱۲ لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ لائبریری کے سالانہ اخراجات تقریباً ۹ لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ لائبریری تقریباً ۴ لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کی وہ واحد درس گاہ ہے جس نے مسلمانوں کے حلیہ و سلیہ اور قومی مزاج و سیاست کی تشکیل میں اہم ترین حصہ لیا ہے۔ ہندوستانی قومیت کی تحریک بھی اس سے شروع ہوئی اور دوسری نظر سے لے بھی اس میں جنم لیا۔ اس درس گاہ سے جو ہر قومیت پر ایک نئے آن علی ایسٹو پرشاد، راجا ہندو پرشاد، حسرت موہانی، سیف الدین کچلا، ظفر علی خان، سردار جعفری، عصمت جغتائی، مجاز ٹکنوی، مولانا محمد علی، خلیفہ انصاری، شعیب قریشی، عبدالرحمان بھٹو، حاجہ عبدالحق شیروانی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محمود، قاسم رضوی، حاجہ امجد عباس، انصار بھٹو، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر رشید عباس، رنیکو دلو، ڈاکٹر احمد، سبط حسن، سید محمد فاضل، ڈاکٹر عظیم، نواب زادہ یاقوت علی خان، شیخ عبداللہ، شمیم احمد شمیم، ڈاکٹر ذاکر حسین، خان عبدالغفار خان، مٹری پالی وال، سردار پانی کر، رفیع احمد قدوائی، یاسین زوری، علی ظہیر، مابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر مجیب، سجاد حیدر یل درم اور ڈاکٹر اقبال کے نام قابل ذکر ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ فرمان جاری کیا: ہماری تخت نشینی کی خوشی میں ایک جامعہ قائم کیا جائے گا جس کا نام جامعہ عثمانیہ ہوگا۔ اس کی تقسیم مغربی اور مشرقی علوم کے امتزاج کے ساتھ اردو زبان میں ہوگی؛ ۱۹۱۷ء میں مولانا حیدر نے نظام کے فرمان کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا چنانچہ ان کی ایما پر سرسید راس مسعود نے ۲۰ ستمبر ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی۔ اسی سلسلے میں ادبی نصاب کی کتابوں کی فراہمی کے لیے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا جہاں علوم و فنون کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ ۱۹۴۹ء میں علی تہ کی دوسری زبانوں کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئی حکومت نے یونیورسٹی میں اردو میں تعلیم کو ختم کر کے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جب خلافت کمیٹی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اختلاف پیدا ہوا تو اس نے علی گڑھ ہی میں مسلم یونیورسٹی کے مقابلے میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک آزاد، ملی و قومی تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے بانیوں میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا آزاد کھنن قابل ذکر ہیں۔ سنگ بنیاد شیخ ہند مولانا محمود حسن نے رکھا۔ شیخ ہند کی علامت کی بنیاد ان کی انتہائی تقریر مولانا شبیر احمد عثمانی نے پرمی شیخ ہند کے الفاظ میں کی تھی:

اے نو بہانہ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) کے غم خوار مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم بھی گروہ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں، دہلیہند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا؛

حکیم اجمل خاں پانڈے نے مقرر ہوئے اور مولانا محمد علی داس چاند اسلیر درس کی ابتدا دیروں اور خیموں میں ہوئی اور خاجہ عبدالحمید نے کئی استادوں اور طالب علموں کو اپنی کوشش میں رہنے کے لئے جگہ دی۔ ابتدائی چند برسوں میں جامعہ کے اخراجات (تقریباً ۱۵ ہزار روپے سالانہ) خلیفہ کی خدمت میں پیش کئے، مگر خلافت تحریک کا سیاسی جوش و خروش کم ہوا تو جامعہ کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ گاندھی جی نے حوصلہ بخشنا اور حکیم اجمل خاں اس ادارے کو جولائی ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے دہلی لے آئے۔ یہاں جیسے بیٹھ کی الالہ نے اور ڈاکٹر ذاکر حسین، برقیہ، محبوب، ڈاکٹر حامد حسین، مولانا مسلم جبراج پوری، شفیق ارحمان قدما کی، روت یا سید نور اللہ اور خاجہ عبدالحمید جیسے اساتذہ کی رضا کا ایک تعلیمی خدمت نے جامعہ کو حیات نو بخش دی۔ ان اساتذہ نے یہ عہد کیا تھا کہ ۱۵۵۰ روپے ماہ وار سے زیادہ تنخواہ طلب نہیں کریں گے۔ جب کہ عملن ہوا یہ کہ ۱۵۵۰ روپے ماہ وار سے زیادہ کبھی کسی کو نہیں ملے۔

اگرچہ جامعہ سیاسی تحریکوں کے حلقوں میں قائم ہوا اور ابتدائی رد و بہ بھی مخالفانہ مگر اس کا بنیادی مقصد ہمیشہ ہی رہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے کہ جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستانی قومیت کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ جامعہ کی بنیاد اس عقیدے پر رکھی گئی کہ مذہب کی کسی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق نہ کی اور ہندوستان کی آزادی و ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی۔ جامعہ ایک ادارے سے زیادہ ایک تعلیمی و تہذیبی تحریک رہی ہے۔ جامعہ نے نائٹ اسکول اور تعلیم بالخان کے کمزور بھی قائم کیے ہیں۔ وار دھا اسکیم کے مطابق بیسک ایجوکیشن کے لیے اردو زبان کے استادوں کے ٹریننگ اسکول بھی جامعہ نے قائم کئے۔ جامعہ کی جانب سے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن بھی قائم کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء سے جامعہ ملیہ کو یونیورسٹی کی حیثیت کا ادارہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جامعہ کے انصاب میں مذہبی تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلمان طالب علموں کے لیے ہمارے روزے کی ادائیگی لاری ہے طلبہ کو بدیشی کپڑا پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ ذریعہ تسلیم اردو ہے۔

مسلم گرائز کا لچ علی گڑھ

سرسید احمد خان کے تعلیم و تربیت دیئے ہوئے لوگوں میں خان بہادور شیخ محمد عبداللہ (بی۔ اے ایل ایس سی) نے ۱۹۵۴ء میں ایک ماہنامہ بنایا 'خاتون' جاری کیا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے ۱۹۵۷ء میں سورج پور سالانہ ادارے کے تائید فرمائی۔ ۱۹۵۷ء میں یو پی کے گورنر لائونگس کی ایما پر علی گڑھ میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا گیا۔ اسکول کے لیے مشکل تمام ایک استانی بل کی۔ مجبور ہو کر استانیوں کی کمی کو بیگم عبداللہ خاں کی دوسروں نے پورا کیا۔ وہ اپنا سارا وقت اسکول کی لڑکیوں کو پڑھانے میں صرف کرتی تھیں۔ چھوٹے ہی عرصے میں مدرسے نے کافی ترقی کر لی۔ اسکول کی اچھی رپورٹ سے خوش ہو کر گورنر نے ۱۹۶۷ء میں مدرسے پر نقد دیے اور ۲۰ ہزار روپے ماہ وار کی امداد دینا شروع کر دی۔ اسکول کی عمارت کے لیے جب زمین خریدی گئی تو شمال ہند کے ذمے دار مسلمانوں نے لڑکیوں کی تعلیم کی کھل کر مخالفت کی۔ مخالفت کے باوجود بیڈی گورنر نے علی گڑھ میں ۱۹۶۹ء میں اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کی بنیاد رکھی۔ جب بورڈنگ ہاؤس میں کتیا رہا تو اس میں رہنے کے لئے کوئی طالب علم نہ آئی۔ تب بیگم عبداللہ خاں اپنی اور اپنے عزیزوں کی لڑکیوں کو لے کر بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگیں۔ لڑکیوں کو بورڈنگ ہاؤس آباد ہونے لگا۔ ۱۹۶۸ء میں یہ مدرسہ اپنی اسکول ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں انٹرمیڈیٹ کلاس کھولے گئے اور اس کا الحاق مسلم یونیورسٹی سے ہو گیا۔ ۱۹۷۳ء میں یہ ڈگری کالج بنا اور ۱۹۷۳ء میں کالج میں بی بی کی کورس کی ابتدا ہوئی۔ یہ سب سے پہلے بیگم عبداللہ کی لڑکیوں نے اعلا مغربی تعلیم پائی۔ بڑی لڑکی رشید چار، ڈاکٹر نبین (اور شاہ ہندوستان کی پہلی ترقی پسند تلم کا رور کیونسل مسلم خاتون بھی دی تھیں)، دوسری لڑکی خاتون عبداللہ نے ایم اے کیا اور مزید تلم کے لیے انگلستان چلی گئیں، تیسری خاتون عبداللہ نے گریجوایش ہو کر شادی کے بعد ریٹائر ہو کر دیوی کے نام سے چند فلموں میں کام کیا اور چوتھی لڑکی پریس بھٹی

مسلم گریز کالج کی پرنسپل بنیں۔

مولانا آزاد کالج اورنگ آباد

جن دنوں ریاست ہمارا مشترک وزیر اعلیٰ دلی۔ بی۔ جی۔ مان تھے حکومت ہمارا مشترک وزیر اعلیٰ زکریا نے اورنگ آباد میں مولانا آزاد کالج کی داغ بیل ڈالی۔ جن 1963ء میں 200 طالب علموں سے کالج کی ابتدا ہوئی۔ اورنگ آباد کا علاقہ ضیاء جو اورنگ زیب کے استاد پیر اسماعیل کا قبو بھی ہے اور جو منٹوں کے عہد میں ایک سرخ بھی نہ چکا ہے اور مکتب بھی اور نظام کے دور میں یہ ردضہ جیل کی شکل میں بدلا آج کل یہ مولانا آزاد کالج ہے۔ اس شای عمارت کے 42 کمرے ہیں جن میں 8 کمرے کالج کے استعمال میں ہیں۔ اس کالج میں کمریلا، کرناٹک، اٹما مل، ناڈو اور اتر پردیش تک کے لڑکے تعلیم پا رہے ہیں۔ طالب علموں میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی اور بودھ بھی۔ کالج کے احاطے میں وہ عید بھی مناتے ہیں، گیش آکسو، بکس اور بودھ جیتی بھی۔ یہ تعلیمی ادارہ مولانا آزاد ایکوٹیشنل ٹرسٹ کے تحت جاری ہے اور اس کا انتظام آزاد تعلیمی سنگھ کے سپرد ہے۔ اس کالج سے ایک سرما ہی اور زر سالہ 'غبار خاں' بھی شائع ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کالج ڈاکٹر رفیق زکریا کی سماجی زندگی کا ایک عظیم اور قابلِ تحریف کارنامہ ہے۔

سیفیہ کالج بھوپال

1935ء میں مرحوم ملا سجاد حسین نے مدھیہ پردیش کے مقام سونج میں جدیدہ پرائمری اسکول قائم کیا۔ ملا صاحب کی نگراںی میں یہ اسکول ترقی کرتے کرتے مدھیہ پردیش کا سب سے بڑا کالج بن گیا اور اب یہ سیفیہ کالج کہلاتا ہے۔ ابتدا میں یہ صرف آرٹس کالج تھا 1960ء سے اس میں سائنس کا شعبہ بھی قائم ہو گیا۔ پھر اس کالج میں کانس کی بھی ابتدا ہوئی اور قانون کی کلاسیں بھی کھول دی گئیں اور بی۔ ایڈ اور یو۔ سیٹ گریجویٹ کلاس بھی جاری کر دیے گئے، چنانچہ سیفیہ کالج ایک مکمل کالج ہے۔ سیفیہ کالج سے ایک لڑکیوں کا اور ایک لڑکوں کا سکینڈری اسکول اور ایک ہومیو پیتھک کالج بھی منسلک ہے۔ کھیل کود کے میدان میں بھی سیفیہ کالج کے طلباء خاصی شہرت رکھتے ہیں کالج کے منتظم ملا فخر الدین (بانی ادارہ کے صاحب زمانے) ہیں جو اپنی حبیب سے ہزاروں روپے سالانہ سستی طلباء کو امداد اور دیکھوں کی صورت میں دیتے ہیں۔

محمد حاجی صابو صدیقی پالی ٹیک نی کل انسٹی ٹیوٹ ممبئی

ممبئی کی انجمن اسلام کا یہ تعلیمی ادارہ ہر اعتباراً بہت کا حال ہے۔ یہ تعلیمی و صنعتی درس گاہ ممبئی کے ایک مشہور و نخبہ جرم مرحوم محمد حاجی صابو صدیقی کے دفن کردہ موائے انجمن اسلام کے زیر انتظام جاری ہے۔ اس صنعتی اسکول کی بنیاد 1936ء میں ممبئی کے گورنار ڈیبر میوں کے ہاتھ رکھوائی گئی تھی۔ اس ادارے کا مقصد معمولی پڑھ لکھے لڑکوں کو ابتدائی صنعتی تربیت دینا ہے۔ 1944ء سے چند نئے ٹریڈ و سرٹیکٹ کورس کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ 1945ء میں حاجی صابو صدیق کی بیوہ جمبا بائی کے ایک لاکھ روپے کے عطیے سے ٹیک نی کل ہائی اسکول کا ایک شعبہ قائم کیا گیا جو اپنی نوعیت کا واحد شعبہ ہے۔ 1958ء سے اس انسٹی ٹیوٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی سول انجیئرنگ اور ایک ٹریڈ و میکانیکل شعبہ۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری ٹیک نی کل اور دیگر موضوعات سے متعلق 10 ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے احاطے میں ٹیک نی کل ایلیج بھی ہے جو ہر سیاسی جلسوں اور مشاعروں کے سلسلے میں کام آتی ہے۔ اس طرح الماطیفی ہالی بھی بڑا کام آ رہا ہے۔ یہ ہال مرحوم ڈاکٹر الماطیفی کے ایک لاکھ روپے کے عطیے سے تعمیر ہوا تھا۔ سابق پرنسپل سید شہاب الدین دسوی کے عہد میں اس انسٹی ٹیوٹ نے خاصی ترقی کی اور آج کے پرنسپل جناب قادر حسین بھی جدید رجحان کے حامل ہیں اور ملک و قوم کی ترقی سے دل چسپی رکھتے ہیں۔

دینی درس گاہیں

دارِ علوم دیوبند

ساجی حافظہ سید عابد حسین اور مولانا ہتھاب علی نے ایک مکتب قائم کرنے کی تحریک کی۔ حاجی عابد حسین نے ردال بھیلایا اور دھنی سب سے پہلے
چندہ دیا۔ ۱۸۶۶ء میں، دیوبند کی ایک مسجد چھتہ کے کزن پرانہ رے دخت کے سامنے میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔ پہلے استاد ملامحمد تھے اور پہلے شاگرد بھی محمود
ہی تھے (جنہوں نے بعد میں شیخ مجدد مہربانی) بعد میں یہ مدرسہ قاضی محمد سیّد اکی اور دیگر فریادے کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا۔ اس محکمہ مکتب کو دار
علوم بنانے والے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ ۵ مئی ۱۸۶۷ء کو رئیس دیوبند شیخ بہال احمد کی دی ہوئی زمین پر میراں جی منے شاہ صاحب نے
دارِ علوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نانوتوی نے عاب دیکھی تھی: 'میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں
اٹکلیدوں سے نہیں جاری ہیں اور اطراف عامین بھیں رہی ہیں! دراصل اس ادارے کے قائم کرنے کا مقصد مغربی تہذیب و تمدن اور نظریات کو رد کرنا تھا۔
اسی لئے باقی دارِ علوم مولانا نانوتوی کی ہدایت تھی؟ تا مقدر و کارکنان مدرسہ کی ہمدردی و تکریر چندہ پر نظر رہے۔ سرکار اور امار کی شرکت بھی مفید معلوم
ہوتی ہے! دارِ علوم کے نصاب میں ۲۲ علوم و فنون داخل ہیں یعنی قرآن، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم عقائد و کلام، علم لالہ ان
(تقریباً)، علم اُل فرائض دال مواہب، صرف، نحو، معانی و بیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ، عروض و قوائی و مناظرہ، ہیئت، جہدہ، حساب، طب
تجوید و قرات۔ کچھ جید مدرسے درجابہ عربی میں خبر افیا، تاریخ، مبادی سائنس اور معلومات عامہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حال ہی میں انگریزی اور ہندی
پڑھانے اور دست کاری کے کلاس بھی شروع کئے گئے ہیں۔ درجہ عربیہ کا کورس گیارہ برس کا ہے۔ تعلیم منت دی جاتی ہے یعنی قیام و طعام، نصاب کی کتابیں
اور دوسری بیوی بیوی ضرورتیں بھی دارِ علوم کی جانب سے پوری کی جاتی ہیں، لباس، شہن، صابن اور بسرو وغیرہ بھی۔۔۔ طالب علموں کی تعداد (بشمول بیرون
ہند) ہر سال کم و بیش ڈیڑھ ہزار رہتی ہے۔ کچھ ایک سو برس میں تقریباً ۷۵ ہزار طلبہ نے تعلیم پائی ہے ان میں سے ۵۰۰ نے معلمین، ۲۷۵ نے مصنفین
۱۶۵ نے مفتی، ۱۱۵ نے مناظر، ۱۱۵ نے سنان، ۲۹۵ نے خطیب و مبلغ اور ۱۶۵ نے اطباء کی حیثیت سے اعلا درجے کا مقام پایا۔ ان دنوں دارِ علوم کا اثاثہ
۱۷۵ افراد پر مشتمل ہے۔ ادارے کا نقد سرمایہ ایک مل جی نہیں کیا جاتا۔ دارِ علوم کا اپنا سیلف ڈپازٹ اور خزانہ ہے۔ ہر برس تقریباً ۱۵ ہزار فتوا چاہنے
والوں کو جواب دیا جاتا ہے۔ دارِ علوم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ابتداء سے چند ایسے قوم پرستوں کا گہوارہ رہا ہے جنہوں نے آزادی ہند کی جدوجہد میں ناقابل
بیان مصائب برداشت کئے ہیں اور جان و مال کی قربانی دکر ہے۔ دارِ علوم کی کتب رستہ میں عربی زبان سے تامل تک تقریباً ۵۰ ہزار کتابیں موجود ہیں۔
خصوصی قلمی نسخوں میں قرآن شریف کے چند ادوار میں قیمت لیسے بھی موجود ہیں۔ استخفا کی خاطر کتب رستہ میں کوئی نمک و نمک شعبدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دارِ علم
کا سالانہ محکمہ دیش ۱۹ لاکھ روپے ہوتا ہے۔ ۱۹۹۱ء سے ایک ماہ نامہ بنام دارِ علوم، جاری ہے جو اس ادارے کا آئینہ ہے۔

مظاہر علوم سہارن پور

فقہ کے استاد مولانا مسعود علی نے ۱۸۶۶ء میں سہارن پور میں مظاہر علوم کی بنیاد رکھی۔ مولانا کے شاگرد ہی اس مدرسے کے پہلے طالب علم
بنے۔ مولانا سادات علی پہلے مدرسہ مقرر ہوئے۔ ابتدا میں یہ مکتب مدرسہ سہارن پور لکھ نام سے مشہور تھا۔ مدرسہ تدریس کی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد اس کا نام
مظاہر علوم رکھا گیا۔ مظاہر علوم کی کئی اقامت گاہیں ہیں اور ہر ایک میں مسجد ہے۔ مظاہر علوم کا اپنا ایک کتب خانہ بھی ہے جو ۵۰ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ مدرسے
میں طالب علموں کی تعداد کم و بیش ۸ سو ہے۔ ان میں زیادہ طلبہ کے گل اخراجات (قیام، طعام، لباس، بستر کچھڑنا، علاج، کتابیں وغیرہ) کی کفالت مدرسہ ہی کرتا
ہے۔ مدرسے کا بجٹ اپنی غیر ہ کی امداد اعانت سے پورا ہوتا ہے۔ اس ادارے کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا احمدی محدث سہارن پوری، مولانا
رشید احمد گنگوہی، شیخ ہند مولانا محمود حسن اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسی مقدہ ہستیاں اس ادارے کی سرپرستی فرما چکی ہیں اور مولانا اشرف علی نے اس مدرسے

میں تعلیم بھی پائی تھی۔ اصول و عقائد کے لحاظ سے یہ ادارہ دارِ علوم دیوبند کا ہم مسلک ہے۔

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

تقریباً ایک صدی پہلے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مراد آباد میں اس دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ کہتے ہیں کہ جب چندے کی ایل کی گئی تو جس نے سب سے پہلے چھ مہادہ ایک ہشتی تھا اور اس نے چندے کے طور پر صرف ایک پیادیا۔ مدرسے کے پاس اپنا کوئی فنڈ نہیں ہے۔ ساڑھے ستر ہزار روپے سال میں خرچ ہوتے ہیں۔ چندوں پر مدرسے کی آمدنی منحصر ہے۔ یہ مدرسہ اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اکثر مدرسین اور طلباء تحریکِ خلافت اور جنگِ آزادی میں حصہ لے چکے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ عربیہ مروہ

تقریباً سو برس پہلے باقی دارِ علوم دیوبند مولانا نانوتوی کے ایماء پر مروہ کے چند مسلمانوں نے مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ مولانا نانوتوی کے شاگرد مولانا میر احمد حسن نے اس مدرسے کے نظام کو باقاعدہ اور باضابطہ بنایا اور علمِ حدیث و تفسیر و علمِ فقہ و تصوف اور معقولات و مقولات میں سے ہر فن کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا احمد حسن مدرسے کے ناظم بھی تھے اور مدرسہ اعلیٰ بھی۔ مولانا حافظ عبدالرحمان بہروردی کے زمانے میں اس مدرسے نے اور زیادہ ترقی کی۔ اس مدرسے میں شیوخِ درس و تدیس کے ساتھ شجرہٴ تبلیغ بھی ہے اس شعبے میں مستقل مبلغین کے ساتھ ساتھ طلباء و مدرسین تبلیغ کے لیے باہر جاتے ہیں۔ مدرسے میں شیعہ اثنائ بھی قائم ہے عربی، فارسی، اردو، ریاضی، حفظ و ناظرہ قرآن شریف کی تعلیم پانے والے طلباء کی تعداد تقریباً پانچ سو ہوتی ہے۔ علومِ عربیہ کے طلب کے لیے مدرسے کا ایک دارِ اقامہ بھی ہے۔ جامع مسجد کا جملہ انتظام بھی اس مدرسے ہی کے تحت ہے۔ مدرسے کا اپنا کتب خانہ ہے جو پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ مدرسہ کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ، تفسیر و تاریخ، سیرت، تصوف، سلوک، ادبِ لغت، طب و معالجہ، مناظرہ اور علمِ کلام کی اچھی کتابیں موجود ہیں۔ محمد علی کے بیات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں سے تعلیم پانے کے بعد بہت سے اصحاب نے عالم، مبلغ، مفتی، مدرّس اور طبیب کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا ہے اور اس مدرسے میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی جیسی نام درہستوں نے درج دیا ہے۔

دارِ علوم ندوۃ علماء لکھنؤ

دیوبندی مولویوں کے کٹر ترین اور علمی گروہ کی انتہائی دنیا داری سے بے رحم اور درسِ نظام کو نظر انداز کرتے ہوئے شبلی، حبیب الرحمن خیر دانی، شاہ سیماں پوری، اظہر علی کا کوروی، احتشام علی کا کوروی، ابراہیم آروی، قاضی سلیمان منصور پوری، شہناز، اللہ امرتسری، سروریم بخش، مسیح ازمان خاں، خلیل الرحمن سہارن پوری، نواب سید علی حسن خاں، حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی اور مولانا آزاد جیسے مختلف خیال علماء نے قدیم و جدید کا جامع علمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۹۲ء میں جب کہ کانپور میں مدرسہ فیض عام کا جملہ تھا ڈپٹی کلکٹر مولوی سبیل غفور نے سنجیدگی سے یہ تحریک شروع کی اور آخر ۱۸۹۴ء میں مولوی سید محمد علی کانپوری نے لکھنؤ میں ندوۃ کے بنیاد رکھی۔ مولوی عبدالحق محدث دہلوی اور مولانا شبلی نے اغراض و مقاصد ترتیب دیئے :-

۱۔ علماء کے باہمی نزاع کا دفع و اخلاقی مسائل کے رد و قدح کا پورا پورا انسداد۔ دینی امور میں فتوے دینے کے لئے محکمہ افتاء کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم و مفتی ہوں گے عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اُس کی تباہی و مگر سیاسی و ملکی معاملات اس سے علاوہ ہیں ایک عظیم شان دار علوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے سوا عملِ صنائع کی تعلیم ہو۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح اور علومِ دین کی ترقی اور تہذیبِ اخلاق اور شائستگی و اطوار۔

ان معاصروں کو سرسید احمد خاں، نواب محسن الملک اور دقارال ملک نے بھی پسند کیا۔ شبلی کی تجویز پر ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم قائم کیا گیا جس کا نصاب تعلیم و جدید علوم کے میل کی بنیاد پر رکھا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں سٹوہ چان پور کے چند دوسانے ندوے کے نام ایک معقول جائے دار و قلعہ کر دی جس کی آمدنی سے ایک بڑے کتب خانے کی بنیاد پڑی۔ ایک دروایا بھی آیا کسی غلط فہمی کی بنا پر یو پی کے گورنر سیک ڈوئل ندوے کے مخالف ہو گئے، حیدر آباد سے آکر مولانا شبلی نے ندوے کا انتظام سنبھالا اور ادارے اور حکومت کے بیچ جو بدگمانی پیدا ہوئی تھی اس کو دور کیا۔ مسلم ریاستوں (رام پور، بھوپال، مھاراجپور وغیرہ) کا دوسرے کے ندوے کے لیے خاص سرمایہ فراہم کیا۔ حکومت یو پی سے کوئی کے کن سے ایک قلعہ آراضی لے کر گورنر جان ہیوٹ کے ماتحت ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا۔ ندوہ علماء، علماء کے باہمی نزاع کے دفع کے لیے قائم کیا گیا تھا مگر ۱۹۱۳ء میں شبلی اس ادارے سے اسکا بنا پر الگ ہو گئے کہ علماء کا باہمی نزاع اس کے لیے ناقابل برداشت بن چکا تھا۔

ندوے کے سربراہوں کا کہنا ہے کہ ندوہ تعلیم و جدید علوم سے استفادے کا قائل ہے۔ چنانچہ ندوہ میں قرآن اور اس کی تفسیر، حدیث شریف، اور فقہ اسلامی نیز عربی و فارسی اور اردو زبان و ادب کے ساتھ حساب، ہندوہ طب، سیاحت و اقتصادیات، سوشل سائنس، انگریزی و ہندی زبان کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ ندوے کے علمی معیار کو مہتمم، مامون، دانشور، باغی ہوئی و سٹیوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ندوے میں طالب علموں کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ ہے جس میں اکثر طلباء کے قیام و طعام اور تعلیمی اخراجات ندوہ بہداشت کرتا ہے۔ مدرسین اور اساتذہ کی مجموعی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ ندوہ کا ایک لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ ہوتا ہے یہ ایک آزاد تعلیمی ادارہ ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتا

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کلکتہ کے چند ممتاز مسلمانوں کی درخواست پر گورنر جنرل دارلن میں شمولیت فیصلہ کیا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں ایک اسلامی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ مولانا حمید الدین اور مولانا محمد کرم سے فائز گران مقرر کیا گیا مابین مدرسے کا بیٹ ۵۲۵ روپے امانت تھا جو گورنر جنرل خود برداشت کرتے تھے مدرسہ جب ترقی کر گیا تو خرچ میں بڑھ گیا چنانچہ سرکار کا جانب سے پچاس ہزار روپے کچھ جائے داد دے کر مدرسہ پر وزارت دے دیئے تحت دے دیا گیا اور پھر پورٹ اس جائے داد کی آمدنی سے مدرسے کا خرچ برداشت کرنے لگا۔ سرکار نے شہر کلکتہ ہی میں مدرسے کی عمارت کے لیے زمین دی اور ۵۵ ہزار روپے سے عمارت بھی تعمیر کروادی اور مزید ۲۵ سو روپے ملنا د اخراجات کے لیے سرکار سے مدرسے کو ملنے لگے۔ ابتدا میں مدرسے سے عربی و فارسی ہی کی تعلیم ہوتی تھی اس لیے فوج نے وہ اطلاع سر جو عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے نوکری دی مدرسے سے لے کر پہل بناتے جاتے تھے ان لوگوں کا کام بھی فارسی میں ہوتا تھا اس لیے اس مدرسے کے پڑھنے والے نوجوانوں کو منصفی و قاضی مہارت یعنی ڈی جیسٹریٹ کا عہدہ بھی آسانی سے مل جاتا تھا۔ کلکتہ کی آبادی میں عربی و فارسی کی طرف بڑھنے لگی قدر سے کی موجودہ عمارت تعمیر کی گئی جس پر ۱۲ لاکھ روپے خرچ ہوئے اور ۱۸۸۲ء میں مدرسہ نئی عمارت میں منتقل ہو گیا ۱۸۵۷ء میں مدرسے میں انگریز مشین شجر قائم کیا گیا جس کے نتیجے میں عربی، فارسی اور دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم بھی شروع کی گئی اور ہائی اسکول کا مکمل کورس مدرسے کے نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں نصاب میں پھر تبدیلی کی گئی اور گورنر کمپنیل کی کمیٹی نے مدرسے کے نصاب میں کافی اصلاح کی۔ جمہور کو آدھے دن کی اور آدھ کو مکمل دن کی جیتی ہونے لگی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ بنگال زبان بھی پڑھائی جانے لگی۔ ۱۹۲۷ء میں پہلی بار ایک مسلمان (مولانا کمال الدین) کو مدرسے کا پرنسپل بنایا گیا۔ اس مدرسے کا تعلق محض کلکتہ شہر سے نہیں بلکہ صوبہ بنگال کے دوسرے شہروں کے کئی تعلیمی ادارے اس سے ملحق رہے ہیں مگر ۱۹۴۷ء میں صوبہ بنگال کی تقسیم کی بنا پر اس مدرسے کا عربی شعبہ ڈھاکہ کا منتقل ہو گیا اور اس کے دوسرے ملحقہ مدرسے بھی اپنی جائے وقوعہ کے اعتبار سے تقسیم ہو گئے، لیکن جمعیت علماء کی کوشش سے ۱۹۴۹ء سے اس مدرسے میں عربی کی تعلیم پھر شروع کر دی گئی۔ مدرسہ عالیہ کے نصاب میں قرآن، تفسیر، حدیث، لغت، علم الکلام، تاریخ اسلام، عربی زبان و ادب، فارسی زبان و ادب، اردو زبان و ادب، منطق و فلسفہ اور انگریزی، بنگال، ہندی، حساب، جغرافیہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ یہ مدرسہ ملک کا قدیم تعلیمی ادارہ ہے جو انگریزوں نے سب سے پہلے قائم کیا۔

مدرسہ عالیہ عربیہ مسجد فستح پوری دہلی

۱۸۵۷ء میں مغلیہ دور حکومت ختم ہونے پر دہلی کی فتح پوری مسجد مسلمانوں کی ایک گلی کے سرکردہ تھی جس نے مسجد کی ہر سہ اور توسیع کا کام شروع کیا۔ مسجد کے چاروں اطراف میں دکانیں بھی تعمیر کرائی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد کے جلا خراجات سے آمدنی بڑھ گئی۔ چنانچہ سید جسکے مہتمم علی مدظلہ العالی نے ۱۹۹۷ء سے قبل اس مدرسے میں درس نظامیہ کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے اور نیشنل امتحانات کی بھی تیاری کرائی جاتی تھی اور عربی تعلیم کی خاطر صوبہ سرحد، آزاد قبائل اور افغانستان سے بھی طلباء علم آتے تھے۔ مگر تقسیم ملک کے بعد نوعیت بدل گئی اور مدرسے میں صرف درس نظامی ہی کی تعلیم باقی رہ گئی۔ البتہ پرائمری دینی کلاس شروع کر دی گئیں۔ طلباء کی تعداد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو رہتی ہے۔ استاد دیندراہن ویسے اس مدرسے سے کبھی مولانا ستیہ راجیشانی اور مولانا عبدالحق حقانی دہلی جیسے فاضل و عالم لوگ وابستہ رہے ہیں۔ فتح پوری مسجد کا یہ مدرسہ چند خطہ تہذیبی بل و ادوات کی آمدنی سے چل رہا ہے۔ اس سے کاتھاب دہی ہے جو دارالعلوم دیوبند کلہے۔ (سجاد حسین صدر مدرس)

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدائشا

جامی سید ذوالہدایہ ۱۹۱۱ء تک سیشن جگ رہے، ریٹائر ہوئے پر انھوں نے اپنے والد کے نام پر ۱۹۱۲ء میں یہ دینی مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس مدرسے میں انھوں نے صوبائی حکومت کے انتظام میں دے دیا اور ۲۵ ہزار روپے سالانہ کی جائے داد اس مدرسے کے نام وقف کر دی۔ آج ریاست بہار کا محکمہ تعلیم اس مدرسے کو چلا رہا ہے۔ طلباء کے قیام و طعام کا انتظام وقف کی آمدنی سے ہوتا ہے۔ تعلیم مفت ہے۔ مدرسے میں قدیم و جدید دونوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے۔

جامعہ اسلامیہ ڈھابیل

شعبان ۱۳۲۶ھ میں چند لوگوں نے ڈھابیل (ضلع سورت، گجرات) میں تعلیم ادین کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ یہ مدرسہ ایک دینی مکتب کی صورت میں ۱۳۵۰ھ تک چلتا رہا۔ اس مکتب کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑی دلچسپی لی۔ وہ ان دنوں بہار جا بڑوہ کی جانب سے تعلقہ نوساری کے منتظم تھے۔ انہی کی کوشش سے ۱۳۵۰ھ کے بعد یہ مکتب ایک بڑا دارالعلوم بن گیا اور دارالعلوم دیوبند کے مولانا شاہ محمد انور لکھنوی اور مولانا شبیر احمد شاہی جیسے مشائی استادوں نے اس مدرسہ کو فائز و متعدد درس گاہیں، دارالافتاء، مکتب خانہ اور مسجد کے بن جانے کے بعد اس مدرسے کا نام جامعہ اسلامیہ رکھ لیا گیا۔ ڈھابیل کے اس جامعہ کا مکتب خانہ ہندوستان کے چند بڑے اسلامی مکتب خانوں میں سے ایک ہے۔

جامعہ سیفیہ سورت

سورت (گجرات) کا یہ تعلیمی ادارہ بوہڑ برادری کے پیشوا مولانا سیدنا طاہر سیفی، اُدین مرحوم کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہاں قرآن تفسیر، تادیل، فقہ، تاریخ، تاریخ اسلامی، تاریخ فاطمی اور تاریخ ہند، ادب عربی اور ادب فاطمی کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ریاضی، علوم عامہ، کامرس، انٹرنیشنل، سیاسیات اور دستور ہند کا بھی درس دیا جاتا ہے۔ اس ادارے میں اس بات پر بڑی توجہ دی جاتی ہے کہ اسلامی تعلیم پایا ہوا نوجوان اپنے سماج پر بوجھ بنے بلکہ اس میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اسی لیے اس ادارے میں مذہبی تعلیمات کے ساتھ ساتھ صنعت، سائنس، کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ تاریخ تحصیل طلباء کو مدرسہ کی جانب سے حج زیارت کے لیے بھی بھیجا جاتا ہے۔

۱۔ علم ملک کسب و طلب نہیں ملتا، ابن شہب کا قول ہے کہ طبیعت تربیت سے بنتی ہے اور علم تلاش سے ملتا ہے۔

جامعہ رحمانی مونگیر

مولانا غلام غفری نے 192۶ء میں مونگیر دیہاں میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ مقصد یہ تھا کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں بدلے ہوئے حالات اور تقاضوں کی رعایت سے تعلیم کی بنیاد رکھی جائے۔ 1934ء کے زلزلے کے بعد یہ مدرسہ بند ہو گیا۔ مونگیری خان قاہرہ رحمانی کے سجادے امیر شریعت سید منت اللہ صاحب رحمانی نے 1942ء میں اس مدرسے کی از بنیاد رکھی۔ مدرسے میں تعلیم کی ابتدائی کی عاملیت و فضیلت کے درمیان سے ہوئی 1954ء میں مولانا منت اللہ کی دعوت پر مدرسے کے لیے دینی علوم کے پچھترہ مہرین نے ایک نیا نصاب ترتیب دیا۔ یعنی قدیم نصاب میں جدید کتب داخل کر کے مدرسے میں نصاب جدید رائج کر دیا گیا۔ یہ نصاب اسلامی نصاب قرآن و حدیث، فقہ، تفسیر، نحو و صرف، بلاغت و بیان، منطق و فلسفہ، تائیس، جغرافیہ، تاریخ، حساب، ہندی اور انگریزی پر مشتمل ہے۔ 9 فروری 1966ء سے دوسرے مدرسے سے منطق و فضیلت کا درجہ بھی کھول دیا گیا۔ جاموں کی جانب سے دو سندیں ہیں ایک عاملیت کی دوسری فضیلت کی، ایک آٹھ سالہ عربی نصاب کی تکمیل کے بعد دی جاتی ہے اور دوسری نو سالہ نصاب کے مکمل ہوجانے پر۔ جامعہ کے طلباء مرحوم سید محمد علی مونگیری کے ذاتی کتب خانہ رحمانیہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ کتب خانہ عربی، فارسی اور اردو کی تیرا ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ جاموں کی تعلیم گاہ اور دارالقامہ کی سہ سترہ عمارت حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے جس پر تھلہ روپے سے زائد خرچ آیا ہے۔ خان قاہ رحمانی کی مسجد جو بھی 1951ء میں تعمیر ہوئی تھی جاموں رحمانی کے طلباء کی برصغیر کی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس پر بڑھائی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے حاجی عبادت حسین پورینا والوں نے 50 ہزار روپے دیئے تھے۔

مفتاح ال علوم بھیمڑی تھانا

1371ھ میں بھیمڑی (جس کا اسلامی نام اسلام آباد ہے) میں قاضی آظہر مہاک پوری نے مفتاح ال علوم کے نام سے ایک مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ حاجی ولی اللہ صاحب نے مدرسے کے لیے اپنا مکان وقف کر دیا اور مدرسے کے قیام و طعام کی ساری دے داری اپنے سر لے لی۔ عثمان غنی رحیم اللہ اور محمود بن عبد اللہ غنور نے عین پچیس روپے کی رقم تنہا کے لیے دینا منظور کی، اس طرز 20 طالب علموں اور ایک استاد اس مدرسے کی ابتدا ہوئی۔ بعد میں مدرسے سے ترقی کی اور مدرسہ مفتاح سے ہندوستانی مسلم میں مشتمل ہو گیا آخر 10 اکتوبر 1954ء کو مدرسے کے لیے ایک مستقل عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ ان دنوں اس مدرسے میں طالب علموں کی تعداد تقریباً پورے تین سو ہے۔ یہیں پیاس کے قریب بڑے، چھ مہرین کے قیام و طعام کا انتظام مدرسے کی جانب سے ہوتا ہے۔ اساتذہ کی تعداد آٹھ ہے نحو و صرف، لغت، ادب، معانی و بیان، فقہ، اصول فقہ، منطق۔ آذکار، اقل زادہ رستاں، گلستان، بوستان، چل سبقت، حفظ و ناظرہ و تجوید اور اردو، ہندی اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسے کا اپنا کتب خانہ ہے جس میں فقہ، حدیث، سوانح، تاریخ، ادب اور قرآن کے مختلف نسخے موجود ہیں اور سعودی عرب کی حکومت بھی انگریزی کی جانب سے کتابیں دیتی رہتی ہے۔ جمعیت ال طلباء کے نام سے طلباء کی اپنی ایک انجمن بھی ہے۔ (ضیائی)

دارالعلوم دیوان شاہ بھیمڑی تھانا

'دارالعلوم دیوان شاہ' بھیمڑی (عرف اسلام آباد) کے ایک بزرگ سیدنا شاہ حسین قادری عرف دیوان شاہ کے نام سے منسوب ہے اس دینی مدرسے کی بنیاد 13 مارچ 1969ء کو مولانا سید مظہر حسین کچھوی نے بھیمڑی میں رکھی۔ 1969ء سے مدرسے کی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ دارالعلوم کا تعلیمی پروگرام یہ ہے کہ کوئی درسوں کے عربی و فارسی ڈپلومہ کورس کی تعلیم دینا، انگریزی کی تعلیم کے شعبے کو کونسا صنعت و حرفت اور حفظان صحت اور اسپورٹس وغیرہ کی تعلیم دینا اور مستحق طلباء کے قیام و طعام، لباس وغیرہ کا انتظام کرنا۔ دارالعلوم کا اپنا ایک اور رسالہ 'دارالعلوم میگزین' بھی ہے جو برس میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ (ضیائی)

مدرسہ جلالہ دینی اور اسلامی تعلیم اداروں کے ساتھ ساتھ قدیم پنج کے دیندار سے ملک میں بے شمار ہیں جن میں (دہلی) مدرسہ امیر کشمیری گیٹ، مدرسہ

گلشن ہندوستانی مدارس۔

کاشف العلوم لبتی نظام ادینی (اتر پردیش) جامعہ احیاء العلوم مبارک پور مفتوح العلوم مو۔ مدرسہ جزیرہ ہدایت العلوم لبتی۔ جامعہ سودیہ عربیہ نور العلوم پیرایچ، جامعہ مظہر العلوم بنارس۔ جیسے رشتہ غازی پور مدرسہ ال اصلاح سرب میر منظر اسلام بریلی، مظہر ال اسلام بریلی۔ مدرسہ منویہ بنارس۔ جامعہ جلالیہ بنارس، مکتبہ ایمانہ بنارس۔ جامعہ نظریہ تفسیر سلطان ال مدارس تفسیر۔ مدرسہ عالیہ رام پور۔ (میرا) مدرسہ اصلاح ال مسلمین پٹنا۔ مدرسہ اشرفیہ بنامہ پور۔ مدرسہ عزیز بہار شریف۔ مدرسہ احمدیہ یا بیکر پور۔ مدرسہ اہادیہ لہریا سرب۔ مدرسہ سعید لہریا سرب۔ (آندھرا پردیش) مدرسہ انارال علوم رایتسوقی۔ مدرسہ اسلامیکرکون۔ مدرسہ انوار ال علوم حیدر آباد۔ مدرسہ مدینہ ال علوم کرکون۔ جامعہ نظامیہ حیدر آباد (بنگال، آسام، اڑیسہ) مدرسہ دارحدیث بدپور۔ ال مدرسہ ال سلطانہ کلک۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ۔ (گجرات و مہاراشٹر) مدرسہ دارعلوم اشرفیہ ٹاندر۔ جامعہ حسینہ راندیر۔ مدرسہ تعلیم اسلام بیکر۔ (خوبی ہند) مدرسہ بیت ال علوم لولی کال۔ کلیر عریہ کوڈی کور۔ مدرسہ باب ال اسلام کالی کٹ۔ مدرسہ بیت ال مجاہدین کالی کٹ۔ مدرسہ معدن ال علوم کتا پور۔ مدرسہ اشاعت ال علوم بیاجام پیٹ۔ جامعہ لطیفہ دیور۔ مدرسہ باقیات ال صالحات دیور۔ جامعہ دار ال اسلام عمر آباد۔ روضۃ ال علوم مالابار۔ مدرسہ معدن ال علوم دائم باڑی شمالی ارکاس۔ مدرسہ اشاعت ال حسنات پیام پیٹ۔ مدرسہ منبع ال علوم لال پیٹ۔ مدرسہ حقانیہ ٹنگور۔ جامعہ محمدیہ رلے ڈرگ۔ مدرسہ محمدیہ مدراس۔ اور مدرسہ معینیہ بحیرہ اور دارعلوم خالویہ ٹونگ کے نام اہم ہیں۔

تَصْنِیفِ تَتَالِیفِ وَ اشَاعَتِ ادارے

دارِ مصنفین اعظم گڑھ

۱9۱4ء میں مولانا شبلی نے اپنے چند ہم قلموں کے تعاون سے اعظم گڑھ میں تصنیف و تالیف کا یہ ادارہ قائم کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی ذاتی جائے داد یعنی اپنا مکان اور بارخ اور کتب خانہ بھی وقف کر دیا۔ مولانا سلمان ندوی اس ادارے کے سرپرست رہے۔ دارِ مصنفین میں ایک ریکی سرب کا بھی شہینا ہے۔۔۔ 'سیرت نبی'، 'ال فاروق'، 'ال مامون'، 'حلی' اہم اسلامی کتبوں نے علوم اسلامی میں اہم اضافے کئے ہیں۔ ۱960ء میں اس ادارے کی گولڈن جوبلی کی شان سے منائی گئی تھی۔ اس موقع پر مرحوم صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں حکومت ہند نے ۲50 روپے عطیہ دیا تھا۔ ۱9۱5ء میں یہ ادارہ دو شہینوں میں بٹ گیا۔ ایک کا نام شبلی اکاڈمی رکھا گیا اور ایک دارِ مصنفین ہی رہا۔ ماہ نامہ 'معارف' اسی ادارے سے شائع ہوتا ہے۔

مصنفین دہلی ندوۃ

یہ ادارہ، تصنیف و تالیف اور اشاعت جس کا مقصد ہے ۱938ء میں قائم ہوا۔ اب تک کم و بیش سو کتب ہیں اس ادارے نے شائع کیں ہیں میں 'فاروق اعظم' کے سرکاری خطوط، 'حضرت ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط'، 'حضرت عثمان غنی کے سرکاری خطوط' اور تفسیر منظر ہی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ترتیب و تدوین تصنیف و تالیف میں ادارہ اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ صدیقہ انصاف کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اس ادارے کو مولانا حفظ الرحمن سیواری اور مولانا سید احمد اکبر آبادی جیسے عالموں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ آج کل مولانا عتیق الرحمن عثمانی دیوبندی اس ادارے کے سربراہ ہیں! برلمان، ادارے کا آرگن ہے۔

دار ال ترجمہ حیدر آباد

حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی نے جب اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تو ۱9۱۹ء میں دارِ ترجمہ کی بنیاد پڑی۔ اس ادارے نے یونیورسٹی کے مکمل کورس کی کتب میں تیار کیں! دستارِ تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، معاشیات، ہمزائیات، نفسیات، اخلاقیات، ریاضیات، طبیعیات، حیاتیات، قانون، فلسفہ، کیمسٹری اور انجینیئرنگ کی 58 جلدیں میں ترجمہ کیں۔ اردو میں سائنسی فنک الفاظ کے مفردات قائم کرنے، وضع الفاظ اور اصطلاحات علمیہ کا بڑا کام انجام دیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا عبدالحق، مولانا عبد اللہ عابدی، مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی، مولوی عنایت اللہ دیوبند، مولوی مسعود علی محمدی جیسے علماء اس ادارے سے

دائرتُ اَل معارف حیدرآباد

ایوانِ اردو حیدرآباد

انجمن اسلام اردویری سرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی

مکتب جامعہ لمیٹڈ دہلی

ہجر کا ہندسہ تا مسلمان ہجر

تصیفی، تالیفی، اشاعتی و مذہبی اداروں کے رسائل

معارف (اعظم گڑھ)، برلمان (دہلی)، البلاغ (بکینی)، آل فزان (لکھنؤ)، آل حضرت (بریلی)، ال حسنات (رام پور)، منادی (دہلی)، استاد (پنجاب)، زندگی (رام پور)، تجلی (دہلی)، دارالعلوم (دہلی)، ال جواد (بنارس)، انوار ال اسلام (بنارس)، آل واعظ (لکھنؤ)، ال محیب (پھلواری شریف)، آل حق (حیدرآباد)، ہما (لکھنؤ)، برسرآزہ (مری نگر)، اردو اکاڈمی جہول (لکھنؤ)، کتاب نما (دہلی)، شمع ملت (حیدرآباد)، ہماری زبان (دہلی)، وغیرہ وغیرہ۔

لَائِب رِیَایَاں

خدا بخش لائب ریری پٹنا

خان بہادر خدا بخش کے آباد اجداد اکبر کے عہد میں عرب سے ہندوستان آئے اور انہیں پورا ضلع سدن بہار میں سکونت اختیار کی۔ مغلیہ فوج اور سلطنت سے ان کا روزگار وابستہ رہا اور نگ زیب نے جب خونِ لطیف سے منہ موڑا تو خدا بخش کے بزرگوں کو ادب و فن کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا۔ خدا بخش کے والد محمد بخش نے مرتے وقت 2 ہزار نادر مخطوطات محمد بخش کے حوالے کیں اور وصیت کی کہ وہ عوام کے لیے ایک لائب ریری قائم کرے۔ خدا بخش نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق 1981ء میں ایک لائب رے ری کی بنیاد رکھی اور اس زمانے میں لائب ریری کی عمارت پر 8 ہزار روپے صرف کیا۔ لائب ریری کے قیام کے وقت کتابوں کی تعداد صرف 3 ہزار تھی اور ایک اندازے کے مطابق ان کتابوں کی قیمت اس وقت ڈھائی لاکھ روپے ہوتی تھی۔ نادروکتیوں کی فراہمی کے لیے خدا بخش نے ایک عرب شخص کی خدمات حاصل کیں وہ 50 روپے ماہانہ تنخواہ اور سفر خرچے کے مقررہ وسطی کے مالک کا دودھ کرتا اور برس میں ایک بار واپس آتا اور نادروکتیوں کی کتابوں کا ڈھیر لگا دیتا۔

اس لائب ریری میں متعدد ایسے مخطوطات موجود ہیں جو انتہائی بیش قیمت ہیں کہ ان میں سے جیسے حضرت علی کے خط کا ایک حصہ جو خط کو فی میں مقلد برکھا ہوا ہے قرآن کا ایک نسخہ جو خط کو فی میں چھپی کاغذ پر دوسری صدی ہجری میں لکھا گیا۔ ایک طبی کتاب جو جرجی بوٹیوں اور کیرٹ کوٹوں سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ایک یونانی طبیب نے لکھی تھی۔ خطبہ مامون کے عہد میں اس کا ترجمہ عربی میں ہوا اور پھر اس کا ایک نسخہ شیروان کے حکیم جلال الدین کے خیراتی ہسپتال میں سو برس تک چلا رہا۔ آخر وہاں نسخہ خدا بخش لائب ریری تک پہنچا۔ ہالیوں کے بھائی مرزا کامران کا دیوان جس پر کئی مغل بادشاہوں کے دستخط اور ہر جس ثبت ہیں۔ اس دیوان کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہے جو اس لائب ریری میں موجود ہے۔ جاتی کا لکھا ہوا 'بوسھ زلیخا' کا وہ نسخہ جو ادراجینے نے 2 ہزار روپے میں خریدا تھا۔ فردوسی کا وہ معقودہ شاہ نامہ جو کبھی کشمیر کے گورنری مراد نے شاہ جہاں کو پیش کیا تھا۔ دیوان حافظ کا وہ نسخہ جس سے کبھی ہالیوں خال لکھا کرتا تھا 'تاریخ خلافتان تیموریہ' کا وہ نسخہ جو اکبر کے عہد میں لکھا گیا اور جس پر شاہ جہاں کے دستخط موجود ہیں۔ اس لائب ریری میں فرانسسیسی، جرمن اور انگریزی زبان کی بھی بہت سی نایاب کتابیں موجود ہیں جیسے لائٹ آف نیولین، جو نیولین کے سیکریٹری نے لکھی تھی اور نیولین سوئم کی ملکیت تھی۔

1905ء میں لندن کے برٹش میوزیم نے لارڈ کرزن کے توسط سے خدا بخش لائب ریری کی ساری کتابیں خرید لینا چاہا تھا اور 5 لاکھ پونڈ کی پیش کش کی تھی مگر خدا بخش نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ کتب خانہ عوام کا ہے۔ خدا بخش ابتدا (1891ء) ہی میں اپنی لائب ریری اور اس کی عمارت کو حکومت ہند کی سرپرستی میں دے چکے تھے اور اُس وقت اس لائب ریری کا نام 'اورینٹل سیک لائب ریری' رکھا گیا تھا۔ اس وقت لائب ریری میں عربی، فارسی اور اردو کے 12 ہزار مخطوطات (متعدد ایسے مخطوطات ہیں جو کبھی قس قس تیار، دمشق، یمن اور بغداد کے کتب خانوں سے تعلق رکھتے تھے) کے ساتھ ساتھ تقریبی 50 ہزار طبع شدہ کتابیں موجود ہیں۔ بہت سے کم یاب اور قدیم رسائل کے فائل، قدیم سیکرٹ اور گراں قدر کلاسیکی تصاویر بھی ہیں۔ ان دنوں لائب ریری کا علم 37 افراد پر مشتمل ہے۔ 50 ہزار روپے سالانہ سرکار سے اخذ ملتا ہے۔ پانچ سالہ نمبر کے تحت بھی لائب ریری کی مزید ترقی کے لیے حکومت کی جانب

512

کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو، ربار

ادارہ ادبیاتِ اردو ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا اور اس کا یہ کتب خانہ ۱۹۳۶ء میں قائم کیا گیا۔ اس کتب خانے کی پیشہ کرتا ہیں ڈاکٹر نقو کا علیہ ہیں۔ اس کتب خانے میں بہت سی ایسی کتابیں ہیں جو ادبیات کا درجہ رکھتی ہیں خصوصی طور پر قدیم اخبارات و رسائل کے مکمل فائل اس کتب خانے کا بیش قیمت سرمایہ ہیں جیسے دہلی اور اخبار ۱۸۵۱ء۔ جامع ال اخبار مدراس، ۱۸۵۲ء۔ فوائد ال ناظرین دہلی ۱۸۴۵ء۔ ادھر پتہ لکھنؤ ۱۸۷۸ء و غیرہ۔ ۱۸۱۹ء میں ہنری مارٹن اور مرزا فخرت نے انجیل مقدس کا جو ترجمہ 'دینہ جدید' کے نام سے کیا تھا وہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ مخطوطات میں حضرت خاجہ بندہ نواز کا 'چکنا نامہ' مکتوب ۱۲۲۲ھ مکتب خاجہ بندہ نواز مکتوبہ ۱۱۵۵ھ اور شیخ اشرف کی 'نوسرہ' بھی موجود ہے۔ ۱۹۰۹ء کی تصنیف ہے۔ یہ دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہے جو اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ میر آسن کی 'بارغ و بہار' کا وہ نسخہ بھی یہاں موجود ہے جو کبھی نامور اردو آصف جاہ نے بطور خاص اہل لکھا تھا (اور مسود)

مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال

اس لائبریری کی شان دار عمارت نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال نے بنوائی تھی اور یہ ۱۹۰۷ء میں جب یہ لائبریری قائم کی گئی تو بھوپال کے آخری نواب محمد حمید اللہ خاں کے نام پر اس لائبریری کا نام 'حمید لائبریری' رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ نام مولانا آزاد سنٹرل لائبریری سے بدل گیا۔ یہ لائبریری اپنے ۹۵۵ مخطوطات کی بنا پر مشہور ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۲۵ ہزار ہے۔

رضا لائبریری رام پور

یہ ہندوستان کی چند قدیم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اس کی بنیاد رام پور کے پہلے نواب سید فیض اللہ خاں نے رکھی تھی مگر اس لائبریری نے بھی معانی میں ترقی کی جب ۱۸۴۵ء میں نواب سید محمد سعید خاں تخت پر بیٹھے۔ نواب سید خاں نے توسنک خانے کا ایک کمرہ لائبریری کے لیے دے دیا اور کتب کو ترتیب دار لائبریری میں رکھنے کا حکم دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد میں جہاں بہت سے عالموں نے رام پور کے نواب سید یوسف علی خاں کے دربار میں پناہ لی وہاں دوسری ریاستوں کے کتب خانوں کے نادر مخطوطات اور کتب بھی ریاست رام پور میں لاکر نواب یوسف علی خاں کی حفاظت میں دے دی گئیں۔ نواب یوسف علی خاں نے نہ سارا ادبی ذخیرہ خرید کر اپنی ریاست کی لائبریری میں شامل کر لیا۔ ۱۸۶۵ء میں سید کلب علی خاں کے نواب بننے پر ریاست کی اس لائبریری میں انگریزی زبان کی کتابیں آنکھ سے ہونے لگیں۔ ۱۸۹۷ء میں نواب سید مشتاق علی خاں نے لائبریری کے لیے باقاعدہ ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور ریاست کے سالانہ بجٹ میں لائبریری کے خرچ کے لیے بھی گنجائش دی۔ ۱۹۳۱ء زارچ ۱۸۹۲ء کو نواب سید حامد علی خاں نے لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح کیا اور اپنے شاہی (فیصل حکیم) حکیم اہل خاں کو اس لائبریری کا ان چارج مقرر کیا۔ حکیم صاحب کی ذہانت اور ادبی ذوق سے اس لائبریری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنے ذرائع سے شام، عراق، مصر، ایران اور یورپی ممالک سے بہت سی عوامی کتابیں منگو کر اس لائبریری کو ملک کی ایک اچھی اور بڑی لائبریری بنوایا۔

ریاست کے ہر نواب نے اس لائبریری کی ترقی میں پیشہ دل چسپی لی۔ ایک بار کلکتہ کی ایسی ریل لائبریری کے لائبریری میں پیشہ۔ اے جپ ٹی کو بلا مگر رام پور کی اس لائبریری کا نگراں مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء سے ایک مشاعری شعبہ قائم کر دیا گیا تاکہ نادر مخطوطات کو شائع کیا جاسکے۔ ابتدا میں اس لائبریری کا نام 'سنٹرل لائبریری' تھا، ۱۹۴۷ء کے بعد (آخری نواب سید عثمان علی خاں کے نام پر) نام بدل کر 'رضا لائبریری' کر دیا گیا۔ اس لائبریری میں عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ترکی، پشتو، گجراتی، تامل اور تیلوگو کے بہت سے نایاب اور اُن مول مخطوطات موجود ہیں۔ نادر طرز سے بھی ہیں اور ایرانی، راج پوتی، انڈو سنڈ اور منگولیوں طرز کے مصوری کے چند شاہ کار بھی یہاں موجود ہیں۔ علم نجوم سے متعلق قدیم آلات بھی یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ قلمی نسخوں کی تعداد گیارہ ہزار سے زیادہ ہے۔

حکیم محمد سعید خاں صاحب

عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد

۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد یونیورسٹی کی یہ لائبریری قائم ہوئی۔ اگرچہ یونیورسٹی میں ہر شعبے کی اپنی ایک الگ لائبریری ہے مگر عثمانیہ یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری بہر اعتبار ہر شعبے کا ضرورت پوری کرتی ہے اور ملک کی چند بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اس لائبریری کے سربراہ فارسی سیکشن پر پیشہ بڑی توجہ دی گئی ہے۔ قلمی نسخوں کی تعداد کئی ہزار ہے۔ بھونچ پر پرکھے ہوئے سنسکرت، ہراکھی، تیلوگو اور کنڑی کے قلم نسخے تو بہت ہی بیش قیمت ہیں۔ کتابوں کی مجموعی تعداد 50 ہزار سے زیادہ ہے۔

عوامی ادارہ مکتبہ

مکتبہ قائدین پورامسلمان محنت کس طبقے کا علاقہ ہے اور عوامی ادارہ اُن کی اپنی ایک باشعور تنظیم کی علامت ہے۔ نومبر ۱۹52ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور ۱۹۵۹ء میں لائبریری اور طبو کے لیے ایک مال تعمیر کیا گیا۔ لائبریری اردو کی تقریباً 4 ہزار قیوں پر مشتمل ہے اور اردو، ہراکھی اور انگریزی کے بہت سے ادبی، تاریخی، تازہ رسالے اور اخبار دروازہ لائبریری میں موجود رہتے ہیں۔ اس ادارے میں ایک فی بی سٹرکھی ہے جس کے ذریعے غریب لکھنوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ ادارے کے تحت محنت کش خواتین کے لیے ایک شیلنگ بھی جاری ہے جہاں ایک سندھیا تہ و سبجہ کار لکھتی ہے۔ شیلنگ سبکی ہے۔ عوامی ادارے کو حاجی احمد عباس، یعنی اعلیٰ، ظواء الفاری، نام بیڑ جبار اور سورگیہ بل راج ساہنی کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ یہ ادارہ ایک ٹرسٹ ایکٹ کے تحت رجسٹر ہے۔

گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ

۱۹۵7ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں جب سوہا بہار میں کانگریس کی ولادت قائم ہوئی تو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بنائے گئے۔ انھوں نے اپنا وزارت میں ایک کامیاب کام پرموہ بہار میں تعلیم بالغان کی ایک تحریک چلائی اور اسی سلسلے میں انھوں نے ہندی پرشید لائبریری اور اردو لائبریری کے نام سے دو ادارے قائم کئے۔ اردو لائبریری ۱۹38ء میں بنائی گئی تھی۔ ان دنوں اس لائبریری میں اردو فارسی کی تقریباً 2۵ ہزار کتابیں موجود ہیں اور بہت سی اخبار اور رسالے اس لائبریری کے نام جاری ہیں۔ (مناظرہ گاؤی)

جمعیت لائبریری بھونڈی

۱5 نومبر ۱۹۵۵ء کو بھونڈی (ضلع بھارہ پور) میں کرگھا سجد کے سامنے کے حصے میں یہ لائبریری قائم کی گئی۔ لکھنوی لائبریری کی اپنی اپنی چھوٹی محنت کی تعمیر ہو گئی اور مرحوم حاجی عبدالرزاق فیضی نے افتتاح فرمایا۔ سستی کے متعدد علم دوست حضرات نے اپنی اپنی جانب سے اس لائبریری کو مدد کی۔ اور لائبریری کے فنڈ سے بھی بہت سی کتابیں باہر سے منگوائی گئیں۔ ۱۹43ء میں جب حاجی صدیق احمد فیضی اس لائبریری کے سرپرست بنے تو انھوں نے 5 ہزار روپے جمع کر کے لائبریری کے لیے اور زیادہ کتابیں خریدیں۔ جمعیت لائبریری حکومت بھارہ پور سے رجسٹرڈ ہے اور بھونڈی میونسپل کونسل سے اس کو 5۵۵ روپے سالانہ ادائیگہ حاصل ہے۔ (ضیائیاتی)

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

اتر پردیش اردو اکادمی کی ابتدا لکھنؤ میں 3۵ جنوری ۱۹72ء سے ہوئی۔ یہ سرکاری اکادمی ہے اس کے لیے پہلے برس 5 لاکھ روپے بجٹ

محرم اسپرنگ کلب کلکتہ

أَوْقَافَ

طُورِ بَيْتِ اَلْ مَالِ حیدرآباد

یہ ۱۹۶۶ء میں قائم ہوا۔ اس بیت المال کو بابت ذرائع اعانت ادا کرنے والے مسلمان ۸۰ ہزار میں حوکم سے کم ایک روپيا اور زياده سے زياده حسب استطاعت اعانت کرتے ہيں۔ اس اعانت کے نتیجے ميں جمع شدہ سرمايہ ۳۰ لاکھ روپے ہے اور عام عطيوں کی صورت ميں جمع شدہ رقم ايک لاکھ روپے ہے۔ دینی مددوں کے بچوں کے قیام و طعام کے سلسلے میں مالی امداد دینا، نادار اور یتیم لڑکیوں کی شادی بیاہ کے سلسلے میں مالی مدد دینا، اولاد مندوں کی تعمیر و تکفیل کا سرچہ برداشت کرنا، عیادت گاہوں کی مرمت و تعمیر تو وسیع پر خرچ کرنا، مستحق طلباء کو مزید تعلیم کے لیے مالی سہولت سہم پہنچانا، اتفاقی و قدرتی حادثوں کا شکار ہونے والے افراد کی امداد کرنا شخصی ضمانت پر قرض دینا وغیرہ اس ادارے کے اعراض و فائدہ سمیٹیں۔ بریس مکرّم جاہ نے اٹھارہ سو مربع گز کا بلاٹ عطا کیا تاکہ اس پر بیت المال، اعلیٰ تعمیر ہو سکے، عمارت کی تعمیر کا کھد ۳ لاکھ روپے ہے۔ رفتہ تیار ہے اور سیرکی اجدا ہونے والی ہے۔ (الغور مسعود)

داؤد بھائی فاضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ ممبئی

راؤ دھبائی فاضل بھائی خواجہ اشاعتی جماعت بمبئی کے ایک تیز فز و تھقے۔ اُن کا انتقال ۱۳ جون ۱۹۱۹ء کو ہوا۔ انھوں نے اپنے وصیت نامے کی رو سے ۵ لاکھ روپے کی جائے راہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی۔ جزیری ۱۹۲۳ء سے اس ٹرسٹ نے اپنا کام شروع کیا۔ ٹرسٹ کی جانب سے مسلم طلباء و طالبات کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے وظیفے دیے جاتے ہیں اور متعدد تعلیمی ادارے بھی جاری ہیں جن میں راؤ دھبائی فاضل بھائی ہائی اسکول، راؤ دھبائی فاضل بھائی پرائمری اسکول اور راؤ دھبائی فاضل بھائی نرسری اسکول قابل ذکر ہیں۔ ان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور طلباء و طالبات کے لیے محفوظ ہے اس ادارے کی جانب سے ۵۰ بوائز لڑکیوں کے لیے جو اسکول جاری ہیں وہ راؤ دھبائی بھاسل بھائی ہجوم سائنس انسٹی ٹیوٹ، راؤ دھبائی فاضل بھائی کرائسٹ ٹیچرس ٹریننگ کالج اور راؤ دھبائی فاضل بھائی سینٹری کرائسٹ انسٹی ٹیوٹ میں اور ان اسکولوں اور لیجسلیوٹیم کو ملے ہوئے ہیں۔ یہ ٹرسٹ اب تک ۵ ہزار سے زیادہ طلباء کو بطور پیر ۵ لاکھ روپے سے زیادہ کے وظائف اور تحفے دیے چکا ہے۔ اس ٹرسٹ کی جانب سے اردو زبان میں تعلیم بالغان کی ایک کلاس بھی جاری

ہے یہ ٹرسٹ اپنی گولڈن جوبلی مناجا کے لیے ٹرسٹ کی ہلکے میں قسیمی وادی میں بسوں کے لیے ایک ہل بھی ہے جو ٹرسٹ کے بانی کے نام سے موسوم ہے یعنی گولڈن جوبلی ٹرسٹ بھائی آؤں کو یہ ہے جناب سلطان حسن دوسل (سالہ شہر) داؤد بھائی دانش بھائی مسلم ایکجو ٹرسٹ کے چیئرمین ٹرسٹ ہیں۔

علم و ادب و صحافت کے گہوارے

اردو زبان کی تاریخ میں چند ایسے اخبار بھی شائع ہوئے جو کئی اخبار ہونے کے باوجود علم و ادب، سیاست و صحافت اور قیادت کا گہوارہ بھی تھے۔ سیکرٹری صحافتی ان کے ہاں سے بن کر اور دھول کر سیکرٹری ان احکامات، اہم اور ٹریسٹ بھی ثابت ہوا اور اس کی رائے سے سارے سیاسی حلقوں نے پیشہ اثر بھی لیا۔

اخبار 'کوہ نور' لاہور

اردو کا اخبار عدوت ہے جنوری 1955ء میں لاہور سے جاری ہوا اس کے مالک ہر سکھ رائے تھے جو دہلی تھے اور ذات، ایک کالستھ تھے۔ اخبار 'کوہ نور' اگرچہ الٹ انداز کی حکومت کا حامی تھا مگر اس اخبار کا دہن اس قدر صاف تھا کہ مالک اخبار کے ہمدرد ہونے کا لگان بھی نہ ہوتا تھا اس میں میرے بھی شائع ہوتے تھے اور لکھتے بھی اور غلامی میں اس اخبار نے ایک مشاعرے کی (1885ء میں) داغ سیل ڈالی تھی۔ یہ اخبار سلاطین، محافل، دقت ہندو، مسلمان اور عیسائی راڈی ٹرون کے مات میں رہا۔ اس اخبار کے ادارے میں جنھوں نے قلمی تربیت پاکر نام پیدا کیا ان میں نادر علی شاہ سیفی، تاج آدین، منشی نول کشور، مرزا محمد، شاعر شہرت، منشی اہل سنگھ، مولوی عبداللہ، مولوی محمد دین نون، منشی محمد علی جتوئی اور مولوی صہب الہی حق اویس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں آدین نے 'کوہ نور' کے ادارے میں رہ کر قابل رشک قاطعیت، صلاحیت پیدا کی وہ غالب کے شاگرد بنے، بڑے بڑے باہل قلم سے ان کی قلمی محرک آئی رہی اور اس اہل شہرت کی باہر ان کو نظام حیدر آباد سے 95 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

اخبار 'زمین دار' لاہور

یہ اخبار مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خاں نے جاری کیا تھا۔ 1909ء کی موت کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے اس اخبار کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ مولانا کے گیت کے مطابق 'زمین دار' اخبار کی یا ایسی یہ تھی کہ زمین داروں کے لئے لکھ لے کر، زمانہ کے ساتھ ساتھ، فی جہل میں تصدیق پر مجبور کیا جاتا مگر ان کا اپنی توانائی نے اخبار کو کبھی زیادہ تر سے تک ایک راہ پر چلنے دیا۔ اس کے باوجود وہ بڑے ذہنی نصیب تھے۔ یہ اخبار لاہور میں دس سال پر چھاپا رہا اور جہلزم کا ایک سہل اصول بنایا۔ اردو کے درجنوں قلم کار اس اخبار کی کھال میں بھل کر سکے۔ رائے دفت: یہ جیسے مولانا اسلام رسول تھرو، مولانا عبدالجبار سالک، علامہ سراج لوری، آقا میر تقی احمد خاں میکش، جبار علی حسرت، مولانا عبدالباقی، سید ابی حسن مکر، سید اسماعیل وحشی آدنی، مولانا صدیق حبیب مہاری، قاضی انس اللہ توسر، مولانا اظہار مسر، سید دلیر حسن مسعود، مولانا اظہار حسن زاہدی، غلام احمد قسطنطنیہ، مہم حسن لطیفی، مولانا غلام حسرت ربانی، لودھی چودھری غلام حیدر خاں، مولانا اختر علی خاں، غلام میر حسن میر کاشری، ممتاز ملک، مولانا عبدالجبار صدیقی، حفیظ جالندھری، سید ظہور احمد وحشی، ابوالعلا وحشی، حاجی تقی، منشی دجاہت حسین قھٹانوی، مولانا وحید ادیس سلیمانی، وغیرہ۔ 1956ء میں مولانا ظفر علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے بڑے مولانا اختر علی خاں نے اخبار سنبھالا۔ 1947ء کے بعد وہ بھی انتقال کر گئے اور پھر ان کے دہلی میں منھوڑ علی خاں اور مسعود علی خاں اخبار کو جاری رکھ سکے۔

اخبار 'مدینہ'، کینو

حاجی مولوی مجید حسن مرحوم نے پہلی مئی 1912ء سے یہ اخبار کینو سے جاری کیا۔ یہ ایسی یہ تھی کہ تحریک آزادی کی تائید کی جائے، آزادی طلب

ہنگامہ فتنہ ستانی مسلمان نمبر

جہاں ان کی حاجت کی جائے اور اسلامی روایات کی حفاظت کی جائے۔ یہ اخبار پیشہ اسی پالیسی پر قائم رہا۔ اس کے نتیجے میں اگر برصغور حکومت کی جانب سے اکثریت بھی ملازل ہوا متعدد بار کی کئی ہزار روپے کی ضمانتیں طلب کی گئیں۔ ایک زمانے میں سارے پنجاب میں 'مدینے' کا دھڑلہ بند ہوا اور حد یہ ہے کہ مسلم سیاست بھجپال نے بھی کافی عرصے تک اس کے داخلے کو اپنے یہاں ممنوع رکھا۔ آج بھی 'مدینہ' اپنی پالیسی کے اعتبار سے ایک قوم پرست اخبار ہے۔ ابتدا کی چار برس میں یہ ہفت روزہ رہا مگر پچاس جنوری ۱۹۱۷ء سے یہ سر روزہ (ہفتے میں دو بار) ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ 'مدینے' کے چند ہی پرچے شائع ہوئے تھے کہ اختر کے نائب مولوی محمد حسن صاحب نے خاب میں آسمان پر چودھویں رات کا چمکنا ہوا چاند اور قدر مدینے کے ایک طاق میں ٹمٹماتا ہوا ایک چراغ دکھا۔ خاب ہی کی حالت میں مولوی نور حسن دہلی نے جو اُن دنوں 'مدینے' کے اڈیٹر تھے، مولوی مجید حسن کو بتایا کہ یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ اخبار 'مدینہ' کی موجودہ حالت ہے اور بددعا کا لہر اس کی ترقی یافتہ شکل۔ 'مدینہ' اخبار کا ادارہ بھی بہت سے لکھے والوں کے لیے ایک ایسی تربیت گاہ ثابت ہوا ہے جیسے حافظ نور حسن دہلی۔ مولانا البر شاہ نجیب آبادی، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی، مولانا امین احسن اصلاحی، قاضی بدرال حسن بدر جلالی، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، مولانا حامد اللہ نعاری غازی، ابو سعید بریلوی دیوبندی، ابوال یسین ندوی اصلاحی، شیر بیگ بریلوی، مولانا عثمان ذوق لیلیط، مولانا محمد اصبح ال حسینی دیوبندی، مولانا محمد وارث کاکل، ضیاء الحسن فاروقی، حمید حسن مگر قدس مہسائی، ماہر ال قادری، آغا رفیق بلند شہری، مولوی نصیر الحق دیوبلی، حافظ علی بہادر مراد آبادی، شاہ خلیل الرحمن مہاری، قاضی محمد عدیل عباسی، مولوی شبیر الحسن چانہ پوری، مولوی نور احمد انجیر الہی وغیرہ۔ آج کل بانی اخبار مولوی مجید حسن مرحوم کے صاحب زادے جناب سعید اختر اخبار 'مدینہ' کے اڈیٹر ہیں۔

مولوی عبدالحمید مشرور نے فرنگی محل کو ایک اعلامیاتی بونی ورٹی اور علم و کامرکز کہا ہے۔ یقیناً لکھنؤ کی اس حویلی کی حیثیت ایک علمی ادارے کی ہے۔ فرنگی محل سے تعلق رکھنے والے آج کے خان دان کے بانی ملا قطب اویں تھے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ پانچ لاکھ روپے سے زیادہ مال کے قبضہ میں رہتے تھے۔ اورنگ زیب ملا قطب کی بزرگی سے شاہجہان پور پر واقف تھا اور ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ ان کے ماراں سے ان سے ملنا جانا مگر وہ اس سے ملنے نہیں گئے۔ مارچ 1692ء کی کسی تلے کے نتیجے میں ملا قطب اٹھ ہی ہو گئے۔ ان دنوں ملا قطب کے بڑے لڑکے محمد اسعد دکن میں اورنگ زیب کے پاس مقیم تھے۔ مال کی موت کے بعد چھوٹے بیٹے محمد سعید نے بہالی اور بارہ بنگی کے عزموگوں کے دست خطوں سے ایک محضر امیر تیار کیا اور دکن پہنچ کر اورنگ زیب کے سامنے فریادیں بنا دیں اور ان کے پاس کو ملا صاحب کے نو بن ناحق کا حال جان کر محنت اشغال میں آیا اور اس نے عمال کے نام پر مان جا کر ان کے قاتلوں سے قصاص لینا چاہا اور ان کا جان و مال برباد کر دیا جائے۔ چونکہ ملا صاحب کے گھر والے ان دنوں نے امرتسار میں اپنے دو لڑکے فرماں (مئی 1694ء) کے بموجب ملا صاحب کے دربار کو لکھنؤ میں رہنے کے لیے ایک سرکاری حویلی دے دی۔ یہ حویلی کچھ ایک فرانسسی تاجر کو کھلی تھی جو سن یا گھوڑوں کا سودا کرتا تھا۔ اس نے اپنی نوکری کے لیے زمین سرکار (حکومت مغلیہ) سے چٹیکے پرٹی تھی۔ چٹیکے کی مدت ختم ہونے پر زمین کے ساتھ اس پر پستی کو بھی بھی خرید لیا۔ شاہی نوکری تھیں کہ یہ حویلی ایک فرنگی کی کوٹھی تھی۔ اس لیے بعد میں فرنگی محل کے نام سے مشہور ہو گئی۔ سلطانا قطب کے چار بیٹے تھے جن میں مولوی نظام الدین سب سے زیادہ بڑے تھے۔ انھوں نے فرنگی تلمیذ کا ایک مکمل نظام مرتب کیا جو درسی نظام تھا۔ اور آج تک عربی مدرسوں میں رائج ہے۔ مولوی نظام الدین نے مدرسہ عالیہ نظامیہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کے ایک صاحب زادے مولانا عبدالعلی تھے جنھوں نے اپنی علمی تصانیف اور درس و تدریس کی بنا پر بڑی شہرت پائی۔ مولوی عبدالعلی بھی فرنگی محل ہی سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے صرف 93 برس کی عمر میں 104 علل و معاری کتابیں تصنیف کی تھیں۔ عرضے فرنگی محل ایک علمی و دینی ادارہ کی صورت میں کھلی ڈھری صدی سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بنگالہ، برصغیر، آزاد اور صقلیا تک مشہور ہے۔

رکھی بنائے مندہ ہزار نے آ کے خد
سچ پوچھے اورو فرمائی مکمل یہ ہے

۴۴

آج انڈیا میں ایجوکیشنل سوشلسٹی کالی کٹ!

کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی مسلم نوازی تعلیم کے متعلق سب سے بڑی تنظیم ہے۔ اس تنظیم کا کسی بھی قسم کی سیاست یا سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں البتہ اس کا مزاج اسلامی ہے۔ اس سوسائٹی کے تحت بہت سے کالج جاری ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر تعلیمی ادارے میں اسلامی مطالعے اور عربی زبان کا ایک شعبہ ہو اور ایک مسجد ہو۔ سوسائٹی کی جانب سے مسلمانوں کے غریب طبقات کے لئے مختلف شہروں میں 14 ہسپتال بھی جاری ہیں۔ ہندوستان کی دوسری 20 تعلیمی انجمنیں اور دیگر اکال کالج اس آل انڈیا مسلم یونیورسٹی سوسائٹی سے احاطہ رکھتے ہیں۔ آج کل اس سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر ٹی۔ کے عبدل غفور داد آئی بی سی سیکرٹری ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ہیں اور اس سوسائٹی کی پارچہ دیں آل انڈیا کانفرنس فروری 1975ء میں کالی کٹ میں منعقد ہوئی تھی۔

دیگر علمی، ادبی، تعلیمی اور ثقافتی اردو انجمنیں

دیگر سی ادبی، سیاسی اور سماجی ادبیات

اردو اکادمی (لکھنؤ) - حلقہ احباب فروغ اردو لکھنؤ - ہندی اردو سنگم لکھنؤ - ہم عصر علی گڑھ - ہم راہی علی گڑھ - دائرۃ
 ادب پٹنا - حلقہ ادب پٹنا - اردو مجلس پٹنا - بزم شعرا بیٹی - اردو سرکل بیٹی - ادبی جم پٹی - ہم تکر بیٹی - حلقہ احباب ادب
 بھوپال - شمع ادب بھوپال - بزم فن کار بھوپال - بزم سخن بھوپال - ادارہ فروغ اردو بھوپال - انجمن تحفظ اردو آنندھرا پدیش
 حیدرآباد - مجلس عمل طلبہ برائے اردو حیدرآباد - ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد - ادبی ٹرسٹ حیدرآباد - ابوالکلام آزاد
 افڈیل می سرجی ٹرسٹ حیدرآباد - زندہ زالن حیدرآباد حیدرآباد - انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد - ادارہ مصنفین
 حیدرآباد - مجلس ادب بنگلور - انجمن اشاعت اردو میسرور - انجمن انامیہ بنگلور - انجمن احباب کلکتا - اردو ٹرسٹ ایسوسی ایشن
 کلکتا - سخن زار کلکتا - بزم لوح و قلم کلکتا - ادارہ فروغ اردو شب پور ہوڑہ - اردو اکادمی کلکتا - اردو ٹرسٹ بری سو سائی لکھنؤ
 داسٹرس ایسوسی ایشن ہوڑہ - مجلس مصنفین اردو مدراس - حلقہ احباب ذوق مدراس - ایس۔ بی۔ جی۔ وی۔ ڈی۔ مدراس - اردو
 ایسوسی ایشن مدراس - اردو انجمن مدراس - بزم شگوفہ مدراس - تل ناڈو پبلی کیشن مدراس - فردوس ادب مدراس - حلقہ ادب
 مدراس - نعل ادب مدراس - کرسنٹ سو سائی مدراس - انجمن شعرائے اہل بیت مدراس - انجمن شوق ادب - جے پور - انجمن کاسٹ
 فکریہ پور - انجمن تجربہ اردو ٹونک - بزم ادب انبالہ - حلقہ احباب اردو گورکھ پور - اردو پریشد چند علی گڑھ - اردو کلب
 روہتک - ستریکل چرل آگنڈا لکھنؤ سرگودھا - کل ہند بزم شعرا سرگودھا - تلاش ادب سری نگر - انجمن تعمیر اردو دہلی - علی مجلس دہلی -
 انجمن فروغ ادب دہلی - اردو ٹرسٹ ایسوسی ایشن دہلی - وغیرہ

دیگر دولابے ریاں

مگورن منٹ اردو لائبریری۔ پٹنہ۔ یہ لائبریری ڈاکٹر سید محمود کی وزارت تعلیم کے زمانے میں (۱۹۳۹ء) قائم کی گئی تھی۔ اس میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۱۳۲۱۸ ہے۔ مسلم لائبریری، ناگ پور۔ انجمن قلم اسلام لائبریری، کامٹی۔ مسلم لائبریری، بھٹارہ۔ مولانا آزاد لائبریری، ملکاپور۔ مسلم لائبریری، سن مار۔ اردو لائبریری، اچولا۔ اردو لائبریری، ایلے گاؤں۔ املار لائبریری، مائے گاؤں۔ انصار لائبریری، مائے گاؤں۔ کتب خانہ نقش بندہ، بالا پور۔ کرنی لائبریری، بھٹارہ۔

جامع مسجد ناب ریری، بمبئی۔ انجی اسلام ری سرچ سنٹر، بمبئی۔ (اس ادارے میں اردو کے کتب و رسائل کی تعداد 5 ہزار ہے) ہاتھ کا ندھی لائب ریری، بمبئی (20 ہزار اردو کتابیں) سوبانی ریڈنگ روم، بمبئی (10 ہزار اردو کتابیں)۔ کھڑی بین برنسپل فرن ریڈنگ روم، بمبئی (8 ہزار اردو کتابیں)۔ کتاب گھر، بمبئی۔ اقبال لائب ریری، بمبئی (اردو کتب و رسائل کی تعداد 5183 ہے) انیس لائب ریری، بمبئی۔ برنسپل ہاربر مطالعہ، بمبئی (2 ہزار اردو کتابیں) حمید کالج لائب ریری، بمبئی (5 ہزار اردو کتابیں) سیف کالج، بمبئی (4 ہزار اردو کتابیں) اسٹیٹ سنٹرل لائب ریری، حیدر آباد (اس لائب ریری کی 2 لاکھ کتابیں ہیں 30 ہزار اردو کتابیں اور 13 ہزار اردو مخطوطات ہیں) سالار جنگ میوزیم لائب ریری حیدر آباد (15 ہزار اردو مطبوعات اور ایک ہزار مخطوطات)۔ ادارہ ادبیات اردو لائب ریری، حیدر آباد (25 ہزار اردو مطبوعات اور 5 ہزار مخطوطات ادبیات سے قدیم اردو اخبارات و رسائل کے فائل)۔ بھات گن وردھک سیمٹی، حیدر آباد (اس میں دنیا کے 42 زبانوں کے 1180 لغات کا ذخیرہ موجود ہے)۔ اردو کاہر لغت اس میں موجود ہے)۔ اسٹیٹ آرکائیو لائب ریری، حیدر آباد (اردو فارسی کے 4 ہزار مخطوطات اور 2 ہزار مطبوعات محفوظ ہیں)۔ کتب خانہ سعیدیہ، حیدر آباد۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد۔ کتب خانہ خواتین دکن، حیدر آباد۔ حیدر گشتی کتب خانہ، حیدر آباد۔ لطف ادولہ اور فیض ری سرچ انسٹی ٹیوٹ لائب ریری، حیدر آباد۔ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ۔ نیشنل لائب ریری، کلکتہ (اس لائب ریری کا یوہار ریکشن اردو شعبہ ہے)۔ شاہی کتب خانہ، سرحد آباد محمد علی لائب ریری، کلکتہ۔ مولانا آزاد کالج، کلکتہ (اس کالج کی لائب ریری کا شعبہ اردو)۔ مہنگی محسن کالج، کلکتہ (اس کالج کی لائب ریری کا شعبہ اردو)۔ امانتی لائب ریری، مدراس (تقریباً 30 ہزار اردو کتابوں میں 15 ہزار مخطوطات ہیں)۔ مدرسہ جامعہ دار السلام، عمر آباد، مدرسہ باقیات صالحات، ویلور۔ مدرسہ لطیفہ، ویلور اور مدرسہ منظر علوم ہائی اسکول، آمبود کے کتب خانوں میں اردو فارسی کی کئی کئی ہزار کتب موجود ہیں۔ کتب خانہ عام اہل اسلام، مدراس (30 ہزار اردو فارسی اور عربی کتب)۔ آسمود (اس انجی کا کتب خانہ بھی قابل ذکر ہے) اور نیل ری سرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک (4 ہزار اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات موجود ہیں) کتب خانہ حکمہ اذفات جامع مسجد بھرت پور۔ کتب خانہ، فتح پور۔ ہمارا جابلک لائب ریری، بے پور۔ کتب خانہ شاعری، بے پور۔ کتب خانہ مولانا عمران بے پور۔ کتب خانہ فضل حسین، اجیمیر۔ ہمارا جابلک لائب ریری، بے پور۔ مولانا آزاد لائب ریری، کمرانا۔ مولانا آزاد لائب ریری، جودھ پور۔ بھجراقبال لائب ریری، جودھ پور۔ بھگت لائب ریری، احمد آباد۔ سری پرنایا بھگت لائب ریری، سری نگر (15 ہزار اردو کتب)۔ کشمیر یونیورسٹی لائب ریری، سری نگر (5 ہزار اردو کتب)۔ حکمہ تحقیقات علیہ کتب خانہ، سری نگر۔ جامعہ مدینۃ ال علوم، حضرت بل۔ کتب خانہ سری نگر۔ دہلی۔ بھگت لائب ریری، دہلی۔ ہارڈنگ لائب ریری، دہلی اور تیزی لائب ریری، دہلی ویلور

ہندستان کے اردو اخبارات

قدیم اہم اردو اخبار و رسالے : کہتے ہیں کہ اردو زبان کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" تھا جو 22 جولائی 1818ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ دوسرے قدیم اردو اخباروں میں مولانا محمد باقر اکبر حیات کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد کے والد کے ہفتہ وار اخبار "دلی اردو اخبار" اسٹرام چندر کے ماہانہ و پندرہ روزہ "لادنا" نامی "غیر خواہ ہند" کلکتہ پور۔ "اسعد ال اخبار" آگرہ۔ "منشی نول کشیدہ" کے "آدھ اخبار" کلکتہ۔ "منشی سجاد حسین کے "موجہ اخبار" اور "پچ" کلکتہ۔ "منشی نوبت رائے" کے "خدیگ نظر" کلکتہ۔ "گلشن گلستا" سرائی مسلمان مسد

منشی دیاناراج نگر کے روزانہ کمال پور۔ نیاز رنج پوری کے۔ نگار، لکھنؤ۔ نئی زندگی، الہ آباد۔ سبط حسن کے "نیادب" لکھنؤ۔
 حسرت موہانی کے "اردو معلّٰی" کمال پور۔ "نور انوار" آرفہ بہار۔ "پٹنہ ہرکارہ" پٹنہ۔ "اخبار بہار" پٹنہ۔ "دیو کلی ریوٹ" گیا۔
 چشمہ علم پٹنہ۔ "ماہنامہ انجمن مذاکرہ علمیہ" پٹنہ۔ ہفت روزہ لطیف، ال اخبار، بھئی۔ "کشف ال اخبار" بھئی۔ "اخبار جام جہاں نایاب"۔
 اخبار خادم ہند، بھئی۔ "بھوپال کے" "عدت ال اخبار"۔ "صحیٰ برہما" بوشنگ آباد۔ "ہر میتر"۔ "نیل ال سلطان"۔ "نگار"۔ "عمر ال
 ملک"۔ "جہاد"۔ "ال حجاب"۔ "صبح وطن"۔ "سید پال پنج"۔ "ستارہ کار"۔ "افکار"۔ "نیامجو پال"۔ "منزل"۔ "ترجمان"۔ "نیاسا سہی"
 "اخلاق"۔ "گواہار"۔ "آفتاب مالوہ"۔ "اجین"۔ میسور۔ "فوجی اخبار"۔ "قاسم ال اخبار"۔ "اصن ال اخبار"۔ "بادشاہ"۔ "بگتر"
 "ایڈورڈ گزٹ"۔ "غشور محمدی"۔ "دیور ال اخبار"۔ "سلطان ال اخبار"۔ "محافظ بنگلور"۔ "بنگلور"۔ "تیر اعظم"۔ "بنگلور اخبار"۔ "بنگلور"۔
 "تعلیم اخبار"۔ "صلح"۔ "دل سوز"۔ "ترغیب"۔ "نست"۔ "صبح بہار"۔ "نگارستان خیال"۔ "جام گزٹ"۔ "ستارہ راہ ترقی"
 "رسالہ نسواں"۔ "دیوار"۔ "سُخبل"۔ "بال"۔ "طلوع"۔ "پیکر خیال"۔ "ذائق"۔ "عروض"۔ "ترنہ"۔ "آفتاب"۔ "قول"۔ "دخشاں"
 "کوثر"۔ "جلوہ سخن"۔ "روزہ روزگار"۔ "دریتم"۔ "نظم اردو"۔ "بھرت پور راجستھان"۔ "ال بیان"۔ "مبے پور"۔ "نئی روشنی"۔ "مبے پور"۔
 "پیغام احمد آباد"۔ "آزاد احمد آباد"۔ "گل مست"۔ "پالن پور"۔ "شہلاخبار (ضلع)"۔ "چشمہ فیض"۔ "سیال کوٹ"۔ (اھور)۔ "کوہ نور"
 "دیباکے نور"۔ "لاہور گزٹ"۔ "راجن نو"۔ "بیسہ اخبار"۔ "ملاپ"۔ "پرتاپ"۔ "زمین دانہ"۔ "امروز"۔ "احسان"۔ "نوائے وقت"
 "شہباز"۔ "بے بند"۔ "مشورہ"۔ "رجحیت"۔ "بندے ماترم"۔ "اجیت"۔ "پر بھات"۔ "آزاد"۔ "ویر بھارت"۔ "شش سلطان"
 "ال فضل رقابان"۔ "ادبی دنیا"۔ "ادب لطیف"۔ "ہمایوں"۔ "کدکشان"۔ "عالم گزٹ"۔ "شاد اکار"۔ "کارواں"۔ "اداکار"۔ "گر و گھنٹاں"
 "مست قلندر"۔ "پریت لڑی"۔ "متذیب نسواں"۔ "رہنمائے تعلیم"۔ "بیسویں صدی"۔ "لطیف شباب"۔ "نوا"۔ "پارس"۔ "مستانہ"
 "جوگی"۔ "رفقاہ"۔ "حالیہ"۔ "نقوش"۔ "جاندھر"۔ "پگ ڈنڈی"۔ "زمرت سر"۔ "نگار ش"۔ "دھرت سر"۔ "جہاں نشا"۔ "دھرت سر"۔ "پڈیا بلاں"۔ "ریو گنگ"
 "لک پز جوں کے نام اہم ہیں۔"

آج کے مشہور اردو اخبار و رسالے: دہلی: روزنامے۔ "ال جمعیت"۔ "وطن"۔ "ملاپ"۔ "پرتاپ"۔ "دھرت"
 "ملک و ملت"۔ "ریج اور سیر"۔ "دیگر"۔ "ہفت روزہ"۔ "اتالیق"۔ "شیر نواب"۔ "ال جمعیت"۔ "ری فارم"۔ "ایشیا"۔ "پیام شرق"
 "حیات"۔ "پرچم ہند"۔ "ہماری زبان"۔ "چترا"۔ "سینک سماچار"۔ "ایندیش"۔ "نئی دنیا"۔ "اور مستقیم"۔ "دیگر"۔ "پندرہ روزہ"
 "آواز"۔ "ہم درد"۔ "نوائے اتحاد"۔ "ہندو کیش"۔ "دیگر"۔ "ماہ نامے"۔ "شرح"۔ "بالوہ"۔ "جزم"۔ "کھلونا"۔ "شبستان"۔ "ہما"۔ "ہوا"
 "محراب"۔ "مدینہ"۔ "واقعات"۔ "ردی"۔ "پاکیزہ"۔ "بیسویں صدی"۔ "تحریک"۔ "شان ہند"۔ "حالیہ"۔ "حقوق مشرق"
 "آج کل"۔ "پیام تعلیم"۔ "خاندانی منصوبہ بندی"۔ "جامعہ"۔ "آستانہ"۔ "دلی"۔ "منادی"۔ "ادب"۔ "اور سہ ماہی"۔ "تحریک"۔ "اور"
 "اردوئے معلّٰی"۔ "دیگر"۔ سری نگر: روزنامے۔ "آفتاب"۔ "سری نگر نامہ"۔ "ہم درد"۔ "خدمت"۔ "زمین دار"۔ "چند"
 "نوجوین"۔ "سندھ"۔ "دیگر"۔ "ہفت روزہ"۔ "رفقاہ"۔ "آئینہ"۔ "جان"۔ "آذان"۔ "اردو دہلی"۔ "شیرازہ"۔ "اور سہ ماہی"۔ "علم"
 "دانش"۔ "دیگر"۔ جالندھر: روزنامے۔ "ہند سماچار"۔ "پرتاپ"۔ "ملاپ"۔ "پروپ"۔ "پر بھات"۔ "ملاپ"
 "جاندھر پورٹ"۔ "صداوت (لڑھیانہ)"۔ "اور فلانگ میل"۔ "دھرت سر"۔ "دیگر"۔ "پندرہ روزہ"۔ "آریہ گزٹ"۔ "ہندو"۔ "سنانہ"
 "دھرم پرچاک"۔ "افز بکرگ"۔ "دیگر"۔ "صدیائے"۔ "ہفت روزہ"۔ "جاٹ گزٹ"۔ "دھرت سر"۔ "انبار سندیش"۔ "انبار"
 "انبار نامہ"۔ "انبار"۔ "ایران ہریانہ"۔ "بھارت پتر"۔ "دیپ سندیش"۔ "دھرت گفٹار"۔ "ہریانہ ملک"۔ "جہم بھوی"۔ "جگت بھتر"۔

۱۔ بیگزٹ۔ ۲۔ پیغام۔ ۳۔ شیراز۔ ۴۔ (موت پت)۔ ۵۔ پیکر اور نشین۔ ۶۔ روشن شمس۔ ۷۔ تحقیقات۔ ۸۔ اور تلقین وغیرہ۔ ۹۔ چدرہ روزہ۔ ۱۰۔ پالکھا۔
 ۱۱۔ پورنیا۔ ۱۲۔ پرفارم تھی گزٹ۔ ۱۳۔ ڈانس آن ایمپلائز۔ ۱۴۔ بے ٹکو۔ ۱۵۔ آر۔ ۱۶۔ نسبت بال۔ ۱۷۔ مسلحہ داڑ۔ ۱۸۔ ماہ نامے۔ ۱۹۔ امر پریا۔ ۲۰۔ دولت کمارش۔ ۲۱۔ اربہ۔
 خوش دل۔ ۲۲۔ لالہ جگ۔ ۲۳۔ نرمان پنجاب۔ ۲۴۔ نگار۔ ۲۵۔ قوم پرست۔ ۲۶۔ اور شہید وغیرہ۔ ۲۷۔ ہاجل پریش، ہمت روضہ، دگر مندیش، کیلاش، ہماہما چل۔
 ٹاکھ، سماچار۔ ۲۸۔ لکھار۔ ۲۹۔ کون راج۔ ۳۰۔ پندرہ روزہ۔ ۳۱۔ ہاجل پریشات۔ ۳۲۔ ٹیاری دنیا۔ ۳۳۔ ماہ نامہ، بین ہاجن۔ ۳۴۔ وغیرہ۔ ۳۵۔ جی پور سپرہ روزہ نشانات۔
 ہفت روزہ بدلا ہوا زمانہ۔ ۳۶۔ ندیم۔ ۳۷۔ ماہ نامہ۔ سلطان الہند۔ ۳۸۔ اور گز ارجید۔ ۳۹۔ (تجسس)۔ ۴۰۔ وغیرہ۔ ۴۱۔ مدراس۔ ۴۲۔ روزنامے۔ ۴۳۔ مسلمان۔ ۴۴۔ اور اتحاد۔
 ہفت روزہ معین۔ ۴۵۔ کل ناڈو ناگز۔ ۴۶۔ رفیق ہلت۔ ۴۷۔ مسلم پورٹ۔ ۴۸۔ اور آزاد نوجوان۔ ۴۹۔ وغیرہ۔ ۵۰۔ ماہ نامے۔ ۵۱۔ جل ترنگ۔ ۵۲۔ آب دتاب۔ ۵۳۔ اور نادان۔ ۵۴۔ وغیرہ۔
 کلکتہ اور زمانے۔ ۵۵۔ آزاد ہند۔ ۵۶۔ محرم جدید۔ ۵۷۔ آبشار۔ ۵۸۔ غازی۔ ۵۹۔ امروز وغیرہ۔ ۶۰۔ ہفت روزہ۔ ۶۱۔ روز و سہ ہند۔ ۶۲۔ کان مزدور۔ ۶۳۔ احاطہ۔ ۶۴۔ تجلیات۔
 فلم ریلی۔ ۶۵۔ اور نکاس۔ ۶۶۔ وغیرہ۔ ۶۷۔ پندرہ روزہ۔ ۶۸۔ تحریک۔ ۶۹۔ ہلت۔ ۷۰۔ اور غریب بکال۔ ۷۱۔ وغیرہ۔ ۷۲۔ ماہ نامے۔ ۷۳۔ حسن و محبت۔ ۷۴۔ اور اسپرٹس ٹوڈے۔ ۷۵۔ وغیرہ۔ ۷۶۔ بنگلورہ روزنامہ۔
 ال کلام۔ ۷۷۔ آزاد۔ ۷۸۔ پاسبان۔ ۷۹۔ آزاد۔ ۸۰۔ وغیرہ۔ ۸۱۔ ہفت روزہ نشین۔ ۸۲۔ کارال۔ ۸۳۔ اور کوثر۔ ۸۴۔ وغیرہ۔ ۸۵۔ اور ماہنامہ سوغات۔ ۸۶۔ حیدر آباد۔ ۸۷۔ روزنامے۔ ۸۸۔ آبشار۔
 و ہلے دکن۔ ۸۹۔ ٹاپ۔ ۹۰۔ انگلے۔ ۹۱۔ شیر دکن۔ ۹۲۔ اور پیغام۔ ۹۳۔ وغیرہ۔ ۹۴۔ ہفت روزہ برگ۔ ۹۵۔ ادارہ۔ ۹۶۔ اور نیا آدم۔ ۹۷۔ وغیرہ۔ ۹۸۔ ماہ نامے۔ ۹۹۔ شب رس۔ ۱۰۰۔ ٹنگوٹ۔
 اندھاپریش۔ ۱۰۱۔ تشر و محبت۔ ۱۰۲۔ آل جی۔ ۱۰۳۔ خاتون دکن۔ ۱۰۴۔ اور سار۔ ۱۰۵۔ (آمر)۔ ۱۰۶۔ وغیرہ۔ ۱۰۷۔ ہجریال۔ ۱۰۸۔ روزنامے۔ ۱۰۹۔ مہر وطن۔ ۱۱۰۔ ندیم۔ ۱۱۱۔ انگلے۔ ۱۱۲۔ اور آل حمراء۔
 ماہ نامے۔ ۱۱۳۔ اور تشکیل۔ ۱۱۴۔ وغیرہ۔ ۱۱۵۔ ہفت روزہ شمس و سنگ۔ ۱۱۶۔ اور ایاز۔ ۱۱۷۔ وغیرہ۔ ۱۱۸۔ جیسی۔ ۱۱۹۔ روزنامے۔ ۱۲۰۔ انقلاب۔ ۱۲۱۔ اور ڈاکٹر۔ ۱۲۲۔ آج۔ ۱۲۳۔ ہندستان۔
 اور دیو پور۔ ۱۲۴۔ جہوریت۔ ۱۲۵۔ وغیرہ۔ ۱۲۶۔ ہفت روزہ۔ ۱۲۷۔ غنڈلیب۔ ۱۲۸۔ بلتیر۔ ۱۲۹۔ سنیز۔ ۱۳۰۔ اور ریاب۔ ۱۳۱۔ وغیرہ۔ ۱۳۲۔ پندرہ روزہ۔ ۱۳۳۔ کادران جات۔ ۱۳۴۔ مسلمان۔
 شمعیت۔ ۱۳۵۔ ٹیکسٹ۔ ۱۳۶۔ اور نواز۔ ۱۳۷۔ اور کیشان۔ ۱۳۸۔ وغیرہ۔ ۱۳۹۔ ماہ نامے۔ ۱۴۰۔ ابلاغ۔ ۱۴۱۔ فلم سنار۔ ۱۴۲۔ تفر۔ ۱۴۳۔ صحیح امید۔ ۱۴۴۔ محاسن۔ ۱۴۵۔ شب رنگ۔ ۱۴۶۔ آب و ہوا۔
 اندیشہ۔ ۱۴۷۔ اور بکین۔ ۱۴۸۔ وغیرہ۔ ۱۴۹۔ اور سہ ماہی۔ ۱۵۰۔ ادب۔ ۱۵۱۔ پناہ۔ ۱۵۲۔ روزنامے۔ ۱۵۳۔ فدا۔ ۱۵۴۔ نسیم۔ ۱۵۵۔ ساقی۔ ۱۵۶۔ صداقت۔ ۱۵۷۔ پیغام ہند۔ ۱۵۸۔ اور۔
 راہ رو۔ ۱۵۹۔ وغیرہ۔ ۱۶۰۔ ہفت روزہ۔ ۱۶۱۔ ندیشی۔ ۱۶۲۔ آدرش (گی)۔ ۱۶۳۔ آواز۔ ۱۶۴۔ ہمارو۔ ۱۶۵۔ امر و ہند۔ ۱۶۶۔ شعل۔ ۱۶۷۔ عظیم ایکسپریس۔ ۱۶۸۔ سورج (گی)۔ ۱۶۹۔ وغیرہ۔
 ماہ نامے۔ ۱۷۰۔ صحیح نو۔ ۱۷۱۔ سہیل (گی)۔ ۱۷۲۔ مسرت۔ ۱۷۳۔ زیور۔ ۱۷۴۔ اورال مجیب (پلمادی)۔ ۱۷۵۔ وغیرہ۔ ۱۷۶۔ اتر پریش۔ ۱۷۷۔ روزنامے۔ ۱۷۸۔ نوی آزاد (لکھنؤ)۔ ۱۷۹۔ پیغام۔
 (کان پور)۔ ۱۸۰۔ نوی جنگ (رام پور)۔ ۱۸۱۔ سیاست جدید (کان پور)۔ ۱۸۲۔ آزاد (بنارس)۔ ۱۸۳۔ وحدت (مراد آباد)۔ ۱۸۴۔ ناظم (رام پور)۔ ۱۸۵۔ اور صحیح دشت (رام پور)۔
 وغیرہ۔ ۱۸۶۔ زہ اخبار۔ ۱۸۷۔ ندین (بخنور)۔ ۱۸۸۔ جو ۱۹۱۷ء سے جاری تھا اب بند ہو چکا ہے)۔ ۱۸۹۔ ہفت روزہ۔ ۱۹۰۔ حق عالم (مراد آباد)۔ ۱۹۱۔ تہان آل قرآن۔
 (بدایین)۔ ۱۹۲۔ انصاری دنیا (مراد آباد)۔ ۱۹۳۔ صدق جدید (لکھنؤ)۔ ۱۹۴۔ حنیف (لکھنؤ)۔ ۱۹۵۔ اور بکینہ۔ ۱۹۶۔ لکھنؤ۔ ۱۹۷۔ وغیرہ۔ ۱۹۸۔ ماہ نامے۔ ۱۹۹۔ ال اعظم (لکھنؤ)۔
 ثمارت (اعظم)۔ ۲۰۰۔ نیا دور (لکھنؤ)۔ ۲۰۱۔ کتاب (لکھنؤ)۔ ۲۰۲۔ شہب خان (ال آباد)۔ ۲۰۳۔ تمل (دیر بند)۔ ۲۰۴۔ زندگی (رام پور)۔ ۲۰۵۔ آل حسنا (رام پور)۔
 دار علم (دیر بند)۔ ۲۰۶۔ آل قرآن (لکھنؤ)۔ ۲۰۷۔ انوار اسلام (بنارس)۔ ۲۰۸۔ شامہ (بنارس)۔ ۲۰۹۔ سکینا (لکھنؤ)۔ ۲۱۰۔ نور (رام پور)۔ ۲۱۱۔ مانی (لکھنؤ)۔ ۲۱۲۔ حیم (لکھنؤ)۔
 روضا (لکھنؤ)۔ ۲۱۳۔ لکھت (ال آباد)۔ ۲۱۴۔ تاریخی دنیا (ال آباد)۔ ۲۱۵۔ روحان دنیا (ال آباد)۔ ۲۱۶۔ فلسفی دنیا (ال آباد)۔ ۲۱۷۔ اور جاسوسی دنیا (ال آباد)۔ ۲۱۸۔ وغیرہ۔

ایک خبر

”تھاڑا ہے، کھیتی کم ہوئی ہے، عرصہ ہوئی کہ شہر میں غلہ بہت گراں ہو گیا۔ تیرہ سیر
 عجبوں، بارہ سیر چاول، اکارہ بڑی خسارے سے ایک روپے کو میسر آتے ہیں۔

لکھنؤ کی ایک خبر۔

اخبار جام ہمال تہا اردو محمد کلکتہ، یکم فروری ۱۹۲۱ء

نیک آرزوئیں اور شبہ کا منہ تیں

لہندستانی مسلمانانہ تمبیر
پر طہنے والوں کے لئے

گھڑی

کے قلم ساز

راہیل

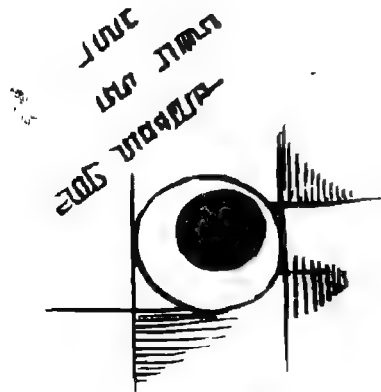
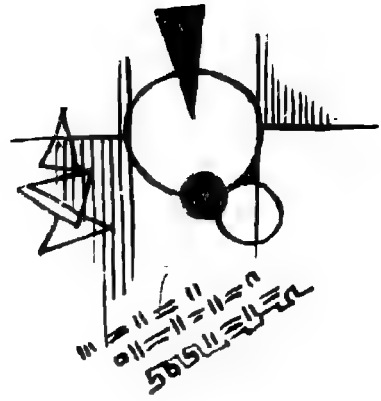
کے جانب سے

بھکے انڈس پرائمریز، رنجیتہ اسٹوڈیوز، داد رعبیہ 14

یادیں

وہ صدائیں

خاص خاص



اگر تم چاہتے ہو کہ مرنے کے بعد زندہ رہو
تو کوئی ایسی چیز لکھو
جو قابلِ مطالعہ ہو۔
یا کوئی ایسا کام انجام دو
جو لکھنے کے لائق ہو !

قلم رائٹرز ایسوسی ایشن بمبئی
کے جانب سے

اور
سليم جاوید

گنگے

ہندوستانی مسلمان نمبر
کے اشاعت پر

مبارکباد پیش کرتے ہیں

کے متعلق ہو لیکن اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا، تمدن کے اعتبار سے پردہ اچھلت یا پڑا، یا جس طرح بعض لوگ مذہبی مسائل کا مفہوم لیتے ہیں ان کے اجتہاد کے بالکل مطابق ہے یا نہیں، ایک بحث طلب بات ہو سکتی ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ ہماری عورتوں کو صحت اور ان کے جسم پر پردہ کا بڑا اثر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

سامنے رکھنی بات دوسری بات سے زیادہ روشن ہے تو یہ ہے کہ انسانی جسم کو پاک ہوا اور مفید ورزش کی ضرورت ہے، اگر پردہ کا موجودہ طریقہ قائم رکھا جائے تو یہ ضرورتیں کس طرح پوری ہو سکتی ہیں؟ ہماری عورتوں کو کیوں کر اور کہاں سے مفید ورزش عیساً کر سکتے ہیں؟ اس سے ہماری عورتوں کے جسموں پر پاک ہوا اور ورزش کے نہ میر کرنے کا خیال کرو، ان کے جسم اور قوموں کی عورتوں کے جسم سے مقابلہ کرو۔ جو پردے کے دباؤ سے آزاد ہو کر کھیلے میلانوں میں جاتی اور گزاریں، پھرتی ہیں، اور اپنے جسم کے مختلف حصوں کو ورزش کرتی ہیں۔ ہماری عورتوں کی صحت کا دوسری قوم کی عورتوں کی صحت سے مقابلہ کرو۔ اعداد کو دیکھو اور ہماری عورتوں کی بڑی تعداد کو دیکھو جو ناپاک ہوا اور ورزش نہ ملنے کی وجہ سے دق کے مرض میں مر جاتی ہیں۔

حضرات! ہم بھی تندرست، مضبوط اور توانا عورتوں کی امید نہیں کر سکتے جب تک ہم ان کو اسی طرح قیدیں بند رکھیں گے جس طرح ہم نے سلا سال سے کر رکھا ہے اور مضبوط، تندرست اور توانا بچوں کی امید نہیں کر سکتے جب تک ہماری عورتیں کمزور، بیمار اور نحیف جسم کی رہیں گی۔“
خطبہ صدارت: محمد علی ایجوکیشنل کانفرنس ممبئی بدیع الدین طیب جی

عورت اور مرد سے قوم بنتی ہے

’پیارے بیٹو!‘

ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ پتے نہیں ادا اپنے عقیدوں پر مضبوط و استوار۔ وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو کبھی بھی کسی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا ہو وفادار نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے باہن اتحاد و اتفاق پیدا کریں، تجربے سے ہمیں سکھا دیا ہے کہ ہمارے اس ملک میں جو مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں ان میں اتحاد و اتفاق کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد و اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آباد نہیں کر سکتے اور نہ پرامن و باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں تاریخ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے تھے لیکن جس وقت برطانوی تجارتی ہندوستان نے اپنی تجارتی پیم برائے اس وقت انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ان کی کامیابی کا انحصار ہماری بھوٹ اور تفریق پر ہے۔ چنانچہ جس وقت سے برطانوی حکومت یہاں قائم ہوئی ہے ہماری قوم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کے سمندر میں غرق ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو دوسروں نے ہمارے لئے ہتھیائی کی ہیں اور ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلے میں ہری عادات کو سیکھی ہیں، تجربہ ہے کہ ہم خداوندی قوانین اور اپنے ملکی مطالبات سے بہت جلد لاپرواہ ہو گئے۔ خدائے قادر و توانا جسے زندہ رکھنا چاہیے اُسے خواہ گنتا ہی زہر دیا جائے لیکن وہ مر نہیں سکتا۔ جس روز گورنمنٹ نے ہندوستان کو رولٹ ایکٹ، پنجاب کی فوجی ریزرگ اور خلافت کی تقسیم کا تجربہ کر کے دیا تھا وہی دن بیداری اور ہندوستان کی بحالی کا تھا ہندوستان کو یہ معلوم ہو گیا اس کا علاج طرہ ہندو برطانوی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے بلکہ خود اس کے پاس ہے احباب! ہم خود ہی جدوجہد کر کے اس کی کوششیں کر رہے ہیں جن مختلف امرائے کا ہم شکار ہو رہے ہیں آپ اپنے کو نجات دلائیں۔

بھنو! خداوندی قانونی مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں قومیں مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں ان سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہندوستان کی یہ انتہائی بد نصیبی کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زیادہ عادی ہو گئیں ہیں اور انھوں نے اپنے آپ کو کس طرح الوطنی کے فرائض سے علیحدہ کر لیا ہے۔ زمانہ موجود کے تاریخ پڑھنے والے کو اس بارے میں بہت زیادہ شک و شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خود جہیں، ہانڈی، رانی، لکھنؤ، بانی آت جھانسی، زیب النساء، اہلیا بائی، پاربتی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں لیکن خداوند عالم کا ہزار ہا دھوکا احباب

تزکیہ نفس اور ذہنی سکون کے لئے
ذہنی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے

فضل بک ڈپو

قبرستان مجید اور ہما اقسام کی دینی کتبیں

یہاں دست یاب ہیں

نزد تاج کمپنی، سندربلڈنگ، 30 محمد علی روڈ، بمبئی۔ 400003

اعادہ شباب

اگر آپ شایعہ سی جوائی کی تجدید کی دلی
خواہش رکھتے ہیں تو آج ہی مردوں اور عورتوں
کے پوشیدہ امراض کے خصوصی ماہر

حکیم ڈاکٹر اے اے دہلوی

(اسے مشورہ کعدیہ)

خواتین کے لئے نرس کا انتظام ہے

۹ صبح ۷ ادھر { خواتین
۴ شام ۷ ادھر { خواتین
321363

پارسہ ہیلتھ کلینک

38 محمد علی روڈ، بالمقابل مینا مسجد، بمبئی۔ 3

اعلان ملکیت و تفصیلات

ماہ نامہ گلن بمبئی

مقام اشاعت : 5 دان غلور، سوب پبلش،
132- کا بے کرا سٹریٹ، بمبئی 3،

وقفہ اشاعت : ماہ نامہ

پرنٹر : شمس کنول

پبلشر : قومیت : ہندوستانی

پتا : 5 دان غلور، سوب پبلش،

اڈیٹر : 132- کا بے کرا سٹریٹ، بمبئی 3

میں شمس کنول اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ میرے
علم و آگاہی کے مطابق مندرجہ بالا تفصیلات سچی ہیں

دست خط پبلشر

شمس کنول

5 دین مارچ 1975ء

کہ اس نسل میں مسٹر قائد محی، مسٹر مروتی، رائیٹر، الیسیا یا، سر لادلو، جیروہانی، بیگم محمد علی، بیگم انصاری، بیگم خواجہ، بیگم حسرت موہانی، بیگم کپلوہم ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی ہمت و جذبات حب الوطنی اور عزم و استقلال میں شہرہ آفاق ہیں اور جنہوں نے سچائی اور ملک کے لئے حیرت انگیز قربانیاں کی ہیں اور مجھے اس کا پورا اطمینان ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈران کے ساتھ ان خواتین کا نام لکھنا نہ بھولے گا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

بسیاری ہنسوا ہوتا ہے درمیان میں سیتا اور زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا آتشہیر کردے گئے ہیں یا قید خانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ تمہارے درمیان میں حضرت بی بی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور کنکا کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے پیاسے بچوں نے اپنے گود میں اور ملک کی قربان گاہ پر خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اے گودالیشروں کی حیثیت سے بھرتی کرانے کے متعلق میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب اس کا وقت آگیا ہے کہ وہ ہر مرد اور عورت جس میں ذرہ برابر ایمان اور خودداری ہے اسے اپنے آپ کو جلونہ تعالیٰ کی فوج کا سپاہی سمجھنا چاہئے، ہم ہندوستانیوں میں کا ہر مرد اور عورت والیشر ہے خواہ مصلحت اور یقین کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے تم معاہدہ پر دستخط نہ کر سکو۔

میں ہم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے سوائے سے نہ ڈرو لیکن اسی کے ساتھ اپنے کسی وقتی خیال سے مرعوب بھی نہ ہونے دو، ہمارے ملک کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہے اور اسی کے ساتھ ہمارا فرض ہو کہ کچھ کم نازک نہیں ہے قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ لیکن اسی کے ساتھ اپنی مذہبی اور سوشل زندگیوں کو ازمداد لین کو بھی فراموش نہ کرو میں تمہیں نصیحت کر رہی کہ جذبات کو مشعل کر کے اپنی گرفتاری کا سبب پیدا نہ کرو لیکن اسی کے ساتھ جب وہ شیش آئے تو بھی گھومیں نہیں، وہ تمہاری جزوت اور بے خوفی کے ایک ذریعہ تھے کہ طور پر وقوع میں آئے گی جیسے قرآن پاک اور شاہ ستر کے احکامات کا یا جند رہنا بنا ہے۔ یاد رکھو جب ہمارے کل "مرد" خاٹوں میں چلے جائیں گے تو اس ذات آزادی کے پھر بڑے کوڑتے ہوئے دیکھ لو گے۔"

حد خطہ صدارت آل انڈیا لیڈر کانفرنس احمد آباد ۲۳ دسمبر ۱۹۳۱ء

لی آماں

پستی کا سبب ملاگری

"ساں سے ہم بلغاریہ کے مفتی صاحب سے ملنے کے لئے اسلامی مذہبی حلالہ میں گئے اور میں پہلے ہی دفتر برادر ملا گیا مفتی صاحب جو ایک بزرگ صورت شخص ہیں سبز لباس میں بیٹھے ہوئے تھے، سر پر تک ٹوپی اور ڈھانپنا تھا، ان کے اسسٹنٹ (نائب) پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، دوسرے دفتر دار بھی داخل بائیں تھے، گفتگو قدرتی طور پر اسلامی دنیا کی موجودہ سیست حالی پر ہوئی، میں نے آخر میں پوچھا کہ "جناب اب کیا کرنا چاہتے؟" بلغاریہ کے مفتی اور دوسرے با اثر بزرگ نے جواب دیا: "سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ پوشیدہ اسلامی طریقہ تعلیم میں جو تمام دنیا میں رائج ہے اذعانہ طور پر نمایاں اصلاح کی جائے، ایشیا، یورپ، افریقہ کی پرانی مذہبی درسگاہیں جہاں علم کو ملا گری کے علاوہ اور کسی کام کا نہیں رکھتیں (اور یہ امر اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے) دنیا میں ہمارے ادا بار اور پستی کا سب سے بڑا سبب ہے، مولوی جس کو اسلام کا ایک باکار ممبر ہونا چاہئے نہ کہ خوشامد سے اپنے حلوے مانڈے کا خیال رکھنے والا ہو۔"

بلغاریہ میں اسلام ۲۲ جون ۱۹۱۳ء

عبدالرحمان بجنوری

جھوٹا، مکار، بے ہودہ ہندی مسلمان

"دہاں جو ہندوستانی اہل سنت و جماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں، ایک بدعتی دوسرے دہاوی، جو بدعتی ہیں وہ دہاویوں کو کافر کہتے ہیں جو دہاوی ہیں وہ بدعتیوں کو برا کہتے ہیں جب بدعتیوں کا وارجل جاتے ہے دہاویوں کو نکلا دیتے ہیں جب دہاوی غالب ہوتے ہیں تو بدعتی چپ ہو جاتے ہیں ران دہاوی بدعتیوں کا وارجل رہا ہے خود شریعت مکر صاحب کو نوگ دہاوی کہتے ہیں مگر یہ سب جھگڑا بدعتی دہاوی کا ہندی صاحبوں ہی

ہیں ہے اور ایسے ایسے فسادات سے ہندی لوگ مکر مخطرہ اور دینہ منورہ میں نہایت ذلیل ہیں کہ عرب والوں نے ہندیوں کو ہندی لبطال کا خطاب دے رکھا ہے اور ذلیل ہونے کی بات بھگت ہے کہ دونوں طرف مولانا صاحب ہی مولانا صاحب ہی گرو ایک، دوسرے کو کافر کہتے ہیں اور ہر وقت اسی ککر میں دہتے ہیں کہ جس طرح ہوسکے دوسرے کو نکلوادیں۔“

حافظ محمد

رسالہ تہذیب الاخلاق، یکم رمضان ۱۳۹۱ھ

مسلمانوں کے دشمن مولوی ملا!

”یعنی خود تو دنیا کے بندے ہی اور کسی مرید یا معتقد کی تذرت تک نہیں چھوڑتے مگر زبان سے دنیا کی بے ثباتی اور ہیچ ہونا کہتے ہیں اپنی جیب میں دنیا بھرتے ہیں اور دوسروں کو اس کے چھوڑنے کی نصیحت کرتے ہیں، جو کام مسلمانوں کی بھلائی و بہتری اور ترقی کا سوچا جاتا ہے یا کیا جاتا ہے یہ عقل کے دشمن، رسول کے دشمن مسلمانوں کے دشمن ایک نہایت مسکین سی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں۔“ ہاں دنیا چند روز ہے۔ دولت مند بھٹے تو کیا، مغرب ہوئے تو کیا، محل میں بھی گزر جاتی ہے درخت کے سائے میں بھی گزر جاتی ہے، موسم کے پھل سے بھی ہدی ڈھک جاتا ہے، ہمیں بھی پھٹ جاتا ہے۔ اچھا کھانے سے بھی پیٹ بھر جاتا ہے اور مٹا کھانے سے بھی بھر تلے۔ ایسی بات کر دو جو ہاں کام آئے، دنیا تو گزری جاتی ہے ہاں جتنی دنیا ہوگی اتنا ہی حساب دینا ہوگا۔ تقدیر پر پٹا کر دو۔ انسان کو خدا بھوکا اٹھا تلے پر پھر کا سلاتا نہیں، یہ لوگ حقیقت میں اس آیت کے مصداق ہیں اور وہ ٹھیک ٹھیک دی وعدہ کرتے ہیں جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔“

سید احمد خان

رسالہ تہذیب الاخلاق، ۵ ایشوال ۱۳۹۱ھ

کھانے فرعونی طریقہ مسنونہ

’باتھ سے کھانا سنت موکرہ نہیں ہے جس کے ترک میں گناہ ہو۔ آپ ہزاروں کام سنت موکرہ کے خلاف کرتے ہیں اور کچھ خیال بھی نہیں کرتے مگر باتھ سے کھانے کی سنت آپ کو یاد ہے۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں چائیں چائیں، مغزنگ جھوڑا، ادنیائی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا جو کے بغیر چھپے آئے کی روٹی تو اکثر نوش فرماتے تھے مگر آپ روزمرہ فورسادر پلاؤ اور تین بریائی سڑک فری وغیرہ میں سے مرغ کھانے نوش فرماتے ہیں۔ کبھی مسنونہ کھانا کھانے کا خیال نہیں آتا مگر کھانے کے مسنونہ طریقے پر بحث ہوئی ہے اور دی ٹھیک مثل آپ پر صادق آتی ہے جو حاسی اسلام سید احمد خان نے لکھی ہے کہ کھانے فرعونی اور طریقہ مسنونہ۔ ایک طرف دس انگریز اور ایک طرف دس مسلمان اور ایک طرف دس ہندو کھانا کھانے بٹھا دو کہ اپنے اپنے طریقے پر کھا دیں اور کھائے دل میں جو باتیں سمائی ہوئی ہیں ان کو تھوڑی دیر کے واسطے عیدہ طاق میں رکھ دو اور سو روٹی کی آکھ سے بلا تھوب دیکھو کہ تینوں تو بڑوں میں سے کس کے طریقے میں نفاست اور صفائی ہے۔“

میرے تین دوست ایک انگریز کے ہاں بہان ہوئے۔ ان میں سے ایک سرگٹھ ہوئے مولوی صاحب بھی تھے۔ انگریز اپنی میز کرسی پر یہ تینوں اس کے سامنے فرش پر بیٹھے اور کھانا کھانا شروع کیا۔ مولوی صاحب کے ہاتھوں پر شور باپنے لگا اور وہ بار بار بچانے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ انگریز پہلے تو ہنسنا آخراں کو اس قدر گھن آئی کہ کھانا چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل گیا۔ جیسا کہ آپ ہندوؤں کو ننگے پید چوکے میں بیٹھا دیکھ کر ان کی طرز خوردش پر حقارت سے ہنستے ہیں ایسا ہی انگریز ہم لوگوں کے کھانے کے طریقے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اس پر ہنستے ہیں اور کھانے والوں کو گنوار کہتے ہیں جب کئی مسلمان باہم کھانا کھانے بیٹھے ہیں تو ان میں سے بعض ایسے چلے پن سے کھاتے ہیں جس کو دیکھ کر نفرت آتی ہے۔ انگلیاں شورب میں بھرتی جاتی ہیں اور دھبے جاتے ہیں۔ پلاؤ میں شوربہ دھتے سے ملاتے ہیں اور اسی ٹھٹھے ہوئے باتھ سے اس کو کھاتے ہیں۔ چاروں انگلیوں سے فرنی کے سڑپے بھرتے ہیں؛

رسالہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، یکم ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ

فاریط اللہ

ضرورت ہے روشن خیال علمائے

ہماری ساری کوشش مذہبی مانتوں پر ضرورت ہوتی ہے بلکہ ہم نے ظاہری یا بیحدیلم مذہب کو مذہب رکھ دیا ہے لیکن کتنا کہ ظاہری یا بیحدیلم مذہب نہیں ہیں اور ہر شخص کو ممانی اللہ کا رجا آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہ مست ہو کر ساری مودظاہری سے آزاد ہو جائے اور مثل رسول شاہین کے چار ابرو کا صفایا کر لے اور دنیا بھر کے منیات اس سے لئے مباح ہوں میرا عرض صرف یہ ہے کہ اس زمانے کے عالم اپنے لئے نیردوسروں کے لئے باطنی خوبیوں پر اس قدر زور لگیوں نہیں دیتے جس قدر کہ وہ ظاہر کے لئے بڑھاتے ہیں۔ یعنی کسی شخص کو گھوٹا بوسے ہوئے، اتوت لیتے ہوئے، مقدمہ بازی سے دوسروں کا حق چھیٹے ہوئے، بے ایمانی سے دوسروں کا مال مارنے ہوئے دیکھ کر اس قدر طیش کیوں نہیں آتا جتنا کہ ایک شخص کی وارٹھی منڈی ہوتی ہیں بڑھی ہوئی، ازار ٹھننے سے نمی دیکھنے سے غصہ آتا ہے۔ ان کے نزدیک ایک مسالیکٹر پولیس حویلی کا گناہ بڑھا ہوا، ماہ صیام میں روزہ رکھتا ہو، بوجہ نماز کچھ دیر وظیفہ پڑھ لیتا ہے یا کمال ہے خواہ وہ کتنا ہی ظالم انسان، اتوت خور بے ایمان کیوں نہ ہو غرض کہ اب ظاہری تہذیب اور پابندیوں کا نام مذہب رکھا گیا ہے اسی لئے لوگوں کے دلوں پر اس کا اثر کچھ نہیں ہوتا لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علم کا معیار قابلیت اب بیشتر سے کچھ بڑھ کر پڑنا چاہئے تاکہ موجودہ زمانے میں وہ با وقعت ہوں۔ اور ان کی تعلیم ہم پر مرہ از پیداکرے اور ان کے ذہن سے مذہب اسلام پھر دنیا میں سرسبز و شاداب اور کامیاب ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہرنانے میں اپنے ہم حصوں کی نظروں میں وقعت حاصل کرنے کے لئے ان سے ان "روں میں گو سبقت لے جانا ضروری ہے جن کا ان میں حرج ہے، اسی بنا پر مصرلوں کی ہڈیاں کے لئے جس حضرت موسیٰ کو بھی لیا تو ان کے ان دونوں سحر و ساحری کا لوگوں میں زیادہ رواج تھا خدا نے حضرت موسیٰ کو یوسفیضا اور لکڑی کو سائب بنائے بنے کا معجزہ عنایت فرمایا اور آنحضرت کے زمانے میں جو مکہ عرب میں، صداحت و بلاغت کی بڑی قدر تھی اس لئے بطور معجزہ کے آنحضرت کو کلام پاک ایسا نصیب دلیغ عطا ہوا کہ آج تک زمانہ عرب میں اس کا مثل نہ ہو سکا ہے ہمارے علمائے مذہب کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے قابل اشخاص ہوں کہ جو علوم مذہبی کے علاوہ آج کے علوم دنیاوی سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں، مہارت روشنی خیال ہوں اور امور محاش و معاد دونوں کی ان میں عقل ہو، یا کیزہ دل اور یا کیزہ خیالات ہوں اور ان کے اعمال و احوال میں اس یا کیزگی کی جھلک ہو صرف اسی قسم کے علماء اس زمانے کے تعلیم یافتہ گروہ میں وقعت و عزت پائیں گے اور وہ عوام و خواص دونوں قسم کے لوگوں میں، احساس و معاذ میں رہائی کر سکیں گے اور وہ لوگ ان کی دل سے وقعت کر سکیں گے اور تقلید کریں گے اور وہ عمدہ رستہ پر چلا دیں گے اور مذہب جیسا کہ اب تک لوگوں کے لئے باعث خیر و برکت رہا ہے آئندہ بھی رہے گا۔

آپ بیٹے

سید الامت حسین

تمہارے یہ مولوی ملّا

یہ کیا مسخر این ہے کہ تم مولوی خدا لے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو دین، ایمان کا جز سمجھتے ہو لیکن ان کی چوبیس گھنٹے کی سپاہیانہ زندگی، ان کی در رقیں کھودتے وقت عملی و مستعدی کو شیر ہادی کی طرح بے ڈکار مضم کر جاتے ہو اور تمہاری شیطانی لغات میں رسول کے ان اقوال کا نشان تک موجود نہیں۔ رسول خدا سے تمہاری چھوٹی محنت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب کوئی شخص تمہیں اس سپاہیانہ زندگی اسی محبت و اخوت اسی حرکت و عمل والی زندگی کی طرف بلاتا ہے تو تمہارا یہ نام رستہ، جسم اور عقلیت نہ انفس پکارا اٹھتے ہیں کہ یہ شخص نبی بننا چاہتا ہے، تمہارے ارادے صاف ہیں تم عمل سے بھاگنا چاہتے ہو، اس عرب کو بدنام کر کے اپنا آرام مانگتے ہو اپنی جندہ خوری کی دوکان کی حفاظت چاہتے ہو اور رسول خدا کے مشکل کاموں سے منہ موڑتے ہو، کیا ایک عمری سے ملا سے تمہاری دوستی اس لئے نہیں ہے کہ ایک مسواک، ایک ڈھیلے اور ڈاڑھی کے بدلے تم کو جنت کا حق دار بنا دیتا ہے، تم سے ڈر کر قرآن کی آیات چھپاتا ہے تمہارے بکھرے کھانپنے والے عیون کی پردہ پوشی کرتا ہے اور زلیوں کی طرح تمہارے حکم کا منہ بنا ہوا ہے۔ وقت بے وقت جیسا ہے نماز پڑھنا دیتا ہے طلاق پڑھنا تو طلاق کا فتویٰ دے دیتا ہے، رجوع چاہو تو رجوع کر دیتا ہے، نکاح کرنا چاہو تو نکاح دیتا ہے، جہاد و قتال کو تمہارے لئے ممنوع قرار دیتا ہے وہ

تہاے مطلب کا اُدی ہے تمہیں اسلام کا کوئی تکلیف وہ حکم نہیں سنا تا جبہاری عقلوں کی تاویلیں کرتا ہے گناہوں کے لیے ڈھونڈتا ہے نہاری چور بازو
کو چھپاتا ہے تاکہ تمہارے محلوں کا آرام اسے ملتا رہے یہ ہے تمہارا اصولانا، مولوی، لیڈر، مرشد، دین کا عالم لیکن جو شخص سرور کائنات کے چوبیس گھنٹے کی
باعمل، بامشقت، سچی اور صالح زندگی کی طرف تمہیں بلائے وہ دہال، وہ کافر اور مدعی نبوت ہے۔
عنایت اللہ مشرق

”قول فیصل“

اہل تشیع اور علی گڑھ کالج

”درستہ العلوم کی حالت عنایت الہی سے اب بہت اچھی ہے۔ روز بروز اس کے چند لڑکے ترقی ہوتی جاتی ہیں۔ اسی طرح اب تک اس کا چہرہ
ایک لاکھ ساٹھ ہزار آٹھ سو ستتر روپے اٹھ آنے ہو چکا ہے۔ نہایت نیک اور عدا پرست ماسٹر عتیق عالم لوگوں نے بھی چندہ دیا ہے اور کئی کی مبری بھی قبول کی
ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے شیخ بھائی بھی اس مدرسہ کا قائم ہونا دل سے چاہتے ہیں۔ ہم کو جناب محمد التھمر سید علی محمد صاحب سے بہت کچھ اس معاملہ میں
امداد کی توقع ہوئی ہے۔ جنوروں علی حاجی حرمین شریفین نواب محمد کلب علی خاں مہار والی رامپور غورندول بدردلر انکلیتہ کمیٹی درستہ العلوم کے سٹین یعنی مری و
سرپرست ہوئے ہیں اور پندرہ ہزار روپے نقد اور بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر وقفی آئی تھیں ہزار روپے کی بطور سرمایہ درستہ محمد فرمائی ہے اور نو ذلش کے اخراجات
جو پانچ ہزار روپے سے کم نہ ہوں گے اپنے ذمہ قبول فرمائے ہیں اور اس عہدہ کی میزان مل پاس ہزار روپے کی ہوئی ہے۔
گورنمنٹ اضلاع شمال و مغرب نے ایک نہایت عمدہ اور وسیع قطعہ زمین، تعدادی لوانے دو سو بیگھ پختہ کے واسطے تعمیر مکان مدرسہ اور باغ متعلق مدرسہ
کے مرحمت فرمایا ہے۔

کئی نے فی الفور باغ کی ورسی کی تہہ پر شروع کا ہیں اور بنظر اہل عنایات امداد کے جو حضور سروریم میور صاحب مہار ایل، ایل، ڈی، کے بی، ایس آئی
نواب ایفٹنٹ گورنر مہار اضلاع شمال و مغرب نے فرمائی ہے، اس باغ کا نام ”دی میور یاد رک“ رکھنا تجویز ہوا ہے۔ اب ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے عرض کرتے
ہیں کہ جو جو لوگ اس خیال سے ہمت ہمارے ہو چکے تھے کہ اتنا بڑا کام ایوں کر انجام ہوگا، ان کو غور کرنا چاہئے کہ یہ کام ہوتا جاتا ہے اب بہت ہارنی نہیں چاہئے اور
مستعد ہو کر اس کام کے انجام میں کوشش کرنی ضرور ہے۔ ”محب مردان، مرد خدا، مشہور مقولہ یہ ہے بہت کرو اور جس قدر مرزا کام اور جس قدر عطاہ مشکل ہو اتنی
ہی زیادہ کوشش کرو خدا سب مشکلوں کا آسان کرے والا ہے۔“

”بھنگلہ نیست کہ آساں نہ شود“

”زبانیہ کہ ہر آساں نہ شود“

رسالہ تہذیب الاخلاق یکم ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ

سید احمد خاں

لائق سید کا نالائق محمود

”آخر میں سید محمود کی یہ حالت ہوئی تھی کہ وہ جو جابہتے سید صاحب کو اس کے کرنے پر مجبور کرتے، چنانچہ ٹریشیوں کی جو گاہیں خالی تھیں، ان کو سید
محمود کے اصرار سے باختیار خود پر کر دیا۔

آخر میں سید صاحب کو اپنی کوٹھی میں رہنے میں اتنی ناگواری پیش آئی کہ انھوں نے بھنگو ملا کر فرمایا کہ ”میرے واسطے پور ڈنگ ہاؤس میں ایک چھوٹا بنگلہ
خالی کرادو“ میں نے کہا بہت اچھا جس بنگلہ میں مولانا حالی آکر مقیم ہوئے تھے وہ بنگلہ خالی ہے اس کو صانت کرادوں گا۔ آپ اس میں تشریف لے آئیے رہتے رہنا۔
۱۲۹۹ میں اس بنگلہ میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر تشریف لے آئے۔

میں نے بیگ صاحب سے کہا کہ سید صاحب بھنگ لگاتے ہیں کہ انھوں نے بیٹے کی تہہ سے ان کو اپنی زندگی میں اپنا جائیداد بھٹیجی

ہنگل کا ہندوستانی مسلمان بنیر

سید محمد احمد کو اس مسئلہ سے سکتہ نہ رہا بلکہ اس قدر حیرت و حیران ہو گیا کہ سید صاحب کو اس پر آمادہ کر کے کہ وہ سید محمد کی جائستنی کو مسخ فرمادیں۔ سید صاحب کو کاما کہنے کے وہ یہ بات لکھ کر دینے کی جس وقت میں سید محمد کو جائستنی کے قابل سمجھتا تھا ان کو اپنا جائستنی کیا بلکہ ان کا دماغ اس قابل نہیں۔ اس لئے یہ کہے دیتا ہوں کہ وہ میرے بعد کاما کرنے کے قابل نہیں ہیں تو جس کو صاحب میرے بعد سکتہ نہ رہا بلکہ اس کے لئے اس کے لئے آج سید صاحب پر سید محمد کی جائستنی کے بارے میں لکھا یا پتا ہے نہ وہ ہو جائے گا اور وہ لکھا کہ اس کے لئے کہ سید محمد نے اس کو اپنی جائستنی کے قابل سمجھا تو اس کو اپنا جائستنی نہیں لکھا۔

میک صاحب نے کہا کہ یہ امر میرے لئے بہت مشکل ہے۔ سید محمد دلی و میری دلالت کی دوستی یا اور وہی لکھ کو یہاں لایا ہے اور میرے میرے ساتھ تھا ہوتا ہے کہ میرے اب میری طرف سے اس کی حرکت ہو نا مانیات۔ صاحب اب اس وجہ سے کہ میں نے کئی شخص لکھا ہوا ہے گا اور کہہ گا کہ سید محمد صاحب، سید صاحب، کجانی کے قابل ہیں۔

متر آخر زما میں سید احمد و سید احمد ان میں متعلق ہے اور ان کو اس بارے میں موت نہیں ہوا اگر ان کو سکون حاصل ہو جاتا تو ضرور ہی کے شوق اس بارے میں کرتے جیسا کہ ظاہر کیا ہے۔ ان دو سید صاحب کا کوئی سکا میں ہے یہ بخیر و بخیر سیکم آ میں اور سید صاحب کو یہ کہہ کر کوئی میری ملکیت ہے سید محمد کی ہے، سید صاحب کو دلپا کوئی یہ لکھیں

سید صاحب میرے روز کو کھلی میں میرے لئے کہ سید صاحب نے میرے لئے لکھا یا اور کہہ دیا پھر روز نکلا ہوا ذکر جانا چاہتا ہوں میرے لئے حکم کا۔ روایت ہو گئی ہے بعض حکم کا کوئی میری وجہ سے حکمت۔ ہو میں یہ کہ کہ ان کی آگ کی وجہ سے اس کے کو خلیف ہو گئی۔ پھر وہی جگہ آگ کے لئے ہائی روڈن گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ کل صبح کو ام کو کہہ لایا جو ان کا اس وقت دعائی کرادینا۔ دوسرے دن میں انتظار کرتا رہا مگر سید صاحب کا کوئی حکم میرے پاس نہیں آیا۔ آخر کار دوسرے دن ہوا تو حاجی اسماعیل خاں صاحب سید صاحب کو انی کو کھلی میں لے گئے میں سید صاحب کو لے کر میرے بہت تکلف ہوئی۔ منشی ناظر خاں اور نجم الدین سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ میرے لئے اس وقت موجود ہے کہ سید صاحب حاجی اسماعیل خاں صاحب کی کو کھلی میں پہنچے، ان کا بیان ہے کہ "جس وقت سید صاحب کو کھلی پر پہنچے تو سید صاحب نے ایک آہ کھینچی اور کہا کہ ہمارے انہوں ہم کو کیا معلوم تھا کہ سید محمد آخر عمر میں ہم کو گھر سے نکال دیا گئے، ہر کیا ہم اس قابل نہ تھے کہ اپنے لئے ایک بھونیر لیتے؟"

میرے دلایت حسین،

سید صاحب کا آخری چندہ

"اس روحانی سرمدنا اثر ہے۔ صاحب یہ ایسا واکر حاجی اسماعیل صاحب کی کو کھلی میں بندوں رہے یا نہ تھے کہ ان کا پناہ بند ہو گیا اور میری صدمہ ان کا مرض الموت ثابت ہوا۔ ۱۰ مارچ ۱۹۵۷ء کی شب میں کیا رہا۔ کے قریب جیل میں ایک کتاب ترجمہ علم الحساب جسے اول کے اختیارات کے سلسلہ لکھ رہا تھا سید صاحب کی کو کھلی کا جو کراہا اور کہا کہ اس کو سرکار نے یاد کیا ہے، میں نے کہا کہ جیوئے سرکار نے یاد کیا ہے یا جیوئے سرکار نے۔ اس نے کہا کہ بڑے سرکار کا (استقال) کر گئے میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کب قال کر گئے تو اس نے کہا تو مجھے کے قریب، تم کو بلائے کہ لئے اسرا لے کر چلا آئی کو بھیجا تھا جب تم نہ پہنچے تو اب مجھ کو بھیجا ہے۔ میں نور کو کھلی پہنچا، عجب سماں دیکھا وہ شخص جس کا احترام چند گھنٹے پہلے بڑے سے بڑا آدمی کرتا تھا اب وہ ایک قودہ خاک بنا ہوا ہے اور اس پر ایک چادر چڑھی ہوئی ہے اور پورے دن کا حافظ بننا ہوا کلام مجید پڑھ رہا ہے پس ماندہ لوگوں میں اس بات پر بحث ہے کہ کافلات اور الماریوں کی کنیاں اس کے پاس رہیں، حاجی اسماعیل خاں کہتے تھے کہ یہ قوم کی ملکیت ہے۔ ہاں یا میں میں اور سید محمد احمد (سید کے بھتیجے) کہتے تھے کہ ہاں یا میں میں چاہیں۔ آخر کار یہ تصفیہ ہوا کہ نہ ہاں یا میں میں نہ تھا ہاں یا میں بلکہ سید صاحب کے سپرد کر دی جاویں۔ سید صاحب اور بیٹنگ صاحب دہان ہو تھے اور چھوٹے صندوق میں اپنی گاڑی میں رکھا کرتے تھے اور الماریوں کو مقل نہ کہ ان کی کنیاں اپنی میں رکھ لیں تھیں۔ بعد ازاں بیٹنگ صاحب مجھے اپنے ہمراہ لے کر کالج میں آئے اور دکنور یہ گیت کے سامنے کے حصہ باغ میں سید صاحب کے مقبرہ کی طرف چلے گئے، اس کو کہہ کر صبح میں سید صاحب کی تیر لکھ دینا۔ سید صاحب اس باغ میں دفن ہوں گے اور ان کا مقبرہ کو ٹوٹ

ہنگن کا ہندستانی مسلمان ہو۔

کی کوشش نہ کریں، لیکن اگر فیصلہ موافق نہ ہو تو ہم دھماکوں (Blasts) کی خواہش کریں گے وہ شرط پوری نہیں ہوئی، جب ایک سال کے اندر خلاف ورزیوں کا سلسلہ بظاہر کم ہونے لگے، تو یہ ہے کہ ہم ایسے قیود کے مطابق آج ایک سال کے بعد یہ نہ کہہ دیں کہ سوراخ کے معنی کا مل آزادی اور کمیٹیٹ انڈینڈنس (Complete Independence) کے ہیں۔

میں ہاتھ دے کر فرمایا اب وہ سب کچھ خاصیت اور عجیب ہے۔ سب کو حل کر سکیں گے۔ اس لیے میں جلدی نہ کرنا چاہئے اس کے دو جواب ہیں پہلا جواب یہ تھا کہ خود اجماع ایک ہی سزا دی ہے۔ نذر کی تھی اور یہاں کیا تھا کہ ہم سوراخ اسی سال میں لیں گے۔ یہاں جیتے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ سب میں اسید لے کر اب و عتیق و یسیر دے دیں۔ اب ہوشا و فکا کہ تم احمدی! اس لئے جاتے ہیں کہ زہر راجا کریم بنی! آرمی کا اعلان کر دیں گے۔

اگر آپ اس وقت آزادانہ طور پر اسلام قبول کر لیتے ہیں تو آپ کو یہ ضرور کیجیے کہ اپنے نسب العین کو تصاف کر دیجئے اور کہہ دیجئے کہ اگر اس وقت ہم اپنے آزادانہ طور پر اسلام قبول کر لیتے ہیں تو ہم اپنے نسب العین کو تصاف کر لیں گے۔

میں نے یہ کام دیتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اس کے لئے راضی ہے تو میں اس کا فیصلہ بھی کر سکتا ہوں۔ اس کی وجہ میں بیان کروں گا پہنچایا کہ فیصلہ کیوں نہیں کیا گیا۔ انکار ہی تھا، یہ ہیں ڈائراور اوڈامائی ترقی سمجھ کر دی جائے اور وہ اپنے لئے پریشیاں ہوں تو میں سمجھوں گا کہ خراب کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن میں کہوں گا کہ ہم کو ملنے والی آزادی حاصل نہ ہوگی۔ اسی وقت جو کجا ب و اقعات پتیارے کے دوبارہ رونما ہونے کا موقع یا امکان نہ ہے جس وقت

تک ہم کو کامل آزادی حاصل نہ ہوگی اس وقت تک جو کہ ڈائراڈ وائر نے کیا ہے اُن کے دوسرے نفعی بھی کر سکتے ہیں اور جن کو مثال آ رہا دیکھتے ہیں کہ موہن لاگوں میر کہ اکی ظلم ہو رہا ہے اس دفعہ جو حکومت کی جارہا ہے ایک غلط قسمی پھیلا کر یہ کہا جارہا تھا جب وہاں ممکن ہے تو ہندوستان میں سی لارج ہو سکتا ہے بھلا کافر مسلم یہ نہ کہ اس کا اعتراف جاتا رہے اور اس قسم کے واقعات پھر نہ ہو سکیں اور یہ جیسا ہی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان

کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک آزاد قوم کو اپنی ذات کی تمام اہمیتوں اور خصوصیات کا مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے۔ بعض اوقات کینیڈین نام ان ملکات گورنمنٹ (Canadian form of self government) کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ لیکن کینیڈا آزاد ہے اور اس کی آزادی کی وجہ سے جس طرح انگریزوں نے ان مقبوضات سے مصالحت کی کوشش کی ہے جہاں تک میں نے سونے کا ہے، وہ سنسلا کے لئے کینیڈا کی قسم کی آزادی اور یکپارگی (Complete Independence) کی چیز زیادہ فرق نہ ہو گا۔

یہ کہ جن ملکوں کو انھوں نے اپنی سرحدوں سے باہر سے فائدہ پہنچا دیا ہے وہ ملکوں کے لئے ایک نیا دور ہے۔ دوسری قومیں ان ملکوں کو اپنی سرحدوں سے باہر سے فائدہ پہنچا دیا ہے۔

ہیں ہندوستان، اسی مفروضہ بات، زندگی، کھلے دوسرے کا محتاج نہیں اور اس کے لئے اس کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کا ماتحت رہے۔ کسی کا یہ سمجھ لینا کہ اگر لوگ ہندوستان کو اس میں کی سیف اور گمنام دے دیں گے۔ یہ مشکل ہے، یہ کیا خیال ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب میں نے یہ ثابت کر دیا کہ گنیش دین فارم آؤ گورنمنٹ کا ملین مشکل ہے جب انگریز وہ سچا خوشی سے رہیں گے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے مقصد کو اعلیٰ درجے پر نہ رکھیں اور

کیوں نہ کہیں کہ ہم اس آزادی کے دریغ بھی حضراتِ مسئلہ خلافت کے متعلق آپ کو معلوم ہے؟ سوراخ کا مسئلہ مسلمانوں نے دو حدیث سے قبول کیا ہے ایک تو عام شہرستانی حیثیت سے اور دوسرے اسلامی حیثیت سے جو مسئلہ خلافت کے متعلق ہے صرف ہندوستان کے لئے کنیڈین فارم آف سلف گورنمنٹ بھی مفید ہو سکتی ہے مگر خلافت سے متعلق سوراخ کے ایک مفہم ہو سکتے ہیں یعنی یورپی اور کامل آزادی خلافت کا تحفظ اس وقت تک نہیں

ہو سکتا جب تک انگریزوں کی شہنشاہی قوت کو شکست نہ ہو جب تک ایسا نہ ہو گا انگریزوں کے قدم عرب اور جزیرۃ العرب کی سرزمین پر نہ پڑیں گے اور تمام دنیا ان کے ہاتھ سے پاکہ ہو سکے گی۔ اس لئے سرسبز خلافت کے متعلق دراج کے صرف ایک معنی ہو سکتے ہیں یعنی کیپٹن انڈیائی تیلر۔ کیپٹن فارم آف سیلف گورنمنٹ سے سرِ خلافت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے خلاف ہو گا کیوں کہ اس سے امپیرل

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان سمیر

کہہ دے گی جب تک ہندوستان کا مکمل طور پر آزاد نہ ہو گا مہاتما گاندھی جی کا یہ دعویٰ کہ ہم پنجاب اور خلافت کے مسائل حل کریں گے بہرگز برآمد ہو سکے گا جہاں تک میرے مسلمان بھائیوں کا حق ہے اُن کا بیشتر قسمہ سوراخ یعنی کامل ارادی کے معنی سمجھنا آگیا ہے کل رکنوں خلافت کا تھوڑے میں اتفاق سے وہ مسئلہ پیش نہ ہو سکا لیکن اس وقت اور انھیں حاضرین کا جو جلسہ عام ہوا اُس میں مسلمانوں نے مالا اتفاق یہ پائے کہ گویا کہ سورتی کے معنی داخل ارادی کے ہیں۔ اگر آپ کو یہ سب مایوس منظور ہیں اور آپ کے بڑے بڑے رہنما جو بیل خانہ میں چلے گئے ان کا یہ کہنا کہ قائم رکھنا ہے تو اس ریفرنڈم کو با اتفاق منظور فرمائیے جس وقت ہندو متی لال بہرودھت میں دیکھ گئے۔ انھوں نے کہا ہم اس عدالت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور یہی دیکھ کر ہم اس عدالت کو تسلیم نہیں کرتے انھوں نے کہا ہم اس حکومت کو تسلیم نہیں کرتے جس وقت میں بڑوں پر مقدمہ کرنا جی میں خود مانتھا انھوں نے بھی کہا کہ ہم اس عدالت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ شوکت علی نے علی الاعلان کہہ دیا اس وقت کو ہمارا فرض ہو جائے گا کہ ہم ہندوستان ری پبلک (Indian Republic) اعلان کریں انفرادی طور پر ہریک نے کہہ دیا ہم آزاد ہیں جسے لوگ یہاں موجود ہیں اگر کیسے کیسے اور فرد افراد ان کے لئے جو بھی جائے تو ہریک ان میں سے ہی لیتا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ ہریک کو جب یہ کہ ہم جمعی طور پر بھی کہہ دیں کہ ہم آزاد ہیں۔ آج کی تاریخ سے ہم آزاد ہیں اور پورے طور سے آزاد ہیں۔ ہریک ان میں سے ہی لیتا ہے کہ ہم کو خوب یاد ہے کہ ارادی ہمارا یہ انشی حق ہے اور ہمارا فرض ہے کہ آزادی لے کر ہیں۔ میں آخر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ کسی کی شخصیت سے اثر پذیر نہ ہوں۔ مہاتما گاندھی کی اپیل کا آپ پر ضرور اثر ہو گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ خود دیکھتے تو ہم لیں گے تو اپنی ذات رائے یہ مہاتما گاندھی جی کی اپیل کہ بھی میرے ہندوستان سے ہے۔

آئیڈیا کانفرنس انجمن اہل ہندوستان

حسرت موہانی

انگریزوں کا مچ جانی پن

”اندر اہل گوروں سرت ہندوؤں کے ساتھ تھی۔ کیا جاتا تھا کہ ہم تمہیں مسلمانوں سے کہیں تھے ہیں؟ اس کے بعد۔ لہاؤں کو روکنا بتایا اور کہا کہ ”تمہیں ہندوؤں سے محفوظ رکھتے ہیں“ جب ہندوؤں اس چال کو سمجھ گئے۔ تو کچھوں میں جاہلی ماس کے بغیر اب نیال سے دوڑا کی ہے کبھی اس نے تعلیم یافتہ آدمیوں کی دوستی نہیں اختیار کی۔ جب ہندو جاہل تھے تو وہ دوست تھے جب مسلمان جاہل تھے تو وہ دوست تھے۔ اب گورکھوں کی باری ہے۔“

مولانا محمد علی

گاندھی جی کا اثر

”مجھے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آپ نے مجھ پر کس قدر گہرا اثر ڈالا ہے۔ غالباً میں نے ایک مرتبہ آپ سے کہا بھی تھا کہ میں میری ہی نادبی سے قبل ہی عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی اور یہ ہندوستان میں ایک غیر معمولی بات ہے لیکن ہمارے متاثرین زندگی کے بعد ہم ایک اور راستہ سے ہمارے ہمارے اس جہان نے میری اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لئے محبوب اور عزیز تر بن دیا۔ زندگی بھر اس کا اور گزشتہ عمر سے بھی جب اس نے میری طرف سے اس وقت یہ راہ اس نے اختیار کی تھی اس وقت سے ۱۹۱۹ء تک یہ خطر زندگی میں تھی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ دلہن کے پوچھنے پر وہ میری طرفوں میں جس قدر عزیز اور محبوب تھی اس سے پہلے وہ میری طرفوں میں نصف بھی نہ تھی۔ وہ ریٹوے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ رہنمائی فراخ دل سے مجھے ہانکے ہر اسان نہ ہونا میری ادب کیوں کی فکر نہ کرنا، مجھے اذکار کبر کر نصرت ہو گئی۔ اور یہاں سے استقلال کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے۔“

کراچی میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۱ء

مولانا محمد علی جوہر کا ایک خط مہاتما گاندھی کے نام

مالیوس ہونے کے بعد

”حقیقتاً ایک اخبار اسی وقت چل سکتا ہے جب کہ قوام ہوا اور کوہ نور سے محسوس ہوا۔ وہ کافی تعداد میں سے خریدیں۔ آج سو کروڑ۔“

کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لئے میں اسے بند کرتا ہوں اور ایک بار پھر بقائے کس شعر کو پڑتا ہوں غرض
غائب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں وہ مجھے ڈار زار کیا کیجئے مائے ہائے کیوں؟

عوام کی نفسی تباہی پھر وہی حالت ہے کہ غرض

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیرہ کے ساتھ یہی حال ہے اب بھی راہبر کو سنیں

اس لئے ہے یہی کہ اخیر ایک دو سال کے لئے ان کے سال پر ہجرتا حال اور مذاہن کے لئے یہاں کی جان بھانہ
فرما رہے اور پیشتر ان کے کہ ہر ایک بزرگ کے ساتھ تھوڑی دور رہتے تھے وہ بالکل خستہ اور حیرت انگیز تھے انھیں مزاج مقصود کا پتہ لگ جائے اور اس رطوبت
بڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں یہی ہے کہ ان کی مدد کیا کر سکتا تھا اپنی استطاعت کے مطابق کچھ حیدر کسی فنڈ میں دے دیا تو بس "قلعہ" اور
"قدیر" ایسے ہیں جنہوں نے ان کی طرح ان کی امداد کی اور قرض میں بڑا طرح گرفتار ہو گئے اور سخت کو بھی تیرا دم چکا دیا جلیس کے مرموں کے باعث پہلے شکر
ہن آیا کرتی تھی مگر اسال جیل (Albans) بھی آ رہی ہے اور ایسی توان (Action) ابھی آرہی ہے اور اعصابی (Neuritis) کے رات کی
نیند اور دن کا آرام حرام کر دیا ہے اب "ہمدرد" کو بند کرتا ہوں اور باہر کی طلب پر کسی بھی نہ جاسکوں گا "قلعہ" اور "قدیر" جو ملک و ملت کی
خدمت کرتا تھا یہودیوں کو اسے بند کر دوں اللہ "سید" جو کچھ ہوسکے گا کر دوں گا ؟

۲۰ مئی ۱۹۳۵ء

مولانا محمد علی جوہر مدبر دانا ملک ہمدرد

شوق سزا

"میں محسوس کرتی تھی کہ کبھی نہ کبھی سزا جاتا ہوں زیادہ سے زیادہ سزا حواشی کے اختیارات میں ہے بلاتامل مجھے دیدے مجھے شکایت یا رنج کا احساس
نہ ہوگا میرا معاملہ یہی ہے جیٹری سے ہے کسی ایک پورے سے ہے میں سے میں جانتا ہوں وہ تب تک نہیں ہوسکتے کی پورے سے اپنے اصل نہیں بدل سکتے ہیں
اپنا یہاں اٹلی کے قتل صداقت "لارڈینو رولو" کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو یہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا تھا۔

"زیادہ سے زیادہ سزا جاسکتی ہے، بلاتامل دیدوئی لیتیں دانا ہوں کہ سزا کا حکم کچھ دوسرے میں قدر جیش تھا ہے اس میں پیدا ہوگا
اس کا عشر غیر اضطراب میرے دل کو نہ ہوگا "سٹوڈنٹ" اور میں اور زیادہ وقت کو روٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا دل حبیب اور غربت انگیز باب ہے
جس کی ترتیب میں نکساں ہم دونوں مستحول میں ہمارے جیسے ہیں۔ مجرموں کا ٹھکانا یہاں ہے اور تمنا ہے جسے میں وہ مشر میں کی کرسی میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے
لئے وہ کسی بھی اتنی ہی ضروری ہے جس قدر یہ لڑا، آؤ، زیادہ کاردارانہ سے والے نام کو جلیہ ختم کرنا، تاریخ ہمارے انتظار میں ہے اور مورخ کب سے ہماری
ماہ تک رہا ہے ہیں جلد طرہاں آنے دو اور تم جلد بدو پہلے لکھتے رہو، ابھی کچھ دیر کام چاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل
جائے گا، جدا کے قانون کی عدالت ہے وقت اس کا ہے وہ اس کا فیصلہ کچھ گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو گا ؟"

دکھنے کے چیف بریسی ڈی جیٹریٹ ستر موہو کی عدالت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اپنے دفاع میں ایک بیان (۱۹۳۲ء)

آزادی کا مطالبہ

"صاحب صدر میں یہاں ہونے کے باعث بیٹھے رہنے کا حق چاہتا ہوں آج میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک میں
حالت میں واپس جاؤں گا جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو میں ایک غلام ملک میں دایں جانے پر غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے مرجانے کو
ترجیح دوں گا۔ اگر دیکھو یہ کا پوتا (کنگ جارج) کچھ رساں کی آدی نہیں دیتا تو اسے یہاں قہر کے لئے جگہ دینی ہوگی۔ میں کامل آزادی کے عقیدے
کا پابند ہوں۔ میں بھی دہی حق چاہتا ہوں کہ لارڈ رینڈنگ ہندوستان میں کسی جرم کے مرتکب ہوں تو میں انھیں میں بھیج دیکھوں۔ ہندوستان میں واحد بندہ

ہے کہ ہندوؤں کو مسلم تسلط کا خطرہ ہے اور مسلمانوں کو ہندو جارحیت۔ تاہم 'ڈیلی ہیرالڈ' نے لکھا ہے کہ میں نے ایسا عقیدہ تبدیل کر دیا ہے۔ میرا مینا کچھ ہے، نظائر حیات ہے اور اپنا فلسفہ سیاست ہے یعنی برابر مطالب اسلام ہے۔ خدا کے حکم سے یہ پہلے مسلمان ہوں بعد میں بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں، اگر آپ چاہیں کہ میں اپنا یہ عقیدہ بدل دوں تو میں ایسا نہیں کروں گا۔ البتہ میں شیطان کے ساتھ کبھی کام کر سکتا ہوں بشرطیکہ وہ اللہ کا کام ہو۔ سب کام ایسے ہو جائیں کہ اگر آپ کے انگلستان میں ایک جوتھ شخص ایسا نکل آئے جو حقیقی معنوں میں انسانی ہو۔ میرا سب سے اعلیٰ بارشہ یہ ہے کہ اگر ہمارے مجھے کوئی سیاسی آزادی دیا جائے تو میں اسے تبدیل کر جاؤں۔

مولانا محمد علی کی بڑائی کی طرف توجہ دے

دوسری گول میز کانفرنس لندن ۱۹۳۱ء

دوم کیونزم کی تشہیر کا ستر کاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کیونزم اور غوریزم دو جدا جدا نہ مضموم ہیں، حالانکہ اس کی حقیقت سوا اس کے اور کچھ نہیں ہے۔ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت و مصیبت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور ہر تہا کا مذہبی کی طرح (۳) کو بہر حالت میں بطور اصول لازمی قرار نہیں دیتے۔۔۔۔۔ ذاتی چیزوں میں گھڑی، چھتری، ٹوٹا، مکان، کپڑے آئے ہیں شمشاد میں رہیں، کارخانے وغیرہ اور کمیونسٹ اصول کا عمل ذاتی جاندا دیکر کہیں ہونا صرف شخصی مرہوتا ہے۔۔۔۔۔ (۱) آزادی کامل کا کل جاؤ روج میں سے قائم کرنا، سوراخ کی سیٹ منڈ دی بیلک کی جو جہاں کیونزم کے اصولوں پر بن گیا ہو جائے۔ (۲) سوراخ کے قائم ہونے تک کاستکاروں اور مزدوروں کے فلاح و آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا۔ اور اس ضمن میں ہندستان کا ہر سیاسی جماعت کے ساتھ اس حد تک اشتراکِ عمل کو جائز رکھنا جس حد تک وہ جماعت ہمارے مذکورہ بالا اغراض کی ناسید کرے۔ اسی کیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہم خیال بنانا تاکہ سوراخ کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہو سکے۔

بہسلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس، کامبرج ۱۹۲۶ء

خطہ صدارت مولانا حسرت موہانی

’ہماری تعداد زمانہ بلد دوسری قوم کے ہندوستان میں ایک شخص ہے اب اگر ہندوستان میں خدا نخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں
ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا اور ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرے میں ہوگا اور اگر کوئی تدبیر اس خطرات سے محفوظ
رہنے کی بہن دستار کے مسلمانوں کے ساتھ ملے، کئے ملاحظہ می ہے کہ وہ یہ ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے۔ ہمارے حقوق کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے
جبکہ ہم گورنمنٹ کی حفاظت پر کمر بستہ رہیں۔ ہمارا وجود اور گورنمنٹ کا وجود لازم و ملزوم ہے۔ _____ انگریزوں کے بغیر ہم اس عزت و آسودگی
کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ _____ اگر مسلمان دل سے یہ انگریزوں کے ساتھ ہیں تو ہندوستان سے ان کو کوئی نکال نہیں سکتا۔ _____ اُن کو
اُس عمدہ خیال کی تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے تئیں مثل ایک انگریزی فوج کے تصور کریں اور تاج برطانیہ کی حمایت میں اپنی جایش قربان کرنے اور اپنا
خون بہانے کے لئے تیار رہیں اور گورنمنٹ سے اپنے حقوق نہایت ادب اور متانت کے ساتھ طلب کریں کہ اس طریقے پر ہمارے دیگر آبائے وطن کا عمل
ہے اور اس سے میری مراد کی بیشمن کے طے لگے سے ہے۔ پس تمہارے دل میں یہی ایک خیال موجزن رہنا چاہیے کہ اس سلطنت کی حمایت کرتا تھا قومی فرض
ہے۔ _____ تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سو بھر خیال کرو، تم تصور کرو کہ انگریزی پرچم تمہارے سر پر لہرا رہا ہے، تم یقین کرو کہ تمہاری یہ دوزخ
اسی لئے ہے کہ تم ایک دن تاج برطانیہ پر (اگر اس کی ضرورت ہو) اپنی جایش نشانہ کرو اور انگریزی سپاہیوں کے ساتھ مل کر اس سلطنت کے مخالفوں
اور دشمنوں کے ساتھ کلے کلے لڑو اگر تم نے یہ خیال دماغ نشین رکھا تو مجھ کو امید ہے کہ تم ایہ قوم کے لئے باعث فخر ہوئے اور آئندہ نسلیں تمہاری شکر
گزار ہوں گی اور تمہارا نام ہندوستان کی انگریزی حکومت کی تاریخ میں سنوئے حرد و درد میں لکھا جائے گا۔‘

نواب وقار الملک، سیکرٹری ملیم لیگ، کی ایک تقریر۔

علی گڑھ سنہ ۱۹۰۷ء

تقسیم ہند کی سب سے پہلی اسکیم

۱۔ مسلمانوں سے ہندوؤں کی مخالفت کی بنا پر جماعتوں کی مخالفت ہی نہیں ہے بلکہ اردو، ہندی کے جھگڑے، انتظام سلطنت میں ہمارے حقوق کی مزاحمت، انتخاب ہر گانہ سے انکار، سرکاری ملازمت کی کٹوتی وغیرہ بھی اپنی جگہ پر اتحاد کے مواقع ہیں اس لئے باصلاحیت اسکیم کر لینے کے بعد کہ مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ رکھا جائے اور جاہلیں کے حقوقات میں تفریق نہ کیا جائے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ایک زبردست کشش مساوی اتحاد ہندو مسلمانوں کے مابین پیدا ہو جائے جو حسب ذیل اسکیم پر غور کرنے کے بعد ایک قابل قبول اور ممکن العمل فیصلہ کر دے۔

۱۔ ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بنا پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کے لئے بڑے سے بڑا حصہ — اس کی آبادی کا ملحدہ کر دیا جائے اور حقیقتہً اس قوم کا حلقہ اثر قرار دیا جائے مثلاً مسلمانوں کے لئے حسب ذیل تین صوبہ جات بنائے جاسکتے ہیں :-

الف : صوبہ سرحد، مغربی پنجاب کے دس اضلاع، راولپنڈی، ملتان، جہلم، گجرات، منہا پور، میانوالی، جھنگ، مظفر کوٹہ، ڈیرہ غازی خان اور ملتان بکھا کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے۔

ب :- بنگال میں لوگر، بگ پور، دیناج پور، جالپائی، فرید پور، ڈھاکہ، راجشاہی، پٹنہ، مین سنگھ، باقر گنج، فاکھالی، پٹنہ اور چٹاگانگ کے اضلاع کا دوسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

ج :- سندھ کو ممبئی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تیسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ یہ بات اصولاً طے کر دی جائے کہ اس تقسیم کے بعد ہر حصہ ملک کا نظم و انتظام اس کے کثیر التعداد و عوام کے مفاد کے لئے کیا جائے گا۔

۳۔ قلیل التعداد اقوام کی حفاظت دارائے مراسم مذہبی و حقوق ملازمت وغیرہ کے لئے قواعد ترتیب کئے جائیں اور ان کے قومی، سیاسی اہمیت کی بنا پر حسب ضرورت دارالامان قائم کئے جائیں مثلاً پنجاب میں سکھ ایک با اثر قوم ہے لیکن کسی واحد ضلع میں وہ مطلقاً آبادی کے ہندو یا مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہے، جو اس کا حلقہ اثر بنایا جائے اس لئے قومی و پولیٹیکل اہمیت کی بنا پر ان کے لئے ایک دارالامان قائم کیا جائے۔ اوصیانہ و امرت سراس کے لئے بہت موزوں ہیں ان مقامات کا نظام حکومت سکھوں کے مفاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے۔ خیال کوٹ عیسائیوں کا ملحد و مادی قرار دیا جائے اور ان کو وہاں دی حقوق دئے جائیں جو سکھوں کو ملحقہ دارائے مراسم میں اسی طرح مالک سہیہ اگر وہ داد دے ہیں جو اسلامی تمدن کا گہوارہ ہے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کی ضرورت ہوگی۔

۴۔ تیار کردہ آبادی کے لئے سبوتاژ، ہم پختائی، حاشیہ کار، قلیل التعداد اقوام کے افراد کو کسی وجہ سے ترک وطن کر کے خورانی قوم کے حلقہ اثر میں جانا چاہیں وہ بغیر زیادہ نقصان کے تبدیل سکونت کر سکیں۔

۵۔ کیسٹن، مخونہ کا فیصلہ قومی معاہدہ کی صورت میں ترتیب دیا جائے اور گورنمنٹ کے سامنے بطور ملکی مطالبے کے عمل درآمد کے لئے پیش کیا جائے۔

۶۔ جس دقت تک اس طرح کا معاہدہ نہ ہو جائے :-

الف : مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کی مخالفت نہ کی جائے۔

ب :- پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب آبادی کی بنا پر قرار دیا جائے جو تناسب نمائندگی کانگریس لیگ اسکیم نے قرار دیا ہے اس کی رو سے جس صوبہ میں مسلمان بلحاظ آبادی زیادہ ہیں وہاں بھی ان کی نمائندگی نہیں رہی اور جہاں جہاں قلت تھی وہ بدستور قائم ہے یہ سراسر نا انصافی ہے۔

ج :- مذہبی منافقت کے التعداد کے لئے قومی پٹی میں قائم کی جائیں جو میں ہندو مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہو اور ہر قوم کی پٹی میں

گانگہ گاندھینائی مسلمان تیسرے

کے لئے وہی لوگ منتخب کیے جائیں جو درحقیقت مستعد علیہ ہوں۔

مہاتما جی! اب میں اس فیصلے کو ختم کرتا ہوں اور متوقع ہوں کہ جس دل سوزی سے میں نے اس کو لکھا ہے آپ اس کی قدر کریں گے اور اس کو ہنسنا غور و تامل کے ساتھ ادل سے آخر تک پڑھ کر اپنے خیالات سے اپنی ملک کو مطلع فرمائیں گے تاکہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جس پر ملک کی آئندہ ترقی و ترقی کا دار و مدار ہے، ہم اسے جاہ پسند لیڈرین اور آپ کی قوم کے متعصب افراد کی دست برد سے محفوظ رہے۔ اس وقت ملک میں آپ کا اثر ہے اور آپ سے یہ امید کرنا بے جا نہیں ہے کہ آپ اپنی ہندو منافشات کے دور کرنے میں استعمال فرمائیں گے۔ دما علینا الا اللہ بلا ع

محمد عبدالقدیر کا کھلا خط گاندھی جی کے نام

مئی گڑھ ۱۹۲۵ء

علی گڑھ پاکستان اسکیم

- اس اسکیم کے مصنف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر سید ظفر الحسن اور افضل حسین قادری ہیں۔ یہ اسکیم سارے ہندوستان کو متحد حصوں میں بانٹتی ہے جس کا ہر حصہ مکمل طور پر ایک سلطنت ہوگا اور تمام معاملات میں آزاد و خود مختار ہوگا۔
- بنگال: اس میں صوبہ بنگال (ہاوڑا اور مدنا پور کے اضلاع کے ماسوا) ہوگا اور آسام کا سلطنت ضلع اور بہار کا پورنیہ ضلع ہوگا۔ مجموعی آبادی 5 کروڑ 25 لاکھ، مسلمان 3 کروڑ 1 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 57 فیصدی
- ہندوستان: اس میں ہندوستان کے تمام بقیہ حصے اور ریاستیں (حیدر آباد، پاکستان، بنگال اور بنگال کی ریاستوں کے ماسوا) شامل ہوں گے۔ مجموعی آبادی 2 کروڑ 60 لاکھ، مسلمان 2 کروڑ 9 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 9 فیصدی
- حیدر آباد: اس سلطنت میں ریاست حیدر آباد صوبہ برار اور کرناٹک (جس کے کچھ اضلاع مدراس سے لینے پڑیں گے اور کچھ وڈیہ سے) شامل ہوگا۔ مجموعی آبادی 2 کروڑ 9 لاکھ، مسلمان 21 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 7 فیصدی
- دہلی: اس میں صوبہ دہلی اور صوبہ متحدہ کا میرٹھ اور دہلی کھنڈ ڈویژن اور علی گڑھ کا ضلع ہوگا۔ مجموعی آبادی 1 کروڑ 25 لاکھ، مسلمان 55 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 28 فیصدی
- مالا بار: اس سلطنت میں مالابار کا صوبہ اور جزیرہ کٹارا ہوگا۔ مجموعی آبادی 99 لاکھ، مسلمان 19 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 7 فیصدی
- آزاد کشمیر: ہندوستان میں جتنے شہر 50 ہزار یا اس سے زیادہ آبادی رکھنے والے ہوں گے انھیں آزاد شہر (City) کا درجہ دیا جائے اور وہ خود بطور ایک سلطنت کی مانند آزاد ہوں۔

سکندر پاکستان اسکیم

یہ اسکیم سکندر خاں خٹک، سرحد میں سکندر خاں اور سی سکندر خاں کے لفظ نظر: گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 535 کے تحت ترمیم کے لئے پیش کی اسکیم ہے۔ ہندوستان کے لئے دفاع (Federation) کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے اور اس میں ہندوستان کو مندرجہ ذیل سات متجانس (Homogenous) منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

گلگت، ہندوستان، شمالی ہندوستان، وسطی ہندوستان، جنوبی ہندوستان، مغربی ہندوستان، مشرقی ہندوستان

۱۔ اس میں آسام اور بنگال (ایک یا دو مغربی اضلاع کے آسام) کے صوبے، بنگال کی ریاستیں اور سکم شامل ہوگا۔
۲۔ بہار اور اڑیسہ کے صوبے جن میں بنگال کے دو اضلاع بھی شامل کئے جائیں گے۔

۳۔ صوبہ متحدہ اور اس کی تمام ریاستیں۔

۴۔ صوبہ مدراس اور مدراس کی تمام ریاستیں۔

۵۔ اس میں بمبئی، حیدرآباد، مغربی ہند کی ریاستیں، صوبہ بمبئی کی ریاستیں، میسور اور صوبہ متوسط کی دہلی ریاستیں شامل ہوں گی۔

۶۔ راجپوتانہ کی ریاستیں (بیکانیر اور جیسلمیر کے آسام) گوالیار، وسط ہند کی ریاستیں اور صوبہ بہار اور اڑیسہ کی ریاستیں اور صوبہ متوسط اور بہار۔

۷۔ صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، کشمیر، بلوچستان، صوبہ پنجاب کی ریاستیں اور بیکانیر اور جیسلمیر کی ریاستیں۔

مولانا محمد علی پاکستان اسکیم

بہتر مگر سے مولانا محمد علی جو نے انگلستان کے وزیر اعظم کو ایک خط لکھا اور اس میں یہ واضح کر دیا: "ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں ان کو مکمل اختیارات ملیں، وہ صوبے چھوٹے ہوں یا بڑے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو تحفظ ملے۔ یہی رعایت اور اختیارات کی خصوصیت ہندوؤں کو حاصل ہو۔" یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ جب مولانا گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔

اسد اللہ پاکستان اسکیم

یہ اسکیم بہت ہی سہل اور مختصر ہے یعنی شمالی ہندوستان مسلمانوں کو دے دیا جائے اور وسط اور جنوبی ہندوستان کے دکن کا حصہ ہندوؤں کو۔ اسکیم میں بہت بڑے پیمانے پر تہذیب و آبادی کا بھی مشورہ دیا گیا ہے اور ہندوؤں کو متورہ دیا گیا ہے کہ وہ جنوبی ہند میں چلے جائیں اور جنوبی ہند کے کل مسلمان شمالی ہند میں جائیں۔

پنجابی پاکستان اسکیم

اس اسکیم نے نزدیک ہندوستان کو مندرجہ ذیل پانچ دفتروں میں تقسیم کیا گیا ہے جو ایک کل ہندو اتحاد (All India Federation) میں شامل ہوں گے۔

۱۔ سندھ، پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور کشمیر کی ریاست

رقبہ ۱۹ لاکھ ۹ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۳ کروڑ ۷ لاکھ ۳۸۰ فیصدی، ہندو ۸ فیصدی، سکھ ۶ فیصدی

۲۔ ہندوستان فیڈریشن:۔ صوبے متحدہ، متوسط، بہار اور اڑیسہ، آسام، مدراس، بمبئی، بنگال کے مغربی اضلاع اور ہندوستان کی تمام ریاستیں (راجستان اور دکن فیڈریشن کی ریاستوں کے علاوہ) شامل ہوں گی۔

رقبہ ۷ لاکھ ۹۲ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۲۱ کروڑ ۶ لاکھ ۸۳۰ فیصدی مسلمان ۱۱ فیصدی

۳۔ راجپوتانہ فیڈریشن:۔ راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کی تمام ریاستیں

رقبہ ۱۸ لاکھ ۸۵ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۱۷ کروڑ ۸ لاکھ ۸۵ فیصدی مسلمان ۸ فیصدی

۴۔ دکن فیڈریشن:۔ اس فیڈریشن میں ریاست حیدرآباد، میسور اور باسور کی ریاستیں

۲۵ لاکھ ۲۵ ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی ۱۵ کروڑ ۵ لاکھ ۸۵ فیصدی مسلمان ۸ فیصدی

5. بنگلہ دیش، مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی اضلاع اور صوبہ آسام نے سبھت اور گولیاہ اضلاع
 قریب 59 ہزار ریسیدنٹ، مجموعی آبادی 31 لاکھ 66 ہزار 660، 1950ء میں 59 ہزار ریسیدنٹ

عربی الطیف پاکستان اسکیم

اس اسکیم میں ہندوستان کو چار مسلم اور گیارہ ہندوستانی علاقوں (Cultural areas) میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مسلم حلقہ: 1. شمال مغربی حلقہ: اس خطے میں پنجاب، صوبہ سرحد، سرحد اور بلوچستان کے کچھ حصے شامل ہیں۔ یہ علاقے درختوں اور پھوسوں پر انحصار کرتے ہیں۔

2. شمال مشرقی حلقہ: اس میں مشرقی بنگال اور آسام شامل ہیں۔

3. وسطی حلقہ: یہ حلقہ ریاست بنیارس، مشرقی بنگال اور آسام کے درمیان واقع ہے۔ یہ علاقے درختوں اور پھوسوں پر انحصار کرتے ہیں۔

4. دکنی حلقہ: اس میں ریاست حیدرآباد اور بنارس کا جنوبی حصہ شامل ہے۔ اس علاقے میں کرنل، کوڑیا، چتوڑ، شمالی اراکٹ اور چنگل پٹ کے برطانوی اضلاع (جوئی احوال صوبہ مدراس میں ہیں) شامل ہیں۔

5. ہندوستان: اس علاقے میں مغربی بنگال کے وہ اضلاع جو مسلم اکثریت کے ہیں اور ہندوستان کے وہ اضلاع جن میں بنگلہ زبان بولی جاتی ہے، شامل ہیں۔

6. سہارا اور لوہی کا علاقہ: جس کی وسعت لکھنؤ اور دہلی کے مسلم علاقوں کے برابر ہے۔

7. راجستھان کی راجپوت ریاستیں مل کر ایک خطہ بنائیں گی۔

8. گجرات اور کاشیاواڑ: 6. بہار، 7. بکسار، 8. آندھرا، 9. مائل ناڈ، 10. مالا بار اور

11. شمالی و مغربی ہند میں ایک ہندو سکھ ملک جس میں کسیر کے کچھ حصے شامل ہیں۔

تبادلہ آبادی: مسند اسکیم نے ان سالوں کو جو ہندو علاقے میں رہتے ہیں، ان کے لئے ایک قریبی مسلم علاقے میں منتقل ہو جائیں اور اسی طرح جو ہندو مسلم علاقے میں ہیں وہ ہندو علاقے میں جو اسیں رہیں گے۔ یہ تبادلہ آبادی کے لئے ایک نیا طریقہ ہے۔

مركز: اس اسکیم کا مقصد کلچرل اور تمدنی کی بنیاد پر متجانس ریاستیں (Cultural homogeneity) کی ایک

اعداد (Confederacy) قائم کرنا ہے۔ لیکن فی الحال یہ اسکیم ان مختلف منطقوں کا ایک کل ہندوستان قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس کی رائے ہے کہ دفاع کی

تمام ضرورتوں (units) کو زیادہ سے زیادہ آزاد دی جائے۔ اور صرف ناگزیر معاملات جیسے دفاع، خارجی حکمت عملی، تجارت، رسل و رساں وغیرہ

دفاع کے سپرد کیے جائیں۔ اس دستور میں دسی ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کے حقوق کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے گا۔

صوبہ یا مرکز کی منتظر (Executive) اکثریت مرتبہ کرے گی، جیسا کہ انگلستان کی پارلیمنٹ کا قاعدہ ہے، بلکہ ایسی منتظر ہوگی جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو مل کر بنائی جائے گی۔ اگر یہ یہ عیس منتظر مجلس مقتدی منتخب کرے گی لیکن یہ مجلس متزکی گرفت سے آزاد ہوگی اور بقول مسند (State executive independence of Legislature) ہوگی۔ وزیراعظم اور اس کی کابینہ کو کڑی نگرانی ہوگی۔

ڈاکٹر عبد الطیف صاحب نے لکھے ہیں: "منتخب وزیراعظم صرف مجلس مقتدی کی معاد میں برسر خدمت رہے گا مگر مقتدی کو اس کی علیحدگی کا اختیار نہ ہوگا"

نمائندگی کا طریقہ جداگانہ انتخاب ہو گا اور تمام صوبوں میں مسلمانوں کی موجودہ تعداد صوبائی اسمبلیوں میں بھی قائم رہے گی۔

اقبال کی پاکستان اسکیم

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ایک ترکیب نکالی اور اس کا تذکرہ اکابر کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں اپنے خطبہ صدارت میں کیا۔ اس میں علامہ موصوف نے فرمایا تھا: ”میری تمنا ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کی جائے حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ملے یا اس سے باہر، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مذکورہ بالا متحدہ سلطنت کی تعمیر مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہئے۔ اس تجویز کو ہندو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اس پر عمل کرنے سے ایک ناقابل انتظام سلطنت ظہور پزیر ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے، لیکن آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی بعض موجودہ صوبوں سے کم تر ہوگی لیکن اگر انبارہ ڈنڈین اور بعض دیگر غیر اسلامی اضلاع کو ایک کر دیا جائے تو اس کی وسعت بھی کم ہو جائے گی اور مسلم آبادی کا عنصر اور بھی بڑھ جائے گا اور اس طرح غیر مسلم اقلیتوں کو مزید موثر سیاسی مراعات دینے کا موقع بھی میسر ہو گا۔“

رحمت علی پاکستان اسکیم

ڈاکٹر اقبال کے رد قومی نظریے کے تحت انہی کی تجویز پاکستان کو کیمبرج یونیورسٹی (لندن) کے طالب باجوہ دھری رحمت علی (اور قتل گشتی محمد اسلم خاں، محمد صادق اور عنایت اللہ خاں) نے جنوری ۱۹۳۳ء میں ایک گشتی اشتہار کے ذریعہ ایک نئی صورت میں پیش کیا۔ ان دنوں سندھ میں تیسری گول میز کانفرنس جاری تھی۔ اشتہار میں کہا گیا تھا کہ سر اقبال نے آل انڈیا فیڈریشن کے اندر مسلم اکثریت کے صوبوں کی ایک ریاست کی تجویز پیش کی ہے ہم چاہتے ہیں کہ ان صوبوں کی اپنی ایک الگ ہی فیڈریشن ہو۔ ہندوستان کی سرزمین پر اس سکون کی نفاذ وقت تک میسر نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمان اپنے کام آپ انجام دینے کا مجاز نہ رکھتے ہوں اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ جب وہ ہندو اکثریت کے دباؤ سے اپنے آپ کو نکال لیں۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں رحمت علی نے اپنے آپ کو پاکستان سیشنل تحریک کا بانی قرار دیا اور کراچی کے ایک جلسہ میں انھوں نے سامنے شمال مغربی علاقے کو مملکت پاکستان کا نام دے دیا اور انھوں نے مسلم بیگن اور مسلم آسام کو بھی اپنی مجوزہ مملکت میں شامل کر لیا اور بعد میں حیدرآباد کو بھی عثمانستان کا نام دے کر مملکت پاکستان کا ایک صوبہ قرار دیا۔ رحمت علی ہوشیار پور پنجاب کے رہنے والے تھے۔

مسٹر جناح کا دو قومی نظریہ

”دو قومیت کی کسی قسم کی تعریف کی رو سے ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ ہم ایک ارب کی تعداد میں ہیں اور اسے بھی قطع نظر ہم ایک علائقہ تہذیب اور یکساں زبان اور ادب، تمام ادب اور دین میں، قانون اور اخلاق میں، رسم و رواج میں، تاریخ اور روایت میں، نظریہ اور خواہشات میں ایک بلکل مختلف قوم ہیں۔ مختصر ہم زندگی کے متعلق اور زندگی پر ایک بلکل الگ نظریے کی حامل قوم ہیں۔ کسی بھی بین الاقوامی قانون کی رو سے ہم ایک قوم ہیں۔ اگر مسلمان ایک الگ قوم ہیں، پھر انھیں ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں، خود مختار رہنے کا حق ہے وہ علاقے جو ان کے دھن کی طرح ہیں شلتن پنجاب، شمال مغربی سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام۔ ان علاقوں میں وہ ایک مسلم ریاست کی تشکیل کر سکتے ہیں جو بین الاقوامی طور پر آزاد ہوگی اور خاص طور پر ہندوستان ہے۔“

مسٹر گاندھی اور مسٹر میری وزیر ہند دونوں متحدہ ہندوستان کے حامی ہیں۔ گاندھی ایک ہندو جماعت ہے اور وہ مسلمانوں کو اپنا اعلامیہ ماننا چاہتی ہے۔

ہنگامہ ہندوستانی نسلان صبر

ہندو مسلمان دو قومیں

اس باب میں مجھے کسی قسم کا دھوکہ ہے، نہ شک و شبہ، کہ ہندوستان میں ایک قوم جتنی ہے اور نہ یہ ایک ہی ملک ہے۔ یہ برصغیر مختلف قوا کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن ملک سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصد کیا ہے اور وہ کونسی قوت مجھ پر ہے جو میں آمادہ بہ عمل کرتا ہے۔ کیا وہ مذہب ہے، سیاست ہے یا ملتان اصلاح ہے تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔۔۔ (لہذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہیں) آج انسانی سعی و عمل کا دائرہ ابکرتا قابل تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ جمعی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر رہے ہیں جسے جس مذہب کو نوع انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں ہیں اسے مذہب تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے بر عمل کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب ہنوتوا انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی کا دہرہ گامہ پروردی بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں خود دشمنی تو بہت ہوتی ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہے۔

مسٹر جناح کا ایک خط گاندھی جی کے نام

جنوری ۱۹۴۷ء

پاکستان کے لئے باضابطہ تجویز

۱۔ مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس 22-23-24 مارچ ۱94۵ء کو مسٹر محمد علی جناح مستقل صدر کی صدارت میں بمقام لاہور منعقد ہوا۔ مسٹر جناح تیسری بار سالانہ اجلاس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ اس سال کے خطبہ صدارت میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندو مسلمان دو جدا گانہ قومیں ہیں اس لئے ملک کو دو جدا گانہ حصوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور دوسرے حصے میں ہندوؤں کی۔ یہ دونوں ریاستیں بالکل خود مختار اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوں اور ہندوستان میں کوئی وفاقی اور مرکزی حکومت نہ ہو!۔

سید طفیل احمد

مسٹر جناح بہت پچھتائے

۱937ء سے لے کر ان وفات تک جتنے واقعات ظہور پذیر ہوئے جب ان کی صحیح اور مکمل تاریخ لکھی جائے گی تو دنیا کو معلوم ہو گا کہ مسٹر جناح نے کتنے اچھے اور سنبھلے مواقع ہاتھ سے کھوئے ہیں۔ ان لوگوں میں نہیں ہوں جو کانگریس کو معصوم سمجھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کانگریس نے بھی اس بارہ میں غلطیاں کیں ہیں لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ مسٹر جناح نے بعض بہترین مواقع کیوں کھوئے؟ یہاں پر میں صرف آخری واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ اس میں میرا بھی بڑا حصہ تھا اس لئے میں شروع سے آخر تک اس سے خوب واقف ہوں۔ نومبر ۱۹4۷ء سے جون ۱94۸ء تک میں زیادہ تر گاندھی جی کے ساتھ رہا۔ میں نے جس درجہ ان کو ہندو مسلم مفاہمت کے لیے بیقرار اور مضطرب پایا اس کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ گاندھی جی جناح گفتگو کی ماکائی کے بعد بھی وہ مایوس نہ تھے اور بہر ممکن کوشش کے لیے ہر ذریعہ تیار رہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بار بار اصرار کیا کہ میں مسٹر جناح سے مل کر گفتگو کروں مگر میں جانتا تھا کہ مسٹر جناح مجھ سے ملنا ہرگز پسند نہ کریں گے اس لیے میں انکار کرتا رہا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ مسٹر جناح ایک سزینٹ اور ایماندار شخص ہیں وہ تم سے غور و ملین گے۔ لیکن میں راضی نہ ہوا۔ بہر حال جو کوششیں اس زمانے میں ہوئیں ان کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس وقت صرف اتنا کہتا ہوں کہ انھوں نے ایک وقت میں تو بھولا بھائی، یاقت علی فاروقی، یا عارضی مفاہمت یا ایکٹ (اسے جس نام سے بھی چاہے یا دیکھئے) سے مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے انکار کیا اور پھر وہی چیز (یعنی کانگریس لیگ پیڑی) (Party) شملہ میں طلب کرتے رہے۔

اگر وہ چیز اچھی تھی تو پہلے اس سے انکار کریں ہوا اور اگر بُری تھی تو پھر شعلہ میں اس کی مانگ کریں ہوئی اور اس پر زندہ کیوں دیا گیا کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ اُس سہرت موقع کو کھو کر ستر جناح نے بعد کو بہت دیر میں اپنی غلطی محسوس کی مگر موقع ہاتھ سے جا چکا تھا اس کے بعد سے میں بالکل مایوس ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ ستر جناح کوئی سمجھوتہ نہیں چاہتے بلکہ وہ انگریزوں ہی سے کوئی بے معنی شے حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کا نام چلے پاکستان ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ مسلمانوں کے درد کا علاج نہ ہوگی اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی آزادی کو سخت نقصان پہونچا دی گئی۔ کمیونل ادارہ کے وقت میں بھی ستر جناح نے بار بار یہاں تھا کہ اس کے حاصل ہونے کے بعد مسلمان منسلب ہو جائیں گے، اور پھر ان کو اکثریت کا کوئی خوف نہ رہے گا۔ کمیونل داؤد ملا لیکن وقت اور تجربہ نے بات کر دیا کہ وہ نہ تو مسلمانوں کے درد کا علاج تھا اور نہ ہے، نہ اُن کی حفاظت اکثریت کے سچے یا جھوٹے مظالم سے کر سکتا ہے۔ اسی طرح ستر جناح کا بتایا ہوا پاکستانی علاج بھونہ صرف بے کار ثابت ہو گا بلکہ مسلمانوں کے لئے زہرِ مہل کا کام لے گا۔

پاکستان حاصل ہونے پر ہندوستان میں تو ہندو راج ملا مشک و شبہ قائم ہو جائے گا لیکن پنجاب و جگال میں مسلم راج کسی طرح بھی نہ ہو گا اس لئے کہ 7 فیصدی اور 14 فیصدی اقلیت میں اور 55 فیصدی اقلیت میں بڑا فرق ہے۔ مورخ الہ دکر کو اقلیت نہیں کہا جاسکتا اور اول الذکر صریح معنوں میں اقلیت ہے۔“

’نئی زندگی پاکستان نمبر‘ 1946ء

ڈاکٹر سید محمود

ستر جناح کی بے نیازی

’میں نے ایک بار جناح صاحب سے دریافت کیا کہ آپ مسلم اکثریتی صوبوں کے نیے تو بعد و جدھر کر رہے ہیں لیکن ان مسلمانوں کا کیا ہو گا جو یوپی کی طرح دوسرے صوبوں میں انتہائی اقلیت میں ہیں؟ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھا اور پھر جواب دیا کہ وہ لوگ اپنی دیکھ بھال خود کر لیں گے، مجھے اُن کے مستقبل سے کوئی دل چسپی نہیں۔‘

’غور نوشت سوانح‘

کریم جھانگلا

فساد پسند مسلم لیگ

”1946ء میں ہندوستان میں جو فسادات شروع ہوئے تھے اُن کی ابتدا مسلم لیگ نے اپنے کلکتہ کے ڈائریکٹ آفیشن سے کی تھی، کلکتہ کے فسادات میں شروع میں تو ہندوؤں کے کچھ آدمی مارے گئے تھے لیکن جب ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم لیگ کے مانند تشدد کا اقدام کیا تو پھر اس جگہ کے مسلمانوں کا ناقابلِ تلافی اور ناقابلِ بیان مالی و حالی نقصان ہوا۔ مسلم لیگ نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی غرض سے نواکھلی میں کلکتہ کا بدلہ لینے کے سہانے سے ہندوؤں پر زمین و آسمان ایک کر دیا اور ایسے مظالم توڑے اور بے حیائی سے بھرے کام کئے کہ انسانیت نے شرم کے مارے اپنا منہ چھپایا۔ فرنگی اپنی پالیسی ’پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو‘ کے مطابق ہندوؤں کو بھی اپنے جال میں لے آئے اور انھوں نے بھی نواکھلی کا بدلہ لینے کے سہانے سے بہار میں مسلمانوں اور غریبوں پر جنگیں اور ہلاکوں کے جوہر دھفکا دیادیں تازہ کر دیں۔ مسلم لیگیوں نے دل کی مراد سرسبز ہو گئی۔ وہ خدا سے یہ دن منگتے تھے۔

اس طرح کے مکر وہ اور ناپاک اواروں کے ساتھ وہ (مسلم لیگی) یا تو برسرِ اقتدار آنا چاہتے تھے اور یا پھر ملک کے ٹکڑے کر دینے پر تے ہوئے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوستان بھر میں فسادات کی آگ لگا دی اور اپنے ہاتھ رنگے شروع کر دیئے انگریز لیگیوں کی ان حرکتوں پر بڑے خوش تھے کیونکہ ہندوستان کی ان خرسیتوں سے انگریز لوکر شاہی انگلستان کی مزدور پارٹی کی حکومت پر یہ بات واضح اعلیٰ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ دزدوں کی مانند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے کا گوشت پوست اُدھیرنے کے در پے ہیں اور یہ کہ انسانوں کی طرح رہنے کے شعور کا ان میں بالکل فقدان ہے لہذا اُن کے سروں پر انگریز کی حکومت کا تسلط ضروری ہے اور اگر ایسا نہیں

ہوگا تو ہندوستان کی مسلمان سب

ہوگا تو یہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

مسلم لیگ انگریز کی اپنی پیداوار تھی اس لئے انھوں نے بھی صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھانا پسند کیا اور لک کا اس دسلائی مٹانے کے لئے انگریز مسلم لیگیوں کی پشت و پناہ لی گئی۔

آپ جی ۱۹۳۲ء

خان عبدالغفار خان

تم ہندو ہو

”پاکستان کی اٹھارہ سالہ زندگی میں مجھے پندرہ سال میں خانوں میں رکھا گیا ہے اور پھر ایسی قید میں جو خدا کسی کو نہ دکھائے آئیں۔ اس عرصے میں ہزاروں کی تعداد میں خدائی خدمت گار موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ قید و بند میں مبتلا کئے گئے۔ اور ان کے ساتھ ایسے ناروا سلوک ہوئے ہیں اور ان پر ایسے مظالم توڑے گئے ہیں جنہیں انسانیت برداشت نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی اس آئین ساز اسمبلی کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کیا تھا۔ میں نے مسلمان ممبروں سے اس مسئلے پر بڑی بحث کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ ہندوستان میں سوشلسٹ جمہوریت قائم کرنا چاہئے۔ نیز اگر ہندوؤں نے ہماری یہ بات مان لی تو ہم فیڈریشن میں رہ جائیں گے۔ مادرائر انھوں نے ہماری یہ بات نہیں مانی تو ہم اپنے اپنے صوبوں میں فیڈریشن سے جدا ہونے کی تجویزیں منظور کر لیں گے۔ یہ حق نہیں حاصل ہے کہ فیڈریشن سے جدا ہو جائیں اور کہ ہمارا صوبہ ایک خود مختار ریاست بن جائے، لیکن مسلمانوں پر ایک ایسی چال چلائی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کی بات پر غور و فکر کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے اور مجھے تو یہ ایک مستقل جواب دیتے تھے کہ ”تم ہندو ہو“۔“

آپ جی ۱۹۳۸ء

خان عبدالغفار خان

مسلم لیگ کی غلط قیادت کا یہی نتیجہ

”میں یاد ہے میں نے نہیں سہیں سے لپکارا اور تم نے میری زبان کا ٹٹی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لئے۔ میں نے چنانچہ اہم تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، پھر نے کر ڈالنی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، حتیٰ کہ کچیلے سات سال کی تلخ نوآسیاست جو آج تمہیں داغ بدائی دے گئی ہے اس کے بعد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر گھمبھڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صحت اغراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سستی تازہ کر دی۔ نتیجہ معلوم کہ آج انہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں مراطہ ستقیم سے دور لے گیا تھا۔۔۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں جتنا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ درقروں کی حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون میں پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت چیز ہے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے کسی اور ان ٹیٹھیل بر کردی اور یہ نہ سوچا کہ دقت اور اس کی رفتار تمہارے لیے اپنا طبع تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کا ہاتھ نہیں، تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں وہ تقدیر جو تمہاری دماغی اختلال میں پیشانی کی منشائے مختلف منہموم رکھتی ہے یعنی تمہارے نزدیک نقدان بہت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بہت جو تم نے دھندلے کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے پکھائی گئی ہے اور انہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے ایک دقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلانے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:۔

جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی خواہش سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی یہی ہے

الغرض یہ لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر

تم نے وقت کے پہلو پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تڑپا اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا سورج نکلے گا : تمہارے گروہ نے جو سب تکروڑ انسانوں کا ایک غلیظ مخالف ملک کی آزادی کے بارے میں وہ ردیہ اختیار کیا جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی ذلیل گناہ بن گیا ہے ۔

ادرا آج ہندستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قند کی دیوار پر آزاد ہندستان کا جھنڈا اپنے پورے گروہ سے لہرا رہا ہے یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حالکا نہ غرور کے آزار قہقہے مسخر کیا کرتے تھے ۔ ہندستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو طرا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط فہمیت کی فاس غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے ۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں ۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا ۔ یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر بھی غور کرو ۔ تمہیں محسوس ہو گا کہ یہ غلط ہے ۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو ؟ اور کیوں جا رہے ہو ؟ یہ دیکھو ! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے فضائل کو کہاں گم کر دیا ؟ انھیں کیا بات ہے کہ ہمیں جتنا کہنے کے تمہارے قاتلوں نے دھوکا دیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خلیفے سے سنبھلی ہوئی ہے ۔ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا ستارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ۔ سیاسی مذہبیت ایسا پھل سا خیر توڑ چکی اور اب سیاسی پتھر ڈھل رہا ہے اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاصر بدلا نہیں اور دماغوں کی جھین ختم نہیں ہوئی تو پھر حالات دوسرے ہیں لیکن واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلیوں کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو کہ جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے ۔ آج زر زروں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زر زرو تھے ۔ آج اندھیرے سے کاتبے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا دھند ایک اجالا تھا ۔ یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھگت جانے کے خدشے سے اپنے پائیسے جڑھٹھالے ہیں وہ تمہارے اسلاف تھے جو سمندر میں اتر گئے ، ہمارے دل کی چھاتیوں کو روند ڈالا ، بھگتیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے ۔ یہ ایمان کی جاں کٹی ہے کہ شہنشاہوں کے گریباؤں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تاریچے رہے ہیں اور حلا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا ۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے اور ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر اھولے رہیں گے ۴

مقام : جامع مسجد دہلی ، اکتوبر ۱۹۹۷ء

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تقریر

فرقہ پرستی کا دروازہ مسلم لیگ

مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہو سکتی کہ جہاں تک ملک کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے فرقہ پرستی کو جو مذہب کے نام سے ابھاری گئی ہے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے کسی ایک گوشے کی فرقہ پرستی نہیں کسی ایک جماعت کی فرقہ پرستی نہیں ، فرقہ پرستی اور بریادلوں سے جو ہمارا گت نے بعد ہوئی رہا ہے لیکن اب ہندستان جس کی آزادی کا ہم ۵ برس سے خواب دیکھ رہے تھے بریاد نہ ہو اور بریادی کے کمنائے دروازے میں نہ جائے ۔ تو ہمارا فرض ہے جس دروازے سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے اس دروازے کو بند کر دیں اور اس کو ختم کر دیں اور اس میں شک نہیں کہ اس فرقہ پرستی کا بہت بڑا دروازہ مسلم لیگ کا درجہ سے کھلا ہے میں نام دلیتا اگر حالات اور واقعات سے یہ ظاہر نہ ہوتا ۔ اب اگر وہ دروازہ بند نہ کیا گیا تو اس میں شبہ نہیں کہ جو وہ مشکلات کے حل کی بہت بڑی ذمہ داری مسلمانوں کے کندھوں پر باقی رہتی ہے ۔ یہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے کچھ مسلمانوں کی طرح کی کوئی امید ماقی نہیں رکھی جا سکتی ۔ بہر حال جو چیز اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فرقہ پرستی کو روک کر اپنی قومی زندگی کو پائی ، فرقہ پرستی کسی دروازے سے بھی آئی ہو اس کو بند کرنا ہو گا ۔ ایک دروازہ جو مسلمانوں کے ذریعہ سے کھولا گیا تھا وہ مسلم لیگ کا تھا ۔ اب اگر وہ بند نہیں کیا جاتا تو بہت بڑی ذمہ داری آپ پر رہ جائے گی ۔ اس وقت میں سوچتا ہوں ہے کہ وہ فرقہ

ہاگن مکتبہ دستاوی مسلمان بنیں

دارائے اجنوں سے بڑھ کر ملک کے سیاسی میدان کی زندگی میں کوئی چیز مہلک نہیں ہو سکتی، جہاں تک اجتماع کا تعلق ہے، آپ صاف دیکھ لو کہ فیصلہ کریں کہ آئندہ کوئی مسلم مجلس، کوئی مسلم نظام سیاسی میدان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم نہ کریں گے اور کسی مجلس کے مقصد پر فرقہ واریت کی پرچھائیں بھی نہ پڑنی چاہئے کیونکہ الیا ہونا ملک کے لئے زہر قاتل ہے، تب آپ کو عافیت حاصل فیصلہ کرنا چاہئے کہ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے وہ نہیں چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے آسمان کے نیچے کوئی فرقہ وارانہ نظام باقی رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مشورہ دینے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عام مسلمان جو کل تک مسلم لیگ میں تھے اب سوائے کانگریس کے کسی دوسری غیر فرقہ وارانہ جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اصل چیز فرقہ پرستی کو سیاست کے میدان سے ہٹانا ہے اس کے بعد جو کچھ کیا جاتا ہے اس کی نوعیت ایک مشورے کی ہے اور وہ مشورہ ہی ہو سکتا ہے کہ نیشنل کانگریس میں شریک ہوں۔

خطبہ برصغرت: آزاد کانفرنس لکھنؤ ۱947ء

مولانا ابوالکلام آزاد

فسادات کا ذمہ دار کون ؟

”سچ کہا ہے کسی شاعر نے۔“

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

سارا قصور جو ہے وہ مسلمان ہی ہے۔ اس کا ہے اس ہندوستان میں جب سے پارٹیشن ہوا ہے مسلمان سے زیادہ غمزدہ، مسلمان سے زیادہ بے ایمان اور غیر وفادار کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ کس قدر افسوسناک پہلو ہے کہ اس میں ہماری ہوم منسٹری کی طاقت کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا جس سے اقلیتوں کو خاص طور پر مسلمان اقلیتوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ ہم بھی اس ملک کے برابر کے باشندے ہیں۔ ہم سیکورسٹیٹ کو مانگتے ہیں۔ ہم نے اپنی جانیں دی ہیں آج کسی فرقہ پرست کو کیسے اس ملک سے محبت ہو سکتی ہے۔ جب انگریز کی گولیاں چل رہی تھیں تو یہ سب کنڈی اور کواڑ بند کئے بیٹھے تھے آج ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنے ملک سے محبت نہ ہو لیکن جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر مسٹر علی سیرٹنڈنٹ سے کہا تھا کہ گولی مار سکے تو مار کر آزادی کا عہد نامہ پڑھا جائے گا اور جو لوگ ملک کی خاطر جیلوں میں سرسٹے ہو سکتے ہیں ان سے زیادہ ملک کا دوست کون ہو سکتا ہے مگر آج وہ سارے فرقہ پرست ہیں ان کے اجتہاد فرقہ پرست ہیں اور وہ لوگ جو کانگریس یا نیشنلسٹ جماعتوں کے صدر تھے میں اس آزاد ملک میں بیٹھے ہیں اور ہمیشہ فرقہ پرستی پرستے رہتے ہیں وہ اپنے دوسروں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر یہ سب کیوں ہے۔ مجھے ان سے شکایت نہیں مجھے ہوم منسٹری سے شکایت ہے۔ مجھے اس کی شکایت ہے کہ اسٹیٹوں کے اندر جو ہوم منسٹر آپ مقرر کرتے ہیں ان کے کام کو دیکھا نہیں جاتا۔ اسٹیٹ کے اندر اگر آپ لائسنس آرڈر کی ذمہ داری کسی کو دیں تو آپ کو چیک کرنا ہوگا کہ وہ صحیح طور پر عمل کر رہا ہے یا نہیں، ساری ذمہ داری آپ کے اوپر ہے اسٹیٹ کے اوپر نہیں اگر اسٹیٹ گورنمنٹیں اس طرح کرتی ہیں تو وہ ان کانگریس کی گورنمنٹیں ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی طور پر دہان سے متعفی ہوں اور اگر استعفیٰ نہ دیں تو آپ ان کو اس کرسی سے ہٹا کر کہیں کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ یہ ذمہ داری لے سکیں۔ ہم جان دینے کے لئے تیار ہیں اگر ہندوستان صبا ہو کہ کوئی ملک آگے بڑھے کہ ہندوستان کو دیکھے۔ گو میروں کے سامنے ہم سینہ تالے رہیں گے لیکن اس کے برعکس ہم اس طریقے سے مسلمان اقلیتوں کو برباد اور تباہ نہیں دیکھ سکتے، یہ طریقہ آپ کو بدلنا ہوگا، انصاف دینا ہوگا۔ صحیح طور پر اس نظام کو کرنا ہوگا اور مجھ جیسے لوگوں کو یہ کہہ کر چپ نہیں کیا جاسکتا کہ ایسی باتیں کرنا فرقہ پرستی ہے اگر مجھ پر بڑبڑاؤں فرقہ پرستیوں کا لیبل بھی لگا دیا جائے تو وہ میری قوم پرستی کو خاک میں نہیں ملا سکتی بلکہ میری قوم پرستی کی آگ میں خود ہی جھسم ہو جائے گی۔“

لوک سبھا 29 مارچ 1961ء

مولانا حفص الرحمن

فارسی موقوف

”ہندوستان کے عوام و خواص میں فارسی زبان مقبول نہیں ہے اس لئے یکم اکتوبر 1933ء سے پوری دہلیگری میں یہ زبان موقوف کی جاتی ہے آئندہ

ہاگن کاہنتستانی سلمان تبصر

رواۓ ہندی و غیرہ کا خدات علاقہ کچی و کلکٹری ہندستان برطانوی اردو ہندی حروف فارسی زبان میں لکھے جائیں لیکن علاقہ ہندوستان میں لکھنؤ اور اس ضلع کی طرف سے لکھی جا رہی ہو۔

اخبار جام جیاں نما 29 اکتوبر 1898ء

ایسٹ انڈیا کمپنی کا فرمان

ہندی اردو تنازع

1898ء اور 1899ء میں اردو ہندی کی بحث میں شہرت شروع ہوئی۔ الہ آباد میں ہندی کی حمایت میں ایک صدر مجلس قائم ہوئی اور مختلف مقامات میں اس کی شاخیں بنائی گئیں۔ اس صدر مجلس کے سیکریٹری (بالو سودا پرشاد سندھیال) اور سرمد میں اسی تنازع کے متعلق مراسلت ہوئی۔ اخبار سائنٹی ٹک سوسائٹی، بنارس گزٹ، رسالہ 'جنت ہندیہ' (لکھنؤ) اور 'البصائر' وغیرہ میں دونوں طرف سے بڑے گرم مضامین نکلے۔ ادھر یہ بحث ہو رہی تھی کہ بہار میں حکومت بنگال نے زیرکستان اردو کی جگہ ہندی رائج کر دی۔ الفرض 1873ء میں جب سرمد کو یہ معلوم ہوا کہ اردو اور فزوں میں دیوناگری جاری کرنے کے لئے ایک درخواست ہندوؤں کے دستخطوں کے لئے گشت کرانی جا رہے تھے تو انھوں نے 9 دسمبر 1873ء کو الہ آباد میں ایک بہت بڑا اجلاس کیا اور اردو کی حفاظت کے لئے ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی جس کے سیکریٹری، سرمد قرار پائے اور اس کی شاخیں دوسرے اضلاع میں قائم کی گئیں۔ سرمد نے ایک برزاد اور مدلل سرکلر جاری کیا جس میں ان نقصانات کو منہ-ٹل طور پر بیان کیا جا اس تبدیلی سے پرہیز گے 1882ء میں جب حکومت ہند کے مقرر کردہ مشہور ایکویشن کمیشن کا دورہ بغرض تحقیقات جگہ-جگہ ہوا تو یہ جنون پھر شدت سے اچھلا اور اضلاع شمال اور مغرب اور پنجاب کے ہندوؤں نے بڑی زور شور سے اردو کی مخالفت کی۔ دونوں سوہوں کی بے شمار جھڑپوں اور ٹکھنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر پیش ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو اس کمیشن کے صدر تھے۔ ایم۔ اے۔ اداکار علی گڑھ کے آڈریس کے جواب میں کہا۔ "روزانہ ڈاک میں ہمارے پاس بے شمار دستخطوں کے ساتھ ہندی کی حمایت میں تھوڑی دھول ہو رہی ہے۔ ایک درخواست پر جو کل ہی وصول ہوئی تین ہزار دوسو ستاسی اشخاص کے دستخط ثبت ہیں۔

یہ آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مارچ 1898ء میں یکایک بھڑک اٹھی۔ اشتعال کا باعث سرانجی سیکلڈاٹل ہوئے جو اس صوبے میں لیفٹیننٹ گورنر ہو کر آئے تھے اس سے پہلے صوبہ بہار میں کلکٹر تھے وہاں یہ اس آگ پر پھونکا تھا۔ ان کے آنے سے ہندی کے طرفداروں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ محزنا دوسرے برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک سموریں لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا مولا نا جانی لکھتے ہیں کہ سرمد پر اگرچہ اس زمانے میں ہجوم رنگ والہ کے سبب ایسا کہنے کا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دبا رہے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو 15 مارچ کے الٹی ٹوٹ گزٹ میں سرمد کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کچھ مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے تھے۔ اسی سال ہندی بولوں کا ایک ڈپوٹیشن لیفٹیننٹ گورنر بہار کی خدمت میں حاضر ہوا جس کو جو آدیتے ہوئے "ہزار آئرنے موجودہ دستور عدالت میں جلد تباد لے کو زاپند کر کے جس کے افسران گورن منٹ عادی نہیں ہیں قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ ہو سکتا ہے" چنانچہ گورن منٹ کے ریزولوشن مورخہ 18 اپریل 1900ء میں ناگری حروف جاری کرنے کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ دائرے کر رہے اپنے احکام میں حروف کا لفظ بدل کر زبان بنا دیا۔ وہ جو ذرا سا لسمہ لگا رہ گیا تھا ظالم نے وہ بھی کاٹ کر رکھ دیا۔

اس پر مسلمانوں میں بڑا سچا ہوا۔ نواب محسن الملک بہادر نے اس نا انصافی کی طرف سے نا منٹ کو توجہ دلانے کی غرض سے ایک بڑا جلسہ منعقد کرنے کی تیاری شروع کی اور ملک کے سربراہ اور تعلیم یافتہ حضرات کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ 17 اگست 1900ء کو بمقام لکھنؤ ماہ درمی قیصر باغ میں بڑی دھوم دھام سے اور جوش و خروش سے ہوا (لیکن نواب محسن الملک کو ایسی سخت دھمکی دی گئی کہ نواب صاحب کو یہ تحریک چھوڑ کر گھر چلے گئے۔)

پھوٹنے ہی اور ساری کوششوں پر دینی پھر گیا) واقعی بہت طہارت انگیز ہے یا اردو کی بہت بڑی شاست ہوئی۔

اس وقت سے یہ زبان جسے ہندی کہا جاتا ہے ترقی کرتی چلی گئی پنڈت بالوہ جی نے جب سندھ اور سنگھن ونگل قائم کئے تو اس کا زور اور بڑھا اور اس نے بی جنوں سے ہندی کی اشاعت کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ راج پوتا نے اور سنٹرل کی ہندو ریاستوں میں دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو تھی وہاں دند کسج بھیج کر اردو کو اکھاڑا اور ہندی کو چھایا۔ ایک جو دھ پور ان کی گرفت سے بچ رہا تھا اس کا جو حشر زور دہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک پنڈت رام چندر نے پور کے دھرت برت رکھا۔ یہ برت نہیں دھکی برت ہے اور جس طرح راج کوٹ کے معاملے میں دھکی برت دھکی میں آگئے تھے اسی طرح جو دھ پور کے وزیر اعظم بھی دھکی میں آگئے۔ سر اینڈ میکڈنل کو دیوناگری جاری کرنے میں دو سال لگ گئے تھے مگر جو دھ پور کے وزیر باتدیر نے چند ہی روز میں حکم نامہ جاری کر دیا اور بے گناہ اردو کے قتل کا فتویٰ سر رزا اسماعیل کے دست مبارک سے نکھایا۔

آپ کو معلوم ہے کہ نومبر 1837ء میں حکومت نے ایک بجٹ پاس کیا جس کی رو سے دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی سے اردو کر دی گئی۔ جب تک فارسی رہی کسی نے زبان کی شکایت نہ کی جب اردو ہوئی تب بھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔ ہندی۔ اردو کی نزاع 1863ء سے شروع ہوئی جب بنارس کے بعض معزز ہندوؤں نے (بابو فتح نرائن سنگھ کی سرکردگی میں) تمام سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرنے اور ہندی بجا شائع کرنے کی کوشش کی (مولانا حالی جیات جادید میں لکھتے ہیں کہ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ کھٹے نہیں ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے کوشش کرنا محال ہے۔

1857ء کے بعد کئی بہادر برخواست ہوئے۔ انگریزی راج آیا۔ حالات نے پلٹا دکھایا، جدید قانون نافذ ہوئے، ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراع۔ کالجوں کی تعلیم، آزادی اور حب وطن، قریبوں اور تحریروں، انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو اور ابھارا، خاص کر ہندو اس سے زیادہ متاثر ہوئے، قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی نیا جوش پیدا کیا جسے سیکس سولہ نے ابھارا اور جس سے بعد میں اپنی برائیت نے خوب کام لیا لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرتی نے دلوں میں جایا۔ گرد کل قائم ہوئے جس میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازمی تھا۔ دیکر زمانے کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی رنگے پاؤں پھرنے اور ایک بے سلی چادر اوڑھنا پسینہ، جینکوں میں رہنا، زیر ساما سونا وغیرہ قوی شاعر بنایا۔ سب سے زیادہ نزلہ اردو زبان پر گرا۔

علی گڑھ کانفرنس 14 فروری 1941ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق

پاکستان کی سرکاری زبان اردو

’میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس معاملے میں غلط نہیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ مصری پاکستان کا دشمن ہے۔‘

تقریر: 9 مارچ 1948ء، دھاکہ

مسٹر جناح

ٹائپ کا ذوق

”سرسید کی تصنیفات سے مجھے ٹائپ کے چھلپے سے ایک ذوق پیدا ہو گیا، اور چون کہ سرسید کی کتابیں پہلے ٹائپ میں چھپی ہیں اور بعض بعض پھر لکھتے ہیں بھی نقل ہو گئیں۔ اس لئے میری کوشش یہ رہی کہ ہر کتاب کا ٹائپ ہی کا ایڈیشن حاصل کروں۔ تفسیر اور مجموعہ تصنیفات احمدیہ کے علاوہ جن میں شبیہ الکلام اور خطبایہ احمدیہ میں محمد نے ہمدیہ الاخلاق کی تین اشاعتوں کی مکمل فائلیں بھی منگوائیں۔ پہلی اشاعت سنا سال تک رہی ہے اس کی بعض جلدیں ڈیوٹی شاپ میں نہیں تھیں۔ میں نے کوشش کر کے اور فی جلد کیس رو پے قیمت نے کراسی کے توسط سے حاصل کی۔

پھر نیاں ہوا کہ ان کے بہت سے مغلیں علی گڑھ گزرتے اور ساٹھ ٹک سوسائٹی کے اخبار میں بھی جو ان کے سفر یورپ کے بعد تک جاری رہا، نکلے ہوئے نہایت کڑا قیمت دے کر ان کی فائلیں بھی حاصل کیں اور سرسید کے انتقال تک علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزرتی تھیں فائلیں مل سکیں، وہ بھی منگوائیں۔
ابوالکلام آزاد

آزادی کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص 253

اردو کا ناقص رسم خط

» اردو طریقہ تحریر ایک قسم کی مختصر نوعی ہے جس کے سیکھنے میں تو دیر لگتی ہے مگر سیکھ جانے کے بعد اس کے لکھنے اور پڑھنے میں مقابلہ ہندی اور انگریزی کے کم وقت صوبہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے موزوں ہے۔ برخلاف اس کے ہندی اور ناگری میں چونکہ اعراب کی جگہ حروف ہیں اور ہر حرف علیحدہ لکھا جاتا ہے اس لئے اس کا سیکھنا اور پڑھنا بہت جلد جاتا ہے اس کی وجہ سے بچے اور پوری عمر کے لوگ اسے بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور تھوڑے وقت میں کتابیں اور اخبارات پڑھنے لگتے ہیں۔ اس سے ہندوؤں میں خواندوں کی تعداد بہت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کے مقابلے میں مسلمان بچے اور پوری عمر کے لوگ برسوں میں بھی اردو کتابیں اور اخبارات پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے اور اگر کچھ پڑھنے کا سلسلہ جاری نہ رہے تو جلد بھول جاتے ہیں۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اب ہر پیشہ میں خواندہ ہونے کی ضرورت ہے پس جو قوم خواندوں کی تعداد بڑھ جائے اس میں پیچھے رہے گی وہ دماغی نشوونما اور تہذیب و تمدن میں بھی لازمی طور پر پسماندہ رہ جائے گی اور قومی کشاکش میں شکست کھائے گی۔ اسی ضرورت کو دیکھ کر جدید ترقی نے اپنے قومی حروف کو چھوڑ کر لاطین حروف اختیار کر لیا۔ بد قسمتی سے اس وقت قومی کشاکش اور منافرت کی وجہ سے کوئی صورت ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ ہندستان کے مسلمان اردو کے موجودہ حروف چھوڑ کر لاطین حروف اختیار کریں۔ اس لئے بجز اس کے چارہ نہیں کہ اردو ہی کو اس حالت میں لے آئیں کہ اس کے اعراب کی جگہ حروف ہوں اور ہر حرف علیحدہ لکھا جائے تاکہ وہ بھی تھوڑے وقت میں اپنی قوم میں زیادہ سے زیادہ خواندہ لوگ تیار کر سکیں جس پر تمام مادی اور روحانی ترقی اور دماغی نشوونما کا انحصار ہے۔ ساہ سال سے ہماری قوم کے قابل اصحاب اردو رسم الخط کو سہل بنانے میں لگے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اہم مسئلہ کو حل کر لیا ہے مگر وہ حقیقت سے بہت دور ہیں اور اندیشہ ہے کہ اس بارہ میں کوئی صحیح راستہ جلد اختیار نہ کیا گیا تو وسیع پیمانہ پر دماغی ترقی کے کام میں شکست کھا کر مسلمان ہندوؤں کے اس ملک میں اپنے مرتبہ پر قائم نہ رہ سکیں گے اور پھر کوئی بہادری اور کسی قسم کی تنظیم اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی صفات انہیں قومی کشاکش میں کامیاب نہ بنا سکے گی۔ ان حالات میں بجز اس کے چارہ نہیں کہ جب تک اردو رسم الخط سہل بنا یا جائے اس وقت تک تمام صوبوں کے مسلمانوں کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ لازمی طور پر اردو ہی پڑھیں بلکہ انھیں موقع دیا جائے کہ وہ مثل نماذ سابق کے اپنے اپنے صوبوں کے موجودہ حروف میں ابتدائی تعلیم حاصل کریں۔

» مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 549

سید طفیل احمد منگلوری

رومن رسم خط

اگر لوگ معاملہ کو ادنیٰ سطح سے دیکھ سکیں تو میری رائے یہ ہے کہ رومن رسم الخط کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ کوئی رسم الخط مکمل نہیں ہے لیکن رومن رسم الخط سب میں سہل اور آج زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اسے تسلیم کر لیا جائے اور اگر تسلیم نہ کیا جائے تو ہندی اور رسم الخط رکھے جائیں لیکن جہاں ہندوؤں پر اتنا اختلاف ہے وہاں رومن رسم الخط کو کیوں نہ منظور کیا جاسکتا ہے، تاہم مجھے یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب ہمیں تجویز کرنا پڑے گا کہ ہمیں ایسا رسم الخط اختیار کرنا چاہیے جو ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

پارلیا منٹ میں ایک تقریر

مسلمان آزادی ہند کی راہ میں کوہ گراں

یہ سہی امر ہے کہ ۱۸۵۸ء سے لے کر اب تک جب انگریزوں کے ہاتھوں سے ہندوستانوں کے ہاتھوں میں اختیارات منتقل ہونے کا مطالبہ کیا جاتا تو ہر موقع پر رجعت پسند مسلمان آٹے آٹے تھے اور نت نئے مطالبات پیش کر کے حکام وقت کی امداد کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ ان مطالبات کی تعداد سترہ تک پہنچ گئی تھی جن میں سے اتنے زیادہ مطالبات پیش ہو چکے تھے کہ ان پر زور دینے کا موقع باقی نہ رہا تھا۔ کانگریس نے ساتھ ۱۹۳۶ء کی بزرگی کے وقت کچھ مطالبات کے ترکش میں کوئی بہتر تیرائی نہ ملتا تھا آخر سر حجاج نے بھی چودھری رحمت علی کے مجوزہ پانچ کا مطالبہ اختیار کر کے اسے مارچ ۱۹۵۰ء کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ لاہور میں پاس کر دیا اور اس طرح آزادی ہند کی راہ میں سنگ گراں نہیں بلکہ مثل کوہ گراں کے لاڈالا۔

نئی زندگی پاکستان نمبر ۱۹۵۶ء

مولانا سید طفیل احمد

ہندی مسلمان نام کے ہندوستانی

”مسیر خیال یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف جو ایجنٹیشن چلا جا رہا ہے وہ خود ایکٹ میں درج باتوں کے خلاف کسی ضابطہ سے زیادہ ذہنی مایوسی کا اظہار ہے۔“

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ کسی شخص کو بھی ایسی کوئی بات کرنے کا حق حاصل نہیں ہے جسے وہ کسی بھی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔ یہ ناقابل برداشت صورت حال ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اب اقلیتی ادارہ نہیں ہے یہ ریگورڈ بھی ہی فیصلہ دے چکی ہے۔ مسلمانوں کا جو طبقہ آج اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو بھی بدل سکتا ہے۔ موجودہ ایکٹ کسی طرح بھی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات میں مداخلت نہیں کرتا۔ ایکٹ کے ذریعہ صرف کچھ انتظامی تبدیلی کی گئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا جو طبقہ اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ اپنے عمل سے پروفیسر راج مدھوک کی اس تصوری کی تصدیق کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بھارتیہ کرن کے ضرورت ہے یہ لوگ صرف نام کے ہندوستانی ہیں۔ ان کا سارا رخ نظریہ اور قدر فرقہ دارانہ ہیں وہ اس بنیادی اور انتہائی حقیقت کو سمجھنے سے منکر ہیں کہ کوئی بھی مذہبی اقلیت نہیں ہوتی۔ جب تک مسلمانوں کا یہ طبقہ یہ سمجھتا ہے گا کہ وہ پہلے مسلمان پھر ہندوستانی ہیں اس وقت تک ٹکڑاؤ ناگزیر ہے۔“

۷ جولائی ۱۹۶۷ء

کے۔ زمیندار۔ ایڈیٹر روزنامہ برتاپ۔ دہلی

ایک تلخ حقیقت

”ہندو مذہب کے برخلاف اسلام میں ایک تو دھرم کا تصور ہے اور دوسرے اس بات پر اصرار ہے کہ محمد (صلعم) آخری رسول تھے ان دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی سماجی اور روحانی ترقیوں کے بارے میں قرآن کو فیصلہ کن اور حتمی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو میری بات خواہ کتنی ہی تکلیف دہ معلوم ہو لیکن درحقیقت مذکورہ بالا خیال ہے بالکل ہی بھل۔ چونکہ مسلمانوں پر اثر رکھنے والے لوگ اپنی مصلحتوں کی وجہ سے کھلم کھلا اس بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ اس لئے کسی دوسرے ہی کو یہ بات کہنی پڑے گی کہ کسی بھی مذہب کا کوئی صحیحہ خواہ اسے خدا نے وحی کے ذریعے انسانوں تک بھیجا ہو یا وہ کسی رشی مئی کے کانوں میں گونجا ہو، زندگی کے کسی بھی میدان میں قطعیت کا درجہ نہیں رکھ سکتا۔“

ایک نیک مشورہ

’علماء کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ابھی تک ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے وہی اکیلے نگراں رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے اس میں بھی تبدیلی ہو جائے۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں کی نوجوان نسل کے دلوں میں ابھی تک علماء کے لیے ایک نرم گوشہ موجود ہے، لیکن نئی نسل تبدیلیوں کی دل سے مخالفت نہیں ہے۔ یہ لوگ ابھی تک اپنے اپنے قدم کے بارے میں یقینی طور سے کچھ طے نہیں کر پائے ہیں، لیکن جوں جوں انھیں سیکولر اور ماڈرن تعلیم ملتی جائے گی، اس بات کا پورا امکان ہے کہ علماء سے ان کا تعلق آہستہ آہستہ ختم ہوتا جائے گا۔ خود مذہبی مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی ایک ذہنی بے چینی پائی جاتی ہے اور ان کی ایک بھی خاص تعداد اپنی روایتی تعلیم سے غیر مطمئن ہو کر دوبارہ سیکولر تعلیم کا ہوں میں داخلہ لیتی ہے۔ ان لوگوں کا جب جدید مسائل سے واسطہ پڑتا ہے تو چوں کہ ان کی اکثریت اپنے مذہبی پس منظر کی دھج سے مذہب کو بالکل پس پشت نہیں ڈال سکتی، اس لیے مسائل کا کوئی ایسا شخصی بخش حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے جو علماء کی نظروں میں قابل قبول ہو یا نہ ہو، لیکن اس کے اپنے خیال میں ’جام شریعت‘ اور ’سند رائے عشق‘ دونوں تقاضوں کو پورا کر دیتا ہو۔ اگر مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کی نئی اور پرانی نسل کا یہ فرق روز بروز بڑھتا رہا اور ہمارے موجودہ علماء نے اپنے موقف پر جمیدگی سے نظر ثانی نہ کی تو اس بات کا امکان ہے کہ دیر سویر ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی قیادت کی ذمہ داری کا بوجھ ان ’نئے علماء‘ کے کندھوں پر آ پڑے۔‘

”مسلمان اور سیکولر ہندوستان“

مشیر الحق

ہم کو کہے گی خلق خدا غائبانہ کیا!

میں نہایت ادب کے ساتھ آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آج جو مورخ گذشتہ دو سو سال کی دنیا کے واقعات اور حالات لکھنا چاہے تو وہ ہماری قوم کی نسبت دنیا کی تاریخ میں کیا درج کرے؟ سوالے اس کے کردہ صفحہ جو ہماری قوم کے لئے مخصوص ہے وہ خالی ہے یا سیاہ کاریوں اور ناکامیوں کے دھبوں سے بھری صفحات کی رونق اور ناز کو خراب کرے۔ اور کیا ہوگا خیال کرنے کی بات ہے کہ جوئے کے اسلحہ کے کارناموں سے آج تک دنیا کی تاریخ کے صفحات مزین ہوں اور اخلاص کے گذشتہ دو سو برس کے حالات نوع انسانی کی تاریخ پر دھبہ لگانے کے قابل ہو جائیں۔ یہ حالت تو آج ہماری ہے۔ لیکن اب میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ہر رانی فرما کر موجودہ زمانے کو چھوڑ کر اپنے خیال میں آئندہ دو سو برس کے بعد جو حالت ہوگی اس کا تصور کیجئے اور سوچئے کہ دنیا کا مورخ اس وقت جو ہماری قوم کے متعلق حالات اور واقعات لکھے گا تو اس کے سامنے ہمارے کیا کارنامے ہوں گے؟ کیا ہماری قومی ناموس اور امت محمدی کی شان کے لئے یہ کافی ہے کہ مورخ صرف یہ لکھے کہ اس زمانے میں اس قوم میں اس قدر ڈپٹی کلکٹر ہوئے، اس قدر رنج ہوئے، اس قدر مال گزار تھے اور اتنے انکم ٹیکس دینے والے تھے، اس قدر تعداد میں مثل اور جانوروں کے زندہ کر دیا ہے۔ جبکہ انگلستان کے صفحہ پر یہ درج ہوگا کہ اس محدود تعداد کے انسانوں نے نہ صرف اپنی ہر ایک قسم کی ترقی اور پیروی کے لئے ہر ایک قسم کے سامان اپنی آزاد پسند طبیعت، قومی اتفاق، جوان مردی، جفاکشی، جان نثاری اور دماغی اور اخلاقی قوت کے اندر سے ہیا کئے۔ بلکہ ان بیش بہا عالی صفات کا خزانہ خدا کی اس محبوب قوم کے پاس اس قدر بٹھا کر اس قدر دراز مالک کی پس ماند اور مردہ قوموں کو زندہ کر دکھایا اور اپنے دماغ اور اخلاق کے وہ جوہر دنیا کی ادھ توہوں کے مقابلے میں دکھائے جس سے نوع انسانی کے شر میں اضافہ ہو گیا جبکہ جرمنی کے صفحہ پر یہ لکھا جائے گا کہ یہ قوم اپنی مشروطات کو جمع کر کے محنت اور دماغ سوزی اور قوت انتظامیہ کے زور سے علوم قدیمہ و جدیدہ کے میدان میں مسابقت لے گئی اور علم کے زور سے نہ صرف اپنے ملک کی جنگی قوت کو حیرت انگیز ترقی دی بلکہ دنیا کی آسائش کے سامان

سیدائے اور در دراز ملکوں کی دولت اپنے ملک کی طاقت کھینچ لی۔ جبکہ امریکہ کی نسبت یہ تحریر یہ کہ اس کے باشندوں نے سو برس تک عرصے میں مشکل کو مشکل کر دکھایا ایک نئے اور جوشی ملک کو تہذیب اور ترقی کے میدان میں ان مالک کے مقابل کر دکھایا جو تاریخی مرکز تہذیب و تہذیب کی کھڑکڑ رہے ہیں۔ اس ملک نے اپنی ایجادات اور مہم جوئی سستی کے ذریعے سے کائنات الہی سے انسان کے ہر قسم کی اسائن اور ضرورت اور تفریح کے سامان سیدائے کے دنیا بھر کی جیبیں خالی کرالیں اور دولت اور جدید ترقی کے میدان میں سب پر سبقت لے گیا۔

جب کہ جاپان کے 'عمان' میں یہ مذکور ہوگا کہ انہوں نے قوتی اشارہ اور ملکی قیمت میں دنیا کی کامیاب قوموں کو سبق دکھایا اور چند روز میں کس پیری کی حالت سے نکل کر دنیا کی ادا اور جکی قوموں میں شمار ہونے لگے تو مل سوان کرناہوں کو ایسی پر شوکت اور پڑھ لکھ کارناموں کے مقابل میں ہمارے قومی حالات کس شمار میں ہوں گے۔ اس لئے اس وقت سے ہم کو یہ خیال ہونا چاہئے کہ دو سو سال کے بعد جب ہماری قوم کے حالات تحریر ہوں تو اس وقت ہماری آئندہ نسلوں کو خیر و مانہ پڑے جس طرح آج ہم گزشتہ دو سو سال کے واقعات پر دنیا کے سامنے ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ پس یہی ہمارا نصب العین کا مہیا ہے کہ آج سے ہم اس ذمہ داری کو اچھی طرح کھیں کہ اب تک جو ہوا سو ہوا، اب ہماری کوشش اور تہذیب کا یہی نہ وہ ہو جو ایک سیدار قوم کا ہونا چاہئے۔

تقریر مجوزہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں (بیرسٹر ایٹ لا)

کانوں کے عیاش

اُنْتَا بڑا جمع ! کہ تھالی اُچھال دوں تو شاید ایک
نر لانگ تک وہ تھالی سروں ہی پر اچھلتی تیرتی
رہے مگر میری سینے والوں کی اس بھیڑ سے کچھ خوش
نہیں ہوں۔ تُم لوگ کانوں کے عیاش ہو، تُم
تقریر کے چٹخاروں کی خاطر یہاں آئے ہو، دوسرے
کیمپ والوں کا جلسہ ہوتا ہے تو وہاں بھی تُم
اسی ذوق و شوق کے ساتھ جاتے ہو۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر سے اقتباس

جی 1946ء

ہنگن کا ہندوستانی مسلمان ممبر

قلبی گیتوں کے علاوہ

پرائیویٹ گیت، غزل، نعت، قرأت
اور دوسرے اسلامی گراموفون ریکارڈ

ستمعونی

(ہراسپیڈ کے)
دست-یاب ہیں آپ

B68-69 - نیومارکیٹ، کلکتہ 13

18/A جی ٹی روڈ، ہوڑہ میدان

— سے طلب فرمائیں —

فون : 24-7509

فون : 67-4646

الکٹرک کاسٹرا سامان



بادرچی خانہ میں استعمال کی پیموٹی بڑی تمام چیزیں

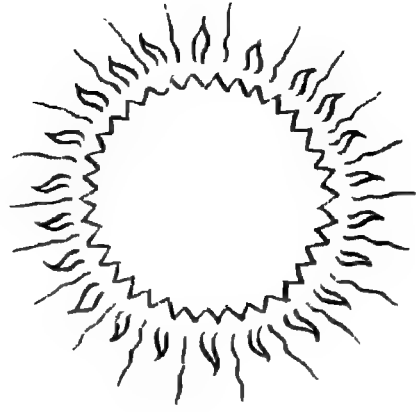
اے لطیف

B-62/64 نیومارکیٹ سے خرید فرمائیں

کلکتہ 13

حکومت ہندوستانی مسلمان شہر

سورج



یہی
تمناشائی

میں بات وہاں سے شروع کرتا ہوں
جہاں سے دوسرے تبصرہ نگاروں نے چھوڑی ہے
— فلک پیمہ



گلن کاہندستانی مسلمان تعبیر

Enjoy daily & in all Festivals
Delicious & Nutritious
Prepared from 100% Wheat

**ELEPHANT
VERMICELLI**



**HATHI CHHAP
SEV UTPADAK**

301-A, Dhanraj Industrial Estate, Sun
Mun Lane, Lower Parel, Bombay-13

ہاتھی چھاپ سیواں

نزلے ذائقہ والی، لذیذ اور لب چسپ

گھر کے چھوٹے بڑے ہر فرد کے لئے پروٹین ڈامن

اور دلکش صحت بخش اجزاء سے بھرپور کھانسیاں،

پکھن کے بعد جن کا تار مار الگ ہو جاتا ہے۔

— ہر منڈیوں میں ہر جگہ ملتی ہیں —

ہاتھی چھاپ سیواں تیار

A-301 دھڑے راج انڈسٹریل اسٹیٹ، سونے مہلے لینے اور پر دلی بمبئی 400013

صباح

(مٹکے و مریچنش)

مال کی اچھی کوالٹی اور دیانت دارانہ سودے کے ضامن

تعمیر کے مقصد کے لئے جملہ قسم کی اور اعلیٰ کوالٹی کی لکڑی

گاہک کی تسکین و تسلی کے لئے دلی تعاون

مالکان

روپے برادرین اینڈ کمپنی

محکمہ مسجد، کلیانے (کھٹانہ، مہاراشٹر)

محکمہ مالی مشاغل

گرم ہوا

ہندستان کی پہلی مسلم سیاسی فلم

فلم ساز و ہدایت کار ایم۔ ایس۔ سنجیو میسور کے رہنے والے ہیں۔ وہ کبھی نیائے شرم کی فلم ”انجلی“ میں جیتن آنند کے اسٹنٹ تھے۔ دہلی کے انڈین نیشنل تھیٹر میں ٹریڈ آرٹ ڈائریکٹر بھی رہے اور ”دیکھ تری بھئی“ اور ”ڈس کور، آف انڈیا“ جیسے ٹائلوں کے سیٹ تیار کئے۔ کچھ عرصے انگریزی جرائد ”لنک“ اور ”پٹرلٹ“ میں لے آؤٹ آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد وہ بمبئی آکر فلم ”حقیقت“ میں جیتن آنند کے اسٹنٹ ہی گئے۔ سنجیو نے اپنے دوسرے دو ساتھیوں (ابوسوئی اور ریشانی بھٹی) کے ساتھ ”گرم ہوا“ کہانی کے سوتے پر فلم نائیٹس کارپوریشن سے 12 لاکھ روپے قرض لیا اور 6 لاکھ روپے اپنے ذرائع سے فراہم کئے۔ کہانی ”گرم ہوا“ کی مصنف عصمت جغتائی ہے۔ دو ہزار روپے میں سودا طے ہوا مگر صرف 5 سو روپے دے کر عصمت سے کہانی حاصل کر لی گئی۔ چون کہ کہانی کا موضوع نرانی تھا اس لئے فلم کی تکمیل کے دوران ہی میں فلم سازوں کو یہ خطرہ لاحق رہا کہ حکومت فلم کو قابل نمائش قرار نہیں دے گی۔ وہی ہوا کہ جب فلم سنسر کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے ری کالیز کے لئے سارٹی فیکٹ دینے سے انکار کر دیا مگر سنسر کی ری وی ڈن کیٹی نے کسی کٹ کے بغیر پاس کر دیا مگر فلم کے سیاسی مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے فلم سازوں کو سارٹی فیکٹ حاصل کرنے کے لیے مرکزی حکومت سے رجوع ہونے کی ہدایت کر دی گئی۔ تب یہ فلم انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز کے منسٹر کی جانب سے چند مرکزی وزراء، پارلیا منٹ کے چند اہم ممبران، چند مدراء شہر لیا اور چند صحافیوں کو دکھائی گئی اور خصوصی طور پر وزیراعظم اندرا گاندھی کو بھی دکھائی گیا۔ فلم کو سب نے پسند کیا۔ اندراجی نے فلم کو سراہا بھی اور تنقید بھی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ تاج محل کے پس منظر کو ٹیگم میں غیر ضروری اہمیت دی گئی ہے اور دریا کا ٹوکی کے درمیان جو محبت دکھائی گئی ہے وہ بہت سطحی ہے۔ بعد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں بھی یہ فلم دکھائی گئی۔ شیخ زیدی، سنجیو کی بیوی اور ٹیگم قدسیہ زیدی (جو دہلی میں ہندستانی تھیٹر کی سرپرست تھیں) کی بیٹی ہیں اور شیخ کراچی کی تربیت دہلی اور انڈیا میں حاصل کر چکی ہیں۔ چونکہ ہدایت کار سنجیو جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں اس لئے شیخ نے فلم میں شمالی ہند کی فضا پیدا کرنے میں اپنے ہدایت کار شوہر کا کافی مات بٹایا ہے۔

”گرم ہوا“ کو مرکزی حکومت سے ذمی یک تہی ایوارڈ مل چکا ہے اور کہانی کا مصنف کو 50 ہزار روپے نقد۔

دکھنا ہیں تو اب لامحالہ اس کو اپنے روئے سے تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ اس میں ایک گورہ افعال اور اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ اس کا مطالبہ صحیح تھا یا غلط۔ میر حالی اس کو عدالت کے ذریعے حاصل کر کے اس نے اپنے بھائی کے نام میں اکوڑا اور لڑائی کے جذبات پیدا کئے ہیں اور ان کی طرف سے اس کے دل میں آگ اور ہے اس بنا پر اگر اسے کوئی طعن دے یا کوڑی سیلی کوئی مات لے بھی تو وہ کسی نہ

مولانا مسیح احمد اکبر آبادی نے ایک بار لکھا تھا ”تقسیم کے بعد ہمارے نزدیک مسلمانوں کی پوزیشن اس شخص کی سی تھی جس نے کسی جن یا مطالبے کے لیے اپنے بھائی کے خلاف عدالت میں مقدمہ چڑھا ہوا اور اس میں کامیاب ہو گیا ہو۔ چون کہ یہ شخص مقدمہ بہت گیا ہے اس بنا پر اس کا مطالبہ تو اسے ضرور ملے گا لیکن اس کے بعد اگر اس شخص کو اپنے بھائی کے ساتھ رہنا سہنا ہے اور خوش گوار تلقین

آن کرے اور بہت کرباب ترکی بڑی دینے کی کوشش کرے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی خدمت، اپنے عمل جس انسانی کے مبالغوں سے اس رنگ اور میل کپیل کو دور کرنے کی کوشش کرے! مقدمہ مارنے کے بعد اس کے بعدانی کے قلب و دماغ پر جم گیا ہے۔“

ہندوستان میں مسٹر جناح کے چھوٹے، سنے مسلمانوں نے بہتر سے بہتر لائحہ عمل دی ہو سکتا تھا جو ادیریاں یا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس بہت کچھ عمل کیا اور نہ آج وہ میں پر عمل کرنے سے لے تیار ہیں۔

آئیے اب فلم ”گرم ہوا“ کی بات کریں
”گرم ہوا“ ضرور دیکھئے۔

جسٹیم گنا بھی ہے اور قوت شفا کی بھی حامل ہے!
”گرم ہوا“ کہانی عصمت نے اپنے ان دو افسانوں ”جڑیں“ اور ”چوتھی کا مڑا“ کو ملا کر لکھی ہے جو بہت پہلے اردو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور کئی صورت میں عصمت کے ماضی مجموعوں میں بھی شامل ہیں کہانی کا زمانہ حیدرآباد کے گھر کے ایک خانہ ”بیتل“ سے لیا گیا ہے۔ فلم کا منظر نامہ کتنی اعظمی اور شمع نے مل کر لکھا ہے، مکالمے اور ایک قوالی تنہا کتنی ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

بات آٹھ تہر کی ہے اور زمانہ اکتوبر 1947ء کا ہے۔

اس کہانی کی جو خوبی سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کہانی کے سارے ہی کردار اور واقعات جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔ ابتدا سے اختتام تک اس موڈ کو برقرار رکھا گیا ہے جو موسط طبقے کے لوہڑوں کی مسلمان کنکوں میں رچا بسا ہے۔ اگرچہ سارے کردار ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں مگر عمر اور تعلیم کی بنا پر ان کے طریقات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سلیم مرزا کے بڑے بھائی فہیم مرزا اور بیٹی فخر آفرین مسیح خدہ مسلم خدہ ہی دسیاسی اصول کے پلے ہوئے کٹ قابیل نے۔ بہادر انسان ہیں مسلمان کو ہندوستان میں کشمکش کا ستورہ دیتے ہیں اور خدہ پاکستان پر رہ جاتے ہیں۔ چھوٹے بھائی سلیم مرزا اپنی محنت، دیانت داری اور اپنے خدا پر اعتماد رکھتے ہیں، اور پڑھا لکھا ہیں کہ حالت سدھرتا میں گھر بھر رہا کا زباہہ ساتھ نہیں لے پاتے۔ زباہے کا رخلے تو مارن ہاے کے لئے

تیار ہیں اور زباہے مبالغات کی خاطر اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہڑتال کا شکار دیتے ہیں اور نہ ہڑتال کے جس میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر ٹاٹا یا ترمز زائد ترقی پسند ہے وہ کارخانے کو جدید ڈھنگ کا بنادینے کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہے مگر باپ مانگ لے لے ہیں اور آخر وہ کئی حالات سے گھبرا کر پاکستان چلا جاتا ہے۔ نو عمر سکندر مرزا جو گروا بیٹا ہے اور کھلے ذہن کا نوجوان ہے تھوڑی ہی سی جدوجہد کے بعد اس نوجوان پرستی کے کہ وہ گار کا مسئلہ فرقہ وارانہ کم، اقتصاد کی زیادہ ہے اور بے روزگاری کسی مخصوص فرقے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک طبقے داری پر مبنی ہے اور اس کو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سب ہی کے ساتھ مل کر حل کیا جاسکتا ہے۔ سکندر مرزا ہی کا ترقی پسند و راندھیرے میں روٹی دکھاتا ہے یہاں تک کہ غم زدہ بات جو بھٹک چلا تھا وہ اپنے اس چھوٹے بیٹے کی دکھائی ہوئی روشنی میں راہ حیات طے کرنے لگتا ہے۔ نسل نو زندہ یار!

کہانی میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ حقیقت کے اتنے قریب ہیں کہ وہ ہم کو اپنی ہی زندگی کے دکھ اور شکم معلوم ہوتے ہیں۔ گھر کا ہر فرد حویلی خالی کر کے باہر آ جاتا ہے مگر ادائی آماں اپنی حویلی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ڈھونڈنے پر تباہ جلتا ہے کہ وہ گھر کے ایک کونے میں چھپی بیٹھی ہیں۔ یہ ان کو یا کی میں لٹا کر سے گھر سے پلٹی حویلی میں لایا جاتا ہے تو انھیں وہ دلہ یاد آتے ہیں جب وہ ایک کم رسن دلہن کی صورت میں ڈولے میں بیٹھ کر اس حویلی میں آئی تھیں، کہانی کے یہ وہ ٹکڑے ہیں جو دامن دل کو کھینچتے ہیں۔

شاید اردو افسانہ نگاروں میں عصمت وہ واحد افسانہ نگار ہیں جو مسلم گھریلو تشویشوں کے عادات و اخلاق و مزاج کو سب سے زیادہ سمجھتی ہیں۔ رادائی آماں دو بیویوں کی ساس ہیں اور یہ بڑا اتفاق ہے کہ ان کی سستی ہیں پنهان چہ جب بیوی اور بھتیجا آئیں ہیں بائیں کرتی ہیں اور ان کے ہلے ہوئے لبوں پر رادائی آماں کی نظر پڑتی ہے تو وہ فوراً کہہ بیٹھی ہیں: ”یہ کیا چپکے چپکے میری برائیاں ہو رہی ہیں!“ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ پاکستانی بھان ان کے لئے چھوٹے ہیں کہ ثبوت دیتے ہیں جیسا کہ جب سلیم مرزا کی بہن پاکستان سے آئی ہے تو اپنے اور اپنے پاکستانی شہر داروں کے لئے کپڑا تو ہندوستان ہی کے بازار سے طویقی ہے مگر کتنی ہی ہے! ”اے وال کیا بڑا چا دل ہے پک کہ یہ یہ لبا ہوتا ہے!“ مسلم معاشرے میں وہ مادی ہے جو روٹی کی اہمیت سے انکار کرتا ہے، دنیا پر دنیا کو ترجیح دیتا ہے مگر کون نہیں جانتا کہ وہ اپنی روٹی ہی

لے لے مسلم معاشرے میں انتشار کا باعث بننا ہے متعلقہ امور کی فہم دہانی
 دھواں دھارے میں فروانے کی کھانے پر کتنے ہرا کرتے ہیں رکٹ کر کے کمرہ
 خوان پڑتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی نسیم مرزا اپنے دونوں ہاتھوں میں سرخ کی
 ٹانگ لے کر ہوئے 'منہ زردی' فرما رہے ہیں اور اس 'منہ زردی' کے بعد یہ بھی فرما
 ہیں کہ ان کا پاکستان چلا جانا ہی بہتر ہے۔ یہ ایک انتہائی حقیقت آمیز طریقہ ہے۔
 یو۔ پی کے پرانے گھڑوں میں یہ شگون عام ہے کہ مکان بدلتے وقت جو
 مکان چھوڑتے ہیں اس کا چھٹا توڑ دیتے ہیں تاکہ اپنی روزی اینسے ساتھ لے جائیں۔
 یہاں بھی نسیم مرزا کی یو۔ پی کوئی کو خیر باد کہتے وقت پاؤں مار کر چھٹا توڑ دیتی
 ہے۔ سبب اس کی حالات کی بنا پر جب نسیم مرزا افسوس خاطر ہو جاتے ہیں تو کھانا نہیں
 کھاتے اور کمرے میں جا بیٹھتے ہیں اور یو۔ پی کے منالے پر بھی نہیں بیٹھتے۔ جب یو۔ پی
 اور دھنی کے یو۔ پی چھٹا کر کھانا لے کر جاتی ہے اور بتاتی ہے: "چھٹا کر لائی ہوئی
 لو کھاؤ" تو نسیم مرزا کرے کی گنتی لگا کر فوٹن کھانا کھانے لگتے ہیں۔
 یو۔ پی کے متوسط دیبے کے گھروں میں فرسٹریشن کی ماری جو زندگی پائی جاتی
 ہے یہ بات اس کے بہت ہی قریب ہے۔

اگرچہ کہانی مختلف مزاج کے کرداروں پر مشتمل ہے مگر کرداروں کا وزن
 یکساں ہے۔ اگر ایک مشرب ہندو مسلمان کے کارخانے کو آگ لگا دیتا ہے تو
 سندھی سیٹھ ہندو اور خرنارنگی ہونے کے باوجود آخر وقت تک مسلمان نسیم
 مرزا کا ہم در نہایت ہوتا ہے۔ نسیم مرزا کے کارخانے کا ایک ملازم افواہیں
 پھیلاتا ہے اور اپنے دوغلے پن کا ثبوت دیتا ہے دوسرا ملازم جو نسیم ہے
 وہ کا رخا نہ چل جانے کے بعد بھی نسیم مرزا کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں،
 جبکہ یہ دونوں ملازم ہندو ہیں۔ اسی طرح ایک کردار چلے والے کا ہے جو جنگ
 آزادی میں حصہ لے چکا ہے اور اپنی ایک ٹانگ حصول آزادی کی نذر کر چکا ہے
 وہ نوجوانوں کا دوست ہے اور زندگی کی ہیرا آمانی میں ان کا ساتھ دیتا ہے
 جو نوجوان اس سے مدد حاصل کرتے ہیں ان میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی اور
 سیکھ بھی۔ جب کہ وہ خود مسلمان ہے۔

لیکن متوسط طبقے کے ایک تقلید پسند مسلم گھرانے کی کواری ریتی کا
 اپنے منگیتر کے ساتھ اپنے ہی شہر میں گھومنا پھرنے اور جنسی اختلاط کا مرتکب ہو
 کر اپنا کنوارا پن گنوا دینا کہانی کا نہ صرف ناقابل یقین ٹکڑا ہے بل کہ کہانی
 کے مزاج کا بھی ساتھ نہیں دیتا۔ ہدایت کار نے جس طرح 'مڑا لڑکی' کا شہر کے
 گلی ہوٹل میں کوہ تلاش کرنے کے سین کو موزن نہ سمجھتے ہوئے کاٹ دینا

بہتر خیال کیا اسی طرح ضروری تھا کہ جنسی اختلاط سے متعلق کتنی کے اس صطر
 کو بھی ڈال دیا جاتا۔ اور اگر ہیروئن کے لئے ہڈی کرنا ضروری تھا تو اس
 کے لئے کوئی اور جواز پیدا کیا جاسکتا تھا۔
 البتہ کہانی کا یہ اشارہ تو بہت ہی اصلاحی، مفید اور معنی خیز ہے کہ
 نسیم مرزا ہر حال اور جلوس کے سلسلے میں اپنے ہی ہم پیشہ لوگوں کا ساتھ نہیں
 دیتے، بیشا نماز کا بہادر کرتا ہے اور باپ روزوں کا۔ اور سبب ہر حال کے
 نتیجے میں مرعات حاصل ہوتی ہیں اور ان سے نسیم مرزا کو محروم رکھا جاتا ہے تو پھر
 نسیم مرزا پکھتاتے ہیں، لے

کہانی کا انجام ظاہری ہے۔ نوجوانوں کے جلوس کا لال چھٹا یہ اشارہ کرتا ہے
 کہ مسلمانوں کی مشکلات کا حل یہی ہے کہ وہ اشتراکیت کو قبول کر لیں اور یہ
 بھی کہ سرخ انقلاب ہی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کی زد سے بچا سکتا ہے۔ اور
 کتنی کی کئی ہوئی یہ بات بھی کہ دھاکے میں مل جاؤ تو بچ جاؤ گے دھارا،
 واضح کرتی ہے کہ ہندوستان جیسے سوشلسٹ اور سیکولر ملک میں کبھی انقلابی فرتے
 کا قومی سماج کے عام دھاکے سے کٹ کر رہنا اکثریتی فرتے سے زیادہ آسا
 کے اپنے لئے نقصان کا رہے اور یہ بھی کہ انقلابی فرقہ رخت زدہ رہ کر زیادہ
 عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا، غلط فہمی خوف، پیدا کرتی ہے اور مل جل کر
 رہنے ہی سے غلط فہمی دور ہو سکتی ہے۔

ملہ ٹی۔ وی کے ایک انٹرویو میں کتنی اعظمی سے یہ کہا گیا تھا کہ ان کی فلم اپنے مولد
 کے اعتبار سے آڈٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے جواب میں کتنی نے کہا تھا کہ حالات
 تو آج بھی ایسے ہی ہیں نہ جانے کتنی صاحب کے خیال میں حالات نہ سمجھا
 کا ذمے دار کون سا فرقہ ہے مگر یہ سلسلے کی بات ہے کہ سبب اقصا کے
 جیسے غیر ملکی مسئلے پر ہندوستان کے ڈھائی لاکھ مسلمان کھن سر سے باندھ
 کر جلوس نکال سکتے ہیں اور اپنے غنیمت و غضب، جوش اور روا، دلے کا ثبوت
 دے سکتے ہیں مگر وہ آج بھی اپنے ملک کے کسی قومی مسئلے پر کسی غیر مسلم کے ساتھ
 شانے سے شانہ ملا کر جلوس میں شامل ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔ ہر حال یا با زلہ
 ہند کے سلسلے میں شہر کا ہر بازار بند ملے گا مگر مسلمان محلوں کی دکانیں ہمیشہ
 کھلی ہی رہیں گی۔ جو ہندوستانی مسلمان یہ جانتا چلتے ہیں کہ قومی دھاراکا
 ہے اور قومی دھارے کے ساتھ چلنا چلنا کیسے کہتے ہیں ان کو 'کلم' گرم ہوا،
 کے ہر حال دالے اس منظر سے جواب مل سکتا ہے۔

روایتی ڈگر سے ہٹ کر چلنے میں کچھ غرضیں بھی ہوتی ہیں چونکہ گزرم
ہوا، ایک تجرباتی فلم ہے۔ اس لئے اس میں بھی ایک دو جگہ قبول موجود ہے
کہانی 15 اگست 1947ء کے دنوں بعد کا زمانہ پیش کرتی ہے۔ اس زمانے
میں پاکستان جانے کے لیے نہ پرمٹ کی ابتدا ہوئی تھی، نہ پاس پورٹ کی اور نہ
دیباچہ کا سوال پیدا ہوا تھا جانے والے اپنی جائے داد سمجھتے تھے اور بڑی
ٹری ریس لینے ساتھ لے جاتے تھے۔ ان دنوں حکومت پاکستان نے اپنی
کڑی سی جاری نہیں کی تھی۔ اس لئے انہیں زمینی پولیٹیکل کانسٹیبل میں جانے اور
آمنہ کے منکیر کاظم کے پاس پورٹ کے بغیر آنے اور گزرتا رہنے کا کوئی سوال
نہیں پیدا ہوتا۔ اسی طرح نسیم مرزا کے کرے میں مسلم لیگی لیڈروں کی جو تصویریں
دکھائی گئی ہیں ان میں یاقوت علی خاں کی وہ تصویر بھی ہے جس میں وہ مکتانے
ہونے دکھائی دیتے ہیں۔ یاقوت علی خاں کی یہ تصویر بھی بہت بعد کے زمانے سے
تصنیع رکھتی ہے۔ ایسی 16 اکتوبر 1957ء کو کراچی میں یوم استقلال کے موقع پر
یاقوت علی خاں نے تقریر کرتے ہوئے ایسا مکتان کر ہندوستان کا ذکر کیا تھا
مکالموں میں مغربی لپٹی کی زبان اور محاوروں کو ملحوظ رکھا گیا ہے
بعد مرور سے طنز و مزاح بھی ہے۔ ”یہ اخبار کہاں کا ہے؟ دلی کا!“
اسے کیا پتا دلی میں کیا ہو رہا ہے، لوہ لاپور کا اخبار پڑھو!“ لہ جب
آزادی ملی تو کتنے بالائی کھانے لگے!“ ”جسے“ ہوا بڑی گرم ہے جو اگھر سے
گاہیں وہ ٹوٹ حائے گا!“ ”نئی سی آزادی ملی ہے سب اپنا اپنا مطلب
نکال رہے ہیں!“ ”سراون کی ہریالی دیکھنے کے بعد سوکھا بھی دیکھنے کے لئے
تیار رہنا چاہئے“ اور کانسٹیبل کے ایک افسر کے آن کی محض جوابی
اماں کے کام میں پڑنے سے تودہ کچھ ہیں: ”میں نے تو دو ہی بیٹے جنے تھے یہ تیرا
کون آگیا؟“ ”غرض کہ فلم کے اکثر مکالموں میں کافی مصنویت ہے۔

اداکاروں میں صرف جلال آغا بھی کو قطعی طور پر نئی اداکار کہا جاسکتا
ہے باقی سب اداکار انہیں جو پلڑے تھے ٹرائیو سی ایشن، ہندوستان تھے

لے آج بھی ہندوستان کے اکثر مسلمان آل انڈیا ریڈیو کی خبروں پر کم پاکستان ریڈیو
اور بی بی سی سے نشر ہونے والی خبروں پر زیادہ یقین کرتے ہیں۔ تہہ کہ
جے جے اے 1947ء سے قبل جو مسلم لیگی اور شریعتی فرقہ پرست تھے وہ آج
اتنے زور سے قوی گجٹی کا نروہ لگا رہے ہیں کہ جو بھی معافی میں قوم پرست رہے ہیں
ان کے شریفانہ آواز دب کر رہ گئی ہے۔

ہنگامہ ہندوستانی مسلمان بعد

ٹر (دہلی) پر تھوڑی تھوڑی اور دہلی کے ٹی۔ سی۔ اسٹیشن سے تعلق رکھتے ہیں۔
اداکاری کے اعتبار سے فلم ”گزرم ہوا“ بل راج ساہنوی کا واداعی کارنامہ ہے اس
فلم میں اس نے اپنے فن کا وہی اعلا معیار پیش کیا ہے جو ”مہم لوگ“، ”دو بیگے
زمیں“ اور ”ہیرا سنی“ جیسی فلموں میں پیش کیا تھا۔ اس فلم میں وہ مندرجہ سبھ
سے مال بیلانی کرنے کے سلسلے میں جس خشمناز انداز سے مہلت چاہتا ہے
اُس سے اس کا فن اداکاری اپنے معراج پر پہنچ جاتا ہے۔ گیتا جو اب تک دیو
یانی کے نام سے ڈراموں میں کام کرتی رہی ہے۔ یہاں آمنہ بنی ہے اس نے اپنے ہر
منظر میں اپنی بے جا لگی، بے بسی و محبوری اور محبت کا اظہار بڑے ہی معصوم انداز
میں پیش کیا ہے۔ آمنہ کے روپ میں اُسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ لڑکی ہنڈ
ہے اور اردو نہیں جانتی۔ سلیم مرزا کی بیوی کی صورت میں شوکت کیفی کی اداکاری
بھی متاثر کرتی ہے۔ شوکت نے اپنے رول کے وقار کو بھی برقرار رکھتے ہوئے
ٹی۔ سی۔ کے دینا ناٹھ رتنی نے نسیم مرزا کے بدل میں نقل کو اصل کر دکھایا ہے۔
البتہ فرقہ پرستوں کے رول میں یونس پرزید کی اداکاری تصنیع آمیز ہے مگر بڑے رول کے بدلے
میں اوسو یا پاکستان جاتے جاتے اپنی اچھی اداکاری کا نقش چھوڑ جاتا ہے۔
جلال آغا (ششاد)، جمال ہاشمی (کاظم)، اور فاروق شیخ (سکندر) میں فاروق
نیا دہ کامیاب رہا ہے۔ وہ اپنی عیب اور اپنے ذہن سے نئی نسل کا موزوں
ترین نمائندہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بڑا اتفاق ہوا کہ اس کے ہنگامہ جیسا
آرٹسٹ یہاں غلط رول کے لیے انتخاب کیا گیا وہ کردار کے تقاضے کے مطابق
مندرجہ لب و لہجہ صحیح طور پر پیش نہیں کر سکا۔ تا نگلے دالے کے رول میں وہ کاس اور
ہندو نسیم کی حیثیت سے راج درما بڑے نہیں رہے۔ ششاد کی اماں کی صورت

لے دراصل کہانی کا یہ کردار تقسیم ملک سے قبل کے مشہور مسلم لیگی لیڈر جدوہری
خلیق آزماں کا حیرہ ہے۔ انہوں نے اسی میں ہندوستان کا دفا دار رہنے
کا حلف اٹھایا تھا۔ مگر جب حکومت ہند کی جانب سے خیر سگالی و فدا لے
کردہ پاکستان گئے تو پھر یہ کستان ہی کو پیا سے ہو گئے۔ اسی طرح دہلی
کے بھگت جیش خاں کی مسجد میں مولوی یونس نے جمہور کی نماز پڑھائی اور
قرآن کی ایک آیت کے حوالے سے مسلمان نمازیوں کو اپنے ملک کا
وفادار رہنے کی نصیحت کی۔ اور خدہ پنچر کی صبح کو پاکستان خزا
ہو گئے۔

شہ کے

میں ماما بزرگ نے اپنا جھوٹا سادول خاصہ اچھے انداز میں نبھادیا ہے مگر ان فلم کی ساری کاسٹ میں ناقابل فراموش دو دورہ بدترین کام ہے جو دای آماں نبی ہیں حیرت ہے کہ انھوں نے کمرے کی موہوگی تھیں محسوس ہیں کی۔

ہدایت کا ردِ تقیہ نے فلم کے ہر پہلو پر نظر رکھی ہے اور اسے بہت حد تک کامیابی ملی ہوئی ہے۔ ہدایت کا رکارڈ کا کمال یہ ہے کہ اس نے صحت سے کام نہیں لیا، حقیقت کو ہر پہلو سے پردے پر پیش کر دیا ہے اس نے اپنے اداکاروں کو گیم پر خنسا ہے اور نہ درد دیوار کو سجا یا ہے۔ اس فلم کا تقریباً ہر حصہ اگرے کے ایک محلے میں فلمایا گیا ہے چنانچہ وہ تنگ گلیاں دردناک کیوار، کنڈی، آگن، دالان، کوٹھے، زینے، چھوچھو، ٹوٹی دار لوٹے پانی کی موری مسلمان گھرانوں کا دعائی گنڈاپن، کچل چھت اور چھت سے پانی ہوئی جالی دار دیوار اور دیوار کے کچے پیگسہ ڈانے کے مہانے کی کاظم کا اپنی آنسو سے چھپ چھپ کر باتیں کرنا کہانی کے تقاضے کے اس حد تک مطابق ہے کہ دیکھنے والا محالہ اپنے آپ کو اسی محلے کا ایک فرد سمجھنے لگتا ہے۔

ہدایت کا کارکیہ قدرت بھی پسند کے لائق ہے کہ اس نے کردار کی نامندگی آواز سے بھی کرائی ہے۔ سٹی دیتے ہوئے ریل کے انجن کا ٹھوڑا سا حصہ دکھا کر وہ یہ خوب واضح کر دیتا ہے کہ آج ایک اور مسلمان پاکستان کو بیا رہا ہوا، اس طرح دفتر میں پہنچنے والے ضرورت مند کو لہ دکھایا جاتا ہے مگر صاحب دفتر کو نہیں،

لہ رامہ نہیں آئی، ایس جوہر کی سابق بیوی ہے، اس نے دوسری شادی نہیں ساب لوک سے کی جو کبھی نیائے شرم کی ناکمل فلم پہلے برت کا لے چو، ایس نیکی کے مقابل ہیرو تھا، اب کیا جوہر رامہ کی بیٹی ہے۔ رامہ آج کل، بھی کے ناج محل ہوٹل کے ہلپتھ کلب کی ان چارن ہے۔ — شے ک 75 سالہ بدترین دراصل اگرے کی انہی گلیوں کی دریافت ہیں کہ جن گلیوں میں گرم ہوا کی شوٹنگ ہوئی تھی — شے ک

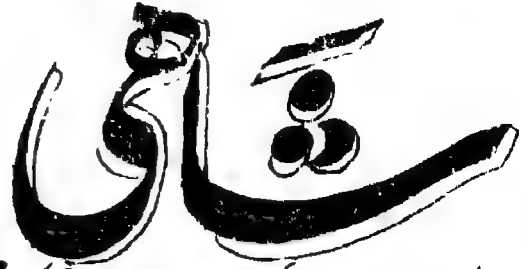
فون پر ہونے والی ایک ہی طرف کی بات سے دونوں طرف کی بات سمجھ لیا جاتی ہے۔ — مگر تاج محل اور فتح پور سیکری کے طویل مناظر دیکھنے والے یہ تاثر چھوڑتے ہیں کہ وہ کوئی نچر فلم نہیں بل کہ ایک دستاویزی فلم دیکھ رہے ہیں البتہ فوٹو گرافی اچھی ہے تاج محل کے سامنے کی روش ہو یا شہر کی جنگ و تارک لگی، کیرائین انسان آریانے دل چاہی اور نہ سے داری کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دیا ہے، لیکن صدا بندی درست ہیں، خصوصی طور پر کلاؤف کی ڈبلگ انتہائی ناقص ہے، اسی بنا پر وہ قوائی جو درگاہ پر پیش کی گئی ہے ناقابل سماعت ثابت ہوئی ہے، بیک گراؤنڈ میوزک بھی سب جگہ یکساں نہیں ہے، جو بھی چھوڑتے وقت جب دای آماں تقبی سٹی میں ہوتا ہے کے سب افراد ان کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، موزک بیک گراؤنڈ میوزک کی ضرورت تھی، جب کہ یہ سین لیکر کی آواز کے پیش کیا گیا ہے اور اس کا بڑا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ساری بات مٹ کر خیر بن گئی ہے جب کہ اس بات کو برکت آمیز ہونا چاہیے تھا۔

اس فلم کی تیاری کے سلسلے میں شمع زبیدی، باب اعویس تارہ جعفری کے نام بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے فلم کی کاسٹنگ کی تہذیب، ذوق و شوق اور فنش کو ملحوظ رکھتے ہوئے فلم کے مختلف گوشوں کے لئے مختلف وضع و تراش کے لباس تیار کئے ہیں جو فلم کی سچائی میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔

اپنی جرات مندانہ کوشش کی بنا پر اس فلم کے بنانے والے داد کے مستحق ہیں، انفارمیشن اینڈ بلڈ سٹنگ مشنری بھی تعریف کے لائق ہے کہ جس نے اس فلم کو قابلِ ناخش سمجھا مگر سب سے زیادہ وہ ہندو سلوج داد دستاؤش کا حق دار ہے کہ جس نے اس فلم کی ناقش کو ہندو سلوج کیا۔

اطلاع کے طور پر عرض ہے

امدادہ تو مرت 400 صفحوں کا تھا مگر بات بڑھتے بڑھتے 600 صفحات تک جا پہنچی۔ پھر بھی ادارے کی کئی تخلیقات پر ان بزرگ و محترم فلم کاروں کی تخلیقات کو ترجیح دی گئی کہ جن سے فرمائش کی گئی تھی۔ اسی لئے اس نمبر میں جوش کی کتاب 'یادوں کی بارات' پر طویل مضمون شامل نہیں کیا گیا سکا۔ قدرت نے چاہا تو یادوں کی بارات میرے لیے ہو کی آگ غالب منشاسی رہے۔ گناہ کا رشتہ اور طوطیان ہند پر آئندہ شماروں میں سیر حاصل تبصرے شائع ہوں گے۔ — ذیاب



طیبی دواخانہ کی مایہ ناز پیش کش

حیاتین اور کیلشیم سے بھرپور۔ صحت دماغ و اعصاب کے لئے مفید۔ افزائش خون کے لئے عودہ
دل و دماغ کو قوت بخشنے والی، نظامِ معدہ درست رکھنے والی۔ تندرستی قائم رکھتے ہوئے قوت
اور طاقت بڑھاتی ہے۔ امراض سے محفوظ رکھتے ہوئے حوصلہ و امنگ پیدا کرتی ہے اور کام کی طرف
رغبت پیدا کرتی ہے۔ ضعف دماغ کے مریض عموماً انسیان میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ دل و دماغ کو قوت
دے کر باغ و بونہر خیالات کی پراگندگی دور کرتی ہے۔

طیبی دواخانہ (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ

فون
324883

محمد علی روڈ ممبئی 77 -

51 بوہرا بازار۔ اندور

33334



GAY ICE CREAM

شادی بیاہ
اور خوشی کی ہر تقریب پر

لذیذ، لطیف

اور راحت بخش

آئس کریم کے لئے

گے آئس کریم کو

یاد رکھئے

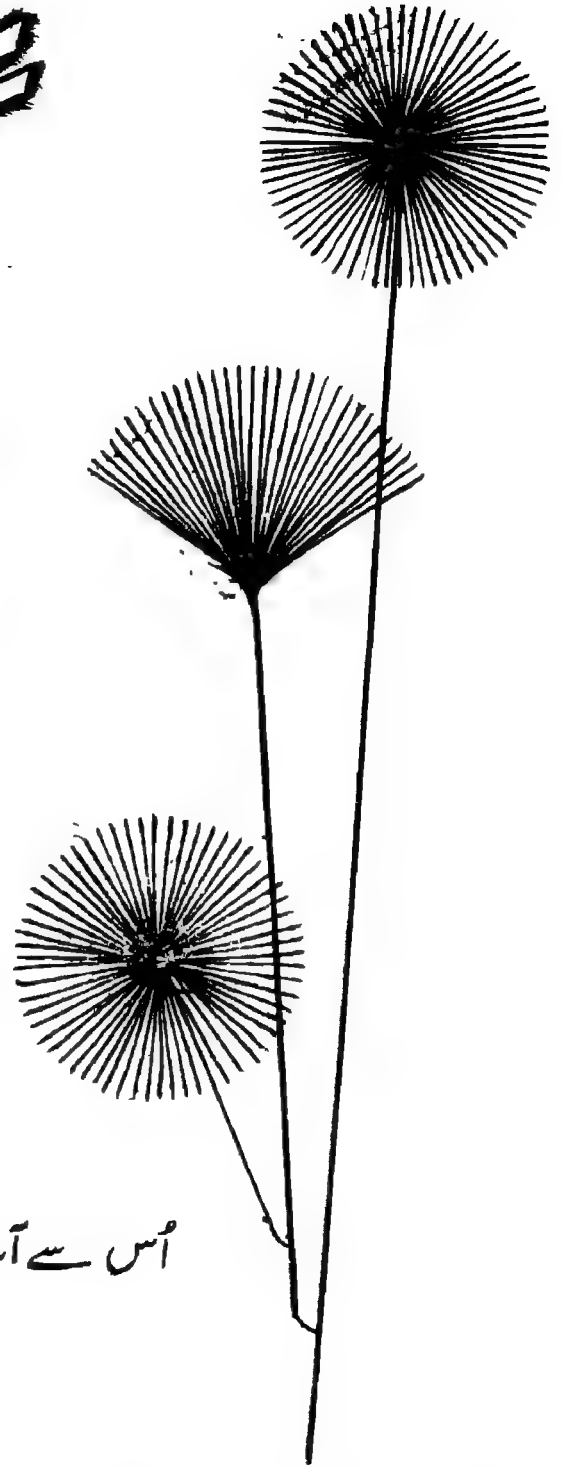
بڑے آرڈر پر خصوصی رعایت

فون: 376713
379247

پتا
52-A مرزا غالب مارگ، نزد اجڑی کھنٹی، ممبئی 8

گلن کاھندستانی مسلمان نمبر

گلزارِ
نماز



جس نے جو کچھ کہا ہے،
اُس سے آپ اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہیں
— عبدل غفار

اگر بتیوں کے دُنیا میں انقلاب

ہندوؤں کے پھول اگر بتی — اپلو جوال جبتی نمبر ۱۰۳

ملی ہندو غنائے میں پہلا انعام پانیوالی

سُگندہ مالا اگر بتی

ہندوستان کے چپے چپے کو سوتا کر رہی ہیں آپ بھی آزما لے

تیار کردہ: اے۔ ونے اگر بتی کمپنی

103۔ سینٹ جانس چرچ روڈ، بنگلور۔ 560005 فون: 52325

دھلی میں مسلمانوں کے ٹھہرنے

کی سب سے اچھی جگہ

آرا دار احمدی ٹریڈ

ارو بازار جامع مسجد دہلی

فون: 262128

حکومت ہندوستانی سدا سدا

گلگن فروری ۱۹۶۳ء سے جون ۱۹۷۴ء تک ایک نظر میں

صفحات	3988 عدد
شمارے	64 عدد
نمودہ بحر (اداریہ)	64 عدد
انتقادات (شذرات)	کل 330 عدد 150 متفرق مسائل پر۔ اہم شذرات کی ایک جامع فہرست اشاریہ میں شامل ہے۔
مضامین	گلگن کے 11 1/2 برس کے زمانہ اشاعت میں کل 500 مضامین شائع ہوئے، اشاریہ میں منتخب اہم مضامین کی فہرست شامل ہے، ساتھ ہی انہیں ضمون کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی ہے۔
نشان راہ (استفسارات کے جواب)	اس مستقل عنوان کے تحت 407 عدد استفسارات کے جواب دیے گئے، کل استفسارات کی موضوعات و اقسام کو کمر کے صفحہ نمبر اور ماہ و سال اشاعت کے اندراج کے ساتھ فہرست تیار کی گئی ہے۔
سورج بھی تماشائی (تبصرے)	کل 264 عدد تبصرے، کتابوں، جریدوں، مشاعروں، فلموں، ڈراموں اور متفرق پروگراموں پر کئے گئے تبصروں کی مکمل فہرست صفحہ نمبر اور ماہ و سال اشاعت کے اندراج کے التزام کے ساتھ درج ہے۔

اَفِئْتَا فِئَق

پیشہ صحافت، آل انڈیا اردو ایڈیٹر کانفرنس، مولانا قاضی علی گڑھ، اردو اخبارات کی فرقا پرستی، ریڈیو سنس، اعجاز صدیقی، ہماری زبان اردو نامہ، نقاش اور فیضی نظام پوری، اردو جرائد کے مسائل، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، انجمن ترقی اردو شاخ ممبئی، ٹائمز آف انڈیا کیلکٹن کی تعصب پرستی اردو کیلکٹن یعنی کے سرخ سوار، مولانا عبدل ہادی، جعفری برائند دیوان، قاتل، ودیلن تیر، جاسوسی ناول، قاتل کی صد سالہ برسی، انداک کی قاتل شہنشاہی، سرخوں کی اردو دشمنی، جشن کرشن چندر، روس کی فلو، فواری، فیض احمد فیض، خدیجہ حمید انصاری اور انقلاب، مکتبہ جامعہ کی کیونسلٹ فواری، میر ہمارے زبان آل احمد سرور، ڈاکٹر صفیر آہ، مکتبہ جامعہ کا اردو قاعدہ، شہاب آدین، مسعودی، مشاعرے اور سے خوش شعراء، مکتبوں کی مستعد بازی اور لوٹ مار، فلو انصاری اور آئینہ، خاجا احمد عباس کی فلمی صحافت، جوش کی تبدیلی وطن، مشاعرے بازیوں، اردو قسم کا اردو زبان کی غلطیاں، ساتھ ساتھ اکاڈمی کی بے انصافیاں۔ بے ازم ادیب، صحافی اور شاعر، راجندر سنگھ بیری

نہرو فیملی اور کپور فیملی، انڈین سینٹرل کانگریس، مسلم لیگ کی فرقہ پرستی، کانگریسی بنیتا، سینڈ نہرو، آصف علی میموریل فنڈ، مسلم پرسنل لا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سرمدیاداران نظام، مجسمہ می، احمد آباد، جل گاؤں کے فسادات، جمہوریت اور جنازہ، شیو سیکائی، ہنگامہ آرائیاں، بین الاقوامی اسلامی کانفرنس، مسلم پرسنل لا خواتین کانفرنس، پاکستان کی جارحیت، سنگا دیش کی کام پالی، فاطمہ جناح، شیخ عبداللہ اور کشمیر، ہندوستانی اقلیتیں، فرقہ وارانہ فسادات، بھونڈی میں مناظرے بازیوں، بادشاہ خاں، جے پرکاش نارائن، عورتیں جھوٹے پاکستان تباہ کیا، کانگریسی ٹیکس اور غریب جتنا، غریب ہٹاؤ اور سولہ ایوب خاں کی شکست، مسلم دودھ، بھوستان اور ہنگامہ آرائیاں، کانگریسی ایڈمنسٹریشن، انٹر پرائسز کے پھرنے کے اسباب، ذرا کے دوسرے، الیکشن یا کرپشن، ڈاکٹر رفیق زکریا، اندرا گاندھی کی کام دیکھ کانفرنس میں شرکت، سیلاب اور خشک سالی، سرحدی تنازعے، سرکاری اعزازات، مسلمان کانگریسی میٹروپولیٹن، ڈاکٹر زکریا، اندرا گاندھی، الیکشن اور سیاسی پارٹیاں، کانگریسیوں کی ادھام پرستی، پنج سالہ منصوبہ بندیوں، اسلامی کانفرنس لاہور

شیخ اسحاق نساد، جماعت اسلامی، شیخی جماعت، جماعت اسلامی اور دعوت، مولوی، مذہب اور عقیدہ، سائنس اور مذہب، ہندو مت، البدر، پاکستان کے مذہبی اور سیاسی راہ نما، تاحروں کی مذہب پرستی، مسلمانوں کی فرقہ بندیوں، علم نجوم، مسلمان اور اسلام، مسلمانوں کی ماضی پرستی اور حال سے بے خبری، طاہریت، مسلم فرقے کی برائیاں، مسلم تاجر، اسلامی حکومت۔

شکیل بدایونی لالہ، شکر جے کتن، الیم ایم ساگر، جیٹن سکیل، جیٹن آنند کی 'حقیقت'، فلم ساند کی انجمن 'امپا'، مینا کاری، نئی، فلم نگری، فلم ساند کی فضول خرچیاں، نیائے شرم کی داستان زندگی، فلم رائٹرز ایسوسی ایشن، جیٹن آنند۔

محکمہ ڈاک کی بدانتظامیاں، ہمدرد دوا خانے کی چشم سحر دروہیاں، ڈاکٹر اسحاق جم خانے والا، سیر جینور وائی، محمد براہیم انصاری بی کام، شبیر احمد راجی، نام نہاد عوامی انجمنوں کی بدانتظامیاں، یوسف دہلوی۔

گلن کھٹکستانی مسلمان نمبر

مضامین

زبان و ادب

مضمون نگار	تفصیل	صفحہ نمبر	ماہ و سال اشاعت
شمس کنول	اردو رسم خط کے موضوع پر پہلا سائنٹیفک مضمون جس میں اردو زبان، رسم خط اور طریق طباعت کی خامیاں بتائی گئی ہیں اور صوتی بنیاد پر اردو لٹے کا اصول پیش کیا گیا ہے۔	10	مارچ ۱۹۶۳ء
اعجاز شمس	اعجاز صدیقی نے 'گنگن' میں انجمن ترقی اردو ہند سمیٹ پر کی گئی تنقیدوں کا جواب لکھا ہے اور شمس کنول نے جواب جواب	9	نومبر ۱۹۶۳ء
مولوی ہمیش پرشار	غالب اردو ادب کے سلسلے میں کسی اصول کے یا بندہ تھے بعض الفاظ کا اطلاق انھوں نے طرز عام سے بڑھ کر اختیار کیا تھا۔	18	"
ضیاء الدین احمد برقی	دنیا کے صحافت میں شاید ہی دہائی میں جیسا کوئی اور سرگھرا، مجاہد اور قلندر نیکے	23	فروری ۱۹۶۴ء
شان الٰہی حق	ذکر ہے لسانی تقاضوں کا، جس میں ضوابط تذکیر و تانیث، معنی کے عدم تعین، اضافت 'کا'، املا، مرکب الفاظ اور محاورہ زبان پر بحث کی گئی ہے۔	16	مئی ۱۹۶۴ء
صفدر آہ گنگن	شان الٰہی حق کے مضمون میں اردو زبان پر کئے گئے اعتراضات کا مسکت جواب۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ زبان کی بقا اور توسیع کے لئے ہر علاقے کے مزاج اور لب و لہجے اور دوسری زبانوں کے اثرات کو فراخ دلی سے قبول کر لینا چاہیے۔	16	اگست ۱۹۶۴ء
شمس کنول	سرستید کی حیات، قلمی اور تعلیمی خدمات اور مذہبی اصلاحات پر ایک جامع مضمون۔	17	اکتوبر ۱۹۶۴ء
گنگن	زبان دانی کے چند قواعد بیان کئے گئے ہیں جن کا جاننا صحیح اردو بولنے اور لکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔	34	"
ہیڈن پرنائیٹ گنگن	سیگم حمید سلطان نے اپنے اور غالب کے بارے میں بعض اہم باتیں بیان کی ہیں لفظ 'آپ' کی سائنسی تحقیق۔	45	مارچ ۱۹۶۵ء
یونس اکا سکر	گالیوں پر ایک دل چسپ اور مزے دار مضمون اس مضمون میں منتخب اَل لباب کے مراغھی مترجم مادھوراؤ بگڑی کی فہرست دانی اور تاریخ نگاری کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔	15	اپریل ۱۹۶۶ء
		40	"
		11	دسمبر ۱۹۶۶ء

اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اسے	اچار یہ دونوں	مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ اکثر ترقی فرمتے کے نظریات اور خاشاک کا ترجمان ہے۔	15	مئی 67ء
ناگری پسیمی لکھو	بھانے			
لغت مؤنت نہیں ہے	خالد احمد	'ہماری زبان میں کسی انجم آرا انجم کا مضمون شائع ہوا تھا جس میں لغت کو مؤنت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ خالد صاحب نے نہایت مدلل، مفصل اور محققانہ جواب تحریر کیا ہے۔	18	فروری 68ء
سُرخے اور گل سرے	گلشن	ترقی پسند شاعری اور ترقی پسند شاعروں کا تنقیدی جائزہ۔	19	جنوری 68ء
انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	شمس کنول	مضمون نگار نے انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا ہے اس کا کہنا ہے کہ انجمن ترقی اردو، اردو زبان کا مذبح ہے اور اس کا ہر ایک بالوں کو۔	15	ستمبر 68ء
نرخیں اچلے دو قدم اور	ماہر ایل تادری	شعر و ادب کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ لغزشیں و خطا سے بڑے بڑے شاعر نہیں بچے۔	13	جنوری 69ء
قیامت اٹھادی	جوں ایلیا	شیخ سیدی ایسے شاہکاروں کی بنیاد دنیا کے ایک عظیم انشا پرداز اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم محقق، اخلاق بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔	15	"
سیماب علامت تھے/ جی ہاں	یعقوب راہی،	شمس صاحب نے ثابت کیا ہے کہ سیماب علامت نہیں تھے اور ان کا اردو دشمنی میں کوئی مقام نہیں۔	19	جنوری 69ء
وہ آتا تھے	شمس کنول			
تالو میں رکھ زبان	-	سیماب صاحب کی دل آزار کتاب 'مسرد غم' کے جواب میں اردو جریدہ کے مدیران کی تحریریں۔	19	اکتوبر 69ء
ہمارے دانش ور، سوئیٹ لینڈ	حیدر چٹھان	ہمارے دانش ور مفاد پرست، توہم فروش اور سوئیٹ لینڈ اور ڈالر لائڈ کے پیروار ہیں۔ آج ہمیں ان کی نہیں بلکہ حسی، نانک، کبیر، تسلی، گاندھی کی ضرورت ہے	28	اکتوبر 70ء
اور ڈالر لائڈ کے پیروار	طارق غازی	اردو صحافت پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے۔	20	دسمبر 70ء
صحافت تلخ دوائی مری گوارا کر	شمس کنول	اس سوانح کا حاصل یہ ہے کہ اقبال ایک مسلم لیگی لیڈر تھے اور غالب کے لئے قدرت نے شعر کہے۔	14	مئی 71ء
اقبال اور غالب	ایم دانی بخاری	مضمون نگار کا کہنا ہے کہ دیوناگری پسیمی اردو زبان سے زیادہ مسلم فرقے کی بقا کے لئے ضروری ہے۔	18	اگست 71ء
دیوناگری پسیمی	ناطق گلگوشوی	ناطق صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لفظ 'علما' پر بحث کی ہے۔	29	نومبر 71ء
علما، بد وضع اور چالاک				
عورت کو کہتے ہیں۔				
آگرا اسکول	آبرار حسنی گوری	آگرا اسکول فرضی نام ہے سیماب صاحب اور ان کے چند شاگردوں کا۔	34	ستمبر 72ء
میرد غالب	شمس کنول	ایک کا نظریہ حیات ترقی پسند، دوسرے کا غیر محنت مند۔ ایک تقابلی مطالعہ۔	23	دسمبر 72ء
اردو اہل	رشیدین خاں	تغیر اصطلاحات اور اصلاح الفاظ کا فرق واضح کیا گیا ہے اور چند تجاویز پیش کی گئی ہیں	27	"
اردو اہل اور انجمن ترقی اردو	انجمن ترقی اردو	انجمن ترقی اردو ہند کی اردو اہل اصلاحات کی تجاویز کا خلاصہ۔	30	"

مشتہکار رسم خط، لسانی تنازعہ	دسنت سوہیا	ہندستان میں لسانیاتی مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ روہن رسم خط اختیار کیا جائے۔	22	ستمبر 1973ء
تلیحات	محمود نیازی	مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ہمارا ادب تلیحات سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔	33	نومبر 1973ء
دلی، چن کا جلو باعث ہے ہری رنگین لوائی کا	شمس کنول	شمس صاحب کا سفر نامہ دلی	3	جنوری 1974ء

سیاست

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

جناب، جیسا کہ میں جانتا ہوں۔	فریڈک لیس	جناب نے اقبال کے نظریہ پاکستان کو ایک شعر کا خوب کہا تھا، لیکن 1937ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کی شکست، کانگریسیوں کے عدم اشتراک اور ان کی ہراساںی ذہنیت نے قائد اعظم کو خالق پاکستان بنادیا۔	9	اپریل 1963ء
بالوکی بیوہ، 1947ء کے بعد اس پر کیا گزری	بی. آر. پٹیل	کانگریس محض ایک سیاسی جماعت کا نام نہ تھا بلکہ بالو اس کے ذریعے ہندوستان میں ظاہری اور باطنی انقلاب لانا چاہتے تھے، بالو کی موت کے بعد نہرو نے اس کی ریڑھ مار کر رکھ دی۔	11	فروری 1964ء
شیر اسلام	شریف الدین پیرزادہ	پنولین کا دل، برک کی زبان، میکا لے کا قلم، یعنی تحریک خلافت کے بانی مولانا محمد علی پرا ایک عہد مضمون	17	"
جند آسے دل و جان سے پیاد کرتے تھے۔	کام دیو	ہمالا کی حسین وادی دارجلنگ میں جناب اور رتن بائی کے پیار کا قہم ہوا اور نہانے کی بغفرتوں کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی بن گئے	19	"
جناب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔	کام دیو	یہ ایک بے چوڑ شادی تھی، اس لئے رفت و رفتا نظریاتی اختلافات بڑھتا گیا اور نوبت طلاق تک جا پہنچی، لیکن جب رتی کا انتقال ہوا تو جند بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔	9	اپریل 1964ء
قومی نشان	خالد عرفان	قومی پرچموں کی تاریخ پر ایک سیر حاصل مضمون	27	اگست 1964ء
غورتوں اور شیردلوں کے عظیم الشان شکاری	کام دیو	راجاؤں اور نوابوں کی عیش پرستی، ان کے شوق شکار اور ان کی ستم رانیوں کی داستان، وقت نے جنھیں پلو پلو اور پالی ٹیکس میں دل چسپی نے پر محبوب کر دیا۔	44	"
مرد غیب، وہ سیاسی زخموں کے لئے ایک نئے سرمہ ساتھ لایا	شمس کنول	انقلاب بصر کا حال، جس نے شاہ فاروق اور مصر کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، دنیا نے سیاست کے مشہور دراندیش سیاست دان عبدل جمال ناصر پر ایک اہم مضمون۔	50	"
شیر کشمیر	گگن	اس مضمون میں شیخ عبداللہ کا سیاسی مزاج سمجھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔	22	جنوری 1965ء
آن دانا، جو ہر مشین میں بیٹ ہو گیا۔	گگن	انڈین کانگریس اپنی 80 سالہ تاریخ سے ایسا کوئی نام پیش نہیں کر سکتی جو امید منتر میں مرحوم رفیع احمد قدوائی کا مقابلہ کر سکے۔	32	مارچ 1965ء
اعلا حضرت انتقال فرما گئے	گگن	عیاشی، بدعتی، بدکرداری اور حیا سوزی کا کوئی درالیا نہ تھا جو اعلیٰ حضرت پر دکھلا ہو، اعلیٰ حضرت شاہ فاروق جو انقلاب بصر کا باعث بنے۔	21	مئی 1965ء

پیکرِ خلوص	لگن	مولانا حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر ایک اہم مضمون	21	اکتوبر 65ء
پوس آمان محمد علی کی تین تمبارا	لگن	بی آماں، لجنوں نے علی برادران جیسے سوراؤں کو جنم دیا اور انھیں آزادی وطن کی راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلنا سکھایا، مضمون نگار نے ان کی جناب میں خراج عقیدت پیش کیا ہے	27	"
جب کیونسٹ انگریزوں کے مجرم بن گئے	جے. بی. کرطانی	جب 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کے مخالفت کیونٹوں نے انگریزوں کی مجرمی کر کے سیاسی ورکروں کو گرفتار کر لیا۔	16	ستمبر 67ء
وہ ہمارے لئے قربان ہو گئے	لگن	انقلاب کی اس خونیں تاریخ کا مختصر سا جائزہ، جس پر عدم تشدد کے سنہری پرے پڑے، پڑے، پڑے ہیں۔	20	"
انڈس کے تارے عورت قیدی کی تحریریں۔	خالد عرفان	تاریخ عالم کی مشہور شخصیتوں کی ان کتابوں کا تذکرہ جو زمانہ قید و بند میں لکھی گئیں	28	"
جوگ جے نارائن جی، پاکستان کے بانی آپ ہیں۔	-	اس مضمون میں سربراہِ درسا سیاسی ہستیوں کی تحریروں سے ثابت کیا گیا ہے کہ تقسیم ہند کا ذمہ دار کانگریس ہے۔	31	فروری 68ء
انڈین نیشنل کانگریس	لگن	کانگریس کے لئے مسلمانوں نے اپنا تان من دھن سب کچھ قربان کر دیا، مگر حصول آزادی کے بعد کانگریس کی قدردانی ناسامی، احسان فراموشی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار مسلم اقلیت ہوئی۔	14	جولائی 68ء
کیا گاندھی جی بھاتا تھے؟	جناداس داس	مضمون نگار نے ہندو دھرم اور ہندو فلسفے کی رو سے یہ ثابت کیا ہے کہ گاندھی جی اگرچہ نیک، خدا ترس اور انسان دوست ضرور تھے مگر روحانی طور پر وہ بھاتا کے مرتبے پر نہیں پہنچ پائے تھے۔	32	جولائی 69ء
کیا گاندھی جی سیاست دان تھے؟	-	سبحا س چندر بوس، ایم این رٹے، گوکھلے اور لوکمانیا تلک جیسے صوبہ ادل کے سیاست دانوں کا کہنا ہے کہ گاندھی جی، سیاست میں کوئی اہم مقام نہیں رکھتے	30	اکتوبر 69ء
محیب سوباشا سوبھالی	لگن	بنگالی کلچر کے تحفظ کے سب سے بڑے علم بردار محیب ارجوان کی سیاسی زندگی پر ایک مختصر مضمون	25	مئی 71ء
مولانا آزاد	لگن	مولانا آزاد کو بنگلادیش کے قیام کی 25 برس پہلے پیش گوئی فرما چکے تھے	29	مارچ 72ء
سونار بنگلا	لگن	بنگلادیش کی جنگ آزادی پر ایک سیر حاصل مضمون	35	"
جنگ	ابوالکلا آزاد	ہندو نے ہمیشہ جنگ کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے اپنے مومنی پر ایک شاہ کار مضمون	40	"
مانک شا	لگن	سیکولرزم اور سرحد کے قابل اعتماد محافظ، ہندوستانی سپر سالار جنرل مانک شا کے حالات زندگی۔	52	"
غدارانِ وطن	تمس کنول	سلطان ٹیپو کے دورِ حکومت کے غداروں پر ایک معلوماتی مضمون	55	"
مسلم لیگ قائم ہوئی تو انگریزوں نے خوشی سے نفیس بجائیں	محمد حسین آدین	برطانوی امپریل ازم کی ایک چال تھی، جس نے مسلم لیگ کو جنم دیا۔ اس سے انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک مضبوط سیاسی جماعت بن جائے	20	ستمبر 72ء

امریکا سے ایک خط	عابد اللہ غازی	کوہستان میں صلح کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں گی۔	30	ستمبر ۶72ء
لیڈرو، ایک بار تو مسکرا دو	گنگن	ایک نکرانگیز مکتوب، جس کی ایک ایک سطر چھٹے سے تعلق رکھتی ہے	81	"
یہ کڑوے لوگ کبھی کبھی شکر بھی	گنگن	اس پر لطف مضمون میں بتایا گیا ہے کہ لیڈروں میں بھی طراوت کا مادا پایا جاتا ہے۔	53	ستمبر ۶73ء
ایک خادمِ قوم بادشاہ	گنگن	لیڈروں کی بذلہ سخی پر ایک دوسرا مضمون	39	"
یا مسلمان! امر مڑ کے نہ	گنگن	افغانستان کے شاہ امان اللہ خان جو بدظہیت ملاؤں کے ستم کا نشانہ بن گئے	25	نومبر ۶7۳ء
دیکھ مڑ مڑ کے		مسلمانوں کی تباہی کا بنیادی سبب، ان کی ماضی پرستی، حال سے لے		
		خبری اور مستقبل سے بے نیازی ہے۔		

تاریخ واساطیر

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

تان سین رسولِ نعم	ادارا	اس مضمون میں تان سین کے روایات سے گھرے کردار کو عظیم تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔	19	مارچ ۶63ء
دہ شاہ زائے کو بہکا تا تھا	ابن عطار	اورنگ زیب کے خیال میں سرمد اور استکوہ کو بہکا تا تھا، اس لیے فرماں ردائے ہند نے سرفروش سرمد کا سراپا دینے کا حکم دے دیا۔	22	ستمبر ۶۵۳ء
ابنِ شمیر ابنِ شمیر	گنگن	مشرق کے آخری بڑے فاتح نادر شاہ پر ایک عمدہ مضمون	40	دسمبر ۶64ء
جہاں پناہ کرے اور مونگ	ربّی	بہادر شاہ ظفر کی پڑپوتی شاہ زادی قمر سلطان کی دکھ بھری سرگزشت	31	اکتوبر ۶65ء
کی دال پسند فرماتے تھے		تاریخ مغلیا کا خون چکاں باب		
ایک تھا بادشاہ جو حضرت	شمس کنول	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک قابل مطالعہ مضمون، ضمنی سلطنت مغلیا کے دور آخر کے فرماں رواؤں کے حالات بھی آگئے ہیں جن کی کم روزی اور نااہلی نے سلطنت مغلیا کی بنیادیں ہلا دیں	45	اپریل ۶۶6ء
مگر کا بیرو کا رہتا				
نور جہاں بڑی عورت تھی	گنگن	عالمِ جہاں گیر سے دنیا واقف ہے مگر نور جہاں کی حق نام شناسی اور مکر و فریب کا کسی کسی کو پتا ہے	43	اکتوبر ۶66ء
قلو پڑا میری عورت نہیں تھی	گنگن	تاریخی شواہد و دلائل کی روشنی میں یہ مضمون قلو پڑا کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے	47	"
تاج محل شاہ جہاں نے	یونس اکاسکر	پی، این و واک کا کہنا ہے کہ تاج محل دراصل ایک راج پوتی محل تھا جسے شاہی حکم پر ضبط کر کے مقبرے میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاریخِ عالم کا سب سے بڑا فراڈ	10	جولائی ۶67ء
دہ نہ بادشاہ تھا نہ پیغام بر	تصدیق سہادی	ذوالقرنین پر ایک تاریخی مضمون، اس مضمون کے جواب میں شاہ نور محمد کا ایک مضمون (گنگن جنوری فروری ۶68ء ص 91) بھی مطالعہ فرمائیے	42	ستمبر ۶67ء
مگر اس کے سر پر دہ بیگ تھے				
سیکو لازم کا بانی جسے نہرو	شمس کنول	شہنشاہ اکبر پر ایک پڑھنے کے لائق مضمون	3۰	نومبر ۶68ء
ہینہ بھلائے رہے				

26	سپتمبر 68ء	نارر شاہ دہلی سے اسکا کچھ لوٹ کر لے گیا کہ 3 سال تک اس نے اپنی ایرانی رعایا پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا	گلگن	6 گھنٹے میں ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا قتل
46	جنوری 69ء	مغل شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے مفصل حالات زندگی۔	گلگن	دادی فرغانا کا شیر
47	اکتوبر 69ء	بابر کی بیٹی، ہمالیوں کی بہن، اکبر کی بیوی بھی۔ گل بدین سلیم پر ایک مضمون	گلگن	ایک دیہ دار خاتون
24	دسمبر 70ء	دہلی ہندو رعایا، جس نے ہمالیوں کے ساتھ منافقت کا ثبوت دے کر اسے ہندستان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا، اُسی ہندو رعایا نے اس کے بیٹے اکبر کو بمبلی بازار مان کر پرستش کے قابل سمجھا۔	گلگن	مسلمان جس کی پوجا کی گئی
31	مئی 71ء	ابراہیم لودھی اور بابر کی جنگ کا حال اور بابر کی جنگی صلاحیتوں پر ایک مضمون	گلگن	پانی پت، جس کی زمین 70 برس تک روتی رہی۔

مذہب و عقیدہ، رسم و رواج

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

15	اپریل 63ء	ایک مختصر مضمون ادہام پرستی اور ادہام پرستوں کی نفسیات پر۔	منیلوفر	اُٹریا پہ کا گالولے
19	سپتمبر 63ء	کرشن جی کے فلسفہ زندگی پر بحث کی گئی ہے اور انھیں قریباً ثابت کیا گیا ہے۔	شش کنول	گہیتا، سیاست دان عالم
27	"	مضمون نگار نے بڑی جرات کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ عورت کو ذلت دینے کے گڑبے سے نکال کر عزت و توقیر کا مقام بخشنے کی دو ستارہ فضیلت اسلام کے سر نہیں ہاتھی۔	سید عباس علی	عورت اور مسلمان
34	اگست 64ء	قسم پر مذہبی، قانونی، تاریخی اور سیاسی نقطہ نظر سے ردِ شنی ڈالی گئی ہے۔ ایک بے حد دلچسپ، انوکھا اور پُر اثر معلومات مضمون	شیر احمد تاثیر	قسم لیے ہوئے درنا چھ ماہ قید یا ایک ہزار روپے جرمانہ
22	دسمبر 64ء	دیوالی کے حوالہ پر لکھا گیا ایک مضمون جو کسی انسانیکلو پیڈیا کا باب معلوم ہوتا ہے	خالد عرفان	دلوں کی چھت جلاؤ تو کوئی بات
15	مارچ 65ء	ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے مسائل پر ایک درس آموز مضمون	شش کنول	بالید ہاری، شہی الزما ہے
50	"	'یوم سال' پر ایک مضمون، دراصل برس کا پہلا دن مذہبی عقائد، سوچ کی گردش، موسم کی تبدیلی، مذہبی ہستیوں کے یومِ پیدائش، علاقائی عقیدے اور علاقائی زبان کے جذبے پر مبنی ہوتا ہے۔	گلگن	1956ء میں بس پلے ...
22	اپریل 66ء	اسلام کی اپنی کوئی تہذیب، کوئی کلچر نہیں، اسلام جہاں جہاں گیا اپنی فطری لچک کی بنا پر مقامی رنگ میں رنگ گیا۔ ایک قابل مطالعہ مضمون	کماری آمون	آپ جی جو تھانی سے بھی زیادہ ہندو ہیں۔
18	مئی 67ء	اسلام کی ابتدا کیسے ہوئی، اسلام کا اسلامی طرہ اور عبادات، مختلف فرقوں میں اسلام کے مختلف طریقے۔	شش کنول	ساجد بھگت
26	اپریل 68ء	انگشت شہادت کے خطوط و نشانات کی منجمانہ تشریح کی گئی ہے، دستِ شناسی یا فراست پر ایک مضمون	نذیر احمد، خاور	انگشت شہادت کی خوش فہمی
"	جولائی 68ء	دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی حد تک توہم پرست ہوتا ہے۔ آخر تو ہم پرستی کا سبب کیا ہے	گلگن	ترجما ہے مومن

گلگن کا ہفت روزہ سالانہ

جہات پات	حیدر پٹھان	اس مضمون میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔	20	جولائی ۱۹۶۹ء
سیکر انقلاب، اسلامی دنیا کا درد مند۔	لنگن	ذات پات کا مسئلہ ہندوستان میں بنیادی طور پر Ethnic مسئلہ ہے! ذات پات پر ایک مختصر مضمون	39	اکتوبر ۱۹۶۹ء
خون کے سوداگر، جنھوں نے مومنوں کو کافر جانا	شمس کنول	سید جمال الدین اخگانی، جنھوں نے مغربی نظریات اور مغربی معاشرے کے بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کیا اور دنیا کے سارے اسلامی ممالک کو ایک مرکز پر لانے کے لئے "پان اسلام ازم" تحریک کی بنیاد ڈالی۔	15	اکتوبر ۱۹۷۰ء
سرسید کا اسلام مذہب، عقل جس کو تسلیم نہیں کرتی اور علی بنی لے	شہناز کنول	اسلام کے تیرا سو سال کے عرصے میں ہزاروں حق پرستوں کا خون فقہ کے فتوؤں کا دامن گیر ہے، اس دعوے کے ثبوت میں تاریخ کے خون جکان ابواب کو صفحہ رقمطراز پر پیش کیا گیا ہے	24	اگست ۱۹۷۱ء
ایک فکر انگیز مکتوب جو ملاؤں کو پسند نہیں آئے گا۔	عابد غازی	سائنسی اصولوں پر مذہب کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔	57	ستمبر ۱۹۷۲ء
عقیدہ ہمیشہ عقل پر غالب رہا ہے۔	نظیر صدیقی	عابد صاحب نے مولانا قاری طیب صاحب کے مکتوب پر تبصر کیا اور مغرب کے جنس زد معاشرے پر اور مسلم معاشرے میں عورت کی اہمیت پر فکر انگیز بحث کی ہے۔	17	دسمبر ۱۹۷۲ء
سکھ	خش دت سنگھ	نظیر صاحب نے مزاحی مزاح میں ہیبت ہی اہم اور بنیادی مسائل پر کام کی باتیں کی ہیں۔	33	"
		جنگ جو سپاہی، محنت کش کسان اور ہوشیار دست کار سکھ قوم پر ایک معلوماتی مضمون۔	43	"

طب و صحت اور نفسیات

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

ان سے زندہ رہنے کا سبق ملتا ہے۔	طاہر صدیقی	مصنف نے حکیم عبدالحمید کو کچھ اس طرح جانا پہچانا، دیکھا اور سمجھا ہے کہ ان کی مثالی شخصیت کھلی کتاب کی طرح سامنے آگئی ہے۔	13	اپریل ۱۹۶۴ء
سٹیم نیشنل ڈش	لنگن	اسلامی کھانوں اور مسلم رکاب داروں کے متعلق دل چسپ معلومات اور پلاؤ پرسائنٹفک اور طبی ریسرچ۔	26	اپریل ۱۹۶۶ء
مصانے سے ذہنی اور جسمانی امراض کا پتہ چل سکتا ہے	لنگن	ڈاکٹر ایس، ایل، انڈل مین نے بڑی دل چسپ بات بتائی ہے کہ انسان کے ہات کی گرفت سے اس کی جسمانی اور ذہنی صحت کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے	20	نومبر ۱۹۶۷ء
فنگی دوست بھی، دشمن بھی	مر نور	مر نور صاحب نے فنگی کے فوائد اور نقصانات پر ایک بڑی معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے	58	فروری ۱۹۶۸ء
فرزند خاک	لقمان حکیم	مٹی سے دوئی کیئے، دنیا کی اس حقیر ترین چیز سے دنیا کی ساری بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔	45	ستمبر ۱۹۶۸ء
سب سستی دوا اور ضرورت بھی لقمان حکیم		بہت سی بیماریاں صرف اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ جسم کو مناسب تبدیلیاں پانی نہیں	39	نومبر ۱۹۶۸ء

سوجا سوجا راج کمار	مر نور	نیز میں سیکھنا اعلان آسان ہے، دراصل دورانِ نیند میں سیکھنے کی بنیادیں امر یہ ہے کہ سوتا ہوا دماغ کام کرتا رہتا ہے اور سونے والا باہر کی دنیا سے بچا حاصل کر سکتا ہے۔	56	جنوری 69ء
لو اسیر	لقمان حکیم	لو اسیر، جگر کی خرابی کا ایک مرض ہے، جو خشخوش خوری اور زہریلی ایلو پیجک روڈوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض کے علاج اور متون کے تدارک کی تدبیروں پر ایک مضمون	42	اپریل 69ء
ماں کی گود سے آسے ہلک	لقمان حکیم	دودھ، انسان کی مکمل ترین مشروب غذا ہے۔ دودھ کے فوائد پر ایک مفید مضمون۔	66	اکتوبر 69ء
کالونی ننگ	جمال خیر گل	آپ اپنے شرانے، کھانسنے، چھینکے، ہجائی لینے، ڈرنے، گھبرانے وغیرہ پر کسی قسم کا تردد نہ کریں کیوں کہ یہ اس امر کی نشانیاں ہیں کہ آپ کا جسم اپنی کھلائی کے لئے اپنی خود کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا ہے	40	فروری 70ء
لیو، بیماری کو کھٹائی میں:	لقمان حکیم	ترش چیزیں عام طور پر مضرت ہیں، لیکن ترش میوہ صحت کی ضمانت ہے	59	"
ڈال دینے والا۔	لقمان حکیم	فاقا، کھانا زندگی کے لئے یا زندگی کھانے کے لئے	31	جون 70ء
موجرے، جو ہمارا جسم دکھاتا ہے۔	جمال خیر گل	ہمارے جسم میں ایسی قوت پوشیدہ ہے جو اپنی حکمت کی بنا پر جسم کو صحت یاب رکھنے کی سعی مسلسل کرتی رہتی ہے اور مختلف امراض میں حیرت انگیز طریقے سے جسمانی دفاع کرتی ہے۔	33	مئی 71ء
پیاز، غذا بھی اور دوا بھی	لقمان حکیم	پیاز ہر اچھے کھانے کی تیاری میں بھی ضروری ہے اور کینسر دوا بڑی اہم چیز ہے	40	اگست 71ء
لہسن	لقمان حکیم	لہسن کی دریافت صحت انسان کی تاریخ میں اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ پنسلین کی دریافت	27	نومبر 71ء
آلو، دنیا کے مہذب لوگوں کی خراک ہے۔	لقمان حکیم	ساری دنیا کی ترکاریوں میں سب سے زیادہ پیداوار آلو کی ہوتی ہے۔	76	مارچ 72ء
درد، خطرے کا پہلا گھنٹا	جمال خیر گل	درد کا احساس جسم کو اپنے دفع پر تیار کرتا ہے۔ اس لئے احساس درد بھی ایک بیش قیمت عطیہ الہی ہے۔	47	دسمبر 72ء
کیا آبِ الرجب میں مبتلا ہیں؟	گلشن	جو چیز ہمارا جسم یا مزاج برداشت نہیں کرتا وہ ہمارے لئے الرجب کا باعث بنتی ہے	17	اپریل 63ء
شادی کیجئے گاگر شادی کیسے کہتے ہیں؟	شمیم اختر	مضمون میں بتایا گیا ہے کہ علم جنسیات کی روشنی میں ایک شکر گوار شادی کے لئے عورت اور مرد کا جنسی اعتدال سے ایک طبیعت اور ہم مزاج ہونا ضروری ہے	22	اگست 63ء
خود کشی	ابن عطار	اگر آپ اپنا خود کشی کا ارادہ ترک کرنا نہیں چاہتے تو یہ مضمون نہ پڑھیں	"	اکتوبر 63ء
یہ مضمون ہونے آپ کے لئے بکھا اُلٹے۔	شمس کنول	ایک قابل مطالعہ مضمون	41	اکتوبر 65ء
درد مندی، مردم بے زاری، عبادت گزاری، خوف گناہ، نمائش پسندی، غارتگری، نیاز مندی، احساس بزدلی، کنیا پروری، ظاہر داری، عیب بینی،				

ہنگن کا ہندستانی مسلمان صبر

		سطحی ذہنی، احساس کمتری، کچھ مزاجی اور بے گولی ان انسانی عادات، خصالت اور اطوار پر عمل اور مدد عمل کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔		
ایک بے بی ٹانگ	انوار اختر احمد	بچوں کو کہانیاں سننے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟ کہانیوں کا بچوں کی نشوونما میں دخل، کس عمر میں بچوں کو کس قسم کی کہانیاں سنانی چاہئیں؟	65	اکتوبر 66ء
مٹھی بنا کر سگریٹ پیئے والے محنتی اور جفاکش بچے ہیں محبوب کی طرح کے ہوتے ہیں	ٹی پاجہ مٹھی	سگریٹ نوشی کی نفسیات اُن کے طریق سگریٹ نوشی کی، برکشی میں	53	ستمبر 67ء
نفر یہ ضروری ہے کہ انسان حساس نہ ہو۔	گلشن	محبوب کے جسمانی اعضا کی بناوٹ سے اس کے مزاج اور کردار کا پتہ لگایا جاسکتا ہے	39	اکتوبر 70ء
فنی تقریر اور نروس پن آب دہولے جنت بھی بنتی ہے جہنم بھی	علاؤ الدین جینا	مضمون نگار کا کہنا ہے کہ جو شخص اسٹیج یا پلیٹ فارم پر آتے ہوئے گھبراتا ہے وہ اچھا مقرر بن سکتا ہے۔	68	مارچ 72ء
فنی تقریر اور نروس پن آب دہولے جنت بھی بنتی ہے جہنم بھی	علاؤ الدین جینا	مضمون کے اس حصے میں نروس پن کو کنٹرول کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔	72	ستمبر 72ء
آب دہولے جنت بھی بنتی ہے جہنم بھی	ایس اے بابی	انسانی زندگی کے ہر شعبے میں آب دہولہ راست اور بلا راست دونوں طرح اثر انداز ہوتی ہے۔	21	مئی 73ء
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟	قیصر سرسوت	بے خوابی کے اسباب اور علاج پر ایک مضمون	7	مئی 74ء

فہم

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

دُرُقِ درق	کیدار شرما	کیدار شرما کی ڈائری کے چند اوراق، جن سے اُن کی فلمی دنیا میں آمد کا حال معلوم ہوتا ہے	16	مارچ 63ء
خالوں کا بخشہ رستان	گلشن	اس مضمون میں تقریباً چھ درجن فلموں، فلم کمپنیوں، ہیروؤں، ہیروئنوں، ہدایت کاروں، گلوکاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا سمندر کو کونے میں بند کیا ہے۔	54	اگست 64ء
برات عاشقان برشاخ آہو	گلشن	اقتدار، اختیار اور دولت حاصل ہوتے ہی موشاہ فاروق بن جالب ہے اور عدت قلوب پلہ فلمی دنیا کی اُن قلوب پلاؤں کی کہانیاں جو مردوں کو پوشاک کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔	47	اکتوبر 65ء
اگلے برس کے یہ لوگ، ان سے کچھ نہ کہو۔	گلشن	اس مضمون میں 1965ء کی ہندوستانی فلموں کا جائزہ لیا گیا ہے	61	اپریل 66ء
بولنے سائے آزادی سے ایک	گلشن	اس مضمون میں آزادی سے پہلے اند آندائی کے بعد کے ہندوستانی سینما کا موازنہ کیا گیا ہے	70	ستمبر 67ء
دامند ساگر	شمس کنول	دامند ساگر سے شمس صاحب کا ایک انٹرویو جس میں اُن کی فلمی اور فلمی زندگی، ہندوستانی فلم انڈسٹری، فلم کی زبان اور فلمی صنعت کو تو میانے کے مسئلے پر اہم سوالات کئے گئے ہیں۔	33	جولائی 68ء
پرہ مانا	ماروت	ہندوستانی سینما کا ارتقائی جائزہ لیا گیا ہے، ساتھ ہی فلمی صنعت میں اقتصادی بحران کے اسباب بتائے گئے ہیں	60	ستمبر 68ء
صحبہ کمال امریکا پر	شمس کنول	کمال امر دہوی سے شمس صاحب کا ایک اہم انٹرویو۔	25	اپریل 69ء

گیت: ہاگالپ	گنگ	انہوں نے خونِ دل مردِ کر کے اشعار تخلیق کئے اور مائے والوں نے ان پر بات	50	جولائی ۱۹۶۹ء
راج و قدیم یونان کا دلچسپ	اداس خاص	راج کیور کی فلمی زندگی پر ایک مختصر مگر جامع مضمون اور راج کی فلموں کی فہرست	75	دسمبر ۱۹۷۰ء
مادری دلیوتا	سی ایل کاڈر	مادوش صاحب کی طرح دوسروں کی فلم کاری کی زندگی کا اتنا درست اور مکمل	61	ستمبر ۱۹۷۲ء
مینا مار، کئی بار مری اور	ایلیکا سیٹھی	نصیحتی اور فلسفیانہ تجزیہ پیش نہیں کر سکا، یہ شمس صاحب کا کہنا ہے	17	جون ۱۹۷۴ء
آخر امر ہوگی		ان ہندوستانی فلموں کا تذکرہ جن میں غیر ملکی فلموں کی نقالی کی گئی ہے		
ہماری فلمیں، ادھاری ہوئی				
حقیقتیں				

کھیل کود

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

ریل ہاؤس، گنبد کا اڑی دش	سعود اختر	ستمبر سٹیشن ریل ہاؤس اتنے اٹھاک سے کھیلنا کرتا تھا جتنے اٹھاک سے	13	اپریل ۱۹۶۳ء
ییل تن آہنی انسان	شمس کنول	لوگ عبادت کرتے ہیں	21	اپریل ۱۹۶۴ء
'کاغذ باد'	گنگ	فن پہلوانی اور رستم زمان احمد بخش کا ماک کی زندگی پر ایک معلوماتی مضمون	36	اپریل ۱۹۶۵ء
سرکاری گیندیں اور ہتے بے	خالد عرفان	پتنگ اور پتنگ بازی پر ایک معلوماتی مضمون	64	فروری ۱۹۶۸ء
سائیکل دوڑاتے دوڑاتے	گنگ	کرکٹ سے متعلق پُر لطف اور ہنسی آمیز جھٹکے	55	اکتوبر ۱۹۶۹ء
وہ کرڈڑتی بن گیا		سائیکل کی ایجاد اور اس کے تدریجی ارتقاء کی معلومات، ساتھ ہی سائیکل دوڑ کے مقابلوں کا حال		

سیروسیاحت

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

غیر لنگاراں جو ایک دن میں	بنت مہرwah	روم جس کی ہر اینٹ تاریخی ہے اور ہر عمارت آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھتی ہے	8	فروری ۱۹۶۳ء
نہیں بنا				
کیتے بلیوں کا شہر	ستبرائے تاثیر	نیویارک، جسے 24 ڈالر کے کپڑوں کے عوض ریڈانڈینوں نے انگریز نوآباد کارڈ کے ساتھ فروخت کر دیا تھا اور آج وہاں کے بڑے بڑے بزنس مین فی منٹ کے حساب سے اپنی آمدنی کا حساب لگاتے ہیں	18	جون ۱۹۶۳ء
ٹریش رو مولوی ستہر	بیگم اختر ریاض	خاتون مضمون نگار کی رائے ہے کہ بحیثیت مجموعی 'ماسکو' ایک خشک، سخت گیر	16	اکتوبر ۱۹۶۳ء
ہائے انارکلی مرگئی	شبنم رحمانی	منشعہ زائد کی طرح ہے	20	دسمبر ۱۹۶۳ء
شہر شہور نو	شاہد احمد بلوی	لاہور دراصل پانچ چیزوں کا نام ہے، مینار، سرخی، کمالی، مقبرے اور گھوڑے کی	23	اکتوبر ۱۹۶۴ء
چین۔ جہاں سب کچھ برائے اللہ کے ہوا شمس کنول		لہو۔ ایک بڑا پُر لطف مضمون	52	ستمبر ۱۹۷۲ء
		کراچی پاکستان کا سب سے تنہا شہر ہے، جو جدید پاکستانی ثقافت کی ہم بھئی بھی ہے		
		حال کا چین ماضی کے چین سے بالکل بلا ہوا ہے، آج کے چین پر معلوماتی مضمون		

حیوانات

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

20	اگست 1963ء	گینڈے کے بانی میں دل چسپ معلومات، مضمون میں گینڈے کی سبیلوں کے استعمال، اُس سے متعلق اعتقادات اور اس کے خریدنے کے فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔	شیراز تاثیر	ایک بھاری بھر کم فٹے
26	ستمبر 1963ء	مور پر ایک معلوماتی مضمون	شمس کنول	جنت کی چڑیا، ہاراقوی نڈیا
21	جون 1964ء	ہاتھی پر ایک مضمون جس میں اس پر دیلائی کہانیوں کی تفصیل، اس کی تجارت پر معلومات، اس کی عام زندگی اور نفسیات کا حال اور بادشاہوں کے ہاتھیوں کو دلانے کے مشغلے کا ذکر ہے۔	خالد عرفان	چلتے پھرتے پہاڑ
26	جنوری 1965ء	روئے زمین پر اپنی تمام تر خوبیوں، خداداد ذہانت، رفتار، جسامت اور طاقت کے لحاظ سے 'اوسیس اور کا' (دھیل) خطرناک ترین جانور ہے	جمال خیر گل	اچانک اس کے پاؤں تلے کی برف پھسل گئی

سماج و معاشرہ

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

10	فروری 1963ء	گفتگو کرنا بھی ایک فن ہے فن گفتگو پر ایک مختصر اور دل چسپ مضمون	ابن عطار	بات کرنا سیکھئے
64	اگست 1964ء	اُس عہد کا ذکر ہے جب عورتوں کا گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا، دختر کشی، کثرت ازدواج، قبل از بلوغت شادی اور سستی کی سبکی رائج تھیں۔ بیوہ کو شادی کی اجازت نہ تھی اور عورتوں کو صرف سامانِ نعیش سمجھا جاتا تھا۔	ابن عطار	4 بیویاں
43	دسمبر 1964ء	ہیجر دور کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت پر ایک دل چسپ مضمون	شمس کنول	رمضان کے آبا۔ ماں جی!
21	جولائی 1967ء	عورتیں یا تو غلط وقت پر سستی ہیں یا غلط مذاق پر یا پھر سستی ہی نہیں ہیں۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ عورتوں میں جس مزاج کا فقدان ہوتا ہے۔	نسرین ندان	وہ ہنستا ہنستا کیا جاوے
33	ستمبر 1967ء	سوتاپے اور کثرت ازدواج کے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں پر فکر انگیز گفتگو کی ہے، مضمون علم اور سائنس کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ مذہب اور جیل، زمانے کے لئے کس حد تک ناقابل قبول ہیں۔	مسلم بیگم	وہ اپنے شوہر کے بستر کی تنہا مالک ہے۔
37	"	ناقص نظام تعلیم اور نااہل معلمین پر سخت کٹا چینی کی گئی ہے۔	-	ایک ایسے اسٹوڈنٹ کے قدم سے
65	جنوری 1969ء	ازدواجی زندگی کا بوجھ ڈھرن کر مرد کے دل و دماغ پر طاری رہتا ہے اگر یہ دور دور ہو جائے تو وہ سدا بہار کھوٹے بنے رہتے کامر مہلورن توڑ ڈالیں۔	ایک شادی شدہ خاتون کے قلم سے	یہ سدا بہار کھوٹے ہر دول کہیں کے۔
42	جولائی 1969ء	باپ سردارِ خاندان ہوتا ہے اس کی کم نگاہی، بے توجہی، غیر ذمہ دارانہ اطوار انہوں سے بے گامگی اور اغیارِ نوازی، اولاد کو بد تہذیب، بد کردار، غیر ذمہ دار دنیاوی اعتبار سے ناکام بناتی ہے۔	گلشن	باپ

14	نومبر ۱۹۷۱ء	عبدالغفور دشتی کے کاروبار پر ایک مضمون	گلگن	ملنگ سے فادرودنگ
20	مارچ ۱۹۷۲ء	مولانا نے لندن سے لکھے ہوئے اپنے اس خط میں انگریزوں کی معاشرت کی تصویر کھینچی ہے۔ ان کے رہی سہی تعلیم و تہذیب، بچوں کی تربیت، کاروبار، اقتصادیات، بلحاظ اسطوات اور ان کی تمدنی سلیقہ مندوں پر دلکش پیرائے میں ان کا افسانہ بیان کیا ہے۔	محمد طیب	احد بزرگ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے
16	جون ۱۹۷۲ء	مولانا نے اپنے اس مکتوب میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا ہے یعنی مغربی تہذیب کی برائیوں کا ذکر کیا ہے۔	محمد طیب	انگریز جسے سونے کا شراب کباب ہوا اور عورت، مرغوب ہے
77	ستمبر ۱۹۷۲ء	ازدواجی زندگی میں تعطل پیدا ہونے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور مستجاب کا طریق بتایا گیا ہے۔	گلگن	حاجہ میر بادی
36	دسمبر ۱۹۷۲ء	انسان جب تک بھوک کی فضا میں سانس لیتا رہے گا اور معاشی طور پر آسودا نہیں ہوگا، مرد اپنی غیرت بچتا رہے گا اور عورت اپنی عصمت فروخت کرتی رہے گی۔ ایک مضمون عبدالغفور دشتی پر۔	گلگن	رہت۔ سوئی نہیں دانتا
44	ستمبر ۱۹۷۳ء	ارادہ جی زندگی سے گریز کرنے والی عورتوں کی نفسیات پر ایک مضمون	گلگن	ت۔ جو شادی میں کرمانی
29	نومبر ۱۹۷۳ء	شجرے کی تاریخ بیان کی گئی ہے، مضمون نگار کا کہنا ہے کہ کم زور ادنا اہل انسان اپنے بزرگوں کے نام کا سہارا لیا کرتا ہے	گلگن	سدا
40	"	ہم جنس زدوں کے طبقے کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف مکتب خیال لوگوں کی آرایش کی گئی ہیں۔	اشوک ریڈ کوئی	ہم جنس مساشرت

متفرق

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

15	نومبر ۱۹۶۷ء	سنٹرل روڈ ری رچ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے جائزے کی روشنی میں اسکول ٹریک تباہ کن سواہی ہے۔	یونس اکاسکر	شیطان کی گھوڑا
40	اپریل ۱۹۶۹ء	موٹر کی ایجاد پر پڑا معلومات مضمون	گلگن	فی ٹیٹ کی یردادی
42	اکتوبر ۱۹۶۹ء	اس مضمون کی شان نزول ہے اسٹریڈو ٹیکلی میں قوالی اور شکیلہ بانو بھوپالی پر جنس و نسب کے ایک مضمون کا شائع ہونا۔ فاضل قلم کار نے جنس و نسب کے مضمون کی قوالی فہمی کا جائزہ لیا ہے اور شکیلہ بانو کی پرکڑی تنقید کی ہے۔	حیدر بھٹان	کھوڑا چلے یا نی کا۔ ذکر ایک قوال کا
17	اکتوبر ۱۹۶۶ء	دنیا کی عدالت میں مسطور مصور پاؤلو کے شاہ کار آخری دسترخوان، کے میو کے گھر میں بانی میں بدلنے کی کہانی۔	حیدر بھٹان	خدی کو کر بلند استا۔۔۔
37	جولائی ۱۹۶۹ء	مضمون میں آسم کے موضوع پر اپنی ساری باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے کہ مضمون نگار کی تحقیق و تلاش پر حیرت ہوتی ہے۔	شمس کنول	طفلی بہار
33	اپریل ۱۹۶۹ء	رس گلے کی ایجاد کی کہانی	گلگن	دیں گلہ۔ خوش بزرگی اور لطافت

بھوک	لگن	اصناف آبادی، غذائی کی اور اس کا ناقص طریقہ تقسیم جیسے مسائل پر مبنی حال اور مستقبل کی روشنی میں منکر انگیز گفتگو کی گئی ہے اور مصر، روم، یورپ، ہالینڈ، یونان، ندرلینڈ، روس، چین اور ہندستان کے تاریخی خطوط کا ذکر کیا گیا ہے۔	22	اگست 1964ء
ان دنوں جب کتے کی دم سیدھی ہوتی تھی۔	یونس کا مسکر	بمبئی پے درشن (کو الٹ بمبئی) نامی کتاب سے اقتباس دیا گیا ہے جس میں 'کتا مارہم' اور کتوں کے خلاف علاقائی قانون پاس ہونے کا ذکر ہے۔	29	مارچ 1965ء
یہ رات پھر نہ آئے گی	یونس کا مسکر	سائنس دانوں کا خیال ہے کہ چند برسوں میں رات کے تاریک دے کر ان آسمان کو ایک روشن و محدود حد تک گاہ میں بدل دیا جائے گا	59	اکتوبر 1966ء
بجلی۔ زحمت ہی نہیں زحمت بھی ہے۔	لگن	نظریات کی طاقت کا ظہور طوفان برق و باران سے بھی ہوتا ہے اس مضمون میں بجلی کی زور سے بچنے کے طریقے اور بجلی کے دائرہ تباہ گئے ہیں	59	اکتوبر 1969ء
21 دن کا اکتوبر	کاہن	کیلنڈر کے بتدریج ارتقائی منازل طے کرنے کی تاریخ، کیلنڈر میں کی گئی تبدیلیوں اور اصلاحوں کا مجمل حال	29	فروری 1964ء
دعواں دعواں	لگن	حق کے انوکھے اور اچھوتے موضوع پر ایک انوکھا مضمون	37	دسمبر 1964ء
اُسے برف کی گری پسند تھی	سعید اختر	عظیم فلاسفر ہنری ڈیوڈ تھیوریو کا شمار امریکا کے جی نیس میں ہوتا ہے، تھیوریو کے عجیب و غریب نظریات پر ایک علم مضمون	18	جولائی 1967ء
ہندستان کے چمکے سورج کے تلے۔	حمید چٹان	ایک مضمون فن مصوری پر، مضمون نگار کا کہنا ہے کہ فن میں اپنے ماحول اور وقت کا مزاج بھلنا ہے اس لئے فن کار کا اپنے گرد و پیش کے ماحول اور روایات سے پرہیز اپنے مقصد کے متعلق سوچنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔	17	اکتوبر 1965ء
معمے جو محض تجارت نہیں	طارق غازی	معمے کی ایجاد اور ارتقاء کی تاریخ	28	مئی 1971ء
نوبل پرائز	اندرجیت لال	دنیا کے سب سے بڑے انعام کی ابتدا اور اس کے طریقہ تقسیم پر معلومات افزا مضمون	17	مارچ 1974ء
ہنری ڈونانٹ	سلمان غازی	دنیا کے عظیم ادائے ریڈ کراس کے خالق ہنری ڈونانٹ کو جب نوبل پرائز ملا تو وہ پاگل ہو چکا تھا۔	13	جون 1974ء

سورج بھی تماشائی

صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

ادب	صفحہ نمبر تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر تاریخ اشاعت
دہماقم، عصمت چغتائی	36	فروری 1963ء
ہفت روزہ طلوع، کابین اتوامی سیاست نمبر	"	"
پیریم چند، ہنس راج وہ بر	38	مارچ 1963ء
کچھ پرانے خط، پرنٹ جواہر لال نہرو کے نام	37	اپریل 1963ء
ماہنامہ نقاش، مدیر ضعی نظام پوری	38	"
کچھ پرانے خط، حصہ دوم	37	جولائی 1963ء
جامعہ، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر	37	جون 1963ء
انکار عبدالجلی، سرتبہ آسما صدیقی	36	اگست 1963ء
ماہنامہ فیض آل اسلام، کافاروق اعظم نمبر	37	"
اردو ادب کا پہلا ماہنامہ اخبار ادبی گزٹ	38	ستمبر 1963ء
سید احمد پوری کی ایک عظیم کلاسیکی کتاب	"	اکتوبر 1963ء
درسوم دہلی	"	"
جلے کئے قلم کاروں کی مشترکہ تخلیق 'فتنا'	"	"

پچھل نصف صدی کی مقامی کتاب ہمارا ڈراما	45	نومبر 63ء	ہندوستانی مسلمان آئینہ آیام میں عالم حسین	30	مئی 65ء
صفدر آہ	46	"	دلربا راج تلو کارٹون، شہاب	33	"
روحانیت کا رحمت ال عالمین نمبر	45	دسمبر 63ء	سوئیٹ لیس کا بھارتی ادیشی دس روزہ آئینا	34	"
غزلیں، درپے گیت، جیل آدین عالی	46	"	ذہن روشن کرنے والی کتاب 'جگمگ' نور بھنڈی	80	اکتوبر 65ء
سال ناما خاتون دکن مدیر صاحب الطاف	38	جنوری 64ء	صد صلوات بر پڑے جو بزرگال اٹھائے شعر	82	"
شخصیت پرستی کا اعلیٰ نمونا 'رکار' کا نیا نمبر	46	فروری 64ء	زمین پیاسی ہے، لیش سروج	84	"
ایک دستور، باقی شاعر کی سبیل رباعیات	"	"	کاروباری رسائل سے زیادہ ہنرمیگ زمین	"	"
وزما	47	"	'کاروان ادب'	"	"
سہل اور بے مقصد انسانے 'وانا ودام' راجندر	48	"	پیام تعلیم	85	اپریل 66ء
سنگھ بیدی	49	"	'ہندوستانی ادب' مدیر جہا ایم خان	"	"
'مذائے ملت' کا صدیقی حسن نمبر	44	اپریل 64ء	'بانو' کا سال ناما	86	"
میر علم دفن و ادب کا 'سیب' مدیر نسیم درانی	45	"	امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر 'صفدر آہ	33	جولائی 66ء
ایک نثر شاعر تین لکھی کتابیں، عبدل عزیز خاں	38	مئی 64ء	'دیوان ناشاد' این بی سین ناشاد	93	اکتوبر 66ء
ضرورت ہے خضر کو ایک راہ ہر کی 'ماہ نامہ ناشاد'	39	"	'ماتم نہرو'، 'میرے گرتا شب و روز'	94	"
مخلصان وطن کی ایک دستاویز 'سور وطن'	40	"	جگن ناتھ آزاد	"	"
مرتبہ جابر جیل	41	جون 64ء	'کوئے دادا'	"	"
ایشاد ارادہ دوستی کا علی ثبوت 'سانا ناقاش'	42	"	کاروان نگر، ڈاکٹر یوسف حسین خان	36	دسمبر 66ء
ابوالکلام، مدیر اختر آزاد	43	"	دنانوس ڈائجسٹ	37	"
ایک گم راہ کن منظم سازش 'دوریات' کا سال	44	"	دبیرضاب، فیضی نظام پوری	40	مئی 67ء
مگر نمبر	45	"	سال ناما 'بانو' برائے 1967ء	43	"
ایک مفکر اردو دانش ورثہ کا آفاق گیر کلام 'الف'	46	"	سال ناما 'پیام تعلیم' برائے 1967ء	44	"
سلیقے سے پیش کیا ہوا 'افکار' کا افسانہ نمبر	47	"	دکیف وکم، یوسف ناظم	35	جولائی 67ء
بچوں کا پہلا اردو ماہ ناما 'پیام تعلیم'	52	اکتوبر 64ء	'جب تو ما بگھلتا ہے' ہریش دوست	36	"
اردو زبان کا پہلا کلاسیکی مزاحیہ ناول حاجی فلول	60	دسمبر 64ء	'روئے کی موت' نور پرکار	37	"
فلسفیانہ الجھنوں کا ایک حل 'فقد اقبال'	61	"	'کتاب' کا سال ناما 'ضیا' کا نثر دم نمبر	39	"
نئے کش اکبر آبادی	62	"	یادگار شخصیتیں 'پنڈت جواہر لال نہرو	87	ستمبر 67ء
ایک نیک خدمت فیض ان اسلام، کا عثمان فی نمبر	63	"	'انتخاب کلام وجد'	88	"
ایک نثر آمیز شعری مجموعہ 'لہر لہر دنیا گہری' زیر صوبی	70	مارچ 65ء	کالیے کاغذ کی نقلیں، باقر مہدی	89	"
'مضطرب غم' بیا بھائی جسدن جالا	71	"	'اردو ادب میں تنقید کی اہمیت' عبدل قیوم صادق	50	نومبر 67ء
نظموں کا ایک سبز مجموعہ 'وادی گل و رغبت' نرود					

جگن کانتہا علی قلم کلمہ

اپریل 1973ء	35	ڈاکٹر اینڈ وڈرٹم آف انڈیا گاندھی
"	36	نہفت رنگ، انتخاب کلام شعرائے بخنور
مئی 1973ء	28	اندھ جیت لال کی تین کتابیں
"	29	بانیو کا سال ناما 1973ء
جون 1973ء	24	دیوان ناشاد، امین بی حسین، ناشاد
جولائی 1973ء	27	نجات کے بعد یوسف نعیم
"	28	اسٹوڈنٹ ٹائمز
اگست 1973ء	28	لفظوں کا سفر، جمیل کلیدی
"	30	صنعت و حرفت
ستمبر 1973ء	77	آئینا کا سال ناما 1973ء
"	78	آپ ہم
اکتوبر 1973ء	16	آج کل کا اردو نمبر
نومبر 1973ء	59	آج کل کا ضمیمہ اردو نمبر
جنوری 1974ء	21	مغربی بنگال میں اردو شاعری کی بھٹا چارہ
"	"	نامے جو میرے نام آئے
مارچ 1974ء	14	سال ناما 'بانیو' 1974ء
مئی 1974ء	14	سائنس اور ہندوستان، اندھ جیت لال
"	15	قومی راج

شاعر

نومبر 1963ء	37	ہندوپاک مشاعر، خواجہ اسٹوڈنٹ لیگ کے زیر اہتمام
اپریل 1963ء	38	آل انڈیا لیڈرز اینڈ جونیئر مشاعر
"	39	آل مہاراشٹر مشاعر
جون 1963ء	38	انڈوپاک مشاعر، سرسنگار سمس کی جانب سے
"	"	دو دیوان مشاعر، بخشی تعلیم کمیٹی کی جانب سے
اگست 1963ء	37	میرسنگار سمس کے پہلے کالیک مشاعر
مئی 1964ء	41	میرسنگار سمس کا آل انڈیا مشاعر
جولائی 1966ء	34	میرسنگار سمس کا 55واں آل انڈیا مشاعر
"	38	صوبہ اتر پردیش کی سوسائٹی کا تیسرا آل انڈیا مشاعر

نومبر 1967ء	51	سب رس، کا ادارہ انجمن
فروری 1968ء	91	بزنس معلومات کی مفصل ڈائرکٹری، ایم ایس بک
اپریل 1968ء	54	ڈاکٹر ذاکر حسین، مرتبہ عبد لطیف اعظمی
"	"	سیاسی اصطلاحوں کی فہرست، مترجم گوپال سنگھ
"	55	نجم صریح، عبد عزیز خالد
"	"	فیض ال اسلام، کاقرآن نمبر
"	56	سال ناما 'نیرنگ خیال'، مدیر حکیم یوسف حسن
"	"	سال ناما 'افکار'، صہبا بھٹوی
جولائی 1968ء	58	یاس لیگانا چنگیزی، راہی معصوم رضا
"	60	جملے کنول، شمس فرخ آبادی
"	61	مشراب کہنا، رشید نعمانی
ستمبر 1968ء	90	اردو زبان کا مذہبی ورثہ، قیوم صادق احمد پور
"	91	ماہ ناما، کتاب کا مراحطی کہانی نمبر
اپریل 1969ء	58	اردو شاعری کی ہندوستانی روح، زرینا شانی
"	59	شعلہ خاموش، کالی داس گیتا رخصا
"	61	نغمہ فردوس، محوی صدیقی
"	62	سال ناما 'پیام تعلیم' برائے 1969ء
"	"	سال ناما 'ادب لطیف'، مدیر ناصر زیدی
"	69	مشتبان، غالب نمبر
جولائی 1969ء	68	آئینہ نمبر
"	73	وقبہ بازار، خواجہ عبد غفور (تیسرا نمبر)
"	46	شاعر، کا کرشن چندر نمبر
جون 1970ء	66	مہر امین اذان، گوپال سنگھ
"	67	پیامی میل، گوپال کرشن مانگ ٹال
دسمبر 1970ء	56	پس بغار، رئیس امر دہوی
اگست 1971ء	52	تہسم، ادیب مائے گاؤں
"	53	ماہ ناما 'ردی'
نومبر 1971ء	31	لاہور کا جو ذکر کیا، گوپال سنگھ
جون 1972ء	45	نمیر اور میریات، صفدر آہ

40	جے منی کی گرجستی	اپریل 63ء
39	'سہرا' سائتا رام کی پیش کش	جون 63ء
"	'ہندی' بمل رائے کی دین	"
38	'مگراہ' بل دیوراج کی تازا نظم	اگست 63ء
39	گزری ہوئی کل کی ایک نظم 'آج اور کل'	ستمبر 63ء
40	ایک زہرا امیر نظم 'ناگ رانی'	"
"	جنتا کے لئے ایک پرانی نظم 'کون اپنا کون پرانا'	"
39	ایک دھواں آلود نظم 'مجھے جینے دو'	اکتوبر 63ء
40	'ملہت اسٹر' درستم دہلپ، 'اکیلی مت جیو'	"
47	بے وقت کی کہانی، مدراسی 'ہورانی'	نومبر 63ء
"	تیری اردو نوازی کے ہم نشین میرے محبوب'	دسمبر 63ء
44	طوفان بدتمیزی کے ساتھ پھر دی دل لایا جو'	جنوری 64ء
50	'دولہا دہن'	فروری 64ء
"	سیس	"
47	ہنستی، ہلکتی، مچتی، گاتی، رام آندھا گری زندگی	اپریل 64ء
46	ایک رنگینہ اسٹیٹ نظم 'راہ زن' لیڈر'	مئی 64ء
44	اردو نظم کارا محمد عباس کی ہندی نظم 'جھوٹا شہر اور جھوٹا سپنا'	جون 64ء
"	ایک ابھی نظم جو نظم میں طبیعت کی توجہ سے محروم رہی	"
95	بے نظیر	اگست 64ء
96	'کھوپڑا'	"
"	میں نے نظم سازوں کے لئے ایک سبق آموز نظم	"
53	'چاروں'	اکتوبر 64ء
54	کبدار شرما کی جھوٹی 'فریاد'	"
61	ایک نظم دل آزا نظم 'جہاں آرا'	دسمبر 64ء
63	کشتور کا پتھر جنم 'دورنگن کی چھاؤں میں'	"
73	ہینڈا کبدار شرما کا فلمی کوک شاستر 'چتر لیکھا'	مارچ 65ء
76	چینی پن کی مسکراتی گاتی تصویر آؤ پیار کریں'	"
77	جیسی روح دیے فرشتے، 'جیہ! جیہ! چاہا!'	"
79	ہے دل ہی دل بھرا ہوا سینے ہی شہر کے، 'دیر بھم سین'	"

41	خاکوش بابا کے آستانے پر ایک 'مشاعر'	جولائی 66ء
42	جزم مولانا آزاد بھی کا دوسرا آل انڈیا مشاعر	"
45	'راؤ دیو لہرادیل فیروز سوسائٹی' کا مشاعر	مئی 67ء
47	'مہر سدا' کی کوشش سوسائٹی کا چوتھا نکل ہندوستان'	"
52	'مہر سدا' رسم کی جانب سے انڈیا کا مشاعر	نومبر 67ء
92	'انٹر نیشنل فورسٹ نمائش' کا آل انڈیا مشاعر	فروری 68ء
12	غالب یادگار کبھی بھی 'کی جانب سے مشاعر'	ستمبر 68ء
88	'ساجین بھائی گزرا' ہائی اسکول کا مشاعر	جنوری 69ء
91	'مہر سدا' رسم کا انڈیا کا مشاعر	"
78	'مہر سدا' رسم کا 15واں آل انڈیا مشاعر	فروری 70ء
70	'جشنِ مظفر' کا آل انڈیا مشاعر	اکتوبر 70ء
61	'دار العلوم دیوان ستاہ' کا آل انڈیا مشاعر	مئی 71ء
54	'آل انڈیا مشاعر'	اگست 71ء
35	'مہاراشٹر کالج' کا آل انڈیا مشاعر	نومبر 71ء
86	چندرا برائے اخبار عرب آل انڈیا مشاعر	مارچ 72ء
56	'مہر سدا' رسم کا 15واں آل انڈیا مشاعر	دسمبر 72ء
30	'پیو پیو دیل فیروز سوسائٹی' کا آل انڈیا مشاعر	مئی 73ء
27	'آل انڈیا کنگا' جی مشاعر	جون 73ء
64	'مہر سدا' رسم کا آل انڈیا مشاعر	نومبر 73ء
21	'مہاراشٹر کالج' کی لائبریری کے لئے آل انڈیا مشاعر	جنوری 74ء

فلمیں ڈرامے

38	'نسن آت انڈیا'	فروری 63ء
39	'پریم پشدر'	"
"	'انتا بھی کیا ستم'، 'ستیم'، 'رودی'، 'رودی'، 'گرم فون'	"
40	'نکارڈ'	"
38	'ابھی جان'، 'ستید جیت سے کی مہا بارتا'	مارچ 63ء
39	'خا جاجا' جو عباس اور سردار جعفری کی گیلانہ زبان پر لکھا	"
"	'ہو تھے آسمان پر'، 'غالب صاحب'، 'ڈراما سوسائٹی'	"
40	کی جانب سے	اپریل 63ء

61	جولائی 68ء	’بہاروں کی منزل‘
92	ستمبر 68ء	’گوری‘
61	نومبر 68ء	’آنگھیں‘
63	اپریل 69ء	’میرے حضور‘
61	جون 69ء	’ستہ کام‘
73	اکتوبر 70ء	’دھونِ صوم‘
58	دسمبر 70ء	’گوئی گاؤں باگھا بائیں‘
59	”	’گیت‘
62	اگست 71ء	’میر رانجھا‘
66	”	’آئند‘
41	نومبر 71ء	’چیتنا‘
85	مارچ 72ء	’کل آج اور کل‘
49	جون 72ء	’پاکیزا‘
48	”	’اپہارا‘
51	”	’تاش کے پتے‘
61	دسمبر 72ء	’ایک ادھوری کہانی‘
37	اپریل 73ء	’پرہیز‘
32	جون 73ء	’دراغ‘
30	جولائی 73ء	’یکار‘
32	”	’انگی رکھا‘
81	ستمبر 73ء	’بستی اور باراد‘
74	نومبر 73ء	’زردوش‘
26	جنوری 74ء	’مک حرام‘
15	مارچ 74ء	’منورجن‘
16	مئی 74ء	’نیاد نئی رات‘

متفرق صفحہ نمبر تاریخ اشاعت

37	فروری 63ء	’ایک شام اخبار رانگہوی کے ساتھ‘
38	”	’یومِ ظفر‘ زیرِ اہتمام انجمن ترقی اردو، شاخ ممبئی
39	اپریل 63ء	’حشرِ نسبا‘ 27 سالہ راجدلی خدات

38	مئی 65ء	اردو زبان کی ایک فلم ’غزل‘
89	اکتوبر 65ء	ایک مقصدی کہانی جو آخر کی فلم زیادہ ہے ہاسا
”	”	’کی گود میں‘
90	”	’مرد کی نفسیات کے تین پہلو‘ تین ڈیویاں
92	”	’ہنسی آمیز، حسین اور رنگین‘ میرے صنف
93	”	’وطن پرستی کے ایمان کو تار کرنے والی فلم‘ حقیقت‘
88	اپریل 66ء	’آر دو‘
90	”	’وقت‘
92	”	’ساز اور آواز‘
94	”	’آکاش دیپ‘
”	”	’رشتے ناطے‘
95	”	’کاجل‘
”	”	’میرات بھر د آئے گی‘
”	”	’نہیگی لالت‘
”	”	’اونچے لوگ‘
43	جولائی 66ء	’ممتا‘
”	”	’گائیڈ‘
”	”	’ایک لڑکی سہیا در کی‘
”	”	’دل لگی‘
46	”	’دل دیا در دیں‘
95	اکتوبر 66ء	’برادری‘
39	دسمبر 66ء	’بہی اور مکان‘
46	جولائی 67ء	’نئی عمری نئی فصل‘
47	”	’پانکی‘ تبصرہ نگار (سی جی ایل جی رونا)
92	ستمبر 67ء	’اسن‘
93	”	’ہیو بیگم‘
56	دسمبر 67ء	’اکارا‘
57	اپریل 68ء	’رام اور شیاام‘ اور آدھی
61	”	’بوندرہ جین گئی مونی‘
63	”	’لورجہاں‘

گان کا ہندوستان مسلمان عیس

41	جولائی ۱۹۶۷ء	پیرم شعر و نغمہ کی جانب سے 'جشن سحر'	40	جون ۱۹۶۳ء	رہائی فنڈ کے لئے سرور ذراکل چرل پروگرام
92	نوردسمبر ۱۹۶۸ء	'یوپیہ'	38	ستمبر ۱۹۶۳ء	ایک مفریج تک 'حبیبہ' ولادت رسول
66	اپریل ۱۹۶۹ء	'جشن غالب' عروت 'دربار زکریا'	46	جنوری ۱۹۶۴ء	چند دلال شا کا مینا بازار انڈین فلم ایگزپٹیشن
70	"	عطر کجوما ۱۹۶۹ء اور 'عطر نسیم'	49	نوردی ۱۹۶۴ء	مجلس تعمیر ادب کا نیک 'انداس' مشام وقار
87	اکتوبر ۱۹۶۹ء	'عزیم' کی رسم اجراء	45	اپریل ۱۹۶۴ء	'صبح امید' کا 25 سالہ جشن سالگرہ مالی اعتبار سے کامیاب رہا
83	نوردی ۱۹۷۰ء	'آل انڈیا اردو کونسل' دن جشن	17	"	ایکوشنل آپ لیفٹ سوسائٹی کا ناکام وراثی پروگرام
86	"	'غالب یادگار کمیٹی' کی جانب سے غالب صدی کا اختتامی جلسہ	44	مئی ۱۹۶۴ء	ایک شعری ادبی اور رنگین نشست 'شام ناصر'
62	جون ۱۹۷۰ء	فلم رائٹرز کی جانب سے سالانہ کل چل پروگرام	48	جنوری ۱۹۶۵ء	اردو فریڈ سٹرکل کی جانب سے 'شام شاہ کجوری'
57	مئی ۱۹۷۱ء	'جشن غالب'	71	مارچ ۱۹۶۵ء	قومی یک جہتی اور اردو کی زندگی کے لئے 'یوم غالب'
26	جون ۱۹۷۳ء	'نیشنل ویل فیر گرپ' کا امدادی پروگرام	37	مئی ۱۹۶۵ء	انجمن ترقی اردو، ہند کی شاخ کلیان
32	اگست ۱۹۷۳ء	'شب نواہت' جعفر سلمان سلم اسٹوڈنٹس ہوسٹل	86	اکتوبر ۱۹۶۵ء	جیون جوت سدراہے 'جشن انقلاب'
79	ستمبر ۱۹۷۳ء	بھونڈی کالج میں 'یوم اقبال'	87	"	انجمن ترقی اردو شاخ کلیان کی انتخابی میٹنگ
83	"	'غواہی کوآپریٹو میٹنگ'	95	"	گلم شدا جت کی از سر نو دریافت اردو یک فہر
23	اکتوبر ۱۹۷۳ء	'اسلام اور کمیونسٹ روس'	87	اپریل ۱۹۶۶ء	ایک مخصوص شعری نشست
25	"	بہی کا طبیا کالج اور اس کا اسپتال تعلیمی سماجی مجلس کی جانب سے	95	اکتوبر ۱۹۶۶ء	'یوم اکبر'
72	نومبر ۱۹۷۳ء	عصیر ملن	38	دسمبر ۱۹۶۶ء	ایک نشست اردو زبان میں تلفظ کا مسئلہ
25	جنوری ۱۹۷۴ء	'رستا گیری مرکز انان کوآپریٹو میٹنگ'	40	جولائی ۱۹۶۷ء	جلسہ تقسیم نعالت، انقلاب قلم کا سوسائٹی

نشانِ راکہ

صفحہ نمبر "تاریخ اشاعت"

		زبان و ادب
		استفسار
13	اگست ۱۹۶۳ء	اکثر خاموش طبع بزرگ کسی کو 'بڑا خفش' کہہ کر ریکارڈ کرتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟
"	"	'گرگ' بارہا دیدہ، تجربہ کار اور آزمودہ کار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن کیوں؟ جب کہ اس کے لفظی معنی دوسرے ہیں؟
12	اکتوبر ۱۹۶۳ء	'گپ' درست ہے یا 'گپ'؟ 'غندڑا' درست ہے یا 'گندڑا'؟
19	دسمبر ۱۹۶۳ء	'ہیڑا پار گزنا' یا 'ہیڑا اٹھانا' ان میں سے کون سی بات درست ہے؟
32	اکتوبر ۱۹۶۴ء	کہتے ہیں 'ETYLE' یونانی لفظ ہے؟
43	مارچ ۱۹۶۵ء	موسیقی کی اصطلاح میں 'نانونک' کیسے کہتے ہیں؟
33	اکتوبر ۱۹۶۶ء	یہ نظم سے بولی آماں محمد علی کی۔ جان مٹیا خلافت ہے دے دو، کس نے کہی تھی؟

گلن کا مکتبہ سلسلی نمبر

دسمبر 66	22	دانش ور، صحافی، عالم، ڈاکٹر رفیق زکریا کی تازہ تصنیف 'رضیا' کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
"	"	سہ خاک ساری نے دکھائیں رشتوں پر رقتیں - اس زمیں سے واہ کیا کیا آسمان پیدا ہوئے، یہ شعر کس کا ہے؟
مئی 67	"	'مرحوم' اور 'آں جہانی' کے استعمال کا محل کیا ہے؟
"	"	یہ شعر کس کا ہے سہ اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں گر پڑے، اگر کراٹھے، اٹھ کر چلے؟
ستمبر 67	59	انگریزی لفظ SALOON آج کل بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ویسے اس لفظ کے درست معنی کیا ہیں؟
"	60	حالات کی تبدیلی پر کوئی شعر سنائیے؟
فروری 68	62	کیا لفظ 'بیگ' اور 'بک' میں فرق ہے؟
اپریل 68	30	آپ نے ایک جگہ 'بحث' کی جمع 'مباحث' کو جمع بنا کر 'مباحثوں' لکھا ہے جو کہ غلط ہے؟
ستمبر 68	49	علامہ اقبال کی ایک نظم کے ایک بند کا مطلب تو سمجھائیے
جولائی 69	35	ایک شاعر کا مصرع ہے 'ک' کوئی اس کو دکھائے دل ہمارا' دوسرا مصرع کیا ہے اور یہ شعر کس کا ہے؟
"	36	گاد، گاؤں زمین، گاؤں سامری، گاؤں غنیر اور گاؤں فلک کے معنی بتائیے؟
اکتوبر 69	51	کیا پہلوی زبان اب بھی زندہ ہے؟ نہیں، تو ختم ہونے کا سبب؟
"	52	'دشیر آبی' یا 'دریائی شیر' سے کیا مطلب لیا جاتا ہے؟
فروری 70	50	کیا یہ سچ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، خوب رو در لڑکوں کو اپنی صحبت میں رکھنا پسند فرماتے تھے؟
"	"	تجدد کے انتقال پر لگن میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا، آپ کے خیال میں ان کا کیا مقام ہے؟
"	52	پہلی میں کانگریس کے اجلاس میں ساحر لدھیانوی کا لکھا ہوا گیت پیش کیا گیا، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
دسمبر 70	30	ٹیکسی کو ٹیکسی کیوں کہا جاتا ہے؟
"	"	مشہور ادیب اہل قرت ال عین حیدر نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟
"	32	'میں معافی مانگتا ہوں' یا 'میں معافی چاہتا ہوں' کون سا جملہ درست ہے؟
مئی 71	41	کیا مندرجہ جملے درست ہیں؟ اگر نہیں، تو اصلاح فرمائیے
اگست 71	42	مثل مشہور ہے 'کبیل ہیں چھوڑتا، یا کھیل' سے یہ لیا ہے، مطلب تو معلوم ہے، مگر وہ بات کیا تھی کہ جس سے مثل بنی؟
"	43	اتفاقاتِ زمانہ پر ایک دو شعر سنائیے؟
"	44	جناب سلامت علی بہر صاحب کی بارے میں کچھ تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں، اور کہاں تک انہوں نے تعلیم پائی ہے؟
نومبر 71	21	نام یا تخلص پر جو علامت (۔) لگائی جاتی ہے، اسے کیا کہتے ہیں اور علامتوں کو کیا کہتے ہیں؟
"	23	جوش ملیح آبادی کو اتنی مقبولیت حاصل کیوں نہیں ہوئی جتنی کہ ہوتی چاہئے تھی؟
مارچ 72	81	آپ کے خیال میں اردو، زبانِ دستور کی وہ عام غلطیاں کیا ہیں، لیکن والے جن کے اکثر مرتکب ہوتے ہیں؟
"	"	علامہ اقبال کے متعلق لگن میں بہت کچھ پڑھا، مگر آپ ان کے کسی شعر کو غلط ثابت نہیں کر سکے؟
جون 72	37	نیار، نیچ، لوری، نیار، کو 'طیار' اور 'تیاری' کو 'طیاری' کیوں لکھتے تھے؟
دسمبر 72	50	کیا مولانا آزاد سے فوشی فرماتے تھے؟
"	"	کیا یہ درست ہے کہ فارسی اور ہنگالی سب انڈولوری میں زبانوں کے خانہ دان سے تعلق رکھتی ہیں؟

دسمبر 72ء	51	اردو شاعری میں زلف، کاہل اور گیسو کے الگ الگ کیا معنی لئے جاتے ہیں؟ خضر پور کے مایہ ناز شاعر اور زناد حضرت (علیہ السلام) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شعر کیا ادب میں اضافہ نہیں ہے۔
"	52	دے دے کے کپہ بچے تھے ہمارے بھی درس گاہ وہ بھی تو جھیں گئے ہیں یہ قسمت کی بات ہے
اپریل 73ء	32	بابائے اردو مولوی عبدل حق کیا 'مولوی' بھی تھے؟
مئی 73ء	25	کیا آپ اردو زبان میں عربی، فارسی الفاظ کو برقرار رکھنے کے حق میں ہیں؟
جون 73ء	22	اقبال نے ہندوؤں میں شاہین ہی کو کیوں پسند کیا؟
"	23	'خطہ خال' درست ہے یا 'خرد خال'؟
جولائی 73ء	25	محترم جناب مولانا حامد الانصاری غازی کے بابے میں مختصر طور پر بتائیے کہ ان کو 'غازی' کا لقب کیسے ملا؟
اگست 73ء	25	آج کا ادب، شاعری اور خاص طور سے یہ نئی گیت، مریانیت اور فحاشی کو اتنا فروغ دے رہے ہیں کہ ہمارا شعروادے اتنا گندہ کبھی نہیں تھا؟
ستمبر 73ء	69	'شامیت اعمال'، صورتِ نادر گرفت، کا کیا مطلب ہے؟
"	70	اکبر الہ آبادی کے اس شعر کے مقابلے کا کوئی شعر سنائیے۔ شیخ اپنی رگ کو کیا کریں، ریشہ کو کیا کریں مذہب کے جھگڑے چھوڑ دیں تو پیٹنے کو کیا کریں
نومبر 73ء	53	مولانا رزم جن کے علم سے اقبال نے بھی استفادہ کیا ہے، ان کا کوئی دیوان بھی ہے؟ جب ہم کسی کی موت پر تعزیت کرتے ہیں تو مرنے والے کے عزیزوں سے کہتے ہیں: 'خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے'؛ 'صبر جمیل' سے آخر کیا مراد ہے؟
"	54	
"	53	زوجت 'یا' رجعت پسندی کے دراصل سہی کیا ہیں؟
"	57	انگریزی حروف میں 'محمد' کی درست ہجے کیا ہے؟
"	"	ذرا یہ تو بتائیے کہ اسکول، اسمتال اور پشال، ان انگریزی الفاظ کو کنڈ کھرا لیا یا ان کو کیا خاصے نام ملتے؟
مئی 74ء	13	کسی شعر کا یہ مشہور مصرع ہے کہ 'خوب گزری گئی حوٹ میٹھیں گے دیوانے دو' اس کا پہلا اور دوسرا مصرع کیا ہے؟

سیاست

اپریل 63ء	19	کیا سیاسی بحث میں ایک دوسرے کو قائل کیا جاسکتا ہے؟
اکتوبر 63ء	12	جن کے نام کے ساتھ 'گاندھی' لگتا ہے، ایسے تو بہت ہیں، لیکن 'نہرو' بہت کم، کیا 'نہرو' ذات کے لوگ ہندوستان میں کم ہیں؟
اگست 64ء	59	گاندھی جی نے تھوڑی تو ٹی کبھی نہیں پسینی، پھر 'گاندھی کیپ' ان کے نام سے کیوں مشہور ہوئی؟
مارچ 65ء	43	مکرمبیلین کہاں ہے؟
اکتوبر 65ء	40	'چند برس پہلے انڈین نیشنل رانی ہندوستان آئی تھی حصول آزادی سے پہلے حکومت انگلستان کے کون کون سے حکمران ہمارے جہان بنے؟
اکتوبر 66ء	39	پروفیسر آل احمد مترور نے 'ہماری زبان' میں مولانا آزاد اور مولوی عبدل حق کے اختلافات کی نوعیت کے سلسلے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ".... وہ ماگ پور میں ہندی ہندوستانی کے قبیضے کے بورد سے گاندھی جی، کانگریس، اور تمام قوم پرست راہ نماؤں سے

دسمبر 66ء	21	بدن جو گئے تھے : دیانت طلب بات یہ ہے کہ کیا مولوی عبدالحق کا قوم پرستوں سے ملن ہو نام درست تھا؟
مئی 67ء	23	ہندستان کے لئے امریکی غذائی امداد کے سلسلے میں انٹرنیٹ پر اپریل 480 'لفظ اخبارات میں استعمال کیا جاتا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟
نومبر 67ء	22	کہتے ہیں 'سنت فتح سنگھ' کبھی مسلمان تھے؟
اپریل 68ء	30	آپ کا مرحوم مسلم لیڈروں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں کے متعلق کیا خیال ہے؟
جنوری 69ء	42	ہمارے سیاسی لیڈروں میں فلم مینی کاشوق کس کس کو ہے؟
اپریل 68ء	36	ہماتما گاندھی جس زبان کو ہندوستانی کہتے تھے، وہ کون سی زبان تھی؟
مارچ 72ء	82	ہر ملک جنگ کے تباہ کن اثرات سے واقف ہے مگر ہر ایک اس سے زیادہ جنگ کی بات کرنا ہے؟
نومبر 71ء	23	یہ 'سی آئی اے' کیا چیز ہے؟
مارچ 72ء	81	علی برادران کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
"	83	کچھ صفحہ عبداللہ کے بارے میں بتائیے، کیا وہ فرقا پرست ہیں؟
جون 72ء	38	'جینوا کن دلشن' کسے کہتے ہیں؟
"	39	کیا صرف مذہب سے انگریزوں جو ان کی بے زاری ہی کی بنا پر (آپ کے بقول) یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کی یونین کی آمد؟
"	37	اپنا وظیفہ ختم ہونے پر اب راجا نواب کیا کریں گے؟
ستمبر 72ء	90	ہماتما گاندھی اور اندرا گاندھی میں فرق کیا ہے؟
"	91	آخر اندرا گاندھی عوام کی اتنی زیادہ غریبی سے متاثر کیوں نہیں ہوتیں؟
"	"	گرینٹ برٹن کو 'یو' کے 'کیوں' کہتے ہیں؟
"	94	'غدر پارٹی' کے بانی کون تھے؟ کچھ ان کے بارے میں بتائیے؟
"	"	مولانا بھاشانی کس مزاج کے آدمی ہیں؟
"	"	'شیل کانفرنس' میں معاہدے پر دستخط کرتے وقت بھٹو بند گھے کا جو کوٹ پہنے ہوئے تھے، وہ کس فیشن کا تھا؟
"	"	'مسلم پرسنل لا' اور 'مسلم یونیورسٹی' کے خلاف ایگزیٹیشن کی حقیقت کیا ہے؟
دسمبر 72ء	51	شیخ مجیب پاکستانیوں کو معاف کر کے بھٹو سے ملاقات کیوں نہیں کرتے؟
"	52	'یوگنڈا' سے جو ایشیائیوں کو نکالا جا رہا ہے، اس کا اصل سبب کیا ہے؟
"	54	علامہ مشرقی کے بارے میں کچھ بتائیے؟
اپریل 73ء	32	آخر پاکستان میں ان مسلمانوں پر کیا گزری گی 1947ء کے بعد ہندوستان سے پاکستان پہنچے ہیں؟
"	33	سال بھر سے زیادہ گزر گیا اور ہندوستان کی امداد بھی جاری ہے مگر تنگلادیش کے حالات ابھی تک بہتر نہیں ہو پائے، آخر کیا بات ہے؟
مئی 73ء	24	'پرسنل ایشیا انٹرنیشنل' کیا چیز ہے؟
"	25	مسلم کے عوام راجا کے خلاف کیوں ہوئے؟
"	26	مسلم لیگ نے جو تشدد آمیز فرقا پرستی شروع کی ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
"	"	کیا آپ کے خیال میں 'علی گڑھ' مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ کردار کو بدنام چاہئے؟

22	جون ۱۹۶۳ء
"	"
25	اگست ۱۹۶۳ء
"	"
"	"
24	اکتوبر ۱۹۶۳ء
"	"
"	"
27	دسمبر ۱۹۶۳ء
"	"
"	"
"	"
24	جنوری ۱۹۶۴ء
"	"
"	"
31	جون ۱۹۶۴ء
"	"
"	"
"	"
68	اگست ۱۹۶۴ء
"	"
"	"
"	"
38	اکتوبر ۱۹۶۴ء
"	"
"	"
"	"
29	جنوری ۱۹۶۵ء
"	"
39	اکتوبر ۱۹۶۵ء

کیا باور رکھانے والے ہر بار صبح محسوس کرتے ہیں؟
 کیا آپ جوانوں کے ساتھ مل جل کر اپنے بڑھاپے کو بھلا سکتے ہیں؟
 کیا اپنی بڑی عادت چھوڑنے کا اعلان آپ کو اپنے دوستوں کے سامنے کر دینا چاہئے؟
 کیا بعد میں لو جوان اچھے محبت کرنے والے ثابت ہو سکتے ہیں؟
 کیا زیادہ احساس یا نازک دماغ ہونا، کاروبار میں ایک رکاوٹ ہے؟
 کیا انسان محض اپنا حسین ماضی ہی یاد کرنا چاہتا ہے؟
 کیا شوہر کو اپنی بیوی کے لئے کچھ ترسانیاں دینا چاہئے؟
 کیا خشتِ نبی ایک اچھی چیز ہے؟
 کیا زیادہ تر آدمی درست نکتہ چینی قبول کر لیتا ہے؟
 کیا بغیر ثبوت حاصل کئے آپ کو اپنے دوست سے ناراض ہو جانا چاہئے؟
 کیا کینا پر در شخص پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟
 کیا دودھ پیتے بچوں کی بھی اپنی پسند ناپسند ہوتی ہے؟
 کیا آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے بچوں کو مجبور کریں کہ وہ ایک ہی کھلونے سے مل کر کھیلیں؟
 کیا قیمتوں میں بھاری رعایت کا بورڈ لگا کر دکان دار، امیر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں؟
 کیا نچلے طبقے کے لوگ اپنی زندگی میں زیادہ مطمئن رہتے ہیں؟
 لیڈر پیدا نشی ہوتا ہے یا بنا جاسکتا ہے؟
 کیا اکثر عورتیں روٹی، کپڑے اور اپنے تحفظ کے لئے شادی کرتی ہیں؟
 کیا آپ کو اپنے بچے کا استاد بننا چاہئے؟
 کیا زیادہ جوشیلا ہونا جذباتی طور پر تین درست ہونے کی دلیل ہے؟
 کیا لڑکیاں لڑکوں کی بہ نسبت جلدی بالغ ہو جاتی ہیں؟
 کیا اکثر لوگ کسی سے مشورہ لینے میں ہر خاص ہو جاتے ہیں؟
 کیا ہر کوئی اکثر اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے؟
 کیا فن کا دنیا کے لوگوں سے میل نہیں کھاتا؟
 کیا پابندی کے ساتھ مندر یا مسجد میں جا کر عبادت کرنے والے مکار ہوتے ہیں؟
 کیا آپ کا اپنے بچوں سے، یہ امید رکھنا کہ وہ آپ کو اپنے لئے ایک نمونہ سمجھیں، درست ہے؟
 کیا آپ کو اپنی خدمت پر شرمنا ہونا چاہئے؟
 کیا ایسے لوگ ہیں جو بیمار ہونے کے باوجود ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے شرماتے ہیں؟
 بعض لوگوں کو پالتو جانوروں سے بہت لگاؤ ہوتا ہے، آخر کیوں؟
 کیا بحرِ مازہنیت کے انسان پستاقد ہوتے ہیں؟
 کیا اکثر لڑکے شرمیلی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے؟

اکتوبر 65ء	40
اکتوبر 66ء	33
دسمبر 66ء	21
"	22
مئی 67ء	"
ستمبر 67ء	60
نومبر 67ء	22
فروری 68ء	61
اپریل 68ء	29
جولائی 68ء	30
نومبر 68ء	32
"	"
جنوری 69ء	41
"	42
"	"
اپریل 69ء	35
جولائی 69ء	"
"	36
اکتوبر 69ء	51
"	52
فروری 70ء	50
"	51
"	52
دسمبر 70ء	30
"	31
"	32
"	"
مئی 71ء	40
"	41
"	"

انسان جرم کا مرتکب کیوں ہوتا ہے؟
 بیٹا ایذا کر دینا نے میں باب سے نیا دامن اثر ہوتا ہے یا ماں سے؟
 کیا یہ درست ہے کہ آج کل کی لڑکیاں بہت جلد بालع ہو جاتی ہیں؟
 اپنے شاگرد یا اپنے تحت کام کرنے والوں کے کام کی تعریف کرنا زیادہ مناسب ہے یا تنقید کرنا؟
 کس قسم کے لوگ زیادہ خوش رہتے ہیں؟
 کیا رک چیز سے اسے مسک مزاج لوگ کم عقل ہوتے ہیں؟
 کیا شادی عسر میں اضافے کا باعث بنتی ہے؟
 کیا زیادہ اثر انسان احسان ماننے والے ہوتے ہیں؟
 کیا اولاد کی خواہش خطری جڑیا ہے؟
 گھر سے باہر کسی مرد اور عورت کو ساتھ ساتھ دیکھ کر یہ کیسے سمجھا جائے کہ وہ میاں بیوی ہیں؟
 دولت بڑی ہے یا عسرت؟
 کیا زن ٹریڈ شوہر اپنی ازدواجی زندگی میں خوش رہتا ہے؟
 کیا طوائف کے وجود کو ختم کرنے کے لئے یہ علاج درست نہیں کہ روشن خیال مرد طوائف سے شادی کر لے؟
 کیا دوسری شادی ایک حوا ہے؟
 کیا کسی لڑکی کا گھر ٹوہنا اچھی بات ہے؟
 کیا پہلوئی کا بچا اپنے دوسرے بھائی بہنوں سے زندگی میں زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے؟
 علم نفسیات کی روشنی میں شہی مارنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟
 کیا کچھ لوگ میدان کشتی طور پر تکمیل ہوتے ہیں، کبھی کے اسباب کیا ہیں؟
 کیا زیادہ عمر کی عورت سے شادی کرنا مرد کے روزگار میں مددگار ثابت ہوتا ہے؟
 شادی کے لئے لڑکی کی عسر؟
 محبت کیا ہے؟
 کیا جنسی لذت سے بڑی کوئی لذت ہے؟
 انسان کی مہربانی اور نزار دلی کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے؟
 ہر مرد اپنی عورت کو 'پتی' دیتا، دیکھنا چاہتا ہے، مگر 'خُد' دیتی دیتا، بننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا، کیوں؟
 کیا شادی کے بعد میاں بیوی کے تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہ سکتے ہیں؟
 کیا بڑے سرد والا انسان زیادہ عقل مند ہوتا ہے؟
 کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے شوہر اور بیوی کا ہم خیال ہونا ضروری ہے یا ہم مذہب ہونا؟
 کیا دوسروں کو دیکھ کر اپنا دکھ محسوس ہونے لگتا ہے؟
 آپ سب کچھ بتاتے ہیں، ازرا دولت پیدا کرنے کا کوئی جائز طریقہ تو بتائیں؟
 شادی سے پہلے بیوی کے اخلاق و مزاج کا کیسے پتا لگے؟
 چنگ نہاوند سنائی مسلمان مسر

42	مئی 71ء	غریب کام چور کیوں ہوتے ہیں؟
43	اگست 71ء	ٹوٹے ہوئے دل کو جڑنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟
"	"	ماہانا اخراجات اور ڈیوٹی کے انجام دینے کے سلسلے میں شادی شدہ مرد زیادہ دتے دار ہوتا ہے یا کتوار مرد؟
"	"	کیا یہ ضروری ہے کہ ایک انسان کے فیصلے یا نظریے سے دوسرا بھی اتفاق کرے؟
44	"	کیا عورت اپنے پیٹ کی خاطر شادی کرتی ہے؟
"	"	کیا عالم کسے لئے خانائیں ہونا اچھا ہے؟
22	نومبر 71ء	پیشادہ لوگوں میں کون کم اور کون زیادہ عسر پاتے ہیں؟
24	"	دو مردوں کا باضابطہ آپس میں شادی کر لینا اور دولہائیوں کا قانونی طور پر میاں بیوی بن جانا آخر یہ کیا تماشہ ہے؟
82	مارچ 72ء	کیا ہم کو صرف آج ہی کے لئے زندہ رہنا چاہئے؟
83	"	کیا اس دنیا میں جی یا بھوت کا وجود ہے؟
37	جون 72ء	حاجی ملنگ سے فارس روڈ تک، پڑھنے کے بعد نتیجہ ایسی نکلتا ہے کہ روٹی اور کپڑے کی ضرورت، عورت کو طوائف بننے پر مجبور کر رہی ہے، کیا کوئی اور وجہ بھی ہے؟
53	دسمبر 72ء	کیا نادل اور افسانے عام ذہن ہی کو متوجہ کرتے ہیں؟
25	مئی 73ء	ایک نوجوان بیٹی کیسے بنتا ہے؟
26	"	کیا دو بھائی ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو حسد کے اس جذبے کو کس طرح دور کیا جائے؟
21	جون 73ء	کیا بچوں کو جیب خرچ دینا مناسب ہے؟
26	جولائی 73ء	بعض بچوں اور گھر کی بعض خواتین سے بھی گھر کی چیزیں ہبت لٹتی ہیں، اس کی وجہ؟
24	اگست 73ء	شیشی فون پر بات کرتے ہوئے اکثر لوگ اپنے سامنے رکھی ہوئی چیزوں کو ایک ہاتھ سے اِدھر اُدھر کرتے ہیں، کیوں؟
"	"	جب چھوٹے بچے آپس میں جھگڑنے لگیں، تو ان کو جھگڑنے سے کیسے روکا جائے؟
26	"	کیا کوئی دوسری ذات ہماری شخصیت کو بدل سکتی ہے؟
"	"	کیا زن مُردہ شوہر کی ازدواجی زندگی خوش گوار گزار رہتی ہے؟
67	ستمبر 73ء	مسلمان کاروبار میں اتنا کام یا بکیوں نہیں جتنے دوسرے فرقے کام یا بے ہیں، جب کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے مسلمان کو کاروبار ہی کرنے پر زیادہ زور دیا ہے؟
68	"	کیا عدالت غیر محفوظ زندگی کی حفاظت کر سکتی ہے؟
69	"	کیا انسان کا زیادہ جوشیلا ہونا اس کے صحت مند ذہن کی دلیل ہے؟
53	نومبر 73ء	کیا یہ ممکن ہے کہ عمل ہم دردی کا بھو مگریتیت میں خلوص نہ ہو؟
55	"	کیا انسان محض اپنا حسین ماضی ہی یاد کرنا چاہتا ہے؟
57	"	کیا بیوی کی طبیعت یا مزاج میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے؟
17	جنوری 74ء	ہے جانتے چوئے بھی کہ شوہر بے دخل ہے، مگر بعض اس سے چمٹی رہتے ہیں؟ کیوں؟
18	"	کیا آج کی لڑکیاں، لڑکوں کی بہ نسبت شادی کرنے کی زیادہ خواہش مند رہتی ہیں؟

نظریاتی اختلاف کے باوجود میان بیوی ایک دوسرے سے محبت کر سکتے ہیں؟
دولت مند بھی ناشائش رہتے ہیں، یہ کیوں؟

طب و صحت

مارچ 74ء	10	کیا سگریٹ نوشی جسمانی نشوونما یا قد کے بڑھنے میں رکاوٹ ڈالتی ہے؟
مئی 74ء	12	شکر کی کمی یا پی کے دنوں میں شہد کی بات تو سبھی نہیں معلوم ہوتی، مگر پھر بھی شہد کے فائدے بیان کیجئے؟
اکتوبر 65ء	40	جب کوئی انسان کسی محفل میں بے مٹی مائیں کتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ بھنگ کھا گیا ہے، کیا بھنگ کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے؟
اکتوبر 66ء	33	دوسرے کا آسان علاج بتائیے؟
"	34	پچھلے دنوں یرقان کا بہت زور رہا، اس مرض کے اسباب کیا ہیں؟
دسمبر 66ء	21	پیمپٹا کو جسگری دوست کیوں کہا جاتا ہے؟
"	22	دوسروں کی نسبت مجھ کو پسند زیادہ آتا ہے، کوئی علاج؟
مئی 67ء	23	پست قد ہونے کے اسباب کیا ہیں، کیا علاج ممکن ہے؟
ستمبر 67ء	59	اپنی آنکھ (بینائی) کسی دوسرے انسان کو عطیے میں لے دینے کا کیا طریقہ ہے؟
"	60	کیا ہندسی سی کا 'روغن سرخ اصلی' دائمی درد، چوٹ اور جلن کے لئے مفید ہے؟
فروری 68ء	62	کچھ آنی بینک کے بارے میں تفصیل بتائیے؟
ستمبر 68ء	48	گزشتہ سال کی خبر ہے کہ دہلی کے ایک گاؤں میں 5 سال کی ایک لڑکی حاملہ ہو گئی، کیا یہ ممکن ہے، اور سبب؟
جولائی 69ء	34	مکھن، مارگرین، بنا سیتی اور لارڈز میں کیا فرق ہے؟
جون 72ء	38	پاسچر اور اسٹریلائز کئے ہوئے دودھ میں کیا فرق ہے؟
ستمبر 72ء	94	جنسی تعلیم کیوں اور بچیوں کے لئے کس حد تک ضروری ہے اور کس طرح دی جائے؟
اگست 73ء	25	ہندوستان میں کینسر کا سرگرم مرکز کہاں ہے یا کم ہوتا ہے؟
ستمبر 73ء	68	کیا کسی کا مخصوص دلوں میں پیدا ہونا، اس کے ذہنی اور کردار کو بھی بدل دیتا ہے؟
"	70	کیا فصیح کی حالت میں انسان زیادہ طاقت ور بن جاتا ہے؟
نومبر 73ء	55	کس چیز سے زیادہ لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے؟
مئی 74ء	12	سلم کھانے اور غیر سلم کھانے میں کیا فرق ہے؟
"	"	

تاریخ و اساطیر

جون 63ء	36	آپ کے شذرات کا عنوان ہے 'افق تا افق'، اس کے لکھنے والے ہیں 'آرگس' اس نام سے کیا مراد ہے؟
"	"	سکندر نے کہا تھا کہ 'اگر میں سکندر نہ ہوتا تو جان گلپی ہوتا' اس جملے کا حوالہ کیا ہے؟
"	"	اسن اور ناجنگ کے اظہار کے لئے فاختا ہی کو سبیل بنا کر کیوں پیش کیا جاتا ہے؟
"	"	کابٹون اور تصویریں اکثر ہمیں کو اپنی چیز میں انسانی جملے ہوئے ہوا ذکر کرتے دکھایا گیا ہے، اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟
"	"	

محکم دلائل سے مزین

42	مئی ۱۹۷۱ء	بیریل کا حسب نسب اور حال بیان کیجئے؟
42	اگست ۱۹۷۱ء	کرشن جی نے کہا تھا کہ جب سنہ ۱۹۷۱ء میں سہیل کے والدین کے آجوتی جاتی
43	"	ہے اس سے زیادہ کیا ہوگی، پھر کرشن جی کہاں ہیں؟
"	"	ایک مزدگ سالہ غازی ہوئے تھے، ان کے متعلق کچھ تفصیل سے بتائیے؟
21	نومبر ۱۹۷۱ء	پھر اس کے کیا معنی ہیں؟
23	"	کیا بادشاہ تغلق واقعی پاگل تھا؟
80	اپریل ۱۹۷۲ء	شوکی مورتی کن حقائق کی نظر ہے؟
82	"	کچھ مانی کے بارے میں بتائیے؟
93	ستمبر ۱۹۷۲ء	ایک برت پوش بوڑھے کو 'سینٹا کلاز' کہنے کی وجہ تھی؟
31	اپریل ۱۹۷۳ء	بابر کا چنگیز خان اور نور سے کیا رشتہ تھا؟
21	جون ۱۹۷۳ء	مرد و عورت، محسن ایک افسانوی کردار ہے یا اس نام کا واقعی کوئی شخص تھا؟
24	اپریل ۱۹۷۳ء	اکبر کی دانیوں میں بھی 'جودھابائی' کا نام آتا ہے اور شاہ جہاں گیر کی بھی ایک رانی جودھابائی تھی، کیا یہ درست ہے؟ اور
26	اگست ۱۹۷۳ء	کیا نور جہاں ہی کے زمانے میں جودھابائی بھی جہاں گیر کے حرم میں داخل تھی؟
53	نومبر ۱۹۷۳ء	مغلیا خان دان میں کل کتنے بادشاہ ہوئے؟
54	"	اکبر بادشاہ کے نورتن کون کون تھے؟
55	"	کہتے ہیں شہر جید آباد کسی طوائف نے بسایا تھا؟
56	"	محبت کے دیوتا کو پتہ کون دھاکیوں بتایا جاتا ہے؟
57	"	آپ نے شاید ایک بار لکھا تھا کہ شاہ جہاں نے ملکا نور جہاں کے آخری دنوں میں اس کو نظر بند کر دیا تھا، شاہ جہاں اور نور جہاں
17	جنوری ۱۹۷۴ء	کی دشمنی کا سبب کیا تھا، اور ممتاز محل کی موت سے کیا کوئی واقعہ شہور ہے؟
"	"	ہندوستان کا سب سے پرانا شہر کون سا ہے؟
19	"	'عروج بن عرق' کس کا نام تھا؟
10	مارچ ۱۹۷۴ء	بہی میں جو یہ اگیت آن لایا ہے، یہ کب اور کس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا؟
"	"	کیا یہ درست ہے کہ درشتی دنیا کے پرانے شہروں میں سے ایک ہے؟
12	مئی ۱۹۷۴ء	'الہیرونی' تاریخ میں کس حیثیت سے مشہور ہے؟
"	"	نوشیروان عادل کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے؟
"	"	دہلی میں پھول والوں کی سیریا جو میلہ ہوتا ہے، اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟
"	"	عشق کیا ہے؟

مذہب و عقیدہ

اکتوبر ۱۹۷۳ء

59

ہنگو شہزادہ ستانی قتلہ

'آداکون' کے مسئلے پر روشنی ڈالو

44	مارچ 65ء	کیا گوتم بدھ کو ادنا یا بیخام بر کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟
23	مئی 67ء	ہماری بستی کے 'فخر' نے جو مقرر شخص میان بھی کیے جاتے ہیں، مسلم تریخی لاء کے موضوع پر تقریر کرنے سے روایا کا 'دفعہ' کا طریقہ کسی دوسری قوم یا مذہب میں نہیں ہے، سوائے اسلام کے، اور ہم اپنے پیغام پر اور مذہبی مبلغوں کو اسٹیج یا میفہ اسکرین پر پیش نہیں کرتے، کیا یہ درست ہے؟
22	نومبر 67ء	اکثر چند برسوں کے دفعے سے موسمی حالات، طغیاناگ ہو جاتے ہیں، سیلاب آتے ہیں، کان پڑتا ہے، زلزلے آتے ہیں، - مدریں طوفان آتے ہیں، کیا اس کو انسان کے گناہ کا رد عمل اور اللہ کا عذاب کہا جائے؟
61	فروری 68ء	کیا مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تلوار ضروری ہے؟
62	"	کیا یہ درست ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی میں سات برس تکلیف میں گزارنے پڑتے ہیں؟
30	اپریل 68ء	کیا سینچر واقعی محسوس دن ہے؟
51	اکتوبر 68ء	کیا ابتدائی اسلام پر ایرانی اثرات مصید ثابت ہوئے اور یہ 'آل برنگ' کون تھے؟
52	"	قسمت کے متعلق کیا رائے ہے؟
53	"	کیا جوش کی رو سے یہ درست ہے کہ جنوری یا فروری میں پیدا ہونے والا سچا شخص قسمت نہیں ہوتا؟
50	فروری 70ء	کیا مذہبی لوگ واقعی برے لوگ ہوتے ہیں؟
51	"	کیا مذہب انسان کے لئے ضروری ہے؟
31	دسمبر 70ء	جماعت اسلامی کی مختصر تعریف؟
40	مئی 71ء	صوفی ازم کی ابتدا کیسے ہوئی؟
43	اگست 71ء	سائنس اور مذہب میں کیا فرق ہے؟
22	نومبر 71ء	کیا یہ سچ ہے کہ چاند یا سورج گریں کے وقت حاملہ عورت کا اُن کے سائے میں آنا اس کے ہونے والے بچے کی صحت کو متاثر کرتا ہے؟
80	مارچ 72ء	بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں میں مذہبی علماء اور دینی مراکز کے سربراہ اکثر دوسرے کرتے رہتے ہیں، وہ کاؤں کھڑے درجہ میں کیوں نہیں جاتے؟
38	جون 72ء	ہندوستان میں ہندو زیادہ مذہبی ہے یا مسلمان؟
39	"	پچھلے دنوں اردو اخبارات میں ایمر شیشین گوئی کا مزاح جو بار بار اس شیشین گوئی کے معقول یا نامعقول ہونے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟
94	سپتمبر 72ء	لگن کے پچھلے شمارے سے معلوم ہوا کہ آپ دعا کے قائل نہیں، آخر کیوں؟
93	"	آپ جماعت اسلامی نے پچھلے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟
52	دسمبر 72ء	پچھلے شمارے سے معلوم ہوا کہ آپ دعا کے قائل نہیں، کیا قسمت کے بھی قائل نہیں؟
51	"	جماعت اسلامی والے کہتے ہیں کہ جس حدائے دنیا بنائی، اس نے دنیا کے ساتھ نظام زندگی بھی دیا، کیا یہ بات درست ہے؟
54	"	جناب انور علی اپنے مضمون 'مذہب' میں فرماتے ہیں: 'مذہب پرست معاشرے اس وقت جہاں جہاں بھی ہیں پس انداز نظر آتے ہیں، کیا یہ بات درست ہے؟'
32	اپریل 73ء	کیا علم نجوم کا مدرسہ زندگی کی آنکھوں کو سلجھایا جا سکتا ہے؟
"	"	آپ نے پچھلے لکھی ہیں.... کے جواب میں ہندو کو مشرک قرار نہیں دیا، یہ بات حقیقت، کہ خدات ہے، ہندو تو کئی خدا کو ماننا ہے

25	مئی ۱۹۷۳	آپ مذہبی اثر کے مخالف کیوں ہیں؟
"	"	روح کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
22	جون ۱۹۷۳	مذہب کیا ہے؟
"	"	آپ نے یہی لوگوں کے اقتدار کو کم کر کے سماج میں مساوات لانا چاہتے ہیں، ارادہ سید ہے مگر کیا آپ یہ کام نہیں انجام دے سکتے ہیں؟
"	"	کیا بچوں کی تربیت کے لئے مذہب کی اخلاقی قدریں درکار ہیں؟
23	"	مسلمانوں کی تبلیغی جماعت کا دور تو اوت کبائے؟
25	جولائی ۱۹۷۳	دجی کی کیا حقیقت ہے؟
26	اگست ۱۹۷۳	شاہد شریف علما اقبال نے دھماکہ دھمکے ہیں مگر آپس میں پھر رکھنا؟ اگر آپ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ وہ سب جھگڑے کی طرف ہے۔
69	ستمبر ۱۹۷۳	معجزے کی حقیقت کیا ہے؟
70	"	آپ یہ کیسے خیال کرتے ہیں کہ دیہات میں مذہب کا مقام کم ہو رہا ہے اور سماج کی حلقہ سوشلزم نے رہا ہے
54	نومبر ۱۹۷۳	معجزے کے سلسلے میں آپ نے جو بیان کیا اس میں کبھی تو ہوتا ہے کہ وہ ایم ایس ایس سے اور کچھ کالج میں دیتے؟
55	"	گویا قصص الانبیاء، حقائق پر مبنی ہے؟
"	مارچ ۱۹۷۴	دنیا کی کسے کہتے ہیں۔
"	مئی ۱۹۷۴	خدا کیا ہے؟
12	"	دشمناء کی وجہ سے کیا ہے؟
13	"	جو لوگ اپنا مذہب بدل دیتے ہیں، ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

تسمیہ

19	جنوری ۱۹۶۴	کیا سچی ہے کہ ملکہ اور کارول جیلز نے فلسفی دیاس میں سب سے زیادہ دلچسپی لی؟
39	اکتوبر ۱۹۶۵	فلم میں ہادی اور ڈی ڈی کو بہت بڑے افسانہ دان ہوتے؟
59	ستمبر ۱۹۶۶	کیا آپ فلم ایکٹرز میں مالا سنبھالی سوانح حیات بیان کر سکتے ہیں؟
30	جولائی ۱۹۶۶	کیا سن رسبدا اب گمارا اور کم سن سائرا کے ارد گرد اچھی تعلقات پیدا ہوا کرتے ہیں؟
53	اکتوبر ۱۹۶۹	کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ فلم 'یا کیزا' میں دیہات کاری کی ادکاری اس کی کھلی تمام فلموں سے بڑھ کر ہوگی؟
31	دسمبر ۱۹۷۰	کیا لوٹا اور رشتہ رسبگ کو فلم کے مارکیٹ میں دوبارہ طے کر سکتا ہے؟ لوٹا دکھ اکثر پروگراموں میں شریک ہوتا اور گشت نشین شمشاد کا پروگرام منعقد کرنا کیا ہی رکھتا ہے؟
32	"	بینا کاری کا نام اب سلیش میں بعد میں آنے لگا ہے، کیا مینا کے ساتھ طرز ازون کی یہ زیادتی نہیں؟
42	مئی ۱۹۷۱	یہ جو فلم اسٹار ایک ایک فلم کی اتنا اجڑی معاوضہ لینے ہیں، اس مائے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
21	نومبر ۱۹۷۱	فلم ہیرا راجہ کسے تھمرے میں سیرتیں مزہ کا دکھایا ہے، وہ کس دن پر مشہور ہوئی؟

79	مارچ 72ء	گلشنِ اُندہ کس گھاٹ کے پتھر ہیں؟
80	"	پاکستان کے چند مشہور بے سبک سنگردوں نے نام لکھے؟
90	ستمبر 72ء	کیا 'مشقارت' نام کی فلم پہلے بھی بن چکی ہے؟
92	"	اتھے خاصے نام در قلم سب دنوں اور ہدایت کاروں کی بعض فلمیں انتہائی غلاب (آمدنی کے اعتبار سے ثابت ہوئی ہیں، اس سلسلے میں ہے؟
94	"	ساجر کے اس شعر کا مطلب کیا ہے؟ 'نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے'... تراوت سے ابھرتا داستان کے لئے؟
51	دسمبر 72ء	فلم 'پکارا کی کہانی' اوندھکرنے لکھی تھی یا کمال صاحب نے؟
53	اپریل 73ء	'پاکیزا' کے اس گلے 'یوں ہی کوئی مل گیا تھا سیر راہ چلتے چلتے' کا بہت حیران ہے۔ آپ اس بیت کے تعلق کیا خیال ہے؟
54	مئی 73ء	ابھی کامیاب فلم ہر دھنوں کے نام ستائے، جو اپنے بچپن میں بھی مسلمانوں میں کامیاب رہی؟
52	مئی 73ء	ہندوستان میں غیر ملکی اشتراک سے جو فلمیں بنی ہیں، ان میں کوئی کامیاب بھی ہوئی؟
23	جولائی 73ء	بہت بولنے والی فلم 'عالم آرا' کا میوزک ڈائریکٹر کون تھا؟ اور اس فلم میں کس کس نے کام کیا تھا؟
24	اگست 73ء	فلم کی دیاسی NEW WAVE سے کیا مراد ہے؟
67	ستمبر 73ء	آپ نے فلم 'پکارا پر اتنا اچھا تبصرہ دیا ہے کہ میں آج تک سنی فلمی رسالے میں اتنا اچھا تبصرہ کسی فلم پر نہیں پڑھا، آپ کوئی فلمی رسالہ کیوں نہیں لکھتے؟
11	اکتوبر 73ء	ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ڈائریکٹر کون ہے؟
54	نومبر 73ء	سوشیلا کامت نام کی ایک خاتون، فلم ڈائریکٹر بنی ہیں، کیا پہلے بھی کوئی عورت فلم ڈائریکٹر بن چکی ہے؟
17	جنوری 74ء	ہندوستان کی پہلی فلم کون سی تھی؟
10	مارچ 74ء	لتا کی پہلی فلم کون سی تھی، اور سب سے زیادہ معروف بے سبک سنگر کون ہے۔ لتا یا آشا؟
12	مئی 74ء	انڈین میوزک میکانا ہے یا ویسٹرن؟

متفرق

60	ستمبر 67ء	کیا آپ فلم گھسنے کے سوا دوسرا کوئی دھندہ نہیں کر سکتے تھے؟
32	نومبر 68ء	آپ نے کیا کبھی کوئی گناہ کیا ہے؟
41	جنوری 69ء	آپ کے استاد کون تھے؟
35	اپریل 69ء	آپ نے گگن کے کچلے ٹھایے میں اپنے آپ کو فروغ دیا ہے، مگر آپ تو اپنے استاد کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں؟
11	مارچ 74ء	جو گگن کی پالیسی یا آپ کی ذات کی مذمت کرتے کسی مانِ نقبت کی خاطر، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
33	اکتوبر 66ء	کیا بڑھتی ہوئی عمر اچھی موٹر ڈرائیونگ میں رکاوٹ بناتے ہوئے لگتی ہے؟
21	دسمبر 66ء	کس عمر کا انسان کہنے وقت میں موٹر ڈرائیونگ سیکھ سکتا ہے؟
56	نومبر 73ء	برطانیہ میں پیلیٹ پہننے پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟
23	مئی 67ء	ہیرے کو اتنی دزنی اور سخت غے کیوں سمجھا جاتا ہے؟
41	مئی 71ء	کیا یہ درست ہے کہ ہیرے اور گولے میں زیادہ فرق نہیں ہوتا؟

12	مئی ۱۹۷۴ء	کرگس گوشت کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟
48	ستمبر ۱۹۶۸ء	لباس کے ایسے میں ملنے ہوئے فیش کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟
36	جولائی ۱۹۶۹ء	کیا آپ جنت پتلون پہنا سہہ کر رہے ہیں، نہیں، اس جدید فیشن سے احتراز کیوں؟
35	"	حضرت یہودیوں کی بڑھتی ہوئی فوج ظفر موج کیا بل ہے، زندگی گزارنے کا یہ مٹھکا خیر ڈھنگ انھوں نے کہاں سے سیکھا؟
30	دسمبر ۱۹۷۰ء	برطانیہ کے مشہور محکمہ برٹرانڈر رسل کے متعلق مختصر طور پر کچھ بتائیے؟
31	"	ارشمیدس کون تھا؟
42	اگست ۱۹۷۱ء	کچھ لارنس آف عربیہ کے بارے میں مختصر طور پر بتائیے؟
26	جولائی ۱۹۷۳ء	لوبل پرائمرکس کی جانب سے دیا جاتا ہے؟
12	اکتوبر ۱۹۶۳ء	مرد مار آمیزن عورتوں کی تاریخ سیاں کیجیے؟
23	نومبر ۱۹۶۷ء	علاقائی تعصب کا سبب کیا ہے؟ کیا واقعی ہندوستان اور مختلف علاقوں کے لوگ طبیعت کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے علاقوں کے لوگوں سے مختلف ہیں؟
29	جولائی ۱۹۶۸ء	کچھ کوکئی منہ رتے کے متعلق بتائیے؟
42	جنوری ۱۹۶۹ء	ہونولولو مشہور کا نام اکثر اخباروں میں پڑھا ہے۔ یہ شہر کس پنا پر مشہور ہے؟
51	دسمبر ۱۹۷۲ء	آسام کے میزولوگوں کے بارے میں بتائیے؟
53	اکتوبر ۱۹۶۹ء	کیا گلاب کی کاشت سب سے پہلے ہندوستان میں ہوئی؟
29	اپریل ۱۹۶۸ء	ایک لوری سال کی طویل مدت یاد دہی کا کیا مطلب ہے؟
34	جولائی ۱۹۶۹ء	ریٹیم کیا چیز ہے، ذرا اس پر روشنی ڈالئے؟
30	دسمبر ۱۹۷۰ء	ستارا اور ستارہ میں کیا فرق ہے؟ اور کتنے ستارے ہیں؟
22	نومبر ۱۹۷۱ء	دنیا میں مہوک، سیاری اور جہالت عام ہے، امریکا اس طوط توجانہ کے کرچانہ ماری پراستی دولت کیوں نشانہ ہے؟
24	اگست ۱۹۷۳ء	یہ امری، غریب کا فرق کیسے دور ہو سکتا ہے؟ جب سے دنیا بنی ہے تب ہی سے امیر غریب موجود ہیں؟
11	مئی ۱۹۷۴ء	دراصل آپ انھیں، بہرا، گولنگا اور غریب انسان کسے کہیں گے؟
91	ستمبر ۱۹۷۲ء	باسکٹ بال کا کھیل ہندوستانی ہے یا غیر ملکی؟
51	دسمبر ۱۹۷۲ء	ٹرانز سٹرکس ملک میں ایجاد ہوا؟
68	ستمبر ۱۹۷۳ء	"خنو بخنو" کسے کہتے ہیں؟
69	"	پی۔ سی۔ سرکار کے مقابلے کا ایک جادوگر گولیا پاشا تھا، کیا وہ زندہ ہے؟ اس کے بارے میں کچھ بتائیے؟
49	ستمبر ۱۹۶۸ء	برکس ۱۹۶۶ء میں جنوری کو سرکار کی جانب سے جو خطابات ملتے ہیں، ان میں سب سے بڑا "پی۔ بی۔ بی۔" ہے یا "پی۔ بی۔ بی۔"؟
53	اکتوبر ۱۹۶۹ء	آج کے طالب علموں کی بد نظمی اور بے چینی کے اسباب؟
52	"	کیا فرماں برداری اور حب الوطنی میں فرق ہے؟
44	مارچ ۱۹۶۵ء	برلا کی کاروباری وسعت کتنی ہے؟
52	فروری ۱۹۷۰ء	کیا جہنم بانی سے زیادہ مذہب یا فسطیہ الف کوئی اور بھی ہوئی ہے؟

۶۷۳	۲۴	جہازِ زنا کے تحت یا دورانِ جنگ میں عورتوں پر جو ظلم دسم ہوتا ہے، اُس کے نتیجے میں مرد، عورت کی مرضی سے حوالہ دلا دیا ہوتا ہے آپ اُسے ناجائز (حرام) مانتے ہیں؟
نمبر ۶۷۳	۵۶	مخبرے اور کبیرے میں کیا فرق ہے؟
۶۷۴	۱۱	عورت کے سوا سنگار مشہور ہیں، مخبر وہ کون کون سے ہیں؟
مارچ ۶۷۴	۱۰	جہازِ زنا کبھی مغل لائن سرکاری ہے یا پرائیویٹ؟
۶۷۴	۱۲	نیوٹرل اور حق کی طرف داری میں کیا فرق ہے؟
نمبر ۶۷۳	۵۴	کیا سچی محبت آج بھی پائی جاتی ہے؟
اکتوبر ۶۶۹	۵۳	اگر محبوب بے وفائیت ہو تو کیا محبت کے دلوں میں دیئے ہوئے تحفے اس سے واپس لئے جاسکتے ہیں؟
دسمبر ۶۷۰	۳۱	کیا دارمھی سے حیرے کی حفاظت ہوتی ہے؟
جولائی ۶۶۹	۳۴	نیکی کا پھل کہاں ملتا ہے؟
فروری ۶۶۸	۶۲	میرے ایک دوست میرے خط کا جواب نہیں دیتے، آخر انہیں کیا لکھا جائے کہ وہ جواب دیں؟
فروری ۶۷۰	۵۱	میں بہت دنوں سے دولت کمانے کی کوشش میں ہوں، مگر ابھی تک کام پائی نہیں ہوئی؟
نمبر ۶۷۱	۲۱	یہ بات اکثر دیکھی گئی ہے کہ خطرے میں گھر کر ایک کم زور انسان بھی اپنے آپ کو طاقت ور سمجھنے لگتا ہے؟ یہ کیوں؟
۶۷۴	۱۲	جس سے سب شش ہوں اور جو سب کا دوست ہو، اُس کو آپ کیا کہیں گے؟
"	"	وہ کون سی جگہ ہے جہاں رہنا مناسب نہیں؟
"	"	دنیا میں جہنم کی سی تکلیف کس بات میں ہے؟
اکتوبر ۶۶۹	۵۳	دنیا کی خوب صورت ترین چیز؟

گنگن آئندہ خاص نمبر مذہب نمبر شوکا

جس میں آپ کو
مذہب کسے کہتے ہیں؟ مذہب کب اور کیوں ایجاد ہوا؟ کیا انسان کو مذہب کی ضرورت ہے؟
مذہب اور خدا میں کیا تعلق ہے؟
ایسے بہت سے سوالوں کا جواب گنگن کے مذہب نمبر میں ملے گا

شعری بحث و مباحثہ سے متعلق
ہندوستان کا واحد اردو ماہ نامہ
شمال ہند
ماہ نامہ

انصاری مارکیٹ
دریا سنگھ
دہلی

مدیر
سرور تونسوی

بدلہ لوفد

سے خالق

آر سی کمار

کے جانب سے

نیک تمناؤں

سنجیدی فلمس

146۔ فیس سنے بلڈنگ۔ نمائشی، کبھی۔ 400011

گرام
سے

فون:۔
395127
372251

گل کامنستانی مسلمان نمبر

صاحب ذوق اور معیاری افراد کی پسند

یادگار خانی پٹیل

کے لذیذ اور صحت بخش کھانے
ساتھ میرے چائے، لستے اور دیگر کھنڈے مشروبات
فون 339179
201- بجت، الاختر
فاک لینڈ روڈ۔ بمبئی 4

نیک خواہشات

تیرپ

ہفت روزہ

کی جانب سے

12A- مہتری بنگلہ، عسرب گلی، بمبئی 3

نہیں ملتا کسی مضمون میں کا مضمون طرزِ انپا ہی سب جدا کہتے ہیں

آج کے نارمل رسالوں میں

ایک ایسا نارمل

رسالہ

گلکن

پہلا اردو کلچرل میگزین جو حق کا طرفدار ہے غیر جانب دار نہیں

آئندہ شمارے سنئے سنئے روپے میں طرزِ خط و قلم

○ آئی کی طرح چھنے والے اڈی ٹوریل نوٹس ○ تیر و نشتر جیسے ادبی فلمی
تبصرے ○ لیکن اندھیرے سے اجالے بن لانے والے اور نئی سمت کا بیتا
دینے والے مضامین ○ اور نئے افق کی جانب اشارہ کرنے والے عنوانات

ایک پرچا : ڈیڑھ روپے	گلکن کا مطالعہ	قیمت پیشگی بذریعہ منی آرڈر
بارا پرچے : اٹھارہ روپے	آپ کو حقیقت	وی پی کیلئے ہدایت نہ فرمائی
	پسند ہونے میں	
	مدد دے گا	

دی 'گلکن' میگزین، 5 واں فلور، کامیہ کرا سٹریٹ بمبئی 400003

مکان ہو یا دکان، پبلک ہال ہو یا سینما ہال
پلاسٹک کے کام کیلئے ہمیشہ



میکس پلاسٹک ورکس

(مبئی بڑے ہنگاموں پر)

کو یاد رکھئے

پلاسٹک ایلو مینٹیڈ پورٹ، پلاسٹک نیم پلیٹ، پلاسٹک میز، پلاسٹک ایڈورٹائزنگ
سلمان اور ناولٹیڈ بنانے میں ماہر ہیں
4 شنگر بلڈنگ، ستان ٹینک کراچی، لین انگریز، ممبئی

فون بتوسط
37 51 72

ایس۔ پی۔ پچرز کی جانب سے
جلد پیش کیا جائے گا
راہے پروڈکشنز کا

اندھیرا

ایک رنگین سس پیش آمیز فلم
غلام ساز فٹ انما ٹرکاکا
ایم۔ اے۔

تذیبی بنیاد پر ڈیزائن والا ایک شہکار

گلن کا ہندوستانی مسلمان مندر

(تیسرا طبع)

ہندوستان کا کے

سفر نامے مسلمان

نظامی صورت میں (۱)
نظامیہ ہندوستان اور اوجہاں خشی مسلمان شہریتوں کے سوانحی
خاکے، ہندوستان کے ایک ہزار برس میں ہندوستانی معاشرے
کو کسی بڑے اثر و رسوخ پر متاثر کیا۔ ان سوانحی خاکوں کی خصوصیت
یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان خامیوں کا بھی
ذکر کیا گیا ہے جو ہندوستان کے لئے بشریت میں موجود تھیں۔

ناشر

عبدل غفار

پتہ کا انتظار رکھئے

پتہ کا انتظار رکھئے

ہر طرح کے چھوٹے بڑے جہازوں کی مرمت کیلئے

(قائم شدہ: ۱۹۲۹)

مادرین امریکا ترکلیمینٹس

کو یاد رکھیے

فون آفس: 332823

گرام
میدین لک

میسرین ہاؤس، بمبئی ۹

ورکشاپ: 331319

نیک خواہشات

ہر سنی مسلم النور

ڈاکٹر عبد الکرم نائیک کی جانب سے

مجھے عجائب گھروں میں کھدو کرتے بے حرمتی کر گئے
مے وجود و عدم پہ یار و خدا کا کلمہ لکھا ہوا ہے

انجیل کے انکالے

آئینہ جہنم کی نیل سالہ شاعری کا انتخاب
قیمت: دس روپے
پتہ: - روڈ نمبر ۱۵، آف بلی کپٹن راجہ، انصاری روڈ، دریا گنج، دھولے

رسالہ فن و شخصیت کی پہلی پیش کش

مہنہ ناتھ یادگار نمبر

— نگراں —
کرشن چندر
ہندو پاک کے نامور قلم کاروں کی تخلیقات
مہنہ ناتھ کے شاہ کار افسانے، یادگار تصاویر
اور کرشن چندر کی لکھی ہوئی مہنہ ناتھ کی سوانح

— مدیران —
سی۔ ایل کادوش
صابر دت

قیمت
تین مورق پبلیکیشنز 15 چیمبر بلڈنگ، ادھواس پاستہ روڈ، وادربستی
25 روپے

چشم روشن و دل ماشاد
پر تکلف، لذیذ، بہترین مصالحوں سے بنے ہوئے شاہانہ مغلائی
کھانے اور پھر انفرادی خدمت کا حسین انداز

آپ کو دہلی دربار میں ملے گا
برساتی، تندوری، وائٹ چکن، ڈبہ گوشت، کھجور، اشامی کباب (نیلی کیلے پیرکٹڈ شینڈروم)
دہلی دربار مول، روپرور روشن ٹائیکرز، کارتر آف گرانٹ روڈ، ممبئی 4
(کیٹرنگ اور ہوم ڈیلیوری سروس کیلئے فون: 336673)

CIPLA

**INDIA'S TRULY NATIONAL
PHARMACEUTICAL CONCERN**



**CIPLA REMEDIES ARE
AMONG THE WORLD'S BEST.**

**CHEMICAL, INDUSTRIAL &
PHARMACEUTICAL LABORATORIES, LTD.**
289, BELLARY ROAD, BYCULLA, BOMBAY-8.

CIPLA The Chemical, Industrial and Pharmaceutical Laboratories—is among the foremost pharmaceutical manufacturing institutions in India.

CIPLA has contributed to the raising of the Indian Pharmaceutical Industry to its present high level.

CIPLA has established a tradition for Quality, Purity & Dependability.

CIPLA products, as a result of scrupulous care and attention at all stages of manufacture, analytical control, biological testing and standardization, rank among the world's best and have thus gained the approval and the fullest confidence of the medical profession in India and abroad.

CIPLA is always at the service of the Medical Profession and the Nation.

گنگن کا ہندوستانی معمارانہ نمونہ

بھارت
کے مسلمانوں کے لئے
”ولی، کپڑا اور مکان“
کے خالق

بھارت
کی جانب سے
نیک تمنائیں اور شہ کا منائیں

A large, stylized, high-contrast black and white graphic of a face, possibly a mask or a stylized portrait, with a prominent nose and a wide, open mouth. The image is heavily textured and grainy, with a stark, almost abstract quality. The face is oriented towards the right, with the mouth wide open in a large, dark, curved shape. The eyes are represented by two solid black circles. The overall style is reminiscent of a high-contrast photocopy or a heavily processed photograph.

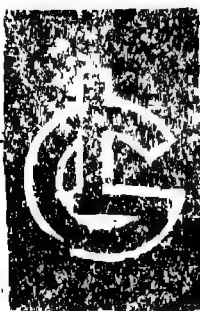
بہارِ کپیلے اور خوشیاں

مكتبة

۱۰) طرح کی کمزوری کیلئے آپوریا کٹانک

مفتی اعظم پاکستان: مولانا محمد رفیع

گیمبر لیبارٹریز



لک بریز یہ اسوٹ لپٹا کے منجنگ ڈاکٹر افغان تھوشتہ ماکی جائے پیکر خواتین

20 YEARS IN THE SERVICE OF INDUSTRY

DISTRIBUTORS OF
INDIAN OXYGEN LTD.

FOR
INDUSTRIAL GASES
GAS WELDING AND CUTTING EQUIPMENT
TRANSFORMER WELDING SET
RECTIFIER WELDING SET
ARGON ARC EQUIPMENT.

SUPPLY & HIRE
AC. & DIESEL WELDING SETS
AIR COMPRESSORS.
PLASMA WELDING & CUTTING
EQUIPMENTS & ACCESSORIES
FOR STAINLESS, ALUMINIUM
& OTHER
NON-FERROUS METAL



ARC BRAZER (PVT) LTD.

ESTD. 1944



SALES OFFICE
64, P. S. NIMBLEH
MARG, OPP. MUNICIPAL
WORKSHOP, BOMBAY-4

PHONE: 378835-374435
RESIDENCE: 378353 374438

HEAD OFFICE

SHOW ROOM & SALES
20, JACKERIA BUNKER ROAD,
COTT. H. GREEN, BOMBAY 33

PHONE: 378441 372327-374407

GRAMS: ARC BRAZER FOMBAY

50/2403

House of 1st welding equipment

With best compliments
from



CHAMANLAL SESODIA

The Canteen Contractor
of

CIBA GEIGY OF INDIA, CORLIM, GOA
CROMTON GREAVES OF INDIA LTD.,
BOMBAY-400 018

BHARAT BIJLEE, KALWA, THANA

MERCK SHARP & DOHM OF INDIA LTD.,
BOMBAY-400 078

HINDUSTAN PETROLEUM REFINERY,
BOMBAY-400 071



H. H. KHAN

A Popular Social Worker

A Renowned Publicist &

A Wellknown Speaker



— PARTNER —

KHAN'S ADVERTISING CORPORATION

(Founders of Cine Publicity in Urdu)

R
E
M
E
M
B
E
R

AKRAMI PUBLICITY

SHOW BUSINESS, PAPER & OUTDOOR
PUBLICITY EXPERT



SHANKAR BUILDING,
4-MASTAN TANK CROSS LANE,
BOMBAY-400 008.

With best compliments from :



RUSI MEHTA

SPL. EXECUTIVE MAGISTRATE
MUNICIPAL COUNCILLOR

CHAIRMAN
PUBLIC HEALTH COMMITTEE

EX CHAIRMAN
WORKS COMMITTEE (CITY)



RUSI MEHTA COMPOUND, JAIRAJBHAI LANE,
NEAR MUNICIPAL WORKS SHOP,
FORAS ROAD,

BOMBAY-400 008

Phone 21 11 01

With the compliments of :

THE MOGUL LINE LIMITED

BOMBAY

(A GOVERNMENT OF INDIA UNDERTAKING)

NOW OPERATES

- 1 Haj Pilgrim Service between Bombay and Jeddah.
2. Passenger and Cargo Service between Bombay and Red Sea Ports
- 3 Passenger-cum-Cargo Service between Bombay and West Asia (Gulf) Ports
- 4 Cruises to Malaysia and Singapore
- 5 Coastal Cargo Services
- 6 Konkan Passenger Service

For pleasure and comfort travel by Mogul Line's latest vessel

m.v. "AKBAR"

and enjoy the traditional hospitality and service of the Mogul Line

THE MOGUL LINE LIMITED

16, BANK STREET,

BOMBAY-400001

Telephone 256835

Telex 4049

Telegram "MOGUL"

U
S
E

Ideal Cooking Medium Products

of

RAJ OIL MILLS

224, BELLASIS ROAD,

BOMBAY-400 008

With
best
complements
from

Pinto Engineering Works

ESTD 1975

CYLINDER RE BORING SLEEVE FITTING, CRANK SHAFT GRINDING,
CONNECTING ROD RE METALING, VALVE SEAT CUTTING,
NO. VALVE SEAT FITTING, VALVE GUIDE FITTING &
ALL KINDS OF TURNING WORK UNDERTAKEN

1, PARTA INDUSTRIAL ESTATE, HEMLOCK ROAD,
WIRSAL ROAD, P. O. BOX 40001, AIR SECTOR,
J. N. ROAD, K. K. ROAD,
BOMBAY 400 011

THE PERFECT PORTLAND CEMENT LTD., RATLAM (M.P.) TYPE SECTION

1. Manufactured from the Pipes & Castings
2. (Conforming to IS 555: 1971)
3. Made from the best quality of Cement & Mortar
4. (Conforming to IS 2942: 1971)
5. (Conforming to IS 2942: 1971)

PERFECT CHEMICAL WARES

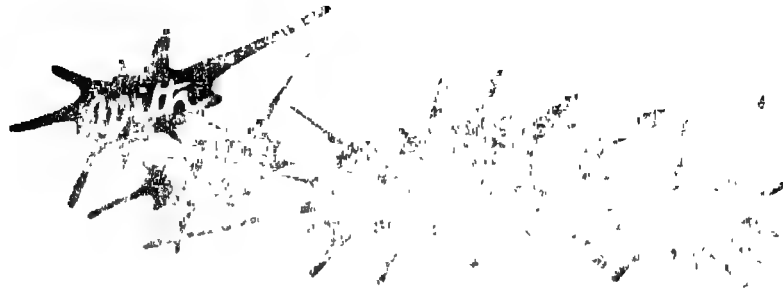
1. Acid Proof Tiles
2. Acid Proof Slabs
3. Acid Proof Rings used for Packing all Types

PERFECT CERAMICS

Manufactured by
Industrial & Electrical Porcelain

Regd. Office
JABALPUR (M.P.)
Phone: 4361

Regd. Office
RATLAM (M.P.)
Phone: 115 208



THE RATLAM STRAWBOARD MILLS PVT. LTD.

RATLAM (M. P.)

With best compliments from :



Grand Welding Centre
REPAIRERS

Oxy-Acetylene Regular, Welding Blow Pipe, Cutting
Blow Pipe Repairers with Work & all Welding Parts

Proprietor

YUSUF NAKHWA

CHIKALPAJA, FORAS ROAD,
BOMBAY-400 008.



**THERE HAS NEVER BEEN
A WATCH STRAP LIKE THIS!**

**NOW YOU CAN MAKE
ANY OF YOUR WATCH
AS CALENDER WATCH
PUT**



**DATE-O-CHANGE
FIBRE STRAP.**



**YOUR FINGER TIP TAKES ONLY
ONE SECOND TO CHANGE
THE DATE**

**CONTACT YOUR WATCH DEALER
OR
YAWACO ENTERPRISES
328, ALLIED INDUSTRIAL ESTATE,
BOMBAY 400016
PHONE 485533-482658**

و ابھی تعریف سے بھی زیادہ
آپ کا زیادہ سے زیادہ تعاون چاہتے ہیں
ایسا تعاون اور ایسا اشتراک جو
نقشہ کوکن
کی زندگی اور اس کی شان و شوکت میں
اضافہ کا باعث بننا چاہئے
نقشہ کوکن
کی اشاعت میں توسیع کے معنی
اس کے مقاصد کی مزید تکمیل کے ہیں
نقشہ کوکن
آج مقبول ہے۔ اسے مقبول تر بنائیے

ماہنامہ

نقشہ کوکن

مہم بیل روڈ ایسٹ، ڈوگری ممبئی

جون ۲۰۱۵ء

With best compliments from :

M M W

MAHARASHTRA METAL WORKS

SPECIALISED IN :

**BRIGHT ANNEALING OF FERROUS &
NON FERROUS METALS**

— PROPRIETOR —

M. F. RAHIM

80-E, CHIKAL PADA, R. S. NIMBKER MARG,
BOMBAY-400 008

For Homely Comfort

STAY AT

HOTEL
N A A Z



NEAR POST OFFICE,
JAMA MASJID
DELHI-110006

Phones 26 25 25, 26 23 63

With best compliments from :

BAREILLY
FURNITURE ART

ALL KIND OF FURNITURE
MAKERS



GALA NO 3, 80-E, CHIKAL PADA,
FORAS ROAD,
BOMBAY-400 008

Prop :

BABU BACHU

1000

TRANSPORT CONTRACTORS

KALYAN (THANA)

PHONE : 326

• •

SPOT

Proprietor :

Phone c/o 32 50 45

Tankiwala

39 32 14

Manufacturers of .

Proprietor

80-H. S. Nimkar Marg,
Chikal Pada (Foras Road),
Workshop No 5
BOMBAY-400 604.

With best compliments from :



**CORONATION
WAFER CO.**

MAZEDAAR AUR KURKURE WAFER

o Proprietor o -

HAKHAMANESHI & CO.

MANCHER MANZIL, FORAS ROAD,

BOMBAY-400 008.

With best compliments from :



**S H A M A
FURNITURE**

Manufacturers of
**All Types of Modern Wooden
Furniture**

- Partners -

MOHD. ISHAQ & SARDAR HUSAIN

5-80-E, Chikkal Pada,
R. S. Nimkar Marg,
Foras Road,
BOMBAY-400 008

With best compliments from :



**BHAGYODAYA
ENGINEERING WORKS**

Forging & Manufacturers of
**Hardware Items, Mill and Railway
Requisites**

Specialists in
Nickel Plating

Proprietor -

HATIM DOHADWALA

Phone no 893214
80-E, Chikal Pada,
Foras Road,
BOMBAY-400 008.

J
H
A
R
A
N

**An Ideal Hair Oil Compound
for Growth of Hair**

MANUFACTURED BY :

P. M. RATHOD & CO. PVT. LTD.
RATLAM (M. P.)

Phone : 37 43 03

**ORIENTAL
METAL INDUSTRIES**

Manufacturers of .

**Copper, Brass, Aluminium Rods,
Wires, Strips, Flat Bars,
etc.**

— Partner —

Ehsan Husain Kikabhoy Bhagat
41-A-B-C, Rusi Mehta Compound
Jairaj Bhal Lane,
Off Foras Road,
BOMBAY-400 008.

With best compliments from .



DOLARE MOTOR STORES

Dealer

HINDUSTAN PETROLEUM CORP.,

Proprietor :

G. M. DOLARE
BHIWANDI (Thana)
Phone : 8381

Among Feminine Fashions
INDIAN SAREES
Are Universally Acclaimed As
Prettiest Dresses

WE STOCK

Banarasi Sarees, South Indian Sarees,
Bangalories Coimbatore Sarees

Visit Your Favourite Shop
IQBAL HASAN & CO.
21-23, ERSKINE ROAD, NULL BAZAR,
BOMBAY-400 003



With Best Compliments from :



ARCHIS ENGINEERING CO.

Specialists in :

**Industrial Piping Instrumentation, Sheet Metal
Fabrication Skilled Labour Supplier**



C/12, "SHANTIWAN", 140-DIXIT ROAD EXTENSION,
VILE PARLE (EAST),
BOMBAY-400 057.

With Best Compliments from :



RAJASTHAN INDUSTRIES

MANUFACTURERS OF :

**EYE BOLTS, THIMBLES SHACKLES, HOOKS, STRANING SCREWS,
NUT BOLTS ELBOW, TEE & FLOW CONTROLL FITTINGS
FOR GAS, OIL & WATER**

— — OFFICE —

**R I Z W A N B U I L D I N G .
51 A-C, DOCKYARD CROSS ROAD,
M A Z A G A O N ,
BOMBAY-400 010.**



With best compliments from :



S H A K E E L A H M E D

Editor & Proprietor

THE "AAJ" DAILY

**242-M. AZAD ROAD,
BOMBAY-400 008.**

**STATION ROAD,
AURANGABAD**

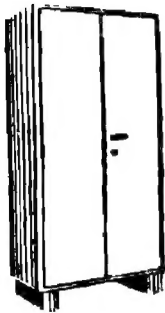
1000

BOMBAY-400 050

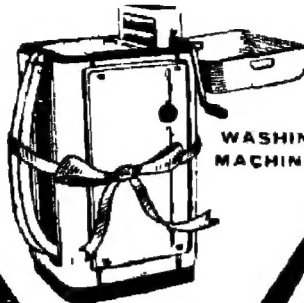
[illegible]

THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LTD.
ENCOURAGES YOU IN RAISING YOUR STANDARD OF LIVING AND HELPS IN ACQUIRING ON CONVENIENT TERMS THE FOLLOWING

**DOMESTIC
ARTICLES**



STEEL CUPBOARDS

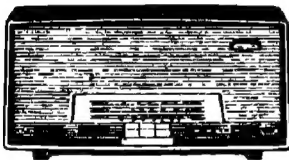


**WASHING
MACHINES**

**ACQUIRE ON
EASY
TERMS**



REFRIGERATORS



RADIOS



**WINDOW TYPE AIR
CONDITIONERS**



**THE BOMBAY MERCANTILE
CO-OPERATIVE BANK LTD.**



**SEWING
MACHINES**



CEILING FANS

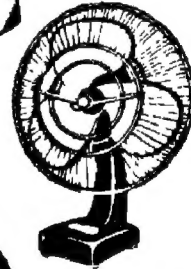


TABLE FANS

ALL KINDS OF BANKING BUSINESS TRANSACTED

K. B. MOHAMEDALLY ALLABUX

CHAIRMAN

ZAIN G. RANGOONWALA

MANAGING DIRECTOR

Phone: 325961 (5 Lines) Grams: 'KHAZANCHI' (Mandvi) Bombay

GOODS GO AT A JET

SPEED THROUGH



BOMBAY ANDHRA TRANSPORT CO.

OUR BRANCHES

Hyderabad, Secunderabad, Gulbarga, Bezwada, Guntur, Rajamundry,
Kavali, Nellore, Vizianagram, Warangal, Chirala, Tuni, Tenali, Madras,
Karimnagar, Nizamabad, Sholapur, Baroda, Ahmedabad, Vishakapatnam,
Banglore, Srikakulam, Surat, Navsari, Kalol, Udhna, Chinchwad,
Thana, Latur.

Administrative Office :

113, Bhandari Street,
Chakla, BOMBAY-400 003.

Booking Office :

105/7/9, Bhandari Street
Chakla, BOMBAY-400 003.

Telex: BATCO { Bombay : 3278
Hyderabad : 350

Tele { grams : BATRAN\$
322027
phones : 320169
322943
327444

Handwritten signature or stamp at the bottom center of the page.

GAGAN
K.A.
HINDUSTANI MUSALMAAN
NUMBER

مشرق کے بہترین روح پرورد عطریات جو اپنی بھینی بھینی خوشبو کے لئے مشہور ہیں!

عطر مجموعہ ۹۶
جسٹ

ATTAR MAJMUA 96

عطر نسیم
رجسٹرڈ

ATTAR NASEEM

حامی ایڈیٹریں پروفیسر جامع مسجد بمبئی

HAMI & CO. Perfumers
Juma Masjid BOMBAY-2 (INDIA)

Gagan

the first and the only cultural and rational magazine in Urdu is impartial: not necessarily non-

TITLE PRINTED AT RAINBOW ART PRINTERS, BOMBAY-400 008.

